

اردو

دائرۂ معارف اسلامیہ

زیر اہتمام

دانش گاہ پنجاب، لاہور



جلد نمبر ۹

(خمسہ.....دہتورہ)

ادارہ تحریر

رئیس ادارہ	ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، ایم اے، ڈی لٹ (پنجاب)
سینئر ایڈیٹر	سید محمد امجد الطاف، ایم اے (پنجاب)
سینئر ایڈیٹر	پروفیسر عبدالقیوم، ایم اے (پنجاب)
ایڈیٹر	عبدالمنان عمر، ایم اے (علیگ)
مستند ادارہ	ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، ایم اے (پنجاب)
ایڈیٹر ۱	خان محمد چاولہ، ایم اے (پنجاب)
ایڈیٹر ۲	پروفیسر مرزا مقبول بیگ بدخشی، ایم اے (پنجاب)
ایڈیٹر ۳	شیخ نذیر حسین، ایم اے (پنجاب)
۱۔ از ۱۹ اکتوبر ۱۹۷۰ء تا ۳۰ ستمبر ۱۹۷۱ء	۲۔ از ۱۱ فروری ۱۹۷۱ء
۳۔ از ۱۰ اکتوبر ۱۹۷۱ء	

مجلس انتظامیہ

- ڈاکٹر محمد اجمل، ایم اے، پی ایچ ڈی، قائم مقام و انس چانسلر، دانش گاہ پنجاب (صدر مجلس)
- جسٹس ڈاکٹر ایس۔ اے۔ رحمن، ہلال پاکستان، سابق چیف جسٹس سپریم کورٹ، پاکستان، لاہور
- لیفٹیننٹ جنرل ناصر علی خاں، سابق صدر پبلک سروس کمیشن، مغربی پاکستان، لاہور
- جناب معز الدین احمد، ایس۔ پی (ریٹائرڈ)، ۲۳۳۔ شارع طفیل، لاہور چھاؤنی
- جناب الطاف گوہر، سابق سی۔ ایس۔ پی، لاہور
- مستند مالیات، حکومت پنجاب، لاہور
- سید یعقوب شاہ، ایم اے، سابق آڈیٹر جنرل، پاکستان و سابق وزیر مالیات، حکومت مغربی پاکستان، لاہور
- جناب عبدالرشید خاں، سابق کنٹرولر پرنٹنگ اینڈ سٹیشنری، مغربی پاکستان، لاہور
- پروفیسر محمد علاء الدین صدیقی، ایم اے، ایل ایل بی، ستارہ امتیاز، و انس چانسلر (رخصتی)، دانش گاہ پنجاب، لاہور
- ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، ایم اے، ڈی لٹ، پروفیسر ایم ریٹس، سابق پرنسپل ادبی انٹیل کالج، لاہور
- پروفیسر ڈاکٹر محمد باقر، ایم اے، پی ایچ ڈی، پروفیسر ایم ریٹس، سابق پرنسپل ادبی انٹیل کالج، لاہور
- رجسٹرار، دانش گاہ پنجاب، لاہور
- خازن، دانش گاہ پنجاب، لاہور

اختصارات ورموز وغیرہ

اختصارات

(الف)

عربی، فارسی اور ترکی وغیرہ کتب اور ان کے تراجم اور بعض مخطوطات، جن کے حوالے اس موسوعہ میں کثرت آئے ہیں

ابن تفری بروی = التجوم الخرابرة فی ملوک مصر والفاہرة ، طبع W. Popper برکلی لائینڈن ۱۹۰۸ تا ۱۹۳۶ء۔

ابن تفری بروی، قاہرہ = وہی کتاب، قاہرہ ۱۳۳۸ھ، بعد۔

ابن حوقل، کرنیرز۔ وائٹ = ابن حوقل، ترجمہ J.H. Kramers and G. Wiet، بیروت ۱۹۹۳ء، دو جلدیں۔

ابن حوقل = کتاب صوره الارض، طبع J.H. Kramers لائینڈن ۱۹۳۸ء۔
BGA, II، بار دوم، ۲ جلدیں۔

ابن خرداذبہ = المسالك والبلد، طبع ذویا (M.I. de Goeje) لائینڈن ۱۸۸۹ء (BGA, VI)۔

ابن خلدون: خیر (یا الخیر): کتاب العمر و دیوان المستعمر والخیر، بولاق ۱۲۸۳ھ۔

ابن خلدون: مقدمہ = Prolegomenes d'Ebn Khaldoun، طبع E. Quatremere، بیس ۱۸۶۸ تا ۱۸۵۸ء (Notices et Extraits, XVI-XVII)۔

ابن خلدون: روزنحال = The Muqaddimah، مترجمہ Franz Rosenthal، ۳ جلدیں، لندن ۱۹۵۸ء۔

ابن خلدون: مقدمہ، دیسلان = Les Prolegomenes d'Ibn Khaldun، ترجمہ دعاشی M. de Slane، بیس ۱۸۶۳ تا ۱۸۶۸ء (طبع دوم) ۱۹۳۳ء۔

ابن خلکان = دنیات الاعیان و انباء ابناء الزمان، طبع دستخط (P. Wustenfeld)، گوتن ۱۸۴۵ تا ۱۸۵۰ء (حوالے شمار تراجم کے اعتبار سے دیئے گئے ہیں)۔

ابن خلکان = وہی کتاب، طبع احسان عباس، ۸ جلد، بیروت ۱۹۶۸ء تا ۱۹۷۲ء۔

ابن خلکان = کتاب مذکور، مطبوعہ بولاق ۱۲۷۵ھ، قاہرہ ۱۳۱۰ھ۔

آ = اردو دائرہ معارف اسلامیہ

آ، آ، ت = اسلام انسائیکلو پیڈیسی (= انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، ترکی)

آ، آ، ع = دائرہ المعارف الاسلامیہ (= انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، عربی)

آ، آ، لائینڈن یا Encyclopaedia of Islam (= انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، انگریزی)، بار اول یا دوم، لائینڈن۔

ابن الابار = کتاب تملک الصلہ، طبع کویرا F. Codera، میڈرڈ ۱۸۸۷ تا ۱۸۸۹ء (BAH, V-VI)۔

ابن الابار = تملک = M. Alarcony Palencia - C.A. Gonzalez، Misc Apendice a la adición Codera de Tecmilo، در

de estudios y textos arabes، میڈرڈ ۱۹۱۵ء۔

ابن الابار، جلد اول = ابن الابار = تملک الصلہ، Texte arabe d'apres un ms. de Fes, tome I, completant les deux

vol. edités par F. Codera، طبع A. Bel و عمر ابن حطب، الجزائر ۱۹۱۸ء۔

ابن الاثیر یا یا ۲ یا ۳ = کتاب الکامل، طبع نوربرگ C.J. Tornberg، بار اول، لائینڈن ۱۸۵۱ تا ۱۸۷۶ء، یا بار دوم، قاہرہ ۱۳۰۱ھ، یا بار سوم، قاہرہ ۱۳۰۳ھ، یا بار چہارم، قاہرہ ۱۳۳۸ھ، ۹ جلدیں۔

ابن الاثیر، ترجمہ فایان = Annales du Maghreb et de l'Espagne، ترجمہ فایان E. Fagnon، الجزائر ۱۹۰۱ء۔

ابن بکوال = کتاب الصلہ فی اخبار احمد الاغدرس، طبع کویرا F. Codera، میڈرڈ ۱۸۸۳ء (BAH, II)۔

ابن بطوطہ = کنزہ النظر فی غرائب الامصار و عجائب الاسفار (Voyages d'Ibn Bato cota)، عربی متن، طبع فرانسوی

مع ترجمہ از B.R. sanguinetti و C. Defremery، ۴ جلدیں، بیس ۱۸۵۳ تا ۱۸۵۸ء۔

- ۱۳۱۸ھ/۱۳۱۹ھ
 الاختصارات = ابن زید: الاختصارات، طبع و شملت، کوئٹہ، ۱۸۵۳ء
 (استاتیک)
 الاصابہ - ابن حجر العسقلانی: الاصابہ، ج ۲، مکتبۃ ۱۸۵۶ء/۱۸۵۷ء
 الاصطوری = المساکک والممکنات، طبع و خویا، لائپزین، ۱۸۷۰ء
 (BGA, I) (نقل باراول) ۱۹۲۷ء
 الاغانی، ۲، یا ۳: ابوالفرج الاصبہانی: الاغانی، باراول، بولاق
 ۱۲۸۵ھ، یا بارودوم، قاہرہ ۱۳۲۳ھ، یا برسوم، قاہرہ ۱۳۳۵ھ: ج ۱
 الاغانی، برنولڈ: کتاب الاغانی، ج ۲، صبح برنولڈ R.E. Brunnow
 لائپزین ۱۸۸۸ء/۱۳۰۶ء
 الاخباری: خزینہ = خزینۃ الاخبار علی طبقات الادباء، قاہرہ ۱۳۹۴ھ
 البغدادی: الفرق = الفرق بین الفرق، طبع محمد بدر، قاہرہ ۱۳۲۸ھ
 ۱۹۱۰ء
 البلاذری: انساب = انساب الاشراف، ج ۳ و ۵، طبع M. Schlusinger
 S.D.F. Goitein، بیت المقدس (بروکلین) ۱۹۳۶ء/۱۹۳۸ء
 البلاذری: انساب، ج ۱ = انساب الاشراف، ج ۱، طبع محمد حمید اللہ، قاہرہ
 ۱۹۵۹ء
 البلاذری: فتوح = فتوح البلدان، طبع و خویا، لائپزین ۱۸۶۶ء
 بیهقی: تاریخ بیهقی = ابوالحسن علی بن زید البیهقی: تاریخ بیهقی، طبع احمد
 بھیکار، تہران ۱۳۱۷ھ
 بیهقی: مختصر = ابوالحسن علی بن زید البیهقی: مختصر صوان الخلفاء، طبع محمد شفیق
 لاہور ۱۹۳۵ء
 بیهقی: ابوالفضل = ابوالفضل بیهقی: تاریخ مسعودی، Bibl. Indique
 ست ۱ = مختصر اردو دائرۃ معارف اسلامیہ
 تاریخ العروس: محمد رفیعی بن محمد اثر بیدی: تاریخ العروس
 تاریخ بغداد = الخطیب البغدادی: تاریخ بغداد، ۱۳، جلد ۱، قاہرہ
 ۱۳۳۹ھ/۱۹۳۱ء
 تاریخ دمشق = ابن عساکر: تاریخ دمشق، ۷ جلدیں، دمشق ۱۳۲۹ء
 ۱۹۱۱ء تا ۱۳۵۱ھ/۱۹۳۱ء
 تہذیب = ابن حجر العسقلانی: تہذیب التجذیب، ۱۲ جلدیں، حیدرآباد
 (دکن) ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء تا ۱۳۳۷ھ/۱۹۰۹ء

- ابن خلکان، ترجمہ دیسلان Biographical dictionary
 دیسلان: کتاب وفيات الاعیان، ترجمہ M. de Slane
 جلدیں، پیرس ۱۸۳۲ء/۱۸۷۱ء
 ابن رست = الاعلاق الفلیسیہ، طبع و خویا، لائپزین ۱۲۹۲ء تا ۱۸۹۴ء
 (BGA, VII)
 ابن رست، ویت Les Atours precieux: Wiet، مترجمہ
 G. Wiet، قاہرہ ۱۹۵۵ء
 ابن سعد: کتاب الطبقات الکبیر، طبع زخاؤ (H. Sachau) وغیرہ
 لائپزین ۱۹۰۳ء تا ۱۹۲۰ء
 ابن عذاری: کتاب البیان المغرب، طبع کولن (G.S. Colin) ویلیوی
 پروونسال (E. Levi provencal)، لائپزین ۱۹۳۷ء تا ۱۹۵۱ء
 جلد سوم، پیرس ۱۹۳۰ء
 ابن العمار: شدات = شدات الفہب فی اخبار من ذہب، قاہرہ
 ۱۳۵۰ء/۱۳۵۱ء (ستین و فیات کے اعتبار سے حوالے دیے گئے ہیں)
 ابن المقفع: مختصر کتاب البلدان، طبع و خویا، لائپزین ۱۸۸۶ء (BGA, I)
 (۷)
 ابن قتیہ: شعر (یا شعر) = کتاب الشعر و الشعر، طبع و خویا، لائپزین
 ۱۹۰۲ء/۱۹۰۳ء
 ابن قتیہ: معارف (یا المعرف) = کتاب المعارف، طبع و شملت، کوئٹہ
 ۱۸۵۰ء
 ابن ہشام: کتاب سیرۃ رسول اللہ، طبع و شملت، کوئٹہ ۱۸۵۸ء تا ۱۸۶۰ء
 ابوالفداء: تقویم = تقویم البلدان، طبع رینو (J.T. Reinaud)
 دیسلان (M. de Slane)، پیرس ۱۸۳۰ء
 ابوالفداء: تقویم، ترجمہ = Geographie d' Aboulfeda traduite
 de l' arabe en franciaz، ج ۱ و ۲، از رینو، پیرس ۱۸۳۸ء و ج
 ۳، St. Guyard، ۱۸۸۳ء
 الادریسی: المغرب = Description de l' Afrique et de
 Espagne، طبع و خویا، لائپزین ۱۸۶۶ء
 الادریسی، ترجمہ جوبار = Geographie d' Edrisi، مترجمہ
 P.P.A. Jauber، جلد، پیرس ۱۸۳۶ء تا ۱۸۳۰ء
 ابن عبد البر: الاستیعاب، ۲ جلد، حیدرآباد (دکن)

لائیڈن ۱۸۹۳ء (BGA. VII).
 المقدسی = المقدسی: احسن التاسیم فی معرفۃ الاقالیم، طبع ذخویہ،
 لائیڈن ۱۸۷۷ء (BGA. VII).
 المقرئ: Analectes = المقرئ: شیخ الطیب فی محضن الاندلس،
 الرطب، Analectes sur l'histoire et la litterature des
 Arabes de l'Espagne، لائیڈن ۱۸۶۱ء
 المقرئ، بولاق = کتاب مذکور، بولاق ۱۲۷۹ھ/۱۸۶۲ء.
 نجم پاشا: صحیفۃ الاخبار، استانبول ۱۲۸۵ھ.
 میرخواند: روحۃ الصفاء، بمبئی ۱۴۶۶ھ/۱۸۳۹ء.
 زمیۃ الخواطر = حکیم عبدالحی: زمیۃ الخواطر، حیدرآباد ۱۹۰۷ء، جلد.
 نسب = مصعب الزبیری: نسب قریش، طبع نیوی پرنسٹن، قاہرہ
 ۱۹۵۳ء.
 الوافی = الصمدی: الوافی بالوفیات، ج ۱، طبع رٹر (Ritter)، استانبول
 ۱۹۳۱ء، ج ۲ و ۳، طبع ڈیڈرنگ (Dedering)، استانبول ۱۹۳۵ء
 ۱۹۵۳ء.
 الہمدانی = الہمدانی: مکتبۃ جزیۃ العرب، طبع ملر (D.H. Muller)،
 لائیڈن ۱۸۸۳ء/۱۸۹۱ء.
 یاقوت طبع و مستطاب: تجمیع البلدان، طبع و مستطاب، ۵ جلدیں لائیڈز
 ۱۸۲۶ء/۱۸۷۳ء (طبع اناسٹیک، ۱۹۲۴ء).
 یاقوت: ارشاد (یا ادب) = ارشاد الارباب فی معرفۃ الارباب، طبع
 مرچلوت، لائیڈز ۱۹۰۷ء/۱۹۲۷ء (GMS. VI)، تجمیع الادباء،
 (طبع اناسٹیک، قاہرہ ۱۹۳۶ء/۱۹۳۸ء).
 یعقوبی (یا یعقوبی) = یعقوبی: تاریخ، طبع ہوتسما (W. Th. Houtsma)
 لائیڈز ۱۸۸۳ء، تاریخ یعقوبی، ۳ جلد، نجف
 ۱۳۵۸ھ/۲ جلد، بیروت ۱۳۷۹ھ/۱۹۶۰ء.
 یعقوبی: البلدان (یا البلدان) = یعقوبی: (کتاب) البلدان، طبع
 ذخویہ، لائیڈز ۱۸۹۲ء (BGA. VII).
 یعقوبی: یاقوت = یاقوت، Yaqubi, Les pays = Wiet، مترجمہ G. Wiet، قاہرہ
 ۱۹۳۷ء.

فرشتہ = محمد قاسم فرشتہ: نقش ابرار، طبع علی، بمبئی ۱۸۳۲ء.
 قرہنگ = قرہنگ جغرافیائی ایران، از انتشارات دائرۃ جغرافیائی
 ستاد ارتش، ۱۳۲۸ھ/۱۳۲۹ھ ش.
 قرہنگ آندراج = منشی محمد بادشاہ: قرہنگ آندراج، ۳ جلد، لکھنؤ
 ۱۸۸۹ء/۱۸۹۳ء.
 فقیر محمد = فقیر محمد علی: حدائق المحلیہ، لکھنؤ ۱۹۶۰ء.
 لٹن و لٹو: Second: Martin Lings, Alexander S. Fulton:
 Supplementary Catalogue of Arabic printed Books
 in the British Museum، لٹن ۱۹۵۹ء.
 لہرست (یا لہرست) = ابن الدیم: کتاب لہرست، طبع فلوجل،
 لائیڈز ۱۸۷۱ء/۱۸۷۳ء.
 (ابن) القطبی = ابن القطبی: تاریخ الحکماء، طبع لپرت J. Lippert،
 لائیڈز ۱۹۰۳ء.
 لکشی، طبع بولاق، فوات = ابن شاکر لکشی: فوات الوفیات، ۲ جلد
 بولاق ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۲ء.
 لکشی، فوات طبع عباس = ابن کتاب، طبع احسان عباس، ۵ جلد، بیروت
 ۱۹۷۳ء/۱۹۷۷ء.
 لسان العرب = ابن منکھور: لسان العرب، ۲۰ جلدیں، ۱۳۰۰ء
 ۱۳۰۸ھ.
 م آ آ = مختصر اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ.
 آثار الامراء = شاہ نواز خان: آثار الامراء، Bibl. Indica.
 مجالس المؤمنین = نور اللہ شوستری: مجالس المؤمنین، تہران ۱۳۹۹ھ ش.
 مراۃ العجمان = الیافعی: مراۃ العجمان، ۴ جلد، حیدرآباد (دکن) ۱۳۳۹ھ.
 مسعود کیمان = مسعود کیمان: جغرافیائی مفصل ایران، جلد، تہران
 ۱۳۱۰ء/۱۳۱۱ھ ش.
 المسودی: مروج: مروج الذهب، طبع ہاربیہ مینارد (C. Barbier)
 (de Meynard) دپاودہ کوڈی (Pevet de Courteille)،
 پیرس ۱۸۷۱ء/۱۸۷۷ء.
 المسودی: التیمیہ = المسودی: حساب التیمیہ والاشراف، طبع ذخویہ،

(ب)

کتاب انگریزی، فرانسیسی، جرمنی، جدید ترکی وغیرہ کے اختصارات، جن کے حوالے اس کتاب میں بکثرت آئے ہیں

Al-Aghani: *Tables=Tables Alphabetiques du Kitab al-aghani, redigees par F. Guidi, Leiden 1900.*

Babinger= F. Babinger: *Die Geschichtschreiber der Osmanen und ihre Werke, 1st ed., Leiden 1927.*

Barkan: *Kanunlar= Omar Lutfi Burkan: XV ve XVI inci Asirlarda Osmanli. Imparat orlugunda Zirai Ekonominin Hukuki ve Mali Esaxlari, I. Kanunlar, Istanbul 1943.*

Blachere: *Litt.=R. Blachere: Histoire de la Litterature arabe, i, Paris 1952.*

Bruckelmann, I. II=C. Brockelmann: *Geschichte der Arabischen Litteratur, Zweite den Supplement-banden angepasste Auflage, Leiden 1943-1949.*

Brockelmann, *St, II, III=G. d A.L., Erster (Zweiter, Dritter). Supplementband, Leiden 1937-42.*

Brown i = E.G.Brown: *Al literary History of Persia, from the earliest times until Firdowsi London 1902.*

Browne, ii=A *Literary History of Persia, from Firdaws to Sadi, London 1908.*

Browne, iii=A *History of Persian Literature under Tartar Dominion, Cambridge 1920.*

Browne, iv=A *History of Persian Literature in Modern Times, Cambridge 1924.*

Caetani: *Annali=L. Caetani: Annali dell' Islam, Milano 1905-26.*

Chauvin: *Bibliographie=V. Chauvin: Bibliographie des ouvrages arabes et relatifs aux Arabes, Lille 1892.*

Dorn: *Quelen=B. Dorn: Muhammedanische Quellen zur Geschichte der sudlichen Kustenlander des*

Kaspischen, Meeres, St. Petersburg 1850-58.

Dozy: *Notices=R. Dozy: Notices sur quelques manuscrits arabes, Leiden 1847-51 and D.S. Margoliouth, London 1937.*

Dozy: *Recherches= R. Dozy : Recherches sur l'histoire et la litterature de l' Espagne Pendant le maoyen-age, 3rd ed., Paris-Leiden 1881.*

Dozy, *Suppl.=R.Dozy :Supplement aux dictionnaires arabes, 2nd ed., Leiden-Paris 1927.*

Fagnan: *Extraits =E. Fagnan: Extraits incdits relatifs au Maghreb, Alger 1924.*

Gesch. des Qor.=Th. Noldeke: Geshichte des Qorans, new edition by F. Schwally, G. Bergstrasser and G. Pretzl, 3 vols., Leipzig 1909-38.

Gibb: *Ottoman Poetry=E.J.W. Gibb: A History of Ottoman Poetry, London 1900-09.*

Gibb-Bowen= H.A.R. Gibb and Harold Bowen: *Islamic Society and the West, London 1950-57*

Goldziher: *Muh.St.=I. Goldziher: Muhammedanische Studien, 2 Vols., Halle 1888-90*

Goldziher: *Vorlesungen= I Goldziher :Vorlesungen uber den Islam, Heidelberg 1910.*

Goldziher: *Vorlesungen²=2nd ed., Heidelberg 1925.*

Goldziher: *Dogme= Le dogme et la loi del Islam, tr. F. Amin, Paris 1920.*

Hammer-Purgstall: *GOR=J.von Hammer (purgstall) : Geschichte des Osmanischen Reiches, Pest 1828-35.*

Hammer-Purgstall: *GOR²=the same. 2nd ed., Pest 1840.*

Hammer-Purgstall: *Histoire=the same, trans by J.J. Hellert, 18 vol., Bellizard (etc.), Paris (etc.)*

- 1835-43.
- Hammer-Purgstall: *Staatsverfassung*=J. von Hammer: *Des Osmanischen Reiches Staatsverfassung und Staatsverwaltung*, 2 vols., Vienna 1815.
- Houtsma: *Recueil*=M.Th. Houtsma: *Recueil des textes relatifs à l'histoire des Seldjoucides*, Leiden 1886-1902.
- Jaynboll: *Handbuch*=Th. W. Jaynboll: *Handbuch des islamischen Gesetzes*, Leiden 1910.
- Jaynboll: *Handleiding*=*Handleiding tot de kennis der mohammedaansche wet*, 3rd ed., Leiden 1925.
- Lane=E.W. Lane: *An Arabic-English Lexicon*, London 1863-93 (Reprint, New York 1955-56).
- Lane-Poole: *Cat*=S. Lane-Poole: *Catalogue of Oriental Coins in the British Museum*, 1877-90.
- Lavoix: *Cat.*=H. Lavoix: *catalogue des Monnaies Musulmanes de la Bibliothèque Nationale*, Paris 1887-96.
- Le Strange=G. Le Strange: *The Lands of the Eastern Caliphate* 2nd ed., Cambridge 1930 (Reprint, 1966).
- Le Strange: *Baghdad*=G. Le Strange: *Baghdad during the Abbasid Caliphate*, Oxford 1924.
- Le Strange: *Palestine*=G. Le Strange: *Palestine under the Moslems*, London 1890 (Reprint, 1965).
- Levi-Provençal: *Hist. Esp. Mus.*=E. Levi-Provençal: *Histoire de l'Espagne Musulmane*, nouv. ed., Leiden-Paris 1950-53, 3 vols.
- Levi-Provençal: *Hist. Chorfa*=E. Levi-Provençal: *Les Historiens des Chorfa*, Paris 1922.
- Maspero-Wiet: *Matériaux*=J. Maspero et G. Wiet: *Matériaux pour servir à la Géographie de l'Égypte*, Le Caire 1914 (Mifao, XXXVI).
- Mayer: *Architects*=L.A. Mayer: *Islamic Architects and their Works*, Geneva 1958.
- Mayer: *Astrolabists*=L.A. Mayer: *Islamic Architects and their Works*, Geneva 1956.
- Mayer: *Metalworkers*=L.A. Mayer: *Islamic Astrolabists and their Works*, Geneva 1959.
- Mayer: *Woodcarvers*=L.A. Mayer: *Islamic Woodcarvers and their Works*, Geneva 1958.
- Mez: *Renaissance*=A. Mez: *Die Renaissance des Islams*, Heidelberg 1922, (Spanish Translation by S. Vila, Madrid-Granada 1936).
- Mez: *Renaissance*, Eng. tr.=the same, English translation by Salahuddin Khuda Bukhsh and D.S. Margoliouth London 1937.
- Nallino: *Scritti*=C.A. Nallino: *Raccolta di Scritti editi e inediti*, Roma 1939-48.
- Pakahn=Mehmet Zeki Pakahn: *Osmanlı Tarih Deyimleri ve Terimleri Sözlüğü*, 3 vols., Istanbul 1946 ff.
- Pauly-Wissowa=*Realencyklopädie des klassischen Altertums*.
- Pearson=J.D. Pearson: *Index Islamicus*, Cambridge 1958.
- Pons Boigues=*Ensayo bio-bibliográfico sobre los historiadores y geógrafos arabio-españoles*, Madrid 1898.
- Rypka, *Hist. of Iranian literature*=J. Rypka et alii, *History of Iranian literature*, Dordrecht 1968.
- Santillana: *Istituzioni*=D. Santillana: *Istituzioni di diritto musulmano malichita*, Roma 1926-38.
- Schlimmer=John L. Schlimmer: *Terminologie medico-Pharmaceutique et Anthropologique*, Tehran 1874.
- Schwarz: *Iran*=P. Schwarz: *Iran im Mittelalter nach den arabischen Geographen*, Leipzig 1896.
- Smith=W.=Smith: *A Classical Dictionary of Biography, Mythology and Geography*.
- Hurgronje: *Verspr. Ged. Geography*, London

1853.	<i>der Araber und ihre Werke</i> , Leipzig 1900.
Snouck Hurgronje: <i>Verspr. Geschr.</i> =C. Snouck Hurgronje: <i>Verspreide Geschriften</i> Bonn Leipzig-Leiden 1923-27.	Taeschner: <i>Wegenetz</i> =F. Taeschner: <i>Die Verkehrswege und den Wegenetz Anatoliens im Wandel der Zeiten</i> , Gotha 1926.
Sources med=Comte Henri de Castries: <i>Les Sources medites de l' Histoire du Maroc</i> , Paris 1905, 1922.	Tomaschek=W. Tomaschek: <i>Zur historischen Topographie von Kleinasien im Mittelalter</i> , Vienna 1891.
Spuler: <i>Horde</i> =B. Spuler: <i>Die Golaene Horde</i> Leipzig 1943.	Wensinck: <i>Handbook</i> =A.J. Wensinck: <i>A Hand book of Early Muhammadan Tradition</i> , Leiden 1927.
Spuler: Iran=B. Spuler: <i>Iran in fruh-Islamischer Zeis</i> , Wiesbaden 1952.	Wiel: <i>Chalifen</i> =G. Weil: <i>Geschichte der Chalifen</i> , Mannheim-Stuttgart 1846-82.
Spuler: Mongolen=B. Spuler: <i>Die Mongolen in Iran</i> , 2nd. ed, Berlin 1955.	Zambaur=E.de Zambaur: <i>Manual de de genealogie et de chronologie pour l'histoire de l'Islam</i> . Hanover 1927 (anastatic reprint, Bad Pyrmont 1955).
SNR=Stephan and Naudy Ronart: <i>Concise Encyclopuedia of Arabic Civilization</i> , Djambatan Amsterdam 1959.	Zinkeisen=J. Zinkeisen: <i>Geschichte des Osmanischen Reiches in Europa</i> , Gotha 1840-83.
Storey=C.A. Storey: <i>Persian Literature: a biobibliographical survey</i> , London 1927.	Zubaid Ahmad= <i>The Contribution of India to Arabic Literature</i> , Allahbad 1946 (reprint, Lahore 1968).
<i>Survey of Persian Art</i> = ed. by A.U. Pope, Oxford 1938.	
Suter=H. Suter: <i>Die Mathematiker und Astronomen</i>	

مجلات، سلسلہ ہائے کتب، وغیرہ، جن کے حوالے اس کتاب میں بکثرت آئے ہیں

AB=Archives Berbères.

Abh. G. W. Gott=Abhandlungen der Gesellschaft der Wissenschaften zu Göttingen.

Abh. K. M.=Abhandlungen f. d. Kunde des Morgenlandes.

Abh. Pr. Ak. W.=Abhandlungen d. preuss. Akad. d. Wiss.

Afr. Fr.=Bulletin du Comité de l'Afrique française.

Afr. Fr. RC=Bulletin du Com. de l'Afr. franc., Renseignements Coloniaux.

AIEO Alger=Annales de l'Institut d'Etudes Orientales de l'Université d'Alger.

AIUON=Annali dell' Instituto Univ. Orient. di Napoli.

AM=Archives Marocaines.

And=Al-Andalus.

Anth=Anthropos.

Anz. wien=Anzeiger der philos-histor. Ki. d. Ak. der Wiss. Wien.

AO=Acta Orientalia.

Arab.=Arabica

ArO=Archiv Orientalni

ARW=Archiv für Religionswissenschaft.

ASI=Archaeological Survey of India.

ASI, NIS=the same, New Imperial Series.

ASI, AR=the same, Annual Reports.

AUDTCFD=Ankara Üniversitesi Dil ve Edebiyat Fakültesi Dergisi.

As. Fr. B= Bulletin du Comité de l'Asie Française.

BAH=Bibliotheca Arabico-Hispana.

BASOR=Bulletin of the American School of Oriental Research.

Bell=Türk Tarih Kurumu Belleten.

BFac. Ar. = Bulletin of the Faculty of the Egyptian University.

BEl. Or. = Bulletin d'Etudes Orientales de l'Institut Française Damas.

BGA=Bibliotheca geographorum arabicorum.

BIE=Bulletin de l'Institut Egyptien.

BIFAO=Bulletin de l'Institut Français J. d'Archéologie Orientale du Caire.

BIS=Bibliotheca Indica series.

BRAH=Boletín de la Real Academia de la Historia de España.

BSE=Bolshaya Sovetskaya Entsiklopediya (Large Soviet Encyclopaedia), 1st ed.

BSE²=the Same, 2nd ed.

BSL(P)=Bulletin de la Société de Linguistique (de Paris).

BSO(A)S=Bulletin of the School of Oriental (and African) Studies.

BTLV=Bijdragen tot de Taal, Land-en Volkenkunde (van Ned-Indie).

BZ=Byzantinische Zeitschrift.

COC=Cahiers de l'Orient Contemporain.

CT=Cahiers de Tunisie.

EI¹=Encyclopaedia of Islam, 1st edition.

EI²=Encyclopaedia of Islam, 2nd edition.

EIM=Epigraphia Indo-Moslemica.

ERE=Encyclopaedia of Religion and Ethics.

GGA=Göttinger Gelehrte Anzeigen.

GJ=Geographical Journal.

GMS=Gibb Memorial Series.

Gr. I. ph=Grundriss der Iranischen Philologie.

GSAI=Giornale della Soc. Asiatica Italiana.

Hesp.=Hesperis.

IA=Islam Ansiklopedisi (Turkish).

IBLA=Revue de l'Institut des Belles Lettres Arabes, Tunis.

IC=Islamic Culture.

IFD=İlahiyat Fakültesi.

IG=Indische Gids.

IIHQ=Indian Historical Quarterly.

IQ=The Islamic Quarterly.

IRM=International Review of Missions.

Isl.=Der Islam.

JA=Journal Asiatique.

JAfr. S.=Journal of the African Society.

JAOS=Journal of the American Oriental Society.

JAnthr. I=Journal of the Anthropological Institute.

JBBRAS=Journal of the Bombay Branch of the Royal Asiatic Society.

JE.=Jewish Encyclopaedia.

JESHO=Journal of the Economic and Social History of the Orient.

JNES=Journal of Near Eastern Studies.

JPak.HS=Journal of the Pakistan Historical Society.

JPHS=Journal of the Punjab Historical Society.

JQR=Jewish Quarterly Review.

JRAS=Journal of the Royal Asiatic Society.

J(R)ASB=Journal and Proceedings of the (Royal) Asiatic Society of Bengal.

J(R)Num.S=Journal of the (Royal) Numismatic Society.

JRGeog.S=Journal of the Royal Geographical Society.

JSFO=Journal de la Societe Finno-ougrienne.

JSS=Journal of Semetic studies.

KCA=Karosi Csoma Archivum.

KS=Keleti Szemle (Revue Orientale).

KSIE=Kratkie Soobshcheniya Instituta Etnografiy (Short Communications of the Institute of Ethnography).

LE=Literaturnaya Entsiklopediya (Literary Encyclopaedia).

Mash.=Al-Mashrik.

MDOG=Mitteilungen der Deutschen Orient- Gesellschaft.

MDVP=Mitteilungen und Nachr. des. Deutschen Palistina- vereins.

MEA=Middle Eastern Affairs.

MEJ=Middle East Journal.

MFOB=Melanges de la Faculte Orientale de Beyrouth.

MGG Wien=Mitteilungen der geographischen Gesellschaft in Wien.

MGMN=Mitt. Geschichte der Medizin und der naturwissenschaften.

MGWJ=Monatsschrift f. d. Geschichte u. Wissen schaft des Judentums.

MI=Mir Islama.

MIDEO=Melanges de l' Institut Dominicaïn d' Etudes Orintales du Caire.

MIE=Memoires de l' Institut d' Egyptien.

MIFAO=Memories publies par les membres de l' Inst. Franc d' Aracheologie Orientale du Caire.

MMAF=Memoires de la Mission Archeologique Franc au Caire.

MMIA=Madjallat al-Madjmaal-ilmi al Arabi Damascus.

MO=Le Monde oriental.

MOG=Mitteilungen zur osmanischen Geschichte.

MSE=Malaya Sovetskaya Entsiklopediya-(Small Soviet Encyclopaedia).

MSFO=Memoires de la Societe Finno-ougrienne.

MSL=Memoires de la Societe Linguistique de Paris.

<i>MSOS Afr</i> = <i>Mitteilungen des Sem. für Oriental. Sprachen Afr. Studien.</i>	<i>RIMA</i> = <i>Revue de l'Institut des études de l'Arabie</i>
<i>MSOS As.</i> = <i>Mitteilungen des Sem. für Oriental. Sprachen Westasiatische Studien</i>	<i>RM</i> = <i>Revue du Monde Musulman</i>
<i>MTM</i> = <i>Mitteilungen der Vorderasiatisch-ägyptischen Gesellschaft.</i>	<i>RO</i> = <i>Revue Orientale (Syrie, etc.)</i>
<i>MVAG</i> = <i>Mitteilungen der Vorderasiatisch-ägyptischen Gesellschaft.</i>	<i>ROC</i> = <i>Revue de l'Orient Chrétien</i>
<i>MW</i> = <i>The Muslim World.</i>	<i>ROL</i> = <i>Revue de l'Orient Latin</i>
<i>NC</i> = <i>Numismatic Chronicle.</i>	<i>RAH</i> = <i>Revue de la R. Académie de la Histoire. Madrid.</i>
<i>NGW Gott.</i> = <i>Nachrichten von d. Gesellschaft d. Wiss. zu Göttingen.</i>	<i>RSO</i> = <i>Rivista degli Studi Orientali.</i>
<i>OA</i> = <i>Orientalisches Archiv.</i>	<i>RT</i> = <i>Revue Tunisienne.</i>
<i>OC</i> = <i>Oriens Christianus.</i>	<i>SBAG. Heid.</i> = <i>Sitzungsberichte der Ak. der Wiss. zu Heidelberg.</i>
<i>OCM</i> = <i>Oriental College Magazine, Lahore.</i>	<i>SBAG. Wien</i> = <i>Sitzungsberichte der Ak. der Wiss. zu Wien.</i>
<i>OCMD</i> = <i>Oriental College Magazine, Dacca, Lahore.</i>	<i>SBBayr. Ak.</i> = <i>Sitzungsberichte der Bayerischen Akademie der Wissenschaften.</i>
<i>OLZ</i> = <i>Orientalistische Literaturzeitung.</i>	<i>SBPMS Erlg.</i> = <i>Sitzungsberichte d. Phys. mediz. Societät in Erlangen.</i>
<i>OM</i> = <i>Oriente Modern.</i>	<i>SBPr. Ak. W.</i> = <i>Sitzungsberichte der preuss. Ak. der Wiss. zu Berlin.</i>
<i>Or.</i> = <i>Oriens.</i>	<i>SE</i> = <i>Sovetskaya Etnografiya (Soviet Ethnography).</i>
<i>PEFQS</i> = <i>Palestine Exploration Fund Quarterly Statement.</i>	<i>SI</i> = <i>Studia Islamica.</i>
<i>PELOV</i> = <i>Publications de l'École des langues orientales vivantes.</i>	<i>SO</i> = <i>Sovetskoe Vostokovedenie (Soviet Orientalism).</i>
<i>Pet.Mit.</i> = <i>Petersburgs Mitteilungen.</i>	<i>Stud. Isl.</i> = <i>Studia Islamica.</i>
<i>PRGS</i> = <i>Proceedings of the R. Geographical Society.</i>	<i>S. Ya.</i> = <i>Sovetskoe Yazykoznanie (Soviet Linguistics).</i>
<i>QDAP</i> = <i>Quarterly Statement of the Department of Antiquities of Palestine.</i>	<i>SYB</i> = <i>The Statesman's Year Book.</i>
<i>RAfr.</i> = <i>Revue Africaine</i>	<i>TBG</i> = <i>Tijdschrift van het Bataviaasch Genootschap van Kunsten en Wetenschappen.</i>
<i>RCEA</i> = <i>Repertoire Chronologique d'Epigraphie arabe.</i>	<i>TD</i> = <i>Tarih Dergisi.</i>
<i>REI</i> = <i>Revue des Etudes Islamiques.</i>	<i>TIE</i> = <i>Travaux Instituts Etnographiques (Works of the Institute of Ethnography).</i>
<i>REJ</i> = <i>Revue des Etudes Juives.</i>	<i>TM</i> = <i>Turkiyat Mecmuası</i>
<i>Rend. Lm.</i> = <i>Rendiconti della Reale Accad. dei Lincei. Cl. di sc. mor., stor. e filol.</i>	<i>TOEM</i> = <i>Tarih-i Othmani (Turk Tarih-i Endjumeni mecmuası).</i>
<i>RHR</i> = <i>Revue de l'Histoire des Religions.</i>	<i>TTLV</i> = <i>Tijdschrift, v. Indische Taal, Land en Volkenkunde.</i>
<i>RI</i> = <i>Revue Indigène.</i>	<i>Verh. Ak. Amst.</i> = <i>Verhandelingen der Koninklijke</i>

Akademie van Wetenschappen te Amsterdam.	ZA=Zeitschrift für Assyriologie.
Verh. Med. Ak. Amst = Verslagen en Mededeelingen	Zap.=Zapiski.
der Koninklijke Akademie van wetenschappen te Amsterdam.	ZATW=Zeitschrift für die alttestamentliche Wissenschaft.
VI=Voprosi Istority (Historical problems).	ZDMG=Zeitschrift der Deutschen Morgenlandischen Gesellschaft.
WI=Die Welt des Islams.	ZDPV=Zeitschrift des Deutschen Palästinavereins.
WI,NS=the same. New Series.	ZG Erdk. Berl.=Zeitschrift der Gesellschaft für Erdkunde in Berlin.
Wiss. Veroff. DOG = Wissenschaftliche Veröffentlichungen der Deutschen Orient-Gesellschaft.	ZK=Zeitschrift für Kolonialsprachen.
WMG=World Muslim Gazetteer, Karachi.	ZOEG=Zeitschrift f. Osteuropäische Geschichte.
WZKM=Wiener Zeitschrift für die Kunde des Morgenlandes	ZS=Zeitschrift für Semitistik.

علامات و رموز و اعراب

(۱)

علامات

※ مقالہ، ترجمہ از آء، لائین

③ جدید مقالہ، برائے اردو دائرہ معارف اسلامیہ

[] اضافی، از ادارہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ

(۲)

رموز

ترجمہ کرتے وقت انگریزی رموز کے سند وجہ ذیل اردو مقابل اختیار کیے گئے ہیں:

کتاب مذکور = op.cit.

دیکھیے لغوی مفہوم (قارب یا قایل) = cit.

ق۔م (قبل مسج) = B.C.

م (مستوی) = d.

محل مذکور = loc. cit.

کتاب مذکور = ibid.

وہی معنی = idem.

ح (سہاہری) = A.H.

ع (سہیحہ سولی) = A.D.

چند = l., ff., sq., sqq.

بذیل ماژہ (یا کلمہ) = s. v.

دیکھیے: کسی کتاب کے حوالے = see; s.

کے لیے

رک۔پہ (رجوع کنید بہ) یا رک۔ہاں = q.v.

(رجوع کنید ہاں): آ آ کے کسی

مقالے کے حوالے کے لیے

بہ واضح کثیرہ = passim.

(۳)

اعراب

(ج)

آء = e آواز کو ظاہر کرتی ہے (پن: pen)

o = o کی آواز کو ظاہر کرتی ہے (مول: mole)

ت = t کی آواز کو ظاہر کرتی ہے (تورکیہ: Turkiya)

ک = k کی آواز کو ظاہر کرتی ہے (کول: köl)

ا = a کی آواز کو ظاہر کرتی ہے (آرادیب: āradjāb: آرادیب)

(radjab

ت = علامت سکون یا ترم (بسمیل: bismil)

(۱)

Vowels

a = (۷) آ

i = (۶) ک

u = (۵) خ

(ب)

Long Vowels

ā = (۸) آ (آج کل: aj kal)

ī = (۹) ی (سیم: Sim)

ū = (۱۰) و (ہارون الرشید: Hārūn al-Rashid)

ai = (۱۱) اے (سیر: Sair)

متبادل اردو عربی حروف

g = گ	s = س	b = ب	b = ب
gh = گھ	sh, ch = ش	Kh = خ	bh = بھ
= ں	s = ص	d = د	p = پ
lh = لھ	d = ذ	dh = دھ	ph = پھ
m = م	t = ط	ḍ = ڑ	t = ت
mh = مھ	z = ز	dh = ڈ	th = ٹھ
n = ن	= ں	dh = ڈھ	t = ٹ
nh = نھ	gh = گھ	r = ر	th = ٹھ
w = و	f = ف	rh = رھ	th = ٹھ
h = ہ	k = ک	r = ر	dj = ج
, = ,	k = ک	rh = رھ	djh = جھ
y = ی	kh = کھ	z = ز	č = چ
		ž, zh = ژ	ch = چھ

مقابلہ اردو عربی حروف

g = گ	s = س	h = ح	b = ب
gh = گھ	sh, gh = ش	Kh = خ	bh = بھ
l = ل	s = مس	d = د	p = پ
lh = لھ	d = ض	dh = دھ	ph = پھ
m = م	t = ط	d̄ = ذ	t = ت
m̄ = مھ	z = ظ	dh̄ = ذھ	th = تھ
n = ن	‘ = ع	dh = ڈھ	t̄ = ٹ
nh = نھ	gh = غ	r = ر	th̄ = ٹھ
w = و	f = ف	rh = رھ	th̄ = ٹھ
h = ہ	k = ق	r̄ = ز	dj = ج
‘ = ے	k = ک	rh̄ = زھ	djh = جھ
y = ی	kh = کھ	z = ز	č = چ
		ž, zh = ژ	ch = چھ

* **خمسه** : ترکی میں **خمسه** - یہ وہ تلفظ ہے جو مشرقی عربوں اور ترکوں کے ہاں رائج ہے - **خمسه** پانچ مثنویوں کے مجموعے کو کہا گیا ہے - سب سے زیادہ مشہور **خمسه** نظامی ہے جسے "پنج گنج" بھی کہتے ہیں یعنی، **مخزن الاسرار** (۱۱۶۳/۵۵۹ء) **خسرو و شیرین** (۱۱۸۰/۵۵۶ء)، "لیلیٰ و مجنون" (۵۸۸/۶۰۸ء) **ہفت پیکر** (۱۱۹۷/۵۵۹ء) **سکندر نامہ** (۱۲۰۱/۵۵۹ء) - **امیر خسرو دہلوی** کا **خمسه** یعنی **نطع الانوار** (۱۲۹۹/۵۷۸ء)، **شیرین و خسرو**، **مجنون و لیلیٰ** (اسی سال)، **آئینہ سکندری** (۱۲۰۰/۵۶۹ء) **ہشت بہشت** (۱۲۰۲/۵۷۰ء) - **خواجو کرمانی** کا **خمسه** یعنی **روضۃ الانوار** (۱۲۳۳/۵۷۳ء) میں مکمل ہوا) **ہمای ہمایوں**، **کمال نامہ**، **گل و نوروں**، **جواہر نامہ** - **کاتبی** کا **خمسه** جو مکمل نہ ہو سکا - **ہمارے پاس** اس میں سے **گلشن ابرار** اور **لیلیٰ و مجنون** تقریباً ۱۲۳۳/۵۸۳ء کے ہیں - **جامی** کا **خمسه** "ہفت اورنگ" یعنی **تحفۃ الاحرار** (۱۲۸۱/۵۸۸ء) **سجۃ الابرار**، **یوسف و زلیخا** (۵۸۸/۱۳۸۳ء)، **لیلیٰ و مجنون** (۵۸۸/۱۳۸۳ء) **خرد نامہ** **سکندری** - **ہاتھی** کا **خمسه** غالباً مکمل نہ ہو سکا - اس میں **لیلیٰ و مجنون**، **ہفت منظر**، **شیرین و خسرو**، **تیمور نامہ** (۱۵۱۰/۵۹۲ء) [بہ تصحیح ۱۵۱۱ء] اور ۱۵۲۱/۵۹۲ء کے درمیان) شامل ہیں - **فیضی** کا **خمسه** مرکز ادوار، **سلیمان و بلقیس**، **نیل دشن**، **ہفت کشور**، **اکبر نامہ** (۱۵۹۵/۱۰۰۳ء) نامکمل - **حسن بن سید فتح** **اللہ** کا **خمسه** **محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم** اور **خلفائے راشدین** کی شان میں ہے (۱۶۲۸/۱۰۳۸ء تا ۱۶۳۰/۱۰۳۹ء) - **سلاطین** **طغرانی** **مشہدی** کا **خمسه** ناقصہ **گولکنڈہ** **دربار** کے پانچ اشخاص کی ہجو میں ہے - **مصنف** کا انتقال اورنگ زیب کے عہد میں (تقریباً ۱۰۶۹/۱۶۵۹ء) میں ہوا۔

ترکی شاعری میں بھی اس نوعیت کے **خمسه** موجود ہیں مثلاً **حمد اللہ حلبی** المعروف بہ **حمدی**، **شیخ آق شمس الدین**

م ۹۱۴/۱۵۰۹ء کا **خمسه** : **یوسف و زلیخا**، **لیلیٰ و مجنون**، **مولد لیلیٰ**، **تحفۃ العشاق**، **محمدیہ** - **فضولی** **بغدادی** (م ۹۶۳/۱۵۵۷ء) کا **خمسه** (جس کا لطیفی اور قتالی زادہ نے غالباً غلطی سے ذکر کیا ہے) - **البانیہ** کے **یحییٰ دقاکین** **Dukagin** کے ہے (م ۹۸۳/۱۵۷۶ء) کا **خمسه** : **شاہ و گدا**، **یوسف و زلیخا**، **کتاب اصول**، **گنجینہ راز**، **گلشن النوار** - **قلندیلین** **Kallandilien** کے **معیدی**، **ہم عصر باق** کا **خمسه** - **بہشتی** (م ۱۰۴۲/۱۵۷۲ء) کا **خمسه** : **وامق و عذرا**، **یوسف و زلیخا**، **حسن و نکار**، **سہیل و نویہار**، **لیلیٰ و مجنون** : **ستان بن سلیمان الملقب** بہ **اطاقی ولد نوائی** (م ۱۰۴۳/۱۵۷۳ء) کا **خمسه** : (در اصل اس میں صرف چار مثنویاں شامل ہیں اور پانچواں شاعر کا دیوان ہے) **صحبۃ الابرار**، **ہفت خوان**، **نقۃ الازہار**، **ساقی نامہ** - **ربوفی** **باشندہ** **ادرہ** (م ۱۰۵۲/۱۵۹۳ء) کا "خمسه رومی" جس کا ذکر سیہی نے بھی کیا ہے، غالباً کہیں وجود میں نہیں آیا۔ **نرگسی** کا **خمسه** **نثر** میں ہے۔

میر علی شیر نوائی نے بھی اس عنوان کے تحت پانچ مثنویوں کا ایک مجموعہ **مشرق** **ترکی** میں مرتب کیا تھا (۱) **Catalogue Quaritch**، **جنوری** ۱۹۱۶ء، ص ۲۳، (۲) **J.A. E. Blochet**، ۱۹۱۶ء، سلسلہ ۱۱، ج ۸، ص ۴۰۰) - **جامی** کی **سوانح حیات** کو جو **پالچ** **حصوں** میں ہے (برلن : **J.A.** ۱۸۶۱ء سلسلہ ۵ ج ۱۷ ص ۳۰۳) **خمسه المتجیرین** کا نام دیا گیا ہے۔

مآخذ : (۱) **Catalogue of Persian** : Ch. Rieu، **Ms. Brit. Mus.**، ص ۵۰۳، ۶۱۱، ۶۱۵، ۶۲۰، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۵۲، ۶۶۱، ۶۸۰ : (۲) **E.J.W. Gibb**، **Ottoman Poetry**، ۱ : ۱۸۵، ۲ : ۸۰، (CL. HUAT).

* **خمسه** : (ولایات **خمسه**، پانچ شہروں پر مشتمل) - **ایران** میں ایک صوبے کا نام، جس کا صدر مقام **زنجان** ہے : اس صوبے کا طالع بھی شامل ہے انتظامی

کی دو قسموں کے جنگل ایک لاکھ مربع ہیکٹر میں بھیلے ہوئے ہیں۔ اس علاقے میں سال میں ۶۶ انچ تک بارش ہو جاتی ہے؛ باقی رہتے پتھروں میں سے رستا ہوا جب غیر جاذب سخت پتھر (marl) کی تہ تک پہنچتا ہے تو دوبارہ سطح زمین کے اوپر جسموں کی شکل میں یہ نکلتا ہے اور وادی مجردہ اور خاص طور پر بحیرہ روم کی طرف چلا جاتا ہے۔ طبرقہ کے دریا کے کنارے کے میدانوں کے علاوہ اور جگہ زراعت مشکل ہی سے ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں رہتے ٹیلوں کا ایک سلسلہ ہر جگہ ساحل اور جنگل کے بیچ میں پھیلا ہوا ہے جو اندرونی علاقے سے آنے والے پانی کا ایک حصہ روک لیتا ہے۔ جست، لوہے اور سیسے کی کانیں مختلف مقامات پر پاؤں جاتی ہیں۔

خمیرہ کی آبادی تقریباً چھے ہزار پانچ سو افراد پر مشتمل ہے، اصلی باشندے جو خمیر یا خمیر کہلاتے ہیں، چار قبیلوں میں منقسم ہیں: طبرقہ، اقلتہ، تارمک اور سلول کے خمیر۔ مویشی یعنی بیل، بھڑیسی او بکریاں ہالنا ان کا ذریعہ معاش ہے۔ صرف وہ لوگ ج طبرقہ کے گرد و نواح میں رہتے ہیں، زراعت پیشہ ہیں عورتیں موٹا جھوٹا کپڑا بیتی اور مٹی کے برتن بناتی ہیں وہاں کے باشندوں کی ایک معتد بہ تعداد کو حکومت نے کورک اوک (شاہ بلوط کی ایک قسم) کے جنگل میں کام پر لگا رکھا ہے۔ خمیر لوگ کم و بیش بستیوں میں آباد ہیں اور شاخوں سے بنی ہوئی جھونپڑیوں میں رہتے ہیں جنہیں ”جوربی“ کہتے ہیں اور جو عام طور پر پہاڑوں کی ڈھلانوں یا کسی دریا کے قرب میں بنائی جاتی ہیں۔ ان میں سے بعض ابھی تک خیموں میں رہتے ہیں، طبرقہ کے قریب زواوہ کی بھی ایک مختہ سی نوآبادی ہے، یہ لوگ ضاع بوجی (Bougie) قبائل کی اولاد سے ہیں اور انہیں سترھویں صدی عیسوی میں بے حمودہ نے یہاں آباد کیا تھا۔ وہ ترکازیوں اور پھلوں کی کاشت کرتے ہیں، پتھروں کے بنے ہو

اعتبار سے یہ ایک مختصر حصہ ملک تھا اور حال ہی میں عراق عجم کا ایک جداگانہ ضلع بن گیا ہے۔ یہ آذربائیجان اور قزوین کے صوبوں کے بیچ میں واقع ہے اس کی آبادی ۱۱,۳۸۰ ہے۔ بجٹ میں اس سے متعلق حسب ذیل اعداد و شمار دیے گئے ہیں۔ نقد مالکداری ۸۱۹,۸۸۰ قرآن۔ اناج کی شکل میں ۱,۵۳۰ خروار (۶۳۹ پائونڈ) بھوسے کی شکل میں ۹,۰۰۰ خروار۔ جنس میں ادائیگیوں کی مالیت ۹۷۸,۶۳۸ قرآن۔ مقامی اخراجات جن میں ٹیکس کی معافیاں شامل ہیں، ۱۹,۱۲۹ قرآن۔ وہ پانچ شہر جن کی وجہ سے اس ضلع کا نام خمسہ ہوا، یہ ہیں: ابور، قزم، غلب، ارسن خانہ، اور زر زین آباد۔ اس ضلع میں افشار کا خانہ بدوش قبیلہ آباد ہے۔

مآخذ: (۱) *Voyage en perse*: [E. Dupre]

(۲) *Voyage en Arménie*: Jaubert

ص ۱۹۷: ۱ *Persia*: G. Curzon (۳) ۲۱۳ تا ۲۱۴

(CL. HUART).

* خمیر: (خمیر)، شمالی تونس کے باشندے۔ خمیرہ

کی حدود یہ ہیں: شمالی سمت میں بحیرہ روم، مغرب میں الجزائر کی سرحد، جنوب کی طرف دریائے غزالہ جو دریائے مجردہ کا ایک معاون ہے اور مشرق کی جانب نفزہ اور چیاہیا کا علاقہ۔ اس خطے کا رقبہ تقریباً ۳۵ مربع میل ہے۔ اس کی سطح بہت ناہموار ہے اور تمام علاقے میں پہاڑوں کا ایک سلسلہ ہے جو الجزائر تک پھیلا ہوا ہے۔ اوسط بلندی بمشکل تین ہزار فٹ سے زائد ہوگی لیکن ان پہاڑوں نے جن کو جگہ جگہ گہرے کھڈ اور ڈھلوان وادیاں کاٹی ہیں: اس علاقے کا منظر بہت ناہموار بنا دیا ہے۔ وہاں کے باشندے خمیرہ کو ہی سب سے اہم پہاڑ (جبل الجبلہ) تصور کرتے ہیں: رہتے پتھر کی ٹہیں جو تقریباً ہر جگہ زیر زمین واقع ہیں، درختوں اور جھاڑیوں کی پیداوار کے لیے مفید ہیں چنانچہ کورک اوک اور زین اوک (شاہ بلوط

کے بعد وہ پناہ لینے کے لیے بھاگ کر شمالی پہاڑوں میں چلے گئے۔

جنگوں اور پہاڑوں کی پناہ میں خبر کو انیسویں صدی عیسوی کے آخر تک تقریباً مکمل آزادی حاصل رہی، ان کا سیاسی نظام بہت ابتدائی قسم کا تھا، ان کے یہاں قاضی نہیں ہوتے تھے، باہمی جھگڑے پنچایت (جماعت) کے سامنے پیش ہوتے تھے۔ قبائل اکثر ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے، تاہم کبھی کبھی متحد بھی ہو جاتے تھے تاکہ وادی مجردہ کے لوگوں کا مقابلہ یا تونس کے بے (باہی) حکمرانوں کے حملوں کی مدافعت کر سکیں، مؤخر الذکر جن کی سیادت کو خبر برای نام تسلیم کرتے تھے، کبھی انہیں ٹیکس دینے پر مجبور نہ کر سکے۔ تونس کے سپاہی اور سرکاری عمال طبرقہ میں مقیم رہتے تھے، انہیں اندرون ملک جانے کی اجازت نہ تھی۔ زواوہ جتھیں بے حمودہ نے پہاڑی باشندوں کی لوٹ مار کو روکنے کے لیے ساحلی علاقے میں آباد کیا تھا، اطمینان سے اپنی مقررہ تنخواہ وصول کر لیتے تھے لیکن اپنے خطرناک ہمسایوں (خمر) سے جنگ کرنے سے گریز کرتے تھے۔ دوسری طرف خمر زیادہ تر تونس کے یا سرحد کے الجزائر قبائل کو لوٹ کھسوٹ کر گزر اوقات کرتے تھے۔ تونس کے بے حکمران اس تاخت و تاراج کا سدباب نہیں کر سکتے تھے۔ محمد الصادق کے زمانہ حکومت میں اس قسم کی لوٹ مار بہت بڑھ گئی، اس لیے فرانسیسی حکومت نے مجرموں کو خود سزا دینے کا فیصلہ کیا۔ تونس کی مہم کی (جس کا مقصد ایک فرانسیسی زیرِ حمایت علاقہ Protectorate قائم کرنا تھا) ابتدا اسی طرح ہوئی۔ خمر کے خلاف جنگی کارروائیوں میں زیادہ دیر نہیں لگی، اپریل ۱۸۸۱ء کے آخر میں الجزائر سے ایک فوجی دستہ جنرل دلی بیک (Delebecque) کی قیادت میں مغربی سمت سے خبریہ میں داخل ہو گیا اور فوج کا ایک حصہ طبرقہ میں جہازوں سے اتارا۔ آٹھ مئی کو فوجی دستے

سکانوں میں رہتے ہیں اور دوسرے باشندوں کی نسبت زیادہ آرام و آسائش کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ یورپی لوگ، جو تعداد میں بہت کم ہیں، عین دژم [رک بان] اور طبرقہ کے مرکزی مقامات میں بسے ہوئے ہیں۔

خبر کو منہاجہ قبیلے کے لوگوں کی اولاد سمجھا جا سکتا ہے جو اسلامی فتح کے وقت تونس اور صوبہ قسطنطنیہ (Constantine) کے شمالی ساحل پر آباد تھے۔ یہ قدیم نسل دوسرے بربر عناصر سے مخلوط ہو گئی ہے جو حلالی حملے کے بعد وسط ملک سے شمال کی طرف دھکیل دیے گئے اور آخر کار ان میں عربی خون کی بھی آمیزش ہو گئی۔ بربر نسل سے ہونے کے باوجود خبر بہت عرصے سے عربی طور طریقے اختیار کر چکے ہیں، انہوں نے بربر زبان کا استعمال ترک کر دیا ہے، اس کے کچھ آثار البتہ ان کی عام بولی میں باقی رہ گئے ہیں انہوں نے اپنا نسب بھی عربی بنا لیا ہے، چنانچہ وہ اپنا مورث خمر بن عمر نامی ایک شخص کو بتاتے ہیں جو عربی النسل تھا اور کہا جاتا ہے اس کی اولاد میں سے ایک شخص عبداللہ بن جمال نے عین دژم کے قریب بود و باش اختیار کر لی تھی۔ ایک اور روایت یہ ہے کہ اس مورث اعلیٰ نے اپنے آپ کو خمر یا قبیلے کے لوگوں کے ساتھ وابستہ کر لیا جو اسلامی فتح کے وقت عراق سے مغرب اقصیٰ میں آ گئے تھے جہاں سے کچھ صدیوں کے بعد عبداللہ ہجرت کر کے تونس آ گیا۔ کہا جاتا ہے کہ خمر کے مختلف قبیلے سید عبداللہ کی اولاد سے ہیں جس کا ”مربوط“ (خاتواہ) اس زمانے میں بھی اس علاقے کا مذہبی مرکز ہے، سال میں دو مرتبہ یعنی موسم بہار اور موسم خزاں میں وہاں ایک ”زرده“ (عرس) منایا جاتا ہے جس میں بہت لوگ شرکت کرتے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خبر شیبہ وفاق کے ماتحت بہت عرصے تک ریجنسی (Regency) کے جنوبی حصے میں آباد رہے اور سترہویں صدی عیسوی میں اس وفاق کے ٹوٹ جانے

(Mozarab) مہاجر تھے جو نویں صدی عیسوی سے قرطبہ کے ہمسایہ عیسائی ملکوں میں آباد ہو چکے تھے۔ ایک لاطینی نژاد زبان، جس کا رواج اندلسی آبادی کے تمام طبقوں میں عموماً اور دیہاتی طبقے میں خصوصاً ثابت ہے، اندلسی عربی کے ساتھ ساتھ جاری تھا، اسے بھی العجمیہ کہتے تھے۔ قرون وسطیٰ کے اواخر میں کہیں اس اصطلاح کی ہسپانوی صورت الخیمہ (Aljama) کا استعمال ان خاص معنوں میں ہونے لگا جو آج کل اسے حاصل ہیں، یعنی ہسپانوی لاطینی نژاد زبان پرتگیزی - جلیقی (Galician)، قشتالی (Castilian)، آرغونی (Aragonese) قیطلونی (Catalan) یہ علاحدہ علاحدہ نام باعتبار علاقہ اس زبان کو دیے گئے، یہ لاطینی رسم الخط میں نہیں بلکہ عربی رسم الخط میں تحریر کی جاتی تھی جو ادب الخیمہ میں موجود و محفوظ ہے: وہ اسی زبان کی نسبت سے الخمیادہ (Aljamiada) کہلاتا ہے۔

الخمیادہ ادب، جو چند مخطوطوں میں موجود ہے، خود ہسپانیہ میں بہت سے محققین کا موضوع مطالعہ بنا رہا ہے۔ انیسویں صدی عیسوی کے آخر میں اس پر خصوصیت سے توجہ دی گئی۔ اس میں منظوم کلام کے علاوہ عموماً مذہبی و قانونی تصانیف شامل ہیں، جو اکثر نصیحت آمیز پیرائے میں تحریر کی گئی ہیں! ان کے علاوہ نثر میں چند افسانے بھی ہیں۔ اس ادب پر غور کرتے وقت یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ذیل کی دو قسم کی تصانیف میں تمیز کی جائے، پہلی قسم میں وہ تصنیفات شامل ہیں جو خاص اندلس میں تخلیق ہوئیں اور اس وقت سے پہلے کی ہیں جب شاہ قلی ثالث نے ۱۰۹۰ء میں موروں کو اسپین سے خارج کر دیا تھا۔ دوسری قسم کی تصنیفات، جو تعداد میں زیادہ ہیں، خصوصیت سے ان موری جماعتوں کا نتیجہ فکر ہیں جو اسپین سے اخراج کے بعد تونس میں آباد ہو گئی تھیں۔ (دیکھیے مورسکو) پہلی قسم میں سب سے اہم تصنیف، جو جو دھویں صدی عیسوی سے پہلے کی معلوم ہوتی ہے

نے سیدی عبد اللہ بن جمال کے "مربوط" پر قبضہ کر لیا اور ۱۳ مئی کو عین دژم پر۔ اس سہنے کے خانمے تک خمر کی فتح مکمل ہو گئی اور عین دژم میں ایک فوجی چوکی بن جانے سے اس علاقے میں بالآخر امن و امان کی بحالی کا یقین ہو گیا۔ اس وقت سے لے کر اب تک مکمل حکومت کے امن و امان میں کوئی خلل نہیں پڑا اور آج کل خمرہ تونس کا ایک ایسا صوبہ ہے جہاں چوری اور قتل و غارت کی واردات سب سے کم ہوتی ہیں۔

مآخذ: (۱) Descr. de la Régence: Pelissier

de Tunis (۲) Moulin: ۱۸۵۳ء باب ۳

Notice sur le pays des Kroumirs. Bull. Soc. de

Voyage: Play-fair (۳) ۱۸۶۹ء: géogr de paris

(۴) ۱۸۷۷ء: au pays des Komaïr, Revue africaine

Etudes sur la Tunisie, Revue de Geogr.: E. Desfossés

La Kroumirie: Quérard et Boutineau (۵) ۱۸۷۹ء

En: de la Berge (۶) ۱۸۸۱ء: et sa colonisation

Tunisie. Récit de l'expédition française

Détails ethnogr.: A. Cherbonneau (۷) ۱۸۸۱ء

sur les Kroumir et les Ouchetas, Revue de Géogr.

Un Français: Madame de Voisins (۸) ۱۸۸۱ء

chez les Kroumirs, Revue politique et littéraire

La Tunisie du Nord-Tunis: Violard (۹) ۱۸۸۱ء

۱۹۰۶ء

(G. YZEY).

* الخیمہ: (Aljama)، (ہسپانوی)، عربی لفظ

العجمیہ (غیر عربی) کی ہسپانوی صورت۔ اس اصطلاحی

لفظ کا اطلاق جزیرہ نماے آئبیری (Iberian Peninsula)

کے اندلسی مسلمان اپنے شمالی ہمسایوں کی مختلف

لاطینی نژاد (Romance) بولیوں پر کرتے تھے۔ ان

بولیوں پر جلد ہی عربیت کا رنگ چڑھ گیا۔ اس عربی

عنصر کی سرایت کا موجب بالعموم وہ مستعرب

نوعیت کے اشخاص کے سوانح حیات دیے ہیں (خصوصاً سکندر ذوالقرنین کے)۔

آخر میں ان نجی خطوط کی دریافت کی طرف بھی توجہ مبذول کرانی ضروری معلوم ہوتی ہے جو "الخنیہ" میں لکھے گئے تھے۔ ان کی خصوصی صفات کی سب سے زیادہ حامل وہ تحریر ہے جو یقیناً غالب کیتھولک بادشاہوں کے غرناطہ کو (۱۴۹۲ء میں) فتح کرنے سے پہلے ہی لکھی گئی ہوگی، اس کا عکس حال ہی میں I. de Las Cagigas نے شائع کیا ہے (بمعاونت Una Carta aljama granadina، در Arabica ۱۹۵۴ء، ص ۲۰۴-۲۰۵)۔

مآخذ : (الف) مخطوطات : منشور مخطوطات پیرس، الجزائر، 'Uppsala' Aix-en-Provence، موزہ برطانیہ، کیبرج اور ایسکوریال Escorial وغیرہ میں پائے جانے میں۔ طلیطلہ (Toledo) میں جو چند نسخے ہیں، ان کے لیے دیکھیے A. González Palencia : *Noticia y Extractos de Mss Arabes y aljamiados de Estudios y Textos Árabes*، در *Miscelanea* میٹرڈ ۱۹۱۵ء؛ نیز بڑے مجموعے حسب ذیل ہیں : (۱) Biblioteca Nacional کا مجموعہ، میٹرڈ (دیکھیے F. Guillén Robles : *Catálogo de Mss arabes*، جو اس وقت "manuscritos de la Junta" Escuela de Estudios Arabes، میٹرڈ میں ہے۔ یہ خاص دلچسپی کا حامل ہے کیونکہ اس میں مخطوطات کا وہ بھاری ذخیرہ جوں کا توں محفوظ ہے، جو ۱۸۸۳ء میں بطام الموناد Almonacid = میرٹھ پایا گیا (دیکھیے J. Ribera اور Mr. Asin : *Manuscritos arabes y aljamiados de la Biblioteca de la Junta*، میٹرڈ ۱۹۱۲ء، جس میں سرقسطہ (Sagossa) کے مخطوطات کا حال بھی شامل ہے؛ (۲) مجموعہ Gayangos، جو Real Academia de la Historia، میٹرڈ میں محفوظ ہے، اس کا حال صرف *Indice de la Literatura Aljamiada* : E. Saavedra

ایک گم نام شاعر کی نظم بعنوان "نقمة یوسف" (Poem of Yūsuf) ہے۔ R. Menéndez Pidal، جس نے اس نظم کی تحقیق و تنقیح کی ہے اور شرح بھی لکھی ہے (*Poema de Yūsuf materiales para su estudio*، در *Revista de Archivos, Bibliotecas y Museos*، جلد ۸، میٹرڈ ۱۹۰۲ء، طبع جدید، غرناطہ Granada ۱۹۵۲ء)، بیان کرتا ہے کہ یہ کسی ارغونی مورسکو کی تصنیف ہے۔ یہ نظم قرآن مجید کی بارہویں سورت (سورۃ یوسف) کا منظوم ہسپانوی ترجمہ ہے۔ اس میں "قصص الانبیاء" کی کتابوں سے اخذ کردہ مواد شامل کیا گیا ہے۔ دوسرے گروہ میں بھی ایک ارغونی مورسکو محمد رمضان متوطن (قلمی) روطہ شلون (Rueda de Jalon) کی نظمیں قابل ذکر ہیں۔ یہ ۱۹۰۳ء کے قریب لکھی گئیں۔ ان میں ابوالحسن البصری کی روایت سے سیرۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات کے متعلق چند بند لکھے گئے ہیں۔ اسی زمانے کے قریب (سترہویں صدی عیسوی کے آغاز میں) Puey Monzon کے ایک مورسکو نے، جو الحاج (Albichante) کہلاتا تھا، منظوم سفرنامہ لکھا۔ ایک اور نظم بھی قابل ذکر ہے، جو رد نصاریٰ میں ہے اور مناظرانہ انداز میں کہی گئی ہے، جسے ایک مورسکو یوآن پیریز Juan Pérez نے ۱۶۲۷ء میں تصنیف کیا، یہ شخص قلعہ النہر (الکلادی ہیناریس Alcalá de Henares) کا باشندہ تھا لیکن ہجرت کر کے تونس میں جا بسا تھا، اس کا اصلی نام ابراہیم تائبلی Taybili تھا۔

اسی دور میں الخنیہ میں لکھی ہوئی مدافعاتہ طرز کی کتابیں بھی ہیں جن میں مذہب اسلام کے معترضین کو جواب دیے گئے ہیں؛ مثلاً وہ کتاب جو ۱۶۱۵ء میں عبدالکریم بن علی پیریز (Pérez) نے تصنیف کی۔ اسی ادب میں افسانوی نثر کے رسالے بھی شامل ہیں، جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے کسی صحابی (مثلاً تمیم الداری) کے متعلق ہیں، بعض اور رسائل میں بائبل کے قصے بیان ہوئے ہیں یا کم و بیش افسانوی

میں بیان ہوا ہے 'Memorias de la Real Academia Española' ۶: میلرڈ ۱۸۷۸ء میں اس کی *Discurso* تکمیل کے طور پر درج ہے۔ یہ اس سلسلے کی ابوی تک ایک اساسی تصنیف ہے 'تاهم یہ الوند Almonacid کے مخطوطات کی دریافت سے پہلے کی تصنیف ہے۔ (ب) ستون کی ہجاء کے لیے دیکھئے Old Spanish: G. D. M. Ford (ج) الخبیہ میں شائع شدہ تصانیف: (۱) J. Ribera 'P. Gil اور M. M. Sánchez Saragossa 'Colección de textos aljamiados' ۱۸۸۸ء: (۲) H. Morf 'Poema de José' در Gratulationsschrift der Universität Bonn an die Universität Zürich: (۳) K. V. Zet. ۱۸۸۳ء: (۴) 'testimon' در MO ۱۹۲۱ء: (۵) R. Menéndez Pidal اور I. de las Cagigas 'دیکھئے J. Cantineau (۱) 'J. N. Lincoln (۲) 'JA ۱۹۲۷ء: (۳) 'American Geographical Riview' ۱۹۳۹ء: (۴) 'Publ. Mod. Lang. Assoc.' (۵) 'A Com-: A. R. Nyki (۶) 'pendium of Alfamlado Literature SBBayr. در 'M. J. Müller (۵) 'Ak. ۱۸۹۶ء: (۶) 'M. Schmitz (۷) 'Romanische For schungen' ۱۹۰۱ء: (۸) 'Textos em aljamia portuguesa: D. Lopes (۹) 'توزن ۱۸۹۷ء: (۱۰) 'آزادانہ متبادل حروف ہیں: (۱) 'Leyendas Moriscas: F. Gullón Robles ۳ جلدیں میلرڈ ۱۸۸۵-۱۸۸۶ء: (۲) 'وہی مصنف: 'de José y de Alejandro Magno' ۱۸۸۸ء: (۳) 'Historia de los amores de Paris y Viana' در 'Revista Historica' شمارہ ۲۲: (۴) 'Las Coplas del Fernegriño de: M. de Pano y Ruete: P. Longús (۵) 'سرقسطہ ۱۸۹۷ء: (۶) 'Puer Monçon

(L. P. HARVEY و E. LEVI-PROVENCAL).
خندقی: زمین کا وہ حصہ جو کسی شہر یا پڑاؤ کے ارد گرد حفاظت کی غرض سے گھودا جائے۔ یہ بعض شہروں کا نام بھی ہے (دیکھئے یاقوت: معجم البلدان اور البلاذری: فتوح البلدان کے اشاریے)۔ یہ ایک معرب لفظ ہے جس کی اصل ہندی آریائی سمجھی جاتی ہے (دیکھئے ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کا جرمن مقالہ قدیم عربی میں فارسی دخیل الفاظ)، شاید اردو لفظ کھنڈا اور فارسی لفظ کندہ کا تعلق اسی سے ہے۔ چھٹی صدی عیسوی کی سریانی تصنیف "کتاب الحمرین" (طبع موبہرگ، صفحہ ۳) میں بھی یہ لفظ آیا ہے۔

تاریخ اسلام میں سب سے مشہور واقعہ جو غزوہ خندقی کے نام سے مشہور ہے، شوال [بقول البلاذری ذوالقعدہ (اتساب الاشراف، ۱: ۳۳۳)] ۵ھ کا محاصرہ

میں بیان ہوا ہے 'Memorias de la Real Academia Española' ۶: میلرڈ ۱۸۷۸ء میں اس کی *Discurso* تکمیل کے طور پر درج ہے۔ یہ اس سلسلے کی ابوی تک ایک اساسی تصنیف ہے 'تاهم یہ الوند Almonacid کے مخطوطات کی دریافت سے پہلے کی تصنیف ہے۔ (ب) ستون کی ہجاء کے لیے دیکھئے Old Spanish: G. D. M. Ford (ج) الخبیہ میں شائع شدہ تصانیف: (۱) J. Ribera 'P. Gil اور M. M. Sánchez Saragossa 'Colección de textos aljamiados' ۱۸۸۸ء: (۲) H. Morf 'Poema de José' در Gratulationsschrift der Universität Bonn an die Universität Zürich: (۳) K. V. Zet. ۱۸۸۳ء: (۴) 'testimon' در MO ۱۹۲۱ء: (۵) R. Menéndez Pidal اور I. de las Cagigas 'دیکھئے J. Cantineau (۱) 'J. N. Lincoln (۲) 'JA ۱۹۲۷ء: (۳) 'American Geographical Riview' ۱۹۳۹ء: (۴) 'Publ. Mod. Lang. Assoc.' (۵) 'A Com-: A. R. Nyki (۶) 'pendium of Alfamlado Literature SBBayr. در 'M. J. Müller (۵) 'Ak. ۱۸۹۶ء: (۶) 'M. Schmitz (۷) 'Romanische For schungen' ۱۹۰۱ء: (۸) 'Textos em aljamia portuguesa: D. Lopes (۹) 'توزن ۱۸۹۷ء: (۱۰) 'آزادانہ متبادل حروف ہیں: (۱) 'Leyendas Moriscas: F. Gullón Robles ۳ جلدیں میلرڈ ۱۸۸۵-۱۸۸۶ء: (۲) 'وہی مصنف: 'de José y de Alejandro Magno' ۱۸۸۸ء: (۳) 'Historia de los amores de Paris y Viana' در 'Revista Historica' شمارہ ۲۲: (۴) 'Las Coplas del Fernegriño de: M. de Pano y Ruete: P. Longús (۵) 'سرقسطہ ۱۸۹۷ء: (۶) 'Puer Monçon

فوراً ہی یہ اطلاع آپ کو راستے میں بھجوا دی ہوگی۔
معرکہ خندق سے پہلے ابوسفیان نے آنحضرتؐ سے جو
خط و کتابت کی (الواقدی و المقریزی)، اگر ان کا متن
اصلی ہے تو اس کا بھی امکان ہے کہ خود قریش نے
اشارہ اپنے حملے سے خبردار کر دیا تھا۔

دومہ کے راستے سے مدینے آنے ہی آنحضرتؐ نے
چند انصار و مہاجرین کے ساتھ گھوڑوں پر سوار ہو کر
شہر کے مضافات کا چکر لگای (الواقدی) اور خندق
کھودنے اور پڑاؤ ڈالنے کی جگہ متعین کی۔ انسبوری
نے بحوالہ ابن اسحق لکھا ہے کہ عہد نبویؐ میں
مدینے کی ایک سمت کھلی تھی باقی تین اطراف میں مکان
اور نخلستان تھے جن میں سے دشمن گزر نہ سکتا تھا۔
ادھر کے تنگ راستوں میں چھوٹی سی جمعیت بھی دشمن
کی بڑی سے بڑی قطاروں کو تیر اندازی سے بہ آسانی
روک سکتی تھی۔

عام روایت ہے کہ خندق کھودنے کا مشورہ حضرت
سلمان فارسی نے دیا تھا۔ معرکہ خندق کے دوران میں
ابوسفیان نے مکرر آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم سے
جو خط و کتابت کی (بحوالہ الواقدی و المقریزی) اس
میں طعنہ دیا کہ میدان میں آنے کے بجائے چھپ کر
بیٹھ گئے اور حیرت ظاہر کی کہ خندقیں کھودنے کا کیا
داؤ آپ کو کس نے سکھایا؟ آنحضرتؐ نے جواب میں
فرمایا کہ ”خدا نے مجھے اس کا الہام کیا“۔

رمضان میں مہم دومہ سے واپسی پر آنحضرتؐ
کو مشکل سے چند ہفتے ملے اور خندق کی کھدائی سے
فارغ ہوئے ہی تھے کہ دشمن کے احزاب آ پہنچے۔
آنحضرتؐ نے حسب معمول عورتوں اور بچوں کو اسلام
(گڑھیوں) میں بھجوا دیا۔ کچھ دستے، ممکن ہے، جانوں
اور مشرقی گزرگاہوں پر مامور کیے گئے ہوں۔ باقی
بوری جمعیت جبل سلع اور اس کے دامن میں خیمہ زن
ہو کر شہر کی مدافعت کرنے لگی۔ دشمن کی طرف
ثولبان (قریش، احابیش اور کسانہ) بغر رومہ پر (مدینے)

مدینہ ہے جس میں مدافعت کے لیے مسلمانوں نے خندق
کھودی تھی۔ نیز قریش، یہود خیبر اور بہت سے گروہ
اش میں جتنا ہتھی کر کے آئے تھے، اس لیے ان کے قرآنی
نام ”احزاب“ سے بھی یہ معرکہ منسوب ہے۔ ۳ھ کی جنگ
احد کے بعد قریش یہ دعویٰ کر گئے تھے کہ شوال ۳ھ
میں پھر لڑنے آئیں گے، مگر نہیں آئے اور یہ زمانہ امن
سے گزر گیا، لیکن اس اثنا میں بنو النضیر مدینے سے
لکالے گئے تو وہ خیبر میں جا بسے اور قریش کو مدینے
پر پھر سے حملہ کرنے پر اکسایا اور اپنی طرف سے مدد
کا بھی یقین دلایا۔ ۳ھ کے اختتام پر ماہ نس (لوند) کا
اضافہ ہوا تھا اس لیے ۵ھ کا شوال ایک ماہ دیر سے آیا۔
احد کے شوال میں کھیتیاں کھڑی تھیں تو خندق کے
شوال میں فصلوں کو کٹتے ہوئے عرصہ ہو چکا تھا
(الواقدی: مغازی)۔ الواقدی ہی نے صراحت کی ہے کہ
یہودیوں نے خیبر کی کھجوروں کی سال بھر کی فصل
قبیلہ غطفان کو دے کر اس پر آمادہ کیا تھا کہ قریش
کے محاصرہ مدینہ کے وقت یہ بھی اسلام کے خلاف جنگ
میں شریک ہوں۔ عرب کے اقصائے شمال (دومة الجندل)
میں مدینے کو رسد لانے والے کاروانوں سے چھیڑ چھاڑ
(السعودی: التنبیہ والاشراف، ص ۲۳۸) بھی بدادہ
انہیں کی ریشہ دوانیوں کا نتیجہ تھی۔ منشا یہ بھی تھا کہ
آنحضرتؐ اس دور دراز علاقے کی طرف جائیں تو غطفان
اور قریش دونوں مل کر مدینے کو لوٹ لیں اور پھر
آنحضرتؐ کو اپنے مرکز سے دور گھیر لیں۔ آنحضرتؐ
واقعی دومة الجندل روانہ ہوئے مگر (ابن ہشام، ۶۶۸)
خلاف معمول آدھے راستے ہی سے مدینے لوٹ آئے۔
مسکن ہے دوران سفر میں آپ کو دیار غطفان میں دشمن
کی تیاریوں کا پتا چل گیا ہو۔ ایک روایت یہ بھی ملتی
ہے کہ قبیلہ خزاعہ نے قریش کی تیاریوں کی اطلاع کے
لیے ایسے تیز رفتار قاصد دوڑائے کہ وہ بارہ دن کے بجائے
صرف چار دن میں مدینے پہنچ گئے، مگر آنحضرتؐ
دومہ کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ غالباً نائب مدینہ نے

ٹیکرے کا نام ہے۔ مسجد فتح وہ مقام ہے جہاں معاصرہ شروع ہونے پر آنحضرتؐ کا خیمہ منتقل ہوا۔ یہاں آنحضرتؐ نے خدا کی بارگاہ میں فتح کی دعا کی تھی۔ یہ ایک مشہور قدیمی زیارت گاہ ہے اور اب تک جبل سلح کی ایک مغربی چوٹی کے محفوظ مقام پر موجود ہے۔ ذباب، بنی عبید، مذاہ اور مسجد فتح سے ایک مربع سا بن جاتا ہے۔ غالباً یہ آباد علاقہ تھا۔ یہاں اب بھی کچھ باغات موجود ہیں۔ عام فوج اس محفوظ علاقے میں خیمہ زن ہوگی۔ ذباب و شیخین کے نیچے کا رقبہ بھی آباد ہوگا کیونکہ ۵۳۵ء و مابعد میں یہاں ایک بڑے شفاخانے کی تعمیر کے لیے جگہ صاف کرائی گئی تو بیسیوں پرانے کنوئیں برآمد ہوئے تھے۔

الواقدی نے لکھا ہے کہ جب خندق کھودی گئی تو نہر کے جنوبی اور مغربی علاقوں کے بسنے والوں نے خندق کو اپنے طور پر عہد نبویؐ کی عید گاہ (مصلیٰ) جہاں اب مسجد غمامہ ہے) کے قریب سے گزرا اور خاصی دور تک قبا کے رخ بڑھا دیا۔ المطری نے التعریف (تاریخ مدینہ) میں لکھا ہے کہ اب وادی بطحان سابقہ گزرگاہ کو بدل کر اس جگہ سے گزرتی ہے جہاں خندق کا یہ حصہ کھودا گیا تھا۔ اس سے وادی بانیان کی سابقہ گزرگاہ کے ایک حصے کا اگرچہ پتا نہیں چلتا، لیکن مذکورہ ذیلی خندق کے تعین میں موجودہ گزرگاہ سے معقول رہنمائی ہو سکتی ہے۔ الواقدی نے لکھا ہے کہ قبا میں بعض قبائل نے اپنے قلعوں (آطام) کے گرد بھی خندقیں کھود لی تھیں۔ یہ بھی لکھا ہے کہ خندق میں بعض جگہ دروازے (غیر کندہ یا عرض میں کم، خندق کی صورت میں) تھے، لیکن کس جگہ تھے؟ یہ خود الواقدی کو بھی معلوم نہ ہو سکا۔ قیاس چاہتا ہے کہ اس سے مراد ذباب، بنی عبید، مذاہ وغیرہ کی وہ پہاڑیاں ہوں گی جن کو خندق کے زنجیرے کے متوازی بنایا گیا اور ان سے برج کا کام لیا جانے لگا۔ احتیاط کے ساتھ وہاں سے عبور و مرور بھی ممکن تھا۔

کے شمال مغرب میں وادی العقیق میں) مقیم ہوئیں اور شمالی ٹولیاں (غطفان، فزارہ اور بنو اسد) اس سے کسی قدر مشرق میں وادی النعمان کے پاس ذائب تقی (نام مقام جو اب نامعروف ہے) سے جبل احد تک پھیل گئیں۔ یہود خیبر جو اصل بانی فساد تھے، اپنی غیر موجودگی کے باعث نمایاں تھے۔ صرف ایکا دکا نظر آتے تھے، لیکن وہ بھی قریظہ کے یہودیوں کو، جو ابھی مدینے ہی میں تھے، اکسائے اور اندرون شہر سے وار کرنے پر آمادہ کرتے رہے، لیکن یہود خیبر کے نہ آنے کی شکایت قریش کو اس بنا پر نہیں تھی کہ ان کے ہاں سے رسد برابر چلی آ رہی تھی اور ایک مرتبہ حبیب بن اخطب کے بھیجے ہوئے یس اونٹ، جن پر جو کھجوریں اور جانوروں کے لیے بھوسا لدا تھا، مسلمانوں کے ایک طلبہ گرد دستے کے ہاتھ پڑ گئے (حیرت شامی)۔

خندق کی حفاظتی تدابیر: ابن سعد وغیرہ کے مطابق دیار بنی حارثہ کے قلعہ رائج (اور بعض روایتوں میں آطام شیخین) سے جبل ذباب تک کا حصہ مہاجرین کے سپرد ہوا اور وہاں سے جبل بنی عبید اور مذاہ سے ہوتے ہوئے مسجد فتح تک انصار متعین کیے گئے۔ (آطام شیخین کی جانشین مسجد شیخین مجھے ۱۹۳۷ء میں جبل سلح اور جبل احد کے درمیان حرہ شرقی کے مغربی کنارے پر نظر آئی اور شاید دو گڑھوں کی یادگار میں اس چھوٹی سی مسجد کی چھت پر برجیاں بنائی گئی ہیں! غالباً رائج اس کے پاس ہی ہوگا)۔ جبل ذباب پر آنحضرتؐ کھدائی کے وقت خیمہ زن تھے اس کی یادگار میں وہاں ”ذوباب“ یعنی دروازے والی مسجد تعمیر ہوئی جو اب تک ذباب کے نام سے مشہور ہے اور جبل سلح میں ایک چھوٹی سی پہاڑی پر واقع ہے۔ جبل بنی عبید کا پتا نہیں چل سکا۔ گمان ہوتا ہے کہ وہ حرہ غربی میں مسجد قبلتین کے قریب دو پہاڑیوں میں سے مغربی پہاڑی ہوگی۔ جبل مذاہ میری دانست میں جبل سلح کے مغرب کی ہلالی شکل کی پہاڑی یا اس سے ملے ہوئے

کے بعض کنبے میری دانست میں اس زمانے کی یادگار ہیں (اس پر میرا مضمون در اسلامک کالج، حیدر آباد اکتوبر ۱۹۳۹ء میں دیکھیے)۔

خندق کا پہرا دینے والوں میں بیدل جماعتوں کے ساتھ مسلمانوں کے تیس سوار بھی تھے۔ ایک مرتبہ رات کو دو مختلف سمتوں سے گشت کرنے والی اپنی ہی جماعتیں آپس میں گٹھ گٹھ گئیں، پھر عادی شعار (بنول کا مقررہ لفظ) پکارا گیا تو ہتیار رکے، مگر اس اثنا میں کچھ مارے گئے اور چند زخمی بھی ہو گئے۔ آنحضرتؐ نے اپنوں ہی کے ہاتھوں مارے والے کو بھی شہید فی سبیل اللہ اور مجروحوں کے زخموں کو جراحت فی سبیل اللہ قرار دے کر خون اور زخموں پر کوئی تاوان عائد نہ فرمایا۔ محاصرین کا زور نہ چل سکا تو یہود خبر نے مدینے کے بنو قریظہ کو ننگ و ناسوس کا واسطہ دے کر غداری پر آمادہ کر لیا اور وہ حملے کی تیاری کرنے لگے۔ ان کے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر قرآنی الفاظ میں مسلمانوں کے کلیجے منہ کو آنے لگے زَوَلَّتْ اَلْقُلُوبُ اَلْحَنَاجِرَ (۳۳ [الاحزاب]: ۱۰۱)۔ خندق کے اس بار بارہ ہزار کا دشمن لشکر اب بنو قریظہ کے ڈیرہ ہزار سے زائد قابل جنگ مردوں سے مل کر پورے دفاعی نظام کو خطرے میں ڈال رہا تھا۔ فوری تدبیر کے طور پر آنحضرتؐ نے کئی کئی سو آدمیوں کی دو جمعیتیں ان کی بستی کے دو جانب متعین کیں جو وقفے وقفے سے رات بھر نعرہ ہارے نکیر لگاتے رہے۔ پھر غطفان و فزارہ کے قبائل کو دشمن سے توڑ لینے کی کوشش کی، مگر وہ بھاؤ بڑھانے لگے تو گفت و شنید ختم کی گئی۔ آخر آنحضرتؐ نے دشمنوں میں پھوٹ ڈالنے کا اہتمام کیا۔ ایک نو مسلم اَنَسُ بْنُ مَسْعُودٍ الْأَشْجَعِيُّ الْغَطَفَانِيُّ نے، جس کے اسلام لانے کی خبر ابھی پھیلی نہ تھی، پہلے بنو قریظہ کو سمجھایا کہ جنگی اقدام سے پہلے قریش سے یرغمال حاصل کر لو کہ وہ ادھوری جنگ چھوڑ کر چلے نہ جائیں، ورنہ تم تمہا محمدؐ کا مقابلہ نہ

خندق کی کھدائی میں کچھ کدال بھاؤڑے بنو قریظہ نے مستعار دیے (الواقعی) جو ایک معاہدے کے تحت یرونی حملہ آوروں کے خلاف مسلمانوں کے ساتھ تعاون کرنے کے پابند تھے۔ مسلمان رضا کاروں کی تعداد تین ہزار بیان کی گئی ہے اور ہر دس دس آدمیوں کی جماعت کو چالیس چالیس ذراع (ہاتھ) لمبی خندق کھودنے کا کام سپرد ہوا (الطبری)۔ ان تین سو ٹولائیوں میں سے ہر ایک نے بیس بیس گز یعنی کل ۶ ہزار گز یا کوئی ساڑھے تین میل لمبی خندق کھودی۔ چوڑائی اور گہرائی کا مؤرخ ذکر نہیں کرتے، مگر گھوڑا بھلانگ نہ سکنے کی تصریح کی بنا پر شاید یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ دس گز چوڑی اور شاید پانچ گز گہری تھی۔ حضرت سلمان فارسیؓ کے متعلق القوادی نے لکھا ہے کہ قوی ہیکل تھے اس لیے تمہا انہیں پانچ ہاتھ لمبی اور پانچ ہاتھ گہری کھدائی کا کام سپرد ہوا (ہر جماعت ان کو اپنے ساتھ شامل کرنے کے لیے کوشش کرتے لگی تو آنحضرتؐ کو دخل دینا پڑا تھا کہ وہ کسی اور کے ساتھ نہیں بلکہ خاص میرے ساتھ ہوں گے (سَلَمَانَ مِّنْ اَهْلِ الْيَتِیْ)۔ وہ آنحضرتؐ کے آزاد کرائے ہوئے غلام تھے اور اسی لیے حسب رواج آزاد کرائے والے کے کنبے میں شامل سمجھے جاتے تھے۔ خندق کو ایک دو مرتبہ دشمن کے چند سواروں نے عبور کر لیا تھا۔ غالباً یہ پہاڑیوں کے راستے (جہاں خندق کے دروازے تھے) آگئے ہوں گے۔ واپسی پر ان کا ایک سوار خندق بھلانگنے کی کوشش میں گر کر مر گیا۔ دشمن نے لاش حاصل کرنے کے لیے رقم کی پیش کش کی، لیکن آنحضرتؐ نے ویسے ہی لاش ان کے سپرد کر دی۔

خندق کی کھدائی میں آنحضرتؐ خود بھی سب کے ساتھ حصہ لے کر شوق دلاتے رہے۔ اس وقت کسی کو بھی فراغت نہ تھی، لیکن محاصرے کے زمانے میں جب پہرا دینے کے لیے نوپنیں مقرر کی گئیں تو پہرے داروں کے علاوہ باقی لوگ فارغ رہتے تھے۔ جبل سلع

ان سے اس شرط پر صلح کرنا چاہی کہ مدینے کی پیداوار (کھجوروں) کا ایک تہائی حصہ ان کو دے دیا جائے۔ ان سے گفتگو ہو رہی تھی کہ آپ نے انصار کے دو سرداروں سعد بن معاذؓ اور سعد بن عبادہؓ سے مشورہ کیا۔ انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اگر یہ اللہ کا حکم ہے تو سر تسلیم خم ہے! اگر یہ آپ کی اپنی پسند ہے تو بھی ہمیں آپ کی خاطر یہ قبول ہے! لیکن اگر یہ بات آپ ہمارے فائدے کے لیے کرنا چاہتے ہیں تو پھر ہم اپنی عرضداشت پیش کریں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں یہ بات آپ لوگوں کے فائدے کے لیے کرنا چاہتا ہوں، کیونکہ میں دیکھتا ہوں

کہ تمام عرب متحد ہو کر تم پر چڑھ آئے ہیں۔ اس پر حضرت سعد بن معاذؓ نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! جب ہم مشرک تھے اور بت بوجتے تھے تو اس زمانے میں یہ لوگ ایک کھجور بھی ہم سے نہیں لے سکتے تھے! اب جبکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اسلام سے مشرف کر کے ہدایت عطا کی اور آپ کی ذات گرامی سے عزت و قوت بخشی، کیا اس حالت میں ہم ان کو اپنا مال دیں؟ ہرگز نہیں! بخدا ان کے لیے ہمارے پاس تلوار کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سرداران انصار کی اس رائے سے اتفاق کیا اور دشمنوں کو ان کی حالت پر جھوڑ دیا (ابن حزم: جوامع السیرۃ، ۱۸۸)۔ اس جنگ میں ایک بات یہ بھی قابل ذکر ہے کہ ایک معزز خاتون حضرت رفیدہؓ نے بھی اس معرکے میں شرکت کی۔ ان کے پاس دوائیں تھیں اور وہ زخمیوں کی مرہم بٹی کرتی تھیں۔ حضرت سعد بن معاذؓ جب زخمی ہو گئے تو بھی حضرت رفیدہؓ ان کے علاج کی نگران تھیں۔

ماخذ: (۱) ابن ہشام، (نثر اردو ترجمہ): (۲) طبقات ابن سعد، ۱/۲۷۷، ۲/۷۷۷ (نثر اردو ترجمہ): (۳) الطبری (اردو ترجمہ): (۴) الواقدی، سغازی، ۳۶۲: (۵) البلاذری، انساب الاشراف، ج ۱: ۳۳۳، بعد (طبیح حمید اللہ): (۶)

کر سکو گے۔" پھر قریش کے بڑاؤ میں جا کر مشہور کیا کہ بنو قریظہ نے آنحضرتؐ سے ساز باز کر لی ہے اور دوستی کا ثبوت دینے کے لیے وعدہ کیا ہے کہ قریش کے چند سرداروں کو ہکڑ کر آنحضرتؐ کے سپرد کر دیں گے۔ پھر یہی خبر اسلامی لشکر میں پھیلانی اور کسی کے دریافت کرنے پر آنحضرتؐ نے فرمایا "لعلنا امرنا ہم بذلك" اور اس کی اطلاع بھی قریش کے بڑاؤ تک پہنچی تو دشمنوں میں باہمی غلط فہمیاں بختہ ہو گئیں اور بنو قریظہ و قریش کے تعاون کے امکانات ختم ہو گئے، [بلکہ ایک دوسرے کو شکوک و شبہات کی نظر سے دیکھنے لگے]۔

اس اثنا میں دشمن کا سامان رسد ختم ہونے لگا [اور اللہ تعالیٰ نے قریش اور غطفان پر سخت آندھی بھیجی جس سے ان کی ہڈیاں اٹل گئیں اور ان کے خیمے اکھڑ گئے]، سردی بڑھ گئی، شدید طوفانی ہواؤں چلنے لگیں، قریش اور ان کے ساتھی قبائل مایوسی کے عالم میں محاصرہ اٹھا کر واپس چل دیے اور مطلع صاف ہو گیا۔ اس طرح بہود خیبر کی عظیم سازش ناکام ہو گئی۔ اس کے دوسرے ہی دن بنو قریظہ کو اپنی غداری کا خمیازہ بھگتنے کا وقت آ گیا۔

جنگ خندق میں کل چھ مسلمان شہید ہوئے اور آٹھ دشمن مارے گئے، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اندازہ درست ثابت ہوا کہ دشمن کا مدّ ختم ہو کر جزر شروع ہو گیا۔

[اس جنگ میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے انصار مدینہ کے عزم و استقلال، جرأت و ہمت اور غیرت و حمیت کا بتا چکے ہیں۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ تمام عرب مسلمانوں پر چڑھ آئے ہیں تو آپ نے چاہا کہ حکمتِ علی سے کام لے کر دشمنوں کے جتنے کو ہار دیا جائے۔ اس مقصد کے پیش نظر آپ نے غطفان کے دو سرداروں عبیدہ بن جحش اور حارث بن عوف سے نامہ و پیام شروع کیا اور

تھا؛ (۳) خندق فیر: موجودہ صوبہ المریہ Almaria میں عبلہ کے قریب واقع تھا؛ (۴) الخندق: یہ مقام قرطبہ Cardova سے ۲۵ میل مغرب میں واقع تھا؛ (۵) الخندق الجنات: موجودہ صوبہ مالقہ Malaga کا ایک مقام، جو غالباً ساحل سمندر کے قریب واقع ہوگا۔ یہاں سے ۵۲۸۳/۵۸۹۷ء میں امیر عبداللہ کی وہ فوج گزری تھی جسے ابن حفصوں کی بغاوت فرو کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔

آج کل اس نام کے صرف دو مقامات شمالی ہسپانیہ میں ملتے ہیں، یعنی تورہ الہندیگا Torre-Alhandiga اور فرزلو الہندیگا Ferzno-Alhandiga۔

ماخذ: (۱) Hist. Des Musulmans: Dozy

d'Espagne (۲) الادریسی: المغرب

لائڈن ۱۸۶۶ء بمعد اشاریہ: (۳) المقری: فتح الطیب

لائڈن ۱۸۵۵-۱۸۶۱ء بمعد اشاریہ: (۴) وؤ: لائڈن

بار اول: بذیل مآذہ Albandega: (۵) محمد عنایت اللہ:

اندلس کا تاریخی جغرافیہ، حیدر آباد (دکن) ۱۹۲۷ء، بذیل

مآذہ الخندق و سمورہ۔

[ادارہ]

* خنسا: (یا خنسا): در رشید الدین: طبع Blochet،

ص ۸۹۹، خنکسائی: در وصف: خنزائی: در طبع سنگی

(بمبئی ۱۸۶۹ء) ص ۲۱، بعد خنرای: در حمد اللہ القزوینی:

نزهة القلوب (طبع Le Strange، ص ۱۰، ص ۷ اور

ص ۲۹۱، ص ۱۰) خنسای، جس کا تلفظ ابن بطوطہ

نے خنسا دیا ہے (طبع Defrémery و Sanguinetti، ج ۳،

ص ۲۸۴، بعد اور جس کا تعلق اس نے مشہور شاعرہ

کے نام سے قائم کیا ہے (رک بہ الخنساء)۔ چین کا ایک

شہر جو سنگ Sung خاندان کی سلطنت کا دار الحکومت

تھا جسے مغلوں نے ختم کر دیا۔ ایسے چینی زبان میں

پہلے کنگ شا King Shew اور اب Hing-cow-fu

کہتے ہیں (قب متذکرہ بالا (گزشتہ) ج ۱، ص ۸۳۵

الف)۔ اکثر اس شہر کا ذکر دور مغول میں آیا ہے اور

البغاری: کتاب الجہاد، باب ۳۳۳، ۱۰۱: (۷) سلم

کتاب الجہاد، حدیث ۱۲۵ تا ۱۳۰: (۸) ابن حنبل: مسند

۲۷۱/۱: (۹) المطری: التعریف بما انتست الهجرة من

معالم دار الهجرة (مخطوطہ، شیخ الاسلام، مدینہ منورہ):

(۱۰) المصہودی: وفاء الوفاء: (۱۱) شبلی: سیرت النبی

۱: ۱۹۱، بعد: (۱۲) قاضی محمد سلیمان:

رحمة للعالمین: (۱۳) محمد حمید اللہ: عہد نبوی کے میدان

جنگ: (۱۴) وہی مصنف: الوثائق السياسية في العهد النبوي

والخلافة الراشدة: (۱۵) عبد الحمی الکنتانی: نظام الحکومت

النبویہ المسمی: التراتیب الاداریہ: ۲۹۸: و بعد: (۱۶)

ابن حجر: الاصابہ، عدد (۳۰۷۳): (۱۷) Caetani:

Annali Dell Islam ۲: ۱۶۷: (۱۸) محمد حمید اللہ:

Military Intelligence in the time of the Prophet

Islamic literature، لاہور ۱۹۴۹ء: (۱۸) ابن خلدون:

تاریخ ۱: ۳۷۷ تا ۳۵۱ (اردو ترجمہ از شیخ عنایت اللہ

لاہور، ۱۹۶۰ء): (۱۹) ابن سید الناس: عیون الاثر ۲: ۵۴

بعد: (۲۰) ابن کثیر: البدایہ والنہایہ، ۳: ۹۲، بعد:

(۲۱) ابن القیم: زاد المعاد، ۲: ۲۸۸، بعد: (۲۲)

السلطان: المواہب اللدنیہ، ۱: ۱۴۲، بعد: (۲۳)

المقریزی: إمتاع الأسماع: ۲۱۵، بعد: (۲۴) الدیار بکری:

تاریخ الخلیس، ۱: ۴۷۹، بعد: (۲۵) ابن حزم: جوامع السیرہ

۱۸۵ تا ۱۹۱: (۲۶) دویدار: صور من حیاة الرسول،

(محمد حمید اللہ و [ادارہ])

⑧ الخندق: اندلس میں متعدد مقامات کا نام: (۱)

شلمتقہ Salamanca کے قریب ایک مقام، جو اب تورہ

الہندیگا Torre-Alhandiga کے نام سے مشہور ہے۔

عیسائی مؤرخین کا بیان ہے کہ ۵۳۸/۵۹۳ء میں یہاں

خلیفہ عبدالرحمن ناصر کی فوجوں کو عیسائیوں کے

مقابلے میں ہزیمت اٹھانا پڑی تھی۔ المقری کی رائے

میں اس جنگ کا محل وقوع شہر سمورہ Zamora تھا:

(۲) خندق آش: یہ مقام موجودہ صوبہ غرناطہ Granda

میں فحص عبلہ اور وادی آش (Guadix) کے درمیان واقع

حصہ لیتے تھے۔

الخنساء کی زندگی کا سب سے پہلا واقعہ، جس کا ذکر اس کے سوانح نگار کرتے ہیں، ایک معمر شخص درید بن الصمۃ کا پیام نکاح تھا۔ درید وہ میں قتل ہو گیا۔ یہ الخنساء کے بھائی معاویہ کا گہرا دوست تھا اور دونوں نے عہد کیا تھا کہ جو بعد میں زندہ رہے گا وہ مرنے والے کی موت پر مرئیہ کہے گا۔ اس وقت الخنساء کم سن تھی اور چونکہ پیام نکاح اس کے بھائی کے ذریعے آیا، یہ خیال ہو سکتا ہے کہ اس کا باپ فوت ہو چکا تھا۔ اس زمانے کو دیکھتے ہوئے یہ بات بہت اہم ہے کہ لڑکی کو پیام نکاح پر غور کرنے کا موقع دیا گیا اور جب اس نے درید کو دیکھا تو ناپسندیدگی کا اظہار بلکہ اس کے خلاف کچھ اشعار بھی کہے جن میں اس پر اور اس کے قبیلے پر طنز کی اور ضہنا یہ بھی کہا کہ اس نے اس سے پہلے بھی پس کے خاندان کے ایک فرد کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس بدر کے بارے میں اس سے زیادہ اور کچھ پتا نہیں چلا۔ اس کے بعد اس نے خود اپنے ہی قبیلے کے ایک فرد عبدالعزیٰ (یا ابن ثبیہ کی روایت کے مطابق رواحۃ بن عبدالعزیٰ) السلمی سے شادی کی، جو اس کے بٹے ابو شجرہ عبداللہ کا باپ تھا۔ غالباً عبدالعزیٰ کا انتقال جلد ہی ہو گیا۔ پھر الخنساء نے اپنے قبیلے کے ایک دوسرے شخص برداس بنی ابی عامر (السلمی) سے شادی کی جس سے اس کے تین بیٹے زید، معاویہ، عمرو اور غالب ایک بیٹی عمرہ بھی پیدا ہوئی جو اس کی سب سے چھوٹی اولاد تھی۔ بقول ابن حزم برداس کے ان بیٹوں کے نام ہیرہ، جزہ اور معاویہ تھے (جمعہ انساب العرب، ص ۲۶۳)۔ تاریخ ورمواد کو مربوط کرنے میں بہت زیادہ دشواری پیش آتی ہے اور خود الخنساء کی اغلب تاریخ پیدائش کی تعیین بھی دشوار ہے، مگر چونکہ اس کے بیٹے ابو شجرہ نے ۲۵ [رک بان] ۱۳ھ [۶۳۳ء] میں نمایاں حصہ لیا اور اس وقت وہ تیس

اسے اس زمانے کے مشہور بڑے بڑے تجارتی شہروں میں سے ایک بیان کیا گیا ہے۔ اسلامی اور عیسائی مآخذ اس امر پر متفق ہیں کہ وہاں مسلمان ۳۰ ہزار تک کی تعداد میں آباد تھے۔

مآخذ: اسلامی مآخذ کو (۱) Quatremère نے 'Histoire des mongols de la perse par Raschideldin' ص LXXXVI بعد اور (۲) Ch. Schefer نے 'Centenaire de l'Ecole des langues Orientales vivantes' میں ص ۱۹ بعد اور ۲۳ بعد میں جمع کر دیا ہے 'عیسائی مآخذ' در (۳) L'Extrême Orient: I. Hellberg 'وغیرہ' Göteborg ۱۹۰۶ء ص ۲۵ بعد 'قب خاص طور پر (۴) "Quinsay" کا مکمل بیان در 'Marcu Pale' طبع 'Yule-Corder' ۲: ۱۸۵ تا ۲۱۵۔ غیر ملکی نو آبادی کے بارے میں جو Hang-tow-fu میں ہے 'نزدیکھے (۵) Hirth اور 'Chao Fukua: Rothhill' سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۱۱ء ص ۱۶۔

(W. BARTHOLO)

* الخنساء: عرب کی مشہور ترین شاعرہ، اس کا اصلی نام ثمانیر بنت عمرو [بن الحارث] بن الشریہ ہے وہ بنو سلیم میں سے تھی۔ الخنساء کا باپ بہت زیادہ شہرت اور دولت کا مالک رہا ہوگا کیونکہ المرزوقی: کتاب الآزمنہ (طبع حیدرآباد، ج ۲ ص ۱۶۸ بعد) سے یہ پتا چلتا ہے کہ اس کا باپ اپنے دونوں بیٹوں معاویہ اور صخر کو لے کر عام الفیل کے بیستسویں سال عکاظ کے میلے میں آیا اور کچھ اراضی جو وحیدہ مقام پر بئرب کے ضلع (مخلاف) میں تھی، جمیل شاعر کے دادا مغیر ابن الحارث کو منتقل کر دی۔ الاصمعی کا بیان ہے کہ اس وقت جو دستاویز لکھی گئی تھی وہ ہارون الرشید کے زمانے تک معمر کے ورناء کے پاس تھی۔ اگر اس دستاویز کو اصلی مان لیا جائے (جس میں مجھے شک ہے) تو الخنساء کے بھائی ہجرت سے ۱۵ سال قبل ۶۰ء میں اتنے بڑے ہو گئے تھے کہ وہ اپنے والد کے معاملات میں

یہ سب واقعات اسلام کے ظہور سے پہلے کے ہیں، لیکن الخنساء بہت دنوں تک زندہ رہی اور [سُرفِ باسلام ہو گئی۔ اس کے چار بیٹوں نے جنگ قادسیہ (۶۳۶ء) میں شرکت کی۔ الخنساء نے اپنے بیٹوں کو بہادری اور ثابت قدمی سے لڑنے کی تلقین و تحریض کی۔ وہ اتنی بے جگری سے لڑے کہ چاروں شہید ہو گئے۔ الخنساء نے اپنے بیٹوں کی شہادت کو اپنے لیے شرف و فضیلت کا باعث سمجھا]۔

[الخنساء کے دیوان کے مخطوطے برلن، برل، بیئرز برگ اور قاہرہ کے کتاب خانوں میں موجود ہیں۔ دیوان کئی بار طبع ہو چکا ہے۔ (دیکھیے براکلمان! معجم النبطیات العربیہ)۔ اس کے مرثیوں کو نوٹس شیخو نے ریاض الادب فی شواغر العرب، (بیروت ۱۸۹۶ء) میں جمع کر دیا ہے]۔

شاعرہ کی سوانح حیات اور اس کی شاعری کے معائن کے بارے میں شیخو Gabrieli 'Cheikho اور Rhodokanakis نے بہت تفصیل سے بحث کی ہے، چنانچہ اس کی زندگی اور کام کا پورے طور سے جائزہ ان مصنفین کی تحریروں سے لیا جاسکتا ہے۔ یہ کہنا بہت دشوار ہے کہ الخنساء نے مرثیوں میں کوئی نئی بات پیدا کی یا نہیں؟ مگر یہ بات یقینی ہے کہ اس کی شاعری نے بہت سے بعد میں آنے والے مرثیہ گوؤں کو متاثر کیا جن میں خود اس کی لڑکی عمرہ بھی شامل ہے۔ اگر ہم اس کے اشعار کا مقابلہ اس کے ہم عصر دوسرے مرثیہ گوؤں سے کریں (سیرے ذہن میں اس وقت متیم [بن نویرہ] اور ابو ذؤبب [الہذلی] ہیں تو ہم کو اعتراف کرنا پڑے گا کہ اس کے اشعار میں وہ شاعرانہ خوبیاں نہیں ہیں جو دوسرے مرثیہ گوؤں کے اشعار میں ہیں، مگر اس کے برخلاف اس کی نظموں میں، جو بہت مختصر بھی ہیں، حقیقی سوز و گداز ضرور ہے۔ دوسری طرف ایک ہی قسم کے خیالات اور معانی کے اعادے سے ان میں ایک طرح کی یکسانیت پیدا

مائی کا ہوگا اس لیے ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ اس وقت الخنساء کی عمر ۳۰ اور ۵۰ سال کے درمیان ہوگی، بلکہ غالباً اس سے بھی زیادہ۔ العباس بن مرداس جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شعرا میں سے ہیں یقیناً الخنساء کے بطن سے نہ تھے بلکہ مرداس کی کسی پہلی بیوی سے تھے۔ مرداس ایک بہت جانباز اور باہمت انسان تھے۔ انہوں نے اپنے کچھ ساتھیوں کی ہمراہی میں ایک چشمے کے پاس دلدل والی زمین کو جوتے کی کوشش کی وہاں رہنے والی ارواح نے انتقاماً ان کو آہستہ آہستہ مارنے کی ترکیب اختیار کی، یا یوں سمجھیے کہ غیر صحت بخش آب و ہوا کی وجہ سے کسی قسم کا بخار لاحق ہو گیا۔

لیکن جس واقعے نے الخنساء کی زندگی کا رخ بدل دیا وہ اس کے دو بھائیوں معاویہ اور صخر کا انتقال تھا۔ معاویہ عرب دستور کے مطابق ۱۸ ساتھیوں کی ہمراہی میں قبیلہ مرہ پر حملہ کرنے گیا تھا۔ اس کا اس قبیلے کے ایک فرد ہاشم بن حرملة سے عکاظ کے میلے میں جھگڑا ہو گیا تھا اور ایک ناکام کوشش کے بعد اس نے بنو حرمہ کے علاقے پر پھر حملہ کیا جس میں وہ ہاشم کے بھائی درید کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ اب صخر پر اپنے بھائی کے خون کا بدلہ لینے کا فرض عائد ہوا اور اسے پہلے درید کو قتل کرنے میں کسبابی ہوں جس نے کہ اس کے بھائی معاویہ کو قتل کیا تھا اور جو اس زخم سے جو (معاویہ کے ساتھ) مقابلے میں اسے لگا تھا آہستہ آہستہ اچھا ہوتا جا رہا تھا۔ اسی اثنا میں ایک اور سستی نے اول الذکر (درید) کے بھائی ہاشم کو قتل کر دیا۔ صخر اپنے بھائی کے اس دھرمے انتقام پر بھی مطمئن نہ ہوا اور برابر بنو مرہ پر حملے کرتا رہا یہاں تک کہ بنو مرہ کے حلیف بنو اسد میں سے ایک شخص قعس نے اسے مہلک طور پر گھائل کر دیا۔ صخر اپنے خیمے میں بہت دنوں تک نیم جان پڑا رہا اور بالآخر زخموں کی تاب نہ لا کر فوت ہو گیا۔

ہو گئی ہے۔

مآخذ : (۱) Nöldeke : *Beiträge zur*
(۲) *Kenntnis der altarab Poesie* ۱۸۶۳ء
دیوان: طبع شیخو، بیروت ۱۸۸۹ء: (۳) *Commentaire Sur*
le Diwan 'd'al-Khansā' طبع شیخو، بیروت ۱۸۹۵ء
(۴) *I tempi, la vita et li canzoniere della*: Gabrieli
N. Rho- Firenze 'poetessa al-Hansā' ۱۸۹۹ء: (۵)
'al-Hansā' und ihre Trauerlieder : dokanakis
Le Diwan : Coppier (۶) ۱۹۰۴ء 'S.B.Ak. wien
d' al-Khansā trad par le pere de Coppler بیروت
۱۸۸۹ء: (۷) *الخنسائی: طبقات* ص ۸ و ۵۱: (۸)
کتاب الأغانی ۱۳: ۱۳۶ بعد: (۹) الطبری: ۱:
۱۹۰۵ بعد: (۱۰) ابن قتیبة: *کتاب الشعر* طبع ڈبویہ
۱۹۷۷ء بعد: ان کے علاوہ الخنساء کے اشعار و امول
تقریباً ان سب تصنیفات میں موجود ہیں جو قدیم عربی
شاعری سے متعلق ہیں یعنی الخنساء اور کتاب الأغانی سے
لے کر آگے تک۔ اور اس کی نظموں کا ترجمہ مشرق شاعری
کے کئی یورپی مستغیب مجموعوں میں ملتا ہے جو
شیخو کے مطبوعہ دیوان کے شائع ہونے سے پہلے کے ہیں:
[(۱۱) السیوطی: *شرح شواهد المغنی* ۸۹: (۱۲) البستانی
الروائع عدد ۲۸، بیروت ۱۹۳۰ء: (۱۳) بشر بیوت:
شاعرات العرب فی الجاهلیة والاسلام، بیروت ۱۹۳۷ء: (۱۴)
براکمان: *تاریخ الادب العربی* ۱: ۱۶۴ تا ۱۶۵
(تعریب)]

(F. KRENKOW) (۱۵) (۱۶)

② **خواجو کرمانی**: ایران کا نامور شاعر،
متوطن کرمان۔ نام کے متعلق تذکرہ نویسوں میں
اختلاف پایا جاتا ہے۔ دولت شاہ سمرقندی نے اس کا
نام محض خواجو کرمانی (ملک الفضل) لکھا ہے
(تذکرۃ الشعراء، طبع براؤن، ۱۹۰۰ء، ۲۴۹)۔ ملا
عبدالنبی اس کا نام انضیل الدین خواجو بناتا ہے۔
(مہخالہ، طبع لاہور ۱۹۲۶ء ص ۷۱)۔

براؤن نے اس کا پورا نام، مع ولیدیت، کمال الدین
ابوالعطا محمود بن علی بن محمود لکھا ہے (*A Literary*
History of Persia، ۲: ۲۲۲)۔ خواجو کے اشعار ذیل
سے اس کا یہی نام ظاہر ہوتا ہے:

کمال الدین، سپہر فضل، خواجو
جہانِ علم و درازی معانی
پدر محمود کرد آن لحظه نامم
ولیکن من لمی دائم کدلم

اس کی تاریخ ولادت پر بھی تذکرہ نویس متفق
نہیں۔ البتہ خود اس نے اپنی مثنوی نو روز و گل کے
خاتمے میں ہماری رہنمائی کی ہے اور تاریخ ولادت
۱۵ شوال ۴۷۷ھ (۷ فروری ۱۲۸۱ء) بتائی ہے۔
خواجو کرمان کے ایک سربراہ آوردہ خاندان کا فرد تھا۔
کرمان ہی میں اس نے تعلیم پائی۔ فارسی کے علاوہ
عربی اور دیگر علوم میں بھی دسترس حاصل کی۔ ہوش
شبہ النبی ہی باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تو تنگ دستی
اور پریشان حالی سے سایہ بڑا جس نے عالم شباب میں
بھی اسے بے چین رکھا:

ہرگز از روز جوانی نشدم یکدم شاد
مادر دھر ندانم بچہ می زاد مرا
"حاصل علوم سے فارغ ہو کر خواجو نے سفر اختیار کیا
جسے اس نے "چار حد ملک و ملک کی سیر" سے تعبیر
کیا ہے، جیسا کہ شعر ذیل سے ظاہر ہے:
من کہ گل از باغ ملک چیدہ ام
چار حد ملک و ملک دیدہ ام

خواجو دورِ مہم مسافت رکن الملت والذین علاء الدولہ
سمانی (م ۵۷۶ھ/۱۱۳۵ء) کا سرید ہوا (تذکرۃ
الشعراء، ص ۲۵) اور کچھ عرصہ خراسان کے شہر
صوفی آباد میں گزارا جب *ErdKunde: Ritter* ۸:
۳۹۶)۔ مرشد کی مدح میں درج ذیل رباعی کہی ہے۔
ہر کو یرہ علی عمرانی شد
چون خضر بسر چشمہ حیوانی شد

از وسوسہ غارت شیطان وارست

مانند علاء دولہ سمنانی شد

صوفیہ کرام سے اسے یوں بھی عقیدت تھی۔ شیخ ابواسحق ابراہیم کازرونی (م ۵۴۶ھ/۴۱۰ء) اسے زمانے کے صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے۔ ان کے مزار کی زیارت کو گیا تو ان کی عقیدت میں مدحیہ اشعار کہے جو اس کی مثنوی کمال نامہ میں شامل ہیں۔ ایک اور بزرگ شیخ امین الدین محمد کازرونی (م ۵۴۵ھ/۴۱۳ء) سے بھی اسے عقیدت تھی، ان کے فیضان صحبت کا بھی ذکر کیا ہے۔ وطن کی سیر و سیاحت کے بعد خواجو نے بغداد کا رخ کیا۔ بغداد جانے کا عزم شاید ذاتی پریشانیوں کی وجہ سے کیا ہو، جیسا کہ وہ خود لکھتا ہے:

برو ترک ابن محنت آباد کن

لب دجلہ و راہ بغداد کن

جو ایوب در بند کرمان مباش

جو یعقوب در بیت احزان مباش

تذکروں سے یہ پتا نہیں چلتا کہ وہ بغداد میں کتنا عرصہ رہا، بہر حال اشعار ذیل سے پتا چلتا ہے کہ کچھ مدت گزارنے کے بعد وہاں سے بھی بد دل ہو گیا:

زمن قاپچ آمد کہ خرچ بلند

کہ از خاک پاکم بغربت فگند

بہ بغداد بہرچہ سازم وطن

کہ ناید بجز دجلہ در چشم من

بغداد سے واپس ہوا تو اس نے مظفری خاندان کے حکمران، یزد مبارز الدین محمد (۵۴۳ھ/۴۱۳ء) کو ۵۵۹ھ/۴۲۸ء) جو بالآخر تخت و تاج سے محروم ہو کر (۵۶۵ھ/۴۲۶ء) میں فوت ہوا) کے قصیدے

کہے۔ اس کے بعد شیخ ابواسحق انجو جو حافظ شیراز کا مرید ہونے کی وجہ سے مشہور ہے، کے دربار سے وابستہ ہوا (۵۶۲ھ/۴۳۱ء)۔ یہ تعلق ۵۷۴ھ/۴۵۳ء تک قائم رہا۔ اس کی ننان میں متعدد

قصیدے کہے۔ خواجو کے مدوحین میں شمس الدین محمود صائغ بھی تھا، جو پہلے امرائے چوپانی کی ملازمت سے منسلک رہا۔ پھر مبارز الدین کے دربار سے وابستہ ہوا بالآخر ابواسحق انجو کا وزیر بنا۔ دربار ابواسحق میں خواجو کی حافظ شیراز سے بھی صحبت رہی۔ اس کا ایک مدوح تاج الدین عراق عدائد کرمان سے تھا جس نے اس کا تعارف محمود صائغ سے کرایا تھا۔ خواجو نے سلطان ابوسعید ایلخانی (۵۷۹ھ/۵۳۶ء تا ۵۸۵ھ/۵۳۵ء) اور اس کے وزیر غیاث الدین محمد جو اپنے والد رشید الدین فضل اللہ کی طرح علما کی قدردانی کے لیے مشہور تھا، کے بھی قصیدے کہے۔ فارسی کے علاوہ خواجو کو عربی میں بھی دسترس تھی، خواجو کے بعض اشعار اس بات کے شاہد ہیں کہ موسیقی میں بھی اسے دستگاہ تھی۔ ذیل کے اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ موسیقی کے مختلف پردوں اور مقاموں سے آشنا ہے اور ان کے محل استعمال سے بھی واقف ہے۔ اس قسم کی معلومات اس زمانے کے تہذیبی طبقے میں عام تھیں۔

گہمی "قول" مطرب ہمی کرد گوش

گہمی یادہ لعل می کرد نوش

خوشنویان چمن در پردہ "عشاق" بین

نوبت ہر روز، ہر بانگ ہزار آواز ند

بشنو نواہی "عشاق" از پردہ "سپاہان"

زان رو کہ از "عراق" است آن لببت عراقی

(قول، عشاق، سپاہان اور عراق پردوں اور سروں کے نام

ہیں۔ غیات اللغات، ص ۳۸۔ بہار عجم، ص ۱۹۶)۔

دولت شاہ سمرقندی نے خواجو کو "نخل بند

شعرا" کہا ہے۔

"اورا فاضلان و بزرگان دین در فصاحت و بلاغت

بی نظیر می دارند و او را نخل بند شعرا می نامند"

(زکریا الشعراء، ص ۲۸۹)۔

آثار خواجو: خواجو نے مختلف اصناف سخن میں طبع

اشعار کا ایک "ماتق نامہ" بھی ہے۔ درج ذیل اشعار میں خواجو نے مثنوی کا سال تصنیف ۵۷۳۲ھ/۱۳۳۱ء بتایا ہے۔

من ابن نامور نامہ از بہر نام
چو کردم بقال ہمایوں تمام
کنم بذل بر ہر کہ دارد ہوس
کہ تاریخ این نامہ "بذل" است و بی

اشعار کی تعداد ۳۲، ۳ ہے۔

یہ مثنوی بغداد میں لکھی گئی (تذکرۃ الشعراء ص ۲۴۹)۔ اس کا قلمی نسخہ موزہ بریطانیہ لندن میں موجود ہے۔ اس نسخے کے ساتھ روضۃ الانوار اور کمال نامہ کے خطی نسخے بھی شامل ہیں (شمارہ ۱۸۱۱۳ Add)؛ ایک نسخہ انڈیا آفس کے کتاب خانے میں ہے (شمارہ ۱۳۳۴)؛ پاکستان و ہند میں یہ مثنوی پہلی بار فخرالدولہ مرزا علاء الدین خان بہادر رئیس لوہاروی تصحیح سے ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء میں طبع ہوئی (صفحات ۲۹۳)؛ دوسری مرتبہ ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء میں بمبئی میں طبع ہوئی (صفحات ۲۹۵)۔ ۲۔ نوروز و گل بھی عشقیہ مثنوی ہے جو نظامی کی خسرو و شیریں کی بحر میں لکھی گئی ہے۔ یہ مثنوی خراسان کے حکمران فیروز کے بیٹے نوروز اور قیصر روم کی شاہزادی گل کے معاشقے کی داستان ہے۔ ضمناً تین اور داستانیں بھی آتی ہیں جو شاہزادے کا شہم غلط کرنے کے لیے اسے سنائی گئی تھیں۔ روائی اور جذبات نگاری کے اعتبار سے یہ مثنوی خواجو کا سب سے سنجیدہ جاتی ہے۔ آغاز اس شعر سے ہوا ہے :

بنام نقشبند صفحہ خاک

عذار افروز مہربان افلاک

مثنوی تاج الدین عراقی کے نام منسوب ہے جو مظہری بادشاہ مبارز الدین کا وزیر ہوا تھا۔ سال تصنیف ۵۷۳۲ھ/۱۳۳۱ء ہے جیسا کہ خواجو نے خود لکھا ہے :

دوشش بر ہفصد و سی گشتہ افزون

پہایان آمد این نظم ہمایوں

آزمائی کی۔ نظامی گنجوی کے ختمے کے طرز پر ختمہ لکھا۔ اس کے علاوہ دیوان اشعار بھی مرتب کیا۔ مثنویوں کا مختصر سا تعارف درج ذیل ہے۔

۱۔ معانی و ہمایوں۔ ختمہ خواجو کی یہ پہلی مثنوی ہے جو نظامی کی رزمیہ مثنوی سکندر نامہ کی بحر (مقارب) میں لکھی گئی ہے۔ شام کے بادشاہ منوشنگ قرطاس قب لاء لائن، بار اول : شاہ ہوشنگ کرمانی ص ۳۳۔ ۱ لیکن خواجو کے اپنے اشعار سے (دیکھیے آگے) منوشنگ ہی درست معلوم ہوتا ہے [کے اکلوتے بیٹے ہمای اور بادشاہ چین کی شاہزادی ہمایوں کے معاشقے کی داستان ہے۔ مثنوی کا آغاز حمد و ثنا سے ہوتا ہے :

بنام خداوند بالا و بہت

کہ از ہمیش ہست شد ہرجہ ہست

خواجو نے شروع میں یہ بھی بتایا ہے کہ یہ مثنوی امیر ابوالفتح محمد الدین محمود کے ایما پر لکھی گئی۔ یہ بھی پتا چلتا ہے کہ مثنوی کا مأخذ کوئی قدیم ایرانی قصہ ہے جو خواجو کو دیا گیا۔

فسون مغان بر سلطان بخوان

جو زردشتیان زند رہبان بخوان

حمد و نعت اور مقربان انوہیت کی توصیف کے بعد خواجو نے اپنے ہم عصر حکمران سلطان ابوسعید بلخانی (۵۷۱۶ھ/۱۳۱۶ء تا ۵۷۳۶ھ/۱۳۳۵ء) اور اس کے وزیر خواجہ غیاث الدین کے قصیدے کہے ہیں ؟ رومانی داستان کا آغاز ان اشعار سے ہوا ہے :

بر آرنده در ز دریای راز

سر آرج گوهر چین کرد باز

کہ شاہ تہی بود در مذاک شام

منوشنگ قرطاس بود بنی نام

نژاد وی از نسلی شاہان کے

مر او را مستخر ہمہ روم و رے

مثنوی میں جگہ جگہ غزلیات بھی شامل کی ہیں؛ نوے

باطنی (۱۷) در صفت غرور (۱۸) در صفت آفرینش -
(۱۹) در صفت توحید (۲۰) در صفت انسان -

مثنوی کی تکمیل کازرون میں شیخ ابواسحق ابراہیم
کازرون کی خانقاہ میں ہوئی - (خاتمہ کتاب) سال تصنیف
۵۷۴ھ / ۱۱۳۲ء ہے جو مصرع ذیل سے نکلتا ہے۔

”جیم“ زنادت شدہ بر ”میم“ و ”ذال“

یہ مثنوی خواجو نے شمس الدین محمود صان وزیر
ابواسحق اینجو کے نام معنون کی ہے۔

۵- کمال نامہ - یہ نظامی کی عشقیہ مثنوی
ہفت پیکر کی بحر میں لکھی گئی ہے - موضوع دین و
عرفان اور اخلاقیات ہے۔

حمد کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی
نعت کہی ہے، اس کے بعد ابواسحق ابراہیم کازرونی کو
عقیدت پیش کی ہے، پھر اپنے بیٹے مجیر الدین ابوسعید علی
سے خطاب کیا ہے اور اسے مزید تحصیل علم و فنر کی
تفہیم کی ہے۔ بعد ازاں مذہب و اخلاقیات پر بارہ مقالات
کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ ہر مقالے کے تحت عرفانی،
دینی اور اخلاقی حکایات لکھی ہیں۔

خانمے میں عالم رؤیا میں زیارت پر کا ذکر کیا
ہے۔ اسی حالت میں خواجو کو کلام سنائے کی فرمائش
کی جاتی ہے تو وہ اسی مثنوی کے اشعار پڑھتا ہے
مثنوی کا نام کمال نامہ اسی عالم میں پر و سرشد نے
تجویز کیا۔

نام نظم کمال نامہ نہاد

از کمالیتم دری بکشد

خرقہ داد و اجازتم فرمود

رو ملک حقیتم بنمود

دوسرے شعر سے واضح ہوتا ہے کہ خواجو کو عالم
رؤیا میں مسند ارشاد کا بھی حق عطا ہوا۔ میخانہ
عبدالنبی میں اس حق ارشاد پر یوں روشنی ڈالی ہے:
”بہ کرمان آمد و در آن جا خانقاہی ساخت - بقیہ عمر
در آن خانقاہ با درویشان بخدا پرستی مشغول بودہ

اشعار کی تعداد ۲۶۱۵ ہے۔ یہ مثنوی بغداد میں تکمیل
پذیر ہوئی۔

۳- روضۃ الانوار، نظامی کی مخزن الاسرار کے
طرز پر لکھی گئی - اس میں صوفیانہ مسائل بیان کیے
گئے ہیں جو بیس مقامات پر مشتمل ہیں۔ ہر مقالے کے
تحت عرفانی، دینی اور اخلاقی حکایات آتی ہیں۔ اس
مثنوی میں شاعر کی پختگی خیال اور عظمت فکر نمایاں
ہے جو اس کی انفرادیت کی مظہر ہے۔ مقالات کی
ترتیب یہ ہے (۱) ”حقیقت سخن“ - نمونے کے طور پر
اس کے تین شعر درج کیے جاتے ہیں:

عقل کہ اقلیم سعادت کشود

بر در دل چشم فراست کشود

شد بسخن تیغ زبان در فشان

گشت سخن گوهر تیغ زبان

جان نگر از دل بزبان آمدہ

و آب حیات از لب جان آمدہ

(۲) در مقامات اولیا و صفات آنان (۳) در کمال
سراتب بشر و در بلندی مقام انسان: یہ خواجو کا
خاص موضوع ہے:

ای بخود قاطر نہ بارکہ

وی بنظر مشرب شش گامگاہ

گلبن جان، جوش نظر باغ تو

لالہ دل سوخته داغ تو

ہیکل دل در برت افکنده اند

شور خرد در سرت افکنده اند

(۴) در تنبیہ و تہدید (۵) در انقلاب امور

(۶) دریافتن معنی انسان (۷) احوال نفس و

اتحاد نفس با حق (۸) شرح آیت عشق (۹) اغراض از

عالم ظاہر و رجوع بباطن (۱۰) در صفت پیری و

غنیمت جوانی (۱۱) در مذمت بادہ پرستی (۱۲) در

عقل و حیا (۱۳) در مذمت کبر (۱۴) در صفت سخا

و کرامت (۱۵) در صفت عالم وحدت (۱۶) در تصفیہ

پر مبنی ہیں۔ مثنوی میں خواجو نے جگہ جگہ غزلیں بھی لکھی ہیں۔ آخر میں ایک غزل محبوب کو خطاب کر کے کہی ہے۔ گوہر نامہ کے اشعار کی تعداد بقول خواجو ۱۰۳۲ ہے:

جو این آیات مطبوعت پسند است

اگر خواہی کہ بشمار کی چند است

حسابی از نظام الملک بر ساز

وز آن مجموع لام و نون بیتار

گویا ۱۱۱۲ سے ۸۰ کم کرنے سے تعداد ۱۰۳۲ ہوتی

ہے۔ مثنوی کا سال تصنیف ۸۷۴ھ/۱۴۷۵ء ہے:

مہ تیر و زمہ یک نیم رفتہ

ز ہجرت "ذال" و "واو" و "میم" رفتہ

مثنوی گوہر نامہ کا ایک خطی نسخہ ایشیائیک

سوسائٹی بنگال میں ہے۔ ایک نسخہ برٹش میوزیم لندن

میں بھی ہے۔ نسخہ کے علاوہ ایک اور مثنوی

مفاتیح القلوب و مصابیح الغیوب بھی خواجو نے لکھی

تھی (۱۱ لائڈن شماره ۳۴، کرمانی، ص ۱۰۳۴) اس کا

خطی نسخہ شاہ اودہ کے کتب خانے میں موجود ہے

(دیکھیے شپرنگر اودہ کیٹلاگ، شماره ۳۳۲) یہ مثنوی

۲۸ ابواب پر مشتمل ہے جن میں مذہبی مسائل بیان

کیے گئے ہیں۔

مثنویوں کے سلسلے میں خواجو کے ساقی نامہ کا

ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ یوں تو ساقی نامہ کے چند

اشعار نظامی کے ہاں بالخصوص سکندر نامہ کے ہر

باب کے آخر میں آئے ہیں، جن میں ساقی کو خطاب

کر کے اگلے باب کی طرف قارئین کو توجہ دلائی ہے

لیکن خواجو نے ہماری وہابیوں میں ۹۰ اشعار پر

مشتمل مستقل نظم کی صورت میں ساقی نامہ لکھا ہے

اس میں وہ بے ثبات دنیا کا مؤثر انداز میں ذکر کرتا

ہے اور اس کے الیمہ اثرات کو بھلانے کے لیے ساقی

سے حیات آفریں جام طلب کرتا ہے۔ پہلا شعر یہ ہے:

بدہ ساق آن عین آب حیات کہ دوران گیتی ندارد ثبات

(میعخانہ، طبع لاہور، ۱۹۲۶ء، ص ۷۳)۔

مثنوی کمال نامہ ابواسحق اینجو کے نام معنون ہے۔

اختتام پر ایک ہر زور فصیحہ اس کی شان میں کہا

ہے۔ مثنوی کا سال تصنیف ذیل کے شعر کی رو سے

۸۷۴ھ/۱۴۷۵ء ہے۔

شد بتاریخ مفید و چل و چار

کار این نقش آوری جو نگار

مثنوی کا قلمی نسخہ، جیسا کہ پہلے ذکر آیا ہے،

برٹش میوزیم لندن میں موجود ہے۔

۵۔ گوہر نامہ اخلاق و تصوف کے بیان میں

ہے اور نظامی کی عشقیہ مثنوی خسرو و شیرین کی

بعر میں لکھی گئی ہے، مصنف نے گوہر نامہ اور

گہر نامہ دونوں طرح سے اس کا نام لیا ہے:

جو کردم گوہر افشان نوک خامہ

گہر نامہ نہادم نام نامہ

کہ گوہر نامہ ای را کر بہائی است

بہایش در درج کبریائی است

مثنوی کا آغاز نعمت و مناجات سے ہوا ہے۔ اس کے بعد

مظفری خاندان کے بانی، مبارز الدین کی مدح کی ہے

پھر خواجہ بہاء الدین (وزیر مبارز الدین)، اس کے آبا و

اجداد اور اس کے جد اعلیٰ نظام الملک طوسی کے قصائد

کہے ہیں۔ قصائد کے آغاز میں شاعر "دانش افروز"

سے خواجہ بہاء الدین کے جد اعلیٰ کے متعلق سوال

کرتا ہے۔ اسے جواب ملتا ہے:

گہر جوئے جو او عالی گہر کیست؟

ہنر جوئے جو او صاحب هنر کیست؟

نظام الملک طومش جد اعلیٰ است

شود کار نظام الملک ازو راست

یہ قصائد نظام الملک کی جیسے بشتوں کا احاطہ کیے

ہوئے ہیں۔ خواجو جیسے شاعر سے یہ توقع تھی کہ وہ

اس دور کے کچھ تاریخی واقعات بھی نظم کرے گا

لیکن ایسا نہیں ہوا۔ یہ قصائد محض تعریف و توصیف

بلکہ آنست سلیمان کہ ز ملک آزاد است
آنکہ گویند کہ بر آب نہاد است جہان
مشنوای خواجہ کہ تا در نگری بر باد است
خاک بغداد بخون خلفا می گرید
ورنہ آن شط روان چیست کہ در بغداد است
حاصلے نیست بجز غم بجهان خواجو را
خرم آنکس کہ بکلی ز جہان آزاد است
خواجو کی غزل گوئی کی یہی خصوصیت ہے جس پر
حافظ نے اپنی شاعری کی بنیاد قائم کی اور اس کے
اسلوب میں غزل سرائی کی۔ چنانچہ وہ اس بات کے
معترف بھی ہیں :

اساد غزل سعدی است پیش ہمہ کس اما
دارد سخن حافظ طرز و روش خواجو
شلی نعمانی نے خواجو اور حافظ کی غزلیات کا موازنہ
کیا ہے (شعر العجم، ج ۲، ص ۲۱۲ تا ۲۱۶، طبع لاہور
۱۹۶۴ء) جس سے یہ حقیقت اور بھی واضح ہو جاتی
ہے کہ حافظ نے خواجو کا اسلوب اختیار کیا، یہاں تک
کہ جزئیات میں بھی اس کی پیروی کی۔ دو غزلوں کے
ایک ایک شعر درج ذیل ہیں :

خواجو : انا صبا خیری کن مرا از آن کہ تو دانی
بدان زمین گذری کن بدان زمان کہ تو دانی
حافظ : نسیم صبح سعادت بر آن نشان کہ تو دانی
گذر بکوی فلان کن در آن زمان کہ تو دانی
خواجو : منزل از یار قرین است چہ دوزخ چہ بہشت
مجدہ ای گر بہ نیاز است، چہ مسجد چہ کنشت
حافظ : ہمہ کس طالب یاراند چہ ہشیار چہ مست
ہمہ جا خانہ عشق است چہ مسجد چہ کنشت

تصوف و عرفان خواجو کی مثنویات کے تو خاص موضوع
ہیں لیکن بعض غزلیات میں بھی صوفیانہ رنگ نمایاں ہے۔
خواجو کے سال وفات کے بارے میں تذکرہ
نویسوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ دولت شاہ سمرقندی
نے اس کا سال وفات ۵۷۲ھ/ (۱۳۳۱-۱۳۳۲ء) لکھا ہے

دیوان خواجو۔ خواجو کا دیوان قصائد، غزلیات اور
رباعیات پر مشتمل ہے۔ دیوان کے اشعار کی تعداد
دولت شاہ نے ۲۰ ہزار بتائی ہے؛ (لیز دیکھیے شہرنگر،
اودہ کیلاگ ص ۴۲) قصائد جو شامل دیوان ہیں
ان میں سے کچھ آل مظفر کے ہائی مبارزالدین، ابواسحق
ایجو اور شروالشاہ بن منوچہر کی مدح سرائی کی ہے۔
ایک منظوم مکتوب شماعی نے حکمران شروالشاہ کے
نام ہے۔ خواجو کا ایک ترجیع بند بھی ملتا ہے،
ترجیحی شعر یہ ہے :

کہ جہاں صورت است و معنی دوست
ور بمعنی نظر کئی ہمہ اوست
ہراؤں نے خواجو کا ایک مستزاد بھی درج کیا ہے اس
کے دو مصرعے یہ ہیں :

تا چند مخالف زنی ای مطرب خوشگو از پردہ عشاق
بنواز زمانی من بی برگ و نوا را از بانگ نوائے
خواجو نے قصائد میں خاقانی اور انوری کی پیروی کی
ہے۔ خاقانی اور خواجو کے دو مطلعے بغرض تقابل
درج ذیل ہیں :

خاقانی : صبحدم چون کلمہ بناد آہ دود آسائے من
چون شفق در خون نشیند چشم شب پیمائے من
خواجو : دوش چون در جنبش آمد قلم سودائے من
موج خون بر اوج زد چشم محیط آسائے من
مثنویاں اگرچہ خواجو نے نظامی گنجوی کی تقلید میں
لکھیں لیکن ان کے مضامین میں خواجو کی انفرادیت
بھی نظر آتی ہے۔ غزل البتہ ایسی صنف ہے جس میں
خواجو کی انفرادیت نسبتاً زیادہ نمایاں ہے۔

خواجو نے عشق و عاشقی کے جذبات کے علاوہ
دنیا کی بے ثباتی، وسعت مشرب اور رندی و مستی پر
زیادہ زور دیا ہے۔ اکثر پوری کی پوری غزلیں دنیا کی
بے ثباتی پر کہی ہیں۔

ایک غزل کے بعض اشعار درج ذیل ہیں :

پیش صاحب نظران ملک سلیمان باد است

شروع میں یہ لفظ انوری کے ایک شعر میں ملتا ہے: اس سے مشتق اسم ذات 'خواجگی' جو سوداگر یا تاجر کے مفہوم میں ہے Meninski اور حسلی (صقایہ) کی دستاویزوں میں ملتا ہے جنہیں Michele Amari نے شائع کیا (ص ۲۱۲)۔

انہیں معنوں میں مولانا جلال الدین رومی کے ہاں بھی آیا ہے:

از سوی خانہ بیامد خواجہ اش

بر دکان بنشست فارغ خواجہ وش

(مثنوی معنوی چاپ امیرکبیر، ۱۳۳۶ھ - عدد ۲۵۱)

انہیں کے ہاں خواجہ 'آقا' کے معنی میں بھی آیا ہے:

خواجہ چون پہلے بلست پندہ داد

بی زبان معلوم شد او را مراد (عدد ۹۳۲)

سعدی لکھتے ہیں:

من و تو هر دو خواجہ تاشانیم پندہ بارگاہ سلطانیم

خواجہ بمعنی توانگر (مغرور) بھی آیا ہے - سعدی:

خواجہ پندارد کہ دارد حاصلی

حاصل خواجہ بجز پندار نیست

صائب:

یوسف مصر وجودیم از عزیزبها ولیک

ہر کہ با ما خواجگی از سرگذارد پندہ ایم

خواجہ 'عارف کامل' کے معنوں میں بھی آیا ہے: حضرت

معین الدین چشتی مہد تھے لیکن عشق الہی اور محبت

رسولؐ کی بدولت جو انہیں عرفان حاصل ہوا، اس سے

وہ خواجہ کے لقب سے مشہور ہوئے - خضر علیہ السلام

کو بھی عرفان کی بدولت خواجہ خضر کہہ دیتے ہیں -

خواجہ 'برگزیدہ' کے معنی میں بھی مستعمل ہے جیسے

خواجہ حافظ شیرازی - معنوی مناسبت اور امتیاز کی

غرض سے پاکستان و ہند میں خواجہ، (جو عزیزوں کا

لقب ہے) کا الف حذف کر کے خوجہ لکھتے ہیں، یہاں

تک کہ کشمیریوں کا لقب بھی الف کے بغیر ہی

مستعمل ہے - (فرہنگ اندراج، ۲) - اب تو کشمیری

(تذکرۃ الشعراء ص ۲۵۱) عبدالبی نے بھی بیخانہ میں

یہی مال وفات دیا ہے (ص ۲۷۲) لیکن یہ درست معلوم

نہیں ہونا کیونکہ ۵۴۳ھ/۱۱۴۳ء میں اس نے مثنوی

کمال نامہ مکمل کی اور خود تاریخ بھی کہی، جیسا کہ

اس کا ذکر اوپر آچکا ہے - خزانہ عامرہ میں اس کا سال

وفات ۵۴۳ھ/۱۱۵۲ء دیا گیا ہے - براؤن بھی اس سے متفق

ہیں (دیکھیے A Literary History of Persia: vol 3,

ص ۲۲۳ مزار 'تنگ اللہ اکبر' میں بیان کیا جاتا ہے

لیکن اس پر کوئی کتبہ نصب نہیں۔

ماخذ: (۱) خمسۃ خواجہ: ہمای و ہمایون،

نوروز و گل، روضۃ الانوار، کمال نامہ، گوہر نامہ: (۲)

دولت شاہ سمرقندی: تذکرۃ الشعراء، طبع براؤن، ۱۹۰۰ء:

(۳) عبدالبی: بیخانہ، طبع محمد شفیع لاہوری: (۴)

علام علی آزاد بلکراسی: خزانہ عامرہ: (۵) لطف علی بیگ

آذر: آتشکدہ، بمبئی ۱۲۹۹: (۶) حمد اللہ المستوفی:

تاریخ گزیدہ، طبع براؤن: (۷) Cat. Persian MSS: Rieu:

(۸) Rosen: Oudh Catalogue: Sprenger:

Cat. Persian (۱۰): Manusc. Persans de l'Institut

Grundriss (۱۱): Poets Bankipore: Firdausi to Hafiz

A Literary: E.G. Browne (۱۲): der Iran Phil II, 248

History of Persia ج ۳: (۱۳) شبلی نعمانی: شعرالعجم،

ج ۲، طبع لاہور۔

(مقبول بیگ بدخشانی)

* خواجہ: (ف)، جس کے اشتقاق کا صحیح علم

نہیں [نوران میں سادات کا لقب (محمد بادشاہ شاد: فرہنگ

اندراج، ج ۲، طبع کتابخانہ خیام)] یہ عزت کا لقب

ہے جو ممتاز شخصیتوں کے لیے مخصوص ہے - عام طور پر

یہ لقب بادشاہ کے وزیروں کا ہوتا تھا - جو اہل دانش

میں سے چنے جاتے تھے [مثلاً ملک زوزن را خواجہ بود

کریم النفس و نیک محضر، الخ (سعدی: گلستان، ۱،

۵۴، طبع چاپخانہ علی اکبر ۱۳۲۷ھ ش)]۔

چھٹی صدی ہجری/بارہویں صدی عیسوی کے

گر خضر در بحر کشتی را شکست
صد دوستی در شکست خضر هست
(مثنوی معنوی)، تہران، عدد ۲۳۶

غالب: کیا کیا خضر نے سکندر سے، الخ.

اقبال: دیکھتا کیا ہوں کہ وہ پیک جہاں پیمائے خضر،
الخ بانگ درا، طبع لاہور، ۲۸۸-۲۸۹۔ وہ روایتیں اور
قصے جو الخضر سے متعلق ہیں ان کا مبدا وہ قرآنی
کتابہ ہے جو سورہ ۱۸، آیات ۵۹-۸۱ میں موجود ہے
[رک بہ الخضر] ہندوستان میں انہیں بہت سی جگہوں
پر دریا کے دیوتا یا کٹنوں اور چشموں کی روح کا روپ
سمجھا جاتا ہے۔ ان کا ذکر سکندر نامے میں ایسے
بزرگ کی حیثیت سے آیا ہے جو چشمہ حیات کے نگران
تھے۔ یہ نام پاکستان و ہند میں اپنا لیا گیا ہے۔ ہندو
مسلم سب ان کی عزت کرتے ہیں۔ دریائے سندھ کے
آس پاس انہیں اکثر دریا کا اوتار سمجھا جاتا ہے اور
کبھی کبھی وہ سبز لباس میں ملبوس ایک عمر رسیدہ شخص
کی صورت میں دیکھنے میں بھی آتے ہیں۔ اگر کوئی آدمی
ڈوبنے سے بچ جائے تو کہا جاتا ہے، اے خواجہ خضر
نے بچا لیا۔ (قب Legends of the Panjab: Temple

۱: ۲۲۱)۔

[خضر کی روحانی فضیلت اور حضرت موسیٰ کے
ساتھ ان کے ہم سفر ہونے کا ذکر اکثر شعرا نے کیا
ہے۔ اقبال:

کشتی مسکین و جان پاک و دیوار یتیم
علم موسیٰ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش
علامہ اقبال نے اشعار ذیل میں خضر کو 'لگران بحر'
اور 'رہنمائے جویائے اسرار' کے طور پر پیش کیا ہے:

ساحل دریا پہ میں اک رات تھا محو نظر
گوشہ دل میں چھپائے اک جہاں اضطراب
دیکھتا کیا ہوں کہ وہ پیک جہاں پیمائے خضر
جس کی پیری میں ہے مانند سحر رنگ شباب
کہہ رہا ہے مجھ سے اے جویائے اسرار ازل

برادری کے لیے خوجہ کے بجائے خواجہ ہی آتا ہے
کبھی خواجہ کی تصغیر خواجو بھی لکھ دیتے ہیں۔
(دیکھیے Grundris der Iran. Phil., i/ii) جیسے خواجو
کرمائی۔

عربی میں اس کا رواج خواجا اور خواجہ کی
شکاوں میں ہوا۔ زمانہ حال کے خواجہ (مشرق زبانوں
میں) کے معنی جناب، مسٹر اور موسیو کے ہیں۔
عثمانی ترکی میں اس لفظ کو خوجہ [رک بان] کی شکل
میں مستعار لے لیا گیا اور یہاں یہ، کاتب، محرر، نقل
کنندہ، اور ذاق التالیق کے معنوں میں آیا ہے۔ اس کے
علاوہ یہ لفظ عربی کی مغربی بولیوں میں بھی پایا جاتا
ہے جہاں اس لفظ کو اسی تلفظ اور معنی کے ساتھ لے
لیا گیا ہے۔ یہ الف لیلة و لیلة میں بھی ملتا ہے
(دیکھیے ڈوزی: ضمیمہ) خوجہ کا خطاب شیخ کی طرح،
ترکستان میں حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت
علی رضی اللہ عنہم کی اولاد کو دیا جاتا ہے، جو
حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے سوا ان کی دوسری
بیویوں سے ہیں۔

مآخذ: Mémotres d' histoire: DeFrémery

'Orientale' ج ۲، ص ۷۷، عدد ۱: (r) Malcolm

'History of Persia' لاہور ۱۸۸۸ء ص ۸۶؛ (۳) سعدی:

گستان، کتاب فروشی و چاپخانہ علی اکبر علمی

۱۳۲۷ھ ش: (۴) جلال الدین روسی: مثنوی معنوی از

انتشارات امیر کبیر، طبع ۱۳۳۶ھ ش تہران: (۵) محمد

پادشاہ: فرهنگ اندراج از انتشارات کتابخانہ خیام

طبع تہران ۱۳۳۶ھ ش: (۶) نیک چند بہار: بہار عجم

طبع نولکشور لکھنؤ ۱۹۱۶ء: (۷) فرهنگ آصفیہ

CL. HUART (و ادارہ)

* خواجہ اجمیری: رک بہ جشتی۔

* خواجہ خضر: (یا خضر) [خضر، قب لسان

العرب: خضر و خضر، قب غیاث اللغات: خضر، خضر

قب فرهنگ اندراج: ج ۲ [نیز رک بہ الخضر]۔

طبع لاہور: (۳) Crooke : *Popular Religion and*
 : Burton (۴) : *Folklore of N. India* لندن ۱۸۹۶ء
 : Temple (۵) : *Sind revisited* لندن ۱۸۷۷ء
 : Longworth (۶) : *of the Panjab* بمبئی ۱۸۸۵ء
 : Dames : *Popular Poetry of the Baloches* لندن
 : W. Irvine (۷) : *Storia do Mogor (Manucci)* لندن
 : A. Burnes (۸) : *Travels into Bakharra* لندن
 : J. Wise (۹) : *Muhammadans of* لندن
 : *Eastern Bengal, Journ. As. Soc. Bengal* ۱۸۹۸ء
 شمارہ ۲۳، جز ۲، ص ۳۸، بعد۔

(M. LONGWORTH DAMES) (و ادارہ)

خوارزم : یا خیرہ، ایک ملک، جو آمو دریا کے
 ترک بان کی زیریں گزرگاہ پر واقع ہے۔ قیاس ہے کہ
 ایک زرخیز ڈیلٹا کے علاقے پر مشتمل ہونے کے باعث
 یہ ملک قدیم زمانے ہی سے وسط ایشیا کی تہذیب کے
 ارتقا میں بڑی اہمیت کا حامل رہا ہوگا۔ نولڈکے (Nöldeke)
 (در Z.D.M.G. ۵۹: ۳۳۸، بعد) کے اعتراضات کے
 باوجود J. Marquart کی اس متنازع فیہ رائے کے حق میں
 بہت کچھ کہا جاسکتا ہے کہ ”خوارزم ہی“ ایریانیم و یجو“
 (Airyanem-Waedge) یعنی سرزمین اوستا تھا“ Erānsahr
 ہرودوٹس (Herodotos) (۱۵۵ ص ۱۹۰ء)۔
 (۳: ۱۱۷) کے قول کے مطابق دریائے آکسیس (Akes)
 کی وادی، جو بین الاقوامی اعتبار سے بہت اہم تھی،
 ایرانیوں کی حکومت سے پہلے خوارزمیوں کے قبضے
 میں تھی۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ وسط ایشیا کی
 تاریخ میں اس وقت بھی قدیمی خوارزم خاصی اہمیت
 رکھتا تھا۔ هکاتایوس (Hekataios) (جز ۱۷۲ و ۱۷۳)
 کے بیان کی رو سے سرزمین خوارزمیان (Chorazmians)
 پارٹھیا (موجودہ خراسان) کے مشرق میں واقع تھی
 اور دارالحکومت کا نام خوارزمیا (Chorasmia)
 (Xorasmia) تھا۔ بقول ہیرودوٹس (۷: ۶۶) خشیارشا
 (Xerxes) [= اشویرشا] کی فوج کا ایک حصہ اہل پارٹھیا

چشم دل وا ہو تو ہے تقدیر عالم ہے حجاب
 ”جواب خضر“ نظم میں خضر کو صحرا نورد ظاہر کیا ہے
 اور ان کے ”تگاپوے دمام“ کو زندگی کی دلیل بتایا ہے:
 کیوں تعجب ہے مری صحرا نوردی پر تجھے
 یہ تگاپوے دمام زندگی کی ہے دلیل
 بانگ درا، ص ۲۹۱۔

ایک بلوچ شاعر کی نظم میں، جو دریائے سندھ
 کی ایک جنگ کے بارے میں ہے، ایک کشتی کے دریا
 میں چھوڑ دیے جانے کا بیان ہے تاکہ ”وہ خواجہ خضر
 کی لہروں میں تیرے“ اور یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ
 ”خواجہ خضر خود اس جنگ کو یاد رکھیں گے“
 (بلوچوں کی عوام پسند شاعری = *Popular poetry of*
 : ۱ : *the Baloches*) ایک اور شاعر نے خضر کا نام
 میکائیل کے نام کی جگہ بطور ایک بڑے فرشتے کے لیا
 ہے۔ ان کی خانقاہ (Shrine) سندھ کے ایک جزیرے میں
 بھکر کے پاس ہے جہاں ہر مذہب کے عقیدت مند
 زیارت کو جاتے ہیں (*Sind Revisited*، ۲: ۲۲۶)۔
 Manucci جو بھکر کے محاصرے (۱۰۶۹/۱۰۶۸ء)
 کے وقت موجود تھا، اس زیارت گاہ کا ذکر Coia Qutan
 کے نام سے کرتا ہے۔

نیز دیکھیے *Travels into Bukhara*: Burnes لندن
 ۱۸۳۸ء۔

ان بزرگ کے بارے میں یہ یقین کیا جاتا ہے کہ وہ
 ایک سچائی پر سوار ہوتے ہیں۔ مجھل کو اودھ کے
 بادشاہوں نے اپنا امتیازی نشان (crest) بنا لیا تھا جو ان
 کے سیکوں پر بھی کندہ ہوا۔ مسلمانوں میں لڑکے کے
 عقیدے کے موقع پر خواجہ خضر کی فاتحہ دی جاتی ہے
 اور ساتھ ہی ایک چھوٹی سی کشتی دریا میں ڈالی جاتی
 ہے: موسم برسات کے ختم ہونے پر بھی ایسا ہی کیا
 جاتا ہے۔

مآخذ: (۱) جلال الدین روسی: مثنوی معنوی
 طبع محمد علی علی، تاریخ ندارد: (۲) اقبال: بانگ درا

فیر یا فیل، یعنی کلاٹ کا قلعہ ۶۲۶ء عہد سلوکیسی (۳۰۰ء) تک نہیں بنا تھا۔ البیرونی کے بیانات اور بعد کے زمانے کی اطلاعات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ متاخر مسلمان مصنفین (ابن الاثیر، طبع ثورن برگ، ۹: ۲۶۷) کا یہ خیال واقعات کے مطابق نہیں کہ ایک قدیمی خوارزم بحیرہ خزر کے قریب دریائے بلخان کے کنارے واقع تھا۔

خوارزم میں سلوکیسی عہد کے آغاز سے ۹۸۰ء سال قبل (۲۹۲ ق م) خوارزم میں تہذیب و تمدن کی ابتدا، سیاوش کی آمد اور ہاتھ سال بعد، یعنی ۱۰۰ ق م میں اس کے بیٹے کیخسرو کے قیام سلطنت اور حداسہ ملی کے اس بطل جلیل کی نسل سے ایک مقامی خانوادہ شاہی کے ظہور کے بارے میں البیرونی نے جو کچھ بیان کیا ہے، وہ بڑی حد تک افسانوی روایات پر مشتمل ہے۔ اس خاندان کے نسب نامے کے بارے میں اس کے بیانات ۳۰۰ء سے ۹۵۵ء تک کے دور پر حاوی ہیں۔ اس نے بتایا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہاں کون کون سے بادشاہ حکومت کرتے تھے، قتیبہ بن مسلم نے ۵۹۳/۶۰۱ء کے قریب اس سرزمین کو فتح کرنے کے بعد کسی تخت پر بیٹھایا تھا؟ اور یہ کہ مؤخر الذکر بادشاہ کا نام شاوش فو تھا۔ خاندان تانگ Tang (تانگ شو Tang-shu) کے چینی و تائع میں ایک سفارت کا ذکر ملتا ہے جو خوارزم کے بادشاہ شاوشی فن Shao-she-fen نے ۷۵۱ء میں چین بھیجی تھی (Documents sur les Turcs : E. Chavannes Occidentaux، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۹۰۳ء ص ۱۳۵)۔ اس سے البیرونی کے بیان کی تصدیق تو ہو جاتی ہے لیکن اس کے برعکس البیرونی کا یہ بیان قرین قیاس نظر نہیں آتا کہ عالموں اور پڑھتوں کا قتل عام کر دیا گیا اور کتابوں کو جلا دیا گیا تھا (وہی کتاب، ص ۳۰۰، ص ۲ و ص ۳۸، ص ۱۳)۔ خوارزم کی تقویم اور ان کے تہواروں کے بارے میں اس کے ہاں جو حوالے

اور خوارزمیوں پر مشتمل اور ایک ہی سپہ سالار کے ماتحت ہوا کرتا تھا، تاہم ہیروڈوٹس کا یہ بیان (۹۳:۳) محل نظر ہے کہ نہ صرف خوارزمیہ اور پارتھیا کو ملا کر ایک صوبہ بنا دیا گیا بلکہ ہخمانہ [الصغد] اور آریہ Aria [ہراہ] کو بھی اس میں شامل کر دیا گیا۔ سکندر اعظم کے زمانے میں خوارزم کے باشندے شاہشاہ ایران کی رعایا نہیں رہے تھے بلکہ ان کا اپنا بادشاہ تھا! یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ انہوں نے ایرانی حکومت کا جوا کب اور کیسے اتار پھینکا۔ بقول آریان Arrian (۱۵:۳) ص ۳ تا ۵) ۳۲۸ ق م کے موسم بہار میں سکندر نے شاہ خوارزمیان، فرسمانیس Pharasmanes کا باختر [= بلخ] میں استقبال کیا تھا، جو ڈیڑھ ہزار سواروں کے جلو میں وہاں پہنچا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ فرسمانیس کا دعویٰ تھا کہ اس کی حدود سلطنت مغرب میں بحیرہ اسود کے ساحل پر کلخیس (Colchis) تک پھیلی ہوئی ہیں۔ کرتیوس (Curtius) (۱:۸) ص ۸ نے بعض شاہ خوارزمیان کی بوجی ہوئی ایک سفارت کا ذکر کیا ہے اور وہ اس بادشاہ کا نام فراتافرنیس (Phrataphernes) بتاتا ہے۔

اس کے بعد آٹھویں صدی عیسوی تک خوارزم کی سیاسی تاریخ کا کوئی پتا نہیں چلتا۔ اسی طرح اس کا محل وقوع بھی غیر یقینی ہے۔ بقول بطلمیوس (Ptolemy) خوارزمی دریائے جیحون [= آمو دریا] کے مشرق کنارے پر آباد تھے اور ان کی جائے سکونت اور زمانہ مابعد کے دارالسلطنت کلاٹ [رک باں] یا کات (شیخ عباس ولی کے موجودہ کھنڈروں) کی جائے وقوع ایک ہی تھی۔ اس کے خلاف خوارزم کے قدیم ترین چینی نام یو کین (Yue-Kien) سے اجوہنوں (Hans) کی ابتدائی تاریخ میں مذکور ہے۔ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شہر گرگانج (موجودہ گتہ - آرگنچ Kunya-Urgench) ہے۔ البیرونی نے جو مقامی روایت بیان کی ہے، (آثار الباقیہ، طبع Sachau ص ۵) اس کے مطابق

نزدیک خوارزمی زبان ایسی تھی جسے غیر ملکی سمجھنے سے قاصر تھے (الاصطخری، ص ۳۰۴، نیچے؛ المقدسی، ص ۳۳۵، ص ۹)۔ اس زبان میں پانچویں صدی ہجری/گیارہویں صدی عیسوی کی لکھی ہوئی دستاویزات اب تک موجود ہیں (الیسٹی، طبع Morley ص ۸۴۲)۔

فتوحات اسلامی کی تاریخ میں مضبوط قلعہ بند دارالحکومتوں (البیرونی کی طرح الطبری نے بھی تین قلعوں کا ذکر کیا ہے) کے علاوہ شہر ہزاراسپ، خوسرود کا بھی ذکر ملتا ہے، مگر مؤخر الذکر نام بعد میں مذکور نہیں ہوا۔ یہاں بادشاہ کا ایک بھائی حکومت کرتا تھا۔ فتوحات کے بعد البیرونی کے قول کے مطابق صرف خطاب شامی ("شاہیہ") مقامی بادشاہوں کے پاس رہ گیا۔ اصل اقتدار ("ولایت") کبھی ان کے اور کبھی دوسروں کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ ۸۱۰ء/۷۲۸ء میں گروہر (نزد بحرہ اراک) کے باشندوں کی ایک بغاوت کا ذکر آتا ہے (الطبری، ۲: ۱۵۲۵)۔ گرگانج (عربی: جرجانیہ) میں خوارزم شاہوں سے الگ ایک خود مختار ریاست قائم ہو گئی، لیکن یہاں کے فرمانرواؤں یا ان کی حکومت کی ابتدا کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ ابن بطریق کے بیان سے، جس کا مفہوم باقوت (طبع ویسٹفلٹ، ۲: ۳۸۴، ص ۱۳) نے غلط سمجھا ہے، صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ گرگانج ۹۲۲ء کے لگ بھگ خوارزم سے متعلق نہیں تھا۔ ۳۸۵ء/۹۹۵ء میں گرگانج کا حکم ماسون بن محمد ہرائے خاندان کو ختم کر کے اس کے علاقے پر متصرف ہو گیا اور یوں خوارزم کو از سر نو سیاسی یک جہتی حاصل ہو گئی۔ خوارزم شاہ کا لقب والی گرگانج نے اختیار کر لیا۔

۳۸۷ء/۹۹۷ء میں ماسون کی وفات کے بعد یکے بعد دیگرے اس کے دو بیٹے، علی اور مامون ثانی، بادشاہ ہوئے۔ گرگانج کے کھنڈروں میں مؤخر الذکر کا ایک عربی کتبہ ملتا ہے (جس میں کسی سinar کی

ملنے ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ آٹھویں صدی عیسوی تک خوارزم میں، اور گیارہویں صدی عیسوی تک زرتشتیوں کے یہاں ایک بہت قدیم ایرانی تہذیب کا وجود باقی تھا۔ یہ زرتشتی اس زمانے میں (یعنی ۱۰۰۰ء میں، جب آثار الباقیہ قالیف ہوئی) اپنے مذہب کے پرجوش پیرو نہیں رہے تھے اور اس کے بارے میں ان کی معلومات محض چند ظاہری رسوم تک محدود تھیں۔ خوارزم میں زرتشتیوں کے علاوہ عیسائی بھی تھے، لیکن وہ ایران اور وسط ایشیا کے بیشتر عیسائیوں کی طرح نسطوری نہیں تھے بلکہ ان کا تعلق راسخ المعیسہ یونانی کلیسا سے تھا (الملکانیون، نسب البیرونی: کتاب مذکور، ص ۲۸۸، ص ۱۵)۔ دوسرے مذاہب کے پیرووں، مثلاً یہودیوں کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا حالانکہ مشہور فہرست اَمَصَار (دیکھیے: Marquart: ۱۱۸: ۲، Grunder. d. Iran. Phil., Eransahr، ص ۷) میں خوارزم کے متعلق لکھا ہے کہ اس کی بنیاد نرسیس (Narses) پسر بزد گرد اقل (۳۹۹ تا ۴۴۲ء) اور اس کی یہودی بیوی نے رکھی تھی۔ اسی طرح Zurn Min. Norodn. Prosveshch: K. Instanacev، ۱۹۱۱ء شمارہ ۲، ص ۲۹۳ (یہ بعد) نے قیاس ظاہر کیا ہے کہ الطبری ۳: ۱۲۳۷، ص ۱۷ نے جن اخبار کا ذکر کیا ہے وہ یہودی تھے، لیکن اس قیاس کے متعلق کم از کم اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ وہ محل نظر ہے (قب اخبار النصارى، ۱: ص ۳۸۰، ص ۱۴۱)۔ خوارزم میں جو ایرانی بولی رائج تھی اس کے بارے میں ان الفاظ سے کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے جو البیرونی نے تقویم اور تہواروں کے ناموں وغیرہ کے ضمن میں استعمال کیے ہیں۔ چند آور الفاظ بعض دوسرے مآخذ میں بھی ملتے ہیں، مثلاً "غَاوْ خَوَارَه"، بمعنی گلے کا چارا (الاصطخری، ص ۳۰۱)؛ پونید، بمعنی روئی (باقوت، ۲: ۳۸۸، ص ۱۵) "بکند"، در باقوت، طبع قاہرہ، بحوالہ ابن فضلان)۔ عربوں کے

(۱۱۵۶ تا ۱۱۷۲ء)، نکیش (۱۱۷۲ تا ۱۱۷۳ء) اور محمد (۱۱۷۳ تا ۱۱۷۴ء) نے حکومت کی اور ان کے عہد میں یہ ریاست بہت طاقتور ہو گئی۔ ۵۹۰ھ/۱۱۹۳ء میں ایران کا آخری سلجوق بادشاہ طغرل، نکیش کے مقابلے میں لڑتا ہوا مارا گیا۔ اب خوارزم شاہ نے صرف مغربی ایشیا کی سیادت کے سلسلے میں اپنے آپ کو سلاجقہ کا جانشین سمجھ سکتا تھا بلکہ خود خلیفہ کے مقابلے میں بھی وہ اسی قسم کا دعویٰ پیش کر سکتا تھا۔ ۵۹۰ھ/۱۱۹۳ء میں آخری گورخانی فرمانروا پر محمد کی فتح کے بعد تراختای حکومت کا جوا بھی اتر گیا۔ محمد کی سلطنت سیر دریا کے دائیں کنارے سے لے کر ان پہاڑی دروں تک پھیلی ہوئی تھی جو ایران اور وادی دجلہ کے درمیان واقع ہیں۔ جنوب میں اس کی سیادت جزیرہ نماے عرب میں (عمان میں) بھی تسلیم کی جاتی تھی۔ ان دنوں خوارزم کا شمار عالم مشرق کے شاندار شہروں میں ہوتا تھا۔ اس وقت تک یہ ملک غالباً ترکی اثرات قبول کر چکا تھا، چنانچہ بعض جغرافیائی مقامات کے ترکی نام پائے جاتے ہیں، مثلاً صو قرا (ابن الاثیر، ۱۲: ۱۲۲) یا قراصو (طبقات ناصر، مترجمہ Raverly، ص ۴۴)۔

اس ملک کی تاریخ میں خوارزم کو ایک اول درجے کی طاقت کی حیثیت سے پہلی اور آخری بار جو ترقی نصیب ہوئی وہ اس کے وسیع تجارتی تعلقات کی مرہون منت تھی، جن کا ذکر الاصلطخری جیسے قدیم مصنف کے ہاں بھی ملتا ہے (BGA، ص ۳۰۳، بعد)۔ محمد ان تجارتی روابط کو اپنے سیاسی مفاد کے لیے استعمال کرنے کا خواہاں تھا۔ اسی باعث اس کی جنگیز خان (رگ باں) سے جنگ ہوئی اور اس کی سلطنت کو زوال کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے خاندان کے تمام افراد گرگانی سے نکل گئے اور یہ شہر سخت مدافعت کے بعد صفر ۶۱۸ھ/اپریل ۱۲۲۱ء میں دشمن کے قبضے میں آ گیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں کی پوری

تعمیر کا ذکر ہے۔ یہ کتبہ ۵۸۰ھ/۱۱۸۰-۱۱۸۱ء کا ہے (اے Zopiski rast. old. ashk. obshch.: N. Katanow ۱۵: ۱۵۰)۔ بعد، نے شائع کیا ہے)۔ اس بادشاہ نے جب سلطان محمود کے مطالبے پر اس کا نام خطبے میں شامل کیا تو اس کی فوج نے بغاوت کر دی اور اسے قتل کر ڈالا۔ اس پر محمود نے صفر ۵۸۸ھ/جولائی ۱۱۹۱ء میں خوارزم پر قبضہ کر لیا۔ البہیقی (طبع Morley، ص ۸۳۸) نے ان سب واقعات کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے اور اس سلسلے میں اس نے البیرونی کی ایک گم شدہ تصنیف (قب Northold : Turkestan، ۲: ۲۸۹) کا تتبع کیا ہے۔ اب خوارزم کی حکومت اور خوارزم شاہ کا لقب سلطان محمود کے مقرر کردہ حاکم آلتون تاش کو ملا۔ ۵۸۳ھ/۶۰۱ء میں اس خاندان کے خاتمے تک آلتون تاش اور اس کے بیٹوں کے حالات کے لیے رگ بہ آلتون تاش: اس خاندان کو جند کے فرمانروا شاہ ملک نے مغلوب کیا تھا۔ دو سال بعد سلجوق (محمود کاشغری: دیوان لغات ترک، ۱: ۳۹۷) بعد کی رو سے یہی تلفظ صحیح ہے: عربی املا سلجوق اصل ترکی تلفظ کے مطابق نہیں) بادشاہ چغری بیگ [رگ باں] نے اس کا تختہ الٹ دیا۔ چند وقفوں سے قطع نظر سلطان سنجر [رگ باں] کے عہد، یعنی ۵۵۲ھ/۱۱۵۷ء تک خوارزم سلاجقہ کی سلطنت کا حصہ رہا۔

گیارہویں صدی عیسوی کے آخری برسوں میں قطب الدین محمد [رگ باں] نے خوارزم میں ایک نئے خاندان کی بنیاد رکھی۔ اس علاقے کا نظم و نسق اول والی خراسان نے اور بعد ازاں سلطان سنجر نے اس کے سپرد کیا تھا۔ اس خاندان کی حکومت کا اصل مؤسس چغری بیگ کا بیٹا آتسز تھا (اس کے حالات کے لیے رگ بہ آتسز)، جو تادم مرگ سلطان سنجر کا باج گزار رہا اور تراختای [رگ باں] کو خراج بھی ادا کرتا رہا۔ اس کے بعد خوارزم بریکے بعد دیگرے اپیل آسلان

آبادی کو قتل یا آمو دریا میں غرق کر دیا گیا۔

اس کے بعد ۱۴۰ برس تک خوارزم پر آلتون اردو کا قبضہ رہا، البتہ اس کے جنوبی حصے، جن میں کاش اور خیوہ شامل تھے، چغتائی سلطنت [رگ بہ چغتای خانہ] ماتحت رہے۔ گر گانج، جسے مغول اور ترک ارگنچ Urgenē کہتے تھے، کچھ سال بعد کسی اور مقام پر دوبارہ بسایا گیا (ابن الاثیر، طبع Toruberg، ۱۲: ۳۲۳)۔ ۱۳۳۳ء میں ابن بطوطہ (طبع Sanguinetti و Defrémery) ۳: ۱ (بعد) نے اور ۱۳۴۰ء میں Balducci Pegolotti (در Cathay and the way Thither: H. Yule، ۲: ۲۷۹) نے اسے ایک آباد اور ہر رونی تجارتی شہر بتایا ہے۔ مشرقی یورپ اور مشرق ایشیا کے درمیان بڑی راستے پر یہ غالباً اہم ترین منڈی تھی۔ معاشی خوشحالی کے ساتھ ساتھ یہاں ادب اور فنون لطیفہ کو بڑی ترقی نصیب ہوئی، چنانچہ خوارزم کو ”مجمع اعیان جہان“ کہا جاتا تھا (عبدالرزاق سرقندی: مطلع سعدین، مخطوطہ جامعہ سینٹ پیٹرزبرگ، عدد ۱۵۷، ورق ۱۷۳-الف)۔ معتزلہ عقائد کی اشاعت یہاں پانچویں صدی ہجری/گیارہویں صدی عیسوی میں ہوئی (قب I. Goldziher، در Islam، ۳: ۲۲۰ (بعد)۔ آلہویں صدی ہجری/چودھویں صدی عیسوی کے نصف آخر تک یہاں معتزلہ عقائد کے پیرو موجود تھے، لیکن اس کے بعد مغربی ایشیا میں ان کا نام و نشان باقی نہ رہا (خوارزم میں معتزلہ تحریک کے بارے میں قب ابن بطوطہ، ۳: ۸؛ ابن عرب شاہ، قاہرہ ۱۲۸۵ء)۔

۱۱۸۰ء جہاں خوارزم کے موسیقاروں کے کمال فن کا ذکر بھی موجود ہے)۔ قدیم ارگنچ کے کھنڈروں میں اس صدی کی اپنی ہوئی عمارتوں کے جو آثار باقی ہیں وہ وسط ایشیا کی بہترین تعمیرات میں شمار ہو سکتے ہیں۔ ان میں آرا بیگ، خاتم کا مقبرہ بالخصوص قابل ذکر ہے (جس کے لیے دیکھیے ابن بطوطہ، ۳: ۲۷۹)۔ یہ خاتون یہاں کے والی قنات دمر کی بیوی

تھی۔ زمانہ مابعد میں تیمور نے کاش [کذا] میں آق سراہ کی تعمیر خوارزمی کاریگروں (”اساتذان خوارزمی“، در مطلع سعدین، ورق ۷۳ ب) سے کرائی تھی۔

۱۳۶۰ء کے تھوڑے ہی عرصے بعد خوارزم میں صوفی نام کا ایک خود مختار خانوادہ برسر اقتدار آیا، جس کا تعلق فوٹغرات کے خاندان سے تھا۔ ان حکمرانوں نے طلائی سکہ ڈھلوائے، جن پر کسی کا نام نہیں، بلکہ محض ”الملك لله“ درج تھا۔ اس قسم کے اولین سکہ ۵۷۵ھ/۱۳۶۳-۱۳۶۴ء کے ہیں۔ خوانین آلتون اردو (= اردوے مطلق = Golden Horde) کے سکہ ۵۷۶ھ/۱۳۶۰-۱۳۶۱ء کے ملتے ہیں۔ اس خاندان کے بانی حسین صوفی نے چغتائیوں سے کاش اور خیوہ چھینے تو تیمور نے اس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ متعدد معرکوں کے بعد ۱۳۷۹ء میں تیمور نے خوارزم فتح کر لیا۔ تیمور اور تقتمیش کے مابین جنگوں میں خوارزمیوں نے مؤخرالذکر کا ساتھ دیا۔ خان مذکور کے نام کے سکہ ۵۷۸ھ/۱۳۸۳-۱۳۸۴ء ہی میں ڈھالے جا چکے تھے۔ ۱۳۸۸ء میں تیمور نے دوبارہ خوارزم فتح کیا، جہاں تقتمیش نے اپنے گھرانے کے امیر اور مقامی خانوادے کے ایک نمائندے سلیمان صوفی کو متعین کر دیا تھا۔ دارالسلطنت ارگنچ (جسے قبل ازیں کاش کی طرح ملک کے نام پر خوارزم کہتے تھے) بالکل تباہ ہو گیا اور اسے زمین کے برابر کر کے وہاں جو بو دیے گئے۔ اس بربادی کے بعد خوارزم دوبارہ کبھی نہ پنب سکا۔ ۱۳۹۱ء میں تیمور نے شہر خوارزم کے ایک حصے محلہ قآن کو (جو چغتائی خوانین کی ملکیت سمجھا جاتا تھا) دوبارہ تعمیر کرایا، مگر یہ شہر محض اسی محلے تک محدود رہا۔

نویں صدی ہجری/پندرہویں صدی عیسوی میں خوارزم کچھ عرصے کے لیے خوانین آلتون اردو کے قبضے میں، پھر چند برس تک تیموری شہزادوں کے ماتحت رہا۔ ۵۸۶۸ھ/۱۶۶۴ء میں مقامی خاندان کے

متن: ص ۲)۔ سلطنت کے اعلیٰ غیر فوجی عہدیداروں، مثلاً وزیر (بعد ازاں مہتر) اور قش بگی، کو بھی محض اتنی اجازت حاصل تھی کہ سرکاری تقریبات میں کھڑے رہ کر شامل ہوں، حالانکہ فوجی سرداروں اور تیغ کے لیے باقاعدہ نشستیں ('اورون') مخصوص ہوتی تھیں۔ تہذیب و تمدن کا یہ قدیم گہوارہ زمان و امان سے محروم ہو کر آ رہ گیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وسط ایشیا کی کاروانی شاہراہ اپنی اہمیت سے محروم ہو گئی۔ اس کی تصدیق اس زمانے کے وائدی یورپی سیاح جنکسن Anthony Jenkinson کے بیان سے ہوتی ہے، جو ۱۵۵۸ء میں خوارزم گیا تھا۔ ملک کا نام تو پہلے ہی دارالسلطنت کو دے دیا گیا تھا (اول کات اور بعد ازاں ارگنج کو)، اب ملک کو عام طور سے دارالسلطنت کے نام پر پہلے ارگنج اور بعد میں خیوہ کہنے لگے۔

خیوہ (قدیم شکل خیوق: یاقوت نے اس کا تلفظ خیوہ لکھا ہے، جو چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی کے جغرافیہ دانوں کے دیے ہوئے تلفظ کے مطابق ہے) بھی غالباً کات کی طرح عہد قبل از اسلام میں آباد تھا۔ یاقوت کے زمانے میں خیوہ کے لوگ شافعی مذہب کے پیرو تھے، حالانکہ خوارزم کے دوسرے مقامات کے باشندے بالعموم حنفی تھے۔ بہلولان عطا محمد (م ۵۷۲۲/۶۱۳۲۲) کو، جس کے مقبرے کا ذکر ابوالغازی (متن، ص ۲۶۰) نے کیا ہے، آج بھی خیوہ کے ولی کا درجہ حاصل ہے۔ عرب محمد (۶۰۳ تا ۶۲۳) کے عہد کے نصف آخر میں دارالسلطنت کے طور پر خیوہ کو پہلی بار سمرت ملی۔ قیاس ہے کہ دریا کا باباں معاون خشک ہو گیا (قب مادہ آو دریا) نو رفتہ رفتہ ارگنج غیر آباد ہونا چلا گیا۔ ۱۶۴۵ء میں خیوہ سے تقریباً بیس میل شمال مشرق میں ایک نیا ارگنج بسایا گیا۔ برائے تجارتی شہر کے باشندے وہاں جا کر آباد ہو گئے اور ان کے اختلاف نے ارگنج کو خیوہ کا اہم ترین تجارتی مرکز بنا دیا۔ بعد کے زمانے

ایک رکن عثمان بن محمد صوفی کا ذکر خان مصطفیٰ کے باجگزار کی حیثیت سے آتا ہے۔ اس خان نے ارگنج کے جنوب میں وزیر کا شہر بسایا تھا، مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک ایشیا کی معاشرتی اور اقتصادی زندگی میں خوارزم کسی اہمیت کا حامل نہیں رہا تھا۔ تیموری سلطان حسین کے ماتحت خوارزم کے والی کا نام چین صوفی بتایا گیا ہے۔ ۱۵۰۵/۸۹۱۱ء میں یہ ملک شیبانی کے قبضے میں آیا، جو ماوراء النہر کی ازبک سلطنت کا بانی ہوا ہے (قب مادہ بخارا)۔

۱۵۱۰/۸۹۱۶ء میں شیبانی کو جنگ مرو میں شکست ہوئی اور خوارزم کا کچھ عرصے کے لیے سلطنت ایران سے الحاق کر لیا گیا۔ اس کے کچھ عرصے بعد وہاں کے ایرانی والی کو شریف صوفی نے نکال باہر کیا، مگر مؤخر الذکر کو ازبک فاتح کے سامنے ٹھہرنے کی مجال نہ ہوئی۔ اب جوچی کے خاندان کی ایک الگ شاخ نے، جس کا نالحنین سمرقند و بخارا سے دور کا تعلق تھا، خوارزم میں اپنی حکومت قائم کر لی (ابوالغازی، طبع Desmaisons، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۷۱ - ۱۸۷۴ء، متن: ص ۱۹۷ کے مطابق سنة الشاة = sleep year، یعنی ۱۵۱۱ء میں؛ اس میں جو سنہ ہجری درج ہے وہ یقیناً غلط ہے)۔ اس خاندان کی حکومت ۱۶۹۸-۱۶۹۵ء تک قائم رہی۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے بخارا کے صرف دو حکمرانوں نے تھوڑے تھوڑے عرصے کے لیے اسے اپنی سلطنت میں شامل کیا، یعنی عبداللہ بن محمود نے ۱۵۳۸ء میں اور عبداللہ بن سکندر [ارک بان] نے ۱۵۹۳ء اور ۱۵۹۵ء تا ۱۵۹۷ء میں۔ اس وقت خوارزم میں ازبکوں کے ہاں جو تہذیب بائی جاتی تھی اسے ماوراء النہر کی تہذیب سے کوئی نسبت نہ تھی۔ یہ بات بہت اہم ہے کہ خان ابوالغازی (۱۶۸۵ تا ۱۶۱۳ء) کو اپنے ملک کی تاریخ خود اکھنی پڑی: کیونکہ اس کی رعایا میں کوئی بھی اس کام کے لیے ضروری علمی استعداد کا مالک نہ تھا (ابوالغازی،

An Account of the British Trade on the : Hnnway)
 Caspian Sea، لندن ۱۷۶۲ء، ۲۳۰ میں دیگر
 مصنفین کے ساتھ تھامپسن G. Thompson کا نام بھی
 ملتا ہے) کے علاوہ کئی روسیوں (Gladishew و
 Murawin، در Geograf. Izv'yestiya، ۱۸۳۹-۱۸۵۰ء)
 کے بیانات بھی ملتے ہیں۔ ۱۷۷۰ء میں ایک فوجی
 افسر نازیموف Nazimov نے شہر خیوہ کا ایک نقشہ تیار
 کیا (Geogr. Izv.، ۱۸۳۹ء ص ۲۰۰)۔ ۱۸۳۲ء میں
 T. Fx. Basiner نے جدید شہر کی مساحت کی
 (Naturwissenschaftliche Reise durch die Kirgisenstep-
 pe nach Chiwa، بمطابق Kenntnis des russ. Reiches،
 سینٹ پیٹرز برگ، ۱۵ : ۱۲۰)۔ ان دونوں نقشوں میں
 خاصا فرق ہے اور ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۸۳۲ء
 کے قریب شہر کی ہیئت ایک صدی قبل کی بہ نسبت
 بہت مختلف تھی اور شاید اس کی جائے وقوع بھی بدل
 چکی تھی۔ Sawel'yew (Geogr. Izv.، ۱۸۳۹ء ص
 ۱۶۷) نے اس کا سبب نادر شاہ کے ہاتھوں
 خیوہ کی مزعومہ تباہی کو قرار دیا ہے؛ تاہم یہ بات
 ثابت کی جا سکتی ہے کہ ۱۷۷۰ء کے بعد چند سال
 تک یہ شہر اپنی سابقہ جگہ ہی پر واقع تھا۔ ۱۷۷۷ء
 میں ایک مدرسے کا ذکر ملتا ہے، جسے خان عرب محمد
 نے قائم کیا تھا۔ اس کے برعکس ۱۷۷۷ء سے کچھ
 پہلے (یوموت قبیلے کے) ترکمانوں کے متواتر
 حملوں سے خیوہ بالکل تباہ ہو گیا تھا اور یہاں صرف
 چالیس (اور ایک اور بیان کے مطابق پندرہ) خاندان باقی
 بچے تھے (مخطوطہ، در مؤزۃ ایشیائی (Asiatic Museum)،
 عدد ۵۹، rob. ۵۵ ب)۔ ۱۷۷۷ء میں ابنات
 محمد امین نے ترکمانوں پر فتح پالی اور اس کی بدولت
 شہر اور ملک میں ایک بار پھر خوشحالی کا دور دورہ
 ہوا۔ قدیم خیوہ کی تباہی اور جدید خیوہ کی بنیاد غالباً
 اسی واقعے کی مرہون منت ہے۔
 ۱۸۰۰ء میں محمد امین کے پوتے ابنات التوزر

میں وزیر کا نیا شہر دریا کے بہاؤ کی جانب اس کے
 بائیں کنارے ہی پر آباد ہوا۔ پرانے دارالسلطنت کٹ
 کو بھی، جو دائیں کنارے پر واقع تھا، اس لیے ترک
 کرنا پڑا کہ اسے سیراب کرنے والی نہر سوکھ گئی
 تھی۔ خان آئوشہ (۱۶۶۳ تا ۱۶۸۷ء) نے موجودہ
 کٹ (یا کٹ) کو جدید ارگنچ سے بیس میل جانب
 جنوب دریا کے بائیں کنارے پر پھر سے تعمیر کرایا۔
 ۱۶۸۱/۵۱۰۹۲ء میں اسی خان کے حکم سے شاہ آباد
 کی نہر بنائی گئی (مشہد کی فتح کے بعد خان نے شاہ کا
 لقب اختیار کر لیا تھا)۔ یہ جدید خیوہ کی اہم ترین
 نہر تھی۔ بارہویں صدی ہجری/اٹھارہویں صدی عیسوی
 میں خیوہ کے خان کی ریاست بالعموم پش قلعہ (پانچ قلعے)
 کہلاتی تھی۔ یہ نام جن پانچ شہروں کے مجموعے کے
 باعث رکھا گیا تھا، ان کے ناموں میں اختلاف پایا جاتا
 ہے۔ "جزیرہ" (ترکی: ارال، یعنی بحیرہ ارال کا خاص
 ڈیلے کا علاقہ، جس کے نام سے یہ موسوم ہوا؛ قب
 مادہ ارال) بھی سیاسی طور پر خیوہ سے علیحدہ تھا۔
 اس خاندان کے خاتمے کے بعد توفرت قبیلے کا
 ابنات (ابناغ)، یعنی شیخ قبیلہ اور فوجی سردار) ہی
 عام طور سے اصل حاکم ہوتا تھا۔ تخت پر چنگیزخان
 کے اخلاف بیٹھتے تھے، جنہیں گیاهستان (Steppes) سے
 بلایا گیا تھا، تاہم ان کی حکومت پرانے نام تھی اور
 جلد ہی چند افراد کے علاوہ باقی سب کو ان کے وطن
 واپس بھیج دیا گیا اور ان کی جگہ ایک اور امیر کو
 دے دی گئی۔ عبدالکریم بخاری (طبع Schefer، پیرس
 ۱۸۷۶ء، متن: ص ۷۹) نے اس رواج کے لیے "خان بازی"
 کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ پیر اعظم نے خیوہ کو
 اپنی سلطنت میں شامل کرنے کی کوشش کی، لیکن اسے
 کامیابی نہ ہوئی۔ نادرشاہ نے ۱۷۷۰ء میں خیوہ کو
 فتح کر لیا، مگر اس نے وہاں جس خان کو گدی پر
 بٹھایا تھا، وہ متمکن نہ رہ سکا۔ اس زمانے سے ہمیں
 خیوہ کے بارے میں مغربی یورپ کے بہت سے افراد

Ilitser نے خان کا لقب اختیار کر لیا۔ جب وہ ۱۸۰۶ء میں بخارا کے خلاف جنگ میں مارا گیا تو اس کے بیٹائی اور جانشین رحیم محمد (۱۸۰۶ تا ۱۸۲۵ء) نے پھر تھوڑے عرصے کے لیے ایک چنگیزی کو تخت پر بٹھا دیا، مگر پھر اسی سال خود خان کا لقب اختیار کر لیا۔ ۱۸۱۱ء میں علاقہ ارال کی تسخیر کے بعد خوارزم کی سیاسی وحدت پھر بحال ہو گئی، جسے دوبارہ صرف تھوڑے سے عرصے کے لیے بغاوتوں نے صلہ پہنچایا۔ ۱۸۲۲ء میں ترکمانوں نے مرو میں حکومت بخارا کے خلاف بغاوت کر کے خیوہ کے خان کی اطاعت قبول کر لی۔ محمد رحیم کے بیٹے اللہ قلی (۱۸۲۵ تا ۱۸۳۲ء) کے عہد میں خیوہ کی قلعہ کو بہت وسعت حاصل ہوئی۔ وہ بحیرہ ارال (تقریباً ۳۹° عرض بلد شمالی) میں سیر دریا کے دہانے سے لے کر کشک (۳۵°۳۰') کے قریب قلعہ سور تک پھیل گئی تھی۔ اس دور میں قدیم ارگنچ کو بھی دوبارہ بسایا گیا۔ ۱۸۳۹ء۔ ۱۸۴۰ء میں خیوہ کے خلاف روسیوں کی مہم ناکام رہی، مگر اس کے فوراً ہی بعد خان کو روسی حکومت کے سب مطالبات پورے کرنے پڑے، حالانکہ اس زمانے میں خیوہ نے انگلستان سے بھی گفت و شنید شروع کر دی تھی۔ خیوہ کی سرکاری تاریخ میں انگریزوں کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ روسی قوم کا ایک حصہ ہیں اور ان کا ملک سلطنت روس کے شمال میں واقع ہے (مخطوطہ موزہ ایشیائی، عدد ۵۹، ob. ورق ۲۶۹)۔ آگے چل کر خیوہ کو بخارا سے (۱۸۴۵ء تک) اور ترکمانوں سے بھی جنگ آزما ہونا پڑا۔ خان محمد امین (مد امین، ۱۸۳۶ تا ۱۸۵۵ء) ترکمانوں کے خلاف لڑتا ہوا ۱۸۵۵ء میں مارا گیا۔ اسی سال اس کے جانشین عبداللہ کا بھی یہی انجام ہوا۔ جدید خیوہ کی سب سے اہم عبارت محمد امین کے دور کی یادگار ہے۔ یہ 'نیلا مینار' ہے، جو ۱۶۰ فٹ سے بھی زیادہ بلند ہے (تصویر کے لیے دیکھیے Fr. v. Schwartz

Freiburg, Turkistan ج ۱، ۱۹۰۰ء، ص ۲۰۵)۔ سید محمد رحیم خان کے عہد (۱۸۶۳ تا ۱۹۱۰ء) میں خیوہ کو روسیوں نے فتح کر لیا (۱۸۷۳ء)۔ خان کے پاس اس کے مقبوضات کا صرف ایک حصہ (آمودریا کے مغرب میں) باقی رہ گیا اور یہاں بھی اسے اپنے آپ کو "روسیوں کے شاہشاہ کا اطاعت گزار" تسلیم کرنا پڑا۔ خان خیوہ کو بعد میں "اعلیٰ حضرت" (His Highness) کا خطاب مل گیا، مگر اس کا منصب امیر بخارا کے مساوی کبھی نہ ہو سکا (رگ بہ مادہ بخارا)۔ سید محمد رحیم اور اس کے جانشین خان اسفندیار (۱۹۱۰ تا ۱۹۱۸ء) نے کئی بار روسیوں سے ترکمانوں کے خلاف اعانت چاہی۔ مرو کے ترکمانوں اور روس کے مابین گفت و شنید (۱۸۸۱ تا ۱۸۸۳ء) میں خیوہ نے ثالثی کا فریضہ اس توقع پر انجام دیا کہ مرو کو براہ راست روس میں شامل نہیں کیا گیا بلکہ اس کے باجگذار خان خیوہ کے حوالے کر دیا جائے گا۔ دور انقلاب کی لڑائیوں میں بھی ترکمانوں نے کئی بار خیوہ کو تاخت و تاراج کیا۔ ترکمان سردار جنید خان نے خان اسفندیار کو حکومت سے معزول کر کے قتل کر ڈالا تو سید عبداللہ (۱۹۱۸ تا ۱۹۲۰ء) کو خان منتخب کر لیا گیا۔ پھر اس خان کی معزولی اور جنید کی جلاوطنی کے بعد جمہوریہ خوارزم کا قیام عمل میں آیا، جو برائے نام روس سے وابستہ تھی۔

سولہویں اور سترہویں صدی کی طرح انیسویں صدی عیسوی میں بھی خیوہ ایک بار پھر فتنہ و فساد کا شکار ہو گیا تھا، مگر پھر بھی گزشتہ زمانے کے برعکس ثقافتی اور معاشرتی ترقی کے لیے یہاں بخارا کے مقابلے میں کہیں زیادہ کام ہوا۔ اڑی بڑی نہریں بنائی گئیں، جن سے ملکی ترقی میں مدد ملی۔ یہاں کی شاہراہوں پر جو پل تعمیر ہوئے ان کی تعداد ترکستان کے دوسرے علاقوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ تھی۔ خان سید محمد رحیم نے یہاں ایک شاندار کتاب خانہ

میں مکمل ہو گئی اور یوں ازبکستان، ترکمنستان اور تاجکستان کے علاوہ متعدد داخلی طور پر خود مختار ریاستوں کا قیام عمل میں آیا۔ آمو دریا ترکمنستان اور ازبکستان کی حد بندی کرتا ہے۔ اب ارگنج، خیوہ اور بخارا کے شہر ازبکستان میں واقع ہیں اور ترکمنستان میں ہے۔ اشتراکی حکومت قائم ہونے کے بعد اس علاقے نے تعلیمی اور معاشی اعتبار سے بہت ترقی کی ہے۔

مآخذ : E. Sachau : Zur geschichte und

'Chronologie von Khwārizm' ج ۱ و ۲ وی انا ۱۸۷۳ء

'S. B. Ak. Wien' 'phil-hist-kl.' ج ۳ بعد: (۲)

'Khiwa oder Kharezm' : P. Lerch سینٹ پیٹرز برگ

۱۸۷۳ء (از "Russian Review" ج ۲): (۲) N. Wese-

Oczek istoriko-geografieskikh Sryed- : lowskiy

'yeniy o Khivinskoy Khantve' سینٹ پیٹرز برگ

۱۸۷۷ء : M.J. de goeje (۲) Das alte Bett der

'Oxus' لائنن ۱۸۷۵ء : (۵) A. Kuhn در Materiali

'dja statistiki Turkestanskogo krajn' ج (۷) (۷) '۲

سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۷۸ء (جس میں ص ۲۵۱ بعد کٹ کے

کھنڈروں کا اور ص ۲۱۳ بعد ارگنج کا بیان ہے):

O domusul' manskoi : K. A. Inostrancew (۶)

Žurn. Minist. Nar. در Kul'ture Khivinskogo orzisa

Prosv. فروری ۱۹۱۱ء ص ۲۸۳ بعد: (۷) A. Vinogra-

khorezniskaya Sovetskaya Narodnaya : dova

'Respublika' در Žizn Nacionalnostei ۱۹۲۳ء شماره

۱ ص ۱۸۱ بعد: (۸) 'Turkestan : W. Batthold' ج ۲

سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۰۰ء بالخصوص ص ۱۵۱ بعد ۲۸۹

بعد: ۳۵۵ بعد: (۹) وہی مصنف : Nachrichten über

den Aral-See und den unteren Lauf des Amu-dar'ja.

مترجمہ II. von Foth (لاڈزگ ۱۹۱۱ء در Quellen und

Forschungen zur Erd-und Kulturkunde طبع

Dr. R. Stille ج ۲): (۱۰) وہی مصنف : K istorii

'orosheniya Turkestana' سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۱۳ء

قائم کیا، جس سے استفادہ کرنے کی روسی طلبہ کو بھی اجازت تھی۔ روسی فتح سے قبل اس ملک کی جو تاریخ سرکاری طور پر مرتب کی گئی، وہ جامعیت اور استناد کے اعتبار سے بخارا یا خوقند میں لکھی جانے والی تواریخ سے کہیں برتر تھی۔ روسیوں نے اس ملک کے آثار قدیمہ کے انکشاف اور اس کی تاریخ اور موجودہ حالات کی تحقیق کے سلسلے میں بہت کم کام کیا ہے، حالانکہ یہاں اسے آثار محفوظ ہیں جو ترکستان کے کسی اور حصے میں نہیں مل سکتے۔ ترکستان میں دستور ہے کہ زمیندار کا مکان گاؤں کے اندر کسی گلی میں ہوتا ہے، لیکن یہاں ترکستان کے قدیم تاجک باشندوں کی بیروی میں زمیندار کی حویلی اس کی اراضی کے وسط میں بنائی جاتی ہے۔ گاڑی بان (ارہ کش) کاشغر کے دستور کے مطابق گاڑی کے اندر بیٹھتا ہے اور تاشکنت اور خوقند کے لوگوں کی طرح گھوڑے پر سوار نہیں ہوتا۔ نہروں کو خیوہ میں ترکمانوں کی طرح تری بولی میں "آرنا اور "پپ" (بڑی اور چھوٹی نہر) کے نام دیے جاتے ہیں، جو ظاہر ہے، آریائی نام ہیں۔ قدیم ارگنج میں جو عمارتیں سلامت رہ گئی ہیں وہ ترکستان کی قدیم ترین اور حسین ترین عمارتیں ہیں، تاہم ان کے حالات ابھی تک بالتفصیل نہیں دکھائے گئے۔

(اشتراکی انقلاب کے بعد ستمبر ۱۹۱۹ء تک پورا ترکستان سوویت روس کے زیر اقتدار آچکا تھا۔ فروری ۱۹۲۰ء میں خان خیوہ کو معزول کر کے وہاں عوامی سوویت جمہوریہ خوارزم قائم کی گئی۔ اگست ۱۹۲۰ء میں امیر بخارا کا بھی یہی حشر ہوا اور اسی طرح کی جمہوریہ بخارا یہاں بھی قائم ہوئی۔ ۱۱ اپریل ۱۹۲۱ء کو ترکستان کی ریاست (governor generalship) کو جمہوریہ شورائیت اشتراکیت کی حیثیت دے دی گئی۔ ۱۹۲۴ء کے موسم بہار میں ترکستان، بخارا اور خیوہ کی جمہورتوں نے قومیت کے اساس پر اپنی ریاستوں کی نئے سرے سے حد بندی کرنے کا فیصلہ کیا، جو مئی ۱۹۲۵ء

میں اس ملک کے بیشتر بادشاہ اور والی اسی لقب سے ملقب تھے، گو وہاں کے آخری خاندان کے باقی التوزر خان (۱۸۰۴ تا ۱۸۰۶ء) نے اپنے سگھوں پر (جو کبھی جاری نہ ہوئے) اپنے آپ کو صرف "وارث خوارزم شاہان" ظاہر کرنے ہی پر قناعت کی (عبدالکریم البخاری طبع Schefer ص ۸۰)۔ وسط ایشیا میں غالباً یہ واحد لقب ہے جس کا مفہوم زمانہ ماقبل اسلام سے لے کر زمانہ حال تک بحال رہا۔ اسلامی عہد سے پہلے زمانے کے خوارزم شاہوں کے شجرہ نسب اور سلسلہ جانشینی کے لیے واحد ماخذ البیرونی [رک بان] کی آثار الباقیہ ہے۔ اس میں مشہور افسانوی شخصیت کیٹسرو [رک بان] کو اس خاندان کا بانی بتایا گیا ہے (آثار الباقیہ، طبع Sachau، ص ۳۵) اور یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس کے عہد حکومت کا آغاز اس وقت ہوا جب اس سر زمین کو پہلی بار آباد ہوئے بانوے برس گزر چکے تھے۔ یہ آبادی سکندر اعظم سے ۹۸۰ سال قبل، یعنی سن ملوک (یعنی ۱۲۹۲ ق م) سے بھی پہلے معرض وجود میں آئی تھی۔ انفرادی حکمرانوں کے ناموں اور موروثی جانشینی کے متعلق حوالے ۶۱۶ سکندری (/ ۶۳۰ء) سے لے کر ۵۳۸/۶۵۵ء تک کے زمانے پر حاوی ہیں، جبکہ اس خاندان کا خاتمہ ہوا۔ ان حکمرانوں میں سے شاوشفر، جو فاتح خوارزم مسلم بن قتیبة کے ہم عصر خوارزم شاہ کا پٹا تھا یقیناً وہی بادشاہ ہے جس کا ذکر چینوں نے شاوشی فن کے نام سے کیا ہے اور جس نے ۵۵۱ء میں چین کو سفارت بھیجی تھی (Documents sur les Tou: E. Chavannes) Kive occid. (ص ۱۴۵)۔ اس کے مقابلے میں ابن الاثیر (طبع Tornberg، ۸ : ۳۱۰) نے جس خوارزم شاہ عبدالقہ بن آشکام کا ذکر بذیل ۵۳۲/۹۴۳ - ۵۴۳/۹۵۴ء کیا ہے اس کا نام البیرونی کے دیئے ہوئے شجرہ نسب میں نہیں ملتا۔ اس خاندان کے آخری حکمران ابو عبد اللہ محمد کے باپ خوارزم شاہ احمد بن محمد کے ۵۳۸/۹۵۹ - ۵۴۰/۹۶۰

(۱۱) وہی مصنف : *Sobitiya pered Khivinskim poludnom 1873 goda razskazu Khivinskago istorika* در 'Kaufmanskiy Sbornik' ماسکو ۱۹۱۰ء ص ۱ بعد، یہاں مذکورہ تواریخ کے بارے میں (بالخصوص جو موزہ ایشیائی Asiatic Museum کے مخطوطات، عدد ۵۹۰ و ۵۹۱ کے تتبع میں لکھی گئیں) جنہیں التوزر اور اس کے جانشینوں کے حکم سے قلمبند کیا گیا تھا، نیز دیکھیے : (۱۲) *Mélanges Asiatiques* ۱۰ : ۲۷۸، جہاں خطابات بھی درج ہیں، پہلی کتاب : (۱۳) فردوس اقبال تھی، جسے شیر محمد، المعروف بہ مؤنس نے التوزر کے حکم سے شروع کیا تھا، مگر خان مذکور کی وفات کے باعث یہ سلسلہ تصنیف ۱۸۰۶ء میں رک گیا۔ اس وقت تک مصنف نادر شاہ کے دربار میں نہیں پہنچا تھا۔ بعد ازاں محمد رجم خان کے حکم سے اس کا سلسلہ ۱۸۱۲ء تک پہنچایا گیا۔ پھر مصنف کو (۱۴) میر خواند : *روضة الصفا* کا ترقی ترجمہ کرنے کا حکم ملا، لیکن اسے مکمل کرنے سے پہلے ہی وہ ۱۸۲۸/۵۱۲۴ - ۱۸۲۹ء میں وفات پا گیا۔ تاریخ غیوہ دوبارہ شروع نہ ہو سکی تاآنکہ ۱۲۵۵/۱۸۳۹ - ۱۸۴۰ء میں اللہ قلی نے مؤنس کے بھتیجے محمد رضا، المعروف بہ آگامی، کو اسے مکمل کرنے کا حکم دیا۔ آگے چل کر اسی مؤلف نے اس ملک کی تاریخ ۱۸۴۲ء تک مختلف عنوانات کے تحت مرتب کی (ہر عہد حکومت کا بیان ایک الگ کتاب میں دیا گیا ہے) : [۱۵] *The Statesman's year Book* ۱۹۶۷-۱۹۶۸ء، ص ۱۵۷۔ بعد : (۱۶) *Encyclopaedia Britannica* طبع ۱۹۵۰ء، ۱۳ : ۳۶۳ بعد : (۱۷) *World Muslim Gazetteer* طبع مؤتمر العالم الاسلامی، کراچی، ص ۵۳۶، ۵۵۰ تا ۵۵۲ و بمواضع کثیرہ)۔

(W. BARTHOLOD [و ادارہ])

* **خوارزم شاہ** : خوارزم [رک بان] کے فرمانروا کا لقب، جو عربوں کی فتح کے وقت بھی رائج تھا (مثلاً دیکھیے الطبری، ۲ : ۱۲۳۷ بعد)۔ اسلامی عہد

۴ : ۱۳۰۶ اور خوارزم شاہوں کے اس خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔

اس کے بعد خوارزم شاہ کا لقب امیر آلتون تاش کو منتقل ہوا، جسے محمود نے خوارزم کا والی مقرر کیا تھا اور اس طرح ایک قلیل مدت کے لیے (۱۰۴۱ء تک) ایک اور خاندان برسرِ اقتدار و حکومت آیا [آلتون تاش اور اس کے دو بیٹوں کے حالات کے لیے رک : آلتون تاش الحاجب]۔ اگرچہ آلتون تاش کی وفات ۱۰۳۲ء کے بعد خوارزم شاہ کا لقب سعید بن سلاطین محمود بن محمود کو منتقل ہو گیا اور ہارون، آلتون تاش اس کے نمائندے (خلیفہ انداز) کی حیثیت پر حکومت کرتا رہا (البیہقی، ص ۴۳۹)؛ تاہم اس مؤرخ نے ایک اور مقام (ص ۴۴۹) پر ہارون خوارزم شاہ کے لقب سے یاد کیا ہے۔

۱۱ : نویں صدی ہجری / گیارہویں صدی عیسوی

کے اواخر میں پھر خوارزم کے ایک والی اکتچی قوجقہر کا ذکر خوارزم شاہ کے لقب کے ساتھ کیا ہے (دیکھیے *Turkestan* : Barthold، ص ۲ : ۴۶ J. Marquart، *Abh. Gött.*، سلسلہ جدید، ۱۳ / ص ۳۸ بعد)۔ ۱۰۹۷ء کے قریب یہی لقب کے جانشین اور خوارزم شاہوں کے جوتھے اور، ترین خاندان کے بانی قطب الدین محمد بن انوشکیج کے استعمال ہوا (ابن الاثیر، ۱۰ : ۱۸۱)؛ الجو تاریخ جہانگشاہی، طبع سرزا محمد، ۲ : ۳)۔ آتہ جس شان و شوکت سے اس خاندان کو استحکام اس کے لیے رک بہ آئیسیر - نکش (۱۱۷۲ تا ۱۱۷۳) اور محمد (۱۲۰۰ تا ۱۲۲۰ء) کے عہد میں اس نے ایران اور وسط ایشیا فتح کرنے کے بعد دول کی صف میں جگہ حاصل کر لی اور یہ ایسی بلند تھی کہ اب خوارزم شاہ کا لقب اس سے فروتر ہوتا تھا۔ نکش نے اپنے سگوں پر اپنا لقب سادا خوارزم شاہ اور محمد سلطان نے ابن السلطان

اور ۵۳۶۶/۹۷۶ء کے سکتے دستیاب ہو چکے ہیں (دیکھیے *Inventar. Katalog Mus. d. A. Markow*)

(*monet. Imp. Ermitaza* ص ۲۹۵ و ۹۷۵)۔

خوارزم کا شمالی حصہ، جس کا دارالسلطنت گرگانج [رک بان] تھا، سیاسی اعتبار سے سلطنت خوارزم شاہان سے الگ تھا؛ اس امر کا ذکر عرب جغرافیہ دانوں نے نہیں کیا، چنانچہ باقوت کو بھی اس کا علم نہیں تھا اور یہی وجہ ہے کہ وہ اس سے متعلق ابن فضلان کے حوالوں کو نہ سمجھ سکا (باقوت : مجمع، ۶ : ۴۸۸؛ نیز Baron Rosen، *Zapiski*، ۱۵ : ۵۹)۔

امیر گرگانج ابوالعباس مأمون بن محمد نے خوارزم کا جنوبی حصہ فتح کرنے کے بعد اپنے اور اپنے خاندان کے لیے خوارزم شاہ کا لقب اختیار کر لیا (۵۳۸۵/۹۹۵ء)۔ اس طرح وہ خوارزم شاہوں کے دوسرے خاندان کا بانی ہوا۔ مأمون ۵۳۸۷/۹۹۷ء میں فوت ہوا، پھر بکے بعد دیگرے اس کے دو بیٹے ابوالحسن علی اور ابوالعباس مأمون دوم اس کے جانشین ہوئے۔ ۵۴۰۱/۱۱۱۰-۱۱۱۱ء کا ایک کتبہ (جو گرگانج [رک بان] کی ایک عمارت کی تکمیل سے متعلق ہے) مأمون دوم ہی کا ہے۔ اس میں اس نے اپنے آپ کو خوارزم شاہ کے لقب سے منسوب کیا ہے۔ مأمون اور محمود غزنوی کی گفت و شنید [رک بہ غزنویہ] اور مأمون دوم کے اپنے سپاہیوں کے ہاتھوں قتل (جمہر رشید، ۱۸۱) سوال ۵۳۷۷/۲۰۰۰ء (راج ۱۰۱۷ء) کے بارے میں دیکھیے *Turkestan etc.* : W. Barthold، ۲ : ۲۸۹ بعد، جو البیہقی، طبع Morley، ص ۸۳۸ بعد، بر مبنی ہے۔ مأمون دوم کا نوجوان بھتیجا ابوالحارث محمد بن علی اس کا جانشین منتخب ہوا، لیکن صفر ۵۴۰۸ء جولائی ۱۰۱۷ء تک خوارزم کو محمود کی سلطنت میں شامل کر لیا گیا [زین الاخبار، طبع برلن، ص ۷۳ : البیہقی، ص ۸۳۸ ص ۱۲ : دیکھیے دیوان عنصری، طبع تہران، ۱۳۰۰ : محمد بن ارسلان : تاریخ خوارزم، در سبکی،

میں اس کی وفات تک خوارزم شاہ کہا گیا ہے۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ناصر الدین سلطان ابراہیم خوارزم شاہ بنا [مطلع سعدین، ۲: ۲۳۸، ۵۶۹] جسے ابو الخیر کی سرکردگی میں اوزبکوں نے ۵۸۳/۱۱۳۱ء کے قریب دارالحکومت سے نکال دیا (رک بہ ابو الخیر) [نیز مطلع سعدین، ۲: ۶۳۳]۔

تاریخی دستاویزات اور ادبی تصنیفات میں بعض اوقات خوارزم شاہ کا لقب خبیوہ کے اوزبک حکمرانوں کے لیے بھی استعمال ہوا ہے، گو بظاہر انہوں نے خود کبھی اس پر اپنا حق نہیں جتایا۔ ابو الغازی [رک بہ ابو الغازی بہادر خان] خوارزم شاہ کا لقب صرف اس خاندان کے لیے استعمال کرتا ہے جسے مغول نے تباہ کیا تھا (طبع Desmazières، ص ۱۳۷) اس کے علاوہ وہ (ص ۲۷۷) خوارزم شاہ کا کلمہ صرف اپنے ایک بھائی کے لیے استعمال کرتا ہے اور وہ بھی اس کے ذاتی نام کے طور پر۔ جب ابو الغازی کے بیٹے اور جانشین آٹوشہ (۱۶۶۳-۱۶۸۷ء) نے مشہد کی فتح کے بعد شاہ کا لقب اختیار کیا تو اس نے بھی اپنے لقب کے ساتھ خوارزم کے لفظ کا اضافہ نہ کیا۔

مآخذ: (۱) میر خواند: [روضۃ الصفاء]، طبع Defrémery، بعنوان *Histoire des sultans du Khwarezm* پیرس ۱۸۳۲ء: (۲) الجوبینی: تاریخ جہانکشی، ج ۲ (سلسلۃ یادگار گب، ۲/۱۶۶)؛ (۳) Barthold: *Turkestan etc.* باب ۳: [(۴) الیرونی: کتاب الجماہر، حیدرآباد دکن ۱۳۵۵ء، ص ۸۷، ۱۶۳ (۲۰۵ بعد ۲۱۰، ۳۵۵)؛ (۵) وطواط: دیوان عربی، تصحیح سخاۃ اللہ، در کتابخانۃ دانشکاد پنجاب و دیوان فارسی (اقتباسات در دیباچۃ حنائی السحر)؛ (۶) بہاء الدین محمد بن مؤید بغدادی: التوسل الی التوسل، تہران ۱۳۱۵ھ]۔

(W. BARTHOLD)

لیکن اس کی سلطنت سے باہر خود محمد کو بھی لوگ خوارزم شاہ ہی کہتے رہے (دیکھیے یا قوت: معجم، ۱: ۲۳۹، ص ۲۱ [جہاں نسب نامہ خوارزم شاہان میں دو غلطیاں ہیں]؛ ۳: ۲۳۳، ص ۱۳: چنگیز خان کے ساتھ محمد کے تعلقات اور اس کے نتیجے کے طور پر اس کی سلطنت کی بربادی کے بارے میں قب مادۃ چنگیز خان، جلال الدین اور اس خاندان کے آخری زوال [۵۶۲۸/۱۱۳۱ء] کے لیے رک بہ جلال الدین خوارزم شاہ)۔

مغول کے ماتحت خوارزم کے والی بظاہر اس لقب سے مقرب نہ تھے۔ یہی بات صوفی خاندان کے امرا کے بارے میں کہی جاسکتی ہے، جن کی خود مختار حکومت بہت قلیل مدت کے لیے (یعنی ۵۷۸/۱۱۳۷ء تک) قائم رہی۔ اس بات کا کوئی اسکاں نہیں کہ اس خاندان کی بنیاد ۵۶۲/۱۱۳۶ء سے قبل یا ۵۶۵/۱۱۳۶ء کے بعد رکھی گئی ہو! قب Bull. de l' Acad، ۱۹۲۱ء، ص ۲۱۲-۵۷۸/۱۱۳۷ء میں تیمور نے خوارزم فتح کر لیا، لیکن بعد کے زمانے میں خوارزم کے اس گھرانے کے کئی والیوں کا ذکر ملتا ہے، مثلاً چین صوفی، جس کے ماتحت اوزبکوں نے ۵۹۱/۱۱۵۰ء میں ملک فتح کیا تھا اور شریف صوفی، جس نے بقول حیدر رازی [رک بہ حیدر بن غنی حسینی رازی] خوارزم پر قلیل عرصے کے لیے حکومت کی (بارٹولڈ: *Sytedientya ob Aral' skam*، Morie, etc. ص ۷۸۹ جرمن ترجمہ *Nachrichten über den Aral-See etc.* ص ۵۸، پر متعلقہ بیان حذف کر دیا گیا ہے)۔ اس کے مقابلے میں مجبلی فصیحی (مخطوطہ، جو پہلے ادارۃ السنۃ شرقیہ *Institute for Oriental Languages* کی ملکیت تھا [قب *Scientifiques, etc.*، ۱۱۱: ۳، بعد] اور اب موزہ ایشیای *Asiatic Museum*) میں ہے، ص ۷۳ میں امیر شاہ ملک کو، جسے شاہ رخ بن تیمور نے خوارزم کا والی مقرر کیا تھا، اواخر ۵۸۲۵/۱۱۸۱۳ء سے ۵۸۲۶/۱۱۸۲۹ء

* الخوارزمی: ابو عبد اللہ محمد بن احمد بن یوسف

(المقریزی: خط، بولاق، ۱۲۷۰ء، ۱: ۳۵۸ میں اسے

الخوارزمی کی مفتاح العلوم کا ذکر کیا ہے (History of Muslim Philosophy ۱: ۱۲۵۹)۔

مآخذ: (۱) براکمان: ۱: ۲۳۷: (۲) دوسرے

مقالے کے حصوں میں سے طب پر E. Seidel: Die

'Erlg. Medizin im Kitab Mafatih al-Ulüm

'S.B.P.M.S. ۱۹۱۵ء: ۱: ۳۷ تا ۷۹ بحث کی ہے: قب

نیز (۳) E. Wiedemann: Beiträge VI, Zur Mechanik

'u. Technik bei den Arabern' S.B.P.M.S. Erlg. در

Beiträge X, Zur (۴) ۱: ۵۶ تا ۳۸: ۱۹۰۷ء

'Technik bei den Arabern' u. ۱۹۰۶ء: ۳۸

Beiträge XIV, Über die Geometrie (۵) ۳۵ تا ۳۷

'u. Arithmetik nach den Mafatih al-Ulüm

Beiträge XVIII, (۶) ۱: ۶۳ تا ۸۰: ۱۹۰۸ء

'Astronomische Instrumente' u. ۱۹۰۹ء: ۳۱

Beiträge XXII, Stücke aus (۷) ۱: ۲۵ تا ۳۱

'den Mafatih al-Ulüm' u. ۱۹۱۰ء: ۳۲

Beiträge XXIV Zur Chemie bei (۸) ۱: ۳۲ تا ۳۷

'den Arabern' u. ۱۹۱۱ء: ۳۳ تا ۱۱۳

Beiträge XXVII Geographische stellen aus (۹)

'den Mafatih al-Ulüm' u. ۱۹۱۲ء: ۳۷ تا ۴۷

Beiträge XLVII Über die Astronomie (۱۰) ۱: ۴۷ تا ۵۶

'nach den Mafatih al-Ulüm' u. ۱۹۱۵ء: ۵۶

Beiträge LXVII, Definitionen (۱۱) ۱: ۲۳ تا ۲۷

verschiedener Wissenschaften und Über diese

'verfasste Werke' u. ۱۹۱۸-۱۹۱۹ء: ۵۱ تا ۵۱

Beiträge LXVI, Zur Geschichte (۱۲) ۱: ۲۲ تا ۲۷

'der Musik' ۱۹۲۲-۱۹۲۳ء: ۵۵ تا ۵۵

۷ تا ۲۲: (۱۳) الزرکلی: ۶: ۲۰: (۱۴) کشف الظنون

۱: ۱۵: (۱۵) المقریزی: الخطوط: ۱: ۲۵۸: (۱۶)

تجسم المطبوعات: ۱: عمود: ۸۳۹: (۱۷) History of

Muslim Philosophy: طبع محمد شریف: ۱۹۶۳ء

(E. WIEDEMANN)

البخاری کہتا ہے) [المکاتب، معجم] چوتھی صدی ہجری/

دسویں صدی میلادی کے نصف آخر میں گزرا ہے:

[سنہ وفات ۵۳۸ھ/۶۹۷ء] مسلمانوں کا قدیم ترین

دائرة المعارف اس کی تصنیف ہے یعنی مفتاح العلوم

(= علوم کی کنجیاں مرتبہ G. van Vloten، لاڈن ۱۸۹۵ء):

جسے اس نے سامانی بادشاہ نوح ثانی (۵۳۶ھ/۶۹۷ء تا

۵۹۷ھ/۶۹۷ء) کے وزیر ابوالحسن عبداللہ بن [احمد]

ابی العتبی کے نام سے معنون کیا تھا (نیشاپور میں وہ

اسی کے دربار سے منسلک تھا)۔ الخوارزمی کی پیدائش

غالباً بلخ میں ہوئی [اسی لیے اسے بلخی بھی لکھا جاتا

ہے، الزرکلی، ۶: ۲۰]۔ جیسا کہ خود اس کی تصنیف

سے ظاہر ہوتا ہے وہ حکومت کے کسی عہدے پر

فائز تھا۔ خراسان میں قیام کی وجہ سے اسے مشرق

کے حالات سے خوب واقفیت تھی۔ عرب اس کتاب کی

بڑی قدر و منزلت کرتے تھے۔ یوں بھی مختلف مباحث

کے متعلق معلومات کے لیے یہ کتاب بڑی قدر و قیمت

رکھتی ہے اور مصنف نے ان پر بالاستیعاب قلم اٹھایا

ہے۔ [المقریزی نے اسے 'جلیل القدر' کتاب قرار دیا ہے]۔

ریاضیات وغیرہ میں الخوارزمی [کی وسعت مطالعہ

کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس نے] بلاشبہ یونانی

مصنفین مثلاً اقلیدس نکوما کوئی ہیرو اور فلو وغیرہ

سے بھی استفادہ کیا ہے۔

یہ تصنیف دو مقالوں میں منقسم ہے۔ مقالہ اول

میں شریعت اور اس سے متعلق علوم، فقہ، کلام، عروض،

تاریخ اور دوسرے میں فلسفہ، منطق، طب، حساب،

ہندسہ، ہیت، موسیقی، حیل (الحیل خاص ایجادات)

اور الکیمیا سے بحث کی گئی ہے۔ [فان فلوتن نے اسے

لاڈن سے ۱۸۹۵ء میں شائع کیا] ڈاکٹر نفیس احمد

سے سائنسی جغرافیے کے تحت چوتھی صدی ہجری/

دسویں صدی میلادی کے بیان میں لکھا ہے کہ جغرافیہ

وغیرہ علوم میں اتنی بلند پایہ ذہنی بیداری کا کوئی

نشان اس عہد سے پہلے نہیں ملتا اور اس سلسلے میں

ان تصنیفات کا تعلق اس زمانے سے ہے جب ابھی یونانی علوم و فنون کے ترجموں کا دور دورہ شروع نہیں ہوا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ الخوارزمی کی زندگی کا کچھ حصہ الحجاج کی معاصرت میں گذرا۔ یہی وجہ ہے کہ جبر و مقابلہ میں اس نے جو خدمات سر انجام دیں ان میں زیادہ تر ہندوؤں، ایرانیوں اور مدرسہ جندی شاپور کی تصنیفات سے کام لیا گیا ہے۔ یونانی مآخذ کی حیثیت اس کے لیے ثانوی تھی۔ البتہ ہیئت اور جغرافیہ میں شاید صورت حالات قدرے مختلف ہے۔ الخوارزمی کی تصنیفات کا ذکر یعقوب النذیم کی الفہرست (ص ۲۷۵) اور ابن القفطی (ص ۲۸۹) میں موجود ہے۔ الفہرست میں الخوارزمی کے فوراً بعد سند بن علی کا ذکر آتا ہے۔ لہذا کارپینسکی Karpinski (کتاب مذکور) کو یقین تھا اور الحساب الہندی، الجمع والتفریق اور الجبر والمقابلہ جنہیں سند سے منسوب کیا گیا، دراصل خوارزمی ہی کی تصانیف ہیں۔

ریاضیات میں اس کی اہم ترین تصنیف، حساب الجبر والمقابلہ (J. Ruska کی رو سے Processes of Calculation for Integration and Equation) ہے لیکن ان معنوں میں نہیں جو ہمارے نزدیک جبر و مقابلہ کے ہیں بلکہ اطلاق (applied) حساب کا ایک مقدمہ، جس کی بنا متعدد حل شدہ مثالوں پر رکھی گئی۔ علاوہ ازیں اس تصنیف میں طرح طرح کی معلومات شامل ہیں۔ (۱) تکمیل (Integration) اور مساوت کا عمل، مساوات کی سادہ ترین شکلیں؛ (ب) پیدائش اور مساحت؛ (ج) ورثوں کی ازروئے وصیت تقسیم کے قواعد۔ لاطینی میں اس کتاب کا ترجمہ G. of Cremona اور R. of Chester وغیرہ نے کیا (دیکھیے مآخذ Rosen اور Karpinski کے تحت)۔ لیکن غلط فہمیوں کی وجہ سے اور الخوارزمی کے تلفظ کے بگڑنے کے سبب طرح طرح کے الفاظ وضع ہونے لگے جن کی انتہا بالآخر الگورزم "algoriam" پر ہوئی یعنی حساب لگانے کا کوئی متوالی طریقہ جو رفتہ

* الخوارزمی: [ابو عبد اللہ و ابو جعفر] محمد بن موسیٰ الطبری میں (طبع ڈھوبہ، ۲، ۱۳۶۳) الخوارزمی کو المجوسی (مجوسی کی اولاد) اور القطریلی دجلہ کے مغرب میں بغداد کے قریب خلع قطریلی باشندہ یا متوطن بھی لکھا گیا ہے [الفلك، الرياضی، المؤرخ]۔ اس کی زندگی کے حالات بہت کم معلوم ہیں اور جو معلوم ہیں وہ بھی معتبر نہیں کیونکہ اکثر صورتوں میں پتا نہیں چلتا کہ ان کا تعلق اس سے ہے یا محمد بن موسیٰ ابن شاکر سے (قب H. Suter: "die Mathematiker" Nachträge zur Abhandl. Zur Gesch der math. Wissensch ۱۹۰۲، جلد ۱۳، اشارہ ۱۹: ص ۱۵۸)۔ الخوارزمی کی تاریخ پیدائش بھی معلوم نہیں۔ تاریخ وفات بھی غیر قطعی ہے۔ سوتر کی رائے میں اس کا انتقال ۸۲۲/۸۲۵ اور ۸۲۳/۸۲۴ کے درمیان ہوا اور نالیو کے نزدیک ۸۲۳/۸۲۶-۸۲۷ کے بعد۔ الخوارزمی نے مامون کے عہد میں فروغ پایا۔ وہ اس کے ہیئت دانوں میں شامل تھا اور اس کے عہد خلافت میں جب زمین کے درجات کی پیمائش کی گئی تو اس میں شاید وہ بھی شریک تھا۔ مطالعے کا بیشتر وقت مامون کے کتب خانے میں گزارتا تھا۔ مامون نے اسے بولانی کتابوں کے جمع کرنے اور ان کے تراجم کروانے کا کام سپرد کیا تھا۔ الخوارزمی نے ریاضیات، جغرافیہ، ہیئت اور تاریخ میں خوب خوب محنت کی اور کتاب التاریخ کے نام سے ایک تصنیف مکمل کی، جس کا ذکر المسعودی نے بطور مآخذ کیا ہے اور جس سے غالباً الطبری نے عہد مامون ۸۲۵/۸۲۶ کے ایک واقعے کے متعلق اقتباس بھی لیا ہے (دیکھیے نالیو C. A. Nallino: al-Huwarizmi وغیرہ، ص ۱۲)۔ الخوارزمی کی تصنیفات بڑی اہم اور خود اس کی ذاتی تحقیقات کا نتیجہ ہیں جو اس کی حکیمانہ طبیعت اور لبوغ علم کا ثبوت ہیں۔

رفتہ قاعدے کی صورت اختیار کر لے۔

جہاں تک شرحوں کا تعلق ہے سنان بن فتح (Suter، عدد ۱۴۹)، عبد اللہ بن السید نانی (Suter، عدد ۱۵۲)، ابوالوفاء (Suter، عدد ۱۶۷) کے حوالے دیے جاتے ہیں۔ روزن Rosen نے ان کے علاوہ (کتاب مذکور، ص ۱۴) کسی المیزمی کا حوالہ بھی دیا ہے۔ الخوارزمی کی تصنیف سے نہایت گہرے اثرات مترتب ہوئے اور آگے چل کر ابو کامل شجاع بن اسام (Suter، عدد ۸۱) نے صاف صاف لفظوں میں اس سے استفادہ کیا (لا ۱ + لا ۳۹ اور اس قسم کی مثالیں بار بار دہرائی جاتی ہیں مثلاً ابو کامل النرخی، عمر الخيام اور عیسائی مصنفین لیونارڈ متوطن پيسا (Leonardo of Pisa) کی تصنیفات میں جو ظاہر ہے الخوارزمی سے متاثر ہوئے۔

حساب میں الخوارزمی کی ایک اور تصنیف ابھی تک محفوظ ہے مگر لاطینی ترجمے میں *Algorimi de Numeris Indosum* مرتبہ Bald. Boncompagni، در *Pubbl. da B.B. Nova Trattati d'arimatica* (۱۸۵۷ء)، رسکے J. Ruska کے نزدیک یہ کتاب *الجمع والتفریق* (غالباً ہیں "بحساب الہند" کے الفاظ کا اضافہ کر دینا چاہیے یعنی "ہندی نہج پر جمع اور تفریق کی کتاب" یا "ہندی رقوم کے ساتھ..." قب J. Ruska، کتاب مذکور ص ۱۸) کے بالکل مطابق ہے۔ محمد بن ابراہیم الفزاری نے سدھانتا کا ترجمہ عربی میں کیا تھا اور وہ سندھ ہند عظیم کے نام سے مشہور ہوئی (اور جس میں سدھانتا سے بحث کی گئی تھی قب ایچ سوتر *Die astronomischen Tafeln: H. Suter* وغیرہ ص ۳۲)۔ الخوارزمی نے سندھ ہند کے دو نسخے تیار کیے بلکہ اس سے پہلے شاید اس کا ملخص بھی۔ فلکی جدولوں کی جو کتاب اس طرح مرتب ہوئی، اس کا نام، جیسا کہ ابن ہونی کا قول ہے، الخوارزمی نے فی زیج رکھا (دیکھیے نالینو: *al-Battlenii Opus*؛ ۱۵۷)۔ زیجی تصنیفات کی طرح اس میں صرف جدولیں

ہی موجود نہیں بلکہ فلکیات سے بھی بحث کی گئی ہے۔ ابن ابی اصیغہ (۲: ۳۹) کا بیان ہے کہ جداول میں الخوارزمی کی اس زبردست تصنیف کو مسلمہ المجربطی نے از سر نو ترتیب دے کر پھر سے شائع کیا اور شاید یہی متن تھا جس کی اساس پر لاطینی میں اس کا ترجمہ ہوا۔ اس تصنیف میں مثالی جدولیں بھی موجود ہیں، جن میں لفظ جیب ہمیشہ *gaib* "djaib" کے لیے استعمال ہوا۔ حالانکہ ثابت ابن قرہ کے یہاں اس کا حوالہ کبھی کبھی ہی ملتا ہے (قب *Axel Bjrnobs, Thabits: C. Kohl* اور *H. Burger* *Abhandl. zur Wesk über den Transversalsatz* در *Arch. und Medizin (Gesch. der Naturewiss* ۱۹۲۴ء)۔ لہذا بہت ممکن ہے الخوارزمی میں اس لفظ کا استعمال مسلمہ ہی نے کیا ہو (قب نالینو: *Al-Battlenii opus*؛ ۱: ۱۵۴)۔ الخوارزمی نے انی کسی دوسری تصنیف میں شاید رؤیت ہلال سے بھی بحث کی ہے (قب نالینو: کتاب مذکور، ۱: ۲۶۹)۔ یاقوت نے (معجم، ۱: ۱۶۱، سطر ۱۰) جسامت زمین کے متعلق ایک بیان کے سلسلے میں محمد بن موسیٰ الخوارزمی کو صاحب الزیج (کتاب الجداول کا مصنف) کہا ہے لیکن زیج میں ایسا کوئی بیان نہیں ملتا۔ الخوارزمی نے دو کتابیں اصطراب کے بارے میں بھی مدقن کیں: کتاب العمل بالاصطراب ("اصطراب کا طریقہ استعمال") اور کتاب عمل الاصطراب ("اصطراب سازی کا فن") مگر ان میں سے کوئی بھی محفوظ نہیں نہ عربی میں اور نہ لاطینی میں۔ الفرغانی کی کتاب فی صنعت الاصطراب بالہندسہ ("اصطراب سازی ہندسہ کی مدد سے") نسخہ برلن، فہرست شمارہ ۵۷۹) میں کئی فلکی مسائل اصطراب کی مدد سے حل کیے گئے ہیں اور اس کا یہ حصہ ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے "محمد بن موسیٰ الخوارزمی کہتا ہے..." (قب *Die Verwendung des Astralabs nach: J. Frank*)

اور افریقہ سے متعلق حصے قریب دے کر اس کے ترجمے کے ساتھ تشریحات کا اضافہ بھی کر دیا ہے۔
 Mitt. d. K.-K. geogr. Gesellsch. in Wien) ۱۹۱۵ء،
 ۳۸: ۱۵۲ بعد اور (Denkschr. Ak. Wien) حصہ فلسفہ،
 ۱۹۱۶ء، ج ۵۹، عدد ۴) اور الخوارزمی کے بیانات کے مطابق ایک نقشہ بھی تیار کیا ہے (قب J. Ruska: Neue Bausteine zur Geschichte der arabischen Geographie, Geogr. Zeitschr. ۱۹۱۸ء، ۲۴: ۷۷ تا ۸۱)۔

مآخذ: (۱) ابن النديم: الفہرست، ص ۲۷۷: (۲) ابن الفطی: تاریخ الحکماء، ص ۱۸۷: (۳) کشف القنون، ص ۵۷۹: (۴) المسمودی: التنبیہ والاشراف، ص ۱۵۷: (۵) حمزة: تاریخ سنی سلوک الارض، ص ۱۲۱: (۶) الزر کلی، ص ۳۳۷: (۷) معجم المطبوعات، عمود ۸۳۱: (۸) براکلمان: تکملة، ۱۳۸۱: (۹) H. Suter: Die Mathematiker und Astronomen der Araber und ihre Werke، عدد ۱۹، در Zeitschrift für Mathematik und Physik، ۱۹۰۰ء، ج ۱۰، عدد ۱۹، اور خصوصاً تکملة: وہی کتاب، ۱۹۰۲ء، ۱۳: ۱۵۸ تا ۱۶۰: (۱۰) M. Cantor: Vorlesungen zur Geschichte der Mathematik، ۱۹۰۷ء، ج ۱، ۷۰: بعد: اور تاریخ ریاضیات سے متعلق دوسری تصانیف: (۱۱) The Algebra of Mohammad ben Musa، طبع و ترجمہ از Fr. Rosen، ۱۸۳۱ء، ج ۱۶، ترجمہ: ص ۲۰۸، متن: ص ۱۲۲: Robert of Chester's Latin Translation (۱۲): of the Algebra of Al-Khwarizmi، طبع L. Ch. Karpenski: University of Michigan Studies، Humanistic Series، نیویارک ۱۹۱۵ء، ج ۵۱: (۱۳) Zur ältesten arabischen Algebra u. Rechenkunst، در S.B. Ak. Heid، ۱۹۱۷ء، عدد ۲: ص ۱۲۵، اور جائزہ از E. Wiedemann، در Berliner Philologische Wochenschrift، ۱۹۱۹ء، ۳۹: ۳۸ تا

Abhandlungen zur Gesch. der Naturwiss. und Medizin، ۱۹۲۲ء، ۳: ۱ تا ۳۲: نیز دیکھیے نالینو: کتاب مذکور، ۱: xlix)۔
 دھوپ گھڑیوں کے متعلق الخوارزمی کی کتاب اثرخاتہ کے متعلق ہیں اس کے سوا اور کچھ معلوم نہیں کہ اس نے اس قسم کی ایک کتاب تصنیف کی۔

الخوارزمی نے نجوم کے بعض مسائل پر عملی پہلوؤں سے قلم اٹھایا، مثلاً ابومعشر کے بیان کردہ ایک قصے کے ماتحت اس نے اس امر کی تحقیق کی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت مبارک کے وقت کواکب کے قرائنات سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آئندہ نبوت کے متعلق کہاں تک پتا چل سکتا تھا (حمزة الاصمغانی: تاریخ، طبع Lib. Gottwaldt، ج ۷، باب ۴، متن: ص ۱۵۳، بعد، ترجمہ ص ۱۲۳)۔

المأمون کے ایما پر الخوارزمی نے، شاید بعض دوسرے علما سے مل کر، افلاک اور شجرۃ ارض کے نقشوں کی ایک اٹلس بھی تیار کی تھی۔ کتاب صورة الارض، جس کا نسخہ سٹراس برگ Strassburg میں محفوظ ہے یا جیسا کہ ابوالفداء اسے کتاب رسم الربع المعمور (کرۃ ارض کے آباد حصے کے نقشوں کی کتاب) کہتا ہے، اسی سے تعلق رکھتی ہے اور نالینو یہ ثابت کر چکا ہے کہ یہی وہ متن ہے جو نقشوں کے ساتھ ملحق تھا۔ نقشوں (دولوں نسخوں) کی تیاری میں اگرچہ بطلمیوس کی Geography پیش نظر تھی مگر اس کی ترتیب اس نے اپنے انداز میں کی اور اس میں نئے اور مستقل اضافے بھی کیے۔

کتاب مذکور کا ایک نسخہ نالینو نے اطالوی زبان میں مرتب کیا اور اس کے جغرافیائی مواد کے متعلق، بالخصوص اسی مواد کے حوالے سے جو بطلمیوس میں ملتا ہے، بڑی تحقیق و تفتیش سے کام لیا ہے۔ H. von Mzik نے بھی اس کتاب پر مکمل بحث کی ہے

خیال تھا کہ شیانی کی بلغار کو روکا جائے، بدیع الزمان اور اس کے بھائی اور شریک بادشاہت مظفر نے خواند امیر کو ہدایت کی کہ وہ قندھار جائے اور شاہ بیگ ارغون کو ترغیب دے کہ وہ ان سے مل جائے۔ صرف ہرات تک پہنچا تھا کہ بدیع الزمان کی بیٹی جو بیگ بیگم کی موت کی وجہ سے دیر ہو گئی اور خود شیانی کے قریب آ جانے کی وجہ سے بھی وہ قندھار نہیں گیا۔ ایک بار وہ ایک بے نتیجہ سفارت پر خسرو شاہ کے پاس گنڈز بھی گیا۔ شیانی کا مقابلہ کرنے کے لیے سرل کے مقام پر ایک کمزور سی کوشش کی گئی، مگر شہزادے بھاگ کھڑے ہوئے اور بہادر ذوالنون ارغون قتل کر دیا گیا۔ مارچ ۱۵۰۷ء میں ہرات پر حملہ ہوا اور خواند امیر اور اس کے بھتیجے عثمان کو، جو شہر کا محتسب تھا، شہر کے باشندوں نے شیانی سے اس کے پڑاؤ میں ملاقات کرنے اور ہتیار ڈال دینے کی شرائط معلوم کرنے کی خدمت سپرد کی۔ عثمان شیانی سے ملاقات کرنے میں کامیاب بھی ہوا، اگرچہ راستے میں اس کے کپڑے چھین لیے گئے اور اس کو لوٹ لیا گیا۔ خواند امیر ہرات پر دشمن کا قبضہ ہو جانے کے بعد وہیں رہا۔ اس نے بہت دلچسپ طریقے سے بیان کیا ہے کہ کس طرح اس سے اور اس کے دوستوں سے ازبکوں نے زبردستی روپیہ وصول کیا۔ وہ اس وقت بھی ہرات میں تھا جب کہ بادشاہ اسماعیل صفوی اول نے شیانی کو شکست دی اور اسے قتل کر کے ۱۵۱۰ء میں شہر پر قبضہ کر لیا۔ ۸۹۲ھ/۱۵۱۳ء میں ہم خواند امیر کو گرجستان کے پشت یا پشت نامی گاؤں میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتے پاتے ہیں۔ یہ مقام شمالی ایران میں ہے (نہ کہ گرجستان میں جیسا کہ Elliot نے لکھا ہے: قب Sacy پر گرجستان، در Mines de l' Orient ۱: ۳۲۱)، جہاں وہ تصنیف و تالیف کے کام میں مشغول رہا۔ پھر اس نے محمد زمان کی، جو اس کے پرانے آقا کا سب سے بڑا بیٹا تھا

Die astronomischen Tafeln : H. Suter (۱۴) : ۵۲
'des Muhammed ben Musa al-Khwarizmi وغيره' کوپن ہیگن ۱۹۱۳ء در Kgl. Danske Vidensk. Selsk.
'Skriptor' سلسلہ ۷، 'Historisk af filosofisk Afd.' : ۱۱۳
(۱۵) مثلی جدولوں کو A.A. Bjørnbo Al-Chwarizmi's :
'trigonometriske Tavler' در Festschrift til H.G.
'Zeuthen' کوپن ہیگن ۱۹۰۹ء میں شائع کیا گیا : (۱۶)
Al-Huwarizmi ell suo rifacimento della geografia
Memorie della Classe di Science در di Tolomeo
morali وغيره ۱۸۹۴ء : ۲ : الف : (۱۷) نالینو
C. A. Nallino نے الیٹانی کی کتاب کے اپنے ایڈیشن میں
الخوارزمی کے متعلق خاصی معلومات دی ہیں (قب اشارہ)۔
(E. WIEDEMANN)

* **خواند امیر :** ایرانی مؤرخ، نام غیاث الدین! وہ خواجہ ہمام الدین بن خواجہ جلال الدین بن خواجہ برہان الدین محمد شیرازی کا بیٹا تھا۔ مؤرخ میر خواند [رک یان] اس کا نانا اور نظام الدین سلطان احمد صدر ماموں تھا۔ اس کا باپ برسوں سمرقند کے سلطان محمود کا، جو بابر کا چچا تھا، وزیر رہا۔ خواند امیر کی پیدائش تقریباً ۱۴۷۵ء میں ہوئی ہوگی اور غالباً ہرات میں، جہاں اس کے نانا رہا کرتے تھے۔ خفت اقلیم میں اس کا مولد بغارا بتایا گیا ہے۔ اس کے نانا میر خواند کے بارے میں بتا چلتا ہے کہ وہ دراصل بلخ کے رہنے والے تھے۔ خواند امیر سلطان حسین کے سب سے بڑے بیٹے بدیع الزمان کی ملازمت میں داخل ہوا، ۱۵۰۲ء میں وہ اس کے ساتھ ہل چراغ میں تھا اور بدیع الزمان سے اس نے وہ واقعات سنے جو پانچ چوبیس سال پہلے بدیع الزمان کو خواند امیر کے والد سے شکست کھانے کے بعد پیش آئے تھے۔

سنی ۱۵۰۶ء میں سلطان حسین کی وفات کے بعد خواند امیر بدیع الزمان کے ساتھ شمالی ایران میں مرل کے مقام پر تھا۔ ۱۵۰۷ء کے موسم بہار میں، جب کہ

جس کے کتاب خانے سے اس نے ضروری مواد فراہم کیا تھا۔ یہ لوجوانی کی تصنیف ہے، اس لیے اس میں فطری طور پر بہت کم مواد ایسا ہے جو اس نے ذاتی معلومات کی بنا پر قلم بند کیا۔ دراصل یہ حبیب السیر کا ابتدائی خاکہ ہے، مگر بعض مقامات پر مثلاً یادگار محمد کی گرفتاری اور اس کے قتل کا بیان ہند کی تصنیف یعنی حبیب السیر سے بھی زیادہ مفصل ہے۔ خواند امیر کی گراں قدر تصنیف (اور صرف وہی شائع بھی ہوئی ہے) حبیب السیر ہے۔ اس کی ابتدا ۱۵۲۱ء میں ہوئی اور اس کا بیشتر حصہ ۱۵۲۳ء - ۱۵۲۴ء میں لکھا گیا اگرچہ اس نے ہندوستان آنے کے بعد اس میں کچھ اور اضافے کیے۔ حبیب السیر، جسے یہ نام ایک دوسرے سرپرست حبیب اللہ کی نسبت سے دیا گیا ہے، عمومی تاریخ ہے، اس میں ابتدائے آفرینش سے اسماعیل صفوی اول کی زندگی کے اختتام [۱۵۲۳/۸۹۳۰ء] تک کے حالات درج ہیں؛ یہ تاریخ مصنف کے خود اپنے زمانے کے حالات کے لیے گراں قدر مآخذ ہے۔ کتاب کے سب سے مفید حصے وہ ہیں جو ہرات کے سلطان حسین [بایقرا] اور اسماعیل اول کی زندگی کے حالات پر لکھے گئے ہیں۔ غرضی طور پر اس نے شیانی اور بابر کے بارے میں بھی بہت اطلاعات بہم پہنچائی ہیں؛ مؤخر الذکر کے بارے میں اس نے جو کچھ لکھا ہے وہ بابر کی توڑک کے دو بڑے خلاؤں کو پر کرنے کا سب سے اچھا ذریعہ ہے۔ وہ غیر جانب دار اور صاحب اصول مصنف ہے۔ اس نے حبیب السیر کو مکمل کرنے سے پہلے اسے تین بار لکھا، اس نے جو کچھ لکھا، بہت صحت سے لکھا اور اکثر اپنے ذاتی علم کی بنا پر لکھا۔ اس میں نقاطی اور صنائع و بدائع کا استعمال بہت ہے، جیسے کہ اس کے ہم عصر حسین واعظ کی انوار سہیلی میں ہے؛ اس میں جگہ جگہ اشعار بھی درج کیے گئے ہیں۔ سلطان حسین اور اسماعیل صفوی کی وہ بہت تعریف کرتا ہے اور کہیں کہیں بے ضرورت پر گو اور

ملازمت اختیار کی اور کچھ دنوں تک بلخ وغیرہ میں اس کا شریک حال رہا؛ مگر جب محمد زمان قندھار جانے کی تیاری کر رہا تھا اس وقت خواند امیر نے پشت واپس جانے کی اجازت چاہی۔ وہ افغانستان میں بھی بہت عرصہ نہیں ٹھہرا اور مارچ ۱۵۲۸ء میں ہندوستان کا رخ کیا۔ آگرے پہنچ کر ماہ ستمبر میں بابر کی خدمت میں حاضر ہوا اور ۱۵۲۹ء میں، جب بابر ہنگال گیا، وہ بھی ساتھ تھا۔ تریموہی یا سرجو اور گنگا کے سنگم پر بھی وہ بابر کے ہمراہ تھا (حبیب السیر، طبع سنگی، ۲: ۸۴، جلد ۲ کے حصہ ۴ کا آخر)۔ بابر ۱۵۳۰ء کے آخر میں فوت ہو گیا اور اس کے بعد خواند امیر نے ہمایوں کی ملازمت اختیار کی اور اس کی عمارتوں اور منصوبوں پر ایک مذبحہ قصیدہ لکھا، جس کا نام قانون ہمایوں یا ہمایوں نامہ رکھا (اس کا ایک بخطوطہ موزے بریطانیہ میں محفوظ ہے)؛ اس کتاب کا حال کچھ اقتباسات کے ساتھ *History of India: Elliot*، ۵: ۱۱۶ پر درج ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ خواند امیر کا انتقال ۱۵۳۴ء/۸۹۴۱ء میں ہمایوں کی سبم گجرات کے دوران میں ہوا، مگر فرشتہ کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی موت گجرات سے واپسی پر عارضہ پیچش سے ہوئی۔ یہ واقعہ ۸۹۴۲/۱۵۳۵ء کا ہے۔ اس سال خواند امیر زندہ تھا اور اس نے اپنے ایک دوست اور ہم سفر شہاب الدین چہستان گو کی تاریخ وفات کہی تھی (قب بدائنی، ترجمہ Ranking، ۱: ۲۵)۔ خواند امیر کا انتقال غالباً ۱۵۳۵ء/۸۹۴۲ء یا ۱۵۳۶ء/۸۹۴۳ء میں ہوا۔ اپنی وصیت کے مطابق وہ دہلی میں نظام الدین اولیا اور امیر خسرو کی آخری آرام گاہوں کے قریب دفن ہوا۔ اس وقت اس کی عمر غالباً ساٹھ سال تھی۔

خواند امیر پر نویس تھا۔ اس کی پہلی تصنیف خلاصۃ الاخبار ہے، جو ۱۵۰۵ء/۸۹۹۹ء - ۱۵۰۰ء میں لکھی گئی اور علی شیر کے نام سے معنون ہوئی،

عقائد کے اعتبار سے اسمعیلیوں کی لزاری شاخ سے تعلق رکھتے ہیں اور آغا خان کے پیرو ہیں۔ یہ لوگ زیادہ تر سدرجہ ذیل علاقوں میں آباد ہیں: (الف) پاکستان: پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ، کشمیر، گلگت، ہنزہ، چترال، سندھ: (ب) بیارت: گجرات (کاٹھیوار)، بمبئی اور مغربی ساحل۔ برصغیر کے خوجوں کی تاریخ خاصی طویل ہے۔ اس کی تفصیلات کے لیے رک یہ اسمعیلیہ: نیز W Iranow: *Brief Survey of the Evolution of Ismailism* لاٹن ۱۹۵۳ء، ص ۱۹ بعد۔ ۱۹۲۱ء کی سرشماری کی رو سے برصغیر میں ان کی آبادی ساٹھ ہزار کے قریب تھی۔

پنجاب کے خوجے آغا خان کے پیرو نہیں اور ان کے مذہبی عقائد بمبئی کے خوجوں سے ملتے جلتے ہیں *Census of India* ۱۹۰۱ء: ۱۷: ۱۵۰ (بعد)۔ یہ بھی بمبئی کے خوجوں کی طرح ہندوؤں سے مسلمان ہوئے ہیں اور زیادہ تر تجارت پیشہ ہیں۔ وہ اپنا حساب کتاب ہندی میں کرتے ہیں اور ہندوانہ رسم و رواج کے پابند ہیں۔ پراجے بھی انہیں کے ہم عقیدہ ہیں۔ جن کی تعداد پنجاب میں چار ہزار کے قریب ہے۔ ان کی ابتدا حاجی سید صدر الدین سے ہوئی، جو پندرھویں صدی میلادی میں اسمعیلی عقائد کی تبلیغ کے لیے خراسان سے آئے اور ریاست بہاولپور کی بینکاری گوٹہ جی کے مقام پر گوٹہ گوریج میں مدفون ہیں۔ انہوں نے اپنے عقائد ہندوؤں کے سامنے ایسی شکل میں پیش کیے جو ان کی ہندوانہ روایات سے مناسبت رکھتے تھے۔ مشہور ہے کہ وہ دس اوتار کے مصنف تھے، جس میں وشنو کے اوتاروں کا سلسلہ اسلام سے اس طرح سلانا گیا ہے کہ پہلے نواوتار تو ہندو تھے اور دسویں اوتار (سنسکرت: نیش کلنگ کا بیہ داغ)، جن کے بارے میں ہندوؤں کا عقیدہ تھا کہ اس کا ظہور کسی آئندہ زمانے میں ہوگا، اسمعیلیوں کے امام غائب ہیں۔ پنجابی خوجے، برصغیر میں آغا خان کے پیرو نیز

طوالت پسند ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ معد زمان کی مہموں کی تھکا دینے والی تفصیلات لکھتا چلا جاتا ہے۔ حبیب السیر تہران اور بمبئی میں چاپ سنگی میں طبع ہوئی۔ خوائد امیر روضۃ الصفا مصنفہ میر خوائد کی ساتویں جلد کا بھی مصنف ہے۔

مآخذ: (۱) *History of India*: Elliot ج ۳ و ۵: (۲) *Vie de Sultan Hosséin Baikara*: H. Ferte (۳) *traduite de Khondémir*: A.S. (۴) (۱۸۹۸ء): (۵) *Babür Nama*: Beveridge ترجمہ ترک بابری (۶) *Asiatic Miscellany* ج ۱: (۷) *F.B. Charmoy*: *Mem de l'Academie imperiale de Saint-Petersbourg* سلسلہ ۶ ج ۳ و ۸: (۸) *Quatneinere*: *des Sarvants* ۱۸۸۳ء ص ۳۸۶ تا ۳۹۴ (۹) *Etou*: *Cat. of Persian Mss.* ۱۸۸۱ء بعد۔

(H. BEVERIDGE)

* **خوجین**: (Chocim) یسریا کے ایک ضلع کا صدر مقام، جو اس لیے تاریخی شہرت کا حامل ہے کہ یہاں سلطان عثمان غنی نے ستمبر ۱۲۰۳ء/۱۲۲۱ء میں پولستانیوں کی مضبوط لشکرگاہ پر شدید حملہ کیا تھا، جو ناکام رہا تھا۔ ۱۲۰۸ء/۱۲۲۳ء میں خراج کے نواح میں دوبارہ جنگ ہوئی۔ گو اس وقت ترکوں کو بظاہر کامیابی نہ ہوئی لیکن آخر کار ۱۲۶۳ء کے اوائل میں پولستانیوں نے یہ شہر ترکی اقواج کے حوالہ کر دیا۔ ۱۱۸۲-۱۱۸۳ء/۱۲۶۹ء میں بھی روسیوں نے شہر کا محاصرہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا، لیکن بعد میں پھر ترکوں کے قبضے میں آ گیا۔ ۱۲۸۸ء میں بھی یہی عمل دہرایا گیا۔ ۱۸۰۶ء میں انہوں نے شہر پر دوبارہ قبضہ کر لیا اور ۱۸۱۲ء میں روس کو تفویض کر دیا۔

(ادارہ)

* **خوجہ**: (فارسی: خواجہ)، [برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کا ایک فرقہ، جس کے اکثر افراد

بمبئی کے خوجوں کے یہاں پیر صدر الدین سے پہلے کے ایک مبلغ ٹورسٹ گز یا پیرسٹ گزٹور کے متعلق یہ روایت چلی آتی ہے کہ وہ بارہویں یا تیرہویں صدی عیسوی میں گزرا ہے۔ ۱۵۹۴ء کے قریب ان کے امام آغا عبدالسلام نے ہندوستانی خوجوں کی ہدایت کے لیے فارسی زبان میں ایک کتاب ہند ناد جوائنوردی لکھی، جس کے قدیم سندھی نسخے کو چھپیسویں خوجہ پیر یا ول کا درجہ دے کر قابل تعظیم و تکریم سمجھا جاتا ہے۔

بمبئی کے خوجوں کے یہاں شادی، طلاق اور تجہیز و تکہیز کی رسوم عام اسلامی دستور اور شریعت سے مختلف ہیں۔ ان کی شادی کی رسوم پر قدیم ہندو واتہ رنگ غالب ہے۔ نکاح کی مخصوص رسم زمانہ حال تک سنی قاضی ادا کیا کرتے تھے۔ گجراتی زبان میں شادی کی ایک سند دی جاتی ہے، جس کے چاروں کونوں پر چار بڑے فرشتوں، یعنی جبرائیل، اسرافیل، عزرائیل اور میکائیل کے نام لکھے ہوتے ہیں۔ جماعت کی اجازت کے بغیر طلاق نہیں دی جاسکتی، تاہم بالعموم پہلی بیوی کے گزارے کے لیے دو ہزار روپے جمع کر دینے پر اس کی اجازت مل جاتی ہے۔ ایک عجیب رسم، جو مرتے وقت ادا کی جاتی ہے، ”سَر چھاننا“ ہے، یعنی مقدس پاؤں کا چھڑکنا اور اس کے ساتھ کتاب دس اوتار کی تلاوت۔

اس جماعت کی تنظیم میں مالی اعتبار سے آغا خان کی مقدس ذات کو مرکزیت حاصل ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی انتظامی امور میں کامل جماعتی آزادی حاصل ہے۔ ہر جماعت کا اپنا علیحدہ ”جماعت خانہ“ ہوتا ہے، جو مجلس اور مسجد دونوں کا کام دیتا ہے۔ اس کے عہدیدار ”نکھی“ (نکھیہا، خازن و صدر) اور ”کامپریہ“ (معتد، محاسب) کہلاتے ہیں۔ اکثر انہیں منتخب کیا جاتا ہے، لیکن بعض اوقات خود آغا خان بھی انہیں نامزد کرتے ہیں۔ امام کے لیے نذرین الہی کی وساطت

مشرق افریقہ کے اسمبلی آج تک دس اوتار اور صدر الدین کی مناجات دونوں کتابیں استعمال کرتے ہیں۔ عملی ہدایت کے لیے پنجابی خوجے قادریہ اور چشتیہ فرقوں کے درویشوں اور دوسرے پیروں کی طرف رجوع کرتے ہیں، اگرچہ یہ ضروری نہیں کہ ان کے اور ان کے عقائد یکساں ہوں۔

صوبہ بمبئی کے خوجوں اور مشرق افریقہ میں ان کی شاخوں کی تنظیم ایک فرقے کی حیثیت سے بہت بہتر ہے اور ان لوگوں کا آغا خان سے براہ راست تعلق ہے۔ ان کے مذہبی خیالات دراصل وہی ہیں جو پنجاب کے خوجوں کے ہیں، لیکن ان کے درمیان امام وقت آغا خان کی موجودگی نے انہیں مسلمانوں کے مذہبی سلسلوں کے اثر سے دور کر دیا ہے۔ وقتاً فوقتاً کچھ لوگ ان کی صفوں سے علیحدگی اختیار کرتے رہے ہیں، لیکن خاص طور پر یہ بات انیسویں صدی عیسوی کے ساتویں عشرے میں وقوع میں آئی جبکہ ان کی ایک جماعت نے یہ کوشش کی کہ پوری برادری کے سنی ہونے کا اعلان کر دیا جائے۔ ۱۹۰۱ء میں ان کی ایک قلیل تعداد نے مغربی طریقے پر تعلیم یافتہ افراد کی قیادت میں اثنا عشری (رک بان) شیعہ ہونے کا اعلان کیا۔ ان لوگوں نے بمبئی میں اپنی ایک الگ مسجد اور ایک علیحدہ قبرستان (جو آرام باغ کہلاتا ہے) بنا لیا ہے، لیکن بمبئی کے خوجوں سے انہوں نے اپنا معاشرتی تعلق برقرار رکھا ہے۔

خوجے زیادہ تر رواجی قانون کے پابند ہیں۔ بمبئی کی عدالت عالیہ کے ایک فیصلے (۱۸۳۷ء) کی رو سے ان پر اسلامی قانون وراثت کا اطلاق نہیں ہوتا، چنانچہ ہندو قانون کی طرح ان کے یہاں بھی عورتیں نوری وراثت کے حق سے محروم ہیں (مقدمہ سرجن میر علی: قس Cases Illustrative : Sir Erskine Perry

of Oriental Life and the Application of English Law

to India (نڈن ۱۸۵۳ء ص ۱۱۰)۔

۱۹۰۳ء 'A brief History of the Aga Khan' (ایک باریکی کی غیر تفیدی تصنیف) : (۲) S. Nandjiani : (Chōdjā Vrīstānt) احمد آباد ۱۸۹۲ء (مؤید تحقیقات کے منظر عام پر آنے سے قبل ایک خوجے کی تصنیف) : (۸) میرزا محسن قانی : دبستان مذاہبہ کلکتہ 'بدون تاریخ' ص ۳۸۸ بعد (مترجمہ D. Shea و Anthony Troyer) پیرس ۱۸۳۳ء : ۲ : ۳۹۷ تا ۴۵۱)۔

(عبدالله يوسف علی)

* خوجہ افندی : سعد الدین بن حسن جان بن

حافظ محمد بن حافظ جمال الدین الاصفہانی، معروف بہ خوجہ (سعد الدین) افندی، ایک مشہور ترکی مؤرخ اور شیخ الاسلام۔ اس کی ولادت ۵۹۳ھ/۱۵۳۶ء - ۱۵۳۷ء میں استانبول میں ہوئی۔ اس کا والد حسن جان ایران سے نقل وطن کر کے یہاں آ گیا تھا اور اس نے سلطان سلیم اول کے عہد کے آخری سات سال میں اس کے حاجب کی حیثیت سے خدمات سر انجام دی تھیں۔ حسن جان نے اپنے بیٹے کو سلطان موصوف کی زندگی کے متعلق طرح طرح کی باتیں سنائی تھیں، جنہیں سعد الدین نے سلیم نامہ کی صورت میں تالیف کیا اور پھر اسے اپنی مشہور تاریخ میں بطور ضمیمہ شامل کر لیا (۲ : ۳۲۱ تا ۳۰۱)۔ قتب Türk. Hss. Berlin : Pertsch، ص ۲۸۱، عدد ۲۱۳ : Die ... Hss. ... in Wien : Flügel، ۲ : ۲۱۰، عدد ۲۸۷ : اس پر J. V. Hammer، در G. O. R، ۲ : ۷۱، ۱۰ : ۳۳۳ و ۹ : ۲۰۳ : ۵۹ : قز وہی مصنف : Lettere sui east orientali، در Bibliotheca italiana، ج ۳۲ [۱۸۲۶ء] : سلیم نامہ کا جرمن ترجمہ [بلا مقدمہ]، از H.F.V. Diez : Denkwürdigkeiten aus Asien، ۱ : ۲۵۶ تا ۳۰۲، برلن ۱۸۱۱ء)۔ سعد الدین نے فقہ کی تعلیم حاصل کی اور جلد ہی ممتاز علما میں شمار ہونے لگا۔ ۵۹۶ھ/۱۵۵۵ - ۱۵۵۶ء میں مشہور فقیہ ابو السعود (رگ پان) کا ملازم ہوا، معرم ۹۸۱ھ/۱۵۷۳ - ۱۵۷۴ء میں وہ ولی عہد مراد کا، جو اس وقت مغربیہ کا والی تھا،

سے جمع کی جاتی ہیں۔ یہ نذرین ڈسٹنڈہ (- عشر) کے علاوہ ایسی رقوم پر مشتمل ہوتی ہیں جو ہر سال مقررہ اوقات پر، مثلاً نوجندی کے موقع پر اور بعض اوقات ولادت، نکاح اور تہیز و تکفین کی رسوم کے موقعوں پر ادا کی جاتی ہیں۔ سولہویں صدی عیسوی میں مومنوں کی جماعت سے علیحدگی ڈسٹنڈہ کی ادائی کے سوال ہی پر ہوئی تھی۔

آغا خان کے جو بیرو ایران، وسط ہند یا شمال مغربی ہمالیہ کی سرحد پر رہتے ہیں ان کی تنظیم کے بارے میں ہمیں بہت کم علم ہے۔ جہاں تک عقیدے کا تعلق ہے وہ اسمعیلیوں کی نزاری شاخ کے مذہب کے پابند ہیں (رگ بہ اسمعیلیہ) عرب اور مصر کے مستعابوں اور ہندوستانی بوہروں (جو انہیں کی نسل سے ہیں) کے عقائد ان سے مختلف ہیں۔

مآخذ : 'Gazetteer of the Bombay Presidency

بمبئی ۱۸۹۹ء : ۱/۹ : ۳۶ تا ۵۰ : (۲) Revue du Monde musliman : ۱ : ۸۸ تا ۸۵ (اے مذکورہ بالا کتاب کا مکملہ سمجھنا چاہیے۔ اس میں اسمعیلی فرقے کے علاوہ آغا خان کے آبا و اجداد کی مختصر تاریخ بھی ملتی ہے) و اشارہ 'در ج ۱ تا ۱۶' بذیل "خوجہ" و "آغا خان" (۳) : جعفر رحمت اللہ : 'History of the Khojas'، بمبئی ۱۹۰۵ء (بمبئی یونیورسٹی کے ایک فارغ التحصیل خوجے کی کجراتی زبان میں تصنیف جس میں خوجہ جماعت کے مشاہیر کے متعلق مفید معلومات درج ہیں) : (۴) Judgment by the Honourable Sir Joseph Arnould in the Khojah case delivered 12th November 1866 بمبئی ۱۸۶۶ء (اس میں اس وقت تک کی خوجوں کی تاریخ کا خلاصہ ہے اور ایک اقلیتی جماعت کے اس دعوے کا رد ہے کہ انہیں سنی ہیں) : 'Census of India' ج ۱۷ : پنجاب، ص ۱۵۰ تا ۱۵۱ : شملہ ۱۹۰۲ء (پنجابی خوجوں کا حال) : (۵) J. Biddulph : 'Tribes of the Hindoo koosh' کلکتہ ۱۸۹۸ء (سرحدی اسمعیلیوں کے سرسری حالات) : (۶) M. Dumasia

(۱۶۰)۔ اس کتاب میں آل عثمان کی تاریخ اس کی ابتدا سے لے کر سلیم اول کی وفات (۲۱ ستمبر ۱۵۲۰ء) تک بیان کی گئی ہے۔ اس تالیف میں اس نے اپنے سے پہلے کے مؤرخین سے بعض واقعات نقل کیے ہیں اور اکثر مقامات پر مبالغے اور اغراق سے کام لیا ہے۔ یہ تاریخ، جس کی تکمیل سلیم ثانی کے عہد (۱۵۶۶ تا ۱۵۷۴ء) میں ہوئی، دراصل مصلح الدین محمد اللاری (م ۱۵۷۹/۱۵۷۱ء) کی فارسی تاریخ *سراۃ الادوار و مرقاة الاخبار* (جس کا ترجمہ سعد الدین نے ترکی میں کیا تھا، مخطوطہ، دروی انا، قِب Fligel، ۲: ۸۰، عدد ۸۳۵) کے ضمیمے کے طور پر لکھی گئی تھی۔ اس کی نشر و اشاعت ہوتی رہی اور اس کے بہت سے مخطوطے لوگوں کے زیر مطالعہ رہے۔ ۱۵۷۹ء/۱۸۹۲ء میں اس کا ایک مطبوعہ ایڈیشن دو ضخیم جلدوں میں (جو علی الترتیب ۵۸۶ اور ۶۱۹ صفحات پر مشتمل ہیں، قِب J. A. ۱۸۶۳ء: ۲: ۲۶۲) عام پڑھنے والوں کو مہیا ہو گیا۔ اس کتاب کے مخطوطے، جو اکثر خوبصورتی سے تیار کیے گئے تھے (مثلاً وہ نسخہ جو پوپ کے محل Vatican میں ہے) یورپی کتاب خانوں میں بالعموم موجود ہیں۔ ان میں سے جو مخطوطے آئندہ کسی تنقیدی اشاعت کے لیے اہم اور سب سے زیادہ کارآمد ہو سکتے ہیں، ان کا یہاں ذکر کر دینا مناسب ہوگا: برلن، عدد ۲۱۳؛ ڈریسڈن، عدد ۳۸۶؛ لائڈن، Cat، ۳: ۲۷؛ لندن، Cat. Turk. Mss. : Rieu، ص ۵۱؛ مایلند، Ambrosiana، عدد ۲۴۳؛ میونخ، عدد ۷۶ تا ۸۱؛ آوکسفورڈ یونیورسٹی، Cat، عدد ۱، ۴، پیرس، عدد ۶۳ و ۷۰؛ سینٹ پیٹرز برگ، Univ.-Bibl، عدد ۲۱؛ فہرست، از Von C. Salemann و V. v. Rosen، ص ۲۱؛ روم، ویٹیکن، Vatican، ایک شاندار نسخہ، جو پہلے سویڈن کی ملکہ کرسٹینا Christina کے پاس تھا (قِب J. v. Hammer، در Bibl. int، ۴: ۳۵ و ۱۱۵؛ نیز P. Horn، در ZDMG، ۱۸۹۷ء

اتالیق)۔ خوجہ، جس کی نسبت سے وہ اس نام سے موسوم ہوا) مقرر ہوا۔ دسمبر ۱۵۷۴ء میں مراد سوم کی تخت نشینی پر وہ اس کا معتمد مشیر رہا اور مراد کے جانشین محمد سوم کے عہد میں "خوجہ سلطانی" یعنی سلطان کے اتالیق کے منصب پر برقرار رہا۔ شعبان ۱۵۹۸/۱۵۹۹ء میں وہ شیخ الاسلام ہو گیا اور اس منصب پر متمکن ہونے کے دو سال بعد ۱۶ ربیع الاول ۱۵۹۸/۲ اکتوبر ۱۵۹۹ء کو، جب وہ جامع آبا صوفیا، استانبول، میں میلاد نبوی (مونود) منقد کرنے کی تیاری میں مصروف تھا، اس کا اچانک انتقال ہو گیا۔ اس کے پانچ بیٹوں میں سے چار بیٹے اعلیٰ مناصب تک پہنچے، یعنی محمد (قِب سجل عثمانی، ۴: ۱۳۸) اور محمد سعد (قِب وہی کتاب، ۱: ۲۳۰، بعد) کو مفتی کا منصب حاصل ہوا اور عبدالعزیز (قِب وہی کتاب، ۳: ۳۳۸) اور صالح (قِب وہی کتاب، ۳: ۲۰۰، بعد) قاضی عسکر کے منصب پر فائز رہے۔ [پانچواں بیٹا] مسعود "محافظ" تھا اور اس کا انتقال کم عمری ہی میں ہوا (قِب وہی کتاب، ۴: ۳۶۵، بعد)۔ [خوجہ افندی کے بیٹے] اس کے جنازے کو قبرستان ابوب میں لے گئے، جہاں اسے مدرسہ حفظ قرآن میں دفن کیا گیا۔

سعد الدین مشہور ترکی تاریخ تاج التواریخ کا مصنف تھا۔ اگرچہ یہ تاریخ شاہی حکم سے نہیں لکھی گئی تھی (سعد الدین باقاعدہ شاہی مؤرخ، یعنی واقعہ نویس نہیں تھا، قِب Mill. zur osm. Gesch، ۱: ۲۴۱)، تاہم اسے بالعموم اب تک عثمانی تاریخ کا ایک معتبر ماخذ سمجھا جاتا ہے۔ اس نے یہ تاریخ مرتب کر کے نہ صرف اس خاندان کی تمام سابقہ تاریخوں کو، جو "تواریخ آل عثمان" کہلاتی تھیں، لوگوں کے ذہن سے فراموش کر دیا بلکہ انہیں ان کی نظروں سے گرا دیا (قِب حاجی خلیفہ، کشف الظنون، ۲: ۱۱۲، عدد ۲۱۵۸، نیز J. H. Mordtmann، در Isl، ۱۰: ۱۰۰)

ماخذ: (۱) ابن اسفندیار: *History of Tabaristan* مترجمہ 'Browne' ص ۱۱۳ تا ۱۲۲: (۲) ظہیر الدین: تاریخ طبرستان، طبع B. Dorn، ص ۶۶ تا ۵۰: (۳) میر خواند: روضۃ الصفا، ۳: ۱۲۵: (۴) الطبری: ۳: ۱۲۰ و ۱۳۶ و ۱۳۷: (۵) ابن الأثیر: الکامل، ۵: ۳۶۹، ۳۸۶، ۳۸۷: (۶) البلاذری: طبع لخبوہ، ص ۲۳۶، ۲۳۷: (۷) تاریخ منجم باشی، ۲: ۳۹۳: (۸) *Erklärung der Münzen*: A.D. Mordtmann در ZDMG، ۱۹: ۵۸۶، ۳۳۵ و ۳۳۶: ۱۱۰ (CL. HUART)

* الخورنق: عراق عرب [کوفہ] میں ایک مقام۔

جو نجف [رگ بان] کے مشرق میں تقریباً ایک میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ پہلے یہاں زیاد قبیلہ آباد تھا۔ ۱۸ء کے بعد لخمی اسیر نعمان نے یہاں اپنے سلسانی آقا کے لیے ایک محل تعمیر کیا جو خورنق ہی کے نام سے موسوم ہوا۔ اسی عمارت میں قیام کے دوران میں ہرویز نے ذوقار کی شکست کی خبر سنی۔ شروع کے خلفا نے اس محل کی توسیع کی اور اسے اپنے کام میں عباسی لائے۔ سولہویں صدی میں وہ کھنڈر ہو چکا تھا۔ زمانہ جاہلیت کے عرب شعرا اکثر الخورنق اور اس کے قریب واقع قلعہ سدیر [شاید اخیضر رگ بان] کا تخیلاً ذکر کرتے ہوئے اسے دنیا کے تیس عجائبات میں شمار کرتے ہیں۔ الخورنق اس لیے بھی مشہور ہے کہ ایک ضرب المثل جزاء مینار (= مینار کا صلہ) اس سے وابستہ ہے، کیونکہ سمار اس بولانی معمار کا نام تھا جس نے یہ محل تعمیر کیا تھا اور جسے بعد میں نعمان نے مروا دیا تھا۔ نام "خورنق" کا ماخذ ایرانی معلوم ہوتا ہے (بقول Andreas) ہورنہ *hu-verna* = خوبصورت چہت والا یا (بقول Vulleis) خورنر *Khawarnar* = جانے ضیافت! اگرچہ ابن جنی اس کا تعلق عربی لفظ خرنق (*Rhirmiq*) [یعنی جھوٹا خرگوش] سے سمجھتا ہے اور Nöldeke ایک رباعی عبرانی لفظ (یعنی "نیشن، گشت زار")

اپنے بیٹوں کی سازش سے وہ ایسا نہ کر سکا اور خورشید کو اس وقت تک حکومت کرنے کا موقع نہ ملا جب تک کہ اس نے اپنے چچا زاد بھائیوں پر تیشہ اور ساری کے مابین قصر دادکان کے مقام پر فتح حاصل نہ کر لی۔ اس نے قلعہ کیسہ کی مرمت کی اور سہ دلہ نام کا ایک اور قلعہ تعمیر کرایا (قب سدیہ، نزد حبرہ)۔ مؤخر الذکر قلعے کے گرد اس نے ایک منشی بنوائی اور ایک کاروان سرائے بھی تعمیر کرائی۔ ابومسلم کے قتل کے بعد سومیاہ نے خلیفہ المنصور کے خلاف بغاوت کرتے وقت اپنا خزانہ خورشید کی حفاظت میں رکھوا دیا، کیونکہ اپنی شکست کے بعد وہ خورشید کے پاس پناہ گزیں ہونا چاہتا تھا، مگر راستے میں خورشید کے چچا زاد بھائیوں میں سے طوس ناسی نے اپنی اہانت کا انتقام لینے کے لیے اسے قتل کر دیا۔ خلیفہ نے اسے کیا کہ خزانہ اس کے حوالے کر دیا جائے، لیکن خورشید نے اس کی بات نہ مانی! تاہم وہ خراج دینے پر راضی ہو گیا۔ المنصور نے اس مال و دولت کا خیال کرتے ہوئے جو اسے طبرستان سے حاصل ہو سکتا تھا اسے فتح کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا، اہل کے سپہ نے ہتار ڈال دیے: خورشید نے اپنی عورتوں اور بچوں کو "عائشہ کرگیلی دز" میں، جسے عرب "قلعة الطاق" کہتے تھے، جھوڑا اور خود سپاہی فراہم کرنے کے لیے گیلان اور دیلم پہنچا۔ وبا (طاعون) سے قلعہ گیر فوج کے بہت سے آدمی ہلاک ہوئے تھے، انہوں نے اپنے آپ کو حملہ آوروں کے حوالے کر دیا اور خورشید نے مایوس ہو کر زہر کھا لیا اور طبرستان اسلام کے دائرہ حکومت میں آ گیا۔ طبری اور ابن الأثیر نے (اس واقعے کی) جو تاریخ لکھی ہے، درست نہیں معلوم ہوتی یعنی ۵۸/۱۱۱ء، خورشید دوم کا آخری سکھ جس کا ہمیں علم ہے ۶۵/۱۱۸ء کا ہے، جو طبرستان کے حساب سنوی (۶۸) میں ۱۱۳ء کے مطابق ہے۔

کھودے ہوئے ایک کتوبی میں پایا جاتا ہے۔ یہی حالت سوئڈینہ کی بھی ہے۔ جبلتہ میں ریگستان ہے۔ یہاں پانی نہیں ملتا اور جانداروں میں یہاں صرف سمندری پرندے پائے جاتے ہیں، جس کی وجہ سے سمندری پرندوں کی پٹوں (guano) کے ڈھیر، جو کھاد کے طور پر کام آتے ہیں، دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ جبلتہ میں کسی زمانے میں انسانی آبادی بھی تھی جیسا کہ ان چند قبروں سے ظاہر ہوتا ہے جو وہاں بنی ہوئی ہیں۔ ان جزائر میں سب سے زیادہ مغرب میں جزیرہ حاسی [کذا، حاسکی ۹] ہے جو ساحل سے صرف بیس میل کے فاصلے پر ہے اور جس میں سب سے زیادہ نمایاں چیز چار سو ٹ اوونچی جوٹیاں ہیں۔ یہ جزائر بھی پانی اور نباتات سے خالی ہے مگر ہنسوں اور حوصلوں کے غول پائے جاتے ہیں۔

جزائر کا یہ مجموعہ، جس کے متعلق بہت پہلے زمانے میں معلوم ہو گیا تھا کہ یہ وہی ہے جسے زئویا کے "سات مسائل جزیرے" کہتے ہیں، پارٹوہا اور حضرموت کی مملکتوں میں حد فاصل بنانا تھا اور اس طرح پارٹوہا کی سرحد کی جائے وقوع خلیج خوریان موریان کے اندرونی کونے میں سمجھنی چاہیے یعنی تقریباً ۵۵ درجے اور ۵۵ دقیقے طول البلد مشرق میں۔ زمین کے بنجر ہونے کی وجہ سے یہاں کے باشندے سمندر پر انحصار کرنے پر مجبور ہو گئے اور قدرتی طور پر وہ مہسی گیروں کی ایک قوم بن گئے۔ الادریسی (م ۱۱۶۵ء) بھی اس بات سے واقف تھا کہ وہاں کے باشندے، جو ملکی حیثیت سے الشجر کے ماتحت تھے، موسم سرما میں بہت افلاس زدہ ہو جاتے تھے، اور جہاز رانی کے موسم میں کھینچ تان کر صرف معمولی طور پر گزر اوقات کر لیتے تھے۔ جہازوں میں بیٹھ کر وہ عمان، عدن اور یمن تک جایا کرتے تھے۔ ان کی آمدنی کا بڑا ذریعہ کچھوؤں کے خول تھے، جن کی تجارت وہ اہل یمن سے کیا کرتے تھے اور کبھی

سے [بقول الاصمعی یہ لفظ خورتقاہ (خنورتگاہ بمعنی کھانے پینے کی جگہ) سے سفرجل کے وزن پر بنا ہے (یاقوت)]۔

[یاقوت نے بتایا ہے کہ الخزرق کے نام سے دو شہر اور بھی تھے: ایک بلاد مغرب میں اور دوسرا بلخ میں]۔

مآخذ: (۱) R. Basset : *Les Alixares de*

Revue 'Grenade et le chateau de Khouarnag

Africaine '۱۹۰۶ء عدد ۲۶ ص ۲۲ (بعد):

(۲) *Mission en Mésopotamie* : L. Massignon

MIFAO ج ۲۸ ص ۳۶ تا ۳۷ و لوحہ ۳۷

ج ۳۱ ص ۱۲۶ : U. Meisner (۳) *Eine*

Reise von Babylon nach den Ruinen von Hira und

Sendschrift der Deutschen Orient-

Gesellschaft '۱۹۰۱ء عدد ۲ ص ۱۹ : (۴) یاقوت:

معجم البلدان، بنیل مادہ۔

(LOUIS MASSIGNON)

خوریان موریان، عرب کے مشرقی ساحل پر

اسی نام کی خلیج میں جزیروں کے ایک مجموعے کا نام، جس میں حلائیہ، قرزویت (قرزوت یا اقربزوت)، سودا (سویدہ)، جبلتہ اور حاسکی کے جزیرے شامل ہیں۔

ان میں سے صرف پہلے جزیرے میں آبادی ہے، مگر اس کے باشندوں کی تعداد اب بہت کم ہو گئی ہے، حالانکہ سودا کے سب باشندے ہجرت کر کے اس میں آ گئے تھے۔ حلائیہ میں نباتات کی کمی ہے، کہیں

کہیں مغرق سمندری نباتات، جھاؤ کے درخت اور جھوٹی سوئی (نبات السنط، mimosas) کی جھاڑیاں روکھے

پھسکے منظر میں رونق پیدا کر دیتی ہیں۔ جزیرے کے وسط میں ایک چوٹی سمندر کی سطح سے ایک ہزار پانچ

سو دس فٹ بلند ہے۔ مغرب میں اس کے سامنے ایک اونچی سطح مرتفع ہے۔ یہاں کا پانی زیادہ تر کھاری

ہے اور سب سے اچھا پانی انگریزی ملاحوں کے

Abhandl. d. Deutsch. Morgenl. در 'des Orients
(۱۱) : ۱۸۵ '۳۳۳ 'Getellsch. لاتبرک ۱۸۶۳ء میں
Bern 'Die alta Geographie Arabiens : وہی مصنف
۱۸۷۵ء میں ۹۸ : بعد : (۱۲) : E. Glaser
'Geschichte und Geographie Arabiens ' برلن ۱۸۹۰ء
۱۸۶ : بعد : (۱۳) : F. Stuhlmann 'Der Kampf
Braun- 'um Arabien, Humburgische Forschungen
: A. Grohmann (۱۴) : ۱۸۹ : ۱۹۱۶ء
Osten und 'Südarabien als Wirtschaftsgebiet ج ۱
: F. Hommel (۱۵) : ۱۸۹ : ۱۹۲۲ء
Grundriss der Geographie und Geschichte des alten
Munich 'Orients ۱۹۲۵ء میں ۷۲۲ : بعد
(ADOLF GROHMANN)

خوزستان : خوز کا ملک، جسے بطلمیوس
[رگ بان] نے Kosraon لکھا ہے، ایران کا ایک صوبہ
جو قدیم اقلیم سومہ (سومینا) سے مطابقت رکھتا ہے
اور جسے اب سرکاری طور پر عربستان یعنی عربوں کا
ملک کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے صحرائی میدانوں
میں بنو کعب (بدوی تلفظ جوب) اور بتولام کے بدوی
قبائل چھا گئے ہیں۔ اس صوبے کی موجودہ حدود یہ
ہیں : شمال کی سمت میں سلسلہ جبال زیاگروس Zagros،
مغرب میں دریائے کرخہ [رگ بان]، جنوب میں دریائے
جراحی یا طاب اور صحرا میں سے گزرتا ہوا ایک خط جو
اس مقام سے کھینچا گیا ہے، جہاں دریائے کارون
[رگ بان] اور دریائے کرخہ کا شط العرب [رگ بان] سے
اتصال ہوتا ہے اور مشرق میں کردستان۔ اس اقلیم کے
بڑے بڑے شہر یہ ہیں : شستر [رگ بان] (جسے عرب
تستر کہتے ہیں) جو والی صوبہ کا صدر مقام ہے، دزقل،
ہویزہ (سوق الاہواز)، رام ہرزہ، محمرہ اور بہسنان۔
پہاڑیوں میں قبائل لوریہ، یعنی فلی Feili، بختیاری کو
مکلو اور مامستی، آباد ہیں۔
ساسانی بادشاہوں کے دور حکومت میں یہ صوبہ

کبھی عمدہ غیر بھی فروخت کرتے تھے جس کی انہیں
بعض اوقات بہت بڑی قیمت مل جاتی تھی الادریسی اس
خلیج کو جس میں یہ جزیرے واقع ہیں جون الحشیش
(نوٹیوں کی خلیج) کہتا ہے۔ سب سے پہلے پرتگالیوں نے
اہل یورپ کو ان جزائر کی طرف متوجہ کیا۔ Alfonso
d' Albuquerque نے ۱۵۰۳ء میں خوریان موریان کے
جزائر کا پتا لگایا۔ کوریا موریان Curia-Moria جزائر کے
نام سے پرتگالی ماخذ میں ان کا ذکر برابر آتا رہا ہے
اور وہ سویدیہ کا نام سودیہ Sodie کی شکل میں، اور حاشی
کا نام آسکی Asquie کی شکل میں اور قرزویت Rodondo
کی شکل میں آتا ہے۔ یہ جزیرے بعد میں سلطان منقط
کے قبضے میں آ گئے مگر اس نے ۱۸۵۳ء جولائی ۱۸۵۳ء کو
انہیں انگریزوں کے حوالے کر دیا۔

ماخذ : (۱) الادریسی : *نزهة المشتاق* ترجمہ
Jaubert : ۱ : ۵۳ : ۲ : ۳۹ : (۲) : Fernao Lopes de
Castanheda : *Historia do descobrimento e con-*
quista da India pelos Portugueses
Historia Oriental de las (۳) : ۵۳ : باب
'percegnaciones de Fernan Mendez Pinto Portugues
پرتگالی سے فستالہ میں ترجمہ از Francisco de Herrera
ییلرڈ ۱۶۲۰ء : باب ۳ : (۴) : Decada primeira
da Asia de foão de Barres ' لڑیں ۱۶۲۸ء ج ۷ : باب
۳ : ورق ۱۳۳ : ج ۹ : باب ۱ : ورق ۱۷۲ : (۵) : Diego do
Decada sexta da Asia : Conlo ج ۱ : باب ۱۸ : (۶)
وہی مصنف : Decada septima ج ۱ : باب ۵ : (۷) : P.
Historia ganeral de Ethiopia : Mannel d'Almeyda
' a alta P. Baltbasar Teltez Coimbra ' ۱۶۶۰ء
ج ۳ : باب ۲ : ج ۳ : باب ۲۸ : (۸) : L' Ambassade de
Dom Garcias de Silva Figueron en Perse
Die Erdkunde : C. Ritter (۹) : ۱۸۹۸ : ۱۸۹۸ء
von Asien ' برلن ۱۸۹۶ء : ۸ : ۲۰۹ : ۲۳۶ : ۳۳۵
Die Post- und Reiserouten : A. Sprenger (۱۰) : ۱۸۵۷

لوگوں کی رنگت نانے کی سی، بدن چہرہ، ڈاڑھی چھدری، اور سر کے بال گھنے ہیں۔ غالباً یہ لوگ ان حبشی النسل لوگوں کے بقیات ہیں جو بہت پہلے یہاں آباد تھے۔ عربوں کی فتح کے وقت تک بھی وہ ایک خاص طرح کی زبان (خوزی) بولتے تھے جو نہ تو ہندی یورپی تھی اور نہ سامی۔ شاید وہ انزانیوں (Anzanites) یا ایلامیوں (Elamites) کی بھی کھچی زبان تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس زبان کے کچھ آثار دِزفُل کی غیر شائستہ بولی میں موجود ہیں۔ اہل روم سے معاریات کے بعد عراق عرب (بین النہرین) کے لوگ شاپور اول کے عہد میں وہاں لے جا کر آباد کر دیے گئے۔ تیسرے کا عظیم الشان بند ان اسیران جنگ نے تعمیر کیا تھا جو شہنشاہ ولیرین Valerian کی تباہ کن ناکام مہم کے بعد گرفتار ہوئے تھے۔

اس ملک میں صنعت و حرفت کی نشوونما ان کاریگروں کے اثر سے ہوئی جو بوزنطی علاقے سے پکڑ کر لانے گئے تھے۔ اب یہاں دریا پر ایک بہت بڑا بند باندھا گیا ہے، جس کی وجہ سے نورے علاقے میں آب پاشی ہونے لگی ہے۔

مآخذ: (۱) A.H. Layard : Description of

Journ. Roy. Geogr.) 'the province of Khuzistan

Society 'ج ۱/۱۶ : ص ۱ تا ۱۰۵ : (۲) Deflémery

Mémoires d'histoire orientale : ۱۲۷ : ۱۲۸ : (۳)

History of Persia : P.M. Sykes : ۱ : ۵۳ : ۵۶ : ۲

۹۳ : ۱۲۹ : ۲۵۷ : (۴) ابو الفداء : تقویم البلدان : ص

۳۱۱ : بعد : (۵) المقدسی : BGA : ۳ : ۲ : ۳ : بعد (اشاریہ

میں مذکور نہیں) : (۶) اصطخری : BGA : ۱ : ۸۸

: بعد (اشاریہ میں نہیں ہے) : (۷) ابن حوقل : BGA

: ۲ : ۱۲۰ : بعد (اشاریہ میں نہیں ہے) : (۸) یاقوت : معجم

طبع وٹینفلڈ : Wüstenfeld : ۲ : ۸۶ : (۹) H. de Meynard

Dict. de la Perse : ۱ : ۲۱۷ : J. Marquart

Erānsahr : ص ۱۷۷ و ۱۳۳

(CL HUANT)

جنوب (نیمروز) کے صوبوں میں شامل تھا، اور عیسائیوں کے آباد ہونے کی وجہ سے یہ ایک عیسائی صوبہ بن گیا تھا جو "بیت ہوزایی" کہلاتا تھا۔ دارالحکومت "بیت لاباط" تھا، جو بعد میں جندی شاپور [جندیساہور] کے نام سے موسوم ہوا۔ ۸۱۹ء / ۶۴۰ء میں جب عربوں نے اسے فتح کیا تو اس کے بچاؤ کے لیے والی (سرزبان) صوبہ ہرمزان نے جنگ کی تھی۔ لیکن سوق الہواز (حمرہ اصفہانی : عجمستان - واجار) پر قبضہ ہو جانے اور عتبہ کے ہاتھوں رام ہرمز کے مقام پر شکست کھانے کے بعد وہ شتر میں چھپے سہنے محصور رہا اور بالآخر اس نے اپنے آپ کو خلیفہ حضرت عمرؓ کے حوالے کر دیا۔ معزالدولہ احمد بن یوسف نے اس پر ۸۳۳ء / ۹۴۵ء میں، بغداد پر قبضہ کرنے سے پہلے، اپنا تسلط جمایا اور اہل خانہ ابائا کے عہد میں اسے لرستان کے اتابک یوسف شاہ اول کو اس صلیے میں بطور جاگیر عطا کیا گیا کہ اس نے خان مذکور کو دیلمیوں کے اچانک حملے سے بچایا تھا۔ کچھ عرصے کے لیے اس جنگ کے بعد، جس میں بغداد کے سامنے شاہ عباس اول کی فوجوں نے ۸۹۵ء / ۱۵۸۷ء میں شکست کھائی تھی، اس پر عثمانی ترکوں کا قبضہ ہو گیا تھا۔

عرب جغرافیہ نویسوں کے بیان کے مطابق خوزستان کی حدود یہ ہیں : مغرب کی سمت میں واسط کا ضلع اور سور الراسی، جنوب کی طرف عبّادان سے لے کر سہریان تک ساحل سندھ، مشرق کی طرف فارس اور عراق عجم (یہاں دریائے طاب حد فاصل بناتا ہے) اور شمال کی طرف دریائے کرخہ اور کوہستان تور۔ یہاں کے اہم شہر یہ تھے : سوق الہواز (صدر مقام)، سوس، جندی شاپور، تتر، عسکر مکرم، رام ہرمز، ذورق (بعد میں ان کے علاوہ : ملیب، قرقوب، جیبی، حمن مہدی)۔ آب و ہوا گرم اور مضر صحت ہے، خاص طور پر غیر ملکوں کے لیے۔ دریا متعدد ہیں، زمین زرخیز اور پیداوار کھجوریں، گیہوں، جو، پاول اور نیشکر۔ یہاں کے

بیان ہے (معجم البلدان، ۳: ۴۹۷ تا ۴۹۸، مترجمہ Barbier de Meynard، ص ۲۶۹) کہ ایک قدیم محدث [ابو علی الحسن بن ابی علی بن الحسن الخوستی] کی نسبت اسی قصبے سے ہے۔ ابن بطوطہ نے بھی ہندوکش میں بہت سے مذہبی زاویوں [خانقاہوں] کا ذکر کیا ہے۔ خوست غالباً ترکمانوں اور ازبکوں کے ہاتھوں تباہ ہو گیا تھا۔ خوست کے حوالوں کے لیے دیکھیے 'The Lands of the Eastern Caliphate: Guy Le Strange' ص ۱۰۱، ۱۰۲؛ تاریخ رشیدی، ترجمہ، ص ۱۰۳ و حاشیہ: Vambéry: شیبانی نامہ، بند (canto) ۶۳، ص ۳۶۰؛ خاقی خان، ۱: ۶۱۵؛ جوان خوست میں ازبکوں پر جگت سنگھ اور اس کے راجپوتوں کی فتح اور وہاں انگریز کی فراوانی کی وجہ سے لکڑی کا ایک قلعہ تعمیر کرانے کا حال بھی درج ہے؛ نیز دیکھیے؛ بادشاہ نامہ، ۲: ۴۶۳؛ یہ ۱۰۵۵ھ/۱۶۴۵ء کا واقعہ ہے۔

افغانستان کے جنوب جنوب مشرق میں ضلع پشاور [پاکستان] کی سرحد پر ایک وادی کا نام بھی خوست ہے۔ خوست نام کا تیسرا مقام [پاکستان کے صوبہ بلوچستان میں کوئٹے سے پینتیس میل مشرق میں واقع ہے، جہاں کوئٹے کی ایک کان ہے (Imperial Gazetteer of India، ۳: ۱۳۸ و ۱۳۹)۔ فارسی میں "خوست" کے معنی جزیروں کے ہیں اور اس طرح اس کا وہی مفہوم ہو سکتا ہے جو اندراب کا ہے۔

(H. BEVERIDGE)

* خوسیم: رگ بد خوتین۔

خوشحال خان خٹک: [ابن شہباز خان بن

بھٹی خان بن ملک اکوڑی]، پشتو کا عظیم شاعر، سید سالار اور پٹانوں کے مشہور قبیلے خٹک کا سردار، [جو ضلع پشاور کی تحصیل نوشہرہ کے علاوہ مردان اور کوہاٹ کے اضلاع میں آباد ہے۔ ۱۵۸۱ء میں جب اکبر (رگ بان) نے مرزا حکیم کی بغاوت کو کچلنے کے لیے کابل کا رخ کیا تو اٹک کے مقام پر ملک اکوڑی نے

* خوست: [اس نام کے تین مقامات ہیں، دو افغانستان میں اور تیسرا پاکستان کے صوبہ بلوچستان میں]۔ افغانستان میں اس نام کا ایک مقام بدخشان [رگ بان] کی سرحد پر اندراب [رگ بان] کے قریب آمو دریا [رگ بان] کے اس نشیبی علاقے میں واقع ہے جو آج کل "افغان ترکستان" کے نام سے موسوم ہے۔ یہ بلخ کے جنوب مشرق میں، ہیک کے جنوب مشرق میں، کابل اور چاریکار سے شمال کی جانب کو، ہندوکش کی پشت پر (یعنی اس کے شمال میں) واقع ہے۔ یہ ایک گننام سی جگہ ہے اور اکثر نقشوں میں نہیں دکھائی جاتی، مگر زمانہ قدیم میں اسے خاص اہمیت حاصل تھی۔ یاقوت اسے ایک زرخیز اور سرسبز قصبہ بتاتا ہے۔ توڑک بابری میں اس کا کئی جگہ ذکر آتا ہے؛ بابر اسے "خوست" لکھتا ہے، جو القزوینی کے خوست اور دوسرے مصنفوں کے خاست ہی کی ایک شکل معلوم ہوتی ہے۔ توڑک بابری کے ترجمے میں، جو سید زین نے لکھا ہے، اسے "خوست بدخشان" لکھا گیا ہے۔ بابر کی دو بیٹیاں خوست ہی میں پیدا ہوئی تھیں، جن میں سے ایک بابر کی بڑی بیگم ماہم کے بطن سے تھی اور دوسری دلدار بیگم کے بطن سے۔ ماہم کا خوست سے قریبی تعلق تھا؛ اس کا بھائی محمد علی طغای یہاں کا ایک میرزا زادہ تھا؛ بایزید بیات اپنی تاریخ میں، جو تاریخ ہمایوں کہلاتی ہے (مخطوطہ انڈیا آفس، فہرست از Ethé، عدد ۲۲۳، ورق ۲۶ الف)، ذکر کرتا ہے کہ ہمایوں (جو ماہم کے بطن سے تھا) خوست میں اپنی ننھیال گیا تھا۔ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بابر ہندوستان سے تحائف بھیجتے وقت خوست کا خاص طور پر نام لیتا تھا (دیکھیے اس کے قاضی سید زین کی کتاب طبقات بابری، جس میں لکھا ہے کہ خوست کے باشندے بہت دیندار تھے)۔ اس سے اشارہ ماہم کے خاندان کی طرف معلوم ہوتا ہے، کیونکہ وہ مشہور ولی اللہ احمد جام کی اولاد میں سے تھی۔ یاقوت کا

اس کشدگی کے مختلف اسباب بیان کئے جاتے ہیں :
 (۱) خوشحال خان شاہجہاں کا وفادار منصب دار تھا اور
 ایسے شاہجہاں کی نظر بندی اور معزول پر سخت صدمہ
 پہنچا۔ دوسری طرف عالمگیر کو یہ ادیشہ پیدا ہو گیا
 کہیں وہ شاہجہاں کی حمایت میں کوئی شورش نہ برپا
 کر دے؛ (۲) پٹھانوں اور مغلوں کے دل کبھی ایک
 دوسرے سے صاف نہیں ہوئے تھے۔ پٹھان ہمیشہ یہ
 سمجھتے رہے کہ مغلوں نے ہندوستان کی ماطلت ان سے
 چھینی ہے اور وہ اپنے علاقے میں کابل خود مختاری
 کے خواہاں رہتے تھے؛ (۳) اس میں شک نہیں کہ
 مغل منہجپدار کی حیثیت سے خوشحال خان کو پٹھانوں
 کے خلاف بھی تلوار اٹھانی پڑی تھی، لیکن بعض
 واقعات سے پتا چلتا ہے کہ وہ اپنی منصب داری کے دوران
 میں مغلوں کو پٹھان قبائل پر یورش کرنے سے باز
 رکھنے کی کوشش کرتا رہا تھا؛ چنانچہ جب ایک آدمہ
 موقع پر مغل فوج کو پٹھانوں کے ہاتھوں نقصان اٹھانا
 پڑا تو عالمگیر کو اس کی وفاداری پر مزید شک ہو گیا؛
 (۴) خوشحال خان مغلوں کا وفادار منصب دار رہنا چاہتا
 تھا، لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی بہ بھی تمنا تھی کہ
 پٹھانوں کی خود مختاری پر آنچ نہ آنے پائے اور ان کے
 معاملات میں اس کی مرضی کے بغیر لوگ دخل انداز نہ
 ہوں۔ گویا وہ ایک طرح سے پٹھانوں اور مغلوں کے
 درمیان ثالث کی حیثیت اختیار کرنا چاہتا تھا (خوشحال و
 اقبال، ص ۷۶ تا ۸۱)۔ ظاہر ہے یہ روش نہ تو
 کابل اور پشاور کے حاکموں کے لیے قابل قبول تھی،
 نہ خود شہنشاہ کے لیے، جو قدرتی طور پر ایسے
 مرکزی سلطنت کے اتحاد اور سالمیت کے مذاق سمجھتا
 تھا؛ چنانچہ ایسے افسوسناک حالات پیدا ہو گئے کہ
 مغل حکومت اور پٹھان ایک دوسرے کو کمزور کرنے
 کے درپے ہو گئے۔

جب تک مہابت خان اس علاقے کا گورنر رہا،
 عالمگیر اور خوشحال خان میں صلح صفائی کے امکانات

اپنی خدمات پیش کیں، جس کے صلے میں شہنشاہ نے
 اسے اپنا منصب دار مقرر کر کے دیگر مرعات کے علاوہ
 ایک اور پشاور کے درمیان شاہراہ کا محصول وصول
 کرنے کا اختیار بھی دیا۔ جہانگیر اور شاہجہاں کے
 عہد میں اکوڑی کے بعد یکے بعد دیگرے اس کا بیٹا
 یعنی خان اور نوتا شہباز خان منصب دار مقرر ہوئے۔
 وہ نہایت وفاداری سے اپنے فرائض انجام دیتے رہے اور
 مغل شہنشاہ ان کے وظائف و مناصب میں اضافے کرتے
 رہے۔ ۱۶۲۲ء/۱۰۹۱ھ میں اکوڑہ کے مقام پر
 خوشحال خان پیدا ہوا۔ یہ جگہ دریائے اٹک سے تقریباً
 بارہ میل کے فاصلے پر شاہراہ اعظم اور دریائے لندی
 (کابل) کے درمیان واقع ہے اور ملک اکوڑی کے نام
 سے موسوم ہے۔ یکم شوال ۱۰۵۰ھ/۱۶۴۱ء جنوری ۱۶۴۱ء
 کو شہباز خان قبائل کی باہمی جنگ میں مارا گیا،
 چنانچہ اٹھائیس برس کی عمر میں خوشحال خان اپنے
 باپ کا جانشین ہوا۔ [شاہ جہاں اس کی وفاداری، علم و
 فضل اور تدبیر و سیاست کے باعث اس کی قدر کرتا تھا۔
 خود خوشحال خان نے اپنے اشعار میں جہانگیر اور
 شاہجہاں کی بہت تعریف کی ہے]۔ اسی زمانے میں
 کانگریس کے راجہ جگت سنگھ سے جنگ ہوئی تو تارا گڑھ
 کا قلعہ اسی نے فتح کیا تھا (مارچ ۱۶۴۳ء)، جس پر
 اسے چار لاکھ روپیہ نقد اور ڈھائی لاکھ کی جاگیر
 لاہور میں عطا ہوئی۔ اسی طرح بدخشاں کی لڑائی
 (۱۶۴۵ء/۱۰۵۵ھ) میں خوشحال خان نے اندراب
 اور ہندوکش کی حفاظت کی اور ۱۰۵۶ھ/۱۶۴۶ء میں
 بلخ و بدخشاں کی فوجی مہم میں بھی وہ شہنشاہ کا
 ہم رکاب رہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۰۵۹ھ/۱۶۴۹ء
 تک وہ زیادہ تر ہندوستان ہی میں مقیم رہا۔

[۱۰۶۹ھ/۱۶۵۹ء میں اورنگ زیب عالمگیر
 [رکبان] نے تخت سنبھالا تو خوشحال خان کو دربار شاہی
 میں پہلا سا اثر و رسوخ حاصل نہ رہا۔ شہنشاہ
 سے اس کے تعلقات روز بروز کشیدہ ہوتے چلے گئے۔

موجود تھے، لیکن ۱۶۶۱ء میں مہابت خان کو حیدرآباد دکن میں تبدیل کیا گیا اور اس کی جگہ سد امیر خان کابل کا گورنر مقرر ہوا۔ امیر خان اور مرزا عبدالرحیم، حاکم بشارہ سے خوشحال خان کی نہ توہم نہ تھی، چنانچہ انہوں نے پہلے تو دربار شاہی سے اس کا منصب اور تمام مراعات منسوخ کرائیں اور پھر اسے گرفتار کر کے دہلی بھیج دیا۔

رمضان ۱۰۷۰ھ / اپریل ۱۶۶۸ء تک خوشحال خان دہلی اور غزنی گوانبار کے قلعہ رتھمبور میں محبوس رہا۔ [اس کے بعض اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شہنشاہ کا مخالف بننا نہیں چاہتا تھا اور دشمنوں نے اس پر ناحق تہمت لگا کر قید کر دیا تھا: "میں ناحق اورنگ زیب کی قید و بند میں پڑا ہوں۔ خدا شاہد ہے کہ میں محض تہمت اور بہتان کی بنا پر مورد عتاب ہوں۔ میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر یہ کہتا ہوں کہ میں اپنا کوئی گناہ و خطا نہیں دیکھتا، لیکن لوگ طرح طرح کی باتیں بنا رہے ہیں۔ شاید میری ہنر مندی اور روشنی طبع ہی میرے لیے مصیبت بن رہی ہے۔ جس دیانتداری اور خلوص سے میں نے مغلوں کی خدمت کی ہے اس کی مثال کوئی دوسرا افغان پیش نہیں کر سکتا۔] قید سے رہائی پانے کے بعد بھی اس پر بلا تاغہ دربار میں حاضر رہنے کی پابندی تھی۔ اس نے جس نامہ کے عنوان سے دو سو بیس اشعار کی ایک نظم لکھی ہے (م رجب ۱۰۷۷ھ / یکم جنوری ۱۶۶۷ء)، جس میں وطن اور باران وطن سے جدائی پر فریاد کی ہے۔ ۱۰۷۹ھ / ۱۶۶۸ء میں خوشحال خان کی جلاوطنی ختم ہو گئی اور وہ وطن لوٹ گیا۔

[اس وقت یوسف زئی قبائل کی یورش (۱۶۶۷ء) فرور ہو چکی تھی اور مغل صوبیدار محمد امین خان کی سخت کارروائیوں نے کچھ عرصے کے لیے ہٹھانوں کی سرگرمیاں سرد کر دی تھیں۔ ۱۶۷۲ء میں دفعہ درہ خیبر کے قبائل نے علم بغاوت بلند کر دیا اور افریدی

سردار اکمل خان نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر کے مغلوں کے خلاف لڑائی چھیڑ دی۔ اس نے اس جنگ کو قومی جہاد کا نام دے کر ہٹھانوں کی کثیر تعداد اپنے پرچم تلے جمع کر لی اور یکم مئی کو علی مسجد کے قریب مغل فوج کو شکست دے کر اسے بے حد نقصان پہنچایا۔ اب خوشحال خان بھی اکمل خان کے ساتھ آ ملا اور اس کی سیف و قلم نے ہٹھانوں میں انک نئی روح بھونک دی۔ اس نے ۱۰۸۵ھ / ۱۶۷۴ء تک نوشہرہ، دواہ اور کڑیہ میں مغل فوج کا مقابلہ کیا۔ ۲ مارچ ۱۶۷۴ء کو کڑیہ کی لڑائی میں شاہی لشکر کو ایسی سخت ہزیمت اٹھانی پڑی کہ مغل سلطنت کے وقار کو بحال کرنے کے لیے عالمگیر کو خود میدان میں آنا پڑا۔ وہ ۶ جولائی ۱۶۷۴ء کو حسن ابدال پہنچا اور اس مہم کی نگرانی کے لیے تقریباً ایک سال تک وہاں مقیم رہا۔ اس کے ترکہ سپہ سالار اغر خان کو پے در پے کامیابیاں نصیب ہوئیں اور مہمندانوں اور غلزنٹیوں کی بغاوت کو کچل کر رکھ دیا گیا، تاہم خوشحال خان بدستور برسرِ پیکار رہا اور اس نے ایک بار پھر [۱۰۸۶ھ / ۱۶۷۵ء میں خائیش اور بعد ازاں گنیت میں مغل فوج کو شکست دی۔] (بہر حال مجموعی طور پر صورت حال پر قابو پا لیا گیا تھا، چنانچہ دسمبر ۱۶۷۵ء میں مغل شہنشاہ نے دہلی کی طرف مراجعت کی۔ ۱۶۷۷ء میں امیر خان کابل کا صوبہ دار مقرر کیا گیا، جو اپنی وفات (۱۶۹۸ء) تک اس علاقے میں بڑی کامیابی سے نظم و نسق چلاتا رہا۔ بایں ہمہ خوشحال خان کا ولولہ سرد نہ ہوا اور اس نے ہٹھانوں کی خود مختاری کی جنگ جاری رکھی۔ جو لوگ شاہی دربار کی طرف سے مامور ہوئے تھے انہوں نے اس کے خاندان میں نفاق کا بیج بو دیا، حتیٰ کہ خود اس کا بیٹا اشرف خان اس کی مخالفت پر اتر آیا۔ پھر ۱۰۹۱ھ / ۱۶۸۰ء میں اس کے دوسرے بیٹے بہرام خان نے اس کے خلاف جنگ کی۔ رفتہ رفتہ خوشحال خان کی قوت گھٹتی گئی

اشعار ہیں: (۲) بازنامہ: یہ کتاب پشتو نثر میں ہے اور اس میں شکار کا طریقہ اور شہباز کے امراض کا بیان ہے: (۳) صحت الابدان: ایک پشتو نظم، جس میں طب اور اصول صحت بیان کیے گئے ہیں: (۴) ترجمہ ہدایہ: نثر کی یہ کتاب فقہ حنفی پر ہے: (۵) آئینہ: فقہ کی ایک عربی کتاب کا پشتو نثر میں ترجمہ ہے: (۶) فضل نامہ (۱۸۹۰ء/۱۳۰۸ء): بحر خفیف میں ایک پشتو مثنوی، جو فقہی مسائل پر ہے: (۷) سوات نامہ: پشتو کے چار سو اشعار پر مشتمل ایک نظم، جس میں سوات کے سفر کے حالات ہیں: (۸) فرخ نامہ: پشتو میں شمشیر و قلم کا منظرہ: (۹) فرات نامہ: جس نامہ: پشتو میں قید و بند کے حالات نظم کیے ہیں: (۱۰) دستار نامہ: پشتو نثر میں اخلاق، سیاست اور اجتماعیات پر ایک تالیف: (۱۱) ریاض: پشتو نثر میں تاریخی یادداشتیں: (۱۲) زنجیری: پشتو نثر کی کتاب، جس میں مختصر نویسی (short-hand) کے اصول بیان کیے گئے ہیں: (۱۳) ریاض الحقیقت، خوشحال خان نے اپنے بچھے ایک بڑا خاندان چھوڑا۔ اس کے بیٹوں میں سے سائے کے نام ہمیں معلوم ہیں۔ ان میں سے بعض صاحب دیوان و تصانیف ہوئے مثلاً اشرف خان المتخلص بہ ہجری، سکندر خان، عبدالقادر خان، گوہر خان اور صدر خان۔ بیٹیاں اس کی ہنس تھیں، جن میں سے بی بی حلیمہ عالمہ اور شاعر تھیں۔ خود اس کے اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کے علاوہ خوشحال خان کے اخلاف میں بڑے بڑے مؤلف، شاعر اور سؤرخ گزرے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ شہرت افضل خان نے باقی، جس نے تاریخ، رصیع، وغیرہ کتابیں تالیف کیں۔ اسی طرح کاظم خان المتخلص بہ شہر پشتو میں صاحب دیوان ہوا۔

مآخذ: (۱) دیوان خوشحال خان، طبع Hellew بشاور ۱۸۹۹ء: (۲) دیوان خوشحال خان، ہونی مردان ۱۹۲۹ء، قندہ: (۳) کلیات خوشحال خان، قندہار ۱۹۳۷ء

اور آخر پیرانہ سالی کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے گوشہ نشینی اختیار کر لی اور بروز جمعہ ۲۸ ربیع الآخر ۱۳۱۰ھ/۱۹ فروری ۱۸۹۹ء کو اٹھتر برس کی عمر میں وفات پائی۔ [اکوڑہ سے چار میل مغرب میں] بسوڑی کے مقام پر پہاڑ کے دامن میں اس کا مدفن ہے۔ اس کی آخری وصیت تھی کہ مجھے ایسی جگہ دفن کرنا جہاں نعل سواروں کے گھوڑوں کی گرد راہ نہ پہنچ سکے۔ [لوح مزار پر اس کا ایک شعر کندہ ہے جس کا مفہوم یہ ہے: "میں نے افغان قوم کی عزت و ناموس کے لیے تلوار کمر سے باندھ لی ہے۔ میں ہوں زمانے کا غیور و جسور اور باحمیت خوشحال خان خٹک"]۔

خوشحال خان خٹک کا مذہب تھا۔ اس نے شیخ رحم کار عرف کا کا صاحب [رک بان] (م ۲۲ رجب ۱۲۳۰ھ) سے بیعت کی تھی۔ وہ ایک دلاور اور جنگجو سپہ سالار ہونے کے علاوہ ایک ممتاز عالم، شاعر اور صاحب تصنیف و تالیف بھی تھا۔ اسے بابائے پشتو کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس نے پشتو اور فارسی میں پینتالیس ہزار اشعار کہے ہیں، جن میں غزلیں، قصیدے، رباعیاں، قطعے، مسدس، مخمس، معشر اور توکیب بند وغیرہ عروض پشتو کے مطابق شامل ہیں۔ فارسی میں بھی اس کی متعدد غزلیں ہیں، جن میں اس نے روہی اور کوہی تخلص کیا ہے۔ اس نے ایسے اشعار بھی کہے ہیں جن میں پشتو اور اردو دونوں زبانوں کے کلمات ہیں۔

اس کے تمام اشعار میں عشق، اخلاق، تصوف اور اجتماعی مسائل کے مضامین ہیں۔ وطن دوستی اور رزمیہ اشعار بھی کافی دارج ہیں۔ اس کے کلام میں بعض اوقات خوش طبعی بلکہ ہزل گوئی بھی باز با جاتی ہے۔ ادبیات کا استحضار کرنے والے بعض مؤلفوں نے اس کی کتابوں کی تعداد دو سو سے زائد بتائی ہے، لیکن ان میں سے مشہور اور موجود حسب ذیل ہیں:

(۱) دیوان یا کلیات: اس میں تقریباً سولہ ہزار

روم کا باشندہ تھا، اگرچہ بہت سے لوگ سلطان بیرس ثانی [رک باں] اور سلطان لاجن ۵۶۹۶/۵۶۹۷ء تا ۵۶۹۸ء کے متعلق بھی یہی بات کہتے ہیں۔ سلطان شیخ [رک باں] نے اسے ایک غلام کے طور پر خریدا اور وہ چمداریہ [رک بہ چمدار] میں بھرتی کر لیا گیا۔ پھر وہ شیخ کے بیٹے احمد کے عہد میں، جس نے صرف چند مہینے حکومت کی، خاصگی (بائی گارڈ) ہو گیا۔ سلطان چقمق [رک باں] کے عہد میں کہیں جا کر ۵۸۴۶ء میں وہ دس سلوکوں کا امیر اور "رأس نوہ" [سر رئیس نوبت] مقرر ہوا۔ ۵۸۵۰/۵۸۴۶ء میں وہ ایک ہزار سلوکوں کا امیر [یک ہزاری امیر] اور ۵۸۵۲ء ۵۸۴۸ء میں قاہرہ کا حاجب العجائب (نوجی عدالت کا صدر) مقرر ہوا۔ تین سال بعد سلطان اینال کے عہد حکومت میں وہ وزیر جنگ ہو گیا اور ۵۸۶۰/۵۸۵۶ء میں اس نے قرمان کے امیر کے خلاف ایک مہم کی قیادت کی اور اس کی فوج سے مدد بھیڑ ہوئے بغیر اس کے علاقے کو بہت بیدردی سے ویران کیا۔ اینال کے بیٹے احمد [رک بہ اینال] نے اسے اتابک [رک باں] یعنی سپہ سالار فوج] مقرر کر دیا؛ مگر اشرافیہ (سلطان اشراف اینال کے مسالیک) سلطان احمد سے غیر مطمئن تھے اور انہوں نے اس کے خلاف سازش کر کے دمشق کے گورنر جانم کو تخت و تاج پیش کیا؛ تاہم ظاہریہ (سلطان ظاہر چقمق کے مسالیک) نے خوش قدم کو ترجیح دی، اس لیے انہوں نے بعجلت تمام اتابک خوش قدم کو جانم کے پہنچنے سے پہلے ہی سلطان بنا دیا اور احمد کو قید کر کے اسکاٹریہ بھیج دیا۔ بعد میں جانم قاہرہ کے قریب پہنچا تو اس کے لیے خوش قدم کو سلطان تسلیم کرنے اور دمشق واپس چلے جانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ دمشق میں وہ اپنے آپ کو دیر تک محفوظ نہیں سمجھتا تھا اس لیے اس نے آق قوبوللو ترکمانوں کے سلطان حسن الطویل کے پاس پناہ لی، جہاں وہ چند ہی روز بعد قتل کر دیا گیا۔ ظاہریہ کا

بالخصوص مقدمہ از عبدالحی حبیبی: (۴) کلیات خوشحال خان؛ پشاور ۱۹۵۲ء؛ مقدمہ: (۵) محمد زردار خان ناشر؛ مولت افغانی؛ مطبوعہ تولکشور ۱۸۷۶ء؛ (۶) گلشنِ رده؛ طبع Ravery؛ لندن ۱۸۶۰ء؛ (۷) محمد حیات خان؛ حیات افغانی؛ لاہور ۱۸۷۳ء؛ (۸) ترانہائی ملی افغانی؛ طبع Darmesteter؛ پیرس ۱۸۸۸ء؛ (۹) کلید افغانی؛ طبع Hughes؛ لاہور ۱۸۹۳ء؛ (۱۰) شیر محمد گنڈا پور؛ خورشید جہان؛ لاہور ۱۸۹۴ء؛ (۱۱) خوشحال خان خٹک پر مختلف مضامین؛ از مریدی و جلالی؛ در مجلہ کابل؛ ۱۹۳۸ء تا ۱۹۳۸ء؛ (۱۲) عبدالحی حبیبی؛ تاریخِ شعر ہشتو؛ در طلوع افغان؛ قندھار ۱۹۳۵ء؛ (۱۳) وہی مصنف؛ پشٹانہ شعرا؛ ج ۱؛ کابل ۱۹۳۰ء؛ (۱۴) وہی مصنف؛ پتہ خزانہ؛ کابل ۱۹۳۳ء؛ (۱۵) وہی مصنف؛ مقدسہ دیوان عبدالقادر خان خٹک؛ قندھار ۱۹۳۷ء؛ (۱۶) الفت؛ پشٹو سنڈریس؛ کابل ۱۹۴۵ء؛ (۱۷) صدیقی اللہ؛ رسالہ سد خانوادہ علمی؛ در سالنامہ کابل؛ ۱۹۴۵ء؛ (۱۸) وہی مصنف؛ تاریخ ادب ہشتو؛ کابل ۱۹۴۶ء؛ (۱۹) بنوا؛ خوشحال خان چہ سی گوید؛ کابل ۱۹۵۰ء؛ (۲۰) تاریخِ مرصع منتخب در گلشنِ رده؛ مخطوطہ در ہونی مردان؛ (۲۱) دوست محمد کامل؛ خوشحال خان خٹک؛ پشاور ۱۹۵۱ء؛ (۲۲) میر عبد الصمد خان؛ خوشحال و اقبال؛ طبع پشاور؛ Ravery؛ (۲۳) Grammar of the : Ravery؛ (۲۴) Bidulph؛ کلکتہ ۱۸۶۷ء؛ (۲۵) Afghan Language؛ (۲۶) Bidulph؛ (۲۷) Afghan Poetry of the Seventh Century؛ لندن ۱۸۹۰ء؛ (۲۸) The Cambridge History of India؛ (۲۹) دہل ۱۹۶۳ء؛ (۳۰) تا ۱۳۰۰ء۔

(عبدالحی حبیبی [و ادراہ])

* خوش قدم: [عربی مصادر میں حُشْدَم] الملک الظاہر [ابوسعید] سیف الدین التامری (یہ نسبت اس کے پہلے آقا کے نام سے ہے)، مصر اور شام کا سلطان؛ اس نے ۵۸۶۵ء/۵۸۶۱ء تا ۵۸۷۲ء/۵۸۶۷ء حکومت کی۔ وہ پہلا سلطان تھا جو (ایشیائے کوچک کی) سلطنت

کہ ایک جہاز کو، جسے رودوس کے Knights نے پکڑ لیا تھا، تاوان دے کر چھڑا لیا، مگر سلطان خوش قدم چاہتا تھا کہ جب تک جیمز باقاعدگی سے خراج ادا کرتا رہے اس سے الجھا نہ جائے۔ جیمز اپنے باجگذار آق قویونلو (ع: القطیع الایض) کے سلطان حسن الطویل کا بکا حلیف تھا کیونکہ مؤخر الذکر کو قراوقیونلو (ع: القطیع الاسود) کے سلطان اور خاندان ذوالغادر کے والیان ابلستین کے خلاف مسلسل جنگ و جدال کرنے کے لیے سلطان مصر کی امداد پر انحصار کرنا پڑتا تھا۔

بنابریں حسن، جس کے تعلقات عثمانی سلطان محمد ثانی سے بھی کچھ زیادہ خوشگوار نہ تھے، ان سب جنگوں اور سازشوں کے دوران میں خوش قدم کا وفادار رہا۔ سلطان محمد ثانی نے حسن کے رشتے دار طرابزون کے پوزنطی شہنشاہ کی حکومت کا خاتمہ کر دیا تھا، اس کے جواب میں حسن نے خوش قدم کے ساتھ مل کر فرمان کے حاکم اسحق کی مدد کی، جو عثمانی ترکوں سے جنگ کر رہا تھا۔ اس نے اور سلطان نے ابلستین کے والیوں بداع، اور رستم کو ان کے حریف شاہ سوار کے خلاف، جو ترکوں کے ساتھ تھا، منصب ولایت حاصل کرنے میں مدد دی (رک بہ قایت ہے)۔ اگرچہ ان دونوں سلطانوں کے درمیان کبھی جنگ کی نوبت تو نہیں آئی مگر وہ ایک دوسرے کے دشمن ہی تھے۔

صیرت حال یہ تھی کہ خوش قدم سلاطین کے ممالک کو تو قابو میں رکھتا تھا، مگر اس کے اپنے ممالک عوام پر مظالم ڈھاتے رہتے تھے۔ سلطان ۸۷۳ھ/ ۱۴۶۷ء میں بیمار پڑا اور دس دن (ابن اباس کے نزدیک تقریباً چالیس روز) کی علالت کے بعد فوت ہو گیا۔

[سلطان خوش قدم ایک جلیل القدر حکمران تھا اور احوال مملکت سے خوب واقفیت رکھتا تھا (ابن اباس، ۸۷۳ھ)۔] اس کے عہد میں مصر میں بڑا امن وامان رہا اور مصر [ھر تسم کے فتنہ و فساد اور] ویاؤں سے بھی محفوظ رہا۔ وہ قدیم نظام مملکت کا حامی

ایک اور بارسوخ امیر والی جتہ جاتی ہے، ابن اباس کے ہاں: جاتی ہکا جس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ سلطان کو سب کچھ اسی کے طفیل حاصل ہوا، اسی کے حکم سے قتل کر دیا گیا۔ اس طرح اس نے مملوک فوج کو اس کے سرداروں سے معروم کر دیا اور ایک حصہ فوج کو دوسرے کے خلاف کھڑا کرنے میں کامیاب ہو گیا؛ مملوک سردار قبرص کے خلاف ان مہمات کی وجہ سے بھی کمزور ہو گئے تھے جو ایتال کی حکمت عملی کا نتیجہ تھیں۔ مؤخر الذکر نے شاہ جیمز (James) کو اس کی بہن شارلٹ (Charlotte) کے خلاف مدد دی جو خود رودوس (Rhodes) کے St. John کے فوجی سرداروں (Knights) کی مدد کی متوقع تھی۔ ایتال نے اپنے عہد حکومت کے آخری دنوں میں طرابلس کے والی کو اس ملک کے خلاف ایک مہم سپرد کی، لیکن مصر کا بادشاہ بدل جانے کی وجہ سے وہ تھوڑے ہی عرصے میں مہم میں مصروف رہ سکا۔ وہ امرا جو شاہ جیمز کی امداد کے لیے دستہ فوج کے ہمراہ قبرص پہنچے گئے تھے، جاتی ہے کے قتل کے بعد گڑ بڑ بھیلنے کی وجہ سے واپس آ گئے، ان میں مختصر سی فوج کے ساتھ صرف ایک امیر کو قبرص میں چھوڑ دیا گیا۔ دارالسلطنت فاماگوستا Famagusta میں جیمز کے سامنے ہتھیار ڈال دیے گئے اور وہ اب عملی طور پر پورے جزیرے کا مالک ہو گیا؛ اس لیے اسے مصریوں کی امداد کی کوئی ضرورت باقی نہ رہی۔ مصریوں سے خلاصی حاصل کرنے کے لیے اس نے Famagusta کے باشندوں کو عقب سے مصریوں پر حملہ کرنے کے لیے اکسایا اور بعد میں ان پر خود بھی ٹوٹ پڑا۔ سلطان کی جواب طلبی پر اس نے اس قتل عام کو سلطان کی اپنی رعایا کی شورش پر محمول کیا اور اپنے آپ کو اس سے بالکل بری الذمہ ظاہر کیا۔ ملکہ شارلٹ نے خوش قدم کی امداد حاصل کرنے کے لیے اسے صحیح واقعے سے آگاہ کر دیا نیز اس طرح بھی اس کی خوشنودی حاصل کی

Tai ts'ing yi t' ung ch. بعد ۱۸۱۵ء تا ۱۸۲۱ء بعد Asiatick سے دیا ہے۔ اُردانا بعد میں وسطی ایشیا کے مسلمان حکمرانوں کے ایک وٹانی کا رکن ہو گیا جس نے چین کے خلاف افغانستان کے فرسانرو احمد شاہ درانی سے مدد کی درخواست کی۔ اس اتحاد کے کچھ مزید نتائج برآمد نہ ہوئے، اگرچہ ۱۷۹۳ء میں احمد شاہ فوج لے کر قزاقستان میں وارد ہوا اور اس نے خوقند اور تاشقند کے درمیانی علاقے پر قبضہ کر لیا، اسی اثنا میں خوقند سے قرہ قرگز کے علاقے پر بھی حملہ کیا گیا۔ (Klaproth : کتاب مذکور، ص ۸۳)، لیکن بعض اور اطراف میں مہمات درپیش ہونے کی وجہ سے اسے جلد ہی واپس جانا پڑا۔ عبدالکریم کا پوتا ناربوتہ بیگ بھی (عہد حکومت اغلباً ۱۸۱۸ء / ۱۷۷۳ء - ۱۷۷۵ء تا ۱۸۱۳ء / ۱۷۹۸ء - ۱۷۹۹ء) دیکھیے L. Zimin در Protokoli Turk. Kruška Lyub. Arkheologii : ۱۸ : ۱۰۲ : نیز Walidow : وہی کتاب، ص ۲۰ : ۱۱۲ (بعد) برای نام چین کے ماتحت تھا۔ اس عہد کے شروع کے برسوں سے روسی سارجنٹ Filipp Yefremow کی سیاحت وابستہ ہے جسے ۱۷۷۳ء میں اہل قرگز نے قید کر کے بخارا میں فروخت کر دیا تھا اور جو ۱۷۸۲ء میں ہندوستان اور انگلستان ہوتا ہوا روس واپس پہنچا۔ اس کے سفر نامے کے مطابق (F. Yefremow : Stranstvovaniye v Bukharikh, iufe, Persii w Indii بار دوم، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۷۹۳ء، ص ۵۹ (بعد)، ناربوتہ کوچینیوں نے پہلے ہی سے خان کا خطاب دے رکھا تھا، اس کا چین سے اتحاد تھا اور بخارا سے عائد۔ اس سفر نامے میں دارالسلطنت کی ممتاز عمارتوں کا کوئی ذکر نہیں (مدرسہ میں ناربوتہ کے عہد میں تعمیر ہوا) : برعکس اس کے مرغینان کی مندی میں واقع ایک بلند ستون (بظاہر مینار) کی کیفیت بیان کی گئی ہے، جو کہا جاتا ہے کہ ۲۸۰ فٹ بلند تھا۔ بقول Filipp Nazarov (دیکھیے نیچے) یہ مینار بحاس

اور شریعت کا بابت (دیکھیے ابن ابیاس، ص ۲ : ۸۳) تھا اور قایت پیر کے برعکس پرانے رسم و رواج کی بہت سختی سے پابندی کرتا تھا [خوش قدم علماء و صالحا کی بڑی تعظیم و تکریم کرتا تھا : دیکھیے ابن ابیاس، ص ۲ : ۸۳]۔

مآخذ : (۱) ابن ابیاس، یولاق ۱۳۱۱ء : ص ۷۰ تا ۸۸ : (۲) 'Geschichte der Chalifen : Weil : ۲۱۵ تا ۲۸۰ : (۳) The : Sir William Muir : ۲۱۵ تا ۲۸۰ : 'Mamluke or Slave Dynasty of Egypt' ص ۱۶۲ تا ۱۷۰

(M. SODERNHEIM)

خوقند : (Kholand) عربی شکل : خوانند، جسے بعد میں خوقند لکھا جانے لگا (اس کی وجہ تسمیہ عام طور پر اس طرح بیان کی جاتی ہے : خوق (خوک) + تند : جنگلی سوروں کا شہر)، فرغانہ کا ایک شہر قبہ اوپر : ص ۶۶ تا ۶۶ : جہاں اس نام کے دوسرے مجھے دیے گئے ہیں۔ اور بارہویں (اٹھارویں) صدی میں ایک خود مختار ازبک سلطنت کا بھی ذکر ہے، جس کا دارالحکومت خوقند تھا۔ پہلے حکمران شامرخ کی تخت نشینی کے بعد وہاں ایک قلعہ تعمیر ہوا۔ اس کے بیٹے عبدالکریم (م - ۱۷۴۹ء) نے انک اور قلعہ بنوایا جو بعد میں "اسکی اُردہ" "Eski Urda" کے نام سے مشہور ہوا۔ عبدالکریم اور اس کے بھتیجے اور جانشین اُردانابی کا ذکر کئی مرتبہ اثنالیق محمد رحیم کی تاریخ میں آیا ہے جو بعد میں بخارا کا خان ہوا (م ۱۷۵۹ء)، محمد وفا کریمینگی : تحفة الخانی، Anal. Mus. کا مخطوطہ، ۵۸۱ ب، خصوصاً ورق ۳۳ ب (بعد، ص ۱۵۵ ب (بعد)۔ جب قلعہ قسطنطنیہ تباہ ہو گئی اور سلطنت چین کی سرحد بڑھ کر فرغانہ تک پہنچ گئی (۱۷۵۸ء) تو اُردانا کو بھی مجبوراً چین کی سیادت تسلیم کرنی پڑی۔ اس کے متعلق حینی تذکروں کا حوالہ I. Klaproth نے Magasin

versis (تیس میل سے زائد) فاصلے سے نظر آتا تھا۔

ناروتوہ کے دو بیٹے عالم اور عمر خوقند کی ریاست اور شہر کے بانی تھے۔ اس نام کے عہد حکومت کی سلسلہ وار تاریخیں (۵۰۲۱۳/۱۷۹۸-۱۷۹۹ء تا ۵۰۲۳۷/۱۸۲۱-۱۸۲۲ء) یورپے و ثوق سے معلوم نہیں ہو سکیں۔ یہاں تک کہ وہ سال بھی، جس میں عالم قتل ہوا اور عمر کو تخت سلطنت پر متمکن کیا گیا، مآخذ میں مختلف طور پر درج ہے۔ تاریخ شاہرخس (طبع Panturaw، ص ۱۰۶) کے مطابق عمر کی وفات ۵۱۲۳۷/۱۸۲۱-۱۸۲۲ء میں ہوئی (حساب ادوار میں "سال اسپ" = ۱۸۲۲ء)۔ بقول Nalivkin (روسی متن) ص ۱۰۱: فرانسیسی ترجمہ، ص ۱۲۴) جس نے یہاں ایک اور مآخذ (حکیم خان کی منتخب التواریخ) کی پیروی کی ہے: عالم ۵۱۲۳۲ (یعنی ۱۸۱۷ء) نہ کہ ۱۸۱۹ء جیسا کہ Nalivkin نے لکھا ہے) کے موسم بہار تک قتل نہیں ہوا تھا۔ اس کے برعکس خود Nalivkin ایک اور جگہ (روسی اصل متن، ص ۱۸۵، فرانسیسی ترجمہ، ص ۲۲۸) یہ کہتا ہے کہ خوقند کی بڑی مسجد عمر خان نے ۵۱۲۳۱/۱۸۱۵-۱۸۱۶ء میں بنوائی تھی۔ روسی ترجمان Philipp Nazarov جو ۱۸۱۳-۱۸۱۴ء کے موسم سرما میں خوقند میں تھا، وہاں کے فرمانروا کو امیر و قیامی Wailiami کہتا ہے (Zapiski o niekotorykh narodakh Srednney Azie، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۲۱ء، ص ۵۰ بعد)۔ غالباً یہ نام "ولی الیمی" ہے نہ کہ "ولی بیٹی" جیسا کہ Klaproth کی کتاب مذکور، ص ۴۵ میں ہے۔ اس وقت وہاں کے فرمانروا کی عمر صرف پچیس سال کی تھی۔ یہ بیان صرف عمر ہی پر صادق آ سکتا ہے نہ کہ عالم پر، جو عمر میں اس سے کہیں بڑا تھا؛ عبدالکریم البخاری کے قول کے مطابق بھی (طبع Schefer، ص ۱۰۲) یہ سفارت اور اس کا سبب (یعنی ایک روسی فوجی سپاہی کے ہاتھوں Petropawlowsk میں خوقندی ایلیچی کا قتل)

دونوں عمر خان کے عہد حکومت میں واقع ہوئے۔ بقول عبدالکریم ص ۱۹۹، عالم ۵۱۲۲۸/۱۸۰۹ء ہی میں قتل ہو چکا تھا، لیکن یہ بیان صحیح نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کی ایک دستاویز ہمارے پاس موجود ہے جس کی تاریخ جمادی الاولیٰ ۵۱۲۲۵/جون ۱۸۱۰ء ہے (Protokoll Turk krugka, Lyub. Arkh.)، ص ۱۶۵:۳ (بعد)، اس لیے فرمانروا کی تبدیلی لازمی طور پر ۱۸۱۰ اور ۱۸۱۳ء کے درمیان ہونی ہوگی۔

عالم کے عہد کی قدیم ترین دستاویز مؤرخہ ۵۱۲۱۳/۱۷۹۸-۱۷۹۹ء سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس وقت تک اپنے آپ کو کسی غیر معلوم الاسم خان کا نمائندہ سمجھتا تھا! بعد میں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک خود مختار حکمران کی حیثیت سے خان یا امیر کے لقب سے مقب ہو گیا تھا۔ تاشقند کی فتح کے بعد وہ قوت و اقتدار میں امیر بخارا کا ہم پلہ ہو چکا تھا۔ عمر کے عہد حکومت میں ۱۸۱۹ء میں (Nazarov) بھی یہی کہتا ہے، نہ کہ ۱۸۱۹ء میں، جیسا کہ Nalivkin روسی اصل متن ص ۱۱۰ بعد: فرانسیسی ترجمہ ص ۱۳۴ بعد میں مرقوم ہے) ترکستان کا شہر اور اس سے متعلق قرہ گز کے وسیع میدانوں کا ایک حصہ خوقند کی سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔ اس کے فوراً بعد عمر نے امیر المسلمین "کا لقب اختیار کر لیا۔ عالم اور عمر دونوں کے عہد حکومت میں اورہ توبہ (Ura Tobe) پر قبضے کے لیے بخارا سے متعدد جنگیں ہوئیں۔ واقعہ یہ ہے کہ روسی فتح کے وقت تک یہ شہر ان دونوں حکومتوں کے درمیان جھگڑے کا باعث بنا رہا۔ کہا جاتا ہے کہ بچوں کے ایک کھیل "اورہ توبہ میرا ہے"، میں اب تک ان جنگوں کی یاد باقی ہے (Zlzn Nactonalnostey، ۱۹۱۳ء، ص ۱:۱۹۵)۔ عمر کی داخلی حکمت عملی اپنے پیشرو سے بالکل مختلف تھی۔ عالم نے اور بہت سے ایشیائی حکمرانوں کی طرح ازبک خاندانوں کے اقتدار کو ختم کرنے کا

اورا توبہ کر خدایار کے قبضے کے بعد دشمنوں کے سروں کا انک سباز (کٹہ سباز) بٹاتا گیا۔

اس کے باوجود اس سلطنت نے روسی فتح تک اپنی سابقہ وسعت برقرار رکھی۔ روسی لشکر ۱۸۵۵ء سے دریائے سیحون کے بالائی حصے میں اس دریا کے دہانے سے تقریباً دو سو میل کے فاصلے پر اور شمال مشرق میں ۱۸۶۰ء سے دریائے چو (رگ بآن) اور اولی کے درمیانی علاقے میں خان خوقند کی سپاہ کے مد مقابل تھے۔ یہ سب علاقے اب تک والی تاشکنت کے ماتحت تھے، جس کا یہ بھی فرض منعی تھا کہ وہ ان علاقوں میں زراعت کو برقرار رکھے۔ کہا جاتا ہے کہ والی میرزا احمد (۱۸۵۳ء تا ۱۸۵۸ء) نے ترکستان کے شہر دے سے دریائے چو کی وادی تک آب رسانی کے انتظامات کیے۔ ۱۸۶۵ء میں روسی فتح سے صرف کچھ عرصہ پہلے تاشکنت امیر بخارا کے قبضے میں چلا گیا۔ ۱۸۶۶ء سے خوقند کی سلطنت فرغانہ تک محدود ہو گئی اور اس علاقے کی حدود کے اندر ۱۸۶۸ء کے روسی معاہدے تک بھی خود مختار رہی۔ اسی زمانے میں الگ نبر کی کھدائی ہوئی (Einblicke in das Ferghana-Thal: Middendorf) سینٹ پیٹرزبرگ (۱۸۸۱ء ضمیمہ، ص ۲۱)، نیز متعدد عمارتیں (جیسے اوردہ نا قصر خان جس کی تصویر اکثر کتابوں میں ہے، مثلاً *Turkestan: Fr. v. Schwarz*، ص ۴۱۲؛ اور اس سے بہتر *Turkestan: W. Masalskiy Krai*؛ سینٹ پیٹرزبرگ ۱۹۱۳ء، ص ۷۰۱ اور ۷۰۳ میں؛ مدرسہ حاکم امین اور مدرسہ محمد سلطان مراد بیگ، جو خان کی والدہ اور بھائی نے قائم کیے ان کی تصویریں *Islamoviedeniye*، M. Ostroumow، ص ۱۸۳ میں ہیں) اسی زمانے میں تعمیر کی گئیں۔

خان خدا یار کی معزولی کے بعد، جو ایک عام بغاوت کا نتیجہ تھی اور جس کی وجہ سے نئی مشکلات پیدا ہو گئیں، باقی ماندہ سلطنت بھی "علاقہ فرغانہ" کے نام سے روسی سلطنت میں شامل کر لی گئی۔ روسی

بہر حال اسی سال کے دوران میں فائنچین دوبارہ نکال باہر کیے گئے اور شیر علی کو، جو عالم اور عمر کا ہم حد تھا تخت پر بٹھایا گیا؛ لیکن روسی فتح کے وقت تک اندرونی امن و امان زیادہ عرصے کے لیے کبھی بحال نہیں ہوا۔ شیر علی (۱۸۴۲ء تا ۱۸۵۵ء) اور اس کے بیٹے خدایار (۱۸۵۵ء تا ۱۸۵۸ء اور ۱۸۶۵ء تا ۱۸۷۵ء) اور ملّا (۱۸۵۸ء تا ۱۸۶۲ء) اور ان کے علاوہ متعدد قصیر مدت حکمرانوں کے ادوار حکومت مسلسل انتشار اور خاص طور پر قیچاق کے ازبکوں اور سرتوں، یعنی مقامی باشندوں کی باہمی جنگ و جدال کا زمانہ تھے۔ خدایار کو، جو ابھی نابالغ تھا قیچاق کے سردار مسلمان قلی نے سردر سلطنت پر متحکم کیا تھا۔ قیچاق نے دارالسلطنت کے سرتوں (Sarts) ان کے گھروں سے نکال دیا اور مالک کی لمروں پر قبضہ کر لیا؛ سرتوں کو صرف ایک مقررہ رقم ادا کرنے کی صورت میں انہیں کھیتوں کے لیے ضروری باقی لینے کی اجازت تھی۔ ۱۸۶۹ء/۱۸۵۲ء سے خدایار نے مسلمان قلی کو دیرلے کی سرداری سے الگ کر کے قتل کرا دیا اور اس طرح یہ علاقہ دوبارہ سرتوں (sarts) کے قبضے میں آ گیا۔ اس کے بعد ملّا نے قیچاق کی اعانت پر بھروسہ کیا اور زمینیں، جو سرتوں نے ان سے چھین لی تھیں انہیں واپس دلا دیں۔ وطن سے نکلے ہوئے مدعیان سلطنت بالعموم بخارا میں پناہ گزین ہو جاتے تھے۔ ان حالات سے فائدہ اٹھا کر ۱۸۷۵ء/۱۸۵۸ء میں نصرانہ پیش قدمی کر کے خجندہ تک آ پہنچا اور اس کا جائشین مظفر ۱۸۷۹ء/۱۸۶۲ء میں اور دوسری بار ۱۸۸۲ء/۱۸۶۵ء میں خوقند پر قابض ہو گیا۔ وطن کے اندر اور وطن سے باہر دشمنوں کے خلاف لڑائی میں قرون وسطی کی سی بے رحمی برتی جاتی تھی۔ مدلی کے خسر محمد شریف اتالیق کو، جو تاشکنت کا والی تھا، خان شیر علی کے حکم سے ایک گھوڑے کی دم سے باندھ کر بے آب و گیاہ میدانوں میں گھسیٹا گیا۔ ۱۸۶۵ء/۱۸۵۸ء میں

خولانہ (۱) : جنوبی عرب کے ایک قبیلے کا *

نام - جنوبی عرب کے قدیم کتبوں میں بھی اس قبیلے کا ذکر موجود ہے (Glaser)، ص ۲۶، ۱۸۰ بعد اور Halevy، ص ۵۸۵ میں ۱۱ بعد (.....)۔ اس قبیلے کے علاقے کا حوالہ (.....) کتبہ (Glaser)، ص ۱۱۹ میں ۵ میں موجود ہے اور اس نام کے ایک خاندان کا ذکر Glaser، ص ۲۰۳ میں ملتا ہے۔ ان سب عبارتوں سے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے کہ قبیلہ خولان ایک ہزار قبل مسیح کے زمانے ہی میں اس علاقے میں آباد ہو گیا تھا۔ یہاں قبیلہ خولان یا کم از کم اس کا ایک حصہ آج بھی موجود ہے، یعنی اس سرزمین میں جو صنعاء اور مارب کے درمیان واقع ہے اور جسے الہمدانی نے "خولان العالیہ" لکھا ہے، یہ ذوجرمہ سمیت یمن کے انتہائی زرخیز علاقوں میں سے تھا؛ یہاں بالعموم مکئی، باجرا، جو اور بالخصوص گیہوں کی پیداوار بکثرت ہوتی ہے۔ قبیلہ خولان اب قبیلہ بکیل گبری کا ایک جزو ہے، جو تقریباً اسی ہزار مسلح آدمی میدان جنگ میں لاسکتا ہے۔ مسیح Glaser نے اس قبیلے کے علاقے کی ۱۸۸۵-۱۸۸۶ء میں جہان بین کی تھی۔ عرب ماہرین انساب خولان بن عمرو بن مالک بن العارث بن مرة بن ادد بن زید بن ایشجب بن عروبہ بن زید بن کنہلان بن سبا کو اس قبیلے کا جد امجد قرار دیتے ہیں جس کے نام پر اس قبیلے کا نام رکھا گیا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ خولان بن عمرو بن الحاف بن قضاہ اس کا مورث اعلیٰ تھا، جس کے جد امجد کے نام پر یہ لوگ خولان قضاہ بھی کہلاتے ہیں؛ تاہم خولان العالیہ اور خولان قضاہ کے درمیان تفریق نسبی نہیں بلکہ جغرافیائی ہے، کیونکہ اول الذکر بھی، کم از کم نشوان کے قول کے مطابق، قضاہ ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ تفریق دراصل اس طرح پیدا ہوئی کہ شروع میں تو خولان کا پورا قبیلہ مارب اور مترواح کے درمیان آباد تھا لیکن سرور زمانہ سے اس کا ایک حصہ نقل وطن کر کے ان بلند علاقوں میں چلا گیا جو صنعاء

حکومت میں بھی خوفند کی حیثیت اس علاقے کے سب سے بڑے شہر (۱۹۱۱ء کی مردم شماری کی رو سے اس کی آبادی ۱۱۳۶۶۶ تھی) اور اہم تجارتی مرکز کے طور پر برقرار رہی۔ جدید مرغیلان کا شہر، جو بعد میں Skobelew کہلایا اور اب فرغانہ کے نام سے موسوم ہے، والی کا صدر مقام تھا۔ ۱۹۱۷ء میں خوفند نے آخری مرتبہ میدان سیاست میں اپنا کردار ادا کیا، اور وہاں ترکستان کی خود مختار حکومت کی تشکیل ہوئی؛ دوسرے سال سرخ فوج نے اس حکومت کا خاتمہ کر دیا۔

مآخذ: (۱) *Kratkaya Istoriya*: W. Nalivkin

Kokandskogo Khanstva قازان ۱۸۸۵ء: (۲) تبصرہ از

Zapiski Vost. Otd. R. Arkh. در *N.V. [eselnowskiy]*

Obshch. ۱: ۲۲۷ بعد: (۳) *Histoire*: V.P. Nalivkin

du Khanat de Khokand مترجمہ 'A. Dozon' پیرس

۱۸۸۹ء: (۴) تبصرہ از *V.R. [osen]* در *Zapiski* وغیرہ

۱۲۶ بعد۔ ماخذ کے متعلق نیز دیکھیے: (۵)

V. Smirnov در *Collection scientifique de l'Inst. des*

langues orient. وغیرہ ج ۸ 'Manuscrits turcs'

سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۹۷ء ص ۱۵۰ بعد: (۶) *W. Barthold*

در *Zapiski* وغیرہ ۱۰۵: ۱۵ بعد: ۲۷۲

بعد: (۷) *A.Z. Walidow* کتاب مذکور ۲۰۳: ۲۰۳ بعد

۳۱۰ اور ۳۲۰-۱۸۷۶-۱۸۷۵ء کی جنگ کے لیے دیکھیے

خصوصاً: (۸) *Na pasnyas' o Ferganle*: A.I. Ilyanov

Noviy Margelan ۱۹۰۱ء ص ۱۵ تا ۷۰: (۹)

Samozvanci Pulushkan Ezegodnik: N.P. Koritov

Feganskoi Oblasti ج ۱ کتاب مذکور ۱۹۰۲ء

ص ۱۹ بعد: ۱۹۱۸-۱۹۱۷ء کی لڑائی کے متعلق:

(۱۰) *Kokandskaya Avtonomiya*: N. Tyurykulov

(*Shornik Statey v 4 godovshchinu sovet'skoi vlasti*)

Turkestanie تاشکنت ۱۹۲۲ء: نیز (۱۱) اخبار

آلغ ترکستان جو اس وقت خوفند میں شائع ہوتا تھا۔

(W. BARTHOLD)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے اور اپنے قبیلے کے مشرف بہ اسلام ہونے کا اعلان کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود انہیں اسلام کی تعلیم سے آگاہ کیا اور انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ اپنے بت "عم انس" کو توڑ دیں گے۔ اس کے بعد ان کی عزت افزائی کے طور پر انہیں ۱۰۰۰ اوقیہ پاندی کا تحفہ دیا گیا اور وہ اپنے وطن واپس چلے گئے۔ رسول اللہ کی وفات کے بعد شروع میں وہ بھی ارتداد کی عام تحریک میں شریک ہو گئے، لیکن ۱۱ھ/۶۳۲ء میں یحییٰ بن مسلمہ، جنہیں ابو بکر صدیقؓ نے کچھ تمزیری فوج دے کر بھیجا تھا انہیں دوبارہ دائرۃ اسلام میں لانے میں کامیاب ہو گئے۔ بن کے دیگر قبائل کی یہ نسبت سیاسی حیثیت سے خولان کے تعلقات مدینے کی حکومت سے بہت فریبی تھے۔ شاید اس کا سبب یہ تھا کہ ان کے تعلقات صنعاء کے ایرانی حکمرانوں سے بھی خوشگوار تھے۔ انہوں نے دو ایرانی شہزادوں جیش اور فیروز کو پناہ دی، جو قیس بن عبد یغوث بن سکنجوح کی قیادت میں عربوں کی بغاوت کی وجہ سے صنعاء سے نکلنے پر مجبور ہو گئے اور مدینے سے مدد پہنچنے تک ان کا ساتھ دیتے رہے۔ ۱۳ھ یا ۱۴ھ میں یمن کی فتح کے بعد جب بالآخر خولان کے علاقوں میں اسلام پوری طرح پھیل گیا تو جنوبی عرب کے جن باشندوں نے مصر کی فتح میں حصہ لیا اور وہاں آباد ہو گئے ان میں قبیلہ خولان کے بعض افراد بہت نمایاں تھے۔ حناجہ آج کل بھی مصر میں اہم عہدوں پر اکثر خولانی متعین نظر آتے ہیں۔ قاهرہ کے قدیم شہر (الفسطاط) میں ایک محلہ ان کے نام پر ہے اور بالعموم یہ نام (خولان) فراشیں بردی اور مزاروں کی لوحوں میں اکثر نظر آتا ہے۔

(۲) دمشق کے قریب ایک گاؤں کا نام جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک مشہور صحابی ابو مسلم عبدالرحمن بن منکرم الخولانی مدفون ہیں۔ مآخذ: (۱) ابن حوقل 'BGA' : ۳ و ۴ : (۲)

کے متعلق میں واقع ہیں اور اس وجہ سے خولان العالیہ کہلائے لگا۔ اس اثنا میں باقی ماندہ قبیلہ ماروب میں مقیم رہا اور کہیں بعد کے زمانے میں جا کر، جب انکے نئی ہجرت شروع ہوئی تو اس نے صنعاء کا رخ کیا، جو اب بھی خولان کے علاقے کا سب سے زیادہ اہم مقام ہے۔ نیبور Niebuhr کی سیاحت کے وقت بھی اس قبیلے کا علاقہ دو حصوں میں منقسم تھا، جن میں سے ہر ایک آج کل کی طرح ایک خود مختار شیخ کے زیرِ افسار تھا۔ ان میں سے شمالی حصے کے لوگ، Niebuhr کے بیان کے مطابق، زبیدی عقیدہ رکھتے ہیں اور ان کا علاقہ بقول F. Glaser صنعاء کے مغرب اور شمال مغرب کی طرف پھیلا ہوا ہے۔ حلی کی بندرگاہ سے، جو صنعاء اور مکے کے درمیان واقع ہے، صنعاء تک چار دن کی مسافت ہے۔ الہمدانی کا یہ بیان قابلِ توجہ ہے کہ اس حصے میں فصیح عربی صرف بند علاقوں میں بولی جاتی تھی اور اس کے برخلاف وادی اور علاقہ القہر میں ایک غیر فصیح بولی رائج تھی۔ خاص اس علاقے میں اب تک خولان کا نام دو اور نمایاں چیزوں سے بھی وابستہ ہے : ان میں ایک تو "خولان کی جوئی" (نہر خولان) ہے، یعنی ایک پہاڑی جوئی جو جبل ثعلبی سے دیکھی جاسکتی ہے اور دوسری چیز بیت خولان ہے، جو جبل خنصر کی جوئی کا نام ہے۔ خولان صنعاء میں نیبور Niebuhr نے صرف ان دیہات کا ذکر کیا ہے : عقبۃ المسلم، حیدان، دھریہ اور سوق الجمہ۔ بعض اور اسباب کے علاوہ قلعہ میں سونے کی ایک کان کی موجودگی سے، جو بنو سعد بن زوارہ بن خولان کی ملکیت تھی A. Sprenger کے ذہن میں رہا خیال تھا کہ خولان کا کچھ نفعی بائبل کے حوالہ سے ہے : اس سے پہلے Niebuhr نے بھی یہی نظریہ افسار کیا تھا۔ خولان صنعاء میں Niebuhr نے مندرجہ ذیل دیہات کا ذکر کیا ہے : بیت راجع، نعیم، بیت ایکسی، بیت النوم، میان، زراحہ، برائش۔ شعبان، ۱۱ھ/نومبر ۱۷۳۱ء میں خولان کا وفد

۳۲۰: ۲ بعد ۶۰۳-۶۶۶ء حاشیہ 'g' ۸۰۰ حاشیہ 'h' (۱۶)
 Zur orientalischen Altertums : J.V. Karabacek
 'kunde' ج ۵ 'Wien S.B. Ak.' ۱۹۱۵ء ۵/۱-۵
 حاشیہ ۱

(ADOLF GROHMANN)

الخونجی : افضل الدین محمد بن قنامور بن
 عبدالملک الشافعی المصری، ابو الفضائل، ابو عبد اللہ،
 ۵۵۹ھ / ۱۱۹۳ - ۱۱۹۸ء میں پیدا ہوا اور ۵ رمضان
 ۵۶۳ھ / [۲۲] دسمبر ۱۲۳۹ء فوت ہوا۔ الخونجی کا
 شمار مشہور مسلمان حکما اور اطبا میں ہوتا تھا۔
 علوم شرعیہ وغیرہ میں بھی اسے ید طولیٰ حاصل تھا۔
 ابن ابی اصیبعہ نے، جو ۵۶۳ھ / ۱۲۳۲ - ۱۲۳۵ء میں
 قاہرہ میں اس کی خدمت میں پہنچا، لکھا ہے کہ میں
 نے اسے سارے علوم میں کامل پایا۔ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ
 الخونجی سے اس نے ابن سینا القانون کے جزء الکلیات کا
 کچھ حصہ پڑھا۔ تفکر و تدبر کی عادت کی وجہ سے یہ فاضل
 سوچ میں بڑ جاتا تو دیر تک اسی حالت میں مستغرق
 رہتا۔ وہ مدرسہ صلاحیہ قاہرہ اور دیگر مدرسوں میں
 درس بھی دیتا رہا۔ عمر کے آخری حصے میں وہ مصر
 اور اعمال مصر کے قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز ہوا۔
 جب وہ فوت ہوا تو اسے جبل مقطم میں دفن کیا گیا
 اور شیخ عزالدین محمد بن حسن الضریو اولیٰ نے اس
 کا مرقبہ لکھا، جس کے چند اشعار عیون الانباء میں دیے ہیں۔
 تالیفات : اس نے طب اور منطق پر متعدد

کتابیں لکھیں : (۱) شرح ماقالہ الرئيس ابن سینا فی
 (عیون الانباء ۲ : ۱۲۱) : (۲) شرح الکلیات، اس
 نسخہ پیرس میں ہے، دیکھیے براکلمان : کتاب
 ۱ : ۸۲۳ (لیجے سے دوسری سطر) : (۳) کتاب
 ادوار الحیات (عیون الانباء، محل مذکور) : (۴) مقال
 فی الحدود والرسوم (عیون الانباء، محل مذکور) : (۵)
 کتاب الجمل فی علم المنطق (یا المختصر، دیکھیے
 کشف الظنون و براکلمان، بذیل الجمل) : (۶) کتاب

المقوی : کتاب البلدان 'BGA' ۳۲۰ : ۲ : (۳) الہدائی :
 مدقہ جزیرۃ العرب، طبع 'D.H. Müller' لاٹن ۱۸۸۳ :
 ۱۸۹۱ء میں ۱۷۲ و ۱۷۳ تا ۱۷۵ و ۱۷۶ : ۱۷۲ و ۱۷۵ :
 (۴) وہی مصنف : الإکلیل ج ۱۰ 'Berol. Glaser'
 (۵) یاقوت : معجم، طبع وینڈنفلٹ 'Wüstenfeld' ۱۸۷۲ :
 ۱۸۷۳ : (۶) مرآۃ الاطلاع، طبع 'T.G.J. Juynboll'
 لاٹن ۱۸۵۲ء : ۱ : ۳۷۵ : (۷) عظیم الدین احمد :
 Die auf Südarabien bezüglichen Angaben Naswān's
 'GMS' 'in Šams al-'Ulām' ج ۲۳، لاٹن ۱۹۱۶ء میں
 ۲۵ و ۲۶ و ۲۷ : (۸) C. Niebuhr : Beschreibung von
 Arabien : کوپن ہیگن ۱۷۷۳ء میں ۱۸۲ : ۲۷۵ و ۲۸۰ :
 بعد : (۹) Die Erdkunde von Asien : C. Ritter : ۱۸۷۸ :
 برلن ۱۸۸۶ء میں ۷۱۲ و ۸۱۹ و ۸۳۳ : (۱۰)
 Die alte Geographie Arabiens : A. Sprenger : برن
 ۱۸۷۵ء میں ۵۱ : ۵۳ : بعد ۵۸ : ۲۳۹ و ۲۸۶ : بعد :
 (۱۱) وہی مصنف : Das Leben und die Lehre des
 'Mohammed' برلن ۱۸۶۹ء : ۳ : ۳۵۷ : بعد : (۱۲)
 Meine Reise durch Arabien und Hāschid : E. Glaser
 در 'Petermanns Mitth.' ۱۸۸۸ء : ۳ : ۱۷۱ : (۱۳)
 وہی مصنف : Über meine Reisen in Arabien Mitth.
 d. Geo. Ges. in Wien ۱۸۸۷ء : ۳ : ۲۲ : (۱۴)
 وہی مصنف : Skizze der Geschichte und Geographie
 Arabiens : برلن ۱۸۹۰ء : ۲ : ۳۷ : ۷۲ : ۱۰۱ : (۱۵)
 وہی مصنف : Sammlung Eduard Glaser : ج ۱ :
 D.H.v. Müller : E. Glaser's Reise nach Mārib
 و 'N. Rhodokanakis' وی انا ۱۹۱۳ء میں ۵۵ : ۱۲۵ :
 حاشیہ ۱ : (۱۶) M. Hartmann : Der islamische Orient :
 Bericht und Forschungsagen : ج ۲ : Die arabische Frage :
 لاہرک ۱۹۰۹ء میں ۲۳۵ : ۳۶۰ : ۳۶۲ : (۱۷) C.H.
 Beiträge zur Geschichte Ägyptens unter : Becker
 dem Islam : میٹراس بزرگ ۱۹۰۳ء : ۲ : ۱۲۳ : ۱۲۴ :
 (۱۸) Annali dell' Islām : L. Caetani : میلان ۱۹۰۰ء

میں شکست دی تھی۔

مآخذ : (۱) یا قوت : معجم طبع Wiistenfeld

Diet. de la Barbier de Meynard (۲) : ۵۰۲ : ۲

Persa ص ۲۲۰ : (۳) حمد اللہ المستوفی : نزهة القلوب

طبع Browne ص ۸۳ : (۴) ابوالفداء : تقویم طبع

Reinaud ص ۳۹۶ : (۵) G. Le Strange : The Lands

of the Eastern Caliphate ص ۱۰۰ : (۶) E. G.

A Year amongst the Persians : Browne ص ۵۰

یعد : (۷) J.P. Moirer : Second Journey ص ۳۰۳

(CL. HUART)

خیار : (ع) عام طور پر کسی "اقرار" یا "اعلان" (باسودے) کے واپس لے لینے کا اختیار۔ اصطلاح میں "خیار" کہلاتا ہے (لفظی معنی ہیں دو صورتوں میں سے بہتر صورت کا اختیار کرنا)۔ خاص طور پر اس کا اسحاق کسی یک طرفہ معاہدے کے نسخہ (منسوخ کرنا) یا ایضا اور اجازت (جاری کرنا) کے حق پر ہوتا ہے۔ یہ حق ہ تو خود قانون دینا ہے یا معاہدہ کرنے والے فریق آپس میں طے کر لیتے ہیں۔ اس کی اجازت اس لیے دی گئی ہے کہ بعد میں تضام و تنازع اور بغض و کینہ نہ پیدا ہو اور شر و اساد کا دروازہ بند ہو جائے۔

دائراً خیار اس وقت ہے جب کوئی چیز خریدنے یا کرانے پر دینے کے لیے پیش کی جائے اور خریدار یا کرایہ دار اسے دیکھے، یہ "خیار الرجوع" کہلاتا ہے، یعنی دیکھتے وقت کا اختیار۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چیز عیب دار نکلے، اسے خیار العیب کہتے ہیں۔ تیسری صورت یہ ہے کہ مال کے لیے جس قسم کی شرط تھی اس پر مال پورا نہ اترے یا کوئی خامی رہ گئی ہو۔ یہ خیار التقریر النفعی ہے۔ یا دھوکا دیا گیا ہو۔ یہ خیار الغبن ہے۔

یہ خاص صورتیں ہیں جن میں کسی معاہدے کے پورے کار لانے یا نہ لانے کا اختیار ہوتا ہے، لیکن اگر

کشف الاسرار عن غوامض الافکار والمنطق، جس پر ابن البدیع البندیہی نے حواشی لکھے اور کاتبی قزوینی صاحب التسمیۃ (م ۵۹۹ھ/۱۲۰۳ء) نے اس کی شرح لکھی، اس کا نسخہ رامپور میں ہے (فہرست رامپور، ۱ : ۵۵۸) : (۱) کتاب الموجز فی المنطق : یہ مختصر رسالہ اس نے اپنے بعض اخوان کے لیے چند فصلوں میں مرتب کیا : اس کے اور اس کی شرح کے لیے دیکھیے براکمان : قلماء، ۱ : ۸۳۸ : (۲) مختصر المطالب العلیہ، دیکھیے براکمان : قلماء، ۱ : ۸۳۸۔

مآخذ : (۱) النسخ : طبقات : ۵ : ۳۰۲ : (۲) ابن ابی اصیبعہ : غرر الانباء : ۲ : ۲۰۰، یعد : (۳) السیوطی : حسن المحاضرة : ۱ : ۳۱۱ : ۳۱۲ : (۴) سلس : قاموس الاعلام : ۱ : ۱۰۰ : ۱۰۱ : براکمان : ۱ : ۸۳۸ و دیکھ : ۱ : ۸۳۸۔ [ادارہ]

خوی : (Khal) عربی : خوی، ایران کے صوبہ آذربائیجان کا ایک شہر، جو تبریز سے ستر میل شمال مغرب میں ساحل مرفوع پر واقع ہے۔ اس کی آبادی بیس سے تیس ہزار تک ہے۔ خوی کی اراضی کو ایک نری، برابر، کٹی ہے، جو سٹمس کے پہاڑوں سے نکل کر اُس دریا کے کنارے بہتی ہے۔ شہر کے گرد چاروں طرف باغات ہیں، جن میں دوسرے شہروں کے علاوہ انجیر اور ایک عمدہ قسم کی ناشپاتی ہوتی ہے، جو "ایفجیری" کہلاتی ہے۔ موجودہ زمانے میں شہر کے مضافات میں گیاس کی فائٹ ہوتی ہے۔ گزشتہ دور میں یہاں ایک کپڑا بنا جاتا تھا، جو "خونچہ" کہلاتا تھا۔ آج کل یہاں ہاتھ یا کرکے سے بنی ہوئی اون سے جرابیں تیار کی جاتی ہیں۔ موجودہ دفاعی استحکامات مٹی کے بنے ہوئے ہیں، جو ایسویں صدی عیسوی کے شروع میں جنرل گارڈن Gardane کی حماد اور فوج نے تعمیر کیے تھے۔ ۱۸۳۲ء کے زلزلے میں شہر کا ایک حصہ تباہ ہو گیا تھا۔ خوی کے قریب ہی ساء اسمعیل اول صدوی کو سلطان مہم اول نے جنگ جالدران (۱۲۰۳ھ/۱۸۱۸ء) میں

(تقویض الطلاق)۔

مآخذ: (۱) الشافعی: کتاب الاقرب (۲) امام مالک: الموضأ: (۳) ہدایہ: (۴) مدونۃ الکبری: (۵) المقابہ الاربعہ: ان پانچوں کتابوں میں دیکھیے بذیل کتاب البیع) اور کتاب النکاح: (۶) Dimitroff: Asch-schaibani (الشیبان) ۲: ۱۱۳ بعد: MSOS ج ۱۲، فصل ۲، ص ۶۰ بعد: (۷) Hooper: The Civil Law of Palestine and Trans-Jordan Dictionary of the Technical Terms used in the science of the Muslims (۸) G. Bergsträsser (۹) (Bibliotheca Indica) ۱: ۳۲۱: Grundzüge des Islamischen Rechts برلن و لایپزگ ۱۹۰۷ء، ہند اشاریہ: قیز (۱۰) قس مقالہ بیع (۱۱) لائنن (مختصر)۔

خیال: سید محمد تقی جعفری حسینی، ایک

ضخیم فارسی داستان، بوستان خیال کے مصنف، احمد آباد (گجرات) کے رہنے والے تھے، مگر ۱۱۳۸ھ/۱۷۲۵ء میں بعہد محمد شاہ دہلی آ گئے تھے۔ اس داستان کی تالیف کے مختلف اسباب بیان کیے جاتے ہیں۔ خود خیال کے الفاظ میں اس کے تین محرکات تھے: (۱) یہ داستان انہوں نے اپنے وطن میں کسی نازنین کا تقرب حاصل کرنے کے لیے لکھی: (۲) دہلی میں بعض لوگوں کے طعن پر داستان امیر حمزہ کے جواب میں لکھی: (۳) نواب رشید خان کی ملازمت میں ان کی فرمائش پر لکھی۔ تین جلدیں مکمل کرنے پر محمد شاہ سے انعام بھی پایا۔ اس کے تاریخی نام فرمائش رشیدی سے سال ابتدا ۱۱۵۵ھ/۱۷۴۲ء برآمد ہوتا ہے۔ خاتمہ کتاب میں مصنف نے بتایا ہے کہ نادر شاہ کے حملے کے بعد وہ مرشد آباد چلا گیا تھا، جہاں سراج الدولہ کے حکم سے یہ کتاب ۱۱۶۹ھ/۱۷۵۵ء میں مکمل ہوئی (لیکن سراج الدولہ کی مدح میں جو قطعہ درج ہے اس میں سال تکمیل ۱۱۷۰ھ/۱۷۵۶ء بتایا گیا ہے: در ہزار و یک جلد ہفتاد و ہشت سو و پانچ

کسی کاریگر کو اجرت پر ملازم رکھا جائے تو اس وقت خیار نہیں۔ عمومی حیثیت سے قانون کا منشا یہ نظر آتا ہے کہ معاہدے ایسی حالت میں فسخ کیے جاسکتے ہیں کہ فرائض نکلیں یا فریق ثانی معاہدے کی پابندی نہ کرے، اگرچہ ہر جگہ اسے خیار نہیں کہا جاتا۔ نکاح فسخ کرنے کا معاہدہ بھی ایسا ہے کہ اس کے لیے خیار کی اصطلاح مستعمل ہے۔

حنفی مذہب کے مطابق اگر کسی عورت کا نکاح اس کے نا بالغ ہونے کے زمانے میں کسی غیر ولی نے کر دیا ہو تو بالغ ہونے پر اسے یہ حق ہے کہ وہ اس نکاح کو فسخ کر دے۔ یہ خیار البالوغ ہے (قب نکاح)۔ اسی طرح قانوناً اس وقت بھی معاہدہ فسخ کرنے کا اختیار ہے جب معاہدہ کوئی ایسا شخص کرے جسے معاہدہ کرنے کا اختیار نہ دیا گیا ہو، یعنی فضولی۔

جیز کو فروخت کرنے یا کرانے پر دیتے وقت فریقین میں سے ایک کو یا دونوں کو یا ان کے بیچ سے کسی تیسرے شخص کو ایک مدت معینہ کے اندر، جو لازماً بہت تھوڑی ہوتی ہے، معاہدہ اسخ کرنے کا جو حق ہے وہ خیار الشرط کہلاتا ہے: اس کے علاوہ خریدنے وقت خریدار کو حق ہوتا ہے کہ متعدد پیش کردہ چیزوں میں سے وہ اپنی پسند کی چیز لے لے، اسے خیار التعمین کہتے ہیں۔ پھر بیچنے والے کو مدت معینہ کے اندر رقم کی ادائی نہ ہونے پر بیع فسخ کرنے کا حق ہے، اسے خیار انقذ کہا جاتا ہے۔ [ایک حدیث کے الفاظ میں البیعان بالخیار مالہم یتفرقا یعنی بائع اور مشتری دونوں کو اسی وقت تک بیع کو فسخ کرنے کا اختیار ہے جب تک وہ الگ الگ نہ ہو جائیں۔ اس میں بعض فقہا جسمانی علیحدگی مراد لیتے ہیں اور بعض سودے اور گفتگو کا انقطاع۔

آخر میں خیار عورت کے اس حق کو بھی کہتے ہیں جب اس کا خاوند اسے اختیار دے دے کہ وہ جب چاہے طلاق لینے کا فیصلہ کر سکتی ہے۔

دہلوی کا ہے۔

مآخذ : (۱) Ethé : Cat. of Pers. Mss. of the Bodlian Library : ۱ : ۲۹۹ : (۲) سکسینہ : History of Urdu Lit. (مترجمہ) : زامداد عسکری : تاریخ ادبِ اردو : حصہ ثریا : ص ۱۰ : (۳) حامد حسن قادری : داستانِ تاریخِ اردو : کراچی ۱۹۶۶ء : ص ۲۶۵ : بعد : (۴) ڈاکٹر گیان چند : اردو کی نثری داستانیں : بار دوم : کراچی ۱۹۶۶ء : ص ۵۹۸ : بعد :

[ادارہ]

خیالِ ظل : نیز ظلِ خیال، یعنی پرچھائیوں کا تماشا: پرچھائیوں کے نازک میں فنِ نقالی کے ڈانڈے موسیقی، مصوری اور شاعری سے جا ملتے ہیں۔ اس میں ایک سفید کپڑے کی چادر پر بیچھے سے روشنی ڈالی جاتی ہے اور اس کے اوپر رنگین و منقش چمڑے کی بنی ہوئی شفاف پتلیوں کے ذریعے ایک ایسا خیالی منظر پیش کیا جاتا ہے جو استغراق پسند اہل مشرق کے لیے مغرب کے حقیقت پسندانہ، لیکن بھونڈے فنِ تخیل کے مقابلے میں کہیں زیادہ پر معنی ثابت ہوتا ہے۔ جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے، یہ فن مغربی ممالک میں بظاہر چین سے پہنچا تھا اور یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اس کا آغاز قدیم یونان یا روم سے ہرگز نہیں ہوا۔

اس کے بارے میں ہمیں جو قدیم ترین حوالہ ملتا ہے اس کا تعلق سرزمینِ ہند سے ہے، اگرچہ وہاں یہ تماشا اب معدوم ہو چکا ہے۔ بہر کیف جاوا کے واینگ wayang سے، جس میں زیادہ تر ہندوستانی ساز و سامان سے کام لیا جاتا ہے، اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ پہلے ہندوستان میں موجود تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ ترکوں نے اہل چین سے یہ فنِ مغول کی وساطت سے حاصل کیا۔ بہر صورت یہ محقق ہے کہ اسلامی ممالک کے لیے چینی خیالِ ظل سے متعارف ہونے کے مواقع موجود تھے۔

یہ داستان طبع نہیں ہوئی، لیکن اس کے نامکمل مخطوطات کئی کتاب خانوں میں محفوظ ہیں مثلاً بودلین لائبریری، انڈیا آفس لائبریری اور سوزہ بریطانیہ کے مخطوطے قابل ذکر ہیں (سوزہ بریطانیہ کے مخطوطے کی جلد دوم میں نواب رشید خان کو ناظم بنکالہ جعفر خان کا بیٹا بتایا گیا ہے، جو غلط ہے۔ بوستانِ خیال کی جلدوں کی تعداد کے بارے میں بڑا اختلاف پایا جاتا (سکسینہ : نو جلدیں : حامد حسن قادری : دس جلدیں، گیان چند : پندرہ جلدیں، وغیرہ) جس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی تقسیم بہت الجھی ہوئی ہے (تفصیل کے لیے دیکھیے Ethé : Cat. of Persian Mss. of the Bodlian Library : عدد ۵۸۰ : گیان چند : اردو کی نثری داستانیں، ص ۶۰۲)۔ نیشنل لائبریری کلکتہ میں بوستانِ خیال کے ایک انتخاب کا قلمی نسخہ ملتا ہے۔ نواب کلب علی خان، والی رام پور، نے بھی اس کا ضخیم فارسی خلاصہ تیار کرایا تھا، جس کا مخطوطہ کتاب خانہ رام پور میں محفوظ ہے۔

داستانِ امیر حمزہ کی طرح اس کا مرکزی کردار بھی ایک تاریخی شخصیت ہے، یعنی فاطمی خلیفہ شاہزادہ معزالدین ابو تمیم۔ اس کے علاوہ کئی اور تاریخی شخصیتیں ہیں (مثلاً جوہر، خلیفہ العاضد، وغیرہ) افسانوی کرداروں کی صورت میں پیش کی گئی ہیں۔ اس ضمن میں مذہبی کتابوں کے بیانات اور رائج الوقت قصے بھی شامل ہیں۔ واقعات کا انداز داستانِ امیر حمزہ سے مختلف نہیں، جس کی چھاپ جنت اور دیوزادوں سے لڑائی اور سحر و ساحری اور طلسمات کے بیان، غرض کہ ہر جگہ نظر آتی ہے : اسی لیے بوستانِ خیال میں کوئی تنوع اور جدت پیدا نہیں ہو سکی۔ مزید برآں اس کا کوئی معین پلاٹ نہیں اور متعدد بعد از قیاس قصوں کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بوستانِ خیال کے مختلف اجزا کے اردو میں متعدد تراجم ہوئے، جن میں ممتاز ترین ترجمہ خواجہ امان

میں نہ صرف عورتوں اور ادنیٰ طبقے کے لوگوں میں مقبول ترین ذریعہ تفریح بنا رہا بلکہ اعلیٰ اور تعلیم یافتہ حلقوں میں بھی بیشتر افراد کو، یہاں تک کہ بعض سلاطین کو بھی اس کا بہت شوق رہا۔ جہاں کہیں بھی ترک اتنی تعداد میں آباد ہوتے کہ تماشا گراں سے تھوڑی بہت روزی حاصل کر سکتا، وہاں ظل خیال ضرور موجود ہوتا تھا۔

ترکیہ سے یہ تماشا غیر ترکی مسالک میں بھی پہنچ گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے یونان میں خاص طور پر اپنے قدم جما لیے تھے۔ یہ کیفیت زمانہ حال تک (خصوصاً ایتھنز Athens، پیرایوس Piraeus اور سالونیکا Salonika میں) قائم رہی۔ اسی طرح یہ اہل رومانیہ کے ہر طبقے میں بھی بہت مقبول رہا۔

مآخذ : (۱) G. Jacob : *Geschichte des Schattentheaters* 'بار دوم' 'ہینور ۱۹۲۵ء' جہاں ان سب سآخذ کا ذکر ہے جن سے استفادہ کیا جا سکتا ہے : نیز دیکھئے (۲) L. Roussel : *Kuragheuz, on un théâtre d'ombres à Athènes* : J. Kats (۳) : ۱۹۲۱ء : (۴) *Wajang Poerwa* : J. Kats (۵) : ۱۹۲۳ء : *Weitevreden Russkij Muzej* : در *Kuklojnyj teatr Turkestane* : *Etnograficeskij otdel* : سنہ پندرہویں ۱۹۲۳ء : عدد ۱ : (Th. MENZEL)

خیالی : اصل نام محمد ہے : وہ یکایمی بھی کہلاتا تھا : سلیمان اعظم (قانونی) کے عہد کا ایک اہم شاعر۔ شاعر اصولی کی طرح وہ بھی روم ایل کے ایک چھوٹے سے شہر وردرینجہ سی کا رہنے والا تھا۔ شیخ غالب کی طرح کم سنی ہی میں اس کے ذہن میں بخنکی آ گئی تھی اور اس کی شاعرانہ صلاحیت نے وقت سے پہلے ہی نشو و نما حاصل کر لی تھی۔ لڑکپن میں وہ ایک صوفی منشی حیدری درویش بابا علی مست کی خدمت میں رہتا تھا۔ انہوں نے اسے تصوف

چین اور ہندوستان سے اسلامی مسالک کو جانے والی شاہراہ ایران سے ہو کر جاتی تھی، چنانچہ ایرانی شعرا کے کلام میں کئی جگہ خیالِ ظل کا ذکر تو آتا ہے، تاہم اس تماشے کے متعلق قطعی معلومات بہت کم ملتی ہیں۔ ایران جدید میں یہ تماشا "کچل پھلوان" کی شکل میں باقی ہے۔

عربی ثقافت کے حامی مسالک، بالخصوص مصر میں خیالِ ظل نے ابتدائی دور ہی میں خاصی ترقی پالی تھی۔ قرون وسطیٰ کی عربی ڈرامائی شاعری کی باقیات میں سے اب صرف محمد بن دانیال الطیب (م ۱۳۱۱ء) کی ظلی تمثیلات محفوظ رہ گئی ہیں۔

ترکوں کے ہاں بھی ظلی تمثیل نے بہت ترقی اور مقبولیت حاصل کی۔ ترکی تماشا اگرچہ بہت سی باتوں میں مصری تماشے سے مشابہ ہے، لیکن محض اس بنا پر یہ فرض کر لینا صحیح نہ ہوگا کہ ترکوں نے اسے مصریوں سے اخذ کیا ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے اس سے بہت قبل تیرھویں صدی عیسوی ہی میں ظلی تمثیل کے لیے اپنی زبان میں ایک خاص "اصطلاح" "قبرجق" وضع کر لی تھی (بشرطیکہ بقول ہوتسما Turkish-Arabisches Glossar : Houtisma لاڈن ۱۸۹۳ء، ص ۳۳، "قبرجق" کے معنی "چینی خیالِ ظل کی ایک پتلی" واقعی صحیح ہوں؛ لیکن یہ بہت مشکوک ہے کیونکہ مشرقِ ترکی میں جو لفظ "قاورجق" یا "قورجق" اب تک باقی ہے اس کا ظل خیال سے کوئی تعلق نہیں۔

تورکستان وغیرہ میں خیالِ ظل اگر کسی زمانے میں رائج تھا بھی تو اب بظاہر معدوم ہو چکا ہے اور اس کی جگہ پتلیوں کے تماشے نے لے لی ہے، جو "قورجق" اور "چادیر خیال" کہلاتا ہے۔

ترکان عثمانیہ اسے قرہ گوز [ارک بان] کہتے ہیں اور زمانہ حال میں بھی جب تک اسے سینما سے مسابقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا، یہ تماشا ماہ رمضان

طرح وہ دیوی مال و متاع سے بے نیاز تھا، اسی طرح اسے اس کی بھی چنداں پروا نہ تھی کہ اس کے سرمایہ کلام کا کیا حشر ہوگا؛ چنانچہ وہ اپنی تصوف کے رنگ میں ڈوبی ہوئی نظموں کو ہشکل دیوان مرتب کرنے کا کام دوسروں پر چھوڑ گیا۔ اس کا بیٹا عمریک (م۔ ۱۰۱۰ھ) بھی شاعر تھا۔

مآخذ: (۱) لطیف: تذکرہ قسطنطنیہ ۱۳۱۴ھ

ص ۱۴۹: (۲) سہی: تذکرہ قسطنطنیہ ۱۳۲۵ھ ص ۱۲۶

(۳) معلم ناجی: مجموعہ قسطنطنیہ ۱۳۰۵ھ عدد

۳۶ ص ۱۴۱: (۴) وہی مصنف: اسامی قسطنطنیہ

۱۳۰۸ھ ص ۱۳۷: (۵) فائق: اسلاف عدد ۷۳

در خزینہ فنون قسطنطنیہ ۱۳۱۱ھ ص ۱۴۷: (۶)

برسلی محمد طاہر: عثمانی مؤلفری قسطنطنیہ ۱۳۳۸ھ

۱۶: ۲ (طاہر نے اسے سلیم اول کے عہد کے خیالی سے

متنبس کر دیا ہے اور دونوں کو ایک شخص قرار دیا ہے

اور مؤخر الذکر کی لیلیٰ و معجون کو اس سے منسوب کیا

ہے: (۷) سامی: قاموس الاعلام ص ۲۰۷: (۸)

ثریا: سجل عثمانی قسطنطنیہ ۱۳۱۱ھ ص ۳۱۳: (۹)

Kat. der. Türk. Handschriften in: Flügel

Wien ۱۸۶۵ء ص ۶۹: (ایک قلمی نسخہ جسے مصنف

نے اور خوش نویس ابراہیم چلی نے لکھا ہے لندن میں

رائل ایشیائک سوسائٹی کے کتاب خانے میں ہے): (۱۰)

A. History of Ottoman Poetry: E. J. W. Gibb

ص ۵۸: (۱۱) G O R: V. Hammer اردوم ص ۲

۳۳۲

(THE MENZEL)

خیر: ایک انجمنستان، جو سطح سندر سے ۲۸۰۰ فٹ بلند اور مدینہ منورہ سے ۱۸۵۰ کیلومیٹر (کچھ کم سو سو میل) شمال میں بری راستے سے آئے والے حجاج کی شاہراہ پر واقع ہے۔ عہد دیوی میں غابہ، یعنی جبل احد کے مغرب سے گزرتے تھے اب جدید ہوائی اڈے (مطار) سے اتصال کی خاطر مشرق سے گزرتے

سے روشناس کرایا، جس کی جھانک اس کی بہت سی نظموں میں پائی جاتی ہے۔ جہاں گردی میں اپنے مرشد کا ہاتھ دیتے ہوئے وہ قسطنطنیہ پہنچا، جہاں مقامی حکام کی مداخلت نے اسے اس درویش کے فیضان صحبت سے محروم کر دیا۔

اس کی شاعرانہ قابلیت کے باعث بالآخر دتردار سکندر چلی اور اس کے بعد فرنگ ابراہیم پاشا اس پر مہربان ہو گیا، جس نے اسے سلطان سلیمان کے حلقہ شعرا میں لے جا کر بٹھا دیا۔ سلطان کا قرب و اعتماد حاصل ہونے کے بعد آخر وہ سلطان کے خاص ندیموں کے زمرے میں شامل ہو گیا اور یوں اس نے وہ بلند ترین اعزاز حاصل کر لیا جو کسی ترکی شاعر کو نصیب ہو سکتا تھا۔ اپنے سر پرست امیروں کے قتل کے بعد (سکندر کو ۱۵۳۵ء میں بغداد میں پھانسی دی گئی اور ابراہیم کو ۱۵۳۶ء میں محل شاہی میں گلا گھونٹ کر مار دیا گیا) ان کے منظور نظر شعراء جو کسی وقت بڑے با اقتدار تھے، رفتہ رفتہ اپنے اثر و رسوخ سے محروم ہونے لگے۔ خیالی کو بھی برے دنوں کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ اسے کبھی یہ سلیقہ نہ آیا کہ وہ ان تعائف اور مراحم خسروانہ کو سنبھال کر رکھتا جن کی اس پر بارش ہوتی رہی تھی؛ لیکن آخر کار سلطان نے اسے بیگ کا خطاب دے کر ایک ستیاق عطا کر دی۔ ۱۵۵۶/۵۹۶ھ - ۱۵۵۷ء میں اس نے شہر ادرانہ میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوا۔

خیالی پسندیدہ اطوار اور برخلاص طبیعت کا حامل تھا۔ اس نے عمر بھر درویشانہ انکسار اور صاف دلی کو برقرار رکھا؛ چنانچہ اس نے حیدری حلقے کی رکنیت بھی ترک نہ کی۔ وہ اپنے زمانے کے جوئی کے شعراء میں سے تھا۔ اس کے ہمعصوروں میں سے کوئی بھی زور کلام اور حسن بیان میں اس سے بازی نہ لے جا سکا، تاہم اس کی زبان پرانے زمانے کی ہے؛ وہ صرف غزل اور قصیدے میں طبع آزمائی کرتا تھا۔ جس

۴ : ۲۰) - آج کل بھی شہر کے جنوب میں، ایک بلند پہاڑ کے دامن میں، کئی میل لمبا ایک گھنا نخلستان ہے۔ خیبر میں اب (۱۹۶۳ء میں) تنیزہ قبیلے کے عرب آباد ہیں۔ کہتے ہیں کہ فصل کٹنے کے زمانے میں تنگسی آبادی پچیس تیس ہزار تک ہو جاتی ہے، ورنہ مستقل آبادی پانچ ہزار کے لگ بھگ بیان کی جاتی ہے۔ شہر میں کئی بلند ٹیلے اور پہاڑیاں ہیں، جن میں سب سے ممتاز وہ ہے جسے قصر مرقب کہا جاتا اور یہودی عہد کی یادگار سمجھا جاتا ہے۔ ترکی دور میں غالباً یہاں فوجی چھاؤنی تھی، اب اس میں سعودی گورنر رہتا ہے۔

بعض مؤلفوں کی رائے میں خیبر کے یہودیوں کی بولی میں "خیبر" کے معنی قلعے کے تھے۔ البکری نے سہل بن محمد الکائب سے اور یاقوت نے الزجلی سے روایت کی ہے کہ یہ اس بستی کے بانی خیر بن قانیہ بن سہلایل کے نام سے منسوب ہے۔ کہیں ایسا تو لہیں کہ اشباط یہود کے گم گشتہ قبائل نے یہاں اور پشاور سے آگے درہ خیبر میں بھی اپنی نشاندہی کے لیے یہ نام دیا ہو؟

خیبر کا قدیم ترین ذکر بابل کے آخری کلدانی بادشاہ نبونعد [نبونید] (۵۵۶ یا ۵۳۹ ق م) کے معنی کتبے میں، جو حران کی مشہد جامع مسجد کے فرش کے ایک پتھر پر ملا تھا (میونخ کی مؤتمر مستشرقین عالم کی روداد، ص ۱۳۲) لکھا ہے کہ جب اس بادشاہ نے تیماہ میں اپنا ذیلی بارے تخت بسایا تو خیبر و فک وغیرہ سے ہونے والے یثرب تک کی سیاحت کی۔ ایک دوسرا کتبہ بھی حران کے قریب لجه میں دستیاب ہوا ہے، جو سیاق ہندسوں کے ساتھ عربی میں ہے کہ "میں نے، یعنی شرحیل بن ظننہ نے ذا المرطول کو سنہ ۶۳ م میں خیبر کی تباہی (مفسد) کے ایک سال بعد تعمیر کرایا" - E. Littmann (R.S.O.) ۱۹۱۱ و ۱۹۱۲، ص ۱۹۳ (بعد) کے مطابق اس تاریخ سے مراد

ہیں۔ تقریباً ایک سو کیلومیٹر تک یہ راستہ تنگ اور پچدار دروں میں سے ہوتا ہوا جاتا ہے، جس کے دونوں طرف بلند پہاڑ ہیں۔ اس ماری مسافت میں پتھر ہوں یا مٹی، حرہ یعنی آتش فشاں سے جلے ہوئے عناصر پر مشتمل ہیں۔ درخت اور پانی نام کو نہیں۔ اکا دکا بکریاں کہیں جرقہ نظر آ جاتی ہیں جو بہت ہست قد ہوتی ہیں۔ ان کے دودھ نہیں ہوتا، البتہ ان کا گوشت کھاتے ہیں۔ مدینے سے خیبر تک مشکل سے دو آبادیاں ملتی ہیں۔ پہلی ضلعال ہے، جو ۲۸ کیلومیٹر پر واقع ہے اور کافی سرسبز ہے۔ مقامی لوگوں کا بیان ہے کہ بستی کے نصف حصے میں کنوؤں کا پانی کڑوا ہے اور نصف حصے میں شیریں ہے! ممکن ہے فک بھی ہو۔ اس سے آگے ایک دوسری چھوٹی اور ویران بستی ہے۔

خیبر بھی ایک حرہ [رگ باں] ہے۔ مدینے سے آئیں تو شہر کے بندرہ بیس کیلومیٹر کے فاصلے پر سفید اور قابل کشت لیکن افتادہ زمینیں ملتی ہیں، جو دس بارہ کیلومیٹر تک پھیلی ہوئی ہیں۔ بعد ازاں پھر حرہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس حرے میں شاہراہ کے دالیں جانب قدیم (یہودی) کوئٹر سیلوں تک پھیلے ہوئے ہیں، جن میں کچھ تالابوں کے منہدم سے بند نظر آتے ہیں۔ گرمی میں پانی خشک ہو جاتا ہے تو ان کی تہہ میں جمی ہوئی مہین مٹی دور دور تک نظر آتی ہے۔ امریکی انجینئر ٹویچل Twitchell نے سعودی عرب کی زرعی پیمائش کی رپورٹ میں یہاں سد الحصد اور بانچ دیگر تالابوں کا ذکر کیا ہے۔ غزوہ خیبر میں آنے اور جانے دونوں وقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سد الصہاء میں قیام فرمایا تھا، وہ بھی شاید یہیں کہیں ہو۔ اس کے آگے ایک ہست اور وسیع وادی ہے، جس میں شہر خیبر آباد ہے۔ یہ نخلستانوں سے اس قدر پٹا ہوا ہے کہ کسی بلندی پر سے بھی شہر کے خط و خالی بالکل نظر نہیں آتے۔ عہد نبویؐ میں محلہ الکئیہ میں کھجور کے چالیس ہزار بیڑ بیان کیے گئے ہیں (ابن الاثیر: البدایہ

کیا ہے، لیکن عہد اسلامی کے جغرافیہ نگاروں میں سے البکری (معجم، ص ۳۳ تا ۳۴) نے کتاب الشکوٰۃ کا جو اتباس دیا ہے وہ واقف حال شخص کا بیان معلوم ہوتا ہے: ”یہ مدینے سے آٹھ برید پر ہے۔ پیدل تین دن میں آسکتے ہیں۔ مدینے سے نکلو تو پہلے غایۃ علیا، پھر سفی کے بعد قصب بردوج آتا ہے، جہاں ایک مسجد نبوی ہے۔ پھر وادی الدومہ آتی ہے، جہاں کنوئیں ہیں۔ پھر جبل أشمذ، پھر حرۃ الشقہ، پھر نمار آتا ہے، جو خیبر سے آٹھ میل پر علاقہ خیبر کی سرحد پر واقع ہے۔ اس سے آگے خیبر اور اس کے قلعے ہیں۔ خیبر کا بازار السرطلہ ہے، جسے حضرت عثمانؓ نے بسایا تھا۔ وہاں کے قلعے میں کچھ برائے لوگ باقی ہیں، جو حضرت عمرؓ کی نسل سے ہیں۔ اس سے آگے حصن وچہہ ہے، جس میں کھجور وغیرہ کے درخت ہیں۔ یہ صرف خاص نبوی رہا ہے۔ پھر الشلالم ہے، جس کا بڑا حصہ صرف خاص نبوی تھا۔ پھر جبل الأھیل آتا ہے، جس میں یہودی برج (آطام) ہیں۔ پھر مزروعی اور باغات ہیں، جن سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات اور بنو المطلب کے روزنے مفرر تھے۔ اسی کو الوطیع کہتے ہیں۔ وطیع سے متصل خلص تک ایک وادی جاتی ہے، جسے الکثیبہ کہتے ہیں۔ یہ سب کی سب صرف خاص نبوی رہی ہے۔ یہ کثیبہ خیبر کے قلعہ ہند مقاموں میں سے ہے۔ یہیں الصباء ہے، جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑا ڈال کر رات گزاری تھی! یہ خیبر سے ایک برید کی مسافت پر ہے۔ خیبر کا سب سے بڑا قلعہ القموص ہے، جسے حضرت علیؓ نے فتح کیا تھا! اسی کے دامن میں مسجد نبوی ہے۔ وہیں نطہ اور الشقی دو وادیاں ہیں۔ ان دونوں کے مابین جو رقبہ ہے اسے السبخۃ اور المعاضۃ کہتے ہیں۔ یہ اس بڑی مسجد نبوی تک جاتا ہے جہاں خیبر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام رہا۔ یہ مسجد عیسیٰ بن موسیٰ نے زرکنیر خرچ کر کے بنوائی، اس کی بنا ”طاوالت معقودہ“ پر ہوئی ہے۔ اس میں بڑے صحن بھی

۵۶۸ء ہے۔ ابن قتیبہ: کتاب المعارف، (ص ۳۱۳) کے مطابق عثمانی حکمران الحارث بن ابی شمر جبکہ (۵۲۸ تا ۵۵۰ء) نے اس رخ حملہ کیا تھا! یہ ممکن ہے کہ خیبر والوں نے ایرانیوں اور حیرہ کے حکمران سے کچھ سازش کی ہو اور اس پر بوزنطی قیصر روم نے اپنے ماتحت حکمران کو ادھر روانہ کیا تھا۔ معلوم نہیں اس وقت خیبر میں کون لوگ تھے، لیکن ساٹھ سال بعد جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم یہاں تشریف لائے تو یہاں صرف یہودی بستے تھے، جو بہت خوش حال تھے! چنانچہ مکے میں شادی بیاہ کے موقع پر یہیں سے دیگیں اور زیور کرائے پر لیے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ زیور کھو گئے تو اہل مکہ نے دس ہزار دینار کا ہرجانہ ادا کیا (ابن سعد، ۸۱: ۱/۲)۔ السرخسی: شرح السیر الکبیر، (۱۸۶/۱)۔ بہت ممکن ہے کہ معاشی روابط نے شادی بیاہ تک نوبت پہنچا دی ہو اور یہاں کی یہودیں بے جھجک عربوں سے نکاح کرتی ہوں! چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پردادا ہاشم اور ان کے بھائی المطلب نے ایسا ہی کیا (ابن حبیب: المتقی، مخطوطہ لکھنؤ، ص ۳۲۵)۔ یہاں کھجوریں بہت ہوتی ہیں، لیکن زمانہ جاہلیت میں بھی لوگ یہاں کے ملیریا سے بہت گھبراتے تھے (بعض قسمی القزونی: الآثار، ۶، ۲ تا ۶، ۱ اور ابن قتیبہ: الانواء، ص ۳۰ تا ۳۱ میں ملین گئے)۔ یہود خیبر کے لباس میں طبلستان بہت مشہور ہے (صحیح البخاری، کتاب ۶، باب ۳، حدیث ۱۲)۔ عبدالمطلب نے یہ نذر مانی تھی کہ اگر ان کے دس بیٹے ہوئے تو وہ ایک کی قربانی دیں گے۔ قرعہ فال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے والد عبد اللہ پر پڑا۔ اس سلسلے میں جس کاہنہ سے مشورہ کیا گیا تھا وہ سال کا کچھ عرصہ مدینے میں اور کچھ خیبر میں رہتی تھی (ابن ہشام: السیرۃ، ص ۹۸ تا ۹۹)۔

یاقوت نے معجم البلدان میں شاہیر خیبر میں سے ابن القاهر الخیرى الغمى محنت کا خاص طور پر ذکر

ہیں۔ وہاں وہ چٹان بھی ہے جسے سترہ [آرک بان] بنا کر حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھا کرتے تھے۔ آج کل یہاں عید کی نمازیں پڑھی جاتی ہیں۔ نطاة میں مڑحَب کا قلعہ اور قصر ہے۔ یہ قصر حضرت الزبیر بن العوامؓ کے حصے میں آیا تھا۔ الشق میں العمة نامی چشمہ ہے، جسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "قصة الملائكة" کا نام دیا تھا۔ اس کا دو تہائی پانی ایک نالے میں جاتا ہے اور ایک تہائی دوسرے میں، حالانکہ نکلتا ایک ہی جگہ سے ہے۔ عہد نبویؐ سے لے کر اب تک یہ ایک اعجوبہ رہا ہے۔ اس چشمے میں تین کھجوریں یا لکڑی کے تین ٹکڑے ڈالو تو دو اس نالے میں چلے جاتے ہیں جس میں دو تہائی پانی جاتا ہے اور ایک دوسرے نالے میں۔ یہ کسی کے بس کی بات نہیں کہ اس میں تہائی سے زیادہ پانی لایا جائے۔ اگر کوئی اس نالے میں کھڑا ہو جائے جس میں دو تہائی پانی جاتا ہے تاکہ اسے دوسرے نالے میں لایا جائے تو پانی اس پر غالب آ کر بہہ نکلتا ہے اور دوسرے نالے میں تہائی سے زیادہ پانی نہیں آ سکتا۔ رہا النطاة، وہاں کا بڑا چشمہ اللعینہ کہلاتا ہے۔ خیبر میں سب سے پہلے دار بنی قنہ فتح ہوا، جو نطاة میں ہے اور اسی میں مڑحَب کا بھائی الیاس رہتا تھا۔ اسی کے متعلق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا تھا کہ "دار بنی قنہ کی فتح سے قبل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کی روٹی اور کھجور پیٹ بھر کر نہیں کھائی تھی"۔

قصر مڑحَب کے دامن میں آج کل ایک چھوٹی سی مسجد رہ گئی ہے۔ اس کے قریب جو چشمہ ہے وہ اب حضرت علیؓ سے منسوب ہے کہ مڑحَب پر وار کرنے میں ان کی تلوار زمین میں اتر گئی اور یہ چشمہ پھوٹ بہا۔ اس سے کچھ فاصلے پر دوسرا بڑا چشمہ بھی باقی ہے۔ دونوں سے نخلستانوں کی آب پاشی ہوتی ہے۔ تاریخ اسلام میں خیبر کی شہرت ۶۲۸ء کے غزوہ نبویؐ کے باعث ہے۔ مدینے سے نکلے ہوئے

اہل خیبر آپؐ کی پیشقدمی سے واقف اور مقابلے کے لیے تیار تھے۔ اس زمانے کی عربی بستیوں کی طرح خیبر بھی متعدد چھوٹے چھوٹے قبائلی محلوں پر مشتمل تھا۔ ہر محلو دوسرے سے کچھ فاصلے پر آباد تھا اور ہر ایک کا نظام معیشت، یعنی کھیت، چراگاہیں، قلعے اور گڑھیاں مستقل تھیں۔ جہاں تک دفاع کا تعلق ہے وہ ایک تو اپنے سات بڑے اور متعدد چھوٹے قلعوں میں محفوظ تھے، جن میں سے بعض میں متحقیق بھی نصب تھیں؛ دوسرے یعقوبی کے مطابق خیبر میں بیس ہزار مقاتل (جنگجو سپاہی) تھے۔ المقریزی (الامتاع) کے مطابق دس ہزار کا مقابلہ پندرہ سو مسلمانوں کو کرنا تھا؛ تیسرے وہ اپنے مرکز اور گھر میں ہونے کی وجہ سے حرری فوقیت بھی رکھتے تھے۔ ازوقہ اور ساز و سامان بھی ان کے پاس بہت تھا۔ السرخسی (شرح السیر الکبیر)

باقی کے ذخیرے تک اس کا جو زمین دوز راستہ تھا اس کا پتا ایک مقامی یہودی ہی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بتا دیا تھا۔

جب قبضہ مکمل ہو گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شرائط صلح میں مزید رعایت منظور فرمائی اور اجازت دی کہ وہ تاحکم ثانی خیر ہی میں رہیں اور بٹائی پر کاشت کر کے نصف پیداوار لگان میں دیا کریں۔ یاقوت (معجم البلدان) نے صراحت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نصف علاقہ بحق حکومت محفوظ کر دیا اور اس میں کتبہ اور مسالیم داخل ہوئے؛ باقی فاتحوں میں بانٹ دیا اور شق و نطافہ و متعلقات اس میں آئے (شکر اسلام میں بارہ سو بیدل اور تین سو گھڑ سوار تھے۔ سواروں کو چونکہ دگنی غنیمت ملتی ہے اس لیے سارا علاقہ چھتیس حصوں میں بانٹا گیا۔ آدھا حکومت کے لیے وقف رہا۔ باقی اٹھارہ حصوں میں سے ہر ایک حصہ سو بیدل سپاہیوں یا پچاس سواروں میں بانٹا گیا)۔ الزہری کا جو بیان ابن کثیر (المباہغہ ۲: ۲۰۰) نے نقل کیا ہے کہ کچھ خیر بزور شمشیر فتح ہوا اور کچھ برآمن طور سے؛ اس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ بغیر جنگ فتح شدہ علاقہ بحق حکومت وقف کر دیا گیا۔ لیکن عام مؤرخ یہ کہتے ہیں کہ زمین کو فاتحوں میں تقسیم کر کے ہوئے حسب معمول شمس حکومت کے لیے لیا گیا اور یہ کتبہ کا بخلستان تھا۔ یہاں کے لگان میں ہر سال جو کھجوریں وغیرہ آتی تھیں ان سے کچھ روزانہ بھی مستقل طور پر منور ہوئے، جس کی ان ہشام وغیرہ نے تفصیل دی ہے۔

یہودیوں کا بٹائی پر کام کرنا حضرت عمرؓ کی خلافت تک باقی رہا۔ پھر جب ان لوگوں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ وغیرہ کے قتل کا اقدام کیا تو ان کو وہاں سے شام منتقل کر دیا گیا اور مسلمان کسان ہی یہاں کاشت کرنے لگے۔

باب خامس، الرانات و الالوتہ) نے لکھا ہے کہ خیر کے ہر قلعے کو آہن تین فصیلوں سے اس طرح گھیرا گیا تھا کہ سوار و فوج ان کے سامنے بے بس تھی۔

برائے نام اب بھلا دے گئے ہیں، اس لیے معلوم نہیں قلعہ ناعم کہاں تھا، جو مؤرخوں کے مطابق سب سے پہلے سر ہوا۔ پھر اندرون شہر کا قلعہ فموص فتح ہوا، جو خاندان ابوالخفیف (اور ام المؤمنین حضرت صفہؓ) کا مسکن تھا۔ اس کی فتح میں حضرت علیؓ نے خاص کارگزاری دکھائی تھی۔ پھر حصن اشق اور حصن النظافہ اور حصن الکعبہ سر ہوئے۔ اس کے بعد حصن النوطع اور حصن السلالیم (دو آخری قلعے) کوئی دو ہفتوں کی کشمکش کے بعد فتح ہوئے۔ بظاہر انہیں تھری دو قلعوں میں سارے یہودی باشندے جمع ہو گئے تھے۔ اگر یہودیوں کے ساتھ انہیں کی توردت کے احکام کے مطابق برتاؤ کیا جانا۔ سارے بالغ مرد قتل اور عورتیں بچے غلام بنے یا سکتے تھے، مگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے رحمدلی اور درگزر سے کام لیا؛ سب کی جان بخشی کی کہ مال چھوڑ کر جسم کے کٹڑوں کے ساتھ جہاں چاہیں چلے جائیں۔ سبرۃ الشامی کے مطابق مدینے میں بنو النضیر کے پاس ایک کنز تھا، یعنی "وہ مال جو وہ اتفاق ضروریات (نوائب) کے لیے جمع کیا کرتے تھے"۔ شہر بدری پر نصیری یہ کنز خیر میں ساتھ لائے تھے۔ حسب معاہدہ جب یہ مسلمانوں کے سپرد نہ ہوا تو آنحضرتؐ نے جواب طلبی کی تو صاحب الكنز نے بہانہ کیا کہ جنگ کی تیاری میں ختم ہو گیا ہے، لیکن رات کو اسے کھنڈروں میں ادھر ادھر پھرتے دیکھ کر شبہ ہوا؛ حناجہ وہاں کھدائی کی گئی تو خزانہ برآمد ہو گیا اور صاحب الكنز کو قریب کاری کی سزا پہنچتی پڑی۔

ابتدائی ناکامیوں ہی نے یہودیوں کا حوصلہ ہست کر دیا تھا۔ سرت نگار لکھتے ہیں کہ حصن الزبیر اپنے استحکام کے باعث اس لیے باسانی فتح ہو گیا کہ

مقرر کیا گیا۔

الیسویں نے لکھا ہے کہ مدینے میں بنو قبیصہ کے کچھ یہودی باقی رہ گئے تھے (متن کبیری، ۹: ۶۳)۔ خیبر کی سہم میں انہوں نے رضا کارانہ شرکت کی تو انہیں مال غنیمت سے کچھ ”رضخ“ (انعام) دیا گیا، لیکن السرخسی کی روایت میں ان یہودیوں کو ”سہم“ یعنی مسلمانوں ہی کے برابر حصہ دیا گیا۔

ابن ہشام نے لکھا ہے کہ کسی خیری یہودی کے ایک حبشی غلام نے، جو جرواھا تھا، اسلام قبول کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ تقاضے دیانت یہ ہے کہ ربوڑ کو مالک کے قلعے تک لے جا کر چھوڑ دو تاکہ وہ عادت کے مطابق خود ہی مالک کے گھر پہنچ جائے۔

المقربزی نے الامتاع میں لکھا ہے کہ مال غنیمت میں ثوریت کے جو نسخے ملے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں کو واپس دلا دیے۔

[اس جنگ میں یہودی سردار حبیب بن اخطب کی بیٹی صفہ بھی جنگ قیدیوں میں مسلمانوں کے ہاتھ آئیں۔ آپؐ نے انہیں حضرت دحہ کو بخش دیا، مگر پھر بعض صحابہ کے مشورے سے سات قیدیوں کے معاوضے میں انہیں واپس لے لیا اور عدت پوری ہونے تک حضرت ام سلمہؓ کے پاس رکھا۔ صفہ مسلمان ہو گئیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آزاد کر کے اپنی زوجیت میں لے لیا۔ اس کا فوری اثر یہ ہوا مسلمان سپاہیوں کا برتاؤ اپنے نبیؐ کے سرالوں سے نرم ہو گیا۔ بظاہر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد بھی نکاح سے بھی تھا۔ حضرت صفہؓ اپنے غیر مسلم میکے والوں سے ہمیشہ عزیزانہ سلوک کرتی رہیں اور وفات پر وصیت کی کہ ان کے مہر کے کا ایک تیرائی، یعنی ایک لاکھ درہم، ان کے غیر مسلم بھانجے کو دیے جائیں۔ بعض مسلمانوں نے مخالفت کی تو حضرت عائشہؓ نے دخل دے کر وصیت کا نفاذ کرایا کہ اسلامی قانون ایسا ہی حکم دیتا

بعد کے زمانے میں کچھ یہود کے خیبر میں آبنے کی داستان بالکل بے بنیاد ہے اور صلیبی جنگوں کے زمانے میں تظیلہ (تذیلہ) کے بن یامین کا یہ بیان بعید از قیاس ہے؛ اور، بار اول، میں گرومان Grohmann (تذیل مادہ خیبر) کو بھی یہ بیان غلط معلوم ہوا ہے۔ بہر حال یہ بن یامین (جو غالباً یہودی ہے) لکھتا ہے کہ ۱۱۷۳ء میں خیبر میں ۱۱۵۰ یہودیوں کی آبادی پائی جاتی تھی۔ انیسویں صدی کے آغاز پر سیاح برکھارٹ کو یہاں ایک بھی یہودی نظر نہ آیا۔

ادبیات اسلام میں ایک مزعومہ مکتوب نبویؐ نقل ہوتا رہا ہے، جس میں یہود خیبر کے لیے بہت سی مراعات مذکور ہیں۔ ابن القیم: احکام اهل الذمة، جلد اول (طبع دمشق)، میں اس کی اصلیت پر بیس تفصیلی اعتراض کیے گئے ہیں۔ ایک اور جعلی منشور نبویؐ میں خیبر اور اسی کے ساتھ مقنا کے لیے بھی (جو وہاں سے کچھ دور خلیج عقبہ میں واقع ہے) ایک ہی دستاویز میں بے شمار حقوق عطا کیے گئے ہیں۔ یہ دستاویز، جو عربی زبان لیکن عبرانی خط میں ملی ہے، غالباً فاطمی دور میں وضع کی گئی (متن کے لیے دیکھئے راقم کی کتاب الوثائق السياسية، عدد ۴۰ اور بحث کے لیے دیکھئے راقم کی کتاب رسول اکرم کی سیاسی زندگی، نیز، Le Prophete de l'Islam، sa vie et son oeuvre، ج ۱، محل مذکور)۔

خیبر کے حصن مرحب کی تصویر سیاح ڈاؤن نے ہاتھ سے کھینچ کر اپنے سفرنامے میں دی ہے، جو خاصی صحیح ہے۔

محاصرہ خیبر کے زمانے میں حضرت معیضہ انصاریؓ کی سرکردگی میں ایک دستہ قذک بھیجا گیا، جیسا کہ السرخسی نے تحصیل سے بیان کیا ہے۔ وہاں کے یہودیوں نے مقابلہ کیے بغیر صلح کر لی اور سالانہ پچاس فی صد لگان آنحضرتؐ کو پیش کرنا منظور کر لیا۔ اس حسن کارگزاری پر حضرت معیضہ کا مستقل روزانہ

ہے (ابن سعد: طبقات، ۸: ۹۱ تا ۹۲)۔

صلح ہو جانے اور یہودیوں کو اپنے باغوں میں آجانے کی اجازت ملنے کے بعد بھی مسلمان سپاہی وہاں جا کر پھل، ترکاری چھیننے لگے اور شکایت آتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً روکا اور بتایا کہ اب وہ غیر کا مال ہے، جو بلا اجازت کھانا حرام ہے۔ [فتح خیر کے موقع پر ایک یہودی عورت زینب بنت الحارث (زوجة اسلام بن مشکم) نے ایک بریاں بکری آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کی اور اس میں زہر ملا دیا۔ آپ نے ایک لقمہ اٹھوایا اور چبا کر تھوک دیا اور فرمایا کہ یہ زہر آلود ہے۔ آپ کے ساتھ حضرت بشیر بن البراء بن معرور نے زہر آلود گوشت کھا لیا، جس کے اثر سے وہ مر گئے۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودی عورت کو بلا بھیجا۔ اس نے جرم کا اقرار کر لیا، مگر اسے آپ نے قتل نہ کیا۔ ایک اور روایت (الامتناع، ص ۳۲۲) میں آیا ہے کہ آنحضرت نے اسے بشر کے رشتہ داروں کے حوالے کر دیا، جنہوں نے اسے قتل کر دیا۔

ماخذ: (۱) ابن ہشام: سیر، (۲) ابن سعد: الطبقات؛ (۳) الطبری (البتینوں کا اردو ترجمہ، مطبوعہ جامعہ عثمانیہ، موجود ہے)؛ (۴) الواقدي: البغازی؛ (۵) البلاذری: أنساب الأشراف، ج ۱ (طبع مصر)؛ (۶) ابن کثیر: البدایہ، ج ۴؛ (۷) محمد بن یوسف الشافعی: سيرة الخطوط استنبول وغیرہ)؛ (۸) محمد حنفی: الوثائق السياسية باب خیر؛ (۹) وہی مصنف: رسول اکرم کی سیاسی زندگی؛ (۱۰) وہی مصنف: عہد نبوی کے میدان جنگ؛ (۱۱) مائتہ جغرافیہ ماے عرب، عدد ۱، ص ۲۱؛ (۱۲) ابن حوقل؛ ص ۲۸؛ (۱۳) المنذسی، ص ۸۳؛ (۱۴) الہمدانی، ص ۱۳۳ و ۱۳۴؛ (۱۵) البکری: معجم، ص ۳۳ تا ۳۳۳؛ (۱۶) یاقوت: معجم البلدان، بذی مادہ؛ (۱۷) سرائد الاطلاع، ۱: ۷۶ تا ۷۷؛ (۱۸) السرخسی: شرح السیر الکبیر، بمواضع کثیرہ، نیز دیکھئے طبع جدید کا

اشارہ: (۱۹) السمعی: البرصی الاثف، ج ۲، ذکر خیر؛ (۲۰) Annali dell' Islam: L. Cactani، ۱/۲، ص ۲۳ تا ۲۴؛ (۲۱) Arable: N. Desverger، ص ۱۸۰ تا ۱۸۱؛ (۲۲) Travels in Arabia Deserta: Ch. M. Doughty لندن ۱۹۳۲ء، ۲: ۷۵، ۹۲، ۱۰۱، ۱۰۳، ۱۰۵، ۱۹۹؛ (۲۳) Alte Geographie Arabiens: A. Sprenger، ص ۱۸۵، ۱۵۳، ۲۰۳؛ (۲۴) K. S. Twitchell، ص ۱۸۵، ۱۵۳، ۲۰۳؛ (۲۵) Agricultural Survey of Saudi Arabia جو عربی اور انگریزی دونوں میں چھپی ہے؛ (۲۶) ابن النیم: زاد المعاد، ۲: ۳۲۳؛ (۲۷) ابن سید الناس: عیون الآثار، ۲: ۱۳۰؛ (۲۸) القسطلانی: انواء، ۱: ۱۷۳؛ (۲۹) دیار بکری: تاریخ الخیم، ۲: ۳۲؛ (۳۰) المقریزی: الامتناع، ص ۳۰۹۔

(محمد حمید اللہ [و ادارہ])

خیر، درہ: مغربی پاکستان اور افغانستان

کے درمیان شمالی راستہ، جو کابل سے پشاور کو جاتا ہے اور تقریباً تینتیس میل لمبا ہے۔ اس کا وسطی حصہ ۳۴ درجے ۶ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۷۱ درجے ۵ دقیقے طول بلد مشرق پر واقع ہے۔ [تاریخی اور عسکری اہمیت کے اعتبار سے یہ دنیا کا اہم ترین درہ ہے۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں متعدد اقوام یہاں سے گزر کر ہندوستان پر حملہ آور ہوئیں۔ یہ ایک پیچ و خم کھاتا ہوئی تنگ سی گھاٹی ہے، جس کے دونوں جانب ۶۰۰ سے ۱۰۰۰ فٹ بلند پہاڑیاں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ پشاور سے دس میل کے فاصلے پر شروع ہو کر یہ درہ تینتیس میل تک مسلسل چلا گیا ہے اور حدود افغانستان میں لوئی ڈگہ کی وادی میں ختم ہو جاتا ہے۔ پشاور سے سات میل مغرب میں راجیت سنگھ [رگ بہ پنجاب] کے سہ سالار ہری سنگھ نلوا نے قلعہ جمروہ تعمیر کرایا تھا، جس سے تین میل آگے دفعۃً چڑھائی شروع ہو جاتی ہے اور پھر قلعہ علی مسجد تک سطح بتدریج بلند ہوتی گئی ہے۔ علی مسجد (۳۱۷ فٹ

بلند) سے پانچ میل تک بلند پہاڑوں سے گھری ہوئی ایک تنگ گھاٹی ہے، جس کی چوڑائی کہیں بھی دو سو گز سے زیادہ نہیں۔ موضع زنتارہ کے قریب ایک بڑا قلعہ موجود ہے، جس کی دیواریں کچی اور برج بلند ہیں۔ یہاں سے کم و بیش ایک میل تک وادی چوڑی ہوئی چلی گئی ہے اور دونوں طرف قلعے، دیہات اور زیر کاشت اراضی کے قطعات نظر آتے ہیں۔ علی مسجد سے دس میل کے فاصلے پر لنڈی کوتل (۳۵۱۸ فٹ بلند) کا قلعہ اور چھاؤنی واقع ہے۔ یہ درے کا بلند ترین مقام اور ایک اہم منڈی ہے۔ یہاں موسم گرما میں درجہ حرارت ۴۷°۸ درجے سینٹی گریڈ (= ۱۱۸°) درجے فارن ہائیٹ) تک پہنچ جاتا ہے۔ لنڈی کوتل سے شتواریوں کے علاقے سے گزر کر لنڈی خانہ پہنچتے ہیں، جہاں سے ایک اور گھاٹی شروع ہوتی ہے۔ لنڈی کوتل سے ۶ میل دور طورخم کے مقام پر یہ درہ افغانستان کو جاتا ہے۔ خیبر اور اس کے گرد و نواح میں زیادہ تر افریدی (رگ باں) آباد ہیں،

پانچویں صدی ق م میں ایران کے شاہنشاہ داریوش اعظم نے کابل فتح کرنے کے بعد درہ خیبر کے راستے ہندوستان کا رخ کیا تھا۔ [دو صدی بعد سکندر اعظم کا حملہ ہوا]۔ سکندر خود تو دریائے کابل کو عبور کر کے وادی گنہار اور وہاں سے بامبور اور سوات میں داخل ہوا، لیکن اس نے اپنی فوج کے ایک حصے کو ہفستیوں Hephaestion اور پرڈیکس Perdicas کی قیادت میں درہ خیبر کے راستے روانہ کیا۔ [اشوک کے عہد میں سوریا سلطنت کی عملداری میں افغانستان بھی شامل تھا، چنانچہ خیبر کے علاقے میں بھی بدھ مت کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ اس مذہب کے کئی آثار آج بھی یہاں نظر آتے ہیں، مثلاً کافرکوٹ، شوپلاستویا (خیبر ٹوپ) اور علی مسجد کے قریب ایک ستویا۔ ایک دو صدی تک یہاں یونانی، باختری نسل کے لوگوں کی متعدد ریاستیں قائم رہیں۔ عہد اسلامی میں ہندوستان پر حملے کے لیے یہ راستہ

کئی بار استعمال ہوا۔ محمود غزنوی کا گزر اس درے سے صرف ایک بار ہوا، جب وہ جے پال سے مقابلہ کرنے کے لیے وادی پشاور میں آیا تھا۔ امین تیمور ۱۳۹۸ء میں ہندوستان پر حملہ کرتے وقت اور ۱۳۹۹ء میں واپس جاتے ہوئے یہاں سے گزرا تھا۔ ۱۵۲۵ء میں بابر نے بھی اسی راستے سے ہندوستان پر یلغار کی۔ ہمایوں کابل پر قبضہ کرنے کے بعد اپنی سلطنت کی بازیابی کی خاطر اسی درے سے ہندوستان واپس آیا تھا۔ اکبر اور اس کے جانشین پنجاب سے کابل جانے کے لیے برابر یہ راستہ استعمال کرتے رہے۔ جلال آباد کا قلعہ پہلی بار ہمایوں نے تعمیر کرایا، مگر اس کا نام [جلال الدین محمد] اکبر کے نام پر پڑا۔ اس درے پر عہد مغلیہ ہی سے افریدیوں کا قبضہ رہا ہے، جو نظریۂ آزادی پسند ہیں اور بیرونی مداخلت کو سخت نا پسند کرتے ہیں۔ اکبر کے زمانے میں جب اس علاقے میں فرقہ روشنیہ [رگ باں] کو فروغ حاصل ہونے لگا تو افریدی، یوسف زئی اور دوسرے قبائل کے بعض لوگوں نے بھی روشنیہ عقائد اختیار کر لیے۔ اکبر کے چھوٹے بھائی اور کابل کے حاکم مرزا محمد حکیم کی وفات کے بعد ۱۵۸۶ء میں راجا سان سنگھ نے شہنشاہ کی طرف سے کابل پر قبضہ کرنے کے لیے چڑھائی کی اور اسے بھی اسی درے سے گزرنا پڑا۔ یہ ایک ایسی مہم تھی جو بڑی دشواری سے سر ہوئی اور فرقہ روشنیہ کو دبانے اور قابو میں لانے کے لیے بہت خونریزی سے کام لینا پڑا، اس پر روپیہ بھی بہت صرفا ہوا۔ ۱۶۷۳ء میں قبائل نے کابل کے صوبے دار محمد امین خان اورنگ زیبی بر درہ خیبر میں حملہ کر کے اس کی چالیس ہزار فوج تباہ کر دی اور عورتوں اور بچوں کو گرفتار کرنے کے علاوہ شاہی خزانے اور ہاتھیوں پر بھی قبضہ کر لیا۔ نادر شاہ نے کابل کے مغل صوبے دار ناصر خان پر حملہ کرنے کے لیے اس درے سے گزرنا چاہا تو قبائلوں نے اس کا مقابلہ کیا، مگر وہ اپنے

تھا۔ قبائلی علاقے (غیر ایجنسی) کے نظم و نسق کا سربراہ پولیٹیکل ایجنٹ ہوتا تھا۔ یہ انتظام بھی مکمل طور پر قابل اطمینان نہ رہا، تاہم سابقہ انتظامات سے بہر صورت بہتر تھا۔

(۱۹۶۰ء میں قیام پاکستان کے بعد درہ خیر اور اس کے فوادی علاقے میں بڑی خوشگوار تبدیلی رونما ہوئی۔ برطانوی حکومت نے یہاں جانچا جھاڑنا قائم کر رکھی تھیں اور "فارورڈ پالیسی" (Forward Policy) کے پیش نظر وقتاً فوقتاً ان کے علاقوں میں جارحانہ اقدامات کرتی رہتی تھی۔ اس رویے کے باعث پٹانوں نے ہمیشہ انگریزوں کو اپنا دشمن سمجھا۔ چنانچہ انہیں جب بھی موقع ملتا، ان کی چھاڑنیوں اور فوجی قافلوں پر حملہ آور ہوتے رہتے۔ آزادی کے بعد حکومت پاکستان نے ایک طرف تو قبائلیوں پر کئی اعتماد کر کے انگریزی دور کی ان تمام فوجوں کو واپس بلا لیا جو قبائلیوں پر ہندوؤں، قانین کھڑی رہتی تھیں، دوسری طرف قانون ساز اسمبلیوں کے ارکان منتخب کرنے کے لیے انہیں حق رائے دہی دے کر پاکستان کے دوسرے شہریوں کے مساوی درجہ دے دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قبائلیوں نے بھی نہ صرف پاکستانی علاقوں پر حملے کرنا ترک کر دیے، بلکہ پاکستان کی حفاظت پر کمر بستہ ہو گئے۔ انہوں نے رضاکارانہ طور پر پاکستان سے اظہار وفاداری کیا اور اس کی حکومت کو اپنی حکومت سمجھا، یہاں تک کہ وہ کشمیر کے مسلمانوں کی آزادی کے لیے سربکھ ہو کر لڑے (۱۹۴۸ء) اور جب افغانستان نے یہاں شور مچا پیدا کرنا چاہی تو اس کی تخریبی کارروائیوں کا سد باب کرنے میں حکومت سے پورا تعاون کیا (۱۹۶۰ء)۔

۱۹۶۱ء کی مردم شماری کی رو سے خیر ایجنسی کی آبادی ۳۰۱۳۱۹ اور اس کا رقبہ ۹۹۵ مربع میل ہے۔ اس علاقے میں صحت اور تعلیم کا معیار روز بروز بلند ہو رہا ہے اور تجارتی سرگرمیاں فروغ پا رہی

رسائے سمیت بازار پہنچ گیا اور ناصر خان پر آنا فائدہ حملہ کر کے اسے جمرود کے قریب شکست دی۔ نادر شاہ کے بعد پنجاب پر حملہ کرنے وقت احمد شاہ درانی اور (اس کے ہوتے) شاہ زمان نے بھی کئی بار اس درے کو عبور کیا۔ (انیسویں صدی کے اوائل میں رنجیت سنگھ کی حدود سلطنت جمرود تک پہنچ گئیں۔ دوست محمد خان، امیر کابل، نے جمرود کے قریب سکھوں کو شکست بھی دی تھی۔ بہر حال اس علاقے کے قبائلیوں کو نظم و نسق کا پابند رکھنا ہمیشہ سے بڑا کٹھن مسئلہ رہا ہے)۔

برطانوی حکومت نے پہلی بار اس درے کو ۱۸۳۹ء میں استعمال کیا [جب کرنل کلاڈ وڈ Claude Wade شہزادہ تیمور کو پشاور کے راستے کابل لے کر گیا تھا، درہ خیر میں انگریزی فوج کو متعدد بار سخت تباہی اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ افغانستان کے خلاف پہلی جنگ میں قبائلیوں سے اس کی کئی بار جھڑپیں ہوئیں۔ ۱۸۷۸ء میں سرنیول چیمبرلین Neville Chamberlane کے سفارتی وفد کو علی مسجد کے قریب روک لیا گیا، جس کے شخصائے میں دوسری جنگ افغانستان جھڑ گئی۔ اس کا خاتمہ صلح نامہ گندسک (۱۸۷۹ء) پر ہوا، جس کی رو سے درے کی دیکھ بھال اور قبائلی علاقے کا نظم و نسق برطانوی حکومت کے سپرد ہوا۔ ۱۸۹۷ء میں افریدیوں نے ایک بار پھر درے پر قبضہ کر لیا اور انگریزی فوج کئی ماہ کی جھجھک کے بعد اپنے قدم دوبارہ جما سکی۔ اس کے بعد یہاں تجربہ کار پولیٹیکل افسر مقرر کیے گئے اور ان کی مدد کے لیے خیر وائفلز کے نام سے افریدیوں کی تحریکات کی ممانعت میں تشکیل ہوئی۔ تیسری جنگ افغانستان (۱۹۱۹ء) کے بعد یہ فوج نوڑ دی گئی اور اس کی جگہ مقامی خاصہ داروں نے لے لی، جو حکومت سے تنخواہ لاتے تھے، لیکن اپنے لیے اسلحہ وغیرہ انہیں خود ہی مہیا کرنا پڑتا

جھانپنے کی صنت نے بھی فروغ پایا۔

اکبر کے زمانے میں، خبرآباد کی سرکار میں ۲۲ محال یا برگٹے تھے، مگر اب ان میں سے بعض کٹھیری اور ہردوئی کے اخلاص میں شامل ہیں۔ اس برگٹے میں ملک کا جنوبی حصہ، جو گوئڈ اور زریاں ندیوں کے درمیان واقع ہے، شامل تھا۔ شمال میں اس کی حد ہندی ہرگرام سے ہوتی ہے؛ مشرق میں لکڑپور اور بسوان سے، مغرب میں سینا پور اور رام کوٹ سے، جنوب میں مچھریہتا سے اور جنوب مشرق میں پیرنگر سے۔ پورا جنوبی نصف برگٹہ اونچی سطح زمین پر واقع ہے، جس کی مٹی زرخیز ہے۔ یہاں ندی نالوں کے ذریعے کھیتوں کی آبیاری ہوتی ہے، جس کی وجہ سے غنہ تسم کے گیہوں کی فصل تیار ہوتی ہے۔ سڑکی کے شمال میں سینا پور سے خبرآباد تک اور خبرآباد سے بسوان تک زمین نشیبی ہے۔ مٹی زیادہ سخت ہے۔ بہت سی جھیلوں اور ندی نالوں کی وجہ سے وہاں سیلاب آ جاتا ہے۔ بہر حال عام طور پر کاشت کی حالت زیادہ اچھی نہیں، زیادہ تر کاشتکار کسانوں کے زیریں طریقے سے تعلق رکھتے ہیں ان کے پاس خاصی بڑی اراضی ہے، لیکن مویشیوں کی حالت اتر ہے۔ بہت سے زمیندار حد درجہ مقروض ہیں۔ آبپاشی کے باقاعدہ ذرائع کم ہیں۔

[خبر آباد عہد اسلامی میں علم و ادب کا مرکز رہا ہے۔ یہاں کا مدرسہ قدیمہ تاریخ سیر کے عہد میں حاجی صفت اللہ محدث (م ۱۱۵۷ھ) نے قائم کیا تھا، جسے ان کے بعد ان کے بیٹے مولوی احمد اللہ نے جاری رکھا۔ علما کے ایک سلسلے کو خبرآباد سے نسبت حاصل ہے۔ اس کے مؤسس فرنگی محل کے نامور عالم ملا کمال الدین کے مشہور شاگرد ملا محمد اعظم فاروق سندیلوی (م ۱۶۹۸ھ) تھے۔ اس سلسلے کی ایک ممتاز شخصیت مولانا فضل امام خبرآبادی (م ۱۲۴۳ھ) صاحب آمد نامہ، دہلی کے صدرالصدر تھے۔ ان کے بیٹے مولانا فضل حق معقولات کے بڑے عالم تھے؛ انھوں نے فلسفے

میں۔ نئی کوتل کو اب ایک بڑی پُر رونق تجارتی منڈی کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔

ماخذ: (۱) الطبری، طبع ثخویہ؛ (۲) میر خواںد: روضۃ الصفا؛ (۳) شہاج سراج: طبقات ناصری، مترجمہ Raverty؛ (۴) شرف الدین یزدی: ظفر نامہ؛ (۵) بابر: بابر نامہ؛ طبع Beveridge؛ سلسلہ یادگار گب' ج ۱، بمبئی اشاریہ؛ (۶) ابوالفضل: اکبر نامہ؛ (۷) جہانگیر: توڑک جہانگیری، ترجمہ Rogers، طبع Beveridge لندن ۱۹۰۹ء، بمبئی اشاریہ؛ (۸) عبدالحمید لاہوری: بادشاہ نامہ؛ (۹) خاقانی (خواجہ) خان: منتخب القیاب، طبع کبیر الدین احمد؛ نیز طبع T.W. Haig، بمبئی اشاریہ؛ (۱۰) N. Manucci: Storia da Mogor، ترجمہ Irvine؛ (۱۱) Gazetteer: The Cambridge History of India؛ (۱۲) Encyclopaedia Britannica، طبع ۱۹۶۹ء ج ۱؛ بذیل مادہ: (۱۳) Pakistan Year Book 1969، کراچی ۱۹۶۹ء؛ (۱۴) سیر عبدالصمد خان: خوشحال و اقبال، طبع ہشاور؛ (۱۵) عید ہاشمی فرید آبادی: تاریخ پاکستان و بھارت، مطبوعہ کراچی؛ (۱۶) T.W. Haig (و ادارہ)

۱۰۔ خبر آباد: [بھارت میں اتر پردیش کے] ضلع سینا پور کا ایک قصبہ ہے، جس کی آبادی ۱۹۰۱ء میں ۳,۷۷۸ تھی۔ پہلے اسے بہت اہمیت حاصل تھی۔ کہا جاتا ہے اسے خیرا نامی ایک ہنسی نے گیارہویں صدی میں آباد کیا تھا، لیکن اغلب یہ ہے کہ مسلمانوں نے ایک پرانے شہر کو، جو اس جگہ واقع تھا، اس نام سے موسوم کیا ہو۔ قدیم شہر کا نام مساجھترا Masachatra بتایا جاتا ہے۔ یہ قدیم زمانے کا ایک متبرک مقام تھا۔ یہاں بہت سے مندر اور مسجدیں پائی جاتی ہیں، جن میں سے بعض اکبر (رک باں) کے زمانے کی ہیں۔ ۱۸۶۹ء سے یہاں میونسپلٹی قائم ہے۔ سینا پور کی اہمیت بڑھ جانے سے یہاں کی تجارت کو نقصان پہنچا، مگر پھر بھی روزانہ منڈی لگتی رہی اور چھوٹے پیمانے پر سوتی کیڑے

مقرر ہوا۔ اس کے بعد بہت سے علمی اداروں کا صدر مقرر ہوا اور نو تشکیل یافتہ وزارت تعلیم میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہا۔ طب کے مدرسے کا بہت ذوق مندر رہا۔ ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء میں ایسے سفیر بنا کر تھران بھیجا گیا، جہاں وہ اچانک ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء میں انتقال کر گیا۔ اس کے بیٹوں کے نام عبدالحق حامد (جو ترکیہ جدید کا بہت اہم شاعر اور ڈراما نویس ہے) اور عبدالمالک نصوحی ہیں۔ ان دونوں نے سفیر اور ایاجی کی حیثیت سے ملک کی خدمات سرانجام دی ہیں۔

خیر اللہ نے متعدد تاریخی، جغرافیائی، طبی، سائنسی اور زراعت سے متعلق کتابیں تصنیف کیں؛ مؤخر الذکر زیادہ تر ترجموں پر مشتمل ہیں۔ ان میں سے بعض طبع بھی ہوئیں، جیسے مسائل حکمت، بیت دھقانی، اور یہ سیاحت نامہ سی، یعنی یورپ کا سیاحت نامہ؛ مگر اس کی شہرت اور اہمیت تاریخ نویسی کی بدولت ہے۔ وقائع مصریہ کے علاوہ اس نے ایک تاریخ بھی لکھی، جس کے لیے اس نے بہت وسیع پیمانے پر اہتمام کیا۔ یہ دولت عثمانیہ کی تاریخ ہے، جس کا نام "دولت عالیہ عثمانیہ تاریخی" ہے۔ یہ اس زمانے میں اکھی گئی جب کہ ملک کے مؤرخ احمد جودت [رک بان] نے ایک تاریخ بارہ جلدوں میں مرتب کی تھی، جس میں ۱۷۷۳ء سے ۱۸۲۶ء تک کا زمانہ آ جاتا ہے۔

خیر اللہ اندلی کا مقصد بظاہر پوری تاریخ ترکیہ کو ایک مسلسل تصنیف کی صورت میں مرتب کرنا تھا۔ یہ پہلا ترکی مؤرخ ہے جس نے یہ امر پیش نظر رکھ کر کہ ترکیہ کی تاریخ کو دنیا کی تاریخ میں کیا حیثیت حاصل ہے، تحقیق کی اور ایک جامع تاریخ مرتب کر دی۔ یہ دوسرے عثمانی مؤرخین کی تاریخوں سے مختلف تھی جو اپنے آپ کو صرف ترکی ذرائع، حالات اور واقعات تک ہی محدود رکھتے تھے۔ گویا یہ پہلا شخص تھا جو کسی حد تک ایک تاریخ عمومی، یعنی تاریخ عالم لکھنے میں کامیاب ہوا۔ von Hammer-

میں ہدیہ سعیدیہ اور شرح ہدایہ الحکمة وغیرہ کتابیں تالیف کیں۔ ۱۸۵۷ء کے خونیں انقلاب میں انہیں گرفتار کر کے انڈمان [رک بان] بھیج دیا گیا، جہاں ۱۲۷۸ھ میں انہوں نے وفات پائی۔ ان کے تلامذہ میں سے: (۱) ان کے بیٹے مولانا عبدالحق نے رام پور میں (۲) مولانا برکات احمد نے ٹونک میں اور (۳) مولانا ہدایت اللہ نے جونپور کے مدرسہ شیخ امام بخش میں علم و فضل کی مجلسیں آراستہ کیں۔ خیر آباد اپنی ادبی سرگرمیوں کے باعث بھی مشہور رہا ہے۔ یہاں کے ایک اردو شاعر ریاض خیر آبادی نے "خبریات" میں بہت ممتاز مقام پیدا کیا۔

مآخذ: (۱) District Gazetteer: H.R. Nevill

(۲) 'of the United Provinces of Agra and Oudh

۱۲۵ و ۱۲۶: (۲) 'Imperial Gazetteer: Hunter

۲۰۷: (۳) سید سلیمان ندوی: حیات شبلی، اعظم گڑھ

۱۹۳۳ء: ص ۲۲، ۲۳: (۴) انتظام اللہ شہابی: تاریخ ملت

۱۱: ۱۸۱: (۵) میر غلام علی آزاد بلگرامی:

مآثر الکرام، ۱: ۳۰۱۔

(ہدایت حسین [و ادارہ])

* خیر اللہ افغانی: ایک اہم ترکی مؤرخ۔ قسطنطنیہ

میں ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوا، جو ۱۶۰ سال سے نگاتار سلاطین کی ملازمت سے وابستہ رہا تھا؛ باپ کا نام عبدالحق افغانی (م۔ ۱۸۵۳/۱۲۷۰ء-۱۸۵۳ء) اپنے زمانے کا بہت مشہور شخص تھا۔ یہ (عبدالحق افغانی) ایک عالم دین اور طبیب تھا؛ اپنے تین ہار رئیس الاطباء مقرر کیا گیا۔ ۱۲۶۹ھ سے اسے رئیس العلما کا اعزازی خطاب حاصل رہا۔ خیر اللہ نے اپنے باپ کے نقش قدم پر چل کر ایک فقیہ کی زندگی اختیار کی۔ سب سے پہلے وہ سمرنا کا "ملا" (۱۲۵۸/۱۸۴۲ء میں) مقرر ہوا، بعد میں اس نے "نفس" طب اور تعلیم کے محکموں کی طرف رجوع کیا۔ ۱۲۶۵ھ میں وہ مجلس تعلیم کا، پھر مجلس زراعت کا رکن اور "انجمن دانش" کا دوسرا صدر

١٣ : (٢) احمد رفعت : الزوطة العزبية : قسطنطينية ١٢٨٢ هـ
١٤ : (٣) جمال الدين عثمانى تاريخ و تاريخ ايرى
قسطنطينية ١٣١٨ هـ : (٤) سامى : قابوس الاعلام
١٥ : (٥) ثريا : رحلت عثمانى : ٢ : ١٣١٩ هـ : (٦)
Bericht über die zu Kons- v. Hammer-Purgstall
in Constantinopel in Druck erscheinende Geschichte des
osmanischen Reiches von Chaurliah Efendi
١٦ : Phil. hist Klasse 'S. B. Ak Wien
Ausführl. Bericht : O. von Schlehta-Wsschrd
über die in Konstantinopel erschienenen orientalis-
chen Werke 'S. B. Ak. Wien
١٧ : ١٣١٨ هـ : ٢٠ : ١٣١٩ هـ : ٢١ : ١٣٢٠ هـ : ٢٢ : ١٣٢١ هـ : ٢٣ : ١٣٢٢ هـ : ٢٤ : ١٣٢٣ هـ : ٢٥ : ١٣٢٤ هـ : ٢٦ : ١٣٢٥ هـ : ٢٧ : ١٣٢٦ هـ : ٢٨ : ١٣٢٧ هـ : ٢٩ : ١٣٢٨ هـ : ٣٠ : ١٣٢٩ هـ : ٣١ : ١٣٣٠ هـ : ٣٢ : ١٣٣١ هـ : ٣٣ : ١٣٣٢ هـ : ٣٤ : ١٣٣٣ هـ : ٣٥ : ١٣٣٤ هـ : ٣٦ : ١٣٣٥ هـ : ٣٧ : ١٣٣٦ هـ : ٣٨ : ١٣٣٧ هـ : ٣٩ : ١٣٣٨ هـ : ٤٠ : ١٣٣٩ هـ : ٤١ : ١٣٤٠ هـ : ٤٢ : ١٣٤١ هـ : ٤٣ : ١٣٤٢ هـ : ٤٤ : ١٣٤٣ هـ : ٤٥ : ١٣٤٤ هـ : ٤٦ : ١٣٤٥ هـ : ٤٧ : ١٣٤٦ هـ : ٤٨ : ١٣٤٧ هـ : ٤٩ : ١٣٤٨ هـ : ٥٠ : ١٣٤٩ هـ : ٥١ : ١٣٥٠ هـ : ٥٢ : ١٣٥١ هـ : ٥٣ : ١٣٥٢ هـ : ٥٤ : ١٣٥٣ هـ : ٥٥ : ١٣٥٤ هـ : ٥٦ : ١٣٥٥ هـ : ٥٧ : ١٣٥٦ هـ : ٥٨ : ١٣٥٧ هـ : ٥٩ : ١٣٥٨ هـ : ٦٠ : ١٣٥٩ هـ : ٦١ : ١٣٦٠ هـ : ٦٢ : ١٣٦١ هـ : ٦٣ : ١٣٦٢ هـ : ٦٤ : ١٣٦٣ هـ : ٦٥ : ١٣٦٤ هـ : ٦٦ : ١٣٦٥ هـ : ٦٧ : ١٣٦٦ هـ : ٦٨ : ١٣٦٧ هـ : ٦٩ : ١٣٦٨ هـ : ٧٠ : ١٣٦٩ هـ : ٧١ : ١٣٧٠ هـ : ٧٢ : ١٣٧١ هـ : ٧٣ : ١٣٧٢ هـ : ٧٤ : ١٣٧٣ هـ : ٧٥ : ١٣٧٤ هـ : ٧٦ : ١٣٧٥ هـ : ٧٧ : ١٣٧٦ هـ : ٧٨ : ١٣٧٧ هـ : ٧٩ : ١٣٧٨ هـ : ٨٠ : ١٣٧٩ هـ : ٨١ : ١٣٨٠ هـ : ٨٢ : ١٣٨١ هـ : ٨٣ : ١٣٨٢ هـ : ٨٤ : ١٣٨٣ هـ : ٨٥ : ١٣٨٤ هـ : ٨٦ : ١٣٨٥ هـ : ٨٧ : ١٣٨٦ هـ : ٨٨ : ١٣٨٧ هـ : ٨٩ : ١٣٨٨ هـ : ٩٠ : ١٣٨٩ هـ : ٩١ : ١٣٩٠ هـ : ٩٢ : ١٣٩١ هـ : ٩٣ : ١٣٩٢ هـ : ٩٤ : ١٣٩٣ هـ : ٩٥ : ١٣٩٤ هـ : ٩٦ : ١٣٩٥ هـ : ٩٧ : ١٣٩٦ هـ : ٩٨ : ١٣٩٧ هـ : ٩٩ : ١٣٩٨ هـ : ١٠٠ : ١٣٩٩ هـ : ١٠١ : ١٤٠٠ هـ : ١٠٢ : ١٤٠١ هـ : ١٠٣ : ١٤٠٢ هـ : ١٠٤ : ١٤٠٣ هـ : ١٠٥ : ١٤٠٤ هـ : ١٠٦ : ١٤٠٥ هـ : ١٠٧ : ١٤٠٦ هـ : ١٠٨ : ١٤٠٧ هـ : ١٠٩ : ١٤٠٨ هـ : ١١٠ : ١٤٠٩ هـ : ١١١ : ١٤١٠ هـ : ١١٢ : ١٤١١ هـ : ١١٣ : ١٤١٢ هـ : ١١٤ : ١٤١٣ هـ : ١١٥ : ١٤١٤ هـ : ١١٦ : ١٤١٥ هـ : ١١٧ : ١٤١٦ هـ : ١١٨ : ١٤١٧ هـ : ١١٩ : ١٤١٨ هـ : ١٢٠ : ١٤١٩ هـ : ١٢١ : ١٤٢٠ هـ : ١٢٢ : ١٤٢١ هـ : ١٢٣ : ١٤٢٢ هـ : ١٢٤ : ١٤٢٣ هـ : ١٢٥ : ١٤٢٤ هـ : ١٢٦ : ١٤٢٥ هـ : ١٢٧ : ١٤٢٦ هـ : ١٢٨ : ١٤٢٧ هـ : ١٢٩ : ١٤٢٨ هـ : ١٣٠ : ١٤٢٩ هـ : ١٣١ : ١٤٣٠ هـ : ١٣٢ : ١٤٣١ هـ : ١٣٣ : ١٤٣٢ هـ : ١٣٤ : ١٤٣٣ هـ : ١٣٥ : ١٤٣٤ هـ : ١٣٦ : ١٤٣٥ هـ : ١٣٧ : ١٤٣٦ هـ : ١٣٨ : ١٤٣٧ هـ : ١٣٩ : ١٤٣٨ هـ : ١٤٠ : ١٤٣٩ هـ : ١٤١ : ١٤٤٠ هـ : ١٤٢ : ١٤٤١ هـ : ١٤٣ : ١٤٤٢ هـ : ١٤٤ : ١٤٤٣ هـ : ١٤٥ : ١٤٤٤ هـ : ١٤٦ : ١٤٤٥ هـ : ١٤٧ : ١٤٤٦ هـ : ١٤٨ : ١٤٤٧ هـ : ١٤٩ : ١٤٤٨ هـ : ١٥٠ : ١٤٤٩ هـ : ١٥١ : ١٤٥٠ هـ : ١٥٢ : ١٤٥١ هـ : ١٥٣ : ١٤٥٢ هـ : ١٥٤ : ١٤٥٣ هـ : ١٥٥ : ١٤٥٤ هـ : ١٥٦ : ١٤٥٥ هـ : ١٥٧ : ١٤٥٦ هـ : ١٥٨ : ١٤٥٧ هـ : ١٥٩ : ١٤٥٨ هـ : ١٦٠ : ١٤٥٩ هـ : ١٦١ : ١٤٦٠ هـ : ١٦٢ : ١٤٦١ هـ : ١٦٣ : ١٤٦٢ هـ : ١٦٤ : ١٤٦٣ هـ : ١٦٥ : ١٤٦٤ هـ : ١٦٦ : ١٤٦٥ هـ : ١٦٧ : ١٤٦٦ هـ : ١٦٨ : ١٤٦٧ هـ : ١٦٩ : ١٤٦٨ هـ : ١٧٠ : ١٤٦٩ هـ : ١٧١ : ١٤٧٠ هـ : ١٧٢ : ١٤٧١ هـ : ١٧٣ : ١٤٧٢ هـ : ١٧٤ : ١٤٧٣ هـ : ١٧٥ : ١٤٧٤ هـ : ١٧٦ : ١٤٧٥ هـ : ١٧٧ : ١٤٧٦ هـ : ١٧٨ : ١٤٧٧ هـ : ١٧٩ : ١٤٧٨ هـ : ١٨٠ : ١٤٧٩ هـ : ١٨١ : ١٤٨٠ هـ : ١٨٢ : ١٤٨١ هـ : ١٨٣ : ١٤٨٢ هـ : ١٨٤ : ١٤٨٣ هـ : ١٨٥ : ١٤٨٤ هـ : ١٨٦ : ١٤٨٥ هـ : ١٨٧ : ١٤٨٦ هـ : ١٨٨ : ١٤٨٧ هـ : ١٨٩ : ١٤٨٨ هـ : ١٩٠ : ١٤٨٩ هـ : ١٩١ : ١٤٩٠ هـ : ١٩٢ : ١٤٩١ هـ : ١٩٣ : ١٤٩٢ هـ : ١٩٤ : ١٤٩٣ هـ : ١٩٥ : ١٤٩٤ هـ : ١٩٦ : ١٤٩٥ هـ : ١٩٧ : ١٤٩٦ هـ : ١٩٨ : ١٤٩٧ هـ : ١٩٩ : ١٤٩٨ هـ : ٢٠٠ : ١٤٩٩ هـ : ٢٠١ : ١٥٠٠ هـ : ٢٠٢ : ١٥٠١ هـ : ٢٠٣ : ١٥٠٢ هـ : ٢٠٤ : ١٥٠٣ هـ : ٢٠٥ : ١٥٠٤ هـ : ٢٠٦ : ١٥٠٥ هـ : ٢٠٧ : ١٥٠٦ هـ : ٢٠٨ : ١٥٠٧ هـ : ٢٠٩ : ١٥٠٨ هـ : ٢١٠ : ١٥٠٩ هـ : ٢١١ : ١٥١٠ هـ : ٢١٢ : ١٥١١ هـ : ٢١٣ : ١٥١٢ هـ : ٢١٤ : ١٥١٣ هـ : ٢١٥ : ١٥١٤ هـ : ٢١٦ : ١٥١٥ هـ : ٢١٧ : ١٥١٦ هـ : ٢١٨ : ١٥١٧ هـ : ٢١٩ : ١٥١٨ هـ : ٢٢

{TH. MENZEL}

د) خیرپور : پاکستان کے صوبہ سندھ کا ایک شہر اور اسی نام کی قسمت (رقبہ ۲۰۲۹۳ مربع میل؛ آبادی ۱۹۶۱ء میں ۳۱۳۴۱۲) اور ضلع (رقبہ ۶۰۱۸ مربع میل؛ آبادی ۱۹۶۱ء میں ۴۲۳۱۳۷) کا صدر مقام۔ مغربی پاکستان میں ریاستوں کے ادغام (رگ بہ پاکستان) سے پہلے یہ خیرپور (میرس) کا دارالحکومت تھا۔ اس ریاست کی تاریخ کا آغاز ۱۱۹۸/۱۷۸۳ء میں ہوتا ہے جب کلہوڑہ خاندان کے خاتمے کے بعد تالپور بر سر اقتدار آئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ تالپور قبیلے کا مورث اعلیٰ ثالثہ (مطلعہ ۹) حضرت حمزہ بن عبدالمطلب کی اولاد میں سے تھا، جو دسویں صدی ہجری میں بلوچستان آیا اور سو ڈیڑھ سو برس میں اس قبیلے کے افراد نے وسط سندھ میں اپنی کئی بستیوں بسا لیں۔ ان کے تین سرداروں نے کلہوڑوں کی حکومت کا تختہ الٹ کر سندھ کو آپس میں تقسیم کر لیا اور میر فتح علی خان نے حیدرآباد (سندھ) میں، میر ٹھارا خان نے میرپور خاص میں اور میر سہراب خان نے خیرپور میں اپنا صدر مقام قائم کر لیا۔ یہ حکمران عصری تاریخوں

کے *Geschichte des osmanischen Reiches* کی Purgstall
 سوا، اس نے جو مصادر استعمال کیے، وہ تقریباً سب
 فرانسیسی ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ خارجی یا
 غیر ترکی ناموں کو اس طرح استعمال کرتا ہے جس طرح
 ان کا فرانسیسی زبان میں تلفظ ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ
 ساتھ وہ ایسے ترکی ماخذ بھی استعمال کرتا ہے جنہیں
 اس سے پہلے کسی اور نے استعمال نہیں کیا تھا۔

اس تاریخ کا مقدمہ جامع ہے، جس میں سلطنت عثمانیہ کی ابتدائی تاریخ دی ہے، جو عثمان اول کے زمانے سے پہلے کی ہے۔ اس کے بعد کتاب کی ترتیب یہ ہے کہ ہر ایک سلطان کے عہد کے لیے ایک جلد مختص کی گئی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ہم عصر مسلمان اور عیسائی حکمرانوں کے حالات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ دوسرے ابتدائی مؤرخین کے غیر سہل اسلوب کے مقابلے میں اس کی زبان سادہ اور قابل فہم ہے۔ اس کی تاریخ بھی اس کے پیش رو مؤرخین کے مقابلے میں قابل تعریف حد تک ممتاز ہے۔ خیر اللہ کے ہاں بھی، دوسرے مسلم مؤرخین کی طرح تعصب بالکل نہیں پایا جاتا اور نہ مسلم اقوام کے تمدن اور حالات کے متعلق ہی کسی مذہبی نفرت کا اظہار کیا گیا ہے۔

اس کی تاریخ کی کل پندرہ جلدیں ۱۲۷۱ھ/ ۱۸۵۴ء تا ۱۲۸۱ھ/ ۱۸۶۴ء) شائع ہوئیں، جو عثمان اول کے عہد سے احمد اول (۱۶۰۴ - ۱۶۶۰ء) کے زمانے تک کے حالات سے متعلق ہیں۔ بعد کی تاریخ لکھنے کے لیے اسے زندگی نے سہلت نہ دی۔ پھر علی شوق نے جو "دیوان احکام عدلیہ" میں ناظر تھا، یہ تاریخ مکمل کرنے کی کوشش کی، جس کا بمشکل نصف حصہ ہی خیر اللہ لکھ پایا تھا، مگر صرف تین مزید جلدیں ۱۶ تا ۱۸ (۱۲۸۹ھ/ ۱۸۷۲ء تا ۱۲۹۲ھ/ ۱۸۷۵ء) شائع ہوئیں۔ ان سے یہ تاریخ سلطان ابراہیم (۱۶۳۹ء تا ۱۶۴۸ء) کے زمانے تک پہنچ گئی۔

ہم آئند : (۱) خود خیر اللہ کی تاریخ : ۱ : ۱۶۵۲ :

شہر ہر گولے بوسانے لگے۔ بربروسہ نے انہیں کمین گاہوں سے باہر نکالنے کی غرض سے ان کے ساحل والے ہزاروں پر حملہ کر کے مجبور کر دیا کہ وہ انگر اٹھا لیں (۱۵۱۹ء)۔ اس کے برعکس مشرق میں قسمت نے اس کا بہت کم ساتھ دیا۔ ایک تونسوی فوج الجزائر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ بربروسہ نے ارض قبائل میں، جو فلیسٹ اُمیل Flissat Umellal کے علاقے میں تھا، ان کا مقابلہ کیا۔ جنگ کے دوران میں سلطان کوٹکو Kuko کو خفیہ طور پر حفصی سلطان نے ساتھ ملا لیا اور وہ ترکوں کا ساتھ چھوڑ کر ان کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گیا جس سے ترکوں کو تباہی کا سامنا کرنا پڑا۔ بربروسہ کے لیے الجزائر واپس آنے کا راستہ مسدود تھا، اس لیے اس نے جیجیل [رک بان] میں پناہ لی۔ اس اثنا میں قبائلیوں نے نتیجہ کو تباہ کر کے الجزائر پر قبضہ کر لیا اور ادھر شورش اور تپش نے بھی بغاوت کر دی (۱۵۲۰ء)۔

جیجیل میں پناہ لینے کے بعد خیر الدین فوج کو پھر سے ترقیب دینے لگا اور وسائل قوت جمع کرنا شروع کیے۔ ساتھ ہی بحری مہموں کا آغاز از سر نو کر دیا اور ۱۵۲۰ء سے ۱۵۲۵ء تک بحر روم کے مغربی ساحل کی آبادی پر ترکتازی کر کے بہت سی دولت حاصل کی۔ بہت سے مہم باز بھی اس کے ارد گرد جمع ہو گئے۔ تھوڑے ہی دنوں میں وہ اس قابل ہو گیا کہ گواو (۱۵۲۱ء میں)، بونہ (۱۵۲۲ء میں) اور قسطنطنیہ پر قبضہ کر لے۔ اس نے قبائل صغریٰ کے باشندوں کی مدد بھی حاصل کر لی، جو بنو عباس کے سردار عبدالعزیز کی بدولت میسر آئی۔ یہ کوٹکو Kuko کے سلطان کا مد مقابل تھا۔ اس طرح ۱۵۲۵ء میں وہ القاضی کے خلاف جارحانہ کارروائی کرنے کے قابل ہو گیا۔ القاضی وادی بگدورا (بندورہ) Wadi Bugdura میں شکست کھا کر اور پھر درہ بنو عائشہ پر بھی شکست خوردہ ہو کر خود اپنے سپاہیوں کے ہاتھوں قتل ہوا۔ نتیجہ اور

کے بادشاہ ابن القاضی کے قبائل Kabyls کے ساتھ چھوڑ دیا۔ قلعہ ان کے حکمران ابو حمو نے شلب کی وادی پر حملہ کر دیا اور بالآخر الجزائر والوں نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ اتنے مخالفین سے بیک وقت اپنا بربروسہ کی فوج کے لیے ممکن نہ تھا، اس لیے اس نے قسطنطنیہ کے سلطان سلیم سے مدد طلب کی اور اس نے یہ وعدہ کیا کہ جو ملک اس کے بھائی نے فتح کیے ہیں، ان کی طرف سے سلطان کو عہد وفاداری یا حلف اطاعت پیش کیا جائے گا اور خراج بھی ادا کیا جائے گا۔ سلطان نے اسی زمانے (۱۵۱۷-۱۵۱۸ء) میں مصر فتح کیا تھا اور اب اس نے اپنی حکومت کا حلقہ اثر بحر روم کے ساحل تک پھیلانے کے لیے یہ موقع غنیمت سمجھا۔ اس نے خیر الدین کا حلف اطاعت (عہد وفاداری) قبول کیا اور اسے پاشا اور بیگلرلیک کے اعزاز سے نوازا [رک بہ بیگ اور بیگلرلیک] اور الجزائر کی طرف دو ہزار فوج اور توپ خانہ بھیجا اور ایسے رضا کاروں کو بھرتی کرنے کی اجازت دی جن کو اس نے اپنی چری [رک بان] جیسے حقوق اور رعایتیں عطا کیں۔ اس طرح سے بربروسہ کے ماتحت چار ہزار ترک (یا اہل الشرق) آ گئے اور یہ الجزائر کی فوج یا اوجق odjak کہلانے۔

اس کمک کے آنے سے خیر الدین کو ان خطروں کا مقابلہ کرنے کا موقع مل گیا جو اس کو گھیرے ہوئے تھے۔ الجزائر والوں کی ایک سازش، جس میں انہوں نے یہ طے کیا تھا کہ اہل قبائل کے ساتھ مل کر بحری بیڑے کو آگ لگا دیں گے اور ترکوں کو قتل کر ڈالیں گے، ختم کر دی گئی اور اس سازش کے سرغنوں کو قتل کر کے ان کے سر پاشا کے محل کے دروازوں پر لٹکا دیے گئے۔ ہسپانوی فوج جو اوگوڈی سون کبڈ Ugode Moncade کے ماتحت تھی، ہسپا کر دی گئی۔ حراش (الحراش) کے دہانے پر جو عیسائی اتر آئے تھے، انہوں نے کدیہ الصابون کی بلندیوں پر اپنے قدم جما لیے اور

الجزائر پر ترکوں نے پھر سے قبضہ کر لیا۔ تیس اور شرشال کے باغی سردار قتل کر دیے گئے اور قسطنطنیہ کے باشندوں کو، جنہوں نے ۱۵۲۷ء میں اپنے قائد کو شہر بدر کر دیا تھا اور ترکی قلعہ بند فوج کو قتل کر ڈالا تھا، بہت سخت سزائیں دی گئیں! بالآخر حسین نے، جو القاضی کا جانشین ہوا، اطاعت اختیار کر لی اور سالانہ خراج دینا منظور کر لیا (۱۵۲۸ء)۔ پنون Penon، جو ایک ہسپانوی قلعہ تھا اور الجزائر سے نوب کے گولے کی مار پر ایک جھوٹے سے جزیرے میں تعمیر ہوا تھا، اس پر قبضہ ہو جانے سے ترکی طاقت دوبارہ بحال ہو گئی۔ مئی ۱۵۲۹ء کے شروع میں بربروسہ نے اس قلعے پر بمباری شروع کی۔ قلعہ بند فوج کو ہسپانوی حکومت زیادہ مستحکم نہیں بنا سکی تھی! چنانچہ ۲ مئی کو ایک حملہ کر کے اسے مسخر کر لیا گیا۔ اس کے اندر صرف پچیس غیر مجروح مدافعتی باقی بچے تھے۔ خیر الدین نے محافظ قلعہ ڈان مارٹن ڈی وارگاڈ Don Martin de Vargas کو قتل کرا دیا اور پنون کی بیرونی دیواروں کو گرا کر زمین کے برابر کرا دیا۔ اس کے ملے سے ایک گودی بنا کر جزیرے کو سطح زمین سے ملا دیا گیا۔ اس گودی کے باعث مغربی ہواؤں سے حفاظت ہو گئی اور بحری مہموں پر جانے والوں کو موقع ملا کہ اپنے جہازوں کو محفوظ جگہ پر ٹھہرا سکیں! ورنہ اس سے پہلے خراب موسم میں ان کو اپنے جہازوں کو ساحل سمندر پر کھینچ کر لانا پڑتا تھا۔ اس سے الجزائر کی بندرگاہیں گئی جو بربری کے بحری بیڑے کے لیے بشت پناہ اور ڈالے کا کام دیتی تھی۔ خیر الدین کی اس نئی کامیابی سے بوکھلا کر ہسپانویوں نے شرشال پر قبضے کے ذریعے ساحل پر اترنے کی جگہ حاصل کرنا چاہی، مگر اس حملے میں جو کہ اینڈریاز ڈوریا Andreas Doria نے کیا تھا، انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا (۱۵۳۱ء)۔ اب الجزائر میں قطعی طور پر قدم جمانے کے بعد

بربروسہ نے اپنی فوجی طاقت میں اضافہ کرنے کے لیے اپنی جبری کے ساتھ ساتھ، جن کی گستاخی اور حکم عدویٰ نے ان کو خطرناک بنا دیا تھا، ایسے سپاہی بھرتی کرنے کی کوشش کی، جو ذاتی طور پر اس سے عقیدت رکھتے ہوں اور اس کے زیر اثر بھی ہوں۔ اس نے ہانسو توہسلہوں کا ایک حفاظتی دستہ قائم کیا جو زیادہ ہسپانویوں پر مشتمل تھا۔ سات ہزار سے آٹھ ہزار فی تعداد تک یونانی اور الہانی سپاہی بھرتی کیے۔ قبائلیوں کو بھی اس میں شامل کیا اور اس نئی فوج اور توہنجوں کی قیادت و کمان پرانے ساتھیوں کو سونپی، جو "رئیس" کہلاتے تھے۔ اس طرح اس نے اپنے لیے یہ موقع نکالا کہ تونس کے خلاف فوج کشی کر سکے جہاں کے باشندوں کے ساتھ وہ بہت دنوں سے خفیہ سازباز کر رہا تھا۔ اس شہر پر قبضہ کر کے وہ ہسپانویوں کی چالوں کو پہلے سے معلوم کرنا چاہتا تھا تاکہ افریقہ کے تمام مشرقی ساحلوں پر اقتدار حاصل کر سکے۔ بربروسہ نے اپنی ساری تدابیر سلطان کو بتا دی تھیں، چنانچہ اس نے بربروسہ کو ضروری اختیارات دے دیے اور اسدادی فوج بھی روانہ کر دی۔ الجزائر میں حسن آغا کو اپنا خلیفہ مقرر کر کے بربروسہ خود تونس میں داخل ہوا اور حلق الوادی la Goulette پر قبضہ کر لیا (۱۶ اگست ۱۵۳۴ء)، پھر یہاں سے آگے بڑھا۔ مولای حسن نے بربروسہ کو روکنے کی کوشش کی، مگر ایک جنگ میں جو الجزیرہ کے دروازے کے پاس ہوئی تھی اسے شکست کھا کر بھاگنا پڑا (۱۸ اگست)۔ ترکوں نے تونس میں داخل ہو کر شہر کو فتح کر لیا۔ باقی ملک نے بغیر کسی مزاحمت کے ہتیار ڈال دیے۔ بربروسہ کی یہ کامیابی بہت ہی تھوڑے دنوں تک رہی۔ جون ۱۵۳۵ء میں چارلس پنجم تونس کے ساحل پر نمودار ہوا۔ ۱۴ جولائی کو ہسپانویوں نے حلق الوادی La Goulette فتح کر لیا اور ۲ جولائی کو تونس کے مالک بن گئے۔ عیسائی غلام، جن کا قتل

سینٹ مورا St. Maura کے مقام پر دو کامیابیاں حاصل کیں۔ ۱۵۳۹ء میں اپنے دو قائلدین جسٹن کرسو اور طرحوت کی مدد سے اس نے کبسنل ٹروو Castelnovo پر، جو خلیج کٹارو Cattaro میں واقع ہے، نیز ملوازیہ Malvasia اور نوبلیا Navplia پر، جو مورہ Mosca میں ہیں، پھر سے قبضہ کر لیا۔ اہل وینس (- اہل بندقہ) نے ہتیار ڈال دیے اور "باب عالی" سے مصالحت کر لی۔ ان کامیابیوں کی وجہ سے بربروسہ کو قسطنطنیہ میں بہت عزت اور رسوخ حاصل ہو گیا۔ سلطان کی دوستی کا شرف حاصل ہونے کے بعد اس نے سلیمان کو یہ ترغیب دی کہ مغربی بحر روم میں جنگ جاری رکھے! ساتھ ہی وہ قطعی طور پر فرانس سے اتحاد قائم کرنے کے حق میں تھا۔ ۱۵۳۴ء سے وہ فرانسس (فرانسو) اول سے خط و کتابت کر رہا تھا۔ بغداد کی صالح کے بعد وہ عیسائیت کے بہت بڑے حامی شاہ فرانس کے سفیروں کا رازدار ہو گیا تھا اور سلطان کے دربار میں فرانسیسی پارٹی کا لیڈر بھی بن گیا تھا۔ چارلس پنجم نے اسے اپنے مقصد کے حصول کے لیے اپنے ساتھ ملا لینے کی کوشش کی اور خفیہ طور پر یہ لالچ دیا کہ وہ اسے ایک مختصر سا خراج لینے کے بعد تمام شمالی افریقہ کا بادشاہ تسلیم کر لے گا۔ بربروسہ نے اگرچہ ظاہر یہ کیا کہ بادشاہ کی تجویز سے اسے اتفاق ہے اور وہ اس کا ساتھ دے گا، مگر فوراً ہی اس نے سلطان کو ان باتوں سے آگاہ کر دیا۔ چارلس پنجم نے الجزائر میں جو مہم روانہ کی (۱۵۳۱ء) اس کے منحوس اور تباہ کن انجام نے خیر الدین کی عزت کو اور چار چاند لگا دیے۔ اگرچہ اس نے شہر کی مدافعت میں کوئی بھی حصہ نہیں لیا تھا۔

نیس Nice کی صلح (۱۵۳۸ء) کے بعد جنگ و جدل کی حالت، جو رک گئی تھی، پھر فرانسس اول اور چارلس پنجم کے درمیان شروع ہو گئی (۱۵۴۱ء)۔ بربروسہ کو ترکی بحری بیڑے کی قیادت مل گئی اور

عام کرنے سے خیر الدین نے انکار کر دیا تھا، اپنی زنجیریں توڑ کر حملہ آوروں میں شامل ہو گئے۔ دشمنوں کے ترغے سے بچنے کے لیے بیگریگی بونہ کی طرف بھاگ گیا، یہاں اسے اپنا وہ بحری بیڑا مل گیا جسے اس نے یہ خبر سن کر وہاں بھیج دیا تھا کہ ہسپانوی حملہ ہونے والا ہے۔ یہاں سے وہ جزائر بلیار کوچل دیا۔ اس نے ماہوں کو تباہ کر دیا اور چھ ہزار نیدی اور بہت زیادہ مال غنیمت لے کر الجزائر واپس آیا۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد سلطان سلیمان کی طلبی پر خیر الدین کو قسطنطنیہ جانا پڑا۔ سلطان نے اسے ۱۵۳۴ء میں قہودان پاشا بنا دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ چارلس پنجم اور اس کے ساتھیوں کے خلاف جو بحری جنگ ہونے والی ہے، اس کا محاذ اس کے سپرد کر دے۔ وہ لوٹ کر الجزائر نہیں آیا۔ الجزائر میں اس کی طرف سے اس کے نائب (خلیفہ) کی حکومت تھی۔ قسطنطنیہ میں بربروسہ نئے کام میں بڑا منہمک رہا۔ اس نے ترکی بحری بیڑے کو پھر سے ترتیب دیا، اس میں اضافہ بھی کیا اور بحری جنگ میں خود ذاتی طور پر سرگرمی سے حصہ لیا۔ ۱۵۳۷ء میں اس نے اپولیا Apulia کے ساحلی علاقے کو تباہ کیا، پھر اچانک حملہ کر کے برنڈزی Brindisi (اٹلی) کو مسخر کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ اس نے کورفو Corfu کے محاصرے میں حصہ لیا، مگر اس پر قبضہ نہ کر سکا، البتہ اس نے بحر ایجہ میں مقبوضات بندقہ کی طرف توجہ کی اور ڈوڈےکانیز Dodecanese کے جزیروں پر قبضہ کر لیا۔ اگلے سال اس نے سکياتوس Sciathos، سکیروس Scyros اور کربا توس Carpathos کے جزیروں کو مسخر کر کے مجمع الجزائر Archipelago (جزائر آرچیپل) کی فتح کو مکمل کیا اور پھر وہ جزیرہ اقریطاش (Crete) میں اتر آیا، جہاں اس نے دو شہر اور اسی گاؤں جلا دیے۔ بحر ایونی (Ionian Sea) میں اس نے اینڈریاز ڈوریا Andreas Doria کے مقابلے میں پریویزا Preveza اور

مختلف موقعوں پر الجزائر کے گورنر کے فرائض انجام دیے تھے [رگ بہ حسن پاشا]۔
بربروسہ نہ صرف کامیاب امیر البحر اور ممتاز سپاہی تھا، بلکہ اس میں ایک حد تک ایک مدیر کی صفات بھی موجود تھیں، وہ غیر متزلزل قوت ارادی رکھتا تھا، جس کی وجہ سے بڑی سے بڑی دشواری پر بھی قابو پا لیتا تھا جو بلاد بربر میں ایک مستقل حکومت قائم کرنے کے لیے ضروری تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ترکی حکومت چونکہ صرف ساحل تک ہی محدود تھی اس لیے اس کا قیام غیر یقینی تھا۔ اس لیے اس نے اندرونی حصوں پر اپنا قبضہ چمانے کی کوشش کی۔ اس کا حوصلہ اور امنگ یہ تھی کہ ایک بڑی سلطنت کے اندر تمام شمالی افریقہ شامل ہو جائے۔ اگرچہ حالات نے اسے اس منصوبے کے کامیاب ہونے میں مدد نہیں دی، تاہم اس نے اس کام کی تکمیل کر لی جسے اوروچ نے شروع کیا تھا۔ اس لیے اس کو ولایت الجزائر کا صحیح بانی کہا جا سکتا ہے۔

مآخذ: (۱) حاجی غلیغہ: تَحْقِيقُ الْبَحَارِیِّ سَفَارِ الْجَارِ

قسطنطنیہ ۱۱۳۱ھ اور اق ۱۵ تا ۲۷، کچھ حصے کا

ترجمہ از J. Mitchell: *The History of the maritime*

Wars of the Turks لندن ۱۸۲۱ء ص ۲۸ تا ۶۹:

(۲) Haedo: *Topographia e historia general de*

Argel Valladdid ۱۶۱۲ء فرانسیسی ترجمہ از

Berbrugger اور Monnerceau 'در *Rev. Africaine* ج

۱۵ و ۱۴: (۳) وہی مصنف: *Epitome de los reyes*

de Argel فرانسیسی ترجمہ از H. de Grammont:

Hist. des Rols d' Alger 'در *Rev. Africaine* ج ۲۴

۲۵ و ۲۶: (۴) E. de la Primaudaie: *Documents*

inédits sur l'Histoire de l'occupation espagnole

en Afrique 'در *Rev. Africaine* ج ۱۹ و ۲۰ و ۲۱:

(۵) Ph. de Sandoval: *Historia de la vida y hechos*

del emperador Carlos V. Antwerp ۱۵۱۱ء: (۶)

اس بیڑے کو فرانسیسیوں (فرانسیسی فوج) سے تعاون کرنا تھا۔ ۱۵۴۳ء میں اس نے اٹالوی ساحل پر حملے کیے۔ رجیو Reggio پر قبضہ کر لیا۔ کلابریا Calabria کے ساحلوں کو تباہ کیا اور پھر ڈک ڈی انہین Duc d'Enghien سے مارسیلز Marseilles میں جا ملنے کے بعد Nice کا محاصرہ کر لیا۔ ولے فرانچ Ville franche کا شہر، جہاں پر ترک اترے تھے، فتح کر کے اسے تباہ کر دیا گیا۔ Nice پر قبضہ ہو گیا، مگر اس کے قلعے پر قبضہ نہ ہو سکا۔ ڈوربا Doria کے بحری بیڑے کے آجانے سے اور پھر Marquis del Vasto کی فوج کی مدد ملنے پر ترکوں کو وہاں سے ہٹنا پڑا۔ ان کے بحری بیڑے کے ایک حصے نے طولون Toulon میں موسم سرما گزارا اور بقیہ بیڑا قطلونیا Catalonia کے ساحل کی طرف چلا گیا اور وہاں پالاموس Palamos اور روزاس Rosas کو غارت کیا۔ کرسپی Crespy کی صلح (۱۵۴۳ء) کے بعد جنگ ختم ہو گئی اور خیر الدین شرق Levant کو واپس آیا اور راستے میں اس نے ٹسکنی Tuscany کے جزیروں، ساحلی علاقوں اور نیپلس Naples کے ملک کو غارت کر دیا۔

اس سہم کے بعد بربروسہ قسطنطنیہ واپس جا کر خانہ نشین ہو گیا۔ اس شہر میں اس کی کثیر دولت جمع تھی اور باسفورس کے کنارے کئی محلات بھی اس کی ملکیت تھے۔

۴ جولائی ۱۵۴۶ء کو تریسٹہ برس کی عمر میں اس کا انتقال ہو گیا اور اس مسجد میں جو اس نے یوک درہ Buyük Dere [رگ بہ درہ] میں تعمیر کرائی تھی، سپرد خاک ہوا۔ اس کے وصیت نامے کے مطابق تمام ایسے غلاموں کو، جن کی عمر پندرہ برس سے کم تھی آزاد کر دیا گیا اور بقیہ آٹھ سو غلام اور تیس مسلح جنگی کشتیاں سلطان کو دے دی گئیں۔ اس کی بقیہ دولت اس کے بھتیجے اور بیٹے حسن کے درمیان تقسیم ہو گئی حسن کی والدہ مغربی عربوں میں سے تھی۔ اس نے تین

یا اس کے کسی شاہکار کے بارے میں شاذ ہی کچھ لکھتے ہیں: اسی وجہ سے خیر الدین کی سرگرمیاں اور اس کے کارنامے پردہ خفا میں ہیں۔ یہ بات بہر حال یقینی ہے کہ وہ ایک تاریخی حیثیت کا حامل ہے۔ کہا جاتا ہے، وہ فن تعمیر کے مشہور ماہر استاد مراد کا بیٹا ہے۔ اس کا شاہکار قسطنطنیہ کی مسجد بایزید ہے (۱۵۰۱ اور ۱۵۰۷ء کے درمیان تعمیر ہوئی)، جو اعلیٰ فن تعمیر کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ اس کے بارے میں دیکھیے اولیا چلبی: سیاحت نامہ، استانبول ۱۳۱۷ھ، ۱: ۱۴۲: سعد الدین: تاج التواوین، استانبول ۱۳۷۹ھ، ۲: ۲۱۱: Constantinopolis under: von Hammet ۱۸۲۲: Bosphoros، پست Pest ۱۸۲۲ء، ۱: ۳۰۲: Skarlatos: Konstantinopolis: Byzantios، ایتھنز ۱۸۹۰ء، ۱: (۴۲)۔

خیر الدین کو ترکی فن تعمیر کا اصل بانی سمجھا جاتا ہے: اس نے جو کمال حاصل کیا ہے اسے ستان [آرک باں] کے سوا نہ تو کوئی اس کا پیش رو (الیاس بن علی محمد المجنون، موسیٰ وغیرہ) حاصل کر سکا اور نہ کوئی اس کے بعد میں آنے والا (م - قاسم، کمال الدین) ہی، اس وجہ سے خیر الدین کو عثمانی ترکیہ کا سب سے بڑا ماہر فن تعمیر اور دنیا کا عظیم ترین ماہر فن سمجھا جاتا ہے۔ اس کی اس عظمت کی تصدیق اس کے شاہکار، یعنی مسجد بایزید سے ہوتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ دو نصف گنبدوں میں جو بڑا گنبد بنایا گیا ہے وہ آیا صوفیہ کے نمونے پر ہے، لیکن اس کے نقشے میں جدید اور عمدہ تصور غالب ہے۔ اس عبارت سے مقدس روایات وابستہ ہیں۔

* خیر الدین کی بتوائی ہوئی ایک اور مسجد بھی ہے، جس کا نام اس کے نام پر ہے، اور جو ہارمق قبو میں واقع وزیر اعظم ستان ہاشا کے مقبرے سے تھوڑے فاصلے پر واقع ہے۔ اس کی قبر اس مقبرے کے سامنے ہے۔ مآخذ: (۱) حافظ حسین: حقیقۃ الجوامع، استانبول

Fondation de la régence: F. Denis اور Sander Rang d'Alger, histoire des Barberousses, chronique du XV le Siècle، پیرس ۱۸۳۷ء، غزوات الخیر الدین، عربی تصنیف۔ یہ تصنیف غلطی سے خیر الدین کی طرف منسوب ہے۔ Giovan Luidgi Alcomora نے اس کتاب کا ایک قدیم ہسپانوی زبان سے اطالوی زبان میں ۱۵۷۸ء میں ترجمہ کیا۔ اسے M. Pelaez نے بعنوان ذیل شائع کیا تھا، La vita e la storia di Ariadino Barbarossa: Hammet (۷): ۱۸۸۷ء، Palmermo: Hist. de l'empire ottoman ج ۵: (۸) E. Charrière: Négociations de la France dans le Levant ج ۱: Cronica de los: Lopez Gomara (۹): ۱۸۸۸ء، Barbarofas: Memorial historico español، در 'ج'، Le Penon: Berbrugger (۱۰): ۱۸۵۳ء، d'Alger الجزائر، ۱۸۶۰ء: (۱۱) H. de Grammont: Le R'azasuat est-il l'aœuvre de kheir ed Dine: Villeneuve sur Lot: ۱۸۷۳ء: (۱۲) Hist. d'Alger sous la domination: وہی مصنف: Hist. d'Alger sous la domination: ۱۸۸۷ء: (۱۳) Jurien de la Gravière: Dorla et Barberoubusse: پیرس ۱۸۸۶ء: (۱۴) G. L'expédition de Charles Quint à Tunis: Medina: la légende et la vérité Rev. Tanisienne ج ۱۳: (۱۵) The Barbary Corsairs: S. Lane- Poole: لندن ۱۸۹۰ء، ۳۱ بعد نیز دیکھیے مآخذ مادۃ الجزائر اور تونس۔

(G. YVER)

* خیر الدین: سلطان ولی بایزید ثانی [آرک باں] کے زمانے (۱۴۸۱/۸۸ تا ۱۵۱۲/۹۱۸ء) کا ایک اہم ترکی ماہر فن تعمیر، ترک مؤرخ غلام طور سے کسی عہد حکومت کے خدا ترس بانی، مادۃ تاریخ لکھنے والے ادیبوں اور خطاطوں کا ذکر خوب کرتے ہیں، مگر کسی ماہر فن تعمیر کے سوانح حیات

صرف ایک آلہ کار بنانا چاہتا تھا۔ صرف آٹھ مہینے وزیر اعظم رہنے کے بعد اسے معزول کر دیا گیا۔ وہ قسطنطنیہ میں ۱۳۰۷ھ/۱۸۸۹ء میں تقریباً ستر سال کی عمر میں فوت ہوا اور (قبرستان) ایوب میں دفن ہوا۔ اس کی شہرت یہ تھی کہ وہ قابل اعتماد، فکریہ مستقل مزاج اور آزاد خیال تھا۔ اس نے عربی زبان میں اقوام المسالک فی معرفۃ احوال العماکک کے نام کی ایک کتاب لکھی، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کا ترکی اور فرانسیسی زبانوں میں ترجمہ بھی ہوا ہے۔

مآخذ : (۱) سامی : قاموس الاعلام، قسطنطنیہ ۱۳۰۸ھ : ۳ : ۲۰۷۳ : (۲) ثریا : سجل عثمانی، قسطنطنیہ ۱۳۰۸ھ : ۲ : ۳۱۷ : (۳) عثمان ثوری : عبدالحمید ثانی دور سلطنتی، قسطنطنیہ ۱۳۲۷ھ : ۲ : ۵۹۸ : Sax (n) : Machtverfall der Türkei، وی ۱۹۰۸ء، ص ۸۱۔ (TH. MENZEL)

خیر الدین پاشا : رگ بہ چندرہ لی و چندرہ لی
Çendereli
خجیوہ : رگ بہ خوارزم۔

الحیاط : بحی بن غالب، ابو علی، ایک عرب منجم و ہیئت دان، ماشاء اللہ کا شاگرد، جس کا ذکر اکثر ازمہ وسطی کے عیسائی مصنفوں نے البوہلی Albohali کے نام سے کیا ہے۔ اس کی پیدائش اور وفات کی صحیح تاریخیں معلوم نہیں مگر وفات کی تاریخ ۵۲۱/۵۲۳ء اور ۵۲۳/۵۲۴ء کے درمیان بتائی جا سکتی ہے۔ اس کی تصنیفات میں سے جو باقی بچی ہیں ان کے نام یہ ہیں۔ کتاب سرائع العمل (الاعمال، الزرکی) جس میں زیادہ تر ہیئت سے متعلق سوالات بنانے وغیرہ کا طریقہ لکھا ہے (برلن میں ہے)؛ کتاب الموائد [= احکام الموائد] (اوکسفرڈ اور قاہرہ میں ہے) کتاب الموائد کا ترجمہ لاطینی زبان میں نیوولی کے رہنے والے افلاطون نے کیا (۱۱۳۶ء)؛ بعد میں جان ہسپالیسیس John Hispalensis نے کیا (۱۱۵۳ء)۔

۱۲۸۱ھ : ۱۳۱۱ھ : ۲۰۰ : (۲) محمد ثریا : سجل عثمانی، ۳۱۵ : ۲ : سامی : تذکرۃ النبیاں، استانبول ۱۳۱۵ھ : Die Baukunst Konstantinopels : Sarlitt (n) : ۵ : برلن ۱۹۱۲ء : ۶۳ تا ۷۷ : (۵) Die : E. Diez : Kunst der Islamischen Völker، برلن ۱۹۱۵ء، ص ۱۳۲ : Quellen zur Osmanischen : Babinger (n) : Künstlergeschichte, Jahrbuch der Asiatischen Kunst، لاہرگ ۱۹۲۵ء، ص ۳۸۔ (TH. MENZEL)

* خیر الدین پاشا : سلطان عبدالحمید ثانی کے زمانے کا ایک چرکسی الاصل مدیر، مگر اس نے اپنی زندگی کے ابتدائی سال تونس [رگ باں] میں گزارے، جہاں وہ اپنی نمایاں قابلیت کی وجہ سے بہت سے اہم عہدوں پر فائز رہا اور بالآخر باش مدیر ہو گیا۔ اس کا بڑا مقصد ترکیہ سے تونس کے قریبی تعلقات پیدا کرنا تھا اور بالآخر سلطان عبدالعزیز کے ایک فرمان کے ذریعے اسے یہ مقصد حاصل ہو گیا۔ والی تونس صادق پاشا سے جھگڑا ہونے کی وجہ سے، اس نے تونس میں ملازمت ترک کر دی اور پیرس جا کر گوشہ نشین ہو گیا۔ ۱۲۹۹ھ/۱۸۷۷ء میں سلطان عبدالحمید ثانی نے اسے قسطنطنیہ بلایا اور اسے مجلس اصلاحات مالیہ کا صدر اور بعد میں مجلس مملکت (Council of State) کا صدر مقرر کیا۔ پھر انتہائی مشکلات کے دور میں ۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء میں اسے وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔ خیر الدین بہت آزاد خیال تھا اور اس وقت مختلف شعبوں، بالخصوص عدل و انصاف کے انتظامی معاملات میں اصلاحات کی جو تحریک شروع ہوئی تھی اسے اس نے تقویت دی اور آگے بڑھایا اور وزیر اعظم کے اقتدار کو ممکن حد تک مضبوط کرنے کے لیے کوشش کی، اگرچہ یہ کوشش سلطان عبدالحمید کی مرضی کے خلاف تھی، جو وزیر اعظم کو یلدرم کوشکی (قصر شاہی) سے جاری ہونے والے احکام و ہدایات کی تعمیل کے لیے

مأخذ : (۱) الفهرست ص ۲۷۶ : (۲) Stein-
 'schneider در 'Biblioth Mathem. ' ۱۸۹۰ء سلسلہ
 دوم ' ۶۹ تا ۷۰ : (۳) وِسْتَفَلْت : Die Übersetzungen :
 arabischer Werke in das latein. Seit dem II.
 'Tahrk. ' ۱۸۷۷ء ص ۴۱ تا ۴۲ : (۴) H. Suter در
 'Abhandl. Z. Gesch. der mathem. Wissensch.
 ۱۰ تا ۱۱ : (۵) براکمان ' ۲۲۱ : تکملہ : ۳۹۴
 (H. SUTER)

مؤخرالذکر ترجمہ نورن برگ Nürnberg ۱۵۴۶ء میں
 بعنوان 'Albohali Arabis astrologi antiquissimi ac
 clarissimi de iudiciis nativitatum liber unus antehac
 non editus. Cum privilegio D. Ioanni Shonero concessio
 طبع ہوا : [المسائل فی احکام النجوم فوائد الفکیة] -
 البوابی کی جگہ ہم مسودوں میں البوہالی الکیہاک
 'Albohali Alghifac، البوآلی العجیت 'Albohali Alchait،
 البین هیت Albenahait وغیرہ بھی پاتے ہیں۔

besturdubooks.wordpress.com

ہجے ہیں، دیکھیے J. Cantineau : Cours، ص ۳۷ تا ۳۸، ۳۹ تا ۴۰۔

مآخذ : متن میں اور پھیل مادہ حروف اِلہجاء۔

(H. FLEISCH)

(۲) عربی کے علاوہ جن دوسری زبانوں میں عربی رسم الخط استعمال ہوتا ہے ان میں دال میں جو تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں اب ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔

ہند آریائی زبانوں میں دال جیسی آوازوں کے دو سلسلے ہیں، دندانی اور کوزی (جنہیں موردهنیا Cerebral) یا قبی (Cacuminal) یا اس کے ضد کے طور پر لسانی بھی کہتے ہیں [یعنی داورڈ]]۔ مؤخر الذکر کو زبان کی نوک کے نیچے کے حصے سے نکالا جاتا ہے، اس طرح کہ زبان کو الٹا کر کے اس کی نوک کو تالو کے اگلے حصے پر مارتے ہیں جس سے زبان کی مجوف بالائی سطح زبان کے خاتمے میں ایک اور صدا پیدا کرتے والا خانہ بنتی ہے۔ مزید برآں ان دونوں آوازوں کے ساتھ مانس بھی شامل ہو سکتا ہے۔ پشتو اور اردو میں ”دندانی“ دال کی نمائندگی اصلی ”دال“ کرتا ہے؛ کوزی کی (جسے انسائیکلو پیڈیا میں ”d“ لکھتے ہیں) ”ڈ“ نمائندگی کرتا ہے اور پشتو میں اس کی شکل بدل کر بوں ہو جاتی ہے کہ دال کے نیچے ایک چھوٹا سا دائرہ کھینچ دیا جاتا ہے (د)، اردو میں اس کی شکل (ڈ) ہے، یعنی دال کے اوپر ط ڈالی جاتی ہے۔ یہ اصل میں ”د“ تھی۔ د اور ڈ کے بعد اس کی ایک آواز وہ ہے جو ہ کے ساتھ ملنے سے پیدا ہوتی ہے جیسے ڈھول (غبار) اور ڈھول (طبل)۔ اس کے لیے اسے دو چشمی ہ

* ۵ : د (دال)، عربی حروف تہجی کا آٹھواں [فارسی کا دسواں، اردو کا سترہواں اور ہندی کا اٹھارہواں، قرہنگ آصفیہ] حرف، سریانی (اور کمنانی) حساب جمل میں اس کی عددی قیمت چار ہے [دیکھیے ابجد]۔

تعریف : ”اے دانتوں اور زبان کے مخرج سے دبا کر نکالا جاتا ہے“ عربوں کی نحوی روایات کے مطابق یہ ”شدیدہ مجہورہ“ ہے اور ”مخرج“ کی رو سے ”نطقیہ“۔ الخلیل کے قول کے مطابق (الزنجشیری : مُنْقَل، بار دوم، طبع J. P. Broch، ص ۱۹۱، ص ۱) جو نطق کے نقطے کو ”نطع“ (یا نطع) یعنی تالو کے اگلے حصے پر یا اس کے کھلے ہوئے حصے پر رکھنا ہے (ابن یعیش، ص ۱۴۶، سطر ۱۹)۔ جدید بولیوں میں اس نطق کا اثر نمایاں نظر آتا ہے (لبنان، شام : H. Fleisch : Materialien : M. Braumann، ص ۶۹ : Zahl، در ۲۷ : ۷۸)۔ ایک دوسری روایت جو شیونہ کی الکتاب (مطبوعہ یرم، ۲ : ۴۵۳، ص ۱۳) پر مبنی ہے اور جسے عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے، یہ ہے کہ اس کا مخرج سامنے کے دانتوں کا وسطی حصہ ہے۔ دال کی آواز کے صوتیاتی تقابلات کے لیے دیکھیے : J. Cantineau : ”Esquisse“ در BSL، (عدد ۱۲۶)، ص ۹۹، بارہواں : متضادات کے لیے دیکھیے کتاب، ۱۳۴۔

مختلف ہجے : شمالی مراکش کی پہاڑی بولیوں میں ”د“ حرف علت کے بعد ”ذ“ بن جاتا ہے؛ قدیم عربی اور جدید بولیوں میں ”د“ کے متعدد مشروط

قرآن مجید (۲۷ [النمل] : ۸۲) میں فرمایا : وَإِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ أَخْرَجْنَا لَهُمْ دَابَّةً مِّنَ الْأَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ أَنَّ النَّاسَ كَانُوا بِآيَاتِنَا لَا يُوقِنُونَ (جب اللہ کا وعدہ ان لوگوں پر پورا ہونے کو ہوگا تو ہم زمین سے ان کے لیے ایک جانور نکل کھڑا کریں گے جو ان سے باتیں کرے گا، کیونکہ لوگ ہماری نشانیوں کا یقین نہیں رکھتے تھے)۔ شاہ عبدالقادر موضح القرآن میں لکھتے ہیں : "قیامت سے پہلے صفا پہاڑ منگے کا بھٹے گا، اس میں سے ایک جانور نکلے گا جو لوگوں سے باتیں کرے گا کہ اب قیامت نزدیک ہے اور سچے ایمان والوں کو اور چھپے منکروں کو نشان دے کر جدا کر دے گا۔" ہو سکتا ہے کہ دابة الارض کے ذریعے یہ دکھلانا مقصود ہو کہ جس چیز کو کفار نے پیغمبروں کے ذریعے نہ مانا، اب ایک جانور کی زبانی ماننے کو تیار ہوں، لیکن اس وقت کی توبہ اور ایمان سودمند نہیں۔ اس سے مراد کافروں کو تنبیہ و توبیخ بھی ہے (المراغی)۔ دابة الارض کا زبان حال یا زبان مقال سے کلام کرنا ان خوارق میں سے ہے جو قرب قیامت کا پتا دیں گے (فی ظلال القرآن)۔

عصر حاضر کے مشہور شامی مفسر جمال الدین القاسمی نے اس سلسلے میں چند تاویلات پیش کی ہیں : (۱) اس سے مراد دنیا میں کافروں کے مقابلے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت و کسراتی ہے۔ وہ کافر اسلام کی بات سننے اور دیکھنے کے لیے بہرے اور اندھے بن گئے ہیں، مسلمانوں کے لشکر جرار کو دیکھ کر اسلام کی حقانیت اور غلبے کا اعتراف کریں گے، ان کا کفر و انکار ان کے لیے عذاب کا باعث بن جائے گا، فلاح و کسراتی اور اصلاح ایمان کی دولت سے حاصل ہوتی ہے اور کفر سے فساد و خفت اور ناکامی و ناسرادی کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوتا : (۲) قرب قیامت کے زمانے میں اللہ تعالیٰ خاص اوع کا ایک جانور پیدا کرے گا جو کافر انسان کو

کے ساتھ لکھنا چاہے دھول اور ڈھول نہ کہ دھول اور ڈھول۔ سندھی میں کورزی "دال" کی ترجمانی د کرتی ہے اور "دھ" [جیسے دھول] اور "ڈھ" [جیسے ڈھول] "د" کی صورت میں لکھی جاتی ہے۔ سندھی زبان میں مغربی ہندوستان کی دوسری زبانوں کی طرح حروف ساکن کا ایک سلسلہ بھی ہے (پ، ج، ڈ اور گ) : ڈ کی ترجمانی د سے ہوتی ہے۔

مآخذ : (۱) 'Linguistic Survey of India' جلد ۱۰ (پشتو) ۱/۸ (سندھی) ۱/۹ (اردو) : (۲) 'A. Standard Pashto : D.N. Mackenzie' در 'BSOAS' ۲/۱۲ (۱۹۵۶ء) : ۲۳۱ تا ۲۳۵ (۳) R.L. Turner : 'Cerebralization in Sindhi' در 'JRAS' ۱۹۳۳ء ص ۵۵۵ تا ۵۸۸ : (۴) وہی مصنف : 'The Sindhi "recursives..."' در 'BSOAS' ۲/۳ (۱۹۳۸ء) : ۱۰۱ تا ۱۱۵ : (۵) محی الدین قادری : 'Hindustani Phonetics' پیرس تاریخ ندارد (۱۹۳۱ء) : نیز مقالے 'سندھی اردو' : (۶) 'Sihawathi's La'-utlehs : A. Schaade' فہرست : (۷) دائرۃ المعارف الاسلامیہ، مصر، جولائی ۱۹۶۲ء ج ۹، بتیل مادہ : (۸) البستانی : دائرۃ المعارف، بیروت ۱۹۸۸ء : ۷ : ۵۸۲۔

J. BURTON PAGE [و اردو]

دابة : (ع، جمع دواب) کا اشتقاق دباب سے ہے جس کے معنی ہیں چیونٹی اور دیگر حیوانات کا زمین پر رینگ کر چلنا، یا آہستہ آہستہ چلنا (لسان و لسان) : دباب (دباب) : دابة، زمین پر چلنے والے ہر جاندار کو کہتے ہیں، قرآن کریم میں (۲۴ [النور] : ۴۵) ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر دابة (زمین پر چلنے والے جاندار) کو پانی سے پیدا کیا ہے، ان میں سے کچھ تو پٹ کے بل رینگتے ہیں، کچھ دو پاؤں پر چلتے ہیں اور کچھ چار پر۔ نیز فرمایا زمین پر جو بھی جاندار (دابة) ہیں ان سب کا رزق اللہ کے ذمے ہے (۱۱ [ہود] : ۶)، (قَبْ لِسَانَ مَادَّةِ دَبَابٍ مَقْرَدَاتٍ، ۲ : ۱ : التَّهَابِ، ۲ : ۱)۔

زجر و توبیخ کرے گا۔

بہر حال دابة الارض کا خروج علامات قرب قیامت میں سے ہے، چونکہ یہ کوائف و احوال عالم غیب کے ہیں اس لیے اس بارے میں قطعی اور حتمی بات صرف خدا کو معلوم ہے۔

یہاں دابہ سے ایک خاص قسم کا جانور مراد ہے جو اس وقت ظاہر ہوگا جب انسان امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو بالکل چھوڑ دیں گے اور دنیا کی حالت اس قدر پگڑ چکی ہوگی کہ اس کے بعد اصلاح کی کوئی صورت نظر نہ آئے گی اور یہ قرب قیامت کا وقت ہوگا، اسی لیے حدیث میں دابہ کو قیامت کی دس علامات میں سے ایک علامت کہا گیا ہے (مسلم، ص ۲۲۶: الطبری، ۲: ۱۰۰: یبعد؛ ابن کثیر، ۲: ۱۰۰: یبعد؛ تفہیم القرآن، ۳: ۶۸)، الزمخشری اسے الجسامة (مغور سے دیکھنے والا، نوہ لگانے والا) کا نام دیتا ہے (الکشاف، ۲: ۳۸۳: نیز قب لسان و تاج بنہل مادة دہب: النووی: شرح مسلم، ۵: ۳۰۰)۔ اس جانور کے خروج کی جگہ کے بارے میں مختلف روایات ہیں کہ وہ تہامہ سے نکلے گا یا طائف میں یا مکے میں صفا و مروہ کے درمیان سے خروج کرے گا (تاج مادة دہب: روح المعانی، ۲: ۲۳): ابو داؤد (۲: ۱۳۳: یبعد) کی روایت کے مطابق یہ جانور تین بار ظاہر ہوگا، دو بار تو دور دراز کے علاقوں میں ظاہر ہوگا: پہلی بار کے خروج سے اس کا ذکر شہر مکہ تک نہ پہنچ پائے گا، مگر دوسری بار اس کا قصہ لوگوں میں شہرت پا جائے گا اور اس کا ذکر مکے تک بھی پہنچ جائے گا، پھر جب کہ لوگ سب سے زیادہ حرمت والی مسجد (یعنی مسجد حرام) میں ہوں گے اس وقت اچانک دابة الارض لوگوں کو دکھائی دے گا (نیز قب ابن کثیر: تفسیر، ۲: ۱۰۰)۔

اللہ تعالیٰ اس جانور (دابة) کو اپنی حجت کے
 اور ہر لوگوں کے سامنے ظاہر کرے گا۔ اس کے

خروج کے بعد توبہ کا موقع کسی کو نہیں دیا جائے گا۔ مومن اور کافر کے درمیان پیشانیوں سے واضح طور پر امتیاز ہو سکے گا حتیٰ کہ مومن کافر سے کہے گا کہ اے کافر میرا حق ادا کر دے! اسی طرح کافر بھی مومن کو واضح طور پر پہچان کر اس سے یہی بات کہے گا (لسان و تاج؛ نیز روح المعانی، ۲۰: ۲۳، الکشاف، ۲: ۳۸۳، القرطبی، ۱۳: ۲۳۶)۔

تفسیر ابن کثیر، ۲۰: ۹ (بعد)۔ اس جانور کے حلقے کے بارے میں بھی مفسروں نے بہت کچھ بیان کیا ہے اور اس کی مختلف علامات کا تعین کیا ہے (تفصیل کے لیے دیکھیے الکشاف، ۲: ۳۸۳، روح المعانی، ۲۰: ۲۳، القرطبی، ۱۳: ۲۳۰)۔ امام ابن کثیر نے اس جانور کے خروج کو اللہ کی آخری حجت اور قیامت کی اولین علامات میں سے ایک علامت قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ جب دابة الارض ظاہر ہوگا تو وہ لوگوں سے کلام کرے گا جسے سب سنیں گے، اور اوگ ان چیزوں کی کوشش کریں گے جو کبھی حاصل نہ ہو سکیں گی یا جن میں بنی آدم کے لیے کوئی فائدہ نہ ہوگا (تفسیر ابن کثیر، ۲۰: ۹ بعد؛ نیز دیکھیے روح المعانی، ۲۰: ۲۱ بعد)۔ اس قسم کے کسی جانور کا ظہور یا اس کا انسانی زبان میں کلام کرنا اللہ کی قدرت کا ایک کرشمہ ہے، وہ جو چاہے تخلیق کرتا ہے اور جس چیز کو چاہے گویائی کی قوت عطا فرما سکتا ہے، حتیٰ کہ جانور تو جانور، خدا تو انسان کی آنکھ، کان اور جسم کی کھال تک کو بولنے کی قوت دے گا (تفہیم القرآن، ۳: ۶۰۵)۔

مأخوذ : (١) ابن منظور : لسان العرب بنيل مادة :

دبیب؛ (۲) الزہیدی : قاجّ المروم، ینزل مادّة دبیب؛ (۳)

ابن الاثير: النهاية^١ قاهره ١٣٠٦ هـ : (م) مسلم ، قاهره

۱۹۵۵ء: (۵) ابو داؤد^۱ لکھنؤ ۱۸۳۱ء: (۶) القرطبی:

الجامع لأحكام القرآن، قاهره ۱۳۹۰ھ؛ (۷) ابن كثير: تفسير،

مطبوعہ کراچی: (۸) الطبری: تفسیر قاهرہ، بلاتاریخ؛

دابق صوبے سے زیادہ اس فیصلہ کن جنگ کی وجہ سے مشہور ہے جو ۱۵ [بہ تصحیح ۲۵] رجب ۵۹۲۲ / ۲۸ اگست ۱۵۱۶ء کو سلطان کُنصوہ (Kansuh) [بہ تصحیح قانصوہ] القوری اور عثمانی سلطان سلیم اول کے درمیان ہوئی۔ گولہ باری میں عثمانی دشمن کے مقابلے میں برتر ثابت ہوئے، چنانچہ جنگ میں مملوکوں کے سواروں کے رسالے کا بڑا حصہ کام آیا اور خود کُنصوہ [قانصوہ] بھی قتل کر دیا گیا۔ عثمانیوں کی یہ فتح ان کے شام اور مصر پر قبضے کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

مآخذ: (۱) البلاذری: فتوح، ص ۱۷۱، ۱۸۹؛ (۲) الطبری: بعد اشارہ: (۳) المسعودی: مروج، ۵؛ ۳۹۷، ۴۰۱؛ (۴) ہروی: کتاب الزیارات، طبع Sourdcl-Thomine، دمشق ۱۹۵۳ء، ص ۶ (ترجمہ) ص ۱۱؛ (۵) ابن العجم: زبدۃ، طبع S. Dahan، دمشق ۱۹۵۱ء؛ ۴۱، ۵۶، ۵۷، ۶۳، ۶۷؛ (۶) ابن شداد: Lu Description d' Alep، طبع D. Sourdcl، دمشق ۱۹۵۳ء، ص ۲۹، ۱۳۸ تا ۱۳۹؛ (۷) یاقوت: ۵۱۳؛ (۸) Palestine under the Moslems: G. Le. Strange، لندن ۱۸۹۰ء، ص ۶۱، ۲۶، ۵۰۳؛ (۹) R. Dussaud: Topographie historique de la Syrie، پیرس ۱۹۳۷ء، ص ۶۸، ۳۷۸؛ (۱۰) M. Canard: Histoire de H'amdānides، الجزائر ۱۹۵۱ء، ص ۲۲۵؛ (۱۱) Das arabische Reich: Wellhausen، برلن ۱۹۰۷ء؛ (۱۲) N. Gorga: Geschichte des osmanis، ۱۶۵؛ (۱۳) Gotha، ۱۹۰۹ء؛ ۳۳۶؛ D. Ayalon: Gunpowder and firearms in the Mamluk Kingdom، لندن ۱۹۵۶ء، بعد اشارہ۔

(D. Sourdcl)

دبئیہ: (دبوی) گیلان [آرک ہاں] کے خاندان دبویہ کا بانی۔ یہ قبیلہ دبویہ کے باپ گیل کوہارہ (Gilgawhara) کے واسطے سے ساسانی النسل ہونے کا

(۹) الزمخشری: الکشاف قاهرہ ۱۹۴۶ء؛ (۱۰) الألوسی: روح المعانی، قاهرہ بلا تاریخ؛ (۱۱) مودودی: تفہیم القرآن، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۲ء؛ (۱۲) مفتاح کنوز السنۃ، بذیل مادہ؛ (۱۳) مسلم: الجامع الصحیح، قاهرہ ۱۹۵۶ء؛ (۱۴) الکرمانی: شرح البخاری، قاهرہ ۱۹۳۷ء؛ (۱۵) النووی: شرح صحیح مسلم، ۴: ۵، بعد؛ قاهرہ بلا تاریخ؛ (۱۶) الراغی: تفسیر الراغی، بذیل آیت ۸۲، سورة النحل؛ (۱۷) جمال الدین القاسمی: تفسیر القاسمی، (۱۸) سید قطب: فی ظلال القرآن؛ (۱۹) اسیر علی: تفسیر مواہب الرحمن۔ (ظہور احمد اضہر [و ادارہ])

* دابق: شمالی شام کے علاقہ غزاز میں ایک مقام جو منہج سے انطاکیہ جانے والی سڑک پر (الطبری، ۳: ۱۱۰۳) اور حلب سے اوپر کی جانب دریائے قویق پر واقع ہے۔ اشوریوں کے زمانے میں اس کا نام دیبکو Dabequ تھا، جو یونانی Dabekon ہو گیا۔ یہ مقام مَرَج دابق کے اس وسیع میدان کے کنارے پر واقع ہے جہاں، اسویوں اور عباسیوں کے عہد میں، لڑائی برپا ہو جانے سے پہلے وہ لشکر پڑاؤ ڈالتا تھا جو بوزنطی علاقے پر حملہ کرنے کے لیے بھیجا جاتا تھا۔ اموی خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کچھ مدت تک دابق میں [اس غرض سے مقیم] رہا [کہ یا تو قسطنطنیہ کو فتح کر لے یا وہاں کے باشندے جزیرہ ادا کرنے پر رناتند ہو جائیں] صفر ۵۹۹ / ستمبر ۷۱۷ء میں وہیں فوت اور دفن ہوا اور حضرت عمر بن عبدالعزیز کو خلیفہ مقرر کیا گیا۔ المسعودی کے بیان کے مطابق عباسیوں نے اس کی قبر کی تحظیر و تذلیل کی، لیکن الشاہبستی کے بیان سے اس کی تردید ہوتی ہے (کتاب الدیارات، بغداد ۱۹۵۱ء، ص ۱۴۹)۔

ایوبی سہد میں سیاحوں نے دابق کے قریب جبل برصایا پر ایک یادگار عمارت دیکھی، جو مقام داؤد کہلاتی تھی: یہ مقام آج کل نبی داؤد کے نام سے موسوم ہے۔

'(Mohanmedwische Quellen . . . Bernhard Dorn
(ج ۱) سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۵۰ء' ص ۳۱۹ بعد: (۳)
'Mem. Ac. Imp. St. Pétersbourg در
'۲۳' ۱۸۵۷ء : ۱۰۲ : (۴) G. Melgunof
'Kaspischen Meeres . . . Das südliche Ufer des
ترجمہ از J. Th. Zenker (۵) 'J. Th. Zenker
شجرہ ہائے خاندان: F. Justi (۵) 'Iranisches Namen-
buch' (۱۸۹۵ء) ص ۳۳۳/۳۳۵ : (۶) E. de Zambaur
'Manuel de généalogie' بار دوم 'Pyrmont' ۱۸۵۵ء
ص ۲۸۶ تا ۱۹۰ - سکتے: (۷) A. D. Mordtmann در
'ZDMG' ۱۹ : (۱۸۶۵ء) : ۳۸۵ : ۳۳ (۱۸۷۹ء) :
۱۱۰ .

(11. SPULER)

- داتا گنج بخش: نام شیخ علی ہجویری* ۵

رحمۃ اللہ علیہ، کنیت ابوالحسن، والد کا نام عثمان ابن علی،
یا "بوعنی" (بروئے آذین اکبری، ۳: ۲۷۸؛ سفینۃ الاولیاء،
ص ۱۶۵)، وطنی نسبت انھوں نے خود "الجلابی
الغزنوی ثم الہجویری" تحریر کی ہے۔ جلال شہر
غزنی کا محلہ اور ہجویر بظاہر بیرونی محلہ یا مضافاتی
بستی تھی تاریخ ولادت کسی ماخذ میں نہیں ملتی۔
قرآن نواح ۱۰۰/۱۰۰ء کے حق میں ہیں۔ یہ
سلطان محمود غزنوی کا عہد (۳۸۸/۳۹۹ء تا ۴۲۱/۴۳۱ء)
۳۰۰ء) اور دارالسلطنت غزنہ کے عروج کا زمانہ
تھا۔

داتا صاحبؒ کا خاندان علم و تقویٰ سے متصف
تھا۔ ان کے ماموں کا لقب "تاج الاولیاء" تھا۔ جس
محلے میں ان کا مزار تھا وہ بوی اسی نام سے معروف
ہوا۔ داتا صاحبؒ کے والدین کی آخری آرام گاہیں اسی
قبرستان میں ہیں، جن کی زیارت گیارہویں صدی ہجری
میں شہزادہ دارشکوہ (م ۱۰۶۹/۱۰۶۵ء) نے کی تھی
(سفینۃ، ص ۱۹۵)۔ ایک تازہ شہادت سے معلوم ہوا
ہے کہ ان قبور کی اب بھی نشان دہی ہوتی ہے۔

مدعی تھا۔ یہ لوگ قصبہ قومان [رگ بان] میں رہتے
تھے اور عرصہ دراز تک زردشتی مذہب کے پیرو
رہے۔ انھوں نے عربوں سے بار بار مقابلہ کیا،
بالآخر اس کے آخری فرمانروا خورشید دوم ۱۴۱ یا
۵۱۴۲/۵۵۸-۵۶۰ء کو، عباسیوں کے طاقتور لشکر
کے مقابلے کی تاب نہ لا کر، فرار ہونا پڑا اور دینم
میں آکر اس نے خودکشی کر لی (الطبری، ۳: ۱۳۹
بعد) اس کی ایک بیٹی، جس کا نام معلوم نہیں، کی
نسبی خلیفہ المنصور سے ہوئی۔

اس خاندان کے حکمرانوں کے نام حسب ذیل
ہیں: دابیوہ ۴۳۰/۶۶۰-۶۶۱ء تا ۵۵۹/۵۹۶ء
اس کا بھائی خورشید اول ۵۵۹/۵۹۶ء تا ۵۹۰/۶۴۰ء
اس کا بیٹا فرخان ۵۹۰/۶۴۰ء تا ۵۹۱/۶۴۱ء
جس نے اسپہبد [رگ بان] ("قائد عسکر") کا لقب
اختیار کیا اور ۶۴۱ء میں عربوں کو شکست دی
اس کا بیٹا داذبوز مسہر (داد مسہر) ۵۹۱/۶۴۱ء تا ۶۲۲/۶۷۳ء
تا ۶۱۱/۶۶۲ء: اس کا بھائی مارویہ (ماروی)
۵۹۱/۶۴۱ء تا ۶۲۲/۶۷۳ء (یہ تصحیح ۶۲۳ء) میں چند
مہینوں کے لیے: داذبوز مسہر کا لڑکا خورشید دوم
۶۱۱/۶۶۲ء تا ۶۳۳/۶۸۴ء یا ۵۵۸/۶۰۹ء۔

دابیوہ کے بھائی یادوسپان (لقب) سے ایک اور
شاہی خاندان کا سلسلہ چلا، جس نے رویان [رگ بان]
اور اس کے آس پاس کے بعض علاقوں پر حکومت کی۔
۶۵۳ء سے یہ خاندان دو شاخوں میں بٹ گیا: ایک
کی حکومت ۱۵۶۷ء تک اور دوسری کی حکومت
۱۵۷۶ء تک برقرار رہی۔

مآخذ: (۱) ابن اسفندیار: تاریخ طبرستان، تہران
۱۹۵۲ء (بحوالہ E. G. Browne: An abridged trans-
lation of the history of Tabaristan . . . by . . . Ibn-i-
Isfandiyyar . . . لائن اور لندن ۱۹۰۵ء اشاریہ
[GMS II]) میں ہو سکی: (۲) ظہیر الدین (- ظاہر الدین
المرعشی): Geschichte von Tabaristan . . . طبع

نہیں لاتے تھے، ایک ”جوان مرد“ (ن: ”نوجوان مرد“) نے وہ سب اشعار اپنے نام کر لیے اور مرتے وقت دنیا سے بے ایمان گیا۔ ایک اور قول دوسرے مجموعہ ملفوظات درر نقاشی، کے قلمی نسخے سے نقل کیا گیا ہے کہ ”میں نے کشف المحجوب کا تمام و کمال مطالعہ کیا ہے۔ یہ ایسی کتاب ہے کہ اگر کسی کو رشد نہ ملے تو اسے پڑھنے سے مل جائے گا“ (عبدالمجید دریا بادی: تصوف اسلام، ص ۳۷)۔ ہمارے علم میں صوفیہ کا پہلا اور معتبر تذکرہ، جس میں داتا صاحب کا باقاعدہ ذکر آیا ہے، ملا نور الدین جامی کا نفعات الانس ہے جو ۸۸۳ھ/۱۴۷۸ء کی تالیف ہے۔ اس میں نام، کنیت اور وطن تو لکھا ہے مگر ولادت اور وفات یا مدفن کا ذکر نہیں آیا۔ [ابوالفضل محمد بن الحسن] ختلی سے مریدی اور متعدد مشائخ سے استفادہ کرنے کا حال بیان کیا ہے، نیز یہ کہ وہ ”کشف المحجوب“ کے مصنف ہیں، جو تصوف کی مشہور اور معتبر کتابوں میں سے ہے۔“ پھر اسی کتاب سے داتا صاحب کے پانچویں صدی ہجری کے دو واقعات درج کیے گئے ہیں۔ بظاہر جامی کو بھی ان کے متعلق، بجز کشف المحجوب اور کوئی ذریعہ معلومات نہیں مل سکا؛ دوسرا حوالہ آئین اکبری، ج ۲ میں آتا ہے جس میں پاکستان و ہند کے اڑتالیس منتخب اولیا کا ذکر کیا ہے، داتا صاحب کا نام و نسب بتا کر، ان کے علم و عرفان اور تصنیف کشف المحجوب کی سائنس کی ہے، نیز ان کی خواب گاہ لاہور میں بیان کی ہے، آئین اکبری کے چار سال بعد لعل بیگ بخشی شہزادہ مراد ابن اکبر بادشاہ نے ثمرات القدس تالیف کی، جس کی ایک منقولہ روایت اوپر بیان ہوئی۔ دیگر حالات نفعات یا کشف ہی سے لیے ہیں، مگر یہ بات کہ داتا صاحب قیام لاہور کے زمانے میں اپنے علم و فضل کے باوجود، بچوں کو پڑھایا کرتے تھے، نیز وفات کے متعلق دو افسانوی روایتیں مؤلف کا اضافہ ہیں؛ اسی صدی کے وسط

(محمد شفیع لاہوری، مقالات، ص ۱۸۳، لاہور ۱۹۶۰ء)۔ داتا صاحب کے حالات زندگی پانچویں چھٹی اور ساتویں صدی ہجری کی کسی معلومہ تاریخ یا تذکرے میں نہیں ملتے۔ سب سے پہلے ان کا ذکر ہمیں شیخ نظام الدین اولیا کے ملفوظات میں ملتا ہے، جو امیر حسن مجزی دہلوی [رک بان] نے کتاب نوآئد الفوائد کی صورت میں قلمبند کیے تھے۔ پہلی بار ۲۹ ذوالقعدہ ۸۷۰ھ/۱۴۶۰ء کی ایک مجلس میں مزارات لاہور کا تذکرہ ہوا۔ اسی میں شیخ نظام الدین سے روایت کی گئی ہے کہ ”ہجویری“ شیخ حسین زنجانی کے پیر بھائی تھے اور اپنے پیر [ابوالفضل محمد بن الحسن الختلی] کے حکم سے جس دن لاہور آنے والے تھے اسی دن زنجانی موصوف نے وفات پائی جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں، اس وقت ان کا سر میرے پہلو میں تھا ژوکوفسکی: کشف المحجوب، ص ۲۰۹ اسی حوالے سے یہ روایت ثمرات القدس (تالیف ۱۰۰۰ھ/۱۵۹۸ء) میں دہرائی گئی ہے، لیکن کچھ آگے حسین زنجانی کو یعقوب زنجانی متقب بہ صدر دیوان (م ۸۶۰ھ/۱۴۵۷ء) کا بھائی بتایا ہے۔ حسین زنجانی کا مقبرہ لاہور، عقب مصری شاہ میں ہے۔ ان کا سال وفات ۸۶۰ھ یا کچھ بعد بتایا گیا ہے (آئین اکبری، ۳: ۲۷۸)۔ خود داتا صاحب نے اپنے کثیر ممتاز معاصرین میں ان کا کہیں نام نہیں لیا۔ نفعات الانس اور سقینۃ الاولیاء میں بھی اس بات کا ذکر نہیں آیا۔ یہ روایت الحاق معلوم ہوئی ہے، اگرچہ زمانہ حال کے تذکروں (مثلاً خزینۃ الاولیاء، ۲: ۲۵۰)، عام معقیدین اور مجاوروں کی زبان پر یہ روایت جاری ہے۔

نوآئد الفوائد کی ایک اور مجلس (۱۵) محرم ۸۷۰ھ/۱۴۶۰ء میں نظام الدین اولیا سے روایت ہے کہ ”شیخ علی ہجویری“ نے کتاب کشف المحجوب لکھی۔ اس کے شروع میں اور آگے دو تین جگہ اپنا نام لائے۔ قبل ازیں عربی اشعار کہتے اور نام

وہ ہیں جن سے مصنفؒ خود مستفید ہوئے! کتاب کے اس حصے میں ایک طولانی باب (جہازدہم) اپنے عہد کے بارہ فرق صوفیہ پر قلم بند کیا ہے، جن میں دس مقبول اور دو ”مردود“ یعنی اسلامی عقائد سے ہٹے ہوئے تھے! آگے چل کر ایک باب (میزدہم) ممتاز معاصر صوفیہ پر ہے، جس میں علاقہ وار ہر بزرگ کا نام اور مختصر حال دیا ہے۔ ان کی تعداد چالیس ہے۔ ضمناً لکھتے ہیں: ”سب کا حال تحریر کرنا ممکن نہیں، صرف خراسان میں تین سو بزرگوں سے ملا۔ ان میں سے ہر ایک صاحب مشرب تھا اور نہ ساری دنیا کے لیے کافی ہوتا“ (ص ۱۳۶)۔ آخری حصہ جو تقریباً نلت کتاب پر محیط ہے، ”کشف حجابات“ کے زیر عنوان، گویا مصنفؒ کی اصل تعلیم پر مشتمل ہے۔ اس میں معرفت الہی، توحید، ایمان، ارکان اسلام (صوم و صلوة، حج و زکوٰۃ) فلسفۂ ازدواج، مسئلہ سماع اور ان کے فروغ پر بڑی عالمانہ بحثیں کی ہیں۔ ایک باب (سی و سوم) میں صوفیہ کی مہذلاحات، ان کی اقسام و رموز کی شرح بیان کی گئی ہے! کتاب میں منقول عربی اشعار اور مشائخ کے اقوال کی تعداد تین سو سے زائد ہے۔ ایک سو چونتیس احادیث نبوی اور قریب قریب تین چوتھائی قرآن حکیم کی سورتوں سے دو سو چونتیس آیات کریمہ استناداً لائی گئی ہیں (دیکھئے فہرست، مطبوعہ لینن گراڈ) جو مصنفؒ کے حیرت انگیز، وسیع اور مستحضر علم کی شاہد عادل ہیں۔

کتاب میں اسلامی تصوف کا بہت بلند معیار پیش کیا گیا ہے۔ صوفی کا اشتقاق صفا سے اور اس کی اصل غیر اللہ سے دل کا انقطاع بتاتے اور اس نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ در حقیقت صوفی کامل ولی ہی کا نام ہے (ص ۲۶)۔ اس میں اولیائے عظام کی کرامات اور خوارق کا بھی ذکر ہے نیز ان کے بیسیوں حکیمانہ اقوال اور نصائح کے ساتھ اوصاف حسنہ، صبر و قناعت، ایثار و سخاوت، ہمت و استغناء، صداقت و اخلاص کی

کا زیادہ مشہور تذکرہ سفینۃ الاولیاء ہے، جسے شہزادہ داراشکوہ نے جوان عمری یعنی ۱۰۳۹ھ/۱۶۲۹ء میں مرتب کیا تھا۔ وہ داتا صاحبؒ کے علم و قوی، طولانی سیر و سیاحت اور ان کی تصانیف منجمنہ کشف المحجوب کی تعریف کرتا ہے! کشف المحجوب کے متعلق لکھتا ہے کہ یہ کامل ہدایت کی کتاب ہے، نصوف کی کتابوں میں ایسی گرانیہ کتاب فارسی میں کبھی نہیں لکھی گئی۔ سفینۃ (ص ۱۶۵) کی یہ زائد روایت کہ داتا صاحبؒ نے غزنین میں مسجد بنوائی اور اس کی سمت قبلہ پر اعتراض من کر لوگوں کو ازہر کرامت کعبۃ اللہ کا مشاہدہ کرا دیا، مقامی روایتوں میں لاہور سے منسوب کی جاتی ہے (خزینۃ الصغیر، ۲: ۲۳۶)۔ ان کے مزار کے متعلق داراشکوہ نے لکھا ہے کہ بد لاہور شہر میں قلعے سے مغرب کی طرف ہے، سال وفات ۱۰۵۶ھ اور بروایت دیگر ۱۰۶۶ھ بیان کیا ہے۔ یہ بھی تحریر کیا ہے کہ ”ان کے خوارق و کرامات کی کوئی انتہا نہیں۔ لاہور میں اقامت گزیر ہوئے تو شہر کے سبھی باشندے رفتہ رفتہ ان کے معتقد ہوتے گئے جو شب جمعہ کو اس نورانی مقبرے کی زیارت کو جاتے اور اپنی مرادیں پاتے، فقیر بھی ان کے روضۂ منورہ اور (غزنین میں) ان کے ماسوں اور والدین کے مقابر کی زیارت سے مشرف ہوا ہے۔“

متاخر تذکروں کے خاص مأخذ نفحات الانس اور سفینۃ الاولیاء ہی ہیں۔ ان دواوں میں سوانحی حالات بہت مختصر لکھے گئے۔ لامحالہ ہمیں اصل سرچشمے یعنی کشف المحجوب کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ یہ بے مثل کتاب غالباً مختلف اوقات میں لکھی گئی، جو متعدد موضوعات پر مشتمل ہے! بعض کا ذکر درج ذیل ہے: تمہید، تسمیہ، علم اور تصوف کی حقیقت! خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم، اولیائے سابقین کا تذکرہ! پھر دس ائمہ صوفیہ متاخرین، جن میں بعض کتاب کی تصنیف کے وقت زندہ تھے اور چھ

جو تقریباً موجودہ مغربی پاکستان کے برابر تھے، کرمان، سیستان، شمال میں ترکستان و ساوراء النہر، مغرب میں ایران کے اکثر اقطاع (خوزستان، طبرستان، آذربایجان، قہستان، فارس)، عراق، شام و فلسطین تک سفر کرتے رہے۔ حرمین شریفین کا ذکر بھی بالواسطہ آیا ہے۔ اس زمانے کی عام مشکلات سفر کے علاوہ، (معلوم ہوتا ہے کہ داتا صاحب اکثر بار بار سفر کرتے اور حسب ضرورت کسی مسجد یا خانقاہ میں ٹھہر جاتے تھے) ایک جگہ (ص ۲۶۹) لکھتے ہیں مجھے اپنی سیاحتوں میں سب سے زیادہ اذیت و رنج اس بات سے ہوتا تھا کہ جاہل خادم (خانقاہ سے) مجھے کبھی کسی زمیندار کے گھر لے جاتے تھے، کبھی اور کسی کے پاس ٹھہرا دیتے تھے۔ دل میں نیت کر لی تھی کہ کبھی خود مقیم ہوا تو مسافروں سے ایسا سلوک نہ کروں گا۔ ”یہ ادبوں کی صحبت سے فقط بھی فائدہ ہے کہ ان کی جو بات ناگوار ہو تو تم ویسا نہ کرو۔“ ایک خانقاہ میں پہنچے تو کپڑے پھٹے ہوئے، ہاتھ میں صرف لالٹھی اور چھالک تھی۔ وہاں کے مقیم صوفیوں نے باسی، بھونڈی لگی روٹی کھانے کو دی اور خربوزے کے چھلکے ان پر پھینکے (ص ۵۰)۔ ان مثالوں اور متعدد اشارات سے ان کے لباس اور قرواقہ میں زندگی گزارنے کا پتا چلتا ہے۔ ان موضوعات پر کشف میں کئی باب لکھے ہیں، بکہ قیروں کی گدڑی اور پیوند لگے کپڑوں پر ایک مستقل کتاب اسرار الخرق والمؤنات تصنیف کی تھی؛ ایک زمانہ ایسا بھی آیا جب وہ عراق میں خوش حال اور مسرف دنیا داروں کی طرح رہا کرتے تھے۔ لوگ دنیاوی چیزیں (”حشویہ دہر“) مانگنے آئے اور یہ ان کی فراہمی کی کوشش کرتے، اسی سلسلے میں ترض کے زیر بار بھی ہوئے، بالآخر کسی بزرگ کی تنبیہ سے آنکھ کھلی اور دل کو ”فراغت“ میسر آئی (ص ۲۷۱)۔ بظاہر انہوں نے ساری عمر تجرد میں بسر کی۔ کشف المحجوب کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ ان

وہ سچی تابناک مثالیں پیش کی ہیں جو ان بزرگوں کے فضل و شرف کی اصلی برہان اور اسلامی تہذیب و اخلاق کی عظمت کی دلیل ہیں۔ مزید برآں مصنف تحقیق پسند تھے اور تحقیق کا بھی بہت بلند مجتہدانہ معیار ان کے پیش نظر تھا۔ پہلے ہی باب میں، جو علم کے وجوب فضیلت پر ہے، زور دیتے ہیں کہ علم کے لیے عمل اور درایت یعنی فہم و تحقیق ضروری ہے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کے اس قول سے استشہاد کرتے ہیں کہ ”ہمة العلماء الدرایة و ہمة السفہاء الروایة۔“ تمثیلات میں اخلاق و السیات کے معارف بکھرے پڑے ہیں، جن کی تفصیل یہاں ممکن نہیں۔ اسی طرح جگہ جگہ نفس انسانی کی وہ کوتاہیاں بھی منظر عام پر لائے ہیں جن تک صرف بزرگ باعمل ہی کی نگاہ پہنچ سکتی ہے، مثلاً اپنے پیار کا ایک واقعہ لکھتے ہیں کہ میں ایک بار ان کے ہمراہ آذربایجان کے علاقے سے گزر رہا تھا۔ دو تین آدمیوں کو دیکھا کہ درویشانہ لباس میں گیہوں کے کھلیان کے قریب دامن پھیلائے کھڑے ہیں کہ زمیندار دانے ڈال دے۔ شیخ کی ان پر نظر پڑی تو یہ آیت کریمہ پڑھی ”أُولَئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهَدٰی“۔ (البقرة: ۱۶)۔ میں نے کہا امتاد محترم! یہ لوگ اس بے حیثی میں کس طرح مبتلا ہوئے؟ فرمایا ان کے پیروں کو حرص تھی کہ بہت سے مرید جمع کریں۔ ان مریدوں کو دنیا جمع کرنے کی حرص ہو گئی۔ اور ایک حرص دوسری سے بہتر نہیں (ص ۸۱) یہ تصحیح، حسب طباعت لین گراڈ، ص ۶۳)۔

کتاب میں دوسرے سوانحی حالات بھی غمنا آجائے ہیں۔ ان کے مطالعے سے پہلا مجموعی تاثر یہ پیدا ہوتا ہے کہ مصنف کی عمر کا بڑا حصہ سیاحت و سفر میں گزرا، جس کا مقصد علم و معرفت حاصل کرنا تھا۔ محولہ مقامات کے ناموں سے عیاں ہے کہ وہ برصغیر پاکستان و ہند (کم از کم غزنوی مقبوضات،

تھا (ص ۱۳۱)۔ ان کے علاوہ یہی داتا صاحب نے بہت سے شیوخ سے استفادہ کیا، جن میں ابوالقاسم الجرجانی، القشیری اور ابوالعباس الاشعری کا خاص طور پر ذکر کرتے ہیں۔ ظاہری علوم کے اساتذہ کا ذکر نہیں کیا، لیکن تفسیر و حدیث کی طرح فقہ اور مقولات میں یقیناً دسترس رکھتے تھے۔ ایک جگہ مسائل فقہ خود پڑھانے کا ذکر کیا ہے (ص ۲۴۵)۔ بعض علمی اور عقلی مناظروں کا بھی ذکر آیا ہے (مثلاً ص ۴۷، ۴۹)۔ ایک دلچسپ مثال یہ ہے کہ غزلیں کے کسی مدعی علم و امامت نے لباس میں پیوند لگانے کو بدعت قرار دیا۔ داتا صاحبؒ نے فرمایا ریشم اور زری کے کپڑے جو ملوک جابر سے تم باصلاح مالک کر لائے ہو انہیں تو جائز سمجھتے ہو اور جامہ حلال، جو جامے حلال اور زر حلال سے حاصل کیا گیا ہے، اسے پہننا بدعت بتاتے ہو (ص ۱۱۵)۔

داتا صاحب اہل سنت اور حنفی تھے؛ ملاحظہ فرماطہ، باطنیہ اور روافض کی مدلل تکذیب کرتے تھے (ص ۱۲۱، ۲۰۵ وغیرہ)۔ شیخین رضی اللہ عنہما سے کمال عقیدت کے سلسلے میں یہ امر لائق ذکر ہے کہ وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی کو طریقت یا ولایت کا امام مانتے ہیں (ص ۲۳)۔ موزوں طبیعت پائی تھی۔ بیسیوں منتخب عربی اشعار ان کے ذوق لطیف کے گواہ ہیں۔ خود (شاید جوانی میں) شعر کہتے اور اپنا دیوان مرتب کیا، جو کوئی چرا کر لے گیا اور اسے اپنے نام سے مشہور کر دیا (ص ۱)۔ کشف المحجوب میں صراحتاً اپنا صرف ایک شعر نقل کیا ہے (ص ۱۹۱)۔ [بعض تذکروں میں ایک پوری غزل ان کے نام سے درج ہے] الشاہر دازی کا بہترین ثبوت ان کی یہی کتاب ہے، جو ثر فارسی کے ابتدائی دور میں تصنیف ہوئی۔ اس کے علاوہ نو کتابیں تصنیف کیں، جن کے صرف نام باقی رہ گئے ہیں: (۱) دیوان؛ (۲) منہاج الدین؛ (۳) اہل صنفہ؛ (۴) منصور حلاج؛ (۵) رسالہ اسرار الخرق والمؤنات؛ (۶) کتاب فنا و بقا؛

میں زہد و ترک کا میلان پایا جاتا تھا اور وہ اکثر مجاہدات و ریاضات شاقہ کیا کرتے تھے، جسے اس زمانے کے اعلیٰ طبقے کے مسلمانوں کی عیش پرستی، حب مال و جاہ، اسراف و تکلفات کا شدید رد عمل کہا جا سکتا ہے۔

داتا صاحبؒ کا منسلک طریقت تین واسطوں سے سید الطائفہ جتید بغدادیؒ [رک بان] تک پہنچتا ہے۔ ان کے پیر ابو الفضل محمد بن الحسن البخلیؒ کا وطن دریاۓ جیحون کا بالائی علاقہ ختلان تھا، لیکن جبل لکام کے موضع بیت الجن میں جا بسے تھے، جو دمشق کے جنوب مغرب میں اس کے اور بابائیس کے درمیان واقع تھا۔ عارف کامل اور زاہد مرتاض تھے۔ ایک عمر خلوت میں گزاری۔ فقر و استغنا کا بد حال تھا کہ مدت تک ایک ہی جیبہ پہنا اور اسی میں پیوند پر پیوند لگاتے رہے (ص ۲۴)۔ ان کا قول تھا کہ الدلیا یوم و لنا فیہا صوم (مدینا ایک دن کی ہے اور اس میں ہمارا روزہ ہے)۔ ایسی فقیری کے باوصف، داتا صاحبؒ شاہد ہیں کہ ان جیسا ہا رعب شخص میں نے نہیں دیکھا۔ ان کے کشف و کرامت کے بارہا مشاہدات ہوئے تھے۔ انہیں میں ایک ذاتی واقعہ یہ لکھا ہے کہ ایک دن میں انہیں وضو کرا رہا تھا۔ خیال آیا کہ سب کام منشاء خداوندی سے ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے مردان آزاد کو حصول کرامت کی امید میں پیروں کا غلام کیوں بنا دیا؟ شیخؒ کشف میری قلبی واردات سے آگہ ہو گئے اور فرمایا "اے فرزند! ہر حکم کے لیے سبب ہوا کرتا ہے، جب خدا چاہتا ہے کہ ایک عام سیاہی زادہ کو تاج مملکت عطا کرے تو اسے توبہ کرنے اور اپنے کسی مقبول بندے کی خدمت کرنے کی توفیق دیتا ہے کہ وہی خدمت عطائے تاج کا سبب بن جائے۔" معلوم ہوتا ہے بہت عرصہ داتا صاحب سفر و حضر میں ان کے ساتھ رہے اور انتقال (۸۴۶ھ/ ۱۴۰۸ء) کے وقت ان کا سر داتا صاحبؒ کے زانو پر

۱۹۰۴ء، مطبوعہ سٹراس برگ)۔ کشف میں امام القشیری اور ابو الحسن سائبہ (م ۴۷۳ھ) کے لسان کے ساتھ رحمۃ اللہ علیہ کا اضافہ کیا گیا ہے، جس سے داتا صاحبؒ کے انتقال ۵۶۵ھ کی عام روایت باطل ٹھہرتی ہے (قب حبیبی: تاریخ وفات داتا گنج بخش...، در اورینٹل کالج میگزین، نروزی ۱۹۹۰ء)، جس میں حبیبی نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ کشف المحجوب کی تکمیل ۴۸۱ھ اور ۵۰۰ھ کے مابین ہوئی، نیز یہ کہ داتا صاحب کی وفات ۴۸۱ھ اور ۵۰۰ھ کے مابین ہوئی (دیکھیے مقالات محمد شفیع لاہوری، ص ۱۹۳)۔ محمد شفیع لاہوری کے طبع شدہ نسخے پر بھی داتا صاحب کی تاریخ وفات ۴۸۱ھ اور ۵۰۰ھ کے مابین دی گئی ہے۔ [دعویٰ ہے کہ ۵۱۵ھ/۵۹۱ء تا ۵۹۲ھ/۶۰۹ء سلطان ابراہیم ابن مسعود غزنوی کا عہد حکومت تھا۔ اس کے سر بیٹے سیف الدولہ محمود اور علاء الدولہ مسعود ۶۰۹ھ سے ۶۰۹ھ تک لاہور میں صوبہ دار رہے (مآثر لاہور، ص ۱، ضمیمہ)۔ ان دو ناموں سے بعد کی روایتوں میں بہت الجھن ہوئی، تاہم یہ تسلیم کرنا ممکن ہے کہ داتا صاحبؒ کے مزار کی زیارت سے اولاً علاء الدولہ مسعود مشرف ہوا (ضمیمہ کشف المحجوب، از حبیب اللہ کتاب) اور مقبرہ سلطان ابراہیم نے تیار کرایا (دیکھیے محمد ظریف: *Antiquities of Lahore*، ص ۱۷۷)۔ داتا صاحبؒ کے اتباع یا خلفا کا کوئی سلسلہ آگے نہیں چلا۔ کشف میں شکایت کرتے ہیں کہ میری کتابیں غزنین میں رہ گئیں اور میں ("در بندہ لہانور کہ از مضافات ملتان است") لاجنوں میں پھنسا ہوا ہوں۔ (ص ۷۲: قب مطبوعہ لینن گراڈ، ص ۱۱۰)۔ انھوں نے عزلت و گمنامی میں زندگی گزار دی، لیکن ان کے فضل و کمال کا مسلسل اعتراف ہوتے رہنا مسلم ہے اور اہل علم و عرفان کے لیے ان کی یہ بلیغ و دلآویز کتاب ایک جاودانی عطیہ ہے۔ یہ سب ان کی عظمت اور ایوض جاریہ کے ہدیہی شواہد ہیں۔

مآخذ: (۱) حسن سجزی دہاوی: فوائد الفوائد

(۲) کتاب البیان لاهل العیان: (۸) بحر القاب: (۹) الرعاۃ لحقوق اللہ (فہرست ۳، مطبوعہ لینن گراڈ: مقالات، محمد شفیع لاہوری، ص ۱۸۷)؛ سید ہاشمی: مآثر لاہور، ص ۲، ۲۲)۔ کشف المحجوب کا سلامت رہنا بھی اس کی مقبولیت کی دلیل ہے؛ شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے وقت سے اہل نظر اس کے مداح چلے آئے ہیں۔ قلمی نسخوں میں سب سے قدیم اور نفیس نسخہ ساتویں صدی ہجری کا لکھا ہوا، محمد شفیع لاہوری کے ذاتی کتاب خانے میں ہے، جو اب لاہور سے طبع ہو چکا ہے۔ ایک نسخہ پروفیسر ژوکوفسکی کی ناقدانہ تصحیح، فہارس و اشاریات کے ساتھ لینن گراڈ سے نسخہ ثالث میں شائع ہوا۔ انہی متن مؤسسہ مطبوعاتی امیر کبیر نے تحقیق جدید کے ساتھ ۱۳۳۶ھ ش میں طبع کیا ہے۔ [اردو ترجموں کے علاوہ پروفیسر نکسن نے کشف المحجوب کا انگریزی میں ترجمہ کیا (سلسلہ مطبوعات گب، لندن ۱۹۱۱ء)، جس سے کتاب کی بین الاقوامی قدر و منزلت ثابت ہوئی ہے۔ کشف المحجوب میں داتا صاحب نے وقت اور مقام تصنیف کی تصریح نہیں کی، اگرچہ ایک جملے سے قیاس ہوتا ہے کہ لاہور میں تکمیل کی جارہی تھی (ص ۷۲، دیکھیے ذیل میں)۔ اسی سے داتا صاحبؒ کے لاہور میں ورود اور قیام کا سوال سامنے آتا ہے۔ جس قرائن سے پتا چلتا ہے کہ شاید وہ کئی بار لاہور آئے۔ آخری قیام اور سال وفات کا سسٹنہ پھر بھی حل نہیں ہوا۔ [جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے داراشکوہ نے ان کا سال وفات ۱۰۷۵ھ/۱۶۶۳ء لکھا ہے؛ غالباً ملک الشعراء بہار کا مآخذ بھی داراشکوہ کی سفینۃ الاولیاء ہے؛ نیز دیکھیے بہار: سبک شناسی، ۲، ص ۱۸۷، مطبوعہ تہران؛ لیکن یہ سال وفات درست معلوم نہیں ہوتا؛ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ داتا صاحب ان کے استاد امام القشیری (م ۴۶۰ھ) کے جوان معاصرین میں سے تھے (دیکھیے *Neuper: Etische Literatur*، عدد ایس ۳۶، G. I. P. ۱۸۹۶)۔

کم و بیش ایک دائرے کی شکل میں نصب ہوں۔ ”دار“ قبائلی پڑاؤ کو کہتے ہیں، جو شمالی افریقہ میں ”دوار“ کے نام سے معروف ہے۔ قدیم ترین زمانے سے مسلمانوں میں ایک مرکزی جگہ کے گرد مکان یا احاطہ بنانے کا رجحان رہا ہے، جہاں جرواے کا ریوڑ دشمنوں کے حملوں سے محفوظ رہے یا جہاں حضری خاندان اجنبیوں کی مداخلت سے محفوظ رہ سکے۔ زمانہ اسلام کے اوائل میں بنایا ہوا سب سے پہلا قابل ذکر مکان خانہ خدا ہے، جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں پہنچ کر تعمیر کیا۔ اس کے بعد وہ مکانات ہیں جو آنحضرت نے اپنے اور اپنے خاندان کے رہنے اور مومنین کے اجتماع کے لیے بنائے۔ ان سب کا ضروری جزو دیواروں سے گھرا ہوا صحن ہے۔ دھوپ سے بچاؤ کا سائبان، جو اصحاب صفہ کو محفوظ رکھنے کے لیے بنایا گیا، ایک طرف دیوار کے ساتھ ساتھ چلا گیا ہے۔ دوسرے پہلو کے ساتھ ساتھ حجرے بنائے گئے تھے۔ ان میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج مطہرات رہتی تھیں اور ان میں بعد میں مزید اضافہ کیا گیا تھا۔

ان حجروں کے موضوع پر حدیث میں ہمیں دلچسپ تفصیل ملتی ہے۔ صحن میں جانے کے لیے ہر حجرے کے دروازے کے سامنے کھجور کی شاخوں کا ایک سائبان بنا ہوا تھا، جو ضرورت کے وقت اونٹ کے بالوں سے بترے ہوئے پردوں سے بند ہو سکتا تھا۔ حجرے کا یہ بیرونی حصہ، جو ”رواق“ کی یاد دلاتا ہے (یعنی وہ اونٹ جو بدویوں کے خیمے کے سامنے لگاتی اور ہٹائی جاسکتی تھی۔ اس کے ذریعے بیرونی دنیا سے گھر کا تعلق بھی قائم رہتا تھا اور یہ ڈیوڑھی کا کام بھی دیتی تھی)، مسلمانوں کے مکانات میں یہ طریقہ ہمیشہ برقرار رکھا گیا۔ قابل سکونت کمروں سے گوری ہوئی کھلی مرکزی جگہ کا یہ نظام عرب دنیا سے مختص نہیں بلکہ

لاہور ۱۹۶۳ء: (۲) الذہبی: تاریخ بول الاسلام، ج ۲
حیدرآباد ۱۳۳۷ھ: (۳) نور الدین جاسی: نفعات الانس
نولکشور ۱۸۷۴ء: (۴) ابوالفضل: اثنین اکبری، ج ۳
نولکشور ۱۸۹۹ء: (۵) لعل بیگ: بخشی شہزادہ مراد بن اکبر بادشاہ: ثمرات القدس (تالیف ۱۰۰۰ء) قلمی نسخہ
ملوکہ ظفر حسن، کراچی: (۶) داراشکوہ بن شاہجہاں: منیۃ الاولیاء کانپور ۱۸۷۲ء: (۷) غلام سرور: خزینۃ الاصلیہ (تالیف ۱۲۸۱ھ) نولکشور ۱۳۲۹/۱۹۱۳ء: (۸) نور اسد: تحقیقات چشتی، لاہور ۱۸۶۵ء: (۹) محمد لطیف: History and antiquities of Lahore لاہور ۱۸۹۲ء: (۱۰) عبدالمجید: تصوف اسلام، اعظم گڑھ ۱۳۴۳ھ: (۱۱) ہاشمی فرید آبادی: مآثر لاہور، لاہور ۱۹۵۶ء: (۱۲) عبدالحی حبیبی: تاریخ ولات داتا گنج بخش علی ہجویری غزنوی، در اور پرنٹل کالج میگزین، فروری ۱۹۹۰ء: (۱۳) محمد شفیع لاہوری: مقالات، لاہور ۱۹۹۰ء: (۱۴) ظہیر احمد بدایونی: ظہیر المطلب، اردو ترجمہ کشف المحجوب، لاہور ۱۹۰۹ء: (۱۵) Revelation of Hidden things انگریزی ترجمہ کشف المحجوب، (از نکسن) لندن ۱۹۱۱ء: (۱۶) کشف المحجوب، مطبوعہ گلزار ہند شمیم پریس، لاہور ۱۹۲۳/۱۳۴۲ء: (۱۷) کشف المحجوب، طبع ژوکوفسکی لینن گراڈ ۱۹۲۶ء: (۱۸) (مقالے میں ہر جگہ صفحات کے نشان لاہور کے مذکورہ بالا مطبوعہ نسخے سے اور بعض حوالے لینن گراڈی طباعت سے دیے گئے ہیں)۔

(ہاشمی فرید آبادی)

الدانخل: رک بہ عبدالرحمن الاول القرطبی۔
دار: (رہنے کی جگہ) گھر۔ ”بیت“ اور ”دار“ دونوں لفظوں کا استعمال ”گھر“ کے لیے بہت عام ہے، لیکن اپنے باریک معانی کی رو سے ان کے خاصے مختلف مفہوم ہیں۔ ”بیت“ دراصل ایک مسقف جگہ ہے جہاں آدمی رات بسر کر سکتا ہے۔ ”دار“ (= بمعنی گھیرنا) ایسی کھلی جگہ کو کہتے ہیں جو دیواروں، مارتوں یا بدویوں کے خیموں سے گھری ہوئی ہو جو

طویل مشرقی اور مغربی خطے میں اقامت گزین ہیں جہاں بارش بہت کم، دھوپ سخت تیز اور گرمی شدید ہوتی ہے۔ بارش کی قلت کے باعث ان خشک اور صحرائی علاقوں میں پانی، چائے وہ جوہڑ کا ہونا یا چشمے کا، بڑی قابل قدر چیز سمجھا جاتا ہے، جس کا محلات بلکہ معمولی مکانوں کی آسائش و آرائش میں بھی بڑا اہم حصہ ہوتا ہے۔ سخت دھوپ اور شدید موسم گرما سے بچنے کے لیے ایسے تہ خانے تعمیر کیے جاتے ہیں جیسے عراق اور ایران کے ”سرادیب“ (واحد ”سرداب“)، یا ایسے کمرے جو خوب ہوادار ہوتے ہیں، لیکن جن میں روشنی مدہم رکھی جاتی ہے، جیسے ”ایوان“، ”ایوان“ ایک ایسا کمرہ ہے جس کے تین طرف دیواریں ہوتی ہیں اور چوتھی طرف کا پورا ضلع باہر کے رخ کھلا ہوتا ہے، جیسے ایک بہت بڑا کشادہ چھتاء جس کی سطح چبٹی اور چھت عام طور پر (نیم آستوانی) لداؤ کی ہوتی ہے۔ یہ صحن کی طرف اس طرح کھلا ہوتا ہے کہ اس سے عربی خیمے کی ”زواق“ کی باد تازہ ہو جاتی ہے۔ یہ کمرہ استقبال کا بھی کام دے سکتا ہے اور یونانی مکان کی ڈیورڈھی (Prostas) سے بھی مشابہت رکھتا ہے۔ اس کے باوجود یہ شاید ایرانی ایجاد ہے۔ ہترا (Hatra الحضر، عراق) کے ایک پارقی محل میں (دوسری صدی عیسوی) یہ ایوان اپنی پوری شان و شوکت سے نمایاں ہے۔ آگے چل کر یہ ساسانیوں کے فن تعمیر کا امتیازی جزو بنا۔ اس کی مشہور ترین مثال مدائن کا محل ”طاق کسری“ ہے، جسے شاہنشاہ انوشیروان (۵۵۱ - ۵۷۹ء) نے تعمیر کرایا تھا۔ عراقی ماہرین تعمیر نے، جو بنو عباس کے لیے کام کرتے تھے، ”ایوان“ کو اپنی یادگار فنی تخلیقات کا ایک لازمی جزو بنا دیا۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ مدائن ہی کا محل دیکھ کر اس معمار کو تحریک ہوئی جس نے ۸۳۶/۸۳۷ء میں سائر (رک بان) کے مقام پر المعتمد کے محل کا بڑا ”ایوان“ بنایا۔ یہ ایک چھوٹے

یہی ہیئت قدیم رومی مکان کی تھی جس کے ساتھ ایک بڑا سا سائبان ہوتا تھا، اسی طرح کی بناوٹ یونانی مکان کی بھی ہوتی تھی، جو کھڑے پتھروں کے حائے سے گھرا ہوتا تھا۔ یہ طرز قدیم زمانے میں بحیرہ روم کے ملکوں نے ضرور اختیار کیا ہوگا، لیکن اس نوع کے گھر کی تعمیر مسلمانوں کی زندگی کا بہترین نقشہ پیش کرتی ہے۔ یہ نقشہ اس تصور سے، جس کی رو سے خاندان میں ایک بزرگ سرد کی حکومت ہو، بہت مطابقت رکھتا ہے اور نہ صرف اس خاندان کے لیے ایک احاطہ بند حلقہ فراہم کرتا ہے بلکہ حجاب کے ضروری وصف کو بھی جو مسلمان کی نجی زندگی میں لازمی ہے، بآسانی پورا کرتا ہے۔ عمارت کی ترتیب، اس کی ترکیب اور بلندی، دونوں میں یہی منشاء جھلکتا ہے۔ ان کی بنائی ہوئی عمارتوں کی روکاروں کی خوش و خرمی، زیبائی اور اس پر مزید تکلفات معمار کے لیے بہت قابل توجہ اور مالک مکان کے لیے امارت کی علامت ہوتی ہے۔ اس کے خلاف ایک مسلمان کا مکان، چاہے وہ کتنا ہی امیر کیوں نہ ہو باہر سے نہایت متین اور مادہ نظر آتا ہے، یعنی صرف ایک چار دیواری جس میں بھاری بھر کم اور ہمیشہ بند رہنے والا دروازہ اور چند تنگ کھڑکیاں لگی ہوتی ہیں۔ گھر کی اس تعمیر میں سب سے زیادہ توجہ کے قابل گھر کے وسط میں کھلا صحن ہے، جو پورے مکان کا صدر حصہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کے ہر طرف کی خوش منظر روکاریں تعمیر کرنے والے کے لیے بیش بہا اور کونا کون جالباتی موضوع عمل ہیں، لیکن ایسا موضوع جس کی خوبصورتی فقط اس کے مکینوں کے لیے ہوتی ہے۔

اگرچہ وہ رسم و رواج جن کی تشکیل اسلام نے کی ہے ان گھروں میں نسبتاً یکسانی کا باعث ہوئے، لیکن ان میں ایک حد تک ان موسمی حالات نے بھی یکسانی پیدا کی جو اکثر مسانک اسلامیہ پر اثر انداز ہیں۔ مسلمان عموماً، جیسا کہ معلوم ہے، ایک

کی نالیوں کا باقاعدہ انتظام ہوتا تھا۔ ان کے آنگنوں کی آرائش حوضوں اور پردوں سے کی جاتی تھی۔ دو مکانوں کے ایک کمرے میں فوارہ بنا ہوا ہوتا تھا، جس کا پانی نہر کے ذریعے آنگن کے حوض میں آتا تھا۔ مستطیل کے چھوٹے پہاڑوں اور دروازے کے سامنے کی طویل دیواروں کے درمیان عموماً فرش زمین کے ہم سطح سائبان نکال دیے جاتے ہیں، جنہیں چھوٹا ایوان کہنا چاہیے۔ ان میں نشست کی چیزیں رکھی جا سکتی ہیں۔

اس سے پیشتر کہ گھریلو فن تعمیر کے ان عناصر کی، جن کے طولانی مکانات مظہر ہیں، مغرب کی جانب منتقلی کا مطالعہ کیا جائے، یہ بتانا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے وطن اصلی میں کس طرح تبدیل ہو چکے ہیں اور ترکوں کے زیر اثر ہیئت بدل جانے کے بعد مصر کی جدید سکونت گاہوں میں اب ان کا کتنا حصہ باقی رہ گیا ہے۔ ان سکونت گاہوں میں آنگن ابھی تک ایک اہم عنصر ہے، لیکن اب یہ عمارت کے مرکز میں نہیں ہوتا بلکہ اس کے سامنے ہوتا ہے، جس میں ایک قوسی برآمدے سے ہو کر جانا پڑتا ہے۔ ملاقاتی کا اس جگہ ایک نیچے کمرے ("تخت بوش") میں استقبال کیا جا سکتا ہے، جو نیچے کی منزل میں جانے کے لیے پوری طرح کھلا ہوتا ہے، یا اوپر کے رخ اس کمانچے میں جاتا ہے جسے "مقعد" کہتے ہیں اور صحن اس کے زیر قدم ہوتا ہے۔ اگر ملاقاتی گھر کے اندر داخل ہو رہا ہے تو اس کا استقبال سلام لیک [صالح سلام علیکم] سے کیا جائے گا۔ اس کا صدر حصہ ایک بڑا دالان ("مندرہ") ہوتا ہے، جس کے وسطی حصے کو، جو آنگن کا بدل ہے، پختہ بنا کر فوارے سے آراستہ کیا جاتا ہے اور اس کے ارد گرد دو یا تین "ایوان" یا جیسا کہ اب مقامی بولی میں کہنے لگے ہیں "لیوان" ہوتے ہیں۔ ان "لیوانوں" پر، جو فرش کی سطح سے بلند بنائے جاتے ہیں، قالین اور (دیوان) بچھائے جاتے ہیں۔ "حریم" تو "سلام علیک" سے قطعی طور پر جدا ہوتا ہے اور

پیمانے پر ۱۴/۵۱/۷۷ء میں بنے ہوئے اخیر کے محل میں پایا جاتا ہے۔ اس شامی محل میں عمارات سے گھرے ہوئے آنگن نظر آتے ہیں۔ ایسے دو آنگنوں کے دو "ایوان" آسنے سامنے کھلتے ہوئے بنے ہیں اور دونوں کے بازو پر آنگن کے سارے عرض میں ایک برآمدہ بنا ہوا ہے۔ یہ موزوں نقشہ، جس میں ایک دوسرے کے روبرو دو گمشادہ برآمدے، اور دور دیوار کی طرف کھلنے والے "ایوان" ہوتے، جو موسم کے مطابق، سرما یا گرما میں، استعمال ہوتے تھے، عراق جدید کے مکانوں میں ہمیشہ برقرار رکھا گیا ہے۔ برآمدہ یا کشادہ کمرہ، جو سہ درجے کمانچے کے ذریعے آنگن کی طرف کھلتا ہے، قریب کھلتا ہے۔ "ایوان" کے دونوں جانب دو کوٹھریاں (= "آؤدہ") ہوتی ہیں، جن سے نقشے کی مستطیل شکل قائم رہتی ہے۔ بہر کیف، تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی تک اس تصور تعمیر نے (گمشادہ پیش دالان، گھرا "ایوان" مع بغلی کمرے کے جن کے دروازے پیش دالان میں کھلتے ہیں) مغرب کی طرف حرکت کی اور بحیرہ روم کے ممالک میں پہنچنا شروع ہو گیا۔ الفسطاط (قدیم قاہرہ) کے بعض مکانوں میں، جنہیں عموماً طولیوں سے منسوب کیا جاتا ہے، "ایوان" ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔ آنگن کے گرد، جس کے کسی ایک گوشے سے داخلہ ہوتا ہے، چار دیواری ہوتی ہے اور چاروں اضلاع میں "ایوان" ہوتے ہیں، جن میں سے بعض زیادہ چوڑے اور بعض کم چوڑے بلکہ چبٹی سطح کے کشادہ سائبانوں کے مانند ہوتے ہیں۔ کسی ایک ضلع میں تین در کا پیش دالان ہوتا ہے اور اس کے سرے پر وسطی "ایوان" اور اس کے ایک جانب حجرے ہیں۔ اس کشادہ پیش دالان اور اس چوڑے "ایوان" کا نقشہ T کی شکل کا ہوتا ہے۔ یہ طولی مکانات جو اس عہد کی یادگار عمارات کے مانند، اینٹوں کے بنے ہوئے ہیں، کئی منزلوں پر مشتمل ہیں۔ ان میں تازہ پانی اندر لانے اور گندہ پانی نکالنے

اس میں ایک دروازے سے، جو آنگن میں کھلتا ہے، اور سیڑھیوں سے، اندر جاتے ہیں۔ ”قاعۃ“ جو اس کا سب سے بڑا کمرہ ہوتا ہے، ”مندره“ سے مشابہت رکھتا ہے، اس لیے کہ یہاں بھی وسط میں جگہ چھوڑ دیتے ہیں اور بقلی توسعات بھی ہوتی ہیں۔ پھر بھی یہ مختلف چیز ہے اور زیادہ واضح طور پر قدیم آنگن سے ماخوذ ہے، کیونکہ وہ دیواریں جو وسطی جگہ کو گھیرے ہوئے ہیں برآمدوں کی سطح تک اونچی ہوتی ہیں اور ان میں ایک قندیل ہوتی ہے جو اندرون خانہ کو روشن کرتی ہے۔

وسطی آنگن والے یہ مکان، ان خصوصیات کے ساتھ جو ایرانی روایت سے ورثے میں ملیں اور جنہیں بوزنطیوں کی ضروریات خانہ داری کے مطابق ڈھال لیا گیا تھا، جلد ہی بحیرہ روم کے مسلم ممالک میں رواج پا گئے۔ اس رواج کی شہادتیں قریبی زمانے کی اثری تحقیقات سے ملی ہیں۔ حال ہی میں حبرہ۔ منصوریہ شہر کی کھدائیوں سے، جسے المنصور قاضی نے ۹۳۵ھ/۹۷۴ء میں القیرونی کے دروازوں کے قریب بسایا تھا، ایک محل برآمد ہوا ہے، جس کی دیواریں مٹی کی ہیں اور کسی زمانے میں گلی مرصع کاری سے اس کی سجاوٹ کی گئی تھی۔ یہاں ہم ایک چوڑے پیش دالان، اور پہلو میں دو کمرے لیے ہوئے اندر کے عریض ایوان کا نقشہ دیکھتے ہیں۔ اس عہد میں (یا ممکن ہے کہ اس سے ذرا پہلے) صنہاجی اسیر زیری کا آئینہ میں محل، جس کی تاریخ تعمیر تقریباً ۹۳۴ھ/۹۳۵ء ہے، آنگنوں اور ان کمروں کے نہایت صحیح تناسب کی وجہ سے جو ان کے چاروں طرف بنے ہیں جاذب توجہ ہے۔ اس کے پانچ کمروں میں مسطح بنیاد والے مائیان دروازے کے مقابل کی دیوار سے ملے ہوئے ہیں۔ ان اندرونی کمانچوں کے مقابل باہر کی طرف کے حصے سامنے سے مستطیل رکھے گئے ہیں۔

اس مقام پر بنو حماد کے قلعے کے محل تیار ہونے نظر آتے ہیں، جن میں سے تین کھود کر نکالے جا چکے ہیں۔ ”دارالبحر“ جو سب سے بڑا ہے، اور جس کا یہ تاریخی نام پانی کی اس وسیع چادر کی بدولت زبان زد ہوا جو سارے وسیع آنگن میں گلی طور پر پھیلی ہوئی تھی، اس عظیم تلاؤ کے کنارے پر سرکاری کمرے تھے۔ ایک دوسرے آنگن کے ارد گرد عمارات تھیں، جو قیاساً گھریلو استعمال، جیسے گودام اور مہمانوں کے غسل خانے کے لیے تھیں۔ مسطح بنیاد والے مائیان، جو غالباً ”ایوان“ سے اخذ کیے گئے تھے اور جن سے ساسانی ماہرین تعمیر یقیناً بہت پہلے سے بخوبی واقف تھے، کمروں کی داخلی بناوٹ میں بوٹلمونی پیدا کرتے ہیں۔ بنو حماد کے ایک اور محل قصر المنار (قلعہ فنل) کی کھدائی سے پتا چلتا ہے کہ اس کے وسطی ایوان کی چھت کسی زمانے میں بلاشبہ قبہ نما ہوئی اور اس کے چاروں طرف مائیان ہوں گے یا دیواروں کے اندر کمانچے تعمیر کیے گئے ہوں گے۔ اس طرح کا ایک چلیبائی نقشہ ہم ہلمو میں زوہ کی کوٹک میں دیکھتے ہیں، جسے نارمن بادشاہوں نے بارہویں صدی عیسوی میں تعمیر کیا تھا۔ ان مائیانوں میں سے ایک میں فوارہ بنا ہے، جس کا پانی کمرے میں سے گذرتی ہوئی ایک نہر میں بہتا ہے، جیسا کہ القسطنطیہ کے طولونی مکانات میں، جن کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔

ایشیائی عناصر، جو شمالی افریقہ میں گھریلو فن تعمیر نے اپنا لیے گئے ہیں، آثار سدرتہ (Sedrata) میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہ صحرا میں ایک شہر ہے، جس کی بنیاد خارجی بربروں نے اوارگلہ (Ouarzila) کے جنوب میں رکھی تھی، اور یہ دسویں سے بارہویں صدی عیسوی تک آباد رہا۔ مکانات میں، جو ریت سے برآمد ہوئے ہیں، آپسے کمرے ہیں جو متعدد آنگنوں کے سامنے ہیں۔ ان عمارتوں کے علاوہ، جن میں چیزیں رکھنے

وسطی آنگن والے یہ مکان، ان خصوصیات کے ساتھ جو ایرانی روایت سے ورثے میں ملیں اور جنہیں بوزنطیوں کی ضروریات خانہ داری کے مطابق ڈھال لیا گیا تھا، جلد ہی بحیرہ روم کے مسلم ممالک میں رواج پا گئے۔ اس رواج کی شہادتیں قریبی زمانے کی اثری تحقیقات سے ملی ہیں۔ حال ہی میں حبرہ۔ منصوریہ شہر کی کھدائیوں سے، جسے المنصور قاضی نے ۹۳۵ھ/۹۷۴ء میں القیرونی کے دروازوں کے قریب بسایا تھا، ایک محل برآمد ہوا ہے، جس کی دیواریں مٹی کی ہیں اور کسی زمانے میں گلی مرصع کاری سے اس کی سجاوٹ کی گئی تھی۔ یہاں ہم ایک چوڑے پیش دالان، اور پہلو میں دو کمرے لیے ہوئے اندر کے عریض ایوان کا نقشہ دیکھتے ہیں۔ اس عہد میں (یا ممکن ہے کہ اس سے ذرا پہلے) صنہاجی اسیر زیری کا آئینہ میں محل، جس کی تاریخ تعمیر تقریباً ۹۳۴ھ/۹۳۵ء ہے، آنگنوں اور ان کمروں کے نہایت صحیح تناسب کی وجہ سے جو ان کے چاروں طرف بنے ہیں جاذب توجہ ہے۔ اس کے پانچ کمروں میں مسطح بنیاد والے مائیان دروازے کے مقابل کی دیوار سے ملے ہوئے ہیں۔ ان اندرونی کمانچوں کے مقابل باہر کی طرف کے حصے سامنے سے مستطیل رکھے گئے ہیں۔

تقریباً ایک سو سال بعد بربر علاقے میں صنہاجہ

(۱۳۵۴ء) اور محمد پنجم (۸۵۵ھ/۱۳۵۴ء تا ۸۷۳ھ/۱۴۶۳ء) کی فنی تخلیقات ہیں، دو مستطیل صحنوں کے ارد گرد بنی ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک Patío de los Leones دو روشوں میں، صلیب کی شکل میں، منقسم ہے، جن پر آگے کو نکلے ہوئے دو کوشک چھائے ہوئے ہیں۔ یہ مستطیل کے چھوٹے پہلوؤں پر بنے ہوئے ہیں، جیسا کہ مرسہ کے مذکورہ بالا قصر میں ہے۔ ان صحنوں کی آرائش میں بھی ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہ البرقہ (Alberca) کے حوض کو بھرتا اور مشہور ”شیروں والے حوض“ کے اوپر سے بہتا ہوا گزرتا ہے۔ برآمدے اور پیش دالان، جو آنگنوں میں کھلتے ہیں، ایوانات شاہی میں لے جاتے ہیں، مثلاً سفیروں کا شاندار کمرہ، جو برج قمار (Comerca) میں اس پورے احاطے کی خاص امتیازی چیز ہے۔ کشادہ کمروں کے ہر سرے پر ایک کمانچہ، ایک بغلی ”ایوان“ ہے جو آگے کو نکلی ہوئی محراب سے محصور ہے جیسا کہ سدرقہ Sedrata کے مکالوں میں ہے۔

گستانی صحنوں کا یہ نقشہ قزاقوں اور پہلیاں روشوں کے ساتھ، جو یقینی طور پر مشرق معلوم ہوتا ہے، مغرب میں ازمنا متوسطہ ہی نہیں آیا ہوگا۔ یہ ابھی تک دلکش ”ریاض“، پائین باغ کی صورت میں، جو قناس اور سرائش میں پائے جاتے ہیں، باقی ہے۔ الجزائر میں، خصوصاً خاص شہر الجزائر میں، بالکل مختلف ہوتا ہے۔ اس کا سیفہ (باڈیوڑھی) بڑا لمبا اور اس کے کناروں پر نشستیں بنی ہوئی ہیں۔ یہاں سے ایک بل کھاتے ہوئے برآمدے یا زینے کے ذریعے صحن میں جاتے ہیں۔ صحن چار ستونوں پر استادہ نعل نما محرابوں والی غلام گردشوں سے گھرا ہوتا ہے۔ وسط میں ایک فوارہ چلتا ہے۔ سب سے زہریں منزل یا اوپر کی منزلوں میں غلام گردشوں کے لیچے کے کمرے بہت کشادہ مگر ذرا پست ہوتے ہیں۔ ان کی محدود بلندی چھت کے شہیروں کے کمزور سہارے کی وجہ سے

کے گودام ہوتے ہیں مکان میں سرکاری کمرے موجود ہیں، جن کی استرکاری پر کثرت سے نقش و نگار تراشے گئے تھے۔ ان کی بعض چھتیں محرابی لداؤ کی ہیں، جو دو نیچی برجیوں سے جاملی ہیں۔ برجیوں کے نیچے گھونکے کی وضع کے توڑے ہیں۔ بعض کمروں کے آگے برآمدے ہیں، جن کی سہ دریاں الفسطاط کی طرح صحن میں کھلی ہوئی ہیں۔ کمرے کا نقشہ T کی شکل کا بنایا جاتا ہے، جو ایک کشادہ کم عرض کے کمرے اور دیوار کے ساتھ ”ایوان“ پر مشتمل ہوتا ہے۔ ایوان کا رخ داخلے کی جانب رکھتے ہیں۔ اس کشادہ کمرے کے دونوں سروں پر محرابی شہ نشین ہوتا ہے۔

ہمیں اس بات کا علم نہیں کہ اس قسم کا مکان اپنے ایرانی اور عراقی مرکب عناصر کے ساتھ کب اور کیسے اندلس اور المغرب میں پہنچا۔ المغرب کے خلفائے خاص کر تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی میں بغداد یا ساسرا سے مآخوذ بہت سی طرزیں درآمد کیں اور وہ اندلس میں معروف ہو گئیں۔ شاید اس طریق سے ہم بعض ان تعمیری عناصر کی تشریح کر سکتے ہیں جن کا انکشاف مرسہ Murcia کے قصر Castillejo میں ہوا اور جنہیں ابن مردنش (۸۴۱ھ/۱۱۴۱ء تا ۸۶۶ھ/۱۱۷۱ء) سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس جگہ ہم کشادہ کمرے دیکھتے ہیں، جن کے سرے پر ایک تنگ حجرہ، پیشیں حصے کے عقب میں بنا ہوتا ہے۔ اندر کا مستطیل صحن باغ کے طرز کا بنایا گیا ہے، جس میں دو روشیں ایک دوسرے کو وسط میں کاٹی ہیں۔ یہ ایرانی طرز کا ہر تو ہے۔ اس مستطیل کی چھوٹی سٹون پر دو آگے کو نکلے ہوئے کوشک ہوتے ہیں، جو روشوں کی نشان دہی کرتے ہیں۔ اس قسم کی اقامت گاہ، جو اندلس میں مروج ہوئی، غرناطہ کے ملوک نصریہ کے محل الحمراء میں بے مثل حسن اور فراخی اختیار کر لیتی ہے۔ یہ معلوم ہے کہ اس شاہی محل کی بڑی بڑی عمارات، جو یوسف اول (۸۳۵ھ/۱۳۳۵ء تا ۸۵۵ھ/۱۴۵۵ء)

'Comptes rendus de l'Académie des Inscriptions
Comptes : P. Blanchet (۱۰) : ۵۱۲ : ۱۹۵۲
'rendus de l'Académie des Inscriptions
Le Maghreb central a : L. Golvin (۱۱) : ۵۲۰
'l'époque des Strides : ۱۸۰ : ۱۹۵۲
'Le jardin et la maison arabe au Maroc : Gallotti
Notice sur la : Gavault (۱۲) : ۱۹۲۹
'bibliothèque-musée d'Alger : RA : ۱۸۹۳ : (۱۳)
'L'architecture musulmane d'Occident : G. Marcais
'Salle, anisalle : ۱۵ : ۱۹۵۲
AIEO Alger : ۱۹۵۲

(G. MARCAIS)

- ① دَارُالْاِسْلَام : (ع) لفظی ترجمہ اسلام کا گھر
یا وطن؛ لیکن فقہائے اسلام کی اصطلاح میں دارالاسلام
سے مراد ایک ایسی باقاعدہ منظم ریاست یا ملک ہے
جس کا سربراہ مسلمان ہو (جیسے امام المسلمین،
امام وقت یا صرف الامام بھی کہا جاتا ہے اور جس
میں بقول الماوردی (الاحکام السلطانیة، ص ۶ بعد)
سات شرائط یعنی عدالت، علم، سلامت، حواس، سلامت
اعضاء، اہانت رائے، شجاعت اور قرشیت پائی جائیں،
صاحب الذر المختار (۲: ۵۳، ۲۸۹) اسے امامت گبری
قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان شرائط کے علاوہ اشراف
واعیان کی بیعت اور رعوب و دبدبے کے ساتھ رعیت پر احکام
اسلام نافذ کرنے کی صلاحیت بھی ضروری ہے، جہاں
اسلامی شریعت کے احکام عملی طور پر نافذ ہوں اور جہاں
کی رعایا مسلمانوں اور ایسے غیر مسلموں پر مشتمل ہو جو
اہل الکتاب یعنی یہود و نصاریٰ وغیرہ میں سے ہوں اور
بت ہرمت اور مشرک نہ ہوں (کشاف اصطلاحات الفنون،
۳۶۶ : احکام اہل الذمہ، ۱ : ۵ بعد، ۳۲۶)۔

دارالاسلام یا اسلامی ریاست کی غیر مسلم رعایا
نے اگر برخا و رغبت اسلامی ریاست کی تشکیل میں
حصہ لیا ہو اور دارالاسلام کے دفاع کے لیے اپنے مسلمان

ہوتے ہیں۔ دروازے کے بالقابل ایک کمانچہ ہوتا ہے،
جس میں دیوان (صوفہ) ہوتا ہے۔ اس میں ہم "ایوان"
کی بگڑی ہوئی صورت دیکھ سکتے ہیں، جس کی
مثالیں ہمیں عراق میں ملتی ہیں۔ الجزائر میں اس
متوسط کمانچے کا ایک اگلا حصہ ہوتا ہے، جسے روکار
میں نصب شدہ کڑیوں کا زاویہ بنا کر اس پر ٹکا دیتے
ہیں۔ یہ بغیر کسی شک و شبہ کے مشرق طرز ہے،
جسے اس شہر کے ترک حکمرانوں نے درآمد کیا تھا۔
مضافات بنگلوں میں خالی جگہ اتنی محدود نہیں ہوتی،
لہذا آگے کو نکلا ہوا حصہ غیر ضروری ہو جاتا ہے۔
اس حصے کا فرش سطح زمین کے برابر ہوتا ہے۔ اوپر کی منزل
میں یہ ایک مختصر سی نشست گاہ یا جھروکا بن جاتا ہے،
جس کے تین طرف دریچے ہوتے ہیں اور وہ اکثر داخلے
کی ڈیوڑھی کے اوپر آ جاتا ہے۔ تولسی مکان ذرا مختلف
ہوتا ہے۔ اس کے مستطیل صحن کے صرف دو چھوٹے
ضلعوں میں غلام گردشیں ہوتی ہیں۔ بڑے بڑے
کمرے T کی شکل کے بنائے جاتے ہیں، جن میں کشادہ
کمرہ ("بیت")، بلند ایوان ("تہو") اور کنارے پر
کوٹھریاں ("مقصورہ") جمع : "مقاصر" ہوتی ہیں۔

مآخذ : (۱) Caetani : 'Annali dell' Islam

۱ : ۳۷۶ بعد : ۳۳۳ بعد : (۲) Creswell : 'Early

'Muslim architecture : ۱ : ۳ تا ۶ و ۲ : ۵۳ : بعد : (۳)

'Palace and mosque of Ukhaidir : Lowthian Bell

اوکسفرڈ : ۱۹۱۱ : (۴) Herzfeld : 'Die Ausgrabungen

'von Samarra : برلن ۱۹۲۳-۱۹۲۷ : (۵) Viollet

'Mémoires de) Un palais musulman du IX^e siècle

: Watelin (۶) : 'l'Académie des Inscriptions : (۷) ۱۹۱۱

'Sasanian building : Pope : 'Survey of Persian art

Fouilles d : A. Gabriel و A. Bahgat (۸) : ۵۸۵ : ۱

'Al-Foustar : Pauty (۸) : ۱۹۲۱

lex inaisons de l'Egypte musulmane (فرانسیسی

ادارہ در قاہرہ) : ۱۹۲۳ : (۹) مصطفیٰ سلمان رئیس :

لائے تو وہ بھی بلاد اسلام قرار پائے (احکام اہل الذمۃ، ۱: ۵، ۳۶۶)؛ تھانوی (کشاف اصطلاحات الفنون، ۱: ۳۶۶) نے فتاویٰ قاضی خان اور فتاویٰ عالمگیری وغیرہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ جس ملک میں مسلمان رہتے ہوں اور آزاد ہوں اور اس میں اسلام کے احکام میں سے ایک حکم بھی نافذ ہو تو اسے دارالمسلمین کہا جائے، دارالکفر نہ کہا جائے، لیکن فقہاء کی اکثریت کا اصرار ہے کہ دارالاسلام صرف احکام شریعت کو نافذ کرنے والی حکومت کی شرط پر قائم ہوتا ہے۔

دارالاسلام کے داخلی استحکام اور بیرونی دفاع کے متعلق فقہائے اسلام نے تفصیل سے بحث کی ہے اور السیر والجهاد کے ضمن میں مختلف موضوعات پر قیمتی معلومات موجود ہیں؛ اس لیے دارالاسلام میں دشمن کو زیادہ دیر ٹھہرنے اور گھومنے کی اجازت نہیں دی گئی، مثلاً دارالحرب [رک بان] کا کوئی باشندہ (حرابی) اگر اجازت سے اور اسان لے کر داخل ہو تو اسے ایک ماہ یا دو ماہ سے زیادہ قیام کی اجازت نہیں، کیونکہ ہو سکتا ہے وہ داخلی حالات معلوم کر کے ملک کے لیے ضرر کا باعث بن جائے، اس لیے اگر ایسا باشندہ زیادہ مدت کے لیے قیام کرنا چاہے تو اسے امام وقت کی طرف سے کہا جائے گا کہ وہ جزیہ ادا کرے، اگر وہ یہ شرط خوشی سے قبول کر لے تو اسے ذمی کا درجہ حاصل ہو جائے گا اور دارالاسلام کے ذمی شہری کی حیثیت سے وہ جزیہ ادا کرے گا (الذرائع المختار، ۲: ۲۷۳)۔ دارالاسلام کے برحق قانونی سربراہ کے خلاف اگر کوئی فرد یا گروہ خروج کرے یا شورش برپا کرے تو اطاعت کی دعوت دی جائے گی اور انکار کی صورت میں ان سے قتال (جنگ) واجب ہے، جس میں شریک ہونا جہاد فی سبیل اللہ کی طرح ہر مسلمان پر فرض ہے۔ برحق امام وقت کے خلاف بغاوت و خروج کرنے والے تین قسم کے لوگ ہو سکتے ہیں، یعنی قَطَاع الطَّرِيق (رہزن، ڈاکو)، باغی (جمع: بغاۃ) اور خَوَاج (واحد: خارجی) اور

ہم وطنوں کے ساتھ بغائے باہمی کے اصول پر ایک ساتھ زندگی بسر کرنے کا عہد و پیمان کیا ہو تو شہریت میں ان کے حقوق و فرائض مسلمانوں کے برابر ہوں گے جس طرح کہ عہد نبوت میں مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان میثاق مدینہ طے پایا تھا، جس کی رو سے مسلمان اور یہودی دارالاسلام (مدینہ منورہ) نے سب سے پہلے شہری قرار پائے تھے (سیرۃ ابن ہشام، ۲: ۳۷۷)؛ حمید اللہ: Muslim Conduct of State، ص ۶۵؛ احکام اہل الذمۃ، ۱: ۵، ۳۶۶؛ حمید اللہ: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی زندگی، ص ۳۲۵ (بعد)؛ لیکن اگر ایسی صورت نہ ہو اور غیر مسلم شوکت اسلام اور مسلمانوں کی عدل گستری سے متاثر ہو کر یا مفتوح قوم کی حیثیت سے اسلامی ریاست کی رعایا ہونا قبول کریں تو انہیں اہل الذمۃ یا ذمی [رک بان] کہا جائے گا اور ان حقوق و فرائض میں اور عامۃ المسلمین کے حقوق و فرائض میں بجز اس کے کچھ فرق نہ ہوگا کہ ذمی شہریوں کے جان و مال کی حفاظت اسلامی ریاست کا فرض ہوگا، لیکن وہ اسلامی ریاست کے دفاع کے فریضے سے مستثنیٰ ہوں گے اور اس کے بدلے میں ان کا فرض ہوگا کہ وہ جزیہ [رک بان] کے ذریعے اسلامی ریاست کی مالی معاونت کریں، لیکن بنیادی شہری حقوق (آزادی، مذہب، آزادی معاش، آزادی رائے اور حق انصاف وغیرہ) میں ان کے ساتھ کسی قسم کا امتیازی سلوک نہیں کیا جاتا (Muslim Conduct of State، ص ۶۵؛ الاحکام السلطانیۃ، ص ۴۵)۔

علامہ ابن القیم نے لکھا ہے کہ جمہور فقہائے اسلام کے نزدیک دارالاسلام وہ جگہ ہے جہاں مسلمان آباد ہوں اور وہاں شریعت اسلامی کے احکام عملی طور پر نافذ ہوں، لیکن اگر احکام اسلام کا اجرا نہ ہو تو وہ جگہ دارالاسلام نہیں کہلائے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں دارالہجرت مدینہ منورہ دارالاسلام تھا، لیکن جب دوسرے علاقوں کے لوگ اسلام

کے زمانے میں دارالاسلام اور دارالحرب کے غرض مندانہ تصورات پر بہت سا مواد موجود ہے، انیسویں یسویں صدی میں اس سلسلے میں بہت سی تاویلین استعماریوں کے مفاد کی تقویت کے لیے کی گئیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی اصلی روح کے مطابق دارالاسلام وہی ہے جہاں مسلمانوں کی اپنی حکومت ہو اور اس میں اسلامی شریعت نافذ ہو۔

مآخذ: (۱) الماوردی: الاحکام السلطانیة، قاہرہ

۱۹۶۶ء: (۲) ابو بکر السرخسی: کتاب البسوط (جلد دوم

لفظ) قاہرہ ۱۳۲۸ھ: (۳) وہی مصنف: شرح السیر الکبیر

حیدرآباد دکن ۱۳۵۵ھ: (۴) امام الشافعی: کتاب الام

قاہرہ ۱۹۶۱ء: (۵) یحییٰ بن آدم: کتاب الغراج، لائٹن

۱۸۹۶ء: (۶) ابن حشام: السیرۃ النبویة، قاہرہ ۱۹۳۸ء:

(۷) تھانوی: کشاف اصطلاحات الفنون، کلکتہ: (۸)

ڈاکٹر حمید اللہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی زندگی

کراچی ۱۳۶۲ھ: (۹) وہی مصنف: Muslim Conduct of

State، حیدرآباد دکن ۱۹۳۱ء: (۱۰) وہی مصنف:

عہد نبوی کے میدان جنگ، حیدرآباد دکن: (۱۱) سید

ابوالاعلیٰ مودودی: الجہاد فی الاسلام، لاہور ۱۹۶۰ء:

(۱۲) ابن قیم: احکام اهل السنة، دمشق ۱۹۶۶ء:

(ظہور احمد اظہر)

الدار البيضاء: کامابلانکا Casablanca کا عربی

نام، سرائش کا ایک بڑا شہر، مقامی لوگ دارالبيضاء

بولتے ہیں۔ زمانہ سابق میں آفنا [رک ہاں] کہلاتا تھا۔

پندرھویں صدی عیسوی میں جب پرتگالیوں نے

آفنا کو تباہ کر دیا تو یہ شہر کھنڈر بنا رہا۔ اس میں

چند بدو رہتے تھے اور گاہ گاہ اے جہازوں کے ہانی

لینے کے مقام کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔

پرتگالیوں نے اس جگہ کا نام ایک سفید مکان کے نام پر

Casabranca رکھ دیا، جہاں سے نیچے کی طرف کھنڈر

نظر آتے تھے اور یہ مکان ان کے جہازوں کے لیے

امتیازی نشان کا کام دیتا تھا۔ ہسپانیوں نے اس نام کو

اس طرح کے دوسرے لوگ جو برحق امام وقت کی حکومت کو تسلیم نہ کرتے ہوں۔ ان میں سے ہر ایک کے لیے الگ الگ احکام موجود ہیں (الذو المختار، ۲: ۲۸۶)۔

دارالاسلام کے امام وقت کا یہ فرض ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام انجام دے۔ شرک چونکہ سب برائیوں کی جڑ (اصل الذاکیر) ہے اس لیے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس سے منع کرنے کے لیے عملی جہاد میں حصہ لے اور اس سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بہترین عملی مثال (اسوۂ حسنہ) اور قرآنی تعلیمات پیش نظر رکھی جائیں۔ مجاہد فی سبیل اللہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ مال و دولت کی خواہش دل سے نکال کر محض اللہ کی رضا کی خاطر گھر سے نکل کر (السرخسی: البسوط، ۱: ۲ تا ۵)۔

اگر مسلمانوں پر ظلم ہو یا دارالاسلام پر مشرکین اور کفار چڑھ دوڑیں تو اس صورت میں امام وقت اعلان جہاد کرے گا اور جہاد بالسیف فرض ہو جائے گا۔ اگر وہ صلح پر آمادہ ہو جائیں تو صلح کرنے کا حکم ہے، اگر کوئی ایسی صورت ہو کہ کفار و مشرکین فتنے کا باعث بن سکتے ہوں تو ان پر حملہ کر کے ان کی سرکوبی کر دینا ضروری ہے (السرخسی: البسوط، ۲: ۱۰ بعد: الاحکام السلطانیة، ص ۴۵ بعد)۔ الماوردی نے صراحت سے لکھا ہے کہ اگر داخلی طور پر دارالاسلام کو خطرہ ہو تو اس وقت بھی جہاد فرض ہے، مثلاً کوئی گروہ یا خطہ دارالاسلام کی مرکزی قانونی حکومت کو چیلنج کرتے ہوئے فرائض اسلام یا بیت المال کے واجبات ادا کرنے سے انکار کرے جیسا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مانعین زکوٰۃ اور مرتدین کے خلاف جہاد کا حکم دیا تھا (الاحکام السلطانیة، ص ۵۵ بعد) تو اس صورت میں بھی جہاد فرض ہے۔ [اسلامی ممالک پر مغربی استعمار کے غلبے

بدل کر کسابلانکا کر دیا، جو شہر کا موجودہ یورپی نام ہے۔ الدارالبیضاء اس کا لفظی ترجمہ ہے۔

علوی سلطان سیدی محمد بن عبداللہ نے اس شہر کو اٹھارہویں صدی عیسوی میں، غالباً پرتگالیوں کے ۱۷۹۹ء میں مازاگان Mazagan کو چھوڑ کر چلے جانے کے بعد، ازسر نو بنایا تھا۔ اس ڈور سے کہ عیسائی کسی دن پھر حملہ کر دیں گے وہ رباط اور مازاگان کے درمیان دفاعی مورچوں میں جو خلا موجود تھا اسے پُر کر دینا چاہتا تھا۔ وہ برج (سقالہ)، جس پر توپوں کے لیے دمدے بنے ہوئے تھے، رباط [رگ باں] اور لراش (Larache) کے برج کی طرح تھا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس سلطان نے دو "ادالے" [یا حصے] کر کے شہر کو ازسر نو آباد کیا تھا۔ ایک حصے میں تو صفحہ کے شلوچ تھے (ایک بربر قبیلہ جو اغا دیو [رگ باں] کے علاقے میں مخزن کے زیر حکومت آ گیا تھا) اور دوسرے حصے میں مکنس (Meknes) کے بواخر (اہل البخاری)۔ آج تک شہر کی ایک قدیم ترین مسجد کا نام "جامع الشاوح" چلا آتا ہے۔ اسیویں صدی عیسوی کے اوائل میں جو سیاح الدارالبیضاء میں گئے انہوں نے اسے کھنڈروں کا ایک ڈھیر بتایا ہے، جو مستقل سکونت کے بجائے زیادہ تر پڑاؤ کے کام آتا تھا۔ فضالہ اور منصوبہ کی طرح یہ رباط اور مراکش کے درمیان سفر میں ایک منزل تھا۔

اناج (جو الدارالبیضاء کی سب سے بڑی برآمد تھی) کی تجارت کی اجازت ۱۷۸۲ء میں قادس (Cádiz) کی ایک ہسپانوی کمپنی کو اور ۱۷۸۹ء میں میڈرڈ Madrid کی Compañía de los Cinco Gremios Mayores کو دی گئی تھی۔ لیکن جب شاویہ کے والی نے بغاوت کر دی اور اپنا مستقر الدارالبیضاء میں بنا لیا تو سلطان مولای سلیمان نے ۱۷۹۴ء میں اس بندرگاہ کو تجارت کرنے والوں کے لیے بند کر دیا اور ان عیسائی سوداگروں کو واپس رباط بلا لیا جنہوں نے الدارالبیضاء میں اپنی تجارت جما لی تھی۔ دوبارہ اس بندرگاہ کو مولای

عبدالرحمن بن ہشام نے کہیں ۱۸۳۰ء میں جا کر کھولا۔ ۱۸۳۰ء اور اس کے بعد سے یورپی تجارت یہاں واپس آنے لگے اور خاص کر ۱۸۵۲ء میں ان کی آمد بہت کثرت سے ہوئی۔ ان میں سب سے پہلے لوڈیو Lodève کے فرانسیسی صنعت کاروں کے نمائندے تھے۔ انہیں خام اون کی تلاش میں بھیجا گیا تھا تاکہ وہ برطانوی منڈی کی محتاجی سے آزادی حاصل کر سکیں۔ ان کے پیچھے جبل الطارق سے انگریز تاجر، پھر جرمن، پرتگالی اور ہسپانوی آئے۔ الدارالبیضاء میں پہلا یورپی نائب قونصل ۱۸۵۷ء میں مقرر ہوا۔ بعد ازاں یورپی اقتصادی بحران یا مقامی اسباب (مثلاً خشک سالیوں اور وباؤں) کی وجہ سے گھٹے گھٹے جمود طاری ہونے کے باوجود غیر ملکوں کی یہ چھوٹی سی نوآبادی مسلسل بڑھتی رہی۔ جہازران کمپنیوں (خصوصاً the French line Paquet) کے جہاز باقاعدہ الدارالبیضاء میں آتے تھے۔ تجارت بڑھتی رہی اور ۱۹۰۶ء میں بندرگاہ میں آمدورفت طنجہ Tangier سے بھی بڑھ گئی (درآمدی اور برآمدی اشیا کی مجموعی مالیت ایک کروڑ چالیس لاکھ طلائی فرانک)۔

۱۹۰۸ء کے فرضے اور ۱۹۰۶ء میں شہر الجزائر کی کانفرنس کے بعد، فرانسیسی سرکاری عہدے داروں نے الدارالبیضاء کے محصول خانے کو اپنی نگرانی میں لے لیا اور ایک فرانسیسی کمپنی نے بندرگاہ کی سہولتوں کو ترقی دینے کا بیڑا اٹھایا۔ ارد گرد کے دیہاتی علاقوں میں آباد شاویہ قبیلے کو ان واقعات سے خطرہ لاحق ہو گیا اور ۳ جولائی ۱۹۰۷ء کو انہوں نے شہر کی چار دیواری کے باہر ایک پتھر کی کلن میں چند یورپی کارکنوں پر حملہ کر کے انہیں مار ڈالا۔ ایک فرانسیسی جنگی جہاز کی مداخلت شہر کی لوٹ مار کا سبب بن گئی، جس میں یہودی محلے کو خاص کر بہت نقصان پہنچا۔ اس کے جواب میں فرانسیسیوں نے پانچ اگست کو بمباری کی اور دو دن بعد ایک

یورپی محلے پرانے مدینے کے ارد گرد، خصوصاً مشرق اور جنوب میں بنے ہیں اور مزید مسلم محلے ان کے آگے بھی تعمیر ہوئے ہیں۔ ان میں سے بڑے محلے کا علاقہ بہت وسیع ہے، جس میں دو لاکھ باشندے ہیں اور اسے نیا مدینہ کہتے ہیں۔ اس شہر کے مضافات میں جھوٹریوں پر مشتمل بستیوں کی جگہ، جہاں دیہاتی لوگ مزدوری کی تلاش میں جوق در جوق آتے تھے، اب جا بجا مزدوروں کے مکانات سے محلے بن گئے ہیں، مثلاً مشرق میں محمدیہ (سابقہ پتھر کی مرکزی کالیں)، جنوب میں سیدی عثمان (سابقہ پین مسیک) اور جنوب مغرب میں حسنیہ شہر، جو پہلے 'درب جدید' (= الدرب الجدید) تھا۔ صنعت کا اہم ترین مرکز رباط کو جانے والی سڑک کے ساتھ ساتھ شمال مشرق میں ہے۔ اس میں ملک کی بہت سی چھوٹی دستکاریوں کے مراکز ہیں اور یہ مراکش میں بہت ہی اہم صنعتی علاقہ ہے۔

مآخذ: احمد بن خالد الناصری النلاوی:

کتاب الاحتماء '4^e partie, Chronique de la dynastie alaouite du Maroc (۱۶۳۱ - ۱۸۹۳)' مترجمہ

'E. Fumey' در 'Archives Marocaines' پیرس ۱۹۰۶ - ۱۹۰۷

۱۹۰۷ء: ۱: ۲۳۲، ۲: ۲۵۹، ۳: ۱۵ تا ۲۰: M. Rey

'Souvenirs d'un voyage au Maroc' پیرس ۱۸۸۳ء

ص ۱۲ تا ۱۵: 'Ce que j'ai vu au Maroc' Georges Bourdon (۲)

'Les journées de Casablanca' پیرس ۱۹۰۸ء

'Villes et tribus du Maroc. Casablanca' (۴) ۱۹۰۸ء

'Mission scientifique au Maroc' ج ۱: Dr. F. Weisgerber

'Maroc' پیرس ۱۹۱۵ء: (۵)

'Casablanca et les Chaouiya en 1900' دارالبیضاء

'Les Conditions géographiques du développement de Casablanca' J. Célérier (۶) ۱۹۳۵ء

'Revue de Géogr. Maroc' مئی ۱۹۳۹ء: (۷) F. Joly

'Casablanca-Eléments pour une étude de géographie'

فرانسیسی بیڑے سے دو ہزار فوج جنرل درودے Drude کی سرکردگی میں ساحل پر اتاری گئی۔ سپین نے بھی حملہ آور فوج کا ایک دستہ بھیجا۔ فرانسیسی مہماتی فوج نے جنگجو قبائل کو پیچھے دھکیل کر بنو شاویہ کے سارے علاقے پر بتدریج قبضہ کر لیا۔ ان واقعات کا سلسلہ ۱۹۱۲ء میں فرانسیسی حکومت قائم ہو جانے پر ختم ہوا۔

پہلے ریڈیڈنٹ جنرل لیانتے Lyautey نے جب یہ فیصلہ کیا کہ اسے مراکش کی سب سے بڑی بندرگاہ بنایا جائے تو نتیجہً اس شہر کی بہت زیادہ توسیع کی گئی۔ اگر دارالبیضاء نے قبل ازیں زیادہ اقتصادی خوش حالی کا منہ نہ دیکھا ہوتا تو بلاشبہ فیصلہ بہت مختلف ہوتا۔ یہ خوش حالی کچھ تو اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ وہاں اچھی خاصی یورپی نوآبادی بن گئی تھی اور کچھ اس وجہ سے کہ مہماتی فوج کو سامان سپاہ کرتے رہنے کی ضرورت پڑی۔ جدید بندرگاہ کلیۃً انسانی ہاتھوں کی بنائی ہوئی ہے۔ اس میں ۴۸۷ میٹر گہرے پانی کے گھاٹ ہیں اور ۳۱۸۰ میٹر لمبا پشہ کھالے سمندر سے اس کی حفاظت کرتا ہے۔ ۱۹۵۶ء میں یہاں ۸۱۵ لاکھ ٹن سامان اتارا یا لادا جاتا تھا۔

۱۹۵۲ء کی مردم شماری کی رو سے اس کی آبادی چھ لاکھ آسی ہزار تھی (تقریباً ۱۹۰۷ء میں بیس ہزار)۔ ۱۹۲۰ء مسلم، ۷۳۷۸۳ یہودی (مراکش میں پوری یہودی آبادی کی ایک تہائی سے زیادہ) اور ۱۳۲۰۰ غیر ملکی (جن میں نو ہزار نوسو فرانسیسی تھے)۔

پرانہ شہر تین محلوں پر مشتمل تھا: مدینہ (متوسط طبقہ)، تنکر (مزدور پیشہ لوگ، یہ پورا نہیں بنا تھا) اور ملاح (یہودی)۔ موجودہ زمانے میں کل علاقہ، جس کی دیواریں جزوی طور پر اب تک صحیح سالم ہیں، پرانا مدینہ کہلاتا ہے اور مغرب اور جنوب مغرب میں یہ فصیل سے آگے تک پھیل گیا ہے۔ کل یہودی آبادی وہاں مسلمانوں کے ساتھ مل جل کر رہتی ہے۔

کے مترجموں سے کام لیا جاتا: (۱) دارالترجمہ کے تنخواہ دار ارکان، جن سے زیادہ تر فلسفہ، سیاسیات، تاریخ، معاشیات، قانون، ریاضی اور طب وغیرہ موضوعات کی کتابوں کے تراجم کرائے جاتے؛ (۲) بیرونی مترجمین، جو عموماً طبیعیات، کیمیا، نباتیات، حیوانیات، انجینیئری، وغیرہ موضوعات کی کتابوں کا ترجمہ کرتے تھے۔

ترجمے کے سلسلے میں مترجمین کو اصطلاحات کے کٹھن مرحلے سے بھی دو چار ہونا پڑا۔ مترجمین، انگریزی اصطلاحات، مجلس وضع اصطلاحات میں بھیج دیتے، جہاں مختلف علوم و فنون کے ماہرین کے علاوہ ایسے اصحاب بھی موجود ہوتے جو عربی و فارسی میں کامل دستگاہ اور اردو زبان کی ادبی و لسانی خصوصیات اور اس کے ذخیرۃ الفاظ سے پوری آگاہی رکھتے تھے۔ اصطلاح سازی کا مرحلہ بڑی رد و کد کے بعد طے ہوتا۔ اس مجلس میں جن ماہرین زبان کی خدمات سے فائدہ اٹھایا گیا ان میں نواب حیدر بار جنگ نظم طباطبائی، مولوی عبداللہ العمدادی، ڈاکٹر مولوی عبدالحق، مولوی عبدالباری ندوی، مرزا محمد ہادی رسوا، مولوی وحید الدین ملیم (مصنف وضع اصطلاحات علیہ)، چودھری برکت علی، سید شمس اللہ قادری اور ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے نام قابل ذکر ہیں۔ تکمیل ترجمہ کے بعد مسودے پر کسی ماہر فن سے نظر ثانی کرائی جاتی، [پھر مذہبی اور ادبی نقطۂ نظر سے اس کا جائزہ لیا جاتا] اور بالآخر کتاب دارالطبع، جامعۂ عثمانیہ، میں طباعت کے لیے بھیج دی جاتی۔ اس طرح دارالترجمہ نے ان تمام علوم و فنون سے متعلق بہت سی کتابیں اردو میں تالیف و ترجمہ کروا کے شائع کیں جن کی تعلیم جامعۂ عثمانیہ میں دی جاتی تھی۔

[۱۹۳۷ء تک ۲۱۹ کتابیں شائع ہو چکی تھیں،
۶۷ زیر طبع تھیں اور ۹۳ پر نظر ثانی ہو رہی تھی۔
ان کتابوں کی فہرست باعتبار مضمون درج ذیل ہے:
فلسفہ (مابعد الطبیعیات، نفسیات، منطق و

urbaine' في 'Cahiers d' Outre-Mer' أبريل - جون
 ١٩٣٨ : (٨) J. L. Miège و E. Hugues :
 Européens à Casablanca au XIX^{ème} siècle (1856-
 1906) أبريل ١٩٥٠ .

(A. ADAM)

۱۰ دارالترجمہ : [جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد (دکن)] کے تحت ایک شعبہ!؛ نظام حیدرآباد میر عثمان علی خاں نے اپنے فرمان (مؤرخہ ۲۲ ستمبر ۱۹۱۸ء) کے ذریعے جامعہ عثمانیہ کے قیام کی اجازت دیتے ہوئے اس کی خصوصیت یہ قرار دی کہ جملہ علوم کی تعلیم زبان اردو میں دی جائے گی اور اس کے ساتھ انگریزی زبان و ادب کی تعلیم لازمی ہوگی۔ [یہ برومفیر پاک و ہند کی پہلی اردو یونیورسٹی تھی، چنانچہ اردو میں مختلف مضامین کی کتابوں کا مناسب ذخیرہ فراہم کرنے کے لیے عظیم الشان پیمانے پر سر رشتہ تالیف و ترجمہ قائم ہوا۔ اگست ۱۹۱۹ء میں اردو کے پہلے کالج، کلیہ جامعہ عثمانیہ، کا افتتاح ہوا تو دارالترجمہ میں کام شروع ہو چکا تھا]۔

دارالترجمہ میں پہلے صرف مغربی زبانوں ہی کی کتابوں کے ترجمے کا انتظام کیا گیا۔ پھر ایجوکیشنل کانفرنس، حیدرآباد، کی تجویز پر علوم شرقیہ، علی الخصوص عربی و فارسی کتب کے ترجمے کی طرف بھی توجہ کی گئی۔ ہر رشتہ تالیف و ترجمہ کے پہلے ناظم مولوی عبدالحق مقرر ہوئے۔ حیدرآباد سے ان کے چلے جانے کے بعد یہ منصب مولوی عنایت اللہ دہلوی کے سپرد ہوا۔ [پھر یکے بعد دیگرے اس پر مولوی محمد الیاس برٹی، ڈاکٹر نظام الدین اور سسٹر ثوبا فائز ہوئے]۔

دارالترجمہ کا طریق کار یہ تھا کہ جامعہ عثمانیہ کی مختلف مجالس نصاب الہی اپنی ضرورت کی کتابوں کا انتخاب کرتیں اور مجالس اعلیٰ کی منظوری کے بعد انہیں دارالترجمہ کے سپرد کر دیا جاتا، جہاں دو طرح

مآخذ : (۱) محی الدین قادری زور : عہد عثمانی
میں اردو کی ترقی، مطبوعہ ۱۹۳۳ء : (۲) مہر حسن :
مغربی تصانیف کے اردو تراجم، ۱۹۳۹ء، ص ۱۰۰ بعد :
[(۳) سکسینہ : تاریخ ادب اردو (مترجمہ مرزا محمد
عسکری)، مطبوعہ نولکشور، بار دوم، حصہ نظم : ص ۳۹۳
(۴) نصیر الدین ہانسی : دکن میں اردو، لاہور، ۱۹۶۰ء
ص ۶۳۹ بعد : (۵) فرحت شاہجہانپوری : نظم طباطبائی
کے خود نوشت سوانح، در صحیفہ (لاہور)، اکتوبر ۱۹۶۶ء
ص ۳۸ (حاشیہ)]

(غلام حسین ذوالفقار [و ادارہ])

دارالجهاد : رگ بہ جہاد! دارالحرب۔

دارالحدیث : دارالحدیث کا اطلاق شروع

میں ان اداروں پر ہوا جو چھٹی صدی ہجری میں
حدیث شریف پڑھانے کے لیے مخصوص تھے۔ یہ نتیجہ
نکالنا درست نہیں کہ اس عہد تک علم حدیث صرف سفر
کے ذریعے حاصل کیا جاتا تھا (جیسے "طَبُّ الْعِلْمِ" کہتے
تھے) اس غلط فہمی کی بنا یہ بنائی جاتی ہے کہ علم حدیث
کے لیے خاص مدارس نہیں بنے تھے (قُبَّ گولڈ تسہیر
Muk. Stud. : Goldziher، ۲ : ۱۸۶) یہ ہمارے
مطالعے کے نتائج سے ہم آہنگ نہیں ہے جس کا اب
سواد میسر آیا ہے! لہذا حدیث سے متعلق دیگر امور کی
طرح اس بات کی بھی تحقیق ہونی چاہیے کہ "طلب
العلم" کے سفر کی نوعیت اور مقصد کے متعلق
جو غلط فہمی تھی، خود اس کے اثرات کیا ہوئے۔

(قُبَّ (۱) F. Sergin : Buhari'nin kaynaklari hak

kinda araştırmalar، ص ۲۳ تا ۳۶ : (۲) وہی مصنف :

Islam Tetkikleri Enst. dergisi، ۱۹۵۷ء، ۱/۲ : ۲۳)۔

الذہبی (۲-۳۸۷ھ/۱۳۸۷-۱۳۳۸ء) کے رسالہ

الامصار ذوات الآثار (مخطوطہ ولی الدین، ۶۶۳/۳،

ورق ۹۲ ب تا ۹۳ الف) میں تعلیم الحدیث کے مرکزوں

اور ساری اسلامی دنیا میں مختلف صدیوں میں ان کی

تقسیم کے متعلق مفصل اور جامع معلومات ملتی ہیں۔

اخلاقیات) - ۵۹ : جغرافیہ و تاریخ (تاریخ اسلام،
تاریخ ہند، تاریخ قدیم و تاریخ یورپ، وغیرہ) - ۱۰۸ :
عمرانیات، سیاسیات و معاشیات - ۲۹ : قانون و دستور -
۲۳ : ریاضی و سائنس (طبیعیات، کیمیا، حیاتیات) - ۷۳ :
طب - ۳ اور انجینئری - ۲۷۔

دارالترجمہ کے قیام سے پہلے ترجمہ کرنے کے

سلسلے میں جو کوششیں ہوئیں (مثلاً فورڈ ولیم کالج
کلکتہ اور سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ میں) وہ بہت
چھوٹے پیمانے پر تھیں اور ان سے مقصود محض
اردو دانوں کو جدید مغربی علوم سے روشناس کرانا تھا۔

نواب شمس الاسراء اور ارباب دہلی کالج نے بھی
نصابی اغراض سے ترجمے کرائے تھے، اسکی اعلیٰ درجے
کی تصانیف کی طرف توجہ نہیں کی۔ دارالترجمہ کا قیام
ایک یونیورسٹی کی نصابی اور علمی ضرورتوں کو پورا
کرنے کے لیے عمل میں لایا گیا تھا اور اسے نظام کی
ذاتی سرپرستی اور ہر طرح کے مواقع و وسائل حاصل
تھے؛ چنانچہ اردو کو علمی زبان بنانے کی یہ پہلی
باخدا طے اجتماعی کوشش بڑی حد تک کامیاب رہی۔

اگرچہ اس کی ان مطبوعات میں جو مغربی زبانوں سے
ترجمہ کی گئی ہیں، الفاظ اور اصطلاحات کے علاوہ
اسلوب بیان کی اجنبیت بھی باقی جاتی ہے، تاہم ان سے
اردو میں غیر معمولی وسعت پیدا ہو گئی؛ اس کے ذخیرہ
الفاظ میں روز بروز اضافہ ہونے لگا؛ ایسے الفاظ رائج کیے
گئے جن کے مشتقات آسانی سے بن سکتے ہیں اور جو
دوسرے الفاظ کے ساتھ ملائے جا سکتے ہیں؛ جدید اور

قدیم علمی و فنی الفاظ و اصطلاحات کا مفہوم معین ہوا
اور اردو زبان میں، جس کا ادب اس سے قبل زیادہ تر
شاعری، قصص و افسانہ اور تذکرہ نگاری تک محدود
تھا، جدید علوم و فنون کا مہقول ذخیرہ منتقل ہو گیا۔

۱۹۴۹ء میں سقوط حیدرآباد کے بعد جامعہ عثمانیہ

میں اگرچہ اردو زبان لازمی ذریعہ تعلیم نہیں رہی، تاہم

دارالترجمہ میں آج بھی کام جاری ہے۔

الاصفہانی (م ۳۱۸/۴۱۰۷۷) کے لیے مدارس الحدیث بنوائے گئے تھے (قَب Wistenfeld : Imam Schafi'i ، ۱۵۶: ۲۵۹۲۹: ۳: ۲۸۸)۔ قاہرہ کے دارالعلم میں، جس کی بنیاد العاکم بامر اللہ نے رکھی تھی (۴۱۰۰۹/۴۱۰۰۰) دو مالکی استادوں نے فقہ اور حدیث کے ماہروں کو اپنے گرد جمع کر لیا تھا (الذہبی: دُول الاسلام، مطبوعہ حیدرآباد، ۱: ۱۸۹)۔ پہلا ادارہ جو خاص طور پر دارالحدیث کہلایا، اس کی بنیاد اثابک نورالدین (م ۵۶۹/۱۱۷۳-۱۱۷۳/۴۱۱۷۳) نے رکھی تھی (النعمی: المدارس فی تاریخ المدارس، دمشق ۱۹۳۸ء، ۱: ۹۹؛ قَب Muh. Stud. ۲: ۱۸۷)۔ نورالدین بذات خود حنفی تھا، لیکن اس نے اس مدرسے کو شافعیوں کے لیے مخصوص کر دیا (Wostenfeld : Die Akademien der Araber und ihre Lehrer، ص ۶۹) اور مؤرخ و محدث عبداللہ بن عساکر (م ۵۷۱/۱۱۷۵-۱۱۷۶ء) کو اس کا صدر مقرر کیا (النعمی: کتاب مذکور، ۱: ۱۰۰)۔ اس ادارے اور اس کے متعلقہ اشخاص کے لیے بہت سے اوقاف تھے (ابو شامہ: الروضتین، قاہرہ ۱۹۵۶ء، ۱: ۲۳)۔ ابن عساکر کا جانشین اس کا بیٹا القاسم (م ۶۰۰/۱۲۰۳-۱۲۰۳/۴۱۲۰۳) ہوا (النعمی: کتاب مذکور، ۱: ۱۰۰)۔ النعمی اس مدرسۃ الحدیث کے قاضیوں کے نام ابن رافع (م ۷۱۸/۱۳۱۸ء) تک دیتا ہے۔ اس پہلے دارالحدیث کے کھل جانے کے بعد اسی قسم کے متعدد اور ادارے قائم ہو گئے، جن کے ساتھ سربراہان و مؤرخین اور محدثین وابستہ تھے۔ پہلے پہل یہ زیادہ تر دمشق اور اس کے نواح میں (النعمی نے ان میں سے مولہ کے نام قلم بند کیے ہیں) کھلے، لیکن پھر ایسے ادارے بہت جلد تمام اسلامی دنیا میں پھیل گئے؛ چنانچہ عبداللطیف البغدادی (م ۶۲۹/۱۲۳۱-۱۲۳۲ء) نے ۵۸۵/۱۱۸۹ء میں موصل جاتے ہوئے اسی قسم کا دارالحدیث ابن مہاجر کے مدرسے کی زیریں منزل میں دیکھا

علم الحدیث سے شغف اور اس کا مطالعہ، وقفے کے بغیر صدیوں تک شام میں جاری رہا، جہاں سب سے پہلے دارالحدیث کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ بیت المقدس بھی (۹۰ سال کے وقفے کے ساتھ) علم حدیث کا مرکز رہا ہے (کتاب مذکور، ۹۳ ب)۔

جب تک حدیث کی تعلیم کے لیے خاص ادارے قائم نہیں ہوئے تھے، دوسرے مذہبی علوم کی طرح اس کی تعلیم بھی مسجِدوں میں ہوا کرتی تھی۔ محدثین چونکہ اس بات کو پسند نہ کرتے تھے کہ ایسی تعلیم محدودے چند اشخاص کو صرف ذاتی مکانات میں دی جائے، لہذا وہ مساجد سے کام لینے کو ترجیح دیتے تھے۔ (قَب، مثلاً الخطیب: تاریخ بغداد؛ ۲: ۳۳)۔ [امام مالک^۲ (م ۱۷۹/۷۹۵ء) مسجد نبوی میں درس حدیث دیا کرتے تھے اور سیکڑوں تلامذہ ان سے فیض یاب ہوتے تھے۔ امام بخاری^۳ (م ۲۵۶/۲۵۷ء) توجوانی کے عالم میں تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی کے اوائل میں بصرے آئے اور وہاں ایک مسجد میں حدیث کا درس دینا شروع کیا، جس میں ہزاروں طلبہ شریک ہوتے تھے (کتاب مذکور، ۲: ۱۶ تا ۱۷)۔ قاہرہ میں امام شافعی^۴ کا ایک شاگرد تیسری صدی ہجری میں مسجد ابن طولون میں حدیث کا درس دیا کرتا تھا (حسن المحاضرہ، قاہرہ ۱۲۹۹ء، ۱: ۱۸۲)۔ جب بعد میں ایسے اداروں کی بنیاد پڑ گئی جنہیں دارالعلم یا مدرسہ کہتے تھے تو لوگ مسجدوں اور استادوں کے ذاتی مکانات کے بجائے اس طرف کھینچنے لگے، تاہم خاص حدیث کی تعلیم کے مدارس چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی اور اس کے بعد سے کھلنے شروع ہوئے؛ چنانچہ مدرسۃ الحدیث میں، جو ابو علی الحسین (م ۶۲۳/۱۰۰۳ء) کے لیے لیشاپور میں قائم ہوا تھا، تقریباً ایک ہزار طلبہ تھے اور ابن القورک (م ۶۰۶/۱۰۱۵-۱۰۱۶ء)، ابو القاسم القشیری (م ۶۵۵/۱۰۷۲-۱۰۷۳ء) اور رکن الدین

سرزمین جنگ۔ فقہائے اسلام کی علمی اصطلاح میں دارالہرب سے مراد دشمنان اسلام کا وہ علاقہ یا ملک ہے جس کے باشندے دعوت اسلام کو مسترد کر کے اسلام [اور مسلمانوں] کے خلاف سرکشی اور عداوت کا اظہار کریں اور جہاں اہل اسلام اور اہل ذمہ کی عبادت گاہیں محفوظ نہ ہوں۔ اسی طرح دارالاسلام کا کوئی علاقہ دوبارہ کفار کے قبضے میں چلا جائے تو وہ بھی دارالہرب بن جاتا ہے، بشرطیکہ وہاں اسلامی شریعت کے بجائے کافرانہ قانون نافذ ہو جائیں اور وہ علاقہ دارالہرب کے متصل واقع ہو اور وہاں اہل اسلام اور ان کے اہل ذمہ کا جان و مال اور دین محفوظ نہ ہو۔ بعض علما تو اسلام کی عملداری سے نکل جانے والے علاقہ کو اس وقت تک دارالہرب کہتے ہیں جب تک اس میں اسلام کا ایک حکم بھی نہ رہے (تھانوی: کشف اصطلاحات الفنون، ۱: ۶۶۶، کتاب اہل الذمہ، ۲: ۵۱۷، بعد: کتاب الآم، ۱: ۱۰۰، بعد: [مگر اس سے یہ دارالاسلام نہیں بن جاتا]۔ دارالاسلام کی حقیقی روح چونکہ امن و سلامتی ہے اس لیے دنیا کو اسلام کے دامن میں پناہ لینے کی دعوت دینی ہے۔ یہ دعوت دو طریقے سے قبول کی جاسکتی ہے: حلقہ بگوش اسلام ہو کر، یا اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے تابع مسلمانوں کے ساتھ مشترک شہریت، است قبول کر کے (یعنی اہل الذمہ بن کر)؛ لیکن اگر شرک کی جس سرزمین سے اس دعوت حق کے خلاف عناد کا اظہار ہو جائے اور وہاں کے لوگ سرکشی و فساد پر اتر آئیں تو ان کے خلاف طاقت کا استعمال واجب ہو جاتا ہے۔ یہیں سے جہاد کی فرضیت کا سر حقیقی عیان ہوتا ہے اور شرک و عناد کی سرزمین دارالہرب قرار پاتی ہے (اسلام کا نظریہ جہاد، ص ۹۰، بعد: اسلام کا نظام امن، ص ۱۵۲)؛ کفار کی سرزمین اس وقت تک دارالہرب نہیں بنتی جب تک اس کے لوگ دعوت اسلام کو مسترد کر کے دارالاسلام

(ابن ابی اصیبعہ، ۲: ۲۰۳)۔ ۵۹۲۲/۱۲۲۵ء میں الملک الکامل ناصرالدین نے دارالحدیث النوریہ کے انداز پر قاہرہ میں ایک دارالحدیث کی تاسیس کی، اور ابوالخطاب بن دحیہ کو اس کا صدر مقرر کیا۔ المقریزی لکھتا ہے کہ ۵۸۰۶/۱۱۸۰ء-۱۱۸۰ء میں یہ اس قدر انحطاط پذیر ہو گیا تھا کہ اس کا صدر محض ایک جاہل نوجوان بلکہ لڑکا تھا (الخطط، قاہرہ، ۱۲۷۰ء: ۲: ۳۵۷)۔ ابن دقماق (م ۵۸۴۵/۱۱۸۱ء تا ۱۱۸۴ء) کے وقت میں قاہرہ کے تہتر مدارس میں سے دو دارالحدیث تھے (انتصار، قاہرہ ۱۲۹۹ء، ص ۹۹)۔ اولین دارالحدیث کے قیام کے بعد قرآن مجید اور حدیث شریف دونوں کے پڑھانے کے لیے دارالقرآن والحدیث کے نام سے ادارے معرض ظہور میں آئے۔ اس قسم کی درس گاہ کا نمونہ سب سے پہلے سیف الدین الملک الناصر (م ۵۷۴۱/۱۱۸۰ء-۱۱۸۱ء) نے قائم کیا (اس کے ابسے ہی دو اور مدرسوں کے لیے دیکھئے النعمی: کتاب مذکور، ۱: ۱۲۳ تا ۱۲۸)۔

دارالحدیث ایک آزاد ادارے کی حیثیت رکھتا تھا۔ مدرسے کے بہت سے شعبوں میں سے ایک شعبہ کی حیثیت سے اسلامی دنیا میں حالیہ زمانے تک موجود رہا؛ چنانچہ بقول مجیرالدین (م ۵۹۲۷/۱۱۹۱ء) بیت المقدس کے جالیس سے زائد مدارس میں سے ایک کو دارالقرآن اور دوسرے کو دارالحدیث کہتے تھے (Hist. de Jérus. et Hebr.: Sauvage، ص ۳۹)۔ عثمانی ترکوں کے عہد میں مسجد سلیمانہ کے بالمقابل جو دارالحدیث تھا، اس کے لیے اساتذہ کا انتخاب بڑے بڑے اور مشہور اساتذہ میں سے ہوتا تھا۔ تاریخ جودت، بار اول، ۱۳۰۹ھ (۱۹۱۱ء)۔ گزشتہ دو تین صدیوں میں دیگر مدارس کی طرح دارالحدیث بھی علمی مراکز کی حیثیت سے اپنی اہمیت کھو بیٹھے ہیں۔

(FUAT SEGIN)

* دارالہرب: لفظی معنی لڑائی کی جگہ یا

بلاد اہل الحرب پر اگر لشکر اسلام بوزور شمشیر قبضہ کر لے تو ان پر جزیہ عائد کیا جائے گا، وہ اہل الذمہ یا ذمی کی حیثیت سے دارالاسلام کے شہری قرار پائیں گے۔ اگر مغلوب ہونے سے قبل ہی اہل الحرب صلح کی پیش کش کر دیں تو صلح واجب ہو جائے گی اور صلح کی جو شرائط بھی طے پالیں گی، ان پر عمل واجب ہوگا۔ امام شافعیؒ کے نزدیک اہل حرب مال کی جس مقدار پر صلح کریں وہ جزیہ کی مقدار سے کم نہیں ہونی چاہیے (کتاب الام، ۱: ۱۸۱ تا ۱۸۲، المبسوط، ۱: ۷۲، بعد)۔ اہل ذمہ میں سے کوئی شخص بھاگ کر دارالحرب میں چلا جائے تو وہ بھی حربی قرار پائے گا اور اس پر اہل الحرب کے قوانین کا اطلاق ہوگا، مثلاً جان و مال کی حفاظت کے حق سے محرومی، گرفتاری کی صورت میں قتل یا غلامی کی سزا دی جا سکے گی (المغنی، ۹: ۳۵۵)۔ اگر دارالحرب کا کوئی باشندہ مسلمان ہو جائے تو دارالحرب کے فتح ہونے پر اس کی جائداد مال غنیمت میں شامل نہیں ہوگی، بلکہ اس کی ملکیت میں رہے گی (المغنی، ۹: ۳۵۷، شرح السیر الکبیر، ۲: ۹۶، بعد)۔ اگر کوئی مسلمان انسان کی صورت میں دارالحرب میں داخل ہو تو وہاں کسی کافر کا خون بہانا، مال لوٹنا یا کسی عورت سے تعرض کرنا حرام ہے (الدر المختار، ۲: ۲۷۳، شرح السیر الکبیر، ۲: ۱۰۲)۔ دارالحرب کے کسی باشندے کو عموماً تین ماہ سے زائد دارالاسلام میں قیام کی اجازت نہیں دی جائے گی کیونکہ جاسوسی وغیرہ سے دارالاسلام کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے اگر وہ اس سے زائد عرصہ دارالاسلام میں قیام کرنا چاہے تو ذمی کی حیثیت سے رہے گا اور جزیہ ادا کرے گا (حوالہ سابق)۔ دارالحرب کے خلاف میدان قتل میں مسلمان پر شرعی حد قائم نہیں کی جا سکتی (المغنی، ۹: ۳۶۸)۔

مأخذ: (۱) ابن قدامہ: المغنی، قاہرہ، بلا تاریخ؛ (۲) مفتی علاء الدین: الدر المختار، لکھنؤ ۱۹۸۲ء؛ (۳)

کے خلاف برسر پیکار نہ ہو جائیں، امام ابن قیمؒ نے لکھا ہے کہ دارالحرب پر بلاوجہ حملہ جائز نہیں، پہلے دعوت اسلام واجب ہے اور مسترد ہو جانے پر جہاد فرض ہوگا، لیکن اگر دارالحرب دارالاسلام پر حملہ آور ہو تو اس وقت دعوت اسلام کی شرط کے بغیر ہی جہاد فرض ہو جاتا ہے (احکام اہل الذمہ، ۱: ۵)۔ کفار کی سرزمین جب دارالحرب قرار پا جائے تو اس کے باشندے حربی یا اہل الحرب کہلائیں گے (شرح السیر الکبیر، ۱: ۱۵۲، بعد؛ المبسوط، ۱: ۳۴، بعد)۔ دارالاسلام کے امام وقت کے فرائض میں سے ایک، دعوت و تبلیغ اسلام کا انتظام بھی ہے۔ وہ غلبہ اسلام کے لیے یا تو خود جہاد پر نکلے یا اپنے نائب کی سرکردگی میں لشکر اسلام روانہ کرے۔ دارالحرب میں مسلمانوں پر ظلم ہو یا مشرکین دارالحرب حملہ آور ہوں تو جہاد بالسیف فرض ہے۔ اگر کوئی ایسی صورت ہو کہ مشرکین فتنے کا باعث بن سکتے ہوں تو ان کی سرکوبی کے لیے جارحانہ حملہ بھی ضروری ہے (المبسوط، ۱: ۲ تا ۴)۔ اس سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کا حکم ہے۔ آپؐ کو پہلے حکمت و موعظت کے ساتھ دعوت اسلام، احسن طریق سے دلائل پیش کر کے صداقت اسلام بنوانے کا حکم ہوا (۱۶ [النحل] ۱۲۵)، پھر ظالموں کے خلاف جہاد کا حکم ہوا (۲۲ [الحج] ۳۹)۔ دارالاسلام مدینہ منورہ میں اسلامی حکومت کے قیام کے بعد آپؐ نے قرب و جوار کے لوگوں کے علاوہ اس وقت کے بادشاہوں کو بھی قبول اسلام کی دعوت دی اور ان میں سے جس جس نے دعوت اسلام کو مسترد کیا اور سرکشی کی اس کا علاقہ یا ملک دارالحرب اور وہاں کا حکمران طاغی یعنی سرکش قرار پایا اور ان کے خلاف جہاد کا حکم ہوا (سیرۃ ابن ہشام، ۲: ۳۷۳)۔ ابن کثیر: السیرۃ النبویۃ، ۳: ۳۹۴، صبح الاعشی، ۱: ۱۵۶، بعد؛ البخاری، ۹: ۸ تا ۹)۔

تھانوی : کشف اصطلاحات الفنون، کلکتہ ۱۸۶۲ء : (۴)
 امام شافعی : کتاب الأم، قاہرہ ۱۹۶۱ء : (۵) ابن التیم :
 احکام اہل الفس، دمشق ۱۹۶۱ء : (۶) السرخسی : المبسوط،
 قاہرہ ۱۹۳۳ء : (۷) وہی مصنف : شرح السیر الکبیر،
 حیدرآباد دکن ۱۹۳۵ء : (۸) ابن ہشام : السیر النبویہ،
 قاہرہ ۱۹۳۳ء : (۹) محمد ظفر الدین : اسلام کا نظام امن،
 اعظم گڑھ ۱۹۶۶ء : (۱۰) حیدر زمان صدیقی : اسلام کا
 نظریہ جہاد، لاہور ۱۹۳۹ء

(ظہور احمد اظہر)

* دارالحکمتہ : عام طور پر علمی اداروں کے
 لیے استعمال ہوتا ہے، بالخصوص امن ادارے کے لیے
 جس کی بنیاد فاطمی خلیفہ الحاکم نے ۵۳۹ھ/۱۱۰۵ء
 میں قاہرہ میں رکھی تھی۔ المامون کے "بیت الحکمتہ"
 [رک بان] کے بعد عراق و ایران میں متعدد کتاب خانے
 قائم کیے گئے جو نہ صرف علم حدیث کے متعلق
 معلومات بہم پہنچاتے تھے بلکہ "علوم الاوائل"
 یعنی قدیم علوم کا بھی تعارف کراتے تھے [رک بہ
 دارالعلم]۔

ایسے ادارے فاطمیوں کے تحت مصر میں بڑے
 کامیاب ہوئے جہاں شیعہ عقائد نے یونانی علوم کی ترقی
 کے لیے سازگار ماحول مہیا کر دیا۔ قاہرہ کے محل میں
 جلد ہی ایک ذخیرہ کتب جمع ہو گیا جس کا ایک
 مستحکم مصنف الشاہبستی (م ۵۳۸۸/۹۹۸ء) تھا۔ العزیز
 کا وزیر یعقوب بن قیس (م ۵۳۸۰/۹۹۰ء) اپنے گھر میں
 ادباء فقہاء اور علمائے دین کے باقاعدہ جلسے کراتا اور
 انہیں مالی وظائف دیا کرتا تھا، لیکن اس کی یہ جدت
 جلد ہی "دارالحکمتہ" (= "دارالعلم") کے سامنے ماند
 پڑ گئی، جسے الحاکم نے مغربی محل کے شمال مغربی
 حصے میں جگہ دی۔ اس میں ایک کتاب خانہ
 اور دارالمطالعہ تھا اور یہ محدثین، فقہاء، نحویوں،
 عالموں، ہیئت دانوں، منطقوں اور ریاضی دانوں کے
 مل بیٹھنے کی جگہ کا کام دیتا تھا۔ قاہرہ کے دارالحکمتہ

کا انتظام "داعی الدعاء" کے ہاتھوں میں تھا جو اہل علم
 کو ہفتے میں دو بار وہاں جمع ہونے کی دعوت دیا
 کرتا تھا۔ اسمعیلی عقائد کی تبلیغ و تعلیم کا کام
 داعی الدعاء کے سپرد تھا، جو المعز کے عہد سے
 "حکمتہ" بھی کہلانے لگے تھے (دیکھیے القاضی النعمان :
 کتاب المجالس، حسب بیان Dachraoui در Arabica،
 ۱۹۶۰ء)۔ ۵۳۳۵ھ/ [بہ تصحیح] ۱۰۴۳ء میں ایک
 نئی فہرست کتب مرتب کی گئی۔ اس میں کم از کم
 ۶۵۰۰ جنبدیں علم نجوم، فن تعمیر اور فلسفے پر تھیں۔
 یہ ادارہ وزیر الافضل نے پانچویں صدی ہجری/گیارہویں
 صدی عیسوی کے اواخر میں بند کر دیا تھا، لیکن
 وزیر ابن المامون نے ۵۱۷ھ/۱۱۲۳ء میں اسے ایک
 دوسری عمارت میں پھر سے کھلوا دیا جو مشرقی محل کے
 جنوب میں تھی۔ اسے المستنصر کے عہد حکومت میں
 خانہ جنگیوں کے دوران میں لوٹ لیا گیا تھا اور جب
 فاطمی خاندان کا خاتمہ ہو گیا (۵۶۷ھ/۱۱۷۱ء) تو
 کتاب خانے کو ایک دفعہ پھر بند کر دیا گیا۔
 انقلاب زمانہ سے جب اس محل کے خزانے فروخت
 ہوئے تو یہ کتابیں القاضی الفاضل ایسے علم دوست اور
 روشن خیال لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ گئیں۔

مآخذ : (۱) المقریزی : الخطط (مطبوعہ بولاق)
 ۱۰۸ : ۳۰۹ تا ۳۳۵، ۳۵۸ تا ۳۶۰ و ۳۶۱ : ۳۶۳
 ۳۸۱ : (مطبوعہ قاہرہ) ۲ : ۲۵۳ تا ۲۵۵، ۳۱۳ : ۳۲۳ تا
 ۳۲۷ و ۳۳۷ : ۱۵۸، ۱۹۲ : ۳۷۷ : (۲) الکنلی : ص ۶۰۰
 ۶۰۰ : (۳) القنطلی : ص ۴۰۰ : (۴) ابن خلکان : (مطبوعہ
 قاہرہ) ۱۹۸۹ء : ۲۸ : ۲۸ : (۵) Le biblioteche : O. Pinto
 degli Arabi : فلورنس ۱۹۲۸ء : ص ۱۶، ۲۵، ۲۶ : (۶)
 Renaissance : Mez : ص ۱۶۹ تا ۱۷۰ : (۷) M. Canard :
 Le cérémonial fatimite در Byzantion : ص ۲۱

(۱۹۵۱ء) : ص ۳۶۷

(D. Sourdel)

دارالسلام : "اس کی جگہ" : اولاً قرآن

اور تمام صومالی مسلمان ہیں۔ (بہ ۶ درجے ۹۴ نانے عرض بلد جنوب اور ۳۹ درجے ۶ نانے طول بلد مشرق واقع ہے)۔

دارالسلام جو شروع میں اگرچہ شاندار سگر خاموش سا دارالحکومت تھا، اب ایک یاروقی تجارتی بندرگاہ ہے۔ ایک ریلوے لائن، جو تابورہ Tabora کے مقام پر دو شاخوں میں منقسم ہو جاتی ہے، اسے جھیل ٹانگانیکا اور جھیل وکٹوریہ سے ملاتی ہے۔ علاوہ ازیں ملک کے تمام حصوں میں سڑکیں جاتی ہیں جن میں سے بعض پکی ہیں۔ سرکاری عمارات کی تعمیر نو جاری ہے۔ اکثر و بیشتر عمارات جدید طرز کی ہیں اور اگرچہ افریقی آبادی کا اپنا روایتی طرز برقرار ہے تاہم مجموعی لحاظ سے یہ شہر مغربی نظر آتا ہے۔

بقیہ ساحلی علاقے اور اندرون ملک کے بہت سے شہروں کی طرح اکثریت کا مذہب اسلام ہے۔ "سواحلی" میں، جو Bantu زبان ہے، پچیس فی صد (سے زیادہ) عربی کے الفاظ ہیں۔ یہ ساحلی زبان ہے۔ Mogadishu کے قریب سے Rovuma اور دور دور تک اندرونی علاقے میں یلجمی کانگو کے اندر بھی مشترکہ زبان کا کام دیتی ہے۔ معدودے چند احمدیوں کے سوا، جنہوں نے قرآن حکیم کا "سواحلی زبان میں ترجمہ شائع کیا ہے، مشرق افریقہ کے مسلمان شافعی المذہب ہیں۔ ان کے لیے شرعی ایصلے دارالسلام میں ایک "Liwali" کے ذریعے ہوتے ہیں جن کی اپیل دیوانی عدالتوں میں ہو سکتی ہے۔ پہلی صدی میلادی سے بھی پہلے عربوں کی نقل مکانی یہاں کے ساحل پر برابر ہوتی رہی ہے اور اسلام شاید ساتویں صدی میں یہاں پہنچ گیا تھا۔ جب ابن بطوطہ نے ۷۳۱ھ/۱۳۳۱ء میں ساحلی علاقے کی سیاحت کی تھی تو وہاں شافعی مذہب کے لوگ پہلے سے موجود تھے۔ موجودہ عربوں میں سے بیشتر شجر سے آئے ہوئے ہیں، لیکن بعض کی آمد حضرموت اور سقط کے دیگر حصوں سے ہوئی ہے اور یہ [خوارج]

حکیم (۶ [الانعام]: ۱۲۷، ۱۰ [یونس]: ۲۵) میں اسے جنت کے لیے استعمال کیا گیا ہے، کیونکہ بقول امام البیضاوی وہ زوال سے محفوظ ("سلامہ") سلامتی کی جگہ ہے یا اس لیے کہ لوگ اس میں داخل ہوتے ہیں تو خدا اور ملائکہ ان پر سلام بھیجتے ہیں ("سالم")۔ اس لیے المنصور نے شہر بغداد کو یہ نام نیز مدینۃ السلام کا نام دیا [قب بغداد نیز یاقوت: معجم البلدان، شروع میں]۔ ٹانگانیکا کے دارالحکومت کے لیے [رک بہ دارالسلام]۔

(T.H. WEIR)

دارالسلام: مزیزیمہ (Mzizima) ("سواحلی" زبان میں صحت افزا اور خوشگوار شہر) سب سے پہلے سترھویں صدی عیسوی میں ویرہ Wabarawa نے آباد کیا، جو Mogadishu کے جنوب میں Barawa کی عرب سواحلی نسل سے تھا۔ موجودہ نام جو بندر السلام (سلامتی کی لنگر گاہ) کا معنی ہے، اس کی ابتدا کم از کم ۱۸۶۲ء سے ہوئی ہے، جب زنجبار کے سلطان سید سعید نے وہاں ایک محل اور دیگر عمارتیں تعمیر کرائیں، جن میں سے چند ایک باقی رہ گئی ہیں۔ اس کی بڑی گلی، "برہ رستہ" (اردو "بڑا راستہ") کی بھی، جو اب "Acacia Avenue" (خیابان ببول) ہو گیا ہے، یہی تاریخ ہے۔ اس کی حالیہ خوشحالی کا آغاز ۱۸۸۸ء سے ہوتا ہے جب یہ جرمن ایسٹ افریقہ کمپنی کا ایک سٹیشن اور ۱۸۹۱ء میں جرمن شاہی حکومت (Imperial Government) کا دارالحکومت بن گیا۔ ۱۹۱۶ء میں پہلی عالمگیر جنگ کے دوران میں اس پر برطانوی فوج کا قبضہ ہو گیا۔ ۱۹۵۷ء میں اس کی آبادی، ۹۳۶۳۳ افریقیوں، ۲۵۸۵ عربوں، ۴۷۹۴ یورپیوں، ۲۸۶۰ گواڈینیوں، ۲۳۶۳ ہندوستانیوں، ۱۷۱۸ پاکستانیوں، ۱۱ صومالیوں اور ۹۰۳ دوسرے لوگوں پر مشتمل تھی۔ غالباً تقریباً ۸۵۰۰۰ افریقی، ۱۲۵۰۰ ہندوستانی اور پاکستانی، نیز عربوں کی اکثریت

نا اسیا بھی ہو سکتا ہے کہ کچھ شرطیں ملوئیں یعنی امام وقت یا اس کے نائبین کے ذمے بھی ہوں اور اہل دارالصلح کے ذمے بھی ہوں، مثلاً اہل دارالصلح بعض مالی ذمے دار ہیں اور پابندیاں قبول کر لیں اور امام وقت بعض صورتوں میں ان کی حفاظت اور معاونت کی ذمے داری قبول کر لے (کتاب الام، ص: ۱۸۱) الاحکام السلطانیۃ، ص ۳۳ بعد: فتوح البلدان، ص: ۱۰۴، ۳۳)۔ جب تک دارالصلح کے باشندے مقررہ شرائط کی پابندی کرتے رہیں اس وقت تک ان سے کسی قسم کا تعرض جائز نہیں، لیکن جب وہ کسی شرط کی خلاف ورزی کریں یا دارالاسلام کے خلاف دارالحرب [رک باں] سے تعاون کریں تو اس وقت ان کا ملک دارالصلح نہیں رہے گا، بلکہ دارالحرب بن جائے گا اور ان سے کیا ہوا معاہدہ صلح ختم ہو جائے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ [رک باں] کے موقع پر اہل مکہ اور ان کے حلیف قبائل سے بعض شرائط پر صلح کی تھی اور اس وقت تک اس کی پابندی فرمانی جب تک کفار مکہ یا ان کے حلیفوں کی طرف سے شرائط صلح کی عاقبت خلاف ورزی نہ ہوئی! اسی طرح مدینے کے قرب و جوار کی یہودی آبادیوں سے بھی بعض شرائط پر صلح طے کی تھی اور انہی طرف سے ان کی پوری پوری پابندی فرمانی تا آنکہ خود قبائل یہود نے صلح کی خلاف ورزی شروع کر دی تھیں، جس کے بعد ان سے کیے ہوئے صلح کے معاہدے ختم ہو گئے (فتوح البلدان، ص: ۳۳، ۳۴: سیرۃ ابن ہشام، ص: ۲۵۵)، [نیز رک بہ البراءۃ (سورہ)]۔

صلح حدیبیہ کے علاوہ دارالصلح کی کئی ایک تاریخی مثالیں ملتی ہیں، پہلی مثال خود عہد رسالت م کی ہے۔ خیر سے واپسی پر آپ م نے حضرت مخبصہ بن مسعود انصاری رضی اللہ عنہ کو اہل فدک کے پاس دعوت اسلام کے لیے بھیجا، مگر اہل فدک نے یوشع بن نون یہودی کی قیادت میں اپنی اراضی اور کھجوروں

انصافی ہیں۔ چند ایک جزائر کمورو Comoros سے ہیں۔ دارالسلام کے سب سے دولت مند باشندے ہندوستانی اور پاکستانی ہیں جن میں سے غالباً نصف مسلمان ہیں۔ خوارج (نزاری شاخ کے اسماعیلی) بھاری اکثریت میں ہیں اور ان کے امام آغا خاں چہارم کی وہاں ۱۹۵۷ء میں بڑی شان و شوکت سے مسند نشینی ہوئی تھی۔ دوسرے شیعہ اثنا عشری اور بوہرے ہیں۔ سیمون کی ایک مختصر سی جماعت اور پاکستانی سنی بھی ہیں۔ مسجدين بکثرت ہیں۔ افریقی مسلمان کوئی تیس کے قریب قرآنی مدرسے چلا رہے ہیں۔ آغا خاں کے پیرو اپنے غیر مذہبی مدارس جن میں ایک ثانوی درجے کا ہے اور کچھ خیراتی ادارے چلا رہے ہیں۔ انفرادی تعلیم کے علاوہ وہاں اعلیٰ پیمانے کی اسلامی مذہبی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہے۔

مآخذ: (۱) C. H. Becker، در وو لائنڈن

بار اول: (۲) Materialien zur Kenntnis des Islam

in Deutsch Ost-Afrika Ist. ۱: ۲، بعد: (۳)

Prosa und Poesie der Suaheli: C. Velton، بولن

Words of oriental origin: B. Krum، (۴) ۱۹۰۷ء

Dor-es-: E. C. Baker (۵) ۱۹۳۰ء، in Swahili

Tanganyika Notes and در Salaam 1860 to 1940

Records، عدد ۲، ۱۹۳۵ء: (۶) ۱۹۵۷ء کی مردم شماری

کی روداد، سرکاری مطبع دارالسلام

(G.S.P. FREEMAN-GRENVILLE)

دارالشفاء: رک بہ بیمارستان

دارالصلح: یعنی صلح کا علاقہ یا سرزمین؛

فتحاے اسلام کی علمی اصطلاح میں، دارالصلح سے مراد وہ علاقے یا ممالک ہیں جن کے باشندے دارالاسلام [رک باں] کے امام وقت یا اس کے نائب کے ساتھ بعض شرائط پر صلح کر لیں۔ یہ شرائط ایسی بھی ہو سکتی ہیں جو یک طرفہ ہوں، مثلاً دارالصلح کے باشندے اپنے اوپر بعض مالی ذمے دار ہیں یا پابندیاں قبول کر لیں

تو ہر وہ زمین ہے جس کے باشندے دارالاسلام سے کوئی باہمی معاہدہ کر لیں، لیکن دارالصلح وہ زمین ہے جس پر لشکر اسلام حملہ آور ہو اور مغلوب ہونے سے قبل ہی وہاں کے باشندے بعض شرائط پر صلح کر لیں (کتاب الام، ۳: ۱۸۱ تا ۱۸۲)۔ الماوردی نے دارالاسلام کے زیر اقتدار آنے والے تین قسم کے ممالک میں سے تیسری قسم (یعنی جو کسی عہد نامے کی رو سے مسلمانوں کے زیر اقتدار آئے) کی دو صورتیں بیان کی ہیں: وہاں کی اراضی یا تو عام مسلمانوں کے قبضہ ملکیت میں آجائیں، یا وہ اصلی مالکوں کے قبضے میں رہیں۔ پہلی صورت میں وہاں کے اصلی باشندے ذمی کی حیثیت سے خراج ادا کر کے ان زمینوں کو کاشت کر سکتے ہیں۔ دوسری صورت میں وہ زمینوں کو بطور مستاجر اپنی ملکیت میں رکھ سکتے ہیں اور پیداوار کی ایک مقررہ مقدار جو جزیرے کی مقدار سے کسی طرح کم نہ ہو ادا کرتے رہیں گے اور ان کی زمین کو دارالصلح یا دارالعہد کی حیثیت حاصل ہوگی (الاحکام السلطانیۃ، ص ۳۵ بعد؛ ۱۳۱ بعد؛ کتاب الام، ۳: ۱۸۲)۔

مآخذ: (۱) البلاذری: فتوح البلدان، بیروت، ۱۹۵۶ء؛ (۲) الماوردی: الاحکام السلطانیۃ، قاہرہ ۱۹۶۶ء؛ (۳) امام شافعی: الام، قاہرہ ۱۹۶۱ء؛ (۴) السرخسی: المبسوط، قاہرہ ۱۳۴۳ھ؛ (۵) وہی مصنف: شرح للسیر الکبیر، حیدرآباد (دکن) ۱۳۳۵ھ؛ (۶) ابن القیم: احکام اهل الذمة، دمشق ۱۹۶۱ء؛ (۷) مفتی علاء الدین: المر المختار، لکھنؤ ۱۲۲۳ھ؛ (۸) قہانوی: کشف اصطلاحات الفنون، کلکتہ ۱۸۶۲ء؛ (۹) ابو محمد عبد اللہ بن قدامہ: المغنی، طبع قاہرہ، بلا تاریخ؛ (۱۰) محمد ظفر الدین مفتاحی: اسلام کا نظام امن، اعظم گڑھ ۱۹۶۶ء؛ (۱۱) مودودی: الجہاد فی الاسلام، لاہور ۱۹۶۶ء؛ (۱۲) حیدر زمان صدیقی: اسلام کا نظریہ جہاد، لاہور ۱۹۸۴ء؛ (۱۳) یحییٰ بن آدم: کتاب الخراج، لاٹن،

کے باغات میں سے نصف پر صلح کر لی (فتوح البلدان، ۱: ۳۳ بعد)؛ اسی طرح عہد رسالت میں نجران کے یہود و نصاریٰ نے بھی صلح قبول کی؛ نجران کے دو مذہبی پیشوا مدینہ منورہ میں حاضر ہوئے تو آپ نے انہیں دعوت اسلام دی، پھر دعوت مباہلہ دی، لیکن بالآخر وہ صلح پر راضی ہو گئے اور دربار نبوت سے صلح کا عہد نامہ لے کر واپس چلے گئے (فتوح البلدان، ۱: ۶۶)۔ حضرت عمرو بن العاصؓ نے فتح مصر کے موقع پر اپنے بھائی نافع بن العاص کی قیادت میں بلاد نوبہ پر حملے کا حکم دیا، مگر مسلمانوں کو فتح حاصل نہ ہو سکی اور کسی نہ کسی شکل میں لڑائی کا سلسلہ قائم رہا حتیٰ کہ حضرت عبداللہ بن سعد بن ابی سرح مصر کے والی بن کر آئے تو اہل نوبہ نے بعض شرائط پر صلح قبول کر لی، جن میں سے ایک شرط یہ تھی کہ اہل نوبہ ہر سال سو غلام بطور بقط [رک بان] ارسال کیا کریں گے اور مسلمان انہیں اسی اندازے کے مطابق کھانے پینے کی بعض اشیا دیا کریں گے۔ صلح کا یہ معاہدہ بعض تبدیلیوں کے ساتھ عباسی خلفا مروانی اور متوکل کے عہد تک قائم رہا (فتوح البلدان، ۱: ۲۸۰ بعد)۔ اسی طرح عہد عثمانی میں الرہا اور ارمینیہ کے باشندوں نے بھی حضرت عیاض بن غنم سے کچھ گندم اور ایک دینار فی آدمی دینے پر صلح کی تھی (فتوح البلدان، ۱: ۲۰۵)۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور بعد کے حنفی فقہائے دارالاسلام اور دارالحرب کے درمیان دارالصلح یا دارالعہد [رک بان] کو ایک مستقل قسم کے طور پر قبول نہیں کرتے، لیکن امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور بعد کے شافعی فقہاء اسے تسلیم کرتے ہیں، لیکن وہ دارالصلح اور دارالعہد میں کوئی فرق نہیں بیان کرتے، تاہم امام شافعی کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دارالعہد کو عام معنی میں لیتے ہیں لیکن ان کے نزدیک دارالصلح اس کی ایک خاص صورت ہے، یعنی دارالعہد

۱۸۹۶ء؛ (۱۴) المقریزی: الخطط، قاہرہ ۱۳۲۴ھ؛

(۱۵) ابن عبدالحکم: فتوح مصر، قاہرہ بلا تاریخ؛

(۱۶) حمید اللہ: Muslim conduct of State، لاہور

۱۹۵۴ء۔

(ظہور احمد اظہر)

* دارالصناعة: (نیز دارالصنعة مگر بہت شاذ)،

اشتقاق کے لحاظ سے اس ترکیب کا ترجمہ "صنعت و

حرفت کی جگہ یا کارخانہ" کیا جا سکتا ہے، لیکن

فی الواقع اس کا اطلاق ہمیشہ حکومت کے کارخانے پر

ہوا ہے، مثلاً بنو امیہ کے عہد میں ہسپانیہ میں سرکاری

استعمال کے لیے سونے چاندی کی مصنوعات یا اسلحہ

بنانے اور ان کے ذخیرہ کرنے کے کارخانے، لیکن اس

کا سب سے زیادہ وسیع استعمال جنگی جہازوں کی ساخت

اور تیاری کے کارخانے کے معنی میں ہوتا ہے، یعنی

"دارالصناعة لِإِثْثَاءِ السُّنَنِ"، جسے کبھی کبھی فقط

"دارالانشاء" بھی کہا گیا ہے۔ اس میں وہ سلاح خانے

شامل نہیں ہیں جن سے ہم نے آگے چل کر بحث کی

ہے، نیز نجی تجارتی جہازوں کی بابت اس میں ذکر

نہیں کیا جائے گا: اس کے لیے دیکھیے، بحریہ، ملاحہ،

سفینہ، اسطول۔

عربی مرکبات دارالصناعة اور دارالصنعة ہی سے

بحرروم کی (یورپی) زبانوں میں "arsenal" اور "wet-dock"

کے لیے لفظ بنائے گئے ہیں: (ہسپانیہ کی) قشتالی میں

darsena, arsenal, ataruzana: قیطلونی میں drasena

darsanale: اور اطالوی میں darsena, arsenale: مالطی

میں tarsnar, tarsna: گمان غالب ہے کہ کسی

اطالوی بولی ہی سے عثمانی ترکوں نے لفظ ترسانہ

(tersanne) لیا ہے (جس پر بعض اوقات توپ خانہ

(جنگی توپوں کا کارخانہ) کے وزن پر "ترس خانہ"

کہہ کر ترکی رنگ چڑھا دیا جاتا ہے)۔ سلطنت عثمانیہ

کے ابتدائی دور میں یہ لفظ کئی زبانوں میں رواج پا گیا۔

جدید یونانی میں στεφανωζε شامی عربی میں ترس خانہ،

مصری عربی میں ترسانہ اور ترس خانہ۔

بحر روم شرق: یہ طبعی امر تھا کہ مسلمانوں

کی خدمات انجام دینے کے لیے پہلے بحر روم کے شرق

علاقے میں سلاح خانے قائم ہوئے، جن میں سے کچھ

انہیں روسی بوزنطی سلطنت سے ترکی کے میں ملے تھے۔

خشکی میں فتح پاب ہونے کے باوجود عرب سمندر کی

طرف سے انتقامی حملوں کی زد میں تھے۔ ان کے انسداد

کے لیے انہوں نے ملک کے اصلی باشندوں کے تجربے

سے کام لیا۔ یہاں تک کہ تھوڑے ہی دنوں میں وہ

خود دوسروں پر بحری حملہ کرنے کے قابل ہو گئے۔

حضرت معاویہؓ جو اس وقت تک صرف شام کے والی

تھے، پہلے شخص ہیں جنہوں نے عکا میں قبرص کی

مہم کے لیے ۶۳۹/۶۲۸ء میں اسلحہ کا کارخانہ قائم

کیا۔ بعد میں یہ کارخانہ سور (Tyre) میں منتقل کر دیا

گیا، جہاں اس کے ساتھ ایک مورچہ بند گودی بنائی گئی،

جو رات کو ایک زنجیر سے بند کر دی جاتی تھی اور

اس میں جنگی جہاز آکر پناہ لیتے تھے۔ پھر بھی المتوکل

نے مناسب سمجھا کہ سلاح خانہ دوبارہ عکا ہی میں

قائم کیا جائے۔ اس سلاح خانے کو ابن طولون نے،

جب اسے اس کا مہتمم بنایا گیا، (المقنسی جنرالیہ دان

کے دادا کے انتظام سے) سور کے کارخانے کے نمونے پر

مورچہ بند کرا دیا۔ یہ ممکن ہے کہ وقتاً فوقتاً چھوٹے

چھوٹے سلاح خانے طرابلس اور لاذقیہ میں بھی بنائے

گئے ہوں؛ لیکن سمندر سے علحدہ ہونے کی وجہ سے

ان کی رونق طرسوس کے کارخانے کے آگے ماند پڑ گئی،

جو انتہائی شمالی علاقے میں دریا کے کنارے بنایا گیا

تھا۔ طرسوس بحری اور بری دونوں قسم کی مجاہدانہ

سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ یہاں تک کہ ایک بغاوت کے

نتیجے میں خلیفہ المقتدی نے ۵۲۸ء/۹۰۰ء میں جنگی

پیڑا جلوا دیا اور پچاس سال بعد بوزنطیوں نے اس شہر

پر از سر نو قبضہ کر لیا۔ صلیبی جنگوں نے آخر ان

کارخانوں کو بالکل ختم کر دیا، جو غالباً شورشوں اور

(۸۵۳/۸۲۳۸) نے اسے دوبارہ منظم کیا؛ چنانچہ اس زمانے میں جزیرہ روضہ کو جزیرۃ الصناعة کہتے تھے، بوزنطیوں (= بابلیوں) کے زمانے میں یہاں بڑے مورچے بنے ہوئے تھے اور عربوں کی فتوحات سے شکستہ اور مرمت طلب ہو گئے تھے انہیں ابن طولون نے پھر بحال کیا۔ اس نے جنگی بیڑے کو دوبارہ بنانے کا کام بھی کیا، مگر اس کی پوری طرح سے کامیاب کوشش آئندہ صدی میں اخشیدیوں نے فاطمیوں کے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے کی۔ اس وجہ سے کہ سلاح خانہ جزیرے میں واقع تھا، اس زمانے میں اس کی حفاظت ناممکن تھی، اس لیے ابن طنج نے جزیرے کو باغ بنا دیا اور قسطنطین میں دریا کے کنارے اس مقام پر جو اس وقت داربنت الفتح کہلاتا تھا ایک نیا سلاح خانہ قائم کرنے کا حکم دیا۔ تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فاطمیوں کے عہد میں دونوں سلاح خانوں میں باری باری سے یا ایک وقت کام ہوتا رہا۔ ۵۱۶/۱۱۲۲ء میں وزیر السامون البطانجی نے جہاز سازی کی صنعت کو معقول بنانے کی اس طرح کوشش کی کہ مصر (قسطنطین) کے سلاح خانے کو، جو اب بہت بڑھ گیا تھا، "شوانی" اور مرکزی جہاز بنانے اور جزیرے کے سلاح خانے کو "شاندیات" اور "حریات" بنانے کے لیے مخصوص کر دیا۔ فاطمیوں کے ابتدائی عہد میں ایک تیسرا سلاح خانہ بھی شہر کی شمالی جانب محلۃ القس میں کام کر رہا تھا؛ لیکن اس کے متعلق اس سے زیادہ ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ ۵۳۸/۹۹۶ء میں یہاں جنگی جہازوں کا ایک بیڑا جو بوزنطیوں سے مقابلے کے لیے تیار کیا گیا تھا جل گیا۔ صلیبی جنگوں کے حوادث اور وہ مصیبتیں جو اس خاندان کے خاتمے کے قریب پڑیں اس بیڑے کے لیے تباہ کن ثابت ہوئیں اور انہیں میں قاہرہ کے سلاح خانے جل کر نابود ہو گئے۔ سلطان صلاح الدین نے کوشش کی کہ اسکندریہ میں جہاز سازی کا کام دوبارہ جاری کرے اور سالیک کے عہد میں ہم پھر

سیاسی تفرقوں کی وجہ سے پہلے ہی کمزور ہو چکے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد مملوکوں نے بھی ان کی، حتیٰ کہ بیروت میں بھی، جو اس ساحلی علاقے کا سب سے بڑا شہر بن گیا تھا، تجدید نہیں کی۔ مصر: یہ بھی حضرت معاویہؓ ہی تھے جنہوں نے اپنی خلافت کے زمانے میں مصر کے سلاح خانے دوبارہ کھولے۔ ان سلاح خانوں کو تیسری صدی ہجری/ نویں صدی عیسوی کے بعد سے مصر کے خود مختار فرمانرواؤں نے نہایت شاندار اور دیرپا ترقی دی۔ جن کارخانوں نے سب سے پہلے کام شروع کیا ان کے مالک بوزنطی تھے۔ ان میں سے ایک قازم (Cysma) میں اور ایک اسکندریہ میں تھا۔ قازم کی جگہ بعد میں سویز نے لے لی اور خوش قسمتی سے سویز کو نہر کے ذریعے دوبارہ دریائے نیل سے ملا دینے کی بدولت یہ کارخانہ بحر احمر اور بحر روم دونوں کے لیے کارآمد ثابت ہوا۔ آگے چل کر دوسرے بحری مرکز (رشید Rosetta)، دمیاط اور تیس میں نیل کے دھانوں پر بنائے گئے اور انہیں بوزنطی حملوں سے بچانے کے لیے عباسی خلفا (خصوصاً المتوکل) نے مستحکم کر دیا اور ان کے لیے ایسی احاطہ بند لنگر گاہیں بنا دیں جیسی شام میں تھیں۔ متعدد بردی تحریرات اس کی شاہد ہیں کہ ان سلاح خانوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے کاربگر اور ضروری سامان بنو امیہ کے عہد سے لے کر آگے تک سرکاری طور پر منگوا یا جاتا رہا۔ پھر بھی سب سے زیادہ محفوظ اور اسی وجہ سے سب سے زیادہ ترقی یافتہ سلاح خانہ وہ تھا جو نیل کے کنارے القسطنطین (جو بعد میں قاہرہ کہلایا) کے قریب قائم کیا گیا تھا اور پہلے ۵۵۳/۱۱۰۷ء میں یہ جزیرہ روضہ میں بنایا گیا تھا۔ جب مروان الثانی نے جہازوں کو اس لیے جلوا دیا کہ عباسی اس کا تعاقب نہ کر سکیں (۵۳۲/۱۰۸۵ء) تو غالباً اسے نقصان پہنچا۔ تیسری صدی ہجری/ نویں صدی عیسوی میں بوزنطیوں سے بحری جنگوں کے دوران میں المتوکل

حکمت علی کو تقویت دین۔ سب سے اہم سلاح خانہ المریة Almeria میں تھا۔ اس کے علاوہ ان مقامات میں بھی ان کے موجود ہونے کا بتا جاتا ہے: طرطوشہ (Tortosa)، دانہ (Denia)، المنکب (Almuñecar)، مالقہ (Málaga)، جبل الطارق، شلتیش (Saltis)، شلتیریہ (Santa Maria de Algarve)، شلب (Stives)، القصر (Alcacer do Sal)۔ غالباً ایک سلاح خانہ قادیس (Cadiz) میں بھی تھا جو بنو مہدیوں کی جاگیر تھا۔ اس خاندان نے کئی قائد المرابطوں کے جنگی بیڑے کے لیے نیز جزائر البلیارق (Balearics) میں مہیا کیے۔

غربی مغرب: دو سب سے قدیم سلاح خانے وہ ہیں جو آبنائے جبل الطارق پر تھتہ (Ceuta) اور طنجه (Tangier) میں واقع تھے اور جو پہلے پہل تجارتی جہاز بنانے کی غرض سے قائم کیے گئے تھے۔

بربر: مراکش کے تین بڑے شاہی خاندانوں — المرابطون، الموحدون، بنو مرین — کے زمانے میں یہ سلاح خانے فوجی ادارے بن گئے۔ یہ جنگی جہاز اور حمل و نقل کے سفینے تیار کرتے تھے، جن سے آبنائے پر اقتدار قائم رکھنا اور اسلامی ہدائیہ کی حفاظت کے لیے اس کے بار فوجیں اتارنا ممکن ہو گیا۔ قرون وسطیٰ میں دوسرے بڑے سلاح خانے جن کا علم ہوا ہے یہ ہیں: الجزائر (جسے آگے چل کر عثمانی ترکوں کے دور حکومت میں خاص طور پر ترقی دی جانے والی تھی) اور اوران، ہین، بادیس، المدورہ (جو اب سونڈی کے دہانے پر المہدیہ ہے)، سلا (Sala) اور انفا (جو اب کاسا بلاٹکا یا دارالبیضاء ہے) کے سلاح خانے۔

صقلیہ: ہم کچھ کہہ نہیں سکتے کہ تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی اور چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی میں اس جزیرے کے یا ملک اطالیہ کے جن مقامات پر مسلمانوں نے قبضہ کیا وہاں سلاح خانے قائم کیے یا نہیں۔ غالب گمان یہ

ہے کہ قبرص پر حملے کے زمانے میں ایک بیڑا تیار کیا گیا، لیکن یہ خال خال اور لمبے وقفوں کے بعد ہونے والی کوششیں تھیں۔ اگرچہ جہاز سازی کی صنعت میں اس سے پہلے ہی ناگہانی نشیب و فراز آئے، لیکن یہ کہنا احتیاط کے خلاف نہ ہوگا کہ مصری سلاح خانے ختم اس وقت ہوئے جب بحر روم پر اطالویوں کا تسلط ہو گیا۔

تیسری۔ چوتھی صدی ہجری / نویں۔ دسویں صدی عیسوی میں جزیرہ افریقش [رک باں] کے مسلمانوں کا خندق کے مقام پر ایک آزاد بحری مرکز تھا۔

مغرب: مغرب میں سب سے پرانے سلاح خانے لازمی طور پر مشرقی سلاح خانوں کے مقابلے میں جدید تر تھے، مگر ان میں سے بعض شاید، ان کی یہ نسبت زیادہ مدت تک قائم رہے اور مشرق نے وقتاً فوقتاً ان سے جنگی ساز و سامان کے ذخیروں کے طور پر کام لینے کی بھی کوشش کی۔

افریقہ: مغرب کا قدیم ترین سلاح خانہ تونس [رک باں] میں تھا۔ اس کی بنیاد تقریباً ۵۷۴/۵۷۵ء میں مشرق کے اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان کے حکم سے وہاں کے والی حسان بن النعمان نے رکھی۔ وہاں ایک جنگی بیڑا، افریقہ کے ساحل کی حفاظت اور خاص طور پر صقلیہ کے فتح کرنے کی غرض سے تیار اور مسلح کرنے کے لیے مصر سے انک ہزار قبضی مع اہل و عیال لائے گئے۔

دیگر بحری۔ سلاح خانوں کے المہدیہ، سوسہ اور پجانبہ میں موجود ہونے کے تحریری شواہد محفوظ ہیں۔

الاندلس: چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی کے ربع اول میں جا کر امویوں نے ہسپانیہ میں سلاح خانے تعمیر کیے۔ انہیں جنگی بیڑوں کی ضرورت، درحقیقت اس لیے تھی کہ فارمن حملوں کا مقابلہ کریں اور بعد میں اس لیے بھی کہ فاطمیوں کے خلاف شمالی افریقہ میں اپنی دخل اندازی کی

کھجور اور انجیر) پیدا کرنے والے علاقوں کے قریب ہوتے یا پھر ان مقامات میں جہاں یہ آسانی کے ساتھ اطالوی، ہندی (ساج یا ناریل) اور مشرقی افریقہ کے سوداگروں کے ذریعے درآمد کیا جا سکتا تھا، اناطولی کے ساحلوں پر لوٹ مار کرنے والوں کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ پانچویں صدی ہجری/گیارہویں صدی عیسوی کے بعد جہاز سازی کی صنعت میں جو زوال آیا اس کے مختلف اسباب میں لکڑی کی روز افزوں کمیابی کو بھی ایک سبب شمار کیا جا سکتا ہے۔

- مآخذ : (۱) *Muslim sea-power: A.H. Fahmy* 'in the Eastern Mediterranean, 7th-10th century
(۲) *Seekrieg und See-: Ekk. Eickhoff* ۱۹۵۰ء
'politik zwischen Islam und Abendland (650-1040)
یوتیورپی سارلینڈ (Saarland) ۱۹۵۳ء : (۳)
Arsenaux et bois de marine dans la Méditerranée musulmane (7e-11e siècles)
در 'Méditerranée musulmane (7e-11e siècles)
Travaux du 2e Colloque "Le Navire" و غیرہ "Bibl. Gén. Éc. Htes. (d'histoire maritime, 1957
Arabes und : W. Hoenerbach (۴) 'Ét., VIe sect. Mittelmeer, Anfänge und Probleme arabischer
Seegeschichte در 'رقی و تبدیلی طوفان ارسائی' ۱۹۵۵ء : (۵) *G. Wiet* 'CIA Egypte' ۱۹۵۵ء تا ۱۹۶۹ء
(Mém. publ. Inst. Franc. archéol. or, 52)
L'Espagne musulmane : E. Lévi-Provençal (۶)
'Hist. Esp. Mus. : (۷) '۱۵۲۰ء (۸) '۱۵۲۰ء (۹) '۱۵۲۰ء
La péninsule ibérique au Moyen Age (۱۰) '۱۵۲۰ء
Deux récits de voyage inédits en Afrique : schwig
du Nord (۱۱) '۱۵۲۰ء (۱۲) '۱۵۲۰ء
orientale sous les Hafsides (۱۳) '۱۵۲۰ء
Les portes de l'arsenal de Salé : H. Terrasse
(۱۴) '۱۵۲۰ء (۱۵) '۱۵۲۰ء : G. S. Colin

ہے کہ صقلیہ میں پالرمو (Palermo) اور ماسینا (Messina) میں چند سلاح خانے تھے۔

بحر ہند اور آس پاس کے سمندر : عام طور پر بحر ہند اور اس کی شاخیں، بحر احمر اور خلیج فارس جو مسلمانوں کے سمندر تھے، بہ نسبت بحر روم کے امن و امان کے علاقے تھے۔ بحری ڈاکو تو یہاں بکثرت موجود تھے، لیکن بحری قوت رکھنے والا کوئی دشمن نہ تھا۔ اس وجہ سے یہاں پاسانی کے دستے کافی ثابت ہوتے تھے، اور غالب گمان یہ ہے کہ وہ تجارتی جہازوں سے، (جو معلوم ہے کہ بنیر کیلوں کے بنائے جاتے تھے) اکثر کام لیتے تھے۔ یہاں بحر روم کے نمونے کا اصلی سلاح خانہ کوئی نہ تھا۔ تاہم بحر قلم کے علاوہ جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، یہ یقینی امر ہے کہ فاطمیوں نے ایک بیڑا بنا رکھا تھا جو بحر احمر میں حجاج اور یمن جانے والے سوداگروں کی حفاظت کے کام آتا تھا اور اس کا مرکزی مقام عیذاب تھا۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ مشرق کی بڑی بڑی تجارتی بندرگاہوں میں جہاز سازی کا کام ہوتا تھا؛ عدن، اس سے پہلے زمانے میں بصرہ (یا یوں کہہ لیں کہ اس کی بیرونی بندرگاہ اور پیش رو ابلہ)، سیراف جس کی جگہ بعد میں کیش نے منبھالی، صحار اور اس کے بعد عمان میں سقط، اور شاید مغربی ہند اور مشرقی افریقہ کے ساحلوں پر آباد مسلمانوں کے شہروں میں بھی جہاز بننے لگے۔ یہ استثنائے ابلہ، ان کے مرتبے اور سیاسی حیثیت کی بابت کوئی یقینی بات کہنا مشکل ہے۔ پانچویں صدی ہجری/گیارہویں صدی عیسوی کے بعد تو، جب کہ بصرہ اور سیراف کی بحری سرگرمیاں بہت کچھ ماند پڑ گئی تھیں ابلہ کی گودیاں بھی کام کرنے کے قابل نہ رہی تھیں۔ جہازی لکڑی کی فراہمی: قدرتی طور پر سلاح خانے ان مقامات میں قائم کیے جاتے تھے جو یا تو جہاز سازی کی لکڑی (صنوبر اور دیودار، مصر میں بلوط، ببول کی تہیں لبخ یا سنط، جمیز (مصری قوت اور کسی حد تک

Bull. de l'Ens. Public du 'Fès Port de mer
: O. F. Hourani (۱۲) (۱۹۳۵) : ۱۸۳ 'Marrac
'Arab sea-faring in the Indian Ocean' ۱۹۵۱ء ایک
یروانہ جس میں ایک سمندری شہر 'ر' جس میں ایک سلاح
خانہ تھا، حاکم مقرر کرنے کا حکم ہے، قدامہ: کتاب الفراج
مخطوطہ، استنبول ۷۴، بعد (مخطوطہ بیرم ۱۷۷ بعد)
میں شامل ہے۔ سلطنت عثمانیہ کے لیے جس سے مقالے میں
بحث نہیں کی گئی ہے، دیکھیے اسمعیل حتی اوزون چارشیلی:
عثمانی دولتین مرکز و بحرہ تشکیلاتی، ۱۹۳۷ء۔

(CL. CAHEN و G.S. COLIN)

* دارالصنعة : رک بہ دارالصناعة .

* دارالضرب : ٹکسال مشرق اوسط میں قرون

متوسطہ کے نظام، عیشت کا نہایت ضروری ادلوہ تھا،
کیونکہ معاشی ترقی کی وجہ سے مسکوکات کا بہت
عمل دخل ہو چکا تھا، خصوصاً مسلمانوں کی فتح کی
ابتدائی صدیوں میں۔ ٹکسال کا اولین فریضہ حکومت
اور عوام کی مالی ضروریات کے لیے سگے سپہا کرنا تھا۔
مالی اصلاحات کے زمانے میں ٹکسال اس ادارے کا بھی
کام دیتی تھی جہاں سے گھسے ہوئے سگے کے عوض
نئے سگے تبدیل کرائے جاسکتے تھے۔ ٹکسالوں میں
چاندی سونا بھی بہت بڑی مقدار میں محفوظ رکھا جاتا
تھا، لہذا ٹکسالیں ذیلی خزانوں کا بھی کام دیتی
تھیں۔

مشرق اوسط کی فتوحات کے فوراً بعد عرب
حکمران ٹکسالوں سے کام لینے لگے تھے جو ان
سابق بوزنطی اور ساسانی حکومتوں سے ورے میں ملی
تھیں۔ بنو امیہ کے عہد میں خلافت اسلامی نے
ٹکسالوں کی تنظیم میں ذاتی طور پر بھی دلچسپی اپنی
شروع کی۔ بہ ادر، الحجاج کی قائم کردہ نئی ٹکسالوں
(مثلاً کوفہ اور واسط میں) سے، جو عبدالملک کی مشہور
"اصلاحات ضرب سگہ" [دیکھیے "دینار"] کے تحت قائم
کی گئیں، نیز ہشام کے اقدامات سے، جس نے سرکیزیت

کو مؤثر بنانے کے لیے سختی کے ساتھ ٹکسالوں کی
تعداد کم کر دی، واضح ہو جاتا ہے۔ ہشام کی
حکمت عملی پر، جو صریحاً بوزنطی حکومت کی ٹکسالوں
کی روایات سے متاثر تھی، خلافت عباسیہ زیادہ عرصے
تک عمل درآمد نہ کر سکی۔ ہارون الرشید کے عہد
میں "ناظرالسکة" کا عہدہ قائم کیا گیا۔ اگرچہ اس
اقدام سے خلافت اپنے ذاتی اختیارات سے ایک مانتحت
ادارے کے حق میں دست بردار ہو گئی، لیکن اس پر بھی
وہ ٹکسالی نظام کے اصول سرکیزیت کی حمایت کرتی
رہی۔ عباسیوں کے سیاسی اور انتظامی اختیارات کم
ہو جانے کے ساتھ ناظرالسکة کا عہدہ بھی ختم ہو گیا۔
اب قیزی سے بھپلتی ہوئی تجارت، اور صنعتی سرگرمیوں
کی وجہ سے ٹکسالوں کی تعداد میں اضافہ اور ان کے
سنا کار میں توسیع ہوئی، نیز چھوٹے چھوٹے حکمرانوں
کے برسر اقتدار آنے کے باعث، جو ٹکسالوں پر اپنا
تسلط جمانا چاہتے تھے، ٹکسالوں کے نظام میں
سرکیزیت قائم نہ رہی۔ یہ صورت حال بہت کچھ
ساسانیوں کے عہد کے حالات کے مماثل تھی۔

ٹکسالوں پر حکمرانوں کا تسلط ان کی آزاد
حکومت کے دعوے کی ایک دلیل ہوا کرتا تھا۔
یہ دعویٰ ٹکسالوں کے جاری کردہ سگے پر ان کے
ناموں کے اندراج سے انارۃ ظاہر ہوتا تھا، حالانکہ
قبل زل یہ حق بلا استثنا صرف خلفا کو حاصل تھا۔

بہر حال اس طریقے سے بہ نئے خود مختار حکمران اپنے
سگے کی قدر و قیمت کا ذمے دار اپنے آپ کو ٹھہرانے
تھے۔ سگے کے کھرے ہونے اور عوام الناس کے
مفادات کی حفاظت کی غرض سے ٹکسالیں حکام عدلیہ
(مثلاً قاضی مصر اور شام میں قاضی القضاۃ اور گیارہویں
صدی کے بغداد میں قاضی) کی تحویل میں دے دی
گئیں، جن کے عمال خود سگہ ضرب کرائے کے کاہوں
میں مدد دیتے تھے۔ اس نظام کے باوجود ان حکمرانوں
نے، جو اپنے صرف زر کے امتیازی حقوق سے ناجائز

الدوحة المتشبكة في غوايط دارالسكة، طبع ایچ - مونس،
 میلرو ۸۱۳۷۹/۶۱۹۵۹ : (۲) ابن خلدون : المقدمة،
 مترجمہ F. Rosenthal، لیوبارک ۱۹۵۸ء، ج ۱ : ۲۶۳،
 و بمواضع كثيرة : (۳) التابلسی : لیسع القوانين الضريبة في
 دواوين انديار المصرية، در C. A. Owen : Scandal in
 'JNES' the Egyptian Treasury، ۱۹۵۵ء، ج ۲ : ۶۱۹۵۵
 ص ۵۷ تا ۷۶ : (۴) ابن بطرمة : كشف الاسرار العلوية
 دارالضرب المصرية (نیز دیکھیے A. S. Ehrenkreutz :
 Extracts from the Technical Manual on the Ayyubid
 Mint in Cairo، در BSOAS، ج ۱۵، ۱۹۵۳ء، ص ۳۳۲
 تا ۳۳۷ : (۵) A. S. Ehrenkreutz : Contribution to
 the knowledge of the fiscal administration of Egypt
 in the Middle Ages، در BSOAS، ج ۲۶، ۱۹۵۳ء،
 ص ۵۰۲ تا ۵۱۰، اس میں اسلامی ٹیکسوں کے موضوع پر
 مزید مآخذ دیے ہوئے ہیں، (۶) وہی مصنف : Studies
 in the monetary history of the Near East in the
 Middle Ages، در JESHO، ج ۲، ۱۹۵۹ء، ص ۱۲۸
 تا ۱۶۱)۔

(A. S. EHRENKREUTZ)

عثمانی عہد : عثمانی ٹیکسوں کو عام طور پر
 "ضرب خانہ عامرہ"، "ضرب خانہ" اور "دارالضرب"
 کہتے ہیں۔ عثمانی دارالضرب کا پہلا سکہ "اقچہ"
 (رکبان) تھا، جو برسہ میں غالباً ۵۷۲۷/۱۳۳۶-۶۱۳۳۷
 میں ڈھالا گیا (قب اوزون چارشلی : Belleten، ۳۴ :
 ص ۲۰۷ تا ۲۲۱)۔ مراد اول اور بایزید اول کے
 "اقچے" اور "سنگیر" نامی تانے کے سکہوں پر جگہ کا
 نام نہیں ملتا (H. Erdem : سکوالات عثمانیہ، استانبول
 ۱۳۳۳ھ، عدد ۱، تا ۵۸)، لیکن یہ ہمیں معلوم ہے
 کہ اس کے یثوں کے عہد میں برسہ، آسید، ادرہ،
 سرز اور آیا ساوغ، افسوس (Ephesos) میں ٹیکسائی
 قائم تھیں (دیکھیے ایچ - ادم، عدد ۵۹ تا ۱۳۸)۔
 پہلا عثمانی طلائی سکہ استانبول میں ۸۸۸۲ھ

فائدہ اٹھاتے تھے، سکہوں میں ناجائز رد و بدل کر کے
 عامۃ الناس کا اعتماد کھو دیا۔

ٹیکسوں کا عملہ منشیوں اور کاریگروں پر مشتمل
 ہوتا تھا۔ اول الذکر حسابات اور ٹیکسوں کی داخلی
 حفاظت کے ذمے دار تھے۔ کاریگر، مثلاً "سباگون"
 (پگھلانے والے) اور ضرابوں (سکے ڈھالنے والے) سکہ
 سازی کا کام کرتے تھے۔ ان کاریگروں میں "نقاش"
 (ٹھہرے ساز) کو خصوصی حیثیت حاصل تھی، جس کا
 کام فقط نقش کنندہ کرنے تک محدود ہوتا تھا۔

مسلمانوں کی ٹیکسوں سے جاری شدہ سکہ
 سونے، چاندی اور تانبے کے ہوتے تھے (دیکھیے "دینار"،
 "درہم"، "فلس")۔ سکہ ڈھالنے کے لیے قیمتی دھاتیں
 سونے چاندی کی سلاخوں کی صورت میں ہوتی تھیں، جو
 سرکاری حکام نیز عام کاروباری لوگ مہیا کرتے تھے۔
 مؤخر الذکر لوگ گھسے ہوئے سکہ اور غیر ملکی سکہ
 یعنی، جن کی مقامی منڈی میں سماعت ہوتی تھی،
 ٹیکسوں کو دینے تھے، جو سکہ یا دھات کی ایک مقررہ
 شرح بطور ٹیکس سکہ سازی خود رکھ لیتی تھی۔
 ٹیکسوں سے جو نقد رویہ وصول کیا جاتا، اسے ٹیکسوں
 کے عملے اور سکہ سازی کے کاموں پر صرف کیا جاتا
 تھا، نیز سرکاری ٹیکس کی ادائیگی اس سے ہوتی تھی۔
 جن دنوں تجارتی سرگرمیاں بڑھ جاتی تھیں، سکہ سازی
 کا کام بھی زوروں پر ہوتا تھا۔ ٹیکسوں سے جو کچھ
 حاصل ہوتا اس سے حکومت کو معتدبہ آمدنی ہوتی
 تھی۔ لیکن قرون متوسطہ کے اواخر میں اقتصادی
 بد حالی نے سکہ کی مانگ کو بری طرح کم کیا، اس
 سے ٹیکسوں کی صورت حال اور ان سے حاصل ہونے
 والے نفع پر بہت مضر اثرات پڑے۔ بعد ازاں ٹیکسوں
 کو اجارے پر دینا مناسب سمجھا گیا۔ یہ وہ مفید
 تدبیر تھی جس پر مثال کے طور پر مصر کے مملوک
 حکمرانوں نے عمل کیا تھا۔

مآخذ : (۱) ابوالحسن علی بن یوسف الحکیم :

۱۷۷۸ء میں ضرب ہوا تھا (1. Artuk : *des Bergbaus im osmanischen Reich* استانبول ۱۹۳۳ء، ص ۱۳۱ تا ۱۳۲)۔ عثمانی قوانین کی رو سے ضروری تھا کہ تمام سونا جو ملک سے حاصل ہوا باہر سے درآمد کیا گیا ہو، سکہ سازی کے لیے براہ راست "ضرب خانوں" (ٹکسالوں) میں لانا جائے۔ نئے "اقچے" (رگ بہ اچہ) جاری ہونے پر جن کے پاس پرانے "اقچے" ہوئے، انھیں ٹکسال میں لانا پڑتا تھا۔ "نسق قلس" یعنی خاص کمائے اس بات کے مجاز تھے کہ غیر مسکوک سونے یا پرانے "اقچے" کے لیے کسی شخص کے سامان کا متبادل کریں (دیکھئے *Belleten*، ص ۶۹۷: ۲ اور *Anhegger-Inalcik* : قانون نامہ، عدد ۲، ۵، ۵۸) اور اس سونے یا چاندی پر، جس پر کسی بیرونی ملک کے باشندے نے درآمد کیا ہو، محصول معاف تھا۔ حکومت اس چاندی پر ۵٪ محصول عائد کرتی تھی جس کے سگے "ٹکسال" میں ڈھائے جاتے تھے اور یہ محصول "اقچے" کی ادائیگی اور سرکاری اہتوں میں فرق کے برابر ہوتا تھا (*Belleten*، ص ۹۷۶ اور *Anhegger-Inalcik*، عدد ۵۸)۔

بطور "مقاطعه" (رگ بنی) محصول کی وصولی کا اختیار عموماً زلام میں سب سے اونچی بولی دینے والے کو اجازت پر دیا جاتا تھا۔ اجارہ دار بولی کی رقم باقاعدہ اقساط میں حکومت کے خزانے میں داخل کرتا تھا (دیکھئے *Anhegger-Inalcik*، عدد ۱۵)۔ *Spandugino* (طبع *Ch. Schiefer*، بیس ۱۸۹۶ء، ص ۷۵) ہمیں بتاتا ہے کہ محمد ثانی کے عہد میں "اقچے" کے ہر نئے اجرا کے موقع پر آٹھ ہزار ٹونک (بائری) آمدنی ہوئی۔ صرف برسہ کے لیے "اقچے" کا اجارہ ۸۹۲/۸۸۷ء میں چھ ہزار ٹونک میں دیا گیا (دیکھئے *Belleten*، ۹۳: ۵۶)۔ جتنی بھی ٹکسالیں ملک میں تھیں ان سب کا واحد "مقاطعه" کے طور پر اجارہ دیا جا سکتا تھا (*Anhegger-Inalcik*، عدد ۱۵)، لیکن ایک "عادل" خود اپنی ذمہ داری پر مفاسی

۱۷۷۸ء میں ضرب ہوا تھا (1. Artuk : *Enith Sultan Mehmed namma kesilonts bir sikke* در *1st. Arkeoloji Müzesi Yilligi*، لیکن اس سے پہلے ۸۲۸ھ/۱۴۲۵ء اور اس سے بھی پیشتر عثمانی ٹکسالوں نے ضرور ورس کے ڈونکٹ (ملائی سگے) بنائے ہوں گے، جنہیں "فرنگی فلوری" یا "الفوری" کہتے تھے (*Zur Frage der osmanischen Münzprägungen im 15. Jahrhundert*، در *Forschungen über die Goldprägungen im 15. Jahrhundert*، ج ۱، ۱۵، ۱۹۵۶ء، ص ۵۵۲)۔ ایک ضابطے *Kāmin-nāme i Sultān* (R. Anhegger, H. Inalcik) *cher mīcebi türki 'Osmanī*، انگزہ ۱۹۵۶ء، عدد ۱ و ۵۸) سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ فرنگی فلوری محمد ثانی کے عہد میں استانبول، درنہ اور سیرز (Serres) کی ٹکسالوں میں ضرب ہوا تھا۔

عثمانی ترکوں نے اسی وسعت پذیر سلطنت میں تجارتی اور انتظامی لحاظ سے اہم شہروں میں اور سونے، چاندی کی کانوں کے مراکز میں نئی ٹکسالیں قائم کیں، جناحہ بايزيدی کے زمانے میں انقرہ، فرد تووہ، قسطنطنیہ، اور کیلی پولی میں نئی ٹکسالیں قائم ہوئیں؛ یہ ان ٹکسالوں کے علاوہ تھیں جو استانبول، برسہ، درنہ، سیرز، آبا سلوغ، نوواردہ (*Novaberd*، *Novobrdn*)، اسکب (*Skoplje*)، ناسہ، تیرہ اور قولہ میں، محمد ثانی کے زمانے سے پہلے موجود تھیں۔ سلیمان اول کے عہد میں حلب، دمشق، مصر، قاہرہ، آمد، بغداد اور الجزائر میں اس کے نام کے ملائی سکے مضروب ہوئے۔ شعبان ۹۵۳ھ/اکتوبر ۱۵۴۶ء میں اوزنجان کے شمال میں ایک چھوٹے سے قصبے جناحہ کے مقام پر چاندی اور سونے سے دو درکانیں دریافت ہوئیں تو وہاں ایک نئی ٹکسال قائم کی گئی۔ *Sidrekapsa 'Novaberd* (*Gilan*) *Morava* اور *Siebrnien* *Serebiencia* میں ٹکسالوں کا قیام بھی چاندی اور سونے سے معدوم کانوں کی وجہ سے ہوا (دیکھئے *Beiträge zur Geschichte*، R. Anhegger

مرکزی حکومت کو نکسال کے محاسبات بھیجے (دسویں صدی ہجری/سولہویں صدی عیسوی کے نصف اول کے "محاسبات ضرب خانہ ہوسہ" کا ایک دفتر یعنی یہی کھیانا بنڈیہ Kutüphanesi، اسنادوں میں موجود ہے، Cevdet yazm. عدد 0.59)۔ ان "برائوں" یعنی نقر کے فرمانوں میں، جو "عاملوں" اور "امینوں" کو دیے جاتے تھے، یہ بات واضح کر دی جاتی تھی کہ خرید کردہ سونے کے عوض انہیں کتنی رقم ادا کرنا ہوگی اور اس کے ہر سو درہم سے کتنے سکے ڈھانے ہوں گے۔ ان سب چیزوں سے اجراء زر کی سرکاری حکمت عملی مترشح ہوتی تھی۔

۱۸۶۵ء/۱۳۸۶ء تک چاندی کے ہر سو درہموں سے ۲۶۵ یا ۲۷۸ "اقچے" مضروب ہوتے تھے، لیکن محمد ثانی کے زمانے میں ۳۵۵ یا ۳۰۰، سلیمان اول کے عہد میں ۵۰۰ اور ۱۸۹۶ء/۱۳۱۵ء میں ۱۰۰۰ "اقچے" مضروب ہونے لگے۔ عثمانیوں کا قدیم نظام زر جو "اقچے" پر مبنی تھا اس زمانے سے درہم برہم ہوتا چلا گیا (اسباب کے لیے دیکھیے Belleten، ۶۰: ۶۵۶ تا ۶۸۳)۔ گھسے ہوئے اور کھوٹے اقچے "زبوق" اور "چرک" منڈی میں بکثرت آ گئے۔ اقچے کی نوعیت اور قدر و قیمت کو استوار کرنے، یعنی "تصحیح سکہ" کی جو بار بار کوششیں کی گئیں، ناکام رہیں (دیکھیے Essais sur l'his. économique de la Turquie, M. Belin, بیروت ۱۸۶۵ء، ص ۱۱۸ بعد (۲) آئی۔ غالب، قانون مسکوگات عثمانیہ، اسنادوں، ۱۵۱۳ء، ص ۲۲۔ تا ۲۲۶)۔ ۱۸۱۰ء/۱۶۰۱ء میں گھسے سونے اور پرانے اقچوں کا استعمال ایک بار پھر ممنوع قرار دے دیا گیا اور "تسغ" (یعنی کھڑے) "اقچے" کی شرح فی اشرق ۱۲۰ "اقچے" قرار دی گئی۔ اشرق کا وزن ایک درہم ۱۰۰ قراط [رگ باں] مقرر تھا۔ زمانہ مابعد میں عثمانی نکسالوں نے بہت کم سرگرمی دکھائی اور ان میں بہت سی بند بھی ہو گئیں۔ گیارہویں صدی ہجری/

نکسالوں کو بھی اجازت پر دے سکتا تھا۔ "عامل" اپنی مدد کے لیے "امین" اور "وکیل" ملازم رکھتا تھا، اگرچہ نکسال کے محصول کا وہ خود ذمے دار ہوتا تھا، لیکن اس کا رویار کا چلانا اور نظم و ضبط قائم رکھنا حکومت کے مقرر کیے ہوئے ملازمین سے متعلق ہوتا تھا، یعنی علاوہ "امین" یا "ناظر" کے، جو نکسال کی نگرانی کرتا تھا (Anhegger-Inalcik، عدد ۱۳)، ایک "صاحب عیار" یا ناظم، بھی ہوتا تھا اور اس حیثیت میں تمام قتی اور قانونی ضروریات کی ذمے داری اس پر عائد ہوتی تھی (Anhegger-Inalcik، عدد ۱۳، اور اولیا چلبی: سیاحت نامہ، ۱: ۱۳۵)۔ سکے ڈھانے کی عملی کارروائیوں کا ناظم ("استاد" یا "استا") ہوتا تھا۔ اس کے ماتحت کئی کاریگر اور مزدور گروہوں میں منقسم تھے، یعنی "قالچیان" [قالچ جی] جو دھات کو پگھلا کر معیاری ڈالے تیار کرتے تھے، "کیلدان" یا "کیلدار" دھات کی تختیاں بناتے تھے، جن سے سکے تیار کیے جاتے تھے اور "سکہ زن" یا "سکہ کن" جو کڑی نگرانی کے تحت فوہ کے سانچے تیار کرتے تھے۔ نکسال کے لیے "دیدبان" (چوکیدار)، "خزینہ دار" (خزانچی) اور کاتب (منشی) وغیرہ بھی مقرر کیے جاتے تھے۔

سکے باری باری (بربنائے نوبت) ڈھالے جاتے تھے۔ ہر باری میں ۱۳۰۶۵ درہم [رگ باں] وزنی چاندی دارالسلطنت سے بھیجی جاتی تھی، جس میں سے ۳۰۰۰ درہم کی چاندی خزانے میں رکھی جاتی، ۱۰۰۰۰ درہم ناظم نکسال کو سکے ڈھانے کے لیے دی جاتی اور ۶۵ درہم وزنی چاندی جائز اقصان کے کھانے میں شمار کی جاتی۔

نکسال اور اس کے حساب کتاب کی عام نگرانی کی ذمے داری ایک مقاسی قاضی کو سونپی جاتی تھی جو وہاں خود اپنا "امین" مقرر کرتا تھا (Anhegger-Inalcik، عدد ۱۲)۔ قاضی کا فرض تھا کہ وہ مقررہ اوقات پر حساب کتاب کی جانچ پڑتال کرے اور

نئے دور کا آغاز ہوا۔ "اتحاد" بنیادی لکائی نہ رہا، گو یہ ۱۲۳۳ھ/۱۸۰۹ء تک مضروب ہوتا رہا۔ پھر مضروب سکوں کی نوعیت کی اصلاح کی طرف خصوصی توجہ دی گئی (دیکھئے آئی۔ غالب، ص ۲۳)۔ مونے کے سکوں کے لیے نئی ٹکسالیں ۱۱۰۰ھ/۱۶۸۹ء میں اذراۃ از میر (سمرنا) اور ارز روم میں قائم کی گئیں اور تانبے کے سکوں کے لیے اسانبول میں توشن تشی کے مقام پر اور بونہ سرائے میں سکہ سازی کے لیے جدید آلات و اسلوب اختیار کیے گئے (راشد: تاریخ، اسانبول ۱۲۸۲ھ، ۲: ۳۸۳، ۳۹۳)۔ ۱۲ جمادی الاولیٰ ۱۱۳۹ھ/۶ جنوری ۱۷۲۷ء کو سب سے بڑی ٹکسال اپنی برائی جبکہ "سیم کش خانہ" سے نئی عمارت میں جو قوپ قبی سرائے کے پہلے احاطے میں ہے، منتقل ہوئی (گچک چابی زادہ عاصم: تاریخ، اسانبول ۱۲۸۲ھ، ۲: ۴۴۳)۔ اسی عہد میں صوبائی ٹکسالیں کسی بہتر انتظام کی خاطر پھر بند کر دی گئیں۔ ۱۱۳۲ھ/۱۷۲۰ء میں جو قرقی سکے مضروب ہوئے ان میں "گرش" کا وزن ۸ درہم ۱۲ قراط، "زولوتا" کا وزن ۶ درہم ۳ قراط، "بارے" کا وزن ۲ تا ۳ قراط اور "اقچے" کا وزن ۳ تا ۱ قراط تھا۔ "گرش" اور "زولوتا" میں ۵ قی مدخالص حاندی ہوتی تھی (آئی۔ غالب، ص ۲۸۰)۔

عثمانی حکومت مالی مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے سکہ سازی کو ہمیشہ محصول کا انک ذریعہ خیال کرتی تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نئے سکوں میں کھوٹ کی آمیزش ہونے لگی اور اصلاح سکہ کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں (آئی۔ غالب، ص ۲۳، ۳۲۷، ۳۷۷)۔ جویت: تاریخ، ج ۳، اسانبول ۱۲۷۵ھ، ص ۱۲۳، ج ۵، اول، ۱۲۷۸ھ، ص ۲۸۹)۔ محمود ثانی کے زمانے میں صورت حال خراب تر ہو گئی۔ انجام کار عبدالعزیز کے عہد میں "فرمان" مؤرخہ ۲۶ صفر ۱۲۵۶ھ/۲۹ اپریل ۱۸۴۰ء کے ذریعے اجراء

سترہویں صدی عیسوی میں صرف اسانبول، قاهرہ بغداد، طرابلس، تونس اور الجزائر کی ٹکسالیں مستقل طور پر کام کرتی تھیں۔ اس صورت حال کا بنیادی سبب یورپی اقوام تھیں، جنہوں نے یہ محسوس کرنے ہوئے کہ حاندی کی قیمت میں فرق کے باعث بہت فہم اٹھایا جاسکتا ہے، اپنے ہاں کے قرقی سکوں کو روز افزوں تعداد میں ترکی علاقوں میں درآمد کرنا شروع کر دیا (صرف ۱۶۱۳ء ہی میں تنہا فرانسیسیوں نے ۷ لاکھ ایکو ۵۰۰ درآمد کیے)۔ پہلے "ربالوں" (= ہسپانوی Reales) نے، پھر گیارہویں صدی ہجری/سترہویں صدی عیسوی میں "ارسلانی" "اسدی" یا "ابو کلب گرش" نے، بعد میں ہالینڈ کے Loewen rikendaler و "قرہ گرش" اور جرمنی کے thalers نے بحر روم کے عثمانی ممالک کی منڈیوں پر رقبہ بول دیا۔ ان سکوں کی درآمد، محصول سے آزاد تھی، لیکن آزادانہ اجرا کے لیے شرط یہ تھی کہ ان پر عثمانی ٹکسالوں میں "صحیح" کا نشان مرتسم کرایا جائے، وجہ یہ تھی کہ یورپی اقوام ترک علاقوں کے لیے خاص طور پر جعلی سکے بنوا کر روز افزوں تعداد میں درآمد کر رہی تھیں۔ ۱۱۰۰ھ/۱۶۸۹ء میں ایک طلائی سکے کی سرکاری شرح ۴۰۰ م اور ایک "گرش" (piastre) کی ۱۶ "اقچے" تھی (Bavkulet Arşivi، Fekete tasnifi، عدد ۳۴۳)۔ انجام کار "گرش" کو بنیادی عثمانی سکہ مان لیا گیا، کیونکہ اقچہ کھوٹ، قیمت میں تخفیف اور تجارتی حاندی کی افراط وازرائی کے باعث قیمت میں بہت کم رہ گیا تھا۔ چھ درہم حاندی کا پہلا عثمانی گرش جرمنی کے thaler کے نمونے ۱۱۰۹ھ/۱۶۸۸ء میں مضروب ہوا (دیکھئے آئی۔ غالب، ۲۳۷، ۲۵۸)۔ اس کی شرح ۳ "قرہ" (بارے) کے برابر رکھی گئی جو پہلی مرتبہ مراد چہارم کے عہد میں مضروب ہوا تھا۔ نصف "گرش" "نصفیہ" اور چوتھائی "گرش" "ربعیہ" سکے بھی مضروب ہوئے۔

اس نئے نظام سے عثمانی سکے کی تاریخ میں انک

”تنگے“ تو ہے، جنہیں محمود غزنوی نے ۱۰۲۷ھ/۱۰۷۷ء اور ۱۰۲۸ھ/۱۰۷۸ء میں لاہور میں ضرب کرایا۔ جب لاہور غزنوی حکمرانوں کا دارالامارت بنا تو یہاں مختلف دھاتوں کی آئینہ دار والے چھوٹے چھوٹے سکہ وقتاً فوقتاً مضروب ہوئے، لیکن جن سکالوں میں یہ سکہ مضروب ہوئے، ان کا کچھ حال معلوم نہیں [سلطان فرخ زاد ابن مسعود کے عہد (۱۰۲۹ھ/۱۰۷۸ء) کے سکہ جو ”لاہور“ میں ضرب ہوئے، لاہور کے عجائب خانے میں موجود ہیں۔ س۔ ۵]۔ معز الدین محمد بن سام نے لاہور، دہلی، پشاور اور غزنی میں سکہ ضرب کرایا، نیز قنوج [رگ پان] میں بھی جب اسے ۱۰۵۹ھ/۱۱۰۹ء میں سر کر لیا گیا۔ اوزان کے نظام اور ساخت کے اعتبار سے یہ سکہ اور شمالی ہند کے مروجہ سکہ یکساں قرار دے دیے گئے! ان میں سونے کے سکہ بھی شامل تھے۔ محمد بن سام کے نائب بلدز نے اپنے اور اپنے آقا کے مشترکہ ناموں کا سکہ مضروب کرایا: چھوٹے (بہ تصحیح) ”دہلی والے“ سکہ جو مقامی رائج الوقت سکوں میں غم کرنے کے لیے پہلے کرمان میں، جن میں طلائی اور ترقی سکہ بھی شامل تھے، اور بعد میں دہلی میں، جو فقط کم قیمت دھات کے تھے، ضرب کرائے گئے، بدستور قائم رہا۔ محمد بن سام کے وفات تک ہندوستان میں کوئی سونے یا چاندی کا سکہ بجز قنوج کی اشرافیوں کے، مضروب نہ ہوا۔ معلوم ہوتا ہے چاندی کا سکہ سب سے پہلے شمس الدین التمش نے مضروب کرایا تھا جس کا اصل وزن ۵ گرام تھا۔ اس عہد میں سکہ سازی کا واضح تجرباتی دور شروع ہوا، کیونکہ اس کے ابتدائی سکوں کے اوزان اور اوضاع متنوع نظر آتے ہیں، تا آنکہ بظاہر ۱۰۳۲ھ/۱۰۸۳ء تک اس کے ترقی سکوں کے لیے ایک مستقل وضع نکل آئی، جس سے آئندہ اس کے طلائی سکوں کے نیچے بھی نمونے کا کام لیا گیا۔ ملی جلی کم قیمت دھات کے سکہ بہر حال زیادہ تر رائج رہے،

زر کے مغربی اصولوں کو رہنمائی کے لیے قبول کر لیا گیا (دیکھیے متن در ایس۔ سودی: اصول مسکوکات عثمانیہ واجنبیہ، استانبول ۱۳۱۱ھ ص ۶ تا ۱۰)۔ ”ضرب خانہ عامرہ“ میں نئی عبارات کا اضافہ کیا اور اسے مشینوں اور انگلستان سے بلائے ہوئے سکہ کی مدد سے بالکل جدید طرز پر منظم کیا گیا (دیکھیے H. Ferid: نقد و اعتبار مالی، مسکوکات، استانبول ۱۳۳۲ھ ص ۲۱۵ تا ۲۲۲)۔ ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۳ء میں نئے طلائی اور ترقی سکہ ”مجدی“ کے نام سے مضروب ہوئے (دیکھیے آئی۔ غالب، ص ۲۲۲ تا ۲۲۵)۔

ماخذ: متن کے حوالوں کے علاوہ (۱) S. Lane- The Coins of the Turks in the British : Poole Musenn قسم ۲۶، سوزہ بریطانیہ میں مشرق سکوں کی فہرست ج ۸، لندن ۱۸۸۳ء (۲) E. von Zambaur: Contributions à la numismatique orientale, Numis- matische Zeitschrift ۳۶: ۳۷ تا ۱۲۲: ۳۷ تا ۹۸: (۳) ایم۔ کانلم: Darbkhaneh in ahwal-i 'da'khilayyari در TOEM: ۱: ۵۵۱ تا ۵۵۷: (۴) Onaltiner asirde Istanbul hayatı: A. Refik ۱۹۳۵ء ص ۶۸ تا ۷۲ (۵) اولیا چلبی: سیاحت نامہ ج ۱، استانبول ۱۳۱۱ھ ص ۵۶ تا ۵۶ ج ۱، استانبول ۱۹۳۸ء ص ۱۲۵: (۶) P. Mauc: Hist. du commerce français dans le Levant, au XVII^e siècle: I. Acluk (۷) ۱۸۹۶ء ص ۳۳ تا ۳۴: ۱۸۹۵ء تا ۱۸۹۵ء: (۸) Fatih'in sikke ve madalyaları: استانبول ۱۹۳۶ء (۹) او۔ توری [Ergin]: مجلہ امور بلدیہ، ج ۱، استانبول ۱۹۲۲ء

(HAAL INALCIK)

پاکستان و ہند: پہلی صدی ہجری، آٹھواں صدی عیسوی میں سندھ کی قدیم عرب حکومت کے غیر اہم سکوبات سے قطع نظر، مسلم حکمرانوں کے قدیمی سکہ جو اس پر صغیر میں جاری ہوئے، دو زبانوں کے

حالانکہ علاء الدین کے دہلی کے سکہ میں یہ اوسط شرح ۱۲ میں ۱.۴۵ حصے ہوتی تھی۔ دیوگری میں نکسالی قائم ہوئی تو وہاں سے ایک طلائی سکہ ۱۳۱۴ء/۱۳۱۴ء - ۱۳۱۵ء میں جاری ہوا۔ علاء الدین کے جانشین قطب الدین مبارک شاہ ۱۲۶۱ء تا ۱۳۱۶ء/۱۳۱۶ء تا ۱۳۲۲ء نے ”قطب آباد“ (=دہلی؟) میں نئے چوکور طلائی اور نقری معیاری وزن کے سکہ، نیز ۶۶ اور ۳۳ گرام کے تانبے کے سکہ بھی مضروب کرائے۔

غیاث الدین تغلق نے دہلی کے نکسالی نظام کو جاری رکھا اور ۱۳۲۴ء/۱۳۲۴ء میں بنگال پر فوج کشی کے وقت ایک سکہ اس نے خود بھی مضروب کرایا۔ اس کے بیٹے محمد بن تغلق کے سکوں کی وضع میں ندرت اور اوزان میں تنوع ہے اور وہ کمال فن کے مظہر بھی ہیں۔ طلائی سکہ دیوگری میں، جو بعد میں دولت آباد [رگ بان] کے نام سے موسوم ہوا، اور سلطان پور (=ورنگل) میں ۲۰۰ گرام کے ”دنار“ تک کا سکہ مضروب ہوا۔ دہلی کا سکہ متعدد چھوٹے چھوٹے حصوں میں منقسم تھا۔ ایک ”تنگہ“ ۵۴ ”کانیوں“ کا ہوتا تھا۔ ۱۶، ۱۲، ۸، ۶، ۲، ۱ اور پوری ۶۴ ”کانیوں“ کے سکہ ہمارے علم میں ہیں۔ ”کانی“ تانبے کے چار ”فلسوں“ کی تھی۔ اس نظام کے علاوہ جزوی طور پر ۲۵، ۵۰ اور ۱۰۰ کانوں کا اعشاری نظام بھی تھا۔ ۵۰ کانوں کے سکہ کو ”عدلی“ کہتے تھے، ۱۴۰ گرام چاندی کے اس سکہ نے سابقہ سب سے بڑے سکہ یعنی نقری تنگہ کی جگہ لے لی۔ نئے دنار کا تبادلہ ۸ پرانے نقری تنگوں یا ۱۰ ”عدلیوں“ سے ہونے لگا۔ یہ شرح سونے اور چاندی کی اضافی قیمتوں کے حساب سے مصنوعی تھی۔ دھوئے چھوٹے سکہوں کا مکمل نظام بعد ازاں چاندی اور تانبے کو حسب خواہش تناسب سے ملانے کے لیے خلط ملط کر دیا گیا تاکہ اصلی قیمت میں مختلف مگر قیامت میں یکساں سکہوں کو ڈھالا جاسکے۔ اس سے ”سبہ تنگہ“ کا رواج شروع

ان میں تانبے کے چھوٹے سکہ کا بھی اضافہ ہوا۔ چاندی، جو اب تک مضروب ہوتی رہی تھی، اس میں بہت کھوٹ ہوتی تھی۔ شمسی ٹکسالی ملتان اور ناگور میں بھی قائم کی گئیں، الشمس کے جانشینوں نے ان ٹکسالوں میں سکہ سازی کا یہی نظام جاری رکھا۔ اس سلسلے میں غزنی کا ذکر بار بار آتا ہے اور پروان کا بھی، جس کے قریب چاندی کی کانیں تھیں۔ سلطانہ رعینہ (۱۲۳۶ء/۱۲۳۶ء تا ۱۲۳۹ء/۱۲۳۹ء) کے عہد تک ٹکسالی مشرق میں بنگال تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس وقت کے چاندی کے ”تنگوں“ پر ”دارالضرب لکھنوی“ کا نام کندہ نظر آتا ہے۔ اس عہد کے دہلی میں ڈھلے ہوئے سکہوں کی جانچ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک ہزار سکہوں میں ۹۹۰ سے ۹۹۶ گرین تک چاندی ہوتی تھی، مگر بنگال کے سکہوں میں اس سے کم، یعنی ۹۸۹ بلکہ ۹۶۲ گرین تک۔ غیاث الدین باین (۱۲۶۵ء/۱۲۶۵ء تا ۱۲۸۷ء/۱۲۸۷ء) کے عہد تک بنگال کا سکہ دہلی سے آزاد ہو چکا تھا اور وہاں مستقل حکومت کے دور میں دارالضرب کے انتظامات بھی درست اور استوار ہونے کی صورت نکل آئی تھی۔ بلبن کا عہد حکومت باقاعدہ طلائی سکہوں کے رواج کے لیے ممتاز ہے۔ طلائی سکہ چاندی کے سکہوں کے نمونے کے مطابق ڈھالے جاتے تھے۔ علاء الدین محمد شاہ (۶۹۵ تا ۷۱۵ء/۱۲۹۵ تا ۱۳۱۵ء) نے نوج کے بڑھتے ہوئے اخراجات کی وجہ سے نقری ”تنگوں“ کو ۱۲۵ سے ۱۳۷ گرام تک کم کرا دیا لیکن طلائی سکہ ۱۲۵ گرام ہی کے رہے، جو اکثر بھونڈے طریقے سے مضروب ہوتے تھے۔ اس کی جنوبی فتوحات کے دوران معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کے طلائی سکہوں ”ہون“ عارضی فوجی ضروریات کے پیش نظر دوبارہ مضروب کرائے گئے تھے، لیکن انہیں شمالی ٹکسالوں کے معیار پر لانے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ ان کے خالص ہونے کی اوسط شرح آئین اکبری ۵:۱ میں ۱۲ میں ۸۶۵ حصے بیان کی گئی ہے۔

ان میں ۱۲، ۱۸ یا ۲۳ گرام خالص چاندی ہوتی تھی۔ ماہد کے تعلق سلاطین اور جونپور کے شرق سلاطین فیروز شاہ کی روایت کی پیروی کرتے رہے۔ تیمور کے ہاتھوں دہلی کے تباہ ہو جانے سے نکسالوں کو زوال آ گیا۔ تیمور کی لوٹ مار کے باعث سونا بڑی حد تک ناپید ہو گیا اور سید خضر خاں نے فیروز اور اپنے دیگر پیشروؤں کے نام کے سٹکے اصل سانچوں کو استعمال کرتے ہوئے مضروب کرانے (لیکن تیمور کے نام کے نہیں جیسا کہ فرشتہ نے دعویٰ کیا ہے)۔

دکن میں نکسالیں پہلے پہل بہمنیوں [رک بان] کے عہد میں قائم کی گئیں۔ احسن آباد، گلبرگہ، اور دوسرے مقامات پر ان کے قائم ہونے سے پہلے سناروں اور سونے کے تاجروں کو شاہی سہر کے حوالے کے بغیر رائج الوقت ہتھک بنانے کی اجازت تھی اور سٹکوں کی حفاظت اہل حرفہ کی برادری کرتی تھی۔ بعد کے دکنی سٹکوں میں تقری "لارین" (مچھلی کے کانٹے کی طرح کا سٹک) بہت دلچسپ تھا، جسے علی ثانی بیجاپوری نے مضروب کرایا اور جو دسویں صدی ہجری/سولہویں صدی عیسوی میں ہندوستان کی بحری تجارت کا معیاری سٹک بن گیا (دیکھیے *On the Bijapur*: G. P. Taylor در *Lari or Larin* NS 'JASB' جلد ۲۶، ۱۹۱۰ء، ص ۶۸۷ تا ۶۹۰)۔

سلاطین مغلیہ، بابر (۹۳۲ تا ۹۴۷/۱۵۱۹ تا ۱۵۲۶ء) اور ہمایوں کے عہد میں جو سٹکے مضروب ہوئے ان میں وسط ایشیا کے نمونوں اور وہیں کے نظام زر کی پیروی کی گئی تھی۔ غالباً باہر سے لانے ہوئے کاریگروں پر انحصار کیا گیا تھا۔ چنانچہ ان دونوں بادشاہوں نے تقری "شاہ رخیاں" آکرہ، لاہور، دہلی اور کابل میں مضروب کرائیں۔ بابر نے نکسال کے مقام کو "اردو" (لشکر) کا نام دیا۔ ہمایوں کے بہت سے طلائی سٹکے نکسالی نہیں اور اس کے تانبے کے

ہوئے، جس میں فقط ۱.۶۴ گرام چاندی ہوتی تھی اور اس کی قیمت پرانے تقری "تنکھ" کے $\frac{1}{8}$ کے برابری تھی۔ بقول ابوالفضل (آئین اکبری، ۱: ۷۱ بذیل مادہ "ضراب") دھات کو گول ڈلوں میں ڈھال کر کاٹ لیا جاتا تھا۔ چونکہ سیاہ تنکھ جنسامت میں تقری تنکھ جتنا تھا اور ایک ہی سانچے دونوں کے لیے استعمال ہو سکتے تھے بلکہ ہوتے تھے، اس طرح نکسال کے کاریگروں کا کام آسان اور رفتار تیز تر ہو جاتی تھی۔ سانچوں کی ایک ہی جیسی چھوٹی جنسامت کی وجہ سے سٹکوں کو مضروب کرنے کے لیے نسبتاً کم محنت کی ضرورت پڑتی تھی اور نتیجہ نکسال کی کارکردگی بڑھ جاتی تھی۔

۳۱ء تا ۳۲ء/۱۳۳۰ء تا ۱۳۳۲ء میں محمد بن تغلق کا مصنوعی سٹک نکلا، یعنی پیتل کا علامتی سٹک جس کی سرکاری قیمت ایک "عدلی" سقر کی گئی تھی۔ یہ تجربہ ناکام ہو گیا کیونکہ جعل سازی کی پوری طرح روک تھام نہیں کی گئی تھی۔ مقامی کاریگروں نے ہزاروں کی تعداد میں علامتی سٹکے بنا لیے، لیکن تین برس کے بعد یہ سب منسوخ کر دیے گئے؛ اس طرح ان سٹکوں کی تمام رقوم عملی طور پر سلطان کی دعا کا عارضی قرضہ بن گئیں، جسے سود کی بہت بڑی شرح کے ساتھ ادا کرنا پڑا۔ اس کے بعد رائج الوقت سٹکے معمول کے مطابق بننے لگے، بجز ۳۱ء تا ۳۲ء/۱۳۳۰ء تا ۱۳۳۲ء کے سونے اور چاندی کے سٹکوں کے جو خلفائے مصر کے نام پر مضروب ہوئے۔

فیروز شاہ تغلق (۷۵۲ء تا ۷۵۹ء/۱۳۵۱ء تا ۱۳۸۸ء) نے ۱۷۵ گرام کا طلائی "سٹک" جاری رکھا، لیکن اس کے تقری تکمیلی جز کو ضرب نہیں کرایا۔ طلائی سٹکے کی جب خوب کثرت ہو گئی تو اس نے چاندی کو اس کی سابق ذمے داری سے سبکدوش کر دیا اور نکسالوں کی توجہ ریزگاری بنانے پر مرکوز ہو گئی، جس میں چاندی اور تانبے سے مرکب چھوٹے سٹکے بھی تھے۔ ۱۸۰ گرام کے سٹکوں کی پرکھ سے معلوم ہوتا ہے کہ

سکوں پر کوئی نام کندہ نہیں ہے۔

دخیل حکمران شیر شاہ ۹۳۵ تا ۱۵۳۸/۵۹۵۲ء تا ۱۵۳۸ء، جو مقامی حالات کا گہرا عملی تجربہ رکھتا تھا، سکوں کی اصلاح کرنی شروع کی۔ اسے بعد میں اکبر نے پایہ تکمیل کو پہنچایا؛ یعنی ایک نیا ۱۷۸ گرام کا معیار چاندی کے روپے کے لیے اور ۳۲۴ گرام کا تانبے کے لیے مقرر کیا، ان کی تقسیم چھوٹے اجزاء میں ایک دوسرے کے تناسب سے کی؛ مخلوط دھات کے چھوٹے سکہ موقوف کر دیے اور ٹکسالوں کی تعداد میں متدبہ اضافہ (۲۵ سے اوپر) کیا۔ بہت سے چاندی اور تانبے کے سکوں پر ٹکسال کا نام نہیں۔ اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ٹھپا زیادہ بڑا تھا، اور سکوں کی گولائی کم تھی جس کی وجہ سے نام ٹھپے میں نہ آسکا۔

ہمایوں نے اپنی حکومت کے دوسرے مختصر دور میں سوری کے نظام کو جوں کا توں رہنے دیا۔ اکبر نے اگرچہ اس نظام کو اصولاً تو برقرار رکھا، لیکن انواع سکے کی تعداد میں بڑی توسیع کی۔ ابوالفضل (آئین اکبری، ۱: ۱۰) ان کی تعداد ۳۰ سے زائد بتاتا ہے اور یہ تعداد بھی آخری نہیں ہے (قب *Studies: Hodivala*، جلد ۳)۔ آئین اکبری میں ٹکسال کے طریق کار کا تفصیل سے ذکر آیا ہے: اس کا سربراہ یا ناظم ”داروغہ“ ہے جس کی معاونت ”امین“ کرتا ہے۔ ”صیوفی“ سونے چاندی کے کھرے رکھنے کا ذمے دار ہے۔ ”مشرف“ کے پاس اخراجات کا بھی کھانا ہوتا ہے۔ سوداگر، تولنے، پگھلانے والے اور دھات کے ڈالے بنانے والے کارکن، کارنگروں کے علاوہ ہیں۔ جب دھات کے ڈالوں کو صاف اور خالص کر لیتے، پگھلا لیتے اور نئے سانچہ میں ڈھال لیتے ہیں تو ”ضراب“ انہیں کاٹنا اور ”سنگھی“ ان پر سانچوں سے مہریں لگانا ہے، جسے کندہ کار نے کندہ کیا ہے۔ ”سنگھی“ کا عہدہ بوزباش کے برابر ہوتا ہے۔ دھاتوں کو نکالنے اور انہیں الگ الگ کرنے، چاندی

اور سونے کو تنہا کرنے اور پرکھنے کے طریقے مفصل بیان کیے گئے ہیں (آئین اکبری، ۱: ۳ تا ۹)۔ آئین اکبری، ۱: ۱۲ کے اعداد و شمار سے یہ بات واضح ہے کہ ہر فرد سونے کو ٹکسال میں لے جاسکتا تھا، جہاں اسے صاف اور خالص کرنے کے بعد سکے میں تبدیل کر دیا جاتا اور ٹکسال کے اخراجات نیز ۱۰۰ فی صد بطور حق سکے حکومت وصول کیا جاتا تھا۔ ابوالفضل اس بات کا بھی خاص طور پر ذکر کرتا ہے کہ سکے کے گھوس جانے پر اس کی سرکاری قیمت میں تخفیف کی اجازت تھی، مثلاً سونے کی، ”سہر“ جب مضروب ہوتی، تو اس کی قیمت ۳۰۰ ”دام“ ہوتی تھی، گو نسبتاً چھوٹی مہریں ۳۶۰ ”دام“ کی بھی مروج تھیں۔ جب تک وزن میں تین چاول سے زیادہ کمی نہ ہوتی، کوئی رعایت نہ دی جاتی تھی، لیکن جب اس میں چار سے چھ چاول تک کمی ہو جاتی تو اس کی قیمت ۳۵۵ دام رہ جاتی؛ اگر اس کا وزن مزید کم ہو جاتا تو اسے قبول نہ کیا جاتا اور اسے غیر مسکوک سونا شمار کیا جاتا۔ دھوکا دہی کو روکنے کے لیے کہ کہیں پورے سکوں کو اجازت شدہ قانونی تخفیف تک کم نہ کر دیا جائے، بادشاہ نے حکم دیا کہ ٹکسال میں سرکاری اوزان (باٹ) بنائے جائیں اور لٹان وصول کرنے والے رقم کی وصولی کسی خاص سکے میں کرنے کا مطالبہ نہ کریں۔ ابوالفضل یہ بھی لکھتا ہے کہ سونے کے سکے مضروب کرنے کے لیے چار ٹکسالیں تھیں: دس اور بھی تھیں جہاں چاندی اور تانبے کے سکے مضروب ہوتے تھے؛ ان کے علاوہ ۲۸ صرف تانبے کے سکوں کے لیے تھیں۔ اس عہد حکومت میں سونا ۲۱ ٹکسالوں میں، چاندی ۵۴ ٹکسالوں میں اور تانبا ۶۴ ٹکسالوں میں مضروب ہوتا تھا۔ مکمل نظام سکے سازی کے لیے [ارک باں] ”سکہ“۔

جہانگیر اور شاہ جہاں کے عہد میں نظام سکے سازی و بسا ہی رہا، بجز بہت بڑے سکوں کے جو وزن

کیا ہے، ۱۲۶ھ/۵۱۲ھ/۱۷۱۵ء کی ہدایت القواعد سے مترشح ہے، جس میں نکسال کے مروجہ قواعد مندرج ہیں (حوالہ از W. Irvine : *Mint rules in 1126 A. H.* : Proc. ASB، ۱۸۹۸ء، ص ۱۴۹ تا ۱۵۲)۔

مآخذ : سلاطین دہلی کے عہد میں نکسال کی تاریخ کی شہادت قطع سکوں ہی سے ملتی ہے، نیز دیکھیے : (۱) *The chronicles of the Pathan kings* : E. Thomas *Mint towns* : H. Nevill (۲) ۱۸۷۱ء : (۳) *of the Delhi Sultans* 'JASB' NS ج ۱۷، ۱۸۹۲ء، ص ۱۱۶ تا ۱۳۰ : (۴) وہی مصنف : *The currency of the Pathan Sultans* 'مجلة مذکور' ص ۲۱ تا ۳۰ (اس سے تھامس کی بیان کردہ جزئیات کے متعدد نکات کی تصحیح ہوتی ہے) : (۵) *Muhammad Tughluq's forced* : R. Burn (۶) *JASB* 'coinage' NS ۲۹، ۱۹۳۲ء، شماره ۵ تا ۶ : (۷) *The Sultans of Delhi : their coinage* : H.N. Wright *and metrology* : S. H. Hodivala (۸) ۱۹۳۶ء : (۹) *Historical Studies in Mughal Numismatics* *Mint-towns of the* : C. R. Singhal (۱۰) ۱۹۲۳ء : (۱۱) *Mughal emperors of India* (Memoir iv, NSI) *Bibliography of Indian Numismatics* : وہی مصنف : (۱۲) ۱۹۵۳ء : ج ۲ (Muhammadan and later Series) *Numismatics* : وہی مصنف : ۱۹۵۳ء

(J. BURTON-PAGE.)

- * دارالطراز : رگ بہ طراز۔
- * دارالعلم : یہ نام متعدد کتاب خانوں یا علمی اداروں کو دیا گیا جو مشرقِ بلادِ اسلامیہ میں تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی اور چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی میں قائم ہوئے۔
- المأمون کے بیت الحکمة (رگ ہاں) کے ناپید ہو جانے کے بعد ایک ادیب علی بن یحییٰ المنجم (م ۲۷۵ھ/۸۸۸ء) نے، جو المتوکل اور بعد میں المعتز کا دوست تھا، اپنے خرچ سے اپنی قیام گاہ (بمقام کرکر، نزد بغداد)

میں ایک ہزار تولے تک کے تھے (۱ تولہ=۳۵۰ گرام) اور جو صرف ممتاز شخصیتوں کو عطیہ دینے کے لیے استعمال ہوتے یا سونے کے ذخیرے کے طور پر جمع کیے جاتے تھے، ان کے علاوہ سونے یا چاندی کے "نثار" بھی مضروب ہوئے، جو تقریباً ۴ گرام کے ہوتے تھے۔ اورنگ زیب نے ۱۰۹۰ھ/۱۶۷۹ء میں جزیرہ (رگ ہاں) لگایا تو اس نے مروجہ تفرقہ "درہم شرعی" مضروب کرایا تاکہ شرعی شرح پر ادائی آسان ہو جائے۔ فرخ میر نے بھی ۱۱۲۹ھ/۱۷۱۷ء میں اس عمل کو دہرایا۔ اس نے نکسالوں کو اجارے پر دینے کی حکمت عملی اختیار کی، جس کے باعث متعدد آزاد سرداروں اور ریاستوں کو مغل شہنشاہوں کے نام پر خود اپنے سگے مضروب کرانے کا موقع ملا۔ ایسا ہی فی الواقع برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی نے کیا اور شاہِ عالم کے سکوں پر گلاب کے بار، گھاس (آئرلینڈ کی) اور گوکھرو (سکاٹ لینڈ کا قومی نشان) جو لارڈ ایک Lord Lake کے ۱۸۰۳ء میں دہلی میں داخلے کی یادگار تھے، برطانیہ کی "شاہی" نکسال میں خارجی اثر و نفوذ پر دلالت کرتے ہیں۔

مغلیہ دور کے متنوع سکوں کی نکسالوں کی عمومی تعداد کا اندازہ دو سو سے زائد لگایا گیا ہے۔ نیز یہ بھی کہ نئے نئے سکے ضرب کرانے کی برابر کوشش ہوتی رہی۔ سکوں کے لیے سال کے ہر مہینے کے کتبے الگ الگ بھی ہوتے تھے۔ چند سال تک جہانگیر ہر مہینے مذکور اور چوکور روپے باری باری ضرب کراتا رہا، بعد ازاں مہینوں کے ناموں کے بجائے آسمانی بروج کی شکلیں بھی نقش کرائیں۔ ہمایوں کے عہد سے ہی سکوں پر خاص خاص علامات بننے لگی تھیں۔ بعض دنہ یہ علامات نکسال کے مہتمم کی تبدیلی کو ظاہر کرتی تھیں، بعض اوقات یہ نکسال کا کوئی واضح نشان ہوتی تھیں۔ یہ بات کہ بعد کی مغلیہ نکسالیں بنیادی طور پر اسی طرح عمل کرتی تھیں جیسا کہ ابوالفضل نے بیان

النجوى، جسے التّوابع کا (م ۵۳۰ھ/۱۱۳۷ء) بھی کہتے ہیں (اور جو ابوالعلاء المعری کا دوست تھا) اور معتد حکومت ابو منصور معتد بن علی (۴۱۸ھ/۱۰۲۷ء)۔ سائبور کے کتاب خانے سے بہت سے علما نے استفادہ کیا، خصوصاً ابوالعلاء المعری نے بغداد میں اپنے مختصر سے قیام کے دوران میں (۳۹۹ھ/۱۰۰۹ء - ۴۱۰ھ/۱۰۲۰ء)؛ نیز اس میں ہمعصر مصنفین کی کتابیں بھی موصول ہوتی تھیں، مثلاً فاطمی معتد حکومت احمد بن علی بن خیران (م ۴۳۱ھ/۱۰۳۹ء) کی۔ آخر میں جب سلجوق ۴۴۷ھ/۱۰۵۵ء - ۴۵۶ھ میں بغداد میں وارد ہوئے تو اسے جلا ڈالا گیا۔ وزیر عمید الملک الکندری فقط چند کتابوں کو بچا ہی سے بچا سکا۔

خیال کیا جاتا ہے کہ فاطمی خلیفہ العاکم نے ۴۰۰ھ/۱۰۱۰ء میں ایک سنی دارالعلم فسطاط میں قائم کیا تھا۔ اس کا انتظام دو سالکی علما کرتے تھے، لیکن تین برس کے بعد کسی وجہ سے کتاب خانہ ضبط کر لیا گیا۔

مآخذ: (۱) تاریخ بغداد، ص: ۹۳؛ (۲) ابن الجوزی: المنتظم، ص: ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵؛ (۳) ابن الاثیر: ص: ۷۱، ۷۲، ۷۳ تا ۷۴؛ (۴) یاقوت: معجم البلدان؛ (۵) ۷۹۹؛ (۶) وہی مصنف: آرشاد، ص: ۲۳۲؛ (۷) ابن خلکان: قاهرہ، ص: ۱۹۹؛ (۸) ابن العساکر: شذرات، ص: ۳؛ (۹) Houtsma: ص: ۱۸؛ (۱۰) ابن العساکر: رسالة الغفران؛ (۱۱) طبخ الیازجی: ص: ۷۳، ۷۴؛ (۱۲) حفظ الزند، قاهرہ، ص: ۱۳۱، ۱۳۲؛ (۱۳) Mez: Renaissance، ص: ۱۶۷ تا ۱۶۹؛ (۱۴) O. Pinto: Le biblioteche degli Arabi، فلورنس، ص: ۸ تا ۹؛ (۱۵) ۱۵ تا ۲۳؛ (۱۶) عواد: خزائن کتب العراق العاتق، ص: ۲۱۸ تا ۲۲۳ (بازبان عربی)؛ (۱۷) La vie et la philosophie d'Abou-l-Ala، ج: ۲، ص: ۱۶۳۔

میں ایک کتاب خانہ قائم کیا۔ اسے [خزانة الحکمة (یا قوت)] "خزانة الكتب" کہتے تھے اور وہ تمام سالک کے علما کے لیے کھلا تھا (یا قوت: آرشاد، ص: ۵، ۵۹، ۶۷)۔ ایک اور مصنف اور شاعر، شافعی فقیہ جعفر بن محمد ابن ہمدانی الموصلی (م ۵۳۳ھ/۹۳۳ء) نے موصل میں "دارالعلم" نامی ایک ادارے کی تاسیس کی۔ اس میں ایک کتاب خانہ بھی تھا [جس میں تمام علوم سے متعلق کتابیں تھیں اور] جو ہر ایک کے لیے کھلا تھا (یا قوت: آرشاد، ص: ۲، ۲۲)۔ آل بویہ کے عہد اقتدار میں مزید کتاب خانے دوسرے شہروں میں کھل گئے اور انہوں نے شیعی عقاید کی اشاعت میں بڑا حصہ لیا۔ ان میں سے وہ کتاب خانہ جو شیراز میں تھا اسے عضدالدولہ نے قائم کیا تھا اور یہاں جغرافیہ دان المقنسی (۴۴۹ھ) اکثر آتا تھا۔ البصرہ اور رام هرمز میں دیگر کتاب خانے ایک شخص ابن سوار نامی نے قائم کیے۔ ان کا تعلق مذہب معتزلہ سے تھا۔ رے کا کتاب خانہ (المقنسی، ص: ۳۹۱، ۳۹۳؛ یا قوت: آرشاد، ص: ۳۱۵؛ ابن الجوزی: المنتظم، ص: ۵۳) اتحاد و زندہ کا مرکز ہونے کی بنا پر سلطان محمود غزنوی کے حکم سے بعد میں ختم کر دیا گیا تھا۔

بغداد: سب سے اہم ادارہ وہ "دارالعلم" تھا جس کی بنیاد وزیر ابو نصر سائبور بن اردشیر نے بہاء الدولہ کے عہد حکومت میں بغداد میں رکھی تھی۔ یہ الکرخ محلے کی ایک عمارت میں ۴۸۱ھ/۹۹۱ء یا ۴۸۳ھ/۹۹۳ء میں قائم ہوا تھا۔ اس میں تمام علمی موضوعات پر دس ہزار سے زائد کتابیں تھیں، جن میں سے بعض خطاطی کا شاہکار تھیں۔ اس کا انتظام دو "شریفوں" اور ایک "قاضی" کے سپرد تھا۔ سائبور کے انتقال کے بعد خیال کیا جاتا ہے کہ شیعی شاعر الشریف المرتضیٰ نے اس کتاب خانے کی باگ ڈور سنبھال لی تھی۔ ہمیں ان اشخاص میں سے بعض کے نام بھی معلوم ہیں جو مستم کتاب خانہ مقرر کیے گئے، مثلاً ابو احمد عبدالسلام

آتا ہے، مگر یہ دارالعلوم عربی حیثیت برقرار رکھنے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ اسے مصر کے مسلم اساتذہ کی بہت بڑی تربیت گاہ ہونے کا فخر حاصل ہے اور اس کا اثر ان استادوں اور ناظرین تعلیم کے ذریعے جنہوں نے یہاں تعلیم پائی، ملک میں پھیلا ہوا ہے۔ یہاں کے طلبہ چند جماعتوں میں منقسم ہیں، چار عربی زبان کی اور تین علوم اسلامیہ کی۔ نصاب پورا کرنے کے بعد جو سند ملتی ہے وہ بی۔ اے کے برابر ہوتی ہے اور اس کے بعد ایم۔ اے یا ڈاکٹریٹ کا امتحان دیا جاسکتا ہے۔ الازہر کے طلبہ کے علاوہ ۱۹۵۱-۱۹۵۲ء سے وہ طلبہ بھی اس میں داخل کیے جا رہے ہیں جنہوں نے سرکاری ثانوی مدارس سے توجیہ (Baccalauréat) کا امتحان پاس کیا ہو اور ۱۹۵۳-۱۹۵۴ء سے خواتین کی مخصوص تعداد بھی داخل ہونے لگی ہے۔ پہلے تو جامعۃ الازہر کی طرح یہاں بھی تعلیم مفت تھی اور طلبہ کو معمولی سا ماہوار وظیفہ دیا جاتا تھا، لیکن اب تعلیم کی فیس لی جاتی ہے۔ البتہ جو طلبہ تعلیم و تدریس کا پیشہ اختیار کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں ان کو خاص مراعات دی جاتی ہیں۔ ۱۹۵۷ء میں ۱۹۵۸ء میں یہاں کے طلبہ کی تعداد ۱۷۱۵ تھی۔ مزید برآں کچھ طلبہ کو یورپ کی یونیورسٹیوں میں تکمیل تعلیم کے لیے وظیفے بھی دیے جا رہے تھے۔

مآخذ: (۱) محمد عبدالجواد: تقویم دارالعلوم العدد الماسی (۱۸۷۲ تا ۱۹۷۷ء) قاہرہ ۱۹۵۲ء: (۲) وہی مصنف: ملحق العدد الماسی (۱۹۵۹-۱۹۵۷ء) قاہرہ ۱۹۵۹ء: (۳) اساطیر احسن: اسلامی نظام تعلیم و تربیت۔ (JOMIER, J. [و ادارہ])

(ب) دیوبند [رک باں] کی مذہبی درس گاہ۔
(ج) فرنکی محل: ملا نظام الدین نے لکھنؤ کے ایک مکان فرنکی محل میں، جو اورنگ زیب نے ۱۱۰۳ھ/۱۶۹۱ء میں ان کے گھرانے کو جائداد کے اس نقصان کی تلافی میں عطا کیا تھا جو نظام کے والد کے قتل

۱۹۴۴ء میں ۱۲۷ تا ۱۲۹: (۱۵) وہی مصنف: La profession de foi d'Ibn Botla دمشق ۱۹۵۸ء میں xxii تا xxiii: (۱۶) U. Makdisi The Topography of eleventh century Baghdad ج ۶ (۱۹۵۹ء) میں ۱۹۵ تا ۱۹۶: زبوا الحسنات: اسلامی مدارس۔ (D. SOURDEL)

* دارالعلوم: [(ع)]: بمعنی مدرسہ و مکتب، بالخصوص اعلیٰ تعلیم کے لیے۔ برصغیر پاک و ہند میں دینی علوم کی درس گاہوں کے لیے عموماً دارالعلوم استعمال کیا جاتا ہے، مثلاً دارالعلوم دیوبند، دارالعلوم سہارنپور، دارالعلوم فرنکی محل، لکھنؤ وغیرہ۔ سرسید احمد خان نے مغربی علوم کی ترویج و تدریس کے لیے علی گڑھ میں جو کالج قائم کیا اس کا نام بھی دارالعلوم علی گڑھ رکھا۔ پاکستان و بھارت میں دینی تعلیم کے لیے اعلیٰ و اذوق قسم کے ہزاروں دارالعلوم قائم ہیں، جہاں قرآن و حدیث کے علاوہ دیگر متعلقہ علوم پڑھائے جاتے ہیں۔ اب بعض حلقوں میں دارالعلوم کی جگہ ”جامعہ“ کا لفظ بھی مدارس و مکتب کے لیے رواج پا گیا ہے۔ بعض اوقات معمولی مدارس کے لیے بھی دارالعلوم استعمال کر لیا جاتا ہے۔

(الف) وہ اونچے درجے کی درس گاہ جو علی پاشا مبارک [رک باں] نے ۱۸۷۲ء میں قائم کی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ الازہر [رک باں] کے طلبہ کی معین تعداد کو علوم کے جدید شعبوں سے متعارف کرایا جائے اور ان کے لیے ۵ سال مدت تعلیم مقرر کی جائے تاکہ وہ نئے سکول میں تعلیم دینے کے قابل ہو جائیں، مگر چونکہ قاہرہ میں سائنس کی تعلیم کے لیے اور مرکز قائم ہو چکے تھے اس لیے ہوا یہ کہ اس کے نصاب تعلیم میں کئی بار ترمیم کی گئی اور علوم صحیحہ (یا تجربیہ) کو پیچھے ڈال دیا گیا اور مدت تعلیم گھٹا کر چار سال کر دی گئی۔ گو اس کا الحاق ایک خاص شعبے کی حیثیت سے قاہرہ (سابقاً فؤاد) یونیورسٹی کے ساتھ ۱۹۴۶ء سے چلا

آثار الاول (جو راقم کو فہم مل سکی): (۴) محمد اکرام: رود کوثر، کراچی، بدون تاریخ، ص ۵۸۲ تا ۵۹۲؛ (۵) عنایت اللہ: تذکرۂ علمائے فرنگی محل، (۶) شبلی نعمانی: مقالات شبلی، ج ۳، اعظم گڑھ (۱۸۳۵/۱۹۳۲ء) ص ۱۰۰ تا ۱۰۵؛ (۷) عبدالاعلیٰ: رسالۃ قطبیت (مخطوطہ)؛ (۸) ولی اللہ فرنگی محل: عدۃ الوسائل (مخطوطہ)؛ (۹) رضی الدین محمود انصاری: اغصان الانساب (مخطوطہ)۔

(د) ندوۃ العلماء، لکھنؤ: اسے ۱۸۹۳/۱۳۱۲ء میں جدت کے حامی علما کی ایک جماعت نے قائم کیا۔ مولوی سید محمد علی کانپوری اس کے پہلے ناظم مقرر ہوئے۔ اعلان کردہ مقصد یہ تھا کہ دینی تعلیم کے مروج نظام کو بہتر بنایا جائے اور ایک اسلامی دارالعلوم قائم کر کے علما کے متفرق گروہوں میں یکجہتی پیدا کی جائے۔ اس دارالعلوم میں خالص دینی اور دنیوی دونوں قسم کے علوم ہی کی تعلیم نہ دی جائے بلکہ ساتھ ہی پیشہ ورانہ تربیت کا انتظام بھی کیا جائے۔ ۱۸۹۸/۱۳۱۶ء میں ابتدائی جماعتیں کھول دی گئیں اور ایک سال بعد اس کا کتاب خانہ قائم کیا گیا۔ [اسی کے اصول پر آگے چل کر "دارالمصنفین" اعظم گڑھ کی بنیاد پڑی۔ یہ ایک اسلامی علمی تحقیقی ادارہ ہے، جس کا اپنا ماہوار رسالہ معارف بھی شائع ہوتا ہے]۔ ۱۸۳۲/۱۹۰۳ء میں شبلی نعمانی [رک بان] ندوۃ العلماء میں بحیثیت اس کے سیکرٹری کے شریک ہوئے۔ ۱۸۳۶/۱۹۰۸ء میں موجودہ نئی عمارت کا افتتاح ہوا۔ درسگاہ کا ہفتہ وار مجلہ الندوۃ پہلے پہل ۱۸۳۲/۱۹۰۳ء میں شائع ہوا اور شبلی اس کے مدیر مقرر ہوئے۔ شبلی کی قیادت میں ندوۃ ہندوستان کی پہلی تعلیم گاہ تھی جس میں جدید تنقیدی تحقیقات علمی کا طریقہ رائج کیا گیا۔ یہ دیوبند اور علی گڑھ کے طرز فکر کا ایک مرکب مجموعہ تھا، مگر یہ نہ تو دیوبند کی راسخ الاعتقادی کو، جو اس کی خصوصیت ہے، جذب کر سکا اور نہ

ہو جانے کے بعد انہیں پہنچا تھا [اورنگ زیب نے صرف زمین بطور معاق دی تھی۔ اس پر وہ یورپی طرز کا لیا مکان بہت بعد میں تعمیر ہوا جسے فرنگی محل کہنے لگے تھے۔ اس مقالے کے مآخذ مثلاً رود کوثر (ص ۴۳) وغیرہ میں یہ صراحت موجود ہے]۔ ملا نظام الدین نے دو سال بعد ایک مدرسہ قائم کیا، جس کا نام دارالعلوم فرنگی محل مشہور ہوا۔ ملا نظام الدین کی شہرت زیادہ تر اس نصاب کی وجہ سے ہے جو انہوں نے دینی تعلیم کے لیے تیار کیا اور جو "درس نظامیہ" کہلاتا ہے۔ یہ اس نصاب کو ترقی دے کر بنایا گیا تھا جس کی بابت کہا گیا ہے کہ اسے پہلے پہل دربار اکبری کے ایک مشہور فاضل فتح اللہ شیرازی نے تیار کیا تھا۔ اس نصاب میں زیادہ زور عربی کے قواعد صرف و نحو، منطق اور فلسفہ پر دیا گیا ہے اور تجربی علوم کی جانب عملاً کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ [یہ نصاب ملک بھر میں مروج ہو گیا، لیکن قیام پاکستان کے بعد درس نظامیہ میں تبدیلیاں ہونے لگیں اور بعض قدیم علوم کو مختصر کر دیا گیا، یا بالکل نظر انداز کر کے جدید علوم کو شامل کیا گیا]۔ جب دیوبند میں دارالعلوم قائم ہوا تو فرنگی محل کی درسگاہ کا وہ تفوق جو اورنگ زیب کے زمانے سے چلا آتا تھا، برقرار نہ رہ سکا اور وہ شہرت میں بہت پیچھے رہ گیا۔ زمانہ حال میں [دیگر درس گاہوں کی طرح] اس نے بھی سیاسی میدان میں حصہ لیا۔ ۱۹۲۰ء کے عشرے کے ابتدائی سنین میں علمائے فرنگی محل خلافت عثمانیہ کی حمایت میں پیش پیش تھے اور ۱۹۳۰ء کے عشرے میں مسلم لیگ کے مطالبہ پاکستان کی تحریک میں انہوں نے نمایاں حصہ لیا۔

مآخذ: (۱) ولی اللہ فرنگی محل: الاغصان الاربعہ للشجرات الطیبۃ در احوال علماء فرنگی محل۔۔۔ لکھنؤ ۱۸۸۱/۱۲۹۸ء؛ (۲) الطاف الرحمن: احوال علماء فرنگی محل، لکھنؤ (۲) ۱۹۰۲ء؛ (۳) عبدالباری:

قابل اعتماد شہادت سمجھا جائے گا اور معاہدہ ختم ہو جائے گا (شرح السیر الکبیر، ۱: ۲۸۲، بعد)۔ عہد شکن قوم کے بارے میں اللہ کا حکم ہے کہ اس کے عہد کا پاس نہ کیا جائے اور خائن قوم کو اس کے جرم کی سزا دی جائے (۹ [التوبة: ۱۲]۔ معاہدہ ٹوٹنے کی صورت میں دارالعہد باقی نہیں رہے گا اور ایسے علاقے یا ملک کو دارالحرب [رک بان] کی حیثیت حاصل ہو جائے گی (البسوط، ۱: ۳۴، بعد: کتاب الأم، ۴: ۱۸۵)؛ شرح السیر الکبیر، ۱: ۲۸۲، بعد)۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ چونکہ دارالاسلام اور دارالحرب کے سوا کسی اور علاقے یا سرزمین کے قائل نہیں، اس لیے دارالعہد اور دارالصلح دو دارالاسلام اور دارالحرب کے درمیان ایک مستقل قسم سمجھنے کے بجائے دارالاسلام کا حصہ قرار دیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ حتیٰ قضا اہل العہد اور اہل الصلح کو اہل الذمہ یا ذمی [رک بان] شمار کرتے ہیں، اس لیے صلح یا عہد کی سرزمین پر اگر اہل الحرب حملہ کریں اور بعض اہل صلح یا اہل عہد کو گرفتار کر لیں، پھر مسلمان دارالحرب پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کریں تو ایسے گرفتار ہونے والے اہل صلح یا اہل عہد کو غلام نہیں بنایا جا سکتا، کیونکہ وہ اہل الذمہ کی حیثیت سے دارالاسلام کے آزاد شہری ہیں (البسوط، ۱: ۵۲، بعد: شرح السیر الکبیر، ۱: ۳۴، بعد: الدر المختار، ۲: ۲۷۲)۔

بعد کے مسلمان حکمرانوں نے بھی دارالعہد کے بارے میں اسلامی تعلیمات پر ہمیشہ عمل کیا اور اہل عہد کے ساتھ جن شرائط پر معاہدہ ہوا ان کی پوری طرح پابندی کی گئی۔ سلطان سبکتگین غزنوی اور اس کے بیٹے محمود غزنوی نے راجا جے پال سے جن شرائط پر معاہدہ صلح کیا ان کی پوری طرح پابندی کی (اسلام کا نظام امن، ص ۷۷، بعد)؛ اسی طرح عثمانی سلاطین نے بھی عیسائی بادشاہوں سے کیے ہوئے

علی گڑھ کے خالص عقلیت پسند رجحان کو پوری طرح اختیار کر سکا۔ ندوہ کے سب سے ممتاز تعلیم یافتہ فاضل سید سلیمان تھے، بابین ہمہ قدرے آزاد خیالی کے باعث ندوہ کو مذہبی حقوق میں زیادہ کامیابی حاصل نہ ہوئی۔
مآخذ: (۱) سید سلیمان ندوی: حیات شبلی، اعظم گڑھ ۱۳۶۲/۱۹۴۳ء، ص ۳۰۱ تا ۳۰۹، ۳۵۲، ۳۹۶، بعد ۴۱۲ تا ۴۱۵، ۵۳۱: (۲) محمد اکرام: موج گوزر کراچی، بدون تاریخ، ص ۳۰۶ تا ۳۱۸: (۳) معارف (سلیمان ندوی)، اعظم گڑھ، رمضان ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۵ء، ۲۵۲ تا ۲۸۲: (۴) W. Cantwell Smith: Modern Islam in India، لندن ۱۹۶۶ء، ص ۲۹۵، ۲۹۶۔ (۵) ابو الکلام: اہلال دور اول۔

(بزمی انصاری)

دارالعہد: (ع)، لفظی ترجمہ 'معاہدے کی سر زمین'۔ فقہائے اسلام کی علمی اصطلاح میں دارالعہد سے مراد ایسا علاقہ یا ملک ہے جو دارالاسلام کے امام وقت یا اس کے نائب کے ساتھ بعض شرائط پر امن اور صلح کا معاہدہ طے کرے، ایسے علاقے یا ملک کو ایک مقررہ رقم بطور خراج ادا کرنا ہوتی ہے: امام شافعیؒ کے نزدیک رقم کی مقدار جزیہ [رک بان] کی مقدار سے کسی طرح کم نہیں ہونی چاہیے (کتاب الأم، ۴: ۸۱، بعد: کتاب الخراج، ص ۵۸: الاحکام السلطانیہ، ص ۵۵، بعد)۔ طے شدہ شرائط کے مطابق جب معاہدہ ہو جائے تو دارالعہد کے خلاف کسی قسم کی جنگی کارروائی جائز نہیں، کیونکہ قرآن کریم میں ایسے مشرکین سے بھی عہد نباہنے کا حکم دیا گیا ہے جو بد عہدی نہ کریں (۹ [التوبة: ۴]، حتیٰ کہ اگر امام وقت کو عہد شکنی کا خدشہ بھی ہو مگر واضح ثبوت اور شواہد نہ ہوں تو امام وقت کو توقف کرنا چاہیے (کتاب الأم، ۴: ۱۸۵)۔ امام محمدؒ کا قول ہے کہ اگر دارالعہد کے حاکم کی طرف سے کوئی قاصد سرِ مہر خط لے کر آئے وار اس میں معاہدہ ختم کرنے کا اعلان ہو تو اسے

وہ اس سامان کو، جو ۱۸۲۵ء/۱۲۸۲ء کی تباہ کن آتش زدگی سے بچ گیا تھا، محفوظ کر سکے۔ سابق ملوک عہد کے آخر زمانے کی معدودے چند دستاویزات اور رجسٹر نیز انیسویں صدی عیسوی کی کمتر اہمیت کی انتظامی مسلیں اور مصر میں پیدائش و وفات کے تمام رجسٹر بھی القلعہ میں رکھے ہوئے ہیں، لیکن انیسویں اور بیسویں صدی کی مصری حکومت کی دستاویزوں کا بیشتر حصہ قاہرہ میں قصر عابدين میں موجود ہے۔

عثمانی حکومت کے زمانے کی جو دستاویزیں بچ گئی ہیں ان کی بڑی بڑی دو قسمیں ہیں۔ دفاتر (رجسٹر) اور جداگانہ پسینے ("اوراق")۔ عثمانی انتظامی رجسٹروں کے بنیادی نمونے دو ہیں، ایک وہ جو احکام و فرامین کی نقلوں کے حامل ہیں اور "دیوانی" رسم الخط میں مرقوم ہیں، دوسرے وہ جو مالیاتی اعداد و رقم پر مشتمل ہیں اور "سیاقت" (رسم الخط) میں لکھے ہوئے ہیں۔ عثمانی احکام و فرامین کے بیشتر رجسٹر، جو مصر میں محفوظ تھے، ۱۸۲۰ء کی آتش زدگی میں تباہ ہو گئے اور یہ مواد فقط فریدوں اور حیرت افندی (دیکھئے مآخذ) کے مطبوعہ مجموعوں میں اور مصر کے اہم رجسٹروں سے دستیاب ہو سکتا ہے جو استانبول میں باش وکالت ارشوی Hesvekalet Arsivi میں موجود ہیں۔ وہ مواد جو القلعہ کے محافظ خانوں میں باقی رہ گیا ہے وہ زیادہ تر مالیاتی رجسٹروں اور چند جداگانہ دستاویزوں پر مشتمل ہے۔ علاوہ ازیں ان محافظ خانوں میں متعدد نجی مجموعے بھی ہیں جن کے مالکوں کی وفات کے بعد حکومت نے انہیں تصرف میں لے لیا۔ انیسویں اور بیسویں صدی کی تاریخی دستاویزات، جو قصر عابدين میں ہیں، زیادہ جامع اور مکمل ہیں: ان میں وہ نقلیں بھی شامل ہیں جنہیں زمانہ حال میں مصر سے متعلق مواد سے جو یورپ کے بڑے بڑے محافظ خانوں میں دستیاب ہوا، تیار کرایا گیا ہے۔

دور عثمانی کے مصر کے "دیوان" کے مذاکرات

معاهدوں کی ہمیشہ پابندی کی۔ عثمانی سلاطین جب کسی عیسائی بادشاہ کو امان دیتے تو اس کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جاتا، جس کی رو سے عیسائی بادشاہ اطاعت اور سالانہ باجگزاری کا عہد کرتا اور عثمانی سلطان اس کی حفاظت کے علاوہ ملک کے مذہب اور دیگر رسوم کے احترام کرنے کا عہد کرتا تھا (حمید اللہ: *Muslim Conduct of State*، ص ۵۷ بعد: منشآت السلاطین، ۳: ۳۵۳ بعد)۔

مآخذ: (۱) محمد ظفر الدین مفتاحی: اسلام کا نظام امن، اعظم گڑھ ۱۹۶۶ء: (۲) الشافعی: کتاب الام، قاہرہ ۱۹۹۱ء: (۳) السوردي: الاحکام السلطانية، قاہرہ ۱۹۹۶ء: (۴) علاء الدین: الدر المختار، لکھنؤ ۱۳۹۳ھ: (۵) ابن القيم: احکام اهل السنة، دمشق ۱۹۶۱ء: (۶) البلاذري: فتوح البلدان، بیروت ۱۹۵۶ء: (۷) جہی بن آدم: کتاب الخراج، لندن ۱۸۶۲ء: (۸) السرخسی: البسوط، قاہرہ ۱۳۲۸ھ: (۹) وہی مصنف: السير الكبير، حیدرآباد دکن ۱۳۳۵ھ: (۱۰) فریدون نے منشآت السلاطین، استانبول ۱۹۶۵ء: (۱۱) حمید اللہ: *Muslim Conduct of State* لاہور ۱۹۵۳ء۔

(ظہور احمد اظہر)

دارالفنون: رگ بہ جامعہ۔

* دارالمحفوظات العمومية: حکومت مصر کا

سرکاری محافظ خانہ جس میں مصر کی حکومتوں کی سولہویں صدی عیسوی سے لے کر آج تک کی سرکاری دستاویزیں محفوظ ہیں۔ انہیں قاہرہ کے القلعہ اور قصر عابدين میں محفوظ کیا گیا ہے۔ عثمانی خزانے اور انتظامیہ کی دستاویزات، جو ۱۸۲۲ء/۱۵۱۷ء میں سلیم اول کی فتح مصر کے وقت سے لے کر انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں اس کے خود مختار ہو جانے تک کے زمانے کی ہیں، مصر میں ابھی تک سلامت ہیں اور اب القلعہ کے محافظ خانوں میں محفوظ ہیں، جنہیں محمد علی نے ۱۸۲۲ء/۱۸۲۷ء میں اس لیے تعمیر کروایا تھا کہ

بتایا جائے کہ فلسفہ حال کے کون کون سے مسائل مذہب کے خلاف ہیں۔ پھر ان مسائل کو رد کر دیا جائے یا تطبیق دی جائے؛ (۳) تاریخ، اسامہ الرجال، معانی و بلاغت، تحقیقات مذہب وغیرہ میں عربی زبان میں کثرت سے تصنیفات موجود ہیں اور انہیں مضامین نے یورپ میں نئے نئے اسلوب اختیار کیے ہیں۔ موازنہ کر کے بتانا چاہیے کہ دونوں کی مختلف خصوصیات کیا ہیں اور کس کو کس پر ترجیح ہے؛ (۴) خالص اسلامی علوم، مثلاً کلام، فقہ، اصول، تفسیر وغیرہ کی تاریخ اور ان پر تنقید لکھی جائے، یعنی یہ کہ یہ علوم کب پیدا ہوئے، کیونکر بڑھے، کس کس زمانے میں کیا کیا باتیں ان پر اضافہ ہوتی گئیں اور کن کن اسباب سے ہوئیں، ان کا کس قدر حصہ صحیح ہے اور کس قدر اصلاح کا محتاج ہے؛ (۵) فارسی، عربی شاعری اور انشا پردازی کی تاریخ لکھی جائے؛ (۶) جن نئے عنوانوں پر یورپ میں مضامین لکھے جا رہے ہیں، اردو زبان میں ترجمے کے ذریعے سے منتقل کیے جائیں؛ (۷) مسلمانوں کی تہذیب و تمدن پر تاریخی مضامین لکھے جائیں، مثلاً انتظام عدالت، انتظام محاصل، مفاد عامہ کے محکمے، تعلیمات، تجارت، فوجی نظم و نسق، معاشرت غرض اس قسم کے تمام امور کی نسبت مؤرخانہ طور پر لکھا جائے کہ مسلمانوں نے ان چیزوں میں کہاں تک ترقی کی اور کس کس مد میں کیا اضافہ ہوا (افادات سہدی، ص ۲۷۳ تا ۲۷۵)۔

ان مقاصد کی تکمیل بعض ایک دو افراد کے ہاتھوں نہیں ہو سکتی تھی بلکہ یہ مصنفین کی ایک ایسی جماعت کا کام تھا جو اس کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دے؛ چنانچہ علی گڑھ سے سبکدوشی کے بعد شبلی نعمانی اپنے تخیل کو عملی صورت میں لانے کی تدبیریں سوچنے لگے۔ مارچ ۱۹۱۰ء میں تدوۃ العلماء کے اجلاس میں انہوں نے ایک عظیم قومی کتب خانے کی تجویز پیش کرتے ہوئے ایک تصنیفی ادارے کے

کی رودادیں اور عدالتی دستاویزیں، جو مسلوکوں کے زمانے کی ہیں، قاہرہ کی مذہبی عدالتوں (المحکمۃ الاحوال الشخصية) میں موجود ہیں۔

مآخذ : (۱) Cairo's Archives : S. J. Shaw
Report 'and the History of Ottoman Egypt Middle East 'on Current Research 'Institute 'Washington ڈی۔ سی '۱۹۵۶ء ص ۵۹ تا ۷۲ :
(۲) Sommaire des Archives Turques du : J. Deny
'Cairo' قاہرہ ۱۹۱۳ء : (۳) محمد احمد حسین :
الوقائع التاريخية قاہرہ ۱۹۳۵ء ص ۹۳ تا ۹۴ : (۴)
The Ottoman Archives as a source of : B. Lewis
'History for the Arab Lands' در IRAS (۱۹۵۱ء)
ص ۱۳۹ تا ۱۵۵ : (۵) Michaud اور Poujoulat :
'Correspondance d' Orient '۱۸۳۱ - ۱۸۳۰ ج ۶ :
پیرس ۱۸۳۵ء ص ۲۹۲ تا ۲۹۳ - عثمانی مصر کے محافظ
خانوں کی دستاویزات کے بعض مطبوعہ مجموعوں کے لیے
دیکھیے : (۶) Recueil de Firmans Impériaux Ottomans
adressés aux valis et aux Khedives d' Egypte, 1006
A.H. 1322 A.H. قاہرہ ۱۹۳۳ء : (۷) مصطفیٰ حیرت
اقتدی السیواسی : انشائے حیرت اقتدی بولاق ۱۲۳۱ھ
۱۸۲۵ء : (۸) فریدون بے : منشآت السلاطین جلد ۲
استانبول ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۷ - ۱۸۵۸ء : (۹) G. Talamas
Recueil de la correspondance de Mohamed : Bey
'All Khédive d' Egypte' قاہرہ ۱۹۱۳ء - کتبہ خوانی اور
دیگر عثمانی انتظامی مواد کے لیے جو بین الاقوامی تعلقات سے
متعلق ہے، دیکھیے Diplomatic .

(S. J. SHAW)

* دارالمصنفین : [مسلمانان ہند کا ایک علمی و تحقیقی ادارہ، جو اعظم گڑھ (ہندوستان، اب بھارت) میں ۱۹۱۵ء سے قائم ہے۔ شبلی نعمانی [رک باں] کی ہمیشہ سے یہ خواہش تھی کہ (۱) فلسفہ حال کے اصول اور اس کا معتد بہ حصہ ملکی زبان میں لایا جائے؛ (۲) یہ

وہ رفیق جو پانچ سال کی تربیت حاصل کر چکے ہوں۔ مصنفین اور رفقا مستقل طور پر دارالمصنفین کے احاطے میں رہتے ہیں اور ان کے وظائف ان کی ضروریات کے مطابق مقرر ہوتے ہیں۔ ایثار و قربانی اور بے لوب خدمت کا جذبہ دارالمصنفین کے کارکنوں کی اہم خصوصیت ہے۔ اس کے پہلے قائم سید سلیمان ندوی بتیس سال تک یہاں کلمہ دیتے رہے اور ان کا زیادہ سے زیادہ وظیفہ اڑھائی سو روپے ماہوار تھا۔ اس طرح عبد السلام ندوی نے وہاں چالیس برس صرف کیے اور آخر وقت میں ان کا وظیفہ ۱۷۰ روپے تھا۔

[دارالمصنفین نے گزشتہ پچاس بچپن سال کے دوران میں بڑا وسیع علمی، تحقیقی، تاریخی اور دینی ادب پیش کیا ہے اور مختلف علوم و فنون میں ایک سو سے زیادہ کتابیں لکھوا کر شائع کی ہیں مثلاً:-

(۱) سیرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم: شبلی نے سیرت النبیؐ کی پہلی جلد مکمل کر لی تھی، مگر ان کی زندگی میں اس کی اشاعت کی نوبت نہ آئی تھی۔ ان کی آخری وصیت کے مطابق سید سلیمان ندوی نے مزید پانچ جلدیں تالیف کر کے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ یہ چھ جلدیں بالترتیب ۱۹۱۸ء، ۱۹۲۰ء، ۱۹۲۳ء، ۱۹۳۴ء، ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئیں۔ یہ دارالمصنفین کی مقبول ترین کتاب ہے، جسے برصغیر پاکستان و ہند کے علاوہ دوسرے ملکوں میں بھی قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کی چند جلدوں کا ترجمہ ترکی اور فارسی میں ہو چکا ہے۔

(۲) سیرت صحابہؓ و تابعینؓ وغیرہ: سیرت صحابہؓ کے سلسلے میں بارہ کتابیں ہیں: جلد اول (خلفائے راشدینؓ)، جلد دوم و سوم (صحابہؓ)، جلد ششم (امام حسنؓ، امام حسینؓ، امیر معاویہؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ) اور جلد ہفتم (مختلف صحابہؓ کرام)، از شاہ معین الدین احمد ندوی، جلد چہارم و پنجم (انصارؓ) اور جلد ہشتم (صحابیاتؓ)، از

قیام کا ذکر کیا۔ پھر ندوۃ العلماء سے علحدگی کے بعد وہ سیرت النبیؐ کی تالیف میں ہمہ تن مصروف ہو گئے تو دارالمصنفین کی تاسیس کا خیال بار بار ان کے ذہن میں آتا رہا۔ ۱۱ فروری ۱۹۱۴ء کو انھوں نے مجلۃ التہلال میں اس کا مجوزہ خاکہ شائع کیا۔ اگست ۱۹۱۴ء میں انھوں نے اعظم گڑھ کے پُر سکون ماحول کو دارالمصنفین کے قیام کے لیے منتخب کیا اور اپنا سروروی مکان اور باغ اس کے لیے وقف کر دیا۔ بدقسمتی سے وہ اپنی زندگی میں اس کی بنیاد نہ رکھ سکے، تاہم ان کی وفات کے تین روز بعد ۲۱ نومبر ۱۹۱۴ء کو ان کے احباب اور نلامذہ نے دارالمصنفین کے قیام کا فیصلہ کیا۔ سید سلیمان ندوی پونا کالج کی ملازمت چھوڑ کر اعظم گڑھ آ گئے اور مسعود علی ندوی کے انتظامی تعاون اور عبدالسلام ندوی کے علمی اہتمام سے ۱۹۱۵ء میں دارالمصنفین نے اپنا کام شروع کر دیا۔ اس ادارے کے اغراض و مقاصد یہ قرار دیے گئے:

(۱) ملک میں اعلیٰ مصنفین اور اہل قلم کی جماعت پیدا کرنا؛ (۲) بلند پایہ کتابوں کی تصنیف و تالیف و ترجمہ کرنا؛ (۳) علمی کتابوں کے طبع و اشاعت کا سامان کرنا [صبح الدین، در مقالات یوم شبلی]۔

۱۹۱۵ء میں سید سلیمان ندوی کی تعینات ارض القرآن، جاد اول، کی اشاعت سے دارالمصنفین کے تصنیفی کام کی ابتدا ہوئی۔ اس ادارے نے بہت جلد تالیف و تصنیف کا ایک ایسا معیار قائم کر دیا جس سے اردو کے تمام سنجیدہ مصنفین اور اہل قلم متاثر ہو کر اس کی تقلید کرنے لگے۔

دارالمصنفین کے کارکنوں کی تین اقسام ہیں:

(۱) رفقاء اعزازی: وہ مشاہیر اہل قلم اور ارباب علم جو دارالمصنفین کو اپنے علمی مشوروں اور قلمی اعانتوں سے مستفید کرتے ہیں؛ (۲) رفیق: وہ اصحاب ذوق جو تکمیل عام کے بعد فن تصنیف کے سیکھنے کی غرض سے دارالمصنفین میں مقیم ہوں؛ (۳) مصنفین:

سلسلے کی قابل ذکر کتابیں یہ ہیں: محمد عزیز مرزا: تاریخ دولت عثمانیہ (دو جلدیں)؛ سید ریاست علی ندوی: تاریخ اندلس اور تاریخ صقلیہ؛ شاہ معین الدین احمد: اسلام اور عربی تمدن، جو محمد کرد علی: الاسلام والحضارة العربیة کا ترجمہ ہے؛ سید ابوالحسن علی ندوی: تاریخ دعوت و عزیمت (دو جلدیں، یعنی عالم اسلام کی اصلاحی و تجدیدی کوششوں کا تاریخی جائزہ)؛ محمد اسحق سندیلوی: اسلام کا سیاسی نظام؛ سلیمان ندوی: عربوں کی جہاز رانی؛ ابوالحسنات ندوی: ہندوستان کی اسلامی دوسگاہیں۔

(۸) تاریخ ہند: رفعت عالمگیر؛ سید نجیب اشرف؛ مقدمہ رفعت عالمگیر؛ سید ابوظفر: مختصر تاریخ ہند اور تاریخ سندھ؛ سید صباح الدین عبدالرحمن: بزم تیموریہ (مغل بادشاہوں کی علمی سرپرستی اور ان کے دربار کے علما و فضلا کا تذکرہ)؛ بزم صوفیہ (عہد تیموری سے قبل کے صاحب تصنیف صوفیہ کا تذکرہ)؛ بزم مملوکیہ؛ ہندوستان کے ازمنہ وسطی کی ایک جھلک؛ ہندوستان کے عہد وسطی کا فوجی نظام؛ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے اور ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے؛ ہندوستان عربوں کی نظر میں (دو جلد، ہندوستان کے بارے میں عرب مصنفین، جغرافیہ نگاروں، سیاحوں اور مؤرخوں کے اقتباسات اور ان کا اردو ترجمہ)؛ ابو ظفر ندوی: گجرات کی تمدنی تاریخ۔

(۹) فلسفہ: عبدالباری ندوی: برکلی اور اس کا فلسفہ؛ اسی مصنف نے مبادی علم انسانی کے نام سے برکلی Principles of Human Knowledge اور فہم انسانی کے عنوان سے ہیوم David Hume: Human Understanding کا ترجمہ کیا؛ افکار عصریہ؛ عبدالماجد دریا بادی: سکالمت (برکلی: Dialogues کا ترجمہ)؛ ظفر حسین خاں: طبقات الامم (جو صاعد الاندلسی کی کتاب کا ترجمہ ہے)؛ عبدالسلام ندوی: انقلاب الامم

سعید انصاری: جلد نہم و دہم (اسوۃ صحابہؓ) اور جلد یازدہم (اسوۃ صحابیاتؓ)، از عبدالسلام ندوی اور جلد دوازدہم (اہل کتاب صحابہؓ) از حافظ مجیب اللہ ندوی؛ ان کے علاوہ تابعینؓ، از شاہ معین الدین احمد اور تبع تابعین، از حافظ مجیب اللہ، کا شمار بھی اسی ضمن میں کیا جا سکتا ہے۔ اس سے قبل کوئی جامع کتاب موجود نہ تھی۔ اس سلسلہ تصنیف نے ایک بہت بڑی ضرورت کو پورا کر دیا۔

(۳) سوانح: بعض مشاہیر اسلام کی نہایت قابل قدر سوانح عمریاں شائع ہوتی ہیں، مثلاً شبلی نعمانی: الفاروقؓ؛ الغزالیؒ؛ المامون؛ سلیمان ندوی: سیرت عائشہؓ؛ غیام؛ حیات شبلی؛ عبدالسلام ندوی: سیرت عمرؓ بن عبدالعزیز؛ امام رازیؒ؛ ابن خلدون (ڈاکٹر طہ حسین کی کتاب کا ترجمہ)۔

(۴) ادبیات: شبلی نعمانی: شعر العجم (پانچ حصے)، فارسی شاعری کی تاریخ؛ عبدالسلام ندوی: شعر الہند (دو حصے)، اردو شعرا اور اصناف سخن کا تذکرہ اور اقبال کامل، اقبال کی زندگی اور شاعری پر سیر حاصل بحث؛ عبدالحی: گل رعنا، اردو شاعری کا تذکرہ؛ کلیات شبلی؛ مکاتیب شبلی (دو جلد)، خطبات شبلی اور مقالات شبلی (آٹھ جلدوں میں شبلی نعمانی کے مذہبی، ادبی، تعلیمی، تنقیدی، تاریخی، فلسفیانہ اور قومی مضامین کا مجموعہ)، مرتبہ سید سلیمان ندوی۔

(۵) تاریخ اسلام: چار جلدوں میں، از شاہ معین الدین احمد: جلد اول میں عہد رسالت و خلافت راشدہ، جلد دوم میں عہد بنو امیہ اور جلد سوم و چہارم میں خلافت عباسیہ کی تاریخ درج ہے۔

(۶) تاریخ علوم و فنون: ارض القرآن، از سید سلیمان ندوی، جس کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے؛ عبدالسلام ندوی: تاریخ فقہ اسلامی، جو محمد خضری: الشریع الاسلامی کا اردو ترجمہ ہے۔

(۷) اسلامی ممالک کی تاریخ و تمدن: اس

(لیسان le Bon کی کتاب کے عربی ترجمے کا ترجمہ)۔

دارالمصنفین کا ایک بڑا کارنامہ، اہنامہ معارف کا اجرا ہے۔ یہ رمضان ۱۴۳۳ھ/ جولائی ۱۹۱۶ء سے سید سلیمان ندوی کے زیر ادارت شائع ہونے لگا اور اب تک باقاعدگی سے نکل رہا ہے۔ [اپنے تحقیقی اور علمی مضامین اور متین و پروقار اسلوب کے اعتبار سے اسے اردو کے بہترین جرائد میں شمار کیا جاسکتا ہے]۔

دارالمصنفین کے ممتاز مصنفین و محققین میں دارالمصنفین کے بانی اور پہلے ناظم، سید سلیمان ندوی (ولادت ۲۲ نومبر ۱۸۸۸ء، م ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء بمقام کراچی)، عبدالسلام ندوی (ولادت ۱۹ فروری ۱۸۸۳ء، م ۱۳ اکتوبر ۱۹۵۶ء بمقام اعظم گڑھ)، شاہ معین الدین احمد ندوی، سید انصاری (م ۱۳ اکتوبر ۱۹۶۲ء، بمقام لاہور)، سید نجیب اشرف (م ۱۹۶۸ء)، سید ریاست علی ندوی، ابو ظفر ندوی اور سید صباح الدین عبدالرحمن بالخصوص قابل ذکر ہیں ان کے علاوہ عبدالباری ندوی، عبدالعاجد دریا بادی اور ابوالحسنات ندوی بھی دارالمصنفین سے منسلک رہے ہیں۔

[یہ صفیں بنگ و ہند میں دارالمصنفین اس لحاظ سے ایک منفرد ادارہ ہے کہ اس کے اپنے کل وقتی مصنفین ہیں، اپنا مطبع ہے، اپنا کتاب خانہ اور اپنا دارالانشاعت رہے اور اپنی سب عمارتیں ہیں۔ ۲۰-۲۱ فروری ۱۹۶۵ء کو اعظم گڑھ میں دارالمصنفین کا پچاس سالہ جشن منایا گیا تھا، جس میں بھارت و پاکستان کے علاوہ کئی دوسرے ملکوں کے نمائندے بھی شریک ہوئے]۔

مآخذ: (۱) سید سلیمان ندوی: حیات شبلی، اعظم گڑھ ۱۹۵۳ء، ص ۶۸۸ تا ۶۹۹؛ (۲) رام بابو سکسینہ: A History of Urdu Literature، مترجمہ مرزا محمد عسکری: تاریخ ادب اردو، مطبوعہ تولکشنور، بار دوم، حصہ ثانی، ص ۷۱ تا ۷۶؛ (۳) سید صباح الدین: دارالمصنفین اور اس کی خدمات، در مقالات پریم شبلی،

مطبوعہ اردو مرکز، لاہور ۱۹۹۱ء، ص ۱۷۲ تا ۱۸۳؛ (۴) سہری الاقادی: انذات سہری، بار چہارم، لاہور ۱۹۸۹ء؛ (۵) بیرون خواجہ: دارالمصنفین، تحقیقی مقالہ برائے ایم۔ اے، در کتاب خانہ جامعہ پنجاب، لاہور، (غلام حسین ذوالفقار اد ادارہ)

دارالندوہ: سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم *

کے عہد میں سگہ معظمہ میں ایک قسم کی شہری جلسہ گاہ۔ اس کی عمارت کعبہ شریف کے شمال میں اس چوک کے دوسری جانب تھی جس میں طواف ہوا کرتا تھا۔ یہ معززین اور شرفاء کے جمع ہونے کی جگہ تھی۔ کہنے ہیں کہ دارالندوہ کو قریش کے جداسجد قصی (رک بان) نے تعمیر کروانا تھا۔ اس کے بعد دارالندوہ عبدالدار کی بھر عبد مناف اور اس کے بیٹے ہاشم اور ہاشم کی اولاد کی وراثت میں آیا۔ کہتے ہیں کہ ظہور اسلام سے قبل قریش کے تمام اہم کام، مثلاً شادی بیاہ، جنگی مجلس، امور عامہ پر مشاورت، شادی کے قابل لڑکوں کی پوشاک کا انتظام، لڑکوں کا خستہ ("لڑا")، لڑائی کے علم کی نفوض یہیں سرانجام دیتے رہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس مقام سے دا اس کے سامنے کے چوک سے تمام تجارتی قافلے روانہ ہوتے اور واپسی پر وہیں آکر رکتے تھے (ابن سعد، ۱/۱: ۳۹)۔

ہنری لامنز Henri Lammens مارتن ہارٹمن Martin Hartmann کے خیال کے مطابق، نیز دیگر قرائن سے، اس بات کی حجت لانا ہے کہ عہد قدیم میں دارالندوہ محض دنیا داروں کی (غیر مذہبی) جگہ نہ تھی بلکہ ایک مقدس عمارت تھی جو مذہبی نوعیت کی معاشرتی رسوم وضع کرنے کا کام دیتی تھی (Les sanctuaires préislamites، ص ۲ تا ۳۳؛ قب مادہ قصی، از G. Levi Della Vida) مگر یہ محض قیاس معلوم ہوتا ہے، اس کے پیش کردہ ثبوت کی کوئی قوی بنیاد نہیں ملتی۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ دارالندوہ ظہور اسلام

پر مشتمل ریاستوں کے زنجیرے کی ایک کڑی تھا۔ اس کا مشرقی ہمسایہ کردفان تھا، جس سے ریت کے ٹیلوں کی ایک پٹی اسے جدا کرتی تھی۔ مغرب میں ودائی واقع تھا۔ صحرائے لیبیا نے شمال کی قدرتی سرحد بنا دی تھی اور بحر الغزال [رگ بان] کی دلدلیں اس کی جنوبی سرحد تھیں۔ دارفور تین بڑے علاقوں پر مشتمل ہے۔ شمالی علاقہ، صحرا کا گیامی کنڑہ ہے، جو شریان قبیلوں کے لیے چارا تو مہیا کرتا ہے مگر اس میں زراعت بہت کم ہوتی ہے۔ وسطی علاقہ (۸۰ درجے ۳۰ ثانیہ شمال سے ۱۰ درجے شمال تک)، جہاں (بہاڑوں میں) بارہ سے پچیس انچ تک بارش ہوتی ہے، مستقل زراعت کرنے والوں کا علاقہ ہے۔ کثیر بارشوں (پچیس تا پینتیس انچ) والا جنوبی علاقہ سویسی رکھنے والے خانہ بدوشوں، "بقارہ" [رگ بان] سے آباد ہے۔ وسطی علاقے میں جبل مرہ کے بلند بہاڑوں کا سلسلہ ۳۰۲۴ میٹر کی بلندی تک پہنچ کر شمال سے جنوب کی طرف چلا گیا ہے۔ دارفور کے شمالی اور جنوبی علاقوں کو مقامی زبان میں "دارالریح" اور "دارالصعید" کہا جاتا ہے۔

وسطی علاقہ مختلف راستوں کا مقام اتصال ہے۔ درب الاربعین [رگ بان] (=چالیس دن کا راستہ) اسیوط سے خارجہ اور سلیمہ ہوتا ہوا کوریہ (Cobbe)، بحوالہ (Urowne) کو جاتا ہے، جہاں ایک چھوٹا سا تجارتی شہر نشو و نما پا گیا۔ ایک اور راستہ دارفور کو طرابلس اور سیرانیکا سے ملاتا ہے۔ کیکایہ، جبل مرہ کے مغرب میں ودائی اور مغربی بلاد السودان کے راستے پر ایک تجارتی مرکز تھا۔ کردفان اور مشرق کو جانے والا راستہ حاجیوں کی گزرگاہ تھا، اگرچہ بعض حجاج مصر سے ہو کر جانے والے لمبے راستے کو ترجیح دیتے تھے۔ ہاتھی دانت اور شتر مرغ کے پروں ایسی چیزوں کے علاوہ دارفور سے غلام بھی برآمد ہوتے تھے، جنہیں وہ جنوب کی جنگلی قوموں سے حاصل کرتے

کے بعد بھی باقی رہا۔ امیر معاویہؓ نے اسے خرید لیا اور بعد ازاں یہ حج کے دوران میں خلفائے بنو امیہ اور بنو عباس کے پہلے خلفاء کی اقامت گاہ کا کام دیتا رہا۔ ہارون الرشید نے ایک مختلف عمارت میں توسیع کر کے اسے اپنی اقامت گاہ ("دارالعمارة") بنایا تھا۔ بعد ازاں دارالندوہ کو زوال آتا چلا گیا۔ تیسری صدی ہجری/ نویں صدی عیسوی کے اواخر میں، خلیفہ المعتضد کے عہد میں اس میں متونوں، محرابی دالانوں اور غلام گردشوں کا اضافہ کیا گیا اور ذیلی عمارت کے طور پر اسے مسجد الحرام میں شامل کر لیا گیا۔

مآخذ: (۱) ابن ہشام، ص ۸۰، ۸۲، ۲۲۳ بعد ۷۸۹: (۲) ابن سعد، ۱/۱، ص ۳۹ بعد: (۳) Wüstenfeld: *Die Chroniken der Stadt Mekka* ج ۱ (۶۱۸۵۸) ص ۶۵ تا ۷۶ (الازرق) ج ۲ (۶۱۸۶۱) بمواضع کثیرہ: (۴) الطبری، ۱: ۱۰۹۸ بعد: (۵) القاسی: *شفاء الغرام* ج ۱ (مکہ ۱۹۵۶) ص ۲۲۶ بعد ۲۳۴ تا ۲۳۶: (۶) *Essai sur l'histoire des : Caussin de Perceval* ج ۱ (۱۸۸۷) ص ۲۳۷ بعد: (۷) *Aunali : Caetani* ج ۱ (۱۹۰۵) بعد: (۸) *Mekka : Snouck Hurgronje* ج ۱ (۱۸۸۸) ص ۱۲: (۹) *Gaudefroy-Demomhynes* ج ۱ (۱۹۱۲) *Le Pèlerinage a la Mekke* ص ۱۵۱ بعد: (۱۰) *La Mecque à la veille de l' : H. Lammens* ج ۱ (۱۹۲۳) *MFOB* ص ۲۲ تا ۲۳: (۱۱) وہی مصنف: *Les sanctuaires préislamiques dans l' Arabie occidentale* (مجلہ مذکورہ) ۲: ۱ (۱۹۲۶) ص ۳۹ تا ۱۷۳: نیز رگ بانہ قسمی۔

(۱۲) PARET

* دارفور: "فور کی سرزمین"، جمہوریہ سوڈان کا ایک صوبہ جو پہلے ایک اسلامی سلطنت تھا۔ جغرافیہ اور باشندے: دارفور "بلاد السودان"

دفعی)، اور جمہلیں [رگہائی] آئے، انہوں نے دارفور میں اسلامی ثقافت اور تجارت کی ترقی میں اہم حصہ لیا ہے۔ اس صوبے کی موجودہ آبادی ۱۳۲۸۵۵۹ ہے (Sudan Almanac، ۱۹۵۹ء)۔

تاریخی ترقیب: اس خاندان کا تاریخی سلسلہ آٹھویں سلطان عبدالرحمن الرشید سے پہلے غیر یقینی ہے۔ براؤن Browne کا خیال ہے کہ سلیمان سلنگ اس کے زمانے سے تقریباً ۱۳۰ - ۱۵۰ سال پہلے یعنی تقریباً ۱۶۴۰ تا ۱۶۶۰ء میں حکومت کرتا تھا۔ تونسوی جو دارفور کی تاسیس کو وڈای اور کردفان کی تاسیس کے ہم زمان سمجھتا ہے، یقین دلانا ہے کہ یہ واقعہ دو سو سال، یعنی تقریباً ۱۶۴۰ء سے پہلے وقوع پذیر نہیں ہوا (تونسوی: Quadāy، ص ۷۵)۔ شقیر کا تاریخی سلسلہ، جو سلیمان سلنگ کے ساتھ چند جامد ناموں کو شامل کر کے نویں صدی ہجری/پندرھویں صدی عیسوی کے وسط تک لے جاتا ہے، بعد کی روایت ہے، اور صاف طور پر جعلی ہے۔ Nachigal سلیمان سلنگ کے عہد حکومت کا آغاز ۱۵۹۶ء بتاتا ہے، جو اصل زمانے سے قدیم تر دکھائی دیتا ہے۔

مسلمانین کے نام اور تخت نشینی کی تاریخیں:

- (۱) سلیمان سلنگ، تقریباً ۱۵۰۵/۱۶۴۰ء؛ (۲) موسیٰ بن سلیمان؛ (۳) احمد بکر بن موسیٰ؛ (۴) محمد دورہ بن احمد بکر؛ (۵) عمر بن محمد دورہ، تقریباً ۱۵۶۱/۱۶۴۳ - ۱۵۷۲ء؛ (۶) ابوالقاسم بن احمد بکر، تقریباً ۱۵۶۳/۱۶۴۳ - ۱۵۷۰ء؛ (۷) محمد تیراب بن احمد بکر، تقریباً ۱۵۷۰/۱۵۷۶ - ۱۵۷۷ء؛ (۸) عبدالرحمن انوشد بن احمد بکر، ۱۵۷۷/۱۵۸۷ء؛ (۹) محمد فضل بن عبدالرحمن، ۱۵۸۷/۱۶۰۰ء؛ (۱۰) محمد حسین بن محمد فضل، ۱۶۰۰/۱۶۲۵ء - ۱۶۳۸/۱۶۳۹ء؛ (۱۱) ابراہیم بن محمد حسین، ۱۶۲۵/۱۶۴۳ء (مصری سودان کے ساتھ دارفور کا الحاق ۱۶۹۱/۱۸۷۶ء)۔ خلیوی اور

نہے۔ ان میں بہت سے "درب الاربعین" کے ذریعے مصر جانے تھے۔ کردفان کی ریلوے، جو (الایض ElObcid) کو خرطوم اور بندر سودان سے ملاتی ہے، اس کی تعمیر ۱۹۱۱ء میں پایہ تکمیل کو پہنچی اور ۱۹۱۶ء میں اسے دارفور سے بھی ملایا گیا، نتیجہً شمال کو جانے والے راستوں کی اہمیت ختم ہو گئی۔ دارالحکومت بالآخر موجودہ مقام انفاشر آرک بان [۱۶۰۶/۱۶۰۶] میں قائم ہوا۔ "نفاشر" نام سلطان کی اقامت گاہ پہلے ہر عہد حکومت میں بدلتی رہتی تھی، قدیم ترین سلاطین کا صدر مقام جبل مرہ تھا۔

دارفور کے باشندے مختلف نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ فور (دیکھیے The Fur: A.C. Heatun، در Sudan، notes and records، ۲۹/۱، ۱۹۳۸ء) ص ۱ تا ۹) حبش نژاد قوم ہے۔ شروع سے ان کی بود و باش جبل مرہ میں تھی، پھر اطراف کے قبیلوں پر اپنی قیادت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ کنجاہ سے، جو فور کے تین قبیلوں میں سے ایک ہے، اکبرہ کے شاہی خاندان کا ظہور ہوا اور بروئے روایت مسلمانوں کا بھی، جنہوں نے کردفان میں اپنی ماضیت قائم کی۔ یہ بھی روایت ہے کہ اس علاقے میں فور سے پہلے فجر قوم کو غلبہ حاصل تھا اور اس سے پہلے داجو کو۔ ان دونوں کے اخلاف ابھی تک دارفور میں موجود ہیں۔ عربوں کی آمد نے نسلی قسم کی تشکیل میں بڑا حصہ لیا ہے۔ قبائلی گروہ، جو قوم جہینہ کی آٹھویں صدی ہجری/چودھویں صدی عیسوی کی بہت بڑی بلغار میں ان کے ساتھ مشرقی بلاد السودان میں وارد ہوئے تھے، ان کی نمائندگی اب شمالی علاقے کے شتریان عرب اور جنوب کے بقارہ کرتے ہیں۔ "قراہ" نام کا اطلاق، جو کبھی شتریان عربوں کے ایک گروہ پر مشترکہ طور پر ہوتا تھا، اب متروک ہو گیا ہے۔ بھاری قبائل میں رزاقات اور تعاشہ قابل ذکر ہیں۔ انفرادی طور پر وادی نیل کے سودان کے جو عربی نژاد اہل قوم، براہرہ آرک بان، دناقلہ (دیکھیے

مہدی کے عہد اقتدار کے برائے نام سلاطین: (۱۲) حَسْبُ اللہ بن محمد فضل: (۱۳) بوش بن محمد فضل: (۱۴) ہارون بن سیف الدین بن محمد فضل: (۱۵) عبد اللہ دود بَنَجہ بن بکر بن محمد فضل: (۱۶) یوسف بن ابراہیم: (۱۷) ابوالہریرہ ابن ابراہیم۔

احیاء شدہ سلطنت: (۱۸) علی دینار بن زکریا ابن محمد فضل، ۱۲۱۶ھ/۱۸۹۸ء (دارفور کا الحاق انگریزی - مصری سوڈان کے ساتھ، ۱۹۱۶ء)۔

سلطنت کے متعلق روایات: مقامی وقائع کے فقدان کے سبب ہم معلومات کے لیے بیرونی مبصروں پر انحصار کرتے ہیں۔ ان میں سے اہم ترین تونسوی عرب محمد بن عمر التونسی ہے، جس کی ہشت سالہ سیاحت کا آغاز ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء میں ہوا۔ دوسرا، جرمن Gustar Nachtigal، جو ۱۸۹۴ء میں دارفور میں تھا، پھر آسٹروی Rudolf v. Statin (گورنر ۱۸۸۱ء تا ۱۸۸۳ء) اور لبنانی نعوم شقیر مشترک حکومت کے محکمہ سراغ رسانی کا ایک ملازم، جس کا سب سے بڑا خبر رساں شیخ الطیب (م ۱۹۰۲ء) تھا، جو پہلے سلطان ابراہیم کا "امام" تھا۔

کیرہ کے سلسلہ نسب سے متعلق جو تناقضات ہیں ان پر التونسی Nachtigal اور شقیر کی نظر پڑی تھی۔ یہ نسب نامے عوامی روایات کے سورماؤں کو، جن میں سے بڑے بڑے احمد المعقور، دالی اور سلیمان سنّ (العرب) تھے، بہ تکلف ایک رشتے میں منسلک کرنے کی کوششیں ہیں۔ اس روایت کے اختلافات کی تفصیل یہاں نہیں دی جا سکتی۔ احمد المعقور تونسوی عرب کو، جو ہلالی یا عباسی اصل سے تھا، ان تنجری حکمرانوں کے جتہ امجد کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جو کیرہ خاندان سے پہلے ہوئے یا تنجری اور کیرہ خاندانوں کی (ازدواجی رشتوں کے ذریعے) درمیانی کڑی تھے۔ اس کا بیٹا (یا زیادہ دور کی اولاد میں) دالی کو ریاست

فوراری کا ناظم اور آئین ساز بتایا گیا ہے۔ دالی کی اولاد میں سلیمان سنّ ہوا، جو ایک عرب خاتون کا بیٹا تھا اور دین اسلام کو رواج دینے کا سہرا اسی کے سر باندھا جاتا ہے۔ وہ سب سے پہلا تاریخی حکمران ہے۔ ممکن ہے احمد المعقور عربوں کے تنجروں (یا فوروں) کے ساتھ خلط ملط ہو جانے کی تاریخی حقیقت کی یاد دلاتا ہو، یا بہ عربوں کی آمد کی تاریخ کو اور قدیم بنانے کے لیے ایک بعد کی گھڑی ہوئی روایت ہو۔ لقب "المعقور" (لنگڑا) عربی لفظ ہے۔ اس کی تشریح Stalin اور شقیر نے ایک صریح افسانوی روایت کے ذریعے کی ہے۔ دالی (یا دہل بحر) ایک تاریخی فرد ہو سکتا ہے یا ممکن ہے قبل از اسلام کیرہ کے حکمرانوں کی روایتوں کا مجسم نمائندہ ہو۔ سلیمان سنّ، جو ایک مجاہد اور منتظم گزرا ہے، دالی کا مسلمان مثنی تھا، جس کی سوانح میں شاید بعض وہ روایات بھی شامل ہو گئی ہیں جو اصل میں دالی سے منسوب تھیں۔ غالباً سلیمان خاندان کیرہ کا بانی نہ تھا بلکہ محض پہلا مسلمان حکمران تھا۔ یہ دعوے کہ شاہی خاندان بنو ہلال یا عباسیوں کی اولاد سے ہے بناوٹی ہیں اور علی الترتیب شمالی افریقہ کے اور وادی نیل کے سوڈانی اثر و نفوذ کا آئینہ دار ہے۔ زیادہ قریب قیاس یہ روایت معلوم ہوتی ہے کہ کیرہ خاندان مسیحات اور ودانی کے حکمران گھرانے سمیت فزارہ کی اولاد سے تھا۔ یہ بات اس روایت سے مطابقت رکھتی ہے کہ سلیمان کی فتوحات خانہ بدوش عربوں کو حلیف بنانے سے حاصل ہوئی تھیں۔

ہو سکتا ہے کہ دارفور میں اشاعت اسلام کا آغاز سلیمان نے کیا ہو، لیکن اس حصے میں پوری طرح اسلام پھیل جانے میں دیر لگی۔ انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی تک یہاں غیر اسلامی رسوم کا برابر رواج رہا، جسے تمام مبصروں نے ملاحظہ کیا ہے۔ دین کی تعلیم دینے والے ("انک") بجائے

اس کے علاقوں پر قبضہ جما لیا۔ اس افسانے کا کہ تیراب نے آم دُرمان Omdurman تک چڑھائی کی اور عبداللہی فوج کو شکست دی، التونسی یا Nachtigal نے ذکر نہیں کیا اور یہ بعد کا، غالباً مہدی کے عہد کا، اضافہ ہے۔ تیراب کردفان میں بارہ تے مقام پر فوت ہوا، کہا جاتا ہے کہ اس کے اسراء کے اسے زہر دیا تھا۔

تیراب کی موت کے بعد اسحق اور احمد بکر کے بیٹوں کے حامیوں میں جانشینی کی جنگ چھڑ گئی۔ مؤرخ الذکر فریق نے انجام کار احمد بکر کے بیٹے عبدالرحمن الرشید کو اپنا سلطان منتخب کر لیا، وہ باپ کی وفات کے بعد پیدا ہوا اور ایک پڑھنے والا، علم دوست نوجوان تھا۔ یہ انتخاب محمد کرہ کی کوشش سے ہوا، جو مرحوم سلطان کا خواجہ مرا تھا۔ اسے عبدالرحمن نے اپنا وزیر اعظم مقرر کیا۔ کرہ نے بعد میں کردفان پر ایک اور چڑھائی کی اور وہاں چند برس حکومت کی۔ عبدالرحمن کے عہد حکومت میں تجارت اور اشاعت دین دونوں کی ترقی ہوئی۔ اس عہد میں یہ ترقی اہل نوبہ کے دارفور میں ورود سے منسوب کی جاسکتی ہے، جو وادی لیل کے سوڈانی علاقے میں فتجی قوت کے زوال کے باعث آئے تھے۔ عبدالرحمن اور عثمانی سلطان کے درمیان تحائف کے تبادلے، ایک انگریز سیاح W.G. Browne کی ۱۷۹۳ - ۱۷۹۶ء میں آمد اور ۱۷۹۹ء میں بوناپارٹ Bonaparte کے ساتھ خط و کتابت اس بات کی دلیل ہیں کہ مصر کے ساتھ تجارت کے ذریعے دارفور کے بیرونی دنیا سے روابط بڑھے (فرانسیسی متن در *Pieces diverses et correspondance relatives aux opérations de l'armée d'orient en Egypte* IX AN، ص ۱۸۷ تا ۲۱۷)۔ ایک مملوک پناہ گزین کو، جو بونا پارٹ کے ہاتھوں سے بچ کر آیا تھا، دارفور میں پناہ دی گئی، لیکن پھر سلطان کے خلاف سازش کرنے کی پاداش میں اسے ہلاک کر دیا گیا۔

”فتیہ“ اور اس کی جمع ہائے ”فتیہا“ یہاں استعمال ہوتی ہے (زیادہ تر مغربی ”بلاد السودان“ سے اور دریائے نیل کے خطے سے آئے۔ یہ دونوں خطے ابسے ہیں جہاں مالکی مذہب کا غالب ہے۔ سلطان کے فوراً بعد جو سلاطین ہوئے ان کے متعلق تحریری حالات بہت کم ملتے ہیں۔ اس کا دوسرا جانشین احمد بکر صرف اس لیے قابل ذکر ہے کہ وہ متعدد بیٹوں کا باپ تھا، جن میں سے پانچ اس کے بعد سلطان بنے۔ دارفور اور ودائی دونوں کی روایتوں میں اس بات کی یاد محفوظ ہے کہ ان دو سلطنتوں کے درمیان مسلسل جنگیں ہوتی رہیں، ان کا آغاز احمد بکر کے عہد میں ہوا، اور اس وقت تک جاری رہیں جب تک کہ محمد تیراب نے اپنے عہد حکومت کے اوائل میں ودائی کے سلطان جوڈہ سے صلح نہ کر لی۔ کہا جاتا ہے کہ عمر اور ابوالقاسم دونوں سلطان انہیں جنگوں میں مارے گئے جن میں ودائیوں کا پلہ عموماً بھاری رہا۔

سلطنت مابعد: محمد تیراب کے عہد حکومت کے ساتھ مفصل روایات کا آغاز ہوتا ہے۔ وہ التونسی کی مباحث کے صرف سواہ برس پہلے فوت ہوا۔ اسے ایک عیسائی پسند اور مرنے والے جو شخص کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، لیکن اس کے عہد حکومت کا اختتام کردفان کے مسیحاوی حکمران سلطان ہاشم کے ساتھ لڑائی میں ہوا۔ مختصمانہ کارروائیوں کا بہانہ یہ کیا گیا تھا کہ ہاشم دارفور کی سترقی سرحد پر دست درازی کر رہا ہے۔ لیکن التونسی کا خیال ہے کہ تیراب کی اصلی نیت یہ تھی کہ وہ احمد بکر کے بیٹوں کے بجائے اپنے بیٹے اسحق کی فائدہ جانشینی کو محفوظ کر لے۔ اس جنگ میں اسحق الملقب بہ ”الخلیفہ“ (=جانشین) بطور نائب السلطنت دارالحکومت میں رہا اور سلطان کے بھائی اور وزیر سلطان کی معیت میں مہم پر گئے۔ ہاشم کو کردفان سے نکال دیا گیا اور اس نے سنار کے قلعی سلطان کے ہاں پناہ لی، اور فوراً ہی فوج نے

بصارت جاتی رہی اور اسور سلطنت کو اس کی بہن "ایا بسی" زمزم سر انجام دیتی تھی۔ اس کا جانشین سلطان ابراہیم جلد ہی وزیقات کے مسئلے میں سوڈانی ملک التجار الزبیر رحمہ منصور کے ساتھ لڑائی جھگڑوں میں الجھ گیا، جس کی نگرانی میں مغربی بحر الفزال کا نظم و نسق آگیا تھا۔ الزبیر نے "حکمدار" اسمعیل پاشا ایوب کے ساتھ (جو مشرق سے فوج لایا تھا) ساز باز کر کے، دارفور پر جنوب سے حملہ کیا۔ ابراہیم کو الزبیر کے ہاتھوں شکست ہوئی اور وہ منوالشی کی جنگ میں ۲۴ اکتوبر ۱۸۷۳ء کو مارا گیا۔ دارفور کا الحاق مصری سوڈان کے ساتھ ہو گیا۔ عہد خدیوہ و عہد مہدویہ: فوراً ہی لوگ جبل مرہ میں ٹھکانا بنا کر نام نہاد سلطانوں کے ایک سلسلے کے تحت اپنی بقا کے لیے مقاومت کرتے رہے۔ پہلے تشب اللہ بن محمد فضل نے الزبیر کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور اسے فوراً ہی شہزادوں اور اکابر کی ایک بڑی تعداد کے ساتھ مصر بھیج دیا گیا۔ اس کے بھائی اور جانشین بوش نے ایک خطرناک بغاوت کی، لیکن وہ الزبیر کے بیٹے سلیمان کے ہاتھوں مارا گیا۔ ۱۸۷۷ء میں لیا محصول عائد ہونے پر ایک اور بغاوت ہوئی، جس کی قیادت محمد فضل کے پوتے ہارون نے کی۔ اس نے صوبائی دارالحکومت الفاشر کا محاصرہ کیا، لیکن اسے جبل مرہ کی طرف واپس دھکیل دیا گیا اور وہ ۱۸۸۰ء میں انور بیگ محمد عنقرہ کے ہاتھوں مارا گیا، جسے بعد میں ایک مہدوی سردار کی حیثیت حاصل ہوئی۔ اس کے بعد محمد فضل کے ایک اور پوتے عبداللہ دود بنجہ نے جبل مرہ میں سلطنت کی باگ اپنے ہاتھ میں لی۔

۱۸۸۱ء میں مہدوی انقلاب برپا ہو جانے سے دارفور میں نازک صورت حال پیدا ہو گئی، کیونکہ فوج اور انتظامیہ کے متعدد عمال کی ہمدردیاں مہدی کے ساتھ تھیں، جو انہیں کی طرح سوڈان کے ساحلی

عبدالرحمن کے چھوٹے بیٹے محمد فضل کو محمد کرہ نے ۱۸۲۱ء/۱۸۰۰-۱۸۰۱ء میں سلطان بنا دیا، لیکن حکمران اور اس کے وزیر کے درمیان ناچاقی پیدا ہو گئی اور کرہ رجب ۱۲۱۹ھ/اکتوبر-نومبر ۱۸۰۴ء میں ہلاک کر دیا گیا۔ فضل کا طویل عہد حکومت زوال پذیری کا زمانہ تھا۔ مصر کے محمد علی پاشا نے اپنے داماد محمد بن خسرو "دقتدار" کی قیادت میں ایک مہم بھیجی، جس نے کرد فان کے اوراوی والی "مقدم" مسلم کو ۱۸۲۱ء میں بارہ کے مقام پر شکست دی اور صوبے کا الحاق کر لیا۔ لیکن وادی نبل میں بغاوت ہو جانے کے باعث "دقتدار" دارفور کی فتح سے باز رہا۔ محمد عبدالکریم صابون، سلطان ودائی نے دار نامہ کو، جو دارفور کی باج گزار ریاست تھی، تہ و بالا کر دیا اور اس سے خراج وصول کیا۔ فضل نے صابون کی موت کے بعد اس کے ایک بھائی کو حصول تخت کے سلسلے میں مدد دی، لیکن وہاں اپنے زیر سیادت حکومت قائم کرانے میں ناکام رہا۔ بقرہ، خصوصاً وزیقات بھی اس عہد میں حکومت کو بہت پریشان کرتے رہے۔

فضل کے جانشین محمد حسین کو ایک مدعی محمد ابو مدین بن سلطان عبدالرحمن سے خطرہ لاحق ہو گیا۔ محمد علی پاشا سلطان عبدالحمید کے ایک فرمان (۱۳ فروری ۱۸۳۱ء) دیکھیے J.C. Hurewitz: *Diplomacy in the Near and Middle East* نیویارک ۱۹۵۶ء (۱: ۱۲۰) کی رو سے دارفور کا دعویٰ دار تھا، اس نے ابو مدین کی حمایت کی اور مصر سے بھیجنے کے لیے فوج تیار کی گئی، لیکن اس مہم کو مصری سوڈان کے اولوالعزم "حکمدار" احمد پاشا ابودان کے رمضان ۱۲۵۹ھ/ستمبر-اکتوبر ۱۸۴۳ء میں انتقال کر جانے پر ترک کر دیا گیا۔ حسین اور بعد کے خدیو سعید اور اسمعیل کے درمیان تعلقات دوستانہ رہے۔ حکومت کے آخری برسوں میں حسین کی

باہر شکست کھا کر فرار ہوئے (فروری ۱۸۸۹ء)۔
ابو الخیرات جبل مرہ کی طرف بھاگ گیا، جہاں وہ
۱۸۹۱ء میں اپنے غلاموں کے ہاتھوں مارا گیا۔
عثمان آدم نے اس صوبے میں دوبارہ اپنی حکومت قائم
کی، خصوصاً بقارہ پر، جنہوں نے خدیوی حکومت کے
خلاف تو مہدیہ کی حمایت کی تھی، لیکن اب مہدی
تسلط سے ناراض تھے۔ خلیفہ کی قبائلی حکمت عملی،
جس پر عثمان آدم نے عمل درآمد کیا، تین بیادوں پر
قائم تھی: موروثی رئیسوں کے بجائے نئے رئیس نامزد
کرنا؛ ام درمان کی طرف قبائل کو دھکیلنا اور قبائلی
رقابتوں سے فائدہ اٹھانا۔ خود خلیفہ کے قبیلے التعابشہ
کی بڑی ہیبت عثمان آدم کے ہاتھوں ۱۸۸۸ء میں
شروع ہوئی اور اس سے حکومت مہدیہ کے لیے اہم
عواقب ظہور پذیر ہوئے۔

۱۸۹۱ء میں عثمان آدم کا انتقال ہو گیا اور اس کی
جگہ محمود احمد والی دارفور بنا، جو آدم کی طرح
خلیفہ کا رشتے دار تھا۔ ۱۸۹۳ء میں کانگو سے بلجیم
کی ایک مہم صوبے کے جنوبی کنارے تک پہنچ گئی
اور انہوں نے فروق قبیلے کے سردار کے ساتھ ایک
معاہدہ کر لیا، لیکن بعد ازاں جلد ہی یہ لوگ واپس
ہو گئے (دیکھیے Traduction de documents : A. Abel
Bull. de l'Academie royale des sciences coloniales
۱۹۵۳ء، ۵/۲۵ : ۱۳۸۵ تا ۱۴۰۹)۔ ۱۸۹۶ء میں،
محمود کو ام درمان واپس بلا لیا گیا تاکہ وہ انگریزی
مصری حملے کے خلاف مہدی فوجوں کی قیادت کرے۔
علی دینار کا عہد حکومت اور تاریخ مابعد: جب
۱۸۹۸ء میں حکومت مہدیہ کا خاتمہ ہو گیا تو
محمد فضل کے ایک پوتے علی دینار نے، جس کی مہدیہ
میں یوقلموں زندگی گزری تھی (دیکھیے A fragment
from All Dinar Sudan notes and records، ۱/۳۳،
۱۹۵۳ء : ص ۱۱۳ تا ۱۱۶)، الفاشر پر قبضہ کر کے

علاقے کا باشندہ تھا۔ دوسری طرف فور اور رزینقات
دونوں ہی خدیو کی حکومت کا تختہ الٹ دینا چاہتے
تھے۔ مہدی کے اٹھنا پر قبضہ کر لینے اور Hicks کی
مہم کے ناکام ہو جانے کے بعد (جنوری اور
نومبر ۱۸۸۳ء) مصر کے آسٹروی گورنر Slatin کا
سلسلہ مواصلات منقطع ہو گیا اور اس نے دسمبر میں
محمد بیگ خالد کے سامنے ہتھیار ڈال دیے، جو دارہ کا
سابق نائب والی تھا اور جسے مہدی نے دارفور میں
اپنا نائب مقرر کیا تھا۔

۱۸۸۳ء میں، مہدی کی ایک فوج نے دودبجہ
کو گرفتار کر لیا، جو بعد میں مہدی فوج میں بطور
سردار شامل ہو گیا۔ ۱۸۸۵ء میں مہدی کی وفات کے
بعد محمد خالد نے اشراف (یعنی مہدی کے رشتے داروں)
کے ساتھ مل کر نئے حکمران خلیفہ عبداللہ بن محمد
[رک بان] کو یہ دخل کر دینے کی سازش کی۔ اس نے
فوج کی اچھی خاصی تعداد لے کر ام درمان پر چڑھائی
کی، لیکن اس کا راستہ روک لیا گیا اور بارہ کے مقام پر
اسے گرفتار کر لیا گیا (اپریل ۱۸۸۶ء)۔ اس نے دارفور
کی حکومت سلطان ابراہیم کے ایک بیٹے یوسف کے
سپرد کی تھی، جس نے ۱۸۸۷ء میں سلطنت کو بحال
کیا۔ ولی کردغان عثمان آدم کی قیادت میں ایک لشکر
نے ۱۸۸۸ء میں انائل میں یوسف کو شکست دی
اور مار ڈالا۔ اب عثمان نے دارفور کی حکومت بھی
سنبھال لی۔

چند ماہ بعد دارفور میں حکومت مہدیہ کا شیرازہ
بکھر گیا۔ یہ ایک بغاوت کا نتیجہ تھا جو مسیح موعود
کے ایک داعی ”قی“ ابو جیمزہ کے تحت دار قامہ میں
شروع ہوئی۔ فور کا برائے نام سلطان ابو الخیرات
(برادر یوسف بن ابراہیم) اپنے حامیوں سمیت ابو جیمزہ
سے مل گیا۔ افواج مہدیہ کو دو لڑائیوں میں زبردست
شکستیں ہوئیں۔ اسی اثنا میں ابو جیمزہ کا چیچک کی
بیماری سے انتقال ہو گیا اور اس کے پیرو الفاشر کے

خود سلطان بن گیا۔ اگرچہ وہ خرطوم کی انگریزی - مصری مشترکہ حکومت کا رسمی طور پر مطیع و منقاد تھا لیکن بہت عرصے تک خلیفہ کی اس حکمت عملی پر کامیابی سے عمل پیرا رہا کہ اپنے مقبوضات میں سے فرنٹیروں کو نکال باہر کرے۔ حکومت سہدیہ کا ایک باقی ماندہ فرد سنین حسین، جو عثمان آدم کے وقت سے کبکایہ کا حاکم تھا، علی دینار کے مقابلے میں آیا اور اب اس نے حکومت مشترکہ کی حمایت حاصل کرنے کی ناکام کوشش کی۔ سنین کو حتمی شکست ۱۹۰۸ء سے پہلے نہ ہو سکی۔ علی دینار کو اپنے پیش روؤں کی طرح ایک طرف بٹارہ پر اور دوسری جانب دارفور اور وڈائی کی درمیانی (Buffer) ریاستوں پر اپنا اقتدار جمانے میں مشکل پیش آئی، جب فرانس نے ۱۹۰۹ء میں وڈائی پر قبضہ کر لیا تو مغربی سرحد کا مسئلہ زیادہ سنگین ہو گیا۔ فرانسیسیوں نے دارفور پر برطانوی اثر و رسوخ کو تو تسلیم کر لیا، لیکن وہ درمیانی ریاستوں پر اپنا قبضہ جمانا چاہتے تھے۔ اگرچہ انگریزوں نے (سوڈان کی) مشترکہ حکومت کے وسیلے سے فوراً دعووں کی شد و مد سے حمایت کی مگر سلطان خاصا عرصہ لڑتے رہنے کے بعد فقط دارالممالت کو قبضے میں رکھ سکا۔ ایک طرف فرانس کے روز افزوں اقتدار کا دباؤ تھا اور دوسری طرف مشترکہ حکومت کے خلاف بے دریغ مقامی لوگوں کی شکایات آ رہی تھیں، جن سے تنگ آ کر علی دینار پہلی عالم گیر جنگ میں عثمانی ترکوں کی طرف مائل ہوا۔ تب یہ بہانہ کر کے کہ دارفور کی طرف سے حملہ ہوئے والا ہے، مشترکہ حکومت نے اس کے خلاف لشکر کشی کی۔ سلطان کی فوج کو الفاشر کے نزدیک ۲۲ جولائی ۱۹۱۶ء کو شکست ہوئی اور وہ خود بھی ۶ نومبر کو مارا گیا۔

علی دینار کا کاٹا نکل جانے کے بعد مغربی سرحد کا فرانسیسیوں سے تصفیہ ہو گیا۔ آخری سمجھوتا ۱۹۱۹ء میں ہوا، جس کی رو سے دارفور، دار فہر، نیز

دارالممالت کا دو تہائی حصہ اپنے قبضے میں رکھنے کا مجاز ہو گیا، جس کے ایک حصے کو وہاں کے حکمران نے ۱۹۱۲ء میں فرانسیسیوں کے حوالے کر دیا تھا۔ سرحد کی حد بندی کا کام ۱۹۲۳ء میں مکمل ہوا۔ اگرچہ سہدی کے ایک داعی کے تحت نیالہ کے مقام پر ۱۹۲۱ء میں بعد از وقت شروع ہوا لیکن اس کے باوجود دارفور میں امن بحال کرنے کا کام مشکل نہیں تھا۔ البتہ دارفور کے الحاق میں جو تاخیر ہوئی اس کے باعث ایسے انگریزی - مصری سوڈان کی ترقی کے ابتدائی مرحلے میں کوئی حصہ نہیں ملا بلکہ مشترکہ حکومت کے آخری سنین تک وہ دوسرے علاقوں سے الگ تھلگ اور پس ماندہ صوبہ رہا۔ ۱۹۳۷ء سے ہوائی مواصلات کے اجراء مدارس کی ترقی اور جنوبی کرد فاف میں سے نیالہ تک ریلوے لائن کی تعمیر (جو اپریل ۱۹۵۹ء میں مکمل ہوئی) اس پر دلالت کرتے ہیں کہ دارفور اب جدید سوڈان سے کامل طور پر متحد ہو گیا ہے۔

نظم و نسق کی تاریخ : کثیرہ سلاطین کے تحت انتظامیہ کے قواعد و ضوابط کو التوتوسی نے، اور زیادہ باقاعدگی سے Nalligal نے بیان کیا ہے۔ اس میں اسلامی خصوصیات بہت کم تھیں، تقریباً تمام عہدوں کے نام فوراً ہی تھے، عربی نہیں تھے۔ اس میں سب سے بڑا استثناء سلطان کے ذاتی نمائندے ("مقدم"، جمع: "مقادیم") تھے، جن کا تقرر عموماً چند سال کے لیے ہوتا تھا اور وہ اپنے اپنے صوبوں میں کامل اختیارات استعمال کرتے تھے۔ شاہی بیگمات باوقار مقام رکھتی تھیں۔ مادر ملکہ کا سلطنت میں دوسرا درجہ ہوتا تھا، لیکن اس سے بھی زیادہ حقیقی قوت کی حامل "ایابیسی" تھی، جو عام طور پر سلطان کی بہن ہوتی تھی۔ غلام اور خواجہ سرا اہم کردار ادا کرتے تھے۔ وزیراعظم، جو بلحاظ عہدہ مشرقی صوبے کا والی بھی تھا، ایک خواجہ سرا تھا۔ اس عہدے دار

مسائل اور انتظامیہ کا ڈھانچہ ورثے میں ملا تھا۔ دارفور پر، جو بعد میں "عمالت العرب" کے صوبے میں کردغان سے ملا دیا گیا تھا، ایک فوجی حاکم (شروع میں "امیر عموم" بعد میں "عامل عموم" دارفور) حکومت کرنا تھا۔ "اولاد العرب" (قبائلی دستے) اور "جہادیہ" (زنگیوں کی فوج) اس کے زیر قیادت ہوتے تھے۔ جہادیہ میں نیز فوجی اور شہری عمال میں بیشتر ایسے تھے جو سابقہ خدیوی حکومت کے تحت رہ چکے تھے۔ والی کی ماتم درمان سے برابر مرسلت رہتی تھی، لیکن اس کا اپنا صوبائی "یت المال" ہوتا تھا۔

علی دینار کے تحت بحال شدہ سلطنت نے خلیفہ کے مرکزی نظام کی بہت سی خصوصیات کو دوبارہ تازہ کیا۔ اصل میں یہ ایک مطلق العنان عسکری حکومت تھی، جس کے تحت قدیم فوراًوی محکمے، نیز مقدموں کا نظام متروک ہو گیا، اور "منادیب" (واحد: "مندوب"۔ خصوصی نائب) محصول وصول کرتے اور صوبوں میں سلطان کی نمائندگی کرتے تھے۔ مقربین اور غلاموں کا مرکز میں بڑا اثر و رسوخ ہو گیا تھا۔ مہدوی نظام کے اثرات قاضیوں کی خود مختارانہ تنظیم اور محصولات کے نظام میں دیکھے جاسکتے ہیں، جو خلیفہ کے زمانے کے نظام سے گہری مشابہت رکھتے ہیں۔

۱۹۱۶ء میں دارفور کے الحاق کے بعد صوبے کا انتظام ایک برطانوی گورنر اور ضلعی کمشنروں کے ہاتھ میں رہا، جو پہلے فوج کے عہدے دار تھے۔ ملکی نظم و نسق کے تجربات سے بعض مفید تبدیلیاں ظہور میں آئیں: خصوصاً عدالتی فرائض مقامی عمائد کو منتقل کرنے سے، لیکن انہیں تجربوں کی وجہ سے یہ کوشش بھی ہوئی کہ مقامی حاکموں کو بہت سے نئے اختیارات دیے جائیں یا سابقہ اختیارات بحال کیے جائیں حالانکہ یہ صورت حالات زمانے کے مطابق نہ تھی۔ ایسی حکمت عملی کی طرف جس پر سابقہ سلاطین اور صوبے دار یکے بعد دیگرے عمل کرتے رہے تھے، پھر

کے اختیارات بادشاہ گر محمد کرہ کی وفات کے بعد کم کر دیے گئے۔ ایک روایت، کہ ابوالقاسم کے رشتے دار جنگ میں اس کا ساتھ اس بنا پر چھوڑ گئے تھے کہ اس کا رجحان حبشیوں کی طرف تھا، غالباً اس بات کی علامت ہے کہ آزاد قبائلیوں کو نظر انداز کر کے محل سرا کے غلاموں کو فوج میں زیادہ بار مل گیا تھا۔ سلطان محمد حسین نے غلام فوج کی از سر نو تنظیم کی۔ اسی نے اپنے لشکر کو آتشیں ہتھیاروں سے مسلح کیا تھا۔ غلام سپاہیوں کے علاوہ فوج میں وہ جنگجو بھی شامل ہوتے تھے جنہیں بوقت ضرورت صوبائی حکام بلا لیتے تھے۔ اسلامی اثرات زیادہ تر شاہی دفتر کے طور طریقوں اور مالکی مذہب کے مطابق قانون شریعت کی قبولیت میں نظر آتے ہیں۔ تاہم قدیم رواجی قانون بالکل متروک نہیں ہوا۔ کتاب دالّی، جس میں، کہا جاتا ہے کہ اس قانون کی تدوین کی گئی تھی، غالباً فرضی روایت ہے یا ممکن ہے کہ نام رواجی قانون کے معرض تحریر میں لانے کی کوششوں کے لیے استعمال کیا گیا ہو، (دیکھیے *The History of Darfur: A.J. Arkell*، ۱۲۰۰ تا ۱۹۵۲ء ج ۳، در *Sudan notes and records*، ۱/۳۳ تا ۱۹۵۲ء ص ۱۳۵ تا ۱۳۶)۔

الزیر کی فتح کے بعد، جہاں تک حالات نے اجازت دی، نظم و نسق کو مصری سوڈان کے دیگر حصوں کے مسائل بنا دیا گیا۔ "مدیر عموم دارفور" (والی یا صوبے دار) کا صدر مقام الفاشر تھا، جبکہ "مدیر" (نائب والی) الفاشر، شکا (خطۃ ریقات پر لگرائی رکھنے کے لیے)، دارہ (جنوب سے دارالحکومت کی طرف جانے والے راستے پر) اور کبکیاتیہ (ودانی کی گزرگاہ پر) میں مقیم ہوتے تھے۔ ان والیوں کے ناووں کی فہرست R.L. Hill نے *Rulers of the Sudan*، ۱۸۲۰ تا ۱۸۸۵ء، در *Sudan notes and records*، ۱/۳۴ تا ۱۹۵۱ء، ص ۸۵ تا ۹۵، میں مرتب کی ہے۔

حکومت مہدیہ کو اس کی پیشرو حکومت کے

'Sudan' کیمرج ۱۹۲۲ء: ۱: ۵۲ تا ۱۲۸: (۷) وہی مصنف: 'The Anglo-Egyptian Sudan' لندن ۱۹۳۳ء
 ص ۱۲۵ تا ۱۳۷: (۸) R. [L.] Hill 'A biographical dictionary of the Anglo-Egyptian Sudan' اوکسفورڈ
 ۱۹۵۱ء متعدد ملاحظات: (۹) P. M. Holt 'The Mahdist state in the Sudan' اوکسفورڈ ۱۹۵۸ء
 ص ۶۶ تا ۶۸، ۱۲۷ تا ۱۳۰، ۱۳۲ تا ۱۳۶: (۱۰) متعدد مقالات، در 'Sudan notes and records' خرطوم
 ۱۹۱۸ء: (۱۱) معلومات جو A.B. Theobald نے بہم پہنچائی تھیں جس کا مقالہ 'Darfur and its neighbours under Sultan 'Ali Dinar,' شائع ہونے والا ہے، در 'Sudan notes and records' خرطوم کے سرکاری دفترخانوں میں مہدیہ، علی دینار کے عہد حکومت اور مشترک عہد حکومت کے مواد کا خام ذخیرہ موجود ہے۔

(P. M. Holt)

الدار قطنی: ابوالحسن علی بن عمر بن احمد *

بن مہدی [الشافعی] ایک نامور محدث، جتھیں "امیر المؤمنین فی الحدیث" کا لقب دیا گیا، ۵۳۰ھ/ ۱۱۳۸ء میں بغداد [کے ایک محلے قطن] میں پیدا ہوئے [اور اسی کی نسبت سے الدار قطنی مشہور ہوئے]۔ اپنے زمانے کے مشاہیر محدثین سے حدیث کی تعلیم کے لیے سفر کیا اور اس سلسلے میں بصرہ، کوفہ، واسط، شام اور مصر پہنچے۔ قرآن مجید کی قراءت کا درس ابن مجاہد (م ۳۲۳ھ/ ۹۳۵ء)، محمد بن الحسن النقاش (م ۳۵۱ھ/ ۹۶۲ء) اور دیگر اساتذہ سے لیا (ابن خلکان) اور فقہ کی تعلیم ابوسعید الاصبغری (م ۳۲۸ھ/ ۹۳۹ء - ۹۴۰ء) سے حاصل کی۔ الدار قطنی نے ادبیات کا بھی مطالعہ کیا، مثلاً دیوان الحمیری انھیں از بو تھا اور اسی وجہ سے ان پر یہ شبہ کیا گیا ہے کہ وہ شیعیت کی طرف مائل تھے۔ ان کے شاگردوں میں الحاکم النیشاپوری (م ۵۰۵ھ/ ۱۰۱۳ء - ۱۰۱۵ء)، ابو حامد الاسفرائینی (م ۴۰۶ھ/ ۱۰۱۵ء - ۱۰۱۶ء)، القاضی ابوالطیب الطبری

رجوع کرنا، اب اس قدر مصنوعی بات تھی کہ عام طور پر کامیاب نہ ہو سکتی تھی۔ مشترک حکومت کے آخری دس برسوں میں دارفور کو بھی آئینی تبدیلیوں میں حصہ ملا، جو بہت تیزی سے واقع ہوئیں۔ مقامی سرکاری کونسلوں کی تشکیل کی گئی اور غور و بحث کرنے والی متعدد مرکزی جماعتوں میں نمائندے بھیجے گئے۔ پہلی جنوری ۱۹۵۶ء کو ملکی آزادی حاصل ہونے سے انتظامیہ کے ڈھانچے پر کوئی اثر نہ پڑا۔ اس میں سوڈانی حکام پہلے ہی سے ان اعلیٰ عہدوں پر مامور ہو چکے تھے جن پر اس سے پیشتر برطانوی مقرر تھے۔ نومبر ۱۹۵۸ء کے فوجی انقلاب نے بھی براہ راست صوبائی انتظامیہ پر کوئی اثر نہیں ڈالا، لیکن مقامی سرکاری کونسلوں کا آئندہ اسی طرح چلتے رہنا غیر یقینی ہو گیا۔ علی دینار اور مشترک حکومت کے تحت انتظامیہ کے لیے دیکھیے: G. D. Lampen

'History of Darfur', در 'Sudan notes and records'

۲/۳۱ (۱۹۵۰ء): ۲۰۳ تا ۲۰۸۔

مآخذ: (۱) W. G. Browne: 'Travels in

'Africa, Egypt, and Syria' لندن ۱۷۹۹ء ص ۱۸۰ تا

۳۵۰: (۲) محمد بن عمر التونسي: 'تشیخات الأذهان بيرة

بلاد العرب والسودان' چاپ سنگی پیرس ۱۸۵۰ء مترجمہ

'Voyage au Darfour par le cheykh: Perron

'Mohammed Elou-Oniar El-Touni' پیرس ۱۸۴۵ء:

(۳) التونسي، مترجمہ Perron: 'Voyage au Ouaddi'

پیرس ۱۸۵۱ء: (۴) G. Nachtigal: 'Sahara und

'Sudan' ج ۲، لائبرک ۱۸۸۹ء ص ۳۵۵ تا ۴۰۶: (۵)

'Fire and Sword in the Sudan: R. C. [von] Slatin

لندن ۱۸۹۶ء ص ۳۰ تا ۲۷۸: (۶) نعوم شقیر: 'تاریخ

السودان' قاہرہ ۱۹۰۳ء: ۲: ۱۱۱ تا ۱۳۸: ۳: ۶۸ تا

۸۴، ۹۳ تا ۹۶، ۱۸۵ تا ۱۹۲، ۴۵۱ تا ۴۵۵، ۴۵۸ تا

۴۶۵، ۵۳۲ تا ۵۳۴، ۶۴۵ تا ۶۴۷: (۷)

'A history of the Arabs in the: H. A. MacMichael

(م ۴۸۵/۴۸۰) اور ابو نعیم الاصفہانی (م ۴۴۳/۴۳۸) مصنف خلیۃ الاولیاء ہیں۔ دار قطنی اسی برس کی عمر میں بروز چہار شنبہ ۸ ذوالقعدہ ۲۸۵ھ/۴۹۵ء کو فوت ہوئے اور قبرستان باب الدیر میں معروف الکرخی کے قریب دفن ہوئے۔ جنازے کی نماز ان کے شاگرد الاسفرائینی نے پڑھائی۔

دار قطنی ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے احادیث کے انتقادی مطالعے کو آگے بڑھانے میں بہت حصہ لیا۔ ان کی اکثر و بیشتر تصانیف علوم الحدیث سے متعلق ہیں، مگر افسوس کہ وہ تمام تر ہم تک نہیں پہنچ سکیں:

(۱) السنن (دہلی: ۱۳۱۰ھ)، اس کتاب میں احادیث عموماً ان کی مختلف اسناد اور اختلاف روایات کے ساتھ ابواب کی ترتیب سے شامل کی گئی ہیں اور دوسری صحاح یا "جوامع" کے خلاف اس میں فقط وہ حدیثیں دی گئی ہیں جن کا تعلق فقہ سے ہے۔ الخطیب (ص ۳۵، ص ۳) لکھتا ہے کہ ایسی کتاب فقط وہی شخص لکھ سکتا ہے جو مسائل فقہ میں آئمہ کے اختلاف آرا سے گہری واقفیت رکھتا ہو۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ دار قطنی نے ابن جنزایہ کو جو مصر میں خشیدیوں کا وزیر تھا، ایک مسند کی تالیف میں مدد دی اور اس مدد کے صلے میں انہیں وافر انعام ملا (ابن خلکان: یاقوت: ارشاد: ۲: ۴۰۸)، لیکن یاقنی کو اس میں بہت کچھ شبہ ہے اور یاقوت (ارشاد: ۲: ۴۰۶، ص ۱۳) لکھتا ہے کہ یہ مسند خود الدارقطنی کی اپنی تالیف ہے [کتاب السنن کی ایک مفید اور عالمانہ شرح مولانا شمس الحق عظیم آبادی نے عربی زبان میں بعنوان تعلیق المعنی کے نام سے لکھی، د ۱۹۱۰ء میں دہلی سے شائع ہوئی۔ حال ہی میں اس کی ایک عکسی طبع بیروت سے شائع ہوئی ہے]۔ (۲) کتاب علل الحدیث (یا البطل الواردة فی الاحادیث النبویہ): یہ کتاب

انہوں نے اپنے حافظے سے لکھوائی۔ اس کی ان کے شاگرد [ابوبکر احمد بن محمد] البرقانی (م ۴۲۵ھ) نے بشکل مسند ترتیب اور اشاعت کی (الخطیب، ص ۳، ص ۱۴۱ بعد)۔ اس کتاب کی دوسری، تیسری اور پانچویں جلد ہم تک پہنچی ہے۔ [اس کے مخطوطات قاہرہ، بانکی پور، آصفیہ اور پٹنہ میں موجود ہیں]۔ النووی نے اپنی کتاب قریب میں اس کتاب کے مطالعے کی سفارش کی ہے (ترجمہ از Matraisi، در ۱/۱ سلسلہ ۹، ۱۸ [۱۹۰۱ء]: ۹۴)۔ (۳) الالتزامات علی الصحیحین: قابل وثوق احادیث کا مجموعہ ہے، جو بخاری و مسلم کے شروط کے مطابق ہیں، لیکن ان کی کتابوں میں درج نہیں ہیں (حاجی خلیفہ، عدد ۱۱۳۲) [اس کا مخطوطہ آصفیہ میں موجود ہے]؛ (۴) الاستدراکات والتبع، بخاری اور مسلم کی ایسی دو سو حدیثوں کی فہرست جو الدارقطنی کے نزدیک ضعیف ہیں (حاجی خلیفہ، ۲: ۵۴۵ اور عدد ۹۹۵۶)؛ (۵) کتاب الاربعین (حاجی خلیفہ: عدد ۴۰۶)؛ (۶) کتاب الآثار، آحاد احادیث پر (السیوطی: حاجی خلیفہ: عدد ۹۸۷۳)؛ (۷) کتاب الامالی، (السیوطی)؛ (۸) کتاب المستجاد (حاجی خلیفہ، ۱۰۳۸، ۱۱۹۲۳)؛ (۹) کتاب الرؤیا، پانچ حصوں میں (حاجی خلیفہ، عدد ۱۰۱۵۰)؛ (۱۰) کتاب التصحیف، اغلاط کتب حدیث پر (النووی: کتاب مذکور، ص ۱۱۵، حاجی خلیفہ: ۹۹۷۵)؛ (۱۱) کتاب المدیح، ان احادیث پر جو ہم عصر محدثوں نے ایک دوسرے سے لیں (ابن حجر العسقلانی: نخبة الفكر، طبع Nassan Lees، ص ۵۱، ص ۱۱ اس لفظ کو یاقوت نے ارشاد الاریب، ۲: ۴۰۶ میں غلطی سے 'مدیح'، الذہبی نے 'مدیح' اور السیوطی نے 'مدیح' لکھا ہے لیکن صحیح تلفظ 'مدیح' ہے)؛ (۱۲) غریب الحدیث (حاجی خلیفہ، عدد ۸۶۲۰) [مخطوطہ رامپور میں موجود ہے]؛ (۱۳) کتاب مختلف والمؤتلف فی اسماء الرجال (ابن خلکان: حاجی خلیفہ،

گوئنگن' ۱۸۹۰ء، عدد ۳۳۵: (۱۰) ۱۹۲۲ء، ص ۱۸۴:
(۱۱) براکلمان' ۱۶۵: ۱۵۳' ۲۵۵: [تاریخ الادب العربی
(تعریب) ۳: ۲۱۰ تا ۲۱۲]: ز. یاقوت: معجم الادباء:
[ارشاد الارباب] ۲: ۶۰۶: ۸: (۱۳) حاجی خلیفہ:
طبع فلورک' بمعد اشاریہ: (۱۴) ابن الجزری: غایۃ النہایۃ
فی طبقات القراء: ۵۵۸: عدد ۲۷۸۱: (۱۵) ابن الصلاح:
علوم الحدیث، حلب، ۱۳۵۰ھ، ۲۱۳: ۲۳۱: (۱۶) سرکس:
ص ۲۵۶: (۱۷) شاہ عبدالعزیز: بستان المحدثین: (۱۸)
الرسالة المستطرفة: (۱۹) طاش کبری زادہ: مفتاح السعادة:
۱۳: ۲.

(HAPPENING) [و ادارہ]

دارا: (داراب)، یہ اس ہخامنشی بادشاہ کے نام *
کی ایرانی صورتیں ہیں (عرب مصنفین نے بھی انہیں
کو اختیار کیا ہے)، جو (یورپ میں) عام طور پر اپنی
یونانی شکل داریوش (Darius) Dareios ہی میں لکھا
جاتا ہے۔ داراب اور اس کا مخفف دارا براہ راست
قدیم فارسی کے داریوش سے لیے گئے ہیں (Bartholomae:
Altiranisches Wörterbuch، ص ۷۳۸: مختلف نحوی
صورتیں فارسی کتبوں کے ذریعے جانچی گئی ہیں
در Ancient Persian Lexicon and Texts: Tolman،
۱۹۰۸ء، بذیل مادۃ داریوش darayavau: ان بادشاہوں
کے قدیم مؤرخوں کے لیے دیکھیے Gr. I. Ph. ج ۲،
بمعد اشاریہ بذیل مادۃ Darcios)۔

داریوش نام کے بادشاہوں کے حالات سے متعلق
جو مآخذ عربی اور فارسی مصنفوں نے جمع کیے ہیں،
وہ بہ نسبت تاریخی ہونے کے افسانوی زیادہ ہیں (قب
مقدمہ از J. Mohl: Livre des Rois، طبع ۱۲ء، ج ۵
۱۸۷۷ء)۔ فارسی شاعر فردوسی (کتاب مذكر ج ۵)
انہیں کے بیانات سے متاثر ہوا، خاص طور پر عہد اسکندر
کی بابت، پھر ان کے بیانات کو اس نے قدیم ایرانی
دستالوں کے اجزا کے ساتھ مختلط کر دیا۔ فردوسی
کے بیانات سے اگر شاعرانہ مبالغات الگ بھی کر دیے

عدد ۷۰۸: (۱۴) کتاب الضعفاء [والمترکین]
(روای: کتاب مذکور، ص ۱۴۲)۔ اس کا ایک مخطوطہ
(الظاهریہ میں اور ایک) استنبول میں محفوظ ہے۔
Beiträge zur arabischen Literatur geschichte: Spies
ص ۱۰۵: (۱۵) کتاب القراءات، (الفہرست، ص ۳۵:
حاجی خلیفہ: عدد ۱۰۳۸)۔ یہ ایک مختصر درسی
رسالہ ہے جس میں مصنف نے سب سے پہلے قراءات
قرآن کے اصول درج کیے ہیں (الخطیب، ص ۳۴، سطر
۲۱): حاجی خلیفہ (عدد ۲۳۱۳) نے ان کی ایک کتاب
بنام معرفۃ مذاہب الفقہاء کا نام بھی لیا ہے۔ یہ مؤلف
کتاب کی خطا ہے جیسا کہ الخطیب ص ۲۳۵ سطر ۲
سے اور اس کے نسخ کے ساتھ مقابلہ کرنے سے صاف
صاف معلوم ہوتا ہے۔ یہ عبارت اصل مقالے میں نہیں
ہے: (۱۶) کتاب الاسماء والأجواد ایک ادبی قسم
کی کتاب ہے جو سوانح لوہیوں کو معلوم نہ تھی،
وجاہت حسین کو ایک لایاب قلبی مخطوطے کی شکل
میں کتب خانۂ پشہ سے دستیاب ہوئی ہے اور ۸۸ میں
شائع بھی ہو چکی ہے S.B. سلسلہ جدید ۲ (۱۹۳۴ء):
۳۶ تا ۱۴۔ اس کی کتاب کا اصلی ہونا اس بات سے ثابت
ہے کہ اس کے اقتباس یاقوت: ارشاد اور ابن حجر:
الاصابہ میں ملتے ہیں۔

مآخذ: (۱) الخطیب البغدادی: تاریخ بغداد:
قاہرہ ۱۹۳۱ء: ۱۲: ۳۳ تا ۴۰: (۲) اسمعی: الانساب:
در GMS ج ۲، ورق ۲۱۷ (مآخذ: الخطیب): (۳) یاقوت:
معجم، طبع ویشٹٹک: ۲: ۵۲۳: (۴) ابن خفکان: وفیات:
قاہرہ ۱۳۱۰ھ: ۱: ۳۳۱ [بولاق: ۱: ۳۷۰]: (۵) الذہبی:
تذکرۃ الحفاظ، حیدرآباد بدون تاریخ، ۳: ۱۹۹ تا ۲۰۳:
(۶) السبکی: طبقات الشافعیۃ الکبریٰ، قاہرہ ۱۳۳۸ھ: ۲:
۳۱۰ تا ۳۱۲: (۷) الیافعی: مرآۃ الجنان، حیدرآباد ۱۳۳۸ھ:
۲: ۲۲۶ تا ۲۲۸: (۸) السوطی: طبقات الحفاظ، طبع ویشٹٹک:
گوئنگن ۱۸۳۳ء: ۲: ۱۱۲: (۹) اقتباس جس میں الذہبی سے
انصاف کیا گیا ہے: (۱۰) ویشٹٹک: Der Imām el Schāfi'.

میں حصہ لیا، جس کی خبر ملکہ کو پہنچ گئی، داراب نے اس لڑائی میں بڑی شہرت حاصل کی۔ ایرانی سپہ سالار اعظم نے اسے ملکہ کے سامنے پیش کیا۔ ملکہ نے اس قیمتی نگ کو پہچان لیا جو اس نے اپنے بچے کے بازو پر باندھ دیا تھا۔ بالآخر ملکہ نے اس کے بادشاہ ایران ہونے کا اعلان کر دیا۔ داراب نے شہر داراب گرد بسایا اور پہلے عربوں کو اور پھر شاہ فیلقوس (مقدونیہ کا لقب) کو شکست دی۔ فیلقوس کو اس نے خراج ادا کرنے پر مجبور کیا اور اس کی دختر سے شادی بھی کر لی۔ لیکن اس یونانی لڑکی کی بوسے دہن کے باعث داراب کو اس سے نفرت ہو گئی اور اسے واپس مقدونیہ بھیج دیا۔ اس وقت وہ حاملہ تھی۔ باپ کے گھر جا کر اس کے لڑکا پیدا ہوا جس کا نام اس نے ایک ہودے اسکندر iskandarus یونانی oxepodov کے نام پر اسکندر رکھا، جس کے استعمال سے اسے بوسے دہن سے نجات ہوئی تھی۔ فیلقوس نے اسکندر کو اپنا بیٹا بنا لیا۔ ادھر داراب کا ایک اور بیوی سے بھی بیٹا پیدا ہوا تھا، جس کا نام دارا تھا۔ آگے چل کر یہ دونوں شہزادے بادشاہ بنے۔ [اسکندر مقدونیہ (یونان) کا اور دارا ایران کا]۔ اسکندر نے نہ صرف دارا کو خراج دینے سے انکار کیا بلکہ مصر کو فتح کر کے اس امید پر ایران پر چڑھائی کر دی کہ وہ اسے (ایران کو) اپنے سوتیلے بھائی سے چھین لے گا۔ اسکندر سفیر کے ہمیں میں دارا کی لشکرگاہ میں آیا، جہاں اس کا شاندار استقبال کیا گیا، لیکن وہاں اسے پہچان لیا گیا اس لیے وہ وہاں سے نکل بھاگا۔ اس کے بعد اسکندر نے دارا کو چار مرتبہ شکست دی۔ بالآخر دارا پر خود اس کے اپنے وزیروں نے قاتلانہ حملہ کیا اور اسکندر کو اس کی اطلاع کر دی۔ اسکندر کو یہ خبر سن کر سخت صدمہ ہوا۔ وہ اپنے سوتیلے بھائی کے پاس دوڑا ہوا آیا تو دیکھا کہ وہ زندہ تو ہے لیکن بستر مرگ پر پڑا ہے۔ دارا نے خدا کے قادر مطلق ہونے کا ذکر کرتے ہوئے اسکندر سے آخری درخواست

جائیں پھر بھی اس کا مواد عرب مؤرخوں کے بیانات سے کہیں زیادہ ہے؛ یہاں تک کہ الطبری سے بھی، جسے بلحاظ زمانہ سب پر تقدم حاصل ہے۔ ذیل میں ان بادشاہوں کے مختصر حالات بیان کیے جاتے ہیں (داراب اور دارا سے علی الترتیب داریوش [دارا] دوم اور داریوش سوم مراد ہیں)۔ شاہ ایران گشتاسپ (وشتاسپا، یونانیوں کے نزدیک ہستاسپ Hystaspes) نے اپنے پوتے بہمن کو اپنا جانشین نامزد کیا، جو اسفندیار کا فرزند تھا (بہمن - وہمن جو اوستا کے وھومناہ، "نیک خیال" سے مشتق ہے) اور جو آرتخشتر (Artaxerxes Longhand) کے نام سے معروف ہے۔ ختک دس Khetuk-das (kvaetvadaa) کی رسم کے مطابق بہمن نے خود اپنی دختر ہمای سے شادی کی [کسی اور ذریعے سے اس کی تائید نہیں ہوئی قب ہراؤن، ج ۱ : ۱۱۷ بہمن سے شادی کی]، (ہمای کو عوامی انسانوں میں پری ستی Parysatis کہا گیا ہے جو بقول Mohl [تاریخی اعتبار سے داریوش دوم کی بیوی تھی]۔ بہمن سے ہمای حاملہ ہوئی۔ بہمن نے اپنی وفات سے پہلے ہمای کو ملکہ ایران نامزد کیا اور اس کا جانشین اس بچے کو مقرر کیا جو اس کے بطن سے پیدا ہو۔ جب بچہ پیدا ہوا تو اس کی ماں نے اسے ایک دابہ کے سپرد کر دیا، جس نے خفیہ طور پر اس کی پرورش کی۔ بچہ جب آٹھ ماہ کا ہو گیا تو ملکہ نے ایک صندوق کو زرو جواہر سے بھر کر اس میں بچے کو ڈال دیا اور درباے قرات میں بٹھا دیا۔ دو جاسوس جو ملکہ نے صندوق کی نگرانی کے لیے مقرر کیے تھے، خبر لائے کہ ایک دھوبی نے صندوق میں سے بچہ نکال لیا ہے۔ دھوبی اور اس کی بیوی نے، جن کا اپنا بچہ ضائع ہو چکا تھا، اس کو اپنا بیٹا بنا لیا اور اس کا نام داراب رکھا (فارسی "درآب"، "یعنی پانی کے اندر" عوام کے نزدیک اصل نام یہی ہے)۔ بچہ بڑا ہوا تو اس نے اپنے اصلی والدین کی بابت ہوجہ گچہ کی۔ اس زمانے میں ایک لڑائی چھڑ گئی: داراب نے اس

بستر مرگ پر پہنچا اور اس کے قاتلوں کو سزا دی۔
 حمزہ الاصفہانی نے اس سلسلے میں بہت اختصار سے کام
 لیا ہے (Annals طبع و ترجمہ Gottwaldt، ص ۲۸ تا
 ۲۹)، ایسے ہی المسعودی (مروج، ۲: ۱۲۷) کا بیان
 بھی مختصر ہے۔ اس نے داریوش دوم اور داریوش سوم
 دونوں کو ایک ہی نام (دارا) سے یاد کیا ہے۔ الثعالبی:
History of the Kings of the Persians (طبع و ترجمہ
 از Zotenberg، ص ۳۹۳ بعد) میں بھی اسم داراب کے
 اشتقاق کی ایسی ہی خیالی وجوہ درج ہیں۔ اس کا بیان
 الطبری کے بیان سے مسائل ہے اور اس میں بھی دارا
 کے کردار اور اسکندر کی مناقبت کو وثوق سے بیان
 کیا گیا ہے۔ یہی بیان المقدسی: *Book of the Creation*
 (طبع و ترجمہ از Cl. Huart، ۳: ۱۵۳، ۱۵۹) میں نظر
 آتا ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ اسکندر نے ادائے خراج
 سے انکار کرنے کے بعد اپنے فیصلے پر نظر ثانی کی اور
 بہتر طرز عمل اختیار کرتے ہوئے خراج ادا کر دیا
 اور ساتھ ہی معذرت نامہ بھیجا۔ اس پر دارا نے
 خیراندیشی کے طور پر اپنی لڑکی کی اس سے شادی
 کر دی۔ جس طرح [یونانی مصنف] Pseudo-Callisthenes
 نے اسکندر کو شاہان مصر کا وارث قرار دیا تھا، بالکل
 اسی طرح ایران کی افسانوی تاریخ نے اسکندر کو
 داریوش (دارا) سوم کا سوتیلا بھائی بنا دیا، جس سے
 اسکندر نے تخت ایران کے لیے جھگڑا کیا (ممکن ہے
 کہ یہ قصہ کوروش (Cyrus) کی روایت سے ملتے
 جلتے دیا گیا ہو جس نے اپنے بڑے بھائی Artaxerxes دوم
 کے خلاف ۱۔ ۳ ق م میں بغاوت کی تھی۔

دارا (با Daras-Anastasiopolis) ایک قلعے کا نام
 بھی ہے جو ماوردين اور نصیبین کے درمیان واقع ہے، جسے
 خسرو اول نے اپنی ۵۵۵ء کی مہم میں یونانیوں سے
 جھینا تھا (*Gesch. der Perser ... zur Zeit*: Nöldeke)
 اور *der Sasaniden*، ص ۲۳۹ اور *L'Iran*: A. Christensen
 ۳۷۲ اور ۳۷۵)۔

کی کہ اس کی دختر روشنگ (Roxane) سے
 شادی کر لے اور ایرانیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔
 اسکندر ابوان کا بادشاہ ہو گیا اور اس کے بعد اس نے
 کئی اور ملک فتح کیے (اسکندر کے کارہائے نمایاں کے
 بیان میں فارسی شعراء، نظامی، امیر خسرو اور جامی نے
 سکندر نامے لکھے ہیں مگر ان میں فقط دارا کو
 شکست دینے تک کا بیان ہے؛ البتہ تقدیر کی نیرنگی پر
 اخلاق پند و نصائح کا اضافہ کیا گیا ہے)۔

عرب مؤرخوں اور فردوسی کے بیانات میں صرف
 جزئیات کا اختلاف ہے۔ الطبری کے وقائع نامہ
 [تاریخ الطبری] (نسخہ فارسی ترجمہ از Zotenberg،
 ۱: ۵۰۸ بعد) میں آیا ہے کہ کم سن داراب کو
 ایک آسیابان نے دریا میں سے نکال کر بچایا۔ ہمای کو
 جب یہ خبر ملی تو اس نے بچے کو آسیابان ہی کے
 حوالے کر دیا اور اس سے فارسی میں کہا "دار" (یعنی
 اس کی خبر گیری کرنا) اور اسی بنا پر اس کا نام دارا
 پڑ گیا (یہ اس کے نام کی دوسری عوامی توجیہ ہے)۔
 "نہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کو داراب اس لیے کہنے
 لگے کہ وہ پانی کے اندر سے ملا تھا" (داراب)۔ جب
 وہ پندرہ سال کا ہو گیا تو ہمای نے اسے خود اس کی
 پیدائش کے راز سے آگاہ کیا۔ آخر اسکندر نے جب دارا
 کو خراج دینے سے انکار کر دیا تو دارا نے اسے علامتی
 طور پر تحفہ کچھ چیزیں بھیجیں (چوگان، گند اور
 نلوں کا ایک تھیلا)۔ یہ چیزیں ان سے بہت مشابہ ہیں
 جو سٹھین (Scythians) نے دارا سے اول کو بھیجی تھیں
 (ہیروڈوٹس Herodotus، ۳: ۱۳۱ تا ۱۳۳؛ نیز
Le déchiffrement des écritures: E. Doblhofer،
 فرانسیسی ترجمہ ۱۹۵۹ء، ص ۲۴)۔ دارا کے کردار کی
 وجہ سے جو بے اطمینانی بھیلی ہوئی تھی فوج نے اس کا ساتھ
 جھوڑ دیا۔ خود اس کے دو حاجیوں نے اسے قتل کر
 ڈالا۔ خود اسکندر اس قتل کی سازش میں شریک تھا اور
 پھر محض دکھاوے کے لیے مناقبہ طور پر دارا کے

ایران، تہران ۱۳۲۰/۱۳۵۱ء : ۰۹۵ : ۷

(D.N. WILDER)

* دارا بخت : رگ بہ بہادر شاہ ثانی۔

دارا شکوہ : شاہجہان اور ممتاز محل کا *

سب سے بڑا بیٹا تھا، وہ اجمیر کے قریب ۱۹ صفر ۱۰۲۴ھ/۲۰ مارچ ۱۶۱۵ء کو پیدا ہوا۔ اسے بارہ ہزار "ذات" چھ ہزار "سوار" کا پہلا منصب (رگ باں) ۱۰۴۲ھ/۱۶۳۲ء میں ملا، نیز حصار کی سرکار تفویض ہوئی اور اس کی ولی عہدی کا اعلان بھی ہوا، ساتھ ہی فیروزہ کی جاگیر بھی ملی، جسے ولیعہد کا تعلقہ تصور کیا جاتا تھا۔ اسی سال اسے اس لشکر کی برائے نام سپہ سالاری بھی تفویض ہوئی جسے قندھار کی مدافعت کے لیے بھیجا گیا تھا، کیونکہ قندھار کو ایرانیوں سے خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ جب یہ خطرہ ایک بار پھر لاحق ہوا تو اسے ۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء میں پھر سپہ سالار بنایا گیا مگر حملہ نہ ہوا۔ ۱۰۵۵ھ/۱۶۴۵ء میں اسے صوبہ آلہ آباد کی صوبیداری عطا ہوئی، پھر ان میں صوبہ پنجاب کا ۱۰۵۷ھ/۱۶۴۷ء میں، صوبہ گجرات کا ۱۰۵۹ھ/۱۶۴۹ء میں (اور ملتان اور بہار کا ۱۰۶۲ھ/۱۶۵۲ء) میں اضافہ ہوا۔ صوبوں کی حکومت اس کے نائبوں کے سپرد تھی اور خود وہ دربار سے وابستہ تھا۔ لاہور سے دارا شکوہ کو بہت دلچسپی تھی، یہاں اس نے متعدد عمارات اور تجارتی منڈیاں تعمیر کرائیں (عمارات میں "آئینہ محل" خاص طور سے قابل ذکر ہے)۔ ۱۰۵۸ھ/۱۶۴۸ء تک اسے تیس ہزار ذات اور ۱۰ ہزار سوار کا منصب مل چکا تھا۔ (ضمناً بتا دینا چاہیے کہ یہ وہی بلند ترین منصب تھا جو تخت نشینی سے پہلے شاہجہان کو ملا تھا)۔

جب قندھار کو ایرانیوں سے (جنہوں نے ۱۰۵۹ھ/۱۶۴۹ء میں اس پر قبضہ کر لیا تھا) واپس لینے کی دو کوششیں ناکام ہو گئیں تو دارا نے اسے واپس لینے کے لیے ۱۰۶۲ھ/۱۶۵۲ء میں اپنی خدمات پیش کیں۔

مآخذ : مقالے میں جو حوالے دیے گئے ہیں ان کے

علاوہ : فردوسی : شاہنامہ، طبع و ترجمہ از J. Mohl در ج ۵ اور ترجمہ در ج ۱۲ طبع تہران ۱۹۳۳ - ۱۹۳۵ (اشاعت Beroukhim) ج ۶ : الطبری، اشاریہ۔

(B. CARRA DE VAUX-(H. MASSÉ))

* دارا بجرد : (جدید داراب)، صوبہ فارس کے

ضلع فسا کا ایک شہر جو شیراز کے مشرق میں ۲۸۰ کلومیٹر کے فاصلے اور ۱۱۸۸ میٹر کی بلندی پر واقع ہے۔ اس کی آبادی ۶۴۰۰ (۱۹۵۰ء) ہے۔ ایرانی افسانوی روایت میں اس شہر کی تاسیس داریوش سوم Darius III Codomannus کے باپ داراب سے منسوب کی جاتی ہے۔ ساسانی حکمران ارد شیر نے جو پہلے دارا بجرد میں فوج کا سپہ سالار تھا، بغاوت کر کے حکومت حاصل کی تھی۔ موجودہ دارا بجرد کے جنوب مغرب میں ۸ کلومیٹر کے فاصلے پر ساسانی دارا بجرد کے آثار ہیں، جو سنگریزوں میں اٹے بڑے ہیں، قلعے کی دیواروں کے نشان بھی باقی ہیں اور ایک ویران آتش کدہ بھی نظر آتا ہے جو اس جگہ کے وسط میں متعین کیا گیا ہے۔ دارا بجرد کے جدید گاؤں سے چھ کلومیٹر دور جنوب مشرق میں چٹان پر تراشا ہوا ابھروان کتبہ ہے، جو "نقش رستم" یا "نقش شاپور" کے نام سے معروف ہے۔ اس کے قریب ہی ایک وسیع دالان ہے، جو پہاڑی کو تراش کر تعمیر کیا گیا اور "مسجد سنگی" کے نام سے مشہور ہے۔ اگرچہ اس میں اب سن ۱۶۵۲ء/۱۲۵۳ء کے کتبے بھی کندہ نہ آتے ہیں اور سلطان ابوبکر کا نام بھی درج ہے، لیکن دالان غالباً اسی زمانے کا ہے، جب کتبہ رستم تیار کیا گیا تھا۔

مآخذ : (۱) فرصت حسینی شیرازی : آثار عجم

یعنی ۱۳۱۳ھ/۱۸۹۶ء ص ۹۷ تا ۹۹، لوحہ ۷ تا ۹ : (۲)

(۲) لی سٹریچ Le Strange ص ۲۸۸ بعد : (۳)

'L'Iran sous les Sassanides : A. Christensen

کوبن ہیگن ۱۹۳۳ء ص ۸۶ تا ۸۷ : ۱ : فرهنگ جغرافیہ

یہ جنگ بہت بڑی تاریخی اہمیت کی حامل ہے کیونکہ اس سے درحقیقت ہندوستان کی بادشاہت کا فیصلہ اورنگ زیب کے حق میں ہو گیا۔ اجپیر کے قریب دیورائی کے مقام پر آخری مرتبہ داراشکوہ نے قسمت آزمائی کرنی چاہی، لیکن یہاں بھی اسے شکست ہوئی (۲۸ جمادی الآخرہ ۱۰۶۹ھ / ۲۳ مارچ ۱۶۵۹ء)۔ [داراشکوہ کو اب رہ رہ کر یہ خیال آتا تھا کہ ہمایوں کی طرح ایران پہنچ کر صفوی حکومت سے مدد حاصل کرے، چنانچہ اس نے اپنے ایلچی بویج کر شاہ عباس دوم سے ایران آنے کی اجازت مانگی۔ شاہ نے نہ صرف اجازت دی بلکہ حکام اور والیوں کے نام فرمان جاری کیا کہ جہاں جہاں شاہزادہ پہنچے، اس کا ہر تپاک خیر مقدم کیا جائے (سکینۃ الاولیاء، طبع ڈاکٹر تارا چند و سید محمد رضا جلالی نائینی، مقدمہ ص ۱۱۰)؛ چنانچہ داراشکوہ نے ایران جانے کے ارادے سے قندھار کا رخ کیا۔ راستے میں وہ ڈھادڑ کے افغان سردار ملک جیوں کے ہاں ٹھہرا، جس نے حکومت وقت سے وفاداری کرتے ہوئے داراشکوہ، اس کے بیٹے سپہر شکوہ اور دو بیٹیوں کو اسیر کر کے دہلی بھجوا دیا۔ یہاں داراشکوہ پر الحاد و بے دینی کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا۔ ۳۰ اگست کی رات علما کے فتوے سے قتل ہوا اور مقبرہ ہمایوں کے احاطے میں اسے دفن کیا گیا۔

اگرچہ دارا میں سیاسی بصیرت اور عسکری مہارت مفقود تھی، تاہم وہ اپنے عہد کی ممتاز شخصیتوں میں سے ضرور تھا۔ وہ تصوف سے خاص دلچسپی رکھتا تھا اور ہندو فلسفے کے زبیر اثر تھا۔ اس نے مسلمان صوفیہ اور ہندو سیاسیوں سے گہرے تعلقات قائم کر لیے تھے؛ ان میں مشہور یہ ہیں: میاں میر^[۴] (م ۱۰۳۵ھ / ۱۶۲۵ء) اور ملا شاہ [بدیشی]^[۵] (م ۱۰۷۱ھ / ۱۶۶۱ء)، جو سلسلہ قادریہ سے تعلق رکھتے تھے (وہ مؤخر الذکر کا ۱۰۵۰ھ / ۱۶۴۰ء میں مرید ہوا، شاہ محبت اللہ آبادی، شاہ دلریا، سرمد، مشہور آزاد مشرب وجودی اور

اور پوری پوری جنگی تیاریوں کے بعد وہ ۱۱ فروری ۱۰۶۳ء کو قندھار روانہ ہوا۔ اگرچہ قندھار کا محاصرہ بڑی شد و مد سے کیا گیا اور زمین داور میں قلعوں پر قبضہ بھی کر لیا گیا، لیکن قندھار مسخر نہ ہو سکا۔ مہم کی ناکامی سے، جو دارا کے لشکر میں نااتفاق نیز اس کے تجربے کی کمی کے سبب ہوئی، اس کی شہرت کو بحیثیت ایک سیاسی اور فوجی رہنما کے نقصان پہنچا۔

اس کی واپسی پر شاہجہاں نے اسے پہلے سے زیادہ امور سلطنت میں اپنا شریک بنایا اور ساٹھ ہزاری اور چالیس ہزاری کا اعلیٰ منصب عطا کیا (۱۰۶۷ھ / ۱۶۵۷ء)۔ اسی زمانے میں جب شاہجہاں بیمار پڑا تو اس کی صحت روز بروز گرنے لگی۔ اورنگ زیب نے باپ سے ملاقات کرنی چاہی تاکہ ملکی مصالح کے پیش نظر صورت حال سے آگاہ کرے، لیکن اس میں اسے کامیابی نہ ہوئی [داراشکوہ ولی عہد سلطنت تو تھا لیکن اورنگ زیب اس وجہ سے اسے تخت و تاج کا اہل نہیں سمجھتا تھا کہ اس میں سیاسی بصیرت اور عسکری مہارت کا فقدان تھا، نیز وہ ہندو علوم کے مطالعے کے بعد ویدانت سے متاثر ہو چکا تھا اور ہندو بیوگیوں اور سیاسیوں کے میل جول کی وجہ سے ہندوؤں کی طرف زیادہ مائل تھا۔ یہ خطرہ بھی واضح تھا کہ اس کے حکومت سنبھالنے ہی دین کی لٹی نئی تاویلیں ہوں گی۔ شریعت اسلام میں رخنے پڑیں گے اور مسلمانوں کے اعتقادات میں فرق آئے گا۔ آخر تخت نشینی کے لیے جنگ چھڑ گئی۔ دھرمات کے مقام پر اورنگ زیب اور مراد کی متعلقہ فوج کا شاہی لشکر سے آنا سامنا ہوا، جس میں انہیں فتح ہوئی۔ اہم ترین جنگ اگرچہ سے آٹھ میل کے فاصلے پر سامو گڑھ میں ہوئی (۹ رمضان ۱۰۶۸ھ / ۲۹ مئی ۱۶۵۸ء)، جس میں داراشکوہ پورے وسائل بروئے کار لایا، لیکن یہ دن اس کے لیے نہ صرف شکست کا بلکہ تخت و تاج سے محرومی کا پیغام لایا۔

اپنی بیوی نادرہ بیگم (بنت شہزادہ پرویز) کو ۱۰۵۱ھ / ۱۶۳۱-۱۶۳۲ء میں اپنے رقم کردہ دیباچے کے ساتھ پیش کیا تھا۔

دارا کی بعض متأخر تصانیف سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ نظریہ وحدت الوجود کا پیرو تھا۔ وہ ہندو فلسفے اور صنمیت سے متاثر تھا، جس کی وجہ سے وہ متعدد ایسے ملحدانہ خیالات کی طرف مائل ہو گیا جن کے واضح مماثل ہندو فلسفے میں پائے جاتے ہیں اور جن کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں، مثلاً مادے میں روح کی تنزیل (یعنی تنزلات)، تاہم وہ جسمانی مشقت اور اذیت کے طریقوں کا مخالف تھا، جس کی ”یوگا“ کے داعی، ضرورت بتاتے ہیں دلیل یہ دیتا تھا کہ خدا سزا نہیں دینا چاہتا بلکہ وہ چاہتا ہے کہ لوگ محبت کے ذریعے اس کا قرب حاصل کریں۔ دارا اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ ویدانت اور تصوف، جن کے ذریعے ”حق“ کا ادراک کرنا چاہیے، وہ باہم مخالف نہیں؛ فرق صرف لفظوں کا ہے۔ اپنشدوں کے ترجمے میں، جسے وہ ”وحدت کا سرچشمہ“ بیان کرتا تھا، دارا نے دو بڑے مذاہب اسلام اور ہندومت کے پیروں کے مشترکہ نظریات کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی، نیز اس نے یہ چاہا کہ ہندوؤں کے اعتقادات سے مسلمانوں کو شناسا کرانے۔

مآخذ: (۱) سرکار J. N. Sarkar: *History of Aurangzeb* بار دوم، ج ۱، ۲، کلکتہ ۱۹۲۵ء؛ (۲) K. R. Qanungo: *Dara Shikoh* بار دوم، کلکتہ ۱۹۵۲ء؛ (۳) بکرماجیت حسرت: *Dara Shikoh: Life and Works* وشوا بھارتی ۱۹۵۳ء (اس میں دارا کی تصانیف کی تمام تصنیفات اور مخطوطات کی مکمل فہرست دی ہوئی ہے)؛ (۴) رسالہ حق نما، مجمع البحرین و اپنشد مندک (طبع محمد رضا جلالی نائینی، مع مقدمہ از تارا چند) تہران ۱۹۵۷ء؛ (۵) تارا چند: *Dara Shikoh and the Upanishads* در Sarmad and: S. K. Rahmān (۶) ۱۹۴۳ء؛ IC

بابا لال داس پیرائی، کبیر کا پیرو۔ اس کے عہد کی تصاویر، جن میں دارا کو صوفیوں اور سنیاسیوں کی صحبت میں دکھایا گیا ہے، محفوظ ہیں۔

ذیل کی تصانیف اس کی یادگار ہیں: (۱) سفینۃ الاولیاء (۱۰۵۰ھ / ۱۶۳۰ء) [آگرہ ۱۸۵۲ء، لکھنؤ ۱۸۷۲ء، کانپور ۱۸۸۳ء، تہران طبع سید محمد رضا جلالی نائینی]؛ (۲) سفینۃ الاولیاء (۱۰۵۲ھ / ۱۶۳۲ء)، یہ کتاب سلسلۂ قادریہ، حضرت میاں میرؒ اور ان کے خلفا من جملہ ملا شاہ بدخشی کے احوال و فضائل پر مشتمل ہے [طبع ڈاکٹر تارا چند و سید محمد رضا جلالی نائینی ۱۳۳۳ھ / ۱۹۶۵ء، تہران]؛ (۳) رسالہ حق نما (۱۰۵۶ھ / ۱۶۳۶ء) [لکھنؤ ۱۸۸۱ء اور ۱۹۱۰ء، تہران مع مجمع البحرین اور اپنشد مندک، طبع سید محمد رضا جلالی نائینی]؛ (۴) حسنت العارفین (۱۰۶۲ھ / ۱۶۵۲ء)، جس میں مختلف سلسلوں کے اولیا کے اقوال ہیں، دہلی ۱۸۹۲ء؛ (۵) مکالمۂ بابا لال و دارا شکوہ، جسے منشی چندر بھان برہمن نے مرتب کیا؛ (۶) مجمع البحرین (۱۰۶۵ھ / ۱۶۵۵ء)، ویدانت اور تصوف کی مصطلحات کا تقابلی مطالعہ [کلکتہ، طبع و ترجمہ از محفوظ الحق ۱۹۲۹ء، تہران، طبع سید محمد رضا جلالی نائینی ۱۳۳۵ھ]؛ اور (۷) سر اکبر (۱۰۶۷ھ / ۱۶۵۷ء) یہ بیجاں اپنشدوں کا ترجمہ ہے، جسے اس نے فاضل پنڈتوں اور سنیاسیوں کی مدد سے چھ ماہ میں مکمل کیا تھا [طبع ڈاکٹر تارا چند و سید محمد رضا جلالی نائینی، تہران ۱۳۳۰ھ / ۱۹۶۲ء]۔ اس کے علاوہ دارا کی سرپرستی اور امداد سے ہندوؤں کی متعدد مذہبی کتابوں کے تراجم فارسی میں کیے گئے، مثلاً یوگ و ششٹ گیتا اور متصوفانہ تمثیل پر بودہ چندرودیدہ۔ دارا خوش نویس بھی تھا اور علوم و فنون کی سرپرستی کرتا تھا۔ اس نے خوش نویسی کے نمونوں اور مغلوں کی مختصر تصاویر کا ایک مرقع

۱۸۲۹ء حیدر آباد ۱۸۳۰ء دہلی ۱۸۳۳ء دمشق (۱۸۳۴ء) ، لیکن یہ نام فقط اسی صورت میں موزوں ہو سکتا ہے جب اسے اس وسیع مفہوم میں لیا جائے، جو قدیم زمانے میں رائج تھا ورنہ اسے السنن کہنا چاہیے [اور عام طور پر سنن الدارمی کے نام سے مشہور بھی ہے] کیونکہ اس میں احادیث کو موضوع کے اعتبار سے مرتب کیا گیا ہے [نہ کے رواۃ کے ناموں کے اعتبار سے۔ مطبوعہ لسٹون کا ذکر کرتے ہوئے سرکس نے معجم المطبوعات میں اس کا نام الجامع الصحیح.... فی السنن تحریر کیا ہے]۔ اس تالیف کو صحاح ستہ کے برابر کی حیثیت نہیں دی گئی، لیکن ابن حجر العسقلانی نے اسے ابن ماجہ کی سنن سے افضل قرار دیا ہے۔ یہ صحاح ستہ کی ہر کتاب سے کہیں چھوٹی ہے۔ حاجی خلیفہ دیگر تین تصنیفات کا ذکر کرتا ہے: ان میں سے دو الدارمی کی مسند کے اقتباسات ہیں، لیکن وہ محفوظ نہیں رہے۔

مآخذ: (۱) ابن ابی حاتم: کتاب الجرح والتعديل حیدر آباد ۱۸۳۲ء/۱۹۵۳ء ۲: ۲۹۹ (۲) تاریخ بغداد ۱: ۲۹ تا ۳۲ (۳) السمعانی ص ۲۱۸ الفب: (۴) الذہبی: تذکرۃ الحفاظ ۲: ۱۰۵ بعد: (۵) ابن حجر العسقلانی: تہذیب التہذیب ۵: ۲۹۳ تا ۲۹۶ (۶) ابن الصلاح: علوم الحديث حلب ۱۸۳۵ء/۱۹۳۱ء ص ۵۲ (۷) ابن العماد: شذرات ۲: ۱۳۰ (۸) حاجی خلیفہ: طبع فلوکل Flügel ۴: ۳۹۲ ۳: ۶۲۸ ۵: ۱۰۹ بعد ۵۳۰ ۵۳۹ بعد: سرکس: [معجم المطبوعات] قاہرہ ۱۹۲۸-۱۹۳۰ء ص ۸۵۷ بعد: (۱۰) Goldziher: Muh. St. ۲: ۲۵۸ تا ۲۶۰ (۱۱) M. Weisweiler: Istanbul Handschriften Zur ara-bischen Bibl. Islam Traditionsliteratur ج ۱۰ (۱۹۲۷ء) عدد ۵: براکلمان ۱: ۱۷۱ بعد: نکالہ ص ۲۷۰۔

(J. Ronson)

'his Quatrains' در 'Calcutta Review' ۱۹۴۳ء: (۷) Mirza Raja Jai Singh: C. B. Tripathi (غیر مطبوعہ) مقالہ: 'الہ آباد یونیورسٹی ۱۹۵۳ء: (۸) آئی۔ اے۔ غوری: Responsibility of the Ulema for the Execution of Dara Shikoh' در 'J. Pak. H. S.' ۱۹۵۹ء: (۹) ایم۔ اطہر علی ۱۶۵۸-۵۹: Religious Issue in the War of Succession' در 'Ind. Hist. Cong. Proc 1960' (ستیش چندر [و ادارہ])

* دارم: رک بہ تعیم۔

* الدارمی: ابو محمد عبداللہ بن عبدالرحمن ابن الفضل بن بہرام بن عبدالصمد التیمی السمرقندی، تعیم کی ایک شاخ بنو دارم بن مالک سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے احادیث کی تلاش میں سفر کیے اور انہیں عراق، شام اور مصر کے متعدد مستند علما سے حاصل کیا۔ ان لوگوں میں جنہوں نے ان کی سند پر احادیث روایت کیں، مسلم بن الحجاج اور ابو عیسیٰ الترمذی تھے۔ الدارمی سادگی اور تقویٰ کی زندگی بسر کرتے تھے، جو مطالعے کے لیے وقف تھی۔ وہ اپنے علم حدیث، ثقافت، صداقت اور اصابت رائے کی وجہ سے مشہور تھے۔ انہیں سمرقند میں قاضی کے عہدے کی پیش کش کی گئی مگر انہوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ سلطان کے اصرار پر یہ عہدہ قبول تو کر لیا، لیکن ایک ہی فیصلہ دینے کے بعد معذرت کی، جسے قبول کر لیا گیا۔ وہ ۱۸۱/۷۹۷ء میں پیدا ہوئے اور ۲۵۵/۸۶۹ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کی تحریریں زیادہ تر حدیث سے متعلق تھیں، لیکن تفسیر قرآن لکھنے کا بھی انہیں امتیاز حاصل ہوا۔ الخطیب البغدادی کہتا ہے کہ دارمی نے المسند اور الجامع تالیف کیں، لیکن ہو سکتا ہے کہ یہ دونوں ایک ہی کتاب کے مترادف نام ہوں۔ [براکلمان نے المسند الجامع لکھا ہے (تعمیم: ۲: ۲۰۰)]۔ دارمی کے مجموعۂ احادیث کو عام طور پر المسند کہتے ہیں (طبع کانپور

* داروغہ: یہ لفظ مغولی جزو ترکیبی "درو"

کی نقل مطابق اصل، مع ترجمہ و شرح از V. Minorsky لنڈن اور لائڈن ۱۹۳۳ء میں ۷۷۷ ب پیمبر : Tavernier : *Collections of Travels* ... میں (۲۳۲، ۲۳۳) - اسے مجرموں کو سزا دینے اور جرمانہ کرنے کے اختیارات حاصل تھے اور بذات خود وہ مال مسروقہ کی بازیابی کا ذمہ دار تھا (تذکرۃ الملوک، حوالہ مذکور) - اسے صلہ خدمت دینے کے لیے لوگوں پر فیس عائد کی جاتی تھی، جسے "داروغہ" کہتے تھے (تذکرۃ الملوک، ص ۹۰، ۹۱، *Etat de la Perse en 1660* : Du Mans، پیرس، ۱۸۹۰ء، ص ۳۹) - بارہویں صدی ہجری/اٹھارہویں صدی عیسوی اور تیرہویں صدی ہجری/انیسویں صدی عیسوی کے دوران میں ایران میں داروغہ کے فرائض وہی رہے جو حاکم شہر کے ماتحت پولیس کے عہدے دار کے ہوتے ہیں۔ وہ قیمتوں، بائوں اور پیمانوں کو منضبط کرتا، شہر اور بازاروں میں امن قائم رکھتا اور لوگوں کے اخلاق کی نگرانی کرتا تھا۔ اس کے اختیار کا دائرہ، بازاروں تک محدود ہو جانے کی وجہ سے وہ اب محتسب کے فرائض میں داخل اندازی بھی کرتا تھا بلکہ بعض صورتوں میں خود اس کی جگہ لے لیتا تھا۔ شاہی خدمات انجام دینے والے بعض کاربگروں کی فہرستیں بھی دارالسلطنت میں اس کے پاس رہتی تھیں (قلم P. A. Taubert : *Voyage en Arménie et en Perse*، پیرس ۱۸۲۱ء، ص ۳۳۳)۔ دستوری عہد کے شروع تک بھی داروغہ کا منصب باقی تھا (دیکھیے *la Perse d'aujourd'hui* : E. Aubin، پیرس ۱۹۰۸ء، ص ۱۰۶، ۱۰۷ : *De Téhéran à Ispahan* : RMM، جون - جولائی ۱۹۰۷ء، ص ۵۹ اور *Le Chisme et la nationalité Persane* : RMM، ۱۹۰۸ء، ص ۸۸۲)۔ لیکن حکومت کے نئے طریق کار میں یہ منصب بے مصرف ہو کر رہ گیا کیونکہ داروغہ کے سابقہ منصبی فرائض اس وقت بلدیات اور پولیس کے محکمے نے سنبھال لیے۔

داروغہ کی اصطلاح کا خاصۃً اطلاق اس شخص

(*daru*) سے بنایا گیا ہے، جس کے معنی "دبانہ، سپر لگانا" ہیں اور اس کا اطلاق مغول سلاطین کے جاگیرداری نظام میں ایک سردار پر کیا جاتا تھا (K. H. Menges : *Glosser zu den Volkskundlichen Texten aus Ost-Turkistan*، ج ۲، Wiesbaden، ۱۹۵۵ء، ص ۷۱۳ : *Le régime social* : B. Vladimirtsov : *darya* : *des Mongols*، پیرس ۱۹۳۸ء، ص ۲۰۹، ۱۱۸ : *Notes sur l'histoire de la Horde d'or* : P. Pelliot، پیرس ۱۹۵۰ء، ص ۷۳) - ۶۱۷-۶۱۸/۶۱۸-۶۱۹ میں المالیغ (Almaligh) کے مقام پر مقامی حاکم کے علاوہ فرمانروائے سلطنت کا نمائندہ ایک مغول داروغہ (*darrakiaçi*) بھی ہوتا تھا۔ اس پر جو فرائض عائد کیے گئے تھے، ان میں پھانسی کے فرائض شامل ہیں : باشندوں کی مردم شماری کرنا، مقامی فوج بھرتی کرنا، ڈاک کا سلسلہ قائم کرنا، محصولات وصول کرنا اور خراج کی رقم دربار کو ارسال کرنا (W. Barthold : *Turkestan*، بار دوم، ص ۱۰۴)۔ ایران میں اس لقب کا استعمال پہلی مرتبہ ہم ایلیخانیوں کے زمانے میں دیکھتے ہیں۔ تیموریوں کا زمانہ آنے آتے تو یہ عملی طور پر شہنہ کی جگہ لے لیتا ہے کیونکہ داروغہ کے عموماً وہی فرائض تھے جو شہنہ کے ہوا کرتے تھے۔ اپنے خاص اختیارات میں وہ فوجی نظام سے متعلق تھا۔ صفواریں کے زمانے میں داروغہ کے فرائض کبھی کبھی وہی ہوتے تھے جو حاکم (عامل) شہر کے ہوا کرتے ہیں (Olearius : *The Voyages and Travels* ...، لنڈن ۱۶۶۹ء، ص ۳۰۳ : *Voyages* : Charden، طبع Langlès، پیرس ۱۸۱۱ء، ص ۲۶۰، ۲۶۱)۔ مگر عام طور پر وہ ایک طرح کا پولیس کا عہدے دار ہوتا تھا، جو عموماً دیوان بیگی کے تحت کام کرتا تھا۔ اس کے فرائض یہ تھے کہ بدعنوانی، ظلم و زیادتی، جھگڑے فساد اور شریعت کی خلاف ورزی، جیسے عصمت فروشی، شراب نوشی اور قمار بازی کی روک تھام کرے (تذکرۃ الملوک، فارسی متن

برطانوی ہند میں یہ عہدہ مختلف محکموں کے مقامی سربراہوں کا ہوتا تھا اور ۱۷۹۳ء سے ۱۸۶۲ء تک پولیس کے مقامی افسر (-تھانے دار) کو بھی داروغہ کہتے تھے (H. C. Burnell اور H. Yale : Hobson Jobson، لندن ۱۹۰۳ء، ۲۹۷-۲۹۸)۔ صفوی عہد میں گرجستان (Georgia) میں داروغہ پولیس کا ایک افسر ہوتا تھا، جو موروی (کانسٹبل) اور ملک (ارمینیا کے بلدیے کا سردار) اور کد خدا کے ساتھ مل کر کام کرتا تھا (دیکھیے فرامین کا جائزہ از M. F. Brasset، در *Histoire de la georgie*)۔

مآخذ : دیکھیے سن بالا اور (۱) G. Le Strange : *Clavijo's Embassy to Tamerlane 1403-1406* (۱۹۲۸ء) ص ۳۰۳ : (۲) وہی مصنف : *Don Juan of Persia* (۱۹۲۶ء) ص ۵۶ : (۳) J. Fryer : *Travels* (۱۶۹۸ء) ص ۳۳۹ : (۴) W. Francklin : *Observations on Tour from Bengal to Persia* (۱۳۰ تا ۱۳۱) ص ۱۳۶ تا ۱۳۷ : (۵) K. K. K. : *History of the Revolution in Persia* (۱۷۹۷ء) ص ۸۰ : (۶) E. S. Waring : *A Tour to Sheeraz* (۱۷۹۸ء) ص ۶۷ : (۷) Sir J. Malcolm : *History of Persia* (۱۸۰۰ء) ص ۶۷ : (۸) A. M. Tancoigne : *A Narrative of a Journey in the Persia* (۱۸۰۲ء) ص ۲۳۹ تا ۲۴۰ : (۹) J. B. Fraser : *Travels and Adventures in the Persian Provinces on the Southern Banks of the Caspian Sea* (۱۸۰۶ء) ص ۱۳۹ : (۱۰) R. B. M. Binning : *A Journal of two years travel in Persia, Ceylon, etc.* (۱۸۵۷ء) ص ۳۷۷ تا ۳۷۹ : (۱۱) A. K. S. Lambton : *Evolution of the office of Darûgha* (تہران (شار) ۱ تا ۳) ۱۳۳۸ھ/۱۹۵۹ء تا ۱۹۶۰ء (A.K.S. LAMBTON)

پر نہیں ہوتا تھا جس کے فرائض عامل شہر یا پولیس کے ہوں۔ ایسی متعدد مثالیں موجود ہیں کہ داروغہ کا تقرر ایک قبائلی گروہ کی نگرانی کے لیے ہوا اور اس کے فرائض شہر کے داروغہ یا بازار کے داروغہ سے صریحاً مختلف تھے، مثلاً عبدالرزاق کا بیان : کبھی کبھی ایک داروغہ اور ایک محصل ہرات کے ہزارہ قبائل سے واجب الوصول لگان وصول کرنے کے لیے بھیجا کرتا تھا (مطلع سعدین، طبع محمد شفیع، ۱۲۹۷ء)۔ صفوی عہد میں ترکمانوں کا ایک داروغہ استراباد میں بھی تھا (قب حسن روملو : احسن التواریخ، طبع و ترجمہ سدن C.N. Seddon، بڑودہ، ۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۳ء) ص ۳۳۶-۳۳۷۔ خاندان قاجار کے زمانے میں مختلف ترکمان قبائل سے محصولات ایک داروغہ وصول کرتا نظر آتا ہے (قب روزنامہ دولت علیہ ایران، ۲ ربیع الاول ۱۲۸۰ھ، ۲۹ محرم ۱۲۸۷ھ) اور مثالیں ایسی بھی موجود ہیں کہ آبادی کے خاص خاص حصوں کے لیے داروغہ مقرر کیا گیا : چنانچہ یزد کے مجوسیوں کے داروغہ کا تقریباً ۱۵۰۵/۱۶۳۳ء میں ذکر آتا ہے (محمد مفید : جامعہ مفیدی، B.M. Or. 210، ورق b ۳۶۳)۔ یہ نہیں بتایا گیا کہ اس کے فرائض کیا تھے۔ بہت ممکن ہے کہ وہ زرتشتی فرقے سے واجب الوصول محصول حاصل کرتا ہو نیز اس فرقے سے متعلق مخصوص قوانین نافذ کرتا ہو۔ صفوی عہد میں داروغہ کی اصطلاح ایک قسم کے صدر مجرر کے لیے بھی استعمال ہوتی تھی، جس کا کام یہ ہوتا تھا کہ بڑے بڑے سرکاری محکموں کے عملے کی نگرانی کرے۔ داروغہ قراش خانہ اور داروغہ دفتر خانہ اسی قبیل کے داروغہ تھے (تذکرۃ الملوک، ورق 91a-91b، ۱۴۱ تا ۲۲۷)۔ قاجاروں کے زمانے میں بھی داروغہ کی اصطلاح انہیں معنوں میں استعمال ہوتی رہی : ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں داروغہ نسامی اصطبل کے ایک عہدے دار کو کہتے تھے ابو الفضل : آئین اکبری ترجمہ Blochmann، ج ۱، ۵۳)۔

۱۱۸۷ء میں فلسطین کے بڑے حصے پر دوبارہ قبضہ کرنے کے سلسلے میں اسے فتح کر لیا۔ آگے چل کر شاہ رچرڈ ”شیر دل“ اور تیسری صلیبی جنگ کے فرانکوں نے ۱۱۹۲ء/۵۸۸ء میں اس کا محاصرہ کر کے اسے مسخر کر لیا اور اس کے مورچے تڑوا دیے لیکن مملوک عہد تک بھی اس کا شمار ان دفاعی قلعوں میں ہوتا رہا جو براہ راست ضلع غازہ کے نائب کے زیر اقتدار صوبہ دمشق کی ساحلی سرحد پر تھے۔

مآخذ : (۱) F.M. Abel : *Géographie de la Palestine* پیرس ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۸ء، خصوصاً : ۲۰ تا ۲۳ : (۲) G. Le Strange : *Palestine under the Moslems* لندن ۱۸۹۰ء، ص ۳۳۷ : (۳) A. S. Marmadji : *Textes Géographiques* پیرس ۱۹۵۱ء، ص ۷۱ تا ۷۲ : (۴) Annali : Caetani، بعد اشاریہ (۲) : (۱۲۹) : (۵) الطبری، بعد اشاریہ : (۶) BGA، بعد اشاریہ : (۷) باقوت : ۲ : ۵۲۵ : (۸) ابن الأثیر، خصوصاً : ۱۱ : ۳۲۶، ۳۶۱ اور ۱۲ : ۵۲ تا ۵۳ : (۹) *Hist. Or. Cr.* ج ۱ تا ۵، بعد اشاریہ : (۱۰) ابن شداد : جنوبی شام، مخطوطہ لائن ۸۰۰، ورق ۱۳۹ ب : (۱۱) *Hist. des Croisades* : Grousset، پیرس ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۶ء، بعد اشاریہ خصوصاً : ۲ : ۵۵۹ تا ۵۶۰ اور ۳ : ۸۵ تا ۸۷ : (۱۲) M. Gaudetfroy-Demomboynes : *La Syrie à l'époque des Mamelouks* پیرس ۱۹۲۳ء، خاص طور پر ص ۱۴ اور ۵۰۔

(J. SOURDEL-THOMINE)

داعی : (داعیہ) ”وہ شخص جو (کسی مسلک کی طرف) بلاتا ہے۔“ یہ لقب سواد اعظم سے الگ دعوت دینے والے فرقوں نے اپنے بڑے بڑے مبلغین کو دیا۔ یہ ظاہر سب سے پہلے یہ لقب مستخدمین معتزلہ [رک باں] نے استعمال کیا، لیکن زیادہ عالی شیعہوں میں یہ نام خصوصیت کے ساتھ استعمال کیا گیا۔ خراسان میں عباسیوں کے حامیوں میں بھی

* الداروم : فلسطین میں ساحل بحر کے قریب ایک مسطح میدان کا نام اور آگے چل کر صلیبی محاربات کے زمانے میں خاص طور پر ایک قلعے کا نام۔ عرب مصنفوں کی کتابوں میں یہ لفظ ان دونوں معنی میں پایا جاتا ہے۔ عبرانی لفظ darom جس سے داروم ماخوذ ہے اور تورات کی کتاب استثناء (۳ : ۳) کے عربی ترجمے میں darom کی جگہ داروم ہی استعمال کیا گیا ہے۔ عہد نامہ عتیق کی چند عبارتوں میں یہ سمت جنوب کے معنی میں استعمال ہوا ہے نیز کسی ملک کے لیے جو جنوبی سمت میں واقع ہو (F.M. Abel) اور بعد کے زمانے میں اس کا اطلاق خاص طور پر اس علاقے پر کیا جاتا تھا جو یہودیہ (Juda) کے جنوب مغرب میں ایک نشیبی علاقہ (Sephela = سفله) (جو اس کے متصل شمال میں ہے) اور جنوبی جانب کا صحرائی خطہ (Negeb) دونوں سے الگ اور متمایز تھا۔ بوزنطی نام دروماس Daromas، جو اس قدیمی لفظ Darom سے مطابقت رکھتا ہے، کا اطلاق البوتھروپولس Eleutheropolis کے وسیع ضلع کے جنوب مغربی حصے پر بھی ہوتا تھا (دیکھیے بیت جبرین) لیکن خود شہر مذکور کو اس میں شامل نہیں کرتے تھے۔ البتہ عربوں کے زمانے میں یہ امتیاز باقی نہ رہا اور القدس کے قول کے مطابق الداروم میں بیت جبرین کے ارد گرد کے سارے علاقے کو شامل کیا جانے لگا اور جب خلافت حضرت ابوبکرؓ میں بیت جبرین فتح ہوا تو یہ سارا علاقہ اس کی تاریخ کا جزو بنا۔

فلسطینی قلعہ الداروم، جسے صلیبی جنگجو Darom کہتے تھے، اس بڑک پر واقع تھا جو غازہ Gaza سے مصر کو جاتی تھی اور اس کی جائے وقوع وہی ہے جس کی نشاندہی آج کل دیرالبلع کے کھنڈر کرتے ہیں۔ یہ قلعہ اس جانب سے یروشلم کی لاطینی حکومت کی حفاظت کے لیے بنایا گیا تھا۔ صلاح الدین ایوبی نے اس قلعے پر خاص طور سے حملہ کیا اور اس کے بعد ۵۸۳ھ

اس جگہ کے علاوہ جہاں امام کی حیثیت با اختیار خلیفہ کی ہوتی تھی، باقی مقامات پر دعوے کی تلقین پوشیدہ طور پر خفیہ تحریک کے ذریعے کی جاتی تھی۔ اس لیے اس علاقے میں جو اسمعیلیوں کے تسلط میں ہوتا داعی کا درجہ بلند ہوتا تھا (داعی الدعاة تمام سرکاری مذہبی امور کے محکمے کا سربراہ ہوتا تھا اور بظاہر اس کا مرتبہ وزیر کے برابر ہوتا تھا، بشرطیکہ داعی الدعاة اور وزیر کا عہدہ ایک ہی شخص کے پاس نہ ہو)۔ اس کے علاوہ دوسرے علاقوں میں داعیوں کی زندگی خطرے سے خالی نہیں تھی اور کبھی کبھی انویں قتل بھی کر دیا جاتا۔ بعض داعی فوجی قائد کے فرائض بھی انجام دیتے تھے، خاص کر فاطمیوں کی حکومت قائم ہونے سے پہلے (مثلاً قمرطی قائدین ابو عبد اللہ الشعمی، جس نے برابر قبائل کو اس بغاوت پر آمادہ کیا تھا جس سے مغرب میں العہدی کا اقتدار قائم ہوا)۔ آگے چل کر بھی داعیوں کو سیاسی ساز باز میں سہارت رکھنی پڑتی تھی؛ چنانچہ بعض نے اس کی کوشش بھی کی کہ مقامی دربار سلطنت کے سربراہوں کو لوگوں بلکہ خود امیر کو بھی اپنے فرقے میں داخل کریں۔ بویہی دربار میں المؤید فی الدین الشیرازی کی آمد اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ وہ محض واعظ ہی نہ تھے بلکہ فاطمی حکومت کے کارندے بھی تھے۔ اس کے باوجود داعی عموماً آزاد علما ہوتے تھے، اور یا ہم بڑے زور دار مذہبی اور فلسفیانہ مجادلے اور مناظرے کرتے رہتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسمعیلیوں کی بڑی بڑی کتابیں ان کے داعیوں ہی نے لکھی ہیں اور نسبتاً زیادہ اہم کتابیں ان داعیوں کی لکھی ہوئی ہیں جو ایران کے، خاصاً مامول میں تحریک کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ اسمعیلی "حدود" میں مذہبی مراتب اور کائناتی نظام کے "واحد حقیقی" کی طرف سے ظہور کے اصول کا تقابل کرتے وقت، داعی کو بعض اوقات، "زمان" یا خیال کے ساتھ منسلک کیا جاتا تھا۔ ایسے مقاصد کے لیے "حجۃ" کا داعی اور

مستعمل ہوا نیز بعض موقعوں پر ایسے زیدوں نے بھی استعمال کیا۔ ابوالخطاب کے متبعین کو بھی یہ لقب دیا گیا تھا۔ اسمعیلیوں اور ان کے ساتھ کی تحریکوں میں اسے خاص اہمیت دی گئی (ان تحریکات کا نام "دعویٰ" رکھا گیا تھا) جہاں یہ لقب ہر اس عہدیدار کو دیا جاتا تھا جو "امام" کا منظور کردہ نمائندہ ہوتا تھا۔

جب اسمعیلی تحریک اپنے عروج پر تھی تو اسمعیلیوں میں "دعاة" (داعیوں) کی تنظیم مذہبی عہدے داروں کے طور پر کی گئی (انہیں عیسائی اسقفوں کے مسائل بیان کیا گیا ہے)۔ مختلف عہدے داروں کو ان کے درجے کے مطابق جو لقب دیے جاتے تھے وہ موقع محل کے لحاظ سے کئی قسم کے ہوتے تھے (اور غالباً درجہ مقرر کرنے کے طریقے کی پابندی سختی کے ساتھ نہیں کی جاتی تھی)۔ داعیوں کا سردار، جو امام کی طرف سے بولنے کا مجاز ہوتا تھا باب [ارک باں] یا داعی الدعاة کہلاتا تھا۔ بڑے بڑے داعیوں کو [رسماً کم سے کم بارہ جوئی کے داعیوں کو] "حجۃ" یعنی صداقت کی دلیل اور شاید ابتدائی زمانے میں "نقیب" لقب ملتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے ان میں سے ایک کے تحت ایک ضلع (جزیرہ) ہوتا تھا جہاں "دعوے" کی تبلیغ کی جاتی تھی۔ بعض تصانیف میں حجۃ کو "لاحق" اور "داعی" کو "جناح" کہا گیا ہے، دیکھیے *Studies in : W. Ivanow Early Persian Ismailism* لاٹنڈن ۱۹۷۸ء، بار دوم، ۱۹۵۵ء، باب ۲)۔ بظاہر داعی کے لیے ایک علاقہ مخصوص کر دیا جاتا تھا۔ جہاں اسے ایمان لانے والوں پر مکمل اختیار ہوتا تھا۔ وہ نئے لوگوں کو اپنے سلسلے میں داخل کرتا اور رفتہ رفتہ باطنیہ [ارک باں] کی تعلیم کی طرف ان کی رہنمائی کرتا تھا۔ اس کی مدد کے لیے اس کے ماتحت کچھ عہدے دار بھی ہوتے تھے، جنہیں "مادون" (وعظ کہنے کا اذن یافتہ) اور سکسیر (ترغیب دینے والا) کے لقب دیے گئے تھے۔

زندگی کے متعلق جو تھوڑی بہت معلومات ہمیں حاصل ہوئی ہیں، وہ منتشر صورت میں اس کی تصانیف اور بعض تذکروں میں ملتی ہیں۔ پیشے کے لحاظ سے وہ قاضی تھا۔ شاعر کی حیثیت سے اس کی شہرت کا آغاز کوتاہیہ کے دربار جریمان میں شہزادہ سلیمان اور یعقوب دوم کی سرپرستی میں ہوا۔ معلوم ہوتا ہے اس نے اناطولیہ اور بلقان کی خوب سیاحت کی۔ جنگ انقرہ (۱۲۸۰ھ/۱۲۸۰ء) کے بعد بدلتظمی کے چند برسوں میں جب بایزید اول کے بیٹوں میں باہم جنگ و جدل کا بازار گرم رہا، داعی ان میں سے امیر سلیمان کی ملازمت سے وابستہ ہوا، جو اس وقت ادرنہ میں تھا۔ اس کے دربار میں متعدد نامور فضلاء زمانہ مثلاً احمدی، اس کا بھائی حمزوی اور سلیمان چلبی جمع تھے۔ داعی محمد اول کے زمانے (۸۱۶ھ/۱۴۱۳ء تا ۸۲۴ھ/۱۴۲۱ء) میں دربار سے وابستہ رہا اور اس کے فرزند مراد دوم کا اتالیقی مقرر ہو گیا۔ ماخذ اس کی تاریخ وفات کے سلسلے میں متفق نہیں۔ حاجی خلیفہ نے اس کی وفات کی تاریخ ۸۲۰ھ/۱۴۱۷ء بتائی ہے لیکن ایسی شہادتیں بھی موجود ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ وہ مراد دوم (۸۲۴ھ/۱۴۲۱ء تا ۸۴۸ھ/۱۴۳۴ء) کے عہد کے ابتدائی برسوں میں زندہ تھا (I. H. Uzunçarşılı: *Kaahyd şehri*، استنبول ۱۹۳۲ء، ص ۲۱۳)۔ یہی (تذکرہ، ص ۵۶) نے اس کی تعریف میں ایک مختصر مگر مدحیہ عبارت لکھی ہے۔ عثمانی عہد نیز دور جدید کے علما نے تھوڑا ہی عرصہ پہلے تک داعی کو ایک معمولی درجے کا شاعر سمجھا تھا، اس لیے کہ اس کی بہت کم تصانیف ان تک پہنچی تھیں لیکن بعد میں اس کی متعدد تصانیف منظر عام پر آئی ہیں۔ خصوصاً اس کے دیوان کا ایک نامکمل نسخہ اور ایک گرائفٹر مشنوی جنگ لائے (Ahmed Ates: *Türk Dili ve Edebiyatı Dergisi*، ۳: ۱۲۲، ۱۹۷۰ء) ان سے پتا چلتا ہے کہ داعی اپنے زمانے کا ایک نامور شاعر ہوا

امام کے مابین ایک علیحدہ مرتبہ قرار دیا گیا۔ جس طرح کہ باب [رک بان] نے کیا۔ کلاسیکی فاطمی اسمعیلیوں میں جو مختلف فرقے پیدا ہوئے، ان سب میں داعی کا مفہوم مختلف رہا ہے۔ شروع شروع کے درویشوں میں داعی ایک ہی قسم کے فرائض انجام دیتے تھے، اور ان کا درجہ ”حدود عظمیٰ“ کی پانچویں حد ”تالی“ (بہاء الدین) سے براہ راست تعلق رکھتا تھا۔ کائناتی نظام کے لحاظ سے وہ ”چند“ (کوشش) کا جسمانی مظہر تھا۔ آگے چل کر ان کی ضرورت باقی نہ رہی۔ ایران کے عہد سلجوقیہ میں ”نزاری“ (حشیشین) اسمعیلی نظام کے وارث ہوئے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظام داعی اصفہان کے تحت تھا۔ داعی اس فرقے کے بڑے سردار کا معمولی لقب ہو گیا، جس کا صدر مقام حسن صباح کے زمانے سے الٹوت ہوا۔ یہاں تک کہ ۵۵۹ھ/۱۱۶۴ء میں اس وقت کے داعی نے اپنے اصلی امام ہونے کا اعلان کر دیا (حسن صباح کو بھی ایک خاص مفہوم میں ”حجۃ“ تسلیم کیا جاتا تھا)۔ یمن کا طیبی ”دعویٰ“ سرکاری فاطمی نظام سے علیحدہ ہو کر ایک الگ نظام کی صورت میں قائم ہوا اور داعی مطلق کے تحت جو اپنے آپ کو ان اصلی اماموں کا نمائندہ کہتا تھا، جو اب نظروں سے غائب ہیں، ایک علیحدہ فرقہ وجود میں آیا۔ یہ داعی پوری برادری پر مکمل اختیار رکھتا تھا اور طیبیوں میں اس کے شخصی طور پر متعین کرنے کے سلسلے میں بارہا اختلاف پیدا ہوئے۔ یسویں صدی کے درمیانی عرصے میں دو بڑے داعی پیدا ہو گئے جو آپس میں رقابت رکھتے تھے۔ ایک تو مقررہ رسم کی بنا پر یمن میں مقیم ہے (سلیمانی) اور دوسرا بمبئی میں رہتا ہے (داؤدی)۔

ماخذ کے لیے دیکھیے اسمعیلی۔

(M.G.S. HODGSON)

* داعی : احمد بن ابراہیم، آٹھویں صدی ہجری / چودھویں صدی عیسوی کے اواخر اور نویں صدی ہجری / پندرھویں صدی عیسوی کے اوائل کا ترکی شاعر۔ اس کی

ہے اور بلاشبہ شاعرانہ وجدان، انفرادیت، فنی مہارت اور بیان کی روانی میں اپنے بہت سے ہم عصروں سے بڑھا ہوا ہے۔

متفرق مذہبی رسائل (Ahmad-I : I. H. Estayn) ، استانبول (۱۹۵۲ء) کے علاوہ داعی مندرجہ ذیل کتب کا منصف ہے : (۱) دیوان ، اس کا صرف ایک نسخہ معلوم ہوا ہے ، جو Burdur Wukf Library میں موجود ہے (عدد ۲۳۵) ۔ یہ دیوان نامکمل ہے اور حروف تہجی کے مطابق مرتب نہیں ہوا۔ اس میں چھ قصیدوں کے علاوہ جن میں سے دو محمد اول کی تعریف میں ہیں ، ۱۹۹ غزلیں شامل ہیں : (۲) چنگ نامہ ، جس کو غلط طور پر بعض مآخذ (Ottoman Poetry : Gibb) : ۱ : ۲۵۶ میں چنگ نامہ کہا گیا ہے اور بعض مآخذ (علی : گنہ الاخبار) : بروسلی محمد طاہر : عثمانلی مؤلفی ، بذیل مادہ) نے اسے شیخ اوغلو کے فرج نامہ (خورشید نامہ) کے ساتھ خلط ملط کر دیا ہے ۔ اس مثنوی میں ۱۴۰۰ سے زائد ابیات ہیں ۔ اسے مصنف نے ۸۸۰ھ / ۱۴۷۵ء میں امیر سلیمان کے نام معنون کیا تھا ۔ اس تشبیلی مثنوی میں روح انسانی کو عود (ایک ساز موسیقی) سے تشبیہ دی گئی ہے ، جس کے آسمانی نغمے اس بات کی علامت ہیں کہ اس کی اصل عالم قدس سے ہے اور وہ صوفیانہ طریقت سے اپنی اصل (واجب الوجود) کے ساتھ جا کر مل جانا چاہتی ہے ۔ شاعر ایک خوش و خرم مجمع کے اندر ، جو موسم بہار میں پھولوں سے بھرے ہوئے تختہ گل میں داد عیش دے رہا ہے ، عود سے پوچھتا ہے کہ وہ اس قدر افسردہ کیوں ہے ۔ اس کے باوجود اتنے میٹھے اور خوشی سے بھرے ہوئے سر کیسے نکالتا ہے ؟ اس کے جواب میں عود کے چاروں اجزا اسے اپنی اپنی روئداد یوں سناتے ہیں ، ریشم ان کیڑوں سے حاصل ہوا ، جو شہتوت کے درختوں کے پتے کھانے سے پہلے حضرت ایوب کے جسم کا گوشت کھا کر بنے : اس کے ڈھانچے کی لکڑیاں اس سے پہلے ایک خوب صورت سرو کا حصہ تھیں :

لکڑیوں پر جو جھلی منڈھی ہے، وہ ایک نرم دل غزال کی کھال ہے، جسے شکاریوں نے بے دردی سے مارا اور اس کی کلید سے بندھے ہوئے بال ایک شاندار گھوڑے کی دم کے ہیں، جسے تاقاریوں نے قتل کیا۔ یہ مثنوی، جو حسن بیان اور مرقع نگاری کا اعلیٰ نمونہ ہے اور جس کے رنگین اور مؤثر اسلوب میں انتہا درجے کی روانی ہے، اپنے عہد ہی کی نہیں بلکہ کلاسیکی عہد کی بھی بہترین بیانیہ نظموں کی ہم پلہ ہے: (۳) ترسل، فنِ مراسلہ نگاری میں ایک رسالہ ہے، جس کا شمار کلاسیکی تصانیف میں ہوتا ہے اور وہ ایک مقبول عام روزمرہ کے استعمال کی کتاب بن گئی ہے مِسیبی: تذکرہ ص ۵۶)؛ (۴) مطالبات، ایک جھوٹی سی کتاب ہے، جس میں بارہ ہاکی پھلکی نظمیں ہیں: (۵) وصیت نوشیروان عادل، ایک مختصر اخلاقی مثنوی ہے جو غالباً فارسی سے ترجمہ کی گئی ہے: (۶) عقود الجواهر، فارسی کے ہم قافیہ الفاظ کا ایک مختصر مجموعہ ہے جسے اس نے اپنے شاگرد شہزادے کے لئے، جو آگے چل کر مراد ثانی ہوا، مرتب کیا: (۷) دیوان فارسی، خود نوشت نسخہ، جو ۵۸۱۶/۱۰۴۱۳ء میں لکھا گیا۔ برسہ کے کتاب خانہ اورخان میں موجود ہے (عدد ۶۶)۔ یہ خیر الدین حاجی خلیل بے کے نام معنون ہے: (۸) تفسیر، ابوالثیث السمرقندی کی تفسیر القرآن کا ترجمہ، جس کے ساتھ ایک منظوم مقدمہ ہے۔ دونوں کی زبان سیدھی سادی اور انداز بے تکلف ہے۔ یہ عمر بے بن تیسور تاش کے نام معنون ہے (Universite Library T.Y. عدد ۸۲۴۲)؛ (۹) عطار کے تذکرۃ الاولیاء کا ترجمہ بھی، جو مسلم صوفیہ کرام کی سیرتوں اور اقوال کی ایک مشہور کتاب ہے، داعی کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

مأخوذ : (۱) 'سہی' لطیف اور قیمتی زادہ حسن
 چلی کے تذکرے اور عالی کی کتبہ الاخبار کا باب السیر
 بفیل ماہ : (۲) Hammet-Purgstall : *Gesch. d. Osm.*
 'Dicht kunst' : ۱ : ۲۶ : (۳) Gibb : *Ottoman Portr.*

۱: ۲۵۶ بید: (۴) Ahmad-i Dā'i : I. H. Ertaylan
 استانبول ۱۹۵۲ء ایک ضخیم مجموعہ جس میں ہو ہو
 نقل کیے ہوئے ترکی دیوان اور جنگ نامہ کے نسخے نیز
 دیگر تصانیف کے انتسابات یکجا کر دے ہیں: (۵)
 Storta della letteratura turca : A. Bombaci میلان
 ۱۹۵۶ء ص ۲۶۷ تا ۲۹۹

(FAHİR IZ.)

* داغ: نواب میرزا خان (اصل نام ابراہیم، دیکھیے
 آئینہ داغ) کا تخلص، جن کا شمار عصر جدید کے ممتاز ترین
 اردو شعرا میں ہوتا ہے۔ وہ نواب شمس الدین خان
 والی فیروزپور چھرکا اور وزیر بیگم (عرف جھوٹی بیگم)
 کے بیٹے تھے۔ نواب میرزا چاندنی چوک، دہلی، میں
 بتاریخ ۱۲ ذوالحجہ ۱۲۴۶ھ/۲۵ مئی ۱۸۳۱ء کو
 پیدا ہوئے (نسب زائچہ، در جلوہ داغ، ص ۹)۔ جب
 ان کے والد نے مسٹر ولیم فریزر، ریزیڈنٹ دہلی، کے قتل
 میں شرکت کے الزام میں پھانسی پائی (۱۸۳۵ء) تو
 نواب میرزا خان کی پرورش کی ذمہ داری ان کی خالہ
 عمدہ خانم نے سنبھالی، جو نواب یوسف علی خان کے
 حرم میں تھیں۔ ۱۸۴۰ء میں وہ اپنی خالہ کے ہمراہ
 رام پور چلے گئے، جہاں انھوں نے مولوی غیاث الدین،
 مؤلف غیاث اللغات، سے فارسی پڑھی۔ ۱۸۴۴ء میں ان
 کی والدہ سے ابو ظفر بہادر شاہ کے بیٹے اور ولی عہد
 میرزا محمد سلطان نعرالملک (میرزا فخر) نے عقد کر لیا۔
 نواب میرزا، جن کی عمر اس وقت تیرہ چودہ برس
 کی تھی، قلعہ دہلی میں چلے آئے اور وہیں انھوں نے
 باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔ انھوں نے سروجہ فارسی کتابیں
 پڑھیں اور سید محمد میر پنچہ کش (م- ۱۸۵۷ء) اور
 سرزا عباد اللہ بیگ سے خوشنویسی سیکھی (غلام محمد:
 تذکرۂ خوش نویسان، کلکتہ ۱۹۱۰ء، ص ۷۱ بعد)۔
 علاوہ ازیں انھوں نے شمسواری اور مختلف ہتیاروں کے
 استعمال میں بھی مہارت حاصل کی، لیکن سب سے بڑھ کر
 یہ کہ قلم سے سکونت کے باعث وہ اپنے زمانے کے

مشہور شعرا سے متعارف ہو گئے، جو قلعہ دہلی کے
 مشاعروں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ اس ماحول میں
 ان کے فطری میلان شاعری نے جلا پائی اور وہ اوائل
 عمر ہی میں اردو میں غزلیں کہنے لگے۔ جب شیخ
 محمد ابراہیم ذوق نے انہیں اپنی شاگردی میں لے لیا
 تو ان کی شعری صلاحیت پوری طرح چمک اٹھی۔ ذوق
 سے قلمذ کا سلسلہ ۱۸۴۳ء سے ۱۸۵۳ء تک جاری رہا
 اور اس دوران میں داغ قلعے اور شہر کے مشاعروں میں
 حصہ لیتے رہے۔ فخر الملک کی وفات (۱۰ جولائی
 ۱۸۵۶ء) کے بعد وہ قلمے کو چھوڑنے پر مجبور
 ہو گئے۔ اس کے کوئی دس ماہ بعد ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ
 ہوا، جس کے بعد داغ اپنے اہل و عیال سمیت ایک بار
 پھر رام پور پہنچ گئے، جہاں نواب یوسف علی خان نے
 انہیں بطور مہمان رکھا۔ نواب یوسف علی خان
 (م- ۲۱ اپریل ۱۸۹۵ء) کی جگہ کلب علی خان والی رام پور
 ہوئے (تو مؤخر الذکر نے بھی ان سے برادرانہ
 سلوک کیا اور ان کی اپنی درخواست پر ۱۸۶۶ء میں
 بعد مصاحبت ستر روپے ماہوار پر داروغہ امپابل و
 فراش خانہ کے عہدے پر مامور کر دیا)۔ اس سال کے
 آخر میں انہیں نواب صاحب کی رفاقت میں کلکتے جانے
 اور چند برس بعد (۱۸۷۲/۱۸۷۳-۱۸۷۳) ان کے
 ملازمین میں شریک ہو کر فریضہ حج ادا کرنے کی سعادت
 بھی نصیب ہوئی۔ اس زمانے میں رام پور میں کئی
 ممتاز شعراء مثلاً امیر، جلال وغیرہ جمع تھے (دیکھیے
 نگار، ص ۴۶) اور داغ کو ان کی صحبت میں جھکنے
 کا خوب موقع ملا۔ داغ کے قیام رام پور کا ایک
 اہم واقعہ منی پائی حجاب سے ان کی محبت کا ہے، جس کا
 ذکر انھوں نے اپنی مثنوی فریاد داغ (۱۸۸۰ء) میں کیا
 ہے۔ نواب کلب علی خان کی وفات (۲۳ مارچ ۱۸۸۷ء)
 پر محفل شعر و سخن درہم برہم ہو گئی اور ارناب عام
 و فن رام پور سے رخصت ہونے لگے۔ داغ بھی اپنی
 ملازمت سے مستعفی ہو گئے (جولائی ۱۸۸۷ء) اور چند

تصانیف: داغ نے چار یا پانچ دیوان مرتب کیے۔ کہا جاتا ہے کہ پہلا دیوان، جو ۱۸۵۷ء تک ان کے قیام دہلی کے دور کی غزلیات پر مشتمل تھا، ضائع ہو گیا، لیکن بعد ازاں داغ نے حافظی کی مدد سے اسے جزوی طور پر دوبارہ لکھا (نوری، ص ۸۹)۔ بعض دوسرے لوگوں کا بیان ہے کہ یہ دیوان مسودے کی صورت میں ان کے پاس تھا اور اس کے حواشی پر ذوق کی اصلاحات درج تھیں۔ دوسرے دیوان یہ ہیں: گلزارِ داغ، راسبور ۱۲۹۶ھ/۱۸۷۸-۱۸۷۹ء؛ آفتابِ داغ، لکھنؤ ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۸ء؛ مہتابِ داغ، حیدر آباد دکن ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۳ء؛ یادِ گلِ داغ، جو ۱۳۱۰ھ سے لے کر ان کے سال وفات ۱۳۲۲ھ تک کے کلام پر مشتمل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مؤخر الذکر دیوان کھو گیا تھا اور شائع نہیں ہوا (وقائعِ دہلی، ۲: ۵۱۰ بعد)۔ داغ کے شاگرد احسن ماربروی نے جو کچھ دستیاب ہو سکا جمع کر کے ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۵ء میں یادِ گلِ داغ شائع کیا (کافلی، ص ۲۰۸) اور اس کا ایک ضمیمہ لالہ سری رام (مؤلفِ خُصَّانۃ جَاوید) نے لاہور میں چھپوا کر دہلی سے شائع کیا۔ سندرجۃ بالا پانچ دواوین میں ۳۸۰۰ اشعار ہیں، جو بیشتر غزل کی صورت میں ہیں، تاہم ان میں قصائد و رباعیات وغیرہ بھی شامل ہیں (کافلی، ص ۲۱۰)۔ داغ نے ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۲ء میں ایک مثنوی معروف بہ فریادِ داغ بھی شائع کی تھی۔ انہوں نے ایک دیوان محاورات (ایک ہزار سے زیادہ اشعار) بھی مرتب کیا تھا، جسے ان کے اعزہ نے آصف جاہ ششم کی نذر کر دیا۔

نثرِ داغ: (۱) انشائے داغ، ان کے مکتوبات، طبع احسن ماربروی، دہلی ۱۹۳۱ء؛ (۲) فرمانِ داغ، ان کے ذاتی خطوط، طبع رفیق بن احسن ماربروی، لکھنؤ ۱۹۵۶ء۔ اس سلسلے میں (۳) بزمِ داغ، لکھنؤ ۱۹۵۶ء کا ذکر بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک روزنامہ ہے، جسے احسن ماربروی اور افتخار عالم

ماہ بعد (دسمبر ۱۸۸۷ء) تقریباً بائیس برس تک ریاست کی ملازمت کرنے کے بعد رام پور سے دہلی چلے آئے۔ یہاں سے وہ حیدرآباد دکن پہنچے (اپریل ۱۸۸۸ء)۔ چند برس بعد (۲۶ جمادی الآخرہ ۱۳۰۸ھ/۶ فروری ۱۸۹۱ء) وہ نظام (حبیب علی خان) کے استاد مقرر ہوئے (۱۳۰۹ھ/۱۸۹۱ء) اور حیدرآباد آنے کی تاریخ سے لے کر ۳۵ روپے ماہانہ (سکہ ریاستی) تنخواہ مقرر ہو گئی، جو ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۴ء میں بڑھا کر ایک ہزار روپیہ کر دی گئی اور مزید انعام و اکرام بھی عطا ہوئے۔ ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۴ء میں نظام کی طرف سے انہیں بلیل ہندوستان، جہاں استاد، ناظم یار جنگ، دیرالذولہ، فصیح الملک نواب میرزا خاں داغ، کے خطابات ملے (معلوم ہوتا ہے کہ وہ دستخط میں اپنا نام صرف "فصیح الملک داغ دہلوی" لکھا کرتے تھے، دیکھئے نوری، مقابل ص ۱۲)۔

داغ کے اکوڑے بیٹے کا انتقال رام پور ہی میں ہو گیا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے ایک لڑکی لاڈلی بیگم کو اپنی بیٹی بنا لیا، جن کی شادی پہلے لوہارو کے ممتاز الدین خاں سے اور ان کی وفات پر سراج الدین خاں شائل سے ہوئی۔ [بیگم شائل نے ۱۹۶۳ء میں بنقام لاہور وفات پائی]۔ [۱۸۹۷ء میں داغ کی بیگم کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد ان کی صحت روز بروز بگڑتی گئی]۔ ۹ ذوالحجہ ۱۳۲۲ھ/۶ فروری ۱۹۰۵ء کو انہوں نے بعارضۃ فالج وفات پائی اور عید کے دن حیدرآباد میں مدفون ہوئے۔ "نواب میرزا داغ" اور "فصیح الملک داغ" سے ان کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔ داغ لمبے قد کے آدمی تھے، چہرے پر کسی قدر چیچک کے داغ تھے، رنگ سانولا تھا اور ڈاڑھی رکھتے تھے۔ آپ ایک باوقار اور شگفتہ شخصیت کے مالک تھے۔ مزاح کا احساس لطیف رکھتے تھے، عادات و اطوار نوابانہ تھے اور موسیقی سے انتہائی شغف تھا۔

مارہروی نے، جو ۱۵ اگست ۱۸۹۸ء سے لے کر تقریباً چار برس تک داغ کے ساتھ مقیم رہے، مرتب کیا ہے۔ ان تصانیف کے مستند ہونے کے بارے میں شبہات کا اظہار بھی کیا جاتا رہا ہے (دیکھیے تمکین کاظمی: داغ، ص ۱۶۲ بعد)۔

کلام داغ کے کئی انتخابات بھی منظر عام پر آچکے ہیں، مثلاً منتخب داغ، الہ آباد ۱۹۳۹ء؛ بہار داغ، لاہور ۱۹۴۰ء؛ کمال داغ، مطبوعہ آگرہ اور دیوان داغ یا انتخاب داغ، مطبوعہ لکھنؤ۔

داغ کا فن: داغ اپنی زبان کی پاکیزگی اور دلربائی، کلام کی روانی اور بے ساختگی اور اسلوب کی سادگی و نفاست کے لیے مشہور ہیں اور یہ سب صفات غزل کے لیے بالخصوص موزوں ہیں۔ واردات حسن و عشق اور دیگر تجربات زندگی کا وہ جس فنکارانہ اور حقیقت پسندانہ انداز سے اظہار کرتے تھے اس کا اثر سامعین پر براہ راست اور بڑا گہرا ہوتا تھا۔ زبان پر انہیں بڑی قدرت حاصل تھی۔ محاورات اور امثال کا وہ اکثر نہایت بر محل استعمال کرتے تھے۔ انہیں اسنادی کا درجہ حاصل تھا (قب ولی محمد خاں: محاورات داغ، دہلی ۱۹۳۴ء، جس میں مؤلف نے ۴۴۴ محاورات جمع کر کے انہیں باعتبار حروف تہجی ترتیب دیا ہے اور ان کی مجمل تشریح اور اشعار داغ سے ان کی سند پیش کی ہے۔ اس سے قبل فصیح اللغات میں انہیں خطوط پر احسن مارہروی کی کوشش نامکمل رہی اور صرف چند ایک محاورات ہی مجلہ فصیح الملک کے بعض شماروں میں شائع ہو پائے)۔ داغ نے اردو شاعری بالخصوص غزل پر بڑا گہرا اثر چھوڑا ہے۔ غزل کو انہوں نے ایک بار پھر بنیادی طور پر اظہار جذبات کا ذریعہ بنا دیا اور اس میں ایسی آسان اور سادہ زبان اختیار کی جو عربی و فارسی کے ان غیر مانوس اور سماعت پر گراں گزرنے والے الفاظ سے پاک تھی جنہیں ناسخ و آتش کے دبستان معن نے فروغ دیا تھا (قب نگار، ص ۱۹)۔

حقیقت یہ ہے کہ ان کے نزدیک اردو ایک ایسی زبان تھی جو فارسی سے پاک ہو (اچھی اردو شاعری کے بارے میں داغ کے تصور کے لیے دیکھیے نوری، ص ۶۵، ۱۷۰: قب جلوت داغ، ص ۱۳۲)۔ ان کی ادبی زندگی کے تین ادوار میں سے قدیم ترین دور ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ ان کے کلام کی بعض ممتاز خصوصیات اس دور کے کلام ہی میں جھلکتی لگی تھیں، یعنی پر وقار، واضح، سادہ، شگفتہ اور پر زور انداز بیان اور بیباکی خیال۔ دور ثانی یا دور رامپور میں یہ خصوصیات اور زیادہ ترقی پذیر ہوئیں اور یہی ان کا بہترین دور ہے۔ ان کا طرز بیان ایسا شیریں اور دلکش ہے کہ اس کی مثال اردو شاعری میں بہت کم نظر آتی ہے۔ وہ اپنے خیالات و جذبات کو جس انوکھے، ڈرامائی اور بے باکانہ انداز سے جامۃ الفاظ پہناتے تھے اس کی نظیر دوسرے شعرا کے ہاں شاذ و نادر ہی ملتی ہے (کمال داغ، ص ۵ بعد)۔ کلام داغ کے یہ استیازی محاسن گلزار داغ اور آفتاب داغ میں پوری طرح موجود ہیں۔ ان کے قیسرے اور آخری دور کا تعلق ان کے قیام حیدر آباد دکن سے ہے، جسے ان کا دور الحطاط کہنا چاہیے، اگرچہ زبان ویسی ہی صحیح، ویسی ہی غیر مبہم اور ویسی ہی ہموار ہے اور عبارت آرائی بھی استادانہ ہے، لیکن اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ آخری ایام میں انہیں اپنے اشعار میں محاورات استعمال کرنے کا ضرورت سے زیادہ شوق ہو گیا تھا۔ اس دور کی خصوصیات یادگار داغ میں نمایاں ہیں۔ عشقیہ شاعری میں داغ کا نصب العین (کسی حد تک) عایانہ اور مبتدل تھا، جس کی بعض لوگوں نے سخت مذمت کی ہے (قب چکبست: مضامین چکبست، الہ آباد ۱۹۳۶ء ص ۶۹ بعد)، لیکن دراصل ان کی شاعری زیادہ تر ان کے زمانے کے فرسودہ معاشرے کے عام رجحانات کی آئینہ دار ہے۔

ہندوستان کے طول و عرض میں ان کے بے شمار

تا ۱۸۸۰ء: (۱۷) جلال الدین احمد جعفری: تاریخ مشنویات اردو مطبوعہ آلہ آباد، ص ۲۱۸ تا ۲۲۰: (۱۸) حامد حسن قادری: کمال داغ آگرہ ۱۹۳۵ء: (۱۹) عبدالشکور شیدا حیدر آبادی: بیاض سخن (مرتبہ ۱۳۵۵/۱۴۲۳ء) حیدر آباد ۱۹۳۶ء: (۲۰) نور اللہ محمد نوری: داغ حیدر آباد ۱۳۵۵ء: (۲۱) سیما اکبر آبادی: حیات داغ: (۲۲) عبدالقادر سروری: اردو مشنوی کا ارتقا (مرتبہ ۱۳۵۸/۱۴۲۳ء) حیدر آباد، ص ۱۲۳: (۲۳) شیخ عبدالقادر: Famous Urdu Poets and Writers لاہور ۱۹۳۷ء: (۲۴) بشیر الدین احمد دہلوی: واقعات دارالحکومت دہلی ۱۹۱۹ء/۱۳۳۷ء: ۲: ۳۳۷ تا ۳۵۹: (۲۵) محمد یحییٰ تنہا: مرآۃ الشعراء لاہور ۱۹۵۰ء: ۲: ۳۳ تا ۳۵: (۲۶) مہناز نگار داغ نمبر ۱ مرتبہ نیاز فتح پوری لکھنؤ ۱۹۵۳ء: (۲۷) رفیق مارہروی: بزم داغ لکھنؤ ۱۹۵۶ء: (۲۸) آفتاب احمد مدنی: گلہائے داغ ڈھاکہ ۱۹۵۸ء: (۲۹) مولانا عروسی رامپوری: کچھ داغ کے متعلق (۱۹۵۸ء مخطوطہ): (۳۰) وحید قریشی: داغ (۱۹۵۸ء مخطوطہ): (۳۱) تمکین کاظمی: داغ لاہور ۱۹۶۰ء: (۳۲) سید ظہیر نیازی: بہار داغ لاہور ۱۹۳۶ء: (۳۳) فرحت ناہید: داغ تحقیقی مقالہ برائے ایم۔ اے (اردو) مخطوطہ در کتاب خانہ جامعہ پنجاب لاہور۔

(معد شفیق)

داغستان: ”بہاؤوں کی سرزمین“، یہ نام ایک غیر معمولی لغوی نوعیت کا حامل ہے، کیونکہ یہ ترکی لفظ داغ (=طاغ) بمعنی بہاؤ اور ایک ایسے لاحقے کا مجموعہ ہے جو فارسی زبان میں ملکوں کے ناموں کو متمیز کرتا ہے۔ بظاہر یہ نام دسویں/سولہویں صدی میں پہلی مرتبہ وجود میں آیا تھا۔ اب اس کا نام خود مختار سوویت سوشلسٹ جمہوریہ داغستان (R.S.F.S.R.) ہے، جس کا رقبہ اسی ہزار پانچ سو مربع میل ہے۔ ۱۹۵۶ء میں اس کی آبادی نو لاکھ

شاگرد پھیلے ہوئے تھے (جلوۃ داغ، ص ۱۲۵: نگار، ص ۱۳۱، ۲۵)، جس سے ان کے اسلوب کی انتہائی مقبولیت کا پتا چلتا ہے (لیکن دیکھیے مرآۃ الشعراء، ۲: ۳۶)۔
 مآخذ: (۱) میرزا قادر بخش صابر دہلوی: گلستان سخن (تصنیف ۱۲۷۰-۱۲۷۱ھ) دہلی ۱۲۷۱ھ: (۲) عبدالغفور خاں نساج: سخن شری: (۳) ۱۲۶۹/۱۲۸۵ء تا ۱۲۸۱/۱۳۶۳ء: فولکشور پریس ۱۲۹۱/۱۳۸۳ء: ص ۱۵۷: (۴) امیر احمد مینائی: انتخاب یادگار (مرتبہ ۱۲۸۹-۱۲۹۰/۱۳۸۷-۱۳۸۸ء): چاپ سنگی ۱۲۹۷/۱۳۸۸ء: (۵) سید نور الحسن: طور کلیم (مرتبہ ۱۲۹۷/۱۳۸۸ء) آگرہ ۱۲۹۸/۱۳۸۱ء: (۶) سید علی حسن: بزم سخن (مرتبہ ۱۲۹۷/۱۳۸۱ء) آگرہ ۱۲۹۸ء: ص ۱۶: (۷) علی نجف رامپوری: غنچۃ ارم (مرتبہ ۱۲۹۹/۱۳۸۱-۱۳۸۲ء) کلکتہ ۱۳۰۱/۱۳۸۳ء: (۸) صغیر بلگرامی: تذکرۃ جلوۃ خضر آرم ۱۳۰۲/۱۳۸۳ء: ۱: ۲۶۶: (۹) علی احسن مارہروی: جلوۃ داغ (مؤلفہ ۱۳۱۹/۱۴۰۱ء) حیدر آباد ۱۳۲۰ء/۱۹۰۲ء: (۱۰) نثار علی شہرت دہلوی: آئینۃ داغ لاہور ۱۹۰۵ء: (۱۱) عبدالجبار خاں صوفی ملکپوری: محبوب الزمن (تذکرۃ شعراء دکن، مرتبہ ۱۳۲۶/۱۴۰۸ء) حیدر آباد دکن ۱۳۲۹/۱۴۱۱ء: ۱: ۱۷۷: (۱۲) سری رام دہلوی: خمخانۃ جاوید (مرتبہ ۱۳۱۵-۱۳۱۶ء) دہلی ۱۳۱۷ء: (۱۳) ۱۰۳ تا ۱۳۶: (۱۴) راس مسعود: انتخاب زرین (مرتبہ ۱۳۱۳ء) مطبوعہ ہدایوں، ص ۱۷۵: (۱۵) طالب آلہ آبادی: در اردو (۱۳۱۵ء) اورنگ آباد اپریل-جولائی ۱۹۳۱ء: (۱۶) جمیل احمد: اردو شاعری، فولکشور پریس ۱۹۳۱ء: ص ۱۶۱ تا ۱۶۵: (۱۷) عبدالحی: گل رعنا (مرتبہ ۱۳۳۰/۱۹۲۱-۱۹۲۲ء) اعظم گڑھ ۱۳۷۰ء: ص ۱۷۷: (۱۸) عبدالسلام ندوی: شعر آئینہ مطبوعہ اعظم گڑھ ۱۳۷۰ء: (۱۹) رام بابو مکسینہ: A History of Urdu Literature of Urdu آباد ۱۹۳۷ء (اردو ترجمہ از مرزا محمد عسکری: تاریخ ادب اردو مطبوعہ فولکشور، ص ۲۶۶)

اٹھاون ہزار تھی [جو ۱۹۶۶ء میں سوا تیرہ لاکھ ہو گئی]۔ یہ جمہوریت دو بالکل علیحدہ حصوں سے مل کر بنی ہے: (۱) قفقاز کا پہاڑی سلسلہ اور (۲) بحیرہ خزر کے اس طرف کے وسیع میدان جو شمال میں دریائے تیرک Terek اور دریائے کما Kuma سے محدود ہیں اور جنوب میں ایک طرف دریائے سمر اور دوسری طرف دریائے گرا Kura کے ایک معاون دریا (الزن Alazan) سے۔

روسی فتح سے پہلے داعستان کا پہاڑی حصہ اور بحر خزر کے قریب کا میدانی علاقہ کبھی بھی زیادہ عرصے کے لیے کسی ایک قوم یا حکمران خاندان کے زیر اقتدار متحد نہیں ہوئے تھے۔ خود ساحلی میدان درہ درہ سے دو حصوں میں منقسم ہو جاتا ہے، جو صرف دو کلو میٹر چوڑا ہے۔ اس کا جنوبی حصہ زیادہ تر ایشیائے کوچک کی تہذیب یافتہ ریاستوں کے قبضے میں رہا، بحالیکہ شمالی حصہ جنوبی روس کی خانہ بدوش قوموں کے قبضے میں تھا۔ تاریخی زمانے کے آغاز سے اس پہاڑی خطے کی آبادی کی تسلی خصوصیات پر نہ تو جنوب کے لوگوں نے کوئی اہم اثر ڈالا ہے، نہ شمال کے باشندوں نے۔ روسی اقتدار کے قائم ہونے سے پہلے کوئی فاتح اس علاقے کے باشندوں کو مستقل طور پر زیر کرنے میں کامیاب نہ ہوا تھا۔ وقتاً فوقتاً یہ لوگ ساحلی میدان کے مختلف حصوں پر قابض ہوتے رہے، لیکن ہر مرتبہ ان فاتحین نے جلد ہی اپنے ان ہم قوموں سے جو پہاڑوں میں رہ گئے تھے، ہر قسم کا سیاسی تعلق منقطع کر لیا۔

ساحلی میدان کا جنوبی حصہ درہند تک قدیم زمانے میں البانیا کے پاس تھا۔ اس خطے کے شمال میں غالباً پہاڑوں کے درمیان بعض چھوٹے چھوٹے قبیلے رہتے تھے، جنہیں Strabo (باب ۳-۵) نے Δῆραι یا Τηρῆαι لکھا ہے۔ اہل روم اور بعد ازاں اہل ایران کو، جو چوتھی صدی عیسوی میں ان کے جانشین ہوئے،

خانہ بدوش قبائل کے خلاف درہند کی محافظت کرنی پڑی۔ عرب فاتحین نے ان علاقوں کو جس حالت میں پایا اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ساسانی سلطنت کی ثقافت اور شاید مزدکی مذہب نے بھی اس پاس کے پہاڑی باشندوں پر کچھ اثر ڈالا تھا۔ ان ممالک کے بعض امرا ایرانی القاب سے ملقب تھے، مثلاً طبرسران شاہ، جو درہند کے مغرب میں ایک ضلع کا حاکم تھا۔ طبرسران میں مشہور زہ ساز موسوم بہ زربہ گران (فارسی لفظ زربہ، بمعنی چار آئینہ، سے) بھی رہتے تھے، جن کی رسوم تجہیز و تکفین کو عبد الحمید الاندلسی (تحفة الالباب، طبع A. Ferrand، در JA، عدد ۲۰۷ (۱۹۳۵ء)، ص ۸۲-۸۳؛ نیز متن، در Borthhold: Zapiski Vostoč Otdel. Arkheol Obščestva (۱۰۴:۱۳) اور بعض دوسرے لوگوں نے بیان کیا ہے۔ ان رسوم کی ابتدا بظاہر ایران کے مذہبی اثرات کا نتیجہ تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ عیسائیت البانیا میں چوتھی اور پانچویں صدی میں پھیلنے شروع ہوئی اور وہاں سے داعستان کے میدانوں میں اور پہاڑی قبائل تک پہنچی۔

داعستان کے شمال میں عرب افواج کی کلمیائی کے باوجود، بالخصوص جب خلیفہ ہشام (۵۰-۷۰/۷۴۲ء تا ۷۵۰/۷۵۳ء) کے عہد میں مسلمہ بن عبدالملک نے پہلی مرتبہ درہند میں ایک حد تک عرب اقتدار قائم کیا، اس شہر نے ساسانیوں کے دور کی طرح عربوں کے زمانے میں بھی ایک سرحدی قلعے کے طور پر اپنی اہمیت بہر صورت قائم رکھی۔ دوسرے مقامات کی طرح وہاں بھی عربوں کی فتح کے بعد ہمسایہ قبائل کے ساتھ تعلقات میں مزید گہرائی پیدا ہو گئی۔ بائیں ہمہ باہمی روابط کے اس احیا سے جن لوگوں نے سب سے پہلے فائدہ اٹھایا وہ عیسائی اور یہودی تھے؛ مسلمانوں کی باری بعد میں آئی۔ قبیلہ خزر کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ انہوں نے ارمن بطریق ساہک Sahak سوم (۶۷۷ تا ۷۰۳ء) کے زمانے میں

شائیران تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کے برعکس بقول السمعودی (مروج، ۲: ۵) قبیلہ لکڑ کے افراد اس خطے کے بلند ترین پہاڑوں میں رہتے تھے۔ ان میں وہ "کافر" بھی شامل تھے جو شروان کے امیر کے ماتحت نہیں تھے۔ ابتدا میں روسیوں نے لکڑوں کا نام شمالی علاقوں یا تاوولی (از ترکی تاو، بمعنی بہاڑ) کے کوهستانوں کے مقابلے میں صرف جنوبی داغستان کے قبائل کے لیے استعمال کیا۔

آئندہ صدیوں میں اسلام کی ترقی کی رفتار داغستان میں بظاہر دھیمی رہی۔ ۶۶۵/۷۳۵ء میں روسیوں نے الغز کے اقتدار کو درہم برہم کر دیا۔ پھر خود اس ریاست کے جنوبی حصے کو جنگ کی تباہ کاریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بظاہر عیسائی الن Alans ایسے لوگ تھے جنہوں نے اس ہیجان سے فائدہ اٹھایا کیونکہ ان کی قلمرو جوتھی صدی ۵ ہجری/۱۱ویں صدی عیسوی کے مقابلے میں مقول فتح کے وقت مشرق کی طرف بہت زیادہ دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ بقول ابن الاثیر (۱۲: ۲۵۲) ان ممالک میں مقول کی پہلی تاخت کے دوران ان کا مقابلہ در بند کے شمال میں سب سے پہلے قبیلہ لکڑ کے افراد سے ہوا، جن میں اس وقت "مسلمان" اور غیر مسلم دونوں شامل تھے، پھر شمال ہی میں اور آگے بعض دوسرے نیم مسلم قبائل سے ہوا جو آوار (Avars) قبائل کے آبا و اجداد تھے اور آخر میں وہ آئن قبائل سے دو چار ہوئے۔ William of Rubruk کے بیان کے مطابق، جس نے نومبر ۱۲۵۴ء میں ان ممالک کی سیاحت کی تھی، یہاں کے پہاڑوں میں عیسائی الن آباد تھے اور "پہاڑوں اور سمندروں کے درمیان" عرب لکڑی (Saracen Lezgians) یعنی مسلمان رہتے تھے، تاہم خود Rubruk نے در بند کے شمال میں صرف ایک دن کی مسافت پر واقع ایک قلعے کو الن کا قا۔ (Castellum Alanarum) کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اس وقت تک مقول ان قبائل کو زیر کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔

عیسائیت قبول کی۔ ہارون الرشید (۸۱۷/۸۰۶ء تا ۸۰۹/۸۱۳ء) کے عہد میں یہودی اس قبیلے کے حاکم اور رؤسا کو اپنے مذہب کا پیرو بنانے میں کامیاب ہو گئے۔

قومیت یا نسل کے اعتبار سے داغستان کی تقسیم اور اس ملک میں تینوں مذاہب کی اشاعت کے بارے میں چوتھی صدی ہجری/۱۱ویں صدی عیسوی کے جغرافیہ نویس ہمیں صحیح معلومات مہیا کرتے ہیں۔ اس وقت عرب در بند کے علاوہ اس پاس کے قلعوں پر بھی قابض تھے، جو بقول السمعودی (۲: ۴۰) شہر سے صرف ایک فرسخ یا تین میل کے فاصلے پر واقع تھے۔ ایک مسلمان، جو در بند کے امیر عبدالملک کا خواہر زادہ تھا، طبرسران پر حکمران تھا۔ ابن رستہ (طبع ڈخویہ، ص ۱۴۷ بعد) بیان کرتا ہے کہ ہمسابہ سلطنت خجرائی کا فرمانروا ایک وقت تینوں مذاہب کا پابند تھا: وہ جمعے کے دن مسلمانوں کے ساتھ نماز میں شریک ہوتا، ہفتے کے دن یہودیوں کی عبادت میں شرکت کرتا اور اتوار کے دن عبادت میں عیسائیوں کا ساتھ دیتا تھا۔ السمعودی (مروج، ۲: ۳۹) نے اس امیر کو مسلمان بتایا ہے۔ اس کے متعلق یہاں تک کہا جاتا تھا کہ اس نے ایک شجرہ نسب بنوایا تھا، جس سے اس کا تعلق عرب نسل سے ظاہر ہوتا تھا، تاہم وہ اپنے ملک میں تنہا ایسا شخص تھا جو مشرق بہ اسلام ہوا، البتہ شمال کی طرف اور آگے ایک مسلم برزبان (کذا، مرزبان؟) قبیلہ گرج کے امیر کی حیثیت سے حکمران تھا۔ . . .

بظاہر عربوں نے جنوبی داغستان کے لوگوں کو لکڑ (Lezgians) کے نام سے موسوم کیا ہے، جن کی جغرافیائی سکونت کہیں بھی انہوں نے یقین سے ظاہر نہیں کی۔ بقول ایبلڈری (طبع ڈخویہ، D. Goeje، ص ۲۰۸) قبیلہ لکڑ کا علاقہ اس میدان میں واقع تھا جو سترہ سے لے کر موجودہ داغستان کے جنوب میں

بیان میں شہر ترقی کا ذکر بھی آیا ہے۔ قازی قوسوق اور قیناق کے درمیان، یعنی موجودہ علاقہ کوپیچی (Kabeci) میں زریہ گراں آباد تھے، جنہوں نے آہنگروں کے طور پر اپنی قدیم شہرت برقرار رکھی تھی اور اپنے ہاتھ کے بنائے ہوئے زرہ بکتر فاتح کی نذر کیے تھے۔ تیموری فتح اور عثمانی تسلط (از ۱۸۶۵ء/۱۲۶۱ء تا ۱۹۰۶ء/۱۳۰۶ء) کے زمانے میں داغستان میں اسلام کو مزید فروغ حاصل ہوا۔ دسویں صدی ہجری/ سولہویں صدی عیسوی کے آغاز سے داغستان کی بے دین آبادیاں مشرف بہ اسلام ہو گئیں۔ اسی دور میں ذرغہ (لشکوچہ) کے لوگوں اور قیناق کے قبیلے کے علاوہ بتدریج نغز اور نے اسلام قبول کر لیا؛ لیکن پندرہویں صدی کے پورے عرصے میں ان کے درمیان عیسائیت کا وجود بھی باقی رہا، بحالیکہ آندی (Andis) اور ددو (Didos) قبیلے لامذہب ہی رہے۔ بیشتر زریہ گراں (Kubaci) پندرہویں صدی میں مسلمان ہوئے تھے، لیکن ان میں سے بعض ایسے بھی تھے جو اٹھارہویں صدی کے اختتام تک عیسائیت ہی کے پیرو رہے۔ تیموری دور کے بعد لکڑوں نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا۔ قبول اسلام اس زمانے میں داغستان کے تاریخی ارتقا کا واحد پہلو نہیں تھا بلکہ اس میں جاگیرداری پر مبنی ریاستوں کی تشکیل کو بھی شامل کرنا چاہیے، جس نے داغستان کو ایک ایسا سیاسی نظام سپاہ کر دیا جو انیسویں صدی عیسوی تک قائم رہا۔

جاگیردارانہ ریاستیں، جو اس وقت ظہور میں آئیں یا جن کی نشو و نما اس زمانے میں ہوئی، دعویٰ کرتی رہی ہیں کہ ان کی ابتدا عربوں کی فتح سے ہوئی، لیکن ایسے دعویٰ آج کل شدت سے معرض بحث میں ہیں۔ تیمور کی مہمات کے بیان سے یہ صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ عثمانی ترکوں نے اپنے مختصر تسلط کے دوران داغستان کو جس حالت میں پایا اس کا آغاز

ابھی یہ ضروری تھا کہ ان دروں کی حفاظت فوج کے مخصوص دستوں کے سپرد کی جائے جن سے پہاڑوں میں سے میدان میں اترنے کا راستہ جاتا تھا تاکہ وسیع سبزہ زاروں میں چرنے والے مویشیوں کے ریوڑ کوہستانیوں کی تاخت سے محفوظ رہیں (قب Rubruk's: Fr. M. Schmidt Reise برلن ۱۸۸۵ء، ص ۸۳ بعد)۔

تیرہویں اور چودھویں صدی میں درہ درہند تک پھیلے ہوئے خطے کے علاوہ اس شہر کے جنوب میں واقع علاقوں کا ایک حصہ بھی آلتون اردو کی سلطنت کا ایک جزو تھا۔ تیمور کی مہمات (۱۳۹۵ء/۷۹۸ء تا ۱۳۹۶ء) کی تاریخ میں داغستان کے دو بڑے قبیلوں، یعنی قبیلہ قیناق (یا قیناغ) اور قبیلہ قازی قوسوق (اب لکڑ) کے نام پہلی مرتبہ اپنی موجود شکلوں میں ظاہر ہوئے ہیں۔ قیناق کا علاقہ، جو درہ درہند سے ملا ہوا تھا، تختمش کی سلطنت میں شامل تھا۔ شرف الدین یزدی (ظفرنامہ، مطبوعہ ہند، ۱: ۲۲۲ بعد) قیناق کے بارے میں لکھتا ہے کہ یہ لوگ لامذہب یا بدکیش (اوہام پرست) ہیں، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس وقت تک دائرۂ اسلام میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ بقول باربرو (Barbaro: Viaggi Ramusio، ۱: ۱۰۹ الف) پندرہویں صدی عیسوی تک بھی قیناق میں بہت سے یونانی اورمن یا روسن کیتھولک عیسائی تھے۔ اس کے برعکس قیناق کا امیر خلیل بیگ، جس کا ذکر Afanasid Nikitin نے اپنی سیاحت (۱۳۶۶ء) کی سرگزشت میں کیا ہے، ایک اسلامی نام سے موسوم تھا۔

قازی قوسوق قبیلے کے لوگ مسلمان تھے اور انہیں ان کے گرد و پیش کے بیدین لوگوں کے خلاف اسلام کا علم بردار تصور کیا جاتا تھا۔ ان کا امیر شوکل کہلاتا تھا۔ قازی قوسوق کے علاقے کے شمال میں لشکوچہ (موجودہ ذرغین) رہتے تھے، جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ تیمور کی مہمات کے

نویں دسویں صدی ہجری/پندرھویں سولہویں صدی عیسوی سے ہوتا ہے۔ مسلمان قبائل سب کے سب یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انہیں ابومسلم نے شرف بہ اسلام کیا تھا اور ان کے امیروں کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ ان والیوں کی اولاد ہیں جن کا تقرر اس نے داغستان میں کیا تھا۔ ”معصوم“ کا لقب، جو طبرسران کے امیر نے اختیار کیا، عربی کا معروف لفظ معصم ہے اور اس طرح قیتاق اوسمی (”نامور“ از اسم = نام) اور قازی قوموق کے شامخال کے لیے عربی اشتقاقیات وضع کر لیے گئے۔ شامخال کے لفظ کے بارے میں دعویٰ کیا گیا کہ یہ شام (ملک شام) سے ماخوذ ہے۔ اس لفظ کے لیے ایک اور اصل بھی دریافت کر لی گئی، یعنی شاہ بعل۔ یہ چیز غیر ممکن نہیں ہے کہ اس قسم کے اشتقاقیات نے بھی زیر بحث القاب کے تلفظ پر کچھ اثر ڈالا ہو۔ بظاہر یہ امر محض اتفاق کا نتیجہ نہیں کہ قازی قوموق کے امیر کا لقب قدیم ترین روسی دستاویزوں میں بھی اس شکل (شیوقل یا شوقل) میں پایا جاتا ہے جو شرف الدین یزدی (ظفر نامہ) میں موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ ایرانیوں اور روسیوں نے ایک دوسرے کی تقلید کے بغیر شامخال کو پکا کر شوقل نہیں بنایا ہوگا۔ اس سے زیادہ قریب قیاس یہ ہے کہ اس لقب کی موجودہ شکل مذکورہ بالا اشتقاق کے اثر سے وجود میں آئی۔ شامخال کی رعایا، یعنی قازی قوموق، یہ دعویٰ کرتے تھے کہ ابومسلم کے زمانے میں وہ حامیان دین کے طور پر ممتاز تھے اور انہوں نے عربوں سے ”غازی“ یا فاتحین کا لقب حاصل کر لیا تھا۔

تین بڑی جاگیریں رہائشیں، یعنی قازی قوموق کی شامخالت، قیتاق کی اوسدیت، اور طبرسران کی معصومت، نویں۔ دسویں صدی ہجری/پندرھویں۔ سولہویں صدی عیسوی میں داغستان پر حاوی تھیں۔ پہلا تاریخی قیتاق امیر، جس نے اوسمی کا لقب اختیار کیا، بظاہر احمد خان تھا۔ اس کی وفات ۸۹۶ھ

۱۵۸۷-۱۸۸۸ء میں ہوئی۔ اس کی بابت مشہور ہے کہ اس نے مجالیس نامی گاؤں کی تائیس کی جہاں عوام کے نمائندے اپنے معاملات کے بارے میں مشورہ کرنے کے لیے جمع ہوتے تھے۔ اس کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس نے رائج العام قانون کے قواعد و ضوابط کو ایک دستور کی شکل میں یکجا کرنے کا حکم دیا جس کی پابندی کرنا ججوں یا قاضیوں کے لیے لازمی تھا۔ یہ ایک ایسا اقدام تھا جسے آثار داغستان کے مصنف میرزا حسن آفندی نے ایک (”جسارت عظیمہ“) تصور کیا ہے۔

گیارہویں صدی کے وسط کے قریب (۸۱۰۵۰/۱۶۴۰) قیتاق قبیلے کے کچھ لوگ اپنے ہم قوموں سے علیحدہ ہو گئے اور جنوبی علاقوں کی طرف چلے گئے۔ ان تارکین وطن کا سربراہ حسین خان سالیان اور کوبہ میں ایک نئی ریاست قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ترکی سیاح اولیا چلبی (سیاحت نامہ، ۲: ۲۹۱ بعد) نے ان تارکین وطن سے ۸۱۰۵۷/۱۶۴۷ء میں شکی (موجودہ نخج) اور شماخی کے درمیان ملاقات کی تھی۔ اولیا چلبی کی مرتبہ فرہنگ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آج کل کی طرح قیتاق اس وقت لکزی (Lezzian) بلکہ مغول زبان بولتے تھے۔

قبیلہ قازی قوموق (موجودہ قبیلہ لکزی) کے شامخال امیروں نے رفتہ رفتہ اپنی حکومت شمال مشرق کے پہاڑوں سے آگے ترکی علاقے (قیق) کے اندر ساحل تک پھیلا دی۔ دسویں صدی ہجری/سولہویں صدی عیسوی میں یہ امیر معمولاً جاڑے کا موسم ساحلی میدان کے ایک گاؤں بیوناق (Bünak) میں اور موسم گرما ایک پہاڑی مقام کمخ میں بسر کرتے تھے۔ ۸۹۸۶/۱۵۷۸ء میں شامخال چوبان نے بیوناق میں وفات پائی، جس پر اس کے مقبوضات اس کے بیٹوں میں تقسیم ہو گئے۔ قدرتی طور پر اس تقسیم سے خاندان کے اقتدار میں کمزوری پیدا ہو گئی۔ قازی قوموق کے لوگوں نے،

اوسمی خان کے قوانین مرتب ہوئے۔

عربی زبان میں اسلامی ثقافت کے پھیلنے پھولنے کے اس زمانے میں سیاسی سطح پر ایک لاقانونی انتشار بھی رونما ہو گیا، جبکہ داغستان بہت سے قبیلوں اور ایک دوسرے کی مددقابل ریاستوں میں تقسیم ہو کر ترکی اور ایرانی اثر و رسوخ کے درمیان نڈبذب کی حالت میں تھا اور باری باری کبھی ایک اور کبھی دوسرے کی طرف مائل ہوتا رہا۔ اس سیاسی انتشار نے داغستان کی کمزوری کو اور محکم کر دیا اور یہ صورت حال لامحالہ کسی بیرونی فاتح کے لیے ترغیب کا باعث بنی۔

سواہریں صدی سے لے کر تین طاقتیں، یعنی ایران، ترکی اور روس، داغستان پر تصرف کی دعوتدار رہیں۔ ملکی امیر ان تینوں میں سے کبھی ایک اور کبھی دوسری سے اتحاد کر لیتے تھے۔ اس طرح کبھی انیسویں صدی میں جا کر بالآخر اس کشمکش کا اختتام روس کے حق میں ہوا۔

۱۵۸۶ء/۱۵۷۸ء کے بعد طبرستان کے امیر نے شامخال اور اوسمی کی طرح سلطان ترکیہ کی اطاعت قبول کر لی۔ پھر جب ۱۵۸۵ء/۱۵۷۶ء میں شاہ عباس نے ان علاقوں میں ایرانی اقتدار کو بحال کر دیا تو اوسمی اس سے مل گیا، بحالیکہ شامخال ترکوں کا وفادار رہا۔ ۱۶۰۲ء میں جو صلحنامہ طے ہوا اس کی ایک شرط یہ تھی کہ شامخال اور باب عالی کے دیگر وفادار امرا ایران کی جانب سے کسی انتقامی کارروائی کا شکار نہ بنائے جائیں گے۔ ۱۶۳۸ء/۱۶۰۸ء میں اوسمی رستم خان کے تذکوں سے جا ملا تو اس کے رقیب شامخال نے شاہ ایران کا التماس حاصل کر لیا، جس نے اس کے اعزازات کی توثیق کر دی۔ اسی قسم کے اعزاز و مناصب وہ اس سے قبل زار میکائی (Michael) سے حاصل کر چکا تھا (آثار داغستان، ص ۸۱)۔

جب شاہ حسین کی کمزور حکومت کے باعث صفوی سلطنت روبہ انحطاط ہو گئی تو داغستان خود ایرانی اقتدار

جو پہاڑوں میں رہتے تھے، بتدریج اپنے آپ کو حکمران خاندان سے مکمل طور پر آزاد کرنا شروع کر دیا۔ ۱۶۳۹ء/۱۶۳۰ء میں شامخال سرخانی میرزا کی وفات کے بعد شامخال امیر اپنے مستقر بیوناق یا تارخوف (ترق) سے صرف ساحلی خطے پر حکومت کرتے تھے۔ بعد کے شامخال حکمرانوں میں سے کوئی بھی کسب واپس نہیں آیا، جہاں شروع کے امیروں کے مزار اب بھی نظر آتے ہیں۔ اسی زمانے میں روسیوں نے امترخان پر قبضہ کرنے کے بعد شمالی قفقاز کے ممالک کو، جن میں داغستان بھی شامل تھا، اپنے تصرف میں لانے کی از سر نو کوشش کی۔ روسی فوج کا ایک دستہ شہزادہ خوف ووستینی (Khuvovos ini) کی سرکردگی میں تارخوف پر قبضہ کرنے اور قوی صوبہ سلفی ندی پر ایک قلعہ تعمیر کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ تاہم زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ روسیوں کو شامخال کے بیٹوں نے شکست دے دی اور وہ دریائے سلفی کے پار ہٹنے پر مجبور ہو گئے۔ ۱۶۹۰ء میں Buturlin اور Pleshceev کی رہنمائی میں تارخوف کے خلاف ایک نیا حملہ پہلے سے بھی زیادہ ناکام رہا۔

عثمانی تصرف اور روسی فتح کے درمیان کے دور کا امتیازی پہلو داغستان میں عربی ثقافت کی نشوونما ہے، جو شامل کے عہد میں اپنے نصف النہار کو پہنچ گئی۔ سترھویں صدی عیسوی کے دوران داغستانی ممتاز دانشور شیخ صالح الیمینی (ولادت ۱۶۳۷ء، وفات بمقام مگہ ۱۶۹۶ء) کے گرد و پیش جمع ہو گئے۔ اس کا سب سے نامور شاگرد گدقلی کا محمد موسیٰ تھا، جس نے داغستان میں اس کی تعلیمات کی اشاعت کی اور جو ۱۷۰۸ء میں حلب میں فوت ہوا۔ اٹھارھویں صدی عیسوی میں داغستانی طلبہ کی جماعتیں عربی زبان اور شریعت اسلامی سیکھنے کے لیے دمشق اور حلب گئیں۔ ثقافتی احیا کا یہ دور قانونی تنظیم کا دور بھی تھا، جس میں آور قبیلے کے اُمہ خان کا ضابطہ اور قسطنطی کے

بحال کیا اور اسے عادل گراسی کے بیٹے خاص پولاد خان کو دے دیا۔ پہاڑوں کے باشندے ادھر ادھر کے مسلسل حملوں، خصوصاً ۱۷۷۳ء اور ۱۷۷۴ء کے حملوں میں بھی آزاد رہے۔

۱۷۷۷ء/۱۱۶۰ھ میں نادر شاہ کے قتل کے بعد

نصف صدی تک ایران میں کوئی ایسی مضبوط حکومت نہ تھی جو اس سرحدی خطے میں اقتدار قائم رکھ سکے۔ خود سلطنت کے صوبوں کو داغستان کے امیروں کی تاخت و تاراج سے نہیں بچایا جاسکتا تھا۔۔۔ پھر روسی ۱۷۳۵ء

کے معاہدے کے باوجود داغستان میں دوبارہ اپنا اثر قائم کرنے لگے۔ سیاح Gomelin کو اوسمی کے علاقے میں گرفتار کیا گیا اور ۱۷۷۴ء میں وہ قتل کر دیا گیا اور ۱۷۷۵ء میں مادم Madem کے زیرِ کمان روسی

فوج کا ایک دستہ آ پہنچا اور اس نے اس علاقے کو ویران کر دیا۔ ۱۷۸۴ء میں شامخال مرتضیٰ علی دوبارہ روس سے جا ملا۔ ۱۷۸۵ء میں والی قفقاز کا عہدہ قائم ہو جانے سے ان ممالک پر روسی اقتدار

مستحکم ہو گیا۔ ایک مذہبی تحریک، جو ترکی کے ایما سے وجود میں آئی تھی اور جس کی رہنمائی شیخ منصور کر رہا تھا، داغستان پر محض سطحی اثر ڈال سکی۔ بیشتر امیروں نے اس کی تائید کرنے سے انکار کر دیا۔

جب قاچار خاندان کے حکمران نے ایران کے صوبوں کو از سر نو ایک سلطنت کے اندر متحد کرنے میں کامیابی حاصل کر لی تو انہوں نے دوبارہ قفقاز کے علاقوں کو اپنی قلمرو میں شامل کرنے کی کوشش

کی، لیکن اس مرتبہ روس اپنے دعاوی سے بغیر مقابلے کے دست بردار ہونے پر تیار نہ تھا، جیسا کہ اس نے نادر شاہ کے مقابلے میں کیا تھا۔ جنگ کا آغاز کتھربین دوم کے عہد حکومت کے آخری سال یعنی ۱۷۹۶ء

میں ہوا۔ درہند پر روسی قابض ہو گئے، لیکن اس کے بعد جلد ہی شہنشاہ بال Paul کے حکم سے اسے خالی کر دیا گیا۔ ۱۸۰۶ء میں روسیوں نے اس شہر پر

کے خلاف ایک تحریک کا مرکز بن گیا۔ اس تحریک کا سربراہ چلاق سور خامٹی خان تھا، جس نے اسی عرصے میں ایک نئی ریاست کی بنیاد ڈالی تھی۔ وہ اوسمی اور مدرس حاجی داؤد سے، جو ایک عوامی تحریک کا رہنما تھا، اتحاد کر کے ۱۷۷۴ء/۱۱۶۲ء میں شماخی پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر ان اتحادیوں نے ایک سفارتی وفد تسلط طلبید بھیجا، جس نے ان کے لیے سلطان سے خلعت اور خطابات و اسناد کے علاوہ باب عالی کی رعایا میں شمار کیے جانے کی مخصوص عنایت حاصل کر لی۔ اسی زمانے میں روس کی مداخلت نے واقعات کا رخ بدل دیا۔ ہوا یہ کہ روس نے ایران کے خلاف ایک مہم روانہ کی اور ۱۷۲۲ء میں در بند پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد جلد ہی ان دوسرے صوبوں کو جو بحر خزر کے مغربی ساحل پر واقع تھے خود روس کی اطاعت قبول کرنی پڑی۔ ۱۷۲۴ء کے معاہدہ تقسیم کی رو سے اس ساحل پر روسی حقوق کو باب عالی نے بھی تسلیم کر لیا۔

اس وقت کا روسی تصرف کچھ زیادہ دیر پا نہ رہا۔ نادر شاہ ایرانی سلطنت کی وحدت بحال کرنے میں کامیاب ہو گیا اور ۱۷۳۹ء کے معاہدے کی رو سے روس نے اسے دریائے کرہ Kura کے جنوب میں واقع تمام ممالک اور ۱۷۳۵ء کے معاہدے کے تحت دریائے کرہ اور دریائے سفق کے درمیان کا علاقہ بھی واپس کر دیا۔ پھر جب روسی اس مہم کو ناکام بنانے میں کامیاب ہو گئے جو کریمیا کے تاتاریوں نے داغستان میں بھیجی تھی تو باب عالی نے بھی اپنے دعاوی ترک کر دیے۔ ۱۷۱۸ء میں شامخال عادل گراسی سے پیٹر اعظم سے وفاداری کا حلف اٹھایا تھا اور ۱۷۲۲ء کی مہم میں اس کی مدد کی تھی، تاہم بعد میں چونکہ اس نے روسیوں کے خلاف اقدام کیا اس لیے ۱۷۲۵ء میں اسے لیپ لینڈ Lapland میں جلا وطن کر دیا گیا اور شامخال کی اسارت ختم کر دی گئی۔ نادر شاہ نے اس اسارت کو

کمزور ہوتے ہوئے بھی وہ اپنی انتظامی اور قائدانہ صفات کی بنا پر ان پر فوٹت رکھتا تھا۔ اس نے بیس سال تک پہاڑوں میں روسیوں کے خلاف جدوجہد جاری رکھی۔ ۱۸۳۳ اور ۱۸۳۴ء میں اس نے اپنی بڑی بڑی کامیابیاں حاصل کیں، جن کے نتیجے میں روسیوں کا تسلط صرف ساحل اور جنوبی علاقوں میں باقی رہ گیا۔ پہاڑوں کے اندر بہت سے روسی قلعے کوہستانیوں کے قبضے میں آ گئے تھے۔ ۱۸۳۹ء کے بعد شامل کا اقتدار دوبارہ پہاڑی خطے کے مغربی حصے تک محدود ہو گیا، لیکن اس نے مزید دس سال تک اپنی جدوجہد جاری رکھی۔

شامل کی معزولی کے بعد، جس نے ۲۵ اگست (۹ ستمبر) ۱۸۵۹ء کو شہزادہ بریاتسکی Baryatinsky کی اطاعت قبول کر لی۔ روسیوں نے کچھ عرصے کے لیے اور امرا کا اقتدار بحال کر دیا، کیونکہ اس وقت انہیں یہی مناسب نظر آیا کہ امیروں اور اونچے طبقے کے لوگوں کا اقتدار مستحکم کر دیا جائے تاکہ ان کی مدد سے مذہبی رہنماؤں کے اثر و رسوخ کو محو کیا جاسکے! لیکن روسی حکام نے جلد ہی اس حکمت عملی کو ترک کر دیا، قبیلہ اور کے شاہی خاندان کو ۱۸۶۲ء میں بے دخل کر دیا گیا اور اس کے بعد جلد ہی دوسرے امیروں کو بھی یکے بعد دیگرے اپنی برائے نام حکمرانی سے دست بردار ہونا پڑا، جو ابھی تک انہیں میسر تھی۔ پھر داعستان میں وہ نظام قائم کر دیا گیا جو ۱۹۱۷ء کے انقلاب تک وہاں موجود تھا۔ ۱۸۷۷ء میں جنگ روس و ترکیہ کے دوران میں یہاں کے لوگوں نے دوبارہ لڑائی شروع کر دی۔ ۸ (۲۰) ستمبر کو اس نئی تحریک والے کیمخ کے قلعے پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ قیناق اور طبرسران میں برائے حکمران خاندانوں کے اختلاف نے اوسمی اور معصوم کے لقب دوبارہ اختیار کر لیے، لیکن اس اثنا میں جنگ کا رخ روسیوں کے موافق ہو گیا اور انہوں نے جلد ہی اس

دوبارہ قبضہ کر لیا اور اس طرح داعستان میں ایرانی اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔

روسیوں کے خلاف امیروں اور بالخصوص ان کی رعیت کی مزاحمت اس کے بعد بھی جاری رہی۔ ۱۸۱۸ء میں شامخال کے ماسوا داعستان کے تقریباً سب امیروں نے روسیوں کے خلاف اتحاد کر لیا اور اس بغاوت کو گورنر Yermolov بمشکل فرو کر سکا۔ قبیلہ قیناق کے اوسمی کا لقب ۱۸۱۹ء میں اور طبرسران کے معصوم کا لقب ۱۸۲۸ء میں منسوخ کر دیا گیا۔ ۱۸۳۰ء کے بعد جن امیروں کو باقی رہنے دیا گیا انہوں نے اپنے ساتھ روسی مشیروں کی موجودگی منظور کر لی۔ عوام، جنہیں ان کے مذہبی رہنماؤں نے کفار کے خلاف جہاد کے لیے ابھارا تھا، مزاحمت میں اپنے حکمرانوں کی نسبت زیادہ ثابت قدم رہے۔ اٹھارہویں صدی کے اختتام سے نقشبندیہ جماعت کے لوگوں نے داعستان میں نفوذ حاصل کر لیا تھا اور وہاں انہوں نے کسانوں سے اپنی تعلیمات کی اشاعت کی۔ ۱۸۳۰ء کے قریب اس جماعت کے رہنماؤں نے اور قبیلے کے لوگوں میں ایک عام تحریک پیدا کر دی تھی، جس کا مقصد بیک وقت حکمران خاندان کی مخالفت، کفار کی مداخلت کا سدباب اور رسم و رواج کے مقابلے میں شریعت کی بحالی کی موافقت کرنا تھا۔ تحریک کا بڑا رہنما غازی محمد [رک بان] تھا، جسے روسی کازی سلا کہتے تھے اور جس کی تعریف و توصیف اس کے شاگرد عوام عربہ کے ایک بڑے ماہر کے طور پر کرتے تھے۔

۱۷ تا ۲۹ اکتوبر ۱۸۳۲ء کو روسی فوج کے ایک دستے نے غازی محمد کو گمری کے گاؤں میں گھیر کر ہلاک کر دیا۔ اس کا جانشین حمزہ بیک [رک بان] بھی ۱۸۳۳ء میں خولزاق کے قریب فوت ہو گیا۔ تحریک کا تیسرا رہنما شامل [رک بان] زیادہ خوش قسمت رہا۔ اپنے پیشرو حضرات سے علیحدت میں

ہنگامے کو فرو کر دیا ۔

داغستان میں شدید خانہ جنگی کے بعد (۱۹۱۷ء تا ۱۹۲۰ء) کے موسم خزاں میں سوویت حکومت قائم ہوئی ۔ ۱۳ نومبر کو خود مختار سوویت اشتراکی جمہوریہ داغستان کا اعلان کر دیا گیا، جس کا صدر مقام مخچ قلا قرار پایا ۔

اس جمہوریہ کی آبادی اب مسلم اکثریت اور غیر مسلم نوآبادکاروں کی اقلیت پر مشتمل ہے، جس میں روسی، یوکرینی، یہودی، قدیم باشندے (داغ چغت) اور بعض تووارد (Aghkenazim) شامل ہیں ۔

مسلم آبادی میں تین بڑے لسانی گروہ شامل ہیں : ۱۔ آئیری قفقازی (Ibero-Caucasians) یہ تین چھوٹے گروہوں میں منقسم ہیں، جو ایک دوسرے سے مختلف زبانیں بولتے ہیں :

اوار، آندی، ددو (Avaro-Ando-Dido) (قب اوار، آندی، ددو اور ارجی) ۔ ۱۹۵۹ء میں ان کی آبادی پہاڑی داغستان کے شمالی حصے میں دو لاکھ اڑسٹھ ہزار تھی ۔ اس میں اوار (یا خونزاق) لوگ، آٹھ چھوٹے آندی قبیلے (آندی خاص، آخوخ، بگولل، بوتلخ، گودوبری (Godoberis)، چنللی (Camalals)، کرتہ (Karatas)، اوار تندی (Tindis)، جو آندی کے دریا قویو سو (Kuyen) کی بلند وادی میں آباد ہیں، پانچ چھوٹے ددو قبیلے (ددو خاص یا Bézeta 'Tzezes 'Ginukhs 'Khwarghis اور Khunzals) اور ارجی قبیلے کے لوگ شامل ہیں ۔

اوار نے، جن کی زبان کو ادبی زبان کی حیثیت حاصل ہے، بعض دوسری قوموں کو اپنے گروہ میں شامل کر لیا ہے جن کی زبانیں احاطہ تحریر میں نہیں آتی تھیں اور ان کے ساتھ مل کر انہوں نے ایک واحد اوار "قوم" کی شکل اختیار کر لی ہے ۔

(ب) دارغین، لاق (Darghino-Lak) گروہ (قب دارغین، لاق، قیناق، گباجی)، جس کی تعداد ۱۹۵۹ء میں کوهستانی داغستان کے مغربی وسطی حصے میں

دو لاکھ پائیس ہزار تھی، اور جس میں دارغین (سابق زمانے میں آشکوچہ)، لاق (سابقہ قاضی قومووخ) اور دو چھوٹے قبیلے قیناق اور گباجی (سابقہ زریہ گران) شامل ہیں ۔ دارغین اور لاق قبیلے کی زبانوں کو ادبی حیثیت حاصل ہے ۔ قیناق اور گباجی قبیلے کو ایسی زبانیں میسر نہیں، آخر وہ دارغین قوم میں ضم ہو گئے ۔ (ج) سموری (Samurina) گروہ، جنوبی داغستان قب لڑک، رتل، طبرسران، اور شاہ داغ قبائل) تعداد دو لاکھ اٹاسی ہزار (۱۹۵۹ء میں) ۔ اس گروہ میں دو قومیں شامل ہیں جن کی زبان ادبی ہے، یعنی لڑکی (دو لاکھ تیس ہزار) اور طبرسران (پینتیس ہزار) ؛ نیز تین چھوٹے قبیلے بھی جو لکڑ قوم میں ضم ہوئے جا رہے ہیں ۔ آگل (Agul، آٹھ ہزار)، رتل (Rutul، سات ہزار)، اور زخھر (Tzakhr، چھ ہزار) ۔ اس گروہ سے شاہ داغ کے پانچ قبیلے بھی منسلک ہیں (تعداد تقریباً پندرہ ہزار)، جن کا سکن شمالی آذربائیجان ہے (Khinalug اور Khaputiz ' Kriz ' Djek ' Budukh) ۔ ان پر ترکی کا بہت اثر پڑا ہے اور یہ آذری قوم میں ضم ہوتے جا رہے ہیں ۔

۴۔ داغستان میں ترکوں کی نمائندگی آذری قبیلے کے لوگ کرتے ہیں، جو درہند کے ارد گرد کے میدان اور دریائے سمور کی نشیبی وادی میں آباد ہیں، نیز قومیق [رک بان] قبیلے کے لوگ، جن کی تعداد ۱۹۵۹ء میں ایک لاکھ پینتیس ہزار تھی بحر خزر کے اس طرف کے میدانوں میں جو درہند کے شمال سے لیے کر دریائے تیرک Terek تک پھیلے ہوئے ہیں ۔ نیز نوگای Nogay [رک بان] قبیلے کے لوگ (تعداد اکتالیس ہزار، ۱۹۵۹ء میں)، جو دریائے ترک اور دریائے کوما Kuma کے درمیان آباد ہیں ۔ آذری قبیلے کی طرح قومیق اور اور نوگای قبیلے کے لوگوں کی بھی ادبی زبانیں ہیں ۔

۳۔ ایرانی زبان بولنے والوں کی نمائندگی تات [رک بان] قبیلے کے لوگ کرتے ہیں جن کی تعداد دو

* دام : رگ بہ سنگہ
 * داماد : فارسی لفظ، بمعنی بیٹی کا شوہر ! جسے عثمانی سلاطین کی شہزادیوں کے شوہر بطور لقب استعمال کرتے تھے۔ ابتدائی سلاطین کے عہد میں حکمران خاندان کی شہزادیوں کی شادی وقتاً فوقتاً ایسے کوچک کے باجگزار سلاطینوں (مثلاً قرمان اورغلو) کے ساتھ اور بعض صورتوں میں سلطان کے وزیروں اور سپہ سالاروں کے ساتھ ہوتی تھی۔ برسہ کے ایک بزرگ امیر سلطان کا معاملہ، جس نے باہرید اول کی ایک بیٹی سے شادی کی، نہ صرف اس زمانے کے لحاظ سے بلکہ بعد کے زمانوں کو دیکھتے ہوئے بھی منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ آگے چل کر وزیر اعظم، قیودان پاشا، نئی جری کے آغا بستانچی باشی اور دوسرے اعلیٰ عہدے دار بھی سلاطین کے داماد بنے۔ ان میں سے زیادہ مشہور یہ ہیں : ابراہیم پاشا، سلیمان اول کا منظور نظر، رستم پاشا (سہ ماہ کا شوہر) سککو محمد پاشا (اسماء خان کا شوہر)، ابراہیم پاشا (محمد ثانی کا داماد) وغیرہ (دیکھیے، GOR : Hammer، اشاریہ، بذیل مادہ "سلاطین")۔ ان میں سے بعض کو ان کے ہمعصر اور مؤرخوں نے "داماد" کا لقب دیا ہے۔ یہ سلسلہ سلطنت عثمانیہ کے خاتمے تک جاری رہا (مثلاً داماد محمود پاشا، داماد فرید پاشا [رگ بان] وغیرہ)۔

شادی کی تقریبات بڑے تزک و احتشام سے منائی جاتی تھیں ! ان کا ذکر عثمانی وقایع میں، نیز مغربی سیاحوں کے سیاحت ناموں میں بڑی تفصیل سے آیا ہے (دیکھیے GOR : Hammer، اشاریہ، بذیل مادہ *Hochzeit und Vermählung*)۔ سلیمان اول نے جہیز کی رقم ایک لاکھ طلائی سکے (ذکلت)، اور خاصہ (شہزادیوں کا نان نفقہ) ایک ہزار سے ڈیڑھ ہزار تھری سترے (اسپر) یومیہ مقرر کیا تھا (۱۶۰۸ء کا ونسی *Relazione*، در Barozzi-Berchet، ص ۷۲ : Hammer، ص ۸ : ۳۱۱)۔ مزید برآں شہزادیوں کو ایک وسیع محل بھی جہیز

کے گرد و نواح میں کئی ہزار تھی، نیز سیدائی گانووں میں رہنے والے پہاڑی یہودی یا داغ چغت (تقریباً بارہ ہزار)، جو مذہباً یہودی ہیں لیکن تاتی زبان بولتے ہیں۔

داغستان ایک ایسی جمہوریہ ہے جس میں بہت سی قوموں کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ سوویت وفاقیہ میں یہی ایک ایسی جمہوریہ ہے جو کسی ایک قوم، ایک غالب قومیت (*narodnost*) پر مبنی نہیں ہے۔ دستور کی شرائط (ذفعہ ۷۸) کے مطابق اس جمہوریہ میں سرکاری طور پر منظور شدہ دس زبانیں ہیں : یعنی، آوارہ، دارغین، لاق، لزگہ، طبرسران، قومیق، نوگای، آذری، تاتی (جسے یہودی اس کی یہودی شکل میں استعمال کرتے ہیں) اور روسی۔ یہ زبانیں ابتدائی مدارس میں ذریعہ تعلیم ہیں۔ قدیم باشندوں کی زبانوں میں صرف آوارہ، دارغین، لاق اور قومیق میں اخبار نکلتے ہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہی چار قومیں آگے چل کر مرکز کشش بن جائیں گی اور یہ کہ بالآخر وہ دوسرے گروہوں کو جذب کر لیں گی۔

مآخذ : نفاذ ہر عام تصانیف کے علاوہ روسی زبان میں داغستان سے متعلق بہت سی کتابیں موجود ہیں ! مآخذ کی ایک فہرست (کتابوں اور مقالات کے ۱۳۲ نام) A. Bennigsen اور H. Carrère d'Encausse : *Une République soviétique musulmane : le Daghestan*, *aperçu démographique* در *REI* ۱۹۵۵ء ص ۷ تا ۵۶ میں ملے گی اور ایک زیادہ مکمل شکل روسی تصنیف *Narodn Pagestana* ماسکو ۱۹۵۵ Acad. Sc. کے ساتھ شائع ہے (۱۳۷ نام، جن میں چھ اناسی انقلاب سے پہلے کی تصانیف کے اور انھوں ۱۹۱۸ء کے بعد کی تصانیف کے ہیں)۔ ترکی مآخذ کے لیے دیکھیے *TR* بذیل مادہ (از مرزا بالا)۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے ان لوگوں سے متعلق مقالوں کے مآخذ جن کا متن میں ذکر ہے۔

(A. BENNIGSEN و W. BARTHOLD)

الداماد : داماد، ایک فخریہ لقب، جو میر *

محمد باقر بن شمس الدین الحسینی استرآبادی کو دیا گیا۔ بعض لوگ اسے امام فن مانتے ہیں اور السّلم الثالث کہتے ہیں۔ یاد رہے کہ مّسلم ثانی الفارابی [زک یان] کا لقب تھا۔ بہر حال اس نے مختلف علوم کو مدون و منظم کیا۔ داماد کا لقب اصل میں اس کے والد شمس الدین کو دیا گیا تھا، جو مشہور و معروف شیعہ عالم علی بن الحسین بن عبدالعلی کرکی، جو ”محقق ثانی“ کے لقب سے مشہور تھا داماد تھا (براہمان: تکملة، ۲ : ۵۷۴)۔ اس کے بعد اس کے فرزند کا بھی یہی لقب مشہور ہو گیا، جسے دامادی یا ابن الداماد کہتے ہیں، اور یہی زیادہ صحیح ہے۔

میر داماد استرآباد میں پیدا ہوا۔ بچپن کا زمانہ طوس میں گزارا۔ اس کے بعد، غالباً ابتدائی تعلیم کے لیے اصفہان گیا، پھر وہاں سے مشہد پہنچا اور تمام عقلی و نقلی علوم حاصل کیے۔ اس کے مشہور اساتذہ میں سے اس کے ماسون شیخ عبدالعلی بن علی (مجتہد) اور شیخ عزالدین حسین بن عبدالصمد عاملی، پدشیش بہائی، جو بعد میں میر داماد کا گہرا دوست بن گیا اور فخرالدین سماکی کا نام لیا جاسکتا ہے۔ تحصیل علم سے فارغ ہونے کے بعد میر داماد نے فقہ، کلام، حکمت اور علوم طبیعی و غریبہ میں تبحر حاصل کیا اور اپنے ہم عصر علما پر سبقت لے گیا۔

میر داماد کا سب سے اہم کام یہ ہے کہ اس نے فلسفے کو دین کے ساتھ تطبیق دی ہے، اگرچہ کلام، فقہ اور تفسیر میں بھی اس نے بڑی وقیع تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ اس نے علوم عقلیہ خصوصاً فلسفے کی تحصیل کو دوبارہ رونق بخشی۔ ابن سینا کے فلسفے کو اشراقی رنگ دے کر اور اسلامی تعلیمات کے ساتھ مرتبط کر کے (شیعی نقطہ نظر کے تحت) اسے نئی زندگی عطا کی۔ فلسفے، کلام اور فقہ میں اس کی کتابوں سے علوم قدیمہ کے طلبہ ہمیشہ استفادہ کرتے رہے ہیں، گو

میں دیا جاتا تھا۔ سلیمان اول کے عہد تک دامادوں کو عموماً صوبوں کا والی بنا کر بھیج دیا جاتا تھا تاکہ وہ باب عالی کے معاملات میں ذاتی طور پر کوئی دخل نہ دے سکیں (Koçibey، طبع ۱۳۰۲ھ، ص ۹۴، ۹۷)۔ پابندی یہ تھی کہ داماد کی اگر پہلی بیویاں ہوں تو انہیں طلاق دے دے اور دوسری کوئی اور شادی نہ کرے (دیکھئے مذکورہ بالا ونسی *Relazione*، ص ۲۰۳، بعد اور Hammer، ص ۱۰۳)۔ داماد کی حیثیت بیوی کے غلام کی سی ہوتی اور ان کے تعلقات کی یہ نوعیت ان کے اہمی انداز تخاطب سے ظاہر ہوتی تھی (دیکھئے مذکورہ بالا بیانات، ص ۲۲، ۱۰۳، *Voyages : de la moutraye*، ص ۳۳۸، بعد؛ Hammer : *Staatsverfassung*، ۱ : ۴۷۶ تا ۴۸۴، *GOR* : ۸ : ۲۱۱ تا ۲۱۳، *White* : *Three Years in Constantinople*، ۳ : ۱۸۰، بعد)۔ یہ روایت کہ ایسی شادیوں سے جو بچے پیدا ہوتے تھے انہیں پیدائش کے وقت مار دیا جاتا تھا (*Survey of the Turkish Empire*، طبع سوم، ص ۱۰۱، *GOR* : Hammer، ص ۳۶۳) درست نہیں، قب جودت، ۶ : ۱۹۶، بعد، *Relazioni*، موضع مذکور، ص (۱۸۱) ۳۷۲؛ البتہ یہ بات درست ہے کہ قدیم زمانے میں انہیں تمام سرکاری عہدوں سے محروم رکھا جاتا تھا (*Relazioni*، ص ۱۸۱)۔

مآخذ : ان کے علاوہ جو مقالے میں مذکور ہیں :

(۱) اسمعیل حقّی اوزون چارشلی : عثمانی دولتیں سرائی نشکیلاتی، انقرہ ۱۹۳۵ء : (۲) A. D. Alderson : *The Structure of the Ottoman Dynasty*، آوکسفرڈ ۱۹۵۶ء، ص ۹۷ تا ۹۸۔ مغول حکمرانوں کے دامادوں کا لقب ”کُرجن“ (Küregen) تھا، اس کے لیے دیکھئے (۳) Djawayni-Boyle، ص ۱۷۴، حاشیہ ۱۱ : (۴) *Trois Documents Mongols* : Cleaves و Mostaert، در *HIAS* ۱۸۵۲ء، ص ۴۷۴ اور (۵) مقالہ ”گور خان“ (J. H. MORDMANN)

ایران میں مثلاً صدرا کی کتابوں کے آگے وہ ماند پڑ گئی ہیں اور مثلاً صدرا کی تصانیف طلبہ کے لیے درسی کتابیں ہو گئی ہیں۔ برصغیر پاک و ہند کے مدارس میں میر داماد کی الاتق العین اور السبح الشداد (متن) میں چار جگہ مصنف نے اس کتاب کا نام السيرة المستقیم بھی لکھا ہے (پڑھائی جاتی ہیں۔ ۹۸۴ تا ۱۵۷۶/۱۰۲۵ تا ۱۶۱۶ء، جو تقریباً چالیس سال کی مدت ہوتی ہے، میر داماد اصفہان میں تدریس و تالیف، فلسفہ و علم الکلام کے باحثوں اور مذہبی مناظروں میں مشغول رہا، اور عہد صفوی کے مشہور علما میں شمار ہوا۔ اسے قرآن مجید کی قراءت کے ساتھ پڑا لگاؤ تھا۔ وہ اپنے اوقات زیادہ تر عبادت، تالیف اور تدریس میں گزارتا تھا۔ میر داماد ایک صاحب ذوق شاعر بھی تھا۔ تخلص اشراق کرتا تھا؛ اشعار کا خاصا مجموعہ اس نے اپنی یادگار چھوڑا ہے۔ اس کے بعض اشعار مجمع الفصحاء، ریاض العارفین اور آتش کدہ میں درج ہیں۔ ایک دیوان بھی اس کی یادگار ہے، جس میں اس کے عربی اور فارسی اشعار درج ہیں اور اس کا نام مشرق الانوار ہے۔ تاریخ عالم آراے عباسی میں، جو ۱۰۲۵ء/۱۶۱۶ء میں، میر داماد کی (۱۰۴۰/۱۶۳۰ء میں) وفات سے پندرہ سال پہلے لکھی گئی تھی، میر داماد کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے کہ وہ تمام علوم و فنون، خصوصاً فلسفے، علوم ادبیہ، ریاضیات، طب، فقہ تفسیر اور حدیث میں ایک عالم متبحر ہے۔ اس کے علاوہ اس کی بارہ کتابوں کے نام مذکور ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس تاریخ کے لکھے جانے سے بہت پہلے میر داماد کا نام حکیم، عالم، مصنف کی حیثیت سے مسام ہو چکا تھا اور علم و فن میں اس کی شہرت پھیل چکی تھی۔

شاہ عباس اول (۹۹۶ تا ۱۵۸۷/۱۰۳۹ء تا ۱۶۲۹ء) اور اس کے جانشین شاہ صفی اول کے دربار میں میر داماد کو خاص احترام، رسوخ اور مرتبہ

حاصل تھا۔ اس حالت میں وہ اپنے بعض ہم عصر علما اور درباریوں کی رقابت اور حسد سے دور رہتا تھا۔ اپنے دو مشہور ہم عصر دانشمند اور حکیم میں فندرسکی اور شیخ بہائی سے میل جول، رفاقت اور دوستی رکھتا تھا، خصوصاً شیخ بہاء الدین عاملی سے اسے خاص محبت تھی۔ ایسی دوستی دو بزرگ عالموں کے درمیان بہت کم دیکھی گئی ہے جس کا ذکر ہر خاص و عام کی زبان پر ہو۔ میر نے بہت سے شاگردوں کو اپنی تربیت سے بہرہ مند کیا، جن میں سے بہت زیادہ مشہور یہ ہیں: صدر الدین شیرازی، جو متاخرین میں سب سے بڑا حکیم گزرا ہے اور کتاب أسفار کا مصنف ہے؛ احمد علوی، جس نے کتاب شفاء اور میر داماد کی چند تصنیفات کی شرح لکھی؛ مثلاً خلیل قرولنی، شارح امول کافی؛ قطب الدین شکوری، جو فلسفے کی ایک صفحہ تاریخ اور چند دیگر رسائل حکمت کا مؤلف ہے؛ اور مشہور و معروف شاعر زلالی، جس نے مثنوی خیالی محمود و ایاز اور نظامی اور جامی کے نمونہ پر ہفت مثنوی لکھی۔

ایک لمبی عمر بسر کرنے کے بعد جو علم، حکمت اور دین کی خدمت میں صرف ہوئی، میر داماد نے ۱۰۴۰/۱۶۳۰ء میں وفات پائی۔ اس وقت وہ عراق کے متبرک مقامات کی زیارت کے لیے نکلا ہوا تھا۔ نجف اور کربلا کے درمیان جان بحق ہوا اور نجف میں دفن کیا گیا۔

میر کی یادگار کتابوں کی ایک اچھی خاصی تعداد باقی ہے، جن میں سے اکثر عربی میں اور کچھ فارسی میں ہیں۔ ان کی عبارت کی ساخت بہت پیچیدہ ہے، جس سے اس کا نام مشکل نویسی میں مشہور ہو گیا ہے؛ چنانچہ اس کی ایک کتاب الصراط المستقیم کے بارے میں ایک ایرانی شاعر کہتا ہے:

صراط المستقیم میر داماد
مسلمان نشنود کافر نبیناد

باریک مسائل کی طرف توجہ دی گئی ہے۔ میر داماد نے قرآن مجید کی ایک آیت کی تفسیر لکھی ہے جس کا نام اسات الہی ہے! ایک اور تفسیر فارسی زبان میں سدرۃ المنتہی نام کی بھی اس کی طرف منسوب ہے! ممکن ہے کہ وہ اس کے شاگرد اور داماد سید احمد علوی نے لکھی ہو۔ اس نے کچھ کتابیں احادیث اور روایات میں بھی چھوڑی ہیں، جیسے الکافی پر حواشی، الفقیہ، الصحیفۃ اور الرواشح الساویۃ، جو احادیث اسماءہ کی شرح ہے۔ احکام فقہ میں بھی میر داماد نے اچھی خاصی تعداد میں رسالے لکھے ہیں، مثلاً شارح النجاة، فقہ اور اصول فقہ پر فارسی زبان میں، جس میں ایک مقدمہ، پانچ باب اور ایک خاتمہ ہے۔ ایسے ہی اور کتابیں اور رسالے ہیں جن میں خاص خاص مسائل نکاح و سہر وغیرہ کے احکام بیان کیے گئے ہیں۔

میر داماد خواجہ نصیر الدین طوسی اور ملا صدرا کے درمیانی زمانے کا بہت بڑا اسلامی حکیم (فلسفی) ہے اور حقیقت میں ملا صدرا کے فلسفے کے لیے زمین میر داماد ہی نے ہموار کی ہے۔ میر داماد نے بوعلی سینا کے فلسفے پر اپنا رنگ چڑھایا اور بعض اشراقی اصولوں سے اس فلسفے کی تعبیر کی۔ بہت سے مشکل اور باریک مسائل کے سمجھنے کے لیے تاویل کے قاعدے پر عمل کیا، اور اس کے ذریعے دین اور فلسفے کے حقائق کے درمیان تطبیق دی۔ میر کے نزدیک باقی 'احکامے اشراقیہ' کی طرح فلسفہ فقط نظری اور ذہنی چیز نہیں ہے، بلکہ ایک زندہ حقیقت ہے جو انجام کار حکیم کو حقائق باطنی کا مشاہدہ کرا دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میر داماد کا استدلالی اور منطقی فکر آخر کار باطنی تجربوں، اور اشراقی مشاہدوں اور ملکوتی حالات کی طرف رہنمائی کرتا ہے، جن میں سے بعض کا ذکر اس کی بعض تحریرات مثلاً رسالہ الخلیۃ میں آ گیا ہے۔ میر داماد نے حکمت میں جو روش اختیار کی ہے

(= میر داماد کی صراط المستقیم کو (خدا کرے) نہ کوئی مسلمان سنے نہ کوئی کافر دیکھے)۔ برا کلام کی کتاب میں اس کی تالیفات کی ایک فہرست درج ہے اور ریحانۃ الادب میں اس کی اڑتالیس کتابیں ذکر کی گئی ہیں، لیکن پوری تحقیق کے باوجود اس کی تالیفات کی صحیح فہرست جو قابل وثوق ہو ہاتھ نہیں لگ سکی۔ میر داماد کی قابل توجہ کتابوں میں سے ایک الآفتی المبین ہے، جس میں وجود، زمان، حدوث و قدم کی بحث ہے؛ اس کی شرحیں بار بار لکھی گئیں اور ایران اور برصغیر پاکستان و ہند میں طالبان علم کی توجہ اس کی طرف بہت مبذول رہی ہے۔ برصغیر پاکستان و ہند کے مشہور متکلم مولوی فضل حق خیر آبادی کو اس کے پڑھانے کا خاص ملکہ حاصل تھا اور بحر العلوم نے اس پر حواشی لکھے ہیں۔ حکمت میں اس کی دوسری کتابوں میں سے جو اس فن میں اس کی اہم ترین یادگار ہے، قیسات ہے۔ اس کتاب میں زیادہ تر زمان اور حدوث عالم کے مسئلوں سے بحث کی گئی ہے اور اس کا سال تالیف ۱۰۳۳/۱۶۲۳ء کی گئی ہے۔ اس کتاب کی کئی شرحیں لکھی گئی ہیں، جن میں سب سے زیادہ مشہور سید احمد علوی کی ہے۔ اس کی ایک اور شرح محمد بن علی رضا بن آقا جانی کی ہے، جو بہت مفصل ہے اور اسلامی کتب حکمت کی سب سے زیادہ طویل کتاب سمجھی جاتی ہے۔ میر داماد کی دیگر یادگار کتابیں حکمت اور علم کلام میں الجہل المتین، تقدیسات، شرح شفاء بوعلی سینا، شرح الاستبصار خواجہ نصیر، تقویم الایمان اور جذوات ہیں۔ یہ آخری کتاب فارسی زبان میں ہے اور میر داماد نے اسے خاص طور پر شاہ عباس کے لیے تالیف کیا تھا۔ اس میں بارہ جذوات کے الدر حکمت الہی کے دورے کی مبداء (شروع) سے لے کر معاد (آخر) تک کی تشریح ہے۔ خاص کر قرآن مجید کی سورتوں کے شروع، قطعات کی تشریح کی گئی ہے اور قرآن مجید اور دین کے بعض

میں ان کی طرف اشارہ کرتا ہاں اور ان کے بارے میں دقیق بحثیں کرتا ہے اور آخر میں اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ عالم کے حادث ہونے کا نظریہ درست اور صحیح ہے۔ اگرچہ اس نظریے کی طرف بعض اس سے پہلے فلسفیوں نے اشارہ کیا ہے لیکن میر داماد نے اسے کمال کو پہنچایا اور وہ اسی کے نام سے مشہور ہو گیا۔

میر داماد حقیقت (واقعیت) کو تین مرحلوں میں تقسیم کرتا ہے : (۱) ذات باری تعالیٰ کہ دراصل تمام حقائق کو محیط ہے ؛ (۲) اسما و صفات اور مثل افلاطونی یا ارباب الانواع ؛ (۳) عالم طبیعی یا موجودات جن کی حالت ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔

ذات باری تعالیٰ اور اس کے اسما و صفات میں جو ہر لحاظ سے غیر متغیر اور ہمیشہ ایک حالت میں ہیں، ربط کا نام میر داماد "سرمد" رکھتا ہے۔ مثلاً افلاطونی، (ارباب الانواع) اور اس موجودات عالم کے درمیان کہ ہر ایک اپنے اپنے رب النوع کا نقل (منم) اور نقل (نظم) ہے، رابطے کو کہہ ان میں سے ایک ثابت اور دوسرا متغیر ہے، دہر کہتا ہے اور آخر میں موجودات متغیر کے باہم علاقے کو زمان کے نام سے موسوم کرتا ہے۔

چونکہ یہ عالم (خارجی) عالم مجردات اور مثل کے واسطے سے موجود ہوا ہے اس لیے اس کا حدوث دہری ہے زمانی نہیں۔ یہ جہاں کسی زمانے میں نہیں پیدا ہوا جو جہاں سے پہلے موجود ہو، بلکہ اس سے پہلے دہری تھا جو طویل اور مستند سلسلہ ہے جو اس کے عالم کے باہر اور اس سے بلند تر ہے۔ لہذا مخلوقات عالم کا ظہور حدوث دہری، ابداع اور اختراع ہے، حدوث زمانی، وضع اور فکون نہیں۔ عالم زمانی اگرچہ اپنے مرتبے میں حقیقت کا حامل ہے، عدم کے اعتبار سے دہری سے پیچھے ہے۔ وجہ یہ ہے کہ موجودات زمانی اگرچہ زمانے کے اندر متحقق اور

اس میں دو نکتے بہت نمایاں ہیں اور انہیں سے اس طرز فکر کی تعیین کی جاسکتی ہے۔ ان میں سے پہلا نکتہ مضامین فلسفہ کی ترتیب بیانی ہے۔ اکثر اسلامی کتب فلسفہ خواہ متقدمین کی ہوں یا متاخرین کی، شروع میں مسائل منطقیہ سے بحث کرتی ہیں، اس کے بعد طبیعیات کی باری آتی ہے پھر ریاضیات کی اور آخر میں الہیات پر کتاب ختم ہوتی ہے۔ میر داماد نے اس مقررہ طریقے سے انحراف کیا اور اپنا الگ طریقہ نکالا اور مسائل فلسفہ کے درمیان میں کوئی مدین طریقہ اختیار نہیں کیا مثلاً کتاب تہات میں جو اس کی سب سے زیادہ مشہور حکمت و فلسفے کی کتاب ہے، دس قس مندرجہ ذیل ترتیب کے ساتھ ہیں :-

- ۱۔ حدوث کی انواع اور وجود کی قسمیں
- ۲۔ سبق ذاتی کی تین نوع
- ۳۔ "بعدہ انفکاکہ" دو نوع کی ہے
- ۴۔ کتاب الہی سے شواہد
- ۵۔ "مباحث مرسلہ" کس طرح وجود میں آئیں
- ۶۔ زمانے کا حرکت کے ساتھ اتصال
- ۷۔ "احتجاجات انتضائیہ" کی تنقید
- ۸۔ اللہ سبحانہ کی قدرت کی تحقیق
- ۹۔ "جواہر عقلیہ" کے ثبوت کی دلائل

۱۔ قضا و قدر کے اسرار کے بارے میں قول فیصل

اس نمونے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مباحث کی ترتیب حکمت کی مشہور کتابوں مثلاً ابن سینا کی الشفاء اور ملا صدرا کی آسفار سے بالکل جداگانہ ہے اور یہی نکتہ ہے جس کی وجہ سے میر داماد کی تصانیف حکمت کی درسی کتابوں میں شامل نہ کی گئیں۔

دوسرا نکتہ جس سے میر داماد کی فلسفیانہ روش متعین ہوتی ہے یہ ہے کہ وہ مسئلہ زمان، پیدائش مخلوقات کی کیفیت اور حدوث عالم کی طرف خاص توجہ دیتا ہے یہاں تک کہ اپنے ہر رسالے اور کتاب

موجود ہیں، لیکن اگر موجودات دہریہ سے ان کا تعلق نہ ہو تو ان میں وجود کا پتا بھی نہ ہو۔ عالم مجردات میں یہ وجود سے لے بہرہ ہیں؛ اسی طرح عالم دہری باعتبار سرمد عدم سے پیچھے ہے۔ وہ کہتا ہے کہ عالم سرمد، دہری کی علت اور دہری زمانے کی علت ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سرمد تمام موجودات کی علت العللی ہے۔

میر داماد زیادہ تر تو مشائین کے عقائد کی پیروی کرتا ہے لیکن بہت سے مسائل میں اشراقیوں کا ہم خیال بھی ہے؛ مثلاً یہ اعتقاد کہ عقول کی تعداد دس پر منحصر نہیں؛ اور نہ کہ عالم ہورقلیا مجردات اور طبیعی اجسام کے درمیان یزید ہے۔ اس نے اشراقیوں سے بعض اصطلاحات بھی اخذ کی ہیں، مثلاً نور اسفید (نفس ناطقہ) اصل یہ ہے کہ میر داماد نے حکمت مشائخ و اشراق اور دین اسلام میں تطبیق دینے کی کوشش کی ہے اور ملا صدرا کے مکتب فکر کے پیدا ہونے کی داغ بیل اسی نے ڈالی ہے، جس نے شرع، معرفت اور استدلال کے درمیان کامل اتفاق اور ہم آہنگی کا دعویٰ کیا ہے۔

مآخذ : یورپ کی زبانوں میں : (۱) براکلمان : تکملہ : ۵۷۹ تا ۵۸۰ : (۲) E.G. Brown : A Literary History of Persia : کیمریج : ۱۹۲۸ء : ۵۶ تا ۵۷ : (۳) H. Corbin : ۵۷ تا ۵۸ : ۲۶ تا ۲۹ : (۴) H. Corbin : ۵۸ تا ۵۹ : ۲۱ تا ۲۸ : (۵) S.H. Nasr : "The School of Isfahan" : در "History of Muslim Philosophy" : طبع ایم۔ ایم شریف : Wiesbaden : ۱۹۷۰ء : ۶۲ تا ۶۳ : (۶) Catalogue of Persian Mss. in British Museum : ۸۳۵ : کتب و مقالات عربی و فارسی :

(۷) ابن معنوم : سلافة العصر : قاہرہ : ۱۳۳۸ھ : ۳۸۵

۱۸۷۸ء : (۸) اسکندر بک مخدومی : تاریخ عالم آرائے عباسی : تہران : ۱۳۱۳-۱۳۱۸ھ : ۱ تا ۶۵۸ : (۹) محمد باقر الخوانساری : روایات الجنات : تہران : ۱۳۳۳ھ : ۱ : ۱۱۸ تا ۱۱۹ : (۱۰) فضل اللہ الحقینی : خلاصۃ الاثر : قاہرہ : ۱۳۲۸ھ : ۳ : ۳۰۱ تا ۳۰۲ : (۱۱) محمد بن صادق نجوم السماء : لولکدور : ۱۳۳۳ھ : ۱ : ۱۶ : اعجاز حسین الکنوری : کشف الحجب والاسرار عن أسماء الكتب والأقوال : کلکتہ : ۱۳۳۳ھ (فہرست بنام محمد باقر بن محمد الحسینی الدہاد) : (۱۲) فہرست کتابخانہ اہدائی آقای مشکوٰۃ محمد تقی دانش بردہ : تہران : ۱۳۳۲ھ : ۳ : ۱۵۲ : (۱۳) محمد بن سلیمان اشکانی : فہرست العلماء : تہران : ۱۳۳۸ھ : ۱ : ۲۳۸ تا ۲۴۰ : (۱۴) عبد العزیز جواہر الکلام : رسالہ در فضیلت العلم والعداۃ (مخطوطہ) : (۱۵) رضا قلی خان ہدایت : مجمع الفصحاء : تہران : ۱۳۹۵ھ : ۷ : ۲ : (۱۶) لطف علی خان آذر : آئینکدہ : ۱۳۹۹ھ : ۱ : ۱۵۹ : (۱۷) رضا قلی خان ہدایت : ریاض العارفین : تہران : ۱۳۰۵ھ : ۱ : ۱۶۷ تا ۱۶۸ : (۱۸) عباس قسبی : الکنی واللقاب : نجف : ۱۳۲۶ھ : ۲ : ۲۰۹ تا ۲۰۷ : (۱۹) بخت آذر خان : مرآۃ العالم (مخطوطہ) : (۲۰) محمد خاتمہ : زینت التواریخ : ورق : ۵۵۳ : (۲۱) احمد علی : وقت آسمان : کلکتہ : ۱۸۸۳ء : (۲۲) محمد مجن آغا بزرگ : الذریعۃ : نجف : ۱۳۵۵ھ : ۲ : ۲۶۱ و تحت اسلامی کتب : میر داماد :

(عبد حسین نصر)

داماد فرید پاشا : اصل نام محمد فرید بن *

حسن عزت تھا : یہ سلطنت عثمانیہ کے آخری وزراء اعظم میں سے تھا اور "شورائے دولت" کا رکن تھا۔ ۱۸۵۳ء میں استانبول میں پیدا ہوا، کئی ادنیٰ درجے کے سفارتی عہدوں پر بھی کام کیا۔ ۱۸۸۲ء میں عبدالحمید ثانی کی عمشیرہ مدیحہ کے ساتھ شادی ہو جانے پر سے "شورائے دولت" کا رکن اور عضو مجلس سنا (senator) مقرر کیا گیا، نیز پاشا کا لقب عطا ہوا۔ ۱۹۱۱ء میں "حریت و اتلاف فرسی" کا مؤسس مشترک ہونے کے

داعغان : تہران اور مشہر کو ملائے والی شاہراہ اعظم پر ایک شہر، جو تہران سے تقریباً تین سو چوالیس کیلومیٹر کے فاصلے پر مشرق کی جانب واقع ہے۔ یہ تہران اور مشہر کے درمیان ریل کا سٹیشن بھی ہے؛ بلندی ۱۱۱۵ میٹر اور آبادی (۱۹۵۰ء میں) ۹۹۰۰ تھی۔ اس شہر سے ایک کیلومیٹر کے فاصلے پر جنوب کی طرف ایک اونچا ٹیلا ہے جو تہہ حصار کہلاتا ہے۔ ۱۹۳۱ء میں بین سلوائیا Pennsylvania کی یونیورسٹی کے زیر اہتمام یہاں کھدائی ہوئی تو زمانہ قبل تاریخ کی چیزوں کے علاوہ سامانیوں کے ایک عہد کی عمارت بھی برآمد ہوئی، جس کے اچھے کھچے حصے پر پلستر کیا ہوا تھا۔ یہاں مسلمانوں کے عہد کی قدیم ترین عمارت تاری خانہ ہے، جس کی تعمیر کی تاریخ تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی بتائی جاتی ہے۔ قیاس ہے کہ ایران کی باقی رہ جانے والی قدیم ترین مسجد یہی ہو۔ اس کے مابق ایک مینار بھی ہے، جو پانچویں صدی ہجری / گیارہویں صدی عیسوی کی تعمیر ہے۔ سلجوق عہد کے چند مقبروں کے گنبد بھی موجود ہیں؛ مثلاً بیس غلدار مورخہ ۵۳۱ھ / ۱۱۳۶ء، چہل دختران، مورخہ ۵۳۶ھ / ۱۱۵۳ء اور اسام زادہ جعفر۔ جامع مسجد کے مینار پر تاریخ ۵۰۰ھ / ۱۱۰۶ء۔ ۱۱۰۷ء مرقوم ہے۔

مآخذ : (۱) اقوال بعمانی : جغرافیای تاریخی دایگان، تہران ۱۳۲۶ھ / ۱۹۴۷ء ص ۳۶ بعد؛ (۲) دہنای ایران، تہران ۱۳۳۰ھ / ۱۹۵۱ء ص ۹۲؛ (۳) قرہنگ جغرافیای ایران، تہران ۱۳۳۰ھ / ۱۹۵۱ء ص ۱۱۶؛ (۴) دائرة المعارف الاسلامیة، مصر ۱۱۲ بعد؛ (۵) الإسطخری، ص ۲۱۰؛ (۶) ابن حوقل، ص ۲۷۱؛ (۷) المقدسی، ص ۶۵۵؛ (۸) Voyages : Ferrier؛ (۹) Ethnography : Khanikof، ص ۷۳؛ (۱۰) نصر الدین شاہ : رحلة فی خراسان، ص ۷۶ بعد؛ (۱۱) Histoire des Mongols : Quatremère، ص ۳۳۱ بعد

علاوہ وہ اس کا حشر بھی بنا۔ عثمانیوں کی شکست کے بعد وہ اپنے برادر نسبتی محمد ششم کا وزیر اعظم مقرر ہوا (۴ مارچ تا ۲ اکتوبر ۱۹۱۹ء اور ۵ اپریل تا ۲۱ اکتوبر ۱۹۲۰ء)۔ اس کی یہ حکمت عملی کہ فاتح طاقتوں کے ساتھ مصالحانہ رویہ رکھا جائے تاکہ ان سے صلح کی نرم شرائط حاصل کی جا سکیں ایسی ہی ناکام ثابت ہوئی جیسی کہ کمال (اتاترک) کے نعت اناطولی میں قومی تحریک مزاحمت کو دبانے میں اس کی کوششیں ناکام رہیں۔ قومی دباؤ کی وجہ سے اسے اکتوبر ۱۹۱۹ء میں استعفیٰ دینا پڑا، لیکن اتحادیوں کی کمک سے استانبول پر قبضہ ہوا تو وہ پھر اس عہدے پر بحال ہو گیا۔ قوم پرستوں کے خلاف مشہور فتویٰ (جس پر "شیخ الاسلام" ڈر زادہ عبداللہ کے دستخط تھے) شائع کرنے کی ذمہ داری اس کی حکومت پر تھی۔ اس نے اناطولی میں قوم پرستوں کے خلاف فوج بھی بھیجی۔ ۱۰ اگست ۱۹۲۰ء کو اس کی مجلس وزرا نے سوروس SAVRES کے صلح نامے پر دستخط کر دیے، لیکن قوم پرستوں کی روز افزوں قوت نے جلد ہی اسے برخاست کر دیا۔ ستمبر ۱۹۲۲ء میں وہ استانبول چھوڑ کر نیسہ Nice چلا گیا، جہاں ۶ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو اس کا انتقال ہو گیا۔

مآخذ : محمود کمال اینال : Osmanlı devletinde sun sadriazamlar، استانبول ۱۹۳۰-۱۹۵۳ء ص ۲۰۶ تا ۲۰۹؛ (۲) ملی نوسان، ۱۳۳۰ھ / ۱۹۱۲ء ص ۳۵۲؛ (۳) Tarik Z. Tunaya : Türkiye'de siyasi partiler، ۱۹۵۲ء ص ۳۱۵ تا ۳۵۵؛ (۴) Ali Funt : Türkpgeldi : Görüp iştiklerim، بار دوم ۱۹۵۱ء؛ (۵) WI، ۱۹۲۸-۱۹۲۹ء ص ۱ تا ۱۵۳؛ (۶) کمال (اتاترک) : Nutuk (دیکھیے ۱۹۳۳ء کے ایڈیشن کا اشاریہ)؛ (۷) ابراہیم علاء الدین گوسا : ترک مشہور لری انسابیگولویسی، ۱۹۵۶ء ص ۱۳۶

(D.A. RUSTOW)

سلسلی نبرد آزماؤں پر حملوں میں حصہ لیا۔ رمضان ۴۹۹ھ/جولائی ۱۱۰۰ء میں صلیبیوں کا ایک قائد یعنی انطاکیہ کا بوہموند Bohemund ملطیہ کی مدد کے لیے، جسے اب دانشمند نے محصور کر لیا تھا، روانہ ہوا لیکن وہ خود امیر کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا اور فیصریہ جدیدہ کے قلعے میں قید کر دیا گیا۔ دوسرے سال فرینکو لمبارڈ صلیبی فوج بوہموند کو چھڑانے کا پادوکیہ کے راستے جا رہی تھی کہ اسے بھی دانشمند نے شکست دی اور اسی سال کے ماہ ستمبر میں اس نے صلیبیوں کے آخری لشکر کے قتل عام میں حصہ لیا یہ لشکر آکوی تانہ Aquitaine اور بویریا کی امدادی افواج پر مشتمل تھا، جس کا قبادوکیہ میں ہراقلیہ (Heracleus) کے مقام پر صفایا کر دیا گیا۔ آئندہ سال دانشمند تین سال کے محاصرے کے بعد ملطیہ میں داخل ہوا اور اپنی کمال فیاضی کی بدولت یہاں کی مختلف النسل آبادی سے تحسین حاصل کی۔ شعبان ۵۰۶ھ/مئی ۱۱۰۳ء میں دانشمند نے بوہموند کو رہا کر دیا اور اس سے اپنے مشترکہ دشمنوں یعنی بوزنٹیوں اور سلجوقیوں کے خلاف اتحاد کے عہد و پیمان کیے، لیکن دانشمند کی وفات نے، جو ۵۰۷ھ/۱۱۰۳ء میں ہوئی، بوہموند کو اس معاہدے سے مستفید ہونے کا موقع نہ دیا اور قلعہ ارسلان کو موقع مل گیا کہ اپنے ستوق حریف کے علاقے کے ایک حصے اور شہر ملطیہ پر قبضہ جمائے۔ دانشمند کا سب سے بڑا لڑکا امیر غازی اپنے باپ کا جانشین ہوا۔ ۵۰۰ھ/۱۱۰۷ء میں قلعہ ارسلان فوت ہو گیا تو خاندانی مناقشات نے اس کے بیٹوں میں تفرقہ ڈال دیا۔ ان جھگڑوں میں غازی نے بھی حصہ لیا اور اپنے داماد مسعود کو ۵۱۰ھ/۱۱۱۶ء میں قونیہ پر قبضہ کر لینے میں مدد دی۔ بعد ازاں اس نے طغرل ارسلان اور والی ملطیہ اور اس کے اتابک ہلک کے ساتھ مل کر ۵۱۸ھ/۱۱۲۰ء میں امیر ارزنجان، ابن منگجنگ اور

Dictionnaire : Barbier de Meynard (۱۲) : ۲۷۸ : ۱
The : G. Le Strange (۱۳) : ۲۲۳ : ۱
'Lands of the Eastern Caliphate' ص ۳۶ پید : (۱۴)
الستانی : دائرة المعارف : بیروت ۱۸۸۳ء : ۵۵۹ : ۷
(D.N. WILDER)

* دانشگاه : رنک جامعہ

* دانشمند : ترکمانوں کا ایک خاندان جس نے شمالی قبادوکیہ (Cappadocia) میں پانچویں صدی ہجری/گیارہویں صدی عیسوی کے آخری ربع سے ۵۷۳ء/۱۱۷۸ء-۱۱۷۸ء تک حکومت کی۔ باقی خاندان امیر دانشمند قبادوکیہ (جنوب مغربی ایشیائے کوچک) میں اس بد نظمی کے عہد میں نمودار ہوا جو ۵۷۸ھ/۱۱۸۵ء میں سلیمان بن قنبلش، اجوق کی وفات کے فوراً بعد شروع ہوا اور پھر پہلی صلیبی جنگ میں اس نے نمائند کر دار ادا کیا۔ جب پہلی صلیبی جنگ کے سلسلے میں دانشمند کا ذکر پہلی بار آیا ہے وہ اس وقت سبسطیہ Sebastien، وادی یسٹیل ایرمانی (قدیم نام ایریس Iris valley) مع توقات Eudoxias، قوآنہ، آماسیہ، قسریہ جدیدہ Neocaesarea، اور کنگری Cagura پر قابض ہو چکا تھا۔ انقرہ سے قسریہ کو جانے والے راستے پر اس کا قبضہ تھا۔ شرق بحر اسود Pontic کے ساحلی شہر ایے خراج دیتے تھے اور اس کے فوجی دستے دور تک بحر اسود کے ساحلی علاقوں کو تاراج کر کے جارچیا اور ارسینیہ میں یورنیں کر رہے تھے۔ اس کا ارادہ ملطیہ Melitene بھی فتح کرنے کا تھا۔ اس وقت سلطان قلعہ ارسلان بن سلیمان نے ملطیہ کا محاصرہ کر لیا تھا اور اس کی مذاقت ارمنی گورنر گیریل Gabriel کر رہا تھا۔ اس موقع پر دانشمند وہاں آیا اور فریقین جنگ میں صلح کرادی۔ پھر صلیبی نبرد آزماؤں نے ۵۹۰ھ/۱۱۹۷ء میں نکائیہ (Nicaea) پر قبضہ کر لیا تو اس کی کوششوں میں رکاوٹ پیدا ہو گئی۔ اس سال کے موسم گرما میں دانشمند نے دوسرے ترک امیروں کے ساتھ مل کر

بار بار کیلیکیا اور بحر اسود کے ساحلی خطے میں ان
 قلموں کو پھر سے جھین لینے کی کوششیں کرتا اور ناکام
 ہوتا رہا، جو خاندان دانشمندہ کے قبضے میں تھے
 دوسرے ملک محمد کی وہ ناخاتیں جو اس کے سرکشی کے
 کاؤنٹ کے علاقوں میں تھیں۔ ۱۱۵۳ء/۱۱۴۱ء-۱۱۵۴ء
 میں ملک محمد کا قسمرہ میں انتقال ہوا۔ اب اس کے
 بھائی باغی ارسلان والی سیسطیہ نے اپنے بھتیجے ذوالنون
 کی حق تلفی کر کے خود امیر ہونے کا اعلان کر دیا اور
 متوفی بھائی کی بیوہ سے شادی کر لی۔ حکومت پر
 غاصبانہ قبضہ کر لینے سے اس نئے امیر نے خاندان
 دانشمندہ کی "امارت" کو کمزور کر دیا جو آگے
 چل کر اس خاندان کے خاتمے کا باعث ہوئی؛ کیونکہ
 ایک طرف تو ذوالنون نے قسمرہ پر قبضہ کر لیا اور
 دوسری طرف باغی ارسلان کا بھائی عین الدولہ پہلے البنان
 پھر سلطیہ کا مالک بن بیٹھا۔ اس طرح ایک ریاست کی
 اب تین حریف شاخیں ہو گئیں، جن کے حقوق کی بعض
 اوقات سلجوقی حمایت کرسکتے اور بعض اوقات مخالفت۔
 پھر کیف، جب تک باغی ارسلان زندہ رہا، اس خاندان
 کا نام قائم رہا۔ اس امر کے باوجود کہ وہ اپنے سر
 مسعود اور بعد ازاں اپنے برادر نسبتی قلیج ارسلان ثانی
 سے مسلطی اڑتا رہا۔ قیصر Manuel، جس نے پہلے
 سلجوقیوں سے اتحاد کر لیا تھا، تاکہ دانشمندوں
 کی بوزلطی علاقوں میں قابضوں کے روکنے کی راہ نکل
 آئے، اب اس نے قلیج ارسلان ثانی کے خلاف ۱۱۵۳ء/
 ۱۱۵۸ء میں باغی ارسلان کی حمایت کی اور ذوالنون پر
 اپنا تسلط جما لیا۔ دوسرے سال کے لمباں واقعات یہ
 ہیں کہ ایک طرف تو قلیج ارسلان اور Manuel کے
 درمیان جنگی سرگرمیوں کا آغاز ہوا اور دوسری طرف
 ایک وقت حریف خاندانوں میں جنگ جھڑپ گئی۔
 ۱۱۵۹ء/۱۱۶۶ء میں باغی ارسلان کی وفات سے اس گھرانے
 کے باہمی تنازعات زور پکڑ گئے، جن سے قلیج ارسلان
 کو اس امارت کے تباہ کر دینے کا موقع ملا، آہ

اس کے حریف صربوں کے ڈیوک کو شکست دی،
 لیکن اس نے اپنے قیدی، بنگجک کو، جو اس کا داماد
 بھی تھا، رہا کر دیا، جو اتحادیوں میں بھوٹ ڈالنے کا
 موجب ہوا۔ ۱۱۵۸ء/۱۱۶۶ء میں باک کے انتقال پر
 امیر غازی نے سلطیہ پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ مسعود
 اور اس کے بھائی ملک عرب، ولی انقرہ قسطنطینی کے
 مابین اس وقت لڑائی ہو رہی تھی۔ غازی نے اس میں
 مداخلت کی اور مؤخر الذکر کو شکست دی۔ اور
 ۱۱۶۱ء/۱۱۶۷ء میں اس سے قسمرہ اور انقرہ جھین لیے۔
 ملک عرب نے بوزلطی سے امداد کی درخواست کی،
 لیکن امیر غازی نے کثرتی اور قسطنطینی بھی فتح کیے
 اور قاپادوکیہ میں اپنا تسلط قائم کر لیا۔ ۱۱۶۳ء/
 ۱۱۶۹ء میں ارمنی بادشاہ تھوروس Thoros کی موت پر
 امیر غازی نے کیلیکیا Cilicia میں مداخلت کی اور
 انطاکیہ کے رئیس بوموند ثانی کو شکست دی، نیز
 ارمنی بادشاہ لیون Leon کو مطیع بنا لیا اور ادسہ
 Edessa کے کاؤنٹ کے علاقوں کو تاراج کر دیا۔
 پھر اس نے جون کومیوس John Comenus کی
 طرف رجوع کیا، جس نے ۱۱۶۲ء/۱۱۶۳ء میں اس
 سے قسطنطینی جھین لیا تھا۔ امیر غازی، جس نے
 Isaac Comenus کو بٹہ دی تھی، اب اپنے بھائی
 کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا اور دوسرے ہی سال مذکورہ بالا
 شہر پر دوبارہ قابض ہو گیا۔ امیر غازی کی فتوحات کے
 صلے میں خلیفہ المستنشد اور سلطان سنجر نے اسے
 "ملک" کا خطاب دیا؛ لیکن سفیر سلطیہ پہنچتے ہی
 تھے کہ امیر فوت ہو گیا اور یہ اعزاز اس کے بیٹے
 محمد کو ۱۱۶۳ء/۱۱۶۴ء میں ملا۔ جون کومیوس
 نے پھر جنگ جھڑپ دی اور ۱۱۶۵ء/۱۱۶۵ء میں
 قسطنطینی اور کثرتی کو دوبارہ حاصل کر لیا، لیکن
 جونہی وہاں سے ہٹا، یہ دونوں شہر ایک بار پھر
 ترکوں کے قبضے میں آ گئے۔ ملک محمد کے عہد حکومت
 کے لمباں واقعات یہ ہیں کہ قیصر جون کومیوس

جلد ۳ : Anna Comnena (۲) طبع 'B. Leib. ۱۸۱۸ء تا ۱۸۲۰ء : Niketas Choniates (۳) طبع یون Bonn ص ۲۷ تا ۲۹ : ۱۵۹ء تا ۱۵۷ء (۵) : Rinnamos طبع یون ص ۱۵ تا ۱۶ : (۶) مور کا Recueil Hist. Crois. Hist. Occ. I. : William Rec. Hist. Crois. : Albert کا Aix (۷) : ۱۲۹۷ء تا ۱۲۹۸ء : Hist. occ. ص ۵۲۳ تا ۵۲۵ : ۵۲۶ء تا ۵۲۷ء : (۸) ابن الاثیر (طبع ٹورن برگ) : ۱۱۰۰ء تا ۱۱۰۱ء : ۱۱۰۲ء تا ۱۱۰۳ء : J. Laurent (۹) : ۱۱۰۴ء تا ۱۱۰۵ء : Sur les Emir Danismendites jusqu'en 1104 : Melanges Iorga : ۱۹۳۳ء : ص ۵۹ تا ۵۶ : (۱۰) Mükt. Halil Yinanç : 'Danismendiler' : (۱۱) 'Selçuklular Devri : Türkiye Tarihi' : استنبول ۱۹۳۸ء : ص ۸۹ تا ۱۰۳ : (۱۲) L. Melikoff : La Geste de Melik Dānismend : جلد ۱ : پیرس ۱۹۶۰ء : (دیکھیے ملاحظہ) : [۱۳] البستانی : دائرة المعارف : بیروت ۱۸۸۳ء : ۷ : ۵۶۱ بعد : (۱۴) دائرة المعارف الاسلامیہ مصر : ۱۱۲ : ۱۱۳ : بعد : (۱۵) A.D. Mordtmann : در Zetische. d. Deutsch Morgenl ges : ۱۸۸۶ : P. Casanova : در Revue Numatique : Francaise (۱۸۹۳ء) : (L. MELIKOFF)

(L. MELIKOFF)

دانیق : یا (دانیق) دیکھیے منجہ

الدانی : ابو عمرو عثمان بن سعید بن عبد الاسوی

مالکی فقیہ اور سب سے بڑھ کر قاری قرآن : ۵۳۷ء / ۹۸۱ - ۶۹۸ء میں قرطبہ میں پیدا ہوئے - حج کرنے کے بعد انھوں نے ۵۹۷ء / ۱۰۰۶ - ۱۰۰۷ء اور ۵۹۹ء / ۱۰۰۸ - ۱۰۰۹ء کے درمیان کا زمانہ قاہرہ میں گزارا۔ اس کے بعد وہ قرطبہ واپس گئے، لیکن بہت جلد انھیں وہاں سے جانا پڑا۔ پہلے وہ سریہ گئے اور بعد میں دانیہ، جہاں سے ان کا نسبی نام بنا بیہنجے

یاغی ارسلان کی بیوہ نے ذوالنون کے بیہنجے اسمعیل بن ابراہیم سے، جس کی عمر حوالہ پیرس کی تھی، شادی کر لی، یہ دونوں ۵۶۷ھ / ۱۱۷۲ء میں ایک انقلاب میں ہلاک ہو گئے اور ذوالنون کو مسطیہ سے بلا کر امیر بنا دیا گیا۔ اب قاج ارسلان نے فوراً ہی اس پر حملہ کر دیا۔ لیکن ذوالنون کے خسر اورالدین اتابک دمشق کی مداخلت سے قلع ارسلان نے مجبور ہو کر ذوالنون سے جھینے ہوئے علاقے واپس کر دیے۔ لیکن ۵۶۹ھ / ۱۱۷۴ء میں اورالدین کی وفات پر قاج ارسلان نے فوراً ہی مسطیہ، وادی یشیل ابرماق نوقات، قومانہ اور آماسیہ پر قبضہ کر لیا اور قیصریہ جدیدہ کو محاصرے میں لینے کے لیے آگے بڑھا۔ ذوالنون کو شکست ہوئی اور سلجوقیوں نے قیصریہ جدیدہ پر قبضہ کر لیا۔۔۔ ذوالنون کو ۵۷۰ھ / ۱۱۷۵ء میں زہر دے کر ہلاک کر دیا گیا۔ وہی ملطیہ کی دانشمندہ شاخ، جو ابھی تک بچی ہوئی تھی، تو وہاں ذوالقرنین بن عین الدولہ کی وفات (۵۷۷ھ / ۱۱۶۶ء) پر اس کے تین بیٹوں کے درمیان اتفاق کا دور دورہ رہا۔ سب سے بڑے بھائی نصرالدین محمد کو ۵۶۵ھ / ۱۱۷۰ء میں معزول کر کے اس کے بھائی فخرالدین قاسم کو تخت نشین کیا گیا، لیکن وہ ابھی بمشکل پندرہ سال کا ہوگا کہ اپنی شادی کے دن اس پر سوار ہوئے کے ایک حادثے کا شکار ہو گیا۔ اس کا جانشین تیسرا بھائی افریدیون ہوا، مگر نصرالدین محمد نے ۵۷۰ھ / ۱۱۷۵ء میں اس سے پھر شہر واپس لے لیا اور قلع ارسلان کی سیادت تسلیم کر کے تین سال تک حکومت کرتا رہا، لیکن ۵۷۳ھ / ۱۱۷۷-۱۱۷۸ء میں سلجوقیوں نے ملطیہ پر قبضہ کر لیا اور اس طرح خاندان دانشمندہ کا خاتمہ ہو گیا۔

مآخذ : ادبہ کا Matthew : Chronicle مترجمہ

B. Dukaier : پیرس ۱۸۵۸ء : (۲) مائیکل ناسی

J.B. Chabot : Chronicle : Michael the Syrian مترجمہ

Littérature Arabe 'پیرس ۱۹۰۲ء' ص ۲۵۸ بعد :
(۲۸) 'دو' ع' ۹ : ۱۱۶ بعد : (۲۵) 'الزركلي : الأعلام'
۳ : ۳۳۶ بعد)۔

(دو) 'لائڈن بار دوم (و ادارہ)

دانیال^{۳۳} : [اسرائیلی روایات کے مطابق حضرت

دانیال^{۳۴} ان کے چار اکابر انبیا میں شمار ہوتے ہیں اور
صحیفہ دانیال عہد قائمہ قدیم کے صحیفوں میں شامل
ہے۔ قرآن و حدیث میں کہیں ان کا بالصراحت ذکر
نہیں آیا، البتہ عربی [تاریخی] روایات میں تورات کے
دانیال نام کی دو شخصیتوں کے متعلق کچھ غیر مکمل
بیان محفوظ ہے۔ ان میں سے ایک دانیال تو وہ
عہد قدیم کا مرد دانا ہے جس کا صحیفہ حزقیل کے
صحیفے کے بعد ہے۔ اور دوسرا دانیال وہ صاحب کشف
و تعبیر جو بنی اسرائیل کی اسیری کے زمانے میں بابل
میں رہتا تھا [ایک ہی شخصیت کے مختلف ادوار
حیات تسنیم کرنے میں کوئی علمی استحالہ بظاہر نظر
نہیں آتا]۔

دانیال نے کچھ مکاشفات دیکھے تھے، کیونکہ
روایات سے مترشح ہوتا ہے کہ ایک کتاب جس
میں اس قسم کی پیشگوئیاں مندرج تھیں اس تابوت
سے دستیاب ہوئیں جس کے متعلق فرض کیا جاتا
ہے کہ اس میں دانیال کی لعش تھی۔ [بقول البلاذری
(فتوح البلدان، ص ۳۷۸) حضرت ابو موسیٰ الاشعری
رضی اللہ عنہ کو فتح سوس کے بعد وہاں کے قلعے
سے دانیال نبی کی لعش ملی تو انہوں نے حضرت عمر
بن الخطاب رضی اللہ عنہ خلیفہ ثانی کے حکم سے
نئے کفن کے بعد دریا کا پانی بند کر کے اسے وسط
دریا میں دفن کر دیا اور پھر پانی جاری کر دیا۔
اسی سلسلے میں البلاذری نے یہ بھی بیان کیا ہے
کہ بخت نصر حضرت دانیال کو قید کر کے بابل
لے آیا تھا اور وہ وہیں فوت ہوئے تھے۔ اہل سوس
کے ہاں قحط پڑا تو انہوں نے اہل بابل سے

بود و باش اختیار کر لی اور ۵۳/۵۳۳ء میں یہیں
وفات پائی۔

ان کی ایک سو بیس تصانیف میں سے، جن کے
نام انہوں نے أرجوزہ میں گنوائے ہیں، صرف دس موجود
ہیں (دیکھیے براکلمان، ۱ : ۳۰۷ : تکملہ، ص ۷۹) :
ان میں سے دو مسائل نحوہ سے بحث کرتی ہیں اور
باقی قراءت کے فن سے تعلق رکھتی ہیں، جس میں الدانی
نے خاص طور سے شہرت حاصل کی۔ ان کی زیادہ مشہور
تصانیف یہ ہیں : کتاب التفسیر فی معرفة رسم مصاحف
الأمصار (دیکھیے *Notices et Extraits : S. de Sacy*
: ۲۹۰) اور التیسیر فی القراءات السبع (طبع O. Pretzl
استانبول ۱۹۳۰ء)، جس کا ابن خلدون کے بیان
کے مطابق، بڑی کثرت سے مطالعہ کیا جاتا
تھا، مقدمہ، ۲ : ۴۵۹) : المحکم فی قحط المصاحف،
حال ہی میں عزت حسن نے دمشق سے طبع کی ہے
(۱۳۷۹/۱۹۶۶ء)۔

مآخذ : (۱) 'دو' ت' طبع اول بذیل دائرۃ الدانی
از محمد بن شنب : (۲) الثقی : عدد ۱۱۸۵ : (۳) ابن شنگوال
عدد ۸۷۳ : (۴) ابن خیر : فهرستہ بعد اشاریہ : (۵)
المقری : نفع الطیب : ۱ : ۵۵۰ : (۶) یاقوت : ۲ : ۵۳۰ :
(۷) ابن فرحون : الدبیاج : قس ۵۱۳۱۶ : ص ۱۹۱ :
(۸) الذہبی : تذکرۃ الحفاظ : ۳ : ۳۱۶ : (۹) السیوطی :
طبقات الحفاظ : ۱۵ : ۱۵ : (۱۰) *Eintleitung : Freytag*
ص ۳۸۶ : (۱۱) *Geschichtsschreiber : Wüstenfeld*
ص ۹۰ : (۱۲) *Bibl. Ar. Sic : Amari* : ۲ : ۵۷۹ : (۱۳)
Ensayo : Pons Boygues : عدد ۹۱ : (۱۴) Nöldeke
وغیرہ : *Gesch. des Qordans* : ۳ : ۲۱۸ : بعد : (۱۵)
ابو المحاسن ابن تغری بردی : انجم الزہراء فی ملوک مصر و
القاهرة : ۵ : ۵۴ : (۱۶) غایۃ النہایۃ : ۱ : ۵۰۳ : (۱۷)
طاش کبری زادہ : مفتاح السعادت و مصباح السیادۃ :
۳۸۶ : (۱۸) براکلمان، ۱ : ۵۱۶ : و تکملہ : ۱ : ۷۹ : (۱۹)
مرتضیٰ زبیدی : تاج العروس بذیل مادہ : (۲۰) *C.L. Huart* :

* دانیال : مغل شہزادہ ، تاریخوں میں اسے سلطان دانیال کہا گیا ہے ۔ مغل شہنشاہ اکبر کا سب سے چھوٹا اور چھپتا بیٹا : اجمیر میں ۲۲/۸۹۷ء کو پیدا ہوا۔ ۱۰۰۸ء/۱۵۹۹ء میں اسے دکن کا فوجی صوبے دار مقرر کیا گیا اور اس کے شہر احمد نگر کو (۱۰۰۹ء/۱۶۰۱ء میں) فتح کر لینے کے بعد اکبر نے اسے اعزاز بخشا اور خاندیش کا صوبہ عطا کیا، جسے اس کے نام پر ”داندیش“ موسوم کیا۔ اس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ مضبوط جسم کا خوبصورت آدمی تھا، گھوڑوں کا شائق اور ہندوستانی نظمیں لکھنے کا سلیقہ رکھتا تھا۔ ابوالفضل نے اکابر سلطنت کی فہرست (آئین اکبری، ۱: ۳) میں اسے ہفت ہزاری دکھایا ہے۔ اس نے ہڈبان خمی کے مرض سے برہان پور میں ۹ ذوالحجہ ۱۰۱۳ء/۲۸ اپریل ۱۶۰۵ء کو انتقال کیا۔

مآخذ : مقالہ اکبر کے مآخذ،

(J. BURTON-PAGE)

* دانیہ : ہسپانوی میں دینیہ Denia، صوبہ Alicante کے شمال مشرق ضلع کا صدر مقام؛ یہ زمانہ حال کے تین صوبوں میں، جو کبھی بلنسیہ کی قدیم سلطنت کے اجزا تھے (قشتلون، بلنسیہ، القنت) سب سے زیادہ جنوبی صوبہ ہے۔ یہ شہر اپنے پچاس ہزار باشندوں کے ساتھ خلیج بلنسیہ (Sinus Sucronensis) کے جنوب مشرقی سرے پر، جبل قاعون (Mougn) کے شمال میں، جو دو ہزار ایک سو نوے فٹ بلند ہے، واقع ہے۔ قدیم رأس آرت میزیم Promontorium Artemesium اور فراریم Ferrarium یا ٹنپریم Tenebrim، موجودہ نام انتونیو Cabo de S. Antonio (یا S. Martin) کے شمال میں دانیہ لنگر انداز ہونے کی جگہ تھی، لہذا چھٹی صدی قبل مسیح میں مسیح مارسیلز یا سنٹی امپورباس (Emporium Ampurias) کے موسمہ والوں نے یہاں کی ایرانی بستی بستی، جسے

دانیال کی نقش عاریۃ مانگ لی تاکہ ان کے ذریعے بارش حاصل کر سکیں۔ اس طرح ان کی نقش اہل موس کے پاس پہنچ گئی۔

بنو اسرائیل کے مستقبل کے بارے میں رمزیہ خواب اور بعض خوابوں کی تعبیریں انہوں نے بیان کی ہیں (دیکھئے محمد جمیل احمد : انبیاء قرآن، ۳: ۵۲۹ تا ۵۳۰ : البستانی : دائرة المعارف، ۷: ۵۷۰)۔

تاریخی روایات میں دانیال میں بیان کیے ہوئے ضمنی قصے قدرے مختلف صورت میں محفوظ ہیں۔

مآخذ : (۱) الیعقوبی، ص ۷۰ : (۲) الطبری، ۱: ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹ تا ۶۶۸ : ۷۱۷ : (۳) المسعودی : مروج، ۱: ۱۱۷، ۱۲۰، ۱۲۱ : ۱۲۸ : (۴) منسوب بہ البیہقی : البدۃ والتاریخ، ۲: ۱۵۶ : بعد ۱۳۴ : ۱۳۵/۱۶۵ : بعد ۱۱۳ : بعد ۱۱۸ : بعد اور قبا اشاریہ : (۵) الثعلبی : عرائس المجالس، ص ۱۹۸ تا ۲۰۲ : (۶) البیرونی : الآثار، ص ۱۵ تا ۱۸/۱۷ : ۲۰ : ۳۰۰/۳۰۲۔ دانیال کے مقبرے اور تابوت سے لیے نیز دیکھئے : (۷) المقدسی، ص ۱۶۴ (قب C. Cahen) در Arabica، ۱۹۵۹ء، ص ۲۸ : (۸) الہروی : کتاب الزبانات، طبع J. Sourdel-Thomine، ص ۶۹/ترجمہ : Guide des lieux de pelerinage، ص ۱۵۴، حاشیہ ۴ (قب M. Schreiner، در ZDMG، ۵۸: ۵۳ : بعد) اور (۹) وولڈن، یار اول، مقالہ موس : مکتوبات دانیال، قب C. Levi Della Vida : Elenco، ص ۹۸ : نیز دیکھئے : (۱۰) Mille et un Contes : R. Basset، ۱۲۵ تا ۱۲۸ (B. Heller) کے تبصرے در RE، ۸۵: ۱۳۳ : بعد اور B. Heller : Encyclopaedia Judaica، ۵: ۷۷۳ : بعد : (۱۱) قرع مصر، ۹: ۱۱۸ : بعد : (۱۲) الثعلبی : قصص الانبیاء، قاہرہ، ۱۹۳۳ء، ص ۲۱۲ : بعد : (۱۳) البستانی : دائرة المعارف، بیروت، ۱۸۸۳ء، ۷: ۵۶۹ : بعد : (۱۴) Jewish Encyclopedia، ۳: ۳۳۰۔

(C. Vajda) [و ادارہ]

ترک وطن اور قوطوں Goths کے عہد کے متعلق گویا کچھ نہیں جانتے۔ دانیہ نے عبدالرحمن اول کے خلاف بغاوتوں میں کچھ نہ کچھ حصہ لینا شروع کیا تھا، لیکن ۴۰۲ء/۱۰۱۲ء-۴۰۳ء میں سقوط خلافت کے بعد یہ حصہ خاصا زیادہ ہو گیا؛ جب کہ خانوادہ عامریہ کے ابوالجیش مجاہد کا زمانہ آیا۔ یہ مجاہد عبدالرحمن ابن المنصور (جسے مغربی مآخذ میں Musett یا Mugeto کہتے ہیں)، کا آزاد کیا ہوا غلام تھا۔ شروع میں اس نے اور مشہور عالم خلیفہ المعینی (۴۰۵ء/۴۱۵ء تا ۴۲۱ء/۴۳۰ء) کی مدد سے دانیہ اور بالیازہ باریکی (Balearic) جزیروں [رک بہ سورقہ] (۴۰۵ء/۴۱۴ء تا ۴۳۶ء/۴۴۵ء) پر قبضہ کر لیا اور دوسرے ملوک الطوائف پر علم و فضل اور دولت کے لحاظ سے سبقت لے گیا۔ اس نے اپنے ارد گرد علما جمع کیے۔ وہ خود ایک ممتاز مفسر قرآن تھا۔ اس زمانے میں دانیہ صوبہ Levante اور اس کے ارد گرد کے علاقوں کا اہم ترین شہر تھا، جہاں قریب قریب بلا فصل سال کے ہر موسم میں کثرت ہوتی تھی اور وہ بہت دولت مند ہو گیا تھا۔ دانیہ کی بادشاہی ریاست نیم جزیری تھی، لہذا بحری مستقر کے طور پر بھی اس نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ اس کی جہازی گودی ہی میں اس بڑے کا زیادہ حصہ تعمیر ہوا تھا جس سے مجاہد بحری تاخت کا کام لینا تھا۔ جزائر بالیازہ پر قبضہ کر لینے کے بعد ۴۰۶ء/۴۱۵ء میں اس نے سارڈینیہ پر چڑھائی کی تھی جو بہت مشہور ہوئی؛ کیونکہ ادھر تو اس کا بیٹا علی المعروف بہ اقبال الدواہ جرموں کے ہاتھوں گرفتار ہوا اور ادھر اس وقت عیسائی اتحادیوں نے مجاہد کو شکست دی، اس کا بیچھا کیا اور جزیرہ دوبارہ چھین لیا۔ کئی برس کی فید کے بعد اقبال الدواہ نالوان دے کر رہا ہوا اور ۴۰۸ء/۴۱۷ء میں اپنے باپ کا جانشین بنا۔ اس نے ۴۰۸ء/۴۱۷ء تک تیس برس حکومت کی۔ اس کی ماں

شروع میں τὸ 'Ημεροσκοπεῖον (سٹرابو Strabo)، Hemeroscopium یعنی "دن کا پھرے دار" کہتے تھے۔ پھر اقیوس Ephesus کو آرٹیمس دیوی کا مشہور مندر بالا حصار کی پہاڑی پر بنا تو اسے آرٹیمیزیم Artemisium کہنے لگے۔ اہل روما کے عہد میں دی آنہ دیوی سے منسوب کر کے دی آنیم Dianium (دی آنہ کا شہر) موسوم کیا گیا اور اس نے عربی میں دانیہ (امالہ کے ساتھ) کی صورت اختیار کی اور آخر میں ہسپانوی میں "دینیہ" Denia بن گیا۔ اگرچہ اس کا اتحاد اہل روما سے تھا، لیکن چونکہ یہ ایک یونانی نوآبادی تھی، اس لیے قرطاجنہ والوں نے اس سے تعرض نہ کیا۔ رومن سپہ سالار کیٹو Cato نے اس شہر کے نواح میں اہل ہسپانیہ پر ۱۹۵ء سے پہلے فتح حاصل کی تھی۔ ہسپانیہ کو فتح کرنے والے مرنٹوریس Sertorius کو اسی جگہ اپنا آخری مأوی اور ایک طاقتور بحری اڈا ملا تھا۔ ایک بہت ہی قرین قیاس شہادت کے مطابق یہی جگہ تھی جہاں اسے ۲۳ء میں قتل کیا گیا۔ سیزر نے اس شہر کو سزا دی، کیونکہ اس نے ہومی (Dianium Stipendiarium) کا ساتھ دیا تھا۔ بابن ہمہ یہ شہر سلطنت روما کے ماتحت نہایت خوش حال بلدیہ بن گیا، جیسا کہ ان کھدائیوں سے ظاہر ہے جو وہاں ہوئی ہیں۔ بد جلد ہی عیسائی بن گیا اور ساتویں صدی عیسوی میں وہاں اسقفی (bishapric) بنا دی گئی، جہاں کے چار بڑے راہب طلیطلہ کی مجالس کلیسیا میں حصہ لیتے تھے۔ اس میں Severina کے قدیم عیسائی پچی کاری کیے ہوئے مقبرے کا ایک ٹوٹا ہوا ٹکڑا اور اس سے بھی زیادہ پرانے آثار موجود ہیں، جو اس کے نئے دین کی تصدیق کرتے ہیں۔ لیکن جب طارق نے ۵۹۴ء/۷۱۱ء میں ملک فتح کیا تو درحقیقت عربوں کے عہد حکومت میں یہ شہر اپنی ترقی کی انتہا کو پہنچا (آبادی پچاس ہزار۔ جتنی کہ اب ہے)۔ اس کے برعکس ہم عربوں سے قبل اس کی آبادی سے

یہاں حکومت کی جب کیتھولک بادشاہوں نے اسے ایک "مارکونیسی" (یا نوابی ریاست) بنا دیا۔ ۱۶۹۱ء میں فلپ سوم نے جب محنتی موروں کو جلا وطن کر دیا تو اس کی بھی بہت سی آبادی گھٹ گئی اور اس زمانے سے اس کی اہمیت جاتی رہی۔ پھر بھی ہسپانیہ کی جنگ تخت نشینی میں دانیہ، جس کی بندرگاہ قلعہ بند تھی، آج ڈیوک کی طرف سے بڑی برجگاری سے لڑا۔ اسے تین مرتبہ فلپ پنجم نے محاصرے میں لیا اور ۱۷۰۸ء میں فتح ہوا۔ ۱۸۱۲-۱۸۱۳ء میں اس پر فرانسیسیوں کا قبضہ ہو گیا تھا۔ دانیہ کا سب سے مشہور عرب عالم عظیم مفسر قرآن [اور ماہر قرأت] الدانی [رکبان] ابو عمر عثمان بن سعید الاموی گزرا ہے۔

مآخذ: (۱) *Historia de la : Roque Cúabas*

Cludad de Denia '۲ جلدیں' دانیہ ۱۸۷۳-۱۸۷۶ء:

(۲) *Dicc. geog-estadístico-histor. : Madoz* ۳۷: ۷

تا ۷۸: (۳) *الادریسی : Desc. de l'Afrique et de*

l'Espagne '۱۹۲: (۴) *باقوت : معجم البلدان* '۲:

۵۵- (اس میں بندرگاہ دانیہ کو الشان کہا گیا ہے):

(۵) *الاستاق : دائرة المعارف* '۷: ۵۷۲: (۶) *مرآة الاطلاع*

۵: ۲۲۶: (۷) *ابن الخطیب : اعمال الاعلام* '۲: ۲۵۰ تا

۲۵۸: *Les "Mémoires" du Roi Ziride Abd Allah* (۸):

در *al-And* '۱/۸: ۸۲ تا ۸۸: (۹) *غنیف ترک : El-Reino*

de Zaragoza en el Siglo XI '۷: تحقیقی

مقالہ '۱۸۹ تا ۱۵۹: (۱۰) *العلل الموشية* '۷: ۶۲:

علم مسکوکات: (۱۱) *F. Codera : Tratado de Numis*

mática arábigo-española 'میلرڈ ۱۸۷۹ء' میں ۱۷۳ تا

۱۸۱: (۱۲) *F. Caballero Infante : Estudio sobre*

las Monedas Arabes de Denia 'در *EL Archivo*

ج '۷: دانیہ ۱۸۸۹ء: (۱۳) *A. Vives y Escudero*

Monedas de las dinastías arábigo españolas 'میلرڈ

۱۸۹۳ء' میں ۲۱۲ تا ۲۲۱: (۱۴) *Dozy : Histoire des*

Musulmans d'Espagne '۸: ۳۰۳: (۱۵)

عیسائی تھی۔ اس کی تربیت قید میں ہوئی تھی۔ وہ مسلمان تھا۔ اس نے ۵۴۶/۵۴۷ء تا ۵۴۷/۵۴۸ء میں ۱۰۵۵ء میں اناج سے بھرا ہوا ایک جہاز مصر بھیجا، جہاں سخت تحفظ پھیلا ہوا تھا۔ جب اس کے برادر نمبیتی المقدس نے دانیہ کی طرف اپنی سرحدوں کو وسیع کرنا چاہا تو علی اس کی مزاحمت کرنے کے ناقابل تھا؛ اس کی رعایا نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور شہر کو المقدس کے حوالے کر دیا، جس نے علی کو سر قسطہ بھیج دیا، جہاں ۵۴۸/۵۴۹ء - ۱۰۸۱ء - ۱۰۸۲ء میں وہ انتقال کر گیا۔ المقدس دانیہ کی مملکت میں اپنے باپ المقدس کا جانشین ہوا اور اس کا بیٹا سلیمان بنو پیر کے زیر سیادت ۵۸۸/۵۸۹ء تک حکومت کرتا رہا۔ اس سال المرابطون نے المریہ پر قبضہ کیا تھا۔ اسی کے ساتھ سرسیہ، جاتوا اور دانیہ چھین لیے اور یہ سارے کے سارے آگے چل کر الموحدون کے زیر نگیں آ گئے۔ ۵۹۹/۶۰۰ء کے موسم بہار میں الموحدون نے دانیہ کی بندرگاہ میں جنگی جہازوں کا ایک طاقنوردستہ اور بڑی فوج جمع کر لی۔ یہ فوج میورقہ کے بنو غانیہ پر حملہ کرنے کے لیے راہ میں ایبہ میں ٹھہر گئی اور اسی سال کے ستمبر میں اس نے پلمہ چھین لیا۔ دانیہ پر اس وقت محمد بن اسحق حکومت کرتا تھا، جو اپنے باپ اسحق بن غانیہ کے بعد میورقہ کے تخت پر بیٹھا تھا، لیکن جسے اس کے بھائیوں نے اس بنا پر تخت سے اتار دیا تھا کہ وہ الموحدون سے ملا ہوا ہے۔ الموحد سلطان المنصور نے اپنی وصیت میں اس کی پر زور سفارش کی تھی۔ ۶۰۱/۶۰۲ء میں دانیہ آخر کار ارغون کے جیمز اول نے مسلمانوں سے لے لیا اور اس کے سرداروں میں سے ایک جرمن سردار کاروز Carroz نے اس کے علاقوں کی دوبارہ تقسیم کا بیڑا اٹھایا۔ ۷۲۵/۷۲۶ء میں اسے شہزادہ پدرو (Infante Don Pedro) کو دے دیا گیا، جس کی نسل کے لوگ گندیا Gandia کے شاہی ڈیوک تھے، جنہوں نے ۱۳۵۹ء سے اس وقت تک

ابن خلدون، مطبوعہ بولاق، ص: ۱۶۴؛ نیز رک بہ مجاہد۔

(A. HUICI MIRANDA و C.F. SHYBOLD)

⑥ داؤد علیہ السلام: اللہ تعالیٰ کے اوالعزم

پیغمبر، جو بنی اسرائیل کی ہدایت و رہنمائی کے لیے مبعوث ہوئے اور جن کا ذکر قرآن کریم میں سولہ مقامات پر نو سورتوں میں وارد ہوا ہے (قَبَّ النَّجَّار، ص ۳۰۳ و سیوہاروی، ۲: ۱۵۵)؛ آپ کا سلسلہ نسب گیارہ پشتوں سے حضرت ابراہیمؑ سے جاملتا ہے (الْبَدَايَةُ وَالنَّهَائِيَّة، ۲: ۱۰؛ النَّجَّار، ص ۳۰۳ و سیوہاروی، ۲: ۱۵۴)۔

بنو اسرائیل کا جو لشکر طالوت کی قیادت میں جالوت کے خلاف برسرِ پیکار تھا اس میں ایک نوجوان بھی تھا، جو اصل میں باپ کی طرف سے اپنے بھائیوں کی خبرگیری کے لیے آیا تھا مگر جب اس نے جالوت کے مقابلے میں اسرائیلیوں کی بس و پیش کو دیکھا تو طالوت کی اجازت سے اس کے مقابلے میں کود پڑا اور جالوت کو قتل کر ڈالا (۲ [البقرة]: ۲۴۷ تا ۲۵۱؛ نیز قَبَّ النَّجَّار، ص ۳۰۵؛ الثعلبی، ص ۲۰۷)۔ یہ جری اور باہمت نوجوان حضرت داؤدؑ ہی تھے۔ بنو اسرائیل میں یہ رسم چلی آتی تھی کہ یہود کے خاندان (سَبَط) سے نبوت اور اِثْرَائِیم کے خاندان (سَبَط) سے سلطنت مختص تھی مگر قتل جالوت کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ کو شہرت و عظمت کے ساتھ سلطنت اور حکمت (نبوت) بھی عطا کر دی (۲ [البقرة]: ۲۵۱؛ الْبَدَايَةُ وَالنَّهَائِيَّة، ۲ تا ۱۰)۔

حضرت داؤد علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ نے جو خاص فضل اور انعام فرمایا تھا قرآن مجید نے اس کا خصوصی اہمیت کے ساتھ ذکر کیا ہے وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُدَ مِمَّا نَفْضَلُ (۳۴ [سبا]: ۱۰) یعنی ہم نے اپنی جانب سے داؤد کو خاص فضیلت دی؛ ان انعامات خاصہ کی قرآن کریم نے تفصیل بھی بیان کی ہے: (۱) اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں اور پرندوں کو ان کا مطیع بنا دیا تھا، جو صبح و شام ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کرتے تھے (۳۴)

[سبا]: ۱۰؛ ۳۸ [ص]: ۱۷ تا ۱۹)۔ (۲) اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ اور ان کے بیٹے حضرت سلیمانؑ کو پرندوں کی بونیوں (مَنْطِقُ الطَّيْرِ) کی تعلیم اور فہم عطا کیا تھا (۲۷ [النمل]: ۱۷)۔ (۳) اللہ تعالیٰ نے لوہے کو ان کے لیے موم کی طرح نرم کر دیا تھا اور وہ اسے جس طرح چاہتے سوڑ لیتے تھے (۳۴ [سبا]: ۱۰؛ الْبَدَايَةُ وَالنَّهَائِيَّة، ۲: ۱۱؛ النَّجَّار، ص ۳۱)۔ (۴) اللہ تعالیٰ نے انہیں زرہ سازی کا فن عطا کیا جس سے وہ اپنی روزی اپنے ہاتھ سے کماتے تھے، چنانچہ حدیث نبوی میں وارد ہوا ہے کہ "انسان کا بہترین رزق وہ ہے جو وہ اپنے ہاتھ سے کما کر کھائے اور اللہ کے نبی داؤد اپنے ہاتھ کی محنت سے اپنی روزی کماتے تھے (۲۱ [الانبیاء]: ۸۰؛ ۳۴ [سبا]: ۱۰؛ الْبَدَايَةُ وَالنَّهَائِيَّة، ۲: ۱۱؛ الیخاری، ۲: ۵)۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے انسانیت پر ایک نعمت و احسان کے طور پر یہ ذکر فرمایا ہے اور کہا ہے کہ "ہم نے انہیں (داؤد کو) تمہارا ایسا لباس تیار کرنے کا فن سکھایا جو تمہیں شدت جنگ کے وقت محفوظ رکھتا ہے (۲۱ [الانبیاء]: ۸۰؛ الْكَشَاف، ۳: ۱۲۸)۔ اللہ تعالیٰ نے سلطنت داؤدی کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا ہے: وَشَدَدْنَا مُلْكَهُ (۳۸ [ص]: ۱۹) یعنی ہم نے اس کی سلطنت کو مضبوط کیا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں خلافت ارضی عطا کر کے لوگوں میں عدل و انصاف قائم کرنے کا حکم دیا (۲۸ [ص]: ۲۵)؛ چنانچہ مؤرخین نے بیان کیا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کو خدا نے ساری اقوام کے تمام خطوں کی حکومت عطا کی تھی جس میں شام، عراق، فلسطین اور جزیرہ عرب کے بعض حصے بھی شامل تھے (الْبَدَايَةُ وَالنَّهَائِيَّة، ۲: ۱۲؛ الثعلبی، ص ۲۱۲؛ سیوہاروی، ۲: ۱۵۷)۔ (۶) خدا نے انہیں حکمت اور فضل الخطاب یعنی منصب نبوت اور خطابت کی فصاحت اور صحیح فیصلے کی قوت بخشی تھی (۳۸ [ص]: ۱۹)۔ (۷)

قرآن کریم نے جن کتب مساویہ کا ذکر کیا ہے ان میں زیور بھی ہے، جو اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام پر نازل فرمائی تھی (النساء: ۱۶۳: ۱۷) [بنی اسرائیل: ۵۷] اور اسی زیور میں اللہ تعالیٰ نے ذکر کے بعد یہ لکھ دیا تھا کہ زمین کے وارث اس کے نیک بندے ہوں گے (الانبیاء: ۱۰۵) اور ایک روایت کی رو سے زیور، جو مواعظ و حکم کا مجموعہ تھا، رمضان میں نازل ہوئی تھی (البداية والنهاية، ۲: ۱۲)۔ (۸) زہد و عبادت میں اللہ تعالیٰ نے انہیں اتہماک بخشا تھا، جو النسائیت کے لیے ایک نمونہ قرار دیا گیا ہے، چنانچہ وہ نصف شب تک آرام کرتے، تہائی رات عبادت میں بسر کرتے اور ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن افطار کرتے تھے: اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ کے نزدیک پسندیدہ نماز داؤد کی نماز ہے اور اللہ کے نزدیک پسندیدہ روزہ داؤد کا روزہ ہے (البداية والنهاية، ۲: ۱۰: الثعلبی، ص ۳۱۲)۔ (۹) حضرت داؤدؑ کو اللہ تعالیٰ نے خوش گو بنایا تھا، چنانچہ لعن داؤدی ضرب المثل بن چکا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب ابو موسیٰ اشعری کی شیریں آواز کو سنتے تو فرماتے کہ ابو موسیٰ کو اللہ تعالیٰ نے لعن داؤدی عطا فرمایا ہے (البداية والنهاية، ۲: ۱۱: الثعلبی، ص ۳۱۰: النجار، ص ۳۱۱)۔

قرآن کریم میں حضرت داؤد علیہ السلام کی ایک آزمائش کا بھی ذکر ہے (۳۸ [ص]: ۲۱) تا (۳۹) جس کے مطابق دو شخص مقدمہ لے کر آئے ایک کی تناوے دلیاں تھیں اور دوسرے کی ایک دہلی تھی اور تناوے والا وہ ایک بھی لینا چاہتا تھا۔ حضرت داؤدؑ نے مدعی کی بات سنتے ہی فیصلہ سنا دیا اور اس راہبری پر اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ شکر بجا لائے۔ اس سلسلے میں اسرائیلی خرافات کے زیر اثر عورت کا قصہ بیان ہوا ہے، لیکن وہ بہتان ہے: اسی لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ

نے اس کے قائلین کے لیے حد کذب کا اعلان فرمایا تھا (النجار، ص ۳۱۳: البداية والنهاية، ۲: ۱۳: یعد: الثعلبی، ص ۳۱۳)۔ قرآن کریم میں حضرت داؤد علیہ السلام کی زندگی کا ایک سبق آموز واقعہ یوں ذکر کیا ہے کہ ایک روز حضرت داؤدؑ فیصلہ کرنے کے لیے عدالت میں تشریف فرما تھے اور آپؑ کے فرزند حضرت سلیمانؑ بھی ان کے پاس موجود تھے، مقدمہ یہ درپیش تھا کہ کسی زیور والے کی بھیڑوں نے رات کو کسی کی پکی ہوئی فصل کھا لی، حضرت داؤدؑ نے فیصلہ دیا کہ کھیت والے کا زبردست نقصان ہوا ہے اس لیے بھیڑیں بطور تاوان اس کے سپرد کر دی جائیں، مگر گیارہ سالہ سلیمانؑ نے مشورہ دیا کہ آپ اپنے فیصلے میں دونوں فریقوں کا خیال رکھیے۔ اس پر داؤدؑ نے کہا کہ تم فیصلہ دو، حضرت سلیمانؑ نے کہا کہ بھیڑیں کھیت والے کو دے دی جائیں وہ ان سے فائدہ اٹھائے اور کھیت بھیڑوں والے کو دیا جائے جو اس پر محنت کر کے اس حالت پر لے آئے جو بریاد ہونے کے وقت تھی: چنانچہ حضرت داؤدؑ نے اس فیصلے سے اتفاق فرمایا (الانبیاء: ۷۹)۔ مفسروں نے اس واقعے سے مقدمات پر نظر ثانی اور قاضیوں کے آداب کے سلسلے میں کئی ایک مسائل استنباط کیے ہیں (ابن العربی المالکی الاندلسی: احکام القرآن، ص ۱۲۵: الکشاف، ۳: ۱۲۸: یعد)۔

مآخذ: (۱) البخاری: (۲) الطبری: تفسیر، قاہرہ ۱۳۲۱ھ: ۵۵۳: یعد: (۳) آلوسی: روح المعانی: (۴) الثعلبی: العرائس، قاہرہ ۱۳۹۲ھ: (۵) النجار: قصص الانبیاء، قاہرہ ۱۹۶۸: (۶) سوہاروی: تصنیف القرآن، دہلی ۱۳۶۲ھ: (۷) نعمة اللہ الجزائری: قصص الانبیاء، نجف ۱۹۶۰: (۸) السعدی: مروج الذهب، بیروت ۱۸۶۱ھ: (۹) ابن کثیر الدمشقی: البداية والنهاية، قاہرہ ۱۹۳۲ھ: (۱۰) الزمخشري:

الکشاف، قاہرہ ۱۹۳۶ء: (۱۱) ابن العربی المالکی الاندلسی:
احکام القرآن، قاہرہ ۱۹۵۸ء: (۱۲) مفتاح کنوز السنۃ
بذیل مادہ: (۱۳) القرطبی: الجامع الاحکام القرآن، قاہرہ
۱۹۳۵ء: (۱۴) ابوبکر الجصاص: احکام القرآن، قاہرہ
۱۳۳۵ھ۔

(ظہور احمد اظہر)

* داؤد بن عبد اللہ: بن ادريس الفطاني یا الفطانی
(پٹنی [رک بان] سے نسبت، جو جزیرہ نمائے ملایا کے
شمال مشرق ساحل پر واقع ہے)، ایک ملایاوی مصنف
جو تیرھویں صدی ہجری / اسیسویں صدی عیسوی کے
نصف اول میں مکے میں رہتا تھا۔ یہ سلسلہ شکاریہ
سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے چھوٹی چھوٹی عوامی
کتابیں لکھیں نیز شافعی فقہ، دینیات اور سنی تصوف پر
مبسوط کتابیں لکھیں۔ یہ تمام تصنیفات عربی سے ملایاوی
زبان میں ترجمہ ہو چکی ہیں اور یہ تراجم عبدالصمد
الہلبانی [رک بان] کے تراجم کی نسبت زیادہ لفظی ہیں،
کیونکہ ان کا مقصد ان عوام الناس کو تعلیم دینا ہے
جو سہولت اور روانی سے عربی نہیں پڑھ سکتے، مگر
عربی زبان کے طرز بیان سے کسی حد تک واقف ہیں۔
اس کی سب سے پہلی تصنیف جس پر تاریخ درج ہے
۵۱۲۳ھ / ۱۸۱۰ء میں اور آخری کتاب ۶۱۸۴ھ میں
مکمل ہوئی۔ اکثر تصنیفات مختلف عربی کتابوں سے مواد
اکٹھا کر کے لکھی گئی ہیں، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے
کہ کبھی کبھی وہ ایک ہی کتاب کا تتبع کرتا تھا،
مثلاً اپنے الغزالی کی منہاج العابدین الی جنة رب العالمین
اور البہجة الوردية فی عقائد اهل الجماعة السنية، کے
ترجمے میں: مؤخر الذکر عبدالرحمن بن عبدالسلام
الصفوری کی شرح پر احمد بن عبدالرحمن الجزائری:
المنظومة فی التوحید (مکہ ۱۲۳۱ھ) اس المنظومہ کے
سرورق پر غلطی سے اسے ابن الورڈی سے منسوب کیا
گیا ہے: المنظومہ کا عربی متن تمام و کمال اس نسخے
کے اندر آ گیا ہے) کا ملایاوی ترجمہ ہے۔ دوسری

قابل ذکر کتاب کنز المن علی حکم ابی مدین ہے، جو
ابومدین شعیب بن الحسین الاندلسی کے حکیمانہ اقوال
کی ایک شرح (مکہ ۱۳۲۸ھ)۔ اقوال عربی میں نقل
کیے گئے ہیں) کا ترجمہ ہے۔ قانون نکاح پر داؤد پٹنی
کا ایک مقبول عام رسالہ سنگا پور میں ۱۳۸۷ھ میں
پتھر پر چھاپا گیا اور چند سال بعد اس کے کچھ اور
رسالے یعنی میں چھاپے گئے۔ اس کی بڑی بڑی تصانیف
مکے میں ۱۳۰۲ھ کے قریب قریب طبع ہو چکی تھیں اور
۱۳۲۸ھ سے آگے تک اس کے اختلاف نے، جو اس
مقدم شہر میں ابھی تک آباد ہیں اس کی کچھ تصانیف
دوبارہ طبع کیں اور بعض پہلے مرتبہ چھاپیں۔ داؤد پٹنی کی
ملایاوی کتابوں کے مخطوطات کیمبرج (سکاٹ کا ذخیرہ)،
جکارتا، لائڈن اور لنڈن (R. A. S) میں موجود ہیں،
لیکن ان میں سے کوئی غیر مطبوعہ نہیں ہے۔

مآخذ: (۱) Mekka: C. Snouck Hurgronje

Catalogus v. d. : H. H. Juynboll (۲) : ۳۸۶ : ۲

Mal. en Sund. liss. der Leldsche Univ. Bibl.

Catalogue der : Ph. S. van Ronkel (۳) : ۲۷۶

Mal. liss. in het Museum v. h. Bat. Gen. v. K. en W.

ص ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱ : C. O. Blagden (۴)

List of Malay books در JRAS ۱۸۹۹ء ص ۱۲۵، عدد

A history of Malay : R. O. Winstedt (۵) : ۵۰

literature در JSRRAS ۱۹۰۵ء ص ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴

(P. VOORHOEVE)

* داؤد بن علی بن خلف: الاصفہانی، ابوسلیمان،

فرقة ظاہریہ [رک بان] جسے داؤدیہ بھی کہا جاتا ہے)
کا امام فقہ۔ یہ اس گروہ کا انتہا پسند نمائندہ ہے جو
عقل و استدلال کو بالکل چھوڑ کر فقط ظاہر قرآن مجید
اور حدیث پر اعتماد کرتا ہے۔ داؤد نے ذاتی رائے ہی کا
انکار نہیں کیا، جیسے الشافعی [رک بان] نے کیا تھا،
بلکہ جہاں تک اس کا بس چلا، باقاعدہ تمثیلی استدلال
(قیاس) کو بھی، جسے الشافعی نے قبول کیا تھا اور

(جن کے ورق تین ہزار تک ہیں)۔ ان میں اصول شرح اور قانون موضوع کے تمام شعبے (فروع) درج ہیں۔ ان میں سے کوئی کتاب باقی نہیں رہی۔ اب ان کے عقیدے کی تفصیلی توضیحات میں صرف متأخرین کی تصنیفات ہی میں مل سکتی ہیں (مثلاً السبکی اور خصوصیت کے ساتھ امام ابن حزم [رک باں] اور "اختلاف" پر لکھی گئی بعض کتب میں)، لیکن یہ مصنفین داؤد اور اس کے اتباع کی رائے میں ہر جگہ امتیاز نہیں کرتے۔ ایک حنبلی مصنف محمد الشطی (۴۱۳/۱۸۸۹ء - ۴۸۹/۱۸۹۰ء) نے دمشق کے مفتی محمود بن حمزہ الافندی الحمزاوی (م ۵۱۳/۱۸۸۷ء - ۵۸۸/۱۸۸۸ء) کے ایما پر ان میں سے بہت سی آرا کو ایک جگہ جمع کیا اور ان کا موازنہ مشابہ حنبلی عقائد کے ساتھ کیا ہے (رسالۃ فی مسائل الاسام داؤد الظاہری، دمشق، ۵۱۳ھ)۔ مرور زمانہ سے ظاہریہ مکتب فکر نابود ہو گیا اور یہی وجہ ہے کہ اجماع علما تعین کا کرتے وقت ظاہریہ فرقے اور ان کے امام داؤد کی آرا کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا، اگرچہ بعض علمائے شافعیہ، کم از کم نظریاتی اعتبار سے، ان کی بابت زیادہ مصالحانہ رائے رکھتے ہیں (دیکھیے النووی اور زیادہ تفصیل کے لیے السبکی)۔ داؤد کا انتقال بغداد میں ۵۲۷/۸۸۴ء میں ہوا اور وہیں اسے دفن کیا گیا۔ اس کا بیٹا محمد بن داؤد [رک باں] ایک مشہور ادیب تھا۔

- مآخذ: (۱) الفہرست، ۱: ۲۱۶، بعد: (۲) تاریخ بغداد، ج ۸، عدد ۳۷۷: (۳) السمعانی، بذیل مادۃ الظاہری: (۴) ابن الجوزی: المنتظم، ۲/۵، عدد ۱۶۵: (۵) النووی: Biographical Dictionary، طبع وٹسفیلڈ، ص ۲۳۶، بعد: (۶) ابن خلکان، بذیل مادۃ: (۷) الیاقبی: مرآۃ الجنان، ۲: ۱۸۳، بعد: (۸) السبکی: طبقات الشافعیۃ، ۲: ۲۲، بعد: (۹) وٹسفیلڈ: Der Imām al. Schäfi'i، عدد ۳۶: (۱۰) ابن کثیر: البدایۃ والنہایۃ، ۱۱: ۴۷

اس کے قواعد مرتب کرنے کی کوشش کی تھی، رد کر دیا اور اپنا مسلک یہ مقرر کیا کہ قرآن حکیم اور حدیث کے صرف ظاہری یا لغوی معنی لینے چاہیے؛ اس نے اجماع کے تصور کو بھی صحابہؓ کے اتفاق رائے تک محدود کر دیا اور کسی ایک ہی امام کی تقلید کو بھی، جو دیگر مذاہب فقہ میں ان دنوں عام ہو گئی تھی، رد کر دیا۔ ان تمام امور میں اس کا مسلک امام الشافعی اور ان کے مذہب فقہ کے صرف ایک پہلو کو اتمام و اکمال کے ساتھ پیش کرتا ہے۔

داؤد کا گھرانہ اصفہان کے قریب کے ایک گاؤں سے تعلق رکھتا تھا، وہ ۲۰۰-۲۰۲/۸۱۵-۸۱۸ء میں کوفے میں پیدا ہوا۔ اس نے بصرے، بغداد اور نیشابور کے مشہور اساتذہ سے حدیث پڑھی اور اس کے بعد بغداد میں سکونت اختیار کر لی، جہاں معلم اور مفتی کی حیثیت سے اس کی بڑی قدر کی جانے لگی۔ اس کے تذکرہ نویس اس کے زہد و تقویٰ اور عجز و انکسار کی بڑی مدح کرتے ہیں، خاص فقہ میں اس کے اساتذہ کے نام معلوم نہیں۔ اس کا باپ حنفی تھا اور خود اسے امام الشافعی کا ایک "متعصب" مقلد قرار دیا گیا ہے اور یہ تعریف اس کے اپنے مسلک کی ابتدا اور اس کے بعد کے ارتقا دواؤں سے مطابقت رکھتی ہے۔ مذہب شافعی کے علما کے تذکروں میں اسے ایک معزز مقام حاصل ہے۔

دینیات میں اس کی یہ رائے بیان کی جاتی ہے کہ قرآن مجید، جو لوح محفوظ کے اندر موجود ہے، غیر مخلوق ہے باستثناء ان اقوال کے جو وقتاً فوقتاً معرض وجود میں آتی رہتی ہیں۔ کہتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل نے اسی بنا پر اس سے ملاقات کرنے سے انکار کر دیا۔

داؤد متعدد رسائل کا مصنف ہے (اس کی تصنیفات کی کم و بیش ہم عصر فہرست کتاب الفہرست میں دیکھیے)، جن میں سے بعض تو بہت ہی طویل تھے

طریقوں کو نمایاں طور پر ابھرنے کا موقع دیا۔ اس نے وفاء عامہ کی بہت سی تعمیرات کرائیں اور دربار و مصاحبین کو بڑے قزک و احتشام سے رکھا۔ حکومت ترکیہ کے بدلتے ہوئے حالات میں اس کا زوال (۱۸۳۱ء/۱۲۴۷ھ) ناگزیر تھا۔ اس کا زوال فوری طور پر اس لیے ہوا کہ اس نے حکام استانبول کی بے بہ حکم عدولی کی۔ ان کا قصہ (جو والی کی حیثیت سے اس کا جانشین ہوا)، بغداد میں ایک تباہ کن سیلاب کے آنے اور لرزہ خیز طاعون کے پھوٹ پڑنے سے اسے بے دخل کرنے اور اس کی جگہ لینے میں کامیاب ہوا۔ داؤد کے گرفتار اور اس پر ہو جانے کے باوجود اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا گیا۔ اسے یورپ اور ایشیا دونوں میں دوبارہ ترقی دے کر اہم عہدوں پر مامور کیا گیا۔ وہ سلطان کا بہت منظور نظر ہو گیا اور ۱۸۳۵ء/۱۲۵۱ھ میں مدینہ منورہ میں روضۃ المبارک کا محافظ مقرر ہوا۔ وہ غیر معمولی تشیب و فراز کی زندگی گزارنے کے بعد ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۱ء میں انتقال کر گیا۔

مآخذ: (۱) S. H. Longrigg: *Four Centuries*

of Modern Iraq، آکسفورڈ ۱۹۲۵ء، ص ۲۳۳ تا ۲۷۷

مآخذ پر اضافہ (۲۲۵) بعد عربی اور ترکی مآخذ (جزوی طور پر بشکل مخطوطہ) اور یورپی سیاحوں کے لیے مخصوص

مآخذ: (۲) C. Huart: *Histoire de Bagdad dans les*

Temps Modernes، پیرس ۱۹۰۱ء۔

(S. H. LONGRIGG)

* داؤد پاشا: کوہ لبنان کا پہلا عثمانی "متصرف"

(گورنر) (۱۸۶۱ء تا ۱۸۶۸ء)۔ وہ آرمینی کیتھولک تھا۔ مارچ ۱۸۱۶ء میں قسطنطنیہ میں پیدا ہوا۔ اس نے اپنی زندگی کے ابتدائی سال ایک فرانسیسی خاندان کے ساتھ غلطہ Galata میں گزارے۔ بعد میں اس نے ایک انگریز خاتون سے شادی کر لی، لیکن "متصرف" ہونے سے پہلے اسے چھوڑ دیا۔ اس کی عوامی زندگی کا

بیمہ (سال ۲۷۰): (۱۱) ابن العماد: *شترک الذهب*، ۲:

۱۵۸، بیمہ: (۱۲) ابن تغری بردی، قاہرہ، ۳: ۴۷، بیمہ

(سال ۲۷۰): (۱۳) *Die Zährten: Goldziher*، ۲۷۵

بیمہ اور یومانیہ کثیر (بنیادی تصنیف): (۱۴) براکلمان،

۱: ۱۹۸، بیمہ: (۱۵) وہی، مصنف: *تکلمہ*، ۱: ۳۱۲:

(۱۶) *Erquisse: Schacht*، ص ۵۶، بیمہ۔

(J. SCHACHT)

* داؤد انطاکی: رک بہ الانطاکی۔

* داؤد پاشا: (۱۸۱۱ء/۱۲۲۷ھ تا ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۱ء)

ترکی عراق کا آخری مملوک حکمران:

سلیمان پاشا (اعظم) نے بغداد میں ایک گرجستانی غلام

لڑکے کی حیثیت میں حاصل کیا۔ سلیمان پاشا کی بیٹی

سے اس کی شادی، نیز اس کے حسن و جمال، علم و فضل

اور نمائشی اتقا نے اس کے سرپرست کے تحت سرکاری

ملازمت میں مستند صیغہ راز، خزانہ دار، دفتر دار اور

انجام کار "کسبہ" کی حیثیت سے اس کی ترقی درجات

میں مدد دی۔ زمانہ سازی، تشدد اور مختلف قوطوں،

کردوں، مملوکوں، دربار، عوام اور قبائل میں مہارہ

توازن کے قیام سے پچاس سالہ داؤد نے ۱۲۳۳ھ/

۱۸۱۷ء میں منصب پاشائی کو اپنے لیے حاصل کر لیا

اور اسے اپنے پیشرو (سعید پاشا) کے قتل اور بیرون

قباضی سے یقینی بنا لیا۔ اس نے ہندوہ برمن

حکومت کی۔ اس نے ایک مضبوط قبائلی حکمت عملی

اختیار کی، اچھا خاصا نظم و ضبط قائم رکھا،

بدنام فتنہ پرور یزیدوں اور صحرائی غزہ کی

گوشمالی کی، کرد رؤسا کے لامتناہی مناقشات اور

دھمکیوں پر نظر رکھی اور ایک خطرناک ایرانی حملے

(۱۲۳۹ھ/۱۸۲۳ء) کو روکنے کی تدبیر کی۔ اس نے

استانبول کے احکام کے تحت بغداد میں بنی چری سپاہ

کو توڑ دیا اور نئی قسم کی رجمنٹیں بنائیں، انہیں

سلاح کیا، اور وقفوں وقفوں پر بہت چوکسی سے

بڑی آزادی سے تجارت اور بیوپار میں یورپ کے

داؤد پاشا کے متعلق اس کے ایک جمعہ نے لکھا ہے کہ وہ ایک قابل مندر اور منتظم، ایک اچھا ماہر لسانیات اور عالم کا دلدادہ تھا۔ اس کے علاوہ وہ برلن کی سائنس اکادمی کا بھی رکن تھا۔

مآخذ: (۱) بطرس البستانی: کتاب دائرة المعارف ج ۷، بیروت ۱۸۸۳ء، ص ۵۷۶ تا ۵۷۷؛ (۲) شیخ ساسی گرشیری: قابوس الاعلام ج ۳، استنبول ۱۳۰۸ھ، ص ۲۱۱۱؛ (۳) سجل عثمانی، ص ۸۷۳؛ (۴) Jouplain؛ (۵) La Question du Liban، پیرس ۱۹۰۸ء، ص ۳۸۳؛ (۶) Dictionnaire universel des contem-، G. Vapereau، porains، پیرس ۱۸۸۰ء، ص ۵۰۷۔

(K.S. SALAMI)

داؤد پاشا: فوجہ، درویش، متوفی ۱۲۹۰ھ/۱۸۹۸ء عثمانی صدر اعظم۔ وہ البالیہ کا باشندہ تھا۔ دیوشرمہ کے ذریعے محلاتی مدرسے میں آیا۔ ۱۲۷۶ھ/۱۸۷۳ء میں، اندلو کے یلدرے کی حیثیت سے وہ شہزادہ مصطفیٰ والی قونیہ کے تحت آق قویونلو یوسف مرزا کے خلاف لڑا۔ ۱۲۷۸ھ/۱۸۷۳ء میں اتلک بلی Otluk-beli کے مقام پر آوزون حسن [رک بان] کے خلاف لڑائی میں ہراول دستے کی کمان اس کے ہاتھ تھی۔ اس نے ۱۲۸۱ھ/۱۸۷۶ء کی مہم بغداد Boghdan میں اور البانیہ میں فوجی کارروائیوں میں، نیز اشکدرہ Ishkodra کے محاصرے (۱۲۷۸ھ/۱۸۸۳ء) میں روم ایللی کے یلدرے کی حیثیت سے خدمات سر انجام دیں۔ بایزید دوم کی تخت نشینی کے بعد وہ وزیر مقرر ہوا اور کچھ عرصے کے بعد ۱۲۸۸ھ/۱۸۸۳ء میں صدر اعظم اسحق پاشا کا جانشین ہوا اور پندرہ برس تک اس عہدے پر فائز رہا۔ اس دوران میں وہ صرف دو مہموں پر گیا: ۱۲۹۲ھ/۱۸۸۷ء میں مملوکوں کے خلاف فوجی کارروائیوں میں، اس نے ادانہ Adana اور ترسوس Tarsus پر دوبارہ قبضہ کر لیا، وارساقوں کو مطیع کیا: اور ۱۲۹۴ھ/۱۸۹۱ء کی مہم البانیہ میں Tepedelen کو سر کیا اور البانیہ کی

آغاز برلن کے عثمانی سفارت خانے سے وابستہ ہوئے سے ہوا، اس کے بعد اس نے وی انا میں عثمانی قوتیں جنرل کی حیثیت سے کام کیا۔ جب اسے پھر قسطنطنیہ میں تبدیل کر دیا گیا تو وہ وزارت داخلہ میں مختلف عہدوں پر فائز رہا۔ ۱۸۵۷ء میں وہ سرکاری مطبوعات کا نگران اور اگلے ہی سال دفتر ٹیلیگراف کا مہتمم مقرر ہوا، جہاں اس نے متعدد اصلاحات کیں۔ اسی سال اس نے وزیر خارجہ نواد پاشا کی غیر ملکی قرضے کے لیے درخواست گزاری میں مدد کی۔ آخر میں باب عالی نے دول یورپ کی رضامندی سے اسے کوہ لبنان کا متصرف مقرر کیا۔ اسے بیروت میں وزارت کے منصب پر بھیجا گیا۔ اس نے اپنا صدر مقام دیوالقمر کو بنایا، اور نئے نظم و نسق کی اس انداز سے تنظیم کی جو تمام متعلقہ گروہوں کے لیے قابل اطمینان تھا۔ دیگر امور کے علاوہ اس نے کوہ لبنان کے جندارمہ کی تنظیم کی، سڑکیں اور پل بنوائے، متعدد مدارس قائم کیے اور اس کی دانشندانہ حکومت نے جلد ہی لبنان میں امن و امان، نظم و ضبط اور خیر مسکالی کو بحال کر دیا۔ پہلے وہ تین برس کے لیے گورنر مقرر ہوا تھا، لیکن بعد میں اس کی مہم میں مزید پانچ برس کی توسیع کی گئی۔ تاہم اپنے عہدے کی دوسری مہم میں اسے کوہستانی علاقے کے بعض روایتی رہنماؤں کی سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا، جس کی بنا پر اسے ۱۸۶۸ء میں اپنی مہم سے قبل مستعفی ہونے کا مشورہ دیا گیا۔ بعد ازاں اس نے تعمیرات عامہ کے وزیر کی حیثیت سے خدمات سر انجام دیں اور اسے قرضے کی گفت و شنید کے لیے یورپ بھیجا گیا۔ لیکن بعض وجوہ کی بنا پر باب عالی اس سے ناراض ہو گیا اور اس نے یورپ ہی میں رہنے کو ترجیح دی۔ اس کا ۹ نومبر ۱۸۷۳ء، یا سجل عثمانی کی رو سے ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء میں بمقام بایارٹیس Biarritz انتقال ہوا۔

Edirne ve Pasa Livasi استانبول ۱۹۵۲ء بمبند اشاریہ
(M. TAYYİR GÖNDÜĞİN)

- * داؤد پاشا، قرا (؟ - ۱۱۰۳ / ۱۶۲۳ء) عثمانی صدر اعظم۔ اس کا سال پیدائش غیر یقینی ہے، لیکن ۱۶۱۲ء میں حاکمیت کو جو "کیفیت نامہ" پیش کیا گیا، اس میں Simone Contarini نے، جو استانبول میں وینس کا سیاسی وکیل رہ چکا تھا، ایک داؤد پاشا کا ذکر کیا ہے۔ اسے وہ کرویشیائی Crot نسل کا بتاتا ہے، نیز یہ کہ اس وقت اس کی عمر تقریباً ۴۶ برس تھی۔ لیکن عثمانی مآخذوں کے مطابق قرا داؤد پاشا بوزنیائی Bosnian نسل سے تھا۔ اس کی تعلیم و تربیت محلّی مدارس میں ہوئی تھی، فارغ التحصیل ہو کر عہدہ "چقدار" (چندر) پر فائز ہوا تھا۔ سلطان محمد سوم (۱۰۰۳ تا ۱۵۹۵/۱۱۰۱۲ء) کے عہد حکومت میں قبیچی باشی مقرر ہوا اور بعد ازاں سلطان احمد (۱۰۱۲ تا ۱۶۰۳/۱۱۰۲۹ء) کے عہد میں وہ ۱۱۰۱۳ء/۱۶۰۳ء میں روم ایلے کا پیکر یک بنا دیا گیا۔ اس کے بعد داؤد پاشا نے ایشیائے کوچک میں جلالی [رک بان] باغیوں کے خلاف، نیز ۱۱۰۲۱ء/۱۶۱۲ء میں ایران کے صفویوں کے خلاف اربوان کی مہم میں خدمات سرانجام دیں۔ اس نے سلطان مصطفیٰ اول (۱۰۲۶ تا ۱۱۰۲۷ء/۱۶۱۷ تا ۱۶۱۸ء) کے پہلے دور حکومت میں تھوڑے سے عرصے کے لیے قبودان پاشا [رک بان] کا عہدہ سنبھالا اور ۱۱۰۳۰ء/۱۶۲۱ء میں ہوسٹانیوں کے خلاف Choczim (حوتن) کی مہم میں وہ سلطان دوم (۱۰۲۷ تا ۱۱۰۳۱ء/۱۶۱۸ تا ۱۶۲۲ء) کا ہم رکاب رہا۔ داؤد پاشا کی شادی سلطان مصطفیٰ کی سگی بہن سے ہوئی۔ ماہ پیکر والدہ سلطان (یعنی مصطفیٰ اول کی والدہ) نے جب اس کا بیٹا مصطفیٰ دوسری مرتبہ سلطان بنا (۱۰۳۱ تا ۱۶۲۲ء/۱۱۰۳۲ تا ۱۶۲۳ء)، اپنے اثر و رسوخ کو کام میں لا کر داؤد پاشا کو بتاريخ ۹ رجب ۱۱۰۳۱ء/۲۰ مئی ۱۶۲۲ء صدارت عظمیٰ کے

فوجوں کو شکست دی (گو ایک مآخذ کی رو سے وہ شمال کی جانب سے ہنگری والوں کے اسکل حملے کے خلاف حفاظت کی خاطر اُسکب Üsküb ہی میں رہا)۔ اسے ۴ رجب ۱۱۰۳۰ء/۸ مارچ ۱۶۲۰ء کو صدارت عظمیٰ سے برطرف کیا گیا اور دیمیتھ میں رہنے کا حکم دیا گیا (اس کا سالانہ وظیفہ ۴ لاکھ اچہ مقرر ہوا)۔ اس کی معزولی کی وجہ یہ تھی کہ محمد دوم کے پوتے اتی قوبونلو گودہ احمدیہ کے تہریز کی طرف فرار کو داؤد پاشا کی غفلت پر محمول کیا گیا۔ ۲ سال بعد ۴ رجب الاول ۱۱۰۳۰ء/۲ اکتوبر ۱۶۲۰ء کو اس کا انتقال ہوا اور اسے استانبول میں اس کی بنائی ہوئی مسجد کی محراب کے سامنے "تربۃ" میں دفن کیا گیا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ایک قابل اور راست باز، مدبر اور علم کا سرشتی تھا۔ خارجی حکمت عملی میں وہ وینس کی حمایت کرتا تھا۔ وہ اپنے وقت کے مشہور ترین مدبروں میں سے تھا: "رسم قسمت" جو اس کی جاگیر پر "قاضی عسکر" کو واجب الادا تھی، ۲ لاکھ اچہ سے کم نہ تھی۔ اس نے ایک محلّے میں، جو اس کے نام پر ہے، ایک مسجد تعمیر کروائی تھی۔ یہ اب تک موجود ہے، اس کے ساتھ اس نے ایک عمارت، ایک چشمہ، ایک مکتب اور ایک مدرسہ بھی بنوایا تھا۔ اس کے نام کا ایک "بیکلی" اور ایک قصر بھی ہے۔ داؤد پاشا صحرایی، جس پر اب داؤد پاشا کی بارکیں کھڑی ہیں، صدیوں تک عثمانی فوج کا ایک مشہور پڑاؤ رہا۔ اس کے بیٹوں مصطفیٰ پاشا اور محمد بیگ کا ذکر مآخذ میں کیا گیا ہے۔

- مآخذ: (۱) *İA* بنبل مادہ (I.H. Uzuncarsilli); (۲) *GOR 'Hammer-Purgatall* ۲: ۳۰۹ بعد و اشاریہ: (۳) *Leunclavius: Hist.* ص ۶۴۴ بعد: (۴) *Gesch. d. Osm. Reiches: Kantermir* ص ۲۲۸: (۵) الشائق الصنایہ، حلیۃ الوزراء، حلیۃ الجوامع (بنبل مادہ ما): (۶) اس کے اوقاف کے لیے T. Gökbilgin

مرید تھے۔ اس کی پانچویں پشت میں کوئی تھل خان (فتح اللہ خان؟) تھا، جس کا لڑکا بھلا خان (بہاء اللہ خان) چنے خان کا باپ تھا۔ چنے خان کے بعد اس کے بیٹے محمد مہدی اور داؤد خان اس کی جگہ قبیلے کے سردار بنے۔ مؤخر الذکر کو قرآن مجید کا ایک نسخہ، تسبیح اور مصلیٰ، جو اس کے باپ کی ملکیت تھا، ورثے میں ملا اور خاندانی تلوار اور باپ کا عمامہ محمد مہدی کے حصے میں آیا۔ محمد مہدی کی اولاد اس کے بیٹے ابراہیم عرف کلہوڑے خان کے نام پر کلہوڑا کہلانے لگی۔

خاندانی مناقشات کا نتیجہ یہ ہوا کہ داؤد خان اولیٰ اس جگہ کو خیر باد کہنے اور دوسری جگہ منتقل ہونے پر مجبور ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ اس نے شہر وانجی، جس کے آثار اب نہیں ملتے، ایک نئی بستی بسائی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا محمود خان اور پوتا محمد خان قبیلے کے سردار ہوئے۔ جب محمد خان کے بیٹے داؤد خان ثانی کی سرداری کے زمانے میں قبیلے کی تعداد بہت بڑھ گئی تو وہ اپنے علاقے کو وسیع کرنے کی ضرورت محسوس کرنے لگا۔ اس داؤد خان ثانی کی اولاد اور متعلقین کو داؤد پوترا کہنے لگے، بلا لحاظ اس امر کے کہ آیا وہ اس کی نسل سے تھے یا اس سے محض روحانی یا دنیوی تعلق رکھتے تھے۔ اس سے اس امر کی وجہ سمجھ میں آ جاتی ہے کہ کیوں خالص سندھی اصل کے بعض خاندان جو زیادہ تر کپڑا بننے کا پیشہ اختیار کیے ہوئے ہیں اور مغربی پاکستان کے اضلاع شکارپور اور داؤد میں رہتے ہیں، ابھی تک فخر سے اپنے آپ کو داؤد پوترا کہتے ہیں۔ بعض غیر ملکی مصنفین (مثلاً A History of Sindh: R. F. Burton، لندن، ۱۸۵۰ء، ص ۱۰۷) کو، جو داؤد پوتروں کے حسب نسب سے پوری واقفیت نہیں رکھتے تھے، یہ یقین ہو گیا کہ داؤد پوترے بعیثت قبیلہ مقامی اصل کے اور پیشے کے لحاظ سے جلائے تھے۔ جو لوگ داؤد خان ثانی کے

سندھ کے حکمران تھے، تعلق رکھتے ہیں۔ داؤد پوترے اور کلہوڑے دونوں اس بات کے مدعی ہیں کہ وہ ابوالفضل العباس بن عبدالمطلب کی نسل سے ہیں۔ بہاول پور کی سابق ریاست، جو اب مغربی پاکستان میں مدغم ہو گئی ہے، کے حکمران داؤد پوتروں سے تعلق رکھتے ہیں اور اپنے ہم جد کلہوڑوں کے برعکس اپنے آپ کو عباسی کہلانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ نجابت اور عالی نسیب کے متعلق ان کا دعویٰ معتبر ماخذوں سے حاصل شدہ ناقابل تردید معلومات کے بجائے محض روایت پر مبنی معلوم ہوتا ہے، جس کو حکمرانی اور اقتدار کی طویل مدت سے تقویت حاصل ہوئی ہے۔

وہ شجرہ ہائے نسب جو بعض مقامی فارسی تاریخوں مثلاً مرآۃ دولت عباسیہ اور جواہر عباسیہ میں مندرج ہیں، ناقص ہیں اور ان کے بغور معائنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاہی احکام پر عجلت سے تالیف کیے گئے ہیں۔ تاہم آثار الامراء (۱: ۸۲۵) ایسی زیادہ قدیم اور مستند تصانیف میں بعض حوالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ داؤد پوترے اور کلہوڑے دونوں عام طور پر العباس (رک باں) کی نسل سمجھے جاتے تھے۔

کلہوڑوں اور داؤد پوتروں کا مشترک جد امجد، جس کے متعلق تاریخ کو کچھ علم ہے، محمد چنے خان خیال کیا جاتا ہے (اس کی مختلف شکلیں یہ ہیں، چینے خان، چینا خان، چنی خان، جیسٹہ عرف جینہ خان)۔ اس کے باپ قائم کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ غزنویوں کی برصغیر پاک و ہند میں آمد سے بہت پہلے ۸۲۵/۸۲۶ء کے قریب ایران سے کچھ مکران کے راستے سندھ میں ہجرت کر آیا تھا۔ لیکن یہ سنہ مشکوک بھی ہے اور غیر اغلب بھی۔ بیشتر تصانیف میں قائم کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس کے بجائے میان اڈہا نامی ایک شخص کا ذکر ملتا ہے جس کے متعلق کہتے ہیں کہ اُس نے ایک شیخ کی زندگی گزاری اور اس کے بہت

کو متعین کیا۔ ان حریف گروہوں کے درمیان بعد کے تصادمات سے اس لڑائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں کے جداگانہ حلقہ ہائے اثر و اختیار میں علحدگی اور حد بندی عمل میں آئی۔

داؤد پوترے آخری مرحلے میں کامیاب رہے، کیونکہ وہ بڑی دشواری سے فتح کیے ہوئے مقبوضات کو محفوظ اور منظم و مستحکم بنانے کے اہل تھے، جبکہ ان کے حریف کلہوڑوں کو تالپوروں نے باہر نکال دیا جو خود انگریزوں کے مطیع ہو گئے، جب مؤخر الذکر نے ۱۸۴۲ء میں پنجاب کے الحاق اور چند روزہ سکھ حکومت کے سقوط سے سات برس پہلے سندھ پر قبضہ کیا۔ مبارک خان اول ۱۱۳۶ھ/۱۷۲۳ء میں اپنے بیٹے صادق محمد خان عباسی اول کے حق میں تخت سے دست بردار ہو گیا اور تین برس بعد ۱۱۳۹ھ/۱۷۲۶ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ صادق محمد خان ایک اولوالعزم سکمران تھا، چنانچہ اس نے سب سے پہلے آج [رگ پان] کا اور اس کے بعد مغل صوبہ ملتان کے ایک حصے اور قلعہ ڈیر اور کا الحاق کیا۔ یہ قلعہ اس نے جیسلمیر کے راول اکھی (۴) سنگھ سے چھینا تھا، جس کے اجداد اس پر مدتوں قابض رہ چکے تھے۔ ۱۱۵۳ھ/۱۷۳۹ء میں جب نادر شاہ افشار نے ہندوستان پر حملہ کیا تو صادق محمد خان اول ڈیرہ غازی خان جا کر اس کی خدمت میں ہاریاب ہوا اور نواب کا خطاب حاصل کیا۔ ان مقبوضات کے علاوہ اس نے بزور شمشیر حاصل کیے تھے، اسے ہندوستان اور لاڑکانہ کے ہر گئے عطا کیے گئے۔

۱۱۵۹ھ/۱۷۴۶ء میں شکار پور پر، جو اس کا آبائی وطن تھا، اس کے حریف کلہوڑا سردار خدا یار خان نے حملہ کیا۔ صادق محمد خان کو مقابلے میں جان سے ہاتھ دھوئے پڑے اور محمد بہاول خان اول اس کا جانشین ہوا۔ اس نے اگلے ہی سال بہاول پور سمیت کئی شہروں کی بنیاد رکھی۔ اس شہر سے آخر کار یہ ریاست

خاندان یا برادری سے تعلق نہیں رکھتے تھے، الہیں برابر کے افراد تسلیم کر کے داؤد پوتروں نے خاندان یا برادری میں آزاد شدہ غلاموں (موالی) کو شامل کر لینے کے دہربنہ عرب رواج کو از سر نو زندہ کیا۔ چونکہ ان میں عربوں کے اس رواج کا عام ہونا بھی ان کے عرب لسل و نژاد سے تعلق رکھنے کے دعوے کی تائید کرتا ہے۔

داؤد خان ثانی کے جانشین آلہ سردار ہوئے، جن میں سے قط بہادر خان ثانی قابل ذکر ہے۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے ۱۱۰۲ھ/۱۶۹۱ء میں شہر شکار پور کی بنیاد رکھی تھی۔ ان تمام داؤد پوترا سرداروں کی تاریخ ہائے ولادت و وفات جو ہانی خانوادہ بہاولپور صادق محمد خان اول (۱۱۳۶ھ/۱۷۲۳ء تا ۱۱۵۹ھ/۱۷۴۶ء)، [رگ پان] کے پیش رو تھے، عملاً نا معلوم ہیں، ان میں سے کوئی بھی اتنا اہم نہ تھا کہ تاریخ میں اس کا حال قلمبند کیا جاتا۔

ایک داؤد پوترا سردار مبارک خان اول نے مقل شہزادہ سمرالدین کی، جو اورنگ زیب عالم گیر کا پوتا اور اس وقت ملتان [رگ پان] اور لاہور [رگ پان] کا صوبے دار تھا، ۱۱۱۳ھ/۱۷۰۲ء میں ڈیرہ غازی خان کے ایک طاقتور بلوچ قبیلے میرانی کی بغاوت کو کچلنے میں مدد کی۔ اس عسکری امداد کے صلے میں شکار پور، بختیار پور اور خان پور کے شہر اُسے جاگیر میں عطا ہوئے۔ اس کے بعد شکار پور کا شہر اس کے خاندان کا صدر مقام قرار پایا۔ اس کا بیشتر وقت اپنے حریف کلہوڑا سردار یار محمد خان عرف خدا یار خان کے خلاف برادر گشی کی لڑائیوں میں گزرا۔ ایک ہفتے سے زیادہ عرصے تک گھمسان کی لڑائی ہوئی جس میں فریقین کا بھاری نقصان ہوا۔ اس زمانے کے احوال سے ظاہر ہے کہ داؤد پوتروں کا شدید نقصان ہوا اور انہیں صلح کی درخواست کرنی پڑی۔ یہ محض دھڑا بندی اور ایک خاندانی چیلنج تھی جس نے واقعات کی آئندہ راہ

سرفراز کیا اور رکن الدولہ نصرت جنگ اور حافظ الملک کے خطابات عطا کیے۔ ۱۰۱۲ھ/ [بہ تصحیح ۱۷۸۶ء] تیمور شاہ درانی نے نواب کی قلمرو پر حملہ کیا اور شہر بہاول پور پر قبضہ کر لیا، اسے تاخت و تاراج کیا اور بعد میں جلا کر تباہ کر دیا۔ دیراوڑ کا قلعہ بھی سر ہو گیا اور اس میں درانی لشکر متعین کر دیا گیا۔ تیمور شاہ نواب کے بیٹے شہزادہ مبارک خان عباسی کو یرغمال کے طور پر اپنے ساتھ لے گیا اور پھر بہاول خان ثانی کو عملاً معزول کر کے مبارک خان کو حکمران بنا دیا۔ تیمور شاہ سزا دینے میں اس قدر سخت تھا کہ وہ ان توپوں کو بھی کابل لے گیا جو بہاول پور میں اس کے ہاتھ لگی تھیں۔ ۱۰۲۰ھ/ ۱۷۸۸ء تک بہاول خان ثانی درانیوں کا صفایا کرنے کی کارروائیوں میں مصروف رہا۔ اس سے پہلے وہ شہزادہ مبارک خان کو بہاول پور واپس آنے پر نظر بند کر چکا تھا۔

جب اس کے مقبوضات پر درانی حملے کا خطرہ جانا رہا تو وہ جارحانہ کارروائیوں پر اتر آیا اور نواحی علاقوں کا الحاق کرنے لگا۔ اس کی ہوس سلک گیری نے آج کے مخدوم حامد گنج بخش (جو مخدوم جہانیاں جلال الدین بخاری [رک بان] کی اولاد سے تھا) کے دل میں شبہات پیدا کر دیے۔ اس نے ہمسایہ سرداروں کی مکمل اعانت سے نواب کے خلاف ۱۰۲۱ھ/ ۱۷۹۹ء میں بغاوت کی اور اپنی گرفتاری کی کوششوں کو ناکام بنا دیا۔ اس نے یکانیر کے حکمران کو بھی ریاست پر حملے کے لیے اکسایا، شہزادہ مبارک خان کو رہا کرایا اور اس کی لوہی کا اعلان کیا۔ باغیوں اور ان کے حلیفوں سے چند سخت مقابلوں کے بعد شہزادہ عبداللہ خان (جو بعد میں نواب صادق محمد خان ثانی کے نام سے معروف ہوا) کے تحت ریاستی فوجیں امن بحال کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔ آزرده خاطر مخدوم نے، جس کا ریاست میں بڑا اثر و رسوخ تھا، کابل کے شاہ شجاع الملک کے ایما پر ۱۰۲۲ھ/ ۱۷۸۰ء میں

موسوم ہوئی۔ بہاول خان اول ہی کے عہد میں ریاست عزت کی نگاہ سے دیکھی جانے لگی اور اس کے سیاسی مرتبے میں اضافہ ہوا۔ اس نے آبپاشی کے لیے جو نہریں کھدوائیں، ان سے ریاست بہاول پور کے خشک علاقوں میں خوشحالی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ اس اثنا میں داؤد پوٹروں کی قوت بدستور بڑھتی چلی گئی۔ ۱۰۶۳ھ/ ۱۷۴۹ء میں بہاول خان اول کی وفات پر محمد مبارک خان ثانی کو داؤد پوٹروں نے متفقہ طور پر اس کا جانشین منتخب کیا۔ ۱۰۶۵ھ/ ۱۷۵۱ء میں درانی افواج کے سالار اعلیٰ جہان خان پوہلڑی نے ڈیرہ غازی خان کے پٹہ دار علی محمد خان خاکوانی کے ایما پر پہلے آج پر حملہ کیا پھر بہاول پور پر چڑھ آیا۔ خان پور کے قریب گھمسان کا رن بڑا جس میں اس نے شکست کھائی، چنانچہ بہاول پور میں مزید وسعت ہوئی، ۱۰۷۳ھ/ ۱۷۵۹ء میں جیسلمیر کے راول رائے سنگھ کو سرحدی قلعہ ڈیرلو واپس کرنا پڑا جو پہلے اسیر بہاول پور سے چھن گیا تھا۔ دو سال بعد غلام شاہ کلہوڑا نے، جو سندھ کا حکمران تھا اور ماضی میں کئی مرتبہ حکمران بہاول پور سے مدد لے چکا تھا، عین اس وقت ریاست پر حملہ بول دیا، جب احمد شاہ ابدالی [رک بہ آن] نے لشکر کشی کی۔ اس نے اس افراتری پر تکیہ کیا جو افغان بادشاہ کے حملے سے پھیلنے والی تھی۔ غلام شاہ کی رضا جوئی کے لیے اس کے بھائی عطر خان کو، جس نے اس کے خلاف ایک ناکام کوشش کے بعد بہاول پور میں پناہ لے رکھی تھی، اس کے حوالے کر دیا گیا۔

۱۰۸۶ھ/ ۱۷۷۲ء میں محمد مبارک خان ثانی کے انتقال پر اس کا بھتیجا محمد جعفر خان اس کا جانشین ہوا، جس نے ۱۲ برس کی عمر میں تخت نشینی کے وقت بہاول خان ثانی کا لقب اختیار کیا۔ ۱۰۹۱ھ/ ۱۷۷۷ء میں ملتان سکھوں نے چھین لیا۔ بہاول خان کو ۱۰۹۳ھ/ ۱۷۷۸ء میں شہنشاہ دہلی شاہ عالم ثانی نے خلعت سے

کو، ملتان فتح کرنے کی غرض سے ۲۳۰۰۰ کا لشکر فراہم کیا جسے ہر برٹ ایڈمز نے، جو ہتوں کا باقی تھا، ۱۸۴۸ء میں سر کر لیا اور اس کا الحاق ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقبوضات سے ہو گیا۔

۱۸۵۲ء میں اس کے انتقال پر سعادت یار خان، الملقب بہ صادق محمد خان ثالث اس کا جانشین ہوا۔ مؤرخ الذکر کی رسم تاجپوشی مخدوم آج نے ادا کی، جو حکمران خاندان اور ریاست کے سب سے طاقتور روحانی گروہ کے درمیان مصالحت کا خوشگوار نتیجہ تھا۔ نواب کا رویہ اپنے بھائیوں کے ساتھ بہت سخت تھا، جس کی وجہ سے سب سے بڑے بھائی شہزادہ حاجی خان نے اس کے خلاف بغاوت کر دی۔ آخر کار صادق محمد خان کو معزول کر کے قلعہ دراوڑ کے ایک الائج کے گودام میں قید کر دیا گیا۔ بعد میں اس کے لیے ایک قلیل سی رقم بطور وظیفہ مقرر کی گئی اور اسے لاہور جلا وطن کر دیا گیا جہاں وہ مدفون ہے۔ حاجی خان نے فتح خان کا لقب اختیار کیا، لیکن جلد ہی داؤد پوتروں کی تائید سے معزوم ہو گیا جو اس کے خلاف مسلسل ناکام سازشوں میں مصروف رہے۔

اس نے پانچ سال کی حکومت کے بعد ۱۸۵۸ء میں انتقال کیا۔ اس کا جانشین رحیم یار خان الملقب بہ محمد بہاول خان چہارم (۱۸۵۸ تا ۱۸۶۹ء) ہوا، جس کے عہد میں یوں تو کوئی قابل ذکر واقعہ نہ ہوا، البتہ الدرونی فتنہ انگیزی اور خلفشار جاری رہا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آٹھ زہر دے کر ہلاک کر دیا گیا۔ اس کے بعد اس کا خور و مال بیٹا صادق محمد خان چہارم تخت نشین ہوا۔ جب وہ ۱۸۷۹ء میں بالغ ہو گیا تو برطانوی ہند کی حکومت نے اسے حکمرانی کے اختیارات باضابطہ تفویض کر دیے، کیونکہ یہ ریاست الحاق پنجاب کے وقت ۱۸۴۹ء میں برطانوی اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کر چکی تھی۔ اس کی تخت نشینی کے فوراً بعد داؤد پوتروں نے بغاوت کر دی، جو بہر حال

پھر بغاوت کر دی۔ یہ کوشش بھی ناکام ہوئی اور دو برس بعد نواب نے برطانوی حکومت سے دوستانہ معاہدہ کر لیا۔ اس کے بعد ریاست میں کامل امن و امان رہا۔ لاہور، دہلی، ڈیرہ غازی خان اور ملتان وغیرہ کے لوگ جو سکھوں کی حکومت میں اور ہندوستان میں بد امنی کی وجہ سے خطرہ محسوس کرتے تھے، نقل مکانی کر کے بہاول پور چلے آئے۔

۱۸۰۵ء میں بہاول خان کی وفات پر، اس کا بیٹا عبداللہ خان اپنے بڑے بھائی شہزادہ واحد بخش پر غلبہ حاصل کر کے باپ کا جانشین ہوا اور واحد بخش ہلاک کر دیا گیا۔ جیسا کہ پہلے مذکور ہوا، عبداللہ خان نے تخت نشینی کے وقت صادق محمد خان ثالث کا لقب اختیار کیا۔ اس کے پندرہ سالہ دور حکومت کا بیشتر حصہ (اس کا انتقال ۱۸۳۵ء میں ہوا) یا تو ایران سندھ کے حملوں کو ہسپا کرنے یا خود اپنے امرا کی بغاوتوں کو فرو کرنے یا اپنے مفتوحہ علاقوں کی مدافعت میں صرف ہوا۔ اس کے عہد حکومت کے دیگر قابل ذکر واقعات میں سے ایک یہ ہے کہ ۱۸۱۸/۱۸۲۳ء میں شاہ شجاع نے خود امیر کی سپاہ کردہ فوجی امداد سے ڈیرہ غازی خان پر قبضہ کر لیا مگر دوسرے ہی سال لاہور کے حکمران رنجیت سنگھ نے اس سے یہ علاقہ چھین لیا لیکن بعد میں رنجیت سنگھ نے ڈیرہ غازی خان [دیکھیے ڈیرہ جات] اڑھائی لاکھ روپے کی سالانہ رقم کے عوض پور امیر بہاول پور کے حوالے کر دیا۔ اس کے جانشین رحیم یار خان الملقب بہ محمد بہاول خان ثالث (۱۸۲۵ تا ۱۸۵۲ء) کے عہد حکومت میں ڈیرہ غازی خان، مظفر گڑھ اور ملتان ہمیشہ کے لیے بہاول پور کے تسلط سے نکل گئے۔ کیونکہ یہ سب علاقہ ایک فرانسیسی فوجی طالع آزما جنرل والنشورا (Ventura) نے ۱۸۲۵ء میں اپنے سکھ آقا رنجیت سنگھ کے لیے فتح کر لیا۔ نواب نے انتقام لینے کے لیے الگریزوں

مختی سے کچل دی گئی اور اس کے سرغٹہ کو موت کی سزا دی گئی۔

اس حکمران کی نابالغی کے زمانے میں ریاست کا انتظام چیف پولیٹکل افسر اور ایجنٹ لفٹیننٹ گورنر پنجاب برائے امور بہاولپور کے ہاتھوں میں رہا۔ وہ بہت ہی ہردلعزیز حکمران تھا اور اسے ”صبح صادق“ کہتے تھے۔ خانوادہ بہلول پور کے اس ”شاہجہان“ نے متعدد خوبصورت محل تعمیر کرائے، جن کی تعمیر میں غیر ملکی اور مقامی معمار لگائے گئے۔ ان میں سے دو صادق گڑھ محل اور محل، قابل ذکر ہیں۔ ۱۸۹۹ء میں مبارک خان الملقب بہ محمد بہاول خان پنجم اس کا جانشین ہوا جو سولہ برس کا تھا اور بہاول پور کا پہلا شہزادہ تھا جس نے ایجنٹ کالج لاہور میں تعلیم حاصل کی۔ وہ حج کے بعد مکہ [مغلطہ] سے واپس آ رہا تھا کہ عنفوان شباب میں عدن کے مقام پر ۱۹۰۷ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔

اس کا جانشین اس کا چھوٹا بیٹا صادق محمد خان پنجم (۱۹۰۷ء تا ۱۹۵۶ء) ہوا، جو اس وقت صرف تین سال کا تھا۔ اس کی نابالغی کے زمانے میں ریاست کے امور کونسل آف رجمنسی سرانجام دیتی رہی، جس کا صدر مولوی سر رحیم بخش تھا۔ وہ انبالے کے نزدیک ٹھسکا میراجی (گراہم) کا باشندہ تھا۔ اس کے عہد انتظام اور فلاح عامہ کی فکر کی وجہ سے، جس میں پرہیز گاری اور فیاضی بھی شامل تھی، اس کی بہت قدر کی جاتی تھی۔ ۱۹۳۷ء میں بہاول پور پاکستان میں شامل ہو گیا اور اس نے خاص طور پر خاندان برباد مہاجرین کو ہمارے میں جو ان دنوں ہندوستان سے دھڑا دھڑا آ رہے تھے، نئی مملکت کی بہت مفید خدمت سرانجام دی۔ ۱۹۵۶ء میں جب وحدت کی تشکیل ہوئی تو یہ ریاست مغربی پاکستان میں مدغم ہو گئی اور اس کی جداگانہ حیثیت باقی نہ رہی۔

مآخذ: (۱) دولت رائے: مرآۃ دولت عباسی، دہلی ۱۸۵۰ء (موزہ بریطانیہ کے مخطوطے سے بلحاظ مواد مختلف ہے، Rieu، ۲: ۱۵۱ الف)؛ (۲) محمد اعظم ہاشمی: جواہر عباسیہ (مخطوطہ)؛ (۳) جان محمد خان سروغانی: تاریخ بہاول خان (مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری)؛ (۴) اعظم ہاشمی: اقبال نامۃ سعادت آیات (مخطوطہ)؛ (۵) گنگام مصنف: خلاصۃ تواریخ عباسیہ (سید نور اللہ کی ایک تصنیف کا خلاصہ جو مجھے دستیاب نہ ہو سکا)؛ (۶) شہامت علی: The History of Bahawalpur (پیر ابراہیم خان خوشکی تصویر، برطانوی ایجنٹ بہاول پور ۱۸۳۰ء تا ۱۸۵۶ء کی ایک فارسی تالیف کا مختصر انگریزی ترجمہ)؛ (۷) Gazetteer of the Bahawalpur State، لاہور ۱۹۰۸ء؛ (۸) ایچ۔ بی ایلورڈز H. B. Edwards: A year on the Punjab frontier in 1848-9، لندن ۱۸۵۱ء؛ (۹) ۳۷۷، ۳۳۴، ۳۱۹، ۳۱۳ (عہد کلہوڑا)، کراچی ۱۹۵۸ء؛ (۱۰) ۳۸۲، ۳۸۰ تا ۱۰۰، ۹۰ تا ۱۱۹ و مواضع کثیرہ: (۱۰) سید مراد شاہ: تاریخ مراد (مخطوطہ)؛ (۱۱) نذیر علی شاہ: صادق نامہ، لاہور ۱۹۵۹ء؛ (۱۲) عطا محمد شکاری: تازہ نوائے معارک، کراچی ۱۹۶۰ء؛ (۱۳) ہتورام: تاریخ ڈیرہ غمازی خان، لاہور ۱۸۷۵ء؛ (۱۴) وہی مصنف: تاریخ بلوچستان؛ (۱۵) حفیظ الرحمن: تاریخ بہاولپور؛ (۱۶) عزیز الرحمن: صبح صادق، طبع دوم، بہاولپور ۱۹۳۳ء؛ (۱۷) A Memoir on Shikarpur: F. G. Goldsmid؛ (۱۸) دستاویزات حکومت بمبئی: (۱۸) نزدیکی مقالہ بہاولپور، اور سی بو ایچسن A Collection: C. u. Aitchison of Treaties, Engagements and Sanads relating to India، ج ۹، کلکتہ ۱۸۹۲ء۔

(نومی انصاری)

داؤد خان کمرانی: شیر شاہ کے ماتحت والی بنگال سلیمان کمرانی کا چھوٹا بیٹا تھا، جو بعد میں مطلق العنان ہو گیا: ۱۵۷۳/۸۹۸ء میں افغان امرا

بھالیکہ اس کا وسطی حصہ ایک سطح مرتفع اور ایک دوسرے سے جدا پہاڑوں پر مشتمل ہے۔ شمالی حصہ نسبتاً بلند ہے۔ اس کے آریار آٹاکورا (Alencora) پہاڑوں کی ڈھلانیں ہیں، جن کی بلندی تقریباً آٹھ سو میٹر تک ہے۔ جنوب میں خاص طور سے رطوبت زیادہ ہے اور یہاں کا درجہ حرارت تقریباً یکساں رہتا ہے۔ اگرچہ یہاں دو موسم بارش کے اور دو خشکی کے ہوتے ہیں، داہومی کی آبادی جو تقریباً دو ملین (بیس لاکھ) نفوس کی ہے، بیشتر ذیل کے قبائل پر مشتمل ہے۔ فون (Fon) (مرکزی خطہ)، گون (Goun) اور Yoruba (جنوب مشرق خطہ)، اجہ (Adja) (جنوب مغرب)، بریبہ (Bariba)، سوما (Somba) اور فلاتی (Fulani) (شمالی علاقہ)۔

یہاں کا بڑا شہر کوتونو (Cotonou) ہے (سناسی ہزار باشندے)، اگرچہ پورٹونوو (Porto-Novo) ہمیشہ سے حکومت کا صدر مقام رہا ہے۔

سترہویں صدی عیسوی میں یورپ کے لوگوں سے واسطہ پڑنے پر داہومی بردہ فروشی سے بالخصوص متاثر ہوا، جو اس کی بعض سلطنتوں اور نمایاں طور پر ابومی (Ahomey) کی دولت مندی کو فروغ دینے میں مدد ہوئی۔ یہ آخرالذکر ہی وہ سلطنت ہے جس نے فرانسیسی نفوذ (۱۸۹۲ء) کے خلاف سب سے زیادہ طویل اور شدید مزاحمت کا مظاہرہ کیا۔

۱۸۹۹ء میں فرانسیسی مغربی افریقہ کے وفاق میں داخل ہو کر داہومی نے اس کی ترقی میں بڑا حصہ لیا۔ یہ خدمت اس نے اپنے منتخب افراد کے ذریعے انجام دی جو نقل وطن کر کے دوسرے مختلف علاقوں میں جا بسے تھے۔ سینیگال (Senegal) کی سمیت میں یہ یوں ان ممالک میں سے ہے جنہوں نے سب سے پہلے سیاسی تحریکوں کی تشکیل کی جن کی قوت کا اظہار دوسری عالمگیر جنگ سے خاصا پہلے ہو گیا تھا۔ اپنے ان بیشتر ہمسایہ ملکوں کی طرح جو خلیج

نے اسے بنگال کے تخت پر بٹھایا۔ انہوں نے اس کے بڑے بھائی بایزید کو معزول کر دیا تھا۔ اس نے نشہ قوت میں سرشار ہو کر مغل شہنشاہ اکبر سے سرنامی کی اور ۹۸۲ھ/۱۵۷۵ء میں غازی پور کی شاہی جوگی پر ہلے بول دیا۔ منعم خان [رگ لاڈن طبع ۲] اس کے مقابلے کے لیے بھیجا گیا، جس نے اس کے دارالحکومت ٹانڈا پر قبضہ کر کے اسے اڑیسہ میں پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ داؤد خان نے ٹکارونی [رگ بان] (منل ماڑی) کی مشہور لڑائی میں جوانی حملہ کیا، لیکن مغلوں کی کمک پہنچ جانے پر اس نے صلح کی درخواست کی اور اکبر کو خراج ادا کیا، چنانچہ اسے اڑیسہ کا صوبہ اپنے پاس رکھنے کی اجازت مل گئی۔ ۱۵۷۵/۹۸۳ء میں منعم خان کا انتقال ہو گیا اور اس کے بعد جو ابتری پھیلی تو داؤد خان نے حمایہ کر کے پھر بنگال پر قبضہ کر لیا۔ ۱۵۷۹/۹۸۶ء میں خان جہاں اور ٹوڈرمل نے مغلوں کی طرف سے دوبارہ حملہ کیا؛ داؤد خان گرفتار ہو کر قتل ہوا اور بنگال بالآخر مغلوں کے ہاتھ آ گیا۔

مآخذ: (۱) ابوالفضل غلامی: اکبر نامہ ۳، ۲۲، ۷۰، ۷۳، ۷۴، ۱۱۸، بعد ۱۷۷ تا ۱۷۸، ترجمہ از بیورج (Beveridge) ۲: ۳۰، بعد ۹۷، بعد ۱۲۰، بعد ۱۶۹، بعد ۲۸۸، بعد: (۲) وہی مصنف: آئین اکبری، ترجمہ از براکلمان، بار دوم، ص ۳۳۷، ۳۵۰، ۳۰۷، ۳۰۷، ۳۰۷۔

(J. BERTON-PAGE)

* داؤد: رگ بہ زمین داؤد، در آؤ، لاڈلن، بار م۔
* داہومی: (Dahomey): ٹوگولینڈ اور نائجریا کے مابین ایک ۱۸ میل لمبا تنگ خطہ، خلیج گنی پر واقع قدیم ترین معروف ممالک میں سے ہے۔ اس کا ساحلی علاقہ، جو نشیب میں واقع ہے، سمندری پانی کی چھوٹی چھوٹی جھیلوں سے گھرا ہوا ہے،

پہنچتی تھیں، اور کولا کے اخروٹ تو شمالی داهومی کے راستے سے نائیجریا اور ہوزہ (Housa) کے علاقوں تک پہنچ جاتے تھے۔ اس طرح بناد ہی چھوٹی چھوٹی سی مسلم نو آبادیاں موسوم بہ وانگرہ (Wangara) یا مارو (Maro) (داهومی میں) قائم ہو گئیں جو کچھ ہی عرصے کے بعد بڑھ کر اہم مرکز بن گئیں، جیسے کہ پراکو (Parakou)، جوگر (Djougou) یا کاندی (Kandi)۔

یہ غیر ملکی آبادیاں ان سرداروں کے زیر سایہ سکونت پذیر تھیں جن کے علاقوں میں سے کاروانی راستے گزرتے تھے۔ ان بستیوں سے متعدد خاندانوں کی بنیاد بڑی اور اس طرح وہ یہاں اسلام کی اشاعت کا ذریعہ بن گئیں جو مقامی باشندوں سے شادیوں کے سہل طریقے کی بدولت بتدریج فروغ حاصل کرتا گیا۔

بعد ازاں جب اہل مراکش نے سترھویں صدی عیسوی میں سونگھائی (Songhai) کی سلطنت کو فتح کر لیا تو سونگھائی مسلمانوں کا ایک گروہ جو دیندی کہلاتے تھے، دریاے نائجر (Niger) کی طرف ہٹ گیا۔ یہ لوگ غالباً موجودہ داهومی کے انتہائی شمالی حصے میں جا کر آباد ہو گئے اور انہوں نے اسلامی اثر و نفوذ کی دوسری لہر کی تشکیل کی۔ تیسری لہر تقریباً اس وقت چلی جب فلان چرواہے ملک میں داخل ہوئے اور انھارہویں صدی کے دوران میں داهومی کے تمام شمالی نصف حصے میں پھیل گئے۔ اگرچہ ان کے مذہب میں ابھی تک ارواح پرستی کے اثرات کا رنگ موجود تھا، تاہم انہوں نے اسلامی مرکز قائم کر لیا جس نے بہت سے سابق غلاموں کو جو گندو (Gando) کہلاتے تھے اور جن سے ان لوگوں کے مستقل تعلقات تھے، اپنا پیرو بنا لیا۔

آخر کار انھارہویں صدی عیسوی کے آخری برسوں میں اسلام نے جنوب مشرق کے لوگوں کو بھی متاثر کیا اور داهومی کے موجودہ دارالسلطنت پورٹو نوو

گنی پر واقع ہیں اور بینن (Benin) تمدن کی خصوصیات سے متاثر ہوئے ہیں، داهومی نے بھی ارواح پرستی (animism) کے راسخ عقیدے کو برقرار رکھا ہے جس پر اس کی تہذیب کی بقا کا دارومدار ہے۔

اس ملک کی معاشرتی و مذہبی تنظیم، جہاں ارواح پرستی سرکاری مذہب تھا، کسی بیرونی عقیدے کے درآئے میں حائل رہی، اور صرف ابومی (Abomey) سلطنت کے سقوط کے بعد عیسائیت کی اشاعت کا آغاز ہو سکا۔

اسلام کی اس ملک میں اشاعت آہستہ آہستہ ہوئی اور لوگ شروع میں زیادہ تعداد میں اس میں شامل نہ ہوئے کیونکہ یہاں کے سردار اور کمتر درجے کے مقامی حکمران انیسویں صدی عیسوی کے اختتام سے پہلے کبھی اپنے عقائد کو ترک کرنے پر تیار نہیں ہوئے، نہ تو شمال مغربی داهومی کے قدیم قبائلی معاشروں، موسوم بہ سومبا (Somba) میں، اور نہ شمال مشرقی علاقے کے جاگیردارانہ نظام رکھنے والے بریبا (Bariba) معاشروں میں، باوجودیکہ وہ کاروانی راستے، جہاں اسلامی کاروان سرائیں اب تک موجود ہیں، اسی ملک سے گزرتے تھے، اور نہ جنوب کی سلطنتوں ہی میں جو مطاقی العنان بادشاہتیں تھیں، جن میں بادشاہ ان موروثی روایات کا مختار کل مخزن تھا، جنہیں وہ اپنے آباؤ اجداد کے اعزاز میں ہر سال نازہ کرتا رہتا تھا۔

مسلمانوں کے نفوذ کا آغاز غالباً شمال مشرق سے ہوا۔ تیرھویں صدی میں مالی (Mali) سلطنت کی ایک چھوٹی سی تجارتی نو آبادی اس علاقے میں قائم کی گئی، جیسے آج کر سوکوٹو (Sokoto) کہتے ہیں۔ اس زمانے کے سیاح اسے گوان گرا (Guangara) کہتے تھے۔ وہیں سے کاروانوں کے سلسلے کولا (kola) کے درختوں کی سرزمین غانہ [= گھانا] کے لیے روانہ ہوتے تھے۔ نمک، غلام، اور بعض مصنوعات شمالی علاقے سے، یہاں تک کہ لیبیا (Lybia) سے جنوب مغرب تک

لوگوں میں سے منتخب کیے جایا کریں گے نہ کہ باعتبار وراثت ان خاندانوں میں سے، جن کا تعلق ارواح پرست سرداروں سے ہے۔ اس سے امریات کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ کروں شمالی داهومی میں بالخصوص قرآنی مدارس قائم ہوئے ہیں، جہاں مذہبی علم و فضل کی ہمیشہ قدر و منزلت رہی ہے۔

مآخذ : (۱) Le Dahu : Aguessy و Akindelo

'omey' برس ۱۹۵۵ء : (۲) وہی مصنفین : Contribution à l'étude de l'histoire de l'ancien royaume de

'Porto-Novo' در 'Mémoires IFAN' ج ۲۵ : (۳) Les établissements français du golfe : d. Albecc

'du Benin' برس ۱۸۸۹ء : (۴) S. Berhain : Le com-

'ptoir français de Juda au XVIII^e siècle' در

'Mémoires IFAN' ج ۳ : (۵) G. Brasseur و

'Porto Novo et sa paluterie : Brasseur Marion

در 'Mémoires IFAN' ج ۳۰ : (۶) Giethlen و Brunet

'Dahomey et dépendances' برس ۱۹۰۰ء : (۷)

'A mission to Gelele, King of Dahomey : A. Burton

لنڈن ۱۸۶۵ء : (۸) Du Dahomey au Benin : Desanti

'Nigre' برس ۱۹۳۵ء : (۹) Ed. Duglas : Contribution à

'l'Histoire du Moyen-Dahomey' ج ۲ جلدیں (۱۰)

'Dahoméennes' ج ۱۹ : (۱۱) ۲۰ : (۱۲) پورٹونوو : (۱۰)

'Le Dahomey : Ed. Foa' برس ۱۸۹۵ء : (۱۱)

'Réactions dahoméennes : R. Grivot' برس ۱۹۳۵ء

'Le pacte de sang au Dahomey : P. Hazoume' (۱۲)

برس ۱۹۳۷ء : (۱۳) وہی مصنف : Doguicimi' برس

۱۹۳۸ء : (۱۴) M.J. Herskovits : Dahomé - an Anci-

'ent West African Kingdom' : (۱۵) ۱۹۳۸ء

'Mission Scientifique au Dahomey : M. Hubert

L'ancien : H. J. Herisse' (۱۶) ۱۹۱۸ء

'royaume du Dahomey' برس ۱۹۱۱ء : (۱۷)

Cotonou, ville africaine, (Études : J. Lombard

(Porto-Novo) میں کچھ مسلم یورویہ (Yoruba) تاجر آباد ہو گئے جو ایلوکن (Ilokin) اور موجودہ نائیجریا کے مغرب سے آئے تھے۔ ان کی تعداد بسرعت بڑھتی گئی۔ انہوں نے داهومی کے بعض یورویہ خاندان کو مشرف بہ اسلام کر لیا، اور بعض ان غلاموں کے اخلاف کو بھی، جو برازیل سے واپس آ گئے تھے اور جن کے نام پرتگالی تھے۔

اگرچہ صحیح اعداد و شمار مرتب کرنا دشوار ہے، تاہم یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ داهومی کے کل اٹھارہ لاکھ باشندوں کی آبادی میں سے دو لاکھ تیس ہزار اور دو لاکھ چالیس ہزار کے درمیان مسلمان ہیں جن میں سے عملی طور پر صرف ایک لاکھ دیندار ہیں۔

ان لوگوں میں سے بیشتر تہجانی ہیں، نسبتاً معمر آدمیوں میں سے بالخصوص بعض سلسلہ قادریہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ شمال میں کچھ لوگ ہمائی ہیں، مذہب میں اس قریبی یگانگت کے باوجود عقیدے کے ذرا سے فرق نے بعض ان مسلمانوں کو جو یورویہ اصل کے تھے، شمالی علاقوں کے باشندوں (ہوزہ، زوسا، فلانی، دندی) کا مخالف بنا دیا جو اپنے مذہب پر زیادہ راسخ عقیدے کے ساتھ کاربند ہونے کے مدعی تھے۔ مسلم داهومی کے یہ دو پہلو زیادہ تر پورٹونوو (مسلم یورویہ)، [جنوبی نائیجریا کے مغربی صوبے کا علاقہ] اور پراکو (مسلم شمالی حصے) میں پائے جاتے ہیں اور یہی دو مقام جلد ہی اسلام کے دو بڑے مرکز بن گئے، کیونکہ جوگو (Djougou) کی جگہ رفتہ رفتہ پراکو (Parakou) نے لے لی، جہاں کچھ تبلیغی تحریکیں پہلے ہی شروع ہو چکی تھیں، اور جہاں قرآن کے ایسے عالم اساتذہ جاگزین رہ چکے تھے جو اپنے دین کا جدید اور زیادہ حرکی تصور رکھتے تھے۔

اس کا قوی امکان ہے کہ آئندہ برسوں میں مذہبی پیشوا اور امام زیادہ تر تعلیم یافتہ اور سرپرآوردہ

صدی عیسوی میں یہ لقب اس فوج کے چالیس صفوں کے سرداروں کو حاصل تھا۔ ۱۵۹۱ء میں ان دایوں نے اپنے افراد میں سے ایک شخص کو فوج کا سپہ سالار منتخب کیا۔ یہ صدر ”دابی“ کم سے کم ۱۵۹۳ء سے ولایت تونس میں نیابت سلطانی کے تمام اختیارات کا مالک ہو گیا۔ اس کی اجازت سے بلربکی پاشا (یعنی اصل والی) اپنے عہدے پر قائم رہا، مگر اس کے اختیارات برائے نام رہ گئے (*Histoire de la Barbarie*: Pierre Dan)۔ ۱۶۲۳ء میں *et de ses Corsaires*، پیرس ۱۶۲۳ء تا ۱۶۲۵ء)۔ جب ۱۶۲۰ء میں حمودہ بن مراد برسر اقتدار آیا تو اس نے دابی کے لقب کو بدستور رہنے دیا، لیکن جس کو یہ لقب عطا ہوا وہ علاقے کی حکومت کا صدر نہ رہا تھا، گو اس کے بلند ترین افسروں میں سے اس کا شمار ہوتا ہو۔

۱۶۰۵ء میں دابی کا لفظ ان القاب میں نہیں ملتا جو حسینی سلاطین عطا کیا کرتے تھے، تاہم تونس کے سرکاری حکام میں نویں درجے کا لقب مانا جاتا تھا، جیسا کہ محمد یحییٰ الخامس التونسی نے کہا ہے *صفوة الاعتبار*، قاہرہ ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۵ء: ۲ تا ۳)۔ یہ اٹھارہویں صدی کی متعدد سفارتی دستاویزات میں بھی پایا جاتا ہے، خصوصاً ان معاہدوں میں، جو تونس کے نائب سلطان اور فرانس کے درمیان ۱۶ دسمبر ۱۶۰۵ء، ۹ نومبر ۱۶۰۲ء اور ۱۶ Ventose سال ۱۰ کو تحریر ہوئے۔ اس وقت یہ لقب محکمہ قضا کے ایک اعلیٰ عدالتی حاکم کے معنی میں آتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لقب انیسویں صدی کے وسط تک جاری رہا۔ الجزائر میں ۱۶۰۱ء کے بعد جب ”بربروسہ برادران“ (جنہیں اہل فرنگ بحری فزاق کہتے ہیں) نے آغاؤں کے اختیارات پر قبضہ جما لیا (دیکھیے مقالہ الجزائر، ۳: ۸۷، بعد) تو دابی کا لقب سلطانی ولایت کے صدر حاکم کو حاصل تھا۔ سترہویں صدی کے شروع تک بھی جب Pierre Dan الجزائر میں تھا، تو صورت حال اس

Dahoméennes (ج ۱۰): ۱۸) La: B. Maupoil
géomancie à l'ancienne Côte des Esclaves
 ۱۹۳۳ء: ۱۹) P. Mercier *Carte ethno-démogra-*
phique de l'Afrique Occidentale ج ۵: IFAN ڈاکر
 ۲۰) M. Quenum *Au pays des Fons*: Dakar
 پیرس ۱۹۳۸ء: ۲۱) Skeretchly *Dahomé as it is*:
 لندن ۱۸۸۳ء: ۲۲) Cl. Tardits *Porto-Novo*:
 ۱۹۵۸ء: ۲۳) P. Verger *Dieux d'Afrique*: پیرس:
 (۲۴) وہی مصنف: *Notes sur le culte des Oricha et*
 ۲۵) R. Cornevin *Mémoires IFAN* ج ۵: *Vodoun*
 ۱۹۶۰ء: *Histoire des peuples de l'Afrique* پیرس:
 ۱۹۶۰ء: *noire*، بعد اشاریہ۔

(J. LOMBARD)

دابی: (Dayi) ایک ترکی لفظ بمعنی ماسوں: ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سرکاری عہدوں کے ظاہر کرنے کے لیے اس کا استعمال صرف الجزائر اور تونس کے سلطانی نائبوں کے لیے ہوا۔ غالباً شروع میں یہ ایک قسم کا اعزازی لقب تھا (اسے لفظ ”الپ“ کے مماثل کہہ سکتے ہیں، جو قدیم ترک استعمال کرتے تھے) اور اس کا حاصل کرنا ضرور ایک مشکل کام رہا ہوگا، کیونکہ اس لقب کے پانے والے کو خطہ بحیرہ روم میں خشکی اور تری میں اپنی شجاعت و قوت کا ثبوت دینا پڑتا تھا (Pakalın، ۱: ۳۰۷-۳۰۸)؛ مگر ان معنی میں اس لفظ کا رواج اس اساطیری کہانی سے تضاد رکھتا ہے جس میں مان لیا گیا ہے کہ بربروسہ بھائیوں کے والد نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی کہ خیر الدین (رک بان) کی اطاعت کریں کیونکہ ”وہ تمہارا دابی“ ہوگا (*Alger au XVIIIe siècle: Venture de Paradis*، در ۱۸۹۶ء، ص ۲۵۷)۔

اس اعزازی لقب کا ایک اور استعمال پنی چری رضا کار فوج کے زیریں درجے کو ظاہر کرنے کے لیے کیا جاتا تھا! تونس میں دسویں صدی ہجری / سولہویں

وقت بہ نہ تھی۔
 پہلے پہل زبروسہ برادران کے طائفے - دابی
 کا انتخاب کیا؟ ۱۶۸۹ء کے بعد فوجی سردار یہ۔ دابی
 کا انتخاب کرنے لگے - ۱۶۹۰ء اور ۱۸۳۰ء کے
 درمیان تیس دابی یکے بعد دیگرے صاحب اقتدار ہوئے۔
 ضابطے کی رو سے تو ان کے اختیارات رضا کار فوج کے
 ”دیوان“ کے زیر نگرانی محدود تھے، مگر واقع میں اگر
 کوئی دابی طاقتور شخصیت والا ہوتا تو وہ اقتدار مطلق
 کا مالک ہو جاتا تھا۔
 دابی الجزائر میں سکونت رکھتا تھا، ابتداءً قصر
 جینہ میں، جو اسی جگہ تھا جہاں اب اسقف اعظم
 (archbishop) کا محل واقع ہے۔ ۱۸۱۶ء کے بعد وہ
 اس قلعے میں رہنے لگا جو ”قصہ“ کہلاتا ہے اور مسلم
 شہر پر سایہ فگن ہے۔ حکمران دابی کی نجی زندگی
 قاعدے کی سختی کے ساتھ بابت نہ تھی؛ وہ اپنے گھر کے
 لوگوں سے الگ رہتا تھا، لیکن جمعرات کے دن کا
 پچھلا حصہ اور جمعرات اور جمعے کی درمیانی شب ذاتی
 مکان میں گزار سکتا تھا۔ اس کے محل میں عورتوں کا
 داخلہ ممنوع تھا اور کوئی عورت صرف سرکاری ہی طور
 پر باریاب ہو سکتی تھی۔ وہ اشیائے خور و نوش اور اس
 تنخواہ کا حقدار تھا جو سب سے زیادہ کسی پنی چری
 کو مل سکتی تھی البتہ اسے کثیر تعداد میں تحائف
 ملتے رہتے تھے، اور اس سے بعض دابیوں نے خاصی دولت
 جمع کر لی تھی۔ ان میں سے جو وہ دابی غیر طبعی
 موت مارے گئے۔
 مآخذ: دابی کے فرائض سے خصوصی تعلق رکھنے
 والے مقالات و کتب کا فقدان ہے؛ بعض سفری معلومات
 ان مآخذ یا مطالعات سے دستیاب ہو سکتی ہیں جن کا تعلق
 الجزائر اور تیونس کی ترقی و لابتوں سے ہے۔
 (R. LE TOURNEAU)
 * الدب: رک بہ علم نجوم۔
 * الدبدبہ: شمال مشرقی عرب میں ایک وسیع

کنکر : ان، جو مشرقی جانب میں قریب قریب
 سارا : نشیب سے گھرا ہوا ہے (یہ نشیب
 سعودی : اور کویت کے درمیان غیر جانبدار علاقے
 کی : رحد ہے)۔ اس کے غربی جانب الباطن
 کی رادی ہے اور جنوب میں الوریعہ کی کنکریلی
 پہاڑی ہے۔ یہ میدان شمال کی جانب علاقہ سعودی
 عرب سے شروع ہو کر شیخ کویت کی ریاست کے
 اندر تقریباً ۲۰ کلومیٹر کے فاصلے تک پھیلتا چلا گیا ہے۔
 اس کا رقبہ تقریباً ۲۰۰۰ مربع کلومیٹر ہے اور
 اپنی مضبوط اور تقریباً ہموار اور سیاٹ سطح کے
 اعتبار سے قابل ذکر ہے، جس میں کہیں کہیں
 جوسے کے کنکر، سنگ مردہ اور آتشیں پتھر ملتے
 ہیں؛ جنہیں طبقات الارض کے جدید ترین دور
 میں وادی الرمة الباطن سے نکلنے والی نہروں نے
 وسطی اور مغربی عرب سے لاکر یہاں ڈال دیا ہے۔
 خود الدبدبہ کا پانی باہر نہیں جاتا بلکہ اٹھلے گڑھوں
 میں، جن کی تہہ میں گادجسی ہوئی ہے، جمع ہو جاتا
 ہے (یہ گڑھ ”خباری“ کہلاتے ہیں، جس کا مفرد
 ”خبراء“ ہے)۔ الدبدبہ قدیم ”دیرہ“ مطبر کا ایک
 حصہ ہے اور آج کل موسم سرما میں متعدد شمال
 مشرق قبائل کی پسندیدہ چراگاہ ہو گیا ہے۔ یہ میدان
 کبھی ہرن کے شکار کے لیے مشہور تھا۔ بعض بدوی
 ”دبدبہ“ (جمع ”دبادب“) کے لفظ کا ہر چہٹی اور پختہ سطح
 والے علاقے پر اطلاق کرتے ہیں۔ اس لفظ کا تعلق
 قدیم ادبی لفظ ”دبدبہ“ سے ہے جو سخت زمین پر
 گھوڑوں کے ٹاپ کی تقارے کی سی آواز کے لیے آتا تھا۔
 نقشے: (امریکی شعبہ مساحت ارضیات U. S.)
 Geological Survey اور عرب امریکی آئل کمپنی
 نے وزارت مال و معاشیات قومی، مملکت سعودی عرب
 اور امریکہ کے محکمہ خارجہ کے مشترکہ انتظام
 کے تحت نقشوں کا ایک سلسلہ تیار کیا ہے:
 پیمانہ ۱:۵۰۰،۰۰۰ (جغرافیائی)؛ وادی الباطن،

نقشہ I-203 B (۱۹۵۹ء) شمالی طوبق، نقشہ B 207 - Y
(۱۹۵۷ء)۔

(J. MANDAVILLE)

* دبدو : (جدید املا دبدو Dehdou : عام تلفظ دبدو Dabdu) نسل اعتبار سے دبدوبی dabdubi جمع : دبادبہ) ، مشرقی سرائش کا ایک چھوٹا سا قصبہ ، جو گیارہ سو میٹر کی بلندی پر ، واد دبدو کی ”وادی کے دائیں کنارے کے دامن میں“ واقع ہے۔ یہ دریا اس وادی سے اسی میٹر کی بلندی پر ایک عمودی چٹان میں سے نکلتا ہے۔ اس کے قریب ہی ایک سطح مرتفع پر ایک قلعہ (قصبہ، قصبہ) ہے ، جس کی حفاظت کے لیے پہاڑ کے رخ ایک کھائی موجود ہے۔ وادی کے بائیں جانب مصلّا نامی ایک نواحی گاؤں واقع ہے۔ یہ شہر وجده Oujda کے عمالہ (یعنی علاقہ مذکور میں فرانسیسی زیر حمایت حکومت کے نظم و نسق) کے ماتحت ہے اور قبیلہ اہل دبدو (جن کی تعداد ۱۹۳۶ء میں ۶۵۹۹ تھی) کا مرکز؛ لیکن اس کی اصل آبادی مشرب بربروں، عربوں اور ان یہودیوں پر مشتمل ہے جنہیں تعداد میں روز بروز کم ہونے کے باوجود ابھی تک اکثریت حاصل ہے (۱۹۳۶ء میں ۱۷۵۱ نفوس پر مشتمل آبادی میں ان کی تعداد ۹۱۷ تھی)۔ شہر کے وسطی محلے (ملاح Mallah) میں جو یہودی رہتے ہیں، ان میں سے بعض بربری الاصل ہیں اور بعض ان اندلسی یہودیوں کی نسل ہیں جو اندلس پر عیسائیوں کے دوبارہ قبضے کے زمانے میں وہاں سے نقل مکانی کر کے چلے آئے تھے۔ فرانسیسی زیر حمایت ریاست کے قیام کے بعد ، ی تاجروں اور صنعت کاروں کا (جن میں زراندہ پشہ لوگوں کا شمار نہیں ہے) طبقہ کم ہو گیا ہے ، کیونکہ ان کے افراد بڑی تعداد میں مشرقی سرائش کے نوزائیدہ سرائش (خاص طور پر مسور Missouri) کی طرف چلے گئے ، تاہم انہوں نے اپنے آبائی شہر سے بڑے مستحکم روابط قائم رکھے ہیں ۔

تازہ Taza کو جانے والے راستے میں واقع ہونے اور سمرن Saharan قبائل کے قبضے میں آ جانے سے دبدو (جہاں ہر جمعرات کو بازار لگتا ہے) ہمیشہ سے خاصا اہم تجارتی مرکز رہا ہے۔ اس کے نواحی اضلاع کی زرخیزی (انگور ، نرندار درختوں ، کدو ، جو وغیرہ) نے اسے زرعی مرکز بھی بنا دیا ہے۔ دبدو یقیناً بہت قدیم زمانے میں بسایا گیا ہوگا۔ سائویں صدی ہجری / تیرہویں صدی عیسوی سے سرائش کی تاریخ میں اس کی اہمیت برابر برقرار رہی ہے ، جس کا سبب یہ ہے کہ فاس اور تلمسان کے درمیان ہونے کے باعث فوجی اعتبار سے اس کا محل وقوع بڑا اہم ہے اور اسی لیے یہ مختلف خاندانوں میں ایک مستقل وجہ نزاع بھی بنا رہا ہے۔ عبدالحق (۵۹۲ تا ۸۶۱/۱۱۹۶ تا ۱۲۱۸ء) کے ہاتھوں مرینی قبائل کے درمیان بٹوارے کے وقت یہ علاقہ بربر قبیلہ بنو ارتجن کے حصے میں آیا ، جنہیں تلمسان کے بنو عبدالواد [رک بان] کی ریشہ دوانیوں کے خلاف فاس کے دفاع کا فرض سپرد ہوا تو انہوں نے اسے اپنی جاگیر کا صدر مقام بنا لیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۸۷۶/۱۳۶۸ - ۱۳۶۵ء میں اسے شاہ تلمسان نے تاخت و تاراج کیا۔ پھر حال ۸۸۳/۱۴۸۰ء کے قریب بنو ارتجن کا ایک سردار دبدو میں ایک چھوٹی سی ریاست قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہاں کے حکمران بنو وٹاسہ سے بالکل آزاد و خود مختار رہے ، بلکہ انہوں نے ۹۰۹/۱۴۹۹ء میں تازہ پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بھی تیار کر لیا۔ دبدو کی یہ چھوٹی سی ریاست بنو سعد کے دوسرے فرمانروا الغالب یافقہ کے دور حکومت میں کہیں جا کر نیست و نابود ہوئی ، جس نے ۹۷۰ء/۱۵۶۳ء میں اپنا علاقہ پاشا کے حلقہ اختیار میں دے دیا۔ اس امر سے اس شہر کی تاریخ ، جو کچھ مبہم سی ہے ، عربوں اور بربروں کے مابین مقامی جھگڑوں تک محدود ہو کر رہ گئی۔ بائیں ہندوستانی

صدی عیسوی میں دندو میں ایک خود مختار انتظامیہ قائم تھی۔ مسلمان آبادی عامل تازہ کے زیر فرمان تھی، جو ہر سال ٹیکس وصول کرنے کے لیے اپنا نائب یہاں بھیجتا تھا۔ اس کے برعکس یہاں کے یہودی اپنے واجبات فاس الجدید کے پاشا کو ارسال کرتے تھے۔ انیسویں صدی کے خاتمے پر مولای عبدالعزیز کے برس اقتدار (۱۸۹۴ء) آنے کے بعد اور مدعی حکومت یوحنا [رگ بان] کی بغاوت کے دوران میں یوحنا نامی ایک بربر نے خود مختار ہونے کی کوشش کی، لیکن ۱۹۰۳ء میں دودو بن حیلہ نامی ایک یہودی کے اکسائے پر اس قصبے اور ضلع نے یوحنا کی حمایت کی۔ یہودی مذکور نے جو دندو کا قائد مقرر کیا گیا تھا، اپنے دشمنوں، یعنی الدلی اصل یہودیوں سے انتقام لینے کے لیے اپنے منصب سے فائدہ اٹھایا۔ فرانسیسی قبضہ ہونے پر یہاں کا امن و امان برقرار ہو گیا۔ اس قبضے کا فیصلہ ایک فرانسیسی کے قتل کے سلسلے میں ۱۹۱۱ء میں ہوا تھا۔

گزشتہ صدیوں کے دوران عرب اثر اور عربی زبان یہاں اس حد تک چھا گئی کہ بربر زبان اب نواحی پہاڑوں کے سوا کہیں بھی نہیں بولی جاتی۔ یہودیوں کی بولی میں بعض دلچسپ خصوصیات نظر آتی ہیں (دیکھیے *Nemrod et Abraham, dans le* : Ch. Pellat *، parler arabe des Juifs de Debdou*، ۱۹۵۲ء، ص ۱ تا ۲۵)۔

ماآخذ : (۱) ابن خلدون : *العبر*، مترجمہ *de Slane*، بعد اشاریہ : (۲) یحییٰ بن خلدون : *بغیة الرواد*، طبع و ترجمہ از *A. Bel* الجزائر ۱۹۰۳ء تا ۱۹۱۳ء بعد اشاریہ : (۳) *Leo Africanus* ترجمہ *Épaulard* : ۱ : ۲۹۹ تا ۳۰۲ : (۴) *Ch. de Foucauld* : *Reconnaissance au Maroc* : ۲۳۸ بعد : (۵) *L'Afrique* : Marmol : ۲ : ۲۹۶ : (۶) *Le Maroc dans les Premières* : L. Massignon

(ادارہ)

دبر و نوق : رک بہ رغوسہ۔

دبستان مذاہب : فارسی کی ایک کتاب کا

نام، جس میں مختلف مذہبوں کا بیان ہے اور خانہ پر گیارہویں صدی ہجری / سترہویں صدی عیسوی میں ہندوستان کی مذہبی حالت بیان کی گئی ہے۔ بیانِ الادیان (چھٹی صدی ہجری / بارہویں صدی عیسوی) کے بعد مذہبوں کے متعلق فارسی میں جو کتابیں لکھی گئیں ان میں یہ سب سے زیادہ مکمل ہے۔ بیانِ الادیان میں واقعات تو صحیح ہیں لیکن مختصر بہت ہیں۔ تبصرۃ العوام : دبستان مذاہب سے پہلے کی ہے (ساتویں صدی ہجری / تیرہویں صدی عیسوی) اور شیعہ نقطہ نظر سے لکھی گئی ہے۔ دبستان مذاہب نے ماخذ جزئی طور پر مختلف مذاہب کے معتقدات کی مقدم کتابیں

۶ (۱۸۳۵ء) : ۶-۸ تا ۳۱ : (۳) Cat. Persia: Rieu
 ۱۰۸۱ : ۳۹۱۳۱ : (۱) Mss. of the British Museum
 (مخطوطات کی دیگر فہرستوں کے علاوہ علاحدہ ابواب کے
 قدیم تراجم کے مفید حوالجات دیے گئے ہیں) : (۵) Etbe
 'Cat. of the Persian Mss. of the India Office Library
 جلد ۱، عدد ۱۳۶۹ (مخطوطات کی دیگر فہرستوں کے مفید
 حوالے) : (۶) (۱۹۱۱ء، مصر، ۱ : ۱۳۹)۔

(H. MASSE و J. HOROVITZ)

دیور : مرزا سلامت علی، لکھنوی، ایک اردو
 شاعر، جنہوں نے اپنی ساری زندگی شہدائے کربلا کی
 شہادت پر انتہائی عقیدت مندانہ مرثیہ گوئی اور
 شہداء کے لیے وقف کر دی تھی۔ وہ مرزا غلام
 حسین کے بیٹے تھے، جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ
 ملاہاشم شیرازی (برادر مشہور اہلی شیرازی، م ۱۸۳۴ء/
 ۱۵۲۷-۱۵۲۸ء) کے پوتے تھے۔ سلامت علی محلہ
 اہلی ماران، دہلی میں ۱ جمادی الاول ۱۲۱۸ء/۲۹ اگست
 ۱۸۰۳ء کو پیدا ہوئے اور بچپن ہی میں باپ کے ساتھ
 لکھنؤ چلے آئے اور وہیں انہوں نے تعلیم حاصل کی۔
 شہر کے مشہور علما سے انہوں نے دینی و غیر دینی
 علوم (منقول و معقول) کی تمام متداولہ فارسی و عربی
 کتب بصاف پڑھیں : اٹھارہ برس کی عمر میں وہ فارغ
 التحصیل ہو چکے تھے۔ شعر کہنے کا آغاز انہوں نے
 ابتدائی عمر (تقریباً ۱۲۳۰ یا ۱۲۳۲ء) میں کر دیا تھا
 اور تحصیل علم کے ساتھ ساتھ میر مظفر حسین ضمیر کی
 نگرانی میں اسے جاری رکھا۔ انہیں بہت جلد شہرت
 حاصل ہو گئی اور نوابان اودھ، ان کے خاندان کے افراد
 اور دربار کے امرا دیور کو عزت و تحسین کی نظر سے
 دیکھنے لگے۔ کم و بیش ساٹھ برس انہوں نے مرثیہ گوئی
 کی۔ آخری دنوں میں وہ بصارت سے قریب قریب
 محروم ہو چکے تھے۔ اس زمانے میں واجد علی شاہ
 کلکتے میں اپنی جلا وطنی کے ایام بسر کر رہے تھے،
 چنانچہ ان کے ایما پر مرزا علاج کے لیے غالباً ذوالحجہ

ہیں، لیکن بعض معلومات کی بنیاد وہ باتیں ہیں جو
 مصنف کو زبانی بتائی گئیں اور بعض خود مصنف کے
 اپنے مشاہدات کا نتیجہ ہیں۔ بہت سے ابواب میں
 مصنف نے ان عربی کتابوں سے بھی استفادہ کیا ہے جو
 اس موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ کتاب میں سب سے پہلے
 پارسیوں کے مذہب کا پوری طرح جائزہ لیا گیا ہے۔
 اس کے بعد ہندو مذہب کا بیان ہے۔ پھر تبتیوں، یہودیوں
 اور عیسائیوں کے متعلق چھوٹے چھوٹے ابواب کے بعد
 مصنف اسلام اور اس کے فرقوں سے بحث کرتا ہے۔
 سب سے آخر میں کچھ ابواب فلسفیوں (مثنائین اور
 نو افلاطونیوں) اور صوفیہ سے متعلق ہیں۔ ایک مدت
 تک غلطی سے یہ سمجھا جاتا رہا کہ دبستان مذاہب

کا مصنف محسن قاضی ہے، بعض مخطوطات میں اس کا
 صرف ایک رباعی کا مصنف بتایا گیا ہے، جس کا حوالہ
 دیا گیا ہے (دیکھیے ترجمہ از Shea-Troyer، ۱ : ۳) :
 دبستان کا مصنف یقیناً پارسی مذہب کا روشن خیال یہ ہے
 تھا اور ہمیں غالباً ان مخطوطات کو معتبر ماننا پڑے گا
 جو سراج الدین محمد آرزو (اس کے تذکرے کی ایک عبارت)
 کے خیال سے متفق ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کا مؤلف
 موبد شاہ یا ملا موبد ہے (نیز قتب Notices: Ouseley،
 ص ۱۸۲)۔ اتنی بات تو خود کتاب ہی سے ظاہر ہے کہ
 اس کا مصنف ۱۰۲۸ھ/۱۶۱۹ء سے کچھ پہلے ہندوستان
 میں پیدا ہوا اور جوانی ہی میں آگرے جا پہنچا : کچھ
 سال کشمیر اور لاہور میں گزارے : ایران (مشرق)
 بھی گیا اور مغربی اور جنوبی ہند سے کچھ واقفیت
 حاصل کی۔ یہ یقینی بات ہے کہ دبستان ۱۰۶۳ھ اور
 ۱۰۶۷ھ/۱۶۵۳-۱۶۵۷ء کے درمیان لکھی گئی۔

مآخذ : (۱) دبستان مذاہب (کلکتہ ۱۲۲۳ھ/
 ۱۸۰۶ء) : اس کتاب کے دیگر ایڈیشن نہران، بمبئی، لکھنؤ
 کے ہیں : (۲) The Dabistan or school of manners
 مترجم David Shea و Anthony Troyer، پیرس
 ۱۸۳۳ء، جلد ۲ (ہر جگہ ہر صبح نہیں ہیں) : (۳) JA

موازنہ کر کے ان کے کلام کے حسن و قبح پر روشنی ڈالی گئی تھی، مثلاً دیکھیے (۱) شبلی نعمانی؛ موازنہ انیس و دیر (آگرہ ۱۹۰۷ء)؛ (۲) سید نظیر الحسن فوق رضوی؛ المیزان (علی گڑھ، بدون تاریخ)، مظفر حسن ملک؛ مرزا دیر مقالہ دکتوری؛ (۳) مرزا محمد رضا معجز؛ تطہیر الاوساخ؛ (۴) میر افضل علی ضو؛ رد الموازنہ، وغیرہ وغیرہ۔

جہاں جہاں انیس کی تعریف ان کی زبان کی سادگی، کلام کی روانی اور فصاحت بیان کے باعث کی جاتی ہے وہاں دیر کو ایجاز، تازگی مضامین، صنائع و بدائع کے کثیر استعمال اور بینوں کے سبب سے سراہا جاتا ہے۔ عربی و فارسی کے عالم ہونے کی وجہ سے دیر ان زبانوں کے ادب سے خوب فائدہ اٹھاتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے کلام میں قرآن، حدیث، اور مقاتل وغیرہ کے متعلق تصانیف سے مواد لے کر شامل کیا۔ حیات دیر ۱ : ۲۹۰ میں دونوں شعرا کا یوں موازنہ کیا گیا ہے کہ ”میر فصیح و شیرین ہیں اور مرزا دقیق و نمکین“۔ بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ انہیں دو شعرا کی کوششوں سے مرثیے کو اردو شاعری میں ایسا اہم مقام حاصل ہوا۔

تصنیفات :

دیر کی اکثر منظومات لٹھو میں طبع ہو چکی ہیں، گو ابھی چند ایک غیر مطبوعہ ہیں۔ ان ایڈیشنوں میں سے جو الحاقات و اضافات کے باعث ناقص ہو چکے ہیں، مفصلہ ذیل بھی ہیں : مثلاً (۱) دو جلدوں میں مرثی کا ایک ایڈیشن مطبع نول کشور میں چھپا (حیات دیر : ۱ : ۶۲۷)؛ (۲) دفتر ماتم، لکھنؤ ۱۸۹۷ء؛ ۲۰ جلد : مندرجات کے تجزیے کے لیے دیکھیے حیات دیر ۱ : ۲۷۹ بعدیہ مرثی ۱۸۵۷ء اور مابعد کے فسادات میں کم ہو گئے تھے اور آگے چل کر دوبارہ جمع کیے گئے؛ (۳) مرثی دیر، طبع اودھ اخبار پریس، ۲ جلد؛ وہی کتاب، ۱ : ۲۹۰؛ (۴) مرثیہ مرزا دیر، ۲ جلد،

۱۸۷۸ء/ جنوری ۱۸۷۸ء کے آخر میں کلکتے پہنچ گئے (حیات دیر، ۱ : ۹۹ ج)۔ (اودھ اخبار میں دیر کے انتقال پر جو سلسلہ مضامین نکلا تھا، اس میں لکھا ہے کہ کلکتے میں ۱۲۹۱ء میں گئے تھے۔ دیکھیے معاصر، حصہ اول، ص ۱۳۲ مقالہ بعنوان ”مرگ دیر“ از قاضی عبدالودود)۔ امراض چشم کے ایک ماہر جرمس معالج نے جو کلکتے میں واجد علی شاہ کے ہاں مقیم تھا، ان کی آنکھوں کا کامیاب آپریشن کیا جس سے ان کی بصارت عود کر آئی۔ بعد ازاں وہ لکھنؤ واپس آ گئے اور اپنی عمر کے بیشتر حصے کی طرح یہ زمانہ بھی یہیں بسر کیا۔ صرف ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں وہ کچھ عرصے کے لیے سینا پور میں منتقل ہو گئے تھے۔ ۱۸۵۸ء میں وہ کانپور اور ۱۸۵۹ء میں عظیم آباد گئے۔ آخر الذکر شہر میں وہ دوبارہ ۱۸۷۲ء/ ۱۸۷۵ء میں گئے۔ وہاں سے انجام کار لکھنؤ واپس چلے آئے اور وہیں ۳۰ محرم ۱۲۹۲ھ/ ۸ مارچ ۱۸۷۵ء کو انتقال کر گئے۔ انہیں ان کے اپنے مکان میں دفن کیا گیا۔ یہ مکان اس گلی میں واقع ہے جو اب ان کے نام پر کوچہ دیر کہلاتی ہے۔ اسی کبر سنی میں انہوں نے محرومی بصارت اور جوان بیٹے اور بھائی کی موت سے صدمات اٹھائے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ دیر ایک پرہیزگار، متقی، کریم النفس، مہمان نواز اور سنجیدہ و متین بزرگ تھے۔ بحیثیت شاعر وہ بہت پر گو تھے اور اچھے اشعار بڑی تیزی سے کہہ لیتے تھے۔ ان کا کلام بیشتر مرثی، سلام (ان کے لیے دیکھیے المیزان، ص ۸۵) اور رباعیات پر مشتمل ہے (حیات دیر، ۱ : ۲۷۲)۔ شاعری کے اس میدان میں ان کے حریف ان کے معاصر میر انیس تھے، جن کا لکھنؤ میں نام چمکنے سے بہت عرصہ پیشتر دیر شہرت کے جھنڈے گاڑ چکے تھے۔ ان کی رقابت کی وجہ سے مداحین بھی دو حریف گروہوں میں بٹ گئے، جو ”دیر پرست“ اور ”انیس پرست“ کہلائے۔ ایسا ادب خاصی مقدار میں منظر عام پر آیا جس میں ان دونوں کا

* دبیس : رگ اہمزدی (خاندان)

* دبیق : (دبقہ اور دبقو اس کی دوسری صورتیں ہیں) دبیق کے بیرونی نواح میں ایک مقام ، جو اعلیٰ قسم کے بنے ہوئے کپڑوں کے لیے مشہور تھا، جو یہاں سے تمام اسلامی سلطنت میں برآمد کیے جاتے تھے۔ دبیق کا محل وقوع اس سے زیادہ صحیح طور پر ہمیں نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا نام ان شہروں کے نام کے ساتھ ملتا ہے جو ناپید ہو چکے ہیں، جیسے شطا، تیس یا تونہ جو غالباً جھیل منزالہ (Lake Menzaleh) کے جزیروں میں واقع تھے۔

دبیق میں سونے کی منبت کاری کے باریک کپڑے بننے لگے اور فاطمیوں کے عہد میں یہاں بوقلمون کتان کے عمامے تیار ہوتے تھے، یہاں کے بنے ہوئے کپڑے ایسے نفیس ہوتے تھے کہ ”دبیتی“ کا لفظ یہاں کے کپڑے کے لیے استعمال ہونے لگا اور اس کی شہرت اتنی بڑھی کہ ایک خاص وضع کا کپڑا دبیتی کہلانے لگا۔ دبیتی کم و بیش ہر جگہ مثلاً تیس، دبیق، مثلث دھانہ (the Delta)، اسیوط، بالائی مصر، یہاں تک کہ ایران اور کازرون میں بھی تیار ہونے لگا۔ دبیق میں تیار ہونے والے کپڑے کی نفاست آگے چل کر یقیناً کم ہو گئی ہوگی، اس لیے کہ ادربیسی لکھتا ہے : اگرچہ یہ کپڑے بہت نفیس تھے، لیکن تیس اور دبیق کے کپڑوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ یہی نتیجہ اس سے پہلے ہی جدے کے چنگی خانہ کے حساب سے نکالا جاسکتا ہے جو المقدسی نے اپنی کتاب میں دیا ہے۔

اس وقت کپڑے کے تین ٹکڑے پائے جاتے ہیں : ایک عباسیوں کے دور کا اور دو فاطمیوں کے عہد کے، جن کی جھاپوں پر دبیق کا نام موجود ہے۔ ابن سنان نے جگہ کا نام نہیں دیا ہے، دبیتی کپڑے کا ذکر البتہ اس کے یہاں موجود ہے۔

ابن دقماق (۵ : ۸۹) اور ابن جیمان (ص ۷۶ : عبد اللطیف : Relation de l'Egypte : ۶۳۸) صوبہ غریبہ

لکھنؤ ۱۸۷۵-۱۸۷۶ء، کانپور ۱۸۹۰-۱۸۹۹ء (آئندہ برسوں میں کئی ایڈیشن شائع ہوئے) : (۵) مرتبہ ہمارے مرزا دبیر، لکھنؤ ۱۸۸۲ء (آئندہ برسوں میں کئی ایڈیشن شائع ہوئے) : (۶) اس کی یہ تصانیف بھی ہیں۔ ابواب المعانی، نثر میں ایک تصنیف، جو حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے سے متعلق ہے : اس کا مقابلہ شہید کربلا کی سرگزشت سے کیا گیا ہے، طبع یوسفی پریس دہلی (حیات دبیر، ۱ : ۲۸۰) : (۷) رباعیات مرزا دبیر، لکھنؤ، بدون تاریخ، ۱۹۷۰ء رباعیات ان کا ایک نسبتاً مختصر مجموعہ بھی رباعیات انیس کے ساتھ آگے سے شائع ہوا تھا۔

ابتدائے عمر میں مرزا نے غزلیات کے بھی تین دیوان مرتب کیے تھے لیکن بعد ازاں یا تو خالق ہو گئے یا گم ہو گئے یا شاید شاعر نے انہیں اپنے کلام سے خارج کر دیا۔

مآخذ : متن میں مندرجہ حوالوں کے علاوہ : (۱)

سیر محسن علی : سراپا سخن، لکھنؤ ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء

ص ۱۰۸ : (۲) میر صفدر حسین : شمس الضحیٰ، لکھنؤ

۱۲۹۸ھ/۱۸۸۱-۱۸۸۰ء : (۳) علی حسن خان : بزم سخن

اگر ۱۲۹۸ھ ص ۸۸ : (۴) سید افضل حسین ثابت رضوی

لکھنوی : حیات دبیر لاہور، ج ۱، ۱۹۱۳ء ج ۲

۱۹۱۵ء : (۵) محمد حسین آزاد : آب حیات لاہور ۱۸۸۳ء

ص ۵۵۰ تا ۵۶۲ : (۶) رام بابو مکسینہ : A History of

Urdu Literature، الہ آباد، ۱۹۳۰ء ص ۱۲۱ بعد (اردو

ترجمہ از مرزا محمد عسکری، لکھنؤ ۱۹۵۲ء ص ۲۳۸

بعد) : (۷) ابواللیث : لکھنؤ کا دبستان شاعری، لاہور

تقریباً ۱۹۵۵ء ص ۶۰ بعد : (۸) J. F. Blumhardt

Cat. of Hind. Printed Books in the Br. Mus. لندن

۱۸۸۹ء عمود ۷، ۶، ۳، ۸، نکتہ، لندن ۱۹۰۹ء عمود

۲۱ : (۹) المعاصر، پٹنہ ۱۹۵۱ء حصہ اول، ص ۱۳۲ :

(۱۰) عبدالحی : گل رعنا، اعظم گڑھ ۱۳۶۳ء ۱۹۴۳ء

(محمد شفیع لاہوری)

۱۸ دقیقے شرق) اور ریاست بھی، جس پر ایک شیخ کی حکومت ہے۔ یہ عرب کے اس ساحل پر واقع ہے جس کی حد بندی عارضی صالح نامیہ کی رو سے عرب کی عارضی صالح کے ساحل (Trucial Coast) تک کی گئی تھی، دیبی کا شہر ایک پل کھاتی ہوئی کھاڑی (خور) کے کنارے آباد ہے جو خشکی کے اندر تقریباً آٹھ میل تک چلی گئی

ہے۔ شمال مشرق کنارے پر واقع کاروباری علاقے دبیرہ اور جنوب مغربی کنارے پر آباد الشندغہ اور دبئی خاص کے ساحلوں کے درمیان کشتیوں کے ذریعے آمد و رفت ہوتی ہے۔ شہر کی سیستائیس ہزار نفوس کی آبادی میں غالب اکثریت عربوں کی ہے، لیکن اس میں کچھ ایرانی، ہندوستانی اور بلوچی بھی ہیں (Hay، ص ۱۱۳) اس ریاست کے عرب السودان، الدور، المرزاقین، آل بو مسہیر، البوہیل، القعزان، المحاربة، السبایس اور آل بوقلاح قبائل پر مشتمل ہیں۔ ان قبائلی گروہوں کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ وہ علاقہ خلیج فارس کے بنی یاس اور العناصر (دراصل ایک بدوی قبیلہ) کے افراد کا مجموعہ ہیں۔ حکمران خاندان، یعنی آل بوقلاسا، قبیلہ الرواشد سے تعلق رکھتا ہے اور یہاں کی اکثریت کی طرح سابق مذہب کا پیرو ہے۔

ریاست شیخ کی سرحدیں مکمل طور پر متعین نہیں کی گئی ہیں، جبل العالی (جسے بعض اوقات الجبیل کہا جاتا ہے) اور خور غناخہ کے درمیان واقع آخری ساحلی مقام، دیبی اور ابو ظبی کے شیوخ کی ریاستوں کے درمیان خشکی کی سرحد ہے۔ دیبی اور الشارقة کے شیوخ کی ریاستوں کے درمیان خشکی کی سرحد دبیرہ کے عین شمال مشرق میں ختم ہو جاتی ہے: دو چھوٹے ساحلی گاؤں ام السقیم اور جمیرہ اور ان سے بڑا گاؤں حبرین پر، جو وادی حتا کے پچاس میل اندر اور ریاست کے باقی علاقوں سے الگ تھلک واقع ہے، فرمان رواے دیبی کے زیر سیادت ہے۔ یہاں کھجوروں

میں ایک جگہ کا ذکر کرتے ہیں، جس کا نام دیبی ہے، لیکن یہ وہ شہر نہیں ہو سکتا جو دمیاط کے قریب و جوار میں واقع تھا اور جس کا ان دونوں مصنفوں نے علحدہ علحدہ ذکر کیا ہے (ابن دقماق، ۵: ۷۸؛ ابن جیعان، ص ۶۲ اور عبداللطیف، ص ۶۲)۔

محض فاصلے ہی کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ بھی ممکن نہیں کہ ہم قدیم دیبی اور آج کل کے دبیب کو ایک کہہ سکیں، جو سینٹ لاورین کے جنوب میں بارہ کیلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے اور جو ہو سکتا ہے کہ وہی دیبی ہو جس کا ذکر ابن دقماق اور ابن جیعان نے کیا ہے۔

مآخذ: (۱) Ya'Kūbī-Wiet، ص ۱۹۳ تا ۱۹۵؛ (۲) ابن خردادبہ، ص ۸۳؛ (۳) الادریسی: مغرب، ص ۱۸۶ تا ۱۸۷؛ (۴) ناصر خسرو، ص ۱۳۱؛ (۵) السقسی، ص ۵۳، ۱۰۳، ۱۹۳، ۲۳۳؛ (۶) ابن سحاق، ص ۸۱؛ (۷) المقریزی، طبع Weir، ص ۲، ۸۳، ۲۰۰، ۲۱۵، ۸۲؛ (۸) لسٹریچ (مع ماخذ کی ایک طویل فہرست کے)؛ (۹) Le Strange، Introduction: Salmon، ص ۲۹۳؛ (۱۰) d'histoire de Bagdad، ص ۱۳۶، ۱۳۸، ۱۳۰؛ (۱۱) Matériaux pour servir à la: Weir و J. Maspero: R.B. Serjeant، ص ۱۷۸؛ (۱۲) géographie de l'Egypte: 'Ars Islamica، ص ۱۳، ۸۹؛ (۱۳) Islamic Textiles Tissues et Tap: Weir، ص ۱۵، ۱۰۰، ۹۸؛ (۱۴) Syria در iseries، ص ۲۸۲ تا ۲۸۳؛ (۱۵) RCEA، ص ۱۰۷؛ (۱۶) Dated Tiraz Fabrics، ص ۲۰۳، ۲۱۷؛ (۱۷) دائرة المعارف الإسلامية، مصر، ۹: ۱۳۲۔

(G' Wiet)

* دبیل: رک بہ دبین۔

* دبئی: (جسے عام طور پر دبئی لکھا جاتا ہے)، ایک بندرگاہ (۲۵ درجے ۱۶ دقیقے شمالی اور ۵۵ درجے

بیرونی ملک سے تعلقات استوار نہیں کرے گا اور ۱۳۸۰ھ/۱۹۶۲ء میں اس نے یہ بات مان لی کہ وہ اپنے علاقے میں دریافت شدہ تیل کے حقوق حکومت برطانیہ کے مقرر کردہ آدمی کے سوا کسی دوسرے کو نہیں دے گا۔ بیرون ساحل مراعات کے منافع میں برطانوی کمپنی *British Petroleum Exploration* (سابقہ *D'Arcy Exploration Co. Ltd.* کا دو تہائی حصہ ہے اور فرانسیسی کمپنی *Compagnie Francaise des Petroles* کا ایک تہائی۔ عراقی پٹرولیم کمپنی سے ایک ملحقہ ادارے *Petroleum Development (Trucial Coast) Ltd.* کو اندرون ساحل تیل کی مراعات حاصل ہیں۔ یہاں ۱۳۸۱ھ/۱۹۶۱ء تک تیل دریافت نہیں ہوا تھا۔

حورالشارقہ میں ریت بھر جانے اور لنگہ *Linga* [رک بان] کے زوال کے باعث دہی کو حالیہ خوشحالی نصیب ہوئی ہے۔ یہاں موتی آب ایک رویہ زوال صنعت اور خشک سچھلی کی برآمد ہوتی ہے اور سامان خوراک، کپڑا اور ہلکی مشینری درآمد کی جاتی ہے۔ ایک ساحلی سڑک دہی کو شمال میں دو میل کے فاصلے پر واقع الشارقہ اور جنوب میں ۸۰ میل دور قصبہ ابوظہبی سے ملاتی ہے۔ اندرون ملک البریمی اور سقط کو ریگستانی پگڈنڈیاں جاتی ہیں۔

حال ہی میں اس ریاست کے انتظامی اداروں کو وسعت دی گئی ہے۔ اب ان میں مجلس بلدیہ (*Municipal Council*)، انتظامیہ گمرک (*Custom*)، (*Administration*)، عدلیہ اور تعلیم، صحت، تسجیل اراضی (*Land Registration*) اور آب رسانی کے محکموں کا اضافہ ہوا ہے۔ شہر میں ایک ہسپتال، لڑکوں کے لیے چار اور لڑکیوں کے لیے دو مدرسے، سلسلہ تار و ٹیلیفون اور باقاعدہ ڈاک کا انتظام اور ایک چھوٹا سا ہوائی اڈا ہے۔ ابوظہبی کے سوا باقی تمام عارضی صلح کی پابند ریاستوں کے برطانوی پولیٹیکل ایجنٹ کے صدر دفاتر ۱۳۷۴ھ/۱۹۵۴ء میں الشارقہ سے دہی میں منتقل

کے درخت اگانے جاتے ہیں، لیکن پانی کی شدید قلت ہے۔ ۱۲۱۳ - ۱۲۱۴ھ/۱۷۹۹ء سے قبل دہی کے متعلق بہت کم معلومات میسر ہیں۔ دستیاب شدہ مآخذ [Lorimer] میں پہلی مرقبہ اس کا ذکر اسی صند کے ذیل میں ملتا ہے۔ انیسویں صدی کے پہلے تہائی حصے کے دوران میں دہی ابوظہبی کے ماتحت سمجھا جاتا تھا، البتہ اس میں سے ۱۲۴۱ھ/۱۸۲۵ء کے بعد کئی سال کی وہ مدت مستثنیٰ ہے جب القواسم کے شیخ سلطان ابن حقر، حاکم الشارقہ، نے یہاں کے عامل محمد بن ہزل بن زعل کی بہن سے شادی کر کے دہی تک اپنا اثر و رسوخ بڑھا لیا (*Selections: India*, ص ۲۴: ۳۱۷)۔ ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۳ء میں جب آل بوفلاسا کے تقریباً آٹھ سو ارکان نے مکتوم بن بطی بن سہیل کی قیادت میں ابوظہبی کو چھوڑ کر دہی کی نو آبادی کا انتظام سنبھالا، (السالمی، ص ۳۱) تو اسے ایک خود مختار ریاست کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اس ریاست کا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لینے کی خاطر پوری انیسویں صدی میں بلکہ بیسویں صدی کے آغاز تک القواسم اور بنی یاس کے درمیان کشمکش جاری رہی لیکن دہی نے کبھی الشارقہ، کبھی ابوظہبی اور بعض موقعوں پر عجمان اور ام القیوین کی چھوٹی چھوٹی شیوخ کی ریاستوں سے معاہدے کر کے اپنی آزادی برقرار رکھی۔ دہی کی آبادی اور خوشحالی میں معتدبہ اضافہ ہوا جو زیادہ تر موتی نکالنے کے کاروبار اور درآمدی و پرامدی تجارت کا سرہون منت تھا۔

دوسری عارضی صلح کی پابند ریاستوں (*Trucial States*) کی طرح دہی نے ۱۲۳۵ھ/۱۸۳۰ء میں برطانیہ کے ساتھ معاہدہ صلح اور ۱۲۵۱ھ/۱۸۳۵ء میں عارضی بحری معاہدے (جو بعد میں مستقل ہو گیا) پر دستخط کیے (دیکھئے مادہ ابوظہبی)، ۱۳۹۰ھ/۱۸۹۲ء میں دہی کا حکمران اس بات پر رضا مند ہو گیا کہ وہ برطانیہ کی منظوری کے بغیر برطانیہ کے سوا کسی

درج ہیں ان کا مآخذ جزوی طور پر ارسطو کی *Historia Animalium* کو قرار دیا جاسکتا ہے۔ مرغی شکاری جانوروں سے نہیں لڑتی، بجز گیدڑ کے، کیونکہ ان دونوں کے درمیان ایک جیلی مفاصمت پائی جاتی ہے۔ اسے رات کے وقت ڈر لگتا ہے، اور اس لیے وہ سونے کے لیے کوئی بلند جگہ تلاش کر لیتی ہے۔ اس میں شکار کرنے والے اور دانہ چگنے والے دونوں قسم کے پرندوں کے خواص یکساں طور پر پائے جاتے ہیں، کیونکہ وہ گوشت بھی کھاتی ہے اور اناج بھی۔ جالے کے دو مہینوں کے سوا سال بھر کے دوران میں مرغی زیادہ تر ایک انڈا روزانہ دیتی ہے (بقول انٹویری مصر میں پورے سال بغیر وقفے کے)۔ اگر وہ دن میں دو مرتبہ انڈا دے تو یہ اس کی عنقریب ہلاکت کی علامت ہوتی ہے۔ انڈے کی سفیدی سے چوزہ پیدا ہوتا ہے، بحالیہ زردی جنین کے لیے غذا مہیا کرتی ہے۔ لمبوترے انڈوں سے مادہ چوزے پیدا ہوتے ہیں اور گول انڈوں سے نر۔ دھری زردی کے انڈوں سے دو چوزے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر انڈوں پر بیٹھی ہوئی مرغی بادل کی گرج سن لے تو انڈے خراب ہو جاتے ہیں۔ اگر وہ بوڑھی اور کمزور ہو تو انڈوں میں زردی نہیں ہوتی اور ان سے بچے نہیں نکلتے۔ وہ مرغ سے جفت ہوئے بغیر بھی [بعض خوراک کے سہارے] انڈے دیتی ہے، لیکن اس قسم کے انڈوں سے بچے نہیں نکلتے۔ جب مرغیاں موٹی ہو جاتی ہیں تو وہ انڈے دینا موقوف کر دیتی ہیں۔

[عربی] مآخذ کئی قسم کی مرغیوں کا ذکر کرتے ہیں اور ان کی کیفیت بیان کرتے ہیں، جن میں سے بعض جسمات میں بطخ کے برابر ہو جاتی ہیں۔ حیوانات اور ادویہ کے عرب ماہرین نے مرغی کے انڈوں، چربی، پتے، ہونٹے، بیٹ وغیرہ کے بہت سے طبی استعمال بیان کیے ہیں، جن میں سے بعض کے مآخذ قدیم یونانی تحریریں ہیں۔ مرغی کے گوشت کو صحت مند خوراک

دلتیہ ۱: ۲ تا ۳ (۱۹۰۵ تا ۱۹۱۳ء) 'بمواضع کثیرہ' (۸) وہی مصنف: *Glossaire Daïnois* ج ۱ تا ۳ (۱۹۲۰ء) : Doreen Ingrams (۹) 'بمواضع کثیرہ' : *A Survey of social and economic conditions in the 'Eritrea' Aden Protectorate* ۱۹۳۹ء ص ۲۷ تا ۳۳ : *Beiträge zur hist. : Höfner u. v. Wissmann* (۱۰) : Wiesbaden 'Geographie de vorislam. Süd-arabien' ۱۹۵۳ء ص ۹ 'بمواضع کثیرہ'۔ نقشہ: جنوبی عرب: عدن محبہ، لوح ۱، از v. Wissmann، ۱۹۵۷ء: پیمانہ ۱: ۵۰,۰۰۰ (مع دلتیہ کے خاص خریطے کے ۱: ۲۵,۰۰۰) : (۱۱) *دائرة المعارف الاسلامیہ*، مصر، ۱۳۳: ۱۸۳: (۱۲) *المکتبة الجغرافية العربية*، طبع دغوبہ، ۸۹: ۵۹ و ۲۶: ۶ و ۱۸۶: ۱۹۰]۔

(O. LÖFGREN)

* **دجاجہ:** [(ع): واحد]، بمعنی گھریلو مرغی، اس کا اطلاق عرب لغات نویسوں کے قول کے مطابق نر اور مادہ دونوں پر کیا جاسکتا ہے۔ متبادل تلفظ دجاجہ اور دجاجہ ہیں۔ زیادہ زمانہ حال کے مقامی استعمال میں (قب Tayakar اور متلوف) دجاجہ البحر اور دجاجہ القبة سچلی کی بعض اقسام کو ظاہر کرتے ہیں [جمع: دجاج، دجاج، دجاج، دجاجات]۔

اس جانور سے، جس کا ذکر عبرانی بائبل میں موجود نہیں، اہل عرب قبل اسلام کے زمانے سے واقف تھے۔ الجاحظ: (۲، ۲۷۷ء بعد) کا بیان ہے کہ اسے بطور انعام شعرا کو ان کے ادبی کارناموں کے صلے میں دیا جاتا تھا۔ اسلامی شریعت میں اسے انسانی خوراک کے طور پر جائز قرار دیا گیا ہے، کیونکہ یہ دیکھا گیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھاتے تھے۔

مرغی اور اس کے انڈوں کے بارے میں علم حیوانات سے متعلق عربی تحریروں میں جو مفصل معلومات

دجاجة آتی ہے (لسان العرب، مادۃ دَجَل، الفائق ۱ : ۳۸۶، ابن الاثیر، ۲ : ۱۴۰)۔

اسلامی اصطلاح میں دجال سے مراد جھوٹا مسیح (المسیح الدجال) ہے اور اس کا دجل اس کی جادوگری اور کذب و فریب ہے (لسان العرب، مادۃ دجل)۔ بقول ابن الاثیر (۲/۱۴۰) دجال وہ ہے جو آخری زمانے میں ظاہر ہوگا اور الوہیت کا دعویٰ کرے گا۔ ابن خالبوہ کے نزدیک دجال کے مفہوم کی بہترین تشریح وہ ہے جو ابو عمرو نے کی ہے یعنی السوء الکذاب (حقیقت کو چھپانے والا سب سے بڑا جھوٹا انسان)۔ فب لسان العرب، مادۃ دجل وابن الاثیر ۲/۱۴۰ والفائق ۱/۳۸۶۔

بقول ابن سینہ مسیح دجال ایک یہودی ہوگا (لسان العرب، مادۃ دجل) اور شاہ رفیع الدین (ص ۸ بعد) کے بیان کے مطابق دجال کا خروج و ظہور علامات قیامت میں سے ہے۔ [احادیث میں بھی ایسا ہی مرقوم ہے (البخاری و مسلم)] اور زمانے کے لحاظ سے یہ امام مہدی کے ظہور کے بعد ظاہر ہوگا اور ان سے اس کا مقابلہ ہوگا۔ مکان کے لحاظ سے دجال کا ظہور اولاً عراق و شام کے درمیان ہوگا اور وہ نبوت کا دعویٰ کرے گا پھر وہ اصفہان کی طرف جائے گا جہاں وہ خدائی کا دعویٰ کرے گا اور ستر ہزار یہودی اس کی پیروی کریں گے (شاہ رفیع الدین، ص ۹ بعد، و صحیح مسلم، ص ۲۲۵۲ و ۱۲۶۶)۔ دجال کا ظہور مشرق کے کسی علاقے سے ظاہر ہوگا (سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب ۳۳) جن میں خراسان اور اصفہان کا نام بھی آتا ہے (مسند احمد ۱ : ۴۷۲، ۳ : ۲۲۳، ۶ : ۷۵) اور اس کے ظہور سے پہلے بڑی قحط مالی ہوگی اور لوگوں کو سختی کا سامنا ہوگا (مسند احمد ۶ : ۱۲۵، ۴۵۳ بعد)۔

دجال کی علامات بھی احادیث میں بیان ہوئی ہیں مثلاً وہ کالا ہوگا اور اس کی آنکھ میں پھلی ہوگی، جو ہیز رنگ کے شیشے کی بنی ہوئی معلوم ہوگی، اس

سمجھا جاتا ہے، اگرچہ یہ کہا جاتا ہے کہ اس کا مسلسل استعمال نقرس اور بواسیر پیدا کرتا ہے : نیم پخت اندھے فوت باء کو بڑھانے کے لیے خاص طور پر کار آمد سمجھے جاتے ہیں۔ مرغی کو خواب میں دیکھنے کی تعبیر پر متعلقہ کتب میں بحث کی گئی ہے۔ عرب ہیئت دان ستاروں کے ایک مجموعے کو الدجاجة کے نام سے موسوم کرتے ہیں، جسے الطائر بھی کہا جاتا ہے۔

مآخذ : (۱) عبدالغنی النابلسی : تعطیر الانام، قاہرہ ۱۳۵۳ھ : ۱ : ۲۲۰ بعد : (۲) الدمری، بنیل مادۃ (ترجمہ Jayakar، ۱ : ۷۶ بعد : (۳) داؤد الأنطاسی : تذکرۃ، قاہرہ ۱۳۲۴ھ : ۱ : ۱۳۹ (۴) الجاحظ : الحيوان، طبع دوم، اشاریہ : (۵) ابن العوام : فلاحۃ (ترجمہ Clément-Mullet)، ۲ : ۲۳۲ بعد : (۶) ابن قتیبہ : عیون الأخبار، قاہرہ ۱۹۲۵-۱۹۳۰ء : ۲ : ۷۱، ۹۲ (ترجمہ Kopf، ص ۴۸) : (۷) الابشہی : المستطرف، باب ۶۲، بنیل مادۃ : (۸) القزوينی (Wästenfeld)، ۱ : ۳۲، ۱۳۳ بعد : (۹) المستوفی القزوينی (Stephenson)، ص ۷۰ بعد : (۱۰) التویری : نہایۃ العرب، ۱ : ۲۹۷ بعد : (۱۱) ابن مفلوف : معجم الحيوان، قاہرہ ۱۹۳۲ء، اشاریہ : (۱۲) وؤ، ج ۱ : ۹ : ۱۳۴ بعد : (۱۳) البستانی : دائر المعارف، بیروت ۱۸۸۳ء بنیل مادۃ۔

(L. Kopf)

⊕ الدَّجَال : (ع) مادۃ دَجَل، صیغۃ مبالغۃ، یعنی حقیقت کو چھپانے والا، سب سے بڑا دھوکے باز اور چالباز (لسان العرب، زیر مادۃ دجل، اور ابن الاثیر، ۲ : ۱۴۰)۔ مادۃ دجل کے اصل معنی ہیں : (۱) خلط (یعنی خلط ملط کر دینا) : (۲) تلبیس (شیطان چالوں سے دوسروں کو دھوکے اور التباس میں ڈالنا) : (۳) تمویذ (ملع سازی کرتا، حقیقت کو چھپانا) : (۴) کذب (جھوٹ بولنا اور غلط بیانی کرنا) : گویا دجال میں یہ تمام اوصاف بد پائے جاتے ہیں۔ دجال کی جمع دجالون اور

کی کوشش کرے گا مگر ناکام ہوگا۔ یہ بزرگ حضرت خضر علیہ السلام ہوں گے (صحیح مسلم) ص ۲۲۵۶: شاہ رفیع الدین، ص ۱۰)۔

دجال کے پیروکاروں میں زیادہ تر یہودی، بد عقیدہ، منافق، کافر اور عورتیں ہوں گی (صحیح مسلم) ص ۲۲۶۹: مستند احمد، ۲/۶۷۷، ۲۳۸، ۲۲۳/۳، ۲۹۲، ۲۵/۶: سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب ۳۳: شاہ رفیع الدین، ص ۱۰ (بعد)۔

احادیث کی رو سے دجال کا دور حکومت اور فتنہ پردازی کا عرصہ چالیس دن یا چالیس برس ہوگا (سنن ابو داؤد، کتاب الملاحم، باب ۱۴: سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب ۳۳: مستند احمد، ۲/۶۷۷: شاہ رفیع الدین، ص ۱۱) اور اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام دمشق کی جامع مسجد کے مشرقی منارے پر نازل ہوں گے جہاں امام مہدی اپنی فوج کے ساتھ موجود ہوں گے جن کی ابتدا میں حضرت عیسیٰؑ نماز پڑھیں گے اور ان کی قیادت میں شریک لشکر ہو کر لُذ کے مقام پر اپنے ہاتھوں سے دجال کو قتل کر دیں گے (لُذ بیت المقدس کے قریب ایک شہر ہے)۔ اس کے بعد اس کے متبعین، جو اکثر یہودی ہوں گے، ادھر ادھر پناہ کی تلاش میں بھاگیں گے مگر انہیں کہیں پناہ نہیں ملے گی۔ دجال کے پیروکاروں میں اکثریت عورتوں کی ہوگی (مستند احمد، ۲/۶۷۷)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتنہ مسیح دجال سے بچنے کے لیے دعا بھی مکھائی ہے: اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَسِيْحِ الدَّجَالِ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں فتنہ دجال سے پناہ مانگا کرتے تھے (البخاری، کتاب الفتن، باب ۲۶)۔

مَا أَخَذَ : (۱) لِسَانُ الْعَرَبِ زَهْرُ مَادَّةِ دَجَلٍ : (۲) ابن الاثیر : النہایۃ، ۲: ۱۴، طبع المكتبة الخيرية قاہرہ: (۳) الزمخشري: الفائق، ۱: ۳۸۶، طبع قاہرہ ۱۹۳۵ء: (۴) مسلم: الجامع الصحیح، ج ۴، [کتاب الفتن، باب ذکر الدجال] طبع محمد فؤاد عبدالباقی، قاہرہ ۱۹۵۵ء: (۵) ابوداؤد:

کے بال حبشیوں کی طرح گھنگریالے ہوں گے اور گلا چوڑا چمکلا ہوگا اور اس کی پیشانی پر ”کافر“ لکھا ہوگا (شاہ رفیع الدین، ص ۸: البخاری، کتاب الانبیاء، باب ۳، کتاب اللباس، باب ۶۸، کتاب الفتن، باب ۲۶، ۲۷: صحیح مسلم، ص ۲۲۷۸: بعد: ابو داؤد طیالسی: مستند حدیث نمبر ۵۳۴، ۲۵۳۲)۔ دجال کے پاس ایک باغ ہوگا جسے وہ جنت کہے گا، اور آگ ہوگی جسے دوزخ کا نام دیا جائے گا، اور اس کے ہاتھ سے خرق عادات ظاہر ہوں گے، جیسے آسمان سے منہ برساتا، درختوں کو پھل لگانا، شیطاں کو لوگوں کے مردہ ماں باپ کی شکل میں زمین کے اندر سے نکالنا، اور یوں تیزی سے دنیا میں ادھر سے ادھر جانا جس طرح ہوا پر بادل تیرتے جاتے ہیں، وغیرہ (شاہ رفیع الدین، ص ۶: بعد: صحیح مسلم، ص ۲۲۵۲: بعد)۔

دجال کی فتنہ پردازی کی مدت چالیس دن ہوگی: پہلا دن ہمارے عام سال کے برابر ہوگا، دوسرا دن ایک ماہ کے برابر، تیسرا دن ایک ہفتے کے برابر، اور باقی دن عام دنوں کی مانند ہوں گے (صحیح مسلم، ص ۲۲۵۲: شاہ رفیع الدین، ص ۱۰)۔ دجال تمام دنیا پر فتح پالے گا مگر مکہ اور مدینے میں داخل نہیں ہو سکے گا (حوالہ سابق)۔ دجال کی فوج جب مدینے کے قریب آئے گی تو شہر میں تین مرتبہ زلزلہ آئے گا جس کے باعث بد عقیدہ اور منافق لوگ خائف ہو کر نکلیں گے اور دجال کے پھندے میں گرفتار ہو جائیں گے۔ اس وقت مدینے میں ایک بزرگ ہوں گے جو دجال کے مناظرے کے لیے نکلیں گے اور اسے دیکھنے ہی کہیں گے کہ یہی وہ دجال ملعون ہے جس کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی۔ دجال کے حکم سے انہیں آرے سے چیر دیا جائے گا۔ پھر دجال اپنی شعبہ بازی سے ان کے ٹکڑوں کو جوڑ کر زندہ کرے گا تو پھر وہ کہیں گے کہ اب تو مجھے پہلے سے بھی زیادہ یقین ہو گیا ہے کہ تو وہی دجال ہے۔ دجال انہیں پھر قتل کرانے

میں آملا ہے اور جس سے دریائے دجلہ میں پانی کی مقدار کم از کم دوگنی ہو جاتی ہے۔ یہ دریا، جسے عرب جغرافیہ نگاروں نے وادی الزم کہا ہے، ان اونچے اونچے پہاڑوں کے فالتو پانی کو جو جھیل وان کے جنوب میں واقع ہیں بہا لاتا ہے اور جن میں بدائش (موجودہ بتلیس) اور سینرد (جدید سیرت) کے خطے بھی شامل ہیں۔ ان کے مقام اتصال سے اوپر پچاس میل مغرب کی جانب حصن کیفا (موجودہ حسن کیف) کا اہم شہر آباد ہے۔

عرب جغرافیہ نگاروں نے بہت جی اور الزاب الاعظم کے دھانوں کے درمیان نہر یزنا، نہر بائنانا (یا باسانفا یا سفان)، دریائے بویار اور وادی دوشہ کا ذکر بھی بطور اس کے معاونوں کے کیا ہے، جنہیں موجودہ پہاڑی نالوں میں شناخت کرنا غیر یقینی ہے۔ آج کل یہ دریا خابور الحسینہ (موجودہ خابور) اور اس کے معاون اُطیل سو ہیں، جن کے ساتھ ساتھ ترکی عراقی سرحد واقع ہے۔ حسنیہ کے شہر (غالباً موجودہ زخو) میں کبھی ایک مشہور ہل تھا۔ دریائے ابو مریا (موجودہ وادی المر جو دجلہ سے اسکی موصل، سابق بلد میں آملا ہے) یا بائیں کنارے کے متعدد سیلابی نالوں کے سوا، خان بور کے جنوب میں الزاب الاعظم تک کوئی بڑا معاون اس میں نہیں ملتا، یعنی موصل (الموصل) ایسے بڑے شہر سے تیس میل اور آگے جو بجائے خود ایک ماسانی شہر تھا اور جسے بنی امیہ کے ماتحت خوب خوب ترقی ہوئی۔

دریائے الزاب الاعظم سے، جو کچھ تو کوہ ہامے حکماری اور کچھ ان پہاڑوں سے نکلتا ہے جن سے ایرانی عراقی سرحد کی تشکیل ہوتی ہے، دریائے دجلہ کے پانی میں بہت بڑا اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہی کچھ ہم الزاب الاصغر کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، جو ایران و عراق کے سرحدی خطے میں ایک وسیع قطعے کے فالتو پانی کو بہا کر، اس دریا سے کوئی ساٹھ میل دور جنوب

سنن ابی داؤد، (۶) ابن ماجہ، سنن، (۷) البیہقی، (۸) دائرۃ المعارف، ۷: ۲۵۳ بعد، بیروت ۱۹۸۸ء: (۹) المسعودی، مروج الذهب، ۸: ۲۸: (۱۰) شاہ رفیع الدین: علامات قیامت، کراچی ۱۹۹۳ء: (۱۱) محمد احمد قادری: علامات قیامت، مطبوعہ لاہور: (۱۲) البخاری: الجامع الصحیح، کتاب الفتن، باب ۲۶، (ذکر الدجال) ویاب ۷: (لایدخل الدجال المدینہ): (۱۳) مفتاح کنوز السنۃ بذیل سادہ۔

(ظہور احمد اظہر)

* **دجلہ:** عراق کے ”دو دریاؤں“ میں سے مشرق دریا کا نام (جسے ہمیشہ ال کے بغیر ہی لکھا جاتا ہے)، دجلہ سماری رسم الخط کے دگلت کی جدید اور مغرب شکل ہے۔ تورات کی کتاب پیدائش میں اسی کو جِدْقِل لکھا گیا ہے۔

یہ دریا (جدید ترقی میں دفل نہری) سلسلۂ طارس Taurus کی جنوبی ڈھلانوں سے نکلتا ہے۔ جھیل گلچوک کے جنوب اور جنوب مشرق میں اس کی بالائی شاخ ان سب معاونوں کے ساتھ جن سے اس کی ترکیب ہوئی دامن کوہ اور میدان کے ایک وسیع علاقے کے بیکار پانی کو بہا کر لے جاتی ہے۔ عہد عباسیہ کے صوبہ جزیرہ کا شمالی حصہ اسی علاقے پر مشتمل ہے جس میں عمید (جدید دیار بکر)، میا فاروق اور بہت سے دوسرے شہر آباد تھے۔ اس کے دوسرے معاونوں میں جغرافیہ نگار (ابن سراہون، مقدسی، یاقوت)، نہر الکلاب (متبادل طور پر نہر الذائب)، وادی صلیب، وادی سائیڈما اور وادی السربط کا نام بھی لیتے ہیں؛ لیکن جنہیں اب موجودہ معاونوں سے (ان کے ترکی ناموں کی شکل) بالخصوص ذوالقرنین سیو، امیرجے، ہمگ جے، بتمن سیو اور گورزن سیو میں یقینی طور پر متماثل نہیں کیا جا سکتا۔ پھر جہاں یہ دریا مشرق سے جنوب کی طرف مڑ گیا ہے یعنی موجودہ تل یا تل (تروں وسطی میں تل فافان) کے مقام پر بہت جی مشرق سے بہتا ہوا اس

دجلے کے دائیں کنارے سے نکالی گئی تھی اور (کہا جاتا ہے کہ) کبھی کبھی دریائے فرات کی نہروں کے آخری حصوں کا پانی بھی اس میں شامل ہو جاتا تھا۔ یہ نہر عکبرا کے جنوب میں مختلف مقامات پر دجلے سے آملتی تھی۔ عہد عباسیہ میں اس دریا کا راستہ اس کی موجودہ گزرگاہ سے کوئی پانچ سے بارہ میل مغرب کی طرف واقع تھا؛ سامرا سے جنوب میں ایک مقام سے لے کر بغداد سے کچھ دور شمال تک (یعنی تقریباً ستر میل تک) جب قادسیہ، العُلت، عکبرا اور رشیدیہ کے شہر اس کے ساتھ ساتھ آباد تھے آب پاشی کی کئی ایک سیلابی ندیاں بھی دریا کے اسی حصے سے نکالی گئی تھیں جنہیں آگے چل کر جب ایک حد تک یا پورے طور پر نظر انداز کر دیا گیا تو (شاید ساتویں صدی ہجری/ تیرھویں صدی عیسوی میں) اس کا نام شَطِیط ہو گیا، یعنی ننھا دریا۔

قَاطُوط - قَاسِر - نہروان کی عظیم آبی گذرگاہ کی ابتداء جس کا تعلق اس دریا کے بائیں کنارے سے ہے، شاید ساسانی عہد میں ہوئی اور ترقی شروع عباسی عہد میں، اصل دریا سے 'دور' کے قریب (سامرا سے پندرہ میل اوپر) نکالی گئی تھی؛ یہ زیادہ سے زیادہ تیس میل تک اور تقریباً اس کے متوازی بہتے ہوئے (موجودہ) کوٹ العمارة (از منہ متوسطہ کے ماذرایا) کے قریب پھر دجلے میں آملتی ہے، مگر اس سے پہلے عَزِیم اور دِیالا کا پانی بھی، جن کا خصوصاً دِیالا کا شمار آج کل دجلے کے اہم ترین معاونوں میں ہوتا ہے (رک بہ نہروان اور دِیالا)، بائیں جانب سے اس میں داخل ہو کر کسی نہ کسی طرح صرف بھی ہو جاتا ہے۔ سلسلہ نہروان کی دائیں جانب سے جو اہم نہریں نکلتی تھیں ان میں ایک "خالص" (جو ابھی تک اس نام سے موجود ہے، لیکن جس کا رخ بدل گیا ہے) تھی، دوسری "بین" تھی۔ یہی نہریں تھیں جن کے پانی سے بغداد کے شمالی علاقے میں گھٹی کاشت ہوتی تھی،

میں، اس سے جا ملتا ہے۔ الزاب الاعظم کے سنگھم کی تعین قرون وسطیٰ میں حدیثہ کے شہر سے ہوتی تھی اور الزاب الاصغر کی سن سے، لیکن ان میں اب کوئی بھی باقی نہیں۔ ان کے درمیانی علاقے میں اور کوئی معاون نہیں، یہ ہو سکتا ہے کہ جبل سنجار کی کسئی ندی یا ندیوں میں جب بعض موقعوں پر سیلاب آتا ہے تو ان کا پانی قلعہ شَرَقَط کے قریب اس دریا میں مل جاتا ہو۔

پھر جہاں یہ دریا جبل حَمْرَین کو انفتحہ کے مقام پر کاٹ کر اپنا رستہ بناتا ہے اس سے آگے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے تَکْرِیْتُ یا اس سے کچھ پہلے وادی ثَوْرَار (جس میں ہو سکتا ہے سیلاب کے بعض موسموں میں (مغربی) خابور کے آبی رقبے کا، جس کا تعلق قدوقی طور پر زیادہ تر دریائے فرات سے ہے، باقی بہ آتا ہو) الحضر سے گذرتے ہوئے اس میں آگرتا ہے۔ یا قوت نے تو اس علاقے میں ایک ایسی ندی کا بھی ذکر کیا جس سے فرات اور دجلہ میں باہم کشتی رانی بھی ہوتی تھی۔ پھر وہ علاقے جن کا پانی تَکْرِیْتُ سے اوپر دجلہ میں آملتا ہے سارا سال بارش ہی سے سیراب ہوتے ہیں، لہذا وہاں خشک سالی کا خطر، تو ہے سیلابوں کا نہیں؛ البتہ جرسوں (ڈولوں) کے ذریعے چونکہ پانی کو باہر کھینچنے کے لیے طرح طرح کی ترکیبوں (موجودہ کرد) سے کام لیا جاتا تھا لہذا دریا کے دونوں کناروں کے ساتھ ساتھ فصلوں کی کاشت یقینی ہو گئی تھی۔ رہا وہ سلسلہ انہار جس کا تعلق قرون وسطیٰ (اور جزوً اس سے بھی زیادہ قدیم زمانے) سے ہے سو اس کی ابتدا تَکْرِیْتُ سے آگے چل کر ہوتی تھی۔ نہر الاسحاق، جو بلاشبہ چشموں کے پانی کی سیلابی ندی تھی اور جزوی طور پر اس پر قابو پایا ہوا تھا، اس کے دائیں کنارے سے نکلتی تھی۔ اس کا وہ پانی جو آب پاشی سے بچ رہتا ہے سامرا سے آگے پھر اس میں جا ملتا تھا۔ نہر دَجِیل بھی سامرا کے جنوب میں

رہی اور (جیسا کہ یورپی مسیاحوں کا بیان ہے) دسویں صدی ہجری/سولہویں صدی عیسوی میں اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ عباسیوں کے عہد میں فرائٹ کی طرح دجلے کا پانی بھی واسطے سے تقریباً ساٹھ میل نیچے (البطاح کی) دلدلوں میں جتنا کچھ بڑی آب پاشی سے بچ رہتا جا گرتا تھا۔ یہ ایک عظیم آبی رقبہ ہے، موجودہ جھیل حمار کے مماثل، لیکن وسعت میں کہیں بڑا۔ عراق کے ان دونوں بڑے بڑے دریاؤں میں سیلاب آتا ہے تو اس کا سارا پانی یہیں بہ آتا ہے اور پھر ایک ہی آبی گذرگاہ کے ذریعے، جسے قرون وسطیٰ میں دجلۃ العوراء (یک چشم دجلہ) اور عصر حاضر میں شط العرب کہا جاتا ہے، خلیج فارس میں جا گرتا ہے۔ چنانچہ قرنہ، البطاح کے منبع سے کچھ آگے شط العوراء ہی پر واقع تھا، جس کے بعد شہروں اور دیہات کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ پھر وہ خشک زمین جو ان دو دریاؤں اور دریائے کارون کی جمع شدہ گاد سے بنی تھی عہد عباسیہ کے اوائل میں (موجودہ) آبادان تک چلی گئی تھی، مگر پھر جب اس کا سلسلہ اور آگے بڑھا تو اس بندرگاہ کا وجود ختم ہو گیا۔ آب پاشی کی متعدد نہریں (بشمول ان کے جو بصرے تکہ گئی تھیں، مثلاً معقل اور ائیلہ) اسی علاقے میں جو آج وسیع نخلستانوں اور دیہات سے بڑا ہے، دجلۃ العوراء سے نکلی گئی تھیں۔ خلفا کے بحری جہاز اسی دلدل کے ذریعے واسطے سے بھی کسی قدر آگے دجلے میں چلے آتے تھے۔

پھر جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، دریائے دجلہ نے اگرچہ قرون وسطیٰ سے اب تک ایک سے زیادہ علاقوں میں اپنی گزرگاہ تبدیل کی ہے، اور گو ہم اس کے نظام انتہا کا تصور بھی کر سکتے ہیں، کچھ اس عہد کے جغرافیہ نویسوں اور کچھ اس کے آثار کی بدولت، بایں ہمہ اس میں دوسری صدی ہجری/آٹھویں صدی عیسوی اور ساتویں صدی ہجری/تیرھویں

بلکہ ایک حد تک خود شہر کے لیے پانی بھی مہیا ہو جاتا تھا۔

دریائے فرات کے اس علاقے (کم از کم بیس میل) اور وسطی عراق کے ذرا نشیب کے قرب کی وجہ سے متعدد بڑی نہریں اس کا پانی لاتی ہوئی اس دریا سے نکلتی تھیں اور ان کا بجا کچھ پانی شہر بغداد اور ماڈرایا کے درمیان کئی مقامات پر دجلے میں گراتی تھیں۔ ان نہروں کی تفصیل یہ ہے: نہر العسلی (تضییاً نہ کہ بمعنی صفلاویہ)، صرصار اور ملک (آج کل کی ابو غریب اور رضوانیہ سے مشابہ)، گوتنا اور نیل؛ آخری نہر جلہ (اور آثار بابل) سے کچھ پہلے نکلتی اور (موجودہ) گوت سے قدرے شمال میں دجلے سے جا ملتی تھی۔ قرون وسطیٰ میں ان نہروں، دریا کی اصل گزرگاہ اور اس کے متوازی سلسلۃ نہروں میں آبادی نسبتاً گنجان تھی اور بہتے ہوئے پانی سے یا پانی کو باہر کھینچ کر کاشت کرتی تھی۔

ماڈرایا اس مقام کی نشاندہی کرتا تھا جہاں سے پہاڑ کی جانب اس دریا کی قرون وسطیٰ اور زمانہ حال کی گزرگاہوں میں زیادہ سے زیادہ فرق نمایاں تھا۔ عہد عباسیہ میں اس کی موجودہ گزرگاہ کو، جس کا راستہ آج کل کے علی الثربی، قلعة صالح اور عمارہ کے ساتھ ساتھ چلا گیا ہے، کوئی خاص اہمیت حاصل نہ تھی یا (تا آنکہ اس میں سیلاب نہ آتا) یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس کا وجود ہی نہ تھا۔ اصل دریا (موجودہ) دریائے جیحی یا غراف کی گذرگاہ کے نیچے یا اس کے معاذ میں قرون وسطیٰ کے عظیم، لیکن اب ناپید، شہر واسط اور جہاں آج کل جیحی، قلعة سنکر اور شطہ آباد ہیں ان سے ہٹ کر بہتا تھا۔ دریائے دجلہ کی موجودہ گزرگاہ میں تبدیلی (جو غالباً زمانہ قبل از اسلام میں بھی ہوتی رہتی تھی)، جس سے غراف کو اگرچہ نسبتاً بہت کم، بایں ہمہ پانی کی اچھی خاصی مقدار مل جاتی تھی، عہد عباسیہ اور اس کے بعد سے بتدریج ہوتی

ہیں، مثلاً الزاب الاکبر پر، نیز وادی ثرنا کو کام میں لانے ہوئے۔ البتہ اس دریا کی بلند اور نشیبی سطح میں پانی کے اخراج میں جو بہت زیادہ فرق ہے اور جو بغداد میں چھ ہزار سے سو مکعب میٹر فی سیکنڈ، بدلتا رہتا ہے اور جس کی وجہ شمال میں برف کا موسمی بگھلاؤ اور سرما و گرما کی بارشیں ہیں، اور دریا کے طاس میں سیلاب کی عدم گنجائش کے باعث اس سے دجلے کو قابو میں رکھنا اور استعمال میں لانا خاص طور پر مشکل ہو گیا ہے۔ رہی دجلے سے میکانیکی پمپ کے ذریعے آبپاشی کی مزید اور اپنی جگہ پر اہم توسیع، سوہ ۱۳۴۶ھ/۱۹۲۷ء سے اس عہد کا احایاں کارنامہ ہے۔

دجلے میں معمولی یا ادنیٰ قسم کی مچھلیاں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔

موجودہ زمانے میں از سنہ قدیم اور قرون وسطیٰ کی طرح، ہر طرح کی کشتیاں جیسی کہ ماضی سے آ رہی ہیں، مثلاً منڈھے ہوئے بیڑے جو موصل یا زاب اکبر و اصغر سے پانی کے بہاؤ کی سست چلتے ہیں، رال سے لپی ہوئی لٹ بند ناویں، بادبانی کشتیاں اور ہر جسامت کے جہازوں سے چلنے والے ڈونگے استعمال میں آ رہے ہیں؛ جن میں ۱۲۵۶ھ/۱۸۴۰ء سے اب تک بغداد اور بصرہ (اور کبھی کبھی اور خطرناک طور پر بغداد اور موصل) کے درمیان دھانی جہازوں، موٹرکشتیوں اور ناؤوں کا متواتر اضافہ ہوتا رہا ہے۔ پھر عام مسافروں اور مال برداری کے لیے جہازوں کی آمد و رفت کے علاوہ، دھانی دریائی بیڑوں نے دونوں عالمگیر جنگوں میں بڑی قابل قدر خدمات انجام دیں۔ بایں ہمہ اس دریا میں کشتی رانی کا معاملہ نہایت کٹھن ہے۔ ریل کا سلسلہ، جس کا ابتدائی حصہ (بغداد تا سامرا) جرمنوں نے تیار کیا تھا اور جو ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء میں آمد و رفت کے لیے کھولا گیا تھا، اب دریا کے دائیں کنارے کے ساتھ ساتھ بغداد سے موصل تک

صدی عیسوی کے درمیان عرصے میں مستقل تبدیلیاں ہوئی رہیں، یہاں تک کہ مؤخر الذکر کے وسط میں وہ مغول کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو گیا۔ پانی کے رخ اور بہاؤ، اس کی بندش اور نہروں میں اس کے اخراج کا معاملہ ہر صدی بدلتا رہا۔ ان میں بیشتر موسمی سیلابی ندیاں تھیں بغیر کسی سر آہ گاہ کے، اور معلوم ہوتا ہے ہر سال جو تباہ کن سیلاب آتے ان کی روک تھام کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ تاہم دجلے کی آب پاشی اور شمال کی بارانی فصلوں سے بلاشبہ اتنی آبادی کو خوراک مہیا ہو جاتی تھی جو آج کل کی آبادی سے شاید تین گنا زیادہ تھی، اور جو شہروں اور دیہات کے جم غفیر میں رہتی تھی، جو اب فراموش ہو چکے ہیں۔ ہولاگو خان (۶۵۹ھ/۱۲۵۸ء) کی لائی ہوئی تباہی کے بعد صدیوں کی بد نظمی، آلام و مصائب اور جمود سے حالات جس طرح بد سے بدتر ہوئے گئے ان میں یہ سارا دریائی نظام بگڑ کر سراسر بے قابو ہو گیا۔ چنانچہ پھر اس مسئلے پر سنجیدگی سے چودھویں صدی ہجری/یسویں صدی عیسوی میں غور ہوا۔

جدید عراقی حکومتوں کی مساعی صرف اس نظام آبپاشی پر مرکوز ہیں جن سے مقصد یہ ہے کہ دریا کی گزرگاہ مستقل ایک جگہ قائم رہے، اور اردگرد کا علاقہ، حتیٰ کہ ایک حد تک بغداد بھی سال کے سال آنے والے اور حد درجہ تباہ کن سیلابوں سے محفوظ رہے، مزید یہ کہ گرمیوں میں آب پاشی کے لیے پانی کا ذخیرہ کر لیا جائے اس لیے کہ وسطی اور جنوبی عراق میں بجز ربیع کی فصل کے، ساری کاشت کا دار و مدار انہیں نہروں پر ہے۔ اس سلسلے میں کئی ایک بند آب تعمیر کیے گئے ہیں، بالخصوص کوث کا بند ۱۲۵۷ھ/۱۹۳۸ء میں، جس سے دریائے حبی (غراف) میں پانی کی مناسب رسد پہنچائی جاتی ہے۔ اسی طرح کئی اور بند، نیز طغیان کے اخراج کے لیے متعدد انتظامات بڑے پیمانے پر کیے جا رہے ہیں، یا زیرِ تجویز

The Exped. for the survey of the : Chenev (۲۵)
(۲۶) : ۱۳ تا ۱۴ : ۱۰ *Revers Euphr. and Tigris*
ج : *Records of the Bombay Government* : Rich
Vom : M. Von Oppenheim (۲۷) : ۱۸۵۷ تا ۱۸۶۳
تا ۱۹۲ : ۲ : *Mittelmeer Zum Persischen Golf*
: Sachan (۲۸) : ۳۱۹ تا ۲۸۲ : بعد : ۲۵۲ : ۲۳۵
Müller Simonis et : (۲۹) : *Am Euphrat V. Tigris*
L' Armenie, le Kurdistan et la : Hyernat
(۳۰) : ۳۸۹ تا ۳۲۳ : م : *Mesopotamie* (۳۱)
: ۳۰۷ تا ۳۲۷ : ۱ : *Armenien* : Lehmann Haupt
Archäol. Reise im Euphrate-v. : Sarro v. Hevzfeld
Tigris-Gebiet ج : ۱۰

([S. H. L. ONGRIGG و R. HARTMANN])

* **دجلہ** : رک بہ کارون۔

* **دخشور** : صوبہ جیزہ میں ایک مقام، جو قاہرہ

سے تقریباً چالیس کیلو میٹر جنوب کی طرف، دریائے نیل
کی مغربی جانب صحرا کے کنارے پر واقع ہے۔ قدیم
سلطنت کے ابتدائی خاندانوں کے زمانے کے بنے ہوئے کچھ
اہرام اور ایک قبرستان موجود ہے۔ پراعنہ کے عہد کے
آثار قدیمہ کے یہاں موجود ہونے کا ذکر الہروی اور
القریزی نے کیا ہے، لیکن ان کی صحیح تفصیل بیان
نہیں کی۔ ابو صالح نے لکھا ہے کہ یہاں ایک کلیسا
اور اہم عیسائی خانقاہ بھی ہے۔ آج کل یہ ایک چھوٹا
سا گاؤں ہے جو کوئی اہمیت نہیں رکھتا، اس کا نام
معض اس کے اہرام کی وجہ سے مشہور ہے۔

مآخذ : (۱) ابن شتی : م ۱۳۸ : (۲) الہروی :
زیارات : م ۳۹ : (۳) ابو صالح : فرق : م ۵۳ : یا قوت :
۲ : ۶۲۳ : (۵) القریزی : م ۱۲۰ : ۲ : ۳۰
Maspero (۷) : ۱۲۲ : (۶) علی پاشا : ۱۱ : ۱۹۷ : (۷)
Matériaux pour servir à la géographie de : Wiet و
'l' Egypte م ۹۳ ۔

(G. WIET)

چلا گیا ہے اور موصل سے شمال کی جانب اس کی ایک
شاخ مغرب کی طرف مڑتے ہوئے ترکی ریلوے سے مل جاتی
ہے۔ بڑی بڑی مڑکیں، جو عہد عتیق کی پگڈنڈیوں کی
جگہ بنی ہیں، دریا کے ساتھ ساتھ متعدد علاقوں میں چلی
گئی ہیں۔ یہ دریا ترکی میں دیار بکر، سیرت، اور سارڈین
کے صوبوں سے گذرتا ہے اور عراق میں موصل، اربیل،
بغداد، کُوت العمارہ، اور بصرے کے صوبوں سے ۔

مآخذ : (۱) الاسطخری : ۱ : ۷۲ تا ۷۷ : ۹۰ :
(۲) ابن حوقل : م ۱۳۸ : ۱۶۲ : (۳) القنسی : م ۲۰ :
۱۲۳ : ۱۳۶ : ۱۳۸ : (۴) ابن خردادبہ : م ۱۷۵ : (۵)
B G A : ۷ : ۹۳ : ۹۶ : (۶) المسعودی : التنبیہ : م
۵۲ : بعد : (۷) ابن سرائیون : در *JRAS* : ۱۸۹۵ : م ۱ تا
۲۵۵ : ۷ : ۳۱۵ : (۸) المسعودی : مروج : ۱ : ۲۲۳ :
تا ۲۳۰ : (۹) یا قوت : ۲ : ۵۵۱ : بعد : و سوانح کثیرہ : (۱۰)
ابوالفداء : تقویم : م ۵۳ تا ۵۵ : (۱۱) التبریشی (طبع
Mehren) : م ۹۵ تا ۹۸ : (۱۲) الفزونی (طبع فسطاط) :
The Lands of the : Le Strange (۱۳) : ۱۷۸ : ۱ :
Eastern Caliphate : م ۲۴ تا ۱۱۵ : (۱۴) M. Streck :
Die alte Landschaft Babylonien : لائن : ۱۹۰۱ : (۱۵)
Memnon : B. Herzfeld : ۸۹ : ۱ : ۱۳۳ تا ۲۱۲ : ۲۳۸ :
The Irrigation of Mesopotamia : W. Willcocks (۱۶)
قاہرہ : ۱۹۰۵ : (۱۷) J. D. Atkinson و A. Sousa :
Iraq Irrigation handbook : بغداد : ۱۹۳۳ - ۱۹۳۶ :
The regime of the rivers : M. Ionides (۱۸)
Euphrates and Tigris : لندن : ۱۹۳۷ : (۱۹)
Iraq 1900 to 1950 : S. H. Longrigg : لندن : ۱۹۵۳ :
(۲۰) دائرة المعارف الاسلامیہ : مصر : ۹ : ۱۳۸ : (۲۱)
The Restoration of the Ancient : Willcocks
Irrigation works on the Tigris : قاہرہ : ۱۹۰۱ : (۲۲)
البستانی : دائرة المعارف : بیروت : ۱۸۸۳ : ۷۰ : ۶۳۳ :
Geogr. v. Gesch. des alten Orients : Hommel (۲۳)
م ۲۹۳ تا ۲۹۸ : (۲۴) *Erdkunde* : Ritter : ۱۱ : ۱۱ تا ۱۱

سوڈان میں ہم عصر مہدوی خروج کے بارے میں مصنف کے نظریے پر روشنی ڈالنے کی بنا پر قابل ذکر ہے، اور ان کی تاریخ مکہ، خلاصۃ الکلام فی بیان اہرام البلد الحرام، جو ۱۰۹۵ھ/۱۶۸۳ء تک السنجاری کی تاریخ (براکمان، ۲: ۵۰۲) سے ایک مختصر اقتباس ہے، آئندہ دو صدیوں میں مکہ معظمہ کے واقعات کے لیے ایک بہت قیمتی ماخذ ہے، جن میں وہابیوں کا عروج، حجاز پر ان کی پہلی حکومت، ان کے خلاف "اشراف" کی جنگ، محمد علی پاشا کا ترکی حکومت کو بحال کرنا اور ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۸ء میں جدے کے فسادات شامل ہیں۔ برسر حکومت اشراف کے خاندان سے دوستی کی بنا پر دحلان کو بہترین تحریری و زبانی معلومات تک رسائی حاصل تھی۔ فتووں کا دینا بھی بلاشبہ ان کے فرائض منصبی کا ایک اہم حصہ تھا اور ان کے بعض اہل علم شافعی مذہب کے مروجہ نصاب میں شامل کر لیے گئے؛ تاہم اپنے آخری برسوں میں انہوں نے روزمرہ کا یہ کام ایک نائب یا امین الفتوی سید محمد سعید بابصیل کے سپرد کر دیا تھا (براکمان، ۲: ۶۵)؛ مکملہ، ص ۸۱۱)۔ Snouck Hurgronje نے ان کا ایک مفصل نمائندہ پیش کیا ہے جو ان کی شخصیت اور پس منظر سے قریبی واقفیت پر مبنی ہے۔

ماخذ: (۱) Verspr. : Snouck Hurgronje (۱) : ۱۲۲ تا ۶۵ : ۳ 'Geschr. (مع دو عدد اقتباس از خلاصۃ الکلام)؛ (۲) براکمان، ۲: ۶۳-۶۵ : ۲ : ۸۱ : بعد؛ (۳) عبد العزیز الکتانی : فہرہ من الفہارہ، ۱: ۲۹۰ تا ۲۹۲ : (۴) مرکس : معجم المطبوعات، ص ۹۹۰ تا ۹۹۲ : (۵) Bijdr. t. d. Taal land en Volleenkunde van Neder 'Z. Indie، ۲: ۳۳۳ تا ۳۰۵ : (۶) دائرة المعارف الاسلامیہ مصر، ۹: ۱۷۱ : بعد؛ (۷) خیر الدین الزرکلی : الاعلام، ۱: ۱۲۵ : (۸) نظم الدرر، مخطوطہ؛ (۹) جرجی زیدان : تاریخ آداب اللغة العربیة، ۴: ۲۸۸۔

(J. SCHACHT)

دحلان : سید احمد بن زبئی جو البیہودین صدی عیسوی کے شروع کے قریب مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے، ۱۲۸۸ھ/۱۸۷۱ء سے اپنے آبائی شہر میں شافعی جماعت کے مفتی اور شیخ العلما (مجلس علما کے صدر لہذا معلمین حرم کے سرگروہ) رہے۔ جب شریف اعظم عون الرفیق، ترکی نائب عثمان پاشا سے کسی مخالفت کی بنا پر مکہ معظمہ کو چھوڑ کر مدینہ منورہ چلے گئے تو دحلان نے بھی اس اقدام میں ان کی تقلید کی، لیکن اس کے بعد جلد ہی سفر کی تھکن سے ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۶-۱۸۸۷ء میں وہ انتقال کر گئے۔ اپنی زندگی کے آخری برسوں میں دحلان نے ایک مصنف کے طور پر خصوصیت سے بہت سرگرمی دکھائی۔ انہوں نے نہ صرف ان روایتی اسلامی علوم کو اپنی تحریر کا موضوع بنایا جن کا مطالعہ ان کے زمانے میں مکہ معظمہ میں کیا جاتا تھا، بلکہ بعض وقتی طور پر زیر بحث مسائل پر بھی متعدد رسائل لکھے، اور مکہ معظمہ میں انیسویں صدی عیسوی میں تاریخ اویسی کے واحد نمائندہ بن گئے۔ روایتی موضوعات پر ان کی سب سے کامیاب تصانیف شرح الآجرومیة اور السیرۃ النبویة [السیرۃ الدحلانیة یا السیرۃ الزینیة] تھیں، یہ دونوں متعدد بار طبع ہوئی ہیں۔ ان کی تصنیف الدرر السنیة فی الرد علی الوہابیة وہابیوں کے موافق و مخالف جوابی تصنیفوں اور ان تصنیفوں کے جوابات کے ایک سلسلے کی محرک بن گئی۔ سلیم آفندی کی مخالفت میں ان کے مناظرات، جو مکہ معظمہ کے ان دو ترکی مذ مقابل شیعوں میں سے ایک تھے جن کا انڈونیشیا کے نقشبندیوں کی قیادت کے لیے ایک دوسرے سے مقابلہ تھا، اور اسی طرح مکہ معظمہ کے صاحب علم و فضل شیخ محمد حسب اللہ کی مخالفت میں جو دانشوری میں شہرت کے اعتبار سے ان کے ہم پلہ تھے، ذاتی اغراض سے خالی نہ تھے۔ تاریخ پر ان کی تصانیف میں الفتوحات الاسلامیة جو مصنف کے زمانے تک کی مسلم فتوحات کی تاریخ ہے،

- ۲۲۱ : (۲) محمد بن حبيب : المسخير ، ص ۶۵ ، ۷۵ ، ۹۰ ، ۹۳ ، ۱۲۱ : (۳) ابن قتيبة : المعارف ، ص ۱۱۳ : (۴) ابن سعد : الطبقات ، ۱/۳ : ۱۴۳ ، ۲/۳ : ۵۲ ، ۳/۳ : ۱۸۳ تا ۱۸۵ ، ۸ : ۳۶ ، ۱۱۳ : ۱۱۵ : (۵) الطبري ، ص ۱۷۵ : (۶) ابن حبان : التمهيد ، ص ۲۱۵ ، ۲ : ۱۸۳ ، ۳ : ۲۳۹ : (۷) ابن حبان : التمهيد ، ص ۲۶۲ ، ۲ : ۱۰۷ : (۸) ابن هشام : سيرة محمد (اشارية) : (۸) ابن عبد البر : الاستيعاب ، بذي لمادة : (۹) البكري : المعجم ، ص ۵۳۰ : (۱۰) الاغانى ، ۶ : ۹۵ : (۱۱) التتوي : التهذيب ، ص ۲۳۹ تا ۲۴۰ : (۱۲) ابن حجر : الاصابة ، عدد ، ۲۳۹ : (۱۳) Caelani : Annall ، ص ۳۵۸ : (۱۴) Zährten : I. Goldziher ، ۱۷۸ تا ۱۷۹ : (۱۵) Das Leben Muhammeds : Buhl ، ص ۲۳۵ : (۱۶) Geschdes Qor. ، ۲۲ : ۱ تا ۱۸۶ : (۱۷) H. Lammens : (۱۸) Gaudefroy : (۱۹) Mahomet : Demombynes ، ص ۱۹۵ : (۲۰) Le Prophète de l'Islam محمد حميد الله ، ص ۱۸۰ : (۲۱) جليلين ، اشارية (مع امدادی مآخذ) : (۲۲) البلاذري : انساب الاشراف ، در مخطوطة پيرس ، ص ۳۰۰ : (۲۳) مطبوعة مصر ، جلد ۱ ، (بمدا اشارية) : (۲۴) السماني : الانساب ، در مخطوطة پيرس ، ص ۸۵ : (۲۵) دائرة المعارف الاسلامية ، مصر ، ۶ : ۱۷۰ : (۲۶) الذهبي : سير اعلام النبلاء ، مصر ، ۱۹۵۷ : ۲ : ۳۹۶ تا ۳۹۹ : (۲۷) ۱۰۵ : ۱۹۹ : ۳ : ۲۲۸ : (۲۸) تهذيب ابن عساکر ، ۵ : ۲۷۸ : (۲۹) خير الدين الزركلي : الاعلام ، ۳ : ۱۳ : (۳۰) ابن حزم : جمهرة انساب العرب ، مصر ، ۱۹۶۲ : ۱ : ۳۵۷ : (۳۱) وهي مصنف : سير اعلام النبلاء ، ص ۲۹۲ .

H. LAMMENS و H. PELLAT (و اداره)

* دخان : رک بہ تثنی .

* الدخان : (ع جمع : أدخنة اور دواخن) ،

قرآن کریم کی ایک مکی سورت کا نام ، مگر آیت ۱۵ کے بارے میں بعض اہل علم کا قول ہے کہ یہ مدینے میں نازل ہوں (روح المعانی ، ۲۵ : ۱۱۶ :

* دحیہ : بن خلیفہ [بن قروم] الکلبی ، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی اور مالدار تاجر تھے ۔ ان کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ بڑے حسین و جمیل تھے اور مدینہ منورہ میں ان کے حسن و جمال کے چرچے تھے ۔ حضرت جبریل علیہ السلام ان کی ضرورت اختیار کر کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا کرتے تھے ۔

[کئی غزوات میں شرکت کی] غزوہ یرموک میں فوج کے ایک چھوٹے دستے کی کمان ان کے ہاتھ میں تھی ۔ ۵۵ میں انہیں ہرقل کے پاس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مکتوب گرامی پہنچانے کا کام سپرد کیا گیا تھا ، جس میں ہرقل کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی گئی تھی ۔ [اس وفد کے سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ حضرت دحیہ الکلبی نے اپنا منصب بیان کرنے کے لیے اپنے آپ کو اللہ کے رسول کا پیغامبر اور ایلچی (رسول رسول اللہ) قرار دیا ۔ یہ خط بعض دوسرے خطوں کے ساتھ اب تک موجود ہے اور اس کی نقول بصورت فوٹو دستیاب ہیں اور اس کا مضمون بعینہ وہ ہے جو صحیح بخاری میں درج ہے ۔ خط کا آغاز میں محمد رسول اللہ سے کیا گیا تھا جو قیصر روم کے دربار میں ناپسند کیا گیا ۔ البتہ یہ بات دلچسپی سے غالی نہیں کہ شاہ روم ہرقل نے حسب دستور ہادی (انسف) کو اپنے دربار میں طلب کر کے اسے خط سنایا تو ہادی خط سن کر کہنے لگا کہ بخدا یہ اللہ کا وہی رسول ہے جس کے بارے میں حضرت عیسیٰ اور حضرت موسیٰ نے پیشگوئی کی تھی ۔ باین ہمہ شاہ روم نے آپ کی رسالت کو تسلیم نہ کیا ، کیوں کہ اسے ڈر تھا کہ اس کی حکومت چھن جائے گی اور رومی اسے قتل کر دیں گے (الذہبی : سير اعلام النبلاء ، ۲ : ۳۹۷) ۔ [آپ سے تین حدیثیں مروی ہیں (دیکھیے ابن حزم : اسماء الصحابة الرواة ، در جوامع السيرة ، ص ۲۹۲) ۔ مآخذ : (۱) الجاحظ : حیوان ، ۱ : ۲۹۹ و ۶۰

ہو گئے ہیں۔ اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۃ الدخان کی آیات عدد دس سے ۱۵ تک تلاوت فرما کر دعا کی، تب بارش ہوئی اور قحط ختم ہوا۔ یہ قحط اس وقت شروع ہوا تھا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مٹھے ہی میں تھے اور آپ کے مدنی دور میں ختم ہوا۔

سورۃ الدخان کے مضامین اجمالاً یہ ہیں کہ سب سے پہلے نزول قرآن کا ذکر ہے کہ یہ کتاب ہدایت و رحمت با برکت رات (= لیلۃ الندر) میں نازل ہونا شروع ہوئی۔ پھر کفار کو دُخان سب سے ڈرایا گیا ہے اور ساتھ ہی مسلسل مصائب کے باوجود کفار کے عدم ایمان کا ذکر ہے، اس کے بعد حضرت موسیٰ اور فرعون کا قصہ بیان کر کے کفار کو عبرت دلائی گئی ہے کہ اہل ایمان ہمیشہ نجات پاتے ہیں اور کافر ہمیشہ ہلاکت سے دو چار ہوتے رہے ہیں، پھر مشرکین کے انکار بعثت کا ذکر کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر دلیل پیش کی گئی ہے اور سب سے آخر میں گنہگاروں و مجرموں کے لیے عذاب و مصائب اور متی لوگوں کے لیے انعام و اعزاز کا ذکر کر کے ایک دفعہ پھر قرآن کریم کی حکمت بالغہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے (تفصیل کے لیے دیکھیے تفسیر الم راغی، ۲۵: ۱۳۹: ف ظلال القرآن، ۲۵: ۱۰۶: [تفسیر مواہب الرحمن، جلد ۲۵])۔

ابوبکر ابن العربی الاندلسی نے احکام القرآن (۳: ۱۶۷۸) میں بیان کیا ہے کہ سورۃ الدخان میں چار آیات (۲، ۳، ۴، ۵) ایسی ہیں جن سے آٹھ قسم کے مختلف شرعی احکام اور فقہی مسائل مستنبط ہوتے ہیں۔

اس سورت کے فضائل کے بارے میں کئی ایک اور احادیث وایہ ہوئی ہیں۔ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے رات

البحر المحيط، ۸: ۳۰: فتح البیان، ۸: ۳۶۶: التفسیر المظہری، ۸: ۳۶۷: [عدد تلاوت ۳۳، عدد نزول ۶۶ ہے]۔ یہ سورۃ الزخرف [رک بان] کے بعد اور سورۃ الباقیہ سے قبل نازل ہوئی جب محمد بن شہاب الزہری: تنزیل القرآن، ص ۲۷، الکشاف، ۳: ۲۶۹: سورۃ الدخان سات حوامیم (رک بہ حم) سورتوں میں سے پانچویں سورت ہے اور اس میں ۵۹ آیات اور تین رکوع ہیں (حوالہ سابق: لیز روح المعانی، ۲۵: ۱۱۹)۔ اس کا نام آیت ۱۰ (فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ) (اس دن کا انتظار کیجیے کہ آسمان کی طرف ایک نظر آنے والا دھواں پیدا ہو) سے ماخوذ ہے۔ مفسرین نے اس دُخان سے مراد وہی دھواں لیا ہے جو حدیث نبوی کی رو سے قیامت کی دس علامات میں سے پہلی علامت ہے: ابن قتیبہ وغیرہ علمائے غریب القرآن سے منقول ہے کہ دُخان شدت خوف اور قحط سالی کو بھی کہتے ہیں (تفصیل کے لیے دیکھیے تفسیر الم راغی، ۲۵: ۱۲۱: فتح البیان، ۸: ۳۶۶: روح المعانی، ۲۵: ۱۱۶: التفسیر المظہری، ۸: ۳۶۹: تفسیر البحر المحيط، ۸: ۳۰)۔

[صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن مسعود نے مروی ہے کہ جب اہل مکہ شہرارت میں بہت بڑھ گئے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی کہ الہی ان یر یوسف کے صہد کی طرح کا قحط مسلط کر۔ اللہ تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی اور قریش مکہ قحط سالی میں مبتلا ہو گئے اہل مکہ کے لیے یہ زمانہ قحط بڑی تکلیف اور مصیبت کا تھا، انہوں نے اس دوران میں ہڈیاں، اور مردار تک کھائے۔ حدیث یہ تھی کہ کوئی شخص آسمان کی طرف دیکھتا تھا تو بھوک کی شدت کی وجہ سے اسے فضا میں ایک دھواں سا دکھائی دیتا تھا۔ آخر اہل مکہ کی طرف سے ابوسفیان مدینے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حاضر ہوا اور النجاشی کی کہ ہم لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ سے بارش کی دعا کیجیے، ہم ہلاک

کے وقت سورہ "حَم الدخان" کی تلاوت کی اس کے لیے ستر ہزار فرشتے دعائے مغفرت میں مشغول رہیں گے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ جس نے جمعرات کو اس سورت کی تلاوت کی اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں ایک گھر تعمیر کرے گا۔ حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سورت کو نماز میں پڑھا کرتے تھے (الکشاف، ۳: ۲۸۳، روح المعانی، ۲۵، ۱۱۰: فتح البیان، ۸: ۴۴۱)۔

مآخذ: (۱) ابن منظور: لسان العرب، بذیل مادہ دَخَن: (۲) الزہری: تزییل القرآن، بیروت ۱۹۶۳ء: (۳) ابو حیان النرناطی: تفسیر البحر المحیط، ریاض، بلا تاریخ: (۴) ابن العربی: احکام القرآن، قاہرہ ۱۹۵۸ء: (۵) ثناء اللہ پانی پتی: التفسیر المظہری، دکن، بلا تاریخ: (۶) الزمخشری: الکشاف، بیروت بلا تاریخ: (۷) تفسیر: محمود الاکوسی: روح المعانی، قاہرہ بلا تاریخ: (۸) المراغی: تفسیر المراغی، قاہرہ ۱۹۶۶ء: (۹) صدیقی حسن خان: فتح البیان، قاہرہ بلا تاریخ: (۱۰) سید قطب: فی ظلال القرآن، بیروت ۱۹۶۸ء: (۱۱) جمال الدین القاسمی: تفسیر القاسمی: (۱۲) محمد امیر علی: مواہب الرحمن، ج ۲۵، نولکشور۔

(ظہور اظہر [وادارہ])

* دَخِيل: لغات (لسان العرب، تاج العروس وغیرہ) میں اس کے ایک تو عام معنی ہیں: "اندرونی، داخل، قریبی"، اور دو مخصوص معنی: (۱) مہمان، جسے حفاظت کا یقین دلایا جائے، (۲) اجنبی، راہی، مسافر، دوسری نسل کا آدمی۔ مخصوص معنی میں سے پہلا تو عام صحرائی قانون کے دستور سے تعلق رکھتا ہے، جس کی رو سے ہر پناہ مانگنے والے شخص کو روایتی طریقوں کے مطابق پناہ کی ضمانت حاصل ہوتی ہے۔ گو یہ تصور ہر زمانے میں موجود رہا ہے لیکن اسے کبھی اسلامی شریعت میں داخل نہیں کیا گیا، جہاں اس مفہوم کو ادا کرنے والی کوئی اصطلاح موجود نہیں۔ جب اس کا اطلاق

عملی طور سے کیا جائے تو یہ دستور عملی مہمان نوازی کے پیچیدہ نظام کے عناصر پر مشتمل نظر آتا ہے، جس میں یہ نیک وقت رائے عامہ کے نقطہ نظر سے "دخیل" کے حقوق اور گھروں، بنی پناہ گزینی کے ایک بہت قدیم قانون کا امتزاج موجود ہے، جس کی توثیق تمام سامی دنیا کے رواج کی بنا پر ہوتی ہے [رک بہ چوار]۔ اس ضمن میں خصوصیت کے ساتھ دیکھیے مفصل تجزیہ از

پیرس ۱۹۴۸ء، ص ۲۰۲ تا ۲۲۰، اور اسی موضوع پر Burckhardt کی یادداشت در Notes on the Bedouins، لندن ۱۸۳۱ء، ۱: ۳۲۹ تا ۳۳۸؛ نیز دیکھیے Layard: Narrative of a second expedition to Assyria، لندن ۱۸۶۷ء، باب ۶، ص ۱۳۹ تا ۱۶۲، اور apud: Caskei: Die Beduinen: Oppenheim، لائپزگ ۱۹۳۹ء، ۲۹: ۱۰۰۔

اس آخری معنی سے لسانیات کی ایک فنی اصطلاح کے طور پر کئی معنوں کا اشتقاق کیا گیا ہے، جنہیں ماہرین لغت متروک خیال کرتے ہیں: ان میں سے خاص خاص معنی یہ ہیں: (۱) کسی غیر زبان کا لفظ جسے عربی نے مستعار لے لیا ہو، جیسے "درہم"، اور (۲) علم عروض کی اصطلاح میں قافیے کے حرفوں میں سے وہ حرف متحرک جو 'روی' [رک بہ عروض] اور حرف تائیس یعنی الف ساکن کے درمیان واقع ہو، جیسے 'صابر' اور 'شاکر' میں 'ب' اور 'ک'؛ دخیل کی پابندی لازم نہیں۔ چنانچہ 'مائل' کا قافیہ 'دل' ہو سکتا ہے [رک بہ قافیہ]۔

(J. LECERF)

دَدَل اوغلو: عاشق موسیٰ اوغلو ولی، انیسویں

صدی کا ترکی لوک گیت لکھنے والا شاعر (۱۷۹۰ء تا ۱۸۷۰ء) انصار قبیلے سے تھا، جس کی جائے سکونت جنوبی آناتولی میں واقع کوہ طاوروس (= طوروس) میں تھی۔ اس کا باپ بھی شاعر تھا اور اس نے بھی اپنا مخلص (تخلص) اپنے خاندان کے نام ہی سے اخذ کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ کچھ عرصے تک دَدَل اوغلو

مجموعہ سی' ج ۱: ۱۹۳۸ء: (۴) کو پرولوزادہ محمد
نواد: اون بدنجی عصر ساز شاعر لارندن قایقچی قل مصطفیٰ
و گنج عثمان حکایہ سی' استانبول: ۱۹۳۰ء: (۵) خالد بایری:
خلق بلگیسی خبرلری' ۱۹۳۳ء: (۶) علی رضا: جنوب دہ
ترکمان اویماقلری' انفر: ۱۹۳۳ء: (۷) سعد الدین نرہت
ارغون: ترک خلق ادبیاتی انٹولویسی: (۸) ملہ طوروس:
دلد اوغلو' ادنہ: ۱۹۳۰ء: (۹) جاہد اوزتلی: قور اوغلو
و دلد اوغلو' Varlık Yayınları' استانبول: ۱۹۵۳ء:
(۱۰) خالدہ ہوشگور: خلق ادبیاتندہ قہرمانلک تور کولری'
استانبول یونیورسٹی لائبریری' استعانی مقالہ ۱۱۲۸
(غیر مطبوعہ): (۱۱) سیحہ قراچہ بی: دلد اوغلو'
استانبول یونیورسٹی لائبریری' استعانی مقالہ ۱۷۵۲
(غیر مطبوعہ)۔

(A. KARAHAN)

ددو: (=دبدو)، ایک قوم جو پانچ چھوٹی
چھوٹی آبیری قفقازی مسلمان قوموں پر مشتمل ہے اور
جس کی مجموعی آبادی ۱۹۵۵ء کے تخمینے کی رو سے
اٹھارہ ہزار کے قریب ہے۔ نسلی اعتبار سے وہ آلدی
[رک بان] اور آوار [رک بان] قوموں سے ملنے جاتے ہیں
اور گرجستان کی سرحد کے قریب وسطی داغستان کے
اونچے اونچے اور دشوار گزار خطوں میں رہتے ہیں۔
ان میں امتیاز کرنا ضروری ہے:

- ۱۔ اصلی ددو (تسر آستہ)، جن کی تعداد
۷۰۰ کے لگ بھگ ہے اور اوری - تسکاس کی بالائی
حدود کے ساتھ ساتھ چھتیس اولوں (aw) میں منقسم ہیں۔
- ۲۔ یزتہ (کیچی، کپچوٹی، پشنے، خول)، ددو
قوم کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ لوگ (۱۹۲۶ء میں
۲۵۰۰ اور ۱۹۳۳ء میں ۲۵۸۰) جو ضلع تارتہ میں
یزتہ، خوجر - خوتہ اور تللد میں آباد ہیں۔
- ۳۔ خورشی (گون)، ۱۹۲۰ء میں ۱۵۶۱ اور
۱۹۳۳ء میں ۱۶۱۳ - اوری تسکاس کی بالائی حدود
میں پانچ اولوں میں آباد ہیں۔

نے دیہات میں امام کی حیثیت سے اور قبائلی سرداروں
کے منشی کے طور پر کام کیا۔ اس کے قبیلے کے خلاف،
جس نے چبری بھرتی یا لگان برداشت کرنے پر رضامند
نہ ہونے کی وجہ سے بغاوت کر دی تھی، حکومت کی
کارروائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے دیگر افشاریوں کے
ساتھ سیواس کے صوبے میں عزیزہ کے قریب واقع سندل
نام گاؤں میں منتقل کر دیا گیا (۱۸۶۶-۱۸۶۸ء)۔
اس بات کی تعین دشوار ہے کہ یہ بیان کس حد تک
حقیقت پر مبنی ہے کہ آخر عمر میں وہ چقور اووہ کے
علاتے میں واپس آگیا تھا، اور ادنہ کے بازاروں میں
اپنی نظمیں سنایا کرتا تھا۔ اس کی نظمیں اس کی زندگی
میں یکجا نہیں کی گئیں۔ ان میں لوک شاعری کی
سب بڑی اقسام موجود ہیں: مثلاً تورکو (turku)،
کوشمہ (koshma)، سمنی (semani)، ورسنی (varsaghi) اور
دستان (destan)۔ اس نے گنج عثمان کے قصے کو
متعدد نظموں میں مقامی رنگ دے کر آراستہ و پیراستہ
کیا اور اس کی دلکشی کو دوبالا کر دیا۔ اس کی
شاعری کا اسلوب تند و تیز اور جذباتی ہے، اور اس سے
ایک بے دھڑک، منجملے راست یاز اور حساس قبائلی کے
پاکیزہ اور مخلصانہ جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کی
نظموں کی عبارات سے اس معاشرے کی جنگجو ذہنیت
اور بدویت کا اندازہ ہو سکتا ہے، جس میں وہ زندگی بسر
کرتا تھا۔ وہ ترکی رزمیہ، غزلیہ اور دیہاتی (pastoral)
لوک شاعری اور داستان گوئی کے آخری زوردار نمائندوں
میں سے تھا، جو ددہ قورقود Dede Korkud کی تصنیف
کے وقت سے برابر چلی آ رہی تھی اور جس کی
نمایاں مثالیں قور اوغلو Kiroghlu اور قراچہ اوغلو
Karadja oglan ہیں۔

مآخذ: (۱) جودت پاشا: تذاکیر (تذکرہ)
ص ۲۶ تا ۳۰) استانبول انقلاب کتب خانہ سی' بھٹ مصنف:
(۲) وہی مصنف: پسر و ضلک، در TOEM ص ۸۷ تا ۹۳
۱۹۲۵ء: (۳) احمد شکاری: دلد اوغلو، خلق بلگیسی

۱۳۱۷: (۲) علی جوان: ممالک عثمانیہ تاریخ و جغرافیہ لغات، جلد ۱، استانبول ۱۳۱۳ھ: (۳) بادی احمد: ریاض بلدہ ادرنہ، جلد ۳ (بازید لائبریری، استانبول)۔

(M. TAYYIR GÖKBİLGİN)

دہ سلطان: ایک بڑے مذہبی تشدد شخص * کا لقب، جس کا نام بورکوچہ مصطفیٰ تھا، اور جو سلطان محمد اول کے وقت میں آناتولی میں ممتاز حبشیت رکھتا تھا (مزید معلومات کے لیے رک بہ بدرالدین ابن قاضی معاونہ)۔

(FR. TARSCHNER)

دہ قورقوت: ترکی بارہ کہانیوں کا ترکی مجموعہ، جس کے بیچ میں اشعار کے قطعات بھی ملے جاتے ہیں۔ یہ غز رزمیہ داستان کا قدیم ترین نمونہ ہے جو اب تک سلامت رہا ہے اور ترکی زبان کی ممتاز ترین یادگاروں میں سے ایک ہے۔ یہ کہانیاں ایک مرد دانا کے نام سے موسوم ہیں، جو ایک افسانوی کردار ہے اور ہر کہانی میں نمودار ہوتا ہے۔ وہ شعر گو مطرب ہے جو ہر ایک قصے کو دوبارہ نظم کرتا اور گاتا ہے اور سب کو اپنی نیک دعائیں دیتا ہے۔ وہ بڑے زور سے شمنی عہد کے سخن گو ساحروں کی یاد دلاتا ہے۔ اس کتاب کا فقط ایک ہی مخطوطہ موجود ہے اور وہ ڈریسڈن میں ہے (H. O. Fleischer: *Catalogus codicum man. orientalium*، عدد ۸۶)، جس کی نقل J. H. von Diez نے برلن لائبریری کے لیے کی تھی (A. Pertsch: *Die Hand. Verzeichnisse*، جلد ۶، عدد ۲۰۳)۔ von Diez کی تصانیف (Denkwürdigkeiten von Asien) جلد ۱، برلن - ہائے ۱۸۱۵ء ص ۳۹۹ تا ۴۵۷) اور باؤلڈ کی مصنفات (*Zapiski Vostochnago Otdeleniya, Imp. Russ. Arkh.*، جلد ۸، ۱۸۹۳ء، ص ۲۰۳ تا ۲۱۸) نیز جلد ۹، ۱۸۹۵ء، جلد ۱۱، ۱۸۹۸ء، جلد ۱۲، ۱۸۹۹ء، جلد ۱۵، ۱۹۰۳ء، جلد ۱۹، ۱۹۱۰ء)۔

مذکور ہیں: (۱) I.T. Zenker: *Türkisch-Arabisch*، لائبرگ ۱۸۶۶ء، بذیل مادہ: (۲) حسین قادری: *Türk hâgati*، استانبول ۱۹۲۸ء: (۳) Seyh Süleyman Buhârî: لغت چغتائی و ترکی عثمانی، استانبول ۱۹۲۸ء: (۴) ابوحنیف: کتاب الادراک لسان الاتراک، طبع A. Caferoğlu: (۵) (۴) ت ۳: ۵۰۶: (۶) (۷) اولیاء افندی: رحلت ترجمہ Hammer: ۱: ۲: ۲۱: ۲۵: ۲۹: ۲۱۳۔ (FR. TARSCHNER)

* **دہ آغاچ:** (دہ آغاچ)، جسے اب الیگزینڈروپولس Alexandropolis کہتے ہیں، تھریس کے بحر ایجہ کے ساحل کا شہر، جس کی بنیاد ۱۸۷۱ء میں بڑی روم ایلی ریلوے لائن کی شاخ کی تعمیر کے بعد ڈالی گئی۔ اس نے سمندر کے عقبی علاقے کی پیداوار کے نکاس کا راستہ ہونے کی وجہ سے سرعت سے ترقی کی، یہاں تک کہ ۱۸۸۳/۸۱۳۰ء میں اس نے ولایت ادرنہ کے ایک "سنجاق" ("متصرفتی") کے صدر مقام کی حیثیت سے دیمتوقہ کی جگہ لے لی۔ ۱۸۹۳ء میں دہ آغاچ کا "سنجاق" دہ آغاچ، انز (Inos) اور سفرولو کی "فضایا" پر مشتمل تھا۔ دہ آغاچ کی قضا میں تین ناحیے: قرہ چک، مکاری اور سیدارک اور اکتالیس گاؤں تھے۔ یہ صورت حال ۱۹۱۲-۱۹۱۳ء کی جنگ بلفان تک رہی، جس کے نتیجے میں یہ علاقہ ہاتھ سے جاتا رہا۔ شہر میں دو مسجدیں تعمیر ہوئیں، ایک ۱۸۷۷ء میں محلہ مصلح الدین میں اور دوسری عربی طرز پر، ۱۸۹۰ء میں محلہ حمیدیہ میں، جس کے صحن میں متصرف طرب زوئی حسین رشدی پاشا دن ہے۔ ۱۸۹۳ء میں دہ آغاچ میں کوئی پندرہ سو مکانات تھے۔ موضع فریالیجیری میں غازی اورٹوس بیک اور (قوجہ) داؤد پاشا [رک باں] کی بنائی ہوئی عمارات تھیں۔

مآخذ: *Edirne Sâlnâmesi*، برائے ۱۳۱۰ اور

، P. N. Boratov ، A. Inan ، M. F. Köprülü ، Faruk Sümer ، Walter Ruben ، Hamid Arash ، M. F. Kirzioglu ، وغیرہ شامل ہیں) بہ مسائل ایہی متنازع فیہ چلے آئے ہیں اور اب تک تاریخِ غالب اس کے مصنف ، موجودہ متن کی اصل، اس کے سورماؤں اور مقامات کے ناموں وغیرہ کی حقیقت کے متعلق اختلاف رائے ہے۔ جہاں تک موجودہ تحقیق پہنچی ہے اس کی بنا پر ہم محتاط رہ کر اسی قدر کہہ سکتے ہیں کہ ان کہانیوں کو ایک نامعلوم مصنف نے غالباً نویں صدی ہجری / پندرھویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں سنی سنائی روایات سے فراہم کیا اور انہیں چلا دیے کر مجموعہ مرتب کر دیا۔ اس کی کہانیاں زیادہ تر اوغز ترکوں کے مآثر پر مبنی دکھائی دیتی ہیں، جو وسط ایشیا میں ان کے اصلی وطن کی زندگی کے متعلق مسہور تھے؛ لیکن موجودہ متن میں یہ قصے شمال مشرقی آناتولی کے اوغز ترکی قبائل کی زندگی، ان کے شہزادے، پندر خان اور ان کے سردار سلورقازان بیگ، اس کی بیگم بورلہ خاتون، اس کے لڑکے آرر اور اس کے رضا کے کارناموں اور دوسرے ترک قبائل اور بحر اسود کے یونانیوں اور گرجستانیوں کے خلاف محاربات کا حال بیان کرتے ہیں۔ ان میں اسلامی ثقافت کا اثر کم اور سطحی سا ہے؛ اسلام سے پہلے کے عناصر بیان، اسلوب اور موضوعات میں آناتولی اور وسطی ایشیا کے عوامی ادب کے ساتھ گہری مشترکہ خصوصیات دکھائی دیتی ہیں۔ بعض کہانیاں (مثلاً پیرک) خفیف سی تبدیل شدہ صورت میں ترکی عوامی کہانیوں میں ابھی تک زندہ ہیں، اور دو کہانیاں (دپہ گوز اور دلی دمزل) ہونڈ، اساطیری کہانیوں (Cyclops اور Admetus) سے حیرت انگیز مشابہت رکھتی ہیں (تب C. S. Mundy : Polyphemus and Tepegöz، در BSOAS، ۱۸، ۱۹۵۶ء)۔

اور کلاسیکی سہلہ رفعت کے نسخے کی پہلی طباعت (کتاب دہ قورقوت علی لسان طائف اغوزان، استانبول ۱۳۳۲ء) برلن کے منقول نسخے پر مبنی ہیں، جو ڈریسڈن کے نسخے سے براہ راست نقل لے کر پہلی دفعہ طبع ہوئی، اس پر Orhan Şaik Gökay نے تاریخی مآخذ سے متعلق طویل مقدمہ بھی لکھا ہے (دیکھیے مآخذ) اور اس میں ڈریسڈن کے نسخے کی بعض تصحیحات کے ساتھ برلن کے نسخے سے بھی کام لیا گیا ہے۔

۱۹۵۰ء میں Ettore Rossi نے کتاب خانہ ویٹیکن "Vatican" میں ایک دوسرا نامکمل نسخہ دریافت کیا (Un nuovo manoscritto del "Kitab-i Dede Qorquş") در RSO، ۲۵ (۱۹۵۰ء) : ۳۳ تا ۴۴، جس کا چرچہ اس نے پوری کتاب کے اطالوی ترجمے اور پچانوے صفحے کے مقدمے کے ساتھ شائع کیا۔ ۱۹۵۸ء میں Muharrem Ergin نے کامل متن کی ایک نئی نقل اصلی مخطوطوں، چربوں اور مقدمہ کتاب کے ساتھ شائع کی ہے۔ اس کی دوسری موعودہ جلد میں اشاریہ، شرح لغات اور حواشی ہوں گے۔ اس تصنیف نے آذربائیجان میں بھی دلچسپی پیدا کر دی (نظریاتی بنیادوں پر تنقید کے لیے دیکھیے Ost. Probleme، جلد ۳، عدد ۳۵، ۱۹۵۱ء)۔ متن کتاب کی ایک طباعت باکو میں ۱۹۳۹ء میں ہوئی اور ایک روسی ترجمہ بھی ۱۹۵۰ء میں چھپا، جو بارٹونڈ کے مخطوطے پر مبنی ہے۔

۱۹۱۶ء میں کتاب کا مکمل متن شائع ہوا تو اس سے دہ قورقوت کے مطالعے کو زبردست تحریک ہوئی اور اس وقت سے روز افزوں تعداد میں اہل علم اس تصنیف کے تاریخی، علمی، لسانی، نسائی اور عوامی رسم و روایات کے متعلق بہت سے مسائل کی تشریح میں منہمک ہیں۔ مذکورہ بالا مصنفین اور دیگر علما کی شاندار خدمات کے باوجود (جن میں ۲۷ تا ۳۰)۔

”باب الحديد“ ہے، جسے ایرانی ترکی میں تاسرفی کہتے تھے۔ یہ نام مشرق اسلامی دلیا میں کئی دروں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ سب سے مشہور در، جسے درد آہنیں کہتے ہیں، ماوراء النہر کا ہے، جوئے سنتو کے پہاڑوں میں در پت کے موجودہ گاؤں کے قریب، سمرقند اور ترمذ کو ملانے والی قدیمی سڑک پر واقع ہے۔

شاید اس ”درد آہنیں“ کا قدیم ترین ذکر چینی سیاح ہیون سانگ Hsüan Tsang کے بیان میں ملتا ہے، جو ۶۳۰ء میں اس درے سے گزرا تھا۔ اس نے معجل طور پر اس کا حال بیان کیا ہے۔ فارسی نام کے تحت اس درے کا سب سے پہلا ذکر الیعقوبی: البلدان، ص ۲۹، ۲۹۵ میں ملتا ہے۔ ازمنہ مابعد میں اس درے کو ماوراء النہر اور بلخ کے تابع علاقوں کے درمیان سرحد خیال کیا جاتا تھا۔ اسلامی ادب میں اس درے کا ذکر کثرت سے آتا ہے، لیکن پہلا یورپی باشندہ، جس نے اس جگہ کو دیکھا، کلاویجو Clavijo تھا، جو یہاں سے ۱۴۰۴ء میں گزرا تھا۔ وہ ایک محصول خانے کا ذکر کرتا ہے، جہاں سے امیر تیمور محصول وصول کرتا تھا۔ اس درے کا ذکر شرف الدین یزدی: نظر نامہ، طبع محمد آلہ داد، کلکتہ ۱۸۸۷ء، ص ۴۹ اور بابر نامہ، طبع بیوریج Beveridge، ص ۱۲۴ میں منگول نام قالیہ (عربی رسم الخط قہلند) کے تحت ملتا ہے۔ بعد میں اس درے کا نام بزغاله خالہ پڑ گیا، جس کا ذکر سب سے پہلے محمد وفا کر مینگی نے تحفۃ الخاقی (مخطوطہ در سابق موزۃ ایشیائی، لینن گراڈ، ورق ۱۸۴ء، جس کا فہرست میں اندراج نہیں) میں محمد رحیم خان کی (۱۱۹۷/۱۷۵۷ء - ۱۷۵۸ء کی مہم کے بیان میں کیا ہے۔ آج کل ایک سڑک اس درے میں سے ہو کر گزرتی ہے، تاہم اب اس درے کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔

مآخذ: (۱) On Yuan Chwang's : T. Watters

مآخذ: مندرجہ ذیل تصانیف میں کتابیات کی منسلک فہرست دی گئی ہے: (۱) Orhan Saik Gökyay : Dede Korkut : استانبول ۱۹۳۸ء: (۲) Ettore Rossi : Il Kitab-i-Dede Qorqut Vatican : ۱۹۵۲ء: (۳) Korkut Ata : P.N. Boratav : در زکات: (۴) وہی مختلف Dede Korkut hikâyelerindeki tarihi olaylar ve Kitabin telif tarihi : TM : ۱۳ : (۱۹۵۸ء) : ۳۰ : تا ۶۲ : Muharrem Ergin : (۵) Dede Korkut : Kitabi : ۱ : Glis-Metin-Facsimile : انقرہ ۱۹۵۸ء: اس تصنیف کی زبان کے حالیہ مطالعے کے لیے دیکھیے (۶) E.M. Kitabi Dede Korkut dastanlarinin : Demircizade diti : ہاگو ۱۹۵۹ء (اس کتاب کا جرمن زبان میں شائع شدہ ترجمہ از J. Hein : Das Buch des Dede Korkut : ۱۹۵۸ء Zurich)۔

(FABRI İZ)

* در : فارسی لفظ، بمعنی دروازہ یا پھاٹک، بہت سی ایرانی اور ترکی زبانوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ عربی کے ”باب“ کا مترادف ہے اور اسی طرح استعمال ہوتا ہے، مثلاً ”در عالیہ“، ”در دولت“ اور ہندوستان میں ”دربار“۔ ”در“ خاص مفہوم میں دربار شاہی کے لیے، یا وسعت دے کر سرکاری حکمران کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ قبل از اسلام ایران میں اس سے یہی مفہوم لیا جاتا تھا۔ پہلوی میں اس کی بے قاعدہ املا ”یآ“ تھی [فرہنگ آندراج، بذیل یآ]۔

[مآخذ: (۱) فرہنگ آندراج، بذیل مادہ: (۲) History of Ottoman Poetry : Gibb. : ۲۱۴ : ۳ : (۳) Supplement aux Dictionn. Arabes : Dozy : ۱۲۴ : ۱ : (۴) Arabic-English lexicon : Lane (۵) : ۱۲۵ : ۱ : (R.N. FRYE)

* درد آہنیں : فارسی، بمعنی ”لوہے کا دروازہ“، اسے ”در بند آہنیں“ بھی کہتے ہیں۔ عربی شکل

تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بوزنطی دور میں بھی سلطنت کے مغربی دروازے کی حیثیت سے دیراخیوم کی بڑی مضبوط قلعہ بندی کی گئی تھی۔

۱۳۰۵ء کی تقسیم میں جب دیراخیوم وینس کے حصے میں آیا تو اس کے بعد حکمران بہت جلد بدلتے رہے، تا آنکہ ۱۳۹۲ء میں اسے یہاں کے مقامی خاندان تھوویا نے وینس کے سپرد کر دیا کیونکہ عثمانیوں کے مقابلے میں وہ اب اس کا مزید دفاع کرنے کے قابل نہ رہا تھا، اہل وینس نے اس کا احاطہ تنگ کر کے لئے پھرے سے فصیلیں تعمیر کیں۔ علاوہ ازیں انہوں نے ساحلی جھیل کو صاف کرنے کی بڑی شد و مد سے کوشش کی تاکہ بندرگاہ میں پیشہ جانے والی ریت اور ملیریا کا سدباب کیا جائے، لیکن اس میں انہیں کامیابی نہ ہوئی۔ ۱۴۶۷ء میں محمد ثانی کی البانوی مہم کے دوران دوراچو Durazzo، جسے یہاں کے دھشت زدہ باشندے قریب قریب خالی کر گئے تھے، ایک یقینی حملے کا شکار ہونے سے بچ گیا (دیکھیے F. Babinger : Mahomet II le conquérant et son temps، ۱۹۵۴ء، ص ۳۱۱ تا ۳۱۳)۔ اس کا خاتمہ کہیں ۱۵۰۱ء میں ہو سکا جب کہ یہاں کے گورنر کی عارضی غیر موجودگی میں قریبی علاقہ ایلبسان Elbasan کے سنجاق بے عیسیٰ بیگ اوغلو محمد بیگ نے ۱۷ اگست کو اس پر شبخون مارا (سعد الدین، ۲ : ۱۱۳، ۱۱۴) جس نے ادریس بدلیسی کے معاصرانہ بیانات کا تتبع کیا ہے)۔ اس کے بعد دوراچو کا نظم و نسق ایلبسان کی ایک قضا کی حیثیت سے انجام پاتا رہا۔ پرانے شہر کے جنوب مشرق میں اس کا رقبہ اور بھی کم کر کے (۶۰ × ۲۵۰ کیلو میٹر میں) اس کی فصیلیں دوبارہ تعمیر کی گئیں اور قدیم بالا حصار اس چار دیواری سے باہر رہ گیا۔ آل عثمان کے زیر حکومت دوراچو کی گزشتہ اہمیت عملاً بالکل ختم ہو گئی اولیا [چلبی] (۱۶۷۰ء) کے بیان کے مطابق یہ ڈیڑھ سو گھروں پر مشتمل

'Travels in India' لندن ۱۶۹۰ء : ۱ : ۱۰۰ تا ۱۰۲ : (۲) الیقوبی، طبع Wiet : ۱۰۵ : (۳) نظام الدین شامی : ظفر نامہ، طبع F. Tauer، پراگ ۱۹۵۶ء : ۲ : ۲۵۲ (بذیل مادہ "قبلاغہ") : (۴) Ruy Gonzalez de Clavijo : Narra- tive of the Embassy to the Court of Timur، ترجمہ C. R. Markham، لندن ۱۸۵۹ء، ص ۱۲۲ : (۵) 'بذیل مادہ باب الحديد'۔

(R. N. FRYE)

* درآ : رک بہ ذرعہ ۔

* دراج : یا دراج Draç، نیز دیرچ Dirac و دوزج Duraç : قدیم دیراخیوم Dysrrhachium (ازمنہ وسطی کی لاطینی زبان میں Duracium، اطالوی Durazzo اور البانوی Durrës) کا سلاخی اور لہذا عثمانی نام : جدید البانیہ کی سب سے بڑی بندرگاہ (۴۱ درجے ۱۸ دقیقے شمالی، ۱۹ درجے ۲۶ دقیقے مشرق)۔ قدیم شہر کی بنیاد اپنی دامونس Epidamnus کے نام سے ایک تنگ پتھریلے جزیرہ نما (کسی زمانے میں جزیرہ) کے جنوبی سرے پر دکھی گئی تھی (نواح ۶۲۵ ق م)۔ یہ جزیرہ نما اس ساحلی میدان کے متوازی پھیلا ہوا ہے، جس کے ساتھ قدیم زمانے میں یہ شمال میں ایک ریتلے ٹیلے اور جنوب میں ایک ہل کے ذریعے ملا ہوا تھا۔ اس طرح گھری ہوئی یہ ساحلی جھیل گزشتہ صدیوں کے دوران میں بتدریج تنگ ہوتی چلی گئی ہے۔ رومیوں کے دور میں اس جزیرے کی، جو اب (غالباً) الیری زبان میں جزیرہ نما کے نام کی رعایت سے) دیراخیوم Dyrrhachium [یا دوراخیوم] کے نام سے معروف ہے، تجارتی خوشحالی کے ساتھ ساتھ فوجی اعتبار سے بھی اس کی اہمیت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا، کیونکہ یہ جزیرہ شاہراہ ایگناتیوس (Agnatia) کا نقطہ آغاز تھا، جسے دراصل برینڈیسی Brundisium سے ایک مختصر اور سہل سی بحری مسافت کے بعد شاہراہ آپیا (Appia) ہی کا مزید سلسلہ کہنا چاہیے اور جو اطالیہ اور بلاد مشرق کے درمیان اہم ترین فوجی راستہ

* **درب :** رگ بہ المدینہ و باب۔
درب الاربعین : بلاد السودان کو شمال سے
 ملائے والے بڑے بڑے راستوں میں سے ایک راستہ
 اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اسے طے کرنے میں چالیس
 دن سفر کرنا ہوتا ہے۔ براؤن W.G. Browne ہی ایک
 ایسا یورپی باشندہ ہے جس نے (۱۷۹۳ء میں) اس راستہ طے
 کیا تھا: اس نے آسیوط سے منتہائے جنوب کے قریب
 السوینہ Sweini تک اٹھاون دن سفر میں لگائے تھے۔
 محمد عمر التونسی نے ۱۸۰۶ء میں اسی فاصلے کو
 ساٹھ دن میں طے کیا تھا۔ آسیوط سے شروع ہو کر یہ
 راستہ نخلستان "خارجہ" تک جاتا تھا، جو عثمانی
 حکومت کی ایک بیرونی چوکی تھی۔ وہاں سے صحرا کو
 پار کر کے راستہ الشب تک پہنچنا تھا، جو ایک گھاٹ ہے
 اور جیسا کہ اس کے نام سے مترشح ہے اس میں (شب)
 پھٹکڑی پانی جاتی ہے۔ اگلے نخلستان سلیمہ سے
 ایک شاخ، جو نویہ کے علاقے میں دریائے نیل کی
 طرف مڑ گئی ہے، "تیسرے آبشار" کے ذرا اوپر موٹو
 کے مقام پر دریا تک پہنچ جاتی ہے، جو فنج کے علاقے
 کی سرحدی چوکی ہے۔ اس راستے پر ۱۶۹۸ء میں
 Ch. J. Poncet نے سفر کیا تھا (دیکھئے اس کا مقالہ
Voyage to Aethiopia، طبع ولیم فاسٹر، در *The Red
 Sea and adjacent countries at the close of the
 seventeenth century*، مطبوعہ Hak. Soc. سلسلہ ۲،
 عددی، لندن ۱۹۳۹ء)۔ سلیمہ سے درب الاربعین
 کی اصل شاعراہ برابر صحرا صحرا چلتی ہوئی دارفور
 کی سرحدی چوکی سوینہ تک جاتی تھی، جہاں سلطان
 کی اجازت حاصل کرنے کے لیے کاروانوں کو روک
 لیا جاتا تھا۔ پھر یہ شاعراہ کبیہ (Brown Cobbe)،
 کے مقام پر ختم ہو جاتی تھی، جو سلطان کی اقامت گاہ
 القاشر کے شمال مغرب میں تقریباً پینتیس میل پر واقع
 تھا۔ کبیہ، جو اب ویران ہو چکا ہے، اٹھارہویں صدی
 اور انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں ایک اہم

ایک چھوٹا سا قصبہ تھا، جس میں صرف ایک
 مسجد تھی، تاہم ازمہ وسطی کی طرح یہاں نمک
 سازی کی صنعت خاصے اچھے پیمانے پر جاری تھی۔
 تجارتی سرگرمیاں بھی قابل اعتنا تھیں اور ایک ویوڈہائی
 voyvodalik کی حیثیت سے اس شہر کا انتظام ایک امین
 کے سپرد تھا، جو ایک قاضی کے ساتھ یہاں سے جنوب
 مشرق میں بیس کلومیٹر کے فاصلے پر ایک نسبتاً صحت افزا
 مقام نویہ میں سکونت پذیر تھا۔

دوراجو کی موجودہ خوشحالی کا آغاز دوسری
 جنگ عظیم سے ذرا قبل ہوا تھا۔ اٹلی نے یہاں
 ایک اول درجے کی بندرگاہ تعمیر کی۔ آج کل یہ ریل
 کے ذریعے تیرانہ اور ایلبسان سے ملا ہوا ہے۔
 بندرگاہ اور تعطیلات گزارنے کی تفریح گاہ کی حیثیت سے
 یہ کافی ترقی کر گیا ہے (آبادی: تیس ہزار)۔

مآخذ: (۱) Pauly-Wissowa 'Bibliographie
 Dyerlachion (طبع Philippson) : (۲) K. Jitček
*Die Lage und Vergangenheit der Stadt Durazzo in
 Albanien* : L. Von Thallöczy : (۳) 'sche Forschungen
 ۱ (۱۹۱۶ء) : ۵۲ تا ۱۵۷ : (۴) 'Mission archéologique de Macédoine : L. Heuzey
 پیرس ۱۸۷۶ء ص ۲۳۹ تا ۳۹۲ و خاکہ: (۵) اولیا چلیبی:
 سیاحت نامہ: ۸ : ۷۱ تا ۷۲ = ملخص ترجمہ و حواشی
 از F. Babinger : در MSOS ۳۳ (۱۹۳۰ء) : ۱۶۶
 (مع مزید حوالہ جات): (۵) H. Hecquard : *Histoire et
 description de la Haute Albanie ou Goutgarie*
 پیرس ۱۸۵۸ء ص ۲۵۸ تا ۲۶۳ : (۶) Baedeker's
Dalmatien und die Adria ۱۹۲۹ء ص ۲۳۵ تا ۲۳۶
 از (F. Babinger) : (۷) 'Enc. It. (۸) 'Albania' : طبع S. Skendi : لندن ۱۹۵۷ء : (۹)
'Guide d' Albanie (Albturist) : تیرانہ ۱۹۵۸ء
 ص ۱۶۶ تا ۱۷۳
 (V. L. MENAGE)

کو این بتاتے ہیں۔ ”دربکۂ“ کا نام اور اس کی مختلف شکلیں بالکل جدید ہیں، گو ”دربکۂ“ (جو کاتب کی غلطی سے ”دربکۂ“ کے بجائے تحریر ہوا ہے) الف لیلۃ و لیلۃ میں مذکور ہے۔ اس کی ایک قسم قدیم مصر میں بھی پائی جاتی ہے۔ ”دربچ“ کا ذکر الفضل بن سلمہ (م ۳۱۸ / ۴۹۳ء) نے کیا ہے۔ گو اس نے غلطی سے یہ خیال کیا کہ وہ ایک قسم کا طنبور تھا، جیسا کہ بہت سے عربی لغت نویسوں کا خیال تھا، لیکن ہم الشیدانی (م ۵۱۸ / ۱۱۲۲ء) کی وجہ سے جانتے ہیں کہ وہ ایک ڈھول تھا۔ ابن مکرّم (م ۵۱۰ / ۱۳۱۱ء) کہتا ہے کہ اس کا صحیح تلفظ ”دربچ“ ہے اور یہ لفظ اپنی مختلف شکلوں کے ساتھ مغرب میں پایا جاتا ہے۔ ”کربچ“ اور ”کربج“ جو القریٰ میں آئے ہیں، وہ بلاشبہ ”دربچ“ کی غلط خوانی ہے۔ الشّیّدی (م ۵۲۸ / ۱۲۳۱ء) اس ڈھول کے لیے بربری نام ”اکوال“ استعمال کرتا ہے اور ابھی تک یہی نام مغرب میں مستعمل ہے، گو Hōst اسے ”اکوال“ کہتا ہے، جبکہ یہ الجزائر میں ”گزل“ ہے۔ طرابلس میں ”تبدہ“ کے نام کا استعمال عام ہے اور مصر میں ”طبلہ“ کا۔

مآخذ : (۱) رُو، لائن بار اوّل، تکملہ بذیل مادّہ طبل، ص ۲۱۵ تا ۲۱۶ : (۲) J. Robson : Collection of Oriental writers on music : ۱۳ : ۱۴ : Beatsden : Studies in Oriental musical : Farmer (۳) : ۱۹۳۸ : instruments : سلسلہ اوّل، ص ۸۶ تا ۸۷ : لندن ۱۹۳۱ء : Description de l' Égypte. : G. A. Villoteau (۴) : E. W. : (۵) : ۱۹۶۶ : ۱۹۸۳ : Modern Egyptians : Lane : ۳۶۶ تا ۳۶۷ : لندن : ۱۸۶۰ : A. Lavignac (۶) : Encyclopédie de la : ۲۰۴۶ : ۲۹۳۲ : ۲۰۴۶ : ۱۹۲۲ : Notes sur la poésie et la : Delphin et Guin (۷) : ۱۸۸۶ : ۱۸۸۶ : musique arabes : ۳۳ تا ۳۴ : ۱۸۸۶ : (۸)

شہر تھا، جس میں زیادہ تر سوداگر آباد تھے، جن کی اکثریت نویہ سے نقل وطن کر کے آئی تھی۔ ”درب الاربعین“ مصر جانے کے لیے قافلۃ السودان کا راستہ تھا، جو غلام، اونٹ، عاج، شتر مرغ کے پر اور گوند لاتا تھا اور دھات کی مصنوعات اور کپڑا لے کر لوٹتا تھا۔ انیسویں صدی کے دوران میں مشرق بلاد السودان میں سیاسی تبدیلیوں اور تجارت غلاموں میں انحطاط آ جانے کے نتیجے میں ”درب الاربعین“ کی اہمیت جاتی رہی اور اب فقط اس کے بعض حصے ہی گامے گامے استعمال ہوتے ہیں۔

مآخذ : (۱) W. G. Browne : Africa, Egypt and Syria : لندن ۱۷۹۹ء : (۲) محمد عمر التونسی : تشحید الاذهان بسمیرت بلاد العرب و السودان : طبع سنگی، پیرس ۱۸۵۰ء، ص ۳۶ تا ۵۱ : ترجمہ Voyage au Darfour par le ckeykh : Perron : Mohammed Ebn-Omar El-Tounsi : پیرس ۱۸۳۵ء : (۳) Darb El Arba'in : W. B. K. Shaw : Sudan : Notes and Records : ۱/۱۲ : ۱۰۹۲۹ : ۶۳ تا ۷۱ : (۴) عکسی تصاویر۔

(P. M. Holt)

* ”دربکۂ“ : گلدان کی شکل کا ڈھول، جس کا زیادہ چوڑا منہ چھلّی سے منڈھا ہوتا ہے اور نیچے کا منہ کھلا ہوتا ہے۔ اس کا بیٹا عموماً منٹش یا گھنڈے ہوئے لٹروف گلی کا ہوتا ہے، لیکن اس میں کندہ کاری اور چولی یا دھات کی پچی کاری بھی ہوتی ہے۔ بجانے کے وقت اسے بازو کے نیچے سیدھا رکھتے اور انگلیوں سے بجاتے ہیں۔ اس نام کی مختلف علاقائی شکلیں ہیں : ”دربکۂ“ (یا خرابکۂ)، ”دربکۂ“ اور ”دربوکہ“۔ ڈوزی Dozy اور براکلمان Brockelmann اس لفظ کو سربانی زبان کے ”آردیکا“ سے مأخوذ سمجھتے ہیں، لیکن فارسی کا ”دلیک“ اور ”تلبک“ زیادہ قریں قیاس ہے، گو لغت نویس غلطی سے مؤخر الذکر

باقی رہ گئے ہیں۔ اس کے مقابلے میں شمالی دیوار، جس میں آٹھ دروازے اور تیس برج ہیں، تقریباً پوری کی پوری قائم ہے۔

شہر کے شمال کی جانب عربوں کے زمانے کا قریقلار کا مقبرہ واقع ہے، جو آٹھویں صدی ہجری / چودھویں صدی عیسوی کا بنا ہوا ہے۔ قدیم جامع مسجد، سترھویں اور اٹھارھویں صدی عیسوی کی کچھ مسجدیں اور کچھ برائی کاروان سرائیں اب بھی تقریباً اپنی اصلی حالت میں موجود ہیں۔ شہر میں قدیم نظام آب پاشی کے جو آثار موجود ہیں وہ اس بات کے شاہد ہیں کہ اس شہر کی تہذیب بلحاظ تکنیک بہت ترقی یافتہ تھی۔

قدیم مستحکم شہر نے اقتصادی حیثیت سے حیرت انگیز ترقی کی تھی۔ شہر کی زمین بہت زرخیز ہے (جس میں انگور اور دوسرے پھل بکثرت ہوتے ہیں)۔ زمین کی نشیبی تہ میں پیٹرولیم اور قدرتی گیس کثرت سے موجود ہے؛ سمندر کے قریب کی وجہ سے یہ مچھلی کے شکار کی ایک اہم بندرگاہ بن گیا ہے اور ان باتوں کے علاوہ پاکوہ، منجھ، صقلہ ریلوے یہاں سے ہو کر گذرتی ہے اور اس سے تجارتی سامان کے لانے لے جانے میں سہولت ہوتی ہے، نیز شہر میں غذائی صنعتوں کی کثرت ہے، جن میں مقامی پیداوار کی چیزوں سے کام لیا جاتا ہے۔

اس صدی کے شروع میں آبادی کے ستاون فی صد مسلمان تھے، اٹھارہ فی صد روسی، سولہ فی صد یہودی اور سات فی صد آرمینی۔ اس زمانے میں ایک طرف تو یغلیس اور پاکوکی بالشویک (بُلشَہی) منظم انجمنوں کے زیر اثر اور دوسری طرف I. V. Maligine اور بعض دوسرے جلا وطنوں کے زیر اثر اشتراکی خیالات پھیل رہے تھے۔ درہند میں جن لوگوں نے سب سے پہلے شورش بھیلائی وہ روسی ریلوے کے کارکن تھے، جن کی سرگرمیاں ۱۹۰۵ء کے انقلاب میں واضح طور پر سامنے آئیں۔ دسمبر ۱۹۱۷ء میں اس شہر میں

المقوری: 'Auliers: ۱۹۳۱ء لندن ۱۹۵۵ء - ۱۹۶۱ء
(۵) 'Nachrichten von Marokos und Fes: Host
ص ۲۹۲، جدول (۱۲۵) ص ۳۱، ۹ کوین جیگن ۱۹۸۷ء
(۱۰) 'La Deraboukka: H. Hickman در
'BIF' ۳۳: ۲۰۰ تا ۲۰۵، قاہرہ ۱۹۵۲ء۔ اس کے
نوعے نیویارک (Crosby Brown، عدد ۳۳۵، ۳۳۵) برماز
(Conservatoire، عدد ۱۱۲، ۳۳۰ تا ۳۳۵، ۶۸۰)
اور پیرس (Conservatoire، عدد ۹۵۸ تا ۹۵۷، ۱۸۵۷)
میں دکھائے جاتے ہیں: [(۱۱) 'و'ع' مصر ۱۷۷: ۱۷۷ بعد؛
'La Population Musulmane de Tlemcen: Bel (۱۲)
ص ۱۴۹]۔

(H. G. FARMER)

* درہند: داغستان [رگ یان] کا ایک شہر، جسے عرب ترون وسطیٰ میں باب الایواب [رگ یان] کہتے تھے۔ اس عنوان کے تحت اس کے فقط زمانہ حال کے واقعات قلمبند کیے جائیں گے۔

۱۷۲۲ء سے ۱۷۳۵ء تک روس کے تحت رہنے کے بعد درہند پھر ایرانیوں کے قبضے میں آ گیا اور نادر شاہ نے کوشش کی کہ اس میں پچھلی سی شان و شوکت پھر پیدا ہو جائے، لیکن اس کی وفات کے بعد درہند گویہ کے خان، فتح علی کے ہاتھ چلا گیا۔ ۱۷۶۵-۱۷۹۶ء میں روس نے اس پر دوبارہ قبضہ کر کے جلدی ہی خالی کر دیا اور بالآخر ۲۱ جون / ۳ جولائی ۱۸۰۶ء کو پھر اس پر قبضہ کر لیا۔

روس کے قبضے میں آنے کے بعد اس شہر کی قدیم جنگی اہمیت ختم ہو گئی۔ تاہم ماضی میں ایک مستحکم شہر کی حیثیت سے اس کی جو شان تھی اس کے آثار کو بڑی احتیاط سے محفوظ رکھا گیا ہے۔ ان دو دیواروں میں سے جن سے شہر اور قلعہ گھرا ہوا تھا جنوبی دیوار کو زیادہ نقصان پہنچا ہے، جس کے آثار میں اب صرف چار دروازے اور تین برج

The Lands of the Eastern Caliphate ص ۱۸۰.
(H. CARRÈRE D'ENCAUSSE)

الدرجینی : ابوالعباس احمد بن سعید بن *
سُلَیْم بن علی بن اِیْخَلَف، ساتویں صدی ہجری/تیرھویں
صدی عیسوی کا ایک اِیاضی نقید، شاعر، مورخ اور
ایاضیوں کے متعلق تواریخی اور سوانحی تالیف
طبقات المشائخ کا مؤلف ہے۔ وہ علما کے ایک
بربر اِیاضی خاندان سے تعلق رکھتا تھا؛ یہ خاندان
طرابلس الغرب (Tripolitania) میں جبل نفوسہ کے ایک
مقام تِیْجَار کا رہنے والا تھا۔ الدرجینی کا جد العاج
اِیْخَلَف بن اِیْخَلَف النُفُوسِ التِیْجَارِی، جو ایک ممتاز
نقید تھا، جرید [رک بان] میں نقطہ کے قرب و جوار
میں رہتا تھا۔ اِیْخَلَف کا بیٹا علی، جو چھٹی صدی
ہجری/بارھویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں گزرا
ہے، سوڈان کے ساتھ تجارت سے بسر اوقات کرتا تھا۔
کہا جاتا ہے کہ اس نے ۵۷۷ھ/۱۱۷۹ء-۱۱۸۰ء
میں اپنے ایک تجارتی سفر کے دوران میں مغربی سوڈان
کی ریاست مالی کے کانر بادشاہ کو اِیاضی مذہب کا
حلقہ بگوش بنا لیا، لیکن یہ محض ایک اساطیری روایت
ہے (قب J. Schacht در *Travaux de l'Institut*
de Recherches Sahariennes ۱۱، ۱۹۵۵ء : ۲۱
بعد)۔ علی کا فرزند مشہور نقید سُلَیْم تھا، جو
ابوالعباس کا دادا ہے۔ وہ جرید میں کنومہ کے مقام
پر رہتا تھا؛ اُسے ولی اللہ خیال کیا جاتا تھا۔ ابوالعباس
کے باپ سعید نے، جو ایک ممتاز محدث تھا، نقطہ کے
قرب درجین السفلی جدید میں سکونت اختیار کر لی۔
ہم الدرجینی کے متعلق کچھ زیادہ نہیں جانتے۔
وہ یقیناً نو عمر ہی ہوگا جب ۶۱۶ھ/۱۲۱۹ء-
۱۲۲۰ء میں اوارگلہ Ouargla گیا اور اس شہر کے
ایاضی مشائخ سے تعلیم حاصل کرنے میں دو برس
گزارے۔ بعد ازاں وہ جرید واپس چلا گیا، جہاں ہم
اُسے ۶۳۲ھ/۱۲۳۵ء-۱۲۳۶ء میں توْزُر Tozeur کے

سوویت اقتدار قائم ہوا اور فروری کے انقلاب کے
وقت کارکنوں اور سپاہ کی سوویت تنظیم کے ہاتھ میں
دے دیا گیا۔ جولائی ۱۹۱۸ء سے مارچ ۱۹۲۰ء تک
یہ شہر خانہ جنگی میں مبتلا رہا؛ طاقت مقامی
قوم پرستوں کے ہاتھ میں تھی، جو بالشویکوں کا مقابلہ
کر رہے تھے۔ بالآخر بالشویکوں کو سرخ فوج سے
درخواست کرنا پڑی کہ وہ وہاں اپنا تسلط جمالے۔
جب سے داغستان کی حکومت جمہوریہ قائم ہوئی
دریخت اپنے ضلع کا صدر مقام ہو گیا ہے اور اہمیت کے
 لحاظ سے وہ جمہوریہ کا دوسرے درجے کا شہر ہے۔
۱۹۵۶ء میں اس کی آبادی اکتالیس ہزار آٹھ سو تھی۔
مآخذ : (۱) W. Barthold 'در *Zapiski vost.*
ix 'old. Imp. Russkago Arkh. Obsht' بعد ۵۷۳
بعد: iv 'xxi' بعد: (۲) وہی مصنف: *'Derbend* در (۳) بار
اول: (۴) F. I. Kazubskiy *Istoriya goroda*
'Derbentu ۱۸۰۶-۱۹۰۶ء تمیر خان شُرا Temir Khan
'Shura ۱۹۰۶ء: (۵) M. I. Artamonov *'Nastoyashchiy*
'Derbent در *Archeologie soviétique* ۱۹۳۶ء: (۶)
'Pamyatniki Dagestana : N. B. Baklanov : ۸ : ۱
لینن گراڈ ۱۹۵۵ء نوْز دیکھئے باب الابواب کے مآخذ :
(۷) البستانی : دائرة المعارف بیروت ۱۸۸۵ء : ۷ : ۷
(۸) دائرة المعارف الاسلامیة مصر : ۹ : ۱۷۸ تا
۱۹۰ : (۹) Th. S. Bayeri *'Opuscula* طبع Klotzels
ہال ۱۷۷۷ء : (۱۰) E. Eichwald *Reise auf dem*
'caspischen Meere دو جلدوں میں : (۱۱) Berezin :
Pute Shestive Po Dagestanu Zakawkaryu وغیرہ :
Bericht Wissenschaftliche Reise in : B. Dorn (۱۲)
den Kaukasus; Beiträge Zur Geschichte der Kau-
kasischen ländel Und Völker aus morgenländischen
shrifststellern, betre ... das Kaspische Meer Und
: G. Le Strange (۱۳) 'angrenzende ländel, Caspia

مقام پر تاریخی تحقیقات کرنے میں مصروف دیکھتے ہیں۔ اس کے بعد وہ کچھ عرصہ جزیرہ حرتہ میں رہا، جہاں "عزابه" (= اباضی علماء) اس کی بڑی قدر کرتے تھے۔ انہیں کی درخواست پر اُسے طبقات المناہجہ لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔

اس کتاب کے اسباب تالیف کے متعلق ابوالقاسم البرادی [وگہاں] کی کتاب الجواهر المصنقات کچھ معلومات ہم پہنچاتی ہے۔

البرادی لکھتا ہے: "یہ ہیں وہ حالات جن کے تحت ابوالعباس نے اپنی کتاب تحریر کی۔ الحاج عیسیٰ بن زکریا اپنے ساتھ کئی تصانیف لے کر انہیں دنوں عمان سے پہنچا تھا۔۔۔ مشرق میں اس کے اباضی بھائیوں نے اس سے کوئی ایسی کتاب بھیجنے کو کہا تھا جس میں سب سے پہلے اباضوں کی سوانح عمریاں اور مغربی اسلاف کے اوصاف مذکور ہوں۔ الحاج عیسیٰ نے فاضل "عزابه" سے مشورہ لیا، جو اس وقت جرہہ میں پائے جاتے تھے اور انہیں ان کے مشرقی ہم مذہبوں کی خواہش سے آگاہ کیا۔ انہیں پہلے ابو زکریا کی کتاب کا خیال آیا، لیکن وہ تسلیم کرتے نہیں کہ یہ کتاب ہر حشبت سے مکمل نہیں ہے اور اس کے مصنف کا طرز، جو بربر زبان کا ہادی تھا، اور اس لیے عربی نحو کے قواعد اور اس کی اصطلاحات و محاورات کا پوری صحت سے استعمال نہیں کرتا تھا، اکثر جگہ ناقص ہے۔ پھر انہیں دولت رستمیہ کی تاریخ اور قدیم علماء کے فضائل پر ایک نئی کتاب تالیف کرانے کی سوچی۔ ابوالعباس سے زیادہ کوئی شخص اس کام کو احسن طریق سے انجام دینے کے لیے موزوں نہ تھا اور یہ کام اسی کو سونپا گیا۔

کتاب طبقات المناہجہ کے فقط کچھ خطی نسخے ہی ملتے ہیں (جند Mzali میں اور ایک Z. Smogorzewski کے ذخیرے میں)۔ یہ بالکل جدا دو حصوں پر مشتمل ہے، جن میں سے پہلا حصہ

تو کتاب البسره و اخبار النعم (مؤلفہ ابو زکریا درجینی بن ابی بکر النورحلائی) کی باکھشا جاہلیہ کہ اس کی تاریخ کے پہلے حصے کی بلغظہ نقل ہے۔ اس میں اباضیوں کے شمالی افریقہ میں نفوذ کرنے کی، اباضی اسامی کے قیام کی اور خاندان بنو رستم کے اساموہ کی تاریخ، نیز اخیر میں مغربی نسل کے اباضہ علماء کی چند سوانح عمریوں مندرج ہیں۔ دوسرا حصہ، جو اندرجینی کا تخلقی کام ہے، علماء اور دیگر مشہور اباضوں کے تذکروں کا مجموعہ ہے، جو رواج کے مطابق بارہ طبقات میں منقسم ہے اور ہر طبقہ پچاس سالہ عہد پر حاوی ہے۔ اس تصنیف کے پہلے چار طبقات پہلی صدی ہجری/ساتویں صدی عیسوی اور دوسری صدی ہجری/آٹھویں صدی عیسوی کے مشرقی اباضی علماء کے تذکروں پر مشتمل ہیں۔ مصنف نے اس جگہ مغرب کی مشہور شخصیتوں کے تذکرے درج کرنا لا حاصل خیال کیا اور صرف ابو زکریا کی تالیف کے متعلقہ حصے کو نقل کر دیا۔ گاہ گاہ ان مشرقی علماء کی سوانح عمریوں کے بہت قندم مآخذ کا ذکر ہے۔ دوسری طرف جو اس کے بعد آٹھ طبقات آئے ہیں وہ مغربی نسل کے اباضی المناہجہ کی سوانح عمریوں تک محدود ہیں۔ آخری چار طبقات میں اورلگہ Ouargla اوریدرج Oued Rija اوریدسوف Oued Souf، جرہہ اور جزیرہ جرہہ ہی کے اشخاص کا ذکر ہے، لہذا ان کی اہمیت مقامی سے زیادہ نہیں۔

الدرجینی نے اپنی کتاب کے دوسرے حصے میں مآخذ کی بہت بڑی تعداد استعمال کی ہے، جس میں دیگر مآخذ کے علاوہ محبوب ابن الرحیل العبدی (دوسری صدی ہجری/آٹھویں صدی عیسوی) اور ابوالریع سفین بن عبدالسلام الرمیانی چھٹی ہجری/بارہویں عیسوی کی تاریخ و رجال سے متعلق تصانیف ہیں۔ اس نے اپنی کتاب میں بعض عجیب عبارات شامل کی ہیں، جو اباضی تاریخ کے طالب علموں کے لیے گرانقدر ہیں، مثلاً "حقتہ" کی

تشکیل کے متعلق قاعدے، جو اباضی علامہ ابو عبد اللہ محمد بن بکر النفوسی (پانچویں صدی ہجری/گیارہویں صدی عیسوی) نے وضع کیے تھے اور وہ خطبہ جو مشہور اباضی سردار ابو حمزہ الشازی (دوسری صدی ہجری/آٹھویں صدی عیسوی) نے مدینے میں دیا تھا۔ کتاب طبقات المشائخ کی نقیص زبان شمالی افریقہ کی دوسری اباضی تصانیف سے فصاحت میں کہیں صفت لے گئی ہے اور مصنف نے اپنے مشربی مآخذ کے اسالیب کی تصحیح کی ہے، جیسا کہ ابو زکریا کی تاریخ کے اصلی متن کا مقابلہ کرنے سے واضح ہو سکتا ہے۔

الدرجینی ایک "دیوان" اور منظوم خطوط کا بھی مصنف ہے؛ بحیثیت ایک فقیہ کے اس نے تقسیم وراثت کے متعدد مسائل کا تصفیہ کیا، جنہیں بعد ازاں الجیطالی [رک بتا] نے یکجا مرتب کیا۔

اس کی وفات کی تاریخ نامعلوم ہے، لیکن وہ بلاشبہ ساتویں صدی ہجری/تیرہویں صدی عیسوی کے نصف ثانی میں ہوئی۔

مآخذ: (۱) ابوالفضل ابو القاسم بن ابراہیم البرادی: کتاب الجواهر المتفحات، طبع سنگی، قاہرہ ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۵-۱۸۸۳ء: ۲: ۲۱۵ بعد ۲۱۹: (۲) ابوالعباس احمد بن سعید الشمانی: کتاب السیر، طبع سنگی، قاہرہ ۱۳۵۱ھ/۱۸۸۳-۱۸۸۵ء: ص ۱۶۳، ۱۷۸، ۳۵۳ تا ۳۶۱ و مواضع کثیرہ: (۳) A. de C. Motylinski: Bibliographie du Mزاب. Les livres de la secte 'abadhite در 'Bulletin de Correspondance Africaine' ۳ (۱۸۸۵ء): ۲۹، ۳۸، ۴۳: (۴) براکلمان: ۱: ۳۳۶ و تکملہ: ۱: ۵۷۵: (۵) Notice: T. Lewicki: ۱۳ (۱۹۳۶ء): ۱۷۲ تا ۱۷۳: (۶) J. Schacht: Bibliothèques et manuscrits abadites در 'C. RA' (۱۹۵۶ء): ۳۹۷۔

درد کے مشہور صوفی شاعر) سید خواجہ میر بین خواجہ محمد ناصر عندلیب کا تخلص (فہرست بانکی پور، خطوط فارسی، ۱۶: ۸۵؛ پورا لام: نورالنار، خواجہ میر محمدی)؛ سلسلہ نسب خواجہ نور الدین نقشبندی سے ہو کر امام حسن عسکری تک پہنچتا ہے۔ درد کے والد خواجہ ناصر عندلیب بھی صوفی باعمل اور فارسی کے مصنف اور شاعر تھے۔ نالہ عندلیب انہیں کی تصنیف ہے، جو ۱۱۵۳ھ میں ختم ہوئی۔ اس میں قصے کے پیرائے میں معارف بلند اور مطالب عالیہ بیان ہوئے ہیں۔ درد بمقام دہلی ۱۱۳۲-۱۱۳۳ھ میں پیدا ہوئے (فہرست بانکی پور میں ۱۱۳۷ء درج ہے، مگر یہ غلط ہے)؛ انتقال ۲۳ صفر ۱۱۹۹ھ کو بعد ۶۸ سال ہوا اور اپنے خاندانی مدفن باغچہ خواجہ میر درد میں دفن ہوئے۔ تفسیر، حدیث، تصوف اور دوسرے علوم رسمی کے علاوہ موسیقی میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ ہر مہینے کی دوسری اور چوبیسویں تاریخ کو ان کے ہاں محفل سماع منعقد ہوتی تھی، جس میں اکثر علما و مشائخ و امراء شرکت کرتے تھے۔ ان کے یہاں ایک مجلس مشاعرہ بھی منعقد ہوا کرتی تھی (دیکھیں نکات الشمر، بذیل میر تقی میر)۔

اٹھائیس برس کی عمر میں لباس فقر پہن لیا؛ اٹالیس برس کی عمر میں والد کے انتقال کے بعد مسند نشین ارشاد ہوئے۔ سلطنت دہلی کی تباہی اور قتل و غارت کے زمانے میں، جب دہلی کے اکثر بڑے بڑے شاعر اور اہل کمال گھر بار چھوڑ کر نکل گئے تھے، خواجہ میر درد ثابت قدمی سے اپنے تکیے میں بیٹھے رہے۔ ان کے اس ثابت نفس، توکل علی اللہ اور حوصلہ مندی سے (جو ان کی شخصیت کے اوصاف خاص ہیں) ان کی شاعری کی روح بھی متاثر ہوئی۔ تصانیف میں اردو اور فارسی دو اویں کے علاوہ تصوف کی چند کتابیں شامل ہیں: اسرار الصاوة، نماز کے

(T. LEWICKI)

افسردگی، جس کے دل غم سے مملوب نہیں ہو جاتا، کیونکہ ان کے اشعار مایوسی کی جگہ دلوں میں تمنا اور آرزو کا جذبہ بیدار کرتے ہیں۔ ان کی غزل میں صوفیانہ خیالات کے علاوہ مجازی عشق کے مضامین بھی موجود ہیں، مگر انہوں نے پیرایہ بیان ایسا رکھا ہے کہ اکثر غزلوں میں محاز اور حقیقت دونوں طرح کے مفہوم شعر میں قائم رہتے ہیں۔ مجاز و حقیقت کا یہ پیوند ان کی غزل کے انفرادی لب و لہجہ کی تعیین کرتا ہے، چنانچہ ان کے استعارات و کنایات بھی اسی قسم کے ہیں (اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سید عبداللہ: بحث و نظر، بذیل "درد کی شاعری کا صوفیانہ لب و لہجہ")۔

درد کی فارسی شاعری کی روح مضمون کے لحاظ سے ان کی اردو شاعری کے قریب ہے، مگر اس کا درجہ ان کی اردو شاعری سے کم تر ہے۔ البتہ فارسی میں ان کی رباعیات پر تاثیر ہیں۔

خواجہ میر درد کے شاگردوں میں بعض اچھے غزل گو شاعر شامل ہیں، مثلاً قائم چاند پوری، (مصنف مخزن نکات)، ہدایت اللہ ہدایت، حکیم ثناء اللہ فراقی، میر اثر (برادر خرد درد)، میر محمدی بیدار وغیرہ۔ ان میں میر اثر مختصر بحروں میں بہت اچھی غزل لکھ لیتے تھے، مگر ان کی شہرت زیادہ تر ان کی مثنوی خواب و خیال کی وجہ سے ہے۔ اس مثنوی کی ابتدا درد نے کی تھی، مگر چند سو شعر کہہ کر لکھنا بند کر دیا۔ میر اثر نے ان اشعار پر بنیاد رکھ کر مثنوی کو مکمل کر دیا۔

مآخذ: (۱) شعراء اردو کے علم تذکرے، مثلاً میر تقی: نکات الشعراء (۲) قائم: مخزن نکات (۳) میر حسن: تذکرہ شعراء اردو، ادب اور شاعری کی تاریخیں، مثلاً (۴) آزاد: آب حیات (۵) عبدالحی: گل رعنا (۶) عبدالسلام: شعر الہند (۷) یحییٰ تنہا: براۃ الشعراء، جلد اول (۸) سری رام: غم ثناء جاوید (۹) رام بانو سکینہ:

سرار و برکات ہر ایک رسالہ، جو پندرہ سال کی عمر میں تصنیف ہوا۔ واردات (۱۱۷۳ھ)، جس میں ایک سو گیارہ عنوانوں میں تصوف کے رموز و معاملات بیان ہوئے ہیں، ان واردات میں سے ہر ایک میں درد کی ایک یا دو رباعیات بھی ہیں، جن کی شرح کی گئی ہے۔ ان کی تصنیف علم الکتاب (۱۱۷۹ھ / ۱۱۸۱ھ) واردات کی شرح ہے۔ اس کے علاوہ آہ سرد، نالہ درد اور سمع محفل ہے (۱۱۹۹ھ) ایک اور رسالہ درد دل بھی ہے۔ غنا کی بحث میں بھی ایک کتاب لکھی (عبدالحی: گل رعنا، ص ۲۰۱)۔ ان کا دیوان فارسی نواب نورالحسن خان بن نواب صدیق حسن خان نے چھپوا دیا تھا۔

خواجہ میر درد اردو کے ممتاز غزل گوؤں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کا دیوان مختصر ہے، مگر رطب و یابس سے پاک ہے ("دیوانش اگرچہ مختصر لیکن مثل کلام حافظ سراپا انتخاب"، رک یہ تذکرہ میر حسن)۔ ان کی غزل عموماً سات شعر یا نو شعر کی ہوتی ہے۔ بحرین عام طور سے چھوٹی اور جیسا کہ آزاد نے آب حیات میں لکھا ہے کہ خیالات ان کے منجیدہ اور متین تھے۔ خواجہ میر درد کی شاعری کا بنیادی امتیاز یہ ہے کہ بقول آزاد "تصوف جیسا انہوں نے لکھا، اردو میں۔ تک کسی سے نہ ہوا" (آب حیات، بذیل درد)۔ مگر ان کی غزل کا خالص عاشقانہ اور مجازی رنگ بھی اپنے دور کے بڑے شعرا سے کسی طرح کم نہیں۔ ان کی شاعری میں خلوص اور درد مندی کے علاوہ حکمت کے اعلیٰ اسباق ملتے ہیں۔ "درد کا دیوان اعلیٰ واردات قاب اور روحانی ارتقا کا ایک سجا پیرہ ہے" (مضامین عظمت، ص ۹۱)۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے برترین حقیقت کا کھوج لگانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے اشعار سچے جذبہ محبت اور اثر و تاثیر سے ٹہریز ہیں۔ ان کے اشعار میں شکستہ دلی اور لطیف افسردگی ہے، مگر حیات بخش

بھیجے۔ کسی زمانے میں یہ خطے بدھ مت کا گڑھ تھے آج تک وہاں بدھ کے بہت سے آثار اور باقیات موجود ہیں۔ درد ”ایک آزاد قوم ہے، جس نے چند برس ہوئے درس Dras کو تاراج کیا۔ ان کا وطن تین یا چار دن کی مسافت پر پہاڑوں میں ہے اور وہ ”پختو“ یا دردی زبان بولتے ہیں۔ جن لوگوں کو وہ اپنے حملے میں قید کر لیتے ہیں انہیں غلام بنا کر فروخت کر دیتے ہیں“ (Voyage par Mir 'Izzetulla in 1812)

در *Magasin Asiatique* : Klaproth : ۳ : ۳ تا ۵۔

یہ عجیب بات ہے کہ دردوں کا کوئی مشترک نام نہیں ہے! ہر قبیلے کا، جو الگ وادی میں رہتا ہے، مختلف نام ہے اور وہ زیادہ تر ان علاقوں سے مأخوذ ہوتا ہے جہاں وہ بستے ہیں۔

دردستان کا جو نام کلی ملک کو لیتنر Dr. G. W. Leitner نے اپنی سیاحت کے بعد ۱۸۶۶ء میں دیا تھا اس کی تاریخ اس کے مشمولہ علاقوں، یعنی ہنزہ، ناگرہ، چترال، بدخشان کے حصے، لداخ، گلگت وغیرہ [رگ بآئیا] کی تاریخ ہے۔ دردوں کا، جو بذات خود اس پسند قوم ہے، سب سے بڑا دشمن اپنے پہلے حکمران گلاب سنگھ کے زمانے کی کشمیر کی ڈوگرا ریاست تھی۔ اس نے دردوں کے خلاف کئی مہموں کی قیادت کی۔ ۱۸۵۰ء میں سکھوں کا ایک بڑا لشکر چلاس کے خلاف بھیجا گیا، جسے ذلت آمیز شکست ہوئی۔ اگلے سال بخشی ہری سنگھ اور دیوان ہری چند نے دس ہزار کا لشکر قلعہ چلاس کو تباہ کرنے اور کوہ پور قبائل کو، جو چلاسوں کی مدد کے لیے آئے تھے، منہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

ہنزہ اور ناگرہ کی دور افتادہ ریاستوں کے متعلق یہ امر بہت کم نوگود کو معلوم ہے کہ انہوں نے کشمیر کی کبھی اطاعت قبول نہیں کی، اس کے سوا کہ کبھی کبھار مٹھی بھر سونے کا برادہ مہاراجا کو بھیج دیا کرتے تھے اور اس کے عوض میں قیمتی تحائف

تاریخ ادب اردو (۱۰) کلیم الدین احمد: اردو شاعری پر ایک نظر: مقالات میں قابل ذکر (۱۱) حبیب الرحمن خان شروانی: مقدمہ دیوان درد، سلسلہ آصفیہ شمارہ ۳: (۱۲) مضامین عظمت اللہ خان (مضمون خواجہ میر درد): (۱۳) سرگدھاسمی فرید آبادی: خواجہ میر درد کے زمانے کی سیاسیات، در رسالہ اردو، اپریل ۱۹۳۵ء: (۱۴) ۱-۵-۲۰: نسیم: مقالہ ”درد“ (جو پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے)۔ (سید محمد عبداللہ)

دردانیال: رگ یہ چناق قلعہ بوغازی۔

* دردستان: کوہ ہندو کش اور کاغان کے درمیان اس علاقے کا نام جو ۳۷ درجے عرض بلد شمالی، ۳۵ درجے طول بلد مشرقی اور ۳۵ درجے عرض بلد شمالی، ۳۷ درجے طول بلد مشرقی کے درمیان واقع ہے۔ یہ ہندو دیو مالا کی ”درد“ قوم کا علاقہ ہے۔ زیادہ محدود معنی میں یہ علاقہ ”شینا“ بولنے والے علاقوں یعنی گلگت، استور، گریز، چلاس، ہودر، ڈریل، تنگر وغیرہ پر مشتمل ہے، یا اس علاقے پر جو اب یاغستان کہلاتا ہے۔ زیادہ وسیع مفہوم میں ہنزہ، ناگرہ اور چترال [رگ بان] (اس حصے کے بشمول جو یاسین کہلاتا ہے) کی ریاستیں، جو اب پاکستان کے شمالی خطوں کی تشکیل کرتی ہیں، دردستان پر مشتمل ہیں: وسیع ترین مفہوم میں یہ ان علاقوں پر مشتمل ہے جو بہت قریبی زمانے میں کا فرستان کہلاتے تھے۔ Herodotus (۳: ۱۰۲ تا ۱۰۵)

پہلا مصنف ہے جو دردوں کے ملک کا حوالہ دیتا ہے اور ”موجودہ افغانستان کے قریب کشمیر کی سرحد پر اس کا مقام“ بتاتا ہے، مگر وہ اس ملک کے ذکر میں ”درد“ کا نام استعمال نہیں کرتا! البتہ Strabo (ج ۱۵) اور Pliny (Natural History، ج ۱۱) اس خطے کے باشندوں کو ”Dardae“ یا ”Dardae“ کہتا ہے۔ سنسکرت مصنفین کے نزدیک درد ”دردہ“ ہیں: یہ وہ خطہ ہے جہاں بدھ نے اپنے مبلغ اور بھکشو

نوگوں (کر پشاور) وغیرہ میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے) :
(ب) وہی مصنف : مقالہ در *Asiatic Quarterly Review* جنوری ۱۸۹۲ء : نیز رگ بہ چترال کے بارے اور ناگز :
(د) محمد علی قصوری : مشاہدات کاہل و باغستان کرلمی بدون تاریخ .

(برسی انصاری)

دردلی : ابراہیم، ترکی عوامی شاعر (۱۸۸۶/۱۸۷۷ء تا ۱۹۲۶/۱۸۴۵ء) - وہ بولی کے صوبے میں جنگلی علاقے کے ایک گاؤں شاہنتر میں پیدا ہوا۔ اپنے باپ کی وفات کے بعد وہ قسمت آزمائی کے لیے استانبول چلا گیا، لیکن بہت جلد اسے اپنے علاقے میں رہنے آنا پڑا۔ اس کے بعد اس نے دس سال مصر میں گزارے۔ ر آغاواؤں کے تمام علاقوں میں خوب سیاحت کی۔ وہ عہد کے چوٹی کے مفتی شاعروں میں شمار ہوا۔ اس کے بعد محمود ثانی کے عہد میں وہ دوبارہ استانبول پہنچے، اور ان قہوہ خانوں کی جو عوامی شاعروں کا مرکز تھے، وہاں شہریت بن گیا۔ یہاں اس نے ترکی ٹولی (Fez) پر اپنا ایک مشہور قصیدہ لکھا اور اس جدید ٹولی کی، جو اس وقت اُنی لٹی رائج ہوئی تھی، نے حد تعریف کی۔ کچھ مدت تک وہ دربار کی راز و سے فیض یاب رہا، لیکن بعد میں شاہی التفات سے محروم ہو کر آنطولی چلا گیا۔ کچھ عرصہ توہر کردی میں گزارا اور خود کشی کی کوشش میں ناکام رہ کر بالآخر انقرہ میں فوت ہوا۔

اس نے جن نظموں میں عروض کی پابندی اور اسے صاحب دیوان شاعروں خصوصاً قُصُولی (رگ بَن) کی پیروی کی ہے، جن کی زبان درشت اور کٹھری ہے، وہاں اس کی حیثیت ایک ناکام مقلد کی ہے، لیکن جو نظمیں اس نے قدیم سراج لے میں لکھی ہیں وہ اگرچہ زبان اور اسلوب کے لحاظ سے ناقص ہیں تاہم اس کے آزادانہ اور لاپالی مزاج کی پُرخلوص صدائے بازگشت ہیں۔ یہ نظمیں اس کے دائمی اور لاپتہا مصائب کا

حاصل آئے تھے۔ جب کبھی کشمیر نے ان پر دست درازی کی کوشش کی ان دو ریاستوں نے کشمیر کو ایک سے آزادہ بار سزا دی ہے، انکو خود وہ ڈوگرا ریاست کی دشمن نہیں رہیں۔

سارے دردستان کا سرچہ مذہب اسلام ہے : ہنزہ، دگر اور چترال کے حصوں میں شیعہ مذہب کی ایک شکل ملتی ہے، گو چترال میں سنی اکثریت میں ہیں۔ مولائی، جیسا کہ وہ اپنے آپ کو کہتے ہیں، اچھے مسلمان (یعنی مومن) ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، اگرچہ ان کا ملان ساتویں شیعہ اسم کی طرف بہت آوی ہے۔ بہر کیف وہ آغا خان کی بیعت میں ہیں۔ مولائی (مزید رگ بہ اسمعیلیہ) کتاب کی پیر کی بڑی مظلوم و نکریم کرتے ہیں، جو فارسی ان میں ہے اور جس کا ایک انڈیشن Ivanow نے (بینی ۱۸۳۵ء) شائع کیا تھا۔

جب "مجاہدین" یعنی سید احمد نرباوی (رگ بَن) کے متبعین کو لاہور کے سردار رنجیت سنگھ کے بیٹے آئور شیر سنگھ کی زار سرکردگی سکھ فوج کے ہاتھوں ۱۸۳۶ء/۱۲۳۰ھ - ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ پر شکست ہوئی اور وہ آئر پتر ہو گئے تو باغستان میں جو قدر باقی ماندہ "مجاہدین" کا مرکز رہا، ان "مجاہدین" اور ان کی اولاد کی اکثریت اور [بعض دیگر] کارروائیوں کی بنا پر برطانوی ہندوستان کے بعد از ان پاکستان سے، باغستان میں داخلے کا انتظام "اجازت ناموں" کے ذریعے کر دیا گیا تھا، تاہم حکومت پاکستان نے یہ قاعدہ ۱۹۵۹ء میں منسوخ کر دیا۔

۱. آئندہ : (۱) G. W. Leitner : *Dardistan in 1866-1886 and 1893* : ووکنگ، بدون تاریخ : (۲)

وہی مصنف : *The Hunza and Nagyr Hand-Book* : کلکتہ ۱۸۸۹ء و ۱۸۹۳ء (۳) وہی مصنف : *The Languages and races of Dardistan* (اس کتاب کے

دوسرے حصے میں دردستان کی نباتات، دریاؤں، پہاڑوں،

ایک مسجد تعمیر کی تھی۔ دوسری عالمگیر جنگ کے دوران حبشہ کے دوبارہ فتح ہو جانے کے بعد یہ شہر برطانوی محروسہ علاقوں کی انتظامیہ کا صدر مقام بن گیا۔ اس کے عقبی میدانی علاقے کی سلطان آبادی کے رسم و رواج میں بوتلمون پائی جاتی ہے اور شافعی مذہب کو عموماً زیادہ مقبولیت حاصل ہے۔

مآخذ : (۱) *Guida dell' Africa Orientale Italiana* (۱) : Milan 'Italiana' ۱۹۳۸ء ص ۳۳۲ بعد : (نقشہ شارع عام' ص ۳۳۵ و نقشہ رقبہ' ص ۳۳۸) : (۲) *Reale 'L' Africa Orientale : Società Geografica Italiana* Bologna ۱۹۳۶ء (اشاریہ بنیل Dire Dawa) : (۳) *'Guide Book of Ethiopia : Chamber of Commerce* ادیس ابابا ۱۹۵۳ء (اشاریہ' بنیل Dire Dawa) : (۴) *British Military administration : Rennell of Rodd of occupied territories in Africa 1941-1947* H. M. Stationery Office ۱۹۳۸ء (اشاریہ' بنیل Dire Dawa) : (۵) *Islam in : J. S. Trimmingham* Ethiopia 'اوکسفورڈ' ۱۹۵۲ء (اس علاقے میں اسلام کی عام خصوصیات کے لیے)۔

(E. ULLENDORFF)

* **دردی اور کافری زبانیں :** یہ نام ان متعدد زبانوں اور بولیوں کے لیے اب عام طور سے استعمال کیا جاتا ہے جو اپنی بہت سی خصوصیات میں انتہائی قدیم ہیں اور افغانستان، پاکستان اور کشمیر میں ہند آریائی لسانیاتی علاقے کے شمال مغربی کوہستانی گوشے میں بولی جاتی ہیں۔ کشمیری زبان کے سوا یہ بولیاں بولنے والوں کی تعداد کے لحاظ سے غیر اہم ہیں اور ان کی ایسی تحریریں بھی موجود نہیں جن سے ان کی دستاویزی تاریخ مرتب کی جاسکے۔

کشمیری کے علاوہ باقی دوسری زبانوں اور بولیوں کی معلومات ہمیں صرف چھوٹی بڑی فرہنگوں اور صرف و نحو کے مختصر رسالوں وغیرہ سے حاصل

عکس ہیں، جن سے اسے اپنی پر آشوب زندگی میں برابر ساتھ رہا۔

مآخذ : (۱) *دیوان' طبع' جنگی' ۱۹۳۶ء*
Aşik Derdli, Hayati : (۲) احمد طلعت : *Aşik Derdli, Hayati*
Dıwani' بولی : M. F. Kâprülü : (۳) Bolu ۱۹۲۸ء
Türk sazâtları Antolojisi ج ۱۲ : استانبول
'Derdli ve Seyranı : Cahit Öztelli (۴) : ۱۹۳۰ء
استانبول ۱۹۵۳ء

(FAHİR İZ)

* **دردوہ :** مشرقی حبشہ میں بری (سڑک اور ریل) اور ہوائی مواصلات کا مرکز اور تجارتی شہر ہے۔ ہر [رک باں] کے شمال مغربی جانب ۳۵ میل کے فاصلے پر واقع ہونے کے باعث دردوہ مملکت حبشہ کے اس بڑے سسٹم شہر کے حلقہ ثقافت میں ہے۔ گمان غالب ہے کہ یہ نام صومالی لفظ در ضبو Dir-dabo "بمعنی در کی حد" سے ماخوذ ہے (در صومالی قبائل کے اس وفاق کا نام ہے جو دردوہ اور جبوتی کے درمیان وسیع خشک علاقے میں آباد ہیں)، مگر یہ بھی ممکن ہے کہ اسہری (حبشہ کی قدیم درباری اور امرا کی) زبان کے سانچے میں ڈھلی ہوئی نام کی یہ شکل اصل میں ایک عوامی اشتقاق پر دلالت کرتی ہو، جو اسہری کلمہ دردوہ = "غیر مزورعہ علاقے کی پہاڑی" سے ماخوذ ہے۔ دردوہ کی موجودہ حیثیت اور اہمیت ادیس ابابا - جبوتی ریلوے کی مرہون بنت ہے، جو دنگلی کے ویران میدان سے بلند ہوتی ہوئی دردوہ میں پہنچتی ہے۔ یہ مقیم آبادی کا پہلا مرکز ہے اور باروے کوہ کے کنارے پر چار ہزار فٹ سے ذرا کم ارتفاع پر واقع ہے۔ اس کی کل آبادی میں (جو ایک اندازے کے مطابق تیس ہزار اور پچاس ہزار کے درمیان ہے) گلس (Gallas)، صومالی، اطالوی، فرانسیسی، یونانی، بھارتی، پاکستانی اور عرب شامل ہیں۔ شہنشاہ لیج ایاسو Lidj Iyasu نے پہلی عالمی جنگ کے دوران دردوہ میں

ہوتی ہیں، جن میں سب سے ذاتی تحریر تقریباً ۱۸۳۰ء کی ہے۔ ان زبانوں کی بیزوں کے لیے ایسی کتب صرف و نحو، فرهنگوں اور نظم و نثر کے مجموعوں کی جو تمام ضروریات کو پورا کر سکیں بہت کمی ہے۔

ذیل کے زبان میں دائرۃ المعارف کی عام اسلامی روایات سے ہٹ کر دو علامتیں استعمال کی گئی ہیں: \$ جو صاد کے لیے نہیں بلکہ مہموم قسم کے سنی 'س' کے لیے اختیار کی گئی ہے۔ جو تالو کے وسط سے ادا ہوتا ہے؛ یعنی سخت کاسی یا حنجری (retroflex) ہے، دوسری علامت ؟ ہے جو حنجری نوں بالفتح کے لیے ہے۔

دردی اور کافری زبانوں کی ریگل تقریبی طبقہ بندی ذیل کے طریقے پر کی جا سکتی ہے:

۱۔ کافری لسانی طبقہ: (۱) کئی (بشکلی) زبان، جس کی دو خاص بولیاں ہیں اور جو شمالی نورستان (کافرستان) میں ریگل، کلم یتوی اور بشگل کی وادیوں میں بولی جاتی ہیں: (ب) پُرس (وسی - ویری؛ ویرن)، جس کا تکلمی علاقہ وادی یتوی کے کئی لوگوں اور بشگل والوں کے درمیان واقع ایک چھوٹی سی وادی میں ہے: (ج) آشگون بولی (اور اس کے ساتھ وامانی بولی)، جو وادی کئی کے جنوب میں آنگر اور پیچ Peet دریاؤں کے درمیان علاقے کی بولی ہے: (د) وے گلی بولی (وے والا)، پُرس کے جنوب مشرق میں وادی وے گل میں ایک اور ذرا مختلف بولی، جو خاصی قابل توجہ ہے اور خاص طور سے گہری بولی، جو وے گل کے مشرق میں کٹر کی طرف وادی ترے گم میں بولی جاتی ہے۔ یہ بولی عام وے گلی بولی سے بہت سی باتوں میں مختلف ہے۔ کافری زبانیں یقیناً بہت قدیم زمانے سے الگ الگ وادیوں میں رائج رہی ہیں۔

ان میں سے مذکورہ (ج) و (د) بمقابلہ (۱) و (ب) بولیوں کے بیرونی اثرات کی زد میں زیادہ رہی ہیں اور مؤخر الذکر زبان میں ایسے زبردست صوتی تغیرات واقع ہوئے ہیں کہ وہ نزدیک ترین ہمسابوں کے لیے قابل فہم نہیں رہی۔

۲۔ دردی زبانوں کا طبقہ: (۱) گلشہ، جس کی دو بولیاں ہیں، جنہیں گلشن قبیلے کے لوگ بولتے ہیں، جو ابھی تک زیادہ تر بت پرست ہیں۔ ان بولیوں کا تکلمی علاقہ جنوبی چترال، خاص طور پر مغربی جانب کی وادیاں ہیں: گلشہ سے قریبی رشتہ رکھنے والی بولی (و) خووار ہے، جو چترال کی سب سے بڑی زبان ہے اور خو (رک بہ چترال، ۲) قبیلے میں بہت کم لسانی اختلاف کے ساتھ بولی جاتی ہے۔ خووار میں وخی زبان سے اور ان ایرانی زبانوں سے جو ایرانی لسانیات کے وسطی مرحلے کی ہیں، یعنی پہلوی وغیرہ سے (دیکھئے BSOS، ۸: ۲۹۴) بہت سے الفاظ داخل الفاظ کے طور پر لے لیے گئے ہیں۔ یہ دو زبانیں ہندو کش کے علاقے میں ہند آریائی نفوذ کے اولین ہلے کی نشان دہی کرتی ہیں۔

۳۔ (۱) دسلی بولی چترال کی مشرق سمت میرخانی اور ارندو کے درمیان واقع وادی کے ایک گاؤں میں بولی جاتی ہے: اس میں کافری الفاظ بہت آگئے ہیں اور اس کا (ح) بولی یعنی اس گوریاتی (نرسیاتی) بولی سے جو چترالی افغان سرحد کے دونوں طرف کٹر دریا کے کنارے واقع چند دیہات میں بولی جاتی ہے ایک جغرافیائی قرب کے سوا کوئی اور تعلق نہیں۔ عوامی روایت ہے کہ یہ بولی کئی سو برس پہلے سوات سے یہاں آئی تھی: (۲) کچھ اسی قسم کی بولیاں، جن کے باقی ماندہ آثار ذرا اور آگے جنوب میں پائے جاتے ہیں، یعنی دریائے پیچ کے کنارے نیکلام ہیں (یہ بولی اب تقریباً معدوم ہو چکی ہے) اور شمشات میں، جو شمال مشرق پشی علاقے میں بولی جاتی ہے۔

(۴) (۵) پشی زبان، جس کی متعدد بولیاں ہیں جو ایک دوسری سے بہت مختلف ہیں اور مشرق میں دریائے کٹر کے زیریں علاقے سے شروع ہو کر نغمان سے ہوتے ہوئے دریائے پنجشیر کے کنارے گل بہار

ہوتی ہیں، جن میں سب سے ذاتی تحریر تقریباً ۱۸۳۰ء کی ہے۔ ان زبانوں کی بیزوں کے لیے ایسی کتب صرف و نحو، فرهنگوں اور نظم و نثر کے مجموعوں کی جو تمام ضروریات کو پورا کر سکیں بہت کمی ہے۔

دردی اور کافری زبانوں کی ریگل تقریبی طبقہ بندی ذیل کے طریقے پر کی جا سکتی ہے:

۱۔ کافری لسانی طبقہ: (۱) کئی (بشکلی) زبان، جس کی دو خاص بولیاں ہیں اور جو شمالی نورستان (کافرستان) میں ریگل، کلم یتوی اور بشگل کی وادیوں میں بولی جاتی ہیں: (ب) پُرس (وسی - ویری؛ ویرن)، جس کا تکلمی علاقہ وادی یتوی کے کئی لوگوں اور بشگل والوں کے درمیان واقع ایک چھوٹی سی وادی میں ہے: (ج) آشگون بولی (اور اس کے ساتھ وامانی بولی)، جو وادی کئی کے جنوب میں آنگر اور پیچ Peet دریاؤں کے درمیان علاقے کی بولی ہے: (د) وے گلی بولی (وے والا)، پُرس کے جنوب مشرق میں وادی وے گل میں ایک اور ذرا مختلف بولی، جو خاصی قابل توجہ ہے اور خاص طور سے گہری بولی، جو وے گل کے مشرق میں کٹر کی طرف وادی ترے گم میں بولی جاتی ہے۔ یہ بولی عام وے گلی بولی سے بہت سی باتوں میں مختلف ہے۔ کافری زبانیں یقیناً بہت قدیم زمانے سے الگ الگ وادیوں میں رائج رہی ہیں۔

ان میں سے مذکورہ (ج) و (د) بمقابلہ (۱) و (ب) بولیوں کے بیرونی اثرات کی زد میں زیادہ رہی ہیں اور مؤخر الذکر زبان میں ایسے زبردست صوتی تغیرات واقع ہوئے ہیں کہ وہ نزدیک ترین ہمسابوں کے لیے قابل فہم نہیں رہی۔

کا سلسلہ مشرق کی طرف بلتستان میں دراس اور داہ ہٹو میں جا کر محدود اور منقطع ہو گیا ہے۔ اس سے پہلے یہ سلسلہ لیہ سے آگے تک بھی جا پہنچا تھا؛ (ف) پھلورا بولی، مذکورہ (ع) بولی کی ایک قدیم شاخ ہے، جو چترال کے جنوب مشرق علاقے میں چند دیہات میں بولی جاتی ہے۔ اس کی ایک ہم رشتہ ساوی بولی گورباتی کے جنوب میں بولی جاتی ہے؛ (ص) ڈماکی، مہرہ کی ڈوم اقوام کی بولی (یعنی گائے بجانے والوں اور لہاروں کی)، جو بروہسکی بولتی ہیں، اس پر مذکورہ بولی (ف) کا اثر بڑا ہے، لیکن ذرا آگے کے جنوبی علاقے کی زبانوں کے ساتھ اس بولی کے مخلوط قسم کے رشتے ہیں۔

(ز) (ق) کشمیری: وادی کشمیر کی زبان؛ اس کی ایک بولی گشتوازی ہے، جسے صحیح معنی میں ایک بولی کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ دوسری بولیاں بھی ہیں، جن پر ڈوگری وغیرہ کا بہت زیادہ اثر ہے۔

ان زبانوں کے تسمیے اور ان کی طبقہ بندی پر محققین نے بہت بحثیں کی ہیں۔ ای۔ کوہن E. Kuhn نے ایک اہم مقالے میں جو *Album Kern* (۱۸۸۲ء) میں شائع ہوا تھا، ان زبانوں اور بولیوں کو ایک محتاط جغرافیائی عنوان ”ہندوکش کی بولیاں“ کے تحت رکھا ہے۔ فیشل Pischel نے *Grammatik der Prakrit-Sprachen* میں ۲۸ء پر انھیں ”دردو اور کافری بولیاں“ کہا ہے اور اس عنوان میں لفظ درد ان وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے جو لسانیات میں اس وقت سے مقبول رہا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ یہ بولیاں پراکرت کی نام نہاد پساجا بولی سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس نظریے کو گریئرسن Grierson نے مطبوعات کے ایک سلسلے میں آگے بڑھایا، لیکن اس کی تائید میں معقول لسانیاتی دلائل پیش نہیں کی گئیں۔ گریئرسن کا عقیدہ ہے کہ درد (با) ”جدید پساجا“ زبانیں ہند آریائی نہیں، بلکہ ان میں متعدد ایرانی خصوصیات موجود ہیں اور یہ کہ ان بولیوں سے

تک کے علاقے میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ان کے بولنے والوں کی تعداد کا تخمینہ گریئرسن Grierson کی *Linguistic Survey of India* میں ایک لاکھ درج کیا گیا ہے۔ پشٹی زبان نکرعازاء، لمپا کا اور کپشا کے ہندو اور بدھ تمدن کی قدیم زبانوں سے نکلی ہے اور اس زبان کی مشرق اور مغربی بولیوں کے درمیان الفاظ کے لحاظ سے نمایاں فرق ہے۔ پشٹی سلسلے کی بولیوں کے چند اسمائے عدد البیرونی کی تحقیق مالہند میں آئے ہیں۔

(۵) (ک) بشکریک (گوری/گڑوی): دیر کے اوپر کی طرف بالائی پنج کورہ وادی میں اور وادی سوات کے دریاؤں کے ابتدائی علاقے میں تین دیہات کی بولی؛ (ل) توروالی: بشک کے نیچے واقع وادی سوات کے بالائی علاقے کی؛ (م) میا، جس کے ساتھ کئی متعلقہ بولیاں شریک ہیں (کنیا والی، دیہری، چلس، گورو وغیرہ)، وادی سندھ کے علاقے میں بولی جاتی ہے جو شنا زبان اور پشتو زبان کے علاقوں کے درمیان واقع ہے۔ میا کو کوہستانی بھی کہتے ہیں، لیکن یہ نام مذکورہ بولیوں (ک) اور (ل) کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور بعض باتوں میں یہ زبان بولی (ع) کے قریب ہے؛ (ن) ووتاپوری (تقریباً معدوم) اور کنار قلائی، دریاے بیچ کے ساحلی اور قریبی علاقوں میں دریاے کٹر کے زیریں جانب چغہ سرائی کے اوپر کی طرف جو (ک) اور (ل) سے مربوط، لیکن ایک زیادہ عام لہندا بولی کی قسم کی ہے؛ (س) تراہی، جو جلال آباد کے جنوب مشرق میں چند دیہات میں بولی جاتی ہے۔ اس بولی کو آفریدیوں نے تراہ سے خارج کر دیا تھا اور شاید یہ بولیوں کے ایک ایسے سلسلے کی یادگار ہے جو کسی زمانے میں وہاں سے شروع ہو کر پشاور کے ضلع سے ہوتے ہوئے سوات اور دیر کے اندر تک پھیلا ہوا تھا۔

(۶) (ع) شنا زبان؛ اس کی کئی بولیاں ہیں، جو گلگت اور چلاس وغیرہ میں بولی جاتی ہیں اور جنوب کی طرف کشمیر میں گریز تک پھیلی ہوئی ہیں اور ان

معمولی ش اور سنی یا سخت کامی ش (\$) کا باہمی امتیاز، یا مثلاً مغربی بولیوں میں قدیم ست اور شت کا تحفظ۔ مجبوراً حروف صامت میں ہائے مخلوط کی خفیف سی کیفیت کا بعض دردی بولیوں میں محفوظ نہ رہنا بعد کی چیز ہے اور ان بولیوں میں سے اکثر میں اس ہائے مخلوط کی کم از کم ایک خفیف سی کیفیت محفوظ رہی ہے۔ کوئی ایک مشترک خصوصیت بھی ایسی نہیں جو دردی زبان کو مجموعی طور پر باقی ہند آریائی زبانوں سے ممتاز قرار دیتی ہو اور خود دردی لسانی علاقے میں لسانیاتی جغرافیائی خطوط کا جو جال بچھا ہوا ہے وہ اکثر صورتوں میں تاریخی دلچسپی کی چیز ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم موصلاتی خطوط اور ساتھ ہی موصلاتی موانع کیا تھے۔ دردی ایک عام سانام ہے جس سے متفرق ہند آریائی پہاڑی زبانوں کے ایک پورے گروہ کی باستانی نشان دہی ہو جاتی ہے، حالانکہ یہ زبانیں ایک دوسرے سے بالکل الگ تھلک رہی ہیں اور اس طرح منقطع رہنے کی یہ کیفیت بہت سی صورتوں میں پٹھان قبائل کے حملے سے اور بھی بڑھتی رہی ہے، چنانچہ یہ زبانیں ہند آریائی ”مدھا دیش“ کے نئے تصرف کی بڑھتی ہوئی اثر اندازی سے کم و بیش محفوظ رہ کر اپنے ذاتی ارتقا میں آزاد رہی ہیں۔

کافری لسانی سلسلے (۱) میں صورت حال بالکل مختلف رہی ہے، اگرچہ اس سلسلے کی زبانیں ہند آریائی (دردی) الفاظ اور ان کی ہیئتوں سے بہت زیادہ گراںبار رہی ہیں۔ پھر بھی ان بولیوں میں کئی خصوصیات، جو مسلم طور پر غیر ہندی ہیں، محفوظ چلی آتی ہیں۔ ان بولیوں میں سہوس اور مجبوراً حروف صامت میں ہائے مخلوط کی کیفیت کا کامل طور پر معدوم ہو جانا (جیسے کئی کا لفظ ”گر“ (=خر)؛ ”دیوم“ (=دھواں)؛ جنوبی کلشہ میں ”غار“، ”دھوم“) ایک نہایت قدیم دور کی چیز قرار پائے گی، اس لیے کہ ہمیں ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں جیسے کئی میں زم (=برق)؛

ہند ایرانی سلسلے کی ایک تیسری شاخ کی تشکیل ہوتی ہے۔ گریٹر سن دردی اور کافری زبانوں کی تقسیم اس طرح کرتا ہے: (۱) کافری لسانی طبقہ (= ۳، ۴، ۵) + (۶) و (۷)؛ (ب) خوار (= (۸)؛ (ج) دردی طبقہ (= ۹، ۱۰)۔ اس کی یہ طبقہ بندی تازہ تالیفات میں مجموعی طور پر تسلیم کر لی گئی ہے، مثلاً *Les langues du monde* کی طبع دوم، ۱۹۵۲ء میں اسے مانا اور سراہا گیا ہے، اور محمد شہید اللہ کے مقالے *Indian Linguistics* میں بھی، جو *Turner Jubilee volume* (۱۹۵۹ء، ۲: ۱۱۷) میں شائع ہوا ہے۔ لیکن دوسری طرف سٹین کونوف Sten Konow نے *JRAS* (۱۹۱۱ء، ص ۱، پیمنہ) میں بشکلی (کئی) کی بعض ایسی خصوصیات کی طرف توجہ دلائی ہے جو بلاشبہ غیر ہندی ہیں اور یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ زبان ایرانی الاصل ہے۔ اس نے گریٹر سن سے اس بات میں اتفاق کیا ہے کہ اس پورے لسانی طبقے کو ہند آریائی سے الگ سمجھنا چاہیے۔ آخر میں سکولڈ (ZDMG) Skold نے *JRAS* (۱۹۱۱ء، ۱۸۱) نے بحث کو یہاں تک پہنچایا ہے کہ حقیقی کافری لسانی طبقہ (۱) ہند ایرانی بھی قطعاً نہیں ہے، بلکہ ہند یورپی لسانی خاندان کی ایک الگ شاخ ہے۔

خط مبحث سے بچنے کے لیے کافری لسانی طبقہ (۱) اور باقی بولیوں (دردی، ۲ تا ۷) کے درمیان امتیاز قائم کرنا ضروری ہے۔ مؤخر الذکر زبانیں مذکورہ بولی (ز) میں کافری زبان کے اختلاط کی بعض صورتوں کو چھوڑ کر اور مذکورہ بولیوں (۵) اور (ج) میں چند شاذ حالتوں کے سوا ایسی صفات کی حامل قطعاً نہیں جن کا اخذ و اشتقاق قدیم ہند آریائی سے ثابت نہ کیا جا سکے۔ ان بولیوں میں متعدد قدیم خصوصیات، جو بہت نمایاں ہیں، محفوظ رہی ہیں اور یہ ایسی خصوصیات ہیں جو اکثر پراکرت بولیوں میں بہت پہلے سے معدوم ہو چکی تھیں، مثلاً نہ صوتی س،

اسی نوع کے بیانات ابن بطوطہ کے ہاں بھی نظر آتے ہیں، جو اس کے ذاتی مشاہدات پر مبنی ہیں۔ جواہرات میں موتی کو بڑا اونچا مقام دیا جاتا ہے اور اس کا امتیازی وصف یہ ہے کہ یہ حیوانی ہے، ترائی نہیں۔ التفاشی نے موتیوں کے محاسن اور نقائص کا مفصل ذکر کیا ہے۔ التفاشی بتاتا ہے کہ سیب گھونگے کی ان تہوں میں سے کیسے حاصل کیا جاتا ہے جن سے اس کی ساخت ہوتی ہے۔

موتی کے بعض نہایت سودمند طبی خواص بھی بیان کیے گئے ہیں۔ یہ اختلاج قلب اور مالیخولیا میں مفید ہے، اعصاب کو مضبوط کرتا ہے، درد سر کو رفع کرتا ہے اور ایسے پانی میں حل کر کے لگائے سے جذام بھی دور ہو جاتا ہے۔ عرق لیموں اور سرکہ کی مدد سے انہیں حل کیا جاسکتا ہے۔

مسلمان فرمانروا نہ صرف اس کی قیمت کی وجہ سے ان کی بہت قدر کرتے تھے (اکبر کے خزانے کے موتیوں کی اقسام اور ان کی قیمتوں کے بارے میں دیکھیے آئین اکبری، ج ۱، آئین اول) بلکہ اس لیے بھی کہ موتی پاکیزگی کی علامت ہے۔ اسلامی ہند میں خالص شگ سرس یا روغنی پتھر سے بنی ہوئی مسجد کو موتی مسجد کہتے تھے۔ قدیم ہندوؤں کے ہاں موتی کی پیدائش کے بارے میں یہ روایت ملتی ہے کہ ماہ اکتوبر میں جب آفتاب سماک الرامح (Arcturus) منسکرت : سوائی میں ہوتا ہے تو اس وقت اگر بارش کے کچھ قطرے سیپوں کے اندر جا پڑیں تو ان سے موتی بن جاتے ہیں۔ [انہیں کی نقل میں] یہ روایت ہندوستانی مسلمانوں کی تصانیف میں بھی دیکھنے میں آتی ہیں۔

مآخذ : (۱) *Das Steinbuch des Aristoteles* طبع Ruska، ص ۹۶، ۹۷، ۱۰۳ : (۲) رسائل اخوان الصفا، مطبوعہ بسبی، ۲ : ۷۵ : (۳) المسعودی : مروج، ۱ : ۳۲۸ : (۴) الادریسی، طبع Jaubert، ۱ : ۱۵۷ : ۳۷۷ : (۵) ابن بطوطہ، ۲ : ۲۸۸ : بحد : (۶) الغزونی :

ج ۸، (Torwali) : (۲۲) تراہی (وہی کتاب، ج ۱۷) : (۲۳) بش کریک Bashkarik ج ۱۸ : (۲۴) وہی مصنف : *Det Norske Videnskaps-Akademi Oslo Skrifiser*، Phalade Hist. Etas. Klasse (۲۵) : (۲۶) ج ۱ : (۲۷) وہی مصنف : *Gawar-Bati Indo-Iranian Frontier Languages : Pashai texts and vocabulary* : ۳ : ۲ : ۳ (G. MORGENSTIERNE)

۱۰ دردیبرتہ : سلسلہ خاوتیہ کی مصری شاخ کا نام نیز [رک بہ طریقہ]۔
۱۱ الدر : موتی۔ اس کی اصل کے بارے میں اساطیری افسانے ارسطو کی Petrology کے علاوہ بہت سے عرب مصنفین کے ہاں ملتے ہیں (دیکھیے مآخذ)۔۔۔ ان حکایات میں بعض حقائق بھی نظر آتے ہیں، مثلاً یہ کہ سیب کا بالائی حصہ اگرچہ کھردرا اور ناصاف ہوتا ہے، تاہم اندر سے یہ ہموار اور چمکدار ہوتا ہے اور موتی اسی مادے سے بنتا ہے جس کی تہہ اس کے اندرونی حصے پر بچی ہوئی ہے، یا یہ کہ موتی میں ایک کیڑا ہوتا ہے (اب یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ سیب میں موتی اسی وقت بنتا ہے جب وہاں طفیلی کیڑے موجود ہوں)۔

المسعودی پہلا مصنف ہے جس نے بحر ہند کے مختلف مقامات میں موتیوں کی موجودگی کا ذکر کیا ہے۔ اس نے خلیج فارس سے موتی نکالنے کا حال بھی قلمبند کیا ہے۔ اس سلسلے میں اس نے مروج میں اپنی ایک سابق تصنیف کا حوالہ دیا ہے، جس کے مندرجات التفاشی سے مقتبس کتاب الاحجار، از یحییٰ بن ماسویہ، سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں۔ المسعودی کی رو سے موتی فقط بحیرہ حبش کے ساحل پر خارک سے، خلیج فارس میں، نیز قطر، عمان اور سرندیپ سے نکالے جاتے تھے۔ اس نے بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے کہ کہ غوطہ خور کس طرح موتی نکالا کرتے تھے۔

عجائب المخلوقات، طبع Wüstenfeld، ۱ : ۱۱۵، ۲۲۳ :
 (۷) الدمشقی : *Kosmographie*، طبع Mehren، ص ۷۷
 وغیرہ : (۸) النقاشی : *أزهار الأفكار*، مترجمہ Baineri
 Biscia، ص ۶ : (۹) ابن البطار، در Notices : Leclerc
 et extr. : Clément-Mullet (۱۰) : ۲۳۸ : ۱/۲۶ :
sur la min. arabe در JA، سلسلہ ششم، ۱۱ (۱۸۶۸) :
 ۱۶ : (۱۱) Mokri، *La pêche des perles dans*
le golfe Persique در JA، ۲/۳۲۸ (۱۹۶۷) :
 ۳۸۱ تا ۳۹۷، جس میں مآخذ بھی دیے ہوئے ہیں : (۱۲)
Le symbole de la perle dans le folklore
persan، در کتاب مذکور، کراسہ م : ص ۶۳ تا ۸۱ :
 موتیوں کی تجارت کے لیے رگ بہ تجارت۔

(J. RUSKA)

* قُرّانی : ایک افغان قبیلہ، جس کا نام پہلے ابدالی
 تھا، پھر احمد شاہ درّانی نے اسے بدل کر درّانی کر دیا
 (دیکھیے ابدالی، احمد شاہ، افغانستان) اس قبیلے کے
 لوگوں کو ہرات سے نادر شاہ نے منتقل کیا اور قندھار
 کے علاقے میں الہیں زمینیں عنایت کیں۔ اس زمانے میں
 یہ خانہ بدوش چرواہے تھے، مگر بارہویں صدی ہجری/
 اٹھارہویں صدی عیسوی میں انہوں نے زراعت کا
 پیشہ اختیار کرنا شروع کر دیا۔ ان کے وسیع مالی اور
 اقتصادی حقوق احمد شاہ اور تیمور شاہ کی حکومت
 میں بدستور قائم رہے بلکہ اور بھی بڑھا دیے گئے
 جب کہ درّانی قبیلہ شاہی حکومت کا سب سے
 بڑا حامی اور معاون بن گیا، اس زمانے میں انہوں نے
 اپنے زرعی مقبوضات ان اضلاع میں بھی بڑھا لیے
 جو قندھار سے زیادہ فاصلے پر تھے، مثلاً زمین داور،
 نیش، تیرین، اور اصل مزارعوں (تاجیک، پارسیان،
 بلوچی، کاکڑ وغیرہ) کو زبردستی مستاجر یا اجیر بنا
 کر ان سے کام لیا، جس طرح کہ یہ لوگ قندھار سے
 قریب تر علاقوں میں کرتے رہے تھے لیکن اٹھارہویں
 صدی کے آخری حصے میں، اور بالخصوص جب کہ

دارالسلطنت قندھار سے کابل منتقل کر دیا گیا اور
 افغانوں کا دور دور پھیلنا بند ہو گیا، مرکزہ حکومت
 نے درّانی سرداروں کی طاقت گھٹانی شروع کر دی
 اور آمدنی بڑھانے کے لیے درّانیوں کو حکومت کم
 مالگزاری ادا کرنے میں جیلہ بہانہ کرنے سے روک
 دیا گیا۔ درّانیوں نے حکومت کے اس طرز عمل کے
 خلاف سخت احتجاج کیا اور یہی مقاومت اٹھارہویں
 صدی عیسوی کے آخر اور انیسویں صدی عیسوی کے
 آغاز میں خانہ جنگیوں کا ایک باعث بنی، جس میں
 درّانیوں کا بڑا نقصان ہوا۔ قندھار کے بارک زئی
 سرداروں کے عروج کے وقت (۱۲۳۳-۱۲۳۸/۱۸۱۸ تا
 ۱۲۵۵/۱۸۳۹ اور ۱۲۵۹/۱۸۳۳ تا
 ۱۲۷۲/۱۸۵۵) درّانی سرداروں کی طاقت اور
 بھی گھٹ گئی کیونکہ انہیں انتظامیہ اور فوجی
 عہدوں سے محروم کر دیا گیا، نیز آبپاشی کے لگان
 اور اس پر حکومت کے اختیارات بتدریج بڑھتے چلے
 گئے۔ یہی طرز عمل اس وقت بھی جاری رہا جب
 قندھار کو کابل کے علاقوں میں شامل کر دیا گیا۔
 قندھار سے فاصلہ جتنا زیادہ ہوتا جاتا، اتنا ہی یہ
 طرز عمل کم کامیاب نظر آتا تھا۔

درّانی قبیلے کی شاخوں کی تقسیم کی بابت حال
 کی کوئی اطلاع نہیں ہے، اور یہ فرض کر لیا گیا ہے
 کہ یہ نو آبادیوں کے اندر مدغم ہوتی چلی گئیں۔
 انیسویں صدی کے وسط تک جو واقع زمانہ گزرا ہے اس کی
 بابت معلومات موجود ہیں۔ الفنسٹن Elphinstone
 کے کہنے کے مطابق یہ قبیلہ برائے نام دو شعبوں میں
 بٹا ہوا تھا (زبرک اور پنج باڑ)۔ اگرچہ قدیم زمانے ہی
 سے اس تقسیم کی کچھ اہمیت نہ تھی، اس کے سوا
 کہ نسل یا خاندان کو ظاہر کرے، شاخ زبرک کے لوگ
 زیادہ مقتدر اور مالدار تھے۔ اس میں تین باوقعت
 خاندان تھے : پوپلزئی، علیکو زئی اور بارک زئی۔
 کولٹہ۔ پشین کے ضلع میں سلسلہ کردہ خواجہ آوران

بعض خاندانوں کی طرح کبھی مٹ بھی جاتے تھے یا ایک دوسرے میں مدغم ہو کر نئے گروہ بنا لیتے تھے۔
 مآخذ : (۱) دیکھیے مقالہ افغانستان، نیز واقعات
 دراچی، کانپور ۱۲۹۲ھ : (۲) *Caubool* : M. Elphinstone
 لندن ۱۸۳۹ء : (۳) *History of the Afghans* : B. Dorn
 لندن ۱۸۳۶ء : (۴) *Central Asia* : C. M. Macgregor
 ج ۲ 'Afghanistan' کلکتہ ۱۸۷۱ء، بالخصوص
 ضمیمہ ص ۳ : (۵) *Report on the* : H. Rawlinson
Imperiya : Yu. V. Gankovski (۶) *Dooranees* . . .
 Durrant، ماسکو ۱۹۵۸ء۔

(M. E. YAPP)

دُرّہ خَیبر : رگ بہ خَیبر، درہ۔

دراچی زادہ : اٹھارہویں/یسویں صدی عیسوی
 کے عثمانی علما کے ایک گھرانے کا خاندانی نام،
 جس کے پانچ افراد نے شیخ الاسلام [رگ بان] کا
 عہدہ کم از کم نو مختلف موقعوں پر ۱۷۳۴ء اور
 ۱۸۱۵ء کے درمیانی برسوں میں سنبھالا۔ ان میں سے
 پانچ مؤرخان ذکر کا حال یہاں بیان کیا جا سکتا ہے جو
 حسب معمول قاضی استنبول، انادولو کے قاضی عسکر
 اور روم ایلی کے قاضی عسکر کے عہدوں سے رفتہ رفتہ
 ترقی کرتے کرتے ملتا تھا۔

(۱) درّی محمد افندی، یہ ایک شخص مسمی
 بہ الیاس کا بیٹا تھا، اس کی تاریخ اور مقام ولادت
 معلوم نہیں (سجل عثمانی میں جو بیان کیا گیا ہے
 کہ وہ انقرہ کا باشندہ تھا غالباً "دوحہ" (Dewha)
 کو غلط پڑھنے کا نتیجہ ہے)۔ جب وہ دوسری دفعہ
 روم ایلی کا قاضی عسکر تھا تو اس وقت ۲ جمادی الآخرہ
 ۱۱۴۷ھ/۳۱ اکتوبر ۱۷۳۴ء کو پہلے عہدے دار
 اسحق افندی کی وفات کے بعد اسے شیخ الاسلام
 مقرر کیا گیا۔ شوال ۱۱۴۸ھ/فروری۔ مارچ ۱۷۳۶ء
 میں اس پر سکّے کا دورہ پڑا اور وہ ملازمت سے
 دست بردار ہونے پر مجبور ہو گیا، چنانچہ اسی سال

کی شمالی ڈھلانوں پر جو ایک زئی بستے ہیں
 وہ بارک زئی کی ایک شاخ ہیں جس کی بابت فرض
 کر لیا گیا ہے کہ اسے احمد شاہ نے الگ کیا تھا۔
 الفسٹن کے بیان کے مطابق پنج پاو کے خاندان نور زئی،
 علی زئی، اسحق زئی، خُگانی اور مگو تھے ان میں
 سے آخری دو کی بابت کچھ بونہی سی اطلاع ہے
 اگرچہ قندھار کے ۱۸۵۷ء تک کے لگان کے اندراجات
 میں بھی ان کی الگ اور ممتاز ہستیاں نظر آتی ہیں۔
 پنج پاو کے دوسرے خاندان زیادہ تر اور بھی آگے کے
 مغربی خطوں میں رہتے تھے۔ علی زئی زمیںدار اور
 کے حاصل خیز صوبے میں تھے جہاں وہ اسیویں
 صدی عیسوی کے اوائل میں آ کر بس گئے تھے،
 اسحق زئی گرم سیر میں جو زیریں تر ہلند کے
 اوپر ہے اور نور زئی جو دیگر قبیلوں سے زیادہ
 مدت تک خانہ بدوش زندگی بسر کرتے رہے، قندھار
 کے مختلف شمالی خطوں (لش، یوین) میں گرم سیر
 کے اندر اور مغرب کی جانب قراہ اور ہرات میں
 بود و باش رکھتے تھے۔ زیرک کے خاندان قندھار
 کے زیادہ قریب تھے، اگوچہ ان کا میلان دوسرے
 خطوں کے اندر پھیل جانے کی طرف بھی تھا، مثلاً
 بارک زئی، جو در اصل وادی آرخسان میں، جو
 قندھار کے جنوب میں ہے، بستے تھے، قلند میں
 بھی آباد تھے اور پوپلزئی جو ترنگ اور آرخسان
 کی زیریں تر وادی میں رہتے تھے، رفتہ رفتہ ترین اور
 قندھار کے شمال کے دیگر پہاڑی علاقوں میں بھی
 پہنچ گئے تھے۔ علیکو زئی وادی ترنگ میں جلدک
 تک، جو غلزیوں کے علاقے کی سرحدوں پر ہے،
 رہتے تھے اور مغرب میں قلند تک آباد تھے، یہ
 متفرق خاندان آگے چھوٹے چھوٹے گروہوں میں، جو
 ان کے ماتحت تھے، بنے ہوئے تھے۔ پوپلزئیوں میں
 سدو زئی کل شاہی خاندان شامل تھا اور ممکن ہے کہ
 بامہ زئی بھی ان میں شامل ہو۔ یہ اندرونی گروہ خود

پایا جاتا ہے (عدد ۳۰۸، واصف، ۱: ۸۳ الف، ۹۱ الف، ۲۱۰ ب، ۲۹۰ الف و ۲۸۵ الف، جودت، ۱: ۷۸، ۷۹)۔

(۳) دُری زادہ سید محمد عطاء اللہ افندی : مذکورہ بالا دُری زادہ کا دوسرا فرزند۔ وہ ۱۱۳۲ھ/ ۱۷۲۹-۱۷۳۰ء میں پیدا ہوا۔ روم اہلی کے قاضی عسکر کا عہدہ دوبارہ سنبھالنے کے بعد ۱۷ جمادی الآخرہ ۱۱۹۷ھ/ ۲۰ مئی ۱۷۸۳ء کو وہ شیخ الاسلام مقرر کیا گیا اور ۲۰ جمادی الاولیٰ ۱۱۹۹ھ/ ۳۱ مارچ ۱۷۸۵ء تک اس عہدے پر فائز رہا۔ اس وقت اس پر خلیل حامد پاشا کے ساتھ ساز باز رکھنے کا شبہ کیا گیا۔ یہ وزیر اس سازش میں شریک تھا جو سلطان عبدالحمید اول کو تخت سے اتارنے کے لیے کی گئی تھی : اس بنا پر اسے اس کے عہدے سے برطرف کر کے گیلی پولی بھیج دیا گیا اور اس کے ساتھ ہی حکم جاری کیا گیا کہ وہ حج کو چلا جائے۔ بہرحال وہ گیلی پولی پہنچ کر تھوڑے ہی دن بعد کسی قسم کے استسقا کے عارضے میں مبتلا ہو کر فوت ہو گیا۔ اس کی وفات کی خبر استانبول میں ۶ رجب ۱۱۹۹ھ/ ۱۵ مئی ۱۷۸۵ء کو پہنچی (جودت، ۲: ۷۱، ۳۰۹، ۳۱۷ : اسمعیل حق اوزون چار شیلی، در TM، ۵ (۱۹۳۵ء) : ۲۵۱، نے انک انوالہ کا ذکر کیا ہے کہ اسے زہر دیا گیا تھا)۔

(۴) دُری زادہ سید محمد عارف افندی : مذکورہ بالا دُری زادہ کا چھوٹا بیٹا۔ وہ ۱۱۵۳ھ/ ۱۷۴۰-۱۷۴۱ء میں پیدا ہوا اور ۲۴ رمضان ۱۱۹۸ھ/ ۱۳ اگست ۱۷۸۳ء کو روم اہلی کے قاضی عسکر کے عہدے پر پہنچ گیا۔ ۱۷ شوال ۱۱۹۹ھ/ ۲۳ اگست ۱۷۸۵ء کو اسے شیخ الاسلام مقرر کیا گیا، مگر ۱۰ ربیع الآخر ۱۲۰۰ھ/ ۱۰ فروری ۱۷۸۶ء کو اسے اس عہدے سے برطرف کر دیا گیا، کیونکہ وہ سیاسی کارروائیوں میں حصہ لیتا تھا۔ اس کے لیے حکم ہوا

ذوالحجہ/اپریل مئی میں وہ اپنے عہدے سے مستعفی ہو گیا۔ ۱۱۳۹ھ/ ۱۷۲۶-۱۷۲۷ء میں اپنے گھر پر بمقام اُسکودار اس نے وفات پائی اور قرآنچہ احمد کے مقبرے میں دفن کیا گیا (صہبی، ورق ۶۲ ب، ۷۱ ب)۔

(۲) دُری زادہ مصطفیٰ افندی : مذکورہ بالا دُری کا فرزند تھا، جس کی ماں سابق قاضی عسکر عبدالقادر افندی کی دختر تھی۔ وہ ۱۱۱۳ھ/ ۱۷۰۲-۱۷۰۳ء میں پیدا ہوا۔ پہلے دو مرتبہ روم اہلی کا قاضی عسکر ہوا، پھر ۲۱ شوال ۱۱۶۹ھ/ ۱۹ جولائی ۱۷۵۶ء کو شیخ الاسلام مقرر کیا گیا، مگر دوسرے ہی سال ۲۸ جمادی الاولیٰ (۱۸ فروری ۱۷۵۷ء) کو اسے اس عہدے سے معزول کر کے گیلی پولی میں جلاوطن کر دیا گیا۔ دوسری بار اس عہدے پر اس کا تقرر ۵ شوال ۱۱۷۵ھ/ ۲۹ اپریل ۱۸۹۲ء سے ۲۴ ذوالقعدہ ۱۱۸۰ھ/ ۲۳ اپریل ۱۷۶۷ء تک رہا : ۱۵ ذوالحجہ ۱۱۸۷ھ/ ۲۷ فروری ۱۷۷۴ء کو وہ تیسری بار پھر شیخ الاسلام مقرر کیا گیا۔ بڑھاپے کی وجہ سے کمزور ہو کر ۲۲ رجب ۱۱۸۸ھ/ ۲۸ ستمبر ۱۷۷۴ء کو اس نے کام چھوڑ دیا اور اسی سال ۷ ذوالحجہ ۸ فروری ۱۷۷۵ء کو وفات پائی۔ اس کی شادی سابق شیخ الاسلام پشماقچی زادہ عبداللہ افندی کی دختر سے ہوئی تھی، جو اولاد رسول میں سے ہونے کا مدعی تھا۔ اس بیوی کے بطن سے جو اولاد ہوئی وہ سید کے لقب سے سرفراز کی گئی۔

۱۱۷۹ھ/ ۱۷۶۵-۱۷۶۶ء میں اس نے پنی قبی کی مسجد کو بحال کیا (حدیث الجوامع، ۱: ۲۳۷) اور بظاہر اس نے ادرند قبی سی کے باہر لعلی زادہ کے فوارے کے قریب ایک خاندانی مقبرے کی بھی بنیاد رکھی۔ فقہ کی ایک کتاب درۃ بیضاء بھی اس کی طرف منسوب کی گئی ہے (عثمانی مؤلفاری، ۱: ۳۰۸) اور ایک عربی رسالے کا اس کا کیا ہوا ترجمہ مذہب قبی امانت خزینہ سی کے مجموعہ مخطوطات میں

۱۱/۵۱۲۴۴ نومبر ۱۸۳۸ء میں اس نے وفات پائی اور قراچہ احمد کے مقبرے میں اپنے پردادا کے قریب دفن کیا گیا (شانی زادہ، ۱۳۶۱: ۳۹۹ و ۲: ۱۱۳، ۲۳۹: لفظی افندی، ۱۵۳: خضر الیاس، ص ۸)۔

مآخذ: اس خاندان کے قریب جالیں ارکان نے عثمی مکاسب (اشغال) میں مختلف مراتب کے عہدے سنبھالے، تفصیلی حالات سبجی عثمانی کے ذیل کے حوالوں میں سے ڈھونڈ کر نکالے جا سکتے ہیں، اگرچہ اتنی احتیاط کے لیے اشارہ کر دینا بہان ضروری ہے کہ کسی تفصیل کو اور خصوصاً تاریخوں کو قبول نہ کرنا چاہیے جب تک کہ اس کی تائید کسی اور ماخذ سے نہ ہو جائے: ۱: ۳۳۶، ۳۹۹: ۲: ۳۳۸، ۳۹۶، ۱۳۶: ۲۴۲، ۲۶۷، ۲۶۳، ۳۹۶، ۴۷۶، ۴۷۵: ۵۸۶ (نور اللہ افندی) ۶۲۷: (۲) مستقیم زادہ سلیمان سعد اندین افندی (مع تکملہ جات منسب افندی اور رفعت افندی): دوحۃ المشائخ، طبع منگی، استانبول، بدون تاریخ، ص ۱۱ (متن پر از اشلاط)، ۱۰۰، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۲۲ - ان کے فتاویٰ کے نمونے جن کا ذکر اس مقالے میں کیا گیا ہے، علمیہ سالنامہ سی، استانبول ۱۳۳۳، ص ۵۱۵، ۵۲۹، ۵۵۱، ۵۵۳، ۵۷۵ میں مل سکتے ہیں: (۳) I. H. Izahli Osmanli tarihi Kronolojisi: Danismend استانبول ۱۹۹۱ء، ہمد اشارہ: (۴) اسمعیل حتی اوزون چارشلی: عثمانی تاریخ، ۲/۳، انقرہ ۱۹۵۹: ص ۳۷۲، ۳۸۸، ۵۰۱، ۵۰۲: (۵) F.F. Karatay: Topkapı Sarayı Müzesi Kütüphanesi Türkçe yazmalar kataloğu، استانبول ۱۹۹۱ء۔ جن تصانیف کا مقالے میں ذکر کیا گیا ہے وہ یہ ہیں: (۶) محمد صبحی افندی: تاریخ، استانبول ۱۹۹۸: (۷) احمد و امف افندی: تاریخ، ۲ جلدیں، استانبول ۱۹۱۹: (۸) احمد جودت پاشا: تاریخ، ۱۲ جلدیں، استانبول ۱۲۷۰ تا ۱۳۰۰: (۹) ایوان سرائی حافظ حسین افندی:

کہ حج کو چلا جائے۔ اس کے بعد اسے کوتاہیہ میں جلاوطن کر کے زبردستی وہیں رکھا گیا۔ ۱۲۰۵/۱۷۹۰-۱۷۹۱ میں اسے واپس استانبول آنے کی اجازت مل گئی، جب کہ اس کے مخالف شیخ الاسلام حمیدی زادہ مصطفیٰ افندی کو اس کے عہدے سے معزول کیا گیا اور ۲۲ ذوالقعدہ ۱۲۰۹/۱۲ جولائی ۱۷۹۲ء کو اسے پھر مسند مشیخت پر بٹھا دیا گیا۔ جب نپولین نے مصر پر حملہ کیا تو عارف افندی کو مصر کی جنگی تیاری میں کوتاہی کا ذمے دار قرار دے کر معزول کر دیا گیا اور اس کے عہدے پر ۱۸ ربیع الاول ۱۲۱۳/۳۰ اگست ۱۷۹۸ء کو کسی اور کو مقرر کر دیا گیا۔ بورسہ میں چند ماہ جلاوطن رہنے کے بعد وہ استانبول واپس آیا اور وہیں ۲ جمادی الاول ۱۲۱۵/۹ اکتوبر ۱۸۰۰ء کو وفات پائی اور اگرچہ قبی میں دفن کیا گیا۔ اس کا ایک مجموعہ فتاویٰ، طوط قبی سرائے، پٹی لڑ، ۳۳۳، میں موجود ہے: اور اسی کتب خانے میں اس کی ایک یادداشت (عدد ۸۳۷۳) بھی ہے، جس میں اس نے ۱۲۰۹-۱۲۱۳ء کے درمیان کے ان علما کی فہرست دی ہے جنہیں اس نے مقرر یا معزول کیا (جودت، ۲: ۲۹۲، ۳۳۱، ۳۳۷، ۳۵۶، ۵۷۵، ۱۸۱، ۷۷: ۵۷، ۶۸، ۱۷۴)۔

(۵) دری زادہ سید عبداللہ افندی: مذکورہ بالا کا فرزند۔ اس کی تاریخ پیدائش قلمبند نہیں کی گئی۔ ابھی وہ نقیب الشریف اور روم ایلی کے قاضی عسکر کے عہدے کے لیے نامزد ہی ہوا تھا کہ ۳ شوال ۱۲۲۳/۲۲ نومبر ۱۸۰۸ء کو اسے شیخ الاسلام مقرر کر دیا گیا اور وہ اس عہدے پر ۲۲ شعبان ۱۲۲۵/۲۲ ستمبر ۱۸۱۰ء تک فائز رہا۔ اسی عہدے پر اس کا دوسرا دور ۳ جمادی الاول ۱۲۲۷/۱۲ جون ۱۸۱۲ء سے شروع ہو کر ۱۰ ربیع الآخر ۱۲۳۰/۲۲ مارچ ۱۸۱۵ء تک رہا۔ ۳ جمادی الاولیٰ

اسے اس عہدے سے برطرف کر دیا گیا اور وہ تحریک "اتحاد و ترقی" [رک بان] کا مخالف بن گیا اور ہمہ تن شہری مشاغل میں مصروف ہو گیا۔ اسی وقت سے وہ "بے" کے لقب سے مشہور ہوا۔ ۱۹۱۸ء کی عارضی صلاح کے بعد وہ اس مجلس کا نگران مقرر ہوا جو مذہبی کتابوں کی اشاعت کی نگرانی کے لیے مقرر کی گئی تھی۔ یکم فروری ۱۹۲۰ء کو وہ "مشيخت" کا نائب معتمد (مستشار) بنایا گیا اور ۳ اپریل کو داماد فرید [رک بان] کی کابینہ میں شیخ الاسلام ہو گیا۔ اس وقت "اتحادیوں" کو استانبول پر مزید طاقت کے ساتھ قبضہ کیے ہوئے تین ہفتے سے کچھ کم ہوئے تھے۔ شیخ الاسلام کی حیثیت سے ۱۱ اپریل ۱۹۲۰ء کو اس نے چار فتوؤں پر دستخط کیے: ان میں سب سے بڑا فتویٰ وہ تھا جس میں کمال کے معاونین کی بابت کہا گیا تھا کہ "کچھ شہری لوگ ہیں جو ابکا کر کے اکھٹے ہو گئے ہیں اور جنہوں نے اپنے قائد (رہنما) خود چن لیے ہیں۔۔۔۔۔ فریب دے کر۔۔۔۔۔ وفادار شاہی رعایا کو۔۔۔۔۔ دھوکا دے رہے ہیں اور بلا پروا نہ شاہی عوام میں سے سپاہی بھرتی کر رہے ہیں: اور اس مقصد کے لیے قانون شرعی اور اعلیٰ حکام کی مخالفت کرتے ہوئے، کچھ مالی مطالبات اور محصول (ٹیکس) لوگوں پر عائد کر رہے ہیں، بظاہر اس بہانے سے کہ ان سپاہیوں کی خوراک اور پوشاک کا بندوبست کرنا ہے، لیکن درحقیقت منتج دنیا کی حرص کی وجہ سے۔۔۔۔۔" دیگر خاص الزامات میں سے ان لوگوں کے خلاف "غدر" اور "سلطنت سے بغاوت" کا الزام بھی تھا اور انہیں باغی (بغاة، باغیلر) قرار دیا گیا تھا، جن کی سزا قانون شرعی کے مطابق یہ تھی کہ الھیر تر کر دیا جائے ایک ایک کر کے یا گروہ کے گروہ (قتل و قتلاری مشروع و فرض اُونور)۔ اس فتوے کے تحت چھوٹے فتوؤں نے مسلمانوں کے لیے لازمی قرار دیا کہ سلطانی فرمان کی

حدیث الجوامع ۲ جلدیں، استانبول ۱۲۸۱ھ: (۱۰) محمد عطاء اللہ ثانی زادہ: تاریخ ۴ جلدیں، استانبول ۱۲۹۰-۱۲۹۱ھ: (۱۱) احمد لطفی افندی: تاریخ ۸ جلدیں، استانبول ۱۲۹۰ تا ۱۳۰۶ھ: (۱۲) خضر الیاس افندی: وقائع لطائف اندرون، استانبول ۱۳۰۶ھ۔

(J. R. WALSH)

* دُری زادہ: عبداللہ ہے یا افندی (۱۸۶۹ء تا ۱۹۱۳ء)، سلطنت عثمانیہ کے آخری شیوخ الاسلام میں سے ایک، جو اپنے ان ثنائی کی وجہ سے مشہور ہے جن میں اس نے اس ترکی قومی تحریک کو جو مصطفیٰ کمال (اتا ترک) کی قیادت میں جاری ہوئی تھی ناجائز قرار دیا ہے۔ وہ ایک دولت مند خاندان میں پیدا ہوا، جو سید ہونے کا مدعی تھا۔ اس خاندان کے بہت سے نرینہ افراد "علیہ" گروہ سے تعلق رکھتے تھے اور ان میں سے پانچ پہلے شیخ الاسلام کے عہدے سنبھال چکے تھے [دیکھیے اس سے پہلا مقالہ]: ان میں سے عبداللہ کا، جس کا ذکر سب سے آخر میں ہوا، فرزند پیر زادہ محمد افندی تھا جو ترقی کر کے روم اہلی کے قاضی عسکر کے عہدے پر پہنچ گیا تھا۔ یہی اس عبداللہ کا باپ ہے جس کا ذکر اس مقالے میں کیا گیا ہے۔

عبداللہ نے ابتدائی اور ثانوی تعلیم غیر مذہبی مدارس میں حاصل کی اور پھر مدرسۂ فاتح میں پڑھنے لگا اور وہاں اگلی خوجہ ابراہیم حق افندی (م ۱۸۹۴ء) سے جو اس وقت مشيخت کا نائب (مستشار) تھا، اجازہ (ڈپلوما) حاصل کیا۔ اولاً اسے ۱۸۸۳ء میں مدرس (ابتداء خارج) کا عہدہ ملا اور ۱۸۸۶ء میں وہ مشيخت سے منسلک ہو گیا، جہاں اس نے صلیانیہ کے مدرس کا عہدہ حاصل کیا۔ ۱۸۹۷ء میں اس نے "علمیہ" خدمت چھوڑ دی، لیکن ۱۹۰۱ء میں وہ پھر شرعی تحقیقات کی مجلس ("مجلس تدقیقات شرعیہ") میں بحیثیت رکن داخل ہو گیا اور اگلے چل کر آناتولی کا قاضی عسکر مقرر ہوا۔ ۱۹۰۸ء کے انقلاب کے بعد

دُرّزو: رُک بہ دراج Draç

* الدُرّزی: [الدُرّزی]، [ابو عبد اللہ] محمد بن *

اسمعیل، ان لوگوں کے حلقے کا ایک فرد جنہوں نے فرقہ دُرّوز [رُک بان] کی بنیاد رکھی۔ وہ عرب نہیں تھا اور دُرّوز کی مذہبی کتابوں میں اس کا نام نشکین لکھا ہے۔ بقول النوبری (جو اسے آشوش تکین کہتا ہے) وہ مخلوط ترکی نسل کا تھا اور بخارا سے آیا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ وہ ۷۰۰ھ - ۸۰۰ھ / ۱۰۱۷ - ۱۰۱۸ء میں مصر آیا اور اسمعیلی "داعی" تھا [رُک بہ داعی: اسمعیلیہ]۔ وہ خلیفہ الحاکم کا بہت ہی منظور نظر تھا، یہاں تک کہ لوگ کہتے ہیں کہ اعلیٰ عہدیداروں کو بھی اس کی نظر عنایت کا طلبگار ہونا پڑتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ نکسال میں ملازم رہا ہو حمزہ الزام دیتا ہے کہ اس نے سگوں میں بدعنوانیاں کیں۔ [الدُرّزی، بمعنی خیاط، دروزی، نیز درزیوں کی اولاد (تاج العروس)]۔

اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ پہلا شخص تھا جس نے برملا الحاکم کی الوہیت کا اعلان کیا۔ اس پر یہ الزام بھی لگایا جاتا ہے (جس طرح دوسرے زندیقوں پر) کہ وہ عقیدہ تناسخ اور شراب خوری اور نکاح محرمات کی بابت "اباحت" (antinomianism) کی تعلیم دیتا تھا، گو مؤخر الذکر کا بہت ہی کم امکان ہے۔ یہ ممکن ہے کہ وہ اسمعیلی عقیدے کو مقبول عام بنانے کے لیے اسے ایسی صورت دیتا ہو جس کے خلاف داعی ہمیشہ خبردار کرتے رہتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے کلیدی رسالے کی تعلیم یہ تھی کہ (اللہ کی) روح، جو حضرت آدمؑ میں حلول کر گئی تھی، [حضرت] علیؑ میں اور پھر (اماموں کے ذریعے) الحاکم میں منتقل ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اسمعیلیت کے راسخ عقیدے کے خلاف ہے کہ (حضرت) علیؑ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اور امامت کو رسالت پر فوقیت دی جائے اور پھر

رو سے انہیں باغیوں کے خلاف ہتیار بند ہو کر کھڑا ہو جانا ضروری ہے، اور اس کے خلاف کرنے والوں اور فوج سے نکل کر بھاگ جانے والوں کو (آخرت کے) عذاب دائمی سے ڈرایا گیا تھا اور کہا تھا کہ اس فرمان کی خلاف ورزی کرنے والوں کو جو باغیوں سے لڑنے سے انکار کر دیں دنیا میں بھی سخت سزا دی جائے گی۔

تھوڑی مدت کے لیے عبد اللہ قائم مقام وزیر تعلیم بھی ہوا اور جب داماد فرید پاشا پیرس کی مجلس صلح میں شریک ہونے کے لیے گیا تو اس نے قائم مقام وزیر اعلیٰ (صدر اعظم وکیل) کی حیثیت سے اس کا کام بھی سنبھال لیا، لیکن ۳۰ جولائی ۱۹۲۰ء کو جب نئی کابینہ بنی تو اس کا نام اس میں سے نکال دیا گیا۔ ستمبر ۱۹۲۲ء میں قوم کے حامیوں کی قسطنطنیہ فتح ہو گئی تو وہ ترکی کو چھوڑ کر رودس Rhodes چلا گیا اور پھر وہاں سے اٹلی - ۲۳ مارچ ۱۹۲۳ء کو وہ مگنہ معظمہ روانہ ہوا اور ۳۰ اپریل کو خانہ کعبہ میں مناسک حج ادا کرتے ہوئے وفات پائی۔ اگرچہ اس کی وفات صلاحنامہ لوزان پر دستخط کیے جانے سے پہلے ہی ہو چکی تھی، پھر بھی اس کا نام ان ڈیڑھ سو آدمیوں (Yüzellilikler) کی فہرست میں شامل تھا جنہیں عفو عام کی رعایات سے محروم کر دیا گیا تھا۔

ماخذ: (۱) مِجَلِّ عثمانی، ۴: ۶۹۱: (۲) محمد ذکی یکن، در *İslam Türk ansiklopedisi* ۲: ۲۵۶ تا ۲۵۷ و در مِجَلِّ عثمانی ذیلی (Türk Tarih) Kurumu کے مجموعہ مخطوطات میں: (۳) اسمعیل حاسی دانشمند: *İzahlı Osmanlı kronolojisi* ۴ (۱۹۵۵ء) ۵۳۶ بعد: (۴) Galip Kemalî Söylemezoglu (۵) *Başımıza gelenler* استانبول ۱۹۳۹ء ص ۲۱۹ بعد: (۵) فتاویٰ کے اصل متون کے لیے دیکھیے: تقویم وقائع، عدد ۳۸۳۴ مورخہ ۱۱ اپریل ۱۳۳۶ھ۔

(DANKWART A. RUSTOW و FAİK RESİT UNAT)

de Sacy کے نام سے منسوب ہے۔ کہ حمزہ اسے اپنی ”ضد“ یعنی بحیثیت امام کے اپنا حریف خیال کرتا تھا، کیونکہ اسے خون کی بطور امام آفاق کردار ادا کرنا مقصود تھا، لیکن الدرزی کے بہت سے متبعین نے، جن میں ممتاز ترین ”داعی“ البرکعی ہے، شروع ہی سے حمزہ کو اس بنا پر مسترد کر دیا تھا کہ وہ الحاکم کا اجازت یافتہ نہیں تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ الدرزی نے غالباً ۸۴۰ھ / ۱۰۱۷-۱۰۱۸ء میں الحاکم کی خفیہ (نہ کہ علانیہ) رضامندی سے، الحاکم کی الوہیت پر ایمان لانے کا علی الاعلان مطالبہ کیا۔ بقول سبط ابن الجوزی یہ مطالبہ اس نے قاہرہ کی بڑی مسجد جامع میں اپنا رسالہ پڑھنے کے ذریعے کیا۔ اس سے متعدد بلوے ہو گئے، جنہوں نے حمزہ کو اپنی لیٹ میں لے لیا اور بظاہر اس پوری تحریک کو لوگوں کی نظروں سے گرا دیا۔ غالباً یہی بات تھی جس نے حمزہ کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنی تبلیغ کو ۹۴۰ھ کے دوران میں منسوی کر دے۔ دروزی بیانات رمزی ہیں اور دیگر بیانات میں کئی واقعات کو بظاہر غلط ملط کر دیا گیا ہے اور ان میں بلووں اور الدرزی کی موت کو مبہم چھوڑ دیا ہے۔ حمزہ کے خطوط، بابت ۱۰۱۹ھ / ۱۰۲۰ء میں اس کی موت کسی گزشتہ واقعے کے طور پر مذکور معلوم ہوتی ہے۔ دروزی شارح اسے ۱۰۱۹ھ میں بتاتا ہے اور بین السطور اس کا یہ مطلب ہے کہ یہ خود حمزہ تھا جس نے الدرزی اور دوسروں کو الحاکم کے سامنے مجرم قرار دیا اور الحاکم کے حکم سے اسے مروا ڈالا۔ اس کے بعد حمزہ نے اس کے مریدوں کو اپنا مرید بنانے کی کوشش کی اور وعدہ کیا کہ وہ بعض ان لوگوں کے لیے جو قید میں تھے الحاکم سے سفارش کرے گا۔

سبط ابن الجوزی کے نزدیک الدرزی الحاکم کے حکم سے چپکے سے شام چلا گیا تھا تاکہ وہاں تبلیغ

خفیہ ”تاویل“ کو منظر عام پر لایا جائے اور غالباً ”تنزیل“ کی صحت برابر قائم رہنے سے انکار کر دیا جائے۔ اس قیاس کی وجہ یہ ہے کہ حمزہ کے خطوط کا شارح اس کے پیرووں کو ”تاویل“ کہتا ہے، جن پر دروز یہ الزام دھرتے ہیں کہ انہوں نے ”تنزیل“ کو بالکل مسترد کر دیا تھا۔ حمزہ نے بذات خود الدرزی کو یہ بات چنانہ ضروری خیال کیا کہ باطنی صداقت اور اس کی ظاہری صورت ہمیشہ اکٹھی ہائی جاتی ہیں۔ وہ اسے یہ الزام بھی دیتا ہے کہ اس نے الحاکم کی فقط انسانیت کو تو پہچانا ہے لیکن [نعوذ باللہ] اس کی الوہیت کو نہیں، جو حمزہ کی نظر میں الحاکم کو [حضرت علیؑ کا] عین سمجھنے کا نتیجہ ہوگی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ الدرزی نے الحاکم کے مذاہن میں سے، بظاہر خود الحاکم کی رضامندی سے، اپنے متعدد پیرو بنا لیے تھے۔ حمزہ جو کھلم کھلا الحاکم کی درگاہ میں افضلیت کا دعویدار تھا، الدرزی کو نافرمان اور اپنی مرضی سے بے سوچے سمجھے کام کرنے والا خیال کرتا تھا؛ مثلاً (درزی کا) صحابہ پر برسر عام تبرک کہنا، اگرچہ اسے اس کے خلاف تنبیہ کی جا چکی تھی۔ حمزہ نے اسے اپنی عقائد کی تصانیف دکھانے سے انکار کر دیا۔ اس نے الدرزی کے پہلے لقب ”سیف الدین“ پر اس کے رمزی معنی کی بنا پر اعتراض کیا اور جب الدرزی نے اس کے بجائے ”سیدالہادیین“ کا لقب اختیار کیا تو وہ اس سے اور بھی زیادہ پرہم ہوا کیونکہ وہ حمزہ کے اپنے لقب ”الہادی“ سے بڑا تھا۔ اس کا دعویٰ ہے کہ ایک وقت وہ بھی تھا جب الدرزی کے متبعین نے اس تحریک (: دروزیت) میں حمزہ کے دعاوی قیادت کو تسلیم کیا تھا، اور خود الدرزی نے بھی ایسا کیا تھا، یعنی اس وقت جب حمزہ کے ایک کارکن علی بن احمد النبال نے اسے اپنے مذہب کا معتقد بنا لیا تھا، مگر بعد میں النبال نے الدرزی کی حمایت کی۔

درسہ : مشرقی آناطولی کا ایک علاقہ، جس کے شمال میں منظور طاغ (۳۱۸۸ میٹر) اور مرکن طاغ کے پہاڑی سلسلے، مغرب میں دریائے فرات کا شمالی منبع (فرہ صو)، جنوب میں فرات کا جنوبی منبع (مراد صو) اور مشرق میں اس کا معاون دریا پیری صو واقع ہے۔ یہ علاقہ زیادہ تر کوہستانی ہے اور اس کے باشندے (دہائی ضلعوں میں) کرد ہیں۔ ایک زمانے میں درسہ کا نام چمش کرک تھا (جو اس وقت دارالسلطنت تھا) اور یہ ایالت دیار بکر کی ایک لوا تھی۔ انیسویں صدی عیسوی میں درسہ کچھ مدت کے لیے ایک ولایت بن گیا، لیکن ۱۸۸۸ء میں اسے معمورۃ العزیز (خرپوت کے تحت منجاق بنا دیا گیا اور اس کا صدر مقام خوزات ہوا اور اووہ جی، چیش کرک چار منجاق، مازگرد، پریک، قوزیجان، قزل کلیسا اور پاخ کی قضائیں اس میں شامل کر دی گئیں۔ جمہوریہ ترکیہ کی تنظیم نو کے زمانے میں درسہ پھر ایک ولایت بن گیا اور اس کا نام تونجہلی (رک بان) رکھ دیا گیا۔

انیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں درسہ کی منجاق کے باشندوں کی تعداد ۶۳۳۳ تھی، جن میں ۱۵۴۶ سنی ترک، ۱۲۰۰۰ کرد، ۶۷۸۰۰ قزلباش (شیعی)، ۷۵۶۰ گرجی اور ۶۱۰ پروٹسٹنٹ امریکی تھے۔
مآخذ : (۱) کاتب چلبی : جہان نامہ، ص ۳۲۹ :
(۲) *La Turquie d'Asie* : V. Cuinet پیرس ۱۸۹۲ء : ۲ : ۳۸۳ بعد : (۳) سامی : قاموس الاعلام *Dictionnaire Universelle d'Histoire et de Géographie* ج ۳ : استانبول ۱۳۰۸ھ / ۱۸۹۱ء : ص ۲۱۳ : بعد : (۴) *Derebeyl ve Dersim* : Nasit Hakkı Uluğ انقرہ ۱۹۳۲ء۔

(FR. TAESCHNER)

درشن : (نیز نسبتاً کم صحیح درسن)، سنسکرت لفظ درشنا (مادہ "درش" = "دیکھنا") یہ معنی

کرے، کیونکہ وہاں کے لوگ نئی باتوں کو قبول کر لیتے ہیں۔ یہ قول دروزی فرقے کے ملک شام میں جگہ بنا لینے کی ایک بعد از وقت توجیہ معلوم ہوتا ہے، پھر اسی الدروزی کا نام "دروزی" (یہ ضعف اول) کی صورت میں پورے "دروزی" فرقے پر عائد کر دیا گیا : غالباً اس لیے نہیں کہ اسی نے سب سے پہلے ان اہل شام کا مذہب تبدیل کروایا (واقعہ یہ ہے کہ مقامی روایت اس کام کو دوسروں کی طرف منسوب کرتی ہے)، بلکہ اس لیے کہ پوری تحریک شروع میں عوام کے دلوں میں اسی کے نام سے وابستہ تھی۔ اسی وجہ سے الانطاکی "دروزیہ" کے نام کا اطلاق خود حمزہ کے متبعین پر کرتا ہے۔ بعض اوقات یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جو مغرب اخلاق تعلیمات یا بدکاریاں نابعد کے دروز میں رائج تھیں، ان کی ابتدا کا سراغ الدروزی تک پہنچتا ہے، مگر اس کی تائید نہیں ہوتی۔

مآخذ : [(۱) کامل الفری : تہذیب الذہب : ۱ : ۲۱۸، حلب ۱۹۲۶ء : (۲) ابن تفری بردی : النجوم الزاهرة : ۱۸۳ : ۳ : (۳) المجتبى : خلاصة الآثار : ۲ : ۲۶۸ : (۴) ابراہیم الأسود : تنویر الاذهان : ۲ : ۱۱۰ تا ۱۲۶، بیروت ۱۹۲۵ء : (۵) بدل جوزی : تاریخ الحركات الفكرية في الاسلام : ۱ : ۸۹ تا ۱۴۱ : (۶) کرد علی : خطط الشام : ۶ : ۲۶۸ تا ۲۷۳ : حمزہ کے مخطوط میں یہ خصوصیت قابل لحاظ یہ ہیں : (۷) انفاة والنميمة : (۸) الرضا و التسليم : (۹) المصیحة الکائنۃ : (۱۰) Silvestre de Sacy : *Religion des Druzes* میں بڑے بڑے حوالے : cccxxxiii تا cccxci : ۹۹ تا ۱۱۳ : ۲ : ۱۵۷ تا ۱۹۰ (و تصحیحات) میں ہیں : نیز دیکھیے (۱۱) یحیی الانطاکی بلسلۃ Eutychius در *Scriptores Arabici* متن سلسلہ ۳ : حصہ دوم : طبع B. Carra de Vaux 'L. Cheikho و ایچ۔ زیات، بیروت ۱۹۰۹ء : ص ۲۱۰ تا ۲۲۳ : نیز رک بہ دروز مع مآخذ :

(M. G. S. HODGSON)

جلد تو سیاہ ہے، لیکن ان کا ناک نقشہ حبشیوں جیسا نہیں ہے۔ ان کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ وہ اس علاقے کے سب سے قدیم باشندے ہیں۔ یہاں کچھ یہودی بھی ہیں، جو بظاہر بربر نسل کے ہیں۔ کل آبادی ایک لاکھ سے زائد ہے۔ یہ مہم لوگ کم از کم ۱۹۳۲ء تک عربوں اور زیادہ تر بربروں کے، جو نواحی پہاڑوں کے خانہ بدوش قبائل تھے، مطیع رہے تھے۔ تاآنکہ درعہ فرانسیسیوں کے زیر حمایت حکومت کے تسلط میں آ گیا۔

درعہ قدیم زمانے سے آباد ہے۔ اس کی تاریخ یقیناً معرکہ مخیز رہی ہوگی، کیونکہ یہی ان علاقوں کے درمیان ایک زرخیز خطہ ہے جو تقریباً صحرائی ہیں۔ اسلام کی اشاعت یہاں بانی قاض کی اولاد میں سے ایک شخص کے ہاتھوں تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی کے نصف اول میں ہوئی۔ بعد ازاں چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی کے اواخر میں درعہ پر مغراوہ کا (جو زناٹہ سے تعلق رکھتے تھے) تسلط ہو گیا۔ مغراوہ بیچلماسہ میں آباد ہو گئے تھے۔

درعہ حقیقۃً المرباطون کے زمانے میں تاریخی اہمیت کا حامل بنا، کیونکہ اس نے ان کے اوقیانوسی مراکش میں داخلے کے لیے ایک اگلی چوکی کا کام دیا۔ پانچویں صدی ہجری / گیارھویں صدی عیسوی سے بعد تک درعہ اس مراکش سلطنت کا ایک حصہ رہا جسے المرباطون نے اور پھر الموحّدون اور بنو مرین نے قائم کیا تھا۔ مغربی عربوں کا عمل دخل وہاں ساتویں صدی ہجری / تیرھویں صدی عیسوی کے اواخر میں ہوا اور ان کا وہاں بہت قوی اثر پڑا۔

دسویں صدی ہجری / سولہویں صدی عیسوی میں یہ صوبہ بتوسعد کے پہلے خاندانہ شرفاء کے زیر تسلط آیا۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں سے سلطان احمد المنصور نے سوڈان کے خلاف (۱۵۹۱ء میں)

دکھانا، جلوہ نما ہونا، سے مأخوذ ہے۔ اسی وجہ سے بادشاہ کے رسمی طور پر اپنی رعیت کے سامنے آنے کے لیے یہ لفظ استعمال کیا جاتا تھا۔ ہندوؤں کے اس رواج کو مغل شہنشاہ اکبر نے اختیار کر لیا تھا (آئین اکبری، ۱: ۷۲) اور اس کے بعد اس کے قریبی جانشین بھی اس پر عمل کرتے رہے۔ انگریز سیاح کورنٹ Coryat لکھتا ہے کہ آگرے میں جہانگیر دن میں تین مرتبہ لوگوں کو اپنی شکل دکھانے کے لیے جھروکے میں بٹھا کرتا تھا۔ ۱۰۶۷ھ / ستمبر ۱۶۵۷ء کے اواخر میں شاہجہان اپنی بیماری کے زمانے میں جھروکے میں لوگوں کے سامنے نہ آ سکا تو اس کی موت کی افواہ پھیل گئی۔ عالمگیر نے بھی درشن کی رسم کی شروع میں پیروی کی، مگر ۱۰۷۸ھ / ۱۶۶۸ء میں اس میں بت پرستی کا شائبہ خیال کر کے اسے ترک کر دیا۔

(J. BURTON PAGE)

* درعہ : (شہر) رک بہ اذرعہ ۔
* درعہ : یہ جنوبی مراکش کے ایک دریا کا نام ہے، جو اطلس کبریٰ کی جنوبی ڈھلانوں سے نکلتا اور جبل بانی کے جنوب میں بحر اوقیانوس میں جا گرتا ہے۔ اسی نام کا مراکش کا ایک صوبہ بھی ہے، جو دریائے مذکور کی گزرگاہ کے دونوں سرزوعہ کناروں کے ساتھ ساتھ مقام آگڈز Agdz سے دریا کے موڑ تک کوئی ۱۲۰ میل تک پھیلا ہوا ہے۔

یہ صوبہ آٹھ اضلاع میں منقسم ہے۔ شمال سے جنوب کی طرف ان اضلاع کے نام حسب ذیل ہیں : مرکزہ، آیت سدرت، آیت زری، تیزلین، تیرنا تہ، فزواتہ، قنّوۃ اور محمّد۔

اس علاقے میں عموماً بربر زبان بولنے والے قبائل اور سیاہ فام لوگ آباد ہیں۔ انھیں ”عبید“ (= صحرا اور رنگیوں کے ممالک سے لائے ہوئے غلام) اور ”حرّاتین“ میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ مؤخر الذکر کی

'Bull. Soc. Géogr.' در 'sur la région de l'oued Draa
Au cœur : de. Segonzac (۸) : ۱۸۸۰ء : دسمبر : ۱۸۸۰ء :
'Dj. Jacques-Meuhié (۹) : ۱۹۱۰ء : 'de l'Atlas
La nécropole de Foum le-Rjam, Tumuli du Maroc
'préaharien' در 'Hesp.' ۲۵ : (۱۹۵۸ء) : ۱۵ تا
۱۳۲ : (۱۰) : Ch. Allain و J. Mounie
'Hesp.' در 'forteresse almoravide de Zagora
Villes et tribus (۱۱) : ۳۰۵ تا ۳۲۳ : (۱۹۵۶ء)
'de Maroc' ج ۹ : 'Tribus berbères' و ۲ :
'Districts et' 'tribus de la haute vallée du Drac' از
'G. Spillmann' : ۱ تا ۲۰۱ : (۱۲) : G. Spillmann
'La zaouia de Tamgrout et les Nasiriyine' در
'Afr.' : ۱۹۳۸ء : 'Sahara et la pacification du Haut draa'
رابطہ : ۱۹۳۶ء :
'Une cité de l'oued' : F. de la Chapelle (۱۳)
'Dra sous le protectorat des nomades' در 'Hesp.'
ج ۹ : (۱۹۳۹ء) : ۲۹ تا ۴۲ : (۱۴) : Dj. Jacques-
'Les oasis des Laktaoua et des Mehamid' : Meuhé
در 'Hesp.' ۳۴ : (۱۹۳۷ء) : ۳۹۷ تا ۴۲۹ و
'Hidarchie sociale au Maroc préaharien' در 'Hesp.'
۲۳۹ تا ۲۶۹ : (۱۹۵۸ء)

(R. LE TOURNIAU)

الْبُرُغِيَّةُ : (یا الدَّرْعِيَّةُ)، نجد میں ایک انجمنستان،
جو سعودی عرب کے دارالحکومت الرياض سے ۲۰
کیلو میٹر شمال مغرب میں واقع ہے اور ۱۲۳۲ھ/۱۸۱۸ء
تک آل سعود (رک بان) کا صدر مقام رہا۔ حنیفہ نام کی
ایک ندی اس کے بالائی حصے میں سے گزر کر جنوب
مشرق کی طرف بہتی ہے اور پھر بڑی آبادیوں کے پاس
سے گزرتی ہوئی مشرق کی جانب مڑ جاتی ہے۔ اس کے
اوپر کی طرف العُلب اور العُودۃ کی آبادیاں کھجور کے
درختوں کے درمیان واقع ہیں۔ ان سے نیچے حنیفہ کی
معاون ندی البُیْدۃ کے بالمقابل غصیہ ہے، جو اب بالکل

اپنی مہم کا آغاز کیا۔ گیارہویں صدی ہجری / سترہویں
صدی عیسوی کے اوائل میں جب گاو (Gao) اور
ٹمبکتو سے اس کی تجارت شروع ہوئی تو اس کی
وجہ سے اس خطے کو کچھ عرصے کے لیے خوشحالی
نصیب ہو گئی۔

تدرجہ پر علوی سلاطین کا پورا یا ادھورا قبضہ
رہا اور وہ ایک اہم مذہبی بڑادری ناصرین کا مرکز
بن گیا، جو گیارہویں صدی ہجری / سترہویں صدی
عیسوی کے اوائل میں "زاوۃ تَمَقُوت" کے نواح
میں وسیع پیمانے پر پھیل گئی۔ اس خطے پر فرانسیسی
فوجوں نے ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۲ء کے درمیان قریب
قریب بغیر لڑائی کے قبضہ کر لیا۔

آج کل یہ علاقہ جس کی آبادی حد سے زیادہ
بڑھی ہوئی اور مفلوک الحال ہے، دارالبیضا اور
دیگر کئی شہروں کو بھاری تعداد میں مزدور مہیا
کرتا ہے، کیونکہ اس کی اپنی زراعت جوں کی توں
نہیں اور روز افزوں آبادی کی کفالت نہیں کر سکتی۔
نقل مکانی عام طور پر عارضی ہوتی ہے اور اس کا
تعلق یہاں کے موسم کے تغیر و تبدل اور زراعتی
پیداوار کی کمی بیشی کے ساتھ ہوتا ہے (Naissance
du prolétariat marocain، پیرس بدون تاریخ، ص ۶۹
تا ۶۹)۔

مآخذ : (۱) البکری : کتاب المسانک والممالک
'Deser. de l'Afrique sept.' مترجمہ دیسلان، ص ۳۸
(۲) الادریسی، ص ۷۰ تا ۷۱ : (۳) الحسن الوزان
نویاتی : 'Leo Africanus' مترجمہ Épaulard، ص ۲۰
تا ۳۲ : (۴) Marmol : 'l'Afrique' : ۲۲۲ تا ۲۲۴ :
مترجمہ Perrot d'Ablancourt، پیرس ۱۶۹۷ء : ج ۳
باب ۹ بعد : (۵) Rohelfs : 'Mein erster Aufenthalt in
'Marokko' Norden : ۱۸۸۵ء : (۶) Ch de Foucauld :
'Reconnaissance au Maroc' پیرس ۱۸۸۸ء : ص ۲۰۸
تا ۲۱۱ : (۷) H. de Castries : ۲۸۵ تا ۲۹۵ :

دوران ہے۔ حنیفہ جہاں مشرقی جانب مڑی ہے وہاں اس کے بائیں کنارے کے ساتھ ساتھ آبادیوں کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ انہیں میں البعیری ہے، جو شیخ محمد بن عبدالوہاب اور آل الشیخ کا وطن ہے۔ جس مقام پر شیخ عبادت کیا کرتے تھے وہاں اب ایک مسجد ہے اور اس کے قریب ہی ان کی قبر ہے۔ ندی کے دائیں کنارے پر البعیری کے مقابل الطرفین کے ٹیکرے پر ان پر شکوہ عمارتوں کے کھنڈر نظر آتے ہیں جہاں ایک زمانے میں شاہان آل سعود رہا کرتے تھے اور جو فلی Philby کے الفاظ میں "ساری وہابی سرزمین میں سب سے عظیم الشان آثار ہیں"۔ یہ عمارتیں گارے سے بٹی ہیں، مگر ستون پتھر کے ہیں، جن پر ایسے خوشنما اور نازک نقش و نگار بنے ہیں جن کی مثال پورے نجد میں نہیں ملتی۔ الطرفین کی بلند ترین عمارت الدربشہ کا قلعہ ہے۔ نخلمستان سے جو سڑک قلعے کی جانب آتی ہے وہ فیصل بن سعود کے نام پر درب فیصل کہلاتی ہے۔ شمالی چوٹی پر ایک محل مقصورہ عمر بھی ابھی تک سلامت ہے اور اس کے قریب الطرفین کی جامع مسجد ہے، جس کے اندر ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء میں امام عبدالعزیز کو قتل کر دیا گیا تھا۔ امتداد زمانہ نیز الطرفین کے دامن میں ایک نئی آبادی کے بسنے کے باعث یہ کھنڈر آہستہ آہستہ مٹتے جا رہے ہیں۔

نجد کے وقائع نگاروں کا بیان ہے کہ الدرعیہ کو ۱۸۵۰ھ/۱۴۴۶ء میں مانع بن ربیعہ المریدی نے بسایا تھا جسے یہ علاقہ اس کے ایک رشتے دار ابن درع، رئیس حجر الیمامہ، نے عطا کیا تھا۔ شروع شروع میں مانع اور ان کے اخلاف کا مرکز غصیبہ رہا، جو نسبتاً زیادہ مستحکم اور محفوظ مقام تھا۔ ۱۱۳۹ھ/۱۷۲۶ء میں یہاں محمد ابن سعود آل مقرن حکمران تھا، جو براہ راست مانع کی اولاد میں سے تھا۔ ۱۱۵۷ھ/۱۷۴۴ء میں شیخ محمد ابن عبدالوہاب اپنے آبائی وطن العینہ سے الدرعیہ چلے آئے۔ شیخ اور محمد بن سعود نے عہد کیا کہ پورے

عرب میں اسلام کو اس کی اصل صورت میں پھیلانے کے لیے مل کر کام کریں گے۔ شیخ کی روحانی قوت اور محمد بن سعود اور اس کے بیٹے عبدالعزیز اور پوتے سعود کی عسکری مہارت کے باعث تیرہویں صدی ہجری/انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں عملاً سارا عرب الدرعیہ کے زیر اثر آ گیا۔ ابن بشر اور ولندیزی سیاح J. L. Reinaud (۱۷۹۹ء) نے اس زمانے میں الدرعیہ کے مفصل حالات بیان کیے ہیں۔

۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء میں عبداللہ بن سعود تخت نشین ہوا۔ اس کے عہد میں ابراہیم پاشا نے مصر سے آ کر الدرعیہ کا محاصرہ کر لیا، جو چھ ماہ تک جاری رہا۔ اس دوران میں گرد و نواح کے علاقے کو بڑی تباہی کا سامنا کرنا پڑا۔ ذوالقعدہ ۱۲۳۳ھ/ستمبر ۱۸۱۸ء میں ابراہیم کا الدرعیہ پر قبضہ ہو گیا، جسے وہ تباہ و برباد کر کے واپس چلا گیا۔ آل سعود کے بہت سے افراد یا تو جنگ میں ہلاک ہو گئے یا گرفتار کر کے قاہرہ پہنچا دیے گئے۔ ۱۲۳۵ھ/۱۸۲۰ء میں مشاری بن سعود نے الدرعیہ کی حکومت سنبھال لی۔ العینہ کے رئیس ابن معمر نے بھی اس کی بیعت کر لی، لیکن بہت جلد وہ اس سے منحرف ہو گیا۔ اس زمانے میں سعود اعظم کا ایک بھتیجا ترکی بن عبداللہ ابراہیم پاشا کے پھندے سے نکل کر نجد میں آ گیا اور مشاری بن سعود کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ مشاری کو مصری فوجوں نے گرفتار کر لیا اور ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۱ء میں وہ بحالت اسیری وفات پا گیا۔ ترکی نے انتقاماً ابن معمر کو مار ڈالا اور الدرعیہ پر قبضہ کر کے الرياض میں بھی قدم جما لیے، تاہم مصری افواج نے اسے بہت جلد وہاں سے نکال دیا۔ ۱۸۲۱ء میں مصر کے نئے سپہ سالار حسین نے الدرعیہ کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا۔ ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۴ء میں ترکی نے ایک بار پھر قوت حاصل کر لی۔ اس نے الرياض پر حملے کر کے مصری فوج کو شکست دی اور اسے اپنا نیا دارالحکومت قرار دیا۔

کے awls اور گیب Miami کے awls میں وہ منفرد جماعتوں کی حیثیت سے آباد ہیں۔ آخر میں متعدد درغن Awls یا قبائل، ۱۹۴۴ء میں، ترک وطن کر کے شمالی داغستان کے ضلع شرکت کے نیم صحرائی علاقے میں منتقل ہو گئے۔

درغنوں کے متعلق قدیم ترین معلومات چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی کے عرب مؤرخوں نے درہند نامہ میں دی تھیں۔ فتح عرب کے بعد قیقاتوں کی اُسی باجگذار ریاست درغنی علاقے کے جنوب مغربی حصے میں قائم ہو گئی، جس کا صدر مقام قلعة قریش موجودہ قبیلہ قبیجی کے [علاقے کے] قریب تھا، جب کہ دیگر درغنی قبیلے قزئی قبی قوم کی لک شہنشاہت کی محکوم ریاست میں پائے جاتے تھے۔ آٹھویں صدی ہجری/چودھویں صدی عیسوی کے اختتام کے بعد شہنشاہت درغن کا علاقہ قیقات کی ریاست اُسی کے، جو سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی میں اپنے اوج کمال کو پہنچ گئی، اور آزاد خیلوں ("جماعۃ") کے درمیان منقسم ہو گیا۔ جو متعدد جماعتوں یا وفاق ریاستوں کی شکل میں متحد ہو گئے تھے ان کی تعداد اصلاً چار تھی: اکوشا، اسلاتین، مغللاتین، خور کلی تین، ان میں انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں چھ مزید خیلوں کو بزور شمشیر شامل کر لیا گیا تھا۔ وہ یہ تھے: کیا در گواہ، کنگلا، سرگلاتین، اُسی درگو، وگن درگو اور چرخ۔ ان وفاق قبائل کا نظم و نسق آخر میں اکوشا کے قاضی کو سونپ دیا گیا تھا۔ یہ قبائلی نظام انیسویں صدی عیسوی میں روسی فتح تک ان میں برقرار رہا۔

درغنی زبان تین بولیوں میں منقسم ہے: اُرخ (یا خور کلی)، جسے سطح مرتفع کے کٹھ بان بولتے ہیں؛ تزدجر، جسے میدانوں میں رہنے والے اہل حرفہ اور تاجر بولتے ہیں، اور اُخوشا [یا اکوشا] جو دوسری دونوں بولیوں سے واضح طور پر متمیز ہے اور ادبی زبان کی بنیاد کا کام دیتی ہے، نیز اسے کبھی اور قیقات

۱۸۶۵ء/۱۲۸۱ء میں خلیج فارس کا انگریز گورنر

کرنل پیلی Pelly ریاض جاتے ہوئے الدرغہ سے گزرا تو اسے یہ جگہ بالکل ویران اور بے چراغ نظر آئی۔ مآخذ: (۱) حسین بن غنم: روضة الافکار، بیروت

بدون تاریخ: (۲) عثمان بن بشر: عنوان البجد، قاہرہ

۱۸۴۳ء (۳) von Zachs Monatliche Correspondenz

۱۸۰۵ء (Reinaud کا سفر): (۴) J.B.L.J. Rousseau

Description du pachalik de Bagdad، پیرس ۱۸۰۹ء

Histoire des Wahabis: L. A. Corancez، پیرس (۵)

Histoire de l'Égypte: F. Mengin، (۶) ۱۸۱۰ء

Diary of a: G. Sadlier [Sadleir]، (۷) ۱۸۲۳ء

Journey across Arabia، بیروت ۱۸۶۶ء (۸) L. Pelly

Report on a journey to the Wahabee capital of

Riyadh، بیروت ۱۸۶۶ء (۹) H. St. J. B. Philby

The heart of arabia، لندن ۱۹۲۲ء

(G. RENTZ [تلخیصی از ادارہ])

* درغن: داغستان میں ایک مسلم آبیری

کاکیشیائی (Ibero-Caucasian) قوم، جو پہلے ماورائے

بحر خزر کے میدانوں میں سکونت پذیر تھی پھر

بارہویں صدی عیسوی میں اسے قبیلوں نے، جو شمال

سے آئے تھے، پہاڑوں کی جانب دھکیل دیا۔ ۱۹۲۹ء

کی روسی مردم شماری کے مطابق درغنوں کی تعداد

۱۲۶۳۷۲ تھی جو ۱۹۵۴ء میں بڑھ کر ۱۵۸۰۰۰

ہو گئی۔ درغنی وسطی داغستان کے علاقوں میں دامن

کوہ اور وسط کوہ کے علاقوں میں مجتمع ملتے ہیں

اور سرگو قلعه، اکوشہ اور دُخدیو Dakhdaev کے

اضلاع میں آبادی کا بڑا حصہ وہی ہیں۔ وہ Levaghi

اور Tzudakhar کے اضلاع میں آوار (Avars) اور لک قوم

(Laks) کے ساتھ اور قیقات (مجالیس) کے اضلاع میں

قبیلوں اور قیقاتوں کے ساتھ ملتے جلتے بھی رہتے ہیں۔

وہ قرہ بدخکت (گیدن اور گوبکی کے awls) Buinaksk

(قدہ، قرمغی اور جنکربی کے awls)، اگل (اُسخ اور چرخ

۱۹۱۷ء کے انقلاب تک درغونوں کے معاشرتی نظام کی شکل اصولاً یہ تھی کہ وہ تَنَم [تغوم] یعنی برادریوں میں منقسم تھے اور برادریاں جنس یعنی جاتی خاندانوں پر مشتمل ہوتی تھیں۔ گوانیسویں صدی عیسوی ہی میں تَنَم میں کوئی مالی یا معاشی اہمیت باقی نہیں رہی تاہم جو رسم و رواج اس کی بنا پر چلے آتے تھے آہستہ آہستہ مٹنے چلے گئے۔

درغونوں میں تعددازدواج کی رسم ہمیشہ سے شاذ تھی اور خاندان ہی میں شادی کرنے کی رسم بھی انیسویں صدی عیسوی سے رو بہ انحطاط ہو گئی۔ شادی کی رسوم قدیم روایات کے مطابق قائم رہیں، اگرچہ غیر مسلموں کے ساتھ شادی کرنا ایک مدت تک ناممکن تھا، لیکن ۱۹۱۷ء کے بعد سے روسیوں کے ساتھ شادی بیاہ نسبتاً عام ہو گیا۔ پہلے زمانے میں اکثر دلہن کو بھگالے جانے کا بھی طریقہ تھا، خصوصاً ان لوگوں میں جو کلیم یعنی واجب الادا زر مہر ادا نہیں کر سکتے تھے، لیکن کلیم ابھی تک موجود ہے۔

روسیوں نے جب درغونوں کو پہلے پہل ۱۸۱۹ء میں مغلوب کیا (فتح اکوشا) اور پھر دوسری بار پہلے پہل ۱۸۴۴ء میں ان پر غالب آئے تو انقلاب سے پہلے انہیں یہ خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ وہ اواروں اور قفقوں دونوں میں بیک وقت جذب ہو جائیں گے۔ سوویت حکام اس خیال سے ان کی قومیت کے تحفظ کا پختہ انتظام کرنا چاہتے تھے کہ وہ ایک یگانہ قوم تھے اور اپنی ادبی زبان رکھتے تھے۔ انہوں نے اس بات کو پسند کیا کہ درغونوں کو دو چھوٹی چھوٹی ہمسایہ قوموں کے ساتھ مجتمع کر دیا جائے۔ یہ ہمسایہ قومیں قیتاق اور اور کیچ تو ہیں جنہیں خود معدوم ہو جانے کا خطرہ درپیش تھا۔

درغن میدانوں میں کاشتکاری اور پہاڑوں کے دامن میں باغبانی کرتے ہیں اور اپنی بھیڑوں، مویشیوں اور گھوڑوں کے گلوں کو پہاڑوں کے گرمائی مرغزاروں

بھی استعمال کرتے ہیں۔ لیکن ترکی (قیق، آذری) اور روسی زبانوں کا اثر و نفوذ خاصا ہے اور درغونوں کی اکثریت دو زبانیں بولتی ہے۔ ابتدائی سکولوں میں تعلیم درغن میں دی جاتی ہے اور ثانوی مدارس میں صرف روسی زبان ہی ذریعہ تعلیم ہے۔ درغنی ادب حال ہی کی تخلیق ہے؛ چنانچہ قدیم ترین تصنیفات انیسویں صدی عیسوی سے پہلے کی نہیں ہیں۔ سوویت ادب کی ترجمانی فقط معدودے چند انشاء پرداز ہی کرتے ہیں؛ ان میں سے معروف ترین رشید رشیدوف Rashidov شاعر ہے۔

یسویں صدی عیسوی کے اوائل میں درغنی ادبی زبان عربی حروف میں لکھی جانے لگی۔ ۱۹۲۰ء میں ایک ترمیم شدہ عربی ابجد (جسے نیا "آجم" کہتے تھے اور جس میں تبتالیس حروف تھے) رائج کی گئی۔ ۱۹۲۸ء میں اس کی جگہ لاطینی ابجد نے لے لی اور پھر اس کی جگہ ۱۹۳۸ء میں سریلی (Cyrillic=روسی) رسم الخط رائج کر دیا گیا۔

۱۹۵۸ء میں آٹھ درغنی اخبارات شائع ہوتے تھے؛ ایک جمہوری جریدہ منخج قلعه سے اور سات مفصل سے نکلتے تھے۔

درغن شافعی مذہب کے سنی مسلمان ہیں، گرش اور بسکتچی کے دو قبیلوں (awls) کے علاقے مستثنیٰ ہیں، جن کے باشندے انقلاب کے وقت تک اثنا عشری شیعہ تھے۔ ان میں اشاعت اسلام، جس کی ابتدا گیارہویں صدی عیسوی میں ہوئی تھی، سولہویں صدی عیسوی میں جا کر تکمیلی مراحل میں داخل ہو گئی، جب کہ یہودیت اور عیسائیت کے آخری نشانات ناپید ہو گئے۔ پندرہویں صدی عیسوی تک بھی کم از کم کچھ درغنی غیر مسلم تھے، کیونکہ ظفر نامہ کا مصنف (۱ : ۷۷۷ بعد) داغستان کے کافر قبائل میں، جنہوں نے اسیر تیمور کا مقابلہ کیا تھا، "آشکجا" کا ذکر کرتا ہے (جسے اول اکوشا کا مرادف خیال کیا جاسکتا ہے)۔

اس کا مرکز زاویہ ٹوئریج تھا، جو قبیلہ بتو زروال [کے علاقے] میں اود ورغہ Oued Wargha ندی کے دائیں کنارے پر واقع تھا۔ پھر ۱۸۶۳ء کے بعد یہ مرکز زاویہ آنجوت Amadzdjuہ میں منتقل ہو گیا، جہاں وہ آج تک موجود ہے اور جہاں ہر سال ستمبر کے آخر میں اس برادری کے افراد سالانہ عرس ("موسم") مناتے ہیں۔ اس موقع پر یہاں بہت سے زائرین آتے ہیں۔

درقاوہ برادری سب سے زیادہ مراکش کے شمالی اور مشرقی حصے میں اور الجزائر کے مغرب میں پھیلی ہوئی ہے۔ مراکش میں خاص طور پر معاشرے کے ہر طبقے کے لوگ اس کے ارادت مندوں میں موجود ہیں، جن میں شاہی شریفی خاندان بھی شامل ہے، چنانچہ سلطان مولائے عبدالرحمن (۱۸۲۲ تا ۱۸۵۹ء) اور مولائے یوسف (۱۹۱۲ تا ۱۹۲۷ء) اسی سلسلے سے تعلق رکھتے تھے۔ انیسویں صدی عیسوی کے آخر میں الجزائر میں درقاوہ کی تعداد کا اندازہ ساڑھے چودہ ہزار لگایا گیا تھا اور مراکش میں یہ ۱۹۳۹ء میں تقریباً چونتیس ہزار کی تعداد میں تھے۔

درقاوہ عقائد میں کلیتاً راسخ الاعتقاد سنی معلوم ہوتے ہیں۔ وہ زیادہ زور اس پر دیتے کہ آدمی جہاں تک ہو سکے اپنی توجہ ذات باری تعالیٰ کی طرف مرکوز کر دے اور اللہ عز و جل کے ساتھ باطنی تواصل حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہے۔ اس مقصد کے لیے لازم ہے کہ سالک بقدر امکان بہ کثرت ذکر کرے اور نماز پڑھے، بالخصوص مجالس ذکر کے دوران جو سلسلے کے مقررہ مقامات پر باقاعدہ منعقد ہوتی رہتی ہیں ذکر الہی میں مصروف رہے۔ یہ وقتی اجتماعات اس لیے ہوتے ہیں کہ اوراد و اذکار نیز صوفیانہ اشعار کے سنتے اور رقص سے وجد کی کیفیت طاری ہو جائے۔ ان مجالس کا بہت عمدہ بیان E. Dermenghem کے مقالے *Essai sur la*

میں لے جاتے ہیں۔ کبجا جزاؤ زیورات اور زرگری جیسی مقامی دستکاریوں کے لیے اور سلیو کنت Sulevkent کوڑہ گری کے لیے مشہور ہیں۔ صنعت و حرفت میں کوئی ترقی نمایاں نہیں۔ اکوشت، لیوشتی اور تزدنخر میں پھلوں کو محفوظ کرنے کے کارخانے ہیں۔

مآخذ : (۱) C. N. Abdoullaev : *Russko-darginskiy slovar* 'مغج - قلعہ ۱۹۵۰ء : (۲) A. Bennigsen اور H. Carrère d'Encausse : *Une république soviétique : le Daghestan* ' در 'REI' ۱۹۵۵ء ص ۶ تا ۵۶ : (۳) A. A. Bokarev : *Kratkie svedeniya o yazykakh Daghestana* 'مغج - قلعہ ۱۹۴۹ء : (۴) E. I. Kozubskiy : *Pamyatnaya knizka Daghestanskoy oblasti* 'تیرخان شرا' ۱۸۹۵ء : (۵) G. P. Serduchenko اور Meshchaninov : *Yazyki Severnogo Kavkaza i Daghestana* 'ماسکو - لینن گراڈ Etnograficheskoe : Z. A. Nikol'skaya (۶) ۱۹۴۹ء : *opisanie darginskogo Kolchozu "Krasniy Partizan" در 'Sov. Etn.* ج ۲ (۱۹۵۰ء) : (۷) L. Žirkov : *Grammatika darginskogo yazyka* 'ماسکو ۱۹۲۶ء ص ۱۰۳ - نیز رک بہ اوار 'داغستان' در پند (CH. QUELQUEJAY)

* درقاوہ : درقاوی نسبت کی جمع، ایک دینی برادری، جو اٹھارہویں صدی عیسوی کے اواخر میں ایک ادریسی شریف مولای العربی الدرقاوی نے شمالی مراکش میں قائم کی۔ درقاوی کی وجہ تسمیہ کی بابت یہ خیال کیا گیا ہے کہ اس کے اجداد میں ایک شخص ابو ذرقہ کہلاتا تھا، جس کے معنی ہیں چمڑے کی ڈھال والا۔ یہ ادریسی ایک اور ادریسی شریف علی بن عبدالرحمن الجمال کا فاس میں شاگرد رہا تھا جو صوفیہ کے سلسلہ شاذلیہ [رگ بان] کا مستند پیر تھا اور جس کے انتقال کے بعد ادریسی نے اسی کی تعلیم سے متاثر ہو کر یہ برادری قائم کی۔ شروع میں

تفتہ Tafas (۱۸۳۷ء) کے عہد لاموں کے بعد فرانس سے مل گیا تھا۔

مآخذ: (۱) مولیٰ العربی الذرقادی: رسائل

طبع سنگ: فاس ۱۳۱۸ھ/۱۹۰۰-۱۹۰۱ء: (۲)

محمد بن جطر الکثانی: سلوة الانفاس، طبع سنگ، فاس

۱۳۱۶ھ/۱۸۹۸-۱۸۹۹ء، مواضع کثیرہ اور بالخصوص

۱: ۱۷۶، ۲۶۷، ۳۵۸: (۳) ناصری: کتاب الاستقامہ

قاہرہ ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۸-۱۸۹۹ء: ۳: ۱۳: (۴) زبانی:

ترجمان العرب، طبع Houdas، پیرس ۱۸۸۶ء، ص ۱۰۰ تا

۱۰۷: (۵) Marabouts et Khouan: L. Rina الجزائر

۱۸۸۸ء، ص ۲۳۱ تا ۲۶۳: (۶) O. Depont اور

Les Confrères Musulmanes: X. Coppoiani الجزائر

۱۸۹۷ء، ص ۵۰۳: (۷) A. Joly Étude sur les

Chadellias الجزائر ۱۹۰۷ء: (۸) G. Drague

Esquisse d' Histoire Religieuse du Maroc پیرس

بدون تاریخ، ص ۲۵۱ تا ۲۷۳۔

(R. LE TOURNÉAD)

دُرکانی: گرجانی قبیلے کا ایک بلوچ خالوادہ۔ *

دُرکانی ڈوڈائیوں کی نسل سے ہیں، جو راجپوتوں کا ایک

قبیلہ تھا اور قدیم زمانے ہی میں بلوچیوں کی

جہتے بندی میں شامل ہو گیا تھا۔ دُرکانیوں کی نسل

پہاڑی ہے اور وہ سلسلہ کوہ سلیمان کے ایک پہاڑ

داخل میں آباد ہیں۔ ان کی زبان بلوچی ہے۔

(M. LONGWORTH DAMES)

دُرگاہ: فارسی میں لغوی معنی ”دروازے کی“ *

جگہ ہے [رگ بہ در] ایران میں عموماً شاہی دربار یا

محل کے معنی میں مستعمل ہے [ہاکستان و] ہند میں

اس کا ایک مزید مخصوص مفہوم کسی پیر کے مزار یا

مقبرے کا بھی ہے۔

دِرُن: رگ بہ اطلس۔ *

دِرَنہ: جنید تلفظ دِرَنہ: برقہ (Cyrenaica) *

کے شمالی ساحل پر ایک شہر، جو آج کل اس علاقے

mystique musulmane میں ملے گا جو اس نے ابن الفارض

کے قصیدہ خمیریہ کے ترجمے (پیرس ۱۹۳۱ء، ص ۲۴،

تعلیقہ ۱) کے مقدمے کے طور پر لکھا ہے۔ اپنے آپ

کو دنیا سے اوری طرح بے تعلق کرنے کے لیے بعض

سالکان طریقت خانہ بندشوں کی طرح جگہ جگہ

گھومتے پھرتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں ایک عصا

ہوتا ہے۔ میلا کچھلا پھٹا پرالا لباس پہنتے ہیں

اور سو دانوں کی تسبیح ان کے گلے میں ہوتی

ہے۔ تاہم ان کی اکثریت اس پر اکتفا کرتی ہے

کہ جہاں تک ہو سکے دنیوی اشغال کی طرف کم

سے کم توجہ کریں اور عوامی زندگی کی کسی

شکل میں کوئی حصہ نہ لیں۔

اس کے باوجود چند مواقع پر درداؤہ نے

سیاسیات میں کچھ نہ کچھ حصہ لیا، چنانچہ ان میں

سے ایک ابن الشریف نے اوران Oran کے ترکی صوبے

میں اچھی خاص شورش برپا کی، جو کئی برس

جاری رہی (۱۸۰۳ تا ۱۸۰۹ء)۔ اگر مولائے سلیمان

(۱۷۹۳ تا ۱۸۲۲ء) اعتدال پسند نہ ہوتا تو ممکن

ہے کہ اس شورش کا انجام یہ ہوتا کہ مغربی الجزائر کا

مراکش کے ساتھ الحاق ہو جاتا۔ اس کے ٹھوڑے

ہی عرصے بعد درداؤہ کے متفرق گروہوں نے مولائے

سلیمان کی حکومت کے آخری برسوں میں برابر قبائل

کی بغاوت میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ اس سلسلے

کے سرگروہ کو کچھ روز کے لیے قید بھی کر

دیا گیا تھا۔ مولائے سلیمان کی وفات کے بعد درداؤہ

نے مراکش کی سیاسیات میں بمشکل ہی کوئی حصہ

لیا، یہاں تک کہ بیسویں صدی کے شروع کے

پر آشوب زمانے میں بھی وہ الگ تھلک رہے۔ دوسری

جانب، فرانس کی الجزائر کی فتح کے پہلے چند برسوں

میں انہوں نے کسی قدر سیاسیات میں حصہ لیا، یعنی

امیر عبدالقادر کی مخالفت کی، جس پر یہ الزام قائم

کیا گیا کہ وہ دیمیشلز Demichels (۱۸۳۴ء) اور

ہندوگھوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی اور عرب فوجوں، تجارتی قافلوں اور زائرین کے عام راستے سے تقریباً نوے کلومیٹر کے فاصلے پر (عین الغزائہ، الشیمی اور مغلی کے) جنوب میں واقع تھی۔ ہندوہوں صدی عیسوی کے اواخر میں جب شمالی افریقہ کے مختلف مقامات سے اندلسی پناہ گزین یہاں آکر آباد ہونے لگے تو درنہ کے بھی دن بھرے، کیونکہ ان میں سے بیشتر کشتکار تھے۔ سترھویں صدی عیسوی میں قاسم پاشا نے طرابلس سے قسطنطنیہ واپس آتے ہوئے درنہ کے علاقے کی زرخیزی دیکھی تو باب عالی کی اجازت سے وہیں اہل اندلس کے درمیان سکونت اختیار کر لی۔ کچھ دن بعد اس کے نائب کی درخواست پر تونس کے لیے آٹھ سو مزید اندلسیوں کو تونس سے درنہ بھیج دیا (۱۶۳۸ء)۔ العیاشی (م ۱۰۹۱ھ / ۱۶۸۰ء) اور ابن ناصر الدروعی (م ۱۱۲۹ھ / ۱۷۱۷ء) کے سفرناموں سے پتا چلتا ہے کہ اندلسی ۱۰۴۰ھ / ۱۶۳۱ء کے قریب درنہ میں آکر آباد ہوئے تھے اور قبل ازیں یہ شہر مدتوں ویران پڑا رہا تھا۔ اس کی رونق بحال ہونا شروع ہوئی تھی کہ طرابلس کے دای (والی) محمد (۱۰۴۱ھ / ۱۶۳۲ء - ۱۰۵۹ھ / ۱۶۴۹ء) نے بن غازی (۱۶۳۸ء) اور آوچلہ پر (۱۶۴۰ء) فوج کشی کر دی، کیونکہ وہ صحرا پار کی تجارت پر قابض رہنا چاہتا تھا اور طرابلس میں بیروق اشخاص کا عمل دخل اسے پسند نہ تھا۔ مزید برآں فزان اور بوزنو سے بحرہ روم کے ساحل پر جانے والے بعض تجارتی قافلے بھی اسی نخلستان کے راستے گذرا کرتے تھے۔ ۱۰۶۶ء میں یہ شہر محمد کے جانشین دای عثمان کے حملے سے ایک بار پھر ویران ہو گیا، کیونکہ باشندوں کی بہت بڑی تعداد ماری گئی اور بہت سے لوگ جلا وطن ہو گئے؛ تاہم یہ شہر بہت جلد دوبارہ رونق پکڑ گیا۔ محمد بن محمود کو، جسے طرابلس کے پاشا نے یہاں کا عامل مقرر کیا تھا، آج بھی بہت احترام سے یاد کیا

میں بن غازی کے بعد سب سے اہم ہے۔ یہ ایک چھوٹے سے میدان میں واقع ہے، جو اسی نام کی ندی کے کناروں کے ساتھ ساتھ چلا گیا ہے۔ اس کے جنوب میں الجبل الأخضر کی سطح مرتفع ہے اور مشرق اور مغرب کی جانب مستتر ہے۔ مداروں چشموں کی بدولت یہاں کھجوروں، (آٹھ ہزار) لارنگیوں اور دیگر میوہ دار درختوں کی خوب کثرت ہے۔ درنہ کی بنیاد یونانیوں نے رکھی تھی، جنہوں نے اپنی ایک بستی اس نواح میں بسائی تھی لیکن یہ تجارتی منڈی، جو ڈرنس Darnis کہلاتی تھی، "پولس" (Polis = شہر) نہ بن سکی؛ چنانچہ اس کا شمار ان پانچ شہروں میں نہ تھا جو سکندر اعظم کے زمانے میں باہم حلیف بن گئے تھے اور جن کی وجہ سے اس علاقے کا نام Pentapolis (= پنج شہری) پڑا۔ اس شہر کی ترقی غالباً مصر کے بطلمیوسی بادشاہوں (Ptolemies) کے زمانے میں ہوئی۔ ۹۶ ق م میں "پنج شہری" کی طرح درنہ پر بھی اہل روم کا قبضہ ہو گیا۔ یہ قبضہ Ptolemy Apion کی وصیت کی رو سے ہوا تھا۔ اس نے Ptolemy Physcon کے فیصلے کی تجدید کی تھی، جو ۱۵۵ ق م میں موجود تھا (مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے Cirenateo : Romanelli، ص ۱ تا ۲۰)۔ مسلمانوں کے ہاتھوں پنج شہری (Pantapolis) کی فتح کے لیے رک بہ برقہ - یا قوت کا بیان ہے کہ ۵۷۶ھ / ۶۹۵ء (یا ۵۷۳ھ / ۶۹۳ء) میں جب یونانی اس علاقے پر دوبارہ قبضہ کرنے کے خیال سے اس جگہ اترے تو یہاں کا عامل ابوشداد زہیر بن قیس البلوی ان کا مقابلہ کرنے کے لیے تیزی سے روانہ ہوا، لیکن شہید ہو گیا۔ یا قوت کا بیان ہے کہ اس کا مزار اور شہدا کی قبریں مشہور ہیں۔ عربوں کے عہد میں درنہ ترقی نہ کر سکا، چنانچہ عرب جغرافیہ نگاروں کے ہاں اس کا ذکر نہیں ملتا۔ دراصل اس کی خوشحالی کا دار و مدار زراعت پر رہا تھا۔ اس کی ہندوگھہ برقہ کی دوسری

اور آہستہ آہستہ یہ قبضہ مستحکم ہوتا چلا گیا۔ حکومت ترکیہ کی یہ انتہائی کوشش رہی کہ سوسہ، سوسہ اور درنہ کے درمیانی علاقے کو آباد کیا جائے۔ لیبا (طرابلس) پر قبضہ کرنے کی غرض سے جب اٹلی نے ترکیہ کے خلاف اعلان جنگ کیا (۲۹ ستمبر ۱۹۱۱ء) تو سب سے پہلے درنہ کو بم بازی کا نشانہ بنایا (۳۰ ستمبر) اور اس پر قبضہ کر لیا (۱۶ اکتوبر)۔ اس وقت اس شہر کی آبادی ساڑھے نو ہزار کے قریب تھی۔ پہلی عالمگیر جنگ کے دوران میں یہ اٹلی ہی کے قبضے میں رہا، لیکن دوسری عالمگیر جنگ میں انجام کار انگریز اس پر قابض ہو گئے (جنوری ۱۹۴۳ء)۔

[آج کل درنہ جمہوریہ لیبا میں شامل ہے۔] یہاں سوسہ کا صرف ایک زاویہ ہے، حالانکہ دوسرے طریقوں کے چودہ زاویے موجود ہیں اور ان میں سے بعض ڈیڑھ سو سال کی طویل مدت سے قائم ہیں۔ یہاں کے گورستان میں سیدی بو منصور الفارسی کا مقبرہ ہے۔ وہ ان ستر غازیوں میں شامل تھے جو مذکورہ بالا زہیر البلوی کی معیت میں شہید ہوئے تھے۔ دریا کے دائیں کنارے کے ساتھ ساتھ شہر کا جو حصہ پھیلا ہوا ہے وہ انہیں کے نام سے موسوم ہو گیا ہے۔ [اس کی موجودہ آبادی چوراسی ہزار سے متجاوز ہے۔]

مآخذ: زمانہ قدیم کے لیے دیکھیے (۱) J.P. Thirgo: *Res Cyrenensium* کوئن ہیگن ۱۸۲۸ء (۲) دوم، Verbania ۱۹۳۰ء (اطالوی ترجمہ 'Verbania ۱۹۳۰ء)؛ (۲) P. Romanelli: *La Cirenaica Romana*؛ (۳) *Storia della Libia* (۱۹۳۳ء) (یہ مجلات *bania* شائع کی گئیں)؛ عرب جغرافیہ نویسوں میں دیکھیے: (۴) یاقوت: معجم؛ بذیل مادہ: عمد بربر کے واقعات کے لیے: (۵) C. Bergna: *Tripoli dal 1510 al 1850*؛ طرابلس ۱۹۲۵ء؛ ص ۱۲۳؛ جلد ۱: ۱۰۶؛ Ch. L. Feraud: *Annales Tripolitaines* تونس ۱۹۲۷ء؛ ص ۱۰۰ تا

جاتا ہے، کیونکہ اس نے سترھویں صدی عیسوی کے اختتام کے قریب آپاشی کے نظام کی طرف توجہ کی اور بہت سے دوسرے رفاہ عام کے کام کیے (خصوصاً یہاں کی مسجد جامع تعمیر کی)۔ درنہ کے لوگ اپنی جرأت اور سخت کوشی کے باعث ہر حکومت کے لیے پریشانی کا باعث ثابت ہوئے، حتیٰ کہ قرہ مائلی والیوں کے لیے بھی وہ درد سزا بنے رہے۔ ۱۷۱۵ء میں احمد اول نے کوشش کی کہ بن غازی اور درنہ کو ہمیشہ کے لیے مطیع کر لیا جائے۔ ورنیلانی، جس نے ۱۱۵۹ء/ ۱۷۶۵ء تا ۱۱۸۱ء/ ۱۷۶۷ء میں یہاں کا سفر کیا تھا، اپنے رحلہ (سفر نامے) میں بتاتا ہے کہ درنہ اور مصراقہ کے باشندوں میں ہمیشہ ٹھنی رہتی تھی اور صرف ایک بار قحط سالی کے باعث ان کی باہمی کشمکش ملتوی ہو گئی تھی۔ ڈیلا سیلا Della Cella نے بھی ایک وبائی طاعون کا ذکر کیا ہے، جس سے ۱۸۱۶ء میں آبادی سات ہزار گھٹ کر صرف پانچ سو رہ گئی تھی۔ ۱۸۰۵ء میں درنہ کو ایک اچانک حملے سے سابقہ پڑا۔ چار سو نفوس پر مشتمل بے قاعدہ فوج نے، جس کی مدد تین امریکی جہاز کر رہے تھے، اس پر بمباری کر کے قبضہ کر لیا۔ قصہ یہ تھا کہ طرابلس کے پاشا یوسف قرہ مائلی کے چھاپہ مار جہازوں نے امریکی جہازوں پر حملہ کیا تھا اور جب امریکی جنگی بیڑے کا طرابلس پر براہ راست حملہ ناکام رہا تو بربر میں امریکہ کے بحری نمائندے ولیم ایٹن William Eaton نے پاشا کے بڑے بھائی احمد کو ساتھ ملا کر کوشش کی کہ مصر سے برقہ کے راستے طرابلس پر چڑھائی کی جائے۔ بے قاعدہ فوج کا یہ دستہ ابھی درنہ سے کچھ زیادہ آگے نہ بڑھا تھا کہ یوسف پاشا کے ساتھ صلح ہو گئی اور اس عجیب و غریب فوجی مہم کا خاتمہ ہو گیا۔ ایک طویل مدت تک قرہ مائلی [رک بان] حکومت کے ماتحت رہنے کے بعد ۱۸۳۵ء میں برقہ ایک بار پھر براہ راست حکومت قسطنطنیہ کے زیر تسلط آ گیا

بعداً: *History of the Second* : J.S. O. Playfair (۲۰) :
World War, The Mediterranean and the Middle
East 'ج ۱' لندن ۱۹۵۸ء بعد اشاریہ: (۲۱)
'Il Regno Unito della Libia : E. Rossi
 در OM '۳۱' (۱۹۵۱ء) ۱۵۷ تا ۱۷۷ نیز کتاب
 مذکور 'مآخذ' ۱۶۲ (۱) : (۲۲) درنہ کے علاقے
 کی سڑکوں کا نقشہ (۱ : ۱۰۰۰۰۰۰) در *Bollettino*
geografico del Governo della Cirenaica, Servizio
Guida d'Italia del Touring (۲۳) : ۹ : Studi
 'Club Italiano, possedimenti colonie' میلان ۱۹۲۹ء
 ص ۸۸ تا ۸۸۔

(L. VECCHIA VOGLIERI)

* **الدروز: واحد الدرزی [اور الدرزی] [رگ بان]**
 شامی نسل کے لوگ، جو باطنی مذہب کے پیرو ہیں، جو
 اسمعیلیہ [رگ بان] عقائد پر مبنی ہے۔ یہ لوگ اپنے آپ
 کو 'موجدون' (ایک خدا) کے ماننے والے کہتے ہیں۔
 ان کی تعداد (یسویں صدی عیسوی کے وسط میں)
 دو لاکھ تھی۔ یہ سورہ (شام) کے متفرق حصوں میں
 رہتے ہیں، بالخصوص جبال لبنان غربی، جبال شرق اور
 حوران میں: ان میں سے زیادہ تر زراعت پیشہ اور زمیندار
 لوگ ہیں۔

ان کے مذہب کا آغاز مصر کے فاطمی خلیفہ
 (۳۸۶ / ۹۹۶ تا ۴۲۱ / ۱۰۳۱ء) الحاکم [رگ بان]
 کے عہد سلطنت کے آخری برسوں میں ہوا۔ اسمعیلی
 شیعہ عقیدہ کے مطابق، جو اس وقت مصر میں باقاعدہ
 حکومت کا مذہب قرار پایا تھا، الحاکم، بحیثیت
 امام، اسلام کا اللہ کی طرف سے مقرر شدہ با اختیار قیم
 (حارس) تھا، اور انسانوں میں اس کا مقام وہ تھا جو
 اصول کائنات میں عقل الفعالی کا ہے اور وہ اسمعیلی
 مذہب کے پیشواؤں کا مسئلہ سردار تھا۔ الحاکم
 اپنی ذاتی زندگی اور مذہبی حکمت عملی دونوں میں
 ایک دتوں مزاج غوماروا ثابت ہوا، اور یکے بعد

۱۰۹ '۱۰۰ تا ۱۱۱ '۱۰۹ بعداً: E. Rossi (۶) :
La Cronaca araba tripolitina di Ibn Galbun (sec.
'XVIII) tradotta e annotata و Bologna ۱۹۲۶ء
 ص ۱۰۱ '۱۰۶ بعداً: (۷) : العیاشی: الرحلة العیاشیة
 فاس ۱۳۱۶ء : ۱۰۸ : بعد (منقول در ورتیانی ص ۳۲۲)
 (۸) ابن ناصر الدرعی: الرحلة الناصریة، فاس ۱۳۲۰ء
 (منقول در ورتیانی ص ۶۰۹) : (۹) ورتیانی: نزہة الأنظار
 فی فضل علم التاريخ و الأخبار = الرحلة الورتیانیة
 الجزائر ۱۳۲۶ / ۱۹۰۸ء ص ۶۰۸ بعداً: ۱۸۰۵ء میں
 درنہ پر اسریکی قبضے کے لیے دیکھیے (۱۰) : E. Dupuy
Americains et Barbaresques (1776-1824)
 Encyclopaedia Bri- (۱۱) : ۲۷۰ تا ۲۳۱ : ۱۹۱۰ء
 : V.H. Serrano و Eaton (۱۲) : *tanica*
 'Ithaca' Libya, the New Arab Kingdom ۱۹۵۶ء
 ص ۱۲ تا ۱۳۱ : انہارہویں صدی عیسوی کے دوری
 سیاحوں کے لیے (۱۳) : *Enciclopedia Italiana*
 و *Cirenaica* : E. Cervelli (۱۴) : *Esplorazioni*
Recueil de Voyages در اقتباس : *et Mémoires de la Société de Géographie de Paris*
 ج ۲ : ۱۸۲۵ء : P. Della Cella (۱۵) : *Viaggio da*
Tripoli di Barberia alle frontiere occidentali dell
Egitto fatto nel 1817 میلان ۱۸۲۶ء (بار اول جنوباً
 ۱۸۱۷ء) ص ۱۶۵ تا ۱۷۰ : ترکی تسلط کے زمانے کے آخر
 کے لیے: (۱۶) : Fr. Cori : *Settantasei anni di domi-*
nazione turca in Libia ۱۹۳۷ء ص ۱۰۲ : اطالوی
 عہد کے مآخذ کے لیے بھی دیکھیے *Enciclopedia*
Italiana پڈل مادہ *Cirenaica* : جدید دور کے لیے (۱۷)
The Sanusi of Cyrenaica : B. E. Evans-Pritchard
 اوکسفرڈ ۱۹۵۸ء بعد اشاریہ: (۱۸) : N.A. Zladen
Sanusiyah, a study of a revivalist movement in
Islam 'لائڈن ۱۹۵۸ء بعد اشاریہ: (۱۹) وہی مصنف :
 برقہ الدولة العریة الثامنہ بیروت ۱۹۵۰ء ص ۸ بعد ۱۸

دوسرا سال ۱۰۴۱ھ تھا، جب کہ عام تبلیغ از سر نو شروع کی گئی۔ اس نے دعوت کیا کہ وہ شروع ہی سے الحاکم کا مقرر کردہ اور مجاز واحد خطیب (نائب اسلام) ہے۔ ۱۰۴۱ھ میں الدروزی کی وفات کے بعد اس نے کوشش کی کہ ساری تحریک کو اپنے ہی حیطہ اقتدار میں لے آئے۔ یں طور پر اس کا عقیدہ الدروزی سے کہیں زیادہ اچھوتا تھا۔ عام اسمعیلی عقیدے کی طرح اس کا نظریہ بھی یہی تھا کہ کائنات کا صدور واحد ہے اور پھر اس کا مرجع بھی انسان کے باطنی علم کے راستے واحد ہی کی طرف ہے، لیکن اس کی فرانی خصوصیت یہ تھی کہ وہ کائنات کے اندر اس واحد کو بلا واسطہ حاضر مانتا تھا اور بنا بریں وہ ثانوی صادرات کو نسبتاً کم اہمیت دیتا تھا۔ اسی وجہ سے حمزہ نے اپنے پیروؤں کا لقب کامل ترین ”موحدین“ رکھا تھا۔

حمزہ کے نزدیک حاکم اب محض امام نہ تھا، خواہ امام کے مفہوم کو کتنا ہی ارفع سمجھا جائے۔ اب خود حمزہ امام تھا، یعنی انسان رہنما، اور اسی وجہ سے وہ العقل الکتبی یعنی کائنات کا اولین مبدأ تھا اور حاکم خود وحدۃ قُصویٰ یعنی خالق اکبر کا جس نے عقل کو پیدا کیا، اوتار تھا، اور اسی وجہ سے خود کسی نام یا عہدے سے سوارا تھا۔ یہاں تک کہ خیر و شر کے دائرے سے بھی باہر تھا۔ اس کے مقابلے میں علی اور اسمعیلی امام بحیثیت امام ثانوی درجے کے افراد تھے (لیکن چونکہ واحد (حقیقی) ہمیشہ حاضر رہتا ہے، خواہ ظاہر نہ بھی ہو، اس لیے بعض آخری امام مع بعض مقدم گمنام اشخاص کے بھی اپنے اپنے وقت میں واحد (حقیقی) کے اوتار تھے)۔ الحاکم کے اندر واحد حقیقی شان یکتائی سے تاریخ (دائرہ زمان) میں موجود تھا۔ اس کی زندگی کی متناقضی حرکات قادر مطلق کے افعال کا مظہر تھیں، جس کے کسی فعل میں چون و چرا کی گنجائش نہیں، اگرچہ اس کے ہر فعل کا مفہوم اس کے امام یعنی عقل یا

دیگرے اسمعیلیوں اور سنیوں دونوں کے جذبات کو یکساں مجروح کرتا تھا۔ اپنے آخری سالوں میں اس کی بہ خواہش تھی کہ اسے ایک لاهوتی شخصیت مانا جائے جس کا مرتبہ ان سب مرقبوں سے بلند تر ہے جو رسمی اسمعیلیت اسے دے سکتی ہے۔ اسمعیلیوں کی ایک خاصی تعداد فی الحقیقت اسے ایسا ہی سمجھتی تھی، اور بظاہر اس کی خفیہ رضامندی سے یہ لوگ اس دھن میں لگ گئے کہ اس کے مریدوں کی خاص جماعت تیار کی جائے۔ انہیں یہ توقع تھی کہ اس کا یہ مرتبہ عام طور پر مان لیا جائے گا۔

ان لوگوں میں سے پہلا شخص جس پر عوام کی نظر پڑی الدروزی [رُک بَان] تھا۔ یہ عجمی النسل تھا (جیسے کہ ان کے کئی اور قائدین تھے)؛ اسی وجہ سے اس پوری تحریک کا نام الدُرُوزِیہ (یا الدُرُوزِیہ) پڑ گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے الحاکم کے معتقدین کے رجحان کی ترجمانی اس قاعدے کے مطابق کی جو اسمعیلی الحاد کا متواتر موقف رہا ہے۔ یہ قاعدہ ”تاویل“ (باطنی حقیقت) اور اس کے نمائندے یعنی امام، کو ”تنزیل“ (نص ظاہر) اور اس کے مبلغ، یعنی رسول پر ترجیح دیتا ہے۔ اس قاعدے کے مطابق اُس نے اس وقت کے امام الحاکم کو ایک مافوق الطبیعی درجہ دے دیا، یعنی عقل کئی کا اوتار، جو نظام کوئیہ میں سب سے بلند عقل ہے، لیکن اس کی عوامی سرگرمیوں سے فسادات برپا ہونے لگے (۸۰۰-۱۰۱۰-۱۰۱۸ء) جس کی وجہ سے الحاکم زیادہ محتاط رہنے پر مجبور ہو گیا۔ ۱۰۴۱ھ میں الحاکم نے ایک اور قائد حمزہ بن علی [رُک بَان] کو، جو ایران کے ستم سوزن کا رہنے والا تھا، اپنی تائید سے سر فراز کیا اور اس نے حاکم کے مذہب کی درووزی شکل مکمل طور پر معین کی۔

حمزہ نے اپنی تبلیغ ۱۰۴۸ھ/۱۰۱۷ء میں شروع کر دی تھی (اور یہی درووزی سنہ کا پہلا سال تھا۔ اس کا

ہم معنی مانا گیا تھا لیکن یہاں اس کا مرتبہ گرا دیا ہے (= سلامۃ بن عبدالوہاب)؛ اور (۵) جناح ائیسر یا التالی (= تائب)، اسمعیلی مذہب میں یہ "نفس" کا ہم پلہ ہے (= ابوالحسن علی بن احمد الشموقی جسے بہاء الدین المقتنی کہتے ہیں)۔ ان پانچ بڑے عہدے داروں کے تحت کام کرنے والے یہ تھے: داعیوں اور مبلغوں کی ایک تعداد؛ ماذون، جنہیں وعظ کہنے کی اجازت دی جاتی تھی، اور المکابر، ترغیب دینے والے، جن کے اندر کائنات الجذ (کوشش)، الفتح (کھولنا) اور الخیال شامل تھے [قب البستانی: دائرة المعارف، بذیل مادہ الدروز؛ الیزرکلی نے الاعلام، بذیل مادہ حمزہ بن علی (م ۳۳۳ھ / ۹۴۱ء) میں الحدود الخمسة کے بعد الحدود الثلاثة یعنی الجذ (= ابوبن علی)، الفتح (= رفاعۃ بن عبدالوارث)؛ اور الخیال (= محسن بن علی) کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد الدعاء کا ذکر کرتے ہوئے ان کے مراتب حسب ذیل ترتیب سے بیان کیے ہیں: (۱) الامام، (۲) الحجۃ، (۳) الداعی، جس کی یہ اقسام بیان کی ہیں: داعی الدعاء، الداعی الماذون اور المکابر۔ ان سب کے نیچے عام معتقدین تھے۔ (ان تمام درجوں میں کسی فرد کی شخصیت اور جسمیت کا اعتبار نہ ہوتا تھا، بلکہ اس کے اندر پوشیدہ غیر فانی قاعدہ اصل سمجھا جاتا تھا جس کے اوپر جسم محض ایک عارضی خول ہوتا تھا؛ معمولی شخص کے اندر اس کا مطلب ہمیشہ ایک نیا جسم قبول کرتے رہنے والا نفس تھا)۔ ان عہدے داروں میں سے کسی نہ کسی کے ساتھ بہت سے ایسے لقب یا تصورات منسوب کر دیے جاتے تھے جو پیچیدہ اسمعیلی نظام میں متشکل ہو چکے تھے۔ تاہم ان درجات اور مراتب کے باوجود "الواحد" کا بلا واسطہ ہر جگہ موجود ہونا سب سے پہلی چیز مانا جاتا تھا اور بعد کے دروزی مذہب میں یہی خیال قائم رہا۔ ان سچی (اصلی) 'حدود' کے خلاف اور انہیں کی طرح الحاکم کی، بحیثیت الواحد الاقصی کے،

عقل کائنات حمزہ پر واضح تھا۔ الحاکم خالق مطلق کا "مقام" حاضر تھا؛ اس لیے انسان اس کی معرفت کی بدولت، متقی اور مظہر ہو سکتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حمزہ کی تعلیم صحیح معنوں میں اسمعیلیت کی غالی صورت نہ تھی گو اس میں غالی اسمعیلیت کے تصورات اور اصطلاحات سے کام لیا گیا تھا۔ اس تعلیم کا تو یہ دعوے تھا کہ وہ ایک مستقل مذہب ہے جو مبنی "تنزیل" اور اسمعیلی "تاویل" دونوں سے بالاتر ہے۔

بظاہر حمزہ یہ توقع رکھتا تھا کہ الحاکم کی خلافت سے تاریخ کے مسیحی عروج کا زمانہ پلٹ آئے گا اور تمام لوگوں کو قدیم الہامی ادیان کے شعائر سے، جن میں دین اسلام بھی شامل ہے، روگردانی پر مجبور کر دے گا اور انہیں محض اس (خداوند) واحد کی بندگی پر لے آئے گا جو الحاکم کے روپ میں صاف طور پر ظاہر ہو گیا ہے۔ الحاکم کے فیصلہ کن اقدام کے اہتمام کے طور پر حمزہ نے امام کی حیثیت سے الحاکم کے معتقدین کے حلقوں میں اس سچے اور صحیح عقیدے کی ترویج کے لیے خود اپنی جماعت منظم کرنی شروع کر دی۔ الحاکم اور خود حمزہ کی طرح اس جماعت کے اعضاء اصول کائنات کے اوتار (مجسمے) تھے۔ ان میں پانچ بڑے کائناتی منصب یا حدود (= الحدود الخمسة) تھے، جو اسمعیلی علوم سے کسی قدر ترمیم شدہ شکل میں اخذ کیے گئے تھے: (۱) العقل (= حمزہ [بن علی بن احمد])، شیطیل کا شیل، جو موجودہ تاریخی دور کے اندر "حقیقی آدم" ہے؛ جس میں "الواحد" کا نام الباز مقرر ہے، (دروزی کتب عقائد میں حمزہ کو "العقل الکلی"، "تائم الزمان"، "الامام"، "آیۃ التوحید"، "آدم الکلی" وغیرہ القاب سے یاد کیا گیا ہے)؛ (۲) النفس الکلیہ، روح کائنات (= اسمعیل بن محمد النعمانی)؛ (۳) الکلمۃ (= محمد بن وہب القرشی)؛ (۴) السابق یا جناح آمن، اسمعیلی مذہب میں اسے عقل کا

۱۴۱۱ھ کے اواخر میں، حمزہ بھی یہ کہہ کر غائب ہو گیا کہ وہ الحاکم کے ساتھ ہی واپس آئے گا۔ اس کے بعد یہ مذہب زمانے کے اس دور میں داخل ہو گیا جو اثنا عشریوں کے اس دور سے ملتا جلتا ہے جسے القیۃ الصغریٰ کہتے ہیں۔ اس زمانے میں فقط "نالی" بہاء الدین المقتنی رہ گیا جو غائب حمزہ اور اس کے وفادار پیرووں کے درمیان کڑی کا کام دیتا تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ الحاکم کے غائب ہونے کے بعد حاکم کے مذہب کی سرگرمیاں مصر میں رفتہ رفتہ گھٹتی گئیں، لیکن اس نے شام میں کاشتکاروں کی مسلسل بغاوتوں کے لیے ایک منظم نظریۂ حیات مہیا کر دیا۔ مبلغین کی ایک خاصی تعداد نے وہاں اس مذہب میں لوگوں کو داخل کرنے کے لیے سرگرمی سے کام شروع کر دیا جن میں سے بعض کے نام لکھے ہوئے موجود ہیں: اس تحریک نے بعض پہاڑی علاقوں پر اپنا اقتدار قائم کر لیا اور کہا جاتا ہے کہ اس کے پیرووں نے وہاں کی مسجدیں منہدم کر دیں اور اپنا نیا نظام قانون قائم کر دیا، اور احتمال ہے کہ انہوں نے قدیم زمینداروں کو بے دخل کر کے آزاد کاشتکاروں کو ان کی جگہ بٹھا دیا۔ ۱۰۳۲ / ۱۰۳۲ء میں امیر انطاکیہ نے امیر حلب کی مدد سے جبل السحاق میں ایک گروہ کی سرکوبی کی، جس میں حلب کے قرب و جوار کے کاشتکار جو وہاں جمع ہو گئے تھے، شامل تھے۔

اس ہجرت کے زمانے میں المقتنی نے اسکندریہ میں (المقتنی کو ۱۴۱۱ھ کے صرف آخری لمحے میں "نالی" مقرر کر دیا گیا تھا) کوشش کی کہ اُس کا اور حمزہ کا اقتدار قائم رہے۔ ظاہر ہے کہ وہ مستور حمزہ کے ساتھ ملا ہوا تھا اور یمن سے اس کے اچانک ظاہر ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس نے جبل السحاق کے شکست خوردہ باغیوں کی ہمت بڑھائی۔ اپنے مسلک کی تبلیغ کے سلسلے میں بہت سے خطوط لکھے، جن میں سے بعض میں شام میں بسنے والوں کے علاوہ اسماعیلی مذہب

پیدا کردہ اشیا میں کاذب (جھوٹی) حدود کا ایک منظم سلسلہ تھا اور اصلی حدود کی طرح وہ بھی الحاکم کے زمانے کے آدمیوں میں جسمانی شکل میں موجود تھا، مثلاً الحاکم کے اسماعیلی مأمورین کے اندر، قدیم مذاہب کے گمراہ کن اصول سکھانے والے معلم۔ حشر نشر کے منظر کا مطلب دو فریقوں کے درمیان میدان جنگ کا برپا ہونا لیا جاتا تھا، جس میں ایک فریق حمزہ بعثیت "قائم الزمان" (= وقت کا مالک) اور اس کے ساتھ صادق (سچی) حدود، جن کی تائید آخرکار الحاکم کھلم کھلا کرے گا، اور دوسرا اس کے مقابل فریق کے جھوٹے معلمین، جنہیں الحاکم علانیہ معزول قرار دے گا۔ الحاکم کے نظام دینی کے پیروؤں کو، خواہ درزی کے تحت یا حمزہ کے تحت بظاہر یہ فکر تھی کہ حوادث جلد سے جلد واقع ہوں اور اس غرض کے لیے وہ کھلم کھلا اعلان کرنے پھرتے تھے کہ قدیم مذاہب، سارے کے سارے جن میں اسلام کا قانون شریعت اور اس کی اسماعیلی باطنی تاویل شامل ہیں، باطل ہو چکے ہیں۔ اگرچہ حمزہ اوروں سے زیادہ محتاط تھا مگر واقع الوقت مذہب کی توہین و تحقیر علی الاعلان کی جاتی تھی۔ الحاکم کی خفیہ تائید اس (فتنے) کو حاصل تھی اور اسی بنا پر فسادات برپا ہوتے تھے۔ جدید مذہب کے پیرووں کے خلاف، جو خود کو شریعت سے آزاد سمجھتے تھے، ہر قسم کی بڑی بڑی بدکاریوں کے الزامات عائد کیے جاتے تھے۔ الحاکم کا دینی مسلک اس روز افزوں سیاسی بحران کا بہت بڑا سبب معلوم ہوتا ہے جو الحاکم کے آخری ایام میں رونما ہوا۔

جب ۱۴۱۱ / ۱۰۲۱ء کے اواخر میں الحاکم غائب ہو گیا تو حمزہ نے اعلان کیا کہ اس کا غائب ہونا اس غرض سے ہے کہ اپنے متبعین کی آزمائش کرے اور وہ بہت جلد واپس آ کر اپنی پوری قوت کا اظہار کرے گا اور فتح کی قلواریں خود حمزہ کے ہاتھوں میں دے دے گا۔ اس کے تھوڑے ہی دن بعد

حمزہ کے مذہبی پیشواؤں کا مقرر کردہ نظام، جس میں "داعیان" اور اس سے کمتر عہدے دار شامل تھے، متروک ہو گیا اور "حدود" کی عدم موجودگی میں "کتاب قانون مقدس" رہنمائی کا کام دینے لگی۔ اگرچہ المقتنی نے اپنے مذہب کی تبلیغ کو حتی الامکان جاری رکھنے پر بڑا زور دیا تھا، لیکن اس کی گوشہ نشینی کے بعد مزید تبلیغ کا سلسلہ بند ہو گیا اور اس بات کی تعلیم دی جائے لگی کہ اس وقت سے کسی نئے آدمی کو "وحدانیت کی حقانیت" میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی جائے (اس معامت کی چند مستثنیات بھی ہیں)۔ اس کے بعد درواز ایک "در بند" فرقہ ہو گیا جس کے اراد اپنے قواعد و ضوابط کو صیغہ راز میں رکھنے لگے، جماعت سے باہر نادی کے رشتے کرنے پر ناک بیون چڑھانے لگے، مذہب کے قبول اور رد کی اجازت ممنوع کر دی گئی اور تا حد امکان اپنی خود مختار حکومت ان کو ہستانی معاول (محفوظ مقامات) میں قائم کر دی جس پر انہوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ ان محفوظ مقامات میں سے وادی قیوم اللہ مشہور ہے، جو کوہ قرمن کے قریب ہے۔ شام کے ان نو مذہب فلاحین نے جن کی قیادت حسب روایت قدیم عربی قبائل کے بعض خاندان کرتے تھے، آگے چل کر ایک ہم جنس قوم کی بنا ڈالی، جن کے جسمانی خد و خال اور معاشری طریقے اوروں سے بالکل الگ تھے اور ان کے اپنے طبقہ اشراف کے خاندان ان پر حکمران تھے۔ اشراف کے یہ خاندان اپنی بے قید غارتگری، اپنی بے حد مہمان نوازی اور اپنے سخت اخلاق نظم و ضبط کے لیے یکساں مشہور ہیں۔ اخلاق ضوابط ہی کے باعث وہ لوٹ مار میں ہاتھ آئی ہوئی عورتوں کی عصمت پر دست درازی نہیں کرتے اور بد چلتی کی صورت میں دروڑی عورتوں کے لیے رحم و کرم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مغربی لوگوں کے وہ طویل طویل قیاسات بالکل بے بنیاد ہیں جن میں دروڑ کو کسی غیر ملکی اصل، مثلاً فرانس

کے تمام مائیر والوں اور ان سے تعلق رکھنے والوں کو بندہ تک کے دہر دراز علاقوں میں مخاطب کیا گیا تھا۔ ان خطوط کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ دروڑ کے صحیح اور مستند عقائد کی بنیاد قائم ہو گئی۔ ایسے ایک سے زیادہ مدعیان قیادت کے خلاف جدوجہد کرنا بڑی، جن میں سے ابن الکردی، جس کی کمک پر بیگین نام ایک شخص تھا، سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ ان مدعیوں میں سے بعض نے بہت وسیع پیمانے پر اخلاقی آزادی دے رکھی تھی، جسے وہ (المقتنی) خود ہنغار حقارت دیکھتا تھا۔ بہر حال جیسے جیسے زمانہ گزرنا گیا تحریک کمزور ہوتی چلی گئی، اور معلوم ہونا ہے کہ شام کے کاشتکاروں کی بغاوت باہمی بھوٹ کی وجہ سے انتشار و فاکسی کی شکار ہو گئی۔ آخر کار المقتنی نے تمام داعیوں کو برطرف کر دیا اور ۱۵۴۵ء / ۱۰۳۸ء کے کچھ عرصہ بعد خود بھی اپنے وفادار مریدوں سے اسی طرح کنارہ کش ہو گیا جیسے حمزہ ہوا تھا! پھر بھی ۱۵۴۴ء / ۱۰۳۲ء - ۱۵۴۵ء کی طویل مدت تک وہ ہر طرف خطوط ارسال کرتا رہا۔ المقتنی کے ہمت ہار دینے کے باوجود یہ تحریک جس حالت میں بھی آئندہ زندہ رہی اس کی بنیاد اسی کی کارگزاری تھی۔ بعد کے آنے والے دروڑ نے یہ مفروضہ قائم کر لیا کہ وہ المقتنی ہی تھا جس نے ایک سو گیارہ خطوط کا مجموعہ تالیف کیا۔ ان میں سے بہت سے خطوط اس کے لکھے ہوئے تھے، کچھ حمزہ کے اور کچھ اسمعیل التیمی کے اور کچھ اجزاء الحاکم کی تصنیف تھے۔ اس نے ان سب خطوط کو یکجا کر کے ایک مستند مذہبی کتاب کی شکل دے دی جو اسی وقت سے دروڑ کی مقدس کتاب مانی گئی ہے اور رسائل الحکمة کے نام سے موسوم ہے۔ المقتنی کی آثار کشی کے وقت سے شامی دروڑ میں حمزہ اور الحاکم کی آمد کے انتظار کا دور شروع ہوا، جو اب تک قائم ہے اور جو اثنا عشریہ کی الغیبة الکبریٰ سے مطابقت رکھتا ہے۔

یا ایران، سے منسوب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس خود مختار جماعتی اور محدود زندگی کی طویل مدت کے دوران میں ایک نیا مذہبی طریق عمل پیدا ہو گیا جو پیشوایان مذہب کی اس حکومت سے بہت مختلف تھا جو اب ختم ہو چکی تھی۔ ہمیں ایسے مصنفین کی خاصی تعداد معلوم ہے جنہوں نے عرفانی نظام کائنات اور مقدس دروزی تاریخ پر جو پہلے ہی سے حمزہ کی تحریروں میں کثافت موجود تھی، قلم اٹھایا ہے اور اسی طرح شارحین "کتاب قانون مقدس" بھی ہمارے پیش نظر ہیں، لیکن یہ معلوم نہیں کہ اس نئے طریقے نے اپنی مکمل شکل کب اختیار کی، اگرچہ غالب گمان یہ ہے کہ ایسا کم سے کم دروزی معلم اخلاق عبداللہ التتوخی کے زمانے تک ہو چکا ہوگا (جس کے مزار کی دروز اور مسیحی دونوں تعظیم کرتے ہیں)۔ عبداللہ التتوخی کی وفات ۸۸۵ھ/۱۴۸۰ء میں ہوئی۔ اس نئے طریقے کی رو سے دروز دو گروہوں میں منقسم ہو گئے: (۱) عقّال (مفرد: عاقل - دانشمند)، جن کو مذہب کے حقائق سے آگاہ کر دیا گیا تھا؛ (۲) جہّال (مفرد: جاہل؛ ناواقف)، جو جماعت میں شامل تھے لیکن حقائق مذہب سے متعارف نہ کیے گئے تھے۔ (اشراف کے وہ مشاہیر جنہیں ابھی حقائق سے واقف نہیں کیا گیا تھا، بحیثیت "امیر" وہ معمولی "جہّال" سے ممتاز تھے)۔ ہر ایک عاقل بالغ دروزی (مرد ہو یا عورت) واقف راز ہو سکتا تھا بشرطیکہ وہ متعدد آزمائشوں کے بعد اس کا اہل ثابت ہو چکا ہو، لیکن اس کے بعد اس کے لیے ضروری ہے کہ سنجیدہ مذہبی زندگی بسر کرے، باقاعدہ وظائف کا روزانہ ورد رکھے، تمام نشہ آور چیزوں سے پرہیز کرے، جھوٹ سے، چوری سے اور انتقام لینے سے (جس میں باہمی جھگڑوں کی وجہ سے حملے کرنا داخل ہے) بچے اور ایسے ہی اور بُرے کاموں سے دور رہے۔ عقّال کا دوسروں سے الگ اپنا ایک خاص لباس ہوتا ہے جس میں سفید عمامہ شامل

ہے۔ جب تک کوئی شخص "جاہل" رہے، وہ اپنی نفسانی خواہشات کھل کر پوری کرنے کا مجاز ہے لیکن دروز قوم کے اخلاق قانون کی حدود کے اندر کر، تاہم وہ روحانی مدرّاج کی امید نہیں رکھ سکتا۔ بہر حال اگر وہ اپنی موجودہ زندگی کے اندر باطنی حقے میں بار نہ پاسکا تو بھی یہ امید کر سکتا ہے کہ اسے کسی دوسرے جنم میں اس کا ایک نیا موقع مل جائے گا۔ عقّال میں سے جو زیادہ پرہیزگار یا فاضل ہو، اُسے قوم میں شیخ بنا کر خصوصی اختیارات دے دیے جاتے ہیں۔ معمولی "عقّال" سے جن اخلاق کا مطالبہ کیا جاتا ہے ان کے علاوہ شیوخ کو اخلاق حیثیت سے اور بھی زیادہ محتاط رہنا ضروری ہے۔ وہ کسی ایسی چیز کا استعمال نہیں کر سکتے جس کو مشتبہ طریقوں سے حاصل کیا گیا ہو، روزمرہ کے برتاؤ میں انہیں ہر قسم کی زیادتی سے بچنا چاہیے، سب کے ساتھ صلح اور میل جول سے رہنا چاہیے اور جہاں کہیں کوئی جھگڑا ہو اس کا تصفیہ کرانے کے لیے انہیں تیار رہنا چاہیے۔ دروز کے ہر ضلع میں ان شیوخ میں سے ایک شیخ جو کسی مخصوص خاندان سے چنا جاتا ہے، سب سے بڑا مذہبی مقتدا مانا جاتا ہے اور رئیس متصور ہوتا ہے۔ شیوخ کی تعلیم و تربیت ایک خاص مدرّسے میں ہوتی ہے؛ وہ اپنا بہت سا وقت مذہبی تصانیف کے نقل کرنے میں صرف کرتے ہیں بالخصوص "کتاب قانون مقدس" کی نقل میں؛ زیادہ دیندار شیوخ عموماً سب سے علیحدہ ہو کر "خلوتوں" میں جا بیٹھتے ہیں۔ یہ خلوت گاہیں لوگوں کی گذرگاہوں سے دور مقامات میں بنائی گئی ہیں؛ کچھ ایسے بھی ہیں جو اسی گوشہ تنہائی میں اپنی ساری زندگی بسر کر دیتے ہیں۔ "عاقل" کے لیے لازمی ہے کہ وہ اپنی محنت سے گذر اوقات کرے، لیکن شیوخ "جہّال" کی زکوٰۃ و صدقات کے صحیح حقدار ہیں۔ ان سے توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ اپنے "جاہل" بڑوسیوں کو روحانی ہدایت کرتے رہیں، اور شادی

اور موت کے موقع پر ان کے راہنماؤں کریں۔

ہر سب جمعہ کو انتہائی سادہ، عیدوں میں منعقد ہونے والی مجالسوں میں سے بعض مجالس میں مارے عقال کا حاضر ہونا ضروری ہے؛ لیکن ”جہال“ کو ان میں سے صرف ان مجالسوں کے اندر آنے کی اجازت ہے جن میں وار کی باتوں پر کم سے کم بحث ہوتی ہے اور جہاں صرف اخلاقی مواعظ قدیم عربی زبان میں لکھے ہوئے پڑھ کر سنائے جاتے ہیں۔ بر اسرار دینی کتابوں کے پڑھنے کی صرف عقال کو اجازت ہے اور صرف وہی خفیہ مذہبی رسوں میں حصہ بھی لے سکتے ہیں، بلکہ ان کا علم بھی صرف انہیں کو ہوتا ہے۔ بیرونی دنیا کا یہ قیاس ہے کہ دروز کی خفیہ رسوم میں کسی نہ کسی طرح دھات کا بنا ہوا بچھڑے کا ایک بت شامل ہوتا ہے جو باتو ”الحاکم“ کی انسانی شخصیت کا مظہر ہوتا ہے یا ممکن ہے حمزہ کے دشمنوں کی بہیمیت کا۔ (دروز کے ہمسایوں نے ان پر اپنی خفیہ مجالس میں ہلا روک ٹوک رکھ رلیاں ننانے کا الزام عائد کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا ہے)۔

حمزہ اور العقیلی نے اسلام کے ارکان خمسہ کی جگہ سات احکام مقرر کیے ہیں، اور یہی سات احکام ہیں جو عقال کی اخلاقی تربیت کے اصول بن گئے ہیں اور کسی حد تک باقی دروز کے لیے بھی یہی احکام سب سے اصول تربیت مانے جاتے ہیں۔ سب سے بڑا حکم یہ ہے کہ جماعت کے افراد آپس میں ہمیشہ سچ بولیں (یا کم از کم خاموشی اختیار کریں مگر کبھی خلاف واقعہ بات نہ کہیں)۔ اس حکم میں سچ کے وہ معنی مراد ہیں جو ”عدم کلام“ میں لیے جاتے ہیں؛ لیکن اپنے بچاؤ یا اپنے مذہب کی خاطر منکرین عقیدہ سے جھوٹ بولنا جائز ہے۔ اس پہلے ”حکم“ میں ایسے اعمال مثلاً چوری، بھی شامل ہیں جن میں جھوٹ ہی بولنا پڑتا ہے۔ دوسرا حکم یہ ہے کہ ایک دوسرے کا بچاؤ اور ایک

دوسرے کی مدد کریں۔ اس میں یہ بھی مضمحل ہے کہ اس مقصد کے لیے ہتیار اپنے ساتھ رکھیں۔ دیگر احکام یہ ہیں: تمام ادیان سابقہ کو ترک کر دیں؛ منکروں سے کوئی میل جول نہ رکھیں؛ اپنے ”مولانا“ (مولانا الحاکم کا بحیثیت الواحد عام لقب ہے) کی یکتائی کو ہر زمانے میں تسلیم کریں؛ جو کچھ وہ کرے اس پر قانع رہیں؛ اس کے تمام احکام بربا و رغبت بجا لائیں، خصوصاً وہ احکام جو ”حدود“ کی معرفت پہنچائے گئے ہیں۔ حمزہ نے اس کے علاوہ ”شریعت“، عدل و انصاف اور شخصی حیثیت سے متعلق خاص احکام نافذ کیے ہیں۔ ان احکام میں خاص طور پر زوجین کے درمیان شادی کے بعد مساویانہ سلوک پر زور دیا گیا ہے۔ بنا بریں زوجین میں سے کسی کی طرف سے طلاق کو جرم قرار دیا گیا ہے جب تک کہ اس کی کوئی معقول وجہ نہ ہو۔

عام طور پر ”جہال“ کے عقائد کو ”عقال“ کی ہدایات کے تحت رکھا گیا ہے، لیکن اس پر مذہبی تفسیر کے قاعدے کا بہت بڑا اثر پڑا ہے، یعنی اپنے مذہب کو صیغہ راز میں رکھنے کے لیے ایک دروزی ظاہری طور پر ان لوگوں کا مذہب اختیار کر سکتا ہے جو اس وقت صاحب اقتدار ہوں؛ دوسرے الفاظ میں وہ عموماً سنی اسلام کا پیرو نظر آتا ہے۔ دروز نے حتیٰ فقہ کو اختیار کیا ہے، گو کسی قدر ترمیم کے ساتھ، مثلاً وصیت کے بارے میں غیر محدود اجازت دی گئی ہے اور طلاق پر کچھ قیدیں لگا دی گئی ہیں۔ دروز عید تو مناتے ہیں لیکن حج نہیں کرتے اور نہ رمضان کے روزے رکھتے ہیں۔ بہت سے گھرانے ختنے کے رواجاً پابند ہیں، لیکن اسے مذہبی اہمیت نہیں دیتے۔ تعاز جنازہ میں وہ اسلامی رسوم کی پابندی کر سکتے ہیں، لیکن اس کا اصلی رکن تبریک شیوخ ہے۔ دیگر عقائد رکھنے والے شامیوں کی طرح وہ خضر (رگ بان) کے مقبرے اور دوسرے انبیا اور اولیا کے مزاروں کی زیارت کے لیے جاتے ہیں۔ ان سب باتوں

'Mémoires de l'institut royal, classe d'histoire
ج ۲ '۱۸۱۸ء ص ۷۳ بعد : دُرُوز کے کچھ اجزا اور ان پر
حواشی: 'Chrestomathie arabe: Silvestre de Sacy (۳)
ج ۲ 'یرس ۱۸۲۶ء میں موجود ہیں۔ دُرُوز کی دیگر
تصنیفات ذیل کی کتابوں میں طبع کی گئی ہیں: (۴) Christian
Die Drusenschrift: Scybold : کتاب النقط والدوائر
Das Buch der Punkte und : N. L. Kirchhain (۵)
Théogonie des: Henri Guys (۶): ۱۹۰۳ء
Druzes 'یرس ۱۸۶۳ء: (۷) Martin Sprengling
American Journal of Semitics 'Berlin Druze lexicon
'Languages ۵۶ (۱۹۳۹ء): ۲۸۸ تا ۳۱۳ و ۵۷
(۱۹۳۰ء): ۷۵ بعد (جس میں دُرُوز کے فلسفہ کائنات کا بہت
اچھا مطالعہ شامل ہے) : (۸) Rudolph Strothmann
'Drusen-Antwort auf Nusairi Angriff' در 'Isl' ۲۵
(۱۹۳۹ء): ۲۶۹ تا ۲۸۱: (۹) Ernst von Döbeln
Monde 'Traktat aus den Schriften der Drusen
J. Khalil (۱۰): ۸۹ تا ۱۲۶: (۱۱) 'Oriental
L. Ronzevalle : الرسالة القسطنطينية 'M F O B
یرس ۱۹۰۹ء: ۳ تا ۹۳: ۵۳ تا ۵۴ دُرُوز کا عام طریقہ تعلیم
مع سوال و جواب مختلف صورتوں میں طبع اور ترجمہ کیا گیا
ہے 'دیکھیے (۱۱) : Eichhorn Repertorium für morgen-
'ländische und biblische Literatur' ج ۱۲ (۱۸۸۳ء):
Catéchisme à l'usage des Druses: Regnault (۱۲)
'djahels' در Bull. de la Société de Géographie 'یرس
۱۸۲۷ء: ۷ تا ۲۲: ۳۰ تا ۳۱ مذکورہ بالا کتابوں کے
علاوہ ذیل کی کتاب سب سے اہم غام مطالعہ ہے: (۱۳)
Les Druses, histoire du Liban: Narcisse Bouron
'et de la Montagne haouranaise' 'یرس ۱۹۳۰ء- دُرُوز
کی کتاب بھی مفید ہے (۱۴) حشائو راشد: جبل الدروز
قادرہ ۱۹۲۵ء: (۱۵) Henri Guys 'la Nation druze
'histoire, sa religion, ses mœurs, et son état
'politique' 'یرس ۱۸۶۳ء: کتاب کی غلطی ہے

کے باوجود جمہال تک بھی اپنے عقیدہ توحید سے واقف ہیں
اور آزادی کے ساتھ اس کی بابت گفتگو کر سکتے ہیں۔
ان کے پاس خلق اور حشر و نشر کی بابت ایک ترقی یافتہ
عقیدہ موجود ہے جس کی بنیاد عقال کی تعلیم پر ہے۔
عرصہ وجود میں ارواح کی تعداد معین ہے، اور موت
کے بعد ہر روح ایک نیا جسم اختیار کر لیتی ہے
(بشرطیکہ وہ کمال حاصل کر کے ستاروں کی دنیا میں
نہ پہنچ جائے)۔ جو لوگ حمزہ کے زمانے میں ایمان لا
چکے تھے ان کا دوسرا جنم دُرُوز ہی کی شکل میں
ہوگا، خواہ وہ شام میں ہو یا چین کی مفروضہ جماعت
دُرُوز میں۔ مختلف جنموں میں سے گزرنے سے
ہر روح کی مکمل اخلاق آزمائش ہو جاتی
ہے (بعض جہال یقین رکھتے ہیں کہ شریر لوگ
گھٹیا جانوروں کا جنم لیتے ہیں)۔ انجام کار جب
الحاکم اور حمزہ دوبارہ ظاہر ہوں گے اور تمام دنیا
کو فتح کر کے اس میں عدل و انصاف کا دور قائم
کریں گے تو وہ دُرُوز جنہوں نے اپنا رویہ درست رکھا
ہے سارے نئی نوع انسان پر فرمانروا ہوں گے۔ پھر
جو سب سے اچھے ہوں گے، وہ خدا سے نزدیک ترین
جگہ میں سکونت پذیر ہوں گے۔ یہ وہ خیال ہے جس
کو عقال، بہت سے اور خیالوں کی طرح، روحانی مفہوم
میں لیتے ہیں۔

مآخذ: قانون دُرُوز یورپ، امریکہ اور شام کے
متعدد کتب خانوں میں مل سکتا ہے، اسی طرح دُرُوز کی
دیگر تصنیفات بھی دستیاب ہو سکتی ہیں۔ "قانون" کا
کچھ بیان اور اس کا کچھ ترجمہ (۱) Silvestre de Sacy
کی اساسی تصنیف: 'Exposé de la religion des Druzes'
جلدیں 'یرس ۱۸۳۸ء میں موجود ہے (کچھ اجزا
کا ترجمہ از Philipp Wolff: Die Drusen und
ihre Vorläufer 'لاہرک ۱۸۸۵ء): نیز دیکھیے (۲)
وہی مصنف: 'Mémoire sur l'origine du culte que
'les Druzes fendent à la figure d'un veau

بنیاد سبط ابن الجوزی کی *مراۃ الزمان* پر ہے) (۲۹) جرجس
المکین : تاریخ المسلمین - مؤخر الذکر کی بنیاد یعنی الانطاقی
کے تکملہ *Scriptores Arabici: Eutychius* متن سلسلہ دوم
H. Zayyat و B. Carrade Vaux و L. Cheikho طبع ۱/۲
بیروت ۱۹۰۹ء ص ۲۲۰ بعد پر ہے : نیز دیکھیے (۳۰)
ابن العنیم : تاریخ حلب ص ۲۲۳ (۳۱) M.G.S. Hodgson
'Al-Darazi and Hamza in the origin of the Druze
religion' در JAOS ۸۲ (۱۹۶۲) : ۵ تا ۲۰
(M. G. S. HODGSON)

(۲) عہد عثمانی

جب عثمانی اور مملوکی فوجیں ۱۵۱۶ء/۹۲۲ھ
میں مرج دابق پر صف آرا ہوئیں تو دروز دونوں
جانب سے اس میں شریک ہوئے۔ ملک کے جنوبی حصے
کے بختری مملوکوں کی طرف سے لڑے اور شوف کے
معنی دمشق کے نائب غزالی کے ساتھ مل کر
ترکوں کے مددگار بن گئے۔ ترکوں کے تحت دروز
پر حکومت مقامی خاندانوں کے ذریعے عمل میں
آئی تھی، جن میں سے آل تنوخ، معنی (= بنو معن)،
بنو شہاب بالخصوص دونوں مؤخر الذکر، (جن کے
شجرہ نسب کے لیے دیکھیے Zambaur : ۱ : ۱۰۸
بعد) سب سے زیادہ اہمیت رکھتے تھے۔ مرج دابق کی
جنگ میں بنو معن کی قیادت امیر فخرالدین اول
[رک بان] کے ہاتھ میں تھی جس نے عین نازک وقت پر
پہلو بدلا اور مملوکوں کے قاصد الوغوری سے دشمنی
کے دمشق میں سلطان اول سے مل گیا۔ سلطان نے
انعام میں آئے جبل لبنان کے امیروں پر سردار اعلیٰ
بنا دیا اور آل تنوخ کی سیادت کو صیدا اور صور تک
محدود کر دیا (Zur Geschichte Syriens: Blau)
ج ۸ (۱۸۵۳ء) ص ۸۸۰ بعد) - ۱۸۵۱ء /
۱۵۳۳ء میں بنو معن کی حکومت فخرالدین کے
فرزند قور قماس کے ہاتھ آئی۔ ۱۵۸۴ء/۹۹۲ھ میں
دروز نے جب ترکوں پر حملے کیے تو قور قماس

سیاحوں میں سے جنہوں نے الدروز کی بابت لکھا ہے سب سے
پہلے (۱۶) Vom Mittelmeer : Max von Oppenheim
'zum Persischen Golf' برلن ۱۸۹۹ء : ۱ : ۱۱۰ بعد
ذیل کی کتاب بھی بڑی دلچسپ ہے (۱۷) W.B. Seabrook
'Adventures in Arabia' نیویارک ۱۹۲۷ء باب ۹ :
دروز کے جدید قانونی موقف کے لیے دیکھیے (۱۸) F. van
De la situation légale des : den Steen de Jehay
'sujets ottoman: non-musulmans' برسلز ۱۹۰۶ء
Personal law of the : J. N. D. Anderson (۱۹)
'Druze community' در WI ۱۹۵۲ء ص ۱ بعد
۸۳ بعد : غنوطات کے اندراجات کے لیے خاص طور پر
دیکھیے (۲۰) Zu den Schriftten Hamzas: Hans Wehr
'im Drusenkanon' در ZDMG ۱۶ (۱۹۶۲) :
۱۸۷ تا ۲۰۷ نیز (۲۱) A.F.L. Beeston 'An ancient
'Druze manuscript' در Bodleian Library Record
۶/۵ (اکتوبر ۱۹۵۶ء) : دیگر حوالوں کے لیے بالخصوص
سیاحوں کی تحقیقات کے لیے دیکھیے مآخذ در Boutron
اور حواشی : Philip K. Hitti 'The origins of the
'Druze People and religion' نیویارک ۱۹۴۸ء (جس میں
کچھ مترجم عبارت بھی شامل ہیں) : ان دونوں میں سے جو
محدوف ہیں وہ یہ ہیں (۲۲) F. Tournet 'Les
'Druzes' در Etudes des pères de la Compagnie de Jésus
۵ اکتوبر ۱۸۹۷ء : B. J. Taylor (۲۳) La Syrie, la
'Palestine, et la Judée' پاریس ۱۸۵۵ء ص ۳۵ تا ۴۰
۷۶ تا ۸۳ : Henri Aupitain 'Etude sur
'les Druzes' در Nouvelles Annales des Voyages ج ۶
فروری ۱۸۶۲ء : 'Magasin pittoresque' ۱۸۳۱ء
ص ۳۶۷ و ۱۸۶۱ء ص ۲۲۶ : قدیم ترین زمانہ کے وقائع
نگاروں کے لیے دیکھیے (۲۵) Exposé : Silvestre de Sacy
(التویری : نہایۃ الأرب) : محمد جعفری : النہج الطرائق
(۲۷) Life of Patriarch : Severus کا
'Zechariah' (۲۸) ابن تفری بردی : النجوم الزاهرة (جس کی

فخرالدین کی موت پر معنیوں کے عروج کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کے بعد قیسی یعنی تنازع شروع ہوا۔ فخرالدین، معنیوں کے عروج سے پہلے کے آل تنوخ کے حکمران خاندان کی طرح ایک یعنی قبیلے کا فرد تھا (جو ترکوں میں افلی (سفید) کے لقب سے مشہور تھا، بحالیہ قیسی قزلی (سرخ) کہلاتے تھے، قب فندقلیل محمد آغا: تاریخ، استانبول ۱۹۲۸ء، ۱: ۲۱۵؛ C. F. Volney: ۱۸۱۳ء، حاشیہ ۱)۔ امیر ملحم، جو ۱۸۰۵ء/۱۶۲۵ء میں اس کا جانشین ہوا، قیسی قبیلے سے تھا اور اس کا مخالف امیر علی علم الدین تھا، جو یمنیوں کا نمائندہ تھا۔ آپس کے تنازعات نے ترکیہ کو دخل اندازی کا موقع دیا؛ چنانچہ ۱۸۰۶ء/۱۶۵۱ء میں حسن پاشا والی طرابلس نے ایسا ہی کیا۔ ۱۸۰۶ء/۱۶۵۳ء میں امیر ملحم نے والی دمشق سے اتفاق کر کے اپنی حکومت صفد تک بڑھائی۔ ملحم نے ۱۸۰۶ء/۱۶۵۹ء میں وفات پائی اور الجبل میں اس کا جانشین اس کا لڑکا امیر احمد ہوا، جو معنیوں کا آخری فرمانروا تھا۔ اس کی وفات ۱۸۰۸ء/۱۶۹۷ء میں ہوئی۔ اس کے جانشین شہابی ہوئے، جو قیسی قبیلے کے تھے۔ شہابیوں کو امیر احمد نے پناہ دی تھی اور انہیں ۱۸۰۷ء/۱۶۶۰ء میں کو ہرولو فاضل احمد پاشا والی دمشق کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس بنا پر والی دمشق نے طرابلس کے والی کی مدد سے معنیوں اور شہابیوں کی متحدہ فوجوں کو کسروان پر شکست دی۔ بعد میں معنی اور شہابی آپس میں لڑ پڑے اور معنیوں نے ۱۸۰۷ء/۱۶۶۶ء میں القفل کے مقام پر فتح پائی جو دیرپا ثابت نہ ہوئی (ابن سباطہ، صالح بن یحییٰ، ضمیمہ - ص ۲۷) پھر حال امیر احمد کی وفات کے بعد الجبل کا جو سردار اعلیٰ ترکی حکام کی رضامندی سے چنا گیا، وہ راشیا کا شہابی امیر بشیر بن حسین تھا۔ یمنیوں نے قیسی خاندان کو ہٹانے کی ناکام کوشش کی، مثلاً فخرالدین ثانی کے بیٹے چھین نے دربار استانبول سے

کی سرزنش کے لیے مصر ابراہیم پاشا فوج لے کر گیا۔ فوراً قماز کے بیٹے امیر فخرالدین دوم [رک باند] نے سیف اوغلو یوسف پاشا، والی طرابلس، کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ابتدا میں اسے کچھ کامیابی نصیب ہوئی، مگر آخر کار اسے الجبل کی طرف بھاگ جانے پر مجبور کر دیا گیا اور یہ اس وقت ہوا جب باغیوں کو ۱۸۰۶ء/۱۶۰۷ء میں اس لڑائی میں جو قویوچی مراد پاشا اور جانبلاط اوغلو [رک یہ جانبلاط] کے درمیان ہوئی، شکست دے دی گئی۔ جانبلاط اوغلو کے خاندان کی اہمیت دروز میں اسی وقت سے شروع ہوئی۔ ۱۸۰۸ء/۱۶۰۹ء اور ۱۸۰۲ء/۱۶۱۳ء کے درمیان جب والی دمشق حافظ پاشا نے خشکی کی طرف سے اور قبودان پاشا اوکوز محمد پاشا نے سمندر کی جانب سے ہلہ بول دیا تو دروز اتحاد ختم ہو گیا۔ فخرالدین نے ۱۸۰۷ء/۱۶۰۸ء میں فلورنس کے ساتھ معاہدہ کر لیا اور پھر ۳۰ رجب ۱۸۰۲ء/۱۵ ستمبر ۱۶۱۳ء کو اس معاہدے کے تحت مدد لینے کے لیے وہ اٹلی گیا اور ۱۸۰۲ء/۱۶۱۸ء میں الجبل واپس پہنچا۔ اس کی غیر حاضری میں معنی حکومت کو برقرار رکھا گیا، بالخصوص اس وجہ سے کہ اس کے جاسوس جو استانبول اور دمشق میں تھے، اسے عثمانی ترکوں کی جنگی کارروائیوں کے خطرے سے فوراً آگاہ کر دیتے تھے تاکہ ان کے مقابلے کے لیے تیاری کر لی جائے۔ اگرچہ ترک سلطان نے ایک فرمان کے مطابق، جو ۱۸۰۳ء/۱۶۲۵ء میں جاری کیا گیا، فخرالدین کو حلب سے، یروشلم تک دروز کا امیر تسلیم کر لیا تھا (حیدر، ۱: ۷۱۵)، پھر بھی کوچک احمد پاشا، جسے مراد رابع نے دمشق کا والی بنا دیا تھا، فخرالدین کو ہمیشہ تنگ کرتا رہتا تھا۔ ۱۸۰۴ء/۱۶۳۳ء میں دروز کو مغارة جرزین پر فیصلہ کن شکست دی گئی۔ امیر اور اس کے بچوں میں سے تین کو گرفتار کر کے استانبول روانہ کر دیا گیا جہاں حسین بے کے سوا سب قتل کر دیے گئے۔

یونانی بحری ترقاقوں نے روسی جھنڈا لہرائے ہوئے بیروت پر حملہ کر دیا اور اس کا بدلہ لینے کے لیے مسلمانوں نے فرانسسکی خائفہ پر حملہ کیا تو امیر کے حکم سے مسلمانوں کے دو سرغنے پھانسی دیے گئے۔

متلحم کے بعد اس کے جانشین اس کے بیٹے احمد (مؤرخ احمد الشہابی کا باپ) اور منصور ہوئے۔ اگرچہ صیدا کے ترک والی نعمان پاشا نے امارت کے لیے قاسم بن عمر کو نامزد کیا تھا، لیکن اسے اس رقبے پر قناعت کرنا پڑی جو حزیز کے ارد گرد تھا۔ قاسم نے ۱۱۸۳ھ / ۱۷۶۸ء میں عیسائی ہو کر وفات پائی اور اس کا لڑکا بشیر بھی علانیہ عیسائی ہو گیا (Biau : کتاب مذکور، ص ۹۹ : La Syrie : Lammens)۔

بیروت ۱۱۹۲ھ : ۱۰۰ بعد)۔ بہر حال مذہب کی یہ انفرادی تبدیلیاں دروز کی اکثریت کو اپنا مذہب برقرار رکھنے میں تو مانع نہ ہوئیں، البتہ یہ ایسا واقعہ تھا جس نے آئندہ کے لیے مشکلات کا بیج بو دیا۔ منصور کو درویش پاشا والی صیدا نے ۱۱۸۳ھ / ۱۷۷۰ء میں معزول کر دیا اور اس کی جگہ امیر یوسف کو ماہور کیا۔ ۱۱۸۵ھ / ۱۷۷۱ء میں جب روسی بیڑے کو، جو Alexei Orlov کی زیر قیادت تھا، صفد اور عتکہ کے باغی حاکم ظاہر العمر نے اکسایا کہ بیروت پر گولہ باری کرے تو منصور نے یہ کوشش کی کہ پچیس ہزار پیادہ دے کر صلح کر لے۔ ادھر امیر یوسف نے ترکیہ سے کمک طلب کی، جس پر عثمان پاشا والی دمشق نے جزائر احمد پاشا کو روانہ کیا اور اس نے امیر یوسف کے نام پر بیروت پر قبضہ کر لیا۔ امیر یوسف اس ناپسندیدہ نائب حکمران کا چار ماہ تک محاصرہ کرنے کے بعد ۱۱۸۷ھ / ۱۷۷۳ء میں اسے بیروت سے نکال دینے میں کامیاب ہو گیا۔ اس میں اس نے روسی بیڑے کو قبرص سے بلا کر اس سے مدد حاصل کی۔ بہر حال جزائر احمد صیدا اور عتکہ میں بیٹھے بیٹھے العیال کے شہابیوں پر برابر اپنا دباؤ ڈالتا رہا۔ خراج کی ادائیگی اور مصر سے نیولین کے حملے کے

اس بات کا انتظام کرا لیا کہ بشیر کو حصیا کے امیروں کے خاندان کے لڑکے حیدر کا جو بارہ سال کا تھا، قائم مقام امیر مقرر کر دیا جائے۔ آگے چل کر اس کے مقامی حمایتیوں نے بشیر کو زہر دے دیا۔ لیکن جب حیدر اپنے حق کی بنا پر امیر ہوا تو اس نے عین دارا کی لڑائی میں یمینوں کو شکست فاش دی، جس سے الجبل کے جاگیرداری نظام کی ساری شکل بدل گئی۔ اس کے بعد شہابیوں کی سیادت میں، جنہوں نے کوشش کر کے دروزوں اور مارونیوں کی باہمی کشمکش کی روک تھام کی، جالبلاط کی حکومت شوف پر قائم ہوئی، ابوالمع نے متن لے لیا اور شویفات میں بنی قبیلے کے ارسلان خاندان کو تملوق یمینوں کے ساتھ شریک ہو کر حکومت کرنا پڑی۔ الجبل کو باہم ملانے رکھنے کے لیے شہابیوں کو ترک والیوں کی مدد کا سہارا لینا پڑا، جن کی دخل اندازی مقامی شیوخ کی تعداد میں اضافے کا باعث بنی، چنانچہ شیوخ کو امیر پر دباؤ ڈالنے کا موقع مل گیا۔ شیوخ خراج تو امیر ہی کو ادا کرتے تھے لیکن مجلس میں اس بات کا فیصلہ انہیں کے ہاتھ میں تھا کہ امن و امان پر قرار رکھا جائے یا جنگ شروع کی جائے۔ امیر حیدر نے ۱۱۸۴ھ / ۱۷۷۲ء میں شہابی دارالحکومت ڈیر القمر میں وفات پائی۔ اس سے پہلے ۱۱۸۱ھ / ۱۷۶۹ء میں وہ اپنے بیٹے متلحم کو تخت پر بٹھا کر خود سلطنت سے دست بردار ہو چکا تھا۔ متلحم کی حکومت ۱۱۹۷ھ / ۱۷۸۵ء تک برقرار رہی۔ اس کے عہد حکومت میں بیروت کی بندرگاہ کو وہی اہمیت پھر حاصل ہو گئی جو فخر الدین کے وقت میں تھی اور وہ ڈیر القمر کے بعد شہابیوں کا دوسرا دارالحکومت بن گیا۔ الجبل میں عیسائیت کا عہد مآ غلبہ ہو گیا اور متلحم کے بہت سے بچے رومن کیتھولک مذہب کے پیرو بنائے گئے۔ متلحم اور اس کے جانشین عموماً اس کوشش میں رہے کہ مقامی مسلمانوں اور عیسائیوں میں توازن قائم رہے، چنانچہ جب ۱۱۷۱ھ / ۱۷۵۷ء میں

پر حملہ کر دیا، جس کی وجہ سے مقامی عیسائیوں کے خلاف انتقامی کارروائیوں کے دوران میں بہت سے عیسائی وطن چھوڑ کر الجبل چلے آئے۔ بشیر کے خلاف مسلمانوں کے جذبات اس پر اور بھی بھڑک اٹھے کہ اس نے مائیک عیسائیوں کو الجبل میں بس جانے کی اجازت دی۔ ۱۸۳۰ء میں بشیر نے عبداللہ پاشا کی بھر مدد کی اور یہ اس لیے کہ نابلس میں جو بغاوت اٹھ کھڑی ہوئی تھی اسے دبا دیا جائے۔ اس کے بعد اس نے ترکوں کے خلاف محمد علی کا ساتھ دیا اور ابراہیم پاشا کی فتوحات میں مدد دی۔

(C. M. SHIHABEDDIN TEKENDAG)

۱۸۳۳ء کے معاہدہ کوتاہیہ کے بعد بشیر نے مصریوں کی مدد کرنے میں مقدور بھر کوشش کی اور اس کے بدلے میں لبنان کے لیے وسیع خود مختارانہ حکومت حاصل کر لی۔ مصری حکومت پہلے پہل تو خوب پسند کی گئی، بالخصوص اس وجہ سے کہ غیر مسلموں پر سے بعض ٹیکس اٹھا دیے گئے، لیکن جب ابراہیم پاشا نے آتشیں اسلحہ کے ضبط کرنے کی کوشش کی اور دروز کو فوجی خدمت کے لیے بلا لیا تو مشکلات رونما ہوئیں۔ ۱۸۳۵ء میں ابراہیم پاشا نے دیرانسر میں فوج متعین کر دی اور مقامی عیسائیوں سے ہتیار چھین کر جمع کر لیا شروع کر دیے، مگر بعد میں اس کارروائی سے سخت کوششیں کر دیا۔ پھر ۱۸۳۷ء میں جب دروز کو حوران میں طلب کرنے کی کوشش شروع ہوئی تو دروز نے بغاوت کر دی اور انتقاماً ابراہیم پاشا کے پیغام رسائوں کو قتل کر دیا۔ حکومت ترکیہ نے دروز کو بھڑکانے کی کوشش کی اور ان کے لیے ہتیار بھجوائے۔ ابراہیم نے اس کا یہ بدلہ لیا کہ گردوں کو اکسایا اور ترکی جہازوں کے لیے شام کی بندرگاہیں بند کر دیں۔ تجماع دروزوں کی بغاوت پھوٹ پڑی، مگر بشیر نے اپنے یت الدین کے محل سے جہاں سے مارونیوں پر اپنا گہرا اثر قائم رکھتا

مقابلے میں ترکوں کی حکومت کے ساتھ وفاداری بھی بشیر ثانی کو اس دباؤ سے نجات نہ دلا سکی۔ اگرچہ یوسف ضیاء پاشا نے، جو نیپولین کے خلاف لڑنے والی ترک افواج کا سپہ سالار تھا، بشیر کو الجبل کا حاکم تسلیم کر لیا تھا، پھر بھی جزار احمد نے اس کو ان افواج کے ذریعے نکال دیا جن کے قائد امیر یوسف کے بیٹے حسین اور سعد الدین تھے اور جنہیں وہ بشیر کی جگہ تخت پر بٹھانا چاہتا تھا۔ بشیر نے برطانیہ کے امیر البحر سڈنی سمٹھ کی پناہ لی اور وہ اسے اپنے عالم بردار جہاز میں بٹھا کر العرش لے گیا اور کچھ دن بعد الجبل واپس لے آیا۔ جزار احمد نے اس وقت اسی پر اکتفا کیا کہ بشیر کے بیٹوں کو بطور برغمال اپنے پاس رکھے۔ ۱۸۰۳ء میں جزار پاشا کے انتقال کے بعد دروز پر دباؤ کم ہو گیا۔ ۱۸۱۰ء میں جب وہابی دمشق پر چڑھائی کرنے والے تھے تو وہاں کے والی یوسف پاشا نے سلیمان پاشا کی، جو عتکہ کا سبقتی بیگ تھا، مدد طلب کی۔ اس نے موقع ملنے ہی دروز کو دمشق بلا لیا۔ دروز نے یوسف کو وہاں سے نکال دینے پر اپنا زور صرف کیا اور پھر سلیمان پاشا کے جانشین عبداللہ پاشا نے انہیں بڑی مشکل سے وہاں سے ہٹا کر حوران میں دھکیلا۔ لیکن الجبل سے بشیر کی غیر حاضری نے اس قدر ناراضگی بھیلانی کہ عبداللہ پاشا اور والی دمشق شیوخ کو اسے واپس لبنان واپس بلا لینے کی اجازت دینے پر مجبور ہو گئے۔ اس کے بعد عبداللہ پاشا نے جب عتکہ میں ترکوں کے خلاف بغاوت کی، تو بشیر اس کا حامی ہو گیا۔ یہ دیکھ کر (عبداللہ پاشا) کے حریف شیخ جائبلاط نے عباس الشہابی کے امیر ہونے کا اعلان کر دیا۔ اب بشیر اور اس کے بیٹوں کو مصر کے محمد علی کی پناہ لینا پڑی۔ بہت دن نہ گزرے پائے تھے کہ بشیر پھر واپس آیا اور ۱۸۲۵ء میں جائبلاط کو مختارہ کی لڑائی میں شکست دی اور اس کو قتل کر دیا۔ اگلے سال یونانی باغیوں کے جنگی بیڑے نے بیروت

تھا، کوشش کی کہ بغاوت خوران سے لبنان تک نہ پھیلے
 پائے، جس میں وہ کامیاب ہوا، کیونکہ اسے یقین تھا
 کہ مصر کا مددگار فرانس ہے اور آخر کار مصریوں کی
 فتح ہو کر رہے گی۔ ادھر جب ابراہیم پاشا نے پھر کوشش
 شروع کی کہ ہتیار ضبط کیے جائیں اور بیروت کی مصری
 فوجوں نے دیکھا کہ ان کا رسل و رسائل کا سلسلہ بند
 ہو گیا ہے تو لبنان میں عام بغاوت بھوٹ پڑی۔ اب کے
 اس میں مارونی بھی شامل تھے۔ ۱۴ اگست ۱۸۴۰ء
 کو برطانوی بحری افسر سر چارلس نیپیر Sir Charles
 Napier نے باغیوں کے ساتھ ربط و ضبط قائم کیا اور جب
 اس سے اگلے ماہ برطانیہ، آسٹریا اور ترکیہ کے جہاز
 باہم مل کر بیروت پر گولہ باری کر چکے تو اس کے
 بعد باغیوں کے لیے ہتیار سہا کیے گئے۔ ابراہیم پاشا
 سے مدد پہنچنے کے انتظار میں بشیر دیرالقرم میں ٹھہرا رہا،
 مگر مدد نہ پہنچی۔ آخر بشیر نے سلطان کی
 اطاعت منظور کر لی! سلطان کی فوجیں اس وقت شام کو
 دوبارہ فتح کرنے کی تیاری کر رہی تھیں اور یہ لندن
 کے معاہدہ کا نتیجہ تھا۔ بشیر کے ذاتی تحفظ کی ضمانت
 دی گئی، تاہم اسے حکومت سے علیحدہ کر کے اس کی
 جگہ اس کے ایک رشتہ دار بشیر قاسم ملحم کو بٹھا
 دیا گیا۔ مصر کے الجبل پر قابض ہو جانے سے ایک
 طرف تو وہاں کا جاگیرداری نظام درہم برہم ہو گیا
 اور دوسری جانب دروزوں اور مارونیوں کے درمیان
 مخالفت زور پکڑ گئی۔ بشیر قاسم کی حکومت کوئی
 ایک سال رہی۔ اسے صیدا کے مشیر سلیم پاشا سے
 دب کر رہنا پڑا، جس کا دارالحکومت بدل کر
 بیروت کر دیا گیا تھا اور جس نے امیر کو صلاح
 مشورہ دینے کے لیے مختلف فرقوں کی ایک مجلس
 شوریٰ بنادی تھی۔ ٹیکس کی اصلاح (مصریوں نے الجبل
 میں ٹیکس ۳۶۵۰ سے ۶۵۰۰ کیسوں (purses) تک
 بڑھا دیے اور پھر گھٹا کر ۳۵۰۰ کر دیے) اور
 معاوضے کے مسئلے پر فرہم دارانہ ناجاقی پیدا ہو گئی۔

پہلا فساد بقیلین میں ہوا، جس کے بعد دیرالقرم
 میں بہت سے مکالموں اور دکانوں کو آگ لگا دی گئی۔
 کسی قدر اس وقت بحال ہوا جب دروزی بخت آرسا
 شہاب المریان کو، جو والی دمشق کی خلعت میں
 تھا، زبردستی زھلہ سے دیرالقرم بھیجا گیا۔ ان واقعات سے
 باہر بڑی چینی پھیل گئی اور غیر ممالک میں ترکی انتظام
 حکومت کی بابت بہت سی شکائیں پیدا ہو گئیں۔ حکومت
 ترکیہ نے اس پر بشیر قاسم کو حکومت سے برطرف
 کر دیا اور الجبل کا انتظام براہ راست سرعسکر ثوری پاشا
 کے ہاتھ میں دے دیا، جس نے اپنی پیادہ فوج کے افسروں
 میں سے ایک افسر میر لواء عمر پاشا کو امارت کی گدی
 پر بٹھا دیا۔ بیرونی ممالک کی پیہم ناراضگیوں نے مجبور
 کیا کہ کوئی قدم اٹھایا جائے۔ چنانچہ ۱۸۴۲ء میں
 سلیم نے کو حالات کی جہان بین کے لیے بیروت بھیجا
 گیا، مگر اس نے یہ اطلاع بھیجی کہ حالت اطمینان بخشی
 ہے اور یہ کہ یہاں کوئی دروز یا مارونی امیر مقرر کرنا
 ناسمکن ہے۔ اس اطلاع پر باب عالی کے غیر ملکی
 سفیروں نے یقین نہیں کیا۔ اس دوران میں نئے حوادث
 کی اطلاع پہنچی، جس کے بعد اسعد مخلص پاشا کو
 صیدا کا مشیر مقرر کیا گیا اور اس کے بیروت پہنچ
 جانے کے بعد سرعسکر کے نصب العین کے پورے
 ہو جانے کا اعلان کر دیا گیا۔ اسعد پاشا نے دو قائم مقام
 مقرر کیے: ایک بیت ابی الائم سے حیدر مارونی اور
 ایک بیت ارسلان سے میر احمد دروزی، علاوہ ازیں جبیل
 کے شمالی اضلاع کو الجبل سے الگ کر کے طرابلس
 میں شامل کر دیا۔ ۱۸۴۵ء میں اس سے بھی زیادہ
 شورشیں ہوئیں جب اسعد پاشا کی جگہ والی حلب
 وچیبھی پاشا کو مقرر کیا گیا۔ ان خونریز حوادث میں
 وہ حملہ شامل تھا جو مارونیوں نے متن کے دروز
 پر کیا اور وہ حملے بھی جو دروز نے آبی اور سلیم کی
 خانقاہوں پر کیے، جنہیں آگ لگا دی گئی۔ اس کے
 بعد آپس میں ایک دوسرے پر ان حوادث کے الزامات

۱۸۵۹ء میں رونما ہوئیں۔ دوسرے ہی سال دروڑ اور مارونی کھلم کھلا ایک دوسرے سے دست و گریبان ہو گئے۔ اس پر خورشید پاشا نے دونوں قضاؤں کی دوبائی سرحد پر فوجیں متعین کر دیں، لیکن اس اقدام سے بھی ۱۸۶۰ء کا بڑا فساد نہ رک سکا۔ ماہ مئی میں دروڑ نے متن کے چند گانووں پر حملہ کر دیا اور ان میں آگ لگا دی، جون میں ان کے ساتھ حوران کے دروڑ بھی آئے، جن کا قائد اسماعیل اطرش تھا (الجبل کے دروڑ کی قیادت بالخصوص سعید جانیلاط اور خطار احمد کے ہاتھ میں تھی)۔ صوبے کی مجلس عمومی نے فوج بھیجنے کے بارے میں والی کی تجویز مسترد کر دی۔ ادھر دروڑ نے حاصیا کے قصر حکومت کے مذاقین کو مغلوب کر کے مقامی عیسائیوں کا قتل عام کر دیا۔ اسی نوع کی زیادتیوں کی اطلاع راشیا، بعلبک (جہاں آل خرگوبین نے مقامی حکومت کا تختہ الٹ دیا تھا)، زحله اور ذیرالقر سے موصول ہوئی۔ ان شورشوں کو دبانے کے لیے حکومت عثمانیہ نے وزیر خارجہ فواد پاشا کو روانہ کیا اور اس کو بوقت ضرورت مکمل اختیارات استعمال کرنے کی اجازت دی۔ [اس کے پہنچنے ہی دمشق میں مقامی باشندوں اور عیسائیوں کے درمیان خونریز فسادات شروع ہو گئے، جن میں دروڑ اور بدویوں نے مقامی عوام کی مدد کی]۔ اس اثنا میں خورشید پاشا نے دروڑ اور مارونیوں کے درمیان عارضی طور پر لڑائی بند کرا دی تھی، جسے فواد پاشا نے پسند نہ کیا، اس وجہ سے کہ اس سے بحکمہ قضا کی کارروائیوں میں خلل واقع ہوتا تھا، تاہم وہ اُسے کھلم کھلا رد بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ خوف تھا کہ خونریزی پھر شروع ہو جائے گی۔ اس موقع پر فرانس نے براہ راست دخل دیا اور پانچ ہزار فوج خشکی پر اتار دی اور اسے ظاہر کی کہ دروڑ کو الجبل سے بالکل نکال دیا جائے۔ فواد پاشا نے کامیابی کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا اور وہ اس طرح کہ دروڑ کے مجرم سرغنوں کے خلاف سختی کے ساتھ قدم اٹھایا، ان کا

لگانے جانے لگے۔ فرانسیسیوں نے وچپھی پاشا پر الزام لگایا کہ وہ دروڑ کا طرفدار ہے۔ خود فرانسیسیوں پر یہ الزام لگایا گیا کہ انہوں نے مارونیوں کو بھڑکایا تھا۔ اس کے بعد ایک اور وفد وزیر خارجہ شکیب افندی کے تحت تحقیق حال کے لیے روانہ ہوا۔ شکیب افندی نے سب سے پہلے یہ مطالبہ کیا کہ سارے ہتیار حکومت کے سپرد کر دیے جائیں۔ اس حکم کی مخالفت کی گئی اور اس سے مزید پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں۔ جنوری ۱۸۶۶ء میں ”فریق“ (ڈویژنل جنرل) اسین پاشا کو سفیر بنا کر بھیجا گیا۔ اس نے جدید انتظام قائم کرنے میں شکیب افندی کی مدد کی اور جون ۱۸۶۶ء میں اس کے ساتھ ہی واپس چلا آیا۔ شکیب افندی کی اصلاحات میں قائم مقاموں کو رہنے دیا گیا جنہیں ایک مخلوط مجلس شوریٰ صلاح و مشورہ دیتی تھی اور جن گانووں میں ملی جلی آبادی تھی وہاں سے خاص نمائندے (وکیل) منتخب کیے گئے۔ دونوں قائم مقاموں کا مشاہرہ ساڑھے بارہ ہزار پیاسٹر مقرر ہوا۔ ان کا تقرر اور برطرفی براہ راست سلطان کے ہاتھ میں تھی؛ نیز قرار پایا کہ سلطان اس ضمن میں صفا کے مشیر کے مشورے سے فرمان صادر کرے گا۔ مجالس حکومت کو قضا، انتظامیہ اور مالیات کے اختیارات تفویض کیے گئے۔ اس طرح ۱۸۶۷ء کے اوائل میں انتظام کو پائیداری نصیب ہوئی، اگرچہ بعض شورش دروڑ سرداروں کو مملکت سے نکالنے میں لاکمی کی وجہ سے کچھ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ دونوں فریقوں میں ٹیکسوں کو حصہ بندی بانٹ دیا گیا: مارونیوں سے ۱۹۹۸ کیسے (purses) اور دروڑ سے ۱۵۰۶ کیسے ادا کرنے کو کہا گیا۔

یہ امن و امان ۱۸۵۶ء تک قائم رہا۔ ۱۸۵۶ء کے ”خط ہمایوں“ کی وجہ سے، جس میں غیر مسلم رعایا کے ساتھ مراعات کا وعدہ کیا گیا تھا، مسلمانوں اور عیسائیوں میں رقابت عام ہو گئی۔ خرابیوں کی پہلی علامتیں

کا والی اس کے خلاف تادیبی حملہ کرنے اٹھا تو دروز نے بڑی سختی سے اس کا مقابلہ کیا؛ آخر ۱۸۸۰ء میں غریقین کے مابین ایک عارضی صلح نامہ طے ہو گیا۔ جب ابراہیم کے فرزند شبلی کو عثمانی عہدے داروں نے درعہ میں قید کر دیا، جس کا سبب بڑی حد تک اقتصادی اور معاشرتی ہنگاموں کا رہا ہونا تھا، تو ایک جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ دروز بھر کمر بستہ ہو گئے اور مجبوراً شبلی کو قید سے رہا کر دیا گیا۔ شبلی کو دوبارہ گرفتار کر لیا گیا، لیکن ۱۸۹۳ء میں دروز نے شورش کر کے پھر اسے چھڑا لیا، اس سال وہ بنو فجر سے ساز باز کر کے اپنے پیروکاروں کو قبیلہ روالہ پر چڑھا لے گیا تھا۔ ان آفتوں کے دوران بہت سے دروز خاندان جلاوطن کر کے آناطولی بھیج دیے گئے، لیکن بعد میں انہیں بھر وطن واپس آنے کی اجازت مل گئی اور اس کے ساتھ ہی دروز کو فوجی خدمات کے لیے بھرتی کرنے کی تجاویز ترک کر دی گئیں۔

اس تمام مدت کے دوران لبنان کے دروز امن کے ساتھ خاموش بیٹھے رہے، یہاں تک کہ ۱۸۹۷ء میں انہوں نے شکایت کی کہ مارونیوں کی جبرہ دستی مسلسل بڑھتی چلی جا رہی ہے اور مطالبہ کیا کہ اگر مارونی اس بات میں کامیاب ہو جائیں کہ شوف کی قضا سے، جو قسما بسٹم قضا تھی، چار ناحیوں کو الگ کر دیا جائے تو ستن کے دس ہزار دروز کے لیے ایک جداگانہ قضا بنا دی جائے۔ ۱۹۰۸ء میں ترک نوجوانوں کے انقلاب کے بعد دروز کے خلاف کارروائی سامی پاشا کے سپرد کر دی گئی۔ سامی پاشا نے فوجی حکومت کے نفاذ کا اعلان کر دیا اور پھر دروز کے سرداروں کو دمشق بلا بھیجا، جہاں ان میں سے بہت سے قتل کر دیے گئے۔ باقی وہ دروز کی مقاومت ۱۹۱۱ء تک جاری رہی۔ جب پہلی عالمی جنگ شروع ہوئی تو تمام معاہدات ختم ہو گئے،

بیچھا کر کے انہیں گرفتار کر لیا اور ان پر مختارہ میں فوجی عدالت کے سامنے مقدمہ چلا کر ان میں سے بعض کو سزائے موت کا حکم سنایا گیا۔ اس نے دمشق میں بھی سخت تادیبی کارروائی کی اور وہاں کے والی احمد پاشا کو گرفتار کر کے استانبول بھیج دیا تاکہ اس کے خلاف عدالتی کارروائی کی جائے، اور خورشید پاشا کو بھی بیروت سے نکال دیا۔ ان تدابیر کی بدولت اس کا اسکن پیدا ہو گیا کہ الجبل سے فرانس کی فوجوں کو واپس بلا لیا جائے گا۔ ۹ جون ۱۸۶۱ء کو ایک عہد نامے پر دستخط ہوئے، جس کی رو سے الجبل کو بیروت اور دمشق کی ولایتوں سے مکمل طور پر الگ کر کے عیسائی "متصرف" کے تحت رکھ دیا گیا، مگر اس ایک عیسائی کے لیے ضلع سے باہر کا ہونا لازمی تھا۔ اس متصرف کو مشورہ دینے کے لیے دونوں فرقوں میں سے ایک ایک وکیل لیا گیا۔ مرکز میں ایک انتظامی مجلس مقرر کی گئی اور جدید قضاؤں میں بھی ایک ایک انتظامی مجلس بنا دی گئی؛ مخلوط پولیس کا ایک دستہ بھی مرتب کیا گیا۔ غیر ملکی سفارتوں کے اشارے سے ایک ارمن کیتھولک داؤد پاشا کو متصرف مقرر کیا گیا، جس نے یہ عہدہ پانچ سال تک سنبھالے رکھا۔ اس کے بعد اس کی جگہ ایک عرب عیسائی فرانکو پاشا مقرر ہوا۔ داؤد پاشا نے دروز کے لیے بہت سے سروسے کھولے۔ اسی طرح ہی مارونی دیہات میں بھی مدارس جاری کیے۔ دروز اس کے جانشین کے عہد میں برابر ترقی کرتے رہے، لیکن حوران کے دروز میں بدامنی جاری رہی؛ ان کے ساتھ لبنان سے بھاگے ہوئے لوگ بھی آکر مل گئے اور اب جبل حوران کا نام جبل دروز پڑ گیا۔ یہاں دروز پر خاندان اطرش نے اقتدار حاصل کر لیا، اس لیے کہ ۱۸۶۰ء کے حوادث میں اسمعیل اطرش نے بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ ۱۸۷۹ء میں اسمعیل کے فرزند ابراہیم نے سوڈان پر حملہ کر دیا، جو جبل حوران کا دارالحکومت تھا۔ جب دمشق

شامل ہیں۔

قبیلے کا بڑا مرکز عبیری کے جنوب میں تقریباً پندرہ
کیاومیٹر کے فاصلے پر تنعم کا گاؤں ہے۔ یہ شیخ کے
کے تحت قبیلہ الحامید اور انصارہ کا "مقیز" (موسم
گرما گزارنے کا مقام؛ جمع مقایز) ہے جن کے تقریباً ایک
سو مستقل بسنے والے آدمی کھجوروں کے باغوں کی دیکھ
بہال کرتے ہیں۔ الحامید اور انداپہ کے نخلستان،
السلف میں بھی ہیں، جو تنعم کے شمال مشرق اور عبیری
کے جنوب مشرق میں ہے۔ علاوہ ازیں از حامید کے باغات
عبیری میں بھی ہیں۔ دوسرے گروہ اپنے باغوں کے گرد
گرما گزارتے ہیں جو المنعمور (الدروع کا معمور)، الحبی،
قل، مدیری، بساہ، یبرین، طیمسہ اور آدم میں ہیں۔

گو الدروع کا بڑا تجارتی مرکز عبیری ہے مگر وہ
دیگر اندرونی منڈیوں میں بھی آتے جاتے ہیں، جن
میں نزوا، بٹلاء اور آدم کی منڈیاں شامل ہیں۔
کبھی کبھی وہ دبی تک نکل جاتے ہیں، جو خلیج فارس
میں ہے بلکہ الخابور اور مسقط تک بھی، جو خلیج عمان
میں ہیں، جا پہنچتے ہیں۔ ان کی خاص قابل فروخت
چیزیں حسب ذیل ہیں: مویشی: اونٹ، بکریاں اور
بھڑیسی؛ دینی مصنوعات: رسیاں، جہاز کی رسیاں،
چٹائیاں (سمة، جمع سیم)، نوکریے وغیرہ؛ جو چھوٹی
کھجور (palmetto) کی طرح کے سَف (پتوں) عمان میں
اسے غضف کہتے ہیں) سے بنائے جاتے ہیں اور بھڑی کی
اُون کے قالین، جن کی نفاست میں الدروع کا آل
حکمان سے مقابلہ رہتا ہے؛ چوبی پیداوار: لکڑی کا
کولنہ (مخام)، جو منہر اور غاف کو ملگا کر بتایا جاتا
ہے۔ یہ درخت ان متعدد ندیوں کے ساتھ ساتھ آگئے ہیں
جو اس چٹیل میدان کو جنوب مغرب کی طرف تقاع کرتی
ہیں؛ معدنیات: گندھک، قارۃ الکبریت سے لکلی عوف،
جو جانوروں کی کھجلی دور کرنے اور بارود بنانے
کے کام آتی ہے؛ نمک، جو قارۃ الکبریت، قارۃ الملح
اور نمک کی کاؤں، جو ام السیم کے مشرق

ساتھ ہی لبنان کی خود مختاری بھی جاتی رہی اور
اسمعیل حق پر کو خود مختار "متصرف" بنا دیا گیا۔
اس کے بعد دروز کے مطالبات پر محل ہو گئے۔ دوران
جنگ میں جمال پاشا نے کچھ دروز سرداروں کو بیت المقدس
میں بطور "سہمان" رکھا۔ اسی جنگ کے زمانے میں
دروز کا سردار یحییٰ الاطرش، جس پر جمال پاشا
نے فرانسیسیوں کے ساتھ ساز باز رکھنے کا الزام لگایا
تھا (خاطرات، استانبول ۱۳۳۹ھ، ص ۱۷۹)،
فوت ہو گیا اور اس کا فرزند سلیم اس کا جانشین ہوا۔
جمال پاشا نے الاطرش خاندان کے دو افراد لسیب اور
عبدالغفار کی خدمات کو سراہا، لیکن اس کا ایک تیسرا
فرد سلطان، جس کے باپ کو سامی پاشا نے قتل کرا
دیا تھا، ترکوں کا مخالف ہو گیا اور وہ پہلا دروز
سردار تھا جو ۲ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو اتحادی فوجوں
کے ساتھ دمشق میں داخل ہوا۔

(M. TAYYIB GÖRBILGIN)

* الدروع: ("ذریعہ")، ایک بڑا غافری قبیلہ، جس
کے افراد زیادہ تر خانہ بدوش زباضی [خوارج] ہیں،
جو عمان اور جنوب مشرق عرب کے چٹیل میدان اور
دامن کوہ میں بودوباش رکھتے ہیں۔ ان کا "ذیرہ"
وادی الصفا، نیز نعیم میں آل بوشایس غافری اور الظاہرہ
میں بنو قتب کی اراضی سے شروع ہو کر میدان سیح
الدروع کے آوارہ جنوب مشرق کی طرف وادی حلفین اور
آل وھبہ کے قبیلہ ہناوی کے علاقے تک پھیلتا چلا گیا
ہے۔ یہ علاقہ حمراء الدروع اور اندرون عمان کے
کوہستان سے منفصل حصوں (جن میں عز اور آدم کے
گرد مرکز غافری الجذیہ کا شمال مغربی گہرا ہوا
علاقہ پایا جاتا ہے) سے لے کر جنوب میں الحقف (الحقف) کے
ناہموار ضلع اور "جدة الحراسیس" کے چٹیل میدان تک
اور جنوب مغرب میں الربع الغالی [رک بان] کے صحرا
تک پھیلا ہوا ہے؛ سوخر الذکر کے زیریں سرحدی علاقے
(الوطاء) میں ام السیم کے صحنہ اور رملات (quicksands)

سوداگر نہیں۔ وہ بنیادی طور پر ایک خانہ بدوش قبیلہ ہے۔ وہ دور دور تک دلیرانہ چھاپے مارنے میں مشہور ہیں اور قبائلی جنگوں میں حصہ لینے میں بھی شہرت رکھتے ہیں۔

الدروع کی اکثریت ایاضی ہے، لیکن القارۃ کا بڑا حصہ اور المعامید کے چھوٹے مگر حکمران گھرانے کے بیشتر لوگ سنی ہیں۔ اس قبیلے کی اصل معلوم نہیں۔ ان کے نام کی آل دروع کے نام سے مماثلت، جو آل سعود کے رشتہ دار ہیں اور پہلے وادی حنیفہ میں رہتے تھے اور جن کے نام پر آل سعود کے پہلے دارالسلطنت کا نام الدوعیہ رکھا گیا تھا، غالباً کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ جنوبی عرب کی ایک مشہور عام روایت یہ ہے کہ الدروع کا وہی اصل ہے جو قبیلہ المناہیل کی ہے، یعنی وہ بھی بنی (یا اہل) الظنہ سے ہیں۔ ان کے ناموں میں ماؤد کے نام کا ذکر پایا جاتا ہے، یعنی فلاں بن قلاتہ! وہ ہو سکتا ہے کہ یہ ان کے جنوبی الاصل ہونے کی علامت ہو۔

الدروع کے علاقے میں رہنے والے دیگر گروہوں میں سب سے زیادہ دلچسپ وہ گروہ ہے جو العفار (رک بان) کے تقریباً چالیس افراد سے مل کر بنا ہے۔ قبیلۃ العفار اصل میں مغربی عفار کے علاقہ حبروت سے آیا ہے اور وہیں ان کے اکثر لوگ اب تک رہتے ہیں۔ العفار سنی اور ہنواہی ہیں، مگر انہیں درعی اور دیگر غافری علاقوں میں اجنبیوں کی حفاظت اور رہنمائی کرنے کا امتیاز حاصل ہے۔ ان کے سرداروں کی بہت قدر و منزلت کی جاتی ہے۔ آل (یا عیال) خمیس کو، جو وادی سبیم میں گھومتے رہتے ہیں اور حمراء الدروع اور الجبل الاخضر کی وادیوں کے پڑوس میں رہتے ہیں اور جن کے مردوں کی تعداد کئی سو تک پہنچتی ہے، درعی الاصل بتایا جاتا ہے، مگر آج کل انہیں ایک جداگانہ قبیلہ خیال کیا جاتا ہے۔ دیگر گروہ جو الدروع سے نکلے ہیں، الشرقیہ اور باطنہ میں بود و باش رکھتے ہیں۔

کنارے پر واقع سبغہ سے حاصل ہوتا ہے، مشہور عمانی اونٹوں میں سے اندروع تین امتیازی نسلوں کی پرورش کرتا ہے: بنات عصیفہ، بنات خبار اور بنات حمرہ۔ نمک کی کانوں میں شبوخ کی عام نگرانی میں کام ہوتا ہے، لیکن وہ ان کی ملکیت نہیں ہیں۔ بہترین نمک قارۃ الکبریت سے حاصل ہوتا ہے، جسے قارۃ العریشہ بھی کہتے ہیں۔ ام السیم کی سرحد پر کمتر خالص نمک کی کانوں میں سے (جہاں کھدائی زیادہ محفوظ ہے اور ان میں وہ مہلک حوادث نہیں واقع ہوتے جو دونوں قاروں میں ہوتے ہیں) نمک کی سیلیاں کٹی جاتی ہیں، جو چار میل کر ایک اونٹ کا بار بنتی ہیں، اور جن سے حاصل شدہ منافع ایک سے لے کر دو ماریا تھیرسا Maria Theresa ڈالر کے درمیان گھٹتا رہتا ہے۔ قیمت گرمیوں میں زیادہ بڑھ جاتی ہے کیونکہ اس موسم میں کان کی کھدائی گرمی اور پانی سے ناصحیہ پر ہونے کی وجہ سے بہت دشوار ہو جاتی ہے۔ پانی حاصل کرنے کے لیے قریب ترین دریا، مویہ الراکہ اور التبیہ اونٹوں کے ذریعے ایک دن سے زیادہ کی مسافت پر واقع ہے۔

چونکہ الدروع عام طور پر "الربع الخالی" کے وسیع ریتلے میدان سے بچتے ہیں، بنا بریں کوئی مستقل وجہ نہیں کہ وہ ام السیم سے گزر کر اسفر کریں جس کی ریگ رواں میں، عوام کے بیانات کے مطابق، بے خبر مسافر، چرواہے اور لٹیرے اور ان کے جانور دھنس کر گائب ہو جاتے ہیں۔ "عیال خرم" اور "المعامید" کے افراد کی بابت کہا جاتا ہے کہ وہ ایسے محفوظ راستوں سے واقف ہیں جو اس کے اندرونی مہلک میدان سے گزر کر شمال سے جنوب کی طرف جاتے ہیں، لیکن پھر بھی وہ خود شاذ و نادر ہی اس کو قطع کرنے کی ہمت کرتے ہیں۔

قدرت نے انہیں جو ذرائع عطا کیے ہیں، ان سے تجارتی منافع کمانے کے باوجود الدروع میں کوئی پیشہ ور

Wissenschaftliche Mittheilungen (۶): ۳۵: ۸۵۵۷
 'aus Bosnien und der Hercegovina' ج ۱ ویانا
 ۱۸۹۳ء ص ۵۱۱: (۷) سچل عثمانی، ۲: ۳۲۹ (۸)
 سعد الدین نرہت ارگون Sadeddin Nüzhet Ergun
 Türk Şairleri ۳: ۱۱۷۲ بعد: (۹) ۱۸ بلیل ماڈ
 درویش پاشا (M. Cavid Baysun).

(V. J. PARRY)

درویش پاشا: (۱۵/۱۰۰۱ء تا ۶/۱۰۰۶ء) ترکی *

وزیر اعظم، جو بوسنہ کا رہنے والا تھا۔ وہ بستانجیوں
 کی فوجی ہلٹن میں ملازم رہا اور اس ہلٹن کا کیتھڈا ہوا
 اور پھر والدہ سلطان کی توجہ سے ۱۵/۱۰۰۱ء تا ۶/۱۰۰۶ء
 میں بستانجی پاشی بنا دیا گیا۔ ۱۵/۱۰۰۱ء تا ۶/۱۰۰۶ء
 جب احمد اول بورسہ گیا تو درویش پاشا کو استانبول
 کا نظم و نسق درویش پاشا کے سپرد کر گیا۔ رمضان
 ۱۵/۱۰۰۱ء تا جنوری ۶/۱۰۰۲ء میں اسے وزیر کا درجہ دے
 کر یوڈان پاشا بنا دیا گیا، اور صفر ۱۵/۱۰۰۱ء تا جون
 ۶/۱۰۰۶ء میں وہ وزیر اعظم ہو گیا۔ لیکن وہ اس عہدے
 پر بہت کم مدت رہ سکا، اس لیے کہ اتنی تیزی سے
 وزیر اعظم کے منصب تک پہنچنے کے دوران میں اس
 نے جن بہت سے لوگوں کو اپنا دشمن بنا لیا تھا انہوں
 نے سلطان کو اس کی طرف سے اس قدر بدگمان کر دیا
 کہ اس نے شعبان ۱۵/۱۰۰۱ء تا دسمبر ۶/۱۰۰۶ء میں اسے
 قتل کروا دیا۔ ترکی وقائع نگار درویش پاشا کو
 تند مزاج، بے انصاف اور نا اہل شخص بتاتے ہیں،
 لیکن استانبول کا انگریزی سفیر لٹو Lello اس کے بارے
 میں بہت اچھی رائے رکھتا ہے اور لکھتا ہے کہ وہ
 ان تمام وزرائے اعظم میں جن سے میں واقف ہوں
 سب سے "زیادہ صاحب عزم اور ماهر سیاست" تھا۔

مآخذ: (۱) بیجوی Pečewi: تاریخ استانبول

۱۳۸۱ تا ۱۲۸۳ء: ۲: ۲۹۳ تا ۳۱۶، ۳۱۹، ۳۲۲

۳۲۳ تا ۳۲۹ء: (۲) حاجی خلیفہ: تذکرہ استانبول

۱۲۸۶-۱۲۸۷ء: ۱: ۲۵۱ تا ۲۵۵، ۲۸۲ تا ۲۸۸

بن گیا، اور بیجوی کے بیان کے مطابق (۲: ۱۳۲)
 سلطان کے قبو کتھڈا کے طور پر خدمات انجام دیں۔
 بیجوی (موضع مذکور) اسے ایک پختہ کار شاعر
 (شاعر بیتین) کہتا ہے اور لکھتا ہے کہ اسے
 ذاتی اوصاف حمیدہ اور علم میں بڑے سے بڑے
 عالم کا ہم پلہ کہا جاسکتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ
 محمد ثالث کے عہد (۳: ۱۰۰۳ تا ۱۵۹۵/۱۰۰۳
 تا ۱۰۰۶ء) تک محل شاہی کی خدمت میں رہا ہو۔
 ۱۰۰۱ تا ۱۵۹۳/۱۰۰۱ء تا ۱۰۰۶ء کے دوران میں
 جب آسٹریا کے ہیسبرگز (Hapsburgs) اور ترکوں
 میں جنگ ہو رہی تھی، درویش پاشا کو ۱۰۰۰ء/۱۵۹۹ء
 میں ہنگری کے قلعہ استونی بلگراڈ Istoni
 Belgrad (Stuhlweissenburg) کے بچاؤ کا حکم دیا گیا
 تھا۔ اس زمانے میں وہ بوسنہ کا بیگلر بیگ تھا۔
 درویش پاشا نے بوسنہ کے بیگلر بیگ ہی کی حیثیت سے
 ۱۵۹۹/۱۰۰۱ء تا ۱۰۰۲ء میں قلعہ استونی بلگراڈ کے دوبارہ
 فتح کرنے میں ترکوں کی مدد کی، جسے شاہی فوجوں
 نے ایک سال پہلے ۱۰۰۱ء/۱۵۹۹ء میں فتح کر لیا
 تھا۔ ۱۰۰۱ء/۱۵۹۹ء میں اسے بوسنہ کی بیگلر بیگی
 سے علیحدہ کر دیا اور یہ عہدہ دلی حسن پاشا کو
 دے دیا گیا جو اس وقت تک ایشیائے کوچک میں
 جلالی باغیوں کا ایک قائد تھا۔ درویش پاشا ہنگری
 کے معاذ پر متعین رہا اور ۱۵۹۳/۱۰۰۲ء کی جنگ
 میں لڑا، لیکن ۴ صفر ۱۵۹۳/۱۰۰۲ء جولائی ۱۵۹۳ء
 کو پست (Pest) کے قریب لڑائی میں مارا گیا۔

مآخذ: (۱) بیجوی: تاریخ استانبول ۱۲۸۱ تا

۱۲۸۳ء: ۲: ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۵۱ بعد: (۲) حاجی

خلیفہ: تذکرہ استانبول ۱۲۸۶ تا ۱۲۸۷ء: ۱: ۱۲۶

۱۲۹ء: (۳) نعیم: تاریخ استانبول ۱۲۸۱ تا ۱۲۸۳ء

۱: ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۹۸، ۳۳۰، ۳۳۱ (۴) اولیا چلی:

سیاحت نامہ ج ۶ استانبول ۱۳۱۸ء ص ۲۱۱ بعد: (۵)

ہیمر برگ: Histoire: Hammer-Purgstall: ۷

کے بیان کے مطابق ۱۶۳۶ء/۱۰۳۶ھ تا ۱۶۳۷ء تک اس منصب پر فائز رہا۔ جب مراد رابع نے ۱۶۳۸ء/۱۰۳۸ھ میں بغداد پر چڑھائی کی تو وہ دیار بکر کا بیگم بیگ تھا، لیکن ۱۶۳۹ء/۱۰۳۹ھ میں بغداد کا بیگم بیگ ہو گیا اور اس کے کچھ ہی عرصے بعد وزیر بنا دیا گیا۔ درویش محمد پاشا بغداد میں تین سال رہا۔ اس کے بعد کے زمانے میں وہ حلب، آندلو [آناطولی]، سیلیٹریا اور بوسنہ کا بیگم بیگ رہا۔ ۱۶۴۹ء/۱۰۵۰ھ میں جب درویش پاشا کو دوسری بار سیلیٹریا میں تعینات کیا گیا تو ایک اور خدمت بھی اس کے سپرد کی گئی، یعنی اسے چناق قلعة بوغازی (درہ دانیال) کی بڑی مدافعت فوج کا افسر اعلیٰ بنا دیا گیا تا کہ وہ وینس کی بحری فوج کو بوغاز سے ہٹا دے، جس نے ۱۶۵۵ء/۱۰۵۵ھ میں شروع ہونے والی کریٹ [اٹریطش] کی جنگ میں اس وقت تک درہ دانیال کو بند کر رکھا تھا۔ درویش محمد پاشا نے یہ مہم جمادی الاولیٰ/مئی ۱۶۴۹ء میں کامیابی کے ساتھ سر کی۔ اس کے بعد ۱۶۵۱ء میں وہ دوبارہ آندلو کا بیگم بیگ مقرر ہوا اور اس وقت بوسنہ کی حفاظت کا کام بھی اس کے سپرد ہوا جسے ایشیائے کوچک کے جلالی باغیوں کی تاخت کا خطرہ درپیش تھا۔ درویش محمد پاشا ۱۶۵۲ء/۱۰۶۲ھ میں قبودان پاشا بنایا گیا اور پھر ربیع الاول ۱۰۶۳ھ/مارچ ۱۶۵۳ء میں وزیر اعظم مقرر ہوا اور ذوالحجہ ۱۰۶۴ھ/اکتوبر ۱۶۵۴ء تک اس منصب پر فائز رہا، اور اسی سال قالج میں مبتلا ہو جانے کی وجہ سے اس عہدے سے ہٹا دیا گیا۔ درویش محمد پاشا کے متعلق مشہور ہے کہ وہ اپنے زمانے کے تمام ترک اکابر میں سب سے زیادہ دولت مند تھا۔ اس نے ۵ ربیع الاول ۱۰۶۵ھ/۱۳ جنوری ۱۶۵۵ء کو وفات پائی اور استانبول میں چنبلی طاش کے مقام پر عتیق علی پاشا کی مسجد سے ملحقہ مقبرے میں دفن ہوا۔

ماخذ : (۱) بیجوی: تاریخ استانبول ۱۲۸۱ تا

(۲) نیر: تاریخ استانبول ۱۲۸۱ تا ۱۲۸۳/۱۰۷۱ تا ۱۰۷۳
(۳) ۱۵۷۷ تا ۱۵۷۸ بمواضع کثیرہ اور ۱۵۷۷ : (۴)
The Report of Lello, Third English Ambassador to the Sublime Porte (Ankara Üni., O. Buran طبع)
versites Dil ve Tarih-Coğrafya Fakültesi Yayınları
عدد ۸۳) انقرہ ۱۹۵۲ء ص ۲۳ تا ۲۷ ۲۹ تا ۳۲ (۵)
Ambassade de Jean de Gontaut Biron. Correspondance Diplomatique et Documents Inédits 1605-1616 طبع
Comte Théodore de Gontaut Biron در
Archives historiques de la Gascogne کراسہ ۱۹
پیرس ۱۸۸۹ء ص ۶۷ تا ۷۱ ۷۲ تا ۷۳ ۷۴ تا ۷۵ ۷۶ تا ۷۷
۷۸ ۷۹ تا ۸۰ ۸۱ تا ۸۲ بمواضع کثیرہ ۸۸
۹۰ تا ۹۱ ۹۲ تا ۹۳ ۹۴ تا ۹۵ ۹۶ تا ۹۷
Histoire : Purgstall ۱۰۲ تا ۱۰۳
بمواضع کثیرہ ۱۰۸۲ : (۷) آئی - ایچ - اوزون چارشیلی
Ozmanlı Tarihi (Türk Tarih : I. H. Uzunçarşılı
Kurumu Yayınlarından ج ۱ سلسلہ شمارہ ۲/۱۶
ج ۲ لوحہ ۲ ص ۳۶۲ تا ۳۶۳ : (۸) عثمان زادہ نائب
حقیقہ الوزراء استانبول ۱۲۷۱ء ص ۵۳ پیمہ : (۹)
جمل عثمانی ۲ : ۳۲۹ : (۱۰) ساسی : قاموس الاعلام
ج ۳ استانبول ۱۳۰۸ء ص ۲۱۲۶ : (۱۱) ID بذیل مادہ
درویش پاشا (M. Cavid Baysun).

(V. J. PARRY)

* درویش محمد پاشا : (تقریباً ۹۹۳ تا ۱۰۶۵ء/۱۵۸۵ء تا ۱۶۵۵ء)، ترکی وزیر اعظم جو اصل کے اعتبار سے چرکس (Circassian) تھا۔ سلطان مراد رابع (۱۰۳۲ تا ۱۰۳۹ء/۱۶۲۳ تا ۱۶۳۰ء) کے وزیر اعظم طبانی یسی محمد پاشا (۱۰۳۱ تا ۱۰۳۶ء/۱۶۲۲ تا ۱۶۳۷ء) کے کتخدا کی حیثیت سے اس نے ۱۰۳۴-۱۰۳۵ء/۱۶۳۵ء میں اریوان کی جنگی مہم میں، جو ایران کے صفویوں کے خلاف تھی، حصہ لیا اور اس کے بعد شام کا بیگم بیگ ہو گیا، اور ابن جمنہ

۱۰ فروری ۱۷۷۷ء کو اُسے خانہ Canea (در افریقا) کا والی مقرر کر دیا گیا، مگر وہ اپنے بحری سفر کے دوران میں بیمار پڑ گیا اور اس نے سافز (Chios) میں وفات پائی اور ابراہیم پاشا کی مسجد میں دفن کر دیا گیا۔ درویش محمد پاشا خاموش طبیعت کا آدمی تھا اور گو اس کی ملکی خدمات ایسی نہیں کہ انہیں قابل اعتنا سمجھا جائے تاہم اس نے استانبول (اخلاق ایوب اور اسکودار)، برصغیر اور مصر میں کچھ دینی عمارتیں تعمیر کرائیں یا ان کی مرمت کرائی۔ اس بات سے کہ یہ سب عمارتیں نکلے (خاتمہ) ہیں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا میلان صوفیوں کی طرف تھا۔

ماخذ : (۱) واصف : تاریخ (استانبول ۱۲۱۹ھ) : ۲ : ۱۹۷۷ء (۲) جودت پاشا : تاریخ (استانبول ۱۲۰۹ھ) : ۲ : ۱۱ : ۲۸۹ء (۳) احمد جاوید : ملحقات حذیقہ الوزراء (جو حذیقہ الوزراء کے ساتھ طبع کی گئی) : استانبول ۱۲۷۱ھ : ص ۷۷ء بعد

(زور : ترکی)

* درویش محمد پاشا : (۱۱۷۸ھ/۱۷۶۵ء تا ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ء) ترکی وزیراعظم، رستم آغا کا فرزند، جو مورہ (Peloponesus) کے موضع ناہولی (Nauplion) کا رہنے والا تھا۔ اس نے وزیراعظم احمد پاشا کے (جو دراصل خود بھی مورہ ہی کا باشندہ تھا) مہر دار کی حیثیت سے تربیت پائی اور پھر اس کی توجہ سے میر میران (پاشا درجہ دوم) اور سنجاق بای مقرر ہوا۔ آگے چل کر وہ حمید کی لواء کا محصل اور ۱۲۳۲ھ/۱۸۱۷ء میں خداوندگار، اسکی شہر اور قوجہ ابلی کا متصرف (وزیر یا پاشا کے منصب کے ساتھ) مقرر ہوا۔ مملکت کا سب سے زیادہ با اثر عہدیدار حالت اندی اس وقت یہ چاہتا تھا کہ وزیراعظم کوئی کمزور شخص ہو۔ اس نے سلطان محمود ثانی کو مشورہ دیا کہ درویش محمد پاشا کو وزیراعظم بنادے، چنانچہ ۲۷ صفر ۱۲۳۳ھ/۶ جنوری ۱۸۱۸ء کو اُسے وزیراعظم مقرر کر دیا گیا۔ دو سال

تک وہ اس عہدے پر فائز رہا، لیکن اس مدت میں وہ کوئی اثر و اقتدار قائم نہ کر سکا، یہاں تک کہ استانبول میں امن و امان قائم کرنے میں بھی ناکام رہا، اس لیے کہ وہ مسند سرخون کے ساتھ سختی کرنے کی بجائے ان کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اگرچہ اس کا یہ طرز عمل اعلیٰ عہدے داروں اور خصوصاً حالت اندی کے منشا کے عین مطابق تھا، لیکن سلطان نے اس کی کمزوری کا اندازہ لگا لیا۔ بایں ہمہ عہدے کا وقار برقرار رکھنے کے لیے اُسے کچھ دن تک اس کے منصب پر برقرار رکھا گیا، لیکن بالآخر ۱۹ ربیع الاول ۱۲۳۵ھ/۵ جنوری ۱۸۲۰ء کو اُسے معزول کر کے گیلی بولی میں جلاوطن کر دیا گیا۔ اس کے باوجود ۱۱ ربیع الآخر ۱۲۳۶ھ/۱۶ جنوری ۱۸۲۱ء کو اسے دمشق کا والی مقرر کیا گیا اور نابلس کی لواء کے انتظام کے ساتھ ساتھ امیر الحج کے فرائض بھی اس کے سپرد کر دیے گئے۔ اسی حیثیت سے اس نے صیدا (Sidon) کے والی عبداللہ پاشا سے جنگ کی اور باب عالی کے حکم سے اُسے عتکہ (Acre) میں محصور کر لیا، لیکن اس کے بعد جب عبداللہ پاشا کو معاف کر دیا گیا تو درویش محمد پاشا کو بدل کر آنطولی کی ایالت (صوبہ) میں بھیج دیا گیا، جہاں اس کے داماد حمیدی نے ظالمانہ طرز عمل کی وجہ سے کوتاہیہ (Cotyleum) کے لوگوں کو شکایات پیدا ہو گئیں۔ اس پر درویش محمد پاشا کو معزول کر دیا گیا اور اس سے وزیر کا عہدہ چھین کر اُسے اقیون قرہ حصار میں جلاوطن کر دیا گیا، جہاں سے اس کی درخواست پر اُسے برصغیر بھیج دیا گیا۔ ربیع الاول ۱۲۵۳ھ/۵ جون ۱۸۳۷ء میں اُسے شیخ الحرم (والی مدینہ) مقرر کیا گیا، لیکن وہاں جاتے ہوئے اسی سال رمضان/دسمبر میں تسبیح مقام پر اس نے وفات پائی۔

درویش محمد پاشا کمزور اور نرم دل آدمی تھا اور ترکی وزراء اعظم میں اُسے اثر و زراعت

بتایا جاتا ہے۔ برصہ اور استانبول میں بعض دینی کام اس کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں۔

مآخذ: (۱) شای زادہ عطا اللہ افندی: تاریخ

(استانبول ۱۲۹۰-۱۲۹۱) ۲: ۲۰۷، ۳۳۱، ۳۵۶

یعدو ۳: ۸۸، ۸۹: (۲) جودت پاشا: تاریخ (استانبول

۱۳۰۱) ۱: ۳۸، ۴۲، ۱۲۵، ۲۳: ۸۳، ۸۴، ۸۵

۱۲۵: (۳) لطفی افندی: تاریخ (استانبول ۱۳۰۲) ۵: ۸۸،

یعدو ۴: (۴) رفعت افندی: وردالحدائق (طبع سنگی) استانبول

ص ۱۵

(M. CAVID BAYSUN)

* درہ بیگی: (درہ بی) ترکی لقب، جو عام طور سے

ایشیائے کوچک کے ان حکمرانوں کو دیا جاتا تھا جنہوں

بازھویں صدی ہجری/اٹھارھویں صدی عیسوی میں اپنے

نے آپ کو استانبول کی مرکزی حکومت ترکیہ سے

تقریباً آزاد کر لیا تھا۔ ترک مؤرخ انہیں عموماً

مُتَقَلِّب (غاصبین) کے نام سے یاد کرتے ہیں اور

جہاں کہیں لرم الفاظ استعمال کرنے کی ضرورت

محسوس ہوتی ہے تو انہیں "خاندان" (= بڑے گھرانے)

کہتے ہیں۔ درہ بی بالآخر ایسے باجگزار فرمانروا

بن گئے جو خود مختار اور موروثی ریاستوں پر

حکمرانی کرتے تھے۔ جنگ کے دنوں میں وہ اپنی فوجیں

لے کر، عثمانی لشکر میں، بو بڑی حد تک انہیں

جاگیرداروں اور رئیسوں کی فوجوں سے مرکب ہوتا تھا،

شامل ہو جاتے تھے۔ اگرچہ بظاہر یہ دکھانے کے لیے

کہ وہ سرکاری عاملوں کے نمائندے ہیں، انہیں محصل

اور مستم جسے خطایات دے دیے جاتے تھے، لیکن

حقیقت میں وہ اپنے اپنے علاقوں کے مستقل اور آزاد

حاکم تھے۔ آناطولی کے یہ درہ بی اُن غاصب پاشاؤں

سے مختلف تھے جنہوں نے دوسرے صوبوں میں ایسی

ہی خود مختاری حاصل کر لی تھی۔ ان کی جڑیں مقامی

طور پر بہت گہری اور مضبوط تھیں اور وہ مقامی

باشندوں کی وفاداری پر پورا اعتماد کر سکتے تھے۔

پاشاؤں کی طرح انہیں یہ فکر نہیں ہوتی تھی کہ وہ اپنے اقتدار کے مختصر زمانے میں زیادہ سے زیادہ روپیہ وصول کر لیں، چنانچہ وہ ایسی تعمیری حکمت عملی پر کار بند تھے جو رعایا کے لیے (جس میں مسلم اور غیر مسلم کا کوئی امتیاز نہ ہوتا تھا) فلاح و تحفظ اور تجارتی ترقی کا ذریعہ بن سکے۔ سیاح

ان کی حکومتوں کی اچھائی کی گواہی دیتے

ہیں اور کہتے ہیں کہ رعایا انہیں بہت عزیز رکھتی تھی۔ باب عالی کسی نہ کسی حد تک

ان کے اقتدار کو تسلیم کرنے پر مجبور تھا اور

ان کے خلاف تادیبی کارروائی صرف اس وقت کی

جاتی تھی جب وہ کھلم کھلا بغاوت کر دیں۔

جنگ روس و ترکیہ (۱۸۲۰/۱۸۲۱ء تا ۱۸۲۸ء/

۱۸۲۹ء) میں درہ بیوں کو کئی مواقع حاصل ہوئے اور

ان کے نظام کو آناطولی کے بہت بڑے حصے میں

پھیلنے میں مدد ملی۔ اُنیسویں صدی عیسوی کے شروع

میں صرف قرہ مان اور آنادولوی دو ایالیتی ایسی تھیں

جو براہ راست استانبول کے مقرر کردہ گورنروں کے

ماتحت تھیں۔ سلیم ثالث کے عہد میں درہ بیے اپنی

قوت کے انتہائی عروج پر پہنچ گئے، یہاں تک کہ

شاہی دربار اور دارالسلطنت سے متعلق امور میں

بھی ان کا عمل دخل خاصا بڑھ گیا۔ ان میں سے بعض

نے، جن میں قرہ عثمان اوغلو اور چپان اوغلو زیادہ

پیش پیش تھے، سلیم ثالث کی اصلاحات کی حمایت

کی، لیکن ان کے مد مقابل جانیکی نے بڑی شد و

مد سے ان کی مخالفت کی۔ ایک طرف تو

اصلاح پسندوں اور ان کے مخالفوں کی کشمکش کو

باج گزار سرداروں کی باہمی رقابت سمجھ لیا گیا اور دوسری

طرف مرکزی اور مشرقی آناطولی میں چپان اوغلو اور

جانیکی کے باہمی تصادم نے بظاہر سلطان کے نئے

فرمان [رک] بہ نظام جدید سے پیدا ہونے والی

مخالفت کی صورت اختیار کر لی۔ درہ بیوں نے اپنے

ختم ہوئی تو وہ صوبوں پر مرکزی حکومت کا اقتدار قائم کرنے کی طرف متوجہ ہوا اور بے درجہ متعدد سیاسی، فوجی اور انتظامی اقدامات کے ذریعے اس نے باغی پاشاں اور خود مختار درہ بیوں کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا اور ان کی جگہ استانبول سے سرکاری عہدے دار مقرر کر کے بھیج دیے (ایک ہم عصر مغربی مبصر کے تاثرات کے لیے دیکھیے: 'Record of travels in Turkey, Greece etc : A. Slade لندن ۱۸۳۲ء : ۱ : ۲۱۵)۔ مرکزی اقتدار کو بڑھانے کا کام اس کے جانشینوں کے زمانے میں بھی جاری رہا۔ اس سلسلے کی سب سے آخری فوجی کارروائی ۱۵۶۶ء کی مہم تھی، جو ضلع چقور اووہ کے باقی مائدہ درہ بیوں، مثلاً سینیچی اوغلو، کوکیلی اوغلو اور توزان کے توزان اوغلو کو مطیع کرنے کے لیے روانہ کی گئی (جوڈت: معروضات، در، 'TEM' ۱۹۲۶ء، ۱۳/۹۱ : ۱۱۷)۔ اگرچہ درہ بیوں کی خود مختار ریاستوں کا خاتمہ ہو گیا، لیکن درہ بے کا لفظ ترکی سیاست کی ابک اصطلاح بن گیا، جو بڑے پیمانے کے موروثی زمینداروں کے لیے مخصوص ہو گئی، بالخصوص جنوبی اور مشرق ترکیہ میں، جو اپنے کاشتکاروں پر نیم باج گذاری اقتدار رکھتے تھے (مثال کے طور پر دیکھیے K.H. Karpat، کے ملاحظیات در 'Social themes in contemporary Turkish literature' در MEJ، ۱۹۶۶ء، ص ۳۵ تا ۳۷)۔

درہ بیوں کے زیادہ مشہور گھرانے حسب ذیل تھے (۱) آبدین، منسا اور برغہ کے قرہ عثمان اوغلو: یہ صارو خان اور آبدین کی سنجاقوں پر حکومت کرتے تھے اور ان کا اقتدار دریائے سندرس بیوک سے لے کر بعیرہ مرمرہ کے ساحل تک پھیلا ہوا تھا (رک بہ قرہ عثمان اوغلو)۔

(۲) بوزوق کے چبان (چبار، جبار) اوغلو: جو نسلا ترکمانی تھے اور عملاً قرہ عثمان اوغلو کے

علاقوں میں جہاں جہاں نئے فرمان کو جاری کیا بظاہر اپنی اغراض اور اپنے نفع کے پیش نظر کیا اور حکومت کے روپے کو اپنی مسلح فوج کو مضبوط بنانے پر صرف کیا (درہ بیوں کے نظام جدید کے غلط استعمال اور اس کے اندر غلط کاریوں کے لیے دیکھیے: عاصم، ۱ : ۱۱۱ تا ۱۱۳؛ قب آق چورہ Akçura، ص ۱۳۰؛ Miller، ص ۱۰۰ تا ۱۰۱)۔

بڑے بڑے درہ بیوں نے ۱۸۰۷ء تا ۱۸۰۸ء کی سیاسی کشمکش میں خاصا اہم کردار ادا کیا اور بَرق دار مصطفیٰ پاشا کی فتح نے ان کی قوت کو اور مستحکم بنادیا۔ وزیر اعظم ہونے کے بعد اس نے جو کام کیے ان میں سے ابک یہ تھا کہ اس نے استانبول میں ایک بڑا دربار منعقد کیا اور اس میں اس نے مملکت بھر کے مختلف قسم کے اکابر کو شرکت کی دعوت دی۔ آناطولی سے بڑے بڑے درہ بیوں نے اپنے اپنے مسلح ماتحتوں کی بھاری فوجوں کے ساتھ شرکت کی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے دربار کی کارروائی میں نمایاں حصہ لیا۔ ایک "سند اتفاق" کے ذریعے پہلی مرتبہ ان کے حقوق، مراعات اور خود مختاری کی توضیح و تصدیق ہوئی (شانی زادہ، ۱ : ۶۶ تا ۷۳؛ جوڈت: تاریخ، بار دوم، ۹ : ۳ تا ۷، ۲۷۸ تا ۲۸۳؛ اوزون چارشیلی: Alemadar، ص ۱۳۸ تا ۱۴۴؛ Miller، ص ۲۸۳ تا ۲۹۱۔ "سند اتفاق" کے متعلق مزید دیکھیے A. Selçuk Özcelik، در Istanbul Univ. Hukuk Fak Mec ۲۴ : ۱ (۱۹۵۹) : ۱ تا ۱۲)۔

سلطان محمود ثانی نے، جسے انیسویں صدی عیسوی کے شروع میں، اس معاہدے کی رو سے باج گذار سرداروں کے حقوق و مراعات تسلیم کرنے پڑے تھے، انہیں ختم کر دینے کا تہیہ کر لیا تھا؛ انیسویں صدی عیسوی میں اس کے لیے اس طرح کے اسوقع مہیا ہو گئے۔ جب ۱۸۱۲ء میں روس کی جنگ

جانیکی [حاجی] علی ہاشا [رک بان] کے جانشین اس کے دو بیٹے بغداد احمد ہاشا (جے ۱۸۲۰/۱۸۹۱-۱۸۹۲ء میں پھانسی دی گئی) اور حسین بٹال ہاشا (م ۱۸۲۱۵/۱۸۰۱ء) ہوئے۔ بٹال پہلے فوجی ہاشی، والی حلب اور والی دمشق کے عہدوں پر فائز رہنے کے بعد ۱۸۲۰۲/۱۸۸۷-۱۸۸۸ء میں طریزون کا گورنر ہوا۔ ۱۸۲۰۱/۱۸۸۷ء میں اس نے روس کے خلاف ترک فوجوں کی قیادت کی، لیکن ۱۸۲۰۵/۱۸۹۰ء میں شکست کھا کر لبر ہوا۔ بٹال ہاشنک کا شہر اس کے نام کی یادگار ہے۔ ایک عرصے تک معنوب رہنے کے بعد ۱۸۲۱۳/۱۸۹۸-۱۸۹۹ء میں، روس کی سفارش پر اسے پھر مرکزی ملازمت مل گئی۔ اس کے بڑے بیٹے خیرالدین راعب ہاشا کو، جو افیون قرہ حصار کا گورنر تھا، ۱۸۲۰۶/۱۸۹۱-۱۸۹۲ء میں معزول کر کے پھانسی دے دی گئی اور اس کے ساتھ ہی جانیکیوں کا خود مختارانہ سیاسی اقتدار ختم ہو گیا۔ یہ خاندان سلیم ثالث کی فوجی اصلاحات کا مخالف تھا، جن کی ان کے حریف خاندانوں چیان اوغلو اور عثمان اوغلو نے حمایت کی تھی۔ حسین بٹال کا چھوٹا بھائی ان اصلاحات کی مخالفت میں زور شور سے سرگرم رہا تھا اور ۱۸۰۵ء سے ۱۸۰۷ء تک وہ روس میں جلاوطن رہا۔ ۱۸۰۷ء میں وہ پھر ترکہ واپس آیا اور مصطفیٰ رابع کی مختصر رجعت پسندانہ حکومت کے دوران میں وزیراعظم کے قائم مقام کے عہدے پر فائز رہا۔ چند ماہ کے بعد محمود ثانی نے اسے عہدے سے برطرف کر کے قتل کرا دیا۔ یہ تین خاندان درہیوں کے سب سے زیادہ اہم خاندان تھے، جنہوں نے علی الترتیب مغربی، وسطی اور مشرقی اناطولی پر حکومت کی۔ ان سے کم اہم خاندانوں میں ذیل کے خاندانوں کا ذکر کیا جا سکتا ہے: قوش آلمہ سی (اسقالہ نووہ Scala Nuova)

معمصر تھے، ان کی حکومت بوزوق یوزغاد، قیصری، اما، بھہ، انقرہ، اور نیکدہ کی متجانوں پر تھی اور اپنے اقتدار کے عروج کے زمانے میں وہ طرسوس پر بھی حکومت کرتے تھے۔ ان کے خاندان کا پہلا شخص، جس کا نام معلوم ہے، احمد ہاشا ہے، جو بوزوق کا متصرف تھا۔ اسے ۱۸۱۷۸/۱۸۶۳-۱۸۶۵ء میں مرکزی حکومت کے حکم سے معزول کیا گیا (واصف، ۱: ۲۳۳ بعد ۲۶۸)۔ اس کے بعد اس کا بیٹا مصطفیٰ اس کا جانشین ہوا، جسے اس کے حفاظتی دستے نے ۱۸۱۹۶/۱۸۸۱ء میں قتل کر دیا (جوڈت: تاریخ، ۲: ۱۷۱ تا ۱۷۲)۔ اس کے بعد اس کا بھائی سلیمان نے اس کا جانشین ہوا، جو چیان اوغلو کی سب سے طاقتور شخصیت ہے اور جس نے سلیم ثالث، مصطفیٰ رابع اور محمود ثانی کے عہد میں کچھ اہم کام انجام دیے۔ ۱۸۲۲۹/۱۸۸۳ء میں اس کی وفات کے بعد اس کا علاقہ مرکزی حکومت کے قبضے میں آ گیا۔ اس خاندان کے لوگ سلاطین کے عہد میں گورنر اور فوجی جرنیل ایسے بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ ان میں سے ایک چیان زادہ آغا اندی (۱۸۳۲ تا ۱۸۸۵ء) تھا، جس نے ترکی صحت کی ترقی میں ایک قائد کا کردار ادا کیا [رک بہ جرہ]۔ اس خاندان کا ایک اور شخص جنگ آزادی کے زمانے میں حزب ملی کے مخالف گروہ کا قائد تھا۔ ان کا تاد ایک ترکی کہاوٹ میں مشہور جلا آتا ہے، جس کا مفہوم ہے ہوشیہ اور غیر متوقع رکاوٹ [یہ کہاوٹ یوں ہے کہ: "ابشی قورمہ الہ آلتی طرف پر چیان اوغلو چیتار" = "کسی کام کو کر دیا جائے تو لیجئے سے چیان اوغلو نکل آتا ہے"]۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی غیر متوقع دشواری پیش آ جاتی ہے۔

(م) طریزون اور اس کے قریب وجوار میں ہارپک کے علی ہاشا کا خاندان ہے۔ ان خاندان کے بانی

جانبکی پر دیکھیے (۷) جوت : تاریخ : بار دوم : ۳ : ۱۳۳۰
 بعد و : ۵ : ۲۹ بعد و : ۵ : ۱۳۳۰ بعد : ۵ : ۱۳۳۰ : الہاس اوغلو
 پر دیکھیے (۸) *Das Fürstentum Men* : P. Wittek (۸)
tesche Osmanli : Yusuf Akçura (۹) : ۱۰۹ تا ۱۱۰ : غوسی
 معلومات کے لیے دیکھیے (۹) *Osmanli : Yusuf Akçura*
Develetinin Dağılma Devri : ۱۰۹۳ : (۱۰)
 اسمعیل حق اوزون چار شیلی : علمدار مصطفیٰ پاشا
 استانبول ۱۹۴۲ : (۱۱) وہی مصنف : عثمانی تاریخ
 انقرہ ۱۹۵۶ : ۱/۳ : ۳۱۸ تا ۳۱۹ : ۳۳۶ تا ۳۳۷ : ۶۱۲ تا
 ۶۱۵ : (۱۲) *Mustafa Pasha Bayraktar* : A.F. Miller (۱۲)
 ماسکو ۱۹۳۷ : (۱۳) *Gibb-Bowen* : ۱/۱ : ۱۹۳ : بعد :
 (۱۴) *The Emergence of Modern Turkey* : B. Lewis (۱۴)
 لندن ۱۹۹۱ : ۳۸ : ۳۳ تا ۳۳۲

(B. LEWIS و J. H. MORDTMANN)

درہم : وزن کے ایک پیمانے کا نام ، جو یونانی
 لفظ δραχμή سے ماخوذ ہے۔ روایتی طور پر درہم کیل
 یا شرعی کا وزن متوسط حجم کے ۵۰ یا ۶۰ چھلکے
 والے شعیر [سجوا] یا حبہ [سدانہ] کے برابر ہوتا تھا اور
 نظری طور پر چوبیس دانق پر منقسم تھا ؛ ذاتی مختلف
 طور پر ۸ یا ۱۰ شعیرہ کے برابر شمار ہوتا تھا۔
 عالم اسلام کے مختلف حصوں میں اور مختلف زمانوں
 میں درہم کے وزن اور ضربوں کے دیگر اوزان سے اس کی
 نسبت کی روایات اتنی کثیر اور متضاد ہیں کہ یہاں
 ان کا خلاصہ نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے لیے قارئین کو
 اس قسم کی تصانیف دیکھنے کا مشورہ دیا جاتا ہے، جیسے
Einführung : Grohmann اور *Masr'aux* : Sauvire
 (دیکھیے ماخذ، بذیل دینار)۔ روایتی درہم کے وزن کو
 جدید اعشاری نظام کے گراموں کے مطابق متعین کرنے
 کی کوششیں مختلف اعداد کی صورت میں انجام پذیر ہوئی
 ہیں، جن میں سے اکثر غالباً غلط ہیں، دیکھیے W. Hinz
Hand-buch der Islamische Masse u. Gewichte در
Orientatistik, Ergänzungsband I، جلد اول، لائڈن

لزد اتسوس (Ephesus) کا الیاس اوغلو، جو
 اٹھارہویں صدی عیسوی کے تقریباً وسط میں میٹشیا کی سبجاق
 بودروم کی جنوبی سرحد تک حکومت کرتا تھا ؛
 کوچک علی اوغلو، جو پچیس میں حکومت کرتا تھا
 اور تھوڑے دن تک آدلیہ [رگ ہاں] پر بھی حاکم رہا، اور
 یلالی اوغلو، جو اسپارتہ اور اگریڈیر میں اور آطالیہ
 کے علاقے میں تھا۔

مآخول : عثمانی وفائے نویسوں نے درہ یوں کی
 طرف کچھ توجہ کی ہے، لیکن ان کا رجحان یہ ہے کہ ان
 کی خود مختارانہ روش پر اپنی سی نظر ڈالیں اور انہیں
 ترکیہ کی مرکزی حکومت (باب عالی) کا اہل کار ظاہر کریں۔
 ان کی بات زیادہ حقیقی اطلاعات مغربی مآخذ میں خاص
 طور پر سیاسی امور اور سفارتی معاملات کے وثائق ناموں میں
 نیز سیاحوں اور ماہرین آثار قدیمہ کے ہاں ملیں گی۔ ان کی کسی
 بالخصوص ناموں اور تاریخوں کے متعلق متعدد مفاسد کتبوں
 سے پوری کی جا سکتی ہے۔ حال کی بڑی تصانیف میں
 درہ یوں کی طرف کچھ توجہ نظر آتی ہے (جیسے M. Cagatay
 Uluçay کے *Manisa* پر اہم مطالعات) ، پھر بھی یہ
 موضوع ابھی تک تفصیلی جانچ پڑتال کا محتاج ہے۔

قرہ عثمان اوغلو کے لیے دیکھیے (۱) *Kgl. Museum* :
Altertümer von Pergamon : برلن ۱۸۸۵ : ۱ :
 ۸۳ تا ۹۱ : (۲) *Christianity* : F. W. Hasluck (۲)
and Islam under the Sultans : اوکسفورڈ ۱۹۲۹ :
 ۵۹۷ تا ۶۰۳ : (۳) *Karaosmanogul* : C. Uluçay (۳)
Tarih Vesiklari در *larina alt hazı Vesikalar*
 ۱۹۳۲-۱۹۳۳ : ۲ : ۱۹۳ : ۲۰۷ تا ۲۰۸ : ۳۰۰ تا ۳۰۸ :
 ۳۳۳ تا ۳۳۴ : (۴) وہی مصنف : *Manisa Unlülert*
 Manisa ۱۹۳۶ : ۵۵ تا ۶۲ : چپان اوغلو کے لیے
 دیکھیے (۵) *Journey* : J. Macdonald Kinneir (۵)
through Asia Minor : لندن ۱۸۱۸ : ۸۳
 بعد : (۶) *Souvenirs d'un voyage* : Georges Perrot (۶)
 en Asie Mineure : پیرس ۱۸۶۳ : ۳۸۶ : بعد :

ٹکسال کے نام اور سکہ کی تاریخ کا ہمیشہ الفاظ میں اندراج ہوتا تھا۔ اموی عہد میں درہم کی خاص ٹکسائیں سابقہ ساسانی شہروں یا انتظامی مرکزوں میں تھیں، لیکن چاندی کے سکے دمشق، شمالی افریقہ اور ہسپانیہ میں بھی ضرب کیے جاتے تھے۔ واسط، جس کی بنیاد ۸۸۴/۷۰۳ء میں رکھی گئی، اموی ٹکسالوں میں سب سے کثیر درہم بنانے والی ٹکسال معلوم ہوئی ہے اور یہ ممکن ہے کہ چاندی کے سکے ڈھالنے کے سرکاری انتظام کا صدر مقام اسی شہر میں ہو اور درہم کے ٹھپے بھی یہیں بنائے جاتے ہوں۔

مختلف خود مختار خاندانوں کی حکومتوں میں چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی کے اختتام تک درہم کی عام شکل و صورت میں زیادہ تغیر و تبدل نہیں ہوا۔ اتنا ضرور ہوا کہ فاطمی سکوں پر رسمی کامے متحد الدکرز دائروں میں لکھے جاتے تھے۔ اس کے بعد ایک زمانہ ایسا آیا کہ مشرقی ممالک میں چاندی کا کال بڑ گیا۔ اس زمانے میں چاندی کے سکے نسبتاً بہت ہی معمولی تعداد میں مضروب ہوئے (دیکھیے R.P. Blake، در *Harvard Journal of Asiatic Studies*، ۱۹۳۷ء، ص ۲۹۱، جہاں اس کا تذکرہ تو کیا گیا ہے مگر کماحقہ اس کی تحقیق نہیں کی گئی)۔ پھر جب ساتویں صدی ہجری/تیرہویں صدی عیسوی کے درمیان مغول کی طاقت کو عروج حاصل ہوا تو درہم اور اس سے دہری تھری قیمت کے سکے بہت بڑی مقدار میں بننے شروع ہو گئے، جن کی شکل صورت قدیم سکوں سے مختلف تھی۔ متاخر فاطمیوں کے ”درہم ورق“، ایویوں کے ”درہم ناعری“ اور ”کابلی“ اور سلووکوں کے درہموں کے لیے دیکھیے P. Balog، در *BIE*، ج ۳۳، ۱۹۵۰ء تا ۱۹۵۲ء اور v. Schrötter، بذیل مادہ درہم۔ المغرب میں ہسپانیہ کی اموی سلطنت کے زوال کے ساتھ درہم کی قدر گھٹ گئی۔ مزابلوں کے زمانے میں درہم کسی قدر بدلی ہوئی شکل میں بحال ہوا اور موحدون کے زمانہ

۱۹۵۵ء، ص ۲، بعد)، جہاں انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی کی مختلف ممالک میں [درہم کی] قانونی تعریفیں بھی ملیں گی۔ اگرچہ اکثر مسلم ممالک نے اعشاری نظام سرکاری طور پر اختیار کر لیا ہے، پھر بھی درہم اور دوسرے روایتی پیمانے مختلف کاروباروں میں بے قاعدگی سے ابھی تک استعمال کیے جاتے ہیں۔ موجودہ مصر میں درہم کا وزن ۲۰۱۲ گرام متعین کیا گیا ہے! سار کے ۱۹۵۳ء کے دو اصلی پیتل کے درہم علی الترتیب ۳۰۱۳۲۲ اور ۳۰۱۳۳۵ گرام ہیں۔

(۲) غریبوں کے مالی نظام کا چاندی کا سکہ، جو ابتدائے اسلام سے مغلیہ عہد تک رائج رہا۔

قدیم ترین عربی درہم (بُغْلُ) یزدجرد ثالث، ہرمز رابع اور (زیادہ تر) خسرو ثانی کے [عہد کے] ساسانی درہم کی نقل ہوتے تھے۔ ساسانی شہسپان رہنے دی گئیں، لیکن حاشیے پر کوئی خط میں کلمہ طیبہ کا اضافہ کر دیا گیا، چند سکوں پر خلیفہ (معاویہ اور عبدالملک) کا نام اور اکثر پر والی صوبہ کا نام، ٹکسال کا مختصر نام اور ہجری اور اس کے مطابق بزد جرجی یا مابعد یزد جرجی سال (سب کے سب پہلوی حروف میں) کندہ ہوتے تھے۔ تقریباً ۵۷۲/۶۹۱ء-۶۹۲ء میں (American Numismatics Society Museum Notes، ۱۹۵۷ء، ص ۱۹۱) اور اس کے چند سال بعد تک قدیم ٹھپے میں آزمائشی طور پر کچھ تغیرات کیے گئے، جن میں مزید کوئی خط کے کلمات کا مزید استعمال اور شہسپان میں جنت شامل ہے، جو اسلامی مذاق سے زیادہ مطابقت رکھتی تھی، لیکن ۶۹۸/۷۱۹ء میں عبدالملک کی مالی اصلاحات نے درہم کی کاپیا ہلٹ دی، جو اس وقت سے دینار کی طرح (سوا چند مستثنیات کے) بالکل لوحی ہو گیا تھا۔ اس اصلاح کے بعد پہلے پہل تو درہم پر کسی کا نام نہیں ہوتا تھا، مگر آگے چل کر دوسری اور تیسری صدی ہجری کے دوران میں والیوں، ولیعهدوں، خلفا وغیرہ کے ناموں کا اضافہ کیا جانے لگا۔

کبھی کبھی درہم اتنا گر جاتا تھا کہ دینار کے ۱۵ ، ۲۰ ، ۳۰ یہاں تک کہ ۵۰ درہم تک مل جاتے تھے (دیکھئے کثیر التعداد سونوں کے اقتباسات، جو Lane Poole نے NC ۱۸۸۴ء میں اور Grohmann نے Einführung ، وغیرہ میں دیے ہیں۔ P. Grierson (کتاب مذکور، بذیل دینار) نے سونے چاندی کے نکسالی اور بازاری نرخ کے تناسب کی اقتصادی بنیادوں کو پوزنٹیو اور عربوں کے باہمی تعلقات کو خاص طور پر ملحوظ رکھ کر واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

طرز نقش اور اقتصاد دونوں لحاظ سے درہم نے بوزنطیہ اور مغرب پر بڑا قوی اثر ڈالا تھا۔ آٹھویں صدی عیسوی کے دوسرے ربع میں بوزنطی "miliaresion" ایک زمانہ دراز کے بعد، جس کے دوران میں قسطنطنیہ میں کوئی چاندی کا مکہ ضرب نہیں ہوا، جاری کیا گیا۔ یہ صاف طور پر درہم کو دیکھ کر ہی جاری ہوا تھا اور آٹھویں اور نویں صدی عیسوی کے بہت سے "miliaresia" تو فی الواقع عرب درہم کے قالب ہی میں ڈھالے گئے تھے۔ اس بات پر یقین کرنے کی بھی وجہ ہے کہ Carolingian کے denier یا دینار کی وضع قطع بھی درہم ہی کے اثر سے متعین ہوئی ہو گی۔ مشرق خلافت کے تحت ممالک اور روس، مشرق یورپ، سکندریہ، یونیا اور بالٹک کے علاقوں کے درمیان ہونے والی تجارت میں عرب کی چاندی جس عظیم اہمیت کی حامل تھی وہ ان بے شمار درہموں اور ان کے ٹکڑوں سے بغوی ثابت ہو چکی ہے جو ان علاقوں میں ڈھیر کے ڈھیر دستیاب ہوئے ہیں اور جن پر ۷۸۰ء اور ۱۱۰۰ء کے درمیان کی تاریخی جار واضح ادوار دکھائی ہیں (جامع اختصارات اور مآخذ کی پوری فہرست U.S.L. Wellin ، در Kulturhistorisk Leksikon

میں اس کے طرز اور وزن میں پورا پورا تغیر واقع ہو گیا۔ وہ ایک چوکور (سریخ) درہم بن گیا، جس کی عیسائیوں نے بھی فرانس میں (millares کے نام سے) نقل کی۔ درہم کی بناوٹ اور مآخذ کی معلومات کے لیے دیکھئے The numismatic history of late : H.W. Hazard medieval North Africa ، نیویارک ۱۹۵۲ء۔

کلاسیکی (قدیم) عربی درہم کے وزن کے بارے میں (غیر مطبوعہ) بیانات ظاہر کرتے ہیں کہ خسروانی کے زمانے کے زیادہ چلنے والے ساسانی درہم کا وزن ۴.۱۵ گرام کے درمیان تھا۔ عربی ساسانی درہم یقیناً اس سے ہلکا تھا اور اس کا وزن تقریباً ۳.۹۸ گرام تھا۔ ۷۹ء کی اصلاحات کے بعد بالکل ایک جدید معیار قائم کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بعد سے لے کر تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی تک، جب کہ اوزان نہایت مبالغہ آمیز ہونے لگتے تھے، درہم کا زیادہ سے زیادہ وزن برابر ۲.۹۱ اور ۲.۹۵ کے درمیان رہا (A.N.S. Museum Notes ج ۹ ، ۱۹۶۰ء، دیکھئے مآخذ)۔ تصحیح شدہ رقم کے گھٹنے کا خیال رکھتے ہوئے ۲.۹۲ تھی اور یہ بالکل اس نظری رقم کے برابر ہے جس کی بنا (قدیم معیاری) عربی ضابطہ پر تھی، جس میں درہم کا وزن متغال (دینار) کا $\frac{1}{20}$ مقرر ہے، یعنی $\frac{1}{20} \times ۴۲.۵ = ۲.۱۲۵$ (رک بہ دینار)۔ درہم کے زجاجی اوزان اس وزن سے تھوڑے سے کم ہیں اور ان کی ایک خاص قسم سے ثابت ہوتا ہے کہ مصر میں ۱۳ "غروبہ" وزن کے بھی درہم تھے، جن کا وزن اس سے بھی کم تھا۔

دینار اور درہم کی شرح تبادلہ مختلف زمانوں اور مملکت کے مختلف حصوں میں بہت زیادہ فرق کے ساتھ گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔ فقہا ذکر کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک دینار کے ۱۰ (یا ۱۲) درہم ملتے تھے۔ اس کے بعد اس بات کی بکثرت شہادت ملتی ہے کہ

Byzantine : G. G. Miles (۴) : Dirhem بذیل مادہ
millarestan and Arab dirhem : Some notes on their
relationship ' در American Numismatic Society
Muséum Notes (۵) : ۱۸۹ تا ۱۹۰ : (۵) (۵) (۵)
سلف : The Iconography of Umayyad Coinage : در
Ars Orientalis ' ج ۳ (۱۹۵۹) ' جدید فہرست مآخذ :
(۶) وہی سلف : 'Trésor de dirhems du IX^e siècle'
Mémoires de la Mission Archéologique en Iran : در
۳۷ (۱۹۶۰) : ۶۷ تا ۱۲۵ (توسہ سے دریافت شدہ
درہموں کے ایک بڑے ڈھیر کا بالتحصیل مطالعہ) : (۷)
Über Mohammedanische Vicarlat : J. Karabacek
Wiener Num. : در smünzen und Kupfer-drachmen
Orientalische : E. Zambaur (۸) : ۱۸۶۹ : 'Zeitschr
Monasblatt. : در Münzen in Nord-und Osteuropa
J. A. Decourde- (۹) : ۱۹۰۲ : Num. Ges. Wien
Étude métrologique et numismatique sur : manche
'les Misqals et Dirhems Arabes' : ۱۹۰۸ : (۱۰)
(۱۱) 'ج' بذیل مادہ]

(G. C. MILLS)

دری : فارسی زبان کا لفظ، بمعنی درباری (زبان)،
اشتقاق از "در" [وگہاں] - عرب مصنفین مثلاً، المقدسی
(ص ۳۳۵)، یاقوت (۳ : ۹۲۵) اور زاین ندیم : الفہرست
(ص ۱۹) نے ہاں دری زبان (بیز "فارسی دری") کو
(ساسانی) دربار کی بول چال اور خط و کتابت کی زبان
بتایا گیا ہے - یہ سرکاری اور ادبی زبان بھی تھی -
اسلامی حکومت کے تین سو برس بعد اسے ایران میں
عربی رسم الخط میں لکھا جانے لگا اور وہ "فارسی"
یا "پارسی نو" کہلانے لگی - اس واقعے نے کہ نئے
فارسی ادب نے سیاسی وجوہ کی بنا پر ایران میں ظہروں،
صغریوں اور سامانیوں کی حکومتیں قائم ہونے سے
خراسان اور ماوراء النہر میں جنم لیا اور ترقی کی، کچھ
مشکلات پیدا کر دی ہیں - [نثر دری جیسا کہ ہمار

for nordisk middelalder ' ج ۱ : کوپن ہیگن
۱۹۵۶ء : بذیل مادہ Arabisk mynt ' میں موجود
(ہے) - ان علاقوں سے کثیر تعداد میں انگلستان
اور فرانس میں بھی درہم پائے گئے ہیں (دیکھیے
J. Duplessy : در Rev. Numismatique ' ۱۹۵۶ء : ص
(۱۰۱) .

پانچویں صدی ہجری / گیارھویں صدی عیسوی
کے آغاز سے کھوئی چالیدی (billion) اور تانبے کے سکے
مختلف حکمران خاندانوں نے ضرب کرنے شروع
کر دیے (متاخر بویہی، اراخان، خوارزم شاہ وغیرہ) -
بنو ارقم کے تانبے کے بڑے بڑے موٹے درہم (سکون کی
فہرست میں "Urtukida") اور ایسے ہی زنگیوں اور
ایریوں کا سکے موجود ہیں، جن کے منقش نمونے
قدیم یونانی، روم کے صوبائی، بوزنطی اور دیگر سکوں
کے مشابہ ہیں اور جن پر کبھی کبھی قدیم اسلامی نقوش
دکھائی دیتے ہیں - ایک بہت ہی غیر معمولی اور عجیب
بات ہے جس کی ابھی تک کوئی خاطر خواہ تشریح نہیں
ہوئی اور جو مزید مطالعے کا مستحق ہے (سب سے بہتر
تصاویر موزہ بریطانیہ اور اسٹائبلوں کی فہرستوں میں، نیز
'Coins of the Urtuk Turkumans : S. Lane Poole
نٹن ۱۸۷۵ء، میں ملیں گی، نیز دیکھیے J. Karabacek
'Num. Zeitschr' ۱۸۶۹ء : ص ۲۶۵) .

مآخذ : علاوہ ان مآخذ کے جو دینار کے ذیل میں
دیے گئے ہیں اور ان کے جن کا اس مقالہ میں ذکر کیا
کیا دیکھیے : (۱) R. Vasmer : در F. v. Schröter :
Wörterbuch der Münzkunde : برلن و لائپزگ : ۱۹۰۳ء
بذیل مادہ Dirhem (جس میں مآخذ کی قابل قدر فہرست
دی گئی ہے) : J. Walker (۲) : A Catalogue of the
Arab-Sassanian Coins : A Cat. of the Muhammadan
'Coins in the British Museum' : ج ۱ : نٹن ۱۹۰۳ء
'U. S. L. Wolin : در Kulturhistorisk Leksikon
'for nordisk middelalder' ج ۳ (کون ہیگن ۱۹۵۹ء)

* دریا بیگی : دریا ہای یعنی السر بحریہ ، ایک خطاب جو مملکت عثمانیہ میں بحری بیڑے کے بعض سرداروں کو دیا جاتا تھا ۔ نویں صدی ہجری / پندرھویں صدی عیسوی میں دریا ہای یا "دیز گلیولی" (deniz-bey) کا خطاب کبھی کبھوں کے السر جنگ کے لیے استعمال کیا جاتا تھا [رگ بہ gelebolu] جس کو سنجاق ہای کا درجہ حاصل تھا اور وہی اس وقت تک اعلیٰ امیر بحریہ بھی ہوتا تھا، جب تک تہودان پاشا [رگ بآن] کا عہدہ قائم نہیں ہوا تھا۔ دسویں صدی ہجری / سولہویں صدی عیسوی میں تہودان پاشا امیر البحر ہونے کے علاوہ اس ایالت (صوبہ) کا والی بھی ہوتا تھا جو بندر گلوں اور جزیروں کے ایک مجموعہ سے مل کر قائم کی گئی تھی [رگ بہ جزائر بحر سفید]۔ یہ صوبہ بھی اور صوبوں کی طرح سنجاقوں میں منقسم تھا جن کے حاکم بجائے سنجاق ہای کے دریا ہای کہلاتے تھے۔ ان کے اور ان کے ماتحت عمال نیز فوجی سرداروں کے پاس زمین اور جاگیریں ہوتی تھیں۔ سنجاق کے ان بحری حاکموں کا فرض تھا کہ بیڑے کی خدمات انجام دیں اور اپنے اپنے سنجاق کو اہمیت کے مطابق ایک، دو، یا تین جہاز، ان کا عملہ، اور ساز و سامان مہیا کریں۔ ان کی جاگیروں کا انتظام ایک محکمے کے سپرد تھا جو "دریا قلی" یعنی بحری محکمہ کہلاتا تھا۔ اور منسوخات [رگ بآن] کے معاملات بھی یہی طے کرتا تھا۔ دریا ہای کا تقرر عموماً مدۃ العمر کے لیے ہوتا تھا جو وراثۃً ان کے لرزلوں کو منتقل ہو جاتا تھا۔ ان کے جہاز اصلی (شاہی) بیڑے کے معاون ہوتے تھے۔

مآخذ : (۱) *Etat militaire de* : Marsigli
(۲) *l'Empire Ottoman* : The Hague ۱۸۳۷ء
(۳) *Tableau général de* : M. D'Ohson ۱۸۵۵ء تا ۱۸۵۸ء
(۴) *l'Empire ottoman* : ج ۲ لیرس ۱۸۷۲ء
(۵) *Staatsverfassung* : Hammer-Purgstall ۱۸۲۷ء
(۶) *Osmanli* : اسمعیل حق اوزون چار شیلی ۲۵۲ تا ۲۵۳

کا خیال ہے قرن سوم کے اواخر میں مروج تھی اور مکاتبات و رسائل اس زبان میں موجود تھے، جو سوء اتفاق سے ہم تک نہیں پہنچے۔ فارسی دری کی قدیم ترین کتابیں جو دستیاب ہیں، وہ چوتھی صدی سے اوپر کی ہیں (دیکھیے بہار : سبک شناسی، ج ۲، ص ۳) طبع امیر کبیر، ۱۳۳۷ھ)۔ حاشیہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ عربی کی قدیم کتابوں مثلاً الطبری، ہیون الاخبار، الاغانی اور کتب جاحظ وغیرہ میں پہلچہ دری فارسی کے جملے ضبط کیے گئے ہیں جو قرن سوم سے اوپر کے زمانے کے ہیں۔

یہ زبان بنیادی طور پر مغربی ایران کی اولی تھی، اسی لیے صوبہ فارس کے نام پر، اس کا نام فارسی پڑا۔ اگر پہلے سے نہیں تو اسلامی عہد میں یقیناً شستہ دری زبان، پہلوی کتابوں کی دقیق لفاظی سے، جسے زیادہ تر زردشتی موبد زندہ رکھے ہوئے تھے، دور ہوتی چلی گئی۔ مغول کی فتح ایران کے زمانے تک دری کی اصطلاح متروک ہو چکی تھی۔

مآخذ : (۱) E. Bertels : *Perstdskty dari*
(۲) SE 'radziksky' جلد ۴، ۱۹۵۰ء ص ۵۵ تا ۹۹
Die Wiedergeburt Persiens um die : R. N. Frye
Jahrtausendwende 'Jst. ' جلد ۳۵، ۱۹۶۰ء
ص ۲۲ مزید لکھتے ہیں : [۳] Cl. Huart : *Jour As*
سلسلہ ۸ ج ۱۱، ۱۸۸۸ء ص ۲۹۸ بحال : (۴) *Zetschr*
d. Deutsch Morgent. Ges جلد ۵۱ (۱۸۹۸ء) ص ۱۹۶
Zetschr. d. Deutsch. Morgent. Ges. : F. Justi (۵)
ج ۳۵، ۱۸۸۱ء ص ۳۲۷ : Anquetil-Duperron (۶)
Mémoires de l'Académie des Inscriptions ج ۳۱
۱۸۶۸ء ص ۳۱ : E. G. Browne (۷) *A year amongst*
the Persians (۸) وہی مصنف *Literary History*
of Persia : ۱ : ۲۶ : (۹) دائرة المعارف الاسلامیہ، قاہرہ
بنیاد مادہ : (۱۰) بہار : سبک شناسی، ج ۲، دیباچہ ص ۳ :
(R. N. FRYE)

بہادر شہسوار اور صف اول کا شاعر (- شاعرِ قہر) تسلیم کیا گیا ہے۔ محمد بن سلام الجعفی نے اسے عرب کے چوٹی کے شعرا میں اول مرتبہ دیا ہے۔ عربوں کے نزدیک وہ سب سے بڑا شہسوار شاعر تھا۔ الاضحیٰ بھی اسے بڑا شخص سمجھتا ہے (تحولۃ الشعراء در ZDMG، ۶۵ : ۶۸، ۶۹۸، سطر ۲)۔

اس کے قصائد میں، جو بدویت کا نمونہ ہیں لڑائی کا بیان، محبت اور دوستی کا اظہار، مراثیہ اور مدح سب کچھ ملتا ہے، اس شخص میں وہ سب خوبیوں اور نقائص موجود تھے جو عربوں کے خصائص میں سے ہیں۔

[اس نے عروض کی بحروں میں سے زیادہ تر وافر اور طویل استعمال کی ہیں۔ نیز بیضا، مقارب وجز، کامل اور رمل بھی اس کے ہاں پائی جاتی ہیں۔ ابن منظور نے لسان العرب میں تقریباً پینتیس جگہ درید کے اشعار سے استشہاد کیا ہے (دیکھئے عبدالقیوم : قہار من لسان العرب، ۱ : ۴۹)۔]

مآخذ : (۱) الاغانی، ۹ : ۲ تا ۲۰، نیز دیکھئے

Tables، ص ۳۲۲ : (۲) ابن قتیبہ : کتاب الشعر، ص ۱۹۷

۲۱۹، ۲۷۰ تا ۲۷۳ : (۳) خزائن الادب، ۱ : ۱۲۵ تا ۱۲۶

۱۲۱، ۳۲۲ تا ۳۲۳، ۱۶۶ : (۴) ۱۳۸، ۳۳۵ تا ۳۳۶، ۵۱۳

۵۱۶ : اس کے کچھ قصائد البکری : معجم : سيرة عنترہ

العقد : الاممات : الکامل : حسانۃ البحتری : حسانۃ ابی تمام

لسان العرب، تاج العروس اور دیگر مجموعوں میں

نہی پائے جاتے ہیں : (۵) R. Růžicka : Duratd

ben Az-zimma, obraz středního Hlidzazu na

usvite islamu، Prag ۱۹۲۵ - ۱۹۳۰، حصہ

۲، ج ۲، در Rozpravy České akademie a umění věd

جلد ۳، عدد ۶، ۶۷ : مضامین دیکھئے ۱۹، ۱۹۵۱

عدد ۲ تا ۴، ص ۱۰۹ : (۶) البستانی : دائرة المعارف

بیروت ۱۸۸۳ء، ۷ : ۶۸۳، بعد : (۷) الروض الآف

ص ۲۸۷ : (۸) السیوطی : شرح الشواهد، ص ۷۰

التبریزی، ۲ : ۱۵۹ : (۹) ابن حبيب : المعجب، ج ۱

۱۹۹۲ء، ص ۲۹۸ تا ۲۹۹ : (۱۰) الطبری، ۱ : ۳۵۵ تا

۳۵۷ : (۱۱) Essai : Caussin de Percevall، ۲ : ۵۳۹

بعد : ۳۵۵، بعد : (۱۲) غیر الدین الزکلی : الاعلام، ۳ : ۱۶

بعد : (۱۳) المرزبانی : معجم الشعراء، ۱ : ۱۹۶، ص ۳۱۲

بعد : (۱۴) براکلمان : تذکرہ، ۱ : ۹۳۸ : (۱۵) عمر فروخ :

تاریخ الجاهلیہ، بیروت ۱۹۶۳ء، ص ۶۵ : (۱۶) ابن حزم :

الاندلسی : جمهرة انساب العرب، مصر ۱۹۶۲ء، ص ۲۷۰ :

(۱۷) شیخو : الشعراء النصرانیة، بیروت ۱۹۸۰ء، ۵ : ۵۵۲

بعد : (۱۸) ابو حاتم السجستانی : المعبرین، ص ۲۱ تا ۲۲ :

(۱۹) ابن درید : الانتقاق، ص ۱۷۷، بعد : (۲۰)

ابو عبید البکری : اللالی، ص ۳۹، بعد : (۲۱) الآمدی :

المؤلف والمختلف، ص ۱۱۳ : (۲۲) النووی : قہذب

الاسماء و اللغات، الطباعة النیرودہ، ۱/۱ : ۱۸۵ : (۲۳)

احمد امین : فجر الاسلام، قاہرہ ۱۹۶۵ء، ص ۸۶ : (۲۵)

المرزوقی : شرح دیوان الحسانۃ، قاہرہ ۱۹۵۱ء، ۲ : ۸۱۲

بعد : (۲۶) میرت ابن شام، ص ۸۳۱ تا ۸۳۲، گونگن : (K. PETRACEK)

(K. PETRACEK)

دزیا : رک بہ تَبُو (= تَبُو)۔

*

دزفول : اسی نام کے ایک ضلع (شہرستان)

کا صدر مقام، ایران کے چھٹے آستان (= خوزستان)

میں ۳۲ درجے، ۲۳ ثانوی شمالی عرض بلد اور ۴۸

درجے، ۲۳ ثانوی مشرق طول بلد (گرین وچ) میں

آپ دز یا دزفول رود کے بائیں کنارے پر واقع ہے۔

یہ ندی جو بروجرڈ کے نواح سے نکلتی ہے، بندر فیر

(عسکر، مکرم، [رک بان]) کے مقام پر قارون [رک بان]

میں جا ملتی ہے۔ یہ شہر، جو سطح سمندر سے دو سو

میٹر اونچا ہے اور مرکب چٹانوں کے اوپر آباد

ہے : اس کے بہت سے باشندوں نے اس پتھریلی ٹیکڑے

میں اپنے مکالوں کے نیچے قہر خانے ("سرداب") بنا

لیے ہیں، جن میں وہ موسم گرما میں گرمی سے بچنے

کے لیے اقامت اختیار کرتے ہیں۔ دژقول (فارسی میں "دژبول" - محماری ہن) کا نام اس حصار کے نام پر پڑا ہے جو وہاں ندی کے مشہور ہل کی حفاظت کے لیے تعمیر ہوا تھا۔ اس ہل کے پاسے شوستر (رگ ہاں) کے زیادہ مشہور ہل کی طرح بلاشبہ ساسانی عہد کے ہیں، محرابین اور بالائی عمارت بعد کے زمانے کی ہے۔ ان کی مرمت بار بار ہوئی ہے۔ بقول اَلْمُسْتَوفِی (۸۷۴/۱۳۳۹ - ۹۱۳/۱۴۰۰) اس ہل کی ۲۲ محرابیں تھیں، جب کہ علی یزدی (۸۲۸/۱۴۲۸ - ۸۴۵/۱۴۳۵) نے لکھا ہے کہ اس کی ۲۸ بڑی اور ۲۴ چھوٹی محرابیں تھیں، یعنی کل ۵۵۔ (ان مصنفوں نے بلاشبہ پابوں کے اوپر امدادی طاقچوں کو محرابیں خیال کیا، جنہیں ہل کے ڈھانچے پر سخت طغیانی کے وقت دباؤ کم کرنے کے لیے ہٹایا گیا تھا)۔

دژقول کا نام چھٹی صدی ہجری/بارہویں صدی عیسوی سے پہلے مستعمل نہیں تھا۔ اس سے پہلے اسے آندل یشک یا آندامیشک کہتے تھے۔ (اب یہ نام ایک قصبے کا ہے جو ٹرانس ایرالین ریلوے پر دژقول کے شمال میں گیارہ کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے)۔ قدیم تر عرب جغرافیہ نویسوں نے اس قصبے کو کئی ناموں سے موسوم کیا ہے، مثلاً قَصْرُ الرُّوَّاشِ، قَنْطَرَةُ الرُّومِ (رومی ہل)، قَنْطَرَةُ الرُّودِ (دریا کا ہل) اور قَنْطَرَةُ الزَّابِ۔ زاب بار بار دریا کے نام کے طور پر آتا ہے، یہ ساسی زبانوں میں 𐭥𐭣 (بمعنی بہنا) استعمال ہوتا ہے۔

پروکوپس اس Procopius نے اپنی تصنیف Cacsareensis (کتاب اول، ۵: ۲۸، ۲۹) میں ایک "گننام قلعے" (τὸ τῆς ἀνθρακῆς πύργου) کا دلچسپ حال بیان کیا ہے، جو ایران میں کسی پوشیدہ جگہ پر واقع تھا، جہاں اونچے درجے کے لوگوں کو قید کیا جاتا تھا: اس کے متعلق بات کرنے کی سزا موت تھی۔ Procopius، عرب اور ایرانی مصنفین میں سے جس

جس نے اس قلعے کا ذکر کیا ہے، اس کا صحیح محل وقوع بیان نہیں کیا، لیکن ارمینی ماخذ کی رو سے یہ آندامیشن میں تھا، جسے H. Hübschmann نے اپنی Armenische Grammatik (لاہیزگ ۱۸۹۷ء، ص ۱۶۱) میں آندامیشک یعنی دژقول ہی میں متعین کیا ہے۔ شوستر کی طرح دژقول بھی اپنے ہم سایہ شہر چنڈپشاہور (رگ ہاں) کے سامنے ایک طویل عرصے تک ماند پڑا رہا۔ بعد ازاں جب چنڈپشاہور ویران ہوا تو دژقول زیادہ خوشحال ہو گیا، لیکن جب ساسانیوں کا حیرت انگیز نظام آب پاشی مرمت نہ ہونے کے باعث خراب ہو گیا تو اسے اور اس کے نواحی ضلعے کو نقصان پہنچا۔ گو دژقول مغول کے ہاتھوں تباہ ہوئے سے بچ گیا تھا لیکن بعد ازاں یہ ایلخانوں کی حکومت کا مطیع ہو گیا۔ ۱۳۹۳ء میں اس نے تیمور کی کوئی مزاحمت نہیں کی۔ کہا جاتا ہے کہ تیمور کی اطاعت قبول کرنے کے تھوڑے دن بعد ہی آردبیل کے شیخ صفی (رگ ہاں) کا ہوتا خواجہ علی دژقول آیا اور اس نے اپنی کرامت سے آب دژ کی روانی کو عارضی طور پر بند کر کے اس کے باشندوں کو شیعہ بنا لیا۔ نادر شاہ (رگ ہاں) کئی موقعوں پر دژقول آیا، اس نے اسے لُروں (Lurs) سے محفوظ رکھنے کے لیے ایک قلعہ تعمیر کیا، جسے دژ شاہ کہتے تھے اور وہ شمال مشرق جانب چند میل پر تھا۔

فتح علی شاہ (رگ ہاں) کے ایک بیٹے محمد علی میرزا نے اس مشہور ہل کو اسیویں صدی عیسوی کے اوائل میں مرمت کیا تھا، لیکن ۱۸۳۲ء کے غیر معمولی شدید سیلاب اس کے ان حصوں کو بہا لے گئے جنہیں بڑی احتیاط سے دوبارہ بنایا گیا تھا۔ یہی زمانہ تھا جب لیل کی کاشت قرب و جوار میں وسیع پیمانے پر شروع کی گئی۔ نیل الفراط سے تیار ہونے لگا، یہاں تک کہ بیرونی رنگوں کی درآمد نے

ہوگا، کیوں کہ یہ نہ صرف ایک وسیع رقبے کی آبپاشی کے لیے کافی پانی فراہم کرے گا، بلکہ شمالی اور وسطی خوزستان کو وسیع پیمانے پر بجلی بھی مہیا کرے گا۔

مآخذ : (۱) BGA 'مواضع کثیرہ' : (۲) باتوت : ۱

۳۷۲ (بذیل مادہ اندامش) : ۱۱۱ : ۱ (بذیل مادہ قصر و ناض)

(۳) Sir W. Ouseley : Travels in the various coun-

'tries of the East' لنڈن ۱۸۱۹ء : ۱ : ۳۵۸ (بیلد) : (۴)

'Description of the province of : Sir A. H. Layard

'Khuzistan' در 'JRGS' لنڈن ۱۸۸۶ء : ص ۵۶ تا ۶۸

(۵) W. K. Loftus : Travels and researches in :

'Chalduva and Susiana' لنڈن ۱۸۵۷ء : ص ۳۱۰ تا

۳۱۴ لنڈن ۱۸۸۶ء : ص ۵۶ تا ۶۸ : (۶) وہی مصنف :

'Early adventures in Persia, Susiana and Baby-

'lonta' لنڈن ۱۸۸۷ء : ۲ : ۲۹۳ : (۷) Sir A. H.

'Houtum-Schindler' در 'ZGEdrk. Berl.' ۱۸۷۹ء

ص ۳۸ (بیلد) : (۸) H. L. Wells : Surveying tours in :

'Southern Persia' در 'Proceedings of the Roy.

'Geograph. Society' ۱۸۸۲ء : (۹) J. Dieulafoy :

'La Perse, la Chaldée et la Susiane' پیرس ۱۸۸۷ء

ص ۶۸ تا ۷۵ : (۱۰) E. Herzfeld : در 'Patermann'

'Geograph. Mitteil.' ۱۹۰۷ء : ص ۷۳ تا ۷۵ : (۱۱)

رژمارا و توتاش : فرهنگ جغرافیائی ایران : ۶ : ۱۶۱ : (۱۲)

'Persian Cities' : L. Lockhart : لنڈن ۱۹۵۹ء : باب ۲۰ :

(۱۳) دائرة المعارف الاسلامیة : قاہرہ : بذیل مادہ : (۱۴)

'The lands of the Eastern Cal-' : G. Le Strange

'phate' ۱۹۰۵ء : ص ۲۳۳ : ۲۳۸ تا ۲۳۹ : (۱۵)

'Djihan numa Geographia Orient' لاطینی ترجمہ از

'M. Norberg' ۱۸۱۸ء : ۱ : ۳۳۲ : (۱۶) Ritter :

'Erdkunde' ۱۸۳۹ء : ۱۶۴ : ۱۷۰ : ۱۹۳ تا ۱۹۵

'Eranische Altertumskunde' : Spiegel : (۱۷) ۳۴۲

۱ : ۱۸۷۱ء : ص ۱۱۰ : ۳۷۵ : (۱۸) de Morgan :

اس صنعت کو غیر منفعت بخش بنا دیا۔ دزفول نرسل کے قلعوں کے لیے بھی مشہور تھا، جنہیں مدت دراز تک مشرق میں بہترین خیال کیا جاتا تھا اور وہ دور دراز ملکوں تک بھیجے جاتے تھے۔ اس صنعت کے لیے خام مال نام نہاد البیطیجہ [رگ باں] یعنی دریائے دجلہ اور فرات کے نشیبی حصوں کی دلدلوں میں نرسل کے غیر مختتم لیستان مہیا کرتے تھے۔

۱۸۳۱ء اور بعد کے سال میں شوشتر میں طاعون اور ہیضہ کی شدید وباؤں کے پھوٹ پڑنے سے اس کی جگہ دزفول نوروزی عرصے کے لیے خوزستان کا صدر مقام بن گیا۔ انیسویں صدی عیسوی کے وسط کے قریب Loftus نے دزفول کی آبادی کا تخمینہ پندرہ اور اٹھارہ ہزار کے قریب لگایا تھا، جو تمام کے تمام مسلمان تھے، بجز تیس کے قریب ہندی (Mandaeen) خاندانوں کے۔ Wells نے ۱۸۸۳ء میں اس کی مجموعی آبادی تیس ہزار بتائی ہے اور Herzfeld نے ۱۹۰۷ء میں اس کا اندازہ فقط پندرہ ہزار لگایا، جس میں ایرانی گرد، لُر اور عرب شامل تھے۔ آج کل (۱۹۶۳ء میں) یہ آبادی تقریباً پچاس ہزار ہے۔ اس کے بیشتر باشندے شوشتر کے باشندوں کی طرح سید ہیں۔ شہر میں کوئی پینتیس مسجدیں اور کثیر تعداد میں اولیا کے مزار ہیں۔ روئند کے مضافات میں سلطان حسین کا روضہ ہے، جو موسم میں نئی دانیال کے روضے سے گہری مشابہت رکھتا ہے۔

حال ہی میں آپ دز کے ہل کی وسیع پیمانے پر مرمت کی گئی ہے، اس کام کے سلسلے میں متعدد پرانی محرابوں کی جگہ پورے عرض کی تین جدید محرابیں بنائی گئی ہیں۔

جب آپ دز کے پار ایک بڑا بند، جو ۱۹۵۹ء تک شہر کے شمال مشرق میں بارہ میل دور ایک گھاٹی میں زیر تعمیر تھا، پابہ تکمیل کو پہنچے گا تو اس سے دزفول اور نواحی علاقے کو بلاشبہ بڑا فائدہ

ایس آلفید لٹالیپ المستفید کے نام سے مرتب کیا۔ ان درسی کتابوں کے علاوہ اس نے مقامات حریری، کلیلہ و دمنہ اور النیۃ ابن مالک کو بھی شائع کیا۔ ان کتابوں کی اشاعت سے فرانس میں عربی زبان کے درس و مطالعہ نے بڑا فروغ پایا۔ اور ۱۸۱۳ء میں فرانس کی حکومت نے دسائی کو اس کی نمایاں علمی خدمات کے صلے میں ہرن Baron کا خطاب عطا کیا۔

دسائی نے ۱۸۱۹ء میں شیخ فریدالدین عطار کا ہند نامہ فرانسیسی ترجمے کے ساتھ شائع کیا اور اس کی ابتدا میں فارسی زبان میں ایک مقدمہ بھی لکھا۔ اس مقدمے کی تصحیح و بلیغ عبارت سے ثابت ہوتا ہے کہ دسائی کو عربی کے علاوہ فارسی پر بھی خوب عبور حاصل تھا۔

اپنے احباب اور تلامذہ کی شرکت سے دسائی نے ۱۸۲۲ء میں ایشیائک سوسائٹی Société Asiatique کی بنیاد ڈالی اور دسائی ہی کو اس سوسائٹی کا پہلا صدر منتخب کیا گیا۔ اس سوسائٹی نے ایک علمی مجلہ بھی جاری کیا جو آج تک Journal Asiatique کے نام سے شائع ہو رہا ہے۔ دسائی کے بہت سے مضامین اور مقالات اس رسالہ میں طبع ہوئے یورپ میں بریدیات (Papyrus) کے مطالعے کا آغاز بھی دسائی ہی کی بدولت ہوا۔ اس نے جو قرطاس شائع کیے وہ ۱۸۲۵ء میں مصر میں سقاہ کے قریب دبیر ابو برمیسن سے دستیاب ہوئے تھے۔

ہرن دسائی نے اپنی تعلیم و تدریس، تحقیق و تدقیق اور تصنیف و تالیف سے فرانس میں عربی علوم کے موجودہ دبستان کی بنیاد ڈالی۔ اس کے حلقہ درس سے بہت سے نامور مشرقین مثلاً Filzgel, Freytag, Ahlwardt, Quatremere, Tornberg, Kosgarten, Reinaud اور De Slane, Fleischer نے اپنے اپنے مرکزوں میں اپنے نامور استاد کی علمی

Mission Scientif en Perse. Etud. Geogr ۲: ۲۷۸ تا ۲۷۹ (۱۹) البستانی: دائرة المعارف، بیروت ۱۸۸۳ء: ۷۱-۷۲۔

(L. LOCKHART)

دسائی: ہرن ساوستر دسائی Baron silvestre de saoy، فرانس کا ایک مشہور اور ممتاز مشرقی، عربی اور فارسی زبانوں میں اچھی دستگاہ حاصل کی اور عہد حاضر میں فرانس کے عربی دبستان کی بنیاد ڈالی۔ ۱۷۵۸ء میں پیرس میں پیدا ہوا اور اس کی عمر ابھی سات سال کی تھی کہ سایہ پدری سر سے اٹھ گیا۔ بے سروسامانی کے باوجود دسائی نے مشرقی زبانوں، خصوصاً عربی اور فارسی کی تحصیل کی اور مشرقی علوم میں ایسا غیر معمولی تبحر حاصل کیا کہ اپنے ہم عصروں میں امام المستشرقین تسلیم کیا گیا۔

۱۷۷۸ء میں فرانس کے شاہ لوی ہڑدہم نے آٹھ علما کی ایک کمیٹی مقرر کی اور شاہی کتب خانے میں مشرقی زبانوں کے جو مخطوطات محفوظ تھے انہیں ان کی اشاعت پر مامور کیا۔ اس کمیٹی کا ایک رکن دسائی بھی تھا۔ ۱۷۹۵ء میں فرانس کی انقلابی حکومت نے پیرس میں مشرقی زبانوں کی تعلیم کے لیے ایک مدرسہ قائم کیا جو Ecole des Langues Orientale کے نام سے آج تک جاری ہے۔ دسائی اس مدرسے میں عربی کا پہلا استاد مقرر ہوا اور جب اس نے عربی کا درس شروع کیا اور سوزوں درسی کتابوں کی کمی، محسوس کی تو اس نے طلبہ کے لیے عربی زبان کی مستند کتابوں کے اقتباسات کا ایک مجموعہ الخلفۃ النبیۃ فی علم العربیۃ کے نام سے دو جلدوں میں ۱۷۹۹ء میں شائع کیا، جو دوسری اغراض کے لیے اس قدر مفید اور مقبول ثابت ہوا کہ ترمیم و اضافہ کے بعد ۱۸۰۸ء میں دوبارہ طبع ہوا اور دیگر مغربی ملکوں میں بھی مرقح ہوا۔ عربی صرف و نحو کی تعلیم کے لیے بھی دسائی نے اسی قسم کا ایک اور مجموعہ

کے بر دی مخطوطات کی ترتیب و طباعت سے ہماری معلومات میں معتد بہ اضافہ ہوا ہے۔ لہذا اسے محض حسن اتفاق نہیں سمجھنا چاہیے کہ ایک ماہر بر دیات گرومن Grohmann نے عربی دستاویزات نویسی کو منظم کرنے کے سلسلے میں خاصا بنیادی کام کر لیا ہے اور اب توقع کی جا سکتی ہے کہ مزید مخطوطات کی طباعت سے اس کام کو آگے بڑھانے میں مدد ملے گی۔ یہ بات خاص طور سے بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ ہمارے پاس اتنے قدیم زمانے کی دستاویزات کے اصل نسخے موجود ہیں، بالخصوص اس صورت میں کہ بعد کی صدیوں کی عربی دستاویزات اتنی تعداد میں نہیں ملتیں۔ ابھی ماضی قریب میں [دستاویزات کے] چند مجموعے منظر عام پر آئے ہیں اور یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ اس طرح کا مزید مواد دستیاب ہو جائے گا۔ مجموعہ ہائے جنزہ (Geniza) اور کوہ سینا پر صومعہ سینٹ کیتھرائن میں متعدد اہم عربی دستاویزات ملی ہیں، اور عہد معالیک کی دستاویزیں اطالیہ اور ہسپانیہ کے دفتر خانوں میں محفوظ ہیں۔

دیروں کے لیے لکھے ہوئے عربی دستور العمل بھی، جو خاصی بڑی تعداد میں محفوظ ہیں، اس مواد میں شامل ہیں، جس پر عربی دستاویز نویسی کے باقاعدہ علم کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ یہ دستور العمل کچھ تو وہ نظری توضیحات و ہدایات ہیں جو کاتبوں کے لیے لکھی گئی ہیں اور بعض کی حیثیت متن میں عملی نمونوں کی ہے، جن میں بالعموم نہ کوئی نام آتا ہے نہ تاریخ۔ بظاہر اس بات کا فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ یہ متون کس حد تک مستند ہیں یا یوں کہیے کہ یہ کس حد تک اعلیٰ دستاویزات پر مبنی ہیں۔ اس قسم کے دستور العمل رفتہ رفتہ تہذیب و تکمیل کی منزلوں سے گزرتے گئے تا آنکہ عہد معالیک میں انہوں نے دائرہ معارف کی حیثیت اختیار

روایات کو جاری رکھا۔ علم و فضل کی بنا پر دسائی کو ملک بھر میں بہت عزت و تکریم کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ فرانسیسی قوم نے دسائی کو بہت سے اعزاز بخشے، دسائی کی قدر و منزلت وطن تک ہی محدود نہ تھی، جرمنی اور روس کے شہنشاہ بھی مشرق علوم کی تنظیم و ترویج کے بارے میں اس سے مشورہ لیتے تھے، چنانچہ دسائی کے ایما پر یورپ کے متعدد ملکوں میں مشرق زبانوں کی تعلیم اور مشرق علوم کی تحقیق کے لیے ادارے قائم ہوئے اور اس کے مشورے سے وہاں لائق اساتذہ کا تقرر عمل میں آیا۔

یرن دسائی نے ۲۱ فروری ۱۸۳۸ء کو پیرس میں اسی سال کی عمر میں وفات پائی۔

مآخذ: (۱) ابوالفاسم سحاب: فرهنگ خاور شناسان، ص ۳۰۳ تا ۳۱۲، تہران: (۲) نجیب العقیق: المستشرقون، ۱: ۱۷۹ تا ۱۸۲، ناشر ۱۹۶۸ء: (۳) Notice sur M. le Baron silvestre: M. Rénaud de Sacy در la séance de la société Asiatique، 25 Juin 1938، le 25 Juin 1938، (۴) Flück، (۵) J. Arabischen Studien in Europa، ص ۱۳۰ تا ۱۵۷، لانٹرک ۱۹۵۵ء: (۵) عنایت اللہ: در Islamic Culture، ۱۲ (۱۹۳۸ء): ۲۳۱ تا ۲۳۲۔

(شیخ عنایت اللہ)

* دستان: رگ بہ حماسہ

* دستاویزات: سیاسی (Diplomatic) تحریرات دست آویز (ف)، عربی میں وثیقہ جمع و ثائق۔

۱۔ قدیم عربی

(۱) عربی دستاویزات پر نسبتاً کم کام ہوا ہے۔ کام

کا مواد بہت بکھرا ہوا ہے اور ابھی صحیح معنوں میں مرتب و مدون نہیں ہوا۔ تاہم کچھ عرصے سے عربی دستاویزات سے اعتنا ہونے لگا ہے۔ متعدد دستاویزات شائع ہو چکی ہیں اور عہد اسلام کی ابتدائی صدیوں

کری دیا گیا اور اب طراز کی اصطلاح صرف کثروں پر نام لکھنے کے مفہوم میں استعمال ہوتی ہے، الفقشندی اس اصطلاح کے صرف ادبی مفہوم سے آشنا ہے، چنانچہ وہ دستاویزات کی ابتدا کے لیے طراز کا استعمال نہیں کرتا، افتتاح کی اصطلاح استعمال کرتا ہے، مثلاً افتتاح الکتاب اور افتتاح المکاتب۔ اس افتتاح کے مختلف اجزاء کو وہ قوائم کہتا ہے، جو یہ ہیں: بسماء (بسم اللہ)، حمدلہ (الحمد للہ)، تشہید، صلواتہ (درود و صلاۃ)، سلام اور بَعْدِیَہ (اُمّابعد) ان میں سے ہر اصطلاح کی اپنی تاریخ ہے، کہا جاتا ہے کہ درود و صلاۃ کا استعمال ۷۹۷ء میں شروع ہوا۔ عنوان بھی افتتاح کا جز ہے۔ اہل یہ من فُلانِ اِلٰی فُلانٍ یا فُلانٍ مِنْ فُلانٍ کی صورت میں ملتا تھا اور یہیں سے اس نے اگلے مراحل طے کیے۔ الفقشندی نے اس کی پندرہ مختلف صورتوں کا ذکر کیا ہے۔ عنوان میں کاتب کے اسم و لقب کو ترجمۂ کتب جاتا تھا، جو مادہ اخوہ یا وا کہہ سے بڑھ کر المملوک الناصری وغیرہ تک جا پہنچا۔ اس بات کی بھی شہادت ملتی ہے کہ مُرسل کے لیے تَفْدِیَہ کی اصطلاح بھی استعمال ہوتی تھی، جس نے قدیم جَعْلَیَ اللہ فِدائِک (مجھے خدا تم پر فدا کرے!) سے شروع ہو کر متعدد عبوری صورتوں سے گزرتے ہوئے دور عباسیہ تک پہنچتے پہنچتے یہ صورت اختیار کر لی۔ مکتوب الیہ کے لیے جو دعائیہ الفاظ استعمال کیے جاتے تھے اور جنہیں دعا کہا جاتا تھا، انہیں بے حد اہمیت دی جاتی تھی۔ اس کی صورتیں اور بھی زیادہ مختلف اور متنوع تھیں۔ دور بنو امیہ میں دعائیہ الفاظ کی حیثیت قطعی غیر نمایاں تھی، لیکن بنو عباس کے عہد تک پہنچتے پہنچتے اس نے ایک باقاعدہ نظام مراتب کی صورت اختیار کر لی۔ معلوم ہوتا ہے کاتبوں نے ادعیۃ کی بہرہیں خاصے ابتدائی زمانے میں مرتب کر لی تھیں اور جب دور فاطمی اور دور عباسیہ میں

کری، جیسا کہ الفقشندی: صبح الاعشی سے معلوم ہوتا ہے۔ اس جلیل القدر مصنف کو مطالعہ دستاویزات کے سلسلے میں انک بنیادی مأخذ کا درجہ حاصل ہے اور اسی لیے اس کے مصنف کو عربی وثائق نویسی کے ممتاز ترین مقدمین میں سے تصور کرنا چاہیے، گویہ پشانا مشکل ہے کہ الفقشندی نے جو عبارتیں درج کی ہیں ان کی اصل کس حد تک اس کی نظر سے گزری تھی۔ البتہ ہمیں یہ معلوم ہے کہ اس کی رسائی دفترخانوں تک تھی اور اس زمانے میں آج کے مقابلے میں کہیں زیادہ متون محفوظ تھے۔ قدیم تر متون کے بارے میں ہم زیادہ وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ غالباً الفقشندی نے اپنی کتاب کی بنیاد زیادہ تر ادبی مأخذ پر رکھی تھی، جن میں سے بعض کے نام بھی اس نے دیے ہیں، لیکن ہمیں یہ توقع ہرگز نہیں کرنی چاہیے کہ اس نے انہیں خاص تنقیدی نظر سے دیکھا ہوگا۔

Bresslau کی ترتیب و تقسیم کی بنیاد پر ذیل میں ایک جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ نسبتاً واضح اور مکمل تصویر سامنے آ سکے۔

(۲) دستاویزات کی ترتیب و تحریر: سب سے پہلے افتتاحیہ یا تشہید، متن اور خاتمہ۔ (الف) افتتاحیہ یا تشہید کو براز اور افتتاح کہا گیا ہے۔ عربی کے بزدی مخطوطات میں تشہید کے لیے طراز کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ شروع شروع میں طرازیں دو زبانوں میں لکھی جاتی تھیں، یونانی عربی میں، پھر عربی یونانی میں، اور بالآخر صرف عربی میں۔ ان کے الفاظ میں خاصاً تنوع ملتا ہے۔ گرومن Grohmann نے بہت زیادہ مواد شائع کیا ہے، اس کی غرض و غایت بظاہر یہ ہے کہ دستاویز کو مستند و معتبر بنا کر پیش کیا جائے، لیکن جہاں تک عربی دستاویزات کی صحت کا تعلق ہے، ایسا کرنا بے معنی ہے۔ چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی سے اسے بالکل ترک

کیونکہ ان سے سرکاری ملازمین کے فرائض اور ان کے اخلاق منصبی کا پتا چلتا ہے اور نسبتاً غیر معروف مناصب پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

(ج) اختتامی آداب میں حسب ذیل چیزیں شامل ہیں: ”خواتیم“: ایشنا - انشاء اللہ تعالیٰ، تحریر میں یہ اکثر یک جا آتے ہیں، لیکن بعض مستند علما کے نزدیک الہیں الگ الگ سطروں میں لکھنا چاہئے: ”تاریخ“: بعض اوقات محذوف ہوتی ہے اور اس پر علیحدہ بحث کی ضرورت ہے (دیکھیے ذیل میں شی ۱۴۰): ”علامہ“ - یعنی دستاویز لکھنے والے کے دستخط، بالعموم ایسے حفظ مراتب کو قطعاً نظر انداز کرتے ہوئے ”رجل غراب“ (= کوئے کا پاؤں) سے موسوم کیا جاتا تھا، عموماً الطُّومار الکلیل (= طویل عبارت) میں: إخوانیات میں ”لامۃ“ حاشیے پر ہوتا تھا۔ القلقشندی کے اختتامی کلمات مثال کے طور پر ”حسب المرسوم الشريف“ اور ”الإشارة العالیة الوزیریة“ ہوتے تھے۔ حمدلہ، صئولة، حسبلہ اور اسی طرح کے دوسرے اختتامی کلمات مذہبی ہیں۔ ان میں ’حر‘ کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے، جس کا مفہوم القلقشندی کی سمجھ میں نہیں آیا اور اس لیے اس کے متعلق اس کا بیان یہ ہے کہ وہ دوسرا حسبلہ یا محض بھرتی کا لفظ ہے (غالباً زیادہ صحیح طور پر حرف ح کے تحت وہ محض ایک علامت امتیاز ہے)۔

۳۔ دستاویزات کی اقسام: گروہمان Grolmann نے عربی دستاویزات کی صف بندی بھی اسی طریق پر کرنے کی کوشش کی ہے جس طرح یورپی دستاویزات کی جاتی ہے، مثلاً: قانونی مافیہ کے ساتھ اور ان کے بغیر: سرکاری اور نجی دستاویزات: تسیخی اور غیر تسیخی دستاویزات: فرامین: اسناد: شہادت اور تجارت سے متعلق دستاویزات، وغیرہ۔ عربوں نے بھی (خصوصاً القلقشندی نے) دستاویزات کی صف بندی

مختلف مناصب کے مابین زیادہ سے زیادہ امتیاز روا رکھا جائے لگا اور ہر لقب کے لیے ایک خاص دعا مخصوص ہونے لگی تو ادعیہ یا دعائیہ کلمات میں بھی زیادہ سے زیادہ تفصیل سے کام لیا جائے لگا۔

مختلف ذاتی نام (الاسماء والکنی، القاب، نعوت) خاصے ارتقائی مراحل سے گزرے ہیں۔ دستاویزات کی تشریح کے سلسلے میں ظاہر ہے کہ ان اسماء وغیرہ سے تعلق رکھنے والی تفصیلات بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ القلقشندی کی مذکورہ بالا کتاب کا تیسرا مقالہ اسی بحث سے مخصوص ہے اور اس سلسلے میں اس نے جو معلومات فراہم کی ہیں وہ بہت مفصل ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ناموں کے لکھنے کی روایت کا ارتقاء بتدریج پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتا گیا۔ عہد بنو امیہ میں اسم اور کنیت کو کافی سمجھا جاتا تھا، لیکن بنو عباس کے دور حکومت میں ”لقب“ اور ”نعت“ کا بھی رواج ہو گیا۔ مسالیک کے زمانے میں فی الواقع بہت سی اصطلاحات استعمال میں آ گئیں، چنانچہ اس کی تصدیق القلقشندی کی فہرستوں سے ہوتی ہے، جن میں ایک سو باون ”القاب“ اور تین سو بہتر ”نعت“ درج ہیں اور ان کی توثیق Caetani: Onomasticon سے کی جا سکتی ہے۔

(ب) اصل عبارت کے لیے ”متن“ کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ مکتوبات میں اسے مائین السلامین بھی کہا گیا ہے، کیونکہ اس کا آغاز سلام سے اور اختتام بھی سلام پر ہوتا ہے۔ متن فاعلی یا مفعولی دونوں میں سے کسی بھی صورت میں لکھا جا سکتا ہے (مفعولی، مثلاً: هَذَا...)۔ متن کے مختلف حصوں کے لیے علیحدہ علیحدہ اصطلاحات مقرر تھیں، مثلاً: تقرر ناموں میں اسناد سے مراد مخصوص طور پر یہ الفاظ ہیں: اَنْ يُفْهَدَ اَلَيْهِ وغیرہ۔ وصیۃ سے مراد وہ حصہ ہے جس میں نام زد فرد کے فرائض بالتفصیل درج ہوتے تھے۔ اس قسم کی تفصیلات بہت اہم ہیں

اپنے ہانچوں مقالے میں مناصب پر اس عنوان کے تحت بڑی تفصیل سے بحث کی ہے۔ بسر حال سرکب اصطلاحات بالعموم زیادہ مستعمل تھیں : ولایت العہد ، ولایت الدیوان ، ولایت الحنبہ ، ولایت القاہرہ وغیرہ۔ مثال کے طور پر ”تسعة سجل“ ”ولایت القاہرہ“ جیسی اصطلاح بھی ملتی ہے۔ ”تولیہ“ حق تقرر کو کہتے ہیں ، لیکن دور مالیک میں یہ حق صرف شام کے عاملوں کو حاصل تھا، مصر کے عاملوں کو نہیں۔ تقرر کے مختلف مدارج کے لیے حسب ذیل اصطلاحات ، کم از کم مالیک کے عہد میں ، ان عام اصطلاحات کے مقابلے میں زیادہ رائج تھیں : یئعہ ، عہد ، تقلید ، تفویض ، رسوم ، ترویج ، منشور۔ ان میں سے ہر اصطلاح کی ایک تاریخ ہے۔

(الف) یئعہ [رک بان] = خلیفہ کی اطاعت اور وفاداری کا حلف و اقرار۔ فاطمیوں کے عہد میں اسے خاص طور پر اہم سمجھا جاتا تھا ، چنانچہ دارالخلافت میں اس کی رودادیں ضبط تحریر میں لائی جاتی اور صوبوں میں بھیجی جاتی تھیں ، جہاں صوبے کا عامل رعایا سے بیعت (حلف وفاداری) لیتا تھا۔

(ب) عہد = عام معنوں میں اس کا مفہوم تھا معاہدہ ، لیکن یہاں خاص طور پر خلیفہ اور اس کے جانشین یا کسی سلطان کے مابین معاہدہ مراد لیا جاتا تھا۔ اسی طرح آگے چل کر اس سے سلطان اور اس کے جانشین یا سلطان اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے فرمانرواؤں کے مابین معاہدہ مراد لیا جانے لگا۔ الفلقشتندی نے ان سب کی صنف بندی تقرر ناموں کے طور پر کی ہے۔ اس کی حتمی رائے یہ ہے کہ پہلی دو قسم کے معاہدوں کا سراغ عہد نبویؐ تک پہنچتا ہے ، لیکن دوسری قسم کے معاہدوں کو وہ اوقاف صورتیں قرار دیتا ہے ، جو نورالدین کی وفات کے بعد ابویہوں کے تحت ظہور پذیر ہوئیں۔

(ج) عہد = سرکاری ملازمین کے تقرر ناموں

اسی طرح بڑی وضاحت سے کی ہے۔

الف۔ حسب ذیل عام اصطلاحات ہیں : کتاب ، وثیقہ ، حاکم ، سند ، حقیقہ ، سجل ، ظہیر۔ ”کتاب“ کی صراحت اکثر اوقات اسی قسم کے لاحقوں ساتھ کی جاتی ہے ، جیسے کتاب الإنشاء ، کتاب النکاح ، کتاب الطلاق ، کتاب الإعتاد وغیرہ۔ اس کا نسبتاً محدود مفہوم دوسروں کے ساتھ وابستہ کیا جاتا تھا ، لیکن فاطمی ”سجل“ کو اور اہل مغرب والے ”ظہیر“ کو ترجیح دیتے تھے۔

ب۔ شروع شروع میں سرکاری دستاویزات کو بھی محض کتب کہا جاتا تھا ، اگرچہ ابتدائی عہد میں کتب عامہ یا مطلقات اور کتب خاصہ میں امتیاز کیا جاتا تھا اور مضامین کی نوعیت کے اعتبار سے ان کی مزید تقسیم کتاب الایمان ، کتاب الاوقاف ، کتاب الملوک ، کتاب السجل ، وغیرہ میں کی جاتی تھی اور دوسروں کی تقسیم ان کے مافیہ کے مطابق کی جاتی تھی۔ چونکہ ”کتب“ کا لفظ ”سرکاری دستاویزات“ کے لیے استعمال کیا جاتا تھا اس لیے یہ بڑے وسیع مفہوم کا حامل ہو گیا۔ نتیجہ امور حکومت سے متعلق جن خطوط کا تبادلہ کیا جاتا تھا انہیں دور بنو عباس میں مکاتبات اور متعلقہ عملہ وزارت کو دیوان المکاتبات کہا جاتا تھا۔ مصر میں بنو فاطمہ ، آل ایوب اور مالیک کے دوران حکومت میں بھی اس کا استعمال عام تھا۔ ”رسائل“ اور ”دیوان الرسائل“ کی اصطلاحیں رائج تھیں۔ ”مراسلات“ اور ”ترسل“ کے الفاظ بھی استعمال ہوتے تھے ، لیکن بظاہر وہ زیادہ عام نہیں تھے۔ إنشاء اور منشآت کے الفاظ بھی استعمال ہوتے تھے ، چنانچہ عہد بنو عباس میں لوگ دیوان الإنشاء کے نام سے واقف ہو چکے تھے ، لیکن آگے چل کر ، بالخصوص فاطمین اور مالیک کے دور حکومت میں ، یہ عملہ وزارت کے لیے ایک عام اصطلاح بن گئی (قب شق ۶ ، سطور ذیل)۔

ج۔ تقرر نامے : ”ولایات“ = الفلقشتندی نے

شروع شروع میں یہ اصطلاح ہر ایک کے لیے (چنانچہ ابن فضل اللہ اور غالباً آل ایوب کا بھی اس سلسلے میں لام لیا جاسکتا ہے)، لیکن آگے چل کر صرف ادنیٰ درجے کے ملازموں کے لیے اور القاشندی کے یہاں کے مطابق ”مستعین“ کے چوتھے اور ادنیٰ ترین طبقے کے لیے استعمال ہونے لگی۔

(ح) منشور - ابتدائی صدیوں میں یہ ایک اجازت نامہ تھا جو مصری کسانوں میں اراضی ترک کرنے کے روز الزون رجعان کو روکنے کے لیے جاری کیا گیا تھا۔ بنو عباس کے عہد میں اس سے جاگیر کے عطیات مراد تھے۔ بنو فاطمہ کے عہد میں اسے ثلث کے بعض پرائیویٹوں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ سلاطین آل ایوب کے دور میں اس سے نسبتاً عام ثلث اور مالیک کے عہد حکومت میں بعض جاگیر کا عطیہ مراد لیا جانے لگا، جو حجم اور تحریر کے اعتبار سے مختلف ہوتا تھا۔ عبارت مختصر اور واضح ہوتی تھی۔ اس میں نہ تو کسی کی ہدایات (وصایا) ہوتی تھیں نہ سلطان کے دستخط، البتہ کبھی کبھی اس کی پیشانی پر ایک طرح کا طغریٰ بنا دیا جاتا تھا، د۔ عہد ناسی: اس سلسلے میں عہد، عقد اور میثاق کی اصطلاحات قدیم ترین دور، حتیٰ کہ قرآن مجید کے دور نزول میں بھی، ملتی ہیں اور ہر زمانے میں سروج رہی ہیں۔ عہد (رک بان) خاص طور پر سیاسی نوعیت کے لیے مستعمل تھا۔ عقد (رک بان) معاشرتی معاہدوں کے لیے استعمال ہوتا تھا، جس کی صراحت کے لیے اکثر مضامین الیہ لگا دیا جاتا تھا، مثلاً عقد النکاح، عقد الذمۃ، عقد الصلح۔ میثاق کا استعمال کم الزار آتا ہے۔ القاشندی نے اس اصطلاح کا ذکر نہیں کیا، البتہ ابن فضل اللہ کی التعریف میں توائبی اور موافقہ کا ذکر آیا ہے۔ القاشندی نے جنگ بندی کے معاہدے کے لیے ہڈۃ اور مہادۃ کی اصطلاحیں لکھی ہیں اور بنو عباس اور مالیک کے عہد کی مثالیں پیش کی

میں ایک اعلیٰ درجے کا پروانہ بھی ہوتا تھا، جیسے عہد کہتے تھے۔ اس کا تعلق اعلیٰ عہدیداروں کے تقرر سے ہوتا تھا۔ فاطمیوں کے بعد یہ سروج نہیں رہا: (د) تَقْلِید - یہ اصطلاح اعلیٰ عہدیداروں، مثلاً وزیروں اور قاضیوں کے لیے بکثرت مستعمل تھی، البتہ دور مالیک میں اس کا استعمال خاص الخاص اعلیٰ عہدیداروں کے لیے محدود ہو گیا (جن میں سے ایک کاتب البسر، یعنی پرائیویٹ سیکرٹری بھی تھا)۔

(ه) تَفْوِیض کا اطلاق قاضی القضاۃ پر ہوتا تھا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ اصطلاح صرف دور مالیک میں مستعمل تھی۔ ممکن ہے کہ اس کا استعمال شہاب الدین بن فضل اللہ (۹) نے شروع کیا ہو۔

(و) مَرَسُوم کی اصطلاح لوجی ملازمین کے لیے مستعمل تھی اور معلوم ہوتا ہے کہ اس کا رواج بھی صرف دور مالیک ہی میں رہا۔ شہاب الدین بن فضل اللہ کے نزدیک اس سے مراد وہ معمولی دستاویزات ہیں جن کا تقرر سے کوئی تعلق نہ تھا (ان میں سے اہم مرسوم پر تسمیہ لکھی ہوتی تھی اور کم اہم دستاویزات، مثلاً اجازت ناموں پر امر کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی تھی)، لیکن القاشندی نے اہم اور عام مراسیم میں یوں امتیاز کیا ہے کہ مکثرة معاملہ قلعہ اور اوسط درجے کا لوجی منصب رکھنے کے لیے اور مضمثرة ادنیٰ مناصب کے لیے مخصوص تھا۔ مؤخر الذکر کا استعمال عاذ ہی ملتا ہے (غالباً اس لیے کہ الہیں بالعموم منشور دیا جاتا تھا)۔

(ز) تَوْقِیع - شروع شروع میں تو اس سے فرمائروں کے دستخط مراد تھے، جو دیوان المکاتبات پر ثبت کیے جاتے تھے (اس کے برعکس علامۃ ایک قسم کا مٹولہ (molto) ہوتا تھا، جسے فرمائروں دستاویز کے لیے دستخطوں کی طرح اپنے قلم سے رقم کرنا تھا)۔ تَوْقِیع قلی القمص غالباً اس سے نکلا ہوگا۔ آگے چل کر تَوْقِیع کا لفظ پروانہ ثلث کے لیے بھی استعمال ہونے لگا۔

باشندوں کو) امن سے روکنے کی ضمانت دی جاتی تھی۔ آگے چل کر ان میں وہ مسلمان بھی شامل کر لیے گئے جن کی طرف سے حملے کا خطرہ لاحق رہتا تھا، اور بالخصوص وہ جو اطاعت سے منحرف ہو جاتے تھے تاکہ اگر ممکن ہو تو انہیں دوبارہ حلقہ اطاعت میں شامل کیا جاسکے۔ دیوان کا بیشتر کام اس قسم کی دستاویزات کو ضبط تحریر میں لانے تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ الفقهندی نے ہر دو قسم کی دستاویزات کا سراغ عہد نبویؐ میں لگانے کی کوشش کی ہے اور بنو امیہ، بنو عباس، بنو فاطمہ اور ممالیک کے ادوار حکومت سے ان کی مثالیں پیش کی ہیں۔ بعض دستاویزات میں مسلمان کی کسی عرضی کا حوالہ بھی ملتا ہے (مثلاً انک ذکر ت رغبتک)، لیکن باقی دستاویزات میں نہیں۔

بزرگ = فرمان، جس کا استعمال ترکوں نے وسیع پیمانے پر کیا اور یہ اصطلاح ممالیک کے دور میں سفیروں کی آمد و رفت کے باعث مصر تک پہنچ گئی؛ لیکن وہاں اس کے معنی محدود تھے اور اس سے صرف وہ اجازت نامے مراد آتے جو غیر ملکی سفیروں کو دیے جاتے تھے۔

اطلاعات: وہ دستاویزات تھیں جن میں سابقہ فرمانرواؤں کے فیصلوں کی از سر نو توثیق کی جاتی تھی؛ تاہم بعض اوقات انہیں محض توثیق کہا جاتا تھا۔ الفقهندی نے جن تین متنوں کا حوالہ دیا ہے ان میں مذہبیین کے اس اعلان کا اضافہ کر لینا چاہیے جو انہوں نے ۵۱۰ھ/۱۱۱۵ء میں کیا تھا تو (طبع Grohmann، در RSO، ص ۳۲، ۶۴۱)۔

ذنب: (یعنی گناہوں کو دفن کر دینا) کہا جاتا ہے کہ یہ اصطلاح زمانہ قبل از اسلام کے عربوں میں مستعمل تھی، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بعد ازاں متروک ہو گئی (غائب امان [رک باں] نے اس کی جگہ اے لی [رک بہ] ذنوب، ذنب)۔

ہیں۔ اس نے اس قاعدے پر خاص طور پر توجہ دی ہے جس کے مطابق حلف اٹھانا جاتا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ کچھ عرصے سے اس قسم کے معاہدوں کا رواج نہیں رہا۔ وہ مؤلفہ، مسئلہ، مقاضا اور مواضع کی اصطلاحات کا ذکر بھی کرتا ہے، لیکن غالباً یہ بہت کم مستعمل تھیں۔ اسی طرح کسی ایک فریق یا دواؤں فریقوں کی طرف سے کسی معاہدے کو کالعدم کردینے کے لیے فسخ اور مفسخہ کی اصطلاحات کا استعمال بکثرت ملتا ہے۔ مزید معلومات کے لیے رک بہ شروط۔

۱۔ زندہ تر تجارتی نوعیت کی دستاویزات: ان میں صرف جاگیروں کے عطیے (دیکھیے ج ۱)، مطور بالا) اور سالانہ محاصل کے تصفیے ہی نہیں بلکہ مسامحات اور ترخائیات بھی شامل ہیں۔ اول الذکر کا تعلق محاصل میں رعایت سے ہے اور غالباً ان کا اجراء ممالیک کے عہد ہی میں ہوا۔ انہیں عنان (بڑے) اور صغار (چھوٹے) میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، جو علی الترتیب سلطان اور عامل کی طرف سے جاری ہوتی تھیں۔ منسوخ شدہ محاصل کو مکتوبہ، چہات، مستحقہ، منکرات اور بواقی (واجب الادا محاصل کا بقایا) کہتے تھے۔ ان میں سے بعض تو تاجروں اور ان کے مال کے لیے جائز تصور ہوتے تھے اور بعض صرف مخصوص رقوم کے لیے۔ ترخائیات سے مراد وہ رعایات تھیں جن کی رو سے معدد ملازمین ریاست کو محاصل سے مستثنیٰ قرار دیا جاتا تھا اور بعض صورتوں میں ان کی معینہ تنخواہ (مستلوم) مقرر کر دی جاتی تھی۔ جہاں تک فوج کا تعلق ہے ان دستاویزات کو مستلوم کہا جاتا تھا اور باقی کو توفیق۔

۲۔ زیادہ تر فقهی (شرعی) نوعیت کی دستاویزات: ان کا اصطلاحی نام امان [رک باں] ہے۔ اس کی رو سے کسی پورے کے پورے قبیلے یا بعض افراد کو (بالخصوص دارالسلام میں رہنے والے غیر ملکی

صدق) ، تاہم مساوات کے انوار ، بقایا سہر کی ادائیگی کے وعدے اور طلاق کی صورت میں تمام دعاوی سے دست برداری وغیرہ کو بھی ویسا ہی اہم سمجھا جاتا تھا ۔

فتویٰ : اگرچہ مفتی میں بعض خصوصیات کا ہونا ضروری سمجھا جاتا تھا ، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ فتویٰ کی کوئی باضابطہ اور معین صورت موجود نہیں تھی۔ بہر حال فتاویٰ کے متعدد مجموعوں کے مطالعے سے ایک مروجہ صورت ضرور سامنے آتی ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ ان میں ایک خاص قسم کے اختصار اور ایجاز کو ملحوظ رکھا جاتا تھا ۔

وَقْفِیَّہ ، یعنی دستاویزِ وقف : اس کا سراغ بھی عہد نبوی میں ملتا ہے ۔ وکلاء نے اس کے مضمون اور طرز عبارت کے بارے میں قواعد و ضوابط مرتب کیے ہیں ۔ اس قسم کی تمام دستاویزات میں وَقْفِیَّہ (میں نے وقف کیا) ، حَبْسِیَّہ (میں نے وقف کیا) اور سَبَلِیَّہ (میں نے وقف کیا) کے الفاظ کے علاوہ اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ایسے نہ تو بیع کیا جا سکتا ہے نہ ہبہ اور نہ ترکے کے طور پر دیا جا سکتا ہے ۔ اس طرح کی عبارتیں ، اصل مسودوں کی صورت میں ، کتابوں میں اور پتھروں پر کھدی ہوئی محفوظ ہیں ۔ زیادہ تعداد میں اوقاف معاشی صورت حال پر مضر اثرات ڈالتے تھے ، لہذا حکومت نے اس کا حل یہ نکالا کہ انہیں وسیع پیمانے پر بحق سرکار ضبط کرنا شروع کر دیا ۔ زمانۂ حال میں بھی انہیں وزارت اوقاف کی لگرائی میں ضبط کر لیا جاتا ہے ۔

وَصِیَّہ ، یعنی آخری خواہش ، عہد نامہ ، میراث : فقہ میں اس کی جزئیات پوری تفصیل سے درج ہیں ۔ اس میں کسی طرح کی پابندی نہیں ، لیکن دو گواہوں کا ہونا ضروری ہے ۔

وصایا دینیہ : یہ مَرَّع عبارت کی طویل دستاویزات تھیں جنہیں اسلامی احکام و قوانین کی وضاحت کے لیے

تَفَالِیدِ حَکَمِیَّہ : یہ وقتاً فوقتاً قاضیوں کے لیے لکھی جاتی تھیں ۔ یہ تقرر یا تو اسناد کی صورت میں عمل میں لائے جاتے تھے یا محض مکاتبات کی صورت میں ۔ اِسْجَالَاتُ الْعَدَالَةِ ، گواہوں کی نیک چلی کے

صدائق نامے : یہ مخطوطات بردی کی صورت میں بھی ملتے ہیں اور بعد ازاں مالیہ کے دور تک بھی ۔ اس کے آخر میں قاضی اپنے ہاتھ سے عَلَامَہ ، تاریخ اور حَسْبَہ لکھتا تھا اور کاتب اس پر اپنی شہادت ثبت کرتے تھے ۔ التَّوْقِیْعُ عَلٰی الْقَبْضِ ، یعنی کھلی عدالت میں

پیش ہونے والی درخواستوں پر فیصلے : کہتے ہیں کہ ساسانیوں کے عہد میں بھی اس کا رواج تھا ۔ ظہور اسلام کے بعد بنو امیہ کے دور میں بھی یہ جاری رہا ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ہارون الرشید کے عہد میں حق توقیع یحییٰ البرمکی کو مستقل کر دیا گیا تھا ۔ والیان مصر بھی اس حق کو استعمال کرتے تھے ، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آل طولون کے بعد اس کا رواج ختم ہو گیا اور اس کی تجدید فاطمیوں کے عہد میں ہوئی ۔ فیصلہ فوری طور پر کر دیا جاتا تھا ، جسے ”صَاحِبُ الْقَلَمِ الرَّقِیْقِ“ عرضی کی پشت پر تحریر کر دینا تھا ۔ پھر سربراہ دیوان کی طرف سے ہدایت (تعمین) مل جانے کے بعد ”صَاحِبُ الْقَلَمِ الْجَلِیْلِ“ اس فیصلے کی پوری پوری تعمیل کرتا تھا ۔ فیصلے کا حق سربراہ دیوان الانشاء کو حاصل تھا ، حتیٰ کہ عہد مالیہ میں بھی یہی دستور رہا ۔ سلطان خود عدالت میں صدر نشین ہوتا تھا ۔ القلشنندی نے درخواست گزارنے کے چھ مختلف طریقے بیان کیے ہیں ۔ یہ توقیع اس قدر مقبول ہوئی کہ لوگ پیشہ کتابت کے لیے توقیع کی اصطلاح استعمال کرنے لگے اور خود کاتبوں کو مَوْقِعُونَ کہنے لگے ۔

عَقْدُ الْإِسْكَاحِ ، یعنی شادی کے معاہدے : یہ وہ قانونی دستاویزات تھیں جن میں معاشی تفصیلات کو خاص اہمیت حاصل تھی (حوادثُ الْمَرْمَسِ ، نُسْخَةُ

معروض تحریر میں آتی تھیں۔

۴۔ دستاویزات کا انتقال و اضعاف (=نقل نویسی):
اس میں کوئی سبب نہیں کہ عرب مسودے، اصل اور نقل (نسخہ) میں امتیاز کرتے تھے۔ ایک لائق نقل کرنے والا (ناسخ) ترقی کر کے منشی کے درجے تک پہنچ سکتا تھا (الصولی، ص ۱۱۸)۔ ابن الصیرفی (ص ۱۴۲) لکھتا ہے کہ نسخہ تیار کرنے کا پیشہ اہم ہوتا تھا۔ اس نے مَبِیض (=صاف نسخہ لکھنے والا) کا بھی ذکر کیا ہے۔ نقول پر تَبْخ یا تَبْخْت (=لکھا گیا ہے) اور اصل کی طرح ان کی تصدیق بھی ”صَح“ کے قلم سے ہو سکتی تھی۔ ان نسخوں کو محفوظ کر لیا جاتا تھا اور انشاء کے بعض مجموعے اور منتخبات غالباً انہیں مسودوں اور نسخوں کے مجموعوں سے مرتب کیے گئے ہیں۔

کتب تاریخ میں مسودات کی نقول کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ محمد حمید اللہ نے کم از کم ۶۶۹ ایسی دستاویزات جمع کی ہیں جو ۶۵۲ء سے قبل کے زمانے کی ہیں (Documents sur la diplomatie musulmane à l'époque du Prophète et des khalifes Corpus des traités et lettres : Suivi de : orthodoxes diplomatiques de l'Islam، پیرس ۱۹۳۵ء؛ نیز عربی میں: الوثائق السياسية في العهد النبوي والخلافة الراشدة) ۱۔ لیکن اس امر کا ان دستاویزات کے مستند ہونے کے حل طلب مسئلے سے کوئی تعلق نہیں۔

۵۔ محافظ خانے: قدیم مشرق اور یونانی مصر میں بھی اصل اور نسخوں کو محافظ خانوں میں حفاظت سے رکھنے کا رواج تھا، لہذا یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ عرب بھی قدیم زمانے ہی میں اس دستور سے واقف تھے؛ چنانچہ بعض مخطوطات بردی کی پشت پر ان کا مختصر خلاصہ ملتا ہے تاکہ ہمسولت انہیں جمع کیا جا سکے اور ان کا حوالہ تلاش کرنے میں زحمت نہ ہو؛ لیکن وہاں کسی مرکزی محافظ خانے کی موجودگی

میں سے پڑھ کر سنایا جاتا تھا۔ فاطمیوں کے زوال کے بعد جب مسلک اہل السنة و الجماعت کا احباب ہوا تو ان کی اہمیت خاص طور پر بڑھ گئی؛ علاوہ ازیں المغرب میں بھی ان کی موجودگی کا پتا چلتا ہے۔

۶۔ یمن (قسم): بیعت لینے کی رسم میں حلف کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور ایمان البیعة کو جسے الحجاج نے رواج دیا، بالخصوص بہت محفوظ سمجھا جاتا تھا۔ فاطمیوں نے خاص طور پر، اس امر کے پیش نظر کہ ان کی رعایا ایک مختلف مذہب سے تعلق رکھتی تھی، ان قسموں کو بڑے منظم طریق سے وسعت دی۔ زمانہ مابعد میں بھی جب [دو فریق] کوئی معاہدہ کرتے تھے، یا کوئی شخص کسی منصب پر فائز ہوتا تھا، یا کوئی پیشہ اختیار کرتا تھا تو حلف اٹھانے کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔

۷۔ عمرہ: یہ وہ دستاویزات ہیں جو ان زائرین بیت اللہ کے لیے جو وہاں عمرہ ادا کرتے تھے تیار کی جاتی تھیں؛ لیکن یہ بہت شاذ ملتی ہیں۔

۸۔ اجازات: علماء اور مصنفین کی طرف سے بسا اوقات جاری ہوتی تھیں، مثلاً فتی، تدریس، روایت۔ اکثر و بیشتر یہ بڑی تقیطع کے قرعۃ الشاسی کی صورت میں ہوتی تھیں۔ ملاحظیات: یہ فاطمیوں کی طرف سے اس وقت ارسال کی جاتی تھیں جب کسی صوبے کا عامل اپنا منصب سنبھالتا تھا یا کسی کو اعزاز (خلعة، تشاریف) عطا کیا جاتا تھا۔ نامہ تقرر یا تحائف کے ساتھ جو خطوط بھیجے جاتے تھے ان کے لیے بھی ملاحظیات کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔

۹۔ تذکرة: یہ وہ فرامین تھے جو اعلیٰ عہدیداروں، سفیروں اور قلعوں کے کمانداروں کے نام صادر کیے جاتے تھے۔ ان کا تعلق زیادہ تر آمدنی اور اخراجات سے ہوتا تھا۔

۱۰۔ تقریظ: اس کے ذریعے کتابوں یا منظومات (کے مطالعے) کی سفارش کی جاتی تھی؛ یہ کبھی کبھی

کا سراغ نہیں ملتا، جیسا کہ یونانی عہد میں ملتا ہے۔ ۱۹۲۰ء میں بارٹولڈ Barthold نے اس موضوع پر قلم اٹھایا تھا کہ اسلامی مشرق میں دستاویزات کو محفوظ رکھنے کی کیا صورت تھی (Arabic Manuscripts) ج ۱، بیٹروگراف ۱۹۲۰ء: دیکھیے Islamica، ۱۳۵: ۴۔ شاید یہ قیاس قابل قبول ہو کہ ہارون الرشید اور اس کے بیٹوں، امین اور مأمون کے مابین ۸۱۸ء/۸۰۲ء میں معاہدے کی جو دستاویزات لکھی گئی تھیں وہ خانہ کعبہ میں لٹکانے کے لیے مکہ معظمہ بھیج دی گئی تھیں اور یوں گویا انہیں اس مقدس مقام پر رکھ کر ایک طرح کے محافظ خانے کے اندر محفوظ کر دیا گیا تھا؟ [گو حقیقت یہ ہے کہ اس میں دستاویز کی اہمیت کو اس کی حفاظت کے مقابلے میں زیادہ اہمیت حاصل تھی۔] عہد فاطمیوں میں باقاعدہ محافظ خانہ ہوتا تھا اور ابن الصیرفی (قانون، ص ۱۴۲) مہتمم محافظ خانہ کے لیے خازن [رکبان] کی اصطلاح استعمال کرتا اور اس کی اہمیت پر زور دیتا ہے۔ اس نے بغداد کے محافظ خانے الخزانة العظمیٰ کی تعریف کی ہے اور اسے ایک مثالی نمونہ قرار دیا ہے۔ خازن کا فرض منصبی یہ تھا کہ آنے والی دستاویزات کے اصل نسخوں اور باہر جانے والی دستاویزات کی نقول کو ماحفہ ترتیب کے ساتھ عائدہ علیہ مسلوں میں ان پر عنوانات لکھ کر مرتب کرے (امبارة یکتب علیہا بطاقت)۔ عہد ممالیک میں اس دستور میں کسی حد تک کمی آگئی اور ایسے بھی دور آئے جب کاتب السیر کے دوا دار کو خازن کے فرائض سرانجام دینے کے لیے کافی سمجھ لیا گیا۔ ۶۔ دیوان: (الف) یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کوئی دیوان قائم کیا تھا جہاں فرمانروایان عالم کے نام آپ کے شہرہ آفاق مکتوبات معرض تحریر میں آئے، البتہ ہمارے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتبوں کی مکمل فہرست موجود ہے، جس میں

خلفائے راشدین کے اسمائے گرامی بھی شامل ہیں۔ ایک روایت کی رو سے بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس قسم کا پہلا محکمہ قائم کیا اور اسے دیوان [رکبان] کا نام دیا۔ اس لفظ کا تعلق قدیم فارسی دیوان بلکہ آشوری دپ dep سے قائم کیا جاسکتا ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ایرانی انتظامیہ کے ساتھ کسی حد تک اس کی مماثلت موجود ہے؛ تاہم معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوان مالی اور فوجی امور کے لیے قائم کیا گیا تھا اور صحیح معنوں میں اسے دیوان حکومت قرار نہیں دیا جاسکتا۔

(ب) دور بنو امیہ میں عربی زبان کو سرکاری زبان کا وہ درجہ مل گیا جو قبل ازیں بلاد مشرق میں فارسی اور بلاد مغرب میں یونانی کو حاصل تھا۔ مشرق میں الحجاج اور مغرب میں عبدالملک نے تعویل الديوان إلى العربیة پر عملدرآمد شروع کر دیا۔ ۸۲۳ء میں ذی الجہاد [رکبان] کے قریب جنگ میں تمام دیوانوں کا جل کر خاکستر ہو جانا یقیناً ایک تباہ کن حادثہ تھا۔ اس کے علاوہ ہمیں اموی دیوانوں کے متعلق بہت کم معلومات حاصل ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اسیر معاویہؓ کے زمانے میں جب ایک بار مجلس سازی کی کوشش کی گئی تو دستاویزات پر مہرین لگانے کا ایک خاص شعبہ دیوان الخاتم قائم کر دیا گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ولید بن عبدالملک نے بعض اختراعات کیں، چنانچہ بردی کاغذ نسبتاً بہتر تیار ہونے لگا اور خط زیادہ خوشنما ہو گیا؛ تاہم حضرت عمر بن عبدالعزیز نے دیگر امور کی طرح اس سلسلے میں بھی متقدمین ہی کی پیروی کو روا رکھا۔ کہا جاتا ہے کہ بنو امیہ ہی کے دور حکومت میں التوقيع علی القصص، یعنی کھلی عدالت میں خلیفہ کے مقدمات سننے اور فیصلے صادر کرنے کا دستور شروع ہوا۔ ان موقعوں پر خطاط خلیفہ کے فیصلوں کو ضبط تحریر میں لا کر محفوظ کر لیتے تھے۔ عبدالحمید بن یحییٰ [رکبان] اموی دور کا

وَحْتَمَتْ بَابِن الْعَمِيد (مکتوب نویسی عبدالحمید سے شروع ہوئی اور ابن الحمید پر ختم ہوئی)۔ آخر عہد عباسیہ کے دیوان الرسائل کے نظام کار کے بارے میں بہت کم معلومات ملتی ہیں۔ اس کے باوجود مصر اور دوسرے ملکوں کے دیوالوں میں اسی طریق کی پیروی کی گئی۔

(د) مصر میں دیوان : بردیات قدیم ترین عہد کے اصل مآخذ ہیں، اور گروہمان Grohmann نے *From the World of Arabic papyri* ص ۳۳۱-۳۳۲ میں انہیں کی بنا پر صوبوں کے نظم و نسق کو بیان کرنے کی کوشش کی۔ اس میں شک نہیں کہ اس وقت مصر میں کوئی سرکاری دیوان موجود نہیں تھا، البتہ صوبوں کے لیے ایک دیوان قائم تھا، جس کا کام دارالخلافہ کے ساتھ تبادلہ مراسلات تھا۔ اتفاق سے فاتح مصر حضرت عمرو بن العاص (م نواح ۵۶۳/۵۶۲ء) کی ایک مسہر کا نقش محفوظ رہ گیا ہے اور قرۃ بن شریک (م ۵۹۶/۵۹۷ء) کے متعدد مکتوبات بھی مل گئے ہیں جن سے دیوان کا سا اندوب جھلکتا ہے۔

۵۸۵/۵۸۴ء میں جب احمد بن طولون خود مختار ہوا تو نظم و نسق کی عام ترقی کے سلسلے میں اس نے بغداد کے نمونے کا ایک دیوان الانشاء قائم کیا۔ اس کا پہلا مہتمم ابن عبد کان تھا۔ اس کی بعض دستاویزات نے خاصی شہرت پائی۔ ابن الدایہ (م ۵۳۰/۵۲۹ء) اور عبدالحمید بن یحییٰ کی نسل سے تعلق رکھنے والے خالوادہ بنو المهاجر کے چار بھائی اس کے دوسرے کاتب تھے۔

مصر اور کسی غیر اسلامی ملک کے درمیان مراسلات کے تبادلے کے بارے میں پہلا بیان آل إخشید کے زمانے سے تعلق رکھتا ہے، یعنی جب محمد بن طنج (۳۲۳/۳۲۵ء تا ۳۲۵/۳۲۶ء) نے بوزنطی شریک شہنشاہ رومانوس Romanus اول کو خط لکھنے کا ارادہ کیا تو اس نے کئی کاتبوں کو اپنا اپنا مسودہ پیش

مشہور ترین خطاط تھا اور سلیمان کے عہد خلافت سے اس خاندان کے خاتمے تک سرگرم کار رہا۔ پتا چلتا ہے کہ اس نے فن خطاطی کی ضرورت میں ہیبت اور مافیہ دونوں کے اعتبار سے اضافہ کیا؛ لیکن جو نگارشات اس سے منسوب کی جاتی ہیں وہ سب کی سب مستند قرار نہیں دی جا سکتیں۔

(ج) عہد بنو عباس کے دیوان : معلوم ہوتا ہے کہ بنو عباس نے اموی نظم و نسق کی بہت سی باتوں کو اختیار نہیں کیا تھا۔ انہوں نے بالکل نیا نظام رائج کیا، جس میں ایرانی اثرات، جو عہد بنو امیہ میں دیے دیے تھے، پوری طرح منظر عام پر آ گئے۔ ”کاتب“ کو وزیر کہنے لگے اور دیوان حکومت کو دیوان الرسائل یا دیوان الانشاء۔ اس کی تنظیم اور طریق کار کے بارے میں ہمیں بہت کم بیانات (بالخصوص ابن عبدوس الجہشیری اور المقریزی کے) ملتے ہیں۔ بعض نئی باتیں ایسا کہ سے منسوب کی جاتی ہیں، مثلاً بیان کیا جاتا ہے کہ خالد بن برمک نے طومار (= صُفْ مَدْرَجَة) کے بجائے چرمی بھی کھاتوں (= دُفَاتِر مِنَ الْجَنُود) کو رواج دیا اور یحییٰ بن خالد نے جسے ایک روایت کی رو سے ہارون الرشید نے توفیق القصص کا حق عطا کر دیا تھا، مسئلہ کو وسعت دے کر اس میں تَصْلِيَة بھی شامل کر دیا۔ جعفر بن یحییٰ کی توفیقات کے نسخے لکھے اور جمع کیے گئے اور ان کا مطالعہ تبحر و علیت کے لمونوں کے طور پر کیا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ العہدی نے یہ حکم دیا تھا کہ کاتبوں کو ہر جمعرات کی تعطیل ہوگی۔ المستنصر کے عہد تک یہ حکم برقرار رہا، پھر اس روز بھی کلوار جاری رہنے لگا۔ دُور بنی عباس کے مشہور کاتب اور وزیر حسب ذیل تھے : ابن مقلہ (م ۳۲۸/۳۲۷ء)، ابن العمید (م ۳۶۰/۳۵۹ء) اور ابو اسحق الصابی (م ۳۸۸/۳۸۷ء)۔ بہت سی اختراعات کا سراغ انہیں افراد تک لگایا جاسکتا ہے۔ لوگ مندرجہ ذیل فقرے کو نقل کیا کرتے تھے : فَتَحَتِ الرِّسَالُ بَعْدَ الْحَمِيدِ

کرنے کا حکم دیا اور تجربی کا مسودہ پسند کیا ،
فاطمی دیوان کے بارے میں نسبتہ زیادہ معلومات
ملتی ہیں، جس کے لیے ہم ابن الصبغی کے مرہون منت
ہیں۔ اس کی تصنیف قانون دیوان الرسائل عملاً دیوان
پر ایک رسالہ ہے اور وہ وزیر الفضل (۸۸۷ تا ۸۵۱ھ /
۱۰۹۳ تا ۱۱۲۱ء) کے نام معنون ہے۔ ایک دیباچے
کے بعد اس کتاب میں جو سندرجات آئے ہیں انہیں
ایک دیوان کا دستور العمل کہا جا سکتا ہے۔ اگر
حقیقتہً اسے جامعہ عمل پہنایا بھی گیا ہو تو مندرجہ ذیل
سوالات کے جواب نہیں ملتے: اس سے پہلے دیوان کی کیا
شکل و صورت تھی؟ اپنی تجاویز مرتب کرنے وقت اس کے
پیش نظر کون سا نمونہ تھا؟ کیا یہ خود اس کے غور و فکر
کا نتیجہ تھیں یا بغداد اور بوزنطیہ سے ماخوذ تھیں؟
ابن الصبغی سے ہمیں ان سرکاری ملازمین کے فرائض
کی بہت سی تفصیلات کا پتا چلتا ہے جو دیوان میں
ملازم تھے اور جسے وہ دیوان الرسائل، نیز دیوان
المکاتبات اور (ابنی مؤخر تصنیف الإشارة إلى من نال
رتبة الوزارة میں) دیوان الإنشاء لکھتا ہے۔ اس نے اہلکاروں
کی بارہ مختلف اقسام بیان کی ہیں: (۱) مہتمم (رئیس،
ستوئی، صاحب)؛ (۲) ایک کاتب یا ذبیر فرمانرواؤں
کو مکتوبات لکھنے (مکاتبات السلوک) کے لیے؛ (۳)
شکایات کا فیصلہ کرنے کے لیے (التوقيعات في وقاع
المظالم)، جس کے ماتحت دو کاتب ہوتے تھے
(صاحب القلم الدقیق اور صاحب القلم الجلیل)؛ (۴)
ایک کاتب نامزد گیوں اور سرکاری اعلانات (إنشاءات
کے لیے؛ (۵) ایک کاتب ملک کے اہم افراد
خصوصاً صوبوں کے عاملوں کو مراسلات لکھنے
کے لیے؛ (۶) ایک کاتب عطائے خلعت و خطاب
(منائبین) کے لیے؛ (۷) ایک مبیض؛ (۸) ایک نقل نویس
یا نسخ؛ (۹) ایک تذاکر، یعنی نمونوں کے مجلد متون
کا محافظ؛ (۱۰) ایک خازن، یعنی مہتمم محافظ خانہ؛
(۱۱) ایک حاجب یا محافظ؛ (۱۲) ایک مترجم، جس

سے صرف ضرورت کے وقت ہی مشورہ طلب کیا جاتا تھا۔
اس اعتبار سے دیوان کے شعبے حسب ذیل تھے: سرکاری
دستاویزات، تقررات، مقدمات کے فیصلے اور کبھی
کبھی لکھی جانے والی دستاویزات، مثلاً اہم واقعات
کے اعلانات (الکتب في العواید الکبار والمہیات)،
اجازت نامے (أمانات)، قسموں اور حلفوں کے متون
(کتب الأیمان و القسمات)، وغیرہ۔
ہمیں ایسا کوئی خاص متن نہیں ملتا جس سے
سلاطین آل ایوب کے عہد کے دیوان الرسائل کے بارے
میں معلومات حاصل ہو سکیں، لیکن چند تفصیلات
رسائل القاضي الفاضل میں اور ابن مہامی، النابلسی اور
ابن شیبہ کے ہاں مل جاتی ہیں۔ القاضي الفاضل نے بتایا
ہے کہ اسے دیوان الإنشاء میں بڑے سخت امتحان کے
بعد داخلہ ملا تھا۔ اس نے دیوان میں گروہ بندیوں
اور سازشوں کا حال لکھا ہے۔ ابن شیبہ نے صوبہ
شام کی صورت حال کا ذکر کیا ہے اور دستاویزات کے
اسلوب پر خاص توجہ دی ہے۔ مرسل کے ”ترجمہ“ کا
مفصل بیان ملتا ہے: دُعا، نعوذ اور عنوان کے علاوہ
دیگر دیوانوں کے ساتھ شرکت کار کا ذکر بھی تفصیل
سے کیا گیا ہے۔

ہمارے مفصل ترین ماخذ کا آغاز عہد ممالیک سے
یعنی شہاب الدین بن فضل اللہ (م ۷۴۹ھ / ۱۳۴۸ء -
۷۴۹ھ / ۱۳۴۸ء) : التعریف بالمصطاح الشریف (تین شرحوں،
تقیف، عرف اور لطائف کے ساتھ) سے ہوتا ہے۔ اس
سلسلے میں الفلکشندی (م ۸۲۱ھ / ۱۴۱۸ء) کا جلیل القدر
دائرة معارف صبح الاعشی (مع مختصر ضوء الصبح) بہت
مستاز ہے۔ عہد ممالیک کے اواخر کی تصنیفات میں سے
ہمارے پاس دیوان الإنشاء کا مخطوطہ پیرس اور خلیل
الظاہری (م ۸۷۲ھ / ۱۴۶۸ء) کی زبدة کشف الممالیک
موجود ہے۔ الفلکشندی کو بالخصوص اس لیے بنیادی
ماخذ قرار دیا جانا چاہیے کہ اس نے خاصی تاریخی
تحقیق کے بعد ابتدائی ارتقاء کا جائزہ پیش کیا ہے،

معلومات بہت مختصر ہیں۔ یہاں اصطلاح ظہیر کا اطلاق عام طور پر تمام دستاویزات پر کیا جاتا تھا۔ ابن الخطیب (م - ۵۷۶ھ/۱۱۸۳ء) نے اپنی تصنیف ربحانۃ الکتاب کے باعث شہرت پائی، جس کا الفقه شندی نے کثرت سے حوالہ دیا ہے، دیکھیے نیچے فصل ۱۰۲۔

۲۔ دستاویزات کی اہمیت بطور شہادت: فقہ اسلامی کی رو سے صرف وہی ثبوت قابل قبول ہے جو گواہوں کے ذریعے پیش کیا جائے اور محض تحریری شہادت کو اصولی طور پر رد کر دیا جاتا ہے۔ بہر حال جہاں تک قانون کے عملی اطلاق کا تعلق ہے دستاویزات کو بہت اہمیت حاصل رہی۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ عرب میں زمانہ قبل از اسلام میں بھی معاہدے لکھے جاتے تھے۔ بلاد مشرق میں مہر یا خاتم کا سراغ بہت قدیم زمانے سے ملتا ہے اور اسے عربی دستاویزات میں توثیق کا ایک اہم ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ یورپ کی طرح یہاں دستخطوں نے مہر کی جگہ لہیں لی بلکہ یہاں دستاویز پر دستخط ثبت ہونے کی صورت میں بھی اسے اس وقت تک مستند نہیں سمجھا جاتا تھا جب تک اس پر مہر نہ لگی ہو۔ کہا جاتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک چاندی کی مہر تھی، جس پر کلمہ ”محمد رسول اللہ“ کندہ تھا۔ قدیم ترین محفوظ مہر حضرت عمرو بن العاصؓ کی ہے۔

۳۔ دستاویزات کا ارتقاء: عربی دستاویزات میں عرشدائیں (قصص) اور ابتدائی امور بھی ملتے ہیں۔ عرشدائیں ظاہر ہیں کہ فیصلوں یا توقعات سے مقدم ہوتی تھیں کیونکہ انہیں کی بنا پر فیصلے صادر کیے جاتے تھے۔ توقع کا اصل متن بالعموم مختصر ہوتا تھا اور اس میں صرف مطالب کی بات کہی جاتی تھی؛ چنانچہ اس میں قصص کا ذکر مشکل ہی سے ہو سکتا تھا۔ اسی طرح فتویٰ بھی کسی تفتیش کے بعد ہی دیا جاتا تھا اور اس میں صورت حال کو کم و بیش صراحت

لہذا اس کی تصنیف کو عربی دستاویز کا پیش رو سمجھنا چاہیے۔ دیوان الانشاء کے رئیسوں میں بنو عبدالظاہر اور بنو فضل اللہ کے خاندانوں نے بڑی شہرت پائی اور ان کے مراتب برابر بلند ہوتے رہے۔ کاتب السرا کا لقب قلاوون کے عہد میں سروج ہوا اور ناصر محمد بن قلاوون کے دور حکومت میں رئیس دیوان الانشاء کو توفیق علی القصص کا منصب اور وزیر پر تقدم حاصل ہو گیا۔ اس عہدے کی اہمیت بڑھ جانے سے ملازمین کی تعداد میں بھی اضافہ ہو گیا۔ اعلیٰ درجے کے عہدے داروں کے لیے کاتب التست اور ادنیٰ درجے کے عہدیداروں کے لیے کاتب الدرّج کے لقب استعمال ہونے لگے۔ اگرچہ ان کی تعداد تو بڑھ گئی لیکن عوام کی نظروں میں ان کی توقیر گھٹ گئی۔ رئیس دیوان آہستہ آہستہ سرکاری ڈاک اور اخبار رسانی کے انتظام کو اپنے تحت اختیار لانے میں کامیاب ہو گیا۔

فرائض و اختیارات کی حدود یہاں بھی وہی تھیں جو فاطمیوں کے دور میں تھیں، لیکن ان میں وسعت اور امتیاز پیدا ہو گیا۔ اس زمانے میں دنیا کے تمام معنومہ حضوں کے ساتھ روابط پیدا ہونے کے باعث غیر ملکی خط و کتابت میں بالخصوص بہت زیادہ اضافہ ہو گیا۔ غیر ملکی زبانوں اور ترجمانوں کو اہمیت حاصل ہوئی۔ جون جون مراتب، القاب اور خطابات میں اضافہ ہوا، صوبوں کے ساتھ تبادلہ مراسلات میں پیچیدگیاں پیدا ہوتی چلی گئیں۔ عہدوں (یا ولایات) کی تعداد بھی بڑھی اور وہ مزید تحریری کام کا تقاضا کرنے لگے؛ چنانچہ اب عہدے داروں کے پانچ مختلف مراتب قائم ہو گئے (دیکھیے سطور بالا، ج ۲)۔ تمام وقتی دستاویزات مثلاً معاہدوں، اسانتوں، قسموں اور معافی کے اعلانوں وغیرہ کی طرح توقعات القصص بھی جاری رہیں۔

۴۔ مصر کے مقابلے میں دیگر عرب ممالک، مثلاً المغرب اور الاندلس کے دیوانوں کے بارے میں ہماری

تھا جس پر ہر قسم کی دستاویزات کی ذمہ داری ہوتی تھی (دیکھیے ابن الصیرفی، ص ۱۳۳، بعد)۔ اس بات کی وضاحت کہیں نہیں ملی کہ یہ صاف نسخہ فرمانروا کے سامنے پڑھ کر سنایا جاتا تھا، یا ان کے حوالے کر دیا جاتا تھا۔

۱۰۔ شفیع اور شاہد: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت دین اسلام میں مشہور ہے، مگر شفاعت کا لفظ غیر دینی نوعیت کی سفارش پر بھی استعمال ہوتا ہے، مثلاً فرمانروا کی خدمت میں عرضداشت پیش کرنے یا کسی مقروض کی ضمانت دینے وقت۔ القلقشنندی (۹: ۱۲۴) نے ابتدائی اور مؤخر زمانے کے متون کے نمونے دیے ہیں اور ایک ”امان“ نقل کیا ہے (۱۳: ۳۲۸) جس میں شفیع کا حوالہ ان الفاظ میں آیا ہے: **إِنَّ مُحَمَّدَ ابْنِ الْمُسَيَّبِ سَلَّ فِي أَمْرِكُمْ وَذَكَرَ رَغَبَتِكُمْ فِي الْخِدْمَةِ**۔ (=محمد بن المسیب نے تمہارے بارے میں سوال کیا اور خدمت کے لیے تمہاری رغبت کا ذکر کیا)۔

۱۱۔ کاتبوں کے لیے نمونہ دستاویزات: یورپ میں رومہ قدیم کے زمانے سے قرون وسطیٰ کے آخر تک ہمیشہ دستاویزات کے لیے ایک معین قسم کی عبارت استعمال ہوتی رہی۔ پہلی صدی کی بعض عربی بردیات ملتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ مراسلات اور دستاویزات ایک خاص طرز و عبارت میں لکھے جاتے تھے: اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ان کے بعض نمونے رائج تھے، اگرچہ اب وہ محفوظ نہیں رہے۔ بعد کے زمانے کی عربی خطوط نویسی جیسے النساء کہا جاتا ہے، ادب کی ایک جداگانہ صنف ہے۔ اس میں تین اقسام متمیز کی جا سکتی ہیں: (۱) نمونوں کے مجموعے؛ (۲) طرز بیان اور تحریری دستاویزات کے متعلق رسائل جو یورپ کی artes یا summae dictaminis سے مشابہ ہیں؛ (۳) دونوں کا مرکب، یعنی اصول مع نظری شرحوں کے، یا نظری رسائل مع عملی مثالوں کے۔ یہ ان رسالوں سے ملتے جلتے ہیں جو یورپ میں بارہویں صدی

کے ساتھ معین الفاظ میں بیان کیا جاتا تھا اور نام معذوف ہوتے تھے۔ معاہدے طویل گفت و شنید کے بعد ضبط تحریر میں آتے تھے، لیکن معاہدے کے اصل متن میں ان مبادیات کا ذکر نہیں ہوتا تھا۔

۹۔ طریق کار، توثیق اور مدارج توثیق: یورپی دستاویزات کے جو نو مدارج توثیق میں معلوم ہیں، عربی دستاویزات میں ان میں سے ابھی تک صرف چند ایک کا سراغ ملا ہے۔ ابن الصیرفی (ص ۱۰۸، بعد) نے نظر ثانی اور درستی کے لیے مقابلہ اور اصلاح کی اصطلاحات کا ذکر کیا ہے۔ فرمانروا کے ساتھ مشورے کے دوران میں رئیس دیوان جواب میں لکھے جانے والے صرف بنیادی نکات کی طرف اشارہ کر دیتا تھا، لیکن اصل جواب متعلقہ کاتب (سیکرٹری) تحریر کرتا تھا۔ اس کے بعد وہ اس جواب کا مقابلہ خلاصے کے ساتھ کرتا: اگر ضرورت محسوس ہوتی تو فروگذاشتوں اور فیصلوں کی اصلاح کرتا (ایک خاص اصلاح دینے والے: تصفیح کا ذکر بھی ملتا ہے) اور پھر مکمل جواب فرمانروا کی خدمت میں دستخط کے لیے پیش ہوتا، جو اپنے دستخط (علامہ) ثبت کر دیتا۔ پتا (عنوان) ہمیشہ رئیس دیوان ہی لکھتا تھا، جو اس بات کا واضح ثبوت ہوتا کہ وہ مضمون سے واقف اور اس کی ذمہ داری قبول کرتا ہے۔ اور اس پر عملدرآمد کرانے کے لیے دستاویز ”تعمین“ کی تقاضی ہوتی تھی، یعنی اسے عملی جامہ پہنانے کی ذمہ داری کس پر عائد ہوگی۔ اس کا خلاصہ قصہ کی پشت پر درج کیا جاتا تھا! یہ تعین رئیس دیوان اپنے ہاتھ سے رقم کرتا تھا۔ جس کاتب کو فیصلے پر عمل درآمد کرانے کا حکم دیا جاتا تھا، اس کے مرتبے کے مطابق مختلف کلمات وغیرہ استعمال کیے جاتے تھے، مثلاً **يُكْتَبُ بِذَا لِكَ** یا **يُكْتَبُ بِذَا لِكَ** (=یہ لکھا جانا چاہیے) (دیکھیے القلقشنندی، ۶: ۲۱۰)۔ ظاہر ہے کہ صاف نسخے کی نفاست اور صفائی پر یہ حد توجہ صرف کی جاتی تھی اور اس کام کے لیے فاطمیوں نے ایک خاص میض مقرر کر رکھا

برڈبات کے بارے میں تب Chrestomathie : Grohmann ص ۳۵

۱۳۔ دستاویزات کی زبان : اگرچہ قرون وسطیٰ میں لاطینی زبان کے ارتقاء پر بڑا سیر حاصل تحقیقی کام ہوا ہے، لیکن اس کے مقابلے میں کلاسیکی قرون وسطیٰ کی زبان سے لے کر موجودہ ادبی زبان تک عربی کے ارتقاء کا محض ایک عمومی سا خاکہ ہمارے سامنے آیا ہے (رک بہ عربیہ)۔ دستاویزات کی تحویل کے سلسلے میں یہ ارتقاء بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی ایک مخصوص شاخ ثرمقی یا تسع ہے، جس پر زکی مبارک کے رسائل (La prose arabe au 4^e siècle de l'hégire، مقالہ تحقیقی، پیرس ۱۹۳۱ء) کے علاوہ دیکھیے عربی میں النثر الفنی فی القرن الرابع، ۲ جلد، ۱۳۵۲ء

۱۹۳۳-۱۹۳۴ء) شاہد ہیں۔ دوسری اصناف کی طرح دستاویزات میں سجع اپنے نقطہ کمال پر دورمابلیک میں پہنچی۔ دستاویزات کی زبان میں جو عامیانہ اور بازاری الفاظ ملتے ہیں ان سے ایک نیا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ اس طرح کی زبان کا سراغ مخطوطات پیرس میں بھی ملتا ہے اور اسی وجہ سے آگے چل کر کاتب بار بار غلطیوں کا ارتکاب کرتے رہے۔ الصولی (ص ۱۲۹) اور الفلشدی (۱ : ۱۳۸) بعد کے ہاں اس کا ذکر تفصیل سے آیا ہے۔

۱۴۔ تاریخ : یورپ کی طرح [عربی میں بھی] تاریخ کے سلسلے میں گوناگوں مسائل ہمارے سامنے آتے ہیں۔ عام ہجری تاریخیں بھی متعدد امکانات کی حامل ہیں، مثال کے طور پر راتوں اور دنوں، تہوار کے دنوں اور مہینے کے مختلف حصوں وغیرہ کی رو سے تاریخیں ڈالنا، لیکن الفلشدی (۶ : ۲۳۳) بعد نے کم از کم آئیس قدیم تقویموں اور ایک نئی تقویم، یعنی یزد جرد کی تقویم، کا ذکر کیا ہے، ان میں سے بیشتر کی اہمیت زیادہ نہیں۔ صرف عیسوی اور قبطی سن کثرت سے آتے ہیں۔ ایک خاص مشکل محاصل کے

کے بعد سے ملتے ہیں۔ متعدد (پچاس سے زیادہ) عربی کتب انشاء میں سے اہم ترین غالباً حسب ذیل ہیں : الصولی (م ۸۳۳/۹۹۶ء) : آدب الکتاب (قسم دوم)؛ ابوالبحر الصابی (م ۸۳۸/۹۹۹ء) : رسائل (قسم اول)؛ ابن الصیری (م ۵۴۲/۱۱۴۷ء) : قانون دیوان الرسائل (قسم دوم)؛ القاضي الفاضل (م ۹۵۶/۱۲۰۰ء) : رسائل (قسم اول)؛ شہاب الدین بن فضل اللہ (م ۷۹۰/۱۳۸۸ء) : التتیریف بالمصطلح الشریف (قسم سوم)؛ الفلشدی (م ۸۲۱/۱۴۱۸ء) : صبح الاعشی فی صناعة الانشاء (قسم سوم)۔ مبادیات کے سلسلے میں غالباً ان نگرشات کا ذکر کیا جا سکتا ہے جو اطلاقات کے نام سے مشہور ہیں اور جن سے گزشتہ فرمانرواؤں کے فیصلوں کی توثیق کی جاتی تھی۔

۱۲۔ نقول : یورپ میں تو اصل کے مطابق سرکاری نقاوں یا نسخوں کی کئی مثالیں ملتی ہیں لیکن مجھے اس قسم کی عربی نقول کا علم نہیں، گو ان کی موجودگی کے قیاس کے اسباب یہاں بھی موجود تھے، مثلاً اصل کا گم ہو جانا یا کسی نئے فرمانروا کا برسر حکومت آنا؛ عربی میں غیر قانونی نقول یا جعلسازی کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ الصولی (۱۳۳) کے ہاں قدیم زمانے کی ایک جعلسازی کا تذکرہ ملتا ہے کہ کس طرح مئة ألف کو مئتی ألف کر دیا گیا؛ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ بنو امیہ نے دیوان الخاتم قائم کیا۔ الفلشدی (۱۳ : ۱۰۴) نے تمیم الداری کے پہلے عطیہ اراضی کی دستاویز کے بارے میں لکھا ہے۔ شہاب الدین بن فضل اللہ (مسالک، ۱ : ۱۷۳) نے دعویٰ کیا ہے کہ اس نے اس کی اصل دیکھی تھی، لیکن اسے زیادہ سے زیادہ ایک جعلی دستاویز کہا جا سکتا ہے۔ جو دستاویزات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب ہیں انہیں حمید اللہ نے مستند تسلیم کیا ہے؛ [اس سلسلے میں محدثین کے ہاں مفصل بحث ملتی ہے]۔ جعلی

ملتی ہیں، جسے مختصر نویسی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ Grohmann (Chrestomathie) ص ۸۳ نے سامان کتابت پر بحث کی ہے اور القلقشنندی (۲: ۳۳۰) نے کم از کم سترہ اصطلاحات کی فہرست دی ہے، لیکن چونکہ ان کی تصویریں نہیں بنائی گئیں اس لیے ان کا صحیح مفہوم سمجھنا مشکل ہے۔ خفیہ تحریروں (codes) اور رمزیہ زبان کی بھی ہمیشہ کچھ نہ کچھ اہمیت رہی ہوگی، جیسا کہ الصولی (ص ۱۸۶) ترجمہ) اور القلقشنندی (۹: ۲۲۹) تعبیر، بعد ازاں حل الرموز سے ظاہر ہے۔ یہ چیزیں بردی مخطوطات تک میں موجود ہیں (Chrestomathie: Grohmann) ص ۱۰۳ ب)۔

۱۷۔ مہر لگانا: الصولی (ص ۱۳۹) اور القلقشنندی (۳: ۲۷۳) کو تو مہر یا خاتم سے دلچسپی تھی ہی، لیکن ہامر Hammer کے زمانے سے یورپ میں بھی عربی مہروں کی شکل و صورت اور استعمال کے بارے میں خاصی دلچسپی پیدا ہو چلی ہے۔ Grohmann کے خیال کے مطابق (Chrestomathie) ص ۱۲۹ (بعد) مہر لگانے کی مختلف غایتوں کا بھی امتیاز ذہن میں رکھنا ضروری ہے، یعنی توثیق کے لیے دستخط کے بجائے مہر لگانا، شناخت اور تصدیق کے لیے مہر لگانا، گواہوں کی طرف سے مہر لگانا (رک بہ خاتم)۔

مآخذ: عربی ہر دہات پر معلومات کے وسیع ذخیرے کے بارے میں غالباً بہترین تصنیف (۱) A. Grohmann: Einführung und Chrestomathie zur arabischen Papyruskunde ۱۹۵۵ء ج ۴ تا ۷ ہے: قب نیز (۲) Die Papyri und die Urkundentehre ص ۱۰۷ تا ۱۳۰: عربی تصنیفات: (۳) الصولی: أدب الکتاب، طبع محمد بیہجہ الاثری، قاہرہ ۱۹۳۷ء: (۴) ابن الصیرفی: قانون دیوان الرسائل، طبع علی بیہجہ، قاہرہ ۱۹۰۵ء: (۵) شہاب الدین بن فضل اللہ: التعلیف بالکُطُوب الشریف، قاہرہ ۱۳۱۲ھ: (۶) القلقشنندی: مبع الاعشی فی صناعة الانشاء

سلسلے میں قمری اور شمسی سال (سنہ ہلالیہ و خراجیہ) کے درمیان مطابقت پیدا کرنے میں پیش آتی ہے: دور بنی عباس جیسے قدیم زمانے ہی میں ضرورت پیش آنے پر "فی تحویل السنہ" کے موضوع پر خصوصی دستاویزات لکھی گئیں [رک بہ تاریخ]۔

۱۵۔ کتابت کا سامان: بردی مخطوطات کے ماہرین نے سامان کتابت پر بڑا سیر حاصل کام کیا ہے۔ اس ضمن میں جدید ترین تحقیق گروہمان Grohmann کی ہے (Chrestomathie) ص ۶۳ (بعد)۔ عام معمولی سامان (گیارہویں صدی تک پیرس، چڑا، کاغذ) کے علاوہ ایسی چیزیں بھی تھیں جو کبھی کبھار استعمال ہوتی تھیں، مثلاً کپڑا (بالخصوص عقد النکاح کے لیے)، لکڑی، پتھر، لاکھ، ہڈی اور ٹھیکری، سائز (قنط، الصولی کے ہاں مقدار) میں بڑا اختلاف پایا جاتا تھا۔ انواع اور ان کی قیمتوں کے سلسلے میں بھی یہی صورت تھی۔ القلقشنندی نے روشنائی (جبر میداد) کی کئی قسمیں لکھی ہیں [نیز ابن السید البطلوسی (م ۵۳۱) نے الاقتضاب فی شرح ادب الکتاب (ص ۷۰ بعد) میں سامان خط و کتابت، اقسام کاغذ و قلم وغیرہ پر مفید اور تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے: رک بہ جلد، کاغذ، قرطاس، رق، ورق]۔

۱۶۔ دستاویزات کا خط: اگرچہ اس موضوع پر Moritz، Tisserand، Cheikho اور دوسروں نے بہت سا بنیادی کام کیا ہے، تاہم عربی خط کی کوئی مکمل عالمانہ تاریخ نہیں ملتی (قب خط)۔ Grohmann نے پیرس کے خط کی تحقیق کی ہے (Chrestomathie) ص ۸۸ تا ۱۰۳)۔ جہاں تک مؤخر دستاویزات کا تعلق ہے بلا تاریخ اوراق کے زمانے کا قریبی اندازہ لگانے کے لیے خط کی مختلف انواع کی امتیازی خصوصیات، اعراب کا استعمال اور امتیازی علامات کا علم کافی ہے۔ دستاویزات پر بعض عبارتیں، اعداد، یادداشتیں، وغیرہ اکثر اختصار کی صورت اور شکستہ خط میں

۳۔ المغرب

دستاویزات کی ظاہری خصوصیات (ترتیب عبارت، کاغذ کا رنگ، خط کی قسم وغیرہ) نیز طراز و انتخاب عبارات میں المغرب کی دستاویزات مشرقی ممالک کے مقابلے میں سادگی کی حامل ہیں۔

لیکن اس سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مراکش کے الموحّدون نے ایک قلمی علامت توثیق کو رواج دیا۔ اسے علامت کہتے تھے اور یہ "وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَحْدَهُ" کے نیازمندانہ کلمے پر مشتمل تھی۔ یہ عبارت جلی حروف میں بڑی نفاست سے کندہ ہوتی تھی۔ آخری لفظ میں حروف ہ اور د مربوط ہوتے تھے اور آخر میں اختتامی سبجّل آتا تھا (دیکھیے سطور زیرین)۔ یہ علامت توثیق بعد میں دستاویز کی پیشانی پر اس جوڑی بٹی پر لکھی جاتی تھی جسے کاتب بِسْمَلَة اور تَصْلِیَة کے نیچے اس لیے خالی چھوڑ دیتا تھا کہ علامت اسی کا نتیجہ متصور ہوتی تھی۔

یہ کلمہ عقیدہ توحید کا حامل ہے اور قیاس ہے کہ سہدی بن تومرت نے اسے اپنی بعض توقیعات میں استعمال کیا ہوگا؛ لیکن یہ بات یقینی ہے کہ اس کے جانشین عبدالنور نے اسے اپنے مشہور رسالۃ الفصول میں استعمال کیا (دیکھیے Elévi-Provençal)؛ Documents inédits d'histoire almohade عربی متن، ص ۱۳)۔ القرطاس (فاس ۱۳۰۵ء، ص ۱۵۴) کی رو سے دراصل یعقوب المنصور (۵۸۰/۱۱۸۴ء تا ۵۹۵/۱۱۹۹ء) نے اس عبارت کو پہلی بار بطور (علامت) اختیار کیا اور اسے اپنے ہاتھ سے لکھا۔ حقیقت یہی ہے کہ پہلی بار اسی فرمانروا کے عہد میں الموحّدون کے دینار (رک بہ Espagne et Cat mon mus Afrique, Lavoix) ص ۳۰۲ تا ۳۰۸) پر سابقہ عبارت اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ کی جگہ یہ عبارت بطور علامت کندہ ہونی شروع ہوئی۔

افریقہ کے الموحّد حنفی فرمانرواؤں نے اس

ج ۱ تا ۱۳، القاہرہ ۱۳۳۱/۱۹۱۲ء تا ۱۳۳۸/۱۹۱۹ء؛ Beiträge zur Geschichte der : W. Björckman (۷)؛ Staatkanzlei in islamischen Ägypten؛ ہیبرک ۱۹۲۸ء؛ ص ۸۷ تا ۲۰۷؛ ہمد اشاریہ؛ دستاویزات کی تہم تر مطبوعات از 'Cusa' 'Amari' 'S. de Sacy' 'de sousa' 'Ribera' 'Remiro' وغیرہ کو (۸) G. Gabrieli؛ 'Manuale' ص ۲۵۵ تا ۲۸۸ میں جمع کر دیا گیا ہے۔ جدید مطبوعات کے بارے میں قبا (۹) H. R. Roemer؛ Über Urkunden zur Geschichte Ägyptens und Persiens in islamischer Zeit؛ در ZDMG ۱۰۷ (۱۹۵۷ء)؛ ۵۱۹ تا ۵۳۸ (اس میں قاطمی و مداوک دستاویزات کو طبع کرنے کے بارے میں [حکومت] مصر کے منصوبے کا ذکر بھی ہے)؛ (۱۰) A. Grohmann؛ 'Ein fatimidenerlass vom Jahre : Pahor Labib' ۱۵/۱۳۱۵ء؛ در R. SO ۳۲ (۱۹۵۷ء)؛ ۶۴۱ تا ۶۵۴ (جس میں Monomenta diplomatica arabica کے منصوبوں کا ذکر ہے)؛ (۱۱) J. Wansbrough؛ 'A Mamluk letter of 877/1473'؛ در BSOAS ۱/۲۳ (۱۹۶۱ء)؛ ۲۰۰ تا ۲۱۳؛ (۱۲) S. D. Goitein؛ 'The Cairo Geniza as a source for the history of Muslim civilization'؛ در Stud. Islam ۳ (۱۹۵۵ء)؛ ۷۵ تا ۹۳؛ (۱۳) الشیال G. E. El Shayyal؛ مجموعۃ الوثائق الفاطمیہ ج ۱، القاہرہ ۱۹۵۸ء؛ (۱۴) حسن الباشا؛ الألقاب الاسلامیہ، القاہرہ ۱۹۳۷ء؛ مزید رک بہ دفتر؛ سبجّل توثیق؛ وغیرہ؛ (۱۵) ابن قتیبہ؛ ادب الکاتب؛ (۱۶) مبعی الصالح؛ النظم الاسلامیہ، بیروت ۱۳۸۵ء؛ (۱۷) ابن السید البطلانوسی؛ الاقتضاب فی شرح ادب الکتاب؛ بیروت ۱۴۰۰ء؛ (۱۸) ابن هشام؛ السیرۃ النبویہ، القاہرہ ۱۹۳۳ء؛ (۱۹) احمد حسن الزیات؛ تاریخ الادب العربی، القاہرہ ۱۹۶۲ء؛ (۲۰) ابن الأثیر؛ إعتاب الکتاب، مطبوعۃ دمشق۔

(W. BJÖRCKMAN)

ایسی بیضوی مہر کا استعمال بھی ہوئے لگا تھا جس پر 'علامہ' کلمہ تھی اور اسے روشنائی سے لگایا جاتا تھا۔ ان کے جانشین مراکشی خاندان سے، یعنی علویوں نے الموحدون کی علامہ کا استعمال، خواہ وہ قلمی تحریر کی صورت میں ہو یا مہر کی صورت میں، قطعاً ترک کر دیا۔ اب توثیق کا واحد نشان یہ تھا کہ ایک مدور مہر (تابع) روشنائی سے ثبت کر دی جاتی تھی، جو دستاویز کی اہمیت کے اعتبار سے چھوٹی بڑی ہوتی تھی اور حَمْدَلْہ اور تَصْلِیْہ کے درمیان خالی جگہ میں لگائی جاتی تھی۔

المغرب کی دستاویزات کی ایک اور قابل ذکر خاص بات یہ ہے کہ جہاں دستاویز کا متن ختم ہوتا تھا وہاں ایک اختتامی نشان تاریخ کے عین بعد لگایا جاتا تھا، جو حرف 'ہ' پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس کا آخری سرا دائیں جانب مڑا ہوا ہوتا تھا۔ اسے بے معنی نہیں سمجھنا چاہیے۔ بدراصل یہ لفظ "اتہما" کی اختصار شدہ صورت تھی۔ بہر حال اسے اس موقع کی اختصار شدہ صورت نہیں سمجھنی چاہیے جسے فرمانروا اپنے قلم سے مراعات و عطیات کی اسناد کے خاتمے پر تحریر کرتا تھا، یعنی صَحْ هَذَا یا صَحیحْ ذَالِکْ (=یہ مستند ہے)۔

یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ بنو وٹاس اور بنو سعد کے زمانے کی بعض دستاویزات پر تاریخی بولانی اعداد میں درج ہیں۔ یہی بات ان کے بعض سکوں میں بھی ملتی ہے۔ علاوہ ازیں بنو سعد کے سلطان احمد المنصور نے ایک رمزی تحریر بھی استعمال کی تھی۔

المغرب کی دستاویزات کی بڑی بڑی اقسام حسب ذیل ہیں: (۱) ظہیر (کتاب ظہیر کے لیے) جمع: ظہائر؛ مراکش کی مقامی بولی میں ظہیر جمع: ضواہر) یہ ایک سند تھی جس کی رو سے کسی جاگیر وغیرہ یا محاصل، مالیانہ اور بیگار کی معافی

عبارت میں "والشُّکْرُ" کے الفاظ کا اضافہ کیا۔ آگے چل کر غرناطہ کے بنو نصر نے "وَلَا غَالِبَ إِلَّا اللَّهُ" (=صرف اللہ ہی غالب آنے والا ہے) کی عبارت اختیار کی۔ عین ممکن ہے کہ اس کے پس منظر میں اپنے جد امجد نصر کی، جس کے نام پر یہ خاندان مشہور ہوا، یادگار قائم کرنے کا جذبہ کارفرما ہو۔ علاوہ بریں ان کے پہلے فرمانروا نے الغالب باللہ کا لقب اختیار کیا تھا۔ بنو حفص اور بنو نصر کی یہ دونوں خاندانی علامات ان کے سکوں اور بعض آثار پر بھی ملتی ہیں۔ شروع شروع میں خود فرمانروا اپنے ہاتھ سے یہ علامت رقم کرتا تھا، لیکن بعد ازاں یہ ذمہ داری ایک بہت اعلیٰ اور معتد عہدیدار (جسے ایک طرح کا وزیر یا مہر بردار کہنا چاہیے) کے سپرد کر دی گئی۔ اسے 'صاحب الِعلامۃ' کہا جاتا تھا۔ اکثر اوقات اس عہدے پر کسی بہت ممتاز عالم کو مقرر کیا جاتا تھا، چنانچہ تونس میں ابن الأبار (رُکّ باند) اور ابن خلدون (رُکّ باند) اس منصب پر فائز رہے۔ توثیق طلب دستاویزات کی اہمیت کے اعتبار سے اس پر علامہ کبریٰ یا علامہ صغریٰ ثبت کی جاتی تھی۔ یہ علامات دو مختلف درجوں کے وزراء کے سپرد کی جاتی تھیں۔

مراکش میں بنو سعد کی حکومت کے خاتمے تک الموحدون کے حَمْدَلْہ کا استعمال بطور علامہ جاری رہا، لیکن اس کی تحریر نے بڑی فنکارانہ صورت اختیار کر لی اور بالآخر طغرانی نقش و نگار کی صورت میں لکھی جانے لگی، جس کا پڑھا جانا بھی مشکل تھا۔ ممکن ہے کہ یہ ترکی طغرانی [رُکّ باند] کی نقل ہو۔ بنی سعد کی انتہائی فنکارانہ علامہ، جسے ایک لحاظ سے ان کے خاندانی نشان کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی، ان کی بندوقوں پر، ان کے بعض سکوں پر اور ان کے محلات کے نقش و نگار پر ملتی ہے۔ بنو سعد کی حکومت کے آخری برسوں میں قلمی 'علامہ' کے علاوہ

لینا چاہیے : (۷) G.S. Colin : *Contribution à l'étude des relations diplomatiques entre les Musulmans d'occident et l'Égypte* : ۳ 'Mélanges Maspero' : ۱۹۷۰ 'Cahier' : ۶۱ : (۸) وہی مصنف : *Note sur le système cryptographique du Sultan Ahmad al-Mansūr* : ۷ 'Hespéris' : ۷۰ : (۹) ۱۹۲۷ : (۱۰) L. Di Giacomo : *Une poétesse grenadine du temps des Almohades* : ۲۸ 'Hespéris' : ۷۰ : (۱۱) R. Brunschvig : *La Berbérie orientale sous les Hafsides* : ۱۰۰ : (۱۲) Cusa : *I Diplomi greci ed arabi di Sicilia* : ۱۸۶۸ : (۱۳) M. Nehlil : *Saadies* : ۱۳۷۳ : (۱۴) *Lettres Chrétiennes* : مراکش کے خاندان علویہ کی ایک سو اٹھائیس سرکاری دستاویزات کا مجموعہ، نقل مطابق اصل پیرس ۱۹۱۵ : (۱۵) *Sources inédites de l'histoire du Maroc* : ایک مجموعہ، جس میں متعدد مراکشی سرکاری دستاویزات نقل مطابق اصل اور عکس کی صورت میں موجود ہیں۔ (G. S. COLIN)

۳۔ ایران

ایرانی دستاویزات کی ابتدا اس زمانے سے ہوتی ہے جب ایران کے علاقے میں ترکوں کی ریاستیں قائم ہوئیں۔ طاہری اور سامانی خاندانوں کے بادشاہ اگرچہ بہت سی باتوں میں ایرانی تہذیب سے متاثر تھے لیکن ان کے ”دیوان“ [دفترا] میں عربی زبان ہی وسیلہ اظہار رہی اور فارسی کو ”درباری زبان“ کی حیثیت سے [رک بہ دری] رواج دینے کی کوششیں [فوری طور سے] کامیاب نہیں ہوئیں۔ محمود غزنوی (۳۸۹ تا ۴۲۱/۹۹۹ تا ۱۰۳۰ء) نے اپنے زمانے میں فارسی کو دفتری زبان بنانے کا اعلان کیا اور اس طرح دیوان میں اس کا رواج شروع ہوا۔ یہی صورت حال سلجوقی بادشاہوں کے عہد میں رونما ہوئی

عطا کی جاتی تھی اور بالخصوص شرفا یا مرابطوں کے حق میں ہوتی تھی : (۲) تنغہ، وہ سند تھی جس کی رو سے عمر بھر کے لیے کسی کا وظیفہ مقرر کیا جاتا تھا یا ایسی جائداد کا حق استفادہ عطا کیا جاتا تھا جو شاہی ملکیت ہو۔ دستاویزات کی یہ دو مخصوص اقسام صک بھی کہلاتی ہیں : (۳) رسالۃ یا براءۃ (مقاسی بولی میں بڑا)، کسی جماعت کے نام ایک مراسلہ ہوتا تھا، جس کے ذریعے کسی اہم واقعہ کا اعلان کیا جاتا تھا (نئے عامل کا تقرر، دشمن یا باغیوں پر فتح یابی وغیرہ) یا اس کا مقصد اسے نصیحت یا تنبیہ کرنا ہوتا تھا۔ یہ سرکاری مراسلات عموماً جمعہ کے روز مسجد میں منبر سے پڑھ کر سنائے جاتے تھے۔ مراکش کے بہت سے علوی سلاطین نے، جن میں سیدی محمد بن عبداللہ اور مولای سلیمان بن محمد بھی شامل ہیں، اس قسم کے مراسلات لکھنے پر مستقل شہرت حاصل کی : (۴) یقیناً، عہد وفاداری، جو عمائد اور لئے فرمانروا کے مابین طے پاتا تھا۔

مآخذ : (۱) ابن خلدون : مقدسہ بولاق ۱۲۷۷ھ

ص ۱۲۰ تا ۱۲۹ و مترجمہ : de Slane : *Prolegomènes*

۱ : xxxi : ۲۷ : ۶۳ : (۲) Rabino : *Contribution à l'histoire des Saadiens*

Les signes : H. de Castris : ۱ : ۱۹۲۰ : (۳) *de validation des chérifs saadiens*

: G. Wiet et E. Tisserant : ۲۳ : ۱۹۲۱ : (۴) *Innocent IV*

Une lettre de l'almohade Murtaqa au pape : ۷ : ۱۹۲۶ : (۵) *Un recueil de lettres* : E. Lévi-Provençal

: ۲۸ : ۱۹۲۱ : (۶) *officielles almohades*

مؤخرالذکر تین مقالات کے متن اور حواشی ایک بنیادی

ماخذ کا کام دیتے ہیں۔ اس کے تحت کے طور پر (۶)

Mémoires d'histoire et de littérature : S. de Sacy

orientales : ۱۸۳۲ء میں ۱۱۹، ۱۲۹ کا اضافہ کر

کو حسب ذیل انواع میں تقسیم کیا جاسکتا ہے :

تقرر یا عطیات کے فراہم (اقطاع ، دور مغول و مابعد مغول : سورغال : تسلیمی : محاصل کی معافی : نیول : سرکاری خدمت کے صلے میں دی گئی جاگیر : وظیفہ : مذہبی عطیات ، جو اوقاف یا سرکاری خزانے سے دیے جاتے تھے : خلعت کا عطیہ ، وغیرہ) عہد نامے ، پاسپورٹ ، فرمانروا کے قانونی فیصلے اور صوبیداروں اور دیگر عہدے داروں کے نام عمومی نوعیت کے احکام ۔ عہد سلاجقہ تک بظاہر مصطلحات میں پختگی پیدا نہیں ہوئی تھی ۔ فرمان کے علاوہ ایک اور اصطلاح جو کثرت سے استعمال ہوتی ہے ، منشور (جمع : منشیر) ہے ، جو متعدد قسم کی دستاویزات کے لیے رائج تھی ۔ ان کے علاوہ تقلید ، تفویض ، تسلیم ، مثالہ (جمع) اسلہ) اور منشور تقلید یا تفویض کی اصطلاحیں بھی ملتی ہیں ، دیکھیے : *Cat. Pers. Mss in the Rieu* : *Brit. Mus.* لندن ۱۸۷۹ء ، ۱ : ۳۸۹ : *Ethé* : *Cat.* : *Pers. Mss in the Ind. off. Library* : ۱ : ۱۱۳۱ : متعجب الدین بدیع آتایک الجویانی : عتبات الکتابہ ، بمواضع کثیرہ) ۔ ایک اصطلاح ”لشان“ عہد تیموریہ میں ملتی ہے (دیکھیے *Roemer : Staatsschreiben der Timuriden* : Wiesbaden ۱۹۵۲ء ، بمواضع کثیرہ) ، جو سترھویں صدی عیسوی تک مستعمل رہی (دیکھیے *Chardin* : *Voyages du Chevalier Chardin en Pers* ، طبع Longlès ، پیرس ۱۸۱۱ء : ۲ : ۹۷) ۔ ”لشان“ ہی کی مترادف اصطلاح ”مکتوب“ ہے ، جو عہد تیموریہ میں وقتاً فوقتاً مستعمل رہی (نظام الدین شامی : ظفر نامہ ، طبع E. Tauer ، ۲ : ۲۶۳ ، بمدد اشاریہ) ۔ فرمان کو حکم (حافظ آبرو) ، طبع *Tauer : Cinque apuscules* ، ص ۸۳ ، بمدد اشاریہ) ، توفیق (فی الاصل صرف فرمانروا کے دستخط کے لیے اور بعد ازاں اس کی مہر کے لیے بھی) (دیکھیے نیچے) یا مثال (شامی ، طبع Tauer ، ۲ : ۲۹۹) بھی کہا جاتا تھا ۔ مغول عہد کے نام پرنسٹن مفرد طور پر یا

(دیکھیے *Iran : B. Spuler* ، ص ۲۳۵ تا ۲۳۶) ۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ عربی دستاویزات نے کہاں تک فارسی دستاویزوں کے لیے نمونے کا کام دیا ، البتہ اس قدیم زمانے میں بھی گہرے عربی اثرات کا مزاج آسانی سے لگایا جاسکتا ہے ۔ سلطان غزنہ اور دربار خلافت کے باہمی روابط کا تقاضا تھا کہ دستاویزات کا ترجمہ فارسی سے عربی میں اور عربی سے فارسی میں کیا جائے ۔ علاوہ ازیں یہاں بعض ترک عناصر بھی موجود تھے جن میں ایلخانی بادشاہوں کے دور حکومت میں مغول اور ترکوں کی آمد سے خاصا اضافہ ہوا اور صدیوں تک دستاویزات اور دیگر مراسلہ نگاری کی ہیئت ان سے متاثر رہی ۔

دستاویزات کی اقسام : فارسی دستاویزات بڑی حد تک عربی دستاویزات سے ملتی جاتی ہیں ۔ دستاویزوں کی متعدد اقسام ہیں : بعض دستاویزات سے کسی امر کی تصدیق ہوتی ہے اور بعض کی رو سے کوئی فرمان صادر ہوتا ہے ۔ پہلی قسم کی دستاویزات میں قانونی معاہدے اور تصدیق نامے شامل ہیں ، جن پر گواہوں کی مہر اور توثیق ثبت ہوتی ہے ، مثلاً قبائلی (خریداری کا معاہدہ جس کی توثیق کوئی قاضی یا منصف کرتا ہے) ، تسک (فرد حساب ، ہندی یا رسید) ، عقد نامہ یا نکاح نامہ ، وکالت نامہ ، بیع شرط نامچہ (فروخت کا معاہدہ) ، وصیت نامہ ، وقف نامہ (کار خیر کے لیے کسی ادارے کا قیام) ۔ ان دستاویزات (سجلات شرعیہ) کا تعلق بنیادی طور پر شرعی قانون نالذ کرنے والے احکام سے ہے ۔ ان کے برعکس جو دستاویزات سرکاری احکام پر مشتمل ہوتے تھے ان کا مکمل اختیار صرف ارکان حکومت کو حاصل ہوتا تھا ۔ انہیں بادشاہ یا اس کے نائبین جاری کرتے تھے ، جو دیوان میں تحریر کیے جاتے تھے ۔ اصولی طور پر بادشاہ کی ہر منشا کے اظہار کے لیے سرکاری دستاویز (فرمان) مل سکتا ہے ۔ عملی اعتبار سے ان دستاویزات

پندرہویں صدی عیسوی تک کی غیر ملکی خط و کتابت میں، جو مغول طرز پر مبنی تھی، کسی حد تک فرمان کی شان باقی رہی، لیکن صفویوں کے عہد، یعنی گیارہویں صدی ہجری/سترہویں صدی عیسوی میں اس میں تبدیلی رونما ہوئے لگی۔ قانونی مندرجات کی بنا پر دستور نامے (مثالیں: *اوغلو خبدر: انشاء میں*، نیز دیکھئے Rieu، ۱۹۰۷ء) طرز عبارت میں فرامین سے قریب آئے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ یہی بات سفیروں کو دی جانے والی اسناد سفارت کے متعلق کہی جا سکتی ہے۔ بادشاہ کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے (دست خط ہمایون یا مبارک) مکاتیب کو جن کا مرتبہ سب سے اونچا سمجھا جاتا تھا، دستاویزات اور دوسری نگارشات کے درمیان جگہ دی جاتی ہے۔ ان مکاتیب کے مضمون میں بادشاہ کے فرمان کی عمل درآمد سے لے کر خفیہ احکام تک کی چیزیں شامل ہوتی تھیں۔

ایرانی دیوان کی نو سو سال کی تاریخ کے دوران میں، یعنی زمانہ حال تک، دستاویزات و نگارشات کی داخلی ساخت میں مشکل ہی سے کوئی تبدیلی پیدا ہوئی ہوگی۔ دستاویز کا آغاز مناجات سے ہوتا ہے اور اکثر اس کے ساتھ کلمات عبودیت *الحکم لله* (حکم صرف اللہ کا ہے) اور *الملک لله* (ملک صرف اللہ کا ہے) شامل کر دیے جاتے ہیں، افتتاح انہیں کلمات، نیز کلمات اعلان پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کے بعد دستاویز کا اہم ترین حصہ، یعنی فیصلہ شروع ہوتا ہے۔ ابتدائی حصے، یعنی طراز و افتتاح میں دستاویز کی غایت عام الفاظ میں (جن کی نوعیت اکثر مذہبی ہوتی ہے) بیان کر دی جاتی ہے۔ اس ضمن میں دستاویز کو قرآنی نظائر و آیات سے زینت دی جاتی ہے اور خطیبانہ انداز بیان اختیار کیا جاتا ہے۔ دستاویز کے دوسرے حصوں کے مقابلے میں، جن میں بڑی حد تک مقررہ تراکیب کی باندی ضروری سمجھی جاتی ہے، اس حصے کی تحریر میں انشا پرداز کو اپنی ادبی صلاحیت کے اظہار کی آزادی ہوتی ہے، لیکن اس فن کا اظہار اصل

حکیم پیرایم مرکب صورت میں پندرہویں صدی عیسوی کے خاتمے تک مستعمل رہا (شامی، طبع Tauer، ۱۹۰۷ء)۔ نویں - دسویں صدی ہجری/پندرہویں - سولہویں صدی عیسوی میں مندرجات کے اعتبار سے نہیں، بلکہ افتتاحی کلمات کے فرق کی بنیاد پر بھی ایک تقسیم ملتی ہے: مثلاً پروانچہ اور حکم، جن کی عبارت برشکوہ اور منجیدہ ہوتی تھی۔ ان کے برعکس سادہ تر دستاویزات "رقم" کہلاتی ہیں (دیکھئے H. Busse: *Untersuchungen zum islamischen Kanzleiwesen an Hand turkmenischer und safawidischer Urkunden*، قاہرہ ۱۹۵۹ء، ۶۲:۱)۔ ماتحت حکام کے احکام کو اب واضح طور پر "مثال" کہتے ہیں (مثال دیوان الصدارة: Papazyan، عدد ۱، ۱۹۵۲ء/۵۹۲)۔ عہد قاجار میں ان عہدوں کے ناموں کا انحصار احکام جاری کرنے والے حکام پر ہوتا تھا۔ "فرمان" صرف شاہ کے حکم کو کہتے تھے اور شاہی نسل کے صوبیداروں کے احکام کو حکم (دیکھئے Greenfield: *Die Verfassung des persischen Staates*، برلن ۱۹۰۳ء، ص ۱۱۵)، لیکن نسبہ کم سرکاری زبان میں تقریباً سب کی سب مذکورہ بالا اصطلاحات مستعمل نظر آتی ہیں (دیکھئے Persische Konversationsgrammatik: S. Beck، ہائیڈل برگ ۱۹۱۳ء، ۲: ۲۱۱)۔

زیادہ غور سے دیکھا جائے تو عہدناموں اور فرمانوں کو ان خطوط (مکتوب یا مراسلے) سے متعز کیا جا سکتا ہے، جو داخلی یا خارجی مسائل سے متعلق ہوتے ہیں۔ سابق الذکر دستاویزات کی طرح ان کی بھی سرکاری طور پر توثیق کی جاتی ہے اور ان کی ایک معینہ خارجی اور داخلی صورت ہوتی ہے، البتہ ان کی عبارت قانونی نوعیت کی نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر ان مکتوبات کو دیکھئے جن کے ذریعے دوستانہ تعلقات کی توثیق کی جاتی ہے (اخوانیات)۔ ہر موقع کے لیے ایک مخصوص امیلوب عبارت ہوتا ہے، مثلاً تہنیت نامہ (ایعتبات)، تعزیت نامہ، وغیرہ۔ نویں صدی ہجری/

جاتا ہے۔ کلمات اعلان کے مقابلے میں، جہاں اعلیٰ ترین عہدیداروں کے نام سب سے اوپر درج ہوتے تھے، یہاں ان کا نام آخر میں لکھا جاتا ہے۔ حساب داروں (مستوفیان) کو ہدایت دی جاتی تھی کہ وہ دستاویز کو درج رجسٹر کریں۔ آخر میں بعض صورتوں میں ایک استماعی حکم شامل ہوتا تھا، جس کی رو سے تجدید کی سالانہ درخواست کی معائنہ کی جاتی تھی اور یہ ہدایت لکھی ہوتی تھی کہ اس کا اطلاق اس قسم کے تمام مقدمات پر کیا جائے۔ نجات کے علاوہ فیصلے سے قبل اور اس کے بعد لکھے جانے والے حصے حذف ہو سکتے تھے۔ اس صورت میں دستاویز صرف فیصلے پر مشتمل ہوتی تھی۔ تاہم بسا اوقات دستاویز کی ترتیب یوں ہوتی تھی: بیانیہ حصہ، فیصلہ، اور خاتمہ (تاریخ وغیرہ)۔ اس صورت میں پورا متن ”چون“ (بیانیہ حصے کی ابتداء) اور ”بنابرین“ (فیصلے کا آغاز) کے درمیان آجاتا تھا۔ بیانیہ حصے میں یا فیصلے میں سیاق عبارت کے ذریعے دستاویز کو درج رجسٹر کرنے کی ہدایت بھی دی جاتی تھی۔ یہ ہدایت اگر دستاویز کی پشت (ظہر، من) پر لکھی جاتی تو متن میں اشارہ کر دیا جاتا تھا۔

دستاویز کو ایسی عبارت پر ختم کیا جاتا تھا جس میں مہر ثبت کیے جانے کا حوالہ موجود ہوتا اور اسلامی تاریخ درج کر دی جاتی: ”کتاب فی“ (= لکھا گیا) (تا زمان رشید الدین، طبع GMS، Jahn، ۱۸۵۰ء: ۲۲۲) یا ”تحریراً فی“ (= تحریر کیا گیا)۔ مہینے کا دن عربی نیز فارسی اعداد میں لکھنا دسویں صدی ہجری/سولہویں صدی عیسوی میں بالکل متروک ہو گیا۔ کبھی کبھی ہفتے کے دن کا ابرائی نام بھی لکھ دیا جاتا ہے (Papazyan، عدد ۱۸، ۹۷۷ھ/۹۵۷ء)۔ مہینے کے پہلے دن کو ”عمرہ“ اور آخری کو ”منہ“ کہتے ہیں۔ مہینوں کے نام ان کی صفات کے ساتھ آتے ہیں: ”حرم الحرام، رمضان المبارک، وغیرہ۔ سال شروع شروع میں عربی حروف میں لکھا جاتا تھا، لیکن دسویں صدی ہجری/سولہویں صدی عیسوی

دستاویزات کی یہ نسبت کتب انشاء میں زیاد واضح نظر آتا ہے۔ دوسرا بیانیہ حصہ اصل مقدمے اور زیادہ تر مدعی کی عرضداشت کے خلاصے پر مشتمل ہوتا ہے، البتہ توثیق کرنے والی دستاویزات میں مجوزہ حکم یا مسئلہ زیر بحث کے اعتبار سے متعدد احکام کلیتہً یا ان کے اہم ترین حصے شامل کر دیے جاتے ہیں۔ بیانیہ حصے ہی میں پہلی بار مکتوب الیہ کا نام و لقب آتا ہے۔ یہاں اس کا ذکر صیغہ غالب میں اور ہمدازان صرف مذکور، مژبور، مشار الیہ یا مؤمنی الیہ ایسے الفاظ سے کیا جاتا ہے۔ مکمل القاب، پناہ، دستگاہ، نظام وغیرہ کے ادبی مرکبات سے کئی کئی مطور پر پھیل جاتے ہیں۔ اعلان کی عبارت (مثلاً فرزندان و وزراء بداند کہ...) ابتدائی یا بیانیہ حصے سے قبل آتی ہے، لیکن اسے حذف بھی کیا جا سکتا ہے۔ ابتدائی حصہ بسا اوقات کلمہ آمابعد پر ختم ہوتا ہے۔

دستاویز کے اصل حصے میں بادشاہ کا فیصلہ ہوتا ہے۔ حکام کے تقرر اور عطیات کے احکام میں تاریخ تقرر، عہدے کا نام یا عطیے کے کی وجوہ کو زیادہ تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے، البتہ دوسرے فرمانوں میں فیصلہ یا حکم براہ راست تحریر کر دیا جاتا ہے۔ فیصلے میں یا تو فعل معروف کا استعمال ہوتا ہے (دوسرے الفاظ میں بادشاہ اپنے بارے میں صیغہ جمع متکلم استعمال کرتا ہے) (مقرر فرمودیم و ارزانی داشتیم) یا فعل مجہول کا (مقرر فرمودہ شد کہ)۔ سترہویں۔ اٹھارہویں صدی عیسوی کی ایک دُکا عبارتوں میں صیغہ واحد متکلم کا استعمال بھی نظر آتا ہے: ”شاہ بابم، جد بزرگوارم (دعائیکہ کلمات کے ساتھ)۔ بیانیہ حصے سے فیصلے کی طرف آتے ہوئے بعض مخصوص کلمات استعمال کیے جاتے ہیں، مثلاً ”بناء علیہ“، ”بنابرین“، ”لہذا“ یا ”منی باید کہ“۔ تقرر یا عطیات کے احکام کی صورت میں فیصلے کے ساتھ ساتھ مکتوب الیہ، عہدیداروں یا اشخاص متعلقہ کے نام ہدایات بھی درج کی جاتی ہیں، جنہیں عموماً ”سپیل و طریق“ کہا

ذکر آتا ہے، عدد ۱۶: خوارزم کے لیے دیکھیے النسوی: سیرت السلطان جلال الدین منگوبردی، طبع حافظ احمد حمیدی، تاحرہ ۱۹۵۳ء ص ۲۲۴۔ یہاں طغری صرف فرما تروا کے نام اور لقب پر مشتمل ہوتا تھا، لیکن دور مغول میں نام کے بعد بہادر کے اضافے (۸۱۳۱۹ کے بعد) دیکھیے *Mongolen, Spuler*، بار دوم، ص ۱۹۷ تا ۲۷۱ کے علاوہ آگہ منو *lige manu* (فرمانے از ما) بھی بڑھا دیا گیا۔ تیموری دستاویزات میں ترکی ترجمے میں یہ عبارت آتی ہے تیمور گورکان سوز و موز (دیکھیے *Fekete: Arbeiten der geusintischen Orient-* *alistik auf dem Gebiet der türkischen und persischen Paläographie und die Frage der Formel szüzümüz* در *AO Hung*، ۷ (۱۹۵۷) ۱: ۱۴)۔ گیارہویں صدی ہجری/سترہویں صدی عیسوی میں پورے ترکمانی دور کی خاص دستاویزات پر طغری اسی صورت میں درج ہوتا رہا۔ علاوہ ازیں خوانین بخارا اور جنوبی روس کے آلتون اردو کے ہاں بھی اس کا استعمال جاری رہا (دیکھیے *Fekete*: وہی کتاب، ص ۱۴)۔ آق قویونلو کی دستاویزات پر طغری کے ساتھ تمنی کا نشان بھی ثبت کیا جاتا تھا، جو ان کے سکو پر بھی نظر آتا ہے (دیکھیے *Hinz: Irans Aufstiege*، *zum Nationalstaat im fünfzehnten Jahrhundert* برلن و لائپزگ ۱۹۳۶ء، ص ۱۰۶ و تصویر بالمقابل ص ۱۰۴)۔ متن کی ابتدائی سطروں کو حاشیے سے ذرا ہٹا کر لکھنا اور (مشرق بعید کے بالواسطہ اثر کے ماتحت) نئی سطر کے آغاز میں نمایاں طور پر بادشاہ کا نام اور لفظ یرلیخ درج کرنا ایغور کا دستور تھا، جسے اختیار کر کے مغول نے دنیائے اسلام میں ایک نئی بات کو رواج دیا (دیکھیے *Busse: Die Entwicklung der Staatkunde in Zentralasien und Persien von den Akten des xxiv. Mongolen bis zu den Safawiden internationalen Orientalisten-kongresses München*

سے اس کے بجائے عربی اعداد لکھے جانے لگے۔ دسویں صدی ہجری/سولہویں صدی عیسوی تک ہجری سال کے ساتھ اس کے مطابق *animal cycle* کا سال بھی درج ہوتا تھا، جو فیصلے میں زمانہ مابعد میں بھی (ہجری سال کے ساتھ) مندرجہ تاریخوں کے حوالے سے مستعمل رہا۔ نویں صدی ہجری/پندرہویں صدی عیسوی تک تاریخ کے بعد اس مقام کا نام بھی لکھا جاتا جہاں سے حکم جاری ہوتا تھا: بمقام، بمذنیہ، یا بدارالملطیہ۔ چند مستثنیات سے قطع نظر یہ طرز آگے چل کر متروک ہو گیا۔ ترکمانی دستاویزات تاریخ اور مقام کے نام کے بعد ایک دعائیہ عبارت درج ہوتی تھی: زلیٰ ختم یا تغیر و الاقبال (میرے رب! بھلائی اور اقبال مندی کے ساتھ خاتمہ فرما) دیکھیے *Busse: Untersuchungen*، عدد ۲)۔ دسویں صدی ہجری/سولہویں صدی عیسوی میں یہ عبارت دائیں حاشیے پر لکھی جانے لگی اور مختصر ہو کر ختم یا تغیر یا ختم رہ گئی اور آگے چل کر بالکل محذوف ہو گئی۔ اسی طرح نویں صدی ہجری/پندرہویں صدی عیسوی کے خاتمے اور دسویں صدی ہجری/سولہویں صدی عیسوی کے آغاز تک متن کے عین نیچے اور عموداً اس کا تب اور ان عہدیداروں کا حوالہ دیا جاتا تھا جنہوں نے اس کی تیاری میں حصہ لیا ہوتا، مثلاً پروانچہ اشرف اعلیٰ، بہ رسالہ (نام) بہ وقوف (نام)۔ گیارہویں صدی ہجری/سترہویں صدی عیسوی کی ابتدا سے یہ حوالہ مختلف صورتوں میں دستاویز کی پشت پر ملنے لگتا ہے (دیکھیے سطور ذرا)۔

دستاویزات کی داخلی ہیئت کی یہ نسبت ان کی خارجیت میں زیادہ تبدیلیاں آئیں۔ ترمیم کے زمانے کو سرور پر حسب ذیل ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: ماقبل مغول، مغول، تیموریہ، ترکمانیہ، صفویہ۔ چودھویں صدی ہجری/بیسویں صدی عیسوی تک۔ طغری [رک بان] کا استعمال سلاجقہ اور سلاطین خوارزم نے کیا (عقبة الکتابہ میں ایک ”وزیر طغری“ کا

ہجری / سولہویں صدی عیسوی میں صوبیداروں کی دستاویزات میں عبارت ”امر عالی شد“ مع طغری، جس میں کلمہ سوزوم شامل ہوتا تھا (Puluridze، شماره ۷۶، ۱۰۵۱/۱۶۴۲ء)، ماتی ہے اور گیارہویں صدی ہجری / سترہویں صدی عیسوی ”مقرر است کہ...“ عہد اسماعیل ثانی (۱۵۷۶ تا ۱۵۷۷ء) میں بعض احکام میں عبارت ”امر دیوان اشرف اعلیٰ“ استعمال ہوتی تھی۔ (Papazyan، شماره ۱۹، ۵۹۸۴/۱۵۷۶ تا ۱۵۷۷ء)۔ گیارہویں صدی ہجری / سترہویں صدی عیسوی کے دوران اور بارہویں صدی ہجری / انہارہویں صدی عیسوی کے آغاز میں مرکزی حکومت کے حکام کی دستاویزات پر شاہی مہر ثبت ہوتی تھی، البتہ افتتاحی کلمات معذوف ہوتے تھے (دیکھیے Busse : Untersuchungen، ص ۶۵)۔ بادشاہ کے مراسلات میں یہ بات آج بھی نظر آتی ہے۔ ان مراسلات کی ابتداء مکتوب الیہ کے نام اور لقب ہی سے ہو جاتی ہے۔ صفویوں کے بعد کے زمانے میں مختلف قسم کی دستاویزات میں مختلف عبارتوں کا استعمال جاری رہا۔ افشاریوں کے فرامین میں عبارت ”فرمان ہمایوں شد“ بدستور لکھی جاتی تھی البتہ ان کے ساتھ کلمہ بعون اللہ تعالیٰ (اللہ کی مدد سے) (بعد ازاں آعود باللہ تعالیٰ) کا اضافہ ہو گیا۔ اس عبارت کے حروف کے شوشوں کو بڑے فن کارانہ انداز سے موڑ دیا جاتا تھا۔ قاچاری دستاویزات میں ”حکم جہاں مطاع“ مع ”الملك لله تعالیٰ“ لکھا جاتا تھا۔ مظفرالدین شاہ (۱۸۹۶ تا ۱۹۰۷ء) کے فرامین میں ایک بار پھر ”فرمان ہمایوں شد“ کی عبارت دیکھنے میں آتی ہے (دیکھیے Beck : کتاب مذکور، ۲، ۳۴۲ تا ۳۴۳ نقل مطابق اصل)۔ طغری بدستور سنہری روشنائی میں لکھا جاتا رہا۔ عبارت ”حکم جہاں مطاع شد“ آخری افشار بادشاہوں کے ہاں نیز بعض زندی دستاویزات میں بھی ملتی ہے، جہاں وہی سادہ اسلوب برقرار رکھا گیا ہے۔ نادر شاہ کی تاجپوشی کے بعد جو فرمان (۸ مارچ

Wiesbaden، ۱۹۵۹ء، ص ۲۷ تا ۲۸)۔ یہ رواج معمولی تبدیلیوں کے ساتھ گیارہویں صدی ہجری / سترہویں صدی عیسوی تک کی طغری دار دستاویزات میں بھی ملتا ہے۔ اس سے اس کا استعمال دوسری دستاویزات میں بھی عام ہوا۔ شاہ اسماعیل اول صفوی کے عہد حکومت (۱۵۰۱ تا ۱۵۲۴ء) میں بعض دستاویزات سے طغری غائب ہو گیا۔ البتہ متن کی پہلی دو سطروں کو بدستور حاشیہ چھوڑ کر لکھتے رہے۔ مہر، جو پہلے دستاویز کے نچلے حصے میں لگائی جاتی تھی، اب اس کی پیشانی پر ثبت ہونے لگی (جہاں یہ اب بھی ”تاج“ Crest کی صورت میں نظر آتی ہے)۔ صفوی خاندان کے دوسرے بادشاہ طہماسپ اول کے عہد (۱۵۲۴ تا ۱۵۷۶ء) میں یہ نئی تبدیلی رونما ہوئی کہ طغری، جسے رئیس دیوان الانشاء (منشی الممالک) رقم کرتا تھا، اب سرخ اور سنہری روشنائی میں لکھا جانے لگا اور اس کے ساتھ افتتاحی کلمات دو صورتوں میں تحریر ہونے لگے (اور پہلی دو سطروں کو حاشیہ چھوڑ کر لکھنے کا دستور ختم ہو گیا) : ”فرمان ہمایوں شد“ یا ”فرمان ہمایوں شرف نفاذ یافت“۔ گیارہویں صدی ہجری / سترہویں صدی عیسوی کے آغاز میں ایک نئی عبارت : ”حکم جہاں متاع شد“ کا اضافہ ہو گیا (جسے وقائع نویس، مجلس نویس یا وزیر چپ سیاہ روشنائی سے تحریر کرتا تھا)۔ دیوان بیگی کی دستاویزات میں یہی عبارت سرخ روشنائی سے لکھی جاتی تھی (دیکھیے تذکرۃ السلوک، طبع و ترجمہ منورسکی، لندن ۱۹۴۳ء، ورق ۲۱ ب، ۲۴ ب، ۲۴ الف)۔ شاہی خاندان کے ارکان کی طرف سے صادر ہونے والی دستاویزات کے طغری میں ایک اور فرق بھی رونما ہونے لگا تھا (پہلی مثال Papazyan شماره ۳، ۵۸۶۶/۱۶۴۲ء میں) اور وہ یہ کہ سوزوموز کی جگہ کلمہ سوزوم (میرا حکم) دسویں صدی ہجری / سولہویں صدی عیسوی تک ملتا ہے (دیکھیے Puluridze، شماره ۱، ۱۰۵۹ء)۔ علاوہ ازیں دسویں صدی

رائج ہوئے (دیکھیے الفہرست، طبع فلوکل، ص ۳۰ بعد)
اور ان کی نشوونما پانچویں صدی ہجری/گیارہویں
صدی عیسوی کے دیوان الانشاء میں جاری رہی۔
قدیم ترین فارسی دستاویزات کا جو ٹکڑا دستیاب ہوا
ہے وہ ایک یح نامہ ہے (دیکھیے Margoliouth، در
R.A.S. ۱۹۰۳ء، ص ۶۱ بعد)۔ اس سے خط تعلیق
کی طرف رجحان کا پتہ چلتا ہے، جو آگے چل کر
عام طور پر رائج ہوا۔ ایلخالیوں کی مغول دستاویزات
بلاشبہ اویغور رسم الخط ہی میں لکھی جاتی تھیں،
جو نویں صدی ہجری/پندرہویں صدی عیسوی تک
نیپوریوں کی ترکی دستاویزات میں مستعمل رہا، البتہ
ان میں بین السطور کی عبارت عربی رسم الخط میں
نقل کر دی جاتی تھی (دیکھیے Topkapı : Kurat
sarayi yariik vebittikler، استنبول، ۱۹۰۴ء، ص ۱۹۵
بعد : ابوسعید کا ایک فرمان مورخہ ۵۸۷ھ/۱۱۹۸ء)۔
دور مابعد مغول کے دیوانوں میں خط تعلیق پوری
طرح رائج ہو چکا تھا اگرچہ بعض حصے (سناجات،
طغری) وقتاً فوقتاً خط ثلث میں لکھے جاتے تھے۔ دسویں
صدی ہجری/سولہویں صدی عیسوی میں خط نستعلیق
استعمال ہونے لگا، گو خط شکستہ بھی استعمال میں آتا
رہا۔ آٹھویں صدی ہجری/چودھویں صدی عیسوی کے
خط تعلیق میں خط شکستہ کی جانب پڑھنے کا رجحان
نظر آتا ہے، جو گیارہویں صدی ہجری/سترہویں صدی
عیسوی میں جا کر اپنی خالص صورت میں منظر عام
پر آیا۔

جہاں تک لوازم کتابت کا تعلق ہے شروع ہی
سے غالباً کاغذ سے کام لیا جاتا تھا، جس نے تیسری صدی
ہجری/نویں صدی عیسوی تک مشرق قریب میں ایک
ملکی صنعت کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ نویں صدی
ہجری/پندرہویں صدی عیسوی ہی سے دوسری اسلامی
ریاستوں کی طرح یہاں بھی یورپ سے کاغذ آنے لگا۔
Chadrien (Vayages، ۳ : ۲۷۱، بعد) اس بات کی

۱۷۳۶ء برائے نام بادشاہ عباس سوم صفوی، ۱۷۳۲ء تا
۱۷۳۶ء (تھا) جاری ہوئے ان میں عبارت ”فرمان عالی شد“
(مع معون . . .) اسی خاص انداز میں لکھی ہوئی ملتی
ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ ۱۷۳۶ء کے بعد سے
”فرمان عالی شد“ کے بجائے ”فرمان ہمایوں شد“ لکھا
جانے لگا۔ عبارت ”فرمان عالی شد“ (اضافوں کے بغیر
اور سادہ صورت میں) کریم خان زند (۱۷۵۰ تا ۱۷۹۶ء)
کی دستاویزات میں بھی نظر آتی ہے، جو اسماعیل سوم
صفوی کی برائے نام بادشاہت کے زمانے میں حکومت
کے اصلی اختیارات کا مالک تھا۔ اس کے پیش رو بختیاری
سردار علی سردان خان نے، کہ وہ بھی ایک ”بے ضابطہ“
بادشاہ تھا، اختتامی عبارت ”حکم والا شد“ کو (کسی
اضافے کے بغیر) اختیار کیا۔ یہاں ایک ایسے دستور کی
طرف میلان ظاہر ہونے لگا جو عہد قاجار میں پوری
طرح رائج ہوا؛ یعنی شاہی خاندان سے تعلق رکھنے
والے صوبیدار عبارت ”حکم والا شد“ تحریر کرتے تھے
اور ان کے مقابلے میں دیگر صوبیداروں کے لیے ضروری
تھا کہ ”حکم عالی شد“ تحریر کریں (یہ دستور دور
صفویہ ہی سے شروع ہو چکا تھا، دیکھیے سید الانشاء،
تہران ۱۳۲۷ھ/۱۹۰۹ء : Beck : کتاب مذکور، ۱ :
۵۵، ۵۵)۔ جدید شاہی فرامین (جن میں یورپی
اثرات نمایاں ہیں) کی ترتیب حسب ذیل ہے : شاہی
لشان (شیر و خورشید)، ”فرمان مطاع مبارک“،
”اعلحضرت ہمایوں شاہنشاہی“، ”بتائیدات خداوند
متعال، ما۔ پہلوی شاہنشاہ ایران۔ سہر۔ یہاں قدیم
عبارتوں کے مختلف حصے یکجا کر دیے گئے ہیں۔

رسوم الخط اور لوازم کتابت : اصلی دستاویزات
کے فقدان کی بنا پر یہ بتانا ممکن نہیں کہ سلجوقوں
کے دیوان الانشاء میں کس قسم کے رسوم الخط
استعمال ہوتے تھے۔ طغری جلی قلم (دیکھیے Spuler :
Iran، ص ۳۶۲) سے لکھا جاتا تھا۔ قیاس ہے کہ
آخری دور بنی عباس میں جو مختلف قسم کے رسوم الخط

شہادت دیتا ہے کہ کم از کم گیارہویں صدی ہجری / سترہویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں کاغذ ایران میں درآمد ہوتا تھا۔ اعلیٰ اقسام کا کاغذ بلخ، بخارا اور سمرقند سے آتا تھا۔ دستاویز کے کاغذ کا عرض مختلف اور پندرہ سے تیس میٹر تک ہوتا تھا۔ بعض دستاویزات کئی میٹر لمبی ہوا کرتی تھیں (مثلاً Busse، شماره ۲۹۳، سینٹی میٹر)۔ یہ متعدد اوراق پر مشتمل ہوتی تھیں جنہیں آپس میں جوڑ لیا جاتا تھا۔ مغول دستاویزات کی مختلف رنگ دار روشنیوں (سرخ اور سنہری) سے اعلیٰ درجے کی آرائش کی جاتی تھی۔ ان حصوں میں ان کا بطور خاص استعمال ہوتا جنہیں نمایاں کرنا مقصود ہوتا تھا۔ گیارہویں صدی ہجری / سترہویں صدی عیسوی کی طغریٰ والی دستاویزات میں بھی یہی بات نظر آتی ہے۔ ان میں بالخصوص مناجات، دعاویہ عبارات، تمنا (آق قویونلو کے فرامین میں) قرآنی آیات اور دائیں حاشیے میں لکھے جانے والے الفاظ کے لیے سنہری روشنائی استعمال کی جاتی تھی۔ افتتاحی عبارات والی دستاویزات میں سنہری اور سرخ روشنائی بکثرت استعمال ہوتی تھی، البتہ اس سے وہ دستاویزیں مستثنیٰ ہیں جن میں عبارت ”حکم جہان مطاع شد“ درج ہوتی تھی۔ یہ دستاویزات سرتاسر سیاہ روشنائی سے تحریر ہوتی تھیں۔ صوبائی حکام کی جانب سے صادر ہونے والی دستاویزات میں بھی رنگ دار روشنائی کا استعمال ختم کر دیا گیا تھا۔ لکھتے وقت پیشانی اور دائیں جانب خاصا بڑا حاشیہ چھوڑا جاتا تھا۔ بالخصوص ابتدائی دور میں سطور بائیں جانب ذرا بلندی کی طرف جاتی تھیں، کبھی کبھی سطر کے آخری لفظ کو کھینچ کر کاغذ کے بائیں کنارے تک بڑھا دیا جاتا تھا تاکہ اس میں کسی اور لفظ کا اضافہ نہ کیا جاسکے۔ نویں صدی ہجری / پندرہویں صدی عیسوی کے خاتمے تک فیصلے کی عبارت کا آغاز خاص طور پر جلی حروف کی صورت میں

نمایاں کیا جاتا تھا (دیکھیے Busse، شماره ۴)۔ جو مکتوبات غیر مائکرواؤٹ کے نام لکھے جاتے تھے ان میں مکتوب الیہ کا نام متن کے اوپر درج ہوتا تھا۔ متن میں جہاں یہ نام مقصود ہونے (القاب کے اندراج کے بعد) اس مقام کی نشان دہی کے لیے تھوڑی سی جگہ خالی چھوڑ دی جاتی تھی۔ مہرین: شروع شروع میں، دستاویزات ونگارشات کی (سوائے ان کے جن پر مہر ثبت ہوتی) تصدیق فرمانروا کی توقیع یا دستخط سے کی جاتی تھی۔ معلوم ہوتا ہے ہوں۔ بہر صورت دسویں صدی ہجری / سولہویں صدی عیسوی میں توقیع سے مہر ہی مراد لی جاتی تھی۔ گیارہویں صدی ہجری / سترہویں صدی عیسوی تک توقیع کی جگہ مہر کے لفظ نے نہیں لی تھی (حالانکہ اس کا استعمال اس سے بہت پہلے شروع ہو جانا چاہیے تھا)۔ شاہ اسمعیل نے اپنے فرامین میں کلمہ ”ہو اللہ العادل“ شامل کر لیا (papazyan، شماره ۱۹، ۱۵۷۶/۹۸۸)۔ لیکن اسے ایک استثنا سمجھنا چاہیے۔ دور قاچار تک مہر کے ساتھ شاہ کے تصدیقی دستخط (طغریٰ) کو ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا (دیکھیے Greenfield: کتاب مذکور، ص ۱۹۷: eck: کتاب مذکور، نقل مطابق اصل: صحیح پہلی سطر کے نیچے)۔ بادشاہ کی مہر ابتداء دستاویز کے نچلے حصے پر ثبت کی جاتی تھی، مغول کی طرح مہر چسپاں شدہ اوراق کے جوڑوں پر بھی ثبت کی جاتی تھی تا کہ بعد میں کوئی اور ورق نہ شامل کیا جاسکے، البتہ نویں صدی ہجری / پندرہویں صدی عیسوی میں مہر صرف دستاویز کے نچلے ہی حصے میں نظر آتی ہے (دیکھیے Kurat: کتاب مذکور، ص ۱۹)۔ دور صفویہ کے ابتدائی دنوں میں بادشاہ اور مرکزی حکومت کے فرامین میں مہر دستاویزات کی پیشانی پر طغریٰ کی جگہ لکائی جاتی تھی۔ صوبیداروں کے فرامین میں، جن پر ”حکم عالی شد“ کا طغریٰ درج ہوتا تھا،

اس کے ساتھ لقب ہوتا "بندہ شاہ ولایت"۔ Chardin نے ایک مربع مہر کا ذکر کیا ہے (لوح ۳۱: ۵۹۱: ۴)۔ بڑی مہریں گول ہوتی تھیں (کبھی کبھی ان کا بالائی بڑھا ہوا حصہ چھت کی شکل کا ہوتا تھا) اور چھوٹی مہریں مستطیل یا ڈھال کی شکل کی (الواح، در Rabinodi Coins, medals and seals of the shah of: Borgomale Fran ۱۵۰۰ تا ۱۹۳۱ء، مقام طباعت ندارد، ۱۹۳۵ء، لوح ۳)۔ آگے چل کر بادشاہ کی مہریں زیادہ تر مستطیل بننے لگیں، جن کا بالائی زائد حصہ چھت کی سی شکل کا ہوتا تھا۔ ۱۱۵۹/۵۱۳۶ء ہی سے مہروں پر "شیر و خورشید" کا نقش نظر آنے لگتا ہے (Chubua، شماره ۷۷ بڑی (مستطیل، زائد حصوں والی) اور چھوٹی (بیضوی) مہریں دور قاجار تک بھی ملتی ہیں (الواح در Rabino: کتاب مذکور، ص ۴)۔ دور صفویہ کے صوفیادوں کی مہریں بیشتر مستطیل یا بیضوی ہوتی تھیں (اکا دکا مثالیں گول مہروں کی بھی ملتی ہیں) اور ان پر کندہ عبارت عہدیدار کے نام اور کسی مذہبی نشان (کلمے) پر مشتمل ہوتی تھی۔ آگے چل کر ان میں کچھ زیادہ تبدیلی نہیں ہوئی۔ صفوی بادشاہوں کے دور میں شاہی حکام ایک خاص مدور مہر دیوان (مہر مسوڈۃ دیوان اعلیٰ) استعمال کرتے تھے۔ شروع شروع میں مہر کو مہر بردار کی حفاظت میں رکھا جاتا تھا لیکن صفوی دور کے ابتدائی ایام میں اس کی حفاظت افسران حرم کے سپرد کر دی گئی (دیکھیے Roemer: Der Niedergang Irans nach dem Tode Ism'ails des Grausamen، ۱۵۷۷ تا ۱۵۸۱ء، Würzburg ۱۹۳۹ء، ص ۴۴)۔ دور صفویہ کے آخر تک یہ انہیں کی۔ پردگی میں رہی۔ مہر لگانے کا اصل کام وہ عہدیدار انجام دیتے تھے جن کا لقب دوات دار [آرگ بہ دوا دار] ہوتا تھا۔ مہر بردار صرف پشت کی جانب ایک چھوٹی سی مہر لگا دیتے تھے (دیکھیے تذکرۃ الملوک، طبع منورسکی، ورق ۴۱ الف بعد)۔

مہر نجلے حصے ہی میں ثبت ہوتی تھی، البتہ جو صوفیادار شاہزادے ہوتے، وہ اپنی مہریں طہری کے دائیں جانب (عثمانی وزراء کے پنچہ کی طرح) لگاتے۔ مکتوبات پر مہر پشت کی جانب لگائی جاتی تھی (دیکھیے A choronicle of the Farmelites in Persia and the papel mission of the XVIIth and XVIIIth Centuries جلد ۲، لندن ۱۹۳۹ء، عکسی تصویر، بالمقابل ص ۹۵، ج ۱ میں)۔ مغول بادشاہوں کے دیوان میں حکومت کے مختلف امور سے متعلقہ دستاویزات پر مختلف رنگوں کی مہریں لگائی جاتی تھیں، مثلاً نیلی، سرخ (یا سنہری)، سبز اور سیاہ (دیکھیے Mongolen: Spuler، ص ۲۹۳، مربع مہر کے لیے)۔ جس سے تیموری بادشاہ بھی کسی حد تک کام لیتے تھے اور سنہری روشنائی استعمال ہوتی تھی۔ آگے چل کر تمام مہریں سیاہ روشنائی سے لگائی جانے لگیں۔ مربع مہروں کے علاوہ (غازان خان نے حکومت کے مختلف شعبوں کے لیے مختلف مہروں کو رواج دیا تھا، دیکھیے رشیدالدین، طبع Jahn، ص ۲۹۲)۔ تیموری خاندان کے بادشاہ گول مہریں استعمال کرتے تھے، جو اکثر صورتوں میں دستاویزات کی پیشانی پر لگائی جاتی تھیں (دیکھیے Un soyurgal du Tlmo: J. Deny، ۲۵۳ تا ۲۶۶)۔ مختلف قسم کی دستاویزات کے لیے مختلف مہروں کے استعمال کا دستور، جس کا رجحان شاہ اسمعیل اول کے عہد میں نظر آتا ہے، آخر دور صفویہ میں پایہ تکمل کو پہنچ گیا۔ بڑی مہریں مہر شرف نفاذ یا مہر ہمایون) "فرمان ہمایون شرف نفاذ یافت" اور "فرمان ہمایون شد" کی افتتاحی عبارت والی دستاویزات پر ثبت ہوتی تھیں اور چھوٹی مہریں "مہر انگشتر آفتاب آثار" یا مہر انگشتری "حکم جہان مطاع شد" والی عبارت پر۔ بڑی مہروں پر کندہ عبارت جزوی طور پر دوازہ امام کے اسمائے مبارک پر مشتمل ہوتی اور چھوٹی مہروں پر صرف بادشاہ کا نام اور اکثر

رجسٹر میں کر دیا جاتا) یا محض صحیح (درست) لکھ دیا جاتا تھا۔ آخر دور صفویہ میں تمام دستاویزات پر تعلیقات اور سرور وزیر اعظم (اعتماد الدولہ)، صدر اور ارکان دولت سے متعلقہ دوسرے عہدیدار، مثلاً قورچی بائی اور قلیز آقاسی ثبت کرتے تھے۔ ہر عہدیدار ان دستاویزات پر جن کا تعلق اس کے دائرہ اختیار میں ہوتا، سپرین لگاتا تھا۔ اس کے برعکس حواشی کے اندراج اور سپرین لگانے کا کام مستوفی الممالک (یا۔ خاصہ)، لشکر نویسی، صاحب توجیہ، ناظر دفتر خانہ اعلیٰ، داروغہ دفتر خانہ اعلیٰ اور دوسرے اہلکاروں کے سپرد تھا۔ عہدیداران سلطنت (سرکار ممالک) کے حواشی، اندراج ملازمین شاہی (سرکار خاصہ شریفہ) کے حواشی سے مختلف ہوتے تھے: مثلاً ”بہ نظر رسید“ (عہدیداران سلطنت) ”ثبت دفتر نظارت شد“ (ملازمین شاہی) دفتر خانہ میں درج ہونے والی (ارقام دفتری) دستاویزات کے برخلاف بعض دستاویزات کا وہاں اندراج نہیں ہوتا تھا (ارقام بیاضی) کیوں کہ یا تو ان کا تعلق مالی انتظامیہ سے نہیں تھا یا انہیں خفیہ رکھا جانا مقصود ہوتا تھا (دیکھیے تذکرۃ الملوک، ورق ۴۲ اور Busse : Untersuchungen، ص ۷۹)۔

دستاویز تیار کرنے کا کام یا تو بادشاہ یا کوئی اور عہدیدار براہ راست، یا بالواسطہ تحریری طور پر دیوان کے سپرد کرتا تھا۔ اصل کارروائی کا اندراج دستاویز میں ہوتا تھا۔ دور مغول میں بھی یہی طریق رائج تھا (دیکھیے Hinz : Die Resala-yl Falakiyya des Abdollah ibn Muhammad ibn Kiyā Wiesbaden 'al-Māzandarani، ۱۹۵۲ء، ورق ۱۴۴)۔

بعد، دسویں صدی ہجری/سولہویں صدی عیسوی تک ترکمانی دستاویزات میں اس تفصیل کا اندراج سامنے کی جانب کنارے کے نچلے حصے میں کیا جاتا تھا (دیکھیے سطور بالا)، لیکن گیارہویں صدی ہجری/ترہویں صدی عیسوی کے آغاز سے یہ اندراج پشت

مکتوب الیہ کے پاس پہنچانے سے قبل دستاویزات مالی انتظامیہ کے مختلف شعبوں (دفتر خانہ ہمایون اعلیٰ) میں بھیجی جاتی تھیں جہاں اعلیٰ عہدیدار توقیعات اور سپرین لگاتے اور دوسرے ملازمین سپرین و خط کے ذریعے ان دستاویزات کا مختلف رجسٹروں میں اندراج ہو جانے کی توثیق کرتے تھے (اس کی ایک اور صورت مثال کے طور پر عثمانی حکومت میں ملتی ہے جہاں یہ ملاحظات مسودے پر تحریر ہوتے تھے ان کی حیثیت محض دفتری حواشی کی ہوا کرتی تھی : Die siyaqaat-schrift in der türkischen : Fekete، Finanzverwaltung، ج ۱، بوداپست ۱۹۵۵ء، ص ۶۷، ۶۸، حاشیہ ۲)۔ توقیعات اور حواشی کا اندراج، مثلاً ہی فاطمہ کے عہد میں، آخری سطور کے درمیان کیا جاتا تھا (دیکھیے Grohmann در RSO، ۳۲، ۱۹۵۷ء : ۶۳۱ تا ۶۵۴)۔ لیکن ایران میں یہ پہلے پہل دستاویز کی پشت پر اور متن کے عموماً ہوتا تھا۔ ایلخانی دستاویزات میں بھی یہی صورت دیکھنے میں آتی ہے (دیکھیے Cleaves در HJAS، ۱۴، ۱۹۵۱ء : ۴۹۳ تا ۵۲۶)۔ اس سلسلے میں غازان خان نے لازمی ہدایات درج کرنے کا دستور بھی شروع کیا (دیکھیے رشید الدین، طبع Jaho، ص ۲۹۱ تا ۲۹۶)۔ سپروں اور حاشیوں کا ایک سلسلہ تیموری (دیکھیے Dony، کتاب مذکور)، ترکمانی اور ابتدائی صفوی دستاویزات (دیکھیے Busse : Untersuchungen، ص ۷۷ بعد) میں بھی ملتا ہے۔ گیارہویں صدی ہجری/ترہویں صدی عیسوی کے آغاز میں ایک قطعی ضابطہ نافذ ہوا جس پر دور قاجار کے آخر تک عمل درآمد ہوتا رہا۔ توقیعات ایک مذہبی کلمے مثلاً بَوَکَلَتَ عَلَی اَکْبَر (میں نے اللہ پر بھروسہ کیا) پر مشتمل ہوتی تھیں اور حواشی کے اندراج میں مسئلے کی نوعیت کا حوالہ بھی دیا جاتا تھا مثلاً ”ثبت دفتر توجیہ دیوان اعلیٰ شد“ (اس کا اندراج دیوان اعلیٰ کے باہر بھیجی جانے والی دستاویزات کے

برہونے لگا : اگر بادشاہ کا زبانی حکم براہ راست ملتا تو عبارت کے الفاظ یہ ہوتے "بالمشافۃ العالیۃ العالیۃ" ورنہ "وَحَسْبُ الْأَمْرِ الْأَعْلٰی" درج کیا جاتا۔ دوسری صورت میں رابطہ کا نام اس عبارت کے نیچے لکھا جاتا "قرار نوشتہ . . ." اس صورت میں کہ درمیانی شخص وزیر اعظم ہوتا، بصورت دیگر "برسالہ" لکھا جاتا۔ جب دستاویز کی تیاری کا حکم وزیراعظم یا کسی اور عہہ دار کی طرف سے صادر ہوتا تو حَسْبُ الْأَمْرِ الْأَعْلٰی کی عبارت حذف کر دی جاتی (دیکھیے Busse : Untersuchungen، ص ۵۹ بعد) معلوم ہوتا ہے کہ صفوی دور کے بعد سے ان تفصیلات کا اندراج متروک ہو گیا۔ جب ضابطے کی ان سب کارروائیوں کی پڑتال کر لی جاتی تو دستاویز کو اس طرح تہہ کر لیا جاتا کہ لکھا ہوا حصہ اندر کی طرف ہو جاتا۔ غیر ملکی بادشاہوں کے نام کے خطوط زینت کے ہر تکلف غلافوں میں رکھ کر بھیجے جاتے تھے۔ ان غلافوں پر ایک خاص سہر لگا دی جاتی تاکہ کوئی غیر متعلقہ شخص انہیں کھول نہ سکے۔

ابتدائی زمانے میں دستاویزات شاہی دیوان (دار الانشاء، دیوان الرسائل) میں منشی الممالک کے زیر نگرانی مرتب ہوتی تھیں، گیارہویں صدی ہجری/سترہویں صدی عیسوی سے "حکم جہان مطاع شد" کی (سیاہ روشنائی سے لکھے ہوئے) طغری والی دستاویزات وقائع نویس کے دیوان میں لکھی جانے لگیں جو غیر ملکی فرمانرواؤں کے نام خطوط کی تیاری کا بھی ذمے دار ہوتا تھا۔ اس سلسلے میں ایک اور تقسیم نظر آتی ہے، یعنی سرکار ممالک کے لیے اور سرکار خاصہ شریفہ کے لیے۔ اسور سلطنت سے متعلقہ دستاویزات (معہ طغری : فرمان ہمایون شرف نفاذ یافت یا فرمان ہمایون شد) منشی الممالک تیار کرتا تھا اور سرکار خاصہ شریفہ کی دستاویزات وقائع نویس۔ ان دو باختیار عہدیداروں کے علاوہ دفتر خانہ کے جداگانہ شعبوں کو بھی

دستاویزات کی تیاری کا اختیار دے دیا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر دور صفویہ میں یہ اختیار لشکر نویس کو نیز قزاقاسی، توپچی باشی، تفنگ باشی اور دوسرے حکام کے کاتبوں کو بھی حاصل تھا۔ ان دستاویزات میں کوئی طغری نہیں ہوتا تھا۔ صوبائی حکام کے اپنے دیوان تھے۔ مذہبی دستاویزات کی نوعیت بالکل جداگانہ تھی۔ کم اہم مواقع پر اگرچہ دوسرے ضابطوں کا خیال رکھا جاتا تھا (سہر، طغری) تاہم فیصلہ عرضداشت کے بالائی حاشیے پر درج کر دیا جاتا تھا۔ ماتحت اہلکاروں کے ضمنی حواشی اور اضافے نویں صدی ہجری/پندرہویں صدی عیسوی تک بین السطور لکھے جاتے تھے لیکن اس کے بعد دائیں حاشیے پر تحریر ہونے لگے (عبارت: مقرر است کہ . . . اور سہر کے ساتھ)۔ مذہبی فراسین میں اگر ضرورت ہوتی تو بادشاہ اپنے ہاتھ سے اضافے (حاشیہ بخط مبارک) کر دیتا تھا۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا، دیوان میں فارسی کے شعبے کے علاوہ غیر ملکی زبانوں کا شعبہ شاہان غزنہ کے عہد ہی میں قائم ہو چکا تھا۔ اسی سلسلے میں اگر ان اقوام کی تعداد پر نظر ڈالی جائے جن کے ساتھ خط و کتابت کی جاتی تھی، تو ایلخانی دیوان خاص طور پر جامع دکھائی دیتا ہے۔ (دیکھیے Die persische : Hinz west-östliche der Geheimkanzlei im Mittelalter Wiesbaden، ۱۹۵۸ء، ص ۳۳۵) شاہان تیموریہ عثمانی سلاطین کے ساتھ خط و کتابت کچھ عربی میں اور کچھ مشرق ترکی میں کیا کرتے تھے (Rieu، ۱ : ۳۸۹ : Kurat : کتاب مذکور، ص ۱۹۵ بعد) اور صفوی بادشاہ عثمانی ترکی میں (دیکھیے Iran Sahlarinia iki türkçe mektubu : Fekete، ۱۹۳۵ء : ۲۶۹ تا ۲۷۳) دور قاجار کے دیوان میں فرانسیسی کو بنیادی غیر ملکی زبان کا مرتبہ حاصل ہو گیا اور ابھی تک وہ اس درجے پر فائز ہے۔ اصل معاہدات اور توثیقات کو ان کے موقع

۲ جلد، ایوان ۱۹۵۶ء تا ۱۹۶۶ء) خاص طور پر بہت جامع ہیں، صفوی دستاویزات (جن میں دو ترکمانی بھی ہیں) کا ایک چھوٹا سا مجموعہ برٹش میوزیم میں ملتا ہے (suppl: Ricci) ص ۲۵۲ تا ۲۶۰، جس کا بیشتر حصہ Busse: Untersuchungen میں طبع ہو چکا ہے) اکادکا دستاویزات اور مکتوبات وٹیکن Vatican میں (A Chronicle of the Carmelites in Persia ضمیمہ B: اور اطالوی محافظ خانوں میں (دیکھیے F. Gabrieli: Re-lazioni tra lo scia 'Abbas e i Granduchi di Toscana Ferdinando I e Cosimo II در Lin 'Rend ۱۹۴۹ء) پولینڈ میں (H. S. Szapszal: Wyobrazenia swietych سوئڈن میں (K. V. Zettersteen: Tirkische tatarische und persische Urkunden im schwedischen Reichsarchiv Uppsala ۱۹۴۵ء) آسٹریا میں (وی آنا) اور جرمنی میں بھی (ڈریسڈن، دیکھیے Fekete: Iran Sahlarinin.....) موجود ہیں۔ ایران میں چھوٹے بڑے مجموعے نجی ذخیروں میں محفوظ ہیں۔ یہ تہران (حسین شاہ شاہانی، محمود فرہاد معتمد خان، سنک) اور تبریز (محمد وحسین آقا تہججوانی) میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ دوسرے مجموعے عجائب خانہ آثار قدیمہ تہران اصفہان کے چہل ستون، جلفای جدید کے ارمی کلیسا اور کتاب خانہ آستانہ مشہد میں محفوظ ہیں، جرمنی میں دستاویزات کا ایک چھوٹا سا مجموعہ ہے جسے ۱۹۳۸ء تا ۱۹۳۹ء میں Wilhelm Eilers (Würzburg) نے ایران میں مرتب کیا تھا (اصل دستاویزات نیز کتبات کی نقول) اور اب Hans R. Roemer (Mainz) کی ملکیت ہیں۔ مؤخر الذکر نے دو مقالات میں وہ تمام معلومات یکجا کر دی ہیں جو ۱۹۵۷ء تک مہیا ہو سکی تھیں: Vorschläge für die sammlung von Ur-kunden zur islamischen Geschichte Persiens ZDMG ۱۱۰، ۱۹۵۳ء: ۳۶۲ تا ۳۷۰ اور

اجراء کے اعتبار سے متمیز کیا جا سکتا ہے۔ موروٹی منصب داروں اور جاگیرداروں کی وفات، نیز حکومت میں تبدیلی آنے کے موقع پر توثیق کی ضرورت پیش آتی تھی۔ اکثر دستاویزات کے خاتمے پر امتناعی عبارت: "تجدید کے لیے ہر سال درخواست نہیں دی جائے گی" اغلب ہے کہ یہ نظر احتیاط درج کی جاتی تھی، عملاً سالانہ تجدید کا دستور عام نہیں ہوتا تھا۔ عملی سہولتوں کے پیش نظر دستاویزات کے مالک ان کی تصدیق شدہ نقلیں جاری کر سکتے تھے جو اصل جیسی ہی مستند تصور کی جاتی تھیں۔ جن فرامین کا تعلق لوگوں کے بڑے بڑے گروہوں یا رعایا کے کسی پورے فرقے سے ہوتا تھا، انہیں سرکاری عمارت و مقامات پر جہاں کر دیا جاتا تھا (دیکھیے Die persische Inschrift an der Mauer der Manichee Moschee zu Ani در ZDMG ۱۰۱، ۱۹۵۱ء، ۲۳۱ تا ۲۶۹: Hinz: steuerinschriften aus dem mittelalterlichen Vorderen Orient در Belleten ۱۲، ۱۹۴۹ء: ۷۳۵ تا ۷۶۹)۔

جو قدیم ترین دستاویزات محفوظ ہیں وہ دور ایلخانیہ کی ہیں (یہ زیادہ تر یورپ کے بادشاہوں کے نام منقول فرمانرواؤں کے مراسلے ہیں) آٹھویں صدی ہجری/چودھویں صدی عیسوی اور نویں صدی ہجری/پندرھویں صدی عیسوی کی کچھ ایرانی دستاویزات ایران (اور اس کی سرحدی ریاستوں) میں اور یورپ کے محافظ خانوں اور عجائب گوروں میں محفوظ ہیں صرف دور صفویہ اور زمانہ مابعد کی دستاویزات کثیر تعداد میں ملتی ہیں۔ اسی سلسلے میں گرجستانی دستاویزات (Persidskie firmani i ukazi: M. chubua) Muszeya Gruzii ج ۱، Tbilisi ۱۹۴۹ء اور Gruzino-persidskie istoriceskie: V. S. Puturidze A.D. (Tbilisi ۱۹۵۵ء) اور ارمی مآخذ (Persidskie dokumenti matenadarana: Papazyan

'Documenta islamica inedita' در 'lungsurkunden
 Berlin: H. Horst (۱۳): ۲۶۰ تا ۲۱۱ ص ۱۹۵۲ء
 Immunitätsdiplom Shah Muhammad Khudabandās
 vom Jahre 989/1381' در 'ZDMG' ج ۱۰۵ '۱۹۵۵ء
 Zwei Erlasse sah: وہی مصنف: (۱۵): ۲۹۷ تا ۲۸۹ ص
 'Tahmāsp I' در 'ZDMG' ج ۱۱۰ '۱۹۶۱ء ص ۳۰۱
 Two Safavid: Ann K. S. Lambton (۱۶): ۲۰۹ تا
 'soyūrghāl' در 'BSOAS' ج ۱۳ '۱۹۵۲ء ص ۴۳ تا
 Lettre de M. Khanikoff à M: Khanikoff: (۱۷): ۵۳
 Dorn ۱۶ ستمبر ۱۸۵۶ء در 'Melanges Asiatiques'
 سینٹ پیٹرز برگ: ج ۳ '۱۸۵۷ء ص ۷۰ تا ۷۳ (آخر دور
 صفویہ کی دستاویز): (۱۸): C. Speelman
 Reis van de Gezant der O. J. Compante Joan
 'A. Hotz' 'Cunaeus near Perzie in 1651-1652
 ایسٹرلم ۱۹۰۸ء (تعدد دستاویزات لفظی ترجمے کی صورت
 میں): (۱۹) محمود قرباد معتمد: تاریخ روابط سیاسی
 ایران و عثمانی: تہران: تاریخ نگار: (تعدد قاجاری دستخط
 ہای ہزاروں کے چرچے): (۲۰): H. L. Robino di Borgo
 Une lettre familière de Fath Ali chah: male
 در 'RMM' ج ۳۰ تا ۳۱ '۱۹۲۰ء ص ۱۳۱ تا ۱۳۵:
 (۲۱) محمد حسن خان: مرآة الابدان قاصری: ۳ جلدیں
 تہران ۱۲۹۳ھ (تقریباً ۷۰ دستاویزات کا متن): (۲۲)
 وہی مصنف: کتاب تاریخ منتظم قاصری: ۲ جلدیں: تہران
 ۱۲۹۸ تا ۱۲۹۹ ش (تقریباً ۳۰ دستاویزات جن میں
 ۲۱ دور صفویہ کی ہیں) زیادہ مفصل بیان کے لئے دیکھیے:
 Persische Diplomatie im Über-: H. Busse (۲۳)
 'Isl' در 'blick Ergebnisse und Probleme' ج ۳۷
 ۱۹۶۲ء

(H. Busse)

م۔ سلطنت عثمانیہ

ترکیہ میں دستاویزات کے آغاز کا سراغ سلطنت
 عثمانیہ کے ابتدائی ایام یعنی آٹھویں صدی ہجری/

Über urkunden zur Geschichte Agyptens und Persiens
 in islamischer zeit: ZDMG: ۱۰۷: ۱۹۵۷ء
 ۵: ۵۳۸ تا ۵۳۹

مآخذ: (۱) V. Minorsky: Some early

documents in Persian: JRAS: ۱۹۳۲ء ص

۱۸۱ تا ۱۹۳ء ص ۸۶ تا ۹۹: A. Moslaert (۲):

Trois documents mongols des: F. W. Cleaves و

Archives secrètes vaticanes: HJAS: ج ۱۵

The: F. W. Cleaves (۳): ۵۰۶ تا ۵۱۹ ص

Mongolian documents in the Musée de Teheran

HJAS: ج ۱۶ '۱۹۵۳ء ص ۱ تا ۱۰۷: (۴)

Ankarada bir ilhani kitabesi: P. Wittek

THITM: ج ۱ '۱۹۳۱ء ص ۱۶۱ تا ۱۶۴: (۵)

A soyūrghāl of Qāsim b. Jahāngir: V. Minorsky

BSOS: ج ۹ '۱۹۳۷ء

A Mongol decree: وہی مصنف: (۶): ۱۶۰ تا ۱۶۱

of 720/1320 to the family of Shaikh Zahid

BSOAS: ج ۱۶ '۱۹۵۳ء ص ۵۱۵ تا ۵۲۷: (۷)

The administration of: Ann K. S. Lambton

Sanjar's empire as illustrated in the 'Atabar

al-kafaba: در 'BSOAS' ج ۲۰ '۱۹۵۷ء ص

۳۶۷ تا ۳۸۰: (۸) محمود میر آفتاب: دستور الکاتب

فی تعیین المراتب: Ph. D کے لیے تحقیقی مقالہ: گونین

۱۹۵۶ء: (۹) Arsiv Kilavuzu: طبع مجلس منتظمہ سوزہ

طوب غبی سرای: ۲ کڑے: استانبول ۱۹۳۸ء تا ۱۹۴۰ء:

Note sur quelques documents Aq: J. Aubin (۱۰):

qoyunlu: در 'Mélanges L. Massignon' ۱۹۵۶ء

Note préliminaire: وہی مصنف: (۱۱): ۱۳۷ تا ۱۳۸

sur les archives du Tokya du Tschinia Rud

Un ferman d' Abu Nasr: خان ملک: (۱۲): ۱۹۵۵ء

Hasan Bahadur: در آثار ایران: ج ۳ '۱۹۳۷ء تا ۱۹۳۹ء

Zwei Steuerbefre: W. Hinz (۱۳): ۲ تا ۳

فرامین اور اسناد سفارت جیسی دستاویزات کی تجدید یا تصدیق کی جاتی تھی۔ تذکرہ نام کی دستاویزات "بویوق" تذکرہ جی کے دفتر سے جاری ہوتی تھیں اور مالیات سے متعلق دستاویزیں "دفتردار" کے محرر تیار کرتے تھے۔ دارالحکومت کے علاوہ صوبوں میں بھی چھوٹے درجے کے عہدے داروں کے اپنے کاتب ہوتے تھے اور انہیں اپنی دستاویزات کے اجراء کا اختیار حاصل تھا (دیکھیے *Staatsverfassung und Staatsverwaltung*: J. Hammer *des osman. Reichs*، وی انا ۱۸۱۵ء؛ اسمعیل حتی اوزون چارشیلی: عثمانی دولتی تشکیلاتی، ۱۹۳۵ء؛ نیز رگ بہ بیلاک۔

دستاویزات کی دو بڑی اقسام تھیں۔ پہلی قسم کی دستاویزات اعلانات اور پیغامات پر مشتمل ہوتی تھیں، مثلاً سلطان کے فرامین عام موسوم بہ نامہ۔ مکتوب، کتاب، یزی، پتی، توقع۔ سب سے زیادہ باضابطہ وہ شاہی اعلانات ہوتے تھے جنہیں "خط ہمایوں" کہتے تھے۔ ان اصطلاحات کا مفہوم کبھی معین نہیں رہا۔ اکثر اوقات ایک ہی دستاویز مختلف ناموں سے موسوم ہوتی رہی ہے۔ یہی حال دوسری قسم کی مختلف دستاویزات کا ہے جو احکام و فرامین و قوانین سے متعلق ہوتی تھیں، مثلاً فرمان، امر، حکم، یوزلندی [رک بان]؛ نیز رگ بہ ۱۔ ح۔ اوزون چارشیلی: بیورلندی، در بلتن، ۱۹/۵، ۱۹۳۱ء اور تقرر نامے (برات)۔ اہم ترین سرکاری دستاویزات کے نام مرکب ہوتے تھے، مثلاً عہد نامہ، ملک نامہ (یا تملیک نامہ)، صلح نامہ۔ ایک اور قسم کی دستاویزات کو نشان (سرکاری کاغذات، اسناد، پروانے وغیرہ)، منشور (کسی عہدے یا منصب پر تقرر کی دستاویز)، مثال اور عرض حال وغیرہ کہا جاتا ہے۔ بعض اوقات دستاویزات کے نام بڑے جامع اور معنی خیز ہوتے تھے، مثلاً نشان شریف عالی شان، فرمان بشارت عنوان وغیرہ۔ یہ نام صرف ان دستاویزات کے لیے مخصوص تھے جنہیں خود سلطان یا اس کے اعلیٰ ترین اہلکار اور سرکاری دفاتر کے محرر

جو دھویں صدی عیسوی تک لگایا جا سکتا ہے۔ اس کا نظام ایشیائی ترکوں کے لائے ہوئے ان نمونوں پر مبنی تھا جن کا ارتقا وسط ایشیائی ریاستوں میں ہوا، چنانچہ اس کے طرز میں اویغوری اور چینی روایات کا امتزاج تھا۔ دوسری طرف اس کی تنظیم زیادہ تر یورپی اور بالخصوص یورپ کی سلطنت کے قائم کردہ طریق کار پر ہوئی۔ تاتاری، یعنی آلتون اردو اور قریم کے مغول کی دستاویزات میں بڑی حد تک وسط ایشیائی نمونوں کی تقلید کی جاتی تھی اور ان میں اویغوری اور بالواسطہ طور پر چینی دستاویزات کے اثرات نمایاں تھے۔ اس امر کی شہادت سولہویں صدی عیسوی سے سترھویں صدی عیسوی تک کی ان ایرانی دستاویزات سے ملتی ہے جن پر سوز و موز کا عنوان قائم ہے (دیکھیے *Arbeits der grusinischen*: L. Fekete *Orientalistik auf dem Gebiete der türkischen und persischen Palaeographie und die Frage der Formel "sözümüz"* در *A O Hung*، ۱۹۵۷ء)۔ پندرھویں صدی سے ترکی دستاویزات کے محض چند ایک مقررہ نمونے ہیں جو پندرھویں صدی سے یکساں صورت میں مروج چلے آ رہے ہیں (دیکھیے *F. Kraelitz Greifen*۔ *horst*، در *SbAK Wien*، ۱۹۲۱ء و *TOEM*، ج ۲۸ و *P. Wittek*، در *WZKM*، ۱۹۵۷ء)۔ دستاویزات، جنہیں عموماً اوراق اور وثیقہ کہا جاتا تھا، باب عالی کے دیوان الانشاء سے جاری کی جاتی تھیں۔ سلطان یا وزراء کی طرف سے ہونے والے اعلانات کی اہم دستاویزات کا اجرائے لک یا بے لک قلمی کے دفتر سے ہوتا تھا، جو باب عالی کے صدر دیوان کا ایک خاص شعبہ اور قبل ازیں دیوان ہمایوں قلمی کے نام سے معروف تھا۔ بیشتر دستاویزات پر کاتب، نسخ اور بے لک جی (مہتمم دیوان) اپنے اپنے دستخط کرتے تھے۔ پھر انہیں رئیس افتدی کے پاس اس کی سہر (رسید) ثبت کرنے کے لیے بھیج دیا جاتا تھا۔ زیادہ اہم معاہدوں کی جانچ پڑتال "نشان جی" کرتا تھا۔ ان پر اس کے طغریٰ کا ہونا ضروری تھا۔ دیوان تکویل میں تقرر ناموں،

اور نمونہ ہمیشہ یکساں رہتا ہے۔ طغریٰ ایک محرر بڑی احتیاط سے تیار اور درج کرتا تھا جو اسی کام کے لیے مخصوص ہوتا تھا اور طغریٰ کش کہلاتا تھا۔ طغریٰ رنگین بنایا جاتا تھا، اس کی اصل کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا (دیکھئے اوزون چارشلی، در بختن، ج ۵، ۱۹۳۱ء؛ P. Wittek؛ Byzantion، ج ۱۸، ۱۹۳۸ء اور ج ۲۰، ۱۹۵۶ء؛ F. Kraelitz-Greifenhorst، در MOG، ج ۱؛ F. Babin؛ Sarre-Festschrift، ger؛ P. Miyatev؛ ۱۹۲۵ء؛ Tugrite na osmanskite sultani ot XV-XX vek، Godischnik na plavdivska narodna biblioteka i muzei 1937-1939ء، صوفیہ، ۱۹۳۰ء؛ E. Kühnel؛ Die osmanische Tughra، Wiesbaden، ۱۹۵۵ء؛ نیز رگ بہ طغریٰ)۔ اعلیٰ عہدیداروں کی طرف سے جاری کردہ دستاویزات پر طغریٰ کے بجائے ایک اور علامت پانچہ درج ہوا کرتی تھی۔ اسے دستاویز کے شروع میں نہیں بلکہ اس کے دائیں یا بائیں حاشیے پر یا طومار کے نچلے حصے میں ثبت کیا جاتا تھا۔ بعض اوقات اسے امضاء اور غلطی سے طغریٰ بھی کہتے تھے (F. Kraelitz؛ Studien zur osmanischen Urkundenlehre، J. Griefenhorst؛ Die Handfeste (Pençe) der osmanischen Westre، در MOG، ج ۲)۔ (۳) ”عنوان“ یعنی اس شخص کا لقب جس کی طرف سے مکتوب لکھا جا رہا ہو۔ دستاویزات سلطانی میں القاب بالخصوص بہت لمبے چوڑے ہوتے تھے اور اس سلسلے میں رسوم و آداب کا بے حد لحاظ رکھا جاتا تھا اور اس کی عبارت حسب دستور ”پن کہ“ سے شروع ہوتی تھی (دیکھئے Tugralarda el muzaffer da'lma duasi؛ Orgun Zariif ve Sah unvanl, Türk Tarih, arkeol. ve etnogr dergisi، استانبول ۱۹۳۹ء)۔ (۴) پتا یا مکتوب الیہ کے القاب، جو اہم دستاویزات میں خصوصاً بہت طویل ہوا کرتے تھے اور ان کی عبارت کا آغاز ”پن کی“ یا ”حالا“ سے

جاری کرتے تھے۔ ان کے علاوہ ایسے احکام بھی ہوتے تھے جنہیں اذنیہ درجے کے اہلکار جاری کرتے تھے، جیسے تذکرہ، تلخیص، تحریر، دفتر، وغیرہ۔ ان کے مقابلے میں غیر ملکی سفارتوں کے ارکان جو اسناد اور پروانے ترکی حکومت کے سامنے پیش کرتے تھے انہیں ”تقریر“ کہا جاتا تھا۔ دستاویزات کی ایک اور قسم وہ تھی جو مذہبی حکام (بالخصوص شیخ الاسلام) جاری کرتے تھے، عرف عام میں انہیں فتویٰ کہتے تھے اور ان کا تعلق تنازعات و اختلافات کے فیصلوں سے ہوتا تھا۔

بحیثیت مجموعی ترکی دستاویزات اور یورپی دستاویزات میں بہت مشابہت نظر آتی ہے؛ عین ممکن ہے کہ ہیئت اور طرز کے اعتبار سے یہ یورپنی دستاویزات کے چرچے ہوں۔ ترکی دستاویزات دو حصوں میں تقسیم کی جاسکتی ہیں: پہلا حصہ (ابتدائی اور اختتامی عبارتیں) آداب و رسوم پر اور وسطی حصہ اصل متن پر مشتمل ہوتا ہے۔ بعض باتیں ہر ترکی دستاویز میں ملتی ہیں: آرکان: (۱) دعوت، یعنی مناجات جو ایسی عبارت پر مشتمل ہوتی ہے جس میں والی (پے) کا نام شامل ہوتا ہے، اس میں ہو جیسے سادہ ترین کلمے سے طویل ترین القاب تک استعمال ہو سکتے ہیں (Fr. Kraelitz؛ Osmanische Urkunden in türkischer Sprache، در SbAK Wien، ۱۹۲۱ء) میں اس کی متعدد مثالیں دی ہوئی ہیں)۔ ابتدائی عبارت کے بعد کسی قدر دائیں جانب تھوڑی سی خالی جگہ چھوڑی ہوتی ہوتی ہے (صرف سلطان کی جانب سے جاری شدہ دستاویزات میں) جس کے نیچے (۲) طغریٰ، یعنی سلطان کی امتیازی علامت یا نشان درج کیا جاتا ہے، جسے نشان ہمایوں، توفیق یا علامت بھی کہتے ہیں، ہر سلطان کی علامت مختلف نمونے کی ہوتی ہے۔ نشان سلطان، سلطان کے نام اور جملہ القاب و دیگر امتیازات اور عبارت ”مظفر دالسا“ پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کے چاروں طرف ایک آرائشی حاشیہ ہوتا ہے جس کی شکل

”شویہ یلہ پسر“ جیسی عبارت کا اضافہ کر دیا جاتا تھا جس کے ساتھ (حکام اعلیٰ سے متعلق) لعنت یعنی عدول حکمی کی صورت میں سزا کی دھمکی بھی درج کر دی جاتی تھی۔ اس کے بعد ایک (۸) عبارت تصدیق آتی تھی، جیسے یورپی corroboratio کے مترادف قرار دیا جا سکتا ہے، مثلاً ”بتی تحقیق پلُوب اعتماد قَلہ پسر“۔ (۹) تاریخ، ایک عربی عبارت کی صورت میں درج کی جاتی تھی، مثلاً تحریر آئی۔ اس کے بعد مہینے کا عشرہ، مہینے کا نام اور سال تحریر کیا جاتا تھا۔ اعداد حروف میں بلا اعراب لکھے جاتے تھے۔ عموماً مہینوں کے نام ان کے صفاتی لاحقوں کے ساتھ آتے تھے، جیسے رمضان شریف۔ دن کے نام کے بجائے بالعموم عشرہ ماہ درج کیا جاتا تھا۔ پہلے عشرے کو اوائل، دوسرے کو اواسط اور تیسرے کو اواخر کہتے تھے۔ مہینے کا پہلا دن غرہ، آخری سلخ اور وسط ماہ منتصف کہلاتا تھا۔ کسی مہینے کا نام لکھتے وقت اس کی اختصار شدہ صورت تحریر ہوتی تھی۔ خط سیات میں لکھی جانے والی دستاویزات میں اسی اصول کی پابندی ہوتی تھی۔ اختصار شدہ صورتوں سے سال کے ربعوں کے نام بنائے جاتے تھے (پہلا ربع موشیر، دوسرا رجب، تیسرا ریشن اور چوتھا اذہ ہے)، دیکھیے J. H. Mordtmann، در ISL، ج ۹، Kraelitz و Greifenhorst، در ISL، ج ۸، J. Mayr، Islamische Zeitrechnungen، در MSOS، ج ۳۰، ۱۹۲۷؛ H. Šabanović، Izrazi evašil, ewasit i evahie u datami-، Prilozi za Orijentalnu i ma turskih spomenika، J. filologiju، ج ۱، ۱۹۵۰؛ (۱۰) مقام اشاعت یا مقام اعلان تاریخ کے بعد درج ہوتا ہے اور یہاں وہی عام عبارت ”بمقام . . .“ لکھی جاتی ہے۔ پھر شمار کا نام (بعض اوقات ایک موزوں اسم صفت کے ساتھ) تحریر کیا جاتا ہے اور اکثر اس کی کیفیت بھی بیان ہوتی ہے۔ اگر دستاویز سفر کے

ہوتا تھا۔ نام اور القاب کے علاوہ (جہاں تک مسیحی فرمانرواؤں کا تعلق ہے) بعض ایسی عبارتیں بھی لکھی جاتی تھیں جو عرصے سے مروج تھیں، مثلاً ”مسیح کے شاہان عالی کا نمونہ کامل“، ”امت مسیح“ کے عمائدین ذی شان کا نمونہ“ وغیرہ۔ مکتوب الیہ کے نام کے بعد (۵) دعا آتی تھی، مثلاً ایک مختصر سی عبارت میں لکھنے والے کی نیک خواہشات کا اظہار ہوتا تھا جسے یورپی دستاویزات میں مندرجہ آداب و تسلیات کا مترادف سمجھنا چاہیے۔ اگر مکتوب الیہ مسلمان ہوتا تو اس عبارت میں دعائے خیر و برکت ہوتی اور اس کی حفاظت کے لیے اللہ تعالیٰ سے التجا کی جاتی۔ اگر خط کسی مسیحی کے نام ہوتا تو اس عبارت میں کتابت یہ توقع بھی ظاہر کی جاتی تھی کہ اس کا خاتمہ اسلام پر ہو، مثلاً ختمت عواقبہ بالخیر، دیکھیے Ostrup: Orientaliske Hofflighedsformler، کوپن ہیگن ۱۹۲۷ء، ص ۸۵ تا ۸۸ (جرمن ترجمہ Orientalische Höflichkeit، لائپزگ ۱۹۲۹ء)۔ آداب و القاب کے ابتدائی حصے کا خاتمہ دعا پر ہوتا تھا۔ اصل متن کی طرف گریز ایک مخصوص عبارت سے ہوتا تھا مثلاً ”جب یہ تحریر آپ کے ہاتھ میں پہنچے تو واضح ہو کہ۔۔۔“ اس کے بعد (۶) نقل ابلاغ یا تصریح، یعنی خط یا دستاویز کا اصل متن لکھا جاتا تھا، جس میں اس تحریر کے لکھے جانے کی وجوہ اور سابقہ عطیات اور مراسلات کا ذکر کیا جاتا۔ بعض اوقات اس کا آغاز ”آرلگ“، یعنی معافی اور اعتذار سے ہوتا جس میں کبھی کبھی کوئی قرآنی آیت یا ضرب المثل بھی شامل کی جاتی۔ غیر ملکی فرمانرواؤں کو بھیجی جانے والی دستاویزات میں بیانیہ حصے اور عبارت مابعد یعنی (۷) ”فیصلے“ میں کوئی تمیز نہیں کی جاتی تھی، جس کے ابتدائی الفاظ حکم یا امر ہوتے تھے۔ اس عبارت میں اپنے فیصلے یا ارادے کا اظہار کیا جاتا تھا، جس پر زور دینے کے لیے لفظ تاکید کا استعمال ہوتا تھا اور

دوران میں یا بڑاؤ پر لکھی گئی ہو تو کلمہ بیورت استعمال کیا جاتا ہے۔ آخر میں (۱۱) مہر یا خاتم ثبت ہوتی ہے، جس سے دستاویز کی تصدیق مقصود ہوتی ہے۔ مہر جینی روشنائی سے نم دار کاغذ پر لگائی جاتی ہے جو مختلف سائزوں اور قطعوں کی ہوتی ہے، گول، بیضوی، مربع، کثیرالاضلاع وغیرہ اور اس پر کندہ عبارت، کاتب کے نام، مذہبی کلمات اور تزئینات پر مشتمل ہوتی ہے (دیکھیے اسعمریل حمی اوزون جارشلی، در بلن، ج ۴، ۱۹۴۰ء؛ نیز [رک بہ مہر]۔ تحریر کے سامنے کے صفحے پر یا اس کی پشت پر اسے مستند اور مصدقہ قرار دینے کے لیے دیوان انشاء کے عہدیدار مختلف تصدیقی عبارات مثلاً صحہ (صحیح) درج کرتے ہیں۔ اکثر اوقات بعض اصطلاحات کی اختصار شدہ صورتیں بھی دیکھنے میں آتی ہیں، مثلاً بمعنی مرقوم اور نہ بجائے اللہ وغیرہ۔

عام طور پر ترکی محافظ خانے کی دستاویزات مقامی زبان (ترکی) میں تحریر کی جاتی تھیں لیکن ایسی دستاویزیں بھی ملتی ہیں جو یونانی، قدیم سلاوی (سرلی Cyrillic رسم الحظ میں) اور ہنگروی میں ہیں اور ان پر اصلی طغری یا پینچہ ثبت ہوتا ہے۔ بعض جگہ ترکی متن کے ساتھ اطالوی، پولش وغیرہ میں ترجمہ بھی منسلک ہوتا ہے یا اس متن کو لاطینی، یونانی اور آرمینی حروف میں لکھ دیا جاتا ہے۔ قازان خانیوں اور آلتون اردو کی دستاویزات، جو پندرھویں صدی عیسوی میں سلاطین کو ارسال کی گئی تھیں، اویغور زبان میں تحریر ہوتی تھیں۔ ان میں وسط ایشیائی دستاویزات کی خصوصیات ملتی ہیں۔ ترکیہ کی سیاسی حکمت عملی کے باعث زیادہ رسمی اور باضابطہ دستاویزات لکھنے کا اسلوب رائج ہوا۔ ہر منظر کا بایاں سرا اوپر کی جانب گولائی کی صورت میں مڑ جانا تھا جس سے خمدار سرے والی تلوار کی سی شکل بن جاتی تھی۔ آرائش میں زیادہ باریکی پیدا کرنے کے لیے

ہر سطر کا آخری حرف بیضوی صورت میں لکھا جاتا تھا (عموماً نون، راء یا تاء)۔ رسم الخط دیوانی استعمال کیا جاتا تھا جسے توقع بھی کہتے ہیں اور اس کی مختلف صورتیں مستعمل تھیں [رک بہ خط]۔ بسا اوقات مناجات ثلث میں لکھی جاتی تھی اور باقی متن دیوانی حروف میں۔ جن دستاویزات پر ادنیٰ درجے کے عہدیداروں کے دستخط ہوتے تھے وہ خط نسخی اور دیوانی میں لکھی جاتی تھیں (دیکھیے Eski yazıları okuma : Mahmut Yazır، anahatları، استانبول ۱۹۴۲ء)۔ مالیات سے متعلق دستاویزات حروف سیاق میں لکھی جاتی تھیں، جن کا بڑھنا بہت مشکل ہے (دیکھیے Die Siyâqut- L. Fekete، Schrifi in der türkischen Finanzverwaltung، ج ۱، ۲۹، ۱۹۵۵ء؛ Paleografski : N. Popov، ۱۹۵۵ء؛ asobenosti na čislitelne imena v pismoto siyakat صوفیہ ۱۹۵۵ء)۔

سرکاری دستاویزات بالعموم دائیں جانب خاصاً چوڑا حاشیہ (کنار) چھوڑ کر لکھی جاتی تھیں اس پر ملاحظات حواشی (دیرکنار)، یعنی وہ اہم نکات لکھے جاتے تھے جن پر جواب کا متن مبنی ہوتا تھا۔ لکھنے کے لیے بالعموم سیاہ چینی روشنائی استعمال کی جاتی تھی بعض اوقات سیاہی سے لکھے ہوئے حروف پر سنہری ریت (آلتن ریگ یا رہ) بکھیر دی جاتی تھی۔ دستاویزات کے لیے آبی نشان والا موسمی کاغذ استعمال ہوتا تھا جو اکثر اطالیہ سے درآمد کیا جاتا تھا (دیکھیے F. Babinger، در OM، ج ۱، ۱۹۳۱ء)۔ کاغذ کے اوراق لمبوترے، مستطیل شکل کے، تقریباً ۵۰ سینٹی میٹر لمبے اور ۲۰ سینٹی میٹر چوڑے ہوتے تھے۔ سلطانی مراسلات اور بین الاقوامی معاہدے بعض اوقات کئی کئی میٹر لمبے ہوتے تھے۔ عام طور پر دستاویزات کو چوڑائی کی طرف سے چٹ ڈال کر تہہ کیا جاتا تھا۔ چنانچہ جب اس کی تہہ کھولی جاتی تو رسمی آداب و القاب والا افتتاحی حصہ سب سے پہلے نظر کے سامنے

دستاویزات کی نقول اور وصول شدہ مراسلات مخصوص دفاتر میں محفوظ رکھے جاتے تھے۔ انہیں دفاتر نے آگے چل کر محافظ خانوں کی صورت اختیار کر لی (رگ بہ باش وکالت ارشوی و Glavni: F. Bajraktarević Prilozi za Carigradski arhivi i ispiši iz niega orijentalnu filologiju i istoriju jugosl naroda ج ۶ و ۷، سراجوو ۱۹۵۸ء)۔

تعدد ترکی دستاویزات ان ممالک میں محفوظ ہیں جو کسی زمانے میں سلطنت ترکیہ کا حصہ تھے، مثلاً مصر (دیکھیے J. Deny: *Sommaire des Archives turques du caire*، قاہرہ ۱۹۳۰ء)، تونس (دیکھیے R. Mantran: *Les Cahiers de Tunisie*، ۱۹۵۷ء)، ص ۳۳۱، یمن (دیکھیے V. Todorov: *Godišnik na Narodna Biblioteka*، صوفیہ ۱۹۲۳ء، P. Mutačiev: *Mitteilungen des deutsch. wissenschaft. Instituts in Sofin*، ۱۹۳۳ء، P. Miyatev: *Leviltari Kozlemények*، ۱۹۳۶ء، B. Nedkov: *Istorički Pregled*، ۱۹۳۶ء، F. Giese: *Turski izvori za Festchrift Jacob H. Šabanović*، بلغراد ۱۹۳۲ء، *Istorijsku Jugoslavena Prilozi za orijentalnu filologiju*، ج ۱، سراجوو ۱۹۵۰ء، R. Muderizović: *Turski dokumenti v dubrovackom arhivu*، Zem. Muz Documentele turcesti din arhivele: M. Guboglu: *Statului*، بخارست ۱۹۵۷ء)۔ یونان میں بہ دستاویزات نسبتاً کم تعداد میں ہیں (دیکھیے E. Rossi: *Ost*، ج ۲، ۱۹۳۱ء)۔ ان دستاویزات کی بہت بڑی تعداد سفارتی ذرائع سے مال غنیمت کے طور پر یا تجارتی تعلقات کے ذریعے غیر ملکی مجبوعوں میں پہنچی ہے، خاص طور پر ان ممالک کے ذخیرے بہت باثروت ہیں

آتا۔ زیادہ لمبی دستاویزات طومار کی صورت میں لپیٹی جاتیں۔ ہر ایک دستاویز ریشمی غلاف (کیسہ) میں رکھی جاتی جیسے اوپر سے کس کر بندھ دیا جاتا۔ کاغذ کی ایک پرچی باہر کی طرف لٹکی ہوئی ہوتی، جس پر پتا یا "قلی" تحریر ہوتا۔

نقول (صورت) تیار ہونے کے بعد فائلوں (مشتات) میں سی کر بکجا کر دی جاتی تھیں۔ ان پر صرف متن تحریر ہوتا تھا اور کسی قسم کے حواشی، آراء، طنز یا ٹکٹ ثبت نہیں ہوتے تھے۔ عام طور پر دائیں حاشیے پر متن کی ابتدائی سطروں کے بالکل قریب اس مطلب کی ایک قانونی عبارت (یا العموم) عربی میں تحریر ہوتی تھی کہ نقل اصل کے عین مطابق ہے: اسے امضاء یا توثیق قاضی کہا جاتا تھا (دیکھیے F. Kraelitz-Greifenhorst: *Legalisierungsformeln in Abschriften osmanischer kaiserlicher Erlasse und Handschriften*، ج ۱، ۱۹۲۶ء)۔ یہ بتانے کے لیے کہ یہ محض نقل ہے اور اصل نہیں، یزیدچک، گوندریلہ جق، ارسال اولوں جیسے کلمات استعمال ہوتے تھے۔ دستاویزات کے رجسٹر رکھے جاتے تھے جن میں نقول یا خلاصوں کی قسم کے جو اندراجات ہوتے، انہیں دفتر یا سچل کہتے تھے۔

ترکی سرکاری و سیاسی دستاویزات کے اسلوب اور اصطلاحی زبان کا ارتقاء سترھویں صدی عیسوی تک جاری رہا تا آنکہ ان کی صورت متعین ہو کر ان میں یکسانی پیدا ہو گئی۔ اسیسویں صدی عیسوی کی تحریر بالکل مطبوعہ نظر آتی ہے۔ ترکی دستاویزات کے اسلوب و زبان کا اثر کسی حد تک کرویہا کے مغول کے مختلف رسم و رواج پر پڑا۔ اسی طرح ایران میں دستاویز نویسی بھی اس سے متاثر ہوئی۔ ایرانی بادشاہ کے رئیس دیوان الانشاء کے دفتر سے مرسلہ متعدد مکتوبات ترکی میں لکھے گئے تھے (دیکھیے L. Fekete: *در تورکیات*، مجموعہ ص ۱۵، ۱۹۳۶ء)۔

”تعارف“ میں تاریخ دستاویز نویسی کے اس مخصوص میدان میں تحقیقات کی ترقی سے متعلق بڑی قیمتی معلومات شامل ہیں۔

۱۹۵۵ء میں ایک کتاب نصاب - A. Zajackowski Jan Reychman نے وارسا سے شائع کی : *An outline history of Ottoman Turkish Diplomatic (Zarys dyplomatyki osmańsko-tureckiej)* - اس کتاب کا ایک انگریزی ترجمہ بعنوان *A manual of Ottoman Turkish Diplomatics* جس میں خاصے اضافے بھی کیے گئے تھے۔ ۱۹۵۸ء میں ایک رومانی عالم M. Guboglu نے *Paleografia, și diplomatica turco-osmană* بخارست ۱۹۵۹ء جس میں ”چربوں“ کے علاوہ رومانی محافظ خالوں سے حاصل کردہ دو سو تین ترکی دستاویزات شامل ہیں۔ اس کتاب میں مصنف نے ترکی دستاویز نویسی اور دستاویزات کے موضوع پر نئی اور مفید معلومات درج کی ہیں۔

مآخذ : مذکورہ بالا تصنیفات کے علاوہ دیکھیے

(۱) *Das Archiv des Bosniaken Osman* : F. Babinger
(۲) *Pascha* : L. Fekete
(۳) *des chartes turques et ses problèmes* : G. Jacob
(۴) *Türkisches Hilfsbuch* : J. Reychman
(۵) *Die Schreiben der türkischen Sultane* : H. Scheel
(۶) *an die preuss. Könige* : P. Wittek
(۷) *Vesikalari* : P. Wittek
(۸) *Zu einigen frühosmanischen Urkunden* : J. Reychman
(۹) *WZKM* : J. Reychman
(۱۰) *A. török oklevelek nyelvezete és for.* : L. Fekete
(۱۱) *rdértéke* : L. Fekete
نیز رگ بہ ہاش وکالت آرشیوی، برات، بلاق، یورلندی، دفتر دارالمحفوظات المصومیہ، خط، سہر، سبیل، طغراء، وثقہ۔
(A. ZAJACKOWSKI و J. REYCHMAN)

جن کے ترکی کے ساتھ بہت قریبی سیاسی یا کسی اور طرح کے روابط رہے ہیں، مثلاً آسٹریا (دیکھیے F. Zsinka، در RCA، ج ۱)؛ جرمنی (برلن اور ڈرسڈن کے مجموعوں کے بارے میں دیکھیے L. Fekete، در *Levélár*، *Közlémények*، ۱۹۲۸-۱۹۲۹)؛ ہنگری و پولینڈ (دیکھیے E. Zawalinski، در RO، ج ۱۴، ۱۹۳۸ء اور *Przegląd Orient* : Z. Abrahamowicz، ۱۹۵۸ء ص ۲)؛ اٹلی (دیکھیے A. Bombaci، در RSO، ج ۱۸، ۱۹۳۹ء و *Levélár Közlémények*، در *Levélár Közlémények*، ج ۱۹۳۹ء)؛ اور سوویٹ یونین - متعدد دستاویزات مندرجہ ذیل ممالک میں بھی ملتی تھیں : (دیکھیے K. V. Zettersteen : *Türkische, tatarische und persische Urkunden im schwedischen Reichsarchiv*، *Mittel.* : H. Duda (دیکھیے *d. Instit. f. Oesterreich. Geschichtsforschung*، ۱۹۵۰ء)؛ برطانیہ (دیکھیے P. Wittek : *The Turkish documents in Hakluyt's 'Voyages'*، در *Bull. of Inst. of Hist. Research*، ج ۱۹، ۱۹۴۲ء اور *Ingiliz devlet arşivinde... Türkiye* : A.N. Kurat، *AÜDTCFD*، *tarihine ait bazı malzemeye ait*، ۱۹۴۹ء)؛ اور چیکوسلوواکیہ وغیرہ (دیکھیے مآخذ از *Zarys dyplomatyki* : A. Zajackowski و J. Reychman، *osmańsko-tureckiej*، وارسا ۱۹۵۵ء، انگریزی ایڈیشن زیر طبع)۔ کئی مجموعوں کی صف بندی ہونا باقی ہے۔ آج کل چند ایک کی فہرست تیار کی جا رہی ہے۔

مطبوعہ ترکی دستاویزات کے مکمل ترین اور جامع ترین مآخذ کے لیے دیکھیے A. Zajackowski و J. Reychman : (انگریزی ایڈیشن) : L. Fekete نے ترکی دستاویزات کی پہلی کتاب نصاب : *Bevezetés a hodo* : *Iság török diplomatikájába*، بوڈاپسٹ ۱۹۲۶ء، شائع کی، اس میں ایک ”تعارف“ اور اس کے بعد دستاویزات کی عکسی تصاویر کا ایک سلسلہ شامل ہے۔

بن ابی المجد عبدالعزیز [بن قریش بن محمد] معروف بہ ابو العینین، بانی سلسلہ دوستیہ جسے برہانہ یا برہامیہ بھی کہتے ہیں اور جس کے پیرو عموماً براہمہ کہلاتے ہیں۔ اغلب یہ ہے کہ ان کی ولادت قریہ مرئس میں جو زیوریں مصر کے ضلع غریہ میں ہے، ۶۳۳/۶۲۵ء میں ہوئی، جیسا کہ الشمرانی نے لواقع میں کہا ہے (مگر المقریزی: کتاب السلوک میں سال پیدائش ۶۳۴/۶۲۶ء دیا گیا ہے اور حسن بن علی شامہ، جس نے الدسوق کی حزب کی شرح لکھی ہے، ۶۵۳/۶۵۵ء بتاتا ہے)۔ الدسوق نے اپنی عمر کا زیادہ حصہ اپنے آریب کے ایک گاؤں دسوق کے گرد و نواح میں گزارا، اور وہیں ۳۳ سال کی عمر میں ان کی وفات ہوئی اور وہیں دفن ہوئے۔ ان کے والد (جو مرقس میں مدفون ہیں) ایک مشہور مقامی ولی تھے اور ان کے نانا ابو الفتح الواسطی ضلع غریہ میں رفاعی نرقے کے سربراہ اور خلیفہ اور امام تھے (الشمرانی: واقع، ۱: ۱۷۶)۔ یہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ واسطی نے اپنے ایک شاگرد محمد بن ہارون کے ساتھ (وہی کتاب، ج ۲: ۳) جو ممکن ہے کہ ابراہیم کے والد کا مد مقابل ہو، مل کر، پہلے پہل اس افسانے کی ابتدا کی کہ ابراہیم مادر زاد ولی ہے کیونکہ اس نے پیدا ہونے ہی رمضان کے شروع ہونے کی شہادت دی اس طرح کہ شعبان کے آخری دن پیدا ہوا اور دوسرے دن ماں کا دودھ نہیں پیا۔ قحہ شافعی کا مختصر مطالعہ کرنے کے بعد ابراہیم صوفی بن گئے۔ انہوں نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی اور ان کی وفات کے بعد ان کے جانشین ان کے بھائی شیخ موسیٰ ہوئے۔

ان کی تصانیف یہ ہیں: الجواهر (جس کے طویل اقتباسات الشمرانی کی لواقع میں دیے گئے ہیں) جو زیادہ تر مبتدیوں کے لیے ہدایات اور عملی احکام کا مجموعہ ہے؛ الجواهرۃ میں ان کی کرامات کا بیان ہے؛ اور الحقائق میں وہ مناجاتیں درج ہیں جو

نہر بیان کرتے ہیں جس کے ارد گرد کھجوروں کے جھنڈ کے جھنڈ اور بہ کثرت مزروعہ اراضی ہے۔ وہ یہاں کی گزبھی کا بھی ذکر کرتے ہیں جسے غالباً عربوں نے پایا تھا (الاسطخری، ص ۸۷: ابن حوقل، ۱: ۷۳۶)، لیکن المندسی (۵۳۷/۵۹۸ء) نے اسے ایک چھوٹا سا قصبہ پایا تھا جس میں ایک لمبا بازار تھا (ص ۱۲۱، قتب ص ۵۳)۔ ساتویں صدی ہجری/تیرھویں صدی عیسوی میں دسکرہ کی رونق کم ہو گئی۔ یاقوت مرآصد، کی پیروی کرتے ہوئے اسے محض ایک چھوٹا سا گاؤں لکھتا ہے (یاقوت، ۲: ۵۷۵: دیکھیے ۳: ۲۲۷: مرآصد، ۱: ۳۰۲)۔ یہ معلوم نہیں کہ دسکرہ کب اجڑا۔

عرب جغرافیادان قدیم دستجرد کے کھنڈر دیکھ کر متاثر ہوتے تھے۔ یعقوبی (البلدان، ص ۲۷۰) یہاں کے قدیم شاہان ایران کی قابل دید عمارتوں کا ذکر کرتا ہے اور ابن رستہ (ص ۱۶۳) ایک مسافاتی محل کا، جس کے گرد بلند و بالا دیوار تھی۔

‘دستجرد۔ دسکرہ’ کے کھنڈر آج کل شہریان کے جنوب میں تقریباً ۹ میل کے فاصلے پر دیالی کی بائیں جانب دکھائی دیتے ہیں (Herzfeld نے ۱۹۰۵ء میں ان کا ذکر کیا تھا)۔ مسلم عہد کے دسکرہ کے کھنڈر ایسی ہی بغداد کہلاتے ہیں۔ یہ تقریباً نصف میل سرے کا وقبہ گھیرے ہو ہیں جن کے گرد مدور برجوں والی فصیل بنی ہوئی ہے۔

ماآخذ: علاوہ ان ماخذ کے جو متن مقالہ میں جان کیے گئے درج ذیل: (۱) یاقوت: المستدرک، طبع و شغل Wilstenfeld ص ۱۷۹: (۲) ابن دلف: الرسالة الثانية، طبع و ترجمہ از V. Minorsky، قاہرہ ۱۹۵۵ء: (۳) Le Strange ص ۶۱: (۴) Erdkunde: Ritter (۸): ۵۰۰، ۳۳۵: ۹ تا ۵۱۔

(A. A. Duri)

* الدسوقی: (الدسوق)، برہان الدین ابراہیم

انہوں نے اللہ سے کہیں۔ ابراہیم چند قصیدوں کے مصنف بھی ہیں جن میں سے دو لواقع میں نقل کیے گئے ہیں (نیز دیکھیں دارالکتب، قاہرہ، فہرست تصوف، عدد ۳۱۹ مجامع) اور انہوں نے ایک صلوٰۃ اور ایک حزب بھی لکھی ہے۔ ان کی سب سے بڑی کتاب الجواہر ہے جس میں حقیقت اور شریعت کے درمیان محکم دلائل سے تطبیق دی گئی ہے۔ (ان کا کہنا ہے کہ) صرف غلبہٴ حال کے وقت شریعت کی پیروی ساقط ہو جاتی ہے۔ صفائے باطن کتاب کا اصل موضوع ہے۔ شریعت کی پیروی فقط زبانی اقرار نہیں ہے۔ اسی طرح تصوف ظاہری لباس اور زاویہ نشینی کا نام نہیں ہے۔ یہاں باطنی کام ("عمل جوتانی") کو دیکھا جاتا ہے، کیونکہ انسان کا اصلی خلوت کلمہ اس کا دل ہے، ولی کو اللہ کے ساتھ گہرا تعلق ہوتا ہے، وہ اللہ کے ساتھ "متصل" ہے، اس کے لیے لازم ہے کہ اللہ کی کامل اطاعت بجا لائے۔ صوفی کے لیے حقیقی راستہ محبت، تسلیم (= ولی کا خدا پر کامل اعتماد) اور "ذبح النفس" (= نفس کشی) کا ہے۔ جوہرہ میں جو کرامات گنوانی گئی ہیں، اگرچہ مبالغہ آمیز ہیں، لیکن اس زمانے کے لحاظ سے وہ کوئی غیر معمولی باتیں نہیں۔ حقائق میں ابراہیم کی ایک بر اثر دعا درج ہے جو انہوں نے اللہ سے کی: وہ یہ کہ "یا اللہ میرا جسم اتنا بڑا کر دے کہ سارا جہنم اس میں بھر جائے تاکہ باقی تمام انسان اس سے بچ جائیں۔" یہ واضح ہے کہ ابراہیم نے کسی اور صوفی سے "بیعت" نہیں کی۔ جوہرہ میں وہ بیان کرتے ہیں کہ سات سال کی عمر ہی میں وہ باہشتناے شیخ عبدالقادر (جیلانی)، باقی تمام اولیا سے رتبے میں بڑھ گئے تھے، (اس سے انہوں نے اس بات کی توثیق کر دی کہ وہ رفاعی اور بدوی کی پیروی سے آزاد ہیں)، مگر آگے چل کر وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک آسمانی قریب میں اللہ نے انہیں حکم دیا کہ وہ تمام اولیا کو "خرقہ"

عطا کرے اور فرمایا کہ "اے ابراہیم تو ان سب کے اوپر "تقیب" ہے۔ اس تقریب میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں میں تھے اور شیخ عبدالقادر ان کے پیچھے اور الرفاعی شیخ عبدالقادر کے پیچھے تھے۔ المقریزی نے ابراہیم کا بہت ہی مختصر ذکر کیا ہے (کتاب السلوک، ج ۱: ۲۳۹) اور ابن ایاس (۲: ۲۲۸) ایک شخص خیر الدین ابوالکرم (م ۵۸۹/۴۱۸۵ء) پر، جو خلفائے دسویہ میں سے ہیں، رائے زنی کرتے ہوئے فقط اتنا کہتا ہے کہ "لاباس بہ" (اس میں کوئی بات قابل اعتراض نہیں)۔ قایتبای ابراہیم کی بہت تعظیم و تکریم کیا کرتا تھا، کیونکہ وہ ۵۸۸/۴۱۷۹ء میں ان کی خانقاہ کی زیارت کے لیے گیا (وہی کتاب، ۲: ۱۸۹)۔ اور اس عمارت کی توسیع کی (مبارک: الخطط، ۱۱: ۷۰)۔ الشعرانی نے لواقع ۱: ۱۴۳ تا ۱۵۸) میں ابراہیم کے لیے اتنی زیادہ جگہ وقف کی ہے کہ اور کسی بزرگ کو اتنی جگہ نہیں دی (اس میں زیادہ تر الجواہر کے اقتباسات ہیں) اور ممکن ہے کہ الدسوق کے نام کی دوبارہ شہرت یہیں سے شروع ہوئی ہو۔ ۱۱۶۸/۵۱۷۵ء میں حسن بن علی شمع نے ابراہیم کے حزب کی سب سے پہلی شرح لکھی اور اس کا نام مسرة العینین بشرح حزب ابی العینین رکھا (قاہرہ، فہرست تصوف، ۱۸۴ مجامع اور سرکیس، ۷۲)۔ علی بن احمد الصیرفی نے کشف النعمۃ مختصر الشیخ حسن شمع کے نام سے اس کی تلخیص کی (وہی کتاب، عدد ۲۰۹۷)۔ اس حزب کی ایک اور شرح محمد البیہی کی ہے (وہی کتاب، ۲۵۹۴) اور ایک غیر معروف شخص عبدالغنی نے ۱۲۷۱/۵۱۸۶ء میں الدسوق کی کتاب الصلوٰۃ کی شرح لکھی تھی (وہی کتاب، ۲۵۹۳)۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ابراہیم کی شہرت بڑی حد تک اس کی حزب پر مبنی ہے جو مرادیں پر لانے، جنات کے بھگانے اور عموماً شفا بخشی اور حفظ و امان

ماخذ: (۱) ابن العماد: منبر، سال ۹۱۹: (۲) براکمان، ۲: ۱۵۳، تکملہ، ۲: ۱۵۳۔

(C. BROCKELMANN)

الدسوقی: السید ابراہیم بن ابراہیم (عبدالغفار): *
صوفی ابراہیم الدسوقی ترک بہ الدسوق برہان الدین (جدید) کے بھائی موسیٰ کی اولاد میں سے تھا۔ وہ ۱۸۱۱/۱۲۳۶ء میں انکے مفلس گھرانے میں پیدا ہوا جو مالکی مسلک کا پیرو تھا۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن دسوق میں حاصل کر کے جامع الازہر کے نامور شیوخ کے حلقہ درس میں شریک ہوا، جن میں مشہور شیخ محمد علیش مالکی (م ۱۲۹۹/۱۸۸۲ء) بھی تھے۔ اس کے بعد خود تھوڑے دن الازہر میں مدرس رہا، پھر ۱۲۳۸/۱۸۳۲ء میں سرکاری ملازمت کے منسلک ہو گیا۔ چونکہ عام انسان سے خوب واقف تھا اس لیے اعلیٰ مدارس میں پڑھائی جانے والی درسی کتابوں کے مصحح کا عہدہ مل گیا اور پھر خدیو اسماعیل پاشا کے عہد میں بولاق کے سرکاری مطبع کا بائن مصحح (یعنی مدیر مصحح) مقرر کیا گیا۔ کچھ عرصے تک سرکاری جریدہ الوقائع المصریہ کا مدیر معاون بھی رہا۔ اس نے ۱۳۰۰/۱۸۸۳ء میں وفات پائی۔ اس تالیف میں اس کے تذکرے کے استحقاق کا باعث یہ امر بھی ہے کہ جب لین E. W. Lane، قاہرہ میں دوبارہ جا کر فرسٹل Fresnel کے ہاں مقیم ہوا تو فرسٹل کی سفارش پر Lane کی مدد القاموس (Arabic English Lexicon) کی تیاری اور اس کے لیے مواد جمع کرنے کے کام پر معتد علیہ معاون کی حیثیت سے الدسوقی کو مقرر کیا گیا، اور اس نے کئی سال تک اس خدمت کو انجام دیا۔ چنانچہ لین نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں اس کی خدمات کا بڑے زور دار الفاظ میں اعتراف کیا ہے اور اس کی علمی لیاقت کی شہادت دی ہے۔ Lane کے انگلستان واپس چلے جانے کے بعد بھی الدسوقی عربی کتابوں سے اقتباسات بھیج بھیج کر اس کی مدد کرتا رہا (مقدمہ،

کی تاثیر رکھتے میں مشہور ہے۔ البیہی نے لکھا ہے کہ اٹھارہویں صدی عیسوی کے مشہور مصری بزرگ محمد الحنفی اس حزب کا ورد رکھتے تھے، جو عام طور پر صبح اور مغرب کی نمازوں کے بعد پڑھی جاتی تھی۔ الجبرتی (۴: ۱۷۰) نے لکھا ہے کہ ”برہانیہ، رفاعیہ، قادریہ اور احمدیہ چاروں کے چاروں ”اصحاب العشائر“ (عرس والی) ہیں۔ ان سلسلوں کے چاروں باقی اکثر چار ”اقیان“ کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔ الدسوقی کے مولد کی مکمل کیفیت علی مبارک (الخطوط، ۱: ۷۰) نے لکھی ہے۔ قبلی مہینوں پر مودہ، قویہ اور مسرا میں علی الترتیب تین عرس منائے جاتے تھے۔ ان میں سے دوسرا اور تیسرا آٹھ دن تک منایا جاتا لیکن تیسرا ”مولد الکبر“ ہوتا تھا۔ خدیو اسماعیل نے الدسوقی کے مزار کی توسیع کی اور ۱۲۹۳/۱۸۷۶ء میں اسماعیل کے فرزند ابراہیم پاشا نے اس کو نئے غلاف (= کیموہ) سے آراستہ کیا۔ الدسوقی اپنی کتاب سلسلہ العین میں اس سلسلے کی جسے وہ برہانیہ کے نام سے موسوم کرتا ہے، خصوصیات گنواتا ہے جو حسب ذیل ہیں: الذکر الجہری، مجاہدات نفس کشی اور ”یا دائم“ کا ورد۔

ماخذ: (۱) متن میں مذکورہ کتب کے علاوہ محمد السلقونی: طبقات الشیخ احمد الشرنوبی، قاہرہ، ۱۲۸۰ھ؛ (۲) صالح بن مہدی: العلم الشاہخ، قاہرہ، ۱۲۲۸ھ؛ (۳) توفیق الطویل: التصوف فی مصر، قاہرہ، ۱۹۳۶ء، بمواضع کثیرہ؛ (۴) Les Con: A. Le Chatelier؛ (۵) Frères musulmans، ۱۸۸۷ء، ص ۱۹۰؛ (۵) Modern Egyptians: Lane، ۳: ۳ تا ۳: ۷؛ (ولید خالدی)

*** الدسوقی: ابراہیم بن محمد بن عبدالرحمن، ایک مشہور صوفی، ۱۸۳۳/۱۲۳۹ء میں پیدا ہوئے اور شعبان ۱۲۹۹/ اکتوبر ۱۵۱۳ء میں دمشق میں وفات پائی، دعاؤں کے مجموعوں (ورد، حزب) کے مصنف ہیں۔**

کے حق میں (ل)، یا کسی کے خلاف (علی)۔ اللہ تعالیٰ سے دعا تین طرح سے ہوتی ہے: (۱) اس کی توحید بیان کرنا اور اس کی حمد و ثنا کرنا، جیسے کہ کہا جائے یا اللہ لا إله إلا أنت، اور جیسے رَبَّنَا لَكَ الْعَمَلُ (۲) اللہ تعالیٰ سے عفو و رحمت ایسی چیزیں طلب کرنا جن سے اس کا قرب حاصل ہو، جیسے اللَّهُمَّ اغْفِرْ لَنَا: (۳) دنیا کی بھلائی کی درخواست کرنا، جیسے اللَّهُمَّ ارْزُقْنِي مَالًا وَلَدًا (ابو اسحاق کا قول، در لسان العرب، بذیل مادہ)۔ تہلیل و تحمید کو بھی دعا کہا جاتا ہے کیونکہ یہ بھی اللہ تعالیٰ سے جزا حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں آتا ہے: اِذَا شَغَلَ عَبْدِي ثَنَاءُ عَلَيَّ عَنْ مَسْئَلِيْ اَعْطَيْتُهُ اَفْضَلَ مَا اَعْطِيَ السَّائِلِينَ۔ دعویٰ بھی دعا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، جیسے وَ اٰخِرُ دَعْوَاهُمْ اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ (۱۰: یونس)۔

[قرآن مجید میں لفظ دعا تقریباً ان جملہ معانی میں (تسمیہ کے سوا) استعمال ہوا ہے: بلانا، پکارنا، جیسے لَا تَجْعَلُوْا دُعَاءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا (۲۴: النور)؛ منسوب کرنا، جیسے ادعواہم لا بِالْهَيْمِ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ اِنْ لَّمْ يَعْلَمُوْا اِيَّاهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِی الدِّیْنِ وَ مَوَالِیْكُمْ (۳۳: الاحزاب)؛ عبادت کرنا، جیسے اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادًا امْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ فَلْيَسْتَجِیْبُوْا لَكُمْ (۷: الاعراف)؛ (۱۰۳)؛ استمداد و استغاثہ، جیسے وَادْعُوْا شُهَدَاءَ كُمْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (۲: البقرة)؛ اللہ تعالیٰ سے استمداد و استغاثہ، جیسے قَالُوْا یٰمُوسٰی اَدْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عٰهَدْتَ عَلٰیكَ (۷: الاعراف)؛ (۱۳۳)۔

ایسی متعدد احادیث ہیں جن میں دعا کا ذکر پایا جاتا ہے [اور جن میں اس کی فضیلت و اہمیت کو واضح کیا گیا ہے]۔ امام الغزالیؒ نے [احیاء علوم الدین (قاہرہ ۱۳۵۲ھ) ۱: ۳۷۳ تا ۳۷۸ میں اس قسم کی کئی احادیث کا ذکر کیا ہے [جیسے ابو ہریرہؓ

۱: xxii, xxiii]۔ ہمارے پاس ایک تذکرہ موجود ہے جو الدسوق نے سابق مصری وزیر علی مبارک کی قاموسی تصنیف کے لیے جمع میں لکھا تھا۔ اس تذکرے میں وہ لہجہ کے ساتھ اپنی ملاقات، لین کی شخصیت، قاہرہ میں اس کے رہن سہن اور طرز زندگی، اور وہاں کے مسلمانوں سے میل ملاقات پر اپنے تاثرات بیان کرتا ہے (ان مسلمانوں میں شیخ احمد بھی شامل ہیں، جن کا نام *Manners and Customs of the Modern Egyptians* کے مقدمہ کی بدولت ہمیشہ زندہ رہے گا)۔ پھر لین کی عربی محاورہ میں مفرد سہارت (گویا کہ وہ ایک عدنانی یا ایک قحطانی عرب تھا) دونوں کامل کرائمہ عربی لغت کی تصانیف کا مطالعہ اور اس مواد سے لغات میں استفادہ کرنے کے طریقے، اور لین کی اپنے عرب مددگاروں پر شفقت کی پوری تفصیل تحریر کی ہے۔ الدسوق کا یہ مقالہ عربی زبان کے انگریز لاضل کے سوانح حیات کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

مآخذ: (۱) علی مبارک: الخیاط الجدیدة لمصر القاہرہ ومدنها وبلادها القدیمة و الشہیرة، بولاق ۱۳۰۵ھ، ۱: ۱۱ تا ۱۳؛ (۲) *Life of E. W. Lane: S. Lane-Poole*؛ (۳) جمال الدین الشیال: تاریخ الترجمة والحركة الثقافية فی عصر محمد علی، مصر ۱۹۵۱ء، ص ۱۸۲۔

(I. GOLDZIEHER)

* دُشْمَنْزَبَار: رگ بہ کا کوہ (بنو)۔
* دُعَا: [ع، جمع: ادْعِیة]، [دَعَا يَدْعُو دُعَا و دَعْوٰی، لغوی معنی بلانا، پکارنا، منسوب کرنا، نام رکھنا جیسے دَعْوَتُ ابْنِ زَيْدَا (سمیں نے اپنے بیٹے کا نام زید رکھا)، عبادت کرنا اور مدد طلب کرنے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے (دیکھئے لسان العرب، تاج العروص، اور المفردات، بذیل مادہ)۔ دعا کا اصطلاحی معنی اللہ تعالیٰ سے استمداد و استغاثہ ہے، اپنے یا کسی

جہاں ان تہمید نے کہا ہے کہ تلاوت قرآن حکم سے صلوٰۃ افضل ہے اور تلاوت قرآن حکیم ذکر سے افضل ہے اور ذکر انفرادی دعا سے افضل ہے) مزید برآں یہ اجتماعی قدر و قیمت اور قومی بہانوں کی یہی حامل ہو سکتی ہے۔ دعا کے لیے الفاظ کے انتخاب میں انسان آزاد ہے، لیکن اکثر و بیشتر وہ دعائیں پڑھی جاتی ہیں جو متون قرآن حکیم و حدیث میں موجود ہیں۔ [علمائے کرام نے قرآنی دعاؤں کو ادعیۃ القرآن ایسی کتابوں میں جمع کر دیا ہے اور ماثورہ دعاؤں کو الک رسائل و کتب میں، مثلاً ابن السنی الدینوری: عمل الیوم واللیلۃ، حیدرآباد دکن ۱۳۱۵ھ؛ ابن تہیمہ: جوامع الکلم الطیب فی الادعیۃ والاذکار، ابن الجزری دمشقی: الحصن الحصین من کلام سید المرسلین، چاپ سنگی مصر ۱۲۷۷ھ، بولاق ۱۳۲۰ھ؛ مثلاً علی القاری: الجزب الأعظم والورد الأفخم لا یتسایہ واستناده إلى الرسول اکرم، چاپ سنگی استانبول ۱۲۶۲ھ، بولاق ۱۳۰۰ھ و ۱۳۰۷ھ، اور چاپ سنگی مکہ ۱۳۰۷ھ، السیوطی: عمل الیوم واللیلۃ؛ اردو تراجم کے ساتھ بھی مستون دعاؤں کی کئی کتابیں موجود ہیں، مثلاً پیارے رسول کی پیاری دعائیں، مکتبہ سنیہ لاہور اور مولانا اشرف علی تھانوی مناجات مقبول۔

جن رسائل میں دعا کی ہدایت و نائین کی گئی ہے، اور خاص طور پر صوفیہ کے رسائل میں، ان میں دعا کے لیے لازمی شرائط اور اس کے ضوابط و آداب کا بیان ضروری سمجھا جاتا ہے۔ ان شرائط و ضوابط کا مقصد یہ ہے کہ درگاہ الہی میں اجابت دعا کی زیادہ سے زیادہ ضمانت دلائی جائے، انباجوری: حاشیہ... علی جوهرة التوحید، (قاہرہ ۱۳۵۳ھ/۱۹۳۴ء، ص ۹ تا ۹۱) میں شرائط دعا کا ذکر یوں آیا ہے: اکل (درزق) حلال؛ اجابت دعا پر مکمل یقین رکھتے ہوئے دعا کرتا؛ دوران دعا میں ذہنی یکسوئی،

سے روایت ہے: "تیس شے اکرم علی اللہ عز وجل من الدعاء: الثمان بن بشر سے روایت ہے: ان الدعاء هو العبادة الدعاء مع العبادة: سلوا اللہ تعالیٰ من فضله فان اللہ تعالیٰ یحب ان یسأل و افضل العبادة انتظار الفرج]۔ ان خود باری تعالیٰ نے اپنے بندوں کو دعوت دی ہے کہ اس سے دعا کریں، جیسے ادعوا ربکم تضرعاً و خفیۃ، انہ لا یحب المتعذبین (۱) [الأعراف: ۵۵]، وقال ربکم ادعونی استجب لکم ان الذین یتکبرون عن عبادتی سیدخلون جہنم داخرین (۲) [غافر: ۶۰] اور واذناک عبادی عني فاني قريب مجیب دعوة الداع اذا دعان فلیستجیبوا لی (۳) [البقرة: ۱۸۶]۔ لیکن قضائے حوائج کے لیے کسی غیر اللہ سے دعا نہیں کرنی چاہیے، فلا تدعوا مع اللہ احداً (۴) [الحج: ۱۸]، بلکہ صرف اللہ تعالیٰ ہی سے دعا کرنی چاہیے، کیونکہ سب سے بڑا گمراہ وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر کسی سے استمداد کرے (۵) [الاحقاف: ۵]۔ البتہ کافروں کی دعا بے اثر اور بے سود رہتی ہے (۶) [الرعد: ۱۳]۔ م (المؤمن: ۵) اور جن باطل معبودوں سے وہ دعا کرتے ہیں وہ ان کی دعا میں سے کچھ نہیں من پاتے (۷) [فاطر: ۱۴]۔ ایک تنقیدی تجزیے میں دعا کے معانی میں صلوٰۃ، ذکر (رک یاں) حزب اور ورد کا ذکر بکثرت آتا ہے۔ دل میں کی جانے والی عبادت کا مفہوم کسی حد تک ذکر اور فکر کی اصطلاحات سے ادا کیا جاسکتا ہے۔ دعا میں ہمیشہ ایک باضابطہ استدعا کا تصور شامل ہوتا ہے، چاہے وہ دعا بے خبر ہو یا دعا بے بد۔ حالات کے مطابق دعا (خدا سے استدعا کرنا) کئی طرح کی ہو سکتی ہے۔ بنابرین دعا کا ترجمہ ذاتی التجا کرنا بھی جائز ہے، (دیکھئے ابن تہیمہ: فتاویٰ، قاہرہ ۱۳۲۶ھ، ۱: ۱۹۷۱، مترجمہ Essai sur: Laolst les doctrines sociales et politiques de Taki-d-Din Ahmad b. Taimiya، قاہرہ ۱۹۳۹ء، ص ۳۲۸ تا ۳۲۶)

(۶ : ۲۴۳) صرف صلوٰۃ (دعا) سے استسقاء میں ہاتھ اٹھانے کے قائل ہیں۔

اسلامی عبادات میں اس بات پر اصرار ہے کہ دعا کو خیر و بہبود بالخصوص امت مسلمہ کی بہبود کے لیے نیز خود اپنی اور دوسروں کی روحانی بہبود کے لیے دعا سے خیر کے طور پر ملحوظ رکھا جانا چاہیے۔ اہل السنۃ اور اہل تشیع کی کتب عبادات میں اچھی اچھی دعاؤں کی کمی نہیں ہے، متابہ کی مقبول عام عبادات میں اکثر دعا کا ذکر ملتا ہے؛ مختلف فرقوں کی کتابوں میں بھی حزب و ورد کے کلمات میں دعا کی آمیزش نظر آتی ہے۔ اس صورت میں یہ ایک ذاتی استدعا سے خیر یا استدعا سے بد کی یہ نسبت ایک ایسی دعا بن جاتی ہے جس میں رحمت خداوندی پر بھروسہ کیا گیا ہو۔ اس طرح اگر اسمائے حسنیٰ کا ورد بالتکرار کیا جائے تو ذکر کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے یا پھر دعا کی صورت اختیار کر لیتا ہے کیونکہ ذات باری کا ہر نام اور ہر صفت دعا گو کی کسی ضرورت سے تعلق رکھتی ہے اور یوں اظہار مدعا ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں دیکھیے اس موضوع پر گزشتہ صدی میں محمد علی خان البخاری کی مخصوص کتاب منة السراء فی شرح الدعاء (طبع حیدرآباد، ۱۳۴۳ھ)۔ دعا خدا کے حضور میں ایک روحانی اسٹک کے مترادف بن جاتی ہے۔

(۲) فلسفہ اور علم کلام میں پیدا شدہ مسائل۔ فلسفہ یونان کے زیر اثر مسلم فلاسفہ اور متکلمین نے اجابت دعا سے متعلق کئی مسائل پیدا کر دیے۔ ہر دستاویز فکر اور ہر مصنف نے اپنے نظریات کے مطابق اس کے مختلف جوابات دیے ہیں۔ یہاں اس کی تین نمایاں مثالیں پیش کی جاتی ہیں (دوسرے مصنفین کے علاوہ الباجوری نے علم کلام کے اصولوں کا ایک خلاصہ دیا ہے، دیکھیے حوالہ مذکور)؛ (الف) معتزلہ دعا کی افادیت کے منکر ہیں،

کسی گناہ، خوفی قرابت داروں کے مابین دشمنی یا کسی مسلمان کے مفاد کو نقصان پہنچانے کے لیے دعا نہ مانگنا، اور آخر میں یہ کہ کسی ناممکن کام کے لیے دعا نہ مانگنا، کیونکہ ایسا کرنا خدا کے حضور میں سوء ادب ہے۔

(ب) دعا کے آداب؛ بہترین وقت کا انتخاب جو الباجوری کے نزدیک سجود، اقامت یا دوران اذان کا وقت ہے؛ دعا کی قبولیت کی شرائط میں سے ہے کہ باوضو ہو کر دو رکعت ادا کرنے کے بعد اعتراف گناہ اور احساس ندامت کے ساتھ دعا کی جائے؛ قبلہ رخ ہونا، ہاتھ اٹھانا، دعا کے آغاز، وسط اور خاتمے پر خدا کی حمدوثنا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنا [آداب دعا میں شامل ہے]۔

بعض صورتوں میں جب دعا کا مقصد امت کی عام فلاح و بہبود ہو تو یہ دعا ایک مسلمہ مذہبی رسم کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس کی نمایاں ترین مثال صلوٰۃ [نماز] استسقاء (بارش کے لیے دعا) ہے؛ اس مقصد کے لیے دعا سے پہلے دو رکعت نماز [رکبہ صلوٰۃ] اور دو خطبے نیز چادر کو اللہ کی رسم کا ادا کرنا ضروری ہے، میت کے لیے دعا کے بھی متعدد آداب مقرر ہیں [اور یہ بھی نماز (صلوٰۃ) کی شکل میں ہوتی ہے]۔

دعا کو ہر اثر بنانے کے لیے یہ شرائط اور آداب ملحوظ رکھے جاتے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ الفاظ کی تاثیر بڑھانے کے لیے شرعی طہارت اور [ہاتھ اٹھانے کے ساتھ تضرع و العاج] بھی ضروری ہے۔ یہ آخری نکتہ بحث طلب ہے؛ جن تصنیفات میں اکثر و بیشتر مواقع پر دعا کی تلقین کی گئی ہے ان میں وضو اور ہاتھ اٹھانے پر زور دیا جاتا ہے، اس کے لیے وہ اس حدیث کا سہارا لیتے ہیں کہ: ”حضور نے دعا میں ہاتھ اٹھانے سے پہلے وضو کیا“ (البخاری، مغازی، ۲ : ۵۵)، لیکن النسائی اور احمد بن حنبل

سیر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے اسے کسی طرح بھی عقیدہ جبر قرار نہیں دیا جاسکتا۔ نہایت یہ بھی قابل ذکر ہے کہ اشعری رسائل میں یہ مسئلہ بڑی وضاحت سے اٹھایا گیا ہے کہ دعائے مقبول اور قضائے الہی یا قدر میں کیسے موافقت پیدا کی جاسکتی ہے۔

اس مسئلے کے جواب میں عموماً قضائے ”مہرم“ اور قضائے ”خلق“ (مشروط) میں خطر امتیاز کھینچا جاتا ہے۔ مؤخر الذکر صورت یہ ہے کہ اس امر کا فیصلہ کہ کوئی واقعہ ظہور پذیر ہو یا نہ ہو ذات باری تعالیٰ کی طرف سے دعا کے امر واقعہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے کیا جاتا ہے اور یوں دعا اپنی نوبت پر مشیت الہی کے طے کردہ اسباب میں داخل ہو جاتی ہے۔ قضائے مہرم کی صورت میں دعا مشیت الہی میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کر سکتی، اس شخص کو بہر حال تائید الہی نصیب ہوگی جو دعا کرے گا اور یہ دعا بہر حال اپنا مطلوبہ مقصد حاصل کر کے رہے گی۔ اور اجابت دعا کے اسباب و حالات کو ”قضائے معلق“ میں شامل کر لیا جائے گا۔

(ج) فلاسفہ نے بالکل مختلف اصولوں کے تحت، لیکن اس قسم کے انداز فکر کے ذریعے دعا کو منطقی طور پر اپنے عالمگیر عقیدہ جبر میں شامل کر لیا ہے۔ اس موضوع پر ابن سینا نے کئی موقعوں پر بحث کی ہے (مشارک النجاة، طبع بار دوم ۱۳۵۷ھ/۱۹۳۸ء، ص ۲۹۱ تا ۳۰۳، معنی الزیارة اور رسالة فی ماہیة الصلوة، طبع A.F. Mehren، لاڈن ۱۹۸۴ء)۔ دعائے مستجاب دعا عالم ارضی کی ترتیب اور عالم سماوی کے اسباب کی موافقت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ جب ہم دعا کے ذریعے تائید الہی کے طلب کار ہوتے ہیں تو (ہماری یہ دعا) قوانین کائنات کے مطابق کرہائے سماوی کی خیالی صورتوں پر ایک مادی ہجوم کی طرح امڈ کر اسی طرح ٹھوس اثرات مترتب کرتی ہے جس طرح انسان کا تعین اس کے اپنے جسم پر اثر انداز ہوتا ہے۔ مزید برآں

کیونکہ ان کے نزدیک دعا سے ذات الہیہ کی کامل ماورائیت میں فرق آ جاتا ہے۔ فی الحقیقت انسان خود اپنے افعال کا خالق ہے، لہذا اسے اپنی مہمات و حوائج میں تائید ایزدی طلب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ افعال انسانی خود اپنے نتائج کے حامل ہوتے ہیں۔ یوں جب اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں اپنے بندوں کو اپنے حضور مستدعی ہونے کے لیے ارشاد فرمایا ہے تو دراصل اس سے مقصود ذات باری کی حمد و ثنا ہے اور جب بندوں سے ان کی دعائیں سننے کا وعدہ کرتا ہے تو یہ کسی نیک عمل کا اجر محض ہوتا ہے جس کی وہ انہیں ضمانت دیتا ہے۔

(ب) دوسری طرف اشعریہ کا علم کلام، جو مطلق اور آزاد ارادۃ الہی پر مرکوز ہے، دعا کی قدر و قیمت کا قائل ہے۔ [ان کے ہاں] نماز جنازہ کی حیثیت ایک دعا کی ہے جس میں اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی التجا کی جاتی ہے، بشرطیکہ یہ اس کی رضا ہو۔ مزید برآں اشاعرہ نے بد دعا کا پہلو بھی فراموش نہیں کیا ہے۔ جو اگر کسی جائز سبب کی بنا پر بد دعا مانگی جائے تو ان لوگوں کے لیے نقصان دہ ہوتی ہے جن کا برا چاہا جاتا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث مروی ہے کہ ”مظلوم کی دعا قبول ہوتی ہے، خواہ وہ کافر ہی کیوں نہ ہو“۔ بعض اوقات دعا بعینہ اور غوری طور پر قبول ہو جاتی ہے، بعض اوقات قدرے تاخیر سے، جس کا سبب صرف اللہ ہی جانتا ہے، اور بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ہم دعا دیں جس چیز کے طالب ہوتے ہیں اس کے بجائے اللہ تعالیٰ ہمیں کچھ اور عطا کر دیتا ہے اور یہ بات ہمارے لیے زیادہ سودمند ہوتی ہے۔

اشعریہ دعا کو مسلمہ طور پر ”خیر“ سمجھتے ہیں اور یہ اس بات کا بدیہی ثبوت ہے کہ ان کا اختیار بشری اور دوسرے ثانوی اسباب سے انکار، اور اس کی بنا پر رضائے الہی کے سامنے جو مکمل

کنوز السنہ، بذیل مادہ الدعاء،

(L. GARDET) اور ادارہ،

* دَعَان : رَک بہ دَوَعن.

* دَعْبَل : عہد عباسی کے شاعر ابو علی [یا ابو جعفر]

محمد [یا حسن یا عبدالرحمن] بن علی [بن عبداللہ]

بن رزین الخُزاعی کا تخلص۔ یہ شاعر ۸۱۳۸/۷۶۵ء

میں پیدا ہوا، اور ۸۲۳۶/۷۸۶ء میں فوت ہوا۔

اس کی جائے پیدائش یقینی طور پر معلوم نہیں؛ شہر

کوفہ اور شہر قرقسیہ اس کی جائے پیدائش بتائے گئے

ہیں۔ کتاب الاغانی میں دیے ہوئے حالات کے مطابق

اس نے اپنی جوانی کا زمانہ کوفہ میں گزارا، اور جہاں

سے اسے اپنی فتنہ پردازی کے باعث قرار ہونا پڑا۔

دعبل نے شعر گوئی کی مشق مسلم بن الولید [رک بان]

کی شاگردی میں شروع کی، اور جلد ہی شاعری میں

بڑا نام پیدا کر لیا، جس کی شہادت خَلْف الْأَحْمَر

(م ۸۱۸۰/۷۹۶ء) اور مروان بن ابی حفصہ (م ۸۱۸۱/

۷۹۷ء) کے ساتھ اس کے تعلقات سے ملتی ہے۔

ہارون الرشید (م ۸۱۹۳/۸۰۹ء) کے دربار میں

باربانی کی سب سے زیادہ مَرَجِح تاریخ ۷۹۵/۸۰۹ء

کے درمیان ہے۔ [طخارستان کے شہر سمجان اور

بعد ازاں اسوان مصر کا والی بھی رہا]۔

چونکہ اس کا میلان شیعیت کی طرف تھا اور

حضرت علی الرضا [رک بان] کی مدح سرائی میں شہرت

پائی تھی، اس لیے وہ عموماً خلفائے عباسی پر، ہارون سے

لے کر متوکل تک، چوٹ کرتا ہے۔ تاہم ظاہر ایسا ہوتا

ہے کہ دعبل کی مدح سرائی کا محرک حصول زر

بھی ہوتا تھا؛ چنانچہ ہمیں اس کے قصائد ان خلفاء کی

تعمریف میں بھی ملتے ہیں۔ اگرچہ دعبل ہجو گوئی اور

مدحیہ قصائد کے لیے مشہور ہے، ہجو میں مغلفات تک

سے نہیں چوکتا، لیکن وہ لطیف جذبات کے اظہار اور

فطری مناظر کی تصویر کشی کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔

اس کا مادہ اور براہ راست اسلوب بیان اسی صفت کا حامل

انہیں کرہ سماوی نے انسانوں کی دعا کے بارے

میں صلاح دی اور پھر یہ صلاح عالمگیر سلسلۂ اسباب و

علل میں اپنی جگہ بنا لیتی ہے۔ اس وقت یہ کہا جا

سکتا ہے کہ یہ درحقیقت ان اسباب کے باہمی تعامل

کا نتیجہ ہے کہ دعا قبول ہوتی ہے۔ ابن سینا کے قول

کے مطابق دعا ہی کرہ سماوی کے ساتھ انسان

کا بلا واسطہ رابطہ استوار کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے

کہ وہ دعائیں جو خاص طور پر بارش، اور ایسی ہی

دوسری باتوں کے لیے مانگی جائیں بڑی افادیت کی

حامل ہوتی ہیں (النَّجَاح، ص ۳۰۱، دیکھیے L. Gardet :

La pensée religieuse d' Avicenne، پیرس ۱۹۵۱ء، ص

۱۳۵ تا ۱۳۷)۔

دعا کا عقلی جواز پیش کرنے کی جو متعدد

کوششیں کی گئیں وہ اس امر کی شہادت دیتی ہیں کہ

مسلمانوں کی مذہبی زندگی میں دعا کی بڑی اہمیت ہے۔

جہاں تک متقی مسلمانوں کا تعلق ہے ان کے نزدیک دعا

انسان اور کرہ سماوی کے درمیان رابطہ نہیں بنتی

بلکہ اصل رابطہ براہ راست دعا کرنے والے اور خدا کے

درمیان ہے۔ اس سے یہ معروف تصور مکمل ہوتا ہے

بلکہ بسا اوقات رافع تر ہوتا ہے کہ اسم کو مسمیٰ پر

قدرت حاصل ہوتی ہے [یعنی دعا کرنے والا اللہ تعالیٰ

سے خطاب اپنی حاجت کی نسبت سے کرے، اگر شفا

مطلوب ہو تو کہے یا شافی، اگر رزق مطلوب ہو تو

کہے یا رزاق، حاجت سے متعلق صفت کے ساتھ خطاب

کرنا دعا کی استجاب پر اثر انداز ہوتا ہے؛ چنانچہ

اکثر دعاؤں میں اس بات کو ملحوظ رکھا گیا ہے، مثلاً:

رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَأَنْتَ خَيْرُ الرَّاحِمِينَ (۲۳) [المؤمنون]؛

(۱۱۸)؛ فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَأَنْتَ خَيْرُ الْغَافِرِينَ (۷)

[الاعراف]؛ (۱۵۵)؛ وَارْزُقْنَا وَأَنْتَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ (۵)

[المائدہ]؛ (۱۱۳)؛ اَللّٰهُمَّ اَنْفِ اَنْتَ الشَّافِی لَا شِفَاءَ اِلَّا

شِفَاؤُكَ]۔

مآخذ : متن مقالہ میں مذکور ہیں؛ (نیز مفتاح

بلکہ اس کی مزید شہادت ہے جو ابتدائی عباسی عہد کی خصوصیت ہو گئی تھی۔

ابن رشیق [رک بان] اس کو ابو نواس [رک بان] کے طبقے میں شمار کرتا ہے اور البحتری [رک بان] اسے مسلم بن الولید سے بلند مرتبہ دیتا ہے۔ ابوتعمام [رک بان] کے ساتھ دعبل کی چشمک، محض شعر و ادب کی وجہ سے نہ تھی، بلکہ اس میں سیاست اور مذہب کو بھی دخل تھا، اس لیے کہ ابوتعمام شیعوں کے ساتھ سرد مہری سے پیش آتا تھا اور شمالی عربوں کا حامی تھا؛ چنانچہ انہیں وجوہات کی بنا پر دعبل نے ابوتعمام کو اپنی کتاب طبقات الشعراء میں جگہ نہیں دی۔

دعبل کی کتاب طبقات الشعراء جس کی تکمیل ۸۲۳/۸۸۶ء کے بعد ہوئی اور جس کے انتسابات نویں صدی عیسوی سے لے کر سترھویں صدی عیسوی تک کی تصنیفات میں پیش کیے جاتے رہے ہیں، تاریخ ادب عربی میں ایک مقام رکھتی ہے کیونکہ یہ [محمد بن سلام] الجمعی (م ۸۳۰/۸۸۵ء) کی طبقات الشعراء اور ابن قتیبہ (م ۵۲۶/۸۸۹ء) کی کتاب الشعر کی درمیانی کڑی ہے۔ علاوہ بریں دعبل چونکہ عہد اسلامی کے چھوٹے شاعروں کے ساتھ خاص دلچسپی رکھتا تھا، جن میں ہارون الرشید، عبداللہ بن الزبیر (م ۲۳۳/۸۴۷ء) اور احمد بن ابی دواد (م ۲۴۰/۸۵۴ء) کی قسم کے شعراء شامل ہیں، اس لیے اس کی تصنیف ان ”جدید شعراء“ کی محافظ سمجھی جا سکتی ہے جو ابن قتیبہ کی کتاب الشعر کے شعراء سے ماقبل تھے۔ [ابن الندیم نے اپنی الفہرست میں طبقات الشعراء کے ساتھ دعبل کے دیوان کا بھی ذکر کیا ہے، لیکن اب اس کے چند طویل قصائد کے سوا اور کچھ نہیں ملتا۔ ان قصائد میں دعبل کا قصیدہ تائیدہ در مدح اہل بیت اور سات مو اشعار پر مشتمل ایک طویل قصیدہ در مدح اہل یمن خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔]

ماآخذ: (۱) براکلسان: ۱: ۷۸، تکملة: ۱: ۱۲۱ تا ۱۲۲، [تعریب: ۲: ۳۹ تا ۴۱]؛ (۲) الفہرست: ص ۱۰۶؛ (۳) الاغانی: ۱۸: ۲۹ تا ۶۰؛ (۴) ابن قتیبہ: الشعر (لغویہ): ص ۵۹۲ تا ۵۹۳؛ (۵) تاریخ بغداد: ۸: ۳۸۲ تا ۳۸۵؛ (۶) ۳۴۲؛ (۷) ابن الجراح: الورقة: قاهرہ ۸۱۳/۸۱۳ء؛ ص ۱۷۱؛ (۸) ابن المعتز: طبقات الشعراء المحدثین، طبع A. Feghhal، لندن ۱۹۳۹ء؛ سلسلہ جدید یادگار گپ ج ۱۳: ص ۱۲۳ تا ۱۲۷؛ (۹) المسمودی: مروج، بحد اشاریہ: (۱۰) المرزبان: معجم قاهرہ ۱۳۵۴/۱۹۳۵ء؛ ص ۲۳۳؛ (۱۱) الأمدی: المؤلف قاهرہ ۱۳۵۴/۱۹۳۵ء؛ ص ۱۶۸؛ (۱۲) ابن رشیق: القمعة قاهرہ ۱۳۲۵/۱۹۰۷ء؛ ج ۱: ۶۳؛ (۱۳) ابن حجر: الآحاد: قاهرہ ۱۳۵۸/۱۹۳۹ء؛ ۲: ۱۰۲؛ (۱۴) وہی مصنف: لسان المیزان: ۲: ۳۳۲ تا ۳۳۳؛ (۱۵) ابن حزم: جمہرة النساب العرب: ص ۲۳۱؛ (۱۶) ابن عساکر: تاریخ دمشق: ۵: ۲۲۷ تا ۲۳۲؛ (۱۷) الباقی: مرآة الجنان: ۲: ۱۳۵؛ (۱۸) ابن العماد: شذرات الذهب: ۲: ۱۱۱؛ (۱۹) عیاس محدود بغداد: مراجعات فی الادب والفنون: ۱۵۳ تا ۱۵۴؛ (۲۰) وہی مصنف: الفصول: ۸۹؛ (۲۱) احمد فرید رفاعی: عصر الناصر: ۳: ۲۵۵ تا ۲۶۰۔

(L. ZOLONDEK آؤ ادارہ)

دعوة: (ع)، اس کی جمع دعوات، مادہ دع و (بقول بعض دعی) پکارنا، بلانا؛ اس کے اصلی معنی پکار اور بلانا ہیں [دعاء، دعویٰ اور دعوة ہم معنی الفاظ ہیں]۔ قرآن [مجید]: (۳۰) [الروم]: ۲۵ میں اس کو قیامت کے دن مردوں کے قبروں سے اٹھنے کے لیے پکار کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے معنی کھانے پر بلانے کے بھی ہیں، اور پھر مہمانوں کے ساتھ کھانے، یعنی ولیمہ کے لیے، بھی مستعمل ہوا ہے: البخاری، کتاب النکاح، ۱: ۷۱، لسان العرب: ۱۸: ۲۸۵۔ اس کے معنی اللہ سے درخواست، دعا اور لذر و نیاز کے بھی ہیں [انجیب دعوة الداع (۲) [البقرہ]: ۱۸۶] یہاں قرآن مجید نے

دَعْوَةُ الرَّسُولِ هِيَ - آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت اسلام کے لیے حکمت اور موعظہ حسنہ کو ذریعہ بنایا اور اسی کا آپؐ کو حکم ملا تھا: اُدْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ (۱۶) [النحل: ۱۲۵]۔
[یہ بھی امر واقعی ہے کہ] جھوٹے مدعیان نبوت نے بھی اپنی تبلیغ کو دَعْوَةُ کا نام دیا ہے، خواہ یہ علانیہ ہو یا خفیہ؛ دیکھیے مثلاً الجاحظ: کتاب الترییع، طبع Pellat، ص ۷۷۔ [یہ بطور تنزیل معنی ہے]۔ زیادہ سے زیادہ توسیع کی صورت میں لفظ دَعْوَةُ میں پیغام انبیاء کی جملہ معنویت، مذہبی قانون وغیرہ بھی شامل کیے جا سکتے ہیں۔ دینی سیاسیات میں دَعْوَةُ یہ ہے کہ جمہور کو کسی خاص شخص یا خاندان کی، جو مسلمانوں کی ”امامت“ کا دعویٰ کرتا ہو، طرف داری اور تائید پر آمادہ کیا جائے، یعنی مسلمانوں سے اس کے دینی اور دنیوی اقتدار کو منوایا جائے۔۔۔ جس کا آخر میں مقصد یہ نکلتا ہے کہ توحید کی بنا پر ایک مثالی حکومت الہیہ قائم کی جائے یا اسے بحال کیا جائے۔ غرض ”دَعْوَةُ“ نئی امامت یا حکومت قائم کرنے کے ذریعوں میں سے ایک ذریعہ ہے، جیسا کہ ابن خلدون اپنے مقدمہ، (۲: ۱۱۱، ۱۱۸ و انگریزی ترجمہ از روزنتھال Rosenthal، ۲: ۱۲۱، ۱۲۹) میں بیان کرتا ہے۔ عباسی دَعْوَةُ اسی قسم کی تھی، جو دراصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کے کسی فرد کے حق میں رائے کی تنظیم تھی؛ اس میں کسی خاص شخص کا نام نہیں لیا جاتا تھا بلکہ تحریک کی بنیاد ”الرَّضَا بْنُ آلِ مُحَمَّدٍ“ یعنی خاندان نبوی کے ایک تسلیم کردہ شخص پر تھی، لیکن جب محمد بن العتقیہ کے وارث نے اپنے حلقہ محمد بن علی العباسی کی طرف منتقل کر دیے تو عباسیوں نے اس تحریک سے فائدہ اٹھایا۔ اسی کو دَعْوَةُ بنی ہاشم یا دَعْوَةُ بنی العباس کہتے ہیں (الطبری، ۲: ۱۳۶۷)؛

بمعنی دعا اور پکار استعمال کیا ہے؛ البخاری، کتاب الدعوات، آغاز و باب ۲۶، کتاب الوضوء، باب ۶۹، کتاب الانبیاء، باب ۹ (دعائے ابراہیمؑ؛ دیکھیے قرآن مجید، ۲ [البقرة]: ۱۲۳ تا ۱۲۹)، باب ۴۰ (دعائے سلیمانؑ؛ نیز دیکھیے ۳۸ [ص]: ۴۵، ۱۰ [یونس]: ۸۹، ۱۴ [الرحیم]: ۴۴، ۴۵ [المؤمن]: ۴۵ و ۵۰ [الطبری: تفسیر، ص ۲۴، ۲۵] میں لفظ دعا سے اس کی شرح کی گئی ہے)۔ ”دَعْوَةُ الْمَظْلُومِ“ (یعنی مظلوم اور ستم رسیدہ کی پکار) ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچتی ہے؛ البخاری، کتاب المظالم، باب ۹ (فب کتاب الجہاد، ۱۸۰)۔ ایک مسلمان کی دَعْوَةُ [دعا] اپنے مسلمان بھائی کے حق میں ہمیشہ مقبول ہے؛ مسام، کتاب الذکر والدعاء، ۸۸۔ ہر قسم کے عہد یا امت کو یہی دَعْوَةُ کہا گیا ہے (ابن المعودی: مروج: ۷: ۳۶۱؛ ابن المعتز: رسائل، قاہرہ ۱۳۶۵، ص ۵۳: دَعْوَةُ بِالْإِثْقَاءِ)۔ اس کا مفہوم بد دعا یا لعنت بھی ہو سکتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ لفظ دعویٰ کے ہم معنی میں بھی آسکتا ہے، جس کا مطلب عدالت میں فریاد، مقدمہ اور قانونی چارہ جوئی ہے۔

مذہبی مفہوم میں ”دَعْوَةُ“ وہ پیغام ہے جو اللہ نے اپنے رسولوں کے توسط سے انسان کو دیا ہے کہ دین حق (یعنی اسلام) کو سچا مانو: [لَهُ دَعْوَةُ الْحَقِّ] (۱۳ [الرعد]: ۳۰)، نیز دیکھیے ۱۴ [الرحیم]: ۴۴، ۵۲: ہر نبی کا دین اسلام رہا ہے: إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ (۳ [آل عمران]: ۱۹) اور ہر نبی کی اپنی ایک دَعْوَةُ ہے (دیکھیے S. Guyard: Fragments 'Not. et Extr. relatifs à la doctrine des Ismaéliens' ۲۲ (۱۸۷۴): ۱۹۳؛ القرطبی: الخطط، ۱: ۳۹۳، ۳۱: ۱۹۵۵؛ The Order of Assassins: Hodgson، ۱۹۵۵، ص ۲۰۰)۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد اس دعوت کی تجدید تھی [جواز ابتدا انبیاء کرام دینے چلے آئے تھے]۔ یہی دَعْوَةُ الاسلام یا

رہے گی اور امام اس کی تجدید کرے گا۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے *The Rise of the Fatimids* Ivanow نیز دیکھیے سیدنا علی بن محمد باج العقائد، مقالہ ۶۵، در *A creed of the Fatimids* Ivanow نیز الشہرستانی، قاہرہ ۱۳۸۵ء، ۲: ۲۶۔

شروع شروع میں اسمعیلی تبلیغ خفیہ طور پر ہوتی رہی۔ یہی طریقہ تھا جس سے یمن اور شمالی افریقہ میں کام جاری رہا (دیکھیے *The origins of Ismā'ilism*، ص ۱۹، ۲۵۲ وغیرہ) اور مغرب میں اسی کے تحت مہدی عبداللہ کے داعی نے اپنے آقا سے اقتدار حاصل کیا۔ ابو حنیفۃ النعمان کی کتاب کا نام، جس میں انہوں نے یمن اور شمالی افریقہ میں فاطمی دعوت کے آغاز اور المغرب میں ان کی سلطنت کے قیام کا حال بیان کیا ہے، کتاب *افتتاح الدعوة وابتداء الدولة* ہے۔ جب امام کافی طاقتور اور ایک ریاست کا سردار ہو گیا تو اس نے علانیہ اپنی دعوۃ شروع کر دی ("اظہر دعوۃ": ابن خلدون: مقدمہ، ۱: ۳۶۳ و مترجمہ روزنٹھال، ۱: ۱۳۱)۔ عباسیوں کی سلطنت قائم ہو جانے کے بعد ان کی دعوۃ تو موقوف ہو گئی تھی، لیکن فاطمیوں کی دعوۃ ان کی ریاست قائم ہو جانے پر ختم نہیں ہوئی بلکہ اس کے برخلاف مصر میں ان کا اقتدار مستحکم ہو جانے کے بعد سے ان کی دعوۃ منظم ہو گئی اور زیادہ وسیع پیمانے پر جاری کی گئی۔ یہ دعوۃ فاطمیوں کے مقبوضہ علاقوں میں اور جہاں جہاں ان کے عقائد کو تسلیم کر لیا گیا تھا کھلم کھلا ہوتی تھی، لیکن دیگر مقامات میں خفیہ طریقے سے جاری تھی، البتہ جو علاقے ان کی طرف مائل ہوتے وہاں علانیہ کی جاتی تھی (جیسے کہ داعی المؤید فی اندین نے ابو کالیجار البوسہی کو دعوت دی، دیکھیے *سیرۃ مؤیدیہ*، طبع محمد کامل حسین، قاہرہ ۱۹۴۹ء، ص ۳۳ بعد)۔ ہر ایک داعی کو ایک مخصوص علاقہ تفویض کیا جاتا تھا جسے

ابن ابی طاہر طیفور، ص ۲۸۸)۔ "صاحب الدعوة" وہ شخص ہے جس کے نام پر تحریک چلائی جائے، لیکن اس لفظ کا اطلاق اس شخص پر بھی ہوتا ہے جو فی الواقع تنظیم کا سربراہ ہو، چنانچہ ابومسلم خراسانی کو "صاحب دعوۃ بنی ہاشم" کہا جاتا ہے (الطبری، ۳: ۱۲۹)۔ یہ تحریک ان پیغام رسانوں کے ذریعہ چلائی جاتی تھی جو دل و جان سے اس مقصد کے حامی تھے اور جنہیں "داعی" (جمع: دُعَاة) اور کبھی کبھی "نقیب" (جمع: نِقَبَاء) بھی کہا جاتا تھا۔

اس طریقے سے علویوں کی "دعوۃ" کا ذکر بھی آتا ہے، جنہیں عباسی ستائے تھے اور جنہوں نے بھاگ کر طبرستان اور دہلیم میں پناہ لی۔ وہاں انہوں نے اپنے حقوق امامت منوا کر ایک ریاست بھی قائم کر لی، جو ٹھوڑے ہی دن چلی (ابن خلدون: مقدمہ، ۲: ۱۲۲؛ انگریزی ترجمہ از Rosenthal، ۲: ۱۳۳)۔ ایسی ہی الموحدون کی "دعوۃ" بھی ہے (کتاب مذکور، ۲: ۱۲۳؛ Rosenthal، ۲: ۱۳۴)۔ ہر ایک قسمت آزماء، جسے الہامی قوتوں کا دعویٰ اور اقتدار حاصل کرنے کی آرزو ہوتی، اسی قسم کی تدبیریں کام میں لاتا تھا اور اپنی "دعوۃ" الگ رکھتا تھا (دیکھیے *محولہ بالا کتابیں*)۔

لفظ دعوۃ قرمطی اسمعیلی تحریک [رک] بہ اسمعیلیہ کے لیے بہت مشہور ہے۔ اس تحریک کا پہلا اثر شام اور عراق عرب کی قرمطی بغاوت (۵۲۸/۵۲۹ء تا ۵۲۹/۵۳۰ء) کی شکل میں ظاہر ہوا (دیکھیے الطبری، ۳: ۲۲۱۸ بعد) اور آگے چل کر اس کے تحت شمالی افریقہ میں فاطمی خاندان کی حکومت قائم ہوئی۔ اس تحریک سے لفظ دعوت کے ایک مخصوص معنی پیدا ہو گئے، جس کا منشا شیعوں کے عقیدے میں یہ ہے کہ یہ دعوۃ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوۃ کا تکملہ ہے۔ اسمعیلیہ کے نزدیک یہ دعوت ہمیشہ جاری

قَب B. Lewis : The origins ... ص ۴۹ تا ۶۰ و عربی ترجمہ، ص ۱۴۱ : نیز در BSOAS، ۱۲ (۱۹۷۸) : ۵۹۷ تا ۵۹۸) - علاوہ بریں M. Canard : L'impérialisme des Fatimides et leur propagande در AJED، الجزائر، ج ۴ (۱۹۳۲ - ۱۹۳۷) - ان طریقوں کی کیفیت لکھتا ہے جو فاطمی داعی اس خاندان کے دعووں کی تائید میں اور اس کے مخصوص فضائل ثابت کرنے کے لیے اور اس کے بوزنطی یا اموی یا عباسی دشمنوں کو بدنام اور کمزور کرنے کے لیے اختیار کرتے تھے۔

ان کے پروپیگنڈے کے اندر یہ بھی داخل تھا کہ نئے مرید بنالیں اور انہیں تعلیم دیں - حقیقت میں ان کا مذہب سیاسی، دینی، فقیہی اور فلسفی عقائد کا مجموعہ تھا، جس کا ان کے نزدیک ایک خفیہ (باطنی) پہلو بھی ہے (اسی بنا پر اس فرقے کا نام باطنیہ [رک پاں] ہوا - ابن خلدون (۱ : ۴۹۳ و مترجمہ روزنتھال، ۱ : ۴۱۳) نے اس کی وجہ تسمیہ بیان کرنے میں غلطی کی ہے اس نے باطن سے امام کا چہرہ ہوا ہونا (صتر) مراد لیا ہے، جس کی بنیاد قرآن مجید اور احکام اسلام کے مجازی معانی پر ہے - یہ معانی مؤمنین کے دانشوروں (=اولیا) کے لیے مخصوص ہیں اور اس کے برعکس ایک دوسرا پہلو ظاہری معنی کا ہے، جو ان لوگوں کے لیے ہیں جن سے فقط امام کی اطاعت مطلوب ہے کہ وہ اس اطاعت کے لوازم (دیکھیے ابو حنیفہ النعمان : کتاب الہمة) نیز مذہبی فرائض ادا کرتے رہیں - عقائد کی تبلیغ اور تعلیم دونوں ساتھ ساتھ چلتے تھے اور فرقے کی مخصوص شرعی عقائد یا حکمت کی تعلیم کے بھی تبلیغی مقاصد تھے - اس کی تفصیل اس تقریر ہی سے واضح ہو سکتی ہے جو جامعۃ الازھر میں بہت پہلے، یعنی ۱۳۸۵ھ/۱۹۶۵ء میں، فقہ فاطمی پر کی گئی تھی اور جس کے متنے والے حاضرین کی فہرست اسما بھی موجود ہے : نیز دوسری تقریر سے، جو وزیر ابن یگیس نے اپنے گھر میں

”جزیرہ“ کہتے تھے (اس کی وجہ تسمیہ اور ان علاقوں کی بابت دیکھیے Rise : Ivanow، ص ۲۰ : محمد کامل حسین : فی ادب مصر الفاطمیہ، قاہرہ، ۱۹۵۰ء، ص ۱۹) - ایران میں یہ دعوت ”دعوة مصریان“ کے نام سے مشہور تھی، جو اس کے مصری الاصل ہونے کی یاد دلاتی تھی (Rise : Ivanow، ص ۱۳۰) - خالص سیاسی پہلو سے یہ دعوة وہ لوگ بھی دے سکتے تھے جو اس کے ساتھ فقط ہمدردی رکھتے تھے، لیکن اصول و عقائد کے لحاظ سے اس کی اشاعت داعیوں کا کام تھا، جن کے سربراہ ”داعی الدعوة“ کا صدر مقام قاہرہ میں تھا اور اس کے فرائض کا نام بھی ”دعوة“ تھا (الفقشدی : صبح الاعشی، ۱ : ۴۳۴) - علی العموم اس کا سیاسی مقصد مسلمانوں کو اس بات کا یقین دلانا تھا کہ فقط امام، جسے ”اللہ کی مدد“ حاصل ہو اور جو ”اسرار نبوی“ کا محافظ ہو، وہی نوع انسان کی صحیح ہدایت کر سکتا ہے، نیز یہ کہ سوا فاطمی خاندان کے، جو اسمعیل بن جعفر الصادقؑ کی اولاد ہیں، باقی تمام حکومت کرنے والے غاصب اور ناجائز حاکم ہیں جو اپنی سیاست کی وجہ سے پکڑے ہوئے اور دین کے مقدس ترین فرائض سے غافل ہیں - الفاظ ”قیام (اقامۃ) الدعوة البہادیہ“ سے صاف ظاہر ہے کہ اماموں کا فرض، جو انھوں نے اپنے ذمے لیا تھا، بنی نوع انسان کو سیدھے راستے پر ڈالنا تھا اور اسی پر ان کے سارے داعی زور دیتے تھے - مثال کے طور پر یہ جملہ ان خطوط میں دیکھا جاتا ہے جو فاطمی خلیفہ المستنصر نے یمن کے صالحی خاندان کی ملکہ کو لکھے : یہ ملکہ اسی فاطمی عقیدے کی تھی (رسائل المستنصر، طبع عبد المنعم ماجد، قاہرہ، ۱۹۵۸ء، عدد ۴۶، ص ۱۵۷)، نیز یہی جملہ داعیوں کے تقرر کی اسناد میں ملتا ہے (الفقشدی : صبح، ۹ : ۱۹ و ۱۰ : ۳۳۵ بیعد) اور اسمعیلی حلف میں پایا جاتا ہے (شہاب الدین العمری : التعریف، ص ۱۵۸ :

کتاب: *History of the People of the East* (۱۹۶۶ء)۔
 ۱۹۹۵ء میں "عام اعلیٰ دت" کے موضوع پر
 قاضی محمد بن عثمان کے خطبات سننے کے لیے
 سامی محل میں جمع ہوا۔ اکھٹا ہو کر گیارہ آدمی
 بیٹھ کر کچیل گئے اور ہلاک ہو گئے۔ ۵۳۵ھ/۱۱۴۰ء
 میں خلیفہ العاکم نے لوگوں کو مجبور کیا کہ
 "دعوت میں داخل ہوں"، جس کا مطلب یہ تھا کہ
 قاضی القضاة عبدالعزیز بن محمد بن عثمان کے
 خطبات سننے کے لیے حاضر ہوں۔ اس نے محل کے
 اندر خطبہ دینے کے لیے مختلف دنوں میں مختلف
 مجلسوں کا انتظام کیا تھا، جن میں سے بعض مردوں
 کے لیے اور بعض خواتین کے لیے مخصوص تھیں
 اور بعض میں فقط اعیان و عمائد شامل ہوتے تھے۔
 ان مجلسوں میں بھی اتنی ہیڑ ہوتی تھی کہ لوگ
 دب کر مر جاتے تھے۔ دوسرے ذریعے سے معلوم
 ہوا ہے کہ رئیس الدعاء محل کے ایک حصے میں
 (جسے المَحْوَل کہتے تھے) دعوت کے جلسوں کا اہتمام
 کرتا تھا؛ یہ جلسے "مجالس الحکمة" کہلاتے تھے۔
 اس کی خاص مجلس المَحْوَل میں ہوتی تھی، جہاں اس کی
 ایک خاص کرسی (کرسی الدعوت) ہوتی تھی۔ وہ ان لوگوں
 سے جو فاطمی مذہب میں نئے داخل ہوتے تھے حلف
 لینا تھا اور حاضرین مجلس (الجزی) اسے چاندی پیش
 کرتے تھے۔ خطبات کی تیاری میں بڑی احتیاط سے کام
 لیا جاتا تھا اور وہ بڑے جاتے سے پہلے خلیفہ کے سامنے
 پیش کیے جاتے تھے۔ ان خطبات کی تیاری میں اس کے
 وہ قسیم اور سرکاری ققیہ اسے مدد دیتے تھے جو
 دارالعلم یا دارالحکمة [رک بان] میں پڑھاتے تھے (اسے
 ۵۳۵ھ/۱۱۴۰ء العاکم نے قائم کیا تھا اور یہ ایک قسم
 کی یونیورسٹی تھی۔ اس میں ایک کتاب خانہ بھی تھا)۔
 جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، مردوں اور عورتوں
 کے لیے الگ الگ مجلسیں منعقد کی جاتی تھیں۔
 ابن الطوتو (۵۳۵ھ/۱۱۳۱ء تا ۶۱۰ھ/۱۲۱۰ء) کے

طابق مردوں کے لیے مجلسیں محل کے بڑے کمرے
 (الانوار الکبیر) میں اور عورتوں کے لیے مجلس الدائمہ
 میں منعقد ہوتی تھیں۔ دوسری جانب المصنوعہ
 (۵۳۶ھ/۱۱۴۰ء تا ۵۴۰ھ/۱۱۴۶ء) نے رائج مجلسیں
 مجلسیں گدوائی میں؛ ایک اولاد کے لیے، ایک عمائد بن
 حکومت اور محل کے حیدر عہدہ داروں کے لیے، ایک
 عوام الناس اور انیسویں مذک سے آنے والے زائرین کے
 لیے، ایک عورتوں کے لیے (جامع الازھر میں) اور ایک
 محل کی عورتوں کے لیے (ان تمام حیثیات کے لیے
 دیکھیے المقریزی، ۱: ۳۱۱ تا ۳۱۲ و ۳۹۰ تا
 ۳۹۱)۔ القاضی (۳: ۳۸۷) کے مطابق رئیس الدعاء
 کی فقہی مجلسیں منعقد ہونے کی جگہ "دارالعلم"
 بھی اور وہیں مذہب میں نئے شامل ہونے والوں سے
 حلف لیا جاتا تھا، لیکن یہ پورے وثوق کے ساتھ نہیں
 کہا جاسکتا کہ مذہبی اور فرقے کے عقائد کے مطابق
 خطبات بھی اسی جگہ دیے جاتے تھے (کامل حسین؛
 فی آداب مصر الفاطمیہ، قاہرہ، ۱۹۹۵ء، ص ۳۶)۔ اس
 کا عام مدین اتفاق طور پر ہوا کہ اسیر رضوان
 (م ۵۵۰ھ/۱۱۵۳ء) کے زمانے میں حلب میں ایک
 دارالدعوت تھا (ابن النجاشی، ص ۲۷؛ کمال الدین
 ابن العديم، در Rec. Hist. Cr. Or.، ۳: ۵۸۹ تا ۵۹۰؛
 ابن نعری بردی: النجوم الزاهرة، قاہرہ، ۵: ۲۰۵ تا ۲۰۶)۔
 ہمارے پاس اس طریق کار کا مفصل بیان موجود
 ہے جس سے اسمعیلی داعی اپنے فلسفیانہ مذہبی
 نظریات کی طرف نئے لوگوں کو راغب کرتے
 تھے۔ ان میں وہ نوافلاطونی نظریہ اشراق، دنیا اور
 اسامت کے دائرے کے تصورات اور اپنے دعادی کے
 نبوت کے لیے قرآن مجید اور قوانین شرعی کی من مانی
 تاویلات پیش کرتے اور جس مذہب کا آدمی دیکھتے
 اسے مائل کرنے کے لیے اس کے مناسب حال مختلف
 طریقے اختیار کرتے تھے۔ اس بیان کے مطابق جو
 المقریزی، ۱: ۳۹۱ بعد، اور اس سے بھی زیادہ

اس بات کو باور کر لینا مشکل ہے کہ اوپر کا بیان محض اختراع ہے۔ نو مدارج المقریزی اور النوری سے پہلے ہی سنی مآخذ کے ذریعے معلوم تھے، اگرچہ ان مآخذ میں یہ اسمعیلی ساوک کے نو درجے یا ”مراتب“ نہیں، بلکہ وہ مرحلے بنائے گئے ہیں جن سے (عام لوگوں کو) مذہب سے رفتہ رفتہ بالکل ہٹا دیتے تھے، ہر درجے کا ایک الگ نام رکھا گیا ہے جو استعمال میں آنے والے منطقی یا نفسیاتی طریقے کے مطابق ہوتا تھا۔ البغدادی: (الفرق بین الفرق، طبع قاہرہ ۱۳۶۷ھ/۱۹۴۸ء، ص ۱۷۹ بعد) نے ان درجات (مراتب) کے نام حسب ذیل دیے ہیں: نفوس، تائیس، تشکیک، تعلیق، ربط، تدلیس، تائیس۔ اس کے بعد حلقوں (ایمان) کی نوبت آتی ہے اور اس کے بعد مکمل ترک (خلع) کا درجہ ہے (نیز دیکھیے الغزالی: کتاب فضائل الباطنیہ: Goldziher: Streitschrift des: Goldziher: G. gegen die Bāḡīnija Sekte، ص ۴۰۔ اور ص ۴۰ بعد) اور محمد کامل حسین: فی ادب، ص ۱۰۹ بعد)۔

یہ مسئلہ ابھی تک قابل تحقیق ہے کہ اسمعیلی تبلیغ اور بحث کے مختلف طریقوں کی پوری ترتیب و تکمیل کا زمانہ کیا تھا۔ اسے اس قدر پیچھے بشکل ہی لے جایا جا سکتا ہے کہ اسمعیلی فرقے کے ابتدائی ایام سے پہلے ملے۔ النوری اور المقریزی نے جو خاکہ پیش کیا ہے وہ اس زمانے کے بعد کا معلوم ہوتا ہے۔ لفظ دعوة کا مفہوم صرف ترغیب اور تبلیغ ہی نہیں ہے، [اس کے بہت سے اور معنی تھے: ۱. اذان، ۲. کے نزدیک اس کا مفہوم عقیدہ، مذہب، ۳. امت، فرقہ، ۴. امام کے طرفداروں کی جماعت وغیرہ بھی ہے۔ Ivanow: Organization، ص ۱۸ تا ۱۹ نے لکھا ہے کہ دعوة کا مفہوم حلقہ اطاعت، سلطنت، خاندان شاہی بھی لیا گیا ہے۔ ابن حوقل کہتا ہے (ص ۵۷ تا ۵۸) کہ ”سر زمین مغرب امیر المؤمنین الیعزیدین اللہ کے حلقہ دعوت میں اندر ہے“ اور (ص ۲۲۱) ”کرمان باشندگان

تفصیل کے ساتھ النوری: (ترجمہ در S. de Sacy: Exposé de la religion des Druzes، جلد ۱، مقدمہ) میں موجود ہے، نیز مرید (الدعو) کا ساوک نو مدارج کی تعلیم و تربیت کے بغیر مکمل نہیں ہوتا تھا اور اس تعلیم کا ہر ایک درجہ دعوة کہلاتا تھا۔ یہ تنظیم اسمعیلی مسلک کے مہینہ بانی عبداللہ بن مہمون القداح سے منسوب کی جاتی تھی۔ اس سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ وہ اپنے عقیدے کے اسرار کس طرح بتدریج نو آموز کے آگے ”تاویل“ اور ”تاویل التاویل“ کے ذریعہ کھولتا تھا (اس آخری تعبیر کے لیے دیکھیے المسعودی: تنبیہ، ص ۳۹۵، ترجمہ، ص ۵۰۱، اور قرب Goldziher: Vorlesungen، بار دوم، ص ۲۴۶؛ فرانسیسی ترجمہ، ص ۲۰۶)۔ Ivanow نے متعدد مقامات پر An Ismailitic Work by Nasirud-din Tusi، در JRAS، (۱۹۳۱ء، ص ۵۳۸، The Organization of the Fatimid، propaganda، در JBRRAS، ۱۵ (۱۹۳۹ء): ۱۱۔ اور Rise، ص ۱۳۳، در باب 'Abdu'l-lahb. Maymūn al-Qaddāl، اس بیان پر اعتراض کیا ہے کہ اسمعیلی مسلک میں نیے داخل ہونے والوں کو نو مدارج یا مراتب کی تعلیم دی جاتی تھی اور اس طرح رفتہ رفتہ انہیں واقف اسرار کیا جاتا تھا۔ اس کی رائے کے مطابق اس جماعت ”حدود الدین“ کی غلط تعبیر کی گئی ہے جو فاطمی پیشوایان مذہب کی ایک قسم تھی (اس طرز تعبیر کے لیے دیکھیے Ivanow: Organization، ص ۸ اور ایک حاشیہ در M. Canard کے ترجمہ سیرۃ جودھر، ص ۵۲)۔ نیے مریدوں کی تعلیم کے ان نو درجوں کا قدیم طریق سے تعلق ہے اور نہ جدید طریق سے، اس کا کوئی نشان نہ خود اس فرقہ کی کتابوں میں ملتا ہے اور نہ مناظروں کی کتابوں میں کہیں دیکھنے میں آتا ہے؛ اسی طرح وہ اس فرقے اور فری میسنز Freemasons کی تعلیم گاہوں اور خفیہ رسوم کی تعلیم میں مشابہت کا انکار کرتا ہے۔ تاہم

یا مستعلیہ یا طیبی دعوت ہے، جس کے پاک و ہند کے بھرے آج کل پیرو ہیں۔ دعوتِ حدیدہ یا نزاری دعوت کی شہرت حسن بن صباح اور حشیشین (Assassins) کی بدولت ہوئی۔ اس کے پیرو آج کل خوجے ہیں۔ اسمعیلی دعوت کی ان دو شاخوں کی بابت دیکھیے ابن خلدون، ۱ : ۳۶۳ (روزنہال، ۱ : ۳۱۳؛ الشہرستانی، طبع Cureton، ص ۱۴۷، ۱۵۰ تا ۱۵۲، (مطبوعہ قاہرہ ۱۳۳۷ھ)، ۲ : ۲۶، ۲۸ تا ۳۱؛ The Order of Assassins، بعد اشارہ۔ شام کے نزاریوں یا حشیشیوں کو فدائیوں بھی کہا جاتا ہے، جنہوں نے اپنے قلعوں کی بدولت صلیبی جنگوں میں اہم حصہ لیا۔ ۵۶۷/۱۱۷۸ء میں انہیں مملوک سلطان یسے نے مغلوب کر لیا۔ پھر بھی وہ متعدد مقامات پر بدستور قابض رہے۔ اس وقت ان کا لقب ”اطائفۃ الاسمعیلیۃ بتلاح الدعوت“ مشہور ہو گیا۔ وہ خود اپنے آپ کو ”اصحاب الدعوت الہادیۃ“ یا ”مجاہدون“ کہتے تھے۔ قاہرہ سے مقرر کردہ ایک اہلک ان پر حاکم ہوتا تھا (دیکھیے القلقشندی، ۱ : ۱۲۲؛ ۲ : ۱۲۶، ۱۳۵، ۲۳۵، ۳۰۹، ۳۱۰، ۲۵۸)۔ موجودہ دور میں اسلامی تبلیغ اور مبلغین کے دبستان کے لیے، جیسے رشید رضا نے قاہرہ کے قریب جزیرۃ روضہ میں قائم کیا اور جس کا نام ”دار الدعوت و الارشاد“ (مرکز تبلیغ و ہدایت) رکھا، دیکھیے Goldziher : *Richtungen*، ص ۳۳۳ تا ۳۳۷ [نیز دیکھیے دعوت و عزیمت، در ابوالکلام آزاد : اہلال اور دوسری تحریریں نیز رگ بہ اسمعیلیہ، باطنیہ، یوہرہ، خوجہ، فاطمین، قرامطہ]۔

مآخذ : متن مقالہ میں مذکور سآخذ کے علاوہ دیکھیے (۱) De Goeje : *Mémoire sur les Car-mathes du Bahrain et les Fatimides*، ص ۱۶ (بعد، ۲۳ بعد، ۲۷ بعد، ۲۸) Casanova : *La doctrine secrète*، ص ۱۸ (ج ۱، ۱۹۲۱ء) : *des Fatimides d'Egypte*، ج ۱، ۱۸ (ج ۲، ۱۹۲۱ء) : *The history of the Ism'ili*، حسین ایف الہمدانی (۲)

مغرب کی دعوت میں ہے۔ ابوحنیفہ النعمان کی کتاب الہدیۃ، باب ۷ میں ”مَنْ شَمَلَتْ دَعْوَةُ الْإِمَامِ“ خلیفہ کی ساری رعایا کو ظاہر کرتا ہے۔ سیرت جودھر (ترجمہ، ص ۵۵، قُب : *Nisa* : Ivanow، ج ۱) میں ”شیوخ الدعوت“ کی ترکیب مجموعی طور پر ”شیوخ الدولۃ“ کے مترادف ہے۔ انہیں معنوں میں شامی خاندان کے واسطے اس کے استعمال کے لیے نیز دیکھیے الاصطخری، ص ۳۶ میں م۔ اور ۲۹۶ میں م۔ ”سواد دعوت بنی العباس“ عباسی خاندان کا سیاہ رنگ (BGA، م : ۲۳۶) المقریزی : ساوگ، ۱ : ۱۸۔ آخر میں ہم یہ دیکھ سکتے ہیں کہ دعوت کا مفہوم وہی ایاضوں کے ہاں مذہب بوی لیا گیا ہے جو اپنے آپ کو اہل المذہب یا اہل الدعوت کہتے ہیں (T. Lewicki : *La repartition géographique des groupements ibadites dans l'Afrique du nord au Moyen Age*، ج ۱، ۲۱، ۱۹۵۷ء)۔

۱۰۹۸/۱۱۸۷ء میں المستصر کی وفات کے بعد، جب اس کے فرزند بستعلی کی جانشینی کا اس کے دوسرے فرزند نزار کے مقابلے میں اعلان کیا گیا، تو اسمعیلی فرقے میں تفرقہ پڑ گیا۔ اسمعیلیوں کے ایک گروہ نے مستعلی کو جانشین ماننے سے انکار کر دیا، اس وقت سے اس فرقے کے دو گروہ ہو گئے، مستعلوی اور نزاری۔ پہلے گروہ ”الدعوت القدیمة“ اور دوسرا ”الدعوت الجدیمة“ کہلایا۔ یہ تفرقہ ہمیشہ کے لیے قائم ہو گیا۔ مستعلی کے فرزند امیر کو نزاریوں نے ۵۲۸/۱۱۳۰ء میں قتل کر دیا تو اس نے مرنے سے قبل اپنا حق سلطنت اپنے چچیزے بھائی عبدالمجید کو، جو آگے چل کر حافظ کہلایا، تفویض کر دیا، کیونکہ اس کا اپنا لڑکا طیب کم سن تھا۔ اس کے بعد طیب شام ہو گیا یا ”ستر“ میں داخل ہو گیا۔ دعوتِ قدیمہ کا دوسرا نام ”دعوت الطیبیۃ“ بھی ہو گیا اور یمن میں اسے دوام حاصل ہو گیا، جہاں کی صلیخی مکہ نے دعوت کو امام الطیب کے نام سے پھیلایا۔ یہی دعوتِ قدیمہ

”قاضی (حاکم عدالت) کے سامنے کسی شخص کا دوسرے شخص کے مقابلے میں اپنے حق کا مطالبہ (مَجَلَّةُ الاحکام العدلیَّة، دفعہ ۱۶۱۳)۔ اسی طرح اس مقدمے کو ایسی جو فیصلہ کے لیے کسی ثالث (حکم) کے سامنے پیش کیا جائے دعویٰ کہتے ہیں۔ ثالث کرنے والا مدعی اور اس کا مقابل مدعی علیہ کہلاتا ہے، مطالبہ کا مقصد مدعی کہلاتا ہے، جس کے لیے زیادہ رائج نام ”مدعی بہ“ ہے، اگرچہ بعض مصنفین کے نزدیک یہ زیادہ صحیح نہیں [مدعی اور مدعی علیہ کی یہ تعریفیں بھی کی جاتی ہیں: مدعی وہ فریق ہے جو اگر چاہے تو دعویٰ سے دستبردار ہو سکتا ہے اور مدعی علیہ وہ فریق ہے جو محض اپنی خوشی سے دعویٰ کے چلنے کو روک نہیں سکتا (ہدایۃ)، ۳، کتاب الدعوی: ۱۸۵]۔ مدعی وہ ہوتا ہے جس کی بات اثبات حق پر مشتمل ہو اور مدعی علیہ وہ ہوتا ہے جس کی بات نفی پر مشتمل ہو۔ مدعی سے مراد وہ شخص جو غیر ظاہر (ظاہری حالت کے برعکس) کا مطالبہ کرتا ہے اور مدعی علیہ سے مراد وہ شخص جو ظاہر کو متمسک ہے۔ مدعی وہ فریق ہے جو اپنے دعوے کو ثابت کیے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتا اور مدعی علیہ وہ فریق ہے جس کے حق میں بغیر شہادت پیش کیے فیصلہ صادر ہو سکتا ہے (التہاتوی: ہدایۃ)۔ امام محمدؒ کے نزدیک مدعی علیہ وہ فریق ہے جو دعویٰ سے منکر ہو [عبدالرحیم: *The Principles of Muhammadan Jurisprudence*، لاہور ۱۹۵۸ء، ص ۳۶۶، نیز اردو ترجمہ]۔ مقدمے کے فریق، اگر دونوں طرف ایک ایک ہوں تو خصمانہ، اور زیادہ ہوں تو خصوم یا خصما (یعنی مقدمے میں ایک دوسرے کے حریف، مخالفین) کہلاتے ہیں (واحد: خصم)، یوں کہنا چاہیے کہ علاقہ ایک دوسرے فریق کا خصم ہے۔ فریقین کا باہمی اختلاف ”خصومة“ کہلاتا ہے (اس کے اور مترادف، الفاظ جو اتنے

Da'wat and its literature during the last Phase of the Fatimid Empire، JRAS، ۱۹۳۲ء، ص ۱۲۶ تا ۱۳۶؛ (۴) المجالس المستنصرية، طبع کمال حسین، قاہرہ ۱۹۴۶ء، مقدمہ: (۵) احمد حیدر الدین النکمرانی: راحت العقل، طبع کمال حسین اور مصطفیٰ حلیمی، قاہرہ ۱۹۵۲ء، مقدمہ: (۶) کمال حسین: فی ادب مصر القاطنیۃ، قاہرہ ۱۹۵۰ء، ص ۱۹ بعد: (۷) Ivanow: *Brief survey of the evolution of Ismailism*، ۱۹۵۲ء؛ (۸) A. M. Magued: *Institutions et Cérémonial des Fatimides*، قاہرہ ۱۹۵۵-۱۹۵۳ء، ص ۱۷۷ بعد: (۹) مصطفیٰ غالب: تاریخ الدعوة الاسعیمیۃ، دمشق ۱۹۵۳ء (اس سے استفادہ نہیں کیا گیا): (۱۰) Bayard Dodge: *Ismā'iliyyah and the origins of the Fatimids*، World، اکتوبر ۱۹۵۹ء، ص ۲۹۹ تا ۳۰۰؛ (۱۱) *The origins of Ismā'ilism*: B. Lewis، کیبرج ۱۹۵۳ء، عربی ترجمہ Khl. A. Jallu اور J. M. Rajab، قاہرہ ۱۹۵۷ء نے کیا (دیکھیے ص ۱۶۳ بعد اور مواضع کثیرہ)۔

(M. CANARD)

* دعویٰ: [ع، جمع دعاوی، دعاوی]، قانون چارہ جوئی [غوی معنی وہ قول جس سے انسان کسی شخص کے مقابلے میں اپنا حق ثابت کرے۔ اقرار اس کا عکس ہے، یعنی اپنے خلاف کسی غیر کے حق کو ماننا۔ فقہا کی اصطلاح میں دعویٰ سے مراد قاضی یا حکم (ثالث) کے سامنے کسی شخص کا کسی دوسرے شخص کے مقابلے میں اور اس غیر شخص کی موجودگی میں اپنے حق کی اطلاع کرنا۔ اگر یہ اطلاع قاضی یا حکم کے سامنے اور اس غیر شخص کی موجودگی میں نہ ہو تو اسے دعویٰ نہیں کہا جائے گا۔ اصل کی نیابت ولی، وصی یا وکیل کر سکتا ہے (التہاتوی: کتات اصطلاحات الفنون، بذیل مادۃ دعویٰ)]۔ ایک مشہور شایعہ کے مطابق اس کی تعریف یہ کی گئی ہے:

اصطلاحی نہیں، نزاع، منازعہ اور تنازع ہیں)۔

دعویٰ کے لفظ میں دو باہم جھگڑنے والے فریقوں کا تصور اس کے مفہوم سے اس حاکم عدالت کی ایسی کارروائی کو خارج کر دینا ہے جس کے ذریعے وہ اپنی منصبی حیثیت کی بنا پر اپنے کچھ اختیارات استعمال کرتا ہے، مثلاً وہ اقدامات جو وہ عوام کی بہبود کی حفاظت کے لیے کرتا ہے۔

بہر حال ہر ایسے مقدمے میں جس کے اندر عملی نزاع کے تین لازمی عناصر کام کر رہے ہوتے ہیں، ایک دعویٰ ضرور ہوتا ہے، خواہ اس قاضی کی جس کے سامنے مقدمہ پیش کیا گیا ہے حیثیت اور مقصد زیر بحث کی نوعیت کچھ بھی ہو۔

الغرض دعویٰ کا وجود ذیل کی صورتوں میں متحقق ہوتا ہے: اس مقدمہ میں جس میں کوئی فرد جسے رنج یا نقصان پہنچا ہو رنج یا نقصان پہنچانے والے کے خلاف استغاثہ دائر کرے۔ جس میں قصاص [ارگ یاں] کے اجرا کا یا دیت [رگ یاں] دلوانے کا مطالبہ ہو؛ (۲) ان مقدمات میں جہاں مختلف حدود شرعیہ [رگ یاہ حد] کے ماتحت کسی مظلوم کے کُلی یا با جزوی نقصان کی تلافی کے لیے ظالم کو عدالت میں طلب کیا جائے، جیسے سرقہ یا زنا کی صورت میں ہوتا ہے؛ (۳) فرائض منصبی کے تحت فوجداری مقدسوں میں جہاں ضرر رسیدہ کو واسطہ بنا کر، یا "حسبہ" [رگ یاہ] کے اختیارات کے بموجب، جس میں تحفظ عوام مدنظر ہوتا ہے، کارروائی کی جائے، یہ کارروائی اس اصول پر مبنی ہوتی ہے کہ شخصی شکایات کے علاوہ ہر مسلمان اس شخص کے خلاف چارہ جوئی کا مجاز ہے جس نے قانون شکنی کا ارتکاب کیا ہو اور (۴) اخیر میں ان مقدمات میں جو مظالم کی غیر معمولی کارروائی کے مطابق دائر کیے جائیں۔

صحیح دعویٰ، یعنی دعویٰ کو صحیح ماننے کے لیے چند شرائط درکار ہوتی ہیں [مثلاً] مدعی بہ کی پوری

پوری تعیین، [اگر مدعی بہ عدالت میں موجود ہے تو اس کی طرف اشارہ کافی ہے مگر موجود نہ ہو تو اس کی توصیف و تعریف، اور اس کی قیمت بیان کرنا ضروری ہے]، فریقین مقدمہ کا شخص ہو، اور ان کی قابلیت معلوم ہونا ضروری ہے۔ جس شخص میں قانون کے سمجھنے کی عام قابلیت نہ ہو، لیکن اس میں اختیار کرنے کی صلاحیت ہو، وہ قانونی چارہ جوئی کر سکتا ہے، مگر ایسا کرنے کے لیے اس سرپرست [ولی] یا قاضی کی اجازت اس کے لیے ضروری ہے [اس طرح نابالغ یا مجنون کے خلاف مقدمہ اس کے ولی کے توسط ہی سے چلایا جاسکتا ہے]۔ اصلی چارہ جوئی میں ضروری ہے کہ قریبی مخالف متنازع فیہ شے بر حقیقہ قابض (صاحب الید) ہو [صحیح دعویٰ کے شرائط کی بابت دیکھیے، مثلاً مجلۃ الاحکام العدلیۃ، دفعہ ۶۱۶ بعد]۔ جس صورت میں دعویٰ دائر کرتے وقت جملہ شروط مکمل نہ ہوں تو انہیں دعویٰ دائر کرنے کے بعد مکمل کیا جاسکتا ہے۔ اس تکمیل کا اصطلاحی نام "تصحیح الخصومة" ہے۔ یہ تکمیل صرف مدعی کی درخواست پر یا قاضی کے حکم پر کی جاسکتی ہے۔ مقدمہ میں فریقین خود بالاصالہ بھی پیش ہو سکتے ہیں اور اپنے بجائے اپنا مختار بھی بھیج سکتے ہیں۔ یہ مختار فریق مقدمہ کا خود مقرر کردہ وکیل بھی ہو سکتا ہے یا جو اہلیت نہیں رکھتے ان کا حسب اقتضائے قانون وصی یا ولی بھی ہو سکتا ہے۔ جو چیزیں عوام الناس کے استعمال کے لیے آزاد ہیں، مثلاً سمندر کا پانی یا شاہراہ عام، ان میں ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنے حق استعمال کی محافظت کے لیے قانونی چارہ جوئی کرے۔ اگر محدود اور معین گروہوں کے درمیان باہم نزاع ہو، مثلاً ایک گاؤں کا دوسرے گاؤں سے مشترک چیزوں، جیسے جنگل "چراگاہ" وغیرہ، کے استعمال کے بابت جھگڑا ہو تو ایک گروہ کا کوئی فرد، دوسرے گروہ کی طرف سے بحیثیت مدعی یا مدعی علیہ

کے متعلق قواعد قطعی نوعیت کے نہیں، فریقین کی باہم رضامندی سے انہیں نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔

فریقین کا حاضر ہونا مقدمہ کی کارروائی کے لیے اصولاً ضروری شرط ہے، اسلامی قانون کے تحت کوئی فیصلہ غیر حاضری کی حالت میں نہیں ہو سکتا۔ مزید برآں حاضری سے بچنے والے مدعی علیہ کو حاضر ہونے پر مجبور کرنے کے مختلف طریقے مقرر ہیں۔ انتہائی اقدام کے طور پر قاضی مدعی علیہ کے بجائے اس کا ایک سرکاری نمائندہ مقرر کرے گا۔

ایک دوسرے نظام میں، جو بالخصوص [مالکی اور] شافعی مسالک اور شیعہ قانون میں مروج ہے، یہ رائے پائی جاتی ہے کہ جب دعویٰ میں مدعی علیہ کا نام اور دیگر کوائف موجود ہوں تو پھر صحتِ دعویٰ کے لیے اس کی حاضری ضروری شرط نہیں؛ مقلدے کی کارروائی اس کی غیر حاضری میں بھی حسب معمول کی جائے گی اور اس وجہ سے اسے ”یک طرفہ کارروائی“ قرار نہیں دیا جائے گا اور جو فیصلہ صادر کیا جائے گا وہ ویسا ہی جائز اور صحیح ہوگا جیسا کہ مدعی علیہ کی حاضری کی صورت میں ہوتا۔

اصولاً مقدمہ کی کارروائی زبانی ہوتی ہے۔ ہر چند کہ فریقین کو اپنے دلائل تحریری طور پر پیش کرنے کی اجازت ہے تاہم جب تک کہ فریق مقدمہ حاکم کے سامنے اس کے صحیح ہونے کا زبانی اقرار نہ کر لے اس کے تحریری بیان کو سند نہ مانا جائے گا۔

کسی دعویٰ کے جواب اور رد کے لیے اصطلاح ”دفع“ استعمال کی جاتی ہے۔ پھر اس لفظ کو وسعت دے کر ہر جواب کو، جو ایک فریق اپنے مقابل فریق کے کسی مخالف استدلال کو رد کرنے کے لیے دے، ”دفع“ کہنے لگے۔

دعویٰ کا بار ثبوت مدعی پر ہوتا ہے [الْبَيِّنَةُ عَلَى الْمُدْعَى، رُكْبَةُ الْبَيِّنَةِ]۔ قانونی ثبوت کے طریقے یہ ہیں: اقبال یا اقرار، گواہی (شہادت)، حلف

قانونی چارہ جوئی کر سکتا ہے، بشرطیکہ اس گروہ کے افراد کی تعداد غیر محدود ہو (قوم غیر محصور)؛ عام رائے کے مطابق ”غیر محصور گروہ“ وہ ہوتا ہے جس کے افراد کی تعداد ایک سو سے زیادہ ہو۔

بعض جاگیروں کی صورت میں، جیسے کہ اوقاف، جنہیں قانوناً ایک مستقل حیثیت حاصل ہے، قانونی کارروائی میں خاص نمائندے پیش ہوتے ہیں۔ یہی حکم منقسم شدہ میراث کا بھی ہے۔ اصولاً ہر وارث سارے ورثا کی طرف سے مدعی یا مدعی علیہ ہو سکتا ہے، [دعویٰ ثابت ہونے پر تمام ورثا اس سے متمتع ہوتے ہیں۔

اور مقدمہ ہارنے کی صورت میں باقی ورثا کو یہ حق نہیں ہوتا کہ وہ مدعی سے مطالبہ کریں کہ وہ اپنا دعویٰ ہر ایک وارث کے مقابلے میں اس کے حصہ کے لحاظ سے ثابت کرے، البتہ وہ فیصلہ کے متعلق مرافعہ کرنے کے مجاز ہوں گے۔ اگر کسی خاص جائداد میں چند شرکا ہوں لیکن ان کی حیثیت ورثا کی نہ ہو تو اس جائداد کی بابت دعویٰ میں ایک شریک باقی شرکا کی طرف سے بحیثیت مدعی علیہ جواب دینے کا مجاز نہیں، لیکن اگر دعویٰ صرف اسی کے خلاف ہے تو بلحاظ اس کے حصے کے اس کے خلاف فیصلہ صادر ہوگا]۔ دعویٰ ایسی عدالت میں دائر کیا جا سکتا ہے جو اس علاقے میں واقع ہو جہاں مدعی علیہ کی مستقل یا عارضی سکونت ہے۔ املاک غیر منقولہ کے بارے میں بھی یہ ضابطہ اسی طرح قابل عمل ہے، لیکن مالکی مذہب میں یہ روا رکھا گیا ہے کہ غیر منقولہ املاک سے متعلق اس جگہ کی عدالت میں جہاں وہ جائداد واقع ہے مقدمہ دائر کیا جائے۔ جب ایک ہی مقام پر متعدد قاضی موجود ہوں، یا جہاں ایک عام قاضی ہو اور ایک ایسا قاضی ہو جسے فوجیوں کے مقدمات سننے کے لیے مقرر کیا گیا ہو (قاضی عسکر [رُكْبَةُ بَأْسٍ]) تو عدالت مجاز کو پسند کرنے کا اختیار مدعی علیہ کو ہے؛ تاہم عدالت کے مجاز ہونے

(یعنی)، طرزِ تحریر (خط) اور قانونی قرائن۔

[اثباتِ دعویٰ کے لیے سب سے زیادہ قوی دلیل مدعی علیہ کا اقرار ہے، یعنی مدعی علیہ اس بات کو تسلیم کر لے جس کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ مگر اپنے اقرار سے پابند ہو جاتا ہے، لیکن صحتِ اقرار کے لیے ضروری ہے کہ مقرر بالغ، اور عاقل ہو اور اس پر کسی قسم کا جبر نہ کیا جائے، نیز یہ کہ غیر کے خلاف اقرار معتبر نہیں ہوتا، یعنی اقرار کا اثر صرف اقرار کرنے والے تک محدود ہوتا ہے، بخلاف شہادت کے کہ وہ غیر پر بھی اثر انداز ہوتا ہے (البینۃ حجة متعدية، والافرار حجة قاصرة)۔ اقرار کے موصوف ہونے کی صورت میں یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے کہ آیا ایسا اقرار قابلِ تجزیہ ہے یا نہیں، مثلاً قرضے کے دعویٰ میں اگر مدعی علیہ یہ اقرار کرے کہ اس نے قرضہ تو لیا تھا لیکن وہ میعاد دی ہے تو اس صورت میں احناف اور مالکیہ کے نزدیک اقرار کا تجزیہ کیا جائے گا، یعنی قرضے کی حد تک تو اس کا اقرار معتبر ہوگا، لیکن باقی کا ثبوت اس سے طلب کیا جائے گا۔ حنابلہ اور مذهبِ ظاہری کے پیروؤں کے خیال میں اقرار قابلِ تجزیہ نہیں۔ شواہد کے اس مسئلہ کے بارے میں دو اقوال ملتے ہیں۔ امام غزالی کی رائے میں اگر مدعی علیہ میعاد قرضہ کا اقرار کرے تو اقرار قابلِ تجزیہ نہ ہوگا اور اگر قرضہ کے اقرار کے ساتھ اس کے ادا کر چکنے کا بھی دعویٰ کرے تو اقرار کا تجزیہ کیا جائے گا۔

جب مدعی علیہ قرضہ لیے تو وہ حقوقِ العباد میں اپنے اقرار سے انحراف نہیں کر سکتا، لیکن ان جرائم میں جن کی سزائیں اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دی ہیں وہ جمہور فقہاء (باستثنائے ظاہریوں) کے نزدیک انحراف کر سکتا ہے۔

اثباتِ دعویٰ کی دوسری دلیل قسم (یمن) ہے۔ اگر مدعی شہادت (بینۃ) پیش نہ کر سکے تو وہ مدعی علیہ سے قسم لینے کا مجاز ہے، لیکن قسم فوجداری مقدمات

میں جائز نہیں۔ اگر مدعی علیہ اپنے بری الذمہ ہونے کی قسم کھالے تو مدعی کا دعویٰ خارج کر دیا جائے گا۔ اس پر تمام فقہاء متفق ہیں، لیکن اس مسئلے میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ مدعی علیہ سے قسم لینے کے بعد مدعی گواہی پیش کر سکتا ہے یا نہیں۔ امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ بن حنبل کے نزدیک شہادت قبول ہوگی کیونکہ شہادت اصل ہے اور قسم اس کی قائم مقام ہے۔ امام مالک کے نزدیک اس کی گواہی قسم لینے کے بعد قابلِ قبول ہوگی بشرطیکہ اسے قسم لینے سے قبل یہ عام نہ ہو کہ اس کے پاس گواہ موجود ہے۔ مذهبِ ظاہری کے مقلدین کے نزدیک قسم لینے کے بعد مدعی کی گواہی قابلِ قبول نہ ہوگی۔ اگر مدعی علیہ قسم کھانے سے انکار کر دے تو اس صورت میں احناف اور امام احمدؒ بن حنبل کی ایک روایت کے مطابق فیصلہ اس کے خلاف صادر کر دیا جائے گا اور مدعی سے قسم نہیں لی جائے گی کیونکہ البینۃ علی المدعی والیمن علی من آنکر۔ باقی ائمہ اور امام احمدؒ بن حنبل کی دوسری روایت کے مطابق مدعی سے بھی قسم لی جائے گی۔ مذهبِ ظاہری کے مقلدین اور ابن ابی لیلیٰ کے نزدیک مدعی علیہ کو قسم کھانے پر مجبور کیا جائے گا، یعنی اسے مجبور کیا جائے گا کہ یا تو اپنے بری الذمہ ہونے کی قسم کھائے یا اقرار کرے۔

مجلة الأحكام العدائیة، (دفعہ ۳۷۷) میں البینۃ علی المدعی کے قاعدے میں ایک استثنا بھی دیا ہے، چنانچہ وہاں لکھا ہے الامین صدق بیینہ، یعنی اگر مستودع یہ دعویٰ کرے کہ اس نے مودع کو اسات واپس کر دی ہے اور مودع وصول پائے سے انکار کرے تو مستودع کی قسم معتبر ہوگی اور اس سے اس دعویٰ کے ثبوت میں شہادت طلب نہ کی جائے گی۔ تمام فقہاء نے (باستثنائے مالکیہ) اس استثنا کو تسلیم کیا ہے۔ مالکیہ اس استثنا کو صرف اسی صورت میں تسلیم کرتے ہیں

جب موّءع نے بغیر گواہوں کے امانت رکھوائی ہو، بصورت دیگر مستودع پر بار ثبوت ہوگا (صحیح مصنفی: فلسفۃ التشریع فی الاسلام، پار دوم، ۱/۱۳۷، ۱۹۵۲ء، ص ۲۷۷: اقرار اور یمن کے لیے دیکھیے وہی مصنف: کتاب مذکور، ص ۲۳۰ تا ۲۳۲ و ۲۳۹ تا ۲۵۵ نیز اردو ترجمہ)۔

شہادت کی ایک خاص شکل تواتر ہے۔ تواتر کے معنی یہ ہیں کہ کثیر اعتماد اشخاص گواہی دیں (ایک عام مسئلہ رائے کے مطابق اور یہ تعداد اتنی بڑی ہو جس سے عقلی طور پر غریب اور جھوٹ کا امکان زائل ہو جائے۔ تواتر کی صورت میں یہ ضروری نہیں کہ گواہی کی سخت شرطوں کا اعتبار کیا جائے، مثلاً یہ کہ گواہ کو شخصی طور پر اس واقعہ کا علم ہو جس کی وہ گواہی دے رہا ہے، یا یہ کہ وہ اخلاقاً ثقہ ہو (عدل [رک باں] سے متصف ہو) باوجود اس کے تواتر، سوائے اقبال (اقرار) کے، تمام طریق اثبات سے افضل ہے۔

اثبات دعویٰ کے لیے تحریر (=خط) بجائے خود کوئی وقعت نہیں رکھتی؛ یہ اسی وقت صحیح طریق ثبوت ہوگی جب معتبر گواہ اس کی زبانی تصدیق بھی کر دیں۔ جب مدعی کے ساتھ مدعی علیہ خود بخود حاضر نہ ہو تو اس میں اختلاف ہے کہ آیا صرف مدعی کی حاضری سے اور دعویٰ پیش کر دینے سے دعویٰ صحیح قرار دیا جائے گا اور مقدمے کی کارروائی شروع کر دی جائے گی یا یہ کہ کارروائی شروع کرنے کا اور مدعی علیہ کے نام لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا جب تک کہ قاضی پہلے تفتیش کر کے اس کا اطمینان نہ کر لے کہ مقدمے کی کارروائی شروع کرنے کے لیے کم سے کم واضح اور ظاہر وجوہ موجود ہیں۔

اثبات دعویٰ کا اصول ایک شرعی اصول ہے، ان معنوں میں کہ جب دعویٰ کا ایسا ثبوت بہم پہنچا دیا جائے جو قانونی تقاضوں کو پورا کرتا ہو اور ان واقعات

کے مخالف نہ ہو جن پر دعویٰ کا دار و مدار ہے تو قاضی کو مقدمے کا فیصلہ اس ثبوت کے مطابق کرنا پڑے گا، خواہ اس کا اپنا دلی یقین کچھ ہی ہو۔ بنابرین فیصلہ کی حسب ذیل صورتیں ہوں گی: ایسے مقدمے میں جہاں فریقین، جن میں سے ہر ایک کسی چیز کے واحد مالک ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، اپنے اپنے دعوے کے ثبوت میں باقاعدہ قابل قبول دلائل پیش کر دیں تو قاضی کا فرض ہوگا کہ یہ فیصلہ کر دے کہ یہ دونوں اس چیز میں برابر کے حصہ دار مالک ہیں، یا ایک رائے یہ بھی ہے کہ ایسی صورت میں قرعہ اندازی ضروری ہو جائے گی اور جس کے نام قرعہ نکلے گا اسے اس چیز کا مالک قرار دیا جائے گا (مگر یہ فریقین کی رضامندی سے ہوگا)۔

[قاضی القضاة کی عدالت میں مرافعہ کے لیے گنجائش ملتی ہے، لہذا عدالتوں کے درجات اور مرافعہ اسلام میں روا ہیں]، لیکن اس ضابطے کی دو اہم مستثنیات ہیں: اول تو جس علاقے میں یا جس زمانے میں ”مظالم“ کی بابت باضابطہ کارروائی کرنے کا انتظام ہو، ہر شخص جسے یہ گمان ہو کہ باقاعدہ سرکاری محکموں میں اس کے ساتھ بے انصافی ہوئی ہے، وہ اس کی تلافی کا مطالبہ اس طرح کر سکتا ہے کہ خود سلطان کے حضور میں ایک درخواست پیش کرے: دوسرے یہ کہ مقدمہ اسی قاضی کے پاس دوبارہ دائر کر دیا جائے، یا پہلے فیصلہ کرنے والے قاضی کے جانشین کے پاس یا فی الواقع کسی قاضی کے پاس جو دیگر وجوہ سے سماعت کا مجاز ہو، تاکہ وہ نئے سرے سے مقدمے کا فیصلہ کرے۔ مستند فقہاء کا اس رائے پر اتفاق ہے کہ ایک فیصلے کے خلاف کارروائی ہو سکتی ہے اور مناسب حالات کے اندر وہ واپس لیا جا سکتا یا منسوخ کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ اس میں کسی مسئلہ ضابطہ قانون کی خلاف ورزی ہوئی ہو۔ سلطنت عثمانیہ میں قانون اسلام کے آخری مرحلے

محضانی: فلسفۃ التشریع فی الاسلام، بار دوم، ۱۹۳۷ء
 ۱۹۵۲ء، ص ۲۲۳ تا ۲۶۱، اردو ترجمہ از مولوی محمد احمد
 رضوی، لاہور بدون تاریخ، ص ۲۵۳ تا ۳۰۲؛ (۱۳)
 عبدالرحیم: The Principles of Muhammadan Juris-
 prudence، لاہور ۱۹۵۸ء، ص ۳۶۳ تا ۳۸۲، اردو ترجمہ
 از مولوی مسعود علی، ص ۷۰۶ تا ۷۳۰۔

(E. TYAN [و ادالہ])

دَفَار: رَک بہ ظَنَار۔

* دَفْتَر: (ف) تالگے سے سیا ہوا یا مجلّد کتابچہ، *

یا رجسٹر، زیادہ محدود یا خاص معنوں میں حساب لکھنے
 یا خطوط کا اندراج کرنے کی کتاب، جو انتظامی اداروں
 میں استعمال ہوتی ہے۔ اس لفظ کا اصل مأخذ یونانی
 لفظ δαφνᾶ بمعنی ”کھال“ ہے، اور اس لیے اس کے
 معنی لکھائی کے لیے تیار کردہ کھال بھی ہیں۔ یہ لفظ
 چرمی کاغذ یا زیادہ عمومی طور پر لکھائی کے سامان کے
 مفہوم میں قدیم یونانی زبان میں پہلے ہی سے مستعمل
 تھا، پانچویں صدی قبل مسیح میں ہیروڈوٹس
 (Herodotus، ۵ : ۵۸) بیان کرتا ہے کہ اس کے اپنے
 زمانے کے بعض غیر مہذب لوگوں کی طرح آئی اونٹونی
 (Ionians) بھی پہلے زمانے میں کھالوں پر لکھا کرتے
 تھے اور اصطلاح کھال (diphthera) کا اطلاق اس وقت
 تک بھی اوراقِ بردی (papyrus) پر کیا کرتے تھے۔ چوتھی
 [صدی میں] Ctesias (در Diodorus siculus، ۲ : ۳۲؛
 Heltedigtning og Fortaellings-: A. Christensen
 litteratur hos Iranerne i Oldtiden، کوپن ہیگن
 ۱۹۳۵ء، ص ۶۹ بعد) نے قدرے غیر اطمینان بخش طور
 پر دعویٰ کیا ہے کہ اس کی کہانیاں غالباً ایران کی
 شاہی دستاویزات پر مبنی ہیں۔ یہ لفظ قبل اسلام بلکہ
 زمانہ قبل مسیح کی یہودی - آرامی تحریروں میں
 بھی پایا جاتا ہے (Griechische: V. Gardthausen
 Paläographie، بار دوم، لائپزگ ۱۹۱۱ء، ۱ : ۹۱
 بعد: A Dictionary of the Targumim،: M. Jastrow

میں جو صورت تھی وہ اس مجموعہ قوانین سے ظاہر
 ہوتی ہے جسے ۱۸۷۰ اور ۱۸۷۷ء میں مجلّۃ الأحکام
 تعدّیہ کے نام سے شائع کیا گیا۔ اس مجموعہ قوانین
 میں دعوے کے قدیم طریقے کی بعض جزئیات میں
 ترمیم کی گئی، جس میں خاص طور پر قابلِ لحاظ امر
 یہ ہے کہ تحریر یا وصیت نامے کا بجائے خود اثبات
 دعویٰ کے سلسلے میں مؤثر ہونا تسلیم کیا گیا (دفعہ
 ۱۷۳۶)، نیز نزاع فیصلہ شدہ (res Iudicata) کا
 اصول مانا گیا (دفعہ ۱۸۳۷)۔ اور یہ کہ فریقِ مقابل
 کی غیر حاضری میں کارروائی کی صورت کیا ہونی چاہیے
 (دفعہ ۱۸۳۳ بعد)۔ ان ترمیمات کے ساتھ ساتھ عدالتی
 نظام کی بھی یورپ کے نمونہ کے مطابق تجدید ہوتی رہی،
 جس کی بنیاد قاضیوں کی مشترکہ عدالت (bench)، اور
 عدالتوں کے درجاتی نظام پر رکھی گئی اور محکمہ عدالت
 میں مراقبہ (ہاپیل) کرنے کے طریقے رائج کیے گئے۔

مآخذ: (۱) کتب فقہ میں ”باب الدعوی“؛ (۲)
 ابن عبدالرحمن: رحمة الامة في اختلاف الائمة، [مصر ۱۳۷۹ھ]
 ۱۹۶۰ء، ص ۳۱۷ تا ۳۲۸؛ (۳) مجلّۃ، دفعہ ۱۶۱۳ بعد؛
 (۴) Recueil de lois concernant les : Query
 muslimans schyites، پیرس ۱۸۷۷ء، ۲ : ۳۸۵ بعد؛
 Handbuch des islamischen : T. W. Juynboll (۵)
 Gesetzes، لاٹن، ۱۹۱۰ء، ص ۳۱۳ بعد؛ (۶) L. Milliot
 Introduction à l'étude du droit musulman
 Études de : M. Morand، بعد؛ ۶۸۲ ص ۱۹۵۳
 droit musulman algérien، الجزائر، ۱۹۱۰ء، ص ۳۱۳
 بعد؛ (۸) Histoire de l'organisation : E. Tyan
 Judiciaire en pays d'islam، ج ۱۲، Lyons ۱۹۳۳ء
 ص ۲۱ بعد، ۱۳۱ بعد، ۳۹۰ بعد، ۷۷۷ بعد؛ (۹)
 وہی مصنف : La procédure du defant en droit
 musulman، در Stud. Isl.، ۱۹۵۷ء، ص ۱۱۵ بعد؛
 (۱۰) التهانوی: کشف اصطلاحات الفنون، بذیل مادہ:
 (۱۱) البستانی: دائرة المعارف، بذیل مادہ: (۱۲) صبحی

etc. بار دوم، نیو یارک ۱۹۲۶ء ص ۳۰۴ (بعد)۔
اس لفظ کو ایک ایرانی اصل [دپ] بمعنی "لکھنا"
سے (جو دیور، دیوان میں بھی پائی جاتی ہے) اخذ کرنے
کی کوششیں معقول معلوم نہیں ہوتیں؛ لیکن دوسری
طرف عرب مصنفین کی شہادت کے پیش نظر، گمان یہ
ہے کہ [اس کی اصل کچھ ہو] یہ لفظ فارسی کے ذریعے
عربی زبان میں پہنچا۔

۱۔ زمانہ قدیم (کلاسیکی) : ابتدائی عہد اسلامی
میں دفت کی اصطلاح بظاہر کتاب یا کتابچے کی مجتمع
شکل کے لیے استعمال کی جاتی تھی، برخلاف لیٹے ہوئے
کاغذوں یا متفرق اوراق کے۔ شروع میں اس کا استعمال
کاغذ کے دستوں یا کاپیوں پر کیا جاتا تھا، خصوصاً
ان اوراق پر جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ
بعض احادیث کے جمع کرنے والے اپنے حافظے کی مدد
کے لیے اپنے پاس رکھتے تھے؛ بعد میں جب زیادہ ضخامت
کے مخطوطات وجود میں آ گئے تو ان پر بھی اس کا
اطلاق ہونے لگا (Studies in Arabic : N. Abbott)
Literary Papyri (۱۱ شکاگو، ۱۹۵۷ء : ۲۱ تا ۲۴)؛ قب
(Muh. St. : Goldziher : ۲ : ۵۰ تا ۵۲، ۱۸ تا ۱۸۱)۔
پہلی صدی ہجری کے ذائق کتب خانوں اور اسناد کے
مجموعوں کے بارے میں جو روایتیں ہیں، انہیں احتیاط سے
پرکھنے کی ضرورت ہے، قب J. Schacht کی توضیحات
گزیب کے کتاب خانے کی ساختہ روایت کے بارے میں
در AO 'On Mīsa b. 'Uqba's Kitāb al-Maghāzi،
۱۹۵۳ء، ۲۱ : ۲۹۶ تا ۲۹۷۔ عربی کے قدیم ترین اوراق
بردی (Papyrus) کے بارے میں دیکھیے A. Grohmann :
Proc. of the Royal (The Value of Arabic Papyrus)
Soc. of Hist. Studies، ۱، قاہرہ، ۱۹۵۱ء : ۳۳ (بعد)۔
سب سے پہلے دیوان دفاتر (record office) کی
تأسیس بالعموم حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منسوب
کی جاتی ہے، جنہوں نے فوجیوں کی حاضری اور
تمخواہ کا نظام قائم کیا [رگ بہ دیوان]۔ اس نظام کی

ابتدائی شکل معلوم نہیں، لیکن کچھ ہی عرصے بعد
اس کے تحت اندراجات غالباً اوراق بردی (papyrus)
پر کیے جانے لگے تھے، جو فتح مصر کے بعد خلافت کے
انتظامی محکموں میں لکھائی کے لیے عام طور پر
استعمال ہونے لگا تھا۔ اوراق بردی سے ظاہر ہوتا ہے
کہ مصر میں زمین، آبادی اور لگان کے بارے میں
یادداشتیں رکھی جاتی تھیں۔ جو دستاویزیں اب تک باقی
ہیں ان میں کاغذ کے دستوں کے ساتھ لیٹے ہوئے کاغذ
اور منتشر اوراق شامل ہیں، اگرچہ بظاہر موخر الذکر
شکل عام تھی، اور مقابلہ بعد کے زمانے تک عربی
میں کوئی کاغذ کا دستہ نظر نہیں آتا (دیکھیے
A. Grohmann : New Discoveries in Arabic Papyri :
BIE, An Arabic Tax-Account Book، ۳۲ : ۶۱۹۵۱)
۱۵۹ تا ۱۷۰)۔ معلوم ہوتا ہے کہ عام طور پر
اموی خلفا بورنظمی دفتری معمولات پر کاربند رہے۔ وہ
اپنی یادداشتوں کے لیے اوراق بردی استعمال کرتے تھے
جو کتابی شکل کے لیے موزوں نہ تھے۔ تاہم ایک اور
دفتری روایت بھی موجود تھی۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ
ساسانی حکمران اپنے نظم و نسق کے لیے درآمد کیے
ہوئے مصری اوراق کی فراہمی پر انحصار نہیں کر
سکتے تھے، چنانچہ وہ لکھنے کے لیے مختلف قسم
کی تیار کی ہوئی کھالیں بھی کام میں لاتے تھے
(قب ابن الندیم : الفہرست، ص ۲۱)۔ حسن الثمینی کے
قول کی رو سے جس نے المدائنی کی سند سے التہذیب کا
حوالہ دیا ہے (تاریخ قم، ص ۸۱) : **سابقہ شہادہ**
قباد Kobad نے حلوان میں زمین کے لکھنے کا ایک دفتر
قائم کر رکھا تھا۔ اس کی تصدیق بالمرسلہ التہذیبی
کے اس بیان سے ہوتی ہے (تاریخ، ۲ : ۲۵۸) جو
امیر معاویہ کے زمانے میں حلوان سے ساسانی شاہی
زمینوں کی فہرستیں حاصل کرنے کے بارے میں ہے
(Landlord and Peasant in Persia : A. K. S. Lambton)
لنڈن ۱۹۵۳ء، ص ۱۵، حاشیہ ۱)۔ ممکن ہے کہ

بھی سرکاری محکموں میں زیادہ تر اوراق بُردی مستعمل تھے اور مصر سے ان کی ہم زمانائی کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ ہارون الرشید کے زمانے میں بویٰ ان کا استعمال جاری رہا، یہاں تک کہ العنصرم کے بعد کے زمانے میں معمری کاریگروں کی مدد سے سامرا میں اوراق بُردی کا ایک کارخانہ قائم کرنے کی ناکام کوشش کی گئی (Beiträge zur Gesch.: W. Björkman) :
Lehte der Staatskanzlei im islamischen Ägypten
 ہیبرگ ۱۹۲۸ء ص ۷ : A. Grohmann
World of Arabic Papyri، قاہرہ ۱۹۵۲ء، ص ۳۳ بعد،
 ۴۵ بعد ۵۲ : *Corpus Papyrorum Raineri Archiducis Austriae* ج ۳، Series Arabica، طبع A. Grohmann
 وی اتا ۱۹۲۴ء، ص ۳۲ بعد، ۵۴ بعد وغیرہ)۔ تاہم بحیثیت مجموعی یہ صحیح ہے کہ عباسی خاندان کے برسر حکومت آنے کے وقت سے لے کر سرکاری دواوین میں دستاویزوں اور حساب کتاب رکھنے کے لیے کتابی شکل کے دفتر کا استعمال عام طور پر ہونے لگا تھا۔ نویں صدی سے لے کر آئندہ عام طور پر کاغذ کا رواج ہو جانے سے اس کے استعمال کو مزید تائید اور توسیع حاصل ہو گئی اور اس وقت سے دفتر کی اصطلاح زیادہ تر نظم و نسق سے متعلق رجسٹروں اور دستاویزوں کے مجموعوں کے لیے مخصوص ہوئی۔ دفاتر کے نظام کو بظاہر سب سے پہلے ایران اور عراق میں فروغ دیا گیا۔ مصر میں چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی تک اوراق بُردی کا استعمال جاری رہا، لیکن دفتر کی مشرقی شکل بظاہر کاغذ کے عام طور پر رائج ہونے سے پہلے ہی اختیار کر لی گئی تھی۔ کاغذ کے سنوں کی شکل میں اوراق بُردی کے حساب ناموں کے جو نمونے اب تک موجود ہیں (جن کی کیفیت New Discoveries ... : A. Grohmann نے بیان کیا ہے، اور وہی مصنف : BIE، New Discoveries ...، ۳۵،

نسبۂ شروع کے دور ہی میں بعض فوجی رجسٹر کم از کم سابق ایرانی صوبوں میں — کتابی شکل میں آچکے ہوں۔ البلاذری (فتوح، ص ۴۵۰، قاہرہ ۱۹۰۱ء، ص ۴۵۵) نے لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بتوعدی سے کہا: ”اگر دفتر تم پر ختم (یطبق) ہو جائے“، اور وہ اس کے مفہوم کی وضاحت یوں کرتا ہے: ”اگر تمہارے نام رجسٹر کے آخر میں لکھے جائیں“۔ ابو مسلم نے ۱۲۹ھ/ ۷۴۷ء - ۷۵۷ء [میں خراسان میں اپنے پیروؤں کی تنخواہ کا جو رجسٹر بنایا تھا، اسے خلاف معمول دیوان کے بجائے دفتر کہا گیا ہے (الطبری، ۲: ۱۹۵ تا ۱۹۶، مزید دیکھیے Das Heerwesen der Araber zur Zeit der : N. Fries Zur : W. Hoernerbach، ص ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸،

دفتری روایت کے مطابق خالد بن برمک پہلا شخص ہے جس نے السِّفَاح کے عہد حکومت میں کذاب یا رجسٹر کو مرکزی نظم و نسق میں داخل کیا۔ اس وقت تک، بقول جہشیاری ورق ۵۵ ب: (مطبوعہ قاہرہ، ص ۸۹) دواوین کو صُحُف (منتشر اوراق) میں محفوظ کیا جاتا تھا۔ خالد نے سب سے پہلے انہیں دفاتری شکل میں مرتب کیا۔ المقریزی (الخطط، ۱: ۹۱) ہمیں اضافہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ صُحُف مدرجہ (لیتے ہوئے اوراق) بڑی؟ قَبِّ الْقَلَشْدَى: صبح، ۱: ۲۲۳—ادراج میں کاغذ و ورق کی جگہ جو اب تک مستعمل تھے، دفاتر میں الجلود—جلدی کاغذ کے دفتر استعمال میں لائے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ ہارون الرشید کے عہد میں خالد کے پوتے جعفر بن یحییٰ برمکی نے کاغذ کے استعمال کی ابتدا کی۔ اس بیان میں کچھ مبالغہ بھی شامل ہے۔ ایک واقعے سے جس کا ذکر جہشیاری نے کیا ہے، (ورق ۹۷ ب: مطبوعہ قاہرہ، ص ۱۳۸) یہ ظاہر ہوتا ہے کہ المنصور کے عہد تک

(۴) الختمة : آمد خرچ کا حساب ہر ماہ چھبند (رک بان) پیش کرتا ہے ۔

(۵) الختمة الجامعة : سالانہ حساب ۔

(۶) التاريخ : جمع کا دفتَر جو ان ابواب (اقسام

مصارف) کو پیش کرتا ہے جنہیں مجموعی طور پر دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے ۔ ان کی ترتیب میں جمع کی سہولت ملحوظ رکھی جاتی ہے ، بشمولیت ، موازنہ ، جو رقوم ادا کی جائیں ، ان کی رسیدیں یہی اس دفتَر میں درج کی جاتی ہیں ۔

(۷) الغرضة : تفریق کا دفتَر ، ان ابواب کے

لیے جن میں دو رقموں کا فرق دکھانے کی ضرورت ہوتی ہے ۔ اسے آئین جدولوں (عمودوں) کی صورت میں مرتب کیا جاتا ہے ۔ اور حاصل تفریق تیسری جدول (عمود) میں ہوتا ہے ۔ یہی شکل اس عریضے کی ہوتی ہے جو اصلی اور ترمیم شدہ رقموں کے درمیان فرق ظاہر کرتا ہے ۔ بحالیکہ مؤخر الذکر بالعموم نسبتہ چھوٹا ہوتا ہے ، یعنی تخمینے اور جو رقمیں فی الواقع موصول ہونیں اس میں درج ہوتی ہیں ۔ اصلی اور استخراج کا بظاہر یہی مفہوم ہے نہ کہ آمدنی اور خرچ ، جیسا کہ جودت اور اوزون چارشلی نے فرض کیا ہے ۔ ترمیم کے مفہوم میں استخراج پر قب اسعیل حتی اوزون چارشلی : مدخل ، ص ۲۷۸ اور Hinz :

Rechnungswesen ، ص ۱۱۸ ، اصل پر قب الماوردی :

الاحکام السلطانیہ ، طبع Einger ، ص ۳۷۳ ، مطبوعہ قاہرہ ،

ص ۲۰۹ ۔ اصطلاح ، دفتَر اصل و استخراج آناطول

کے سلجوقی عہد کے ایک متن میں پائی جاتی ہے ،

O. Turan : ترکیہ سلجوقی حقانہ رسمی وثیقہ لہ ، انقرہ

۱۹۵۸ء ، متن ص ۲۶ ۔ یہ جدا جدا پہلے اور دوسرے

عمودوں میں درج کیے جاتے ہیں ، بحالیکہ ان کے

درمیان جو فرق ہے اسے تیسرے عمود میں دکھایا جاتا

ہے ۔ آخری میزائیں تینوں عمودوں میں سے ہر ایک کے

نیچے دکھائی جاتی ہیں ۔

۱۹۵۲ - ۱۹۵۳ : ۱۵۹ تا ۱۶۹) وہ دفتَر کی کیفیت کے بارے میں ان بیانات سے خاصی قریبی مطابقت رکھتے ہیں جو مشرقی مآخذ کی تحریروں میں ملتے ہیں ، (دیکھئے نیچے) ۔ مصر سے دفتَر کا رواج مغربی اسلامی دنیا تک پہنچ گیا ۔ ۵۳۳ھ / ۱۱۳۸ء میں المقدسی (ص ۲۳۹) کو یہ چیز قابل ذکر معلوم ہوئی کہ اندلس کے باشندوں کے پاس جو حساب نامے اور اس طرح قرآن مجید کے جو نسخے موجود تھے وہ چرمی کاغذوں پر لکھے ہوئے تھے (لکھائی کے سامان کے بارے میں مزید دیکھئے جلد ، کاغذ ، قلماس ، رقی ، ورق) ۔

دفتَر کی اقسام :

حکومت کی اداری تنظیمات میں وسعت پیدا ہو جانے کے ساتھ دفتَر کی نگہداشت ایک ایسا کام ہو گیا جس کے لیے مخصوص صلاحیت اور علمیت کی ضرورت تھی اور اس طرح بہت سے مختلف قسم کے دفتَر وجود میں آ گئے ۔ ملکی نظام و نسق سے متعلق کسی اسلامی ادارے کی دستاویزات اور دفتَر کے بارے میں سب سے پہلا مرتب بیان جو ہمارے علم میں ہے ، وہ محمد بن احمد الخوارزمی کا چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی کے آخر کا ہے ۔ اس میں اس نے مندرجہ ذیل دفتَر شمار کیے ہیں :

(۱) قانون الخراج : بنیادی جائزہ ، جس کے

مطابق خراج وصول کیا جاتا ہے ۔

(۲) الاوارج : آوارہ کا معرب ، جس کا مفہوم

ہے ”منتقل کیا ہوا“ : ان قرضوں کو ظاہر کرتا ہے

جو قانون کی رو سے افراد کے ذمے ہوں اور نیز ان افسانہ

کو جو ان کے بیاق ہونے تک ادا کی گئیں ۔ (اوارج پر

دیکھئے تذکرۃ الملوک ، طبع V. Minorsky ، لندن

۱۹۸۳ء ، ص ۱۸۸ ، جس کی ترمیم Recl. : W. Hinz

، ص ۱۲۰ ، بعد کی روشنی میں کرنی چاہیے) ۔

(۳) الروزنامج : روزنامہ ، جو رقوم ادا کی

گئیں اور جو وصول ہوئیں ان کا روزانہ اندراج ۔

(۱۴) المؤامرة: ان احکام کی فہرست جو "طبع" کے نفاذ کے دوران میں جاری کیے جاتے ہیں، جس کے آخر میں اجازت کے طور پر سلطان کے دستخط ہوتے ہیں۔ اس قسم کا مؤامراہ ہر ایک دیوان تیار کرتا ہے۔ (۱۵) الاشتراک: اس سامان کی فہرست جو اجراء اور ادائی کے بعد باقی رہ جاتا ہے۔

(۱۶) المواصفة: ایک فہرست (عمل) جو رد و بدل (تبادلوں، موقوفیوں، اموات اور ترقیوں) کے احوال و اسباب کی وضاحت کرتی ہے۔

(۱۷) الجريدة المسجلة: سربمہر دفتر، سچل (سہر) وہ خط ہے جو کسی ایلچی یا قاصد کو اس بات کا مجاز کرنے کے لیے دیا جاتا ہے کہ وہ منزل مقصود پر پہنچ کر کسی بھی عامل سے اپنے سفر کے مصارف وصول کرے۔ کسی قاضی کا مرتب کردہ عدالتی فیصلہ (محضر) بھی سچل کہلاتا ہے۔

(۱۸) الفہرست: دیوان کی فہرستوں اور رجسٹروں کے بارے میں معلومات کا مخزن۔

(۱۹) الدستور: "جماعة" کی نقل جو سودے سے تیار کی جاتی ہے۔

آخر میں الخوارزمی تین دفاتر کے نام بتاتا ہے: جنہیں عراق کے کاتب استعمال کرتے تھے، وہ (طبع مذکور کے مطابق) دوج ذیل ہیں: (۱) الانجیج: (۲) الاوشنج: (۳) الدروزن۔

ان میں سے نمبر ۳ کی وضاحت پیمائش زمین کے جائزے (مساحة) کے دفتر کے طور پر کی گئی ہے۔ (الخوارزمی: مفاتیح العلوم، طبع Van Vloten، ص ۵۸ تا ۵۹، دیکھیے Renaissance: Mez، ص ۱۰۳، انگریزی ترجمہ ص ۱۰۹: تاہم اس ترجمے میں Mez کا مطلب کچھ زیادہ واضح نہیں کیا گیا۔ ترکی کے سرکاری محکموں کے تجربے کی روشنی میں ایم۔ جودت نے الخوارزمی کے متن کا ایک مختصر ترجمہ (دفتر، ص ۸۸ تا ۹۱) ترکی زبان میں کیا تھا۔ اسمعیل حق

(۸) البراعة [رک باں]: لگان ادا کرنے والوں کو جہیز [رک باں] یا خازن کی طرف سے دی ہوئی رسید (بہ واضح نہیں کہ الخوارزمی کی مراد نقلوں اور رسیدوں کے دفتر سے ہے یا وہ براعة کا ذکر محض ایک دستاویز کے طور پر کر رہا ہے)۔

(۹) الموافقة والجماعة: جامع حساب و کتاب (حساب جامع) جسے کوئی عامل اپنے عہدے سے سبکدوش ہونے پر پیش کرتا ہے۔ اگر اس کی تصدیق اس افسر کی جانب سے ہو جاتی ہے جس کے سامنے وہ اسے پیش کرتا ہے تو اسے موافقہ کہا جاتا ہے، اگر ان میں اختلاف ہو تو یہ محاسبہ کہلاتا ہے۔

فوج کے محکمے (دیوان الجیش) کا ذکر کرتے ہوئے الخوارزمی یہ فہرست دیتا ہے:

(۱۰) الجريدة السوداء: جو ہر ایک کمان کے لیے ہر سال مرتب کیا جاتا ہے۔ اس میں سپاہیوں کے نام مع ان کے حسب نسب، (اصل و نسل)، حلیہ، راشن، تنخواہ وغیرہ لکھے جاتے ہیں۔ یہ اس دیوان کا بنیادی مرکزی رجسٹر ہوتا ہے۔

(۱۱) رجة: ایک حکم نامہ (حساب)، جسے بخشی (معطی) دور کے علاقوں میں متعینہ افواج کے لیے تنخواہ کے اجرا (طبع) کے بارے میں بحوالہ دیوان صادر کرتا ہے۔

(۱۲) الرجة الجامعة: مجموعی حکم نامہ جسے فوج کی تنخواہ، راشن وغیرہ کے ہر ایک عام اجرا (طبع) کے لیے دیوان الجیش کے سربراہ نے صادر کیا ہو۔ (۱۳) الصک: ایک فہرست (عمل، قب Dozy: Suppl.، ۲: ۱۷۵) جو تنخواہ کے اجرا کے لیے درکار

ہوتی ہے، اس میں ان لوگوں کے نام مع اعداد و رسوم درج ہوتے ہیں جنہیں کوئی رقم دی گئی ہو۔ ادائی کی سند کے لیے اس پر سلطان کے دستخط ثبت ہوتے ہیں۔ خچر والوں اور سائبانوں سے کرایہ پر کام لینے کے لیے بھی اس فہرست کی ضرورت ہوتی ہے۔

بظاہر متروک ہو گئی تھی اور اس کی جگہ دوسری اصطلاحات نے لے لی تھی۔ مصل میں اصطلاح مکلفہ زمین کے جائزے سے متعلق دفاتر کے لیے استعمال کی جاتی تھی، جنہیں ایک 'ماسح' [پٹواری] تیار کرتا تھا اور جن کی ترتیب دیہات کے مطابق ہوتی تھی (Grohmann: *New Discoveries*، ص ۶۳)۔ الحقریزی: الخطط: ۱: ۸۲ کے مطابق مصر میں ہر تیس سال بعد نیا جائزہ لیا جاتا تھا۔ (اوراق بردی پر لکھے ہوئے لکائن کے مصری دفاتر کے نمونوں کے لیے دیکھیے A. Dietrich: *Arabische Papyri*، لاہرگ ۱۹۳۷ء، ص ۸۱ بعد،) (نیز دیکھیے دفتر خاقانی، مساحہ، روک، تحریر اور تہو)۔ روزنامہ یا روزنامچہ کا ذکر ایک حکایت میں آتا ہے، جو یحییٰ بن خالد البرکی کے زمانے سے منسوب ہے۔ اصطلاحات اور تسمیات کے لیے عربی کا انحصار فارسی پر ہونے کے بارے میں ایک ایرانی ایک عرب پر یوں طنز کرتا ہے "تمہارے کھانا پکاتے، پینے پلاتے، یہاں تک کہ تمہارے دواوین سے متعلق الفاظ کا انحصار بھی فارسی پر ہے۔" آخر الذکر سے متعلق الفاظ کی مثال میں وہ روزنامچہ کا حوالہ دیتا ہے (محمد بن یحییٰ الصولی: *آداب الکتاب*، قاہرہ ۱۳۴۱ھ، ص ۱۹۳۔ مسکوئڈ کی ایک عبارت اس چیز پر روشنی پڑتی ہے کہ چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی کے اوائل میں بغداد میں روزنامچہ کو خزانے میں کیونکر رکھا جاتا تھا۔ وہ بتاتا ہے کہ ۳۱۵ھ/۹۲۷ء میں وزیر علی بن عیسیٰ نے ابراہم بن ایوب (خزانے کا ایک عیسائی مہتمم جسے آئندہ سال میں دیوان الجہیزہ کا افسر اعلیٰ مقرر کر دیا گیا۔ عریب: *صلتہ تاریخ الطبری*، ص ۱۳۵۔ نیز اس کے بارے میں دیکھیے الصولی: *اخبار الرازی*، ص ۱۹۹: *ہلال الصابی*: *تحفته الامراء فی تاریخ الوزراء*، ص ۱۳۶، ۲۷۹، ۲۹۶) کو یہ خدمت تفویض کی تاکہ وہ اسے مالی معاملات سے الگ کرتا رہے، خازن (صاحب بیت المال) کہ

اوزون چارسیلی کا سرتب کردہ ایک اور قدرے زیادہ روان ترکی اختصار بھی ہے، یعنی عثمانی دولتی تشکیلاتہ مدخل، استانبول ۱۹۴۱ء، ص ۷۹ تا ۸۰۔ مؤخر الذکر کا ترجمہ جرمن زبان میں B. Spuler نے کیا ہے، یہ عنوان: *Iran in früh-islamischer Zeit*، Wiesbaden ۱۹۵۲ء، ص ۳۳۸، حاشیہ ۱۔

اغلب یہ ہے کہ الخوارزمی کے بیان کا دراصل عباسی دواوین سے اس قدر تعلق نہیں جتنا سامانی دواوین سے ہے، تاہم تقریباً یقینی طور پر اس کا اطلاق بہت حد تک عباسی نظم و نسق پر بھی کیا جا سکتا ہے، اور اس کے بیشتر بیانات کی تصدیق ایران اور عراق کے مؤرخین کے ضمنی حوالوں سے ہو جاتی ہے۔

الخوارزمی کے دفاتر دو بڑے مجموعوں میں منقسم ہیں: مالی اور فوجی، جن پر اب جدا جدا غور کیا جا سکتا ہے۔

مالی دفاتر: دیوان خراج کا سب سے اہم دفتر القاتون ہے، جو زمین اور لکائن کے قابل فصلوں کے جائزے پر مشتمل ہوتا ہے (الموردی: *الآحکام السلطانیة*، طبع Enger، ص ۳۷۰، طبع قاہرہ، ص ۲۷۷ میں اصطلاح قانون کا مفہوم یہی معلوم ہوتا ہے)۔ یہ دفتر لکائن عائد کرنے اور وصول کرنے کے کام میں ایک بنیادی حیثیت رکھتا تھا، اور اس طرح اس دیوان کی سرگرمیوں کے لیے اہم ترین ذریعہ تھا۔ اصطلاح قانون، جسے پہلے ہی الخوارزمی یونانی سے مغرب (یونانیہ مغرب) تسلیم کر چکا ہے، زیادہ تر عراق اور مشرق میں مستعمل تھی، اور سرہویں اور چودھویں صدی تک بھی اس کا استعمال جاری رہا تھا جبکہ اس سے مراد ایک قسم کا ارضی و مالی جائزہ تھا (M. Minoi: *Nasir al-Din Tusi*، V. Minoi: *BSOAS on Finance*، ج ۱۰، ۱۹۴۷ء، ص ۷۶)۔ ۷۷۳ء/۷۸۱ء: *CR chancery*، *Wintz*، ص ۱۳۳ بعد۔

سابق روزنامہ اور ختمہ کی تیاری کو جہیز کے فرائض منصبی میں شامل کرتا ہے (دیکھیے کتاب قوانین التواوین، طبع A.S. Atiya، قاہرہ ۱۹۳۳ء، ص ۳۰۰)۔ مصر میں روزنامہ کی مثالوں کے لیے دیکھیے: Grohmann: New Discoveries: ان سے حساب کتاب کا جو طریق کار مترشح ہوتا ہے، اس کے لیے دیکھیے: C. Leyerer: 'Die Verrechnung und Verwaltung' نیز دیکھیے حساب اور معاسبہ۔

عباسی دواوین میں جو دفاتر مستعمل تھے، ان کے بارے میں متعدد حوالے مسکویہ، حلال الصیاق اور دیگر تصنیف کی تحریروں میں مابین کے جو خاص طور پر ملکی نظم و نسق سے متعلق معاملات میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ سلطنت کے حسابات کے پیمانے اور پیش کرنے کے طریقے سے متعلق کچھ اندازہ شاہی بداخل و مخارج کے ان چند منفرد اوراق میزان سے ہو سکتا ہے جنہیں مورخین نے محفوظ کر رکھا ہے۔ ان میں سے قدیم ترین جو ہازون الرشید کے زمانے کا ہے، جمہ شیری (ورق ۱۷۹ الف، ۱۸۲ ب، مطبوعہ ص ۲۸۱) نے، اور ایک مختلف بیان کی صورت میں ابن خلدون (مقدمہ، ۱: ۳۲۱ تا ۳۲۳ - Rosenthal، ۱: ۳۶۱ تا ۳۶۵) نے محفوظ رکھا ہے۔ (نیز دیکھیے: R. Levy: 'The Social Structure of Islam'، کتبچہ ۱۹۵۷ء، ص ۳۱۷ تا ۳۲۰، [۵۹۱۸/۵۳۰۶] کا ایک میزانہ حلال (الوزراء، ص ۲۱۱) نے دیا ہے اور اس کا تجزیہ، مع دیگر ماخذ کے A. von Kremer نے 'Über das Einnahmebudget des Abbasiden-Reiches, Denkschrift d. Phil. hist. Kl. d. Wiener Ak.' ج ۳۶، ۱۸۸۸ء، ص ۲۸۳ تا ۳۶۲ میں کیا ہے۔ دوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی میں فرہاروا کی شخصیت آمدنی (بیت المال الخاص) کی تفصیل مسکویہ نے دی ہے (Mez، ص ۱۱۵ تا ۱۱۶، نیز دیکھیے بیت المال)۔ فوجی دفاتر: فوجی سپاہیوں کی حاضری کے کاغذات

وزانہ مصارف کے بارے میں ہدایات دے اور اسے ہر ہفتے روزنامہات پیش کرنے کا مکلف بنائے، تاکہ اسے جلد ہی معلوم ہو جائے کہ کیا ادا کیا گیا، کتنا وصول ہوا اور بقایا کیا تھا (ماحل و ما قبض و ما بقی) اکذا فی الاصل، لیکن بظاہر ماحل و ما قبض و ما بقی، زیادہ صحیح ہوگا۔ اس سے پہلے حساب تیار کرنے کا دستور العمل یہ رہا تھا کہ ایک ماہانہ گوشوارہ دیوان کے سامنے آئندہ مہینے کے وسط میں پیش کیا جاتا تھا تجارب الامم، طبع Amedroz، ۱: ۱۵۱ تا ۱۵۲)۔

اسی تصنیف کے دو اور بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ خزانے کے جس افسر کا کام ختمہ تیار کرنا تھا، وہ جہیز کہلاتا تھا (کتاب مذکور، ص ۱۵۵ و ۱۶۴ - D. S. Margoliouth نے مسکویہ کا جو انگریزی ترجمہ کیا ہے، اس میں وہ ان عبارتوں کا اصطلاحی مفہوم واضح کرنے سے قاصر رہا ہے)۔ المقتدر کے عہد کی دو دستاویزوں سے، جن کا حوالہ تاریخ قم میں دیا گیا ہے، یہ واضح ہوتا ہے کہ قم اور فارس میں روزنامہ سے کیا کام لیا جاتا تھا۔ یہاں روزنامہ محرر (کاتب) جہیز سے انگ ہے اور وہ ایک سرکاری عہدیدار ہے۔ اس کا کام خراج کے سلسلے میں موصولہ رقوم کا اندراج اور ان کی رسیدیں دینا ہے، جو براءة [رک بان] کہلاتی ہیں، اور جہیز کی کارگزاریوں کا ایک طرح سے معاسبہ کرتا ہے (تاریخ قم، ص ۱۳۹ بعد: دیکھیے Ann. 'An Account of the tarikh-i-Qum: K. S. Lambton: BSOAS ج ۱۲، ۱۹۳۸ء، ص ۵۹۵: 'Quelques problèmes économiques et fiscaux de l'Iraq AIEO (Buyide... ج ۱، ۱۹۵۲ء، ص ۳۵۵: روزنامہ بر مزید دیکھیے Islamic Taxation: F. Lokkegaard in the Classic Period' کوپن ہیگن، ۱۹۵۰ء، ص ۱۳۹، ۱۵۹)۔ سر کے ابولی عہد میں ابن العناتی بدستور

ص ۱۳۷ تا ۱۴۱، فرانسیسی ترجمہ از H. Massé، در
BIBAO ج ۱۹۱۸/۱۱، ص ۱۰۸ تا ۱۰۹، دیکھیے
الفلستندی: صبح الاعشی: ۱: ۱۳۳ تا ۱۳۵، جس
میں یہ دفاتر قدرے مختلف ترتیب سے درج ہیں اور
Beiträge: Björkman، ص ۲۸ تا ۲۵ کی بارہویں
فصل میں وہ ان دفاتر اور یادداشت کے کاغذات
(تذکرہ: Massé نے اس کا ترجمہ "Bulletin" کیا ہے)
کی جانب توجہ مبذول کرتا ہے جن کا رکھنا اس دیوان
میں ضروری ہے نیز ان کے نگران کی صفات کا بھی ذکر
کرتا ہے۔ اس کے بیان کے مطابق ان کی دیکھ بھال
دیوان کے اہم ترین کاموں میں سے ہے۔ محافظ دفتر کے
لیے لازمی ہے کہ وہ قابل اعتماد، جفاکش، محتبی اور کام
سے دلچسپی رکھنے والا ہو اور اسے مندرجہ ذیل تذکرے
اور دفاتر اس کی تحویل میں ہونے چاہیے:

۱۔ ان اہم معاملات (مسائل الامور) کی یادداشتیں
(تذاکیر) جو خط و کتابت میں زیر بحث آچکے ہیں
اور جن کا حوالہ دینے کی آئندہ ضرورت پڑ سکتی
ہے۔ یہ یادداشتیں (تذاکیر) حوالہ کے کاغذات کے
دستوں (اضایر، Massé اس کا ترجمہ "dossier" کرتا
ہے) کے مقابلے میں سہل الوصول ہوتے ہیں، لہذا
جو بھی خطوط وصول ہوں ان سب کو جواب دیے
جانے کے بعد مستحل (Registrar) کے پاس بھیج دینا
ضروری ہے، جو ان پر غور کرے گا اور جو کچھ
اس کی اپنی یادداشت کے لیے ضروری ہوگا، اسے درج کر
لے گا اور اگر اس کا کوئی جواب بھیجا گیا ہو تو ساتھ ہی
اس کو بھی درج کرے گا۔ وہ ہر ایک معاملے (مسئلہ) کے
لیے کچھ اوراق، ایک موزوں عنوان کے ساتھ، مخصوص
کر دے گا۔ پھر وہ آنے والے خطوط کو درج کرے گا،
یہ لکھے گا کہ وہ کہاں سے آئے، کس تاریخ کو
پہنچے، ان کے مضامین کیا ہیں، نیز یہ کہ ان کا کیا
جواب دیا گیا اور بصورت دیگر اگر کوئی جواب نہیں
بھیجا گیا، تو یہ بات بھی لکھ لی جائے گی۔ وہ یہ

اسلامی سلطنت کے آغاز سے ہی وجود میں آگئے، تھے
تاہم یہ قبائلی دفتر فوج کی ان باقاعدہ فہرستوں سے بالکل
مختلف نوعیت کے تھے جن کی کیفیت الخوارزمی نے
بیان کی ہے۔ ممکن ہے کہ ابو مسلم پہلا شخص
ہو جس نے سپاہیوں کا دفتر مرتب کیا لیکن یہ
دستور العمل عباسیوں کے عہد میں یقیناً عام ہو گیا
تھا۔ الخوارزمی کے حواشی کے علاوہ دیوان الجيش
سے متعلق فوجی فہرستوں کے بارے میں ایک
زیادہ مفصل بیان قدامہ کی کتاب البخراج اور
فن حرب پر بعد کے ایک گمنام رسالے میں موجود
ہے (ترجمہ: ویٹفلٹ، در Das Heerwesen der
Muhammedaner، گوتنجن Gottingen، ۱۸۸۰ء)
ص ۱ تا ۷۔ ان دونوں کا، علاوہ دیگر شہادتوں
کے، تنقیدی مطالعہ W. Hoenerbach نے کیا ہے:
Zur Heeresverwaltung، ص ۲۶۹ بعد، نیز دیکھیے
عطاء۔ اسی قسم کی فہرستیں مصر میں فاطمی خلفاء
کے دیوان الجيش اور دیوان الرواتب (فوج کا دیوان
اور تنخواہ کا دیوان) میں رکھی جاتی تھیں (الفلستندی:
صبح الاعشی، ۳: ۴۹۲ تا ۴۹۳، ویٹفلٹ:
Die Geographie und Verwaltung von Aegypten
گوتنجن ۱۸۷۹ء، ص ۱۹۰ تا ۱۹۱)۔ فوجی فہرستوں
کے لیے عام اصطلاح جریدہ تھی۔

سفراتی دفتر: الخوارزمی کا بیان مالیات واعداد و
شمار سے متعلق دفاتر، مال گزاری اور تنخواہ کے دواوین،
حساب کتاب، اشیاء کی گنتی، اور اس قسم کی دوسری
چیزوں تک محدود ہے۔ ان کے علاوہ مکتوبات کے
مجموعے اور دیگر سفراتی دفاتر بھی ہوتے تھے جو
دواوین رسائل میں مستعمل تھے۔ فاطمی دیوان الرسائل
میں اس قسم کے جو کاغذات رکھے جاتے تھے ان کی
کیفیت مصری کاتب ابن الصیرفی (۴۶۳/۸۷۳ء تا
۵۵۲/۱۱۳۷ء) نے بیان کی ہے۔ اپنی تصنیف
قانون دیوان الرسائل (طبع علی بھجت، قاہرہ ۱۹۰۵ء،

وغیرہ کی فہرست۔ یہ سادہ پناہ تیار ہونی چاہیے، سال
بسال یکجا کی جانی چاہیے، اور ہر نئے سال پر از سر نو
شروع ہونی چاہیے۔

آخر میں ابن الصیرفی ان خطوط کے عربی تراجم
کی ضرورت کا ذکر کرتا ہے جو غیر ملکی رسم الخط
جیسے کہ ارمی، یونانی یا افرنجی (Frankish) میں
موصول ہوں۔

القائندی کے بیان کے مطابق مسیح الاعشی، ۱۰۲۹ء
دیکھیے (Beiträge: Björckman، ص ۹۳) یہ فاطمی

دفاتر بالعموم آٹھویں صدی ہجری / چودھویں صدی
عیسوی کے اختتام تک قاہرہ کے دیوان الرسائل میں
بدستور سابق مستعمل تھے۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ
دیوان الرسائل سے متعلق دفاتر اور دستاویزات کے اس
نظام کی ابتدا خلافت کے مشرق سالک میں ہوئی اور
وہاں یہ کسی نہ کسی شکل میں قرون وسطیٰ کے
دوران میں باقی رہا۔ اس کی بعد کی نشوونما کو ترکی
مہمہ دفتری، احکام دفتری، توجیہات دفتری،
تشریفاتچی قلمہ دفتری کی شکل میں دیکھا جاسکتا ہے۔

۱۱۔ ترکی و منگول عہد: وسط ایشیا کے وسیع
میدانوں کی رہنے والی ترک و منگول اقوام کے دور اقتدار
میں حکومت اور نظم و نسق کے بیشتر دیگر شعبوں کی
طرح دفتری دستور عمل میں بھی نمایاں تبدیلیاں پیدا
ہوئیں۔ ممکن ہے کہ ان میں سے بعض تبدیلیاں چینی
اثرات کا نتیجہ ہوں، جو اویغور، قراخانی اور سب سے
بڑھ کر منگولوں کی ایشیائی سلطنت کے ذریعے پہلے۔

یہ بات تردید قیاس ہے کہ دفاتر کا نظام ایک حد تک
مشرق ایشیا کی مثالوں سے متاثر ہوا ہو (مثال کے طور پر
دیکھیے الجونی، ۱: ۲۴ تا ۲۵، Boyle، ۱: ۳۳ تا
۳۴ اور رشید الدین: جامع التواریخ، طبع Dhaclet، ص
۳۹ تا ۴۰، ۵۶ تا ۵۷؛ پیکن Pekin کے دفاتر کے
بارے میں دیکھیے کتاب مذکور، ص ۸۳)، لیکن اس

پورے مسئلے کے متعلق مزید تحقیقات کی ضرورت ہے۔

اندراجات سال کے خاتمے تک جاری رکھے گا اور اس کے
بعد ایک نیا تذکرہ شروع کر دے گا۔

۲۔ نام تجویز جانے والے خطوط میں متضمن
اہم احکام (اوامر) کی یادداشت رقم کی جاتی ہے جس میں
ان خطوط کے موصولہ جوابوں کے منامین اور ان کے
موصول ہونے کی تاریخیں بھی درج ہوتی ہیں۔ یہ اس
کے تیقن کے لیے کیا جاتا ہے کہ احکام کی جانب سے
یہ توجہی نہیں برتی جاتی اور انہیں بغیر جواب دیے
نہیں جھوڑا جاتا۔

۳۔ ایک دفتر جو مشرق قسم کے خطوط اور
اسناد میں مختلف سرکاری افسروں اور منصب داروں،
نیز غیر ملکی حکمرانوں اور باہر کے دیگر خط و کتابت
کرنے والوں کے القاب و آداب (دعاء) وغیرہ کی صحیح
شکلیں پیش کرتا ہے۔ ہر ایک منصب یا عہدے
(خدمت) کے لیے ایک جدا ورق (انورقہ المفردہ) ہونا
چاہیے جس پر اس شخص کا نام، اس کا لقب اور اس کے
لئے مخصوص دعا لکھی ہوئی ہے۔ تبدیلیوں اور
تبادلوں کے اندراج کی جانب خاص توجہ ضروری ہے۔

۴۔ اہم وافعات (الحوادث العظيمة) کا دفتر۔
۵۔ رسمی لباس (تشریفات) اور اعزازی خلعتوں
کی خصوصیات کی وضاحت، جو بوقت ضرورت ان کی
تیاری میں کام آسکے۔ اس ضمن میں یہ بتانا چاہیے
کہ ان کی تیاری کے لیے کیا رقم دی گئی، اور سلائی
کی تفصیلات اور قیمتوں کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔

۶۔ سال، مہینے اور دن کے مطابق، موصول
ہونے والے خطوط کی فہرست، جس سے یہ واضح ہو
جاتا ہے کہ خط کہاں سے آئے، کس تاریخ کو
ملے، اور ساتھ ان کا خلاصہ، یا ضرورت ہو تو متن کی
نقل بھی اس میں درج ہوتی ہے۔

۷۔ ایسی ہی ایک فہرست باہر بھیجے جانے والے
خطوط کے لیے۔

۸۔ اسناد، اعزازی مناصب، پروانہای راہداری

وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس عہدے میں فوجی دفاتر (جری دفتری، Recueil ۳ : ۱۰۹)۔ سنجم نے دیوان العرض سے متعلق جو تقریریں ان کے لیے دیکھیے کتاب غبۃ الکتب، طبع محمد قزوینی و عباس اقبال، تہران ۱۳۲۹ھ ص ۳۹ تا ۶۲ تا ۷۳) کی نگرانی شامل تھی۔ اس تصنیف کی ایک اور عبارت (Recueil ۳ : ۲۱۰) میں چوبیس دفاتروں کا ذکر ہے، بارہ زمین اور مالگزاری سے متعلق دیوان وزارت میں اور بارہ سپاہیوں کی فہرستوں، تنخواہ اور جاگیروں سے متعلق دیوان عارض میں تھے۔ یازیبی اوغلو نے ایک نظم نقل کی ہے (ص ۲۵۴ تا ۲۵۵)، جس میں یہی اعداد دہرائے گئے ہیں، لیکن چونکہ اس نظم میں انہیں اوغوز روایت میں بار بار آنے والے عدد بارہ سے منسلک کر دیا گیا ہے اس لیے ان کا مستند ہونا مشتبہ ہو جاتا ہے۔ یہی نظم زمینوں کے اندراج کے بارے میں مکمل معلومات مہیا کرنے کا بھی دعویٰ رکھتی ہے (جوہد، ص ۹۱ تا ۹۳)۔

ایلخانی عہد سے پہلی مرتبہ ہمیں ملنے لگی سرکاری حساب و کتاب پر مفصل رسائل ملتے ہیں۔ دو اہم تصنیفیں، فلک علای التبریزی کا سعادت نامہ (مؤلفہ ۵۷۰ھ/۱۱۷۴ء)، اور عبداللہ بن محمد بن کیا المازندرانی کا رسالہ فلکیہ (تقریباً ۵۷۷ھ/۱۱۸۵ء - ۱۳۶۵ء) ان کا تجزیہ کیا ہے (مقتلر دورندہ الدلوتون اقتصادی وضعی THITM ج ۱، ۱۹۳۱ء، ص ۱ تا ۳۲)۔ ایک مختصر قیموری رسالہ جو تقریباً ۸۸۳ھ/۱۴۸۱ء میں ہرات میں لکھا گیا تھا عدنان آری نے دریافت کیا تھا (Ein orientalisches Handelsunternehmen : W. Hinz) ۱۵۱۹ء تا ۱۵۲۳ء اور ایک مکمل میزانہ (جاسع الحساب) مؤرخہ ۵۳۸ھ/۱۱۴۲ء - ۵۳۸ھ/۱۱۴۲ء ذی ولیدی طوغان کی دریافت ہے۔ پہلے دو کا تفصیلی مطالعہ W. Hinz :

عظیم سلجوق حکمرانوں کے عہد میں تنظیم کو کی کچھ شہادت ملتی ہے، لیکن اس کے باوجود ان کی سلطنت کے، نیز سلجوق اناطولی اور ایوبی مصر کے دفاتروں اور کتاب داروں نے بظاہر سابقہ دور کے بہت سے طور طریقوں کو برقرار رکھا۔ جو کچھ بھی جدت نظر آتی ہے وہ بظاہر طریق کار سے متعلق باتوں، بالخصوص اعداد و شمار کی معلومات کے جمع کرنے اور پیش کرنے میں ہے۔ ترکی سلطنت کے دفتری دستور عمل کا کسی قدر اندازہ ابن بی بی : الاوامر السلطانیۃ، عکسی طبع انقرہ ۱۹۵۶ء، طبع N. Lugal و A. S. Erzi، جزو ۱، انقرہ ۱۹۳۷ء؛ اختصار Recueil : Houtsma ج ۲، جرمن ترجمہ H.W. Duda، کوپن ہیگن ۱۹۵۹ء؛ ترکی ترجمہ از یازیبی اوغلو، Recueil : Houtsma ج ۳ سے کیا جاسکتا ہے۔ دفاتر دیوان اعلیٰ میں رکھے جاتے تھے۔ جن میں زمین اور لگان سے متعلق امور درج ہوتے تھے۔ جب نئے علاقے فتح ہوتے تھے یا دوبارہ حاصل کیے جاتے تھے، تو نئی پیمائش عمل میں آتی تھی (ابن بی بی، ص ۱۳۶؛ انطالیہ، ص ۱۵۳ تا ۱۵۴؛ Sinop، ص ۲۲۸، اخلاط)۔ یازیبی اوغلو کا ایک اضافے (Recueil ۳ : ۵۵۰؛ ابن بی بی میں موجود نہیں) سے یہ منکشف ہوتا ہے کہ عزالدین کیاؤس کے دور حکومت میں صاحب دیوان کا عہدہ اور مالی دفاتر (اسوال دفاتر) کی نگہداشت خواجہ بدرالدین الخراسانی کے سپرد کی گئی، جو بلاد روم من خطاطی، بلاغت، انشاء، سیاحت اور حساب رک بان میں یکتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی خواجہ فجرالدین علی التبریزی کو انشاء اور مکتوبات کی خدمت تفویض کی گئی اور دیوان وزارت کے بارہ دفاتر میں سے ہر ایک کسی ماہر فن (استاد) کی تحویل میں دے دیا گیا۔ ایک اور موقع پر امیر عارض کا عہدہ شمس الدین کو عطا ہوا، یہ بھی انشاء اور سیاحت میں ماہر تھا (ابن بی بی، ص ۱۲۷)۔ یازیبی اوغلو اس کی مزید

عثمانی دفتار دوسری حکم از مبحث آچکے ہیں (دیکھیے) باش و کالت آرشیوی، دفتر خاندانی، سیاسی، مذہبی، دفتری، سبکی وغیرہ)، لہذا ان کے متعلق یہاں کسی بیان کی ضرورت نہیں، یورپ، ایشیا اور افریقہ کے سابق عثمانی علاقوں سے بھی متعدد دفاتر دستیاب ہوئے ہیں۔ ان کی مادی شکل کے بارے میں دیکھیے L. Fekete : Die Siyaqat-Schrift (۱۹۰۱ء)۔

مآخذ : (۱) عام بحث کے لیے دیکھیے - جودت کا مقالہ مطبوعہ، در معلم اوم - جودت حیات انٹرنی و کتب خانہ سی از عثمان آرکائیو، استنبول ۱۹۳۷ء، ضمیمہ ص ۶۶ تا ۶۹ جو بدستوری سے نامکمل ہے : (۲) مالی دفاتر کے لیے دیکھیے Studien zum Rechnungswesen der : C. Leyrer 'Arabischen Steuerämter' ج ۱۲، ۱۹۵۱ء، ص ۸۵ تا ۱۱۲ : (۳) دہی معتب : Die Verrechnung und Verwaltung von Steuern im islamischen Ägypten : N. F. ZDMG ص ۲۸، ۱۹۵۳ء، ص ۳۰ تا ۶۹ : (۴) Das Rechnungswesen orientalischer : W. Hinz Reichsfinanz-ämter im Mittelalter, Isl. ج ۲۹، ۱۹۵۰ء، ص ۱ تا ۱۲۹ : (۵) فوجی دفاتر کے لیے دیکھیے Zur Heeresverwaltung : W. Hoernerbach der Abbasiden رسالہ مذکور، ص ۲۵۷ تا ۲۹۰ : (۶) عثمانی مالی دفاتر کے لیے دیکھیے L. Fekete : Siyaqat Schrift in der türkischen Finanzverwaltung ج ۱، بولڈہسٹ ۱۹۵۵ء، ص ۶۷ تا ۱۱۰ : (۷) قاضی کے دفاتر کے لیے دیکھیے خالد اون گان : انقرہ نگ ۱ نومبر ۱۹۵۸ء : J. Kabrda : Les anciens registres turcs des Cadis de Sofia et de Vldin ج ۱۹، ۱۹۵۱ء، ص ۳۲۹ تا ۳۶۲ : (۸) صفوی ایران کے لیے دیکھیے V. Minoraky : تذکرہ الملوک، لندن ۱۹۴۳ء : (۹) وسطی ایشیا پر دیکھیے M. Yuldashev : The State Archives of XIX century feudal Khiva : Papers by the Soviet Delegation at the xxiii. در

نے کہا ہے (Das Rechnungswesen) اور ان میں سے دوسرے کی ایک تنقیدی طبع بھی اس کی کاوش کا نتیجہ ہے (Wiesbaden : Die Resala-ye Falakiyya - ۱۹۵۰ء)۔ ان تصانیف سے حساب و کتاب رکھنے کے ایک نظام کا انکشاف ہوتا ہے، جو ذیل کے دفاتر پر مبنی ہے :
۱. روزنامہ - روزانہ حساب کی کتاب مغرب کی شکل روزنامہ، یہ دفتر تعلق بھی کہلاتا ہے۔
۲. دفتر آوارجہ : رجسٹر نقدی (cash-book)، جو خزانے میں موجودہ رقم کی میزان پیش کرتا ہے۔
۳. دفتر توجیہات : ادا کردہ رقم کا دفتر۔
۴. دفتر تعویلات : دفتر ماسبق کی ایک شاخ، جو سامان کی فراہمی اور سرکاری اداروں اور مہموں کو چلانے کے مصارف سے تعلق رکھتا ہے۔
۵. دفتر مفردات : میزان دفتر، جو آمدنی اور خرچ کو جدا جدا شہروں، ضلعوں اور صوبوں کے مطابق پیش کرتا ہے۔
۶. جامع الحساب : حساب کی جامع کتاب، جس سے سالانہ مالی اطلاعات تیار کی جاتی تھیں۔
۷. قانون : زمین کی پیمائش اور لگان کے تخمینے کی کتاب یا سلطنت کے بندوبست اراضی کی یادداشت (ان دفاتر پر اور نیز دستور العمل اور اصطلاحات میں رد و بدل کے بارے میں پوری بحث کے لیے دیکھیے Hinz : Rechnungswesen، ص ۱۱۳ تا ۱۳۷)۔
مابعد منگول ریاستیں : بہت سے دیگر معاملات کی طرح دفتری طور طریقوں میں بھی مابعد منگول عہد کی مسلمان ریاستیں بظاہر بہت حد تک ایلخانی حکمرانوں کی پیروی کرتی رہیں، چنانچہ ان طور طریقوں میں سے بعض کا استعمال دور دراز ممالک مثلاً مملوک قاہرہ، عثمانی استنبول اور منول دہلی تک ہوتا تھا۔ ان میں سے صرف ایک، یعنی عثمانی سلطنت نے دفاتر کا ایک ایسا مجموعہ چھوڑا ہے جو آج تک باقی ہے، اگرچہ کچھ مفرد دفتر دوسرے ممالک سے بھی دستیاب ہوئے ہیں،

ان کی اندازاً کتنے اسپر (aspers) ترکی کا چاندی کا سکھ) قیمت ہے۔

تاہم ان دفاتر میں مندرجہ بالا سے متعلق معلومات اس زرعی فہرست تک محدود نہیں ہوتیں۔ ان میں ماہی گیری کے مقامات اور معدنیات کی کالوں کا بھی حوالہ موجود ہے اور اسی طرح معاصر چنگی، میلوں، مٹیوں اور فرازو گھروں سے آبدی کے بارے میں اور ساتھ ہی ان کے وقوع کی جگہوں، ان کے قواعد و ضوابط، اور کاروبار کی کیفیت اور کمیت کے متعلق بھی معلومات درج ہیں۔

دفتر خاقانی کی جانب رجوع کرنے سے ہم ملک کے معاصر کی سرکاری زمینوں، فوجی جاگیروں، اوقاف اور نجی جائیدادوں (ملک) کے درمیان تقسیم کے بارے میں بھی صحیح اندازہ کر سکتے ہیں۔ فی الواقع یہ دفاتر ایک ایسے جائزے پر مشتمل ہیں، جو ہر زرعی زمین کی ملکیت کی شکل، ان تبدیلیوں کی اجمالی کیفیت کے ساتھ پیش کرتا ہے، جو اس میں یکے بعد دیگرے واقع ہوئیں۔ ان دفاتر کی تالیف کا سبب سلطنت کی انتظامی تنظیم تھی۔ زیادہ تر عثمانی عہدیدار۔ شہری اور فوجی۔ دونوں، اپنی تنخواہیں مرکزی حکومت کے ہزارے سے حاصل نہیں کرتے تھے، لیکن اس کے عوض میں انہیں اپنے طور پر کسی مقررہ علاقے پر لگان عائد کرنے کی اجازت دی جاتی تھی؛ چنانچہ دسویں صدی ہجری/سولہویں صدی عیسوی کے شروع میں صرف "تیماروں" (جاگیروں) پر تصرف رکھنے والوں کو، جن کی تعداد بڑھ کر تقریباً پچیس ہزار تک پہنچ گئی تھی، ان لگانوں کا نصف سے زیادہ حصہ ملتا تھا، جو سلطنت کی سر زمین پر عائد تھے۔ مزید برآں یہ تناسب پوری سترہویں صدی عیسوی کے دوران میں بڑھتا رہا اور ساتھ ہی تیماردازوں (جاگیرداروں) کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔

اس نظام کو کامیابی سے عمل میں لانے کے لیے سلطنت کے معاصر کے مختلف ذرائع کی ہر ایک تفصیل

International Congress of Orientalists, Iranian, Armenian and Central Asian Studies, Maske 1950ء میں ۲۲۱ تا ۲۲۰: بعض دفاتر پورے طبع ہو چکے ہیں۔ قدیم ترین عثمانی جائزے کا دفتر H. Inalcik نے طبع کیا تھا، بنام ہجری ۸۷۵ تاریخی صورتی دفتر استیاق آروانید، انقرہ، ۱۹۵۴ء، گرجستان Georgia کا ایک عثمانی دفتر جائزہ S. Jikia نے طبع کیا تھا، بعنوان "Gurjistanlı vilayethis didi dushor" دفتر مقسّم ولایت گرجستان، ولایت گرجستان کا بڑا دفتر، ج ۱، ترکی متن، ج ۲، گرجی ترجمہ: Izdatel'stvo Akademii Nauk Gruzinskoy SSR، ٹبلیس، ۱۹۴۱ء تا ۱۹۴۷ء (B. Lewis)

* دفتر ارمینی: ایک لقب جو سلطنت عثمانیہ میں دفتر خاقانی [رک باں] کے ناظم کو دیا جاتا تھا۔

* دفتر خاقانی: ان دفاتر کا مجموعہ جن میں اس پیمائش کے نتائج درج کیے جاتے تھے، جو عثمانی دور میں گیارہویں صدی ہجری/سترہویں صدی عیسوی کے شروع تک ایک قدیم انتظامی و مالی دستور کے مطابق ہر تیس یا چالیس سال بعد عمل میں آتی تھی۔

شاہی دفاتر یا دفتر خاقانی شروع میں سلطنت کے دیہاتوں اور شہروں کے بالغ ذکور کی فہرست پر مشتمل ہوتے تھے اور اس میں ان لوگوں کے ناموں اور ولادت کے ساتھ ساتھ ان کی قالونی حیثیت، جس معاشی اور معاشرتی طبقے سے وہ تعلق رکھتے تھے، اس کے مطابق ان کے حقوق و استحقاقات، اور جو زمینیں ان کے پاس تھیں، ان کی حدود کے بارے میں معلومات مہیا کی جاتی تھیں۔

ان دفاتر میں زمین کے استعمال کی شکل (کھیت، پہلوں کے باغیچے، انگور کے باغات، دھان کے کھیت وغیرہ)، چکیوں کی تعداد، بھیڑوں اور شہد کی مکھیوں کے چھٹوں کے متعلق بھی بہت سی معلومات ہوتی ہیں جن سے یہ بھی منکشف ہوتا ہے کہ

عام طور پر وہ ایک یا دو قسموں تک محدود ہوتا تھا؛ چنانچہ تیماروں، یعنی تیمارداروں کی فہرستیں مع ان کے محاصل کے بارے میں مختصر بیانات کے رکھی جاتی تھیں نیز شاہی اراضی اور جاگیروں کی بھی فہرستیں بھی۔

۲۔ دفتر در دست یا "تغیرات کا دفتر" : یہ دفتر ان دیہاتوں یا شہروں کی فہرست پر مشتمل ہوتا تھا، جو فوجی جاگیروں کے مرکزی حصے کی تشکیل کرتے تھے۔ ان سے وہ تبدیلیاں سامنے آتی ہیں جو ہر جاگیر میں یکے بعد دیگرے واقع ہوتی تھیں، اور اس کو دیکھ کر عمال باسانی یہ معلوم کر سکتے تھے کہ کون سی جاگیریں لاوارث ہونے کی وجہ سے حکومت کے قبضے میں آگئیں، یا ان پر اب کوئی متمرد نہیں رہا۔

۳۔ دفتر روزنامہ یا "روزمرہ کی کتاب" : جس میں حسب موقع عطا کی جاگیر کے ان کاغذات (برات) کی نقل درج کر لی جاتی تھی جن کا اجرا نئے جاگیرداروں کے حق میں ہوتا تھا۔

ہر مرتبہ جب کوئی نیا جائزہ لیا جاتا تو پرانے دفاتر کو نئے دفاتر سے بدل دیا جاتا اور انہیں دفتر خانے کے پرانے کاغذات میں رکھوا دیا جاتا تھا۔ ایک مستقر سے دوسرے مستقر کو منتقل کیے جانے کے دوران میں پرانے دفتر کا بیشتر حصہ کھو جاتا یا تلف ہو جاتا تھا، تاہم باش وکالت آرشوی واقع استانبول میں تقریباً ایک ہزار دفتر باقی ہیں اور علاوہ ان کے بعض ترکی اور غیر ملکی محافظ خانوں اور کتب خانوں میں چند دفتر موجود ہیں۔ ان دفاتر میں سے بعض اسے ہیں جو سلطان مراد ثانی (۱۵۲۳ء / ۱۵۲۱ء تا ۱۵۵۵ء / ۱۵۵۱ء) اور سلطان محمد ثانی فاتح (۱۵۵۵ء / ۱۵۵۱ء تا ۱۵۸۶ء / ۱۵۸۱ء) کے عہد کے ہیں اور جن میں اس عہد سے پہلے کے جائزوں کا حوالہ ملتا ہے۔

پیمائش اور زمین سے متعلق دفتر خانے واقع انقرہ کے پرانے کاغذات کے شعبے میں اسے دفاتر کا ایک

کی معرفت اور کسی معین دور میں ان کی تبدیلیوں کی سلسلہ واپسروی ایک لازمی امر تھا۔ اس طرح یہ اندازہ کرنا ممکن تھا کہ کیا تنخواہیں، جن کی رقوم دفاتر میں درج ہوتی تھیں، اور اقطاع (عطا کی جاگیر) کے کاغذات (برات [رک باں])، جن کا اجرا ان سے مستفید ہونے والوں کے لیے کیا جاتا تھا، ان لگالوں سے مطابقت رکھتے ہیں جو فی الواقع عائد کیے جاتے ہیں۔ توسیع کے دور میں، جب کہ آبادی اور سلطنت کے وسائل میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا، اکثر و بیشتر ہونے والے جائزے سلطنت کے محاصل میں ہمیشہ نئی فاضل مقداروں کی نشان دہی کرتے تھے، لیکن گیارہویں صدی ہجری / سترہویں صدی عیسوی اور اس کے بعد کے زمانے میں ملکی معاملات میں بد نظمی کی وجہ سے مرکزی حکومت کو ان جائزوں پر عمل درآمد کرنے کے لیے ضروری اختیار حاصل نہ رہا۔ علاوہ ازیں تیماروں کے نظام میں خلل پیدا ہونے کی وجہ سے ان اقدامات کا فائدہ بھی مبہوم ہو گیا۔

ان مفصل دفاتر کے علاوہ، جن میں جائزوں کے نتائج ترتیب وار درج کیے جاتے تھے، کچھ معاون دفتر بھی درکار ہوتے تھے، جو تیماروں کی تقسیم میں وقع ہونے والی تبدیلیوں کو ضبط کرنے میں کام آتے تھے، جس کی وجہ سے ان اضافوں اور ترمیموں کو درج کر لیا جاتا تھا جن کا شامل کرنا "مفصل دفتر" میں ضروری ہو جاتا تھا۔ دسویں صدی ہجری / سولہویں صدی عیسوی کے شروع میں جو نظام رائج تھا اس کے لیے دو ہذا تین قسم کے معاون دفاتر استعمال کیے جاتے تھے۔

(۱) دفتر اجمال یا "فہرست بالاختصار" : یہ متصل دفتر پر مبنی ایک مختصر سا دفتر ہوتا تھا، جس میں باشندوں کے نام مذکور نہیں رہتے تھے اور انحصار محاصل کو ہر ایک "وحدت" کے لیے مخصوص ہونے کے طور پر پیش کر دیا جاتا تھا۔ دفتر اجمال میں کسی ایک منجائی یا ہر ایک کی منجائی کی

فروخت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ وہ اپنی زر کاشت زمین کے حق تصرف کو منتقل کر سکتا تھا، لیکن اس کارروائی کو جو مقامی زمیندار (سیاہی) کی زیر نگرانی اور اس کی اجازت سے عمل میں آتی تھی، شاہی دفتر میں اندراج کا موضوع نہیں بنایا جاتا تھا۔

دفتر اراضی انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں جا کر ترکی میں اس اصطلاح کے موجودہ مفہوم میں قائم کیا گیا۔

مآخذ: (۱) Ö. L. Barkan, *Les grands recensements de la population et du territoire de l'Empire Ottoman*, Revue de la Faculté des Sciences Economiques de l'Université d'Istanbul, ج ۲، ۱۹۳۰ء، ص ۲۱ تا ۲۳، ۱۶۸ تا ۱۷۹؛ (۲) وہی مصنف: *Essai sur les données statistiques des registres de recensements dans l'Empire Ottoman aux XVème et XVIème siècles*, JESHO, ج ۱، حصہ ۱، ۱۹۵۷ء؛ (۳) The Ottoman Archives as a Source for the: B. Lewis, *History of the Arab lands*, IRAS, ۱۹۵۱ء، ص ۱۳۹ تا ۱۵۵؛ (۴) وہی مصنف: *Studies in the Ottoman Archives*, BSOAS, ج ۱۶، حصہ ۲، ۱۹۵۳ء، ص ۲۶۹ تا ۲۸۱؛ (۵) H. Inalcik, *History of the Ottoman Empire*, ج ۱، ۸۳۵ ہجری، تاریخی صورت دفتر سنجاق آروئید، انقرہ ۱۹۵۳ء؛ (۶) آئی۔ ایچ۔ اوزون چارشیلی: عثمانی دولتی مرکز و بحریہ تشکیلاتی، انقرہ ۱۹۳۸ء، ص ۹۵ تا ۱۱۰؛ (۷) L. Fickete, *Die Siyâgat-Schrift in der türkischen Finanzverwaltung*, بوڈاپست، ۱۹۵۵ء، نیز دیکھیے، باش وکالت آرشیوی، دفتر، تحریر، لپو۔

(Ö. L. BARKAN)

* دفتر دار: ترکی میں دفتردار (defterdar) دفتر [رک بان] کا رکھنے والا، محکمہ مال کے اعلیٰ افسر کے لیے عثمانی اصطلاح جو مشرق اسلامی دنیا کی اصطلاح مستوفی [رک بان] سے مطابقت رکھتی ہے۔ التفتشندی کے قول کے مطابق (صبح، ۳: ۳۸۵،

تا ۱۵۹۲/۱۵۶۶ء اور سلطان مراد ثالث (۹۸۲ تا ۱۰۰۳/۱۵۷۳ تا ۱۵۹۵ء) کے عہد حکومت کے آخری جائزوں سے متعلق ہے۔ ان دفاتر میں ان جائزوں کے نتائج کا اضافہ کر دیا گیا ہے جو ایسے صوبوں مثلاً اتریش Crete میں عمل میں آئے، جو بعد میں فتح ہو یا جیسے کہ موریا Morea جسے اہل ویش Venetians سے دوبارہ حاصل کیا گیا۔ آج تک بھی مقدمات میں بعض نادر موقعوں پر اس مجموعے سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ اس مجموعے میں "مفصل دفاتر" کی تعداد ۲۵، "مختصر فہرستوں" (اجمال) کی ۱۱۶، "تغییرات کے دفاتر" (در دست) کی ۱۶۹ اور "روزانہ دفاتر" (روزنامہ) کی ۱۳۶۳ جلدیں ہیں۔ "مفصل دفاتر" میں سے ہر ایک میں تقریباً ۳۰۰ صفحات ہیں جن کا عرض ۱۵ سینٹی میٹر اور طول ۳۲ سینٹی میٹر ہے۔

تین صدیوں سے زائد عرصے کے دوران میں، جو آخری جائزے سے لے کر اب تک گزر چکا ہے، جب کبھی نئے اوقاف کے وجود میں آنے پر بعض زمینوں کی قانونی حیثیت میں واقع ہونے والی تبدیلیوں کو دوج کرنے کی ضرورت پیش آتی، تو ایسے ہر موقع پر ان کاغذات میں ترمیم کر کے انہیں وقت کے مطابق کر دیا گیا۔ اس واقعہ سے ان دفاتر کی قدر و قیمت میں اور اضافہ ہو جاتا ہے کہ ان میں بعض عدالتی فیصلے درج کیے گئے ہیں جو جاگیردار افراد کے حق میں کیے گئے تھے اور جن کا تعلق گانووں اور چراگاہوں کی حدود سے متعلق مقدمات سے ہے۔ پھر بھی یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ دفتر خانے کے طے کردہ سب معاملات کو ان دستاویزوں میں جگہ دی گئی ہے۔

بعض مصنفین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ دفتر خاقانی اراضی کا دفتر ہے۔ لیکن شاہی زمینوں (ارضی میریہ) کے نظام میں کاشت کار کبھی بھی اس زمین کا مالک نہیں ہوتا تھا، جو محض اتفاقاً اس کے تصرف میں ہوتی تھی، اور اس لیے وہ اس کا حق ملکیت

روباداد یا میزانیہ پیش کرنا شامل تھا جس کے صلے میں اس کو ایک خلعت عطا کی جاتی تھی۔ اس کی خدمات کا معاوضہ یا تو چھ لاکھ اسپر (aspers) کی مالیت کی جاگیر خاص [رک بان] ہوتی تھی یا ڈیڑھ لاکھ اسپر سے لے کر دو لاکھ چالیس ہزار اسپر تک، شاہی خزانے سے سالانہ وظیفہ (سالیانہ)۔ اس کے علاوہ دفتردار جاگیر "خاص" کے تمام عطیات کی رجسٹری فیس (حق امضاء) کے حقدار ہوتے تھے، بحساب ایک ہزار اسپر فی یار (یوک) ایک لاکھ اسپر) خواہ یہ عطیہ بطور اجارے کے ہو یا بطور سرمدگی (التزام یا امانت)؛ نیز جو نقد رقمیں سرکاری خزانے میں داخل کی جائیں ان پر ۲۲ اسپر فی ہزار کے حساب سے "جمع کرنے" کا معاوضہ (کسر میزان) اور شاہی زمینوں سے بطور عشر میں آکھٹی کی ہوتی پیداوار میں اس جنس کا ایک حصہ بھی ان کے حقوق میں شامل تھا۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے پر انہیں اسی ہزار اسپر کی پنشن سنٹی تھی (کتاب مذکور، ص ۸ تا ۲۹)۔ سر دفتردار (باش دفتردار) کمتر درجے کے افسران مائ کے نظام مراتب کی تصدیق کرتا تھا۔ اول صنف میں معمول افسران مائ (مائ دفتردار) بیٹھے تھے، ان سے نیچے ان کے معاون (دفتردار کتخداسی) اور ان کے ماتحت تیمار کے دفتردار (تیمار دفترداری)۔ ان سب کے لئے حقوق کا ایک مسلمہ و معینہ زینہ تھا۔

بابرید ثانی کے وقت سے باش دفتردار کا تعلق زیادہ تر روم ایلی سے تھا اور وہ روم ایلی دفتردار کے نام سے بھی معروف تھا۔ ایک اور دفتردار، یعنی آندلو دفتردار آناطولی کے محاصل سے مستغنی، معاملات کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ دسویں صدی ہجری/سولہویں صدی عیسوی کے اوائل میں زیادہ دور کے ایشیائی صوبوں کی دیکھ بھال کے لئے دفتردار کا ایک اور دیوان حلب میں قائم کیا گیا تھا، اس کا سربراہ دفتردار عرب و عجم کہلاتا تھا۔ اس دیوان کی بعد میں اس

صاحب الدفتر کا لقب فاطمی نظم و نسق میں اس افسر کے لئے پہلے ہی سے موجود تھا جو دفتردار المعظم، یعنی حساب و محاسبہ کے دفتردار کا مستعمل ہوتا تھا۔ لقب دفتردار خوان — دفتردار پڑھنے والا، سلطان صلاح الدین کے وقت میں دکھائی دیتا ہے۔ *Three Biographies from Kamāl ad Dīn* : B. Lewis) درؤاد کوپرولو (امغانی، استانبول ۱۹۵۳ء، ص ۲۴۳)، اور اسلامی مغرب میں دوبارہ مستعمل ہوا (العقربى : *Analectes*، ۱ : ۶۶)۔ لقب دفتردار کی ابتدا بظاہر ایلخانوں کے ساتھ ہوتی جنہوں نے دفتار مرتب کرنے اور ان کی نگرانی کرنے کے لئے دفتردار دیوان ممالک یا دفتردار ممالک کا تقرر کیا (اوزون چارشلی : *مداخل*، ص ۲۲۹ تا ۲۳۰)؛ کوپرولو : *Bizans*، ص ۲۰۳ تا ۲۰۵) : *Geschichte der Goldenen Horde* : Hammer) : *Pest*، ص ۱۸۳ء، ص ۴۷ تا ۵۰)۔

نویں صدی ہجری / پندرہویں صدی عیسوی اور اس کے بعد کے ترکی قانون ناموں سے سلطنت عثمانیہ میں دفتردار کے عہدے کا ارتقا ظاہر ہوتا ہے۔ سلطان محمد ثانی کے قانون نامے میں سر دفتردار پہلے ہی سے ایک اونچے درجے کا ملازم ہوتا تھا جو وزیر اعظم کی عام نگرانی کے ماتحت منطقی مالیات کا ذمہ دار افسر (وکیل) ہوتا تھا (قانون قلم آل عثمان، *TOEM*، تہمید، استانبول ۱۹۳۳ء، ص ۱۰)۔ اس کا نام وزیر اعظم کے نام کے فوراً بعد آتا تھا اور رتبے کے لحاظ سے وہ اس کے مقابلے کا تھا۔ دیوان میں اس کی نشست وزیر اعظم اور دو قاضیان عسکر کے فوراً بعد ہوتی تھی، اور ان کی طرح اسے بھی اپنے دائرہ اختیار کے اندر فرامین جاری کرنے کا حق حاصل تھا۔ اسے سلطان سے ملاقات کرنے کا ذاتی حق بھی حاصل تھا، جو اسے خوش آمدید کہنے کے لئے کھڑا ہو جاتا تھا (کتاب مذکور، ص ۱۰ تا ۱۱، ۱۶ تا ۱۷، ۲۳ تا ۲۵)۔ اس کے فرائض منصبی میں محاصل و مخارج کی ایک سالانہ

طرح ذیلی تقسیم ہوئی کہ دہار بکر، ارزروم، دمشق، حلب، طرابلس اور دوسرے مقامات میں جدا جدا دیوان قائم کیے گئے۔ سولہویں صدی عیسوی کے وسط میں استانبول کے لیے ایک علیحدہ دیوان قائم کیا گیا، اور پھر اس صدی کے آخر میں ایک اور دیوان ڈینیوب کے Danubian صوبوں کے لیے۔ یہ آخری دفتر دار صرف ایک قلیل مدت تک رہا۔ تین بڑے دیوان پہلی، دوسری اور تیسری قسمت کہلانے لگے (شق اول، ثانی، ثالث) یعنی روم ایل، آناتولی اور نسبتاً دور کے صوبے۔ سلیم الثالث نے ایک چوتھی شق طرز جدید کی فوج کے میزانیے سے متعلق معاملات کے لیے قائم کی [دیکھئے نظام جدید]۔ یہ شق مؤخر الذکر کے ساتھ منسوخ کر دی گئی۔ ۱۸۳۸ء/۵۱۲۵ھ میں منصب دفتر دار کا نام بدل کر وزارت مال (مالیہ) کر دیا گیا، لیکن دفتر دار کی اصطلاح مالیات کے صوبائی مدیران مال کے لیے مستعمل رہی۔

مآخذ : (۱) محمد ذکی: تشکیلات عتیقہ دہ دفتر دار، ITBM، پندرہواں سال، ۱۹۲۶ء، ص ۹۶ تا ۱۰۲، ۲۳۴ تا ۲۴۴؛ (۲) کوپرولوزادہ: م۔ فؤاد: ہیزانیس مؤسٹریٹک عثمانی موسٹریٹک۔ تاثیر نقیہ بعضی ملاحظہ لرا، THITM، ج ۱، ۱۹۳۱ء، ص ۲۰۱ تا ۲۰۵، (=م۔ فؤاد کوپرولوزادہ: Alcune Osservazioni intorno all'influenza delle Istituzioni bizantine sulle Istituzioni ottomane، روم ۱۹۵۳ء، ص ۳۸ تا ۴۸)؛ (۳) Pakalin، بنیل: مادہ: Gibb-Bowen، بعد اشارہ: (۵) Hammer-Purgstall، بعد اشارہ: (۶) JA بنیل: مادہ (از اوزون چارشلی)۔

(B. Lewis)

* دفترنگی: رگ بہ ذورنگی۔

* دف: (جدید تلفظ دف، جس کا سلسلہ ابو عبیدہ [م تقریباً ۸۲۵ء] تک پہنچتا ہے) طنبورے یا ڈمولک کی جنس کے تمام سازوں کا عام نام ہے، گو کبھی کبھی

یہ ایک خاص قسم کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اسلامی روایت کے مطابق اس کا موجد تبت بن لک تھا (المسعودی: مروج، ۸: ۸۸)۔ ایک حکایت یہ بھی ہے کہ اس ساز کو پہلے پہل حضرت سلیمان اور بلقیس کی شادی کی رات بجایا گیا تھا (اولیا جلی، ۲/۱: ۲۲۶)۔ الفضل بن سلمہ (م ۹۲۰ء) کہتا ہے کہ یہ عربی الاصل ہے (ورق، ۲) اور ابن ایاس (م تقریباً ۱۵۲۳ء) اپنی کتاب بدائع الزہور میں لکھتا ہے کہ بنی اسرائیل نے اپنے سونے کے بچھڑے کے آگے جو ساز بجایا تھا وہ دف ہی تھا۔ یقینی طور پر یہ لفظ عبرانی "toph" کا مساوی ٹھہرایا جا سکتا ہے اور شاید اشوری adapa کے بھی مساوی قرار پائے۔ ایک یہودی سجدہ (م ۹۲۳ء) toph کا ترجمہ دف ہی کرتا ہے۔ گول اور چوکھوٹی، دونوں قسم کی شکل کا یہ ساز ہمیں قدیم سامی صنعت میں ملتا ہے (Five Great Monarchies: Rawlinson، ۱: ۵۳۵؛ Hist. de l'art: Perrot-Chipiez، ۳: ۳۵۱؛ Figurines antiques: Heuzey، لوحہ ۴، ص ۴۸) اور قدیم مصر میں بھی پایا جاتا ہے (Manners: Wilkinson، and Customs of the Ancient Egyptians، ۱: ۴۴۳، شکل ۲۲)۔

مسلمانوں کے طنبورے سات مختلف نمونوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں: ۱۔ چوکھوٹی شکل؛ ۲۔ سادہ گول شکل؛ ۳۔ گول تار کے جال والا؛ ۴۔ گول جھنکار دار تھالیوں والا؛ ۵۔ گول جھنکار دار چھلّوں والا؛ ۶۔ گول چھوٹی گھنٹیوں والا؛ ۷۔ گول جس میں جالی اور جھنکار کی تھالیاں دونوں ہوتی ہیں۔

(۱) آج کل کا چوکھوٹی شکل کا طنبورہ دونوں طرف سے کھال سے بندھا ہوتا ہے جس کے نیچے دونوں طرف یا ایک طرف تار کے حلقے (اوتار) پھیلے ہوتے ہیں۔ المطرزی [م ۹۱۰/۵۱۳ء] کہتا ہے کہ چوکھوٹی اور گول دونوں قسم کے طنبوروں کو دف کہتے تھے۔ چوٹی لکھی عیسوی کے قدیم زمانے میں ہم جابر بن

مشتبہ ہے کہ مزہر یا مزہر عود کی قسم تھی۔ یہ غلطی غالباً اس وجہ سے ہوئی کہ ایک قدیم لغت نویس نے یہ لکھ دیا تھا کہ ”مزہر عود کی طرح کا ایک آلہ موسیقی ہے“ (دیکھیے الفیوسی : مصباح)، جس سے مراد یہ تھی کہ عود کی طرح مزہر بھی ایک آلہ موسیقی ہے۔ گیارہویں صدی کی ایک کتاب *Glossarium Latino-Arabicum* میں مزہر (ص ۵۶۲) یا مزہر (ص ۵۰۸) کو *Tinfannum* (تیمپانم) کے مطابق قرار دیا گیا ہے۔ آج کل بھی سازی کی یہ قسم ترکیہ (Lavignac، ص ۳۰۲۳) اور فلسطین (ZDPV، ۱ : ۶۳، لوحہ ۸) میں ملتی ہے۔ مصر کے مزہر میں چھ چھلانے ہوئے چھلنے لگے ہوتے ہیں۔

(۳) جالی والی گول شکل : یہ بالکل سابق الذکر قسم کا ساز ہے، لیکن امن میں سرے کے اندر تار کا جال بچھا ہوا ہوتا ہے۔ ہم وثوق کے ساتھ نہیں بتا سکتے کہ اسلام کے ابتدائی زمانے میں اس کا نام کیا تھا، لیکن غالباً یہ وہی آلہ ہے جسے امن کے چھنی کی طرح گول ہونے کی وجہ سے غربال کہتے تھے۔ الصنعتی (م تقریباً ۱۲۶۱-۱۲۶۲ء) کہتا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مندرجہ ذیل ارشاد میں جس دائرے کی طرف اشارہ کیا ہے وہ اسی قسم کا ہے: [أَعْلِنُوا هَذَا النِّكَاحَ، وَأَضْرِبُوا عَلَيْهِ بِالْغُرْبَالِ] ”اپنی شادی کا اعلان کرو اور امن کے لیے دائرہ (غربال) بجاؤ“ (ابن ماجہ : سنن، کتاب النکاح، باب ۲)؛ اس حدیث کے دیگر طرق روایت میں امن آلے کو دُفّ کہا گیا ہے [حدیث کے ضعیف یا موضوع ہونے سے قطع نظر، بعض شارحین حدیث کے نزدیک غربال سے مراد دُفّ ہے]۔ جدید الجزائر میں امن قسم کے آلہ موسیقی کے لیے لفظ بَندَر یا بَندَر مستعمل ہے؛ یہ بظاہر گوتھک لفظ *pandero* سے مستعار ہے، جو ایک آلہ موسیقی کا نام تھا اور ہسپانیہ میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے استعمال کیا جاتا تھا، امن کا اشیانیہ کے Isidore

حنی شاعر کے کلام میں دُفّ کا ذکر پاتے ہیں اور غالباً یہ ایک چوکھونٹا ساز تھا۔ کشف البہوم کا مصنف کہتا ہے کہ اسلام سے پہلے کا طنبورہ (طارالجاهلی) امن کے زمانے کے گول مصری طنبورہ (دُفّ المصری) سے مختلف تھا (ورق ۱۹۳)۔ اسلامی دور کا پہلا نامور مغنی طویس ایک چوکور طنبورہ (دُفّ مربع) بجانا کرتا تھا (الآغانی، ۴ : ۱۷۰)۔ مدینے کے معز بن اسلام کی پہلی صدی میں چوکھونٹا ساز پسند کرتے تھے (المفضّل بن سلمہ، ورق ۱۱)۔ یہ ہمیں معلوم ہے کہ شامی بھی اسی قسم کا ساز استعمال کرتے تھے کیونکہ عہد عتیق کے سریانی نسخے میں اس لفظ کا ترجمہ *rebhi'a* (چوکھونٹا) کیا گیا ہے (خروج، باب ۱۵، آیہ ۲۰؛ Judith، باب ۳، آیہ ۷)۔ آج کل یہ شکل عرب، شام، مصر اور ایران میں متروک ہو گئی ہے لیکن مغرب میں مل سکتی ہے۔ امن کے نمونوں کے لیے دیکھیے Christianowitsch، ص ۳۲، لوحہ ۱۱ جس میں اسے دُفّ کہا گیا اور Host، ص ۲۶۲، جدول xxxi، ۱۱۱ جس میں اسے *bandair* کہا گیا ہے۔ امن کے اصل نمونے برسلز Brussels میں موجود ہیں، عدد ۳۳۹، ۳۴۰ (Mahillon، ۱ : ۴۰۰) اور نیویارک میں بھی پائے جاتے ہیں، عدد ۳۹۲، ۳۹۶ (Catalogue، ۲ : ۸۲، ۳ : ۵۰)۔

(۴) گول شکل : امن کا نام بھی دُفّ تھا (المطرزی) اور کہا جاتا ہے کہ اس شکل کا ساز جس میں جھنکار دار تھالیاں یا گھنٹیاں نہ ہوں ’جائز‘ شمار ہوتا تھا (اولیا جلی، ۲/۱ : ۲۲۶)۔ غالباً یہی ہے جسے زمانہ قبل از اسلام اور ابتدائی زمانہ اسلام میں مزہر یا مزہر کہتے تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ عربی لغت نویس کہتے ہیں کہ مزہر ایک عود (lute) ہوتا تھا اور امن تعریف کی موسیقی پر لکھنے والے عربی مصنفوں سے بھی تائید ہوتی ہے (العقد الفريد، ۳ : ۱۸۶؛ المفضل بن سلمہ، ورق ۲ : کتاب الامتاع والانتفاع، ورق ۱۳؛ السعودی : مروج، ۸ : ۹۳)، لیکن یہ بات بے حد

۹۳ : Lavignac (۲۸۴۴) اور اس کا ایک خاکہ جسے دُف، مَزر اور طار، سے بڑا ہوتا ہے، اگرچہ کشف الہموم میں ہم یہ پڑھتے ہیں کہ 'دائرے' مختلف نمونوں کے بنائے جاتے تھے اور 'ان کا حجم طار کبیر سے لے کر گھٹتے گھٹتے "غریب دُقی" تک پہنچ جاتا تھا"۔ مصری آلہ موسیقی کے لیے دیکھیے Villoteau (ص ۹۸۸) اور الجزائر کے لیے دیکھیے Christian-owitsch (ص ۳۱، لوحہ ۹) Delphin et Guin (ص ۳۷) اور Lavignac (۲۹۳۱)۔ بقول Host (ص ۲۶۱، لوحہ ۳۱) مراکش میں اس کا نام ضیف تھا۔ ان کے اصلی نمونے برسلز، عدد ۳۰۸، ۳۰۹، (Mahillon، ۳۹۳ : ۱ تا ۴۰۰) اور نیویارک، عدد ۴۵۲، (Catalogue، ۵۰ : ۳) میں مل سکتے ہیں۔

(۵) چھنچھنائے چھٹوں والی گول شکل : یہ سابق الذکر ساز سے ملتا جلتا ہے، لیکن اس میں جھنکار پیدا کرنے والے چھٹے (جلاجل) زیادہ ہوتے ہیں۔ انہیں اسی جگہ بھنسا دیا جاتا ہے جہاں سابق الذکر ساز میں تھالیاں لگائی ہوتی ہیں۔ Villoteau کے زمانے میں ایسے مصر میں مَزر کہتے تھے، لیکن ایران میں ایک صدی بعد جو ساز ملتا ہے اسے Kampfer دائرہ کا نام دیتا ہے (ص ۴۱، سطر ۸)۔

(۶) چھوٹی چھوٹی گھنٹیوں والی گول شکل : یہ سابق الذکر ہی کے مشابہ ہے، لیکن گھنٹیوں کو کناروں پر بنے ہوئے سوراخوں میں لگاتے کے بجائے اندر کی جانب لٹکایا جاتا ہے۔ یہ چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں (= اجراس، جرس کی جیسج)، جو اکثر گُرسے کی شکل کی اور sonnettes کے مشابہ ہوتی ہیں، کبھی کبھی اس کے کناروں کے اندرونی جانب لگی ہوئی دھات یا لکڑی کی سلاخ میں پرو دی جاتی ہیں۔ یہ آلہ ایران اور ترکستان میں مقبول ہے، جہاں اسے عموماً دائرہ کہتے ہیں۔ سترھویں صدی کا ایک ایسا آلہ Kaempfer نے دکھایا ہے (ص ۴۲، سطر ۸)۔ جدید آلے کے لیے دیکھیے Lavignac (ص ۳۰۶)۔

نے ذکر کیا ہے۔ ہندیر عموماً دوسری اقسام، جیسے دُف، مَزر اور طار، سے بڑا ہوتا ہے، اگرچہ کشف الہموم میں ہم یہ پڑھتے ہیں کہ 'دائرے' مختلف نمونوں کے بنائے جاتے تھے اور 'ان کا حجم طار کبیر سے لے کر گھٹتے گھٹتے "غریب دُقی" تک پہنچ جاتا تھا"۔ مصری آلہ موسیقی کے لیے دیکھیے Villoteau (ص ۹۸۸) اور الجزائر کے لیے دیکھیے Christian-owitsch (ص ۳۱، لوحہ ۹) Delphin et Guin (ص ۳۷) اور Lavignac (۲۹۳۱)۔ بقول Host (ص ۲۶۱، لوحہ ۳۱) مراکش میں اس کا نام ضیف تھا۔ ان کے اصلی نمونے برسلز، عدد ۳۰۸، ۳۰۹، (Mahillon، ۳۹۳ : ۱ تا ۴۰۰) اور نیویارک، عدد ۴۵۲، (Catalogue، ۵۰ : ۳) میں مل سکتے ہیں۔

(۴) چھنچھنائی تھالیوں والی گول شکل : یہ (۲) کے مشابہ ہے، لیکن اس میں چند جوڑے جھانچھر کی تھالیوں (صُوج) کے زائد لگا دیے جاتے ہیں، جو ساز کے کناروں میں بنے ہوئے سوراخوں میں لگے ہوتے ہیں۔ یہی وہ آلہ ہے جسے طار کہتے ہیں۔ اگرچہ کشف الہموم کا مصنف اس نام کو بہ نسبت دُف کے زیادہ قدیم بتاتا ہے، تاہم ہمارے پاس اس کا اب تک کوئی قوی ثبوت موجود نہیں ہے۔ یمن میں طار کا وجود بارہویں صدی میں پایا جاتا تھا (Yaman : Key، ص ۵۳)، چنانچہ تیرھویں صدی کی کتاب Vocabulista in Arabico میں یہ لفظ بشکل طَر (Tinpanum = Tarr) دیا ہوا ہے۔ Kaempfer نے دُف کے نام سے ایرانی آلے کی تصویر کھینچی ہے (ص ۴۱، تصویر ۷) اور Niebuhr نے اس کا ایک عربی نمونہ پیش کیا ہے، جس کا نام اس نے دُف بتایا ہے (ج ۱، لوحہ ۲۶)۔ Husl (ص ۲۶۱، لوحہ ۳۱) مراکشی آلے کا خاکہ پیش کرتا ہے، جو تیرھویں صدی میں مستعمل تھا اور اس کا نام تَر (Tirr) بتاتا ہے۔ الجزائر میں اس کو طار کہتے ہیں (Delphin et Guin، ص ۴۲ : تذکرۃ النسیان، ص

(tambour de Basque) کے نام سے مشہور رہا، کیونکہ ہسپانوی مسلمانوں کی تہذیبِ یورپ میں باسک کے خطے ہی کے راستہ سے نفوذ کرچکی تھی۔ تقریباً پندرھویں صدی عیسوی میں اس کا رواج یورپ میں متروک ہو گیا تھا، لیکن اٹھارھویں صدی عیسوی میں ترکوں یا یمنی چریوں کی موسیقی کا شوق بہت بڑھا تو اسے بھی یورپ والوں نے اسی موسیقی کا جزو ہونے کی حیثیت سے دوبارہ اختیار کیا۔

مآخذ: (۱) *History of Arabian* : Farmer

(۲) *Music to the xliith Century* : ۱۹۳۹ء (۳) وہی مصنف:

Studies in Oriental Musical Instruments : ۱۹۳۱ء

(۴) *Reallexikon der Musikinstrumente* : Sachs

(۵) *Histoire générale de la musique* : Fétis

(۶) *Esquisse* : Christianowitsch

(۷) *historique de la musique arabe* : ۱۸۶۳ء

(۸) *Notes sur la Poésie et la* : Guin و Delphin

(۹) *musique arabes dans le Maghreb algérien* : ۱۸۸۶ء

(۱۰) *La musique chez les Persans en 1885* : Advielle

(۱۱) *Nachrichten von Marokos und* : Hüst

(۱۲) *Fes* : ۱۷۸۷ء

(۱۳) *carum* : ۱۷۱۲ء

(۱۴) *كتاب الملاہی*، قاہرہ، مخطوطہ، ورق ۵۳۳

(۱۵) *کشف الہجوم*، مخطوطہ، ورق ۱۱

(۱۶) *كتاب الاغانی*

(۱۷) *Catalogue ... du* : Mahillon

(۱۸) *Musée Instrumental du Conservatoire Royal de*

(۱۹) *Catalogue of the Crosby* : بار دوم

(۲۰) *Brown Collection of Musical Instruments*، نیویارک:

(۲۱) *Narrative of Travels ... by* : اولیا چلی

(۲۲) *Evliya Efendi* : ۱۸۸۶ء

(۲۳) *ابن عبد ربہ* : المقدافریہ،

(۲۴) *قاہرہ ۱۸۸۷ - ۱۸۸۸ء* : (۲۵) *كتاب الامتاع و الانتفاع*،

(۲۶) *Madrid*، مخطوطہ، عدد ۶۰۲ : (۲۷) *Toderini*،

(۲۸) *Letteratura Turchesca* : ۱۷۸۷ء

بظاہر معاموم ہوتا ہے کہ دائرہ اور دَف ہر قسم کی ڈھولک یا طنبور کے نام ہو گئے ہیں، حالانکہ دائرہ کا نام صرف گول شکل کے آلے کے لیے مخصوص ہونا چاہیے۔ (۲) گول شکل، جس میں جالی اور جھانچہ دونوں ہوں : المغرب میں اس ساز کا نام شگشاک ہے (Guin و Delphin، ص ۳۸، ۶۵ : Lavignac، ۲۹۳۲ و ۲۹۳۳)، لیکن بعض علاقوں میں اس نمونے کو طبلہ کہتے ہیں۔ مصر میں Villoteau کے کہنے کے مطابق یہی بتدیر ہے۔

اگر ڈھول (طبل) کو مسلمانوں کی موسیقی کے رزمیہ رنگ کا حامل کہا جائے، جیسا کہ ایک دفعہ Doughty نے کہا تھا، تو ڈھولک یا طنبورہ میں رزمیہ رنگ ملے گا۔ یہ صحیح ہے کہ زمانہ جاہلیت میں طنبورہ بوقت جنگ بڑی بوڑھیوں اور گلے والی چھو کرپوں (قیقات) کے ہاتھ میں ہوتا تھا اور کبھی کبھی، جیسا کہ یہودی قبیلوں کا دستور تھا، اس کے ساتھ بال سری (بزماری) بھی ہوتی تھی (الآغانی، ۲ : ۱۷۲)، لیکن مجلسی زندگی میں بھی بلاشبہ یہی آلہ نمایاں طور پر استعمال کیا جاتا تھا (السیوطی : مزہر، ۲ : ۲۳۶)، جیسا کہ بہت سی حدیثوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ فنی موسیقی میں تال سر (ایقاعات، اصول، ضرب) قائم رکھنے کے لیے طنبورہ کو اہم ترین ساز کی حیثیت حاصل رہی ہے۔

”دَف“ فارسی میں دَف یا دَب، کردی میں دَفک، البانوی اور بوسنی میں دَف، ہسپانوی اور پرتگالی میں آدِف (adufe) ہو گیا۔ ”دائرہ“ قفقازی میں دہرہ (dabare)، سریو اور البانیا میں دیرہ (daire) اور ہندوستان میں دارا (dara) بنا [آج کل اردو یا ہندوستانی میں ”دائرہ“ ہی بولا جاتا ہے، بمعنی، ڈنلی، چنگ]۔ طار کی شکل پولینڈ کی بولی میں Tur اور سواحلی میں alari ہو گئی۔ طنبورہ کا یورپ میں عام رواج ہسپانیہ کے مسلمان مورروں کے ذریعے ہوا اور ایک مدت تک طنبورہ باسک

سے الترمذی کی سنن پڑھ رہا تھا۔ الدقاق اور ابوالسلاوی نامی ایک شخص نے اسے تصوف کی طرف مائل کیا، التثوف، ص ۳۱۹۔ الدقاق چونکہ ابومدین کے اساتذہ میں سے تھا اس لیے اس کا نام محو نہیں ہو سکا۔ الدقاق نے ایک تارک الدنیا کی طرح زندگی بسر کی اور اس کی یہ خصوصیت دوسری تمام باتوں سے زیادہ نمایاں ہے کہ وہ عالم سے زیادہ صوفی تھا۔ اس نے جس انداز سے اپنے زہد و اتقا کا دعویٰ کیا ہے اور اس کے تسامیم کیے جانے پر جس مسرت اور اطمینان کا اظہار کیا ہے اس کا ہمارے دلوں پر کوئی خوش گوار اثر نہیں پڑتا۔ الدقاق کا انتقال فاس میں ہوا۔ A. Bel کے بیان کے مطابق اس کی وفات زیادہ سے زیادہ چھٹی صدی ہجری/بارہویں صدی عیسوی کے آخری ربع میں ہوئی۔ وہ باب النجیہ کے قبرستان میں دفن ہے۔

مآخذ: Sidi Bou Medyan et son : A. Bel
Mélanges René Basset در maître Ed-Daggaq à Fès
پیرس ۱۹۲۳ء: ۳۱ جلد: (۲) التادلی: التثوف إلى
[معرفة رجال التصوف، طبع A. Faure، الرباط ۱۹۵۸ء۔
(A. FAURE)

دَقْوَقَاع: (یا دَقْوَق)، سلطنت عباسیہ کے صوبہ * جزیرہ میں کُرگوک سے کوئی بیس میل جنوب مشرق میں ایک چھوٹا سا قصبہ، جو شاہراہ موصل - ۵ - بغداد پر واقع تھا۔ اس فصیے کا ذکر بعد کے عرب جغرافیاء نویسوں نے کیا ہے۔ اندازہ ہے کہ پانچویں صدی ہجری/گیارہویں صدی عیسوی میں یہ قصبہ ترقی کر کے شہر بن گیا تھا، اگرچہ مشہور وہ کبھی نہیں ہوا۔ قرون وسطیٰ کی کچھ خشتی عمارتوں کے آثار اور ایک مینار یہاں اب بھی موجود ہے۔ زمانہ مابعد میں (نویں صدی ہجری/بندرہویں صدی عیسوی یا اس سے ذرا پہلے سے) اس کا نام ”طہروق“ یا ”طاوق“ ہو گیا اور اس کا موجودہ نام بھی یہی ہے۔ یہ صحت افزا اور سرسبز و شاداب مقام پہاڑوں کی تران

Encyclopédie de la musique ج ۵، ۱۹۲۲ء: (۲۰)
Villoteau، در Description de l'Égypte، ج ۱: (۲۱)
Glossarium Latino-Arabicum، طبع Seybold: (۲۲)
Voyage en Arabie: Niebuhr، ۱۷۷۶ء: (۲۳) فطرت:
اوزبک کلاسیک موسیقی، تاشقند ۱۹۲۷ء: (۲۴)
Pesni Fergani-Bukhari i Khlvi: Mironov، تاشقند ۱۹۳۱ء: (۲۵)
uzbekistana، ماسکو ۱۹۳۳ء: (۲۶) کامل العظمی:
کتاب الموسيقى الشرقي، تارہ ۱۳۲۲ھ: [بزرگ بہ ایفاج]۔
(H. G. FARMER)

* دَقْنُ الدَّنُوبِ: رگ بہ دُنُوبِ۔

* الدَّقَاق: ابو عبد اللہ، ایک مراکشی صوفی، جو سبجلماسہ میں پیدا ہوا۔ وہ اور ابو عبد اللہ محمد بن عمرا لام (جو ۵۴۲ھ/۱۱۴۷ء میں قتل ہو گیا تھا) صوفیوں کے ان چھوٹے حلقوں میں سے ایک حلقے سے تعلق رکھتے تھے جنہیں عام طور پر حکومت پسند نہیں کرتی تھی۔ ابو عبد اللہ اس سے پہلے فاس کے مقام پر اپنے بعض رفیقوں کے ساتھ، جن میں سے ایک الدقاق بھی تھا اور جسے بعد میں تاشقین بن علی المروی کے حکم سے رہا کر دیا گیا تھا، قید رہ چکا تھا۔

کسی کو نہ تو اس صوفی کی تاریخ پیدائش معلوم ہے نہ تاریخ وفات، تاہم یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ چھٹی صدی ہجری/بارہویں صدی عیسوی کے وسط میں وہ فاس میں صوفی کی حیثیت سے معروف ہو چکا تھا، جہاں اس کے ”احوال“ نے ابن العریف اور ابن برجان کو اس پر مہربان کر دیا تھا۔ ان دونوں کا انتقال ۵۳۶ھ/۱۱۴۱ء میں ہوا۔

اگر ہم التادلی کی شہادت کو صحیح تسلیم کریں تو الدقاق کبھی سبجلماسہ اور کبھی فاس میں رہتا رہا۔ فاس ہی میں اس کی ملاقات ابومدین سے اس وقت ہوئی جب مؤخر الذکر تحصیل علم کے سلسلے میں ابوالحسن ابن جریرہم سے المحاسبی کی الرعاۃ اور ابن غالب

کی شاخ دمیث کے مشرق کنارے پر بسا ہوا ہے اور نیل کی یہی شاخ اس کی مغربی سرحد بناتی ہے جو صوبہ شرقیہ کے جنوب مشرق پر جا کر ختم ہو جاتی ہے۔

مآخذ: (۱) ابن خردادبہ، ص ۸۲: (۲) قدانہ،

ص ۸۸: (۳) علی پاشا، ۱۱: ۱۷: (۴) Maspero اور Wiet

'Materiaux pour servir à la géographie de l'Égypte

ص ۱۸۶ تا ۱۹۱۔

(G. WIET)

* **دقیقی:** ابو منصور محمد بن احمد (یا محمد بن

محمد بن احمد)، ایرانی شاعر، جس نے فارسی زبان میں پہلی قومی رزمیہ نظم لکھی۔ اس کی جائے پیدائش غیر یقینی ہے (طوس، بخارا، بلخ یا سمرقند)۔ وہ ۳۱۸ اور ۳۲۹/۹۳۰ اور ۹۴۰ء کے درمیان پیدا ہوا، اس لیے کہ جب وہ امرائے جغالیان کا اور پھر سامانی امیر منصور بن نوح (۳۵۰ تا ۳۶۶/۹۶۱ تا ۹۷۶ء) کا قیدیہ گو تھا، تو اس کی عمر کم از کم بیس سال تھی۔

علاوہ ازیں، فردوسی، جس نے اس کے بعد شاہنامہ کی تصنیف کا سلسلہ جاری رکھا، کہتا ہے کہ جب اس نے امیر نوح [ثانی] بن منصور (۳۶۶ تا ۳۸۷/۹۷۶ تا ۹۹۷ء) کی خواہش پر یہ کام شروع کیا تو دقیقی نوجوان تھا، اس لیے گویا دقیقی اس سلطان کے عہد سے پہلے مرا نہیں تھا اور فردوسی نے شاہنامہ کی تصنیف کا کام تقریباً ۳۷۰/۹۸۰ء میں دوبارہ اس وقت شروع کیا جب اس کے پیشرو (دقیقی) کو اس کے ایک غلام نے قتل کر دیا تھا۔

شعرا کے تذکروں (باب الاباب، مجمع الفصحاء، ترجمان البلاغۃ وغیرہ) میں بعض غزلیہ اشعار اور قطعے ایسے ملتے ہیں جو دقیقی کی شاعرانہ صلاحیت، اس کے لطیف و نازک شاعرانہ مزاج اور اس کے آسان اور عام فہم طرز کے شاہد ہیں، لیکن وہ تصنیف جس نے اسے بقائے دوام بخشی ہے شاہنامہ کا ایک حصہ ہے (تقریباً ایک ہزار اشعار جو اس کے جانشین فردوسی

کے عین مغرب میں ہموار سطح پر ایک چوڑے چشمے طاؤق چای کے ساتھ واقع ہے، جو گرمی کے موسم میں تو محض رستا رہتا ہے، لیکن سردیوں کی برسات کے بعد اس میں سخت سیلاب آ جاتا ہے۔ یہ پہلے دریائے عظیم میں جا کر گرتا ہے اور پھر وہاں سے دریائے دجلہ میں مل جاتا ہے، لیکن جب نہروان کی بڑی نہر موجود تھی تو اس میں جا ملتا تھا۔ جدید عراق میں طاؤق، جس میں کوئی دو ہزار گزردی اور ترکستانی زبان بولنے والے آباد ہیں، اب ایک "ناحیہ" کا صدر مقام ہے۔ شہر کا انداز تھوڑا بہت مغربی ہے اور یہ قرب و جوار کے کرد قبیلوں (داؤدیہ اور کاکی) اور ترکمان دیہاتیوں کے لیے زرعی اور تجارتی منڈی ہے۔ طاؤق چای پر جدید قسم کے پل بنائے گئے ہیں اور عراق ریلوے کی لائن اور پختہ سڑک ان پر سے ہو کر گزرتی ہے۔ حضرت زین العابدینؑ بن حضرت امام حسین علیہ السلام کا مزار یہاں سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ہے۔

مآخذ: (۱) Le Strange، ص ۹۲، اور عرب استاد

جو وہاں مرقوم ہیں: (۲) عبدالرزاق الحسینی: العراق، قتبنا وحیدنا، سلوم ۱۳۶۷/۱۹۴۸ء ص ۱۶۷: راقم کے اپنے مشاہدات۔

(S. H. LONGRIGG)

* **دَقْلِبَہ:** طاس نیل کے مشرق علاقے میں مصر کا ایک صوبہ۔ یہ نام دَقْلِبَہ نام کے ایک گاؤں سے منسوب ہے جو قبلی نام تَکْہَلِی (Tkebli) کا معرب ہے۔ یہ گاؤں دیمیرہ اور دیسات کے درمیان واقع تھا اور دیسات کے مقابلے میں دیمیرہ سے زیادہ قریب تھا۔ ایک زمانے میں یہ اپنے کاغذ سازی کے کارخانے کی وجہ سے مشہور تھا، لیکن آج کل ایک گمنام سا گاؤں ہے۔

یہ صوبہ پانچویں صدی ہجری/گیارہویں صدی عیسوی کے اواخر میں قائم کیا گیا اور آج تک اپنے حدود میں تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ باقی ہے۔ آج کل یہ دریائے نیل

کہ اس سے ایران کی اس عظیم قومی نظم کے مآخذ پر روشنی پڑتی ہے۔

مآخذ: (۱) فردوسی: شاہنامہ، طبع و ترجمہ از

J. Mohl، ۳ : ۲۵۸ تا ۷۳۰ (۱۸۷۷)؛ طبع

Vullers-Landauer، ۱۳ : ۱۹۵ تا ۱۷۷۷؛ طبع تہران

۱۹۳۴-۱۹۳۵ (نشر Beroukhim)، ج ۶ : (۲)

Le Mémorial de Zarîr : E. Benveniste، در JA

ج ۲۲، ۱۹۳۲، عدد ۲، ص ۲۳۵؛ بعد: (۳) غزلیات :

Les premiers poèmes persans : G. Lazard، تنقیدی

طبع، مع حواشی و ترجمہ اور مآخذ: (۴) براؤن E.G. Browne :

A Literary History of Persia، ۱ : ۵۵۹ تا ۶۶۲

و بعدد اشاریہ: (۵) رضا زادہ شفق: تاریخ ادبیات ایران،

تہران ۱۳۴۲، ص ۵ تا ۵۲؛ بعدد اشاریہ: (۶) حسین فریود:

تاریخ ادبیات ایران و تاریخ شعراء، بار دوازدہم ۱۳۴۲،

ص ۹۳ تا ۹۵: (۷) سلیم نیساری: تاریخ ادبیات ایران،

بار پنجم، تہران ۱۳۳۴، ۱ : ۲۸ تا ۲۹: (۸)

جلال الدین عماد: تاریخ ادبیات ایران، بار دوم، تہران

۱۳۴۰، بعدد اشاریہ: (۹) ذبیح اللہ مفا: تاریخ ادبیات

در ایران، ج ۱، ۱۳۳۸، [ش]۔

(CL. HUART و H. MASSÉ)

* دُکُزلی: رگ بہ دنزلی۔

* دُکالہ: مراکشی قبائل کا ایک وفاق، جس نے

فرانس کے زیر حمایت ایک خود مختار ریاست تشکیل

کی تھی۔ جب مراکش کو آزادی مل گئی تو یہ علاقہ

دارالایضاء کے صوبے سے ملحق کر دیا گیا۔ اب

یہ "الجذیدہ" کے حلقہ (مُزَگن) کے ایک حصے سے زیادہ

حیثیت نہیں رکھتا۔ قبیلہ غرب کے بعض فریقوں کا بھی

یہی نام ہے۔

البکری دُکالہ کا ذکر نہیں کرتا، مگر الادریسی

اور اس کے ہم خیال ابن خلدون (عبر) اور آگے چل کر

الحسن بن محمد الوزان الزیاتی Leo Africanus اس

وفاق کے لیے ایک وسیع رقبہ معین کرتے ہیں،

نے اپنی نظم میں شامل کیے ہیں۔ دقیقہ کے اس منظوم حصے میں شاہ گشتاسپ کے عہد حکومت، زردشت کے ظہور اور اس کے کارناموں اور ان کے تورانی دشمنوں کے خلاف جنگ کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔

اگرچہ دقیقہ کا نام مسلمانوں کا سا ہے، اس کی

ایک رباعی اور بعض دوسری نظموں سے ظاہر ہوتا

ہے کہ وہ عقیدے کے اعتبار سے زردشتی تھا؛ لیکن

سوال یہ ہے کہ کیا وہ دل سے زردشتی تھا؟ اگر وہ

سچے دل سے مسلمان تھا تو کیا اسے اپنے شاہنامہ میں،

جس کے لکھنے کا کام اس نے سامانی امیر جیسے انتہائی

راسخ العقیدہ مسلمان کے حکم سے شروع کیا تھا،

زردشتی مذہب کے عروج اور اس کی بھڑکائی ہوئی

جنگ کی کھلم کھلا تعریف کرنی چاہیے تھی؟

بہر کیف اگر یہ بات یقینی نہیں تو اغلب ضرور ہے کہ

اس نے یہ واقعہ اس لیے منتخب کیا کہ اس کے پاس

ایک زربران (یادگار زبیر) کا ایک نسخہ موجود تھا۔

یہ منظوم کتاب سامانی عہد کی ہے اور پہلوی میں لکھی

ہوتی ہے (جیسا کہ E. Benveniste نے بیان کیا ہے)۔

دقیقی براہ راست اسی سے متاثر ہوا۔ اگر ہم دقیقہ کی

ان نظموں کو پیش نظر رکھیں اور اپنے اسلوب اور بحر

کے اعتبار سے رزمیہ کہی جا سکتی ہیں جو تذکروں میں

منتشر صورت میں ملتی ہیں، تو یہ خیال ہوتا ہے کہ اس

نے شاید شاہنامہ کے دوسرے حصوں کو بھی نظم کیا ہو۔

دقیقی کے جو اشعار باقی رہ گئے ہیں، ان سے

ظاہر ہوتا ہے کہ اسے بیانیہ، زندانہ، یا عاشقانہ اسالیب

کے مطابق اپنے تاثرات کو بدلنے کی حیرت انگیز استعداد

حاصل تھی۔ فارسی کے تذکروں اور لغات میں اس کے

جو متعدد اشعار نقل کیے گئے ہیں، ان سے ثابت ہوتا

ہے کہ اسے اپنی شاعری کے مختصر سے دور ہی میں

شہرت دوام حاصل ہو گئی تھی۔ بلاشبہ شاہنامہ

میں اس کے اشعار کی شمولیت نہ صرف بلند پایہ ہونے

کے لحاظ سے اہمیت رکھتی ہے بلکہ اس لحاظ سے بھی

طرز سکونت عملی و خواہ کی بنا پر ہے، خانہ بدوشوں کی سی زندگی بسر کرنے کے خیال سے نہیں۔ اس علاقے کا اقتصادی مستقبل امید افزا ہے، بشرطیکہ امن و امان (Infoudam)، جو ۱۹۵۰ء میں تیار ہو چکا تھا، ترقیاتی منصوبے طے شدہ خاکے کے مطابق تکمیل پاتے رہیں۔ دیکھانہ اور پرنکالیوں کے باہمی تعلقات کی بابت رگ بہ ازسور اور اس سے بڑھ کر الجذیدہ۔

مآخذ : (۱) ضروری معلومات M. Michaux-
Villes et Tribus : Reg. des Dukkala : Bellaire ج ۱، در
Jiu Maroc ج ۱، پیرس ۱۹۳۲ء میں دی گئی ہیں؛ نیز
دیکھانہ (۲) P. Lanoie : Rep. alph. des Conf. de
tribus, des tribus de la zone franç. de l'emp. chér
دارالبیضاء ۱۹۳۹ء : H. Terrasse (۳)
Maroc : (۴) ابن زیدان : إتعاظ أعلام الناس (۵ جلدیں،
۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۳ء) اور (۵) محمد بن احمد القانون :
آسی۔۔۔۔۔ قاہرہ ۱۳۵۳ھ/۱۹۳۴ء۔

(G. DEVERDUN)

* دیکھانہ یا دیکھانہ : نماز جمعہ (یا نماز عیدین) کے موقع پر مسجد میں کسی بلند آواز نمازی کو "بلغ" [=مکبر] کے فرائض سونپے جاتے ہیں۔ نماز کے دوران میں وہ بلند آواز سے امام کے بعض کلمات [تکبیریں وغیرہ] دہراتا جاتا ہے تاکہ تمام نمازی انہیں سن سکیں۔ بڑی بڑی ممتاز مسجدوں میں وہ ایک دیکھانہ پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ دیکھانہ ایک چبوترے کو کہتے ہیں، جو عام طور پر متونوں پر دو یا تین میٹر بلند بنایا جاتا ہے اور یہ مسجد کے مسقف حصے میں محراب اور صحن کے درمیان ہوتا ہے۔ قاہرہ میں ایسے متعدد چبوترے پائے گئے ہیں جن کی تاریخ معلوم نہیں۔ سب سے قدیم چبوترہ، جس پر "د - ک - ة" حروف کندہ ہیں، سلطان قاہرہ کے زمانے (نوبی صدی ہجری) پندرہویں صدی عیسوی کے اواخر) سے تعلق رکھتا ہے۔

جس میں تقریباً وہ لکونی شکل کا رقبہ شامل ہے جو دریائے ام الریح، دریائے نصف اور بحراوقیانوس کے ساحل کے مابین واقع ہے۔ بارہویں صدی عیسوی سے سرائش کے ایک بڑے دروازے کو بھی دیکھانہ کا نام دیا گیا ہے۔ روایت سے پتا چلتا ہے کہ اس وفاق میں چھ قبیلے شامل تھے : رگراگہ، مزمرہ، بنو دقو، بنو ماگر، شترہ اور صنہاجہ۔ اس فہرست سے اس تضاد کا حل بھی نکل آتا ہے، جسے ابن خلدون پہلے ہی ظاہر کر چکا ہے، جس کی رو سے دیکھانہ کبھی متصافہ کا (پہلے پانچ قبیلے تو یقیناً اس کا حصہ تھے) اور کبھی صنہاجہ [رگراگہ] کا حصہ سمجھا جاتا تھا۔ یہ دونوں قبیلے بربر نسل کے تھے۔ انہیں ایک اور بربر قبیلے تاسنا کے ساتھ، جو اب معدوم ہو چکا ہے، منسلک کرنا مشکل ہے۔ یہ وفاق ان حوادث سے جو الموحدون کی بدولت رونما ہوئے، بچ نہ سکا۔ ان حوادث کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرائش کے علاقے میں عرب قبیلے داخل ہو گئے اور کچھ دن بعد قبیلہ حاتمہ اور قبیلہ بنو سفل کو ان کے اپنے علاقے میں واپس دھکیل دیا گیا۔ جنوب میں فقط رگراگہ قبیلہ صبح سالم بیچ سکا، مگر اس سے پہلے تاریخی لحاظ سے اس نے بھی اپنا اہم کردار ادا کیا۔ اس کے "سات درویشوں کے افسانے" نے مذہبی وقائع کی تمام کتابوں میں جگہ حاصل کر لی؛ جب ان کو ظہور اسلام کا عام ہوا تو یہ ساتوں کے ساتوں درویش سگہ پہنچے اور انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بربر زبان میں باتیں کیں۔ ان کے مزارات کی، جو جبل الحدید میں ہیں، آج تک تعظیم و تکریم ہوتی ہے۔ دیکھانہ کے نام کی اب کوئی نسلی اہمیت نہیں ہے۔ اس سے آج کل قبائل عرب یا پورے طور پر عرب کے زیر اثر قبائل مراد لیے جاتے ہیں۔ یہ قبائل ایک ہی جگہ مستقل طور پر مقیم ہیں اور اگرچہ ان میں سے کچھ ابھی تک خیموں میں رہتے ہیں، لیکن یہ

ایک منفرد اور واضح خصوصیت رکھتا ہے: لہذا دکن خاص کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ وہ پانچ حصوں پر مشتمل ہے: (۱) مغربی حصہ، جس کے ارد گرد سمندر اور مغربی گھاٹ ہیں، جسے "دیش" کہتے ہیں۔ یہی مرہٹوں کا اصلی وطن ہے، یہ حصہ گھاتوں کے آگے تک چلا گیا ہے اور اس میں وہ کل علاقہ شامل ہے جس کے بڑے شہر احمدنگر اور پونا ہیں؛ (۲) وہ علاقہ جسے قرون وسطیٰ میں برار کہتے تھے اور جو اب اپنے قدیم نام ودرہ سے معروف ہے اور اس کا اہم شہر ناگپور ہے؛ (۳) مرتھ وادہ، قدیم ریاست حیدر آباد کا وہ حصہ جہاں مرہٹی بولی جاتی ہے اور جس کا مرکزی مقام اورنگ آباد ہے؛ (۴) تلنگانہ، جہاں کی آبادی کے ایک بہت بڑے حصے کی مادری زبان تیلیگو ہے۔ اس علاقے کا تاریخی اور ثقافتی مرکز حیدر آباد ہے؛ (۵) جنوب مغربی علاقہ، جس میں زیادہ تر کنڈکا آباد ہیں۔ اس علاقے کا سب سے بڑا شہر بیجاپور ہے۔

اگر رام اور راون کی مشہور دیومالائی جنگ کو نظر انداز کر بھی دیں تو یہ بات یقینی ہے کہ یہاں آریائی تمدن موریہ حکومت کے خاتمے تک پوری طرح پھیل چکا تھا۔ موریانوں کے زوال سے آندھروں کے عروج تک جنہوں نے دکن کی پوری سطح مرتفع پر پانچ سو برس تک حکومت کی، کوئی خاص بات قابل بیان نہیں۔ ان کے علاوہ ہمیں تاریخوں میں ناگر جٹا کونٹہ کے ایشوکوں، برار کے واکتکوں، بداسی اور کایانی کے مغربی چالوکیوں، ملکھید کے راشٹرکوتوں، ونکی کے مشرقی چالوکیوں، دیوگری کے یادوؤں اور وارنگل کے کانٹیوں کا ذکر بھی ملتا ہے، جو مسلمانوں کی فتح سے قبل کی صدیوں میں دکن کے مختلف حصوں میں حکومت کرتے رہے۔

شمال کے مسلمانوں سے دکن کا پہلا سابقہ ۱۶۹۳ء/۱۰۹۴ھ میں اس وقت ہوا جب دہلی کے سلطان جلال الدین فیروز خلجی کے بھتیجے علاء الدین نے

عہد عثمانی کی مساجد کے دتے منبر کی شکل کے ہیں اور محراب کے بالمقابل دیوار کے ساتھ بنے ہوئے ہیں۔ آج کل مبلغ کی آواز کو بلند کرنے کے لیے آلہ مکبر الصوت استعمال ہوتا ہے۔

دکنہ کو "کرسی السورہ" سے خلط ملط نہیں کرنا چاہیے، جو ایسی نشست کو کہتے ہیں جہاں قاری دو زانوں ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ دکنہ کی اصطلاح ایک قسم کی جوبی چوکی کے لیے بھی آتی ہے، جو عام دنیاوی کاموں میں استعمال ہوتی ہے۔

مآخذ: (۱) Van Borchem، در Egypte،

بمد اشارہ۔

(J. JOMIER)

* دکن: یہ لفظ ہشکرت کے لفظ "دکشین" (dakshina) سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں دائیں (ہاتھ)، یعنی جنوب، اس لیے کہ سمتوں کی تعین طلوع آفتاب کے تعلق سے کی جاتی تھی۔ شمالی ہندوستان کو جنوبی ہندوستان سے جدا کرنے والے روایتی خط کی تشکیل کوہ وندھیاچل کے جنوب مغربی سمت کے بڑے ہوئے حصوں اور اس کے اس سلسلے سے ہوتی ہے جسے ست پڑا کہتے ہیں۔ اس خط کے جنوب میں جزیرہ نما ہندوستان کا جو حصہ واقع ہے، اس کی مزید تقسیم عموماً اس طرح کی جاتی ہے: (۱) دکن خاص، جو تنگ بھدرہ تک پھیلا ہوا ہے اور (۲) جنوبی ہند، جو اس جزیرہ نما کے انتہائی جنوبی نقطے تک چلا گیا ہے۔ طبعی لحاظ سے بھی ان دونوں حصوں کی حیثیت در علمہ علمہ وحدتوں کی ہے، اس لیے کہ جزیرہ نما دکن کی تشکیل لاوا سے بنی ہوئی اس وسیع سطح مرتفع سے ہوئی ہے جو گوداوری اور کرشنا کے طاسوں سے چند میل دور مغرب میں ایک مقام سے آہستہ آہستہ بلند ہوتی ہے اور مغربی گھاٹوں تک پہنچتے پہنچتے یکایک ختم ہو جاتی ہے، چنانچہ وہ علاقہ جو تنگ بھدرہ کے جنوب میں واقع ہے اور بندرگہ گوا کو چھوتا ہے، اپنی

کے خاتمے کی باری ۱۰۹۷ء/۱۶۸۶ء اور ۱۰۹۸ء/۱۶۸۷ء میں آئی جب کہ اورنگ زیب عالمگیر نے ان دونوں حکومتوں کو اپنی وسیع سلطنت میں شامل کر لیا؛ لیکن دکن میں مرہٹوں کے مسلسل حملوں نے مغل حکومت کو مستحکم نہیں ہونے دیا۔ مرہٹوں نے شیواجی کے تحت ۱۰۸۵ء/۱۶۷۳ء میں اپنی ایک علیحدہ حکومت قائم کر لی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہنشاہ کو اپنی مہموں کی تیادت اورنگ آباد میں رہ کر کرنی پڑی، جہاں ۱۱۱۹ء/۱۷۰۷ء میں اس کا انتقال ہوا۔ دکن کی تاریخ میں دوسری اہم تاریخ ۱۱۳۶ء/۱۷۲۳ء ہے، جب نظام الملک آصف جاہ [رگ بآں] نے ساز خان کو شکر کھڑوہ کے مقام پر شکست دے کر پورے دکن پر قبضہ جما لیا۔ آصف جاہی خاندان نے پہلے اورنگ آباد اور پھر حیدرآباد [رگ بآں] سے دکن پر بڑے مؤثر طریقے سے حکومت کی، لیکن ۱۱۹۸ء میں حکومت ہند نے اسے بھارت میں مدغم کر لیا۔ نظام دکن سر میر عثمان علی خان آصف جاہ ہفتم کو بھارت کے صدر نے راج پر مکہ یا ریاست کا آئینی سربراہ بنا دیا۔ وہ ۱۱۹۵ء تک اس حیثیت سے کام کرتے رہے جب کہ ریاست حیدرآباد کو لسانی اعتبار سے تقسیم کر کے آندھرا، بمبئی اور میسور کے صوبوں میں شامل کر دیا گیا۔

مآخذ: (۱) آر۔ جی اینڈرکس: *Early History of*

the Dekkan down to the Mahomedan Conquest

بار دوم، بمبئی ۱۸۹۵ء: (۲) ایس۔ کے۔ آئننگر:

India and her Muhammedan Invaders، لندن ۱۹۲۱ء:

History of the Bahmani Dynasty: J. S. King (۳)

لندن ۱۹۰۰ء: (۴) شروانی: *The Bahmanis of the*

Deccan, an Objective Study، حیدرآباد، بدون تاریخ:

History of the Deccan: J.D.B. Gribble (۵) ج ۱،

لندن ۱۹۳۶ء: (۶) یوسف حسین خان: *نظام الملک*

دیوگری [رگ بہ دولت آباد] پر چڑھائی کی اور یادوں کے راجا راجندر کو خراج دینے پر مجبور کیا، لیکن اس کی ریاست کا، جو مرہٹوں کے بیشتر علاقے میں پھیلی ہوئی تھی، ۱۲۱۸ء/۱۳۱۸ء میں پہلی مرتبہ سلطنت دہلی کے ساتھ الحاق ہوا۔ سلطان محمد بن تغلق نے وارنگل کے کانگڑوں کے مقبوضات کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کے علاوہ جنوبی ہندوستان کے ایک بڑے حصے کو بھی اس کے ساتھ ملحق کر لیا اور دیوگری کو اپنا دوسرا دارالسلطنت بنا کر اس کا نام دولت آباد رکھا؛ تاہم وہ اپنی وسیع سلطنت کا انتظام مؤثر طریقے سے نہ کر سکا اور ۱۲۴۶ء/۱۳۴۵ء میں اس کے دکنی امرا ("امیران صمد") نے اس کے خلاف بغاوت کر دی اور اسماعیل مینگ کو دکن کا پہلا آزاد مسلمان حکمران منتخب کیا۔ ۱۲۴۸ء/۱۳۴۷ء میں اس کی جگہ ظفر خان بادشاہ ہوا اور اس نے علاء الدین حسن بہمن شاہ کا لقب اختیار کیا اور یوں گویا اس نے بہمنی سلطنت [رگ بہ بہمنی] کی بنیاد رکھی۔ بہمنیوں نے اپنی سلطنت کو سمندر کے ایک ساحل سے لے کر دوسرے ساحل تک پورے دکن میں پھیلایا اور پہلے احسن آباد گبرگہ [رگ بہ گبرگہ] اور بعد ازاں محمد آباد بیدر [رگ بہ بیدر] کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ پندرہویں صدی عیسوی کے آخر اور سولہویں صدی عیسوی کے شروع میں بہمنی صوبوں کے والے پہلے خود مختار اور پھر آزاد ہو گئے، اور آخر کار دکن احمد نگر، بیجاپور، برار، بیدر اور گولکنڈہ کی پانچ حکومتوں میں تقسیم ہو گیا، جہاں علی الترتیب نظام شاہی، عادل شاہی، عماد شاہی، برید شاہی اور قطب شاہی خاندان حکمران ہوئے۔ برار اور بیدر تو کچھ ہی عرصے بعد احمد نگر میں شامل ہو گئے۔ پھر احمد نگر شاہ جہان کے عہد حکومت میں ۱۶۳۳ء/۱۱۴۲ء میں سلطنت دہلی کا حصہ بن گیا۔ بیجاپور اور گولکنڈہ

آصف جاہ اول، منگور ۱۹۳۶ء۔

(ہارون خان سرواں)

* دکنی : (دکنی) رگ بہ اردو۔

* دکنی الراجز : دو شاعروں کا نام، جنہیں ابن قتیبہ

نے ملتیس کر دیا ہے (الشعر [و الشعران]، طبع شاکر، ص

۵۹۲ تا ۵۹۵) نیز ان مصنفوں نے بھی جنہوں نے

اس سے نقل کیا ہے، یا اس سے استفادہ کیا ہے، یعنی

ابن عبد ربہ : العقد، طبع ۱۹۳۶ء/۱۹۳۸ء ص ۲۰۲ تا

۲۰۳؛ الآغاثی، ۸ : ۱۵۵ و طبع بیروت، ۹ : ۲۵۲ تا

۲۵۳؛ M. Nallino (جس کی Edit. : C.A. Nallino) نے

ایک حاشیے میں تصحیح کی ہے۔

(۱) دکنی بن رجاء الفقیہی (م ۱۰۵ھ/۷۲۳ء -

۷۲۴ھ) : مصعب بن الزبیرؓ کی مدح میں ایک قصیدے

کے علاوہ (جو بحر رجز میں ہے) اپنے گھوڑے کی

تعریف میں اس کا ایک ارجوزہ بھی محفوظ ہے جو

الولید بن عبدالمک کے حکم سے ہونے والی گھڑ دوڑ

میں جیتا تھا (دیکھیے یاقوت، ۱۱ : ۱۱۳ تا ۱۱۷؛

ابن عساکر، ۵ : ۲۴۴ تا ۲۴۹) محفوظ ہیں۔

(۲) دکنی بن سعید الدارمی (م ۱۰۹ھ/۷۲۷ء -

۷۲۸ھ) جس کے لیے درحقیقت ابن قتیبہ نے اپنا مقالہ بہ عنوان

دکنی الراجز وقف کیا ہے؛ نیز دیکھیے ابن عساکر؛

وہی کتاب؛ یاقوت، ۱۱ : ۱۱۷ تا ۱۱۹۔ اس نے

حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کی شان میں ایک مدحیہ قصیدہ

اس موقع پر لکھا تھا جب وہ مدینہ منورہ کے والی مقرر

کیے گئے (۸۷ھ/۷۰۶ء) اور اس پر اسے بیش بہا انعام دینے

کے علاوہ مزید وعدے بھی کیے گئے اسے شاید حضرت

عمر بن عبدالعزیز کا تقرب بھی نصیب ہوا۔ جب وہ

خلیفہ ہو گئے تو دکنی ان سے ملاقات کے لیے گیا اور

انہیں ان کے وعدے یاد دلانے اور مزید انعام حاصل

کیا۔ اسی دکنی کی طرف یہ بیت منسوب کیا گیا ہے :

”[إذ المرء لم يدنس من اللؤم عرضه

فكحل رداءه برتديہ جمیل]

یعنی جب تک آدمی اپنی عزت پر بد اعمالی کا دھبہ نہ

لگائے تو جو لباس بھی وہ پہنے خوب صورت ہے۔

بہر صورت یہی شعر سنوآل کے مشہور لامیے کے شروع

میں بھی ملتا ہے (فوائد سنائی: الدجانی الحدیثہ، ۱ : ۳۴۵)۔

اس دکنی کو دکنی بن سعید (سعد) العنتمی

(العزنی) سے، جو صحابہ کرامؓ میں سے ہیں، ملتیس نہیں

کرنا چاہیے (دیکھیے ابن حجر : الاصابہ، عدد ۲۴۰)۔

مآخذ : مقالہ کے اندر دیے گئے ہیں۔

(CH. PALLET)

* دکن : رگ بہ دکن۔

* دگللال : مغربی اریتریا Eritrea اور مشرقی سوڈان

کے ضلع آگوردات Agordat کے قبائلی گروہ ابی عامر کے

موروثی حکمران کا لقب؛ وہ اسراء کے نبتاب Nabtab

طبقے یا ذات کا رکن اعلیٰ بھی ہے، جنہیں ابی عامر کی

ہر شاخ میں بعض ایسے تاریخی اسباب کی بنا پر جن کی

توضیح اب ناممکن ہے، برتری کا درجہ حاصل ہے۔ خیال

کیا جاتا ہے کہ یہ لقب شاید نواج الاہل ہے اور غالباً

ان ایام کی یادگار ہے جب یہ قبیلہ دسویں صدی

ہجری/سولہویں صدی عیسوی اور گیارہویں صدی

ہجری/سترہویں صدی عیسوی میں پستار کے مسلم فوج

خاندان کا وقتاً فوقتاً ہاجزارہا، جس کا تعلق وادی نیل

سے تھا۔ دگللال کے عہدے کی علامات میں سرخ مخمل کی

ایک انوکھی طرز کی تکنیکی ٹوپی بھی شامل ہے۔

مآخذ : (۱) A. Pollera : Le Popolazioni

Bologna indigene dell' Eritrea ۱۹۳۵ء؛ اریتریا کے

برطانوی فوجی نظم و نسق کے لیے (۷) S. F. Nadel :

Races and tribes of Eritrea، اسرار ۱۹۳۲ء؛ (۲)

Short history of Eritrea : S. H. Longrigg، اوکسفورڈ

۱۹۳۵ء؛ (۴) و و لائن، بار دوم، بذیل مادہ [

(S. H. LONGRIGG)

دلاور پاشا : (۱۰۳۱ - ۱۰۳۲ھ/۱۶۲۲ء)

عثمانی وزیراعظم، جو نسل کروٹ Croat تھا۔ اس نے

تصیر سلطانی کی ملازمت میں چاشنی گیر ہاشی کے درجے تک ترقی کی، بعد ازاں وہ قبرص کا، پھر ذوالعجۃ ۱۲۲۰ھ/جنوری ۱۶۱۴ء میں بغداد کا بیگریگی مقرر ہوا۔ دیار بکر کے بیسگاریگی کا عہدہ اُسے ۱۲۳۰ھ/۱۶۱۵ء میں عطا ہوا۔ اس نے ایران کے صفویوں کے خلاف ۱۲۳۵ھ/۱۶۱۷ء کی جنگ اربوان میں حصہ لیا۔ اس کی بعد کی زندگی ۱۲۳۰ھ/۱۶۲۱ء تک کسی قدر تاریکی میں ہے۔ عثمانی وقائع (دیکھیے پچوی، ۲: ۳۶۶؛ حاجی خلیفہ، ۱: ۳۹۲؛ نعیم، ۲: ۱۶۶) میں مذکور ہے کہ مصطفیٰ پاشا نامی ایک شخص، جو عثمانیوں اور صفویوں کی جنگ (۱۰۳۳ تا ۱۲۳۵ھ/۱۶۱۵ تا ۱۶۱۸ء) کے آخری مہرکوں میں میدان کارزار میں کام آیا تھا، اپنی موت کے وقت، جو ۱۲۳۵ھ/۱۶۱۸ء میں ہوئی، دیار بکر کا بیگریگی تھا۔ وینس کے ایک اطلاع نامے ("relazione")، مؤرخہ جولائی ۱۶۲۰ء میں دلاور پاشا کی دیار بکر کے بیگریگی کے عہدے سے برطرفی کا ذکر ہے، اور یہ کہ وہ عہدہ اب "Silidar del Re" کو دے دیا گیا ہے (دیکھیے Hammer-Purgstall، ۸: ۳۶۷)۔ دلاور پاشا نے ایک دفعہ اور دیار بکر کے بیگریگی کی حیثیت سے (دیکھیے حاجی خلیفہ، ۱: ۳۹۶؛ نعیم، ۲: ۱۹۴) پولستانیوں کے خلاف ۱۲۳۰ھ/۱۶۲۱ء کی جنگ خوتین (Chocim) میں حصہ لیا۔ یہ یکم ذوالقعدہ ۱۲۳۰ھ/۱۶۲۱ء ستمبر کا واقعہ ہے کہ سلطان عثمان ثانی (۱۰۲۷ تا ۱۲۱۸ھ/۱۶۱۸ تا ۱۶۲۲ء) نے دوران جنگ میں دلاور پاشا کو وزارت عظمیٰ پر فائز کیا، لیکن اس کے اس عہدے کی مدت بہت مختصر تھی۔ ۸ رجب ۱۲۳۱ھ/۱۹ مئی ۱۶۲۲ء میں وہ اپنی چریوں کی اس بغاوت میں مارا گیا جو عثمان ثانی کی معزولی اور موت پر متوجہ ہوئی تھی۔ دلاور پاشا نے اُلرہا اور بیرہ چک کے درمیان چارمیلک کے مقام پر ایک بڑی "خان" (=سرای) تعمیر کرائی، اور دوسری "خان" سیدی غازی (سید غازی) کے مقام پر بنوائی،

جوسلطان مراد چہارم (۱۰۳۶ تا ۱۰۴۹ء) ۱۶۲۳ تا ۱۶۴۰ء کے زمانے تک پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکی۔
 مآخذ: (۱) پچوی: تاریخ، ۲: ۳۶۸، ۳۷۸، ۳۸۲، ۳۸۳؛ (۲) قرہ چلی زادہ: روضۃ الأبرار، ص ۵۴۴، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹؛ (۳) حاجی خلیفہ: تذکرۃ، ۱: ۳۷۵، ۳۹۳، ۳۹۶، ۴۰۷، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸

ہے۔ فیروز تغلق کے عہد حکومت میں اسے ایک خطاب اور منصب عطا کیا گیا تھا۔ دھار میں شیخ کمال الدین مالوی کے مزار کے احاطے سے سنگ مزار کا ایک کتبہ دستیاب ہوا ہے، جس سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ ۱۵۹۵ء/۱۳۹۲-۱۳۹۳ء میں دلاور خان مالوے کا والی تھا۔ اس کے دلاور خان کا لقب اختیار کرنے کی صحیح تاریخ معلوم نہیں، لیکن اغلب یہی ہے کہ یہ وہ خطاب تھا جسے فیروز شاہ تغلق نے اسے عطا کیا اور اسی کے بیٹے محمد شاہ نے اسے مالوے کا صوبے دار مقرر کیا تھا (حیرت ہے کہ محولہ بالا کتبے میں اس زمانے کے فرمانروا کا نام محمود شاہ مذکور ہے)۔

جب ۱۳۹۸ء/۸۰۱ میں تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا تو دلاور خان نے مغور تغلق بادشاہ ناصر الدین محمود شاہ کو بلا توقف حفاظت و پناہ دی۔ اس بد نصیب بادشاہ سے دلاور خان کے تعلق خاطر اور وفاداری کی وجہ سے اس کا جہ طلب بیٹا الپ خان (بعد ازاں ہوشنگ غوری [رک بان]) ناراض ہو گیا اور اس نے اپنے باپ کے پناہ گزین آقا کی اطاعت گزاری کو پسند نہ کیا، بلکہ مانڈو [رک بان] میں منتقل ہو گیا، جہاں اُس نے قلعے کی عمارتوں کا انتظام فرست کیا اور انہیں مستحکم بنایا۔ محمود تغلق جب ۸۰۴ء/۱۴۰۱ میں دہلی روانہ ہوا تو دلاور خان نے، جس نے ۱۳۹۲ء/۸۰۵ء ہی سے مالوے کی فاضل رقوم کا دہلی بھیجنا بند کر دیا تھا، اپنے بیٹے الپ خان کے بہت زیادہ اکسائے پر اپنی آزادی کا اعلان کر دیا (دیکھیے *Perishta: Briggs*، ص ۱۶۹)۔ بہر حال دلاور خان اپنی خود مختاری کے ثمر سے لطف اندوز ہونے کے لیے زیادہ دیر تک زندہ نہ رہا اور ۸۰۸ء/۱۴۰۵ء میں دفعۃً انتقال کر گیا۔ اس کی اجانک موت سے یہ شبہہ، جس میں بعض اعلیٰ مرتبت سپہ سالار بھی شریک تھے، پیدا ہو گیا کہ اُسے اس کے جہ طلب بیٹے نے زہر دیا ہے،

Ottoman Porte from the Year 1621 to 1628 inclusive طبع وچرڈ سن S. Richardson، لندن، ۱۹۲۳ء، ص ۴۲ تا ۵۱ (بمواضع کثیرہ)؛ *Histoire: Hammer-Purgstall* (۱۵)، ص ۲۸۱ تا ۲۹۱ (بمواضع کثیرہ)؛ *Zinkeisen* (۱۶)، ص ۲۹۸ تا ۳۰۳؛ *Geschichte: N. Jorga* (۱۷)، ص ۱۹۱ تا ۲۰۳؛ *des osmanischen Reiches*، گوٹھا، ۱۹۱۰ء، ص ۳۳۵ تا ۳۴۸ (۱۸) اسماعیل حق اوزون چارشیلی: عثمانی تاریخی، انقرہ، ۱۹۵۸ء، ص ۲/۳ تا ۳۲۵؛ (۹) عثمان زادہ احمد نائب: حقیقۃ الوزراء، ص ۳۱؛ (۲۰) ساسی: قاموس الاعلام، استانبول، ۱۹۲۸ء، ص ۳ تا ۲۱۵۱؛ (۲۱) نسیم عثمانی، *TA* (۲۲)، بذیل مادہ دلاور پاشا (از M. Tanyib، Gokbilgin)۔

(V. J. PARRY)

* **دلاور خان**: سلطنت مالوے [رک بان] کا بانی، جس کا اصل نام حسن تھا (فرشتہ، طبع ٹولکشور، ۲۳۳)، یا حسین (فرشتہ، ترجمہ Briggs، ص ۱۷۰ تا ۱۷۱) نیز دیکھیے یزدانی: *Mandu*، یا عمید شاہ داؤد (ٹورک جہانگیری، ترجمہ Rogers و Beveridge، ص ۲ تا ۳۰۷، جو دھار کی جامع مسجد (لاٹ مسجد) کے کتبوں پر مبنی ہے، دیکھیے ظفر حسن: *Inscriptions of Dhar and Mandu*، در EIM، ۱۹۰۹ء تا ۱۹۱۰ء، ص ۱۱ تا ۱۲ و لوحہ ۳ و ۴)۔ جس کی شہادت اس امر سے بھی ملتی ہے کہ وہ معز الدین محمد بن سام شہاب الدین غوری کی صلیبی اولاد میں سے تھا اور یہ عقیدہ اس حقیقت میں بھی جھلکتا ہے کہ اس کے اور اس کی اولاد کے نام کے ساتھ عموماً خاندانی نام غوری استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ طبقات ناصری اور دیگر مآخذ میں صراحت کی گئی ہے، سلطان معز الدین غوری کے کوئی تربیت اولاد نہ تھی۔ غوری ایک بڑا خاندان تھا اور غور کے سبھی رہنے والوں کے لیے یہ نسبت استعمال ہو سکتی ہے، لہذا مقالہ نگار کا یہ قیاس صحیح نہیں

دَلتَاوَه : مرکزی عراق میں دیالاکہ یو امیں واقع *
خالص کی "قضا" کا صدر مقام جو ۳۳ درجے ۳۰ ثانیے
مشرق، ۳۳ درجے ۵۰ ثانیے شمال میں واقع ہے۔ اس
شہر کی آبادی، جو تمام کی تمام مکین عراقی عربوں پر
مستعمل ہے اور جن میں شیعوں کی تعداد سنیوں سے زیادہ
ہے، ۱۹۳۷ء/۱۳۵۷ھ میں دس ہزار تھی۔ پوری
"قضا" کی آبادی ستر ہزار تھی۔ اس کے ماتحت جو دو
"ناحیے" ہیں ان کے نام خان بنی سعد اور منصورہ
(سابق ذلی عباس) ہیں۔ عراقی علماء کے نزدیک دلتاؤہ
اپنے اصل نام دولت آباد کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔

مآخذ : (۱) عبد الرزاق العسلی : *التراق اقدیما و*
حدیثا، صیدا (Sidon) ۱۳۶۷ء/۱۹۴۷ء۔

(S. H. Longrigg)

دَلْدَل : نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے *
خاکستری رنگ کے خچر کا نام، جو آپ کو متوفی
[رک بان] نے بطور ہدیہ بھیجا تھا اور اسی کے ساتھ
ایک گدھا بھی، جو یعقوب یا عقیل کہلاتا تھا، ارسال
کیا تھا۔ دلدل نے آپ کے غزوات میں آپ کی سواری
کا کام دیا۔ یہ آپ کی وفات کے بعد بھی زندہ تھا اور
ینبوع میں اس قدر سن رسیدہ اور بے دندان ہو کر مرا
کہ آجے کھلانے کے لیے جو اس کے منہ میں ڈالنا
پڑتے تھے۔ شیعہ روایات کی رو سے جنگ جمل میں
حضرت علیؓ اسی پر سوار تھے [رک بہ العجل] اور
صفین میں بھی آپ نے اسی پر سواری کی تھی۔ چونکہ
عربی میں دلدل مسیہ یا خاریشت کو کہتے ہیں اس لیے
ممکن ہے کہ یہ نام اس کی جال کی وجہ سے پڑ گیا
ہو، لیکن یہ قیاس یقینی نہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ
علیہ وسلم کے گھوڑوں کے ناموں کی بابت دیکھیے
۱۹۳۸ء، ص ۵۱، آپ کی اونٹنیوں، اعضاء اور
القصواء کے لیے دیکھیے الجاحظ : *الحيوان*، بمقدار اشارہ،
مآخذ : (۱) الجاحظ : *البعال*، طبع Pellat، قاہرہ

چنانچہ گجرات کی ہمایہ سلطنت کے حکمران مظفر شاہ
اول کا بھی عرصے تک یہی خیال رہا اور آخر کار اسی
شبہ نے اُسے اپنے دوست اور حلیف کا بدلہ لینے کی
نیت سے مالوہ پر حملہ کرنے پر آمادہ کیا۔ جہانگیر
نے (توزک جہانگیری، طبع لاہور، ص ۳۳) دھار کی
جامع مسجد کی تعمیر کی جو تاریخ دی ہے، یعنی
ہشت صد و ہفتاد (۸۷۷ھ)، وہ بظاہر اس کتبے کی ایک
سطر کی غلط قراءت پر مبنی ہے جو محولہ بالا مسجد
کے مشرقی دروازہ پر ہے، وجہ یہ ہے کہ دلاور خان
۸۸۰ھ/۱۴۷۵ء میں انتقال کر چکا تھا۔ شمالی دروازے
پر جو کتبہ ہے (EIM) ۱۹۰۹ء تا ۱۹۱۰ء و لوحہ
(۱۳) اس میں سن تعمیر رجب سبع و ثمانی مائے
(۸۷۷ھ) درج ہے۔ دلاور خان کی دیگر عمارتیں یہ
ہیں : مالٹو کے مقام پر ایک مسجد، جو اس کے نام
سے معروف ہے (کتبہ مؤرخہ ۸۸۰ھ/۱۴۷۵ء) اور اس
قلعے کا ٹاراپور دروازہ (۸۸۰ھ/۱۴۷۵ء کا کتبہ، وہی
کتاب، ۱۹ و لوحہ ۲/۷) : اگرچہ مؤخر الذکر اس کی
تعمیر کو دلاور خان سے منسوب کرنا ہے، لیکن قرینہ
سے ظاہر ہے کہ یہ اس کی موت کے بعد اس دروازے
کی تکمیل کی تاریخ ہے۔

مآخذ : (۱) محمد ہادی ذمور خان : *ہفت گلشن*
(مخطوطہ) : فصل ۳ : (۲) فرشتہ : *گلشن ابراہیمی*، طبع
نولکشور، ۲ : ۲۰۳۳ (۳) *توزک جہانگیری* انگریزی
ترجمہ (Beveridge و Rogers) لندن ۱۹۰۹ء، ۲ : ۳۰۷
بعد : (۴) *Dhar and Mandu* : E. Barnes، در
JBRRAS ۱۹۰۰ء تا ۱۹۰۳ء، ۲۱ : ۳۳۹ تا ۳۹۱،
بمواقع کثیرہ : (۵) *History of Indian and Eastern Architecture*
لندن ۱۹۱۰ء، ص ۵۳۱ : (۶) *Mandû : the City of Joy* : G. Yazdani،
آکسفورڈ ۱۹۲۹ء : (۷) امیر احمد علوی : *شاہان مالوہ*، لکھنؤ
بدون تاریخ، ص ۱۳ تا ۱۷ : *توزک بہ دھار*، مالوہ، مالٹو۔

(بڑی انصاری)

وہ آپس میں ایک دوسرے سے بات کرتے اور اپنے افسروں کے احکام وصول کرتے تھے۔ بقول Bon ان میں بہت سے لکھ سکتے تھے "اور وہ بھی سمجھ بوجھ کر اچھی طرح سے"۔ ان کے فرائض میں پاسانی اور خدمت گزاری، نیز بہت ہی زیادہ خفیہ امور، بشمول سزائے قتل میں پیغام رسانی اور سفارت کے کام شامل تھے۔

مآخذ : (۱) تاریخ عطاء : ۱ : ۱۷۱ تا ۱۷۲

A description of the : Robert Wihers (۲) : ۲۸۳
Grand Seigneur's seraglio (adapted from Ottaviano Bon, Il serraglio del gran signore (1608)).

Purchas his Pilgrims : ج ۲/۲، لندن ۱۶۲۵ء

(بار دیگر، کلاسکو ۱۹۰۵ء، ج ۹)، باب ۷ (نیز طبع

J. Greaves، لندن ۱۶۵۰ء، ۱۶۵۳ء، ۱۶۷۷ء) : (۳)

History of the Present State of the : P. Rycaut

Ottoman Empire، بار چہارم، لندن ۱۶۷۵ء، باب ۸

Tableau général de : D' Ohsson (۴) : ۶۲ تا ۶۳

l'Empire ottoman، پیرس ۱۸۲۳ء، ۷ : ۴۵ : (۵)

Staatsverfassung : Hammer-Purgstall، ۲ : ۵۷

Gibb-Bowen، ۱/۱ : ۸۰ : (۶) اسماعیل حقّی اوزون

چارشلی : عثمانی دولتی سازی تشکیلاتی، انقرہ ۱۹۸۵ء

من، ۳۳ : (۸) Pakalın، ۱ : ۲۳۷۔ عثمانی دربار کے متعلق

متعدد مغربی رودادوں میں ان گونگے بہروں کے حالات اور

تصاویر ہیں۔

(H. LEWIS)

الدلفی : تیسری صدی ہجری/انویں صدی عیسوی

کا ایک اہم قبیلہ، جس کی مقبوضہ اراضی ان کے ایک پورے ضلع پر مشتمل تھی، جو "الآغارین" (دواقطاع) کہلاتا تھا اور العجل میں نہاوند کے مشرق میں ہمدان اور اصفہان کے درمیان واقع تھا۔ عیسیٰ بن ادریس اس قبیلے کا بانی تھا، جس نے شاہراہوں پر لوٹ مار کر کے اتنی دولت جمع کر لی کہ آخر کار الکرج میں ایک مضبوط قلعہ بنا کر غارت گری چھوڑ دی۔ اسی قلعے کو اس کے فرزند

۱۹۵۵ء، ص ۲۱ : (۲) محمد بن حبیب : المختبر، ص ۷۶ :

(۳) الطبری، ۱ : ۱۷۸۳ : (۴) المسعودی : مروج، ص ۴ :

۳۱۷، ۳۵۹، ۳۶۹ : (۵) ابن الاثیر، ۲ : ۲۳۸ : (۶) التتوی،

ص ۴۶ : (۷) الذہیری، بذیل مادہ : (۸) تاج العروس،

بذیل مادہ : (۹) لسان العرب، بذیل مادہ۔

(Cl. HUART و Ch. PELLAT)

* دلیس : ترکی میں یہ معنی، بے زبان، سلاطین عثمانیہ

کے محل کے اندر کام کرنے والے بھرے گونگے ملازموں

کا نام، جنہوں نے کچھ عرصے کے لیے باب عالی میں

بھی خدمات سرانجام دیں۔ اسی مفہوم میں انہیں فارسی

لفظ "بے زبان" سے بھی موسوم کرتے تھے۔ وہ محمد ثانی

کے عہد سے سلطنت کے خاتمے تک محل میں موجود

رہے۔ ان کی تعداد کے متعلق معلومات میں اختلاف

ہے۔ بقول عطاء تین سے پانچ تک دلیس ہر ایوان

(- توغش) سے متعلق ہوتے تھے : Rycaut ان کی تعداد

"تقریباً چالیس" بتاتا ہے۔ مصطفیٰ ثانی (م ۱۱۱۵ھ/

۱۷۰۳ء) کے وقت کی ایک دستاویز میں، جس کا

حوالہ اوزون چارشلی نے دیا ہے اور جو محل

کے ملازمین میں کپڑے کی تقسیم سے متعلق ہے،

لکھا ہے کہ ہر حرم سرا میں ایک "بے زبان"، شاہی

خلوت خانے ("خاص اوطاق") میں دو "بے زبان" اور

ایک ہونا (جیجی)، ایوان خزانہ (خزینہ توغش) میں اور

ایک بے زبان سردار، ایک ہونا سردار، چھ "بے زبان"

اور دو بوئے، ایوان لشکر کشی ("بیفری توغش) میں

ایک "بے زبان" سردار، ایک ہونا سردار اور دس

"بے زبان" ہوتے تھے۔

"بے زبانوں" کو تنخواہ اور پنشن ملتی تھی اور

ان کی خاص وردیاں اور درباری لباس ہوتے تھے۔ ان

کے سرداروں کو "باش دلیس" (= بے زبان سردار) کہتے

تھے، گو وہ پیدائشی گونگے بھرے ہوتے تھے، لیکن

کہا جاتا تھا کہ عقل و فہم رکھتے تھے اور ان کی

اشاروں پر مبنی ایک خاصی جامع زبان تھی، جس کے ذریعے

اور جانشین القاسم بن عیسیٰ العجلی نے، جو ابو دلف کے نام سے معروف ہے، خانوادہ دلفی کی اسامی کے لیے استعمال کیا۔

ابو دلف ایک شیعہ اور بڑا تعلیم یافتہ آدمی، مستبدانہ شاعر، عظیم سپہ سالار اور لائق رہنما تھا۔ اس کا وقار اتنا تھا کہ اگرچہ اس نے علویوں کا برجوش طرفدار ہونے کے باعث المأمون کے خلاف فوج کشی بھی کی تھی لیکن المأمون نے اسے معاف کر دیا اور اپنے درباریوں میں شامل کر لیا (رک بہ القاسم)۔ اپنی افواج کی مدد سے اس نے بابک الخرمی (رک بان) (۸۳۶-۸۳۷ء) کی بغاوت کو کچلنے میں اہم کردار ادا کیا اور اس کے اخلاف نے، جو دلفی کہلاتے، خلیفہ وقت کے تحت اس کے طرفدار ہو کر خدمات انجام دیں اور خلافت کی بہت سی فوجی سہمات میں حصہ لے کر اس کے وفادار حمایتی ہونے کا ثبوت دیا۔ ابو دلف اور اس کے پوتے احمد نے علی الترتیب خلیفہ المستعصم اور المعتضد کے عہد میں بحیثیت سپہ سالار خاص طور پر نام پیدا کیا۔ ان کا خاندان تقریباً پورے طور پر خود مختار تھا اور کوئی ستر سال فرمانروائی کرتا رہا۔ ان کو جاگیر دہشی طور پر عطا ہو گئی تھی اور دلفی ایک سب سے مالانہ خراج خلیفہ کو دیا کرتے تھے، نیز ان کے اوپر اور کوئی ٹیکس عائد نہ کیا جاتا تھا اور وہ سب سے بھی اپنا ہی چلاتے تھے۔

دلفیوں کا دارالحکومت النکرج، کسی قدر بلندی پر بسایا گیا تھا اور ایک زرخیز علاقے کے وسط میں ایک اہم مقام پر واقع تھا، جس کی مالانہ پیداوار اکتیس لاکھ درہم کی قیمت کی ہوتی تھی۔ ابو دلف نے شہر کو تقریباً دو فرسخ تک پھیلا دیا تھا اور اس میں بختہ ایٹوں کے اچھے بے ہوئے مکانات تھے، دو منڈیان تھیں اور متعدد حمام تھے۔

۸۳۶/۸۳۷ء - ۸۴۰ء میں ابو دلف کی وفات کے بعد اس کی اولاد اس ریاست پر حکمرانی کرتی رہی۔

شروع میں اس کا بیٹا عبدالعزیز تخت پر بیٹھا، جو ۸۴۶/۸۴۷ء میں خلیفہ المعتضد کے تحت الزمرے کا گورنر بھی رہا تھا (م ۸۴۶/۸۴۷ - ۸۴۸ء)۔ پھر یہ تسلسل اس کے پوتے، دلف (م ۸۴۸/۸۴۹ - ۸۵۲ء) احمد (م ۸۵۲/۸۵۳ - ۸۶۳ء) عمر (م ۸۶۳/۸۶۴ - ۸۶۶ء) اور الحارث المعروف بہ ابولیلی تخت حکومت کے مالک ہوتے رہے۔ یہ سب خلیفہ وقت کے وفادار رہے۔

الحارث ۸۶۸/۸۶۹ - ۸۷۲ء کی لڑائی میں ایک حادثے کا شکار ہو کر مرا۔ المسعودی کے بیان کے مطابق، جس گھوڑے پر وہ سوار تھا اس کو گرا دیا گیا اور اس کی اپنی برہنہ تاوار، جو اس کے کندھے پر تھی، اس کے بدن میں گھس گئی جس سے کاری زخم لگا اور وہ مر گیا۔ اس کے مرنے کے ساتھ ہی دلفیوں کی حکومت اور ان کا خاندان دونوں ختم ہو گئے اور ان کی اراضی مرکزی حکومت کے قبضے میں چلی گئی۔

مآخذ: (۱) الطبری، ج ۲: (۲) المسعودی: مروج، بعد اساریہ، بذیل مادہ: (۳) Schwar: Iran، ۵: ۵۴۲ بعد: (۴) Le Strange، ص ۱۹۷ تا ۱۹۸: (۵) ابن خلدون، ترجمہ de Slane، ۲: ۵۰۲ تا ۵۰۳: (۶) Dictionnaire géographique: Meynard، ص ۷۷۸ تا ۷۷۹: (۷) یاقوت، ۲: ۸۳۶: (۸) ابن خردادبہ، ص ۲۴۴: (۹) Zambau، ص ۱۹۹: (۱۰) Die: Ritter، Geheimmisse der Wortkunst (Asrar al-Balaghah)، (Bibl. Isl. در ۱۹۵۹ء، ۱۹: ۳۰۰ (حاشیہ)۔

(J. MARIN)

الدلفین: رک بہ نجوم۔

دلال: (عربی)، "گمانستہ": دلال کے لفظی معنی "رہنما" کے ہیں اور یہ "بیمسار"، "سبیل" کے لیے عربی کا عام لفظ ہے۔ تاج العربی میں "بیمسار"

وہ بیان جو C. H. Becker نے ۱۰۰۱ء میں دیا ہے۔
 بڑے بڑے سودے بھری دفاتر معاملہ میں ملے پائے
 تھے۔ وہاں دلال اس موقع پر جب لین دین فرنگیوں
 سے ہوتا تھا مترجم کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔
 تجارتی معاہدوں میں واضح طور پر ان دلالوں اور ترجمانوں
 کے معاوضے کی صراحت کر دی جاتی تھی (Amari :
Diplomi Arabi، ص ۱۰۶، ۲۰۳)۔ اس قسم کے
 سودوں کے متعلق تفصیلی معلومات کے لیے دیکھیے
Levantehandel: Heyd، ج ۱۔ مغربی بحیرہ روم میں اس
 موضوع کی تفصیلات کے لیے *Traité: de Mas Latrie*
de paix et de commerce برس ۱۸۶۶ء ص ۱۸۹ کا
 مطالعہ کرنا چاہیے۔ آگے چل کر دلالی کے معاملات کو
 مغرب نے اپنی اجارہ داری بنا لیا (قُب Schaubہ :
Handelsgeschichte der romanischen Völker des
Mittelmeergebietes، ص ۷۶)۔

لیکن بلادِ مشرق میں لوگ صرف غیر ملکوں سے
 تجارت کرتے وقت ہی نہیں بلکہ اپنے کاروبار میں بھی
 دلال سے کام لیتے تھے (مثلاً دیکھیے عہد عثمانی میں
 دلالی کے معاملہ کے متعلق تفصیلات در B. Lewis :
Studies in the Ottoman Archives، ۱، در *BSOAS*،
 ۱۹۵۴ء، ۱۶ : ۴۹۵)۔ علاوہ برس دلال اپنی
 ذاتی حیثیت میں بھی تجارت کرتے تھے، مثلاً وہ درانہ
 کبڑے بیچا کرتے تھے (*Description de l'Égypte État*
moderne، ۱۸ : ۲۰۱)۔ دلال کا لفظ اس سداگر کے
 لیے بھی استعمال ہوتا تھا جو گدڑی بازار میں اسلامی کا
 کام انجام دیتا تھا اور اس سے بھی زیادہ اس کا اطلاق
 اس شخص پر ہوتا تھا جو جھوٹے سونے سودوں
 میں دلال کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ ان دلالوں کے
 بارز زندگی کی تفصیلات Lane نے اپنی کتاب *Manners*
and Customs of the modern Egyptians، بار ۱۸۶۰ء
 ۲ : ۱۳ میں بہت اچھی طرح بیان کی ہیں۔ یورپوں
 کے متعلق بھی کہا گیا ہے کہ وہ دلالی کا کام کرتے

کے متعلق یہ لکھا ہے : ”یہ وہ شخص ہے جسے عام
 طور سے ”دلال“ کہتے ہیں؛ یہ شخص خریدار کو بتاتا
 ہے کہ اس کی مطلوبہ چیزیں کہاں دستیاب ہو سکتی
 ہیں اور بائع (بیچنے والے) کو بتاتا ہے کہ اچھے سے
 اچھے دام کس طرح وصول کیے جا سکتے ہیں“۔ عربی
 ماخذ سے دلالوں کی اصل کا بہت کم پتا چلتا ہے جو
 اقتصادی معاملات میں ہمیشہ سے بہت اہمیت رکھتے
 چلے آئے ہیں۔ دلال بوزنطی کے *πωδιστὴς* کا ہم معنی
 تھا۔ چونکہ اس ضمن میں کوئی باقاعدہ مطالعہ
 نہیں ہوا اس لیے جو معلومات ادھر ادھر سے فراہم کی
 گئی ہیں انہیں یہاں بیان کرنے پر اکتفا کیا جاتا
 ہے۔ فقہ کی کتابیں دلالوں کو بددیانتی کے ان طریقوں
 سے محفوظ رکھنے کی نہایت کوشش کرتی ہیں جو کاروبار میں عام
 طور سے رائج ہیں (ابن الحاج : کتاب المدخل، ۳ :
 ۵۶)۔ حقیقت یہ ہے کہ دلال عموماً خریداروں سے وہ
 مال خریدنے کی سفارش کرتے تھے جسے وہ گھنہا سمجھتے
 تھے اور ہمیشہ خریداروں کے مقابلے میں بیچنے والوں
 کی طرفداری کرتے تھے مگر ان کے پیشے کو ایک طرح کی
 سرکاری حیثیت حاصل ہوتی تھی اور اس پیشے کو
 ”دلالہ“ کہتے تھے۔ الدلال کا لفظ قدیم زمانے میں ایک
 لقب کی حیثیت سے استعمال ہوتا تھا (تاج العروس)۔
 فاطمی خلفاء کے عہد میں بعض چیزیں صرف دلالوں کے
 ذریعے فروخت ہو سکتی تھیں (المقدسی، ص ۲۱۳،
 ۶)۔ دو فیصد رخم جو قدیم زمانے سے دستوری ہے
 طور پر دلالوں کو دی جاتی تھی اس پر معاویوں کے
 عہد میں محصول عائد کر دیا گیا۔ اس طرح دلال کا
 ادعا نفع اس سے چھن گیا، چنانچہ اس نے اپنا یہ نقصان
 فاحشوں کے سر ڈال دیا۔ دلال کے اس عمل کے لیے
 ”نصف المشرة“ کی اصطلاح رائج ہو گئی (المغربی :
 خط، ۱ : ۸۹، ص ۵)۔ اس سے تقریباً ملتی جلتی رسم
 شمالی شام میں بھی موجود تھی (قُب Sobernheim، در
Corpus Inscriptionum Arabiarum، ج ۲، عدد ۵۵ اور

معنی عورتوں کے لباس کی تجارت کرنے والی "عورت کے ہیں، جو امیروں کے گھروں میں جا کر زنانہ ملبوسات، کٹرے اور زیورات بیچتی ہے، (انزاس کے کٹرے معنی بھی ہیں)۔

مآخذ : (۱) Le Tournieu : *Les avant le* (۲) *praticment* ۱۹۳۹ء سے ۱۹۶۱ء (۳) *Texte aus Fes* : Kampffmeyer (۴) وہی مصنف : *Weitere Texte aus Fes und Tanger* ص ۷۱۔ (G. S. COLLIN)

دلی : رگ بہ دہلی ۔

الذلو : رگ بہ نجوم ۔

دلوک : عرب مصنفین نے یہ نام اس مقام کو

دیا ہے جو آٹالولی اور شام کی سرحد پر، بھر کرزین کی بالائی وادی میں (گردطاع) Anti-Taurus کے دامن میں عین تاب کے شمال مغرب میں واقع ہے۔ زمانہ قدیم میں اسے Doliche کہتے تھے جو ایک "سامی دیوتا کی، جس کا نام یونانی - رومی عہد میں Zeus Dolichenos ہو گیا، برستش کی وجہ سے مشہور تھا۔ یہاں جرمانہ، نیکولی اور زوغما جانے والے راستے باہم ملتے تھے۔ اسے عیاض بن غانم نے فتح کر لیا تھا اور وہ ان قلعوں میں سے ایک تھا جو اسلام کے قدیم ترین ایام سے بوزنطیوں کے خلاف سرحد کی حفاظت کے کام آتے تھے (قب فسیدہ عبدی بن السکاع، در یاقوت، ۲)۔

۵۵۳ء اور نولدیہ کا ملاحظہ، در ZDMG، ۱۹۰۳ء) : پہلے یہ جندر قسیرین میں شامل تھا اور جب ہارون الرشید نے عواصم [رگ بان] کا ضلع بنانا تو اسے بھی اس میں شامل کر دیا گیا۔ جب حمدانیوں اور بوزنطیوں کے درمیان سیف الدولہ اور ابو فراس کے زمانے میں لڑائیاں ہوئیں تو دلوک نے بھی ان میں حصہ لیا اور بوزنطیوں نے اسے ۳۵۱ھ/۹۶۲ء میں فتح کیا (ابن الاثیر ۸ : ۳۰۳)، یعنی اسی سال جس میں ابو فراس [رگ بان] گرفتار ہوا تھا۔ اس زمانے میں اس قلعے کو ایک اہم کارنگ کے ذریعے باقی

تھیں۔ انہیں دلالہ کہتے تھے اور ان کی رسائی اونچے درجے کے حرموں تک تھی (Lane : کتاب مذکورہ، ۱ : ۲۰۰، ۲۳۹، ۲۴۳)۔ لفظ دلال کے دوسرے مفہیم کے لیے قب ڈوزی : تکملہ، بذیل مادہ۔

۲۔ عہد اسلامی کے المغرب میں دلال خصوصیت کے ساتھ اس درمیانی شخص کو کہتے ہیں جو اجرت یا معاوضہ لے کر لوگوں کی ان چیزوں کو عام نبلام کے ذریعے بیچتا ہے جو وہ اس کے سپرد کر دیں۔ بڑے بڑے شہروں میں دلالوں کی ایک خاص برادری یا جماعت ہوتی ہے، جس کی نگرانی ایک "امین" کرتا ہے اور دلالوں سے خاص ہونے کا وعدہ لیتا ہے۔ ان لوگوں کا تعلق زیادہ تر ان چیزوں کی دلالی سے ہوتا تھا جو مختلف طرح کے کاریگر دوکانداروں کے ہاتھ بیچتے تھے، مثلاً جوئے، مقامی طور پر بنا ہوا کپڑا، قالین، زیور وغیرہ۔ اس کے علاوہ صنعتی خام مال، جیسے کھانیں (خام یا دباحت شدہ)، اون (خام یا تاکا)، اور وہ اشیاء جو بڑی مقدار میں بکتی ہیں، مثلاً تیل، مکھن، شہد، مقامی صابون، حناء، اٹڈے، بھل اور سزیاں، سواری اور بار برداری کے مویشی، گھر کا ساز و سامان، کتابیں اور پرانے کٹرے بھی ان کے کاروبار کی حد میں شامل ہوتے تھے۔ فرانس کے زیر حمایت آنے سے قبل مراکش میں دلال غلاموں اور کنیزوں کی خرید و فروخت کا کام بھی کرتے تھے۔

یہ لفظ فارسی اور ترکی (دلال) میں اور ترکی سے بھر کئی بلقانی زبانوں (جدید یونانی : tellites) میں داخل ہو گیا ہے۔ دلال (غرناطہ میں دلیل) کے علاوہ ہسپانوی عربی میں لفظ سواقی بھی استعمال ہوتا تھا۔

المغرب میں آج کئی دلال کا لفظ برّاج، بمعنی مناد شہر اور "سیمسار" (رگ بان) بمعنی تجارتی، انجنٹ، سے بالکل مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ بڑے بڑے شہروں میں "دلالہ" (مؤنٹ) کے

مُفَرَّجُ الْكَرُوبِ، طبع الشَّيْخ، ۱ : ۱۲۵ : (۱۸) اور شامہ :
کتاب الروضتين، مطبوعہ قاہرہ، ۱ : ۷۹ : (طبع جلی احمد،
قاہرہ ۱۹۵۶ء : ۱/۱ : ۱۹۲ تا ۱۹۳)۔

(D. SOURDEL)

دِلْوِیْنہ : البانیا میں ایک سنجاق بے کا سابق
صدر مقام؛ عہد عثمانیہ میں دِلْوِیْنہ (ترکی اور البانوی
میں اسی طرح ہے؛ یونانی میں Delvinon، Delvino) ولایت
روم ایللی کی ایک سنجاق تھی۔ یہ مقام سطح سمندر سے ۷۷۰
فٹ اونچا اور بحر آئی اولین Ionian کے ساحل سے تقریباً
ساڑھے دس میل دور ہے۔ اس میں صرف ایک ہی بازار
ہے، جو زیتون، لیموں اور انار کے درختوں کے مابین
واقع ہے۔ اس سے اوپر کسی قدیم، شاید یونانی قلعے
کے کھنڈر چھائے ہوئے ہیں۔ ۱۹۸۰ء سے پہلے یہاں
کے باشندوں کی تعداد تقریباً تین ہزار تھی، جن میں سے
دو تہائی مسلمان اور بقیہ قدیم یونانی کلیسا کے پیرو
عیسائی، نیز چند ایک (تقریباً ۳۰) یہودی تھے۔ ان
کی کثیر اوقات موبیشیوں کی پرورش، ماہی گیری، زیتون
کی کاشت اور خوردہ فروشی پر تھی۔ اپنی ہم نام سنجاق
کے اس مرکزی شہر دلوینہ میں متعدد مساجد اور
یونانی کلیسائے قدیم کے گرجا موجود ہیں۔ زمانہ سابق
میں اسے اس آبادی کے حملوں کے خلاف اچھی
طرح سے قلعہ بند کر دیا گیا تھا جو ترکان عثمانی
کے زیر حکومت عموماً غیر مطمئن رہتی تھی۔

دلوینہ، جو پہلے یونان کے قبضے میں تھا، ۱۹۱۳ء
میں البانیا کی نو قائم شدہ ریاست کے اندر آ گیا؛ قُب
Allyrisch-albanische Forschungen : I. von Thullier
سیولخ ولانیوگ ۱۹۱۶ء : ۱ : ۲۶۰ : (دلوینہ در ۱۸۸۳ء)
۲ : ۲۰ : (البانیا کو دیا جاو) : Edith P. Strickley
Stanford : Southern Albania 1912-1923 : ۱۹۲۶ء
بمواضع کثیرہ۔

مآخذ : (۱) Rameli und Buxta geographisch
beschrieben von Mustafa Ben Abdulla Hadschi

بہنچایا جاتا تھا اور یہ میووں کے باغات سے گھرا
ہوا تھا۔ صلیبی جنگوں کے دوران میں یہ (Tulupe) کے
نام سے) الرہا (Edessa) کے صوبے کے ایک اُسقف کی
جائے قیام رہا اور بہت سے سر کے یہاں ہوئے۔ ۵۸۹ء/
۶۱۵ء میں جب نورالدین کی افواج نے عین تاب
[رک بان] کی فتح کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد اس پر
دوبارہ قبضہ کیا تو دلوک کی حیثیت بہت گرچی تھی،
اس کا قلعہ کھنڈر ہو گیا تھا اور یہ ایک معمولی گاؤں
سے زیادہ نہ رہا تھا۔

قدیم نام ابھی تک دلوک گوی Dülükky
کے نام میں محفوظ ہے، جو شام کی -رحہ کے
قریب ایک ترکی گاؤں ہے؛ نیز یہ لیل دلوک کے نام میں
بھی موجود ہے، جو اس مقام کے جنوب میں واقع ہے
اور جہاں اب ایک والی کی یادگار تعمیر کر دی گئی ہے۔

مآخذ : (۱) Études syriennes : Fr. Compti
پیرس ۱۹۱۷ء، ص ۱۷۳ تا ۱۷۷ : (۲) وہی مصنف :
Syria : P. Meilat : ۱۸۹ : ۱۹۲۰ء : (۳)
Jupiter Dalichennu : پیرس ۱۹۶۰ء، ص ۱۵ : (۴)
Topographie historique de la Syrie : R. Dussaud
پیرس ۱۹۲۷ء، ص ۳۷۷ : (۵) Histoire : M. Canard
de la dynastie des Haulandides : الحزائر ۱۹۵۱ء
La Syrie du nord à : Cl. Cahen : (۶) ۲۳۲ :
d'époque des Croisades : پیرس ۱۹۸۰ء، مدد اناریہ
بالخصوص ص ۱۱۵ : (۷) R. Grousset :
Histoire des Croisades : جلدیں، پیرس ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۹ء
مدد اناریہ : (۸) Le Strange : Palestine : ص ۳۶
۳۸۶ تا ۳۸۸ : (۹) البلاذری : فتوح : ص ۱۲۲ :
(۱۰) ابن خردادبہ، ص ۱۵۷ : (۱۱) اُرداہ، ص ۱۵۳ :
(۱۲) الیعقوبی، طبع Wiet، ص ۲۳۰ : (۱۳) باقوت :
۲ : ۵۹ : (۱۴) ابن الشَّجَّہ : الدر المنخب، ص ۲۲۳ :
(۱۵) ابن العديم : تاریخ حلب، طبع S. Dahan، مدد
اناریہ : (۱۶) ابن الاثیر، مدد اناریہ : (۱۷) ابن واسل :

پگڑے جاتے تھے۔

”دلیوں“ کی یورپی کچھ آو ترکوں سے اور کچھ اقوام بٹقان، مثلاً اہل بوسنہ، کرویٹ اور سرب سے کی جاتی تھی۔ شروع میں وہ سرحدی جنگوں اور روم ایل کے (یوگاریگی) (رگ یاں) (بیاریا) کے ذاتی دشمنوں میں نجی حیثیت سے رکھے جاتے تھے اور اپنے غیر معمولی حوصلے اور تہور کی وجہ سے دلی، یعنی سرپرست، کہلاتے تھے۔ امیر المؤمنین حضرت عمرؓ ان کے اوجاقوں (یعنی جمعیتوں) کے سرپرست خیال کیے جاتے تھے۔ ان کا قول ”بازیلان کاپر باشہ“ [لکھا ہوا آٹا ہے سر پر] تھا، یعنی جو قسمت میں لکھا ہے ہو کر رہے گا۔ دلی نسچوں، مجوف ڈھالوں، نیزوں اور زین سے بندھے ہوئے گرزوں (بوز طوغان) سے مسلح ہوتے تھے۔ وہ چرخ یا چیتے ایسے درندوں کی کھالوں کی بڑی بڑی ٹوپیاں پہنتے تھے، جن کے کناروں پر عقاب کے پر لگے ہوتے تھے۔ ان کی ڈھالیں بھی ایسے ہی بڑوں سے مزین ہوتی تھیں۔ ان کا لباس اور گھوڑوں کی بالھر، شبروں، جنتوں اور لوہڑیوں کی کھال کی اور جست پاجامے رچھوں یا بھیڑیوں کی کھال کے بنے ہوئے تھے، جن کا بالوں والا رخ سامنے رکھتے تھے۔ ان کے ہندلیوں تک لاپٹے مہمیزدار جوتوں کے پیچھے نوکدار ہوتے تھے اور ابڑی اونچی ہوتی تھی؛ انہیں سرحدی، یعنی سرحدی، جوتے، کہتے تھے۔ ان کے گھوڑے طاقت اور قوت برداشت کے لیے مشہور تھے۔ وہ ان ببارباہوں یا بیگوں سے مقررہ تنخواہ پاتے تھے جن کی وہ ملازمت کرتے تھے۔ جلال زادہ مصطفیٰ چلبی اپنی کتاب طبقات الممالک فی درجات المسالک میں سمندرہ کے یک یحییٰ پاشا زادہ بالی بے کے دلیوں کا ذکر مہاک Mohacz کی مہم کے سلسلے میں کرتا ہے اور ان کے لباس کا حال بیان کرتا ہے۔ دسویں صدی ہجری / سولہویں صدی عیسوی کے پہلے نصف میں یحییٰ پاشا زادہ بالی بے اور محمد بے اور بوسنہ کے سنجاق ہای غازی خسرو کے

Chalifa، مترجمہ J. Von Hammer، ویانا ۱۸۱۲ء، ص ۱۳۰ (جہاں دلوینہ کے غلط ہجے دیے ہیں)؛ (۲) Die europäische Turkey : M. F. Thielon، ویانا ۱۸۲۸ء، ص ۵۸ بعد؛ (۳) Fr. Babinger، در لائبرک Dalmation und die Adria : Baedeker، ۱۹۲۹ء، ص ۲۵۰؛ میاحوں نے دلوینہ کی شاذ ہی کبھی سیاحت کی اور اس کا حال لکھا، تاہم دیکھیے: (۴) Travels in Northern Greece : W. Leake، ج ۱، لندن ۱۸۳۵ء نیز وہ اہم بیانات جو (۵) سامی : قانسوس الاعلام، استانبول ۱۳۰۸ھ / [۱۸۹۰ء] : ۳ : ۲۱۵۳ میں دلوینہ کے متعلق ۱۸۹۰ء تک کی مفصل معلومات کے ساتھ ملتے ہیں؛ سترھویں صدی عیسوی کے لیے اہم ترین ماخذ (۶) اولیا چلبی : سیاحت نامہ، ۸ : ۶۶۸ بعد، ہے؛ پندرھویں صدی عیسوی کے اواخر میں البانیا کی آبادی نے عثمانیوں کی جو مخالفت کی تھی، اس کے لیے دیکھیے (۷) Fr. Babinger : Das Ende der Arianiten، در Phil.-SOBayer. Ak. (hist. K) ۱۹۹۰ء کراسہ ۵، ص ۱۹ بعد و ماخذ، جو زیادہ تر مخطوطے ہیں؛ دلوینہ طاس کے لیے قس (۸) Albanien. Eine Landeskunde : H. Louis، شٹگارٹ ۱۹۲۷ء، ص ۹ بعد، بالخصوص ۱۰۰ : ۱۰۲؛ زیدرگ بہ آراؤدلیں۔

(FR. BABINGER)

* دِلِہِمَہ : رگ بہ ذوالہِمَہ۔

* دلی : ترکی میں اسم صفت، بمعنی سرپرست، من چلا، شجاع، تندخو وغیرہ۔ سلطنت عثمانیہ میں دلی گھڑ سواروں کا ایک گروہ تھا، جس کی تشکیل اصل میں بٹقان (روم ایل) (رگ یاں) میں نویں صدی ہجری / پندرھویں صدی عیسوی کے اواخر یا دسویں صدی ہجری / سولہویں صدی عیسوی کے اوائل میں ہوئی۔ اگرچہ بعد ازاں سرکاری طور پر ان کے حتمی نام کو ترک کر کے انہیں ”دلیل“ (رہنما) کہنے لگے؛ تاہم عوام میں وہ زمانہ حال تک بدستور اپنے اصل نام ہی سے

سے محروم ہو جانے (یا تو اس والی کی برطرفی کی وجہ سے جس کے وہ ملازم تھے اور یا اپنی موتوفی کے نتیجے میں) تو اپنے لیے کسی نئے سرپرست کی تلاش میں مارے مارے پھرتے اور اس زمانے میں دیہاتوں پر چھاپے مارے رہتے تھے۔ بارہویں صدی ہجری / اٹھارہویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں ان کی ناخوشی کو تاحہ اور قونیہ کے علاقوں میں، رنکڑ ہو گئی تھیں۔ قوجہ باشی نام کا ایک "دلی باشی" ایک بہت بڑے گروہ کا سرخیل ہو گیا اواخر صدی میں وہ کوتاہیہ میں بہت بدنام تھا؛ ادھر ایک اور "دلی باشی" اسمعیل نے ۱۸۰۱ء میں قونیہ کے خطے میں دھشت پھیلا رکھی تھی۔ ۱۸۰۳ء میں (فوج کے) نظام جدید کے خلاف قونیہ میں جو بغاوت رونما ہوئی، اس میں اسمعیل نے باغیوں کی مدد کی اور قونیہ میں داخل ہو کر اس نے قاضی عبدالرحمن پاشا کو قید کر دیا، جو قونیہ کا والی مقرر ہوا تھا۔

دلیوں کا فتنہ و فساد بارہویں صدی ہجری / اٹھارہویں صدی عیسوی کے اواخر اور تیرہویں صدی ہجری / انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں التہاکو پہنچ گیا اور وہ آناطولی کے لوگوں کے لیے سخت مصیبت کا باعث بن گئے۔ یہی وجہ تھی کہ وزیراعظم یوسف ضیاءپاشا اپنی مصر کی مہم سے واپسی پر حلب میں یہ فیصلہ کرنے پر آمادہ ہو گیا کہ دلیوں کو دوبارہ منظم کیا جائے، اس نے ان میں سے بعض کو تو بغداد بھیجا دیا، لیکن ان میں سے جو اس کے خدم و حشم میں تھے، انہیں درخواست کرنے کے بجائے استانبول لے جا کر اشغودر کی چھاؤنی میں رکھ لیا۔ روم اہلی کے فرقہ پرور گرجی عشاق پاشا کے کثیر التعداد دلیوں کو بھی استانبول لایا گیا اور انہیں داؤد پاشا کی چھاؤنی میں ٹھہرایا گیا۔ بعد ازاں استانبول میں تمام دلیوں کو، جن کے دو سو دسے ("ہوق") تھے، بغداد بھیج دیا گیا۔

دلیوں کے لشکر بلقان میں مشہور تھے۔ خسرو بیگ کے پاس دیگر افواج کے علاوہ دس ہزار دلی تھے۔

دلیوں کی سوار فوج کی تنظیم بعد میں آناطولی میں پھیل گئی، جہاں دلی، وزیروں اور بیلربایوں کے خدم و حشم میں شمار ہوتے تھے۔ دلیوں کا لباس بارہویں صدی ہجری / اٹھارہویں صدی عیسوی میں تبدیل ہو گیا۔ اس زمانے میں وہ نلکی نما لمبی ٹوئیاں، جو کوئی چھینس انچ لمبی اور سیاہ قراقلی کی بنی ہوئی تھیں، پہنے نظر آتے تھے، ان کے ارد گرد پکڑی بندھی ہوتی تھی۔

یجاس سے ساٹھ تک دلیوں کا ایک فوجی دستہ بتاتا تھا (ایک "بیرق"، یعنی جھنڈے تلے)۔ اس قسم کے چند دستوں کی قیادت "دلی باشی" کرتا تھا۔ نئے بھرتی ہونے والے جوان کو آغا [رک ہاں] کے خدم و حشم میں شامل کر دیا جاتا تھا؛ اوجاق (جمعیت) کے طور طریق سیکھ لینے اور اپنی قابلیت ثابت کرنے کے بعد وہ دین اور ملک کی خدمت کرنے اور لڑائی میں ثابت قدم رہنے کی قسم کھاتا تھا اس نعرے کے اختتام پر، جس میں دعائیں بھی مانگی جاتی تھیں، اسے "آغا چراغی" (آغا کا شاگرد) بتایا جاتا اور دلی کی کلام باقاعدہ طور پر اس کے سر پر رکھی جاتی تھی۔ اپنی قسم کو توڑ دینے، "اوجاق" کے قواعد پر پوری طرح عمل نہ کر سکنے یا میدان جنگ چھوڑ کر بھاگ جانے والے دلی کو خارج کر دیا جاتا، اور اس سے کلام چھین لی جاتی تھی۔ گیارہویں صدی ہجری / سترہویں صدی عیسوی کے وسط میں بمول Rycall ایک دلی کا روزنامہ بارہ سے ہندہ آفچہ تک ہوتا تھا۔ Marsigli، جو کچھ بعد کا مصنف ہے، کہتا ہے کہ دلیوں کو صرف اس وقت تنخواہ ملتی تھی جب وہ لڑائی پر ہوتے تھے۔

دسویں صدی ہجری / سولہویں صدی عیسوی میں دلیوں نے حکومت کی خوب خدمات انجام دیں، لیکن بعد میں دوسری فوجی جمعیتوں کی طرح ان میں بھی نظام و ضبط قائم نہ رہا۔ دلی جب اپنے سرپرست

دبروجہ کے ، سطح اور بے شجر علاقے سے نمایاں طور پر متمیز کرتی ہے ۔

دریائے ڈینیوب کے بائیں کنارے کا علاقہ بھی ، جہاں افلاق (Wallachia) کے میدان میں دریائے آوتہ Aluta اور ویدہ Vede کے دہانوں کے درمیان ضلع تلہاورمن Teleorman واقع ہے ، اسی نام سے موسوم ہو چکا ہے (Einige Bemerkungen über die Überreste der petchenegischen und Kumanen, sowie die Völkerschaften der sogenannten Gagauzi und Sarguci im heutigen Bulgarien Sitzungsber d. K. böhmischen Gesellschaft der Wiss. Philoz.-gesch. Klasse ۱۸۸۹ء ص ۱۱ - بقول Jireček اس نام کا اطلاق پہلے اس تمام بھاری جنگل والے علاقے پر ہوتا تھا جو جنوبی مالڈوویا Maldivia اور مشرقی افلاق میں کوهستان کار پنہٹین Carpathians کے سامنے پھیلا ہوا ہے ۔ Tomaschek لکھتا ہے کہ بارہویں صدی کے ایک ہونٹھی مصنف John Kinnamos کے ہاں ایک مقام کا بگڑا ہوا نام ملتا ہے ، جو یہی تلہاورمن ہے ۔ اگر اس کی رائے درست ہے تو پھر دلی اورمان شمالی ترکوں سے پہلے کا نام ہوگا ، جو شمالی ترکوں کی کسی قدیم تر نقل مکانی کے ذریعے آتا ہے ۔

دلی اورمان میں صرف ایک نسلی نسل پہلے تک ترکوں کی آبادی کا غلبہ تھا ، لیکن انیسویں صدی کے وسط سے بلغاریا کے آبادکار بتدریج بڑھتے جا رہے ہیں ۔ بائیں ہند ترک اب بھی آبادی کا ایک قابل اعتنا حصہ ہیں ، چنانچہ ترکی زبان ہر جگہ سنتے میں آتی ہے اور یہی حال نوزوک اور گراووی صوبوں کا ہے جو اس کے متصل جنوب میں ہیں ۔

دلی اورمان عہد عثمانی میں ہر قسم کے سیاسی اور مذہبی ستارہ گزینوں کا مہلجا تھا ، لہذا اس میں ابھی تک طرح طرح کے فرقہ پرستی کے آثار ملتے ہیں ۔ یہی جگہ تھی

۱۸۲۹ء کی جنگ روس و ترکیہ کے بعد دو ہزار دلی ، جن کی قیادت اٹھارہ دلی باشیوں اور ایک رابطہ باشی (مسلح گروہ کا سرخیل) کے ہاتھ میں تھی ، آناطولی میں داخل ہو گئے اور قونیہ کے خطے میں جمع ہو کر انہوں نے پھر رہزی اختیار کرنے کی کوشش کی : مگر سلطان محمود ثانی ، جو اپنی اصلاحات کو عملی جامہ پہنانے کا عزم کر چکا تھا ، ان کا خاتمہ کرنے میں کامیاب ہو گیا ۔ ان کے کچھ بقیہ السیف انزاد مصر اور شام کی طرف بھاگ گئے : جو پیچھے رہ گئے اور جنہوں نے ملک میں بسنے کے احکام کی خلاف ورزی کی ، انہیں قرمان کے والی اسد پاشا نے شکست دی ۔ (I. II. UZUNGARSILI)

دلی اورمان : ایک ضلع کا تاریخی نام ، جس کا بیشتر حصہ شمال مشرق بلغاریا اور بقیہ رومانیہ میں ہے ؛ لیکن یہ چونکہ اصطلاح عوامی ہے ، اس لیے اس کے صحیح حدود نہیں بتائے جاسکتے ۔ اس کا اطلاق عموماً ایک مثلث نما علاقے پر ہوتا ہے ، جس کا نقطہ راس تو شہر رستجک ہے اور جس کے دونوں بازو دریائے ڈینیوب اور رستجک ۔ وارنہ ریلوے سے جلتے ہیں ۔ قاعدے کا خط قدرے غیر متعین ہے اور بحرامود کے ساحل سے کسی قدر فاصلے پر چلا گیا ہے ۔ شمال مشرق میں دلی اورمان کی حد بندی دبروجہ سے اور جنوب میں توزلوک Tuzluk اور گراووی Gerlovo کے بلغاری صوبوں سے ہوتی ہے ۔ دلی اورمان میں اہم ترین مقامات بلغاریا کے علاقے میں بال بونار Balbunar ، کمانار Kemandar اور رازگراڈ Razgrad ہیں اور رومانیہ میں اکادینار Akkadinar اور کورت بونار Kurtbunar کے شہر ہیں ۔

دلی اورمان کا نام ترکی الاصلی ہے اور اس کے معنی خودرو جنگل ، قدیم جنگل کے سے ہیں ۔ یہ علاقہ واقعی کسی زمانے میں قدیم جنگل سے ڈھکا ہوا تھا ، جس کے خاصے بڑے قطعے ابھی تک باقی ہیں ۔ جنگلوں کا ہونا اس ضلع کی وہ خصوصیت ہے جو اسے

لائیبرک ۶۸۸۹ (دورے اشاریوں کے ساتھ) : C. Jireček (۳)
 Das Fürstenthum Bulgarien : ویٹا - لائیبرک
 ۶۸۹۱ (اشارہ جات) : W. Stubenrauch (۳) : Berliner Geog.
 graphische Arbeiten : (مکمل حوالوں کے ساتھ) : آبادی کے مسئلے پر : (۳) : L. Miletič : Staroto
 bulgarsko naselenije v ševcaizložna Bilgaraija
 Zedelnarskite : S.S. Bobčev (۵) : ۱۹۰۲ء
 Turci i za Kijilhasite : در Shornik na Bilgarskata
 Akademijska Nauka : ج ۱۲ : ۱۹۰۹ء - زبان کے
 مسئلے پر : D. G. Gadžanov (۶) : دو مختصر تبصرے
 در : Anzeiger der philos.-hist. Kl. d. k. Akad. d. Wiss. in Wien
 ۱۹۱۲ء : T. Kowalski (۷) : Compte rendu de
 l'excursion dialectologique en Dobroudja, faite du
 10 septembre au 1^{er} octobre 1937 : در Bull. Intern.
 Acad. Polon. Philolog. : ۱۹۳۸ء : ۳/۱ : ۷ تا ۱۶
 (۸) وحی مصنف : Les éléments ethniques turcs de
 la Dobroudja : در RO : ج ۱۳ : ۱۹۳۹ء : ص ۶۶ تا ۸۰
 Türk Dili : I. Eckmann (۹) : Ruzgard Türk ağızı
 ve Edebiyatı hakkında araştırmalar : ۱۹۵۳ء : ص ۲۵
 (۱۰) : P. Wittek : Les gens de Kaykıs : در RO : ج ۱۷ : ۱۹۵۳ء
 : ۲ تا ۲۵ : J. Németh (۱۱) : Zur Einteilung der
 türkischen Mundarten Bulgariens : صوفیہ ۱۹۵۶ء
 Die anatolische und rum. : A. Caferoğlu (۱۲) : Philologie
 Turcicae Funda : ج ۱ : ۱۹۵۹ء : ص ۲۳۹ تا ۲۶۰ : (۱۳)
 : G. Doerfer : Das Gagausische : کتاب مذکور : ص ۲۶
 : I. Conea (۱۴) : Contribution : I. Donat : à l'étude de la toponymie péchelngu-comune de la
 Plaine Roumaine du Bas-Danube : در Contraintions

جہاں سے شیخ بدرالدین نے ۸۱۹ھ / ۱۴۱۶ء میں اپنی
 تبلیغی سرگرمیوں کا آغاز کیا تھا (Schejeh : F. Babinger)
 Bedr ed-Din, der Sohn des Richters von Simnaw : در
 Isl. : ج ۱۹ : ۱۹۲۱ء : ص ۶۰)۔ کئی ادوار میں مختلف
 تعلیمات نے، جو علم طور پر شیعیت سے متاثر نہیں،
 یہاں پناہ لی ہے۔ دلی اورمان میں (حضرت) علی رضی
 اللہ عنہ کے پیروں کے خاصے بڑے باقی ماندہ گروہ آج تک
 موجود ہیں، جو یہاں غامدی یا قزلباش کہلاتے
 ہیں۔ بظاہر ان کا صدر مقام کمانار (کمال کی جمع،
 جس میں دونوں لادوں کی آوازوں کو ایک خاص
 طریقے پر مختلف کر دیا گیا ہے) کا چھوٹا سا شہر
 تھا، جس کے قرب و جوار میں بکناشی ولی دیر بابا کی
 مشہور، مگر اب غیر آباد خانقاہ ہے (F. Babinger :
 Das Bektaschi-Kloster Demir Baba : MSSA :
 ج ۳۳ : ۱۹۱۵ء : Babinger میری توجہ اولیا چلبی :
 سیاحت نامہ : ۵ : ۷۵ کی طرف مبذول کرتا ہے جہاں
 ایک جگہ دیر بابا کو حاجی بکناش کا مريد بتایا گیا ہے)۔
 شمن Shumen واقع شمال مشرقی بلغاریہ کے بکناشی شاعر
 دردلی کاتب کیاڑھوں صدی ہجری / سترھویں صدی
 عیسوی کی اس خانقاہ کی تہذیب میں ایک چھوٹی سی نظم
 ”نفس“ ہے (سعدالدین نرہت : بکناشی شاعر نرہت،
 استانبول : ۱۹۹۳ء : ص ۵۵)۔

شہر کی ایک نمایاں خصوصیت یہاں لوگوں کی
 کشتیاں ہیں جو بظاہر بکناش ولیوں کی پرستش سے
 متعلق ہیں اور دلی اورمان کی ترکی آبادی کی دل پسند
 تفریح کا سامان ہیں۔ یہ علاقہ جس کے متعلق
 تحقیقی و تفتیشی بہت کم ہوئی ہے، بلاشبہ نہ صرف
 ترکوں کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے بلکہ
 اسلامیات کے طلبہ کے لیے بھی تحقیق کا بہت دلچسپ
 میدان ہے۔

مآخذ : متن میں مندرجہ حوالوں کے علاوہ

(۱) Donau-Bulgarien und der Balkan : F. Karitz : ج ۳

Onomastiques, بخارست ۱۹۵۸ء، ص ۱۳۹ تا ۱۶۷.
J. REYCHMANN - T. KOWALSKI اور
(A. ZAJACZKOWSKI)

* دلیل : رک بہ قیاس ۔

* دَلِیم : عراق کا ایک بڑا سنی قبیلہ جو دریاے فرات پر فلوجہ کے بالکل نیچے سے لے کر انقائم تک آباد ہے ۔ ان لوگوں کا دعویٰ ہے کہ پانچ صدی پہلے ان کے آباؤ اجداد کا اصلی وطن دَلِیمات تھا، جو نجد کے علاقے میں تھا، لیکن یہ محض اساطیری خیال ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ قبیلہ مخلوط قبیلوں کے ہمت سے مختلف حصوں اور بے قبیلہ کاشتکاروں کا ایک مجموعہ ہے ؛ اس کے کچھ افراد الجزیرہ میں خانہ بدوش زندگی بسر کرتے ہیں اور دروا کی طرف فقط اپریل سے ستمبر تک رہنے کے لیے آتے ہیں ۔ ان کی بڑی اکثریت عراقی کسانوں کے غریبانہ معیار زندگی کے مطابق زمین کثرت کر کے زندگی بسر کرتی ہے ۔ یہ لوگ فرات سے پانی بھر بھر کر زمین کی آبیاری کرتے ہیں یا پھر اس سے جاری کی ہوئی نہروں سے (جن میں سے مقلایہ سب سے مشہور ہے) آبیاری کرتے ہیں اور اپنی بھڑوں اور ٹونٹوں کے ربوڑ اپنے ہی قبیلے کی شاخوں کے چرواہوں کے حوالے کر دیتے ہیں ۔ یہ گروہ، ویشیوں کی برداشت کے ماہر ہوتے ہیں، عانہ، راوہ، حدیثہ اور فلوجہ کی آبادیوں میں ایک جگہ بسنے والے دیلم کے بعض عناصر بھی شامل ہیں ۔ دَلِیم قبیلہ خود بہت سے حصوں اور شاخوں میں بٹا ہوا ہے جن کے اہم روابط کا دار و مدار ان کے سربرآوردہ شیوخ کی شخصیت اور ان کے آپس کے میل ملاپ پر ہے ۔ دَلِیم قبیلے کے بہت سے افراد اس تیل کمپنی میں کام کرتے ہیں جس کے تیل کے ٹیل ان کے علاقے سے، حدیثہ کے قرب و جوار میں سے ہو کر گزرتے ہیں اور کچھ ہیٹ کے زفت (bitumen) کے مخازن میں کام سے لگے ہوئے ہیں ۔ اس قبیلے کا الجزیرہ کے شمر سے پرانا عناد اور صحرائے شام کے

عنزہ سے قدیم دوستانہ روایت مشہور چلا آتا ہے ؛ تاہم قبائلی فساد ۱۳۳۰ھ / ۱۹۲۱ء سے بہت کم اور شاذ و نادر ہی ہوا ہے اور دَلِیم اپنے دو یا زیادہ نامور شیوخ کی سعی مشکور کی بدولت (بالخصوص علی سلیمانی)، عراق کے بڑے بڑے قبیلوں کے بہتر اور خوش اطوار قبائل میں سے ایک ہے ۔ ترکوں کے عہد میں بغداد تاحاب کی شاہراہ میں مسافروں پر ان کی جبرہ دستیوں کی وجہ سے حکومت کو کچھ تعزیری اقدامات کرنا پڑے ؛ بالخصوص ۱۹۱۰ء میں ناظم یاشا کی جانب سے، اور اسی وجہ سے فوجی چوکیوں کا اور خانات (سراؤں) کا ایک سلسلہ بارہویں صدی ہجری / انیسویں صدی عیسوی میں قائم کیا گیا ۔ اس قبیلے کے علاقے پر ۱۹۱۷ء میں برطانیہ کا اقتدار قائم ہوا اور ۱۹۲۰ء کے پریشان کن سالی میں جو باغیانہ تحریک اٹھی وہ اس قبیلے کے صرف ایک حصے تک ہی محدود رہی، اس وقت سے مستقل آبادکاری اور خوش حالی میں ترقی ہوئی ہے ۔

عراق کے ”دَلِیم لواء“ (صوبے) کا نام اسی قبیلے کے نام پر رکھا گیا ہے (اس کی آبادی ۱۹۴۷ء میں ۱۹۳۰۰۰ تھی) جس میں عانہ، فلوجہ اور زمادی کے ”قضاء“ شامل ہیں اور زمادی اس کا صدر مقام ہے ۔
(S. H. LONGRIGG)

* دَمَاوَنَد : شمالی ایران کے سرحدی پہاڑوں کی

سب سے اونچی چوٹی [دیکھیے البرز] جو ۳۶ درجے عرض بلد شمالی سے کسی قدر نیچے کی طرف اور تہران سے تقریباً پچاس میل شمال مشرق کی جانب واقع ہے ۔ ڈی مارگن de Morgan کے بیان کے مطابق یہ پہاڑ رہنہ Rehna کی سطح مرتفع سے اٹھتا ہے اور ۱۳۰۰ فٹ کی بلندی تک چلا جاتا ہے ۔ اس کی بلندی کے متعلق لوگوں کے اندازے الگ الگ ہیں ۔ ٹامسن Thomson کے نزدیک اس کی بلندی ۲۱۰۰ فٹ ہے (جو یقیناً حد سے زیادہ ہے)، ڈی مارگن کا اندازہ ۲۰۲۶ فٹ ہے ۔ ہوٹم شندلر Houtum Schindler کے اندازے کے مطابق یہ بلندی ۱۹۶۶ فٹ ہے ۔ سون ہیڈن

Sven Hedin کا تیسرا ۱۸۱۸۷ فٹ ہے اور Stieler کی Handatlas (۱۹۱۰ء) کے سب سے آخری ایڈیشن میں اس کی بلندی ۱۸۸۳ فٹ بتائی گئی ہے۔ اس کی چوٹی جو ہمیشہ برف سے ڈھکی اور تقریباً ہر وقت بادلوں میں گھری رہتی ہے، کئی دن کی مسافت کے فاصلے سے نظر آتی ہے، جیسا کہ باتوت نے اپنے مشاہدے کی رو سے لکھا ہے۔ صاف موسم میں جب مطلع روشن ہو تو ملگونوف Melgunov کے بیان کے مطابق یہ بحر خزر سے بھی نظر آتی ہے، جو اس سے ۲۶۰ ورست (۱۶۲ میل) سے زیادہ فاصلے پر ہے۔ اس سلسلے میں تزیوینی کے بیانات مبالغہ آہیز ہیں لیکن یہ بات یقینی ہے کہ دماوند کی اونچی چوٹیوں کا سلسلہ، ازندران (زمانہ وسطیٰ کا طبرستان) کی تمام ساحلی زمینوں پر چھایا ہوا ہے۔

ایران کی قدیم تاریخ میں دماوند پیش دادی اور کیانی حکمرانوں کی افسانوی تاریخ کے ساتھ منسلک ہے۔ آج تک بھی مازندران کے لوگ ان مقامات کی نشاندہی کرتے ہیں جہاں جشید، فریدون، سام، زال، رستم اور دوسرے مشہور سوراؤں نے، جنہیں شاہنامہ نے جاودانی بنا دیا ہے، اپنے حیرت انگیز کارنامے دکھائے۔ دماوند ہی کو مشہور افسانوی طائر سیمرغ کا مسکن بتایا گیا ہے۔ زمانہ قدیم ہی سے ظالم بادشاہ ضحاک (قدیم ایرانی میں دھاکا - نیز بیوراسپ) کا قید خانہ بھی یہیں بتایا جاتا ہے۔ روایات میں موجود ہے کہ فریدون (قدیم ایرانی میں Qaetana) نے ضحاک کو اس پہاڑ کی چوٹی پر ایک غار میں بند کر دیا تھا۔ مقامی عوام کا اعتقاد ہے کہ وہ ظالم بادشاہ آج تک زندہ ہے اور اس غار میں رہتا ہے۔ اس پہاڑ کے اندر سے کبھی کبھی جو بھاری آوازیں سنائی دیتی ہیں، ان کے خیال میں وہ اسی کے کراہنے کی آوازیں ہیں اور وہ بخارات اور دھواں جو پہاڑ کی سطح کی درزوں اور چشموں سے نکلنا دکھائی دیتا ہے اس کے سانس ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ افواہیں دماوند کی آتش نشانی خصوصیتوں کی بنا پر

عام ہوتی ہیں۔ ایک اور کہانی میں ہے کہ صخر نامی دیو بھی، جسے سلیمان علیہ السلام نے قید کیا تھا، کوہ دماوند میں بند ہے۔ چونکہ ایران میں دماوند ہی سب سے اونچا پہاڑ ہے اس لیے ایرانیوں کا خیال ہے کہ شینہ نوح طوفان کے بعد یہاں آ کر ٹھہرا تھا۔ دماوند سے متعلق بے شمار افسانوں کے سلسلے میں دیکھئے باقوت، ۲: ۶۰۶، ۶۱۰؛ قزوینی: Melgunov، ص ۲۲؛ بعد: Grünbaum در ZDMG، ۳۱: ۳۳۸ تا ۳۳۹۔

اس سے پہلے دماوند کی ڈھلانوں پر اور اس کی وادی میں بہت سے مستحکم اور قلعہ بند مقامات تھے۔ آج کل سب سے اہم مقام ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جسے اس پہاڑ کے نام پر دماوند کہتے ہیں۔ یہ قصبہ پہاڑ کی جنوب مغربی سمت میں بڑھی ہوئی شاخوں پر واقع ہے۔

دماوند کا نام فارسی اور عربی ماخذ میں مختلف شکلوں میں آتا ہے۔ فارسی میں دماوند (Vallers)؛ Lex. Persico-Lat.، ۱: ۹۰۷ (ب)۔ دماوند (کتاب مذکور ۹۰۷ ب)، دماوند (وہی کتاب ۹۵۵ ب) اور دیووند (کتاب مذکور ۹۵۶ ب)؛ عربی میں دماوند، دماوند، دماوند۔ اس نام کی قدیم ترین شکل دماوند معلوم ہوتی ہے اور آج کل کی معمولی بول چال میں دماوند (دماوند) مستعمل ہے۔ اس نام کے لکھنے کے مختلف طریقوں کے متعلق دیکھئے Hist. des Mongols: Quatremère، ص ۲۰۰؛ بعد: ابوالقداہ، طبع Hist. Antei، Fleischer، ۱۸۸۳ء، ص ۲۱۳؛ بعد: ۲۳۲۔ Islamic، لائپزگ ۱۸۸۳ء، ص ۲۱۳؛ بعد: ۲۳۲۔ Armanische Grammatik: II. Hübschmann، لائپزگ ۱۸۹۷ء، ص ۱۷۷۔

مآخذ: (۱) BGA، مواضع کثیرہ: (۲) باقوت، ۲: ۶۰۶، ۵۸۵، ۵۸۳؛ بعد: (۳) القزوینی: Kosmographie، طبع ویسٹفیلڈ، ۱: ۱۵۸، ۱۸۲؛ بعد: (۴) مرآۃ الأطلاع، طبع Juynboll، ۱: ۳۸۸، ۳۸۹ ج ۵: ۱۲۹؛ بعد: (۵) Hist. des Mongols: Quatremère، ۲: ۱۸۸۳، ۱۸۸۲۔

(M. STRACK)

ج ۲، بہ ذیل مادۃ دماوند :
 دیمتوفہ : رگ بہ دیمتوفہ :
 الدرداشی : [اند، ورتاشی]، احمد، بارہویں
 صدی ہجری / اٹھارہویں صدی عیسوی کا ایک
 مصری مؤرخ۔ اس کی زندگی کے متعلق اس سے
 زیادہ کچھ معلوم نہیں کہ وہ قاہرہ میں دستہ
 (رجمنٹ) عزبان میں کتخدا کے عہدے پر مامور
 تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ روزنامچی حسن افندی
 الدرداشی کا رشتے دار ہو، جو گیارہویں صدی ہجری /
 سترہویں صدی عیسوی کے اوائل میں مشہور ہوا اور
 جس کے کارناموں کا اسے پورا علم تھا۔ اس کی تاریخی
 تصنیف الذرۃ المصنعة فی اخبار الکائنات، ۱۰۹۹ھ/۱۶۸۸ء
 تا ۱۱۶۹ھ/۱۷۵۵ء کے احوال پر مشتمل ہے۔ اس سے
 پتا چلتا ہے کہ وہ عربی نہیں جانتا تھا اس لیے کہ اس
 کی عبارتوں کا مطلب کہیں تو الجھ جاتا ہے اور کہیں
 مبہم ہو جاتا ہے۔ اس کے باوجود کتاب اول تو اس
 نے قابل قدر ہے کہ اس میں قاہرہ کے حالات کا مفصل
 بیان موجود ہے اور دوسرے اس لیے کہ ترکی عہد کے
 مصر کے حالات پر یہ واحد کتاب ہے جو ایک اعلیٰ
 فوجی افسر نے لکھی ہے۔ برٹش میوزیم اور بوڈلین
 کے مخطوطات و قضاہات اور عبارات کے لحاظ سے ایک
 دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ برٹش میوزیم کا مخطوطہ
 اس لحاظ سے منفرد حیثیت رکھتا ہے کہ اس میں مصنف کا
 نام درج ہے۔ الذرۃ کا کوئی نسخہ الیہیاتی کی عجائب الآثار
 کا مآخذ معلوم ہوتا ہے؛ مثلاً ذوالفقارہ اور قاسمیہ
 فرہوں کی ابتدا کی دوسری ذہانی جو الیہیاتی کی کتاب
 میں دی ہے وہ نور گیارہویں صدی ہجری کے اوائل کے
 سنجاق بیگوں Sandjakbegs کی جو فہرست اس میں دی گئی
 ہے الذرۃ سے بہت قریبی مشابہت رکھتی ہے (الیہیاتی :
 ۲۳ - ۲۴ : NM. Or. عدد ۱۰۷۳، ورق ۵، الف
 تا ۶ ب، مخطوطہ بوڈلین، Bruce، عدد ۳۴، ورق

ص ۲۰۰، ۲۰۱ : Le Strange (۶) : ۳۷۱ : K. Ritter :
 Erdkunde : ۸ : ۵۰۲ تا ۵۰۵ : ۵۵۰ تا ۵۵۰ : (۸)
 Iranische Altertumskunde : Fr. Spiegel
 Travels in var : W. Ouseley (۹) : ۱۷۸۷ :
 countries of the East : لندن ۱۸۱۹ء بعد ۳ : ۳۲۶ تا
 ۳۳۵ : W. Taylor Thomson (۱۰) : JRGeog. S
 Hommaire de (۱۱) : بعد ۱۰۹ : ۱۸۳۸ء : ج ۸
 Voy. en Turquie et en Perse : Hell : پیرس ۱۸۵۵ء بعد
 جس کے ساتھ Historical Atlas لگی ہوئی ہے، لوحہ ۷۷
 الف : Thi. Kotschy (۱۲) : Petermann's Geogr.
 Mitteil. : ۱۸۵۹ء : ص ۳۹ بعد : (۱۳) : J. E. Polak :
 Persien : لاہرک، ۱۸۶۵ء : ۱۲ : ۱۳ : ۱۵ : ۱۶ : ج ۲ :
 Das süd. : G. Melgunof (۱۴) : ۱۸۶۱ : ۱۷ :
 Ufer des Kasp. Meeres : لاہرک، ۱۸۶۸ء : ص ۲۱ تا
 ۲۷ : ۲۸ : ۲۹ : ۳۰ : ۳۱ : ۳۲ : ۳۳ : ۳۴ : ۳۵ : ۳۶ :
 Das Lärthol bei Teherân u. der Demâwend
 N.F. Mitteil. der Geog. Ges. in Wien : ج ۱۹ : ۱۸۷۶ء :
 G. Napier (۱۶) : ۱۸۷۲ء : ۱۷ : ۱۸ : ۱۹ : ۲۰ : ۲۱ :
 Journal : ۱۸۷۷ء : ص ۲۶ تا ۲۷ : اور در Peter
 mann's Geogr. Mitteil. : ۱۸۷۷ء : ص ۳۳ : (۱۷)
 Der Vulkan Demâwend in Persien : Tietze
 Jahrb. der k. k. geolog. Reichsanst. : ویانا ۱۸۷۷ء :
 Mission scientif. en : de Morgan (۱۸) : ۲۷ :
 Perse : Etud. géograph. : ج ۱ : پیرس ۱۸۹۰ء : ص ۱۰۵ :
 مع مناظر برجستہ : (۱۹) : Sven Hedin :
 Verh. der Ges. f. Erdkunde (برلن) :
 ZG Erdk. Bief. : در Sarre (۲۰) : ۳۲۲ : ۳۰ : ۳۱ : ۳۲ :
 ۳۳ : ۳۴ : ۳۵ : ۳۶ : ۳۷ : ۳۸ : ۳۹ : ۴۰ : ۴۱ : ۴۲ :
 مسعود میمان : جغرافیائی
 مفصل ایران، نهران، ۱۳۱۰ھ/۱۹۳۲ء، اشارہ بہ ذیل مادۃ،
 فردوسی : شاہنامہ، طبع اور ترجمہ : Molt
 ۱۸۷۸ء : ج ۷ اشارہ بہ ذیل مادۃ دماوند، خجاک : (۲۳)
 Croyances et coutumes persans : H. Massé : اشارہ

۲ الف تا (۳ الف)۔

(P. M. Holt)

* **دِمَشْقُ** : دِمَشْقُ الشَّامِ یا مَحْضُ الشَّامِ (لاطینی : Damascus، فرانسیسی : Damas)، شام کا سب سے بڑا شہر [اور الجمهوریة العربیة السُّوریة کا دارالحکومت]، جو ۳۶ درجے ۸ دقیقے طول بلد مشرقی اور ۳۳ درجے ۳۰ دقیقے عرض بلد شمالی کے درمیان واقع ہے، یعنی قریب قریب اسی عرض بلد پر جس پر بغداد اور فاس ہیں۔ یہ سطح سمندر سے تقریباً سات سو میٹر بلند، صحرا کی حد پر اور لبنان شرقیہ کے سلسلہ کوہ کی ایک مشرق پہاڑی جَبَل قاسیوں کے دامن میں آباد ہے؛ مشرق اور شمال مشرق میں دریائے فرات تک ایک نیم صحرائی میدان پھیلا ہوا ہے، جو جنوب کی جانب عرب میں مدغم ہو جاتا ہے۔

شہر بحیرہ روم سے دم و بیش ایک سو کیاوہتر کے فاصلے پر جبل لبنان و جبل شرق (لبنان) کے عقب میں ہے۔ یہ پہاڑ دہری سد کا کام دیتے ہیں اور تین ہزار میٹر تک بلند ہیں، لہذا سمندر کی ہوائیں اور بادل اس تک نہیں پہنچتے۔ ابتداءً یہی گمان گزرتا ہے کہ اس کا تعلق صحرا سے ہوگا۔ اس کے موسموں میں بڑا فرق پایا جاتا ہے۔ موسم سرما بہت مختصر ہوتا ہے، جس کے دوران میں کبھی کبھار برف پڑ جاتی ہے۔ بارش دسمبر، جنوری اور فروری کے مہینوں میں ہوتی ہے، جن میں سے مؤخر الذکر مہینہ بالخصوص مرطوب ہے؛ لیکن یہاں کی بارشوں کو کسی طرح بھی وافر نہیں کہا جاسکتا (حقیقت یہ ہے کہ یہاں اڑھائی سو سے تین سو ملی میٹر تک بارش ہوتی ہے اور اس کے مقابلے میں بیروت [رک بان] میں ۸۵۰ سے ۹۳۰ ملی میٹر تک) موسم بہار مختصر ہوتا ہے، دفعۃً آتا ہے اور اواخر مارچ اور اوائل اپریل میں محض چند ہفتوں تک رہتا ہے۔ اس کے بعد شدید گرمی آ جاتی ہے۔ مئی سے نومبر تک موسم قطعاً خشک رہتا ہے۔ روزانہ درجہ حرارت سائے

میں ۳۵ درجے سنٹی گریڈ سے بڑھ جاتا ہے۔ آنکھیں چندہما دینے والی روشنی آدمی کو سائے کی تلاش پر مجبور کر دیتی ہے۔ نومبر کے آخر میں پہلی موسلا دھار بارش پتوں پر جمی ہوتی ریت دھو ڈالتی ہے۔ یہ یہاں کا موسم خزاں ہے، مگر اس نیم صحرائی قسم کی آب و ہوا میں خلاف توقع نباتات خاصی افراط سے ہوتی ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اتنے عرصے تک ہوتی ہیں کہ جانوروں اور انسانوں کی ضرورت پوری ہو جائے۔ یہ وہ قطعہ ہے جہاں اس علاقے کا واحد دائمی چشمہ بڑی [رک بان] پہاڑ کے پہلو سے نکل کر، صحرا میں جذب ہو جانے سے پیشتر، میدان میں داخل ہوتا ہے۔ اس چشمے کے پانی کو کام میں لانے کے لیے بڑی ذہانت سے آبپاشی کا ایک مصنوعی نظام تیار کیا گیا ہے۔ اس طرح اپنی ضروریات کے لیے ایک موزوں گوشہ زمین گویا صحرا سے لے لیا گیا ہے؛ یہی نہیں بلکہ اسے ایشیا کے اس حصے کا زرخیز ترین علاقہ القوطة [رک بان] بنا دیا گیا ہے، جسے مسلمانوں کی روایات میں تین ارضی ہشتوں میں شمار کیا جاتا ہے (دوسری دو ہشتیں سمرقند اور البُلطہ بتائی جاتی ہیں، ابن عساکر : تاریخ، ص ۱۶۹)۔ یہی وجہ ہے کہ صحرا اور پہاڑوں کے درمیان اس کے محل وقوع، زمین کی زرخیزی اور پانی کی فراوانی کے باعث انسانی آبادی اسے وسیع پیمانے پر یہاں کی پیداوار سے بہرہ ور ہوئی کہ ابتداءً تاریخ سے لے کر اب تک اسے صدر مقام کا درجہ حاصل رہا ہے۔

شہر اور سمندر کے درمیان وسائل حمل و نقل کی دقتوں کی وجہ سے اعلیٰ دمشق کو اندرون ملک کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ مغربی پہاڑوں کی بدولت محفوظ ہوئے، پانی کی بہترین بہم رسانی اور شام میں سے شمالاً جنوباً گزرنے والی ساعراہ کے کنارے ایک زرخیز نعلستان کے وسط میں واقع ہونے کی بنا پر یہ شہر بدویوں کے لیے منڈی اور فرات سے نیل تک سفر کرنے والے قافلوں کے لیے پڑاؤ کا کام دیتا رہا۔ نوکوں کی لگانا آمدورفت

”جالی نما“ نقشہ تیار کیا، جس کے بازار بظط مستقیم ایک دوہرے کو قطع کر کے چوراہے بنائے تھے۔ یہ نقشہ دو ہزار سال ق۔م کے بابل اور آشور کے مشابہ تھا۔ دمشق کا شہر اپنے نہری نظام کی تیاری کے لیے آرامیوں ہی کا سرہون منت تھا۔ ہمیں کتاب مقدس (الملوک الثانی، باب ۵) میں نعمان الابریس کے قصے سے پتا چلتا ہے کہ دسویں صدی ق۔م میں نہر ابانہ، بردی کے ساتھ ساتھ بہتی تھی اور نہر ثوری، جس کا نام آرامی ہے اور جو جیل قاجیوں کی ڈھلانوں کے ساتھ ساتھ کھودی گئی تھی، اس علاقے کو سیراب کرتی تھی جو شہر کے شمال اور شمال مشرق میں واقع ہے۔ اسے اس نعلستان کی زوئی معیشت میں بڑی اہمیت حاصل رہی۔ یہ شہر حضرت داؤدؑ کے ہاتھوں فتح ہوا (الملوک الثانی، ۸ : ۵ و ۶)، لیکن حضرت سلیمانؑ کے عہد میں دمشق کے بادشاہ نے شمال کے شاہان آشور اور جنوب کے ملوک اسرائیل کے خلاف جنگ میں کامیابی حاصل کی۔ ۳۲ ق۔م میں ٹیگلت پلیر (Tiglathpilezer) سوم کے آشوری لشکر نے دمشق کی بادشاہت کا خاتمہ کر دیا۔ انہوں نے شہر پر قبضہ کر کے معبد اور محل کو لوٹ لیا، جس کا کچھ سامان ۶۱۹۳ء میں بالائی عراق عجم کے علاقے کی کھدائی سے نکلا ہے۔ اس دور میں شہر مذکور کی تاریخ کے لیے، جہاں تک اس پر آٹھویں صدی قبل مسیح میں آشوریوں، ساتویں صدی میں بابلیوں، چھٹی صدی میں مغادیشیوں، چوتھی صدی میں یونانیوں اور پہلی صدی ق۔م میں یوزنطیوں کے یکے بعد دیگرے قبضہ کرنے کا تعلق ہے، دیکھیے K. Wulzinger و C. Watzinger : *Damascus*، ج ۱ : *Die Antike Stadt*؛ نیز مقالات از J. Denzinger، در *Pauly Wissowa*، ۲ : ۳۲ تا ۳۸، J. Labert، در *Dictionnaire d'archéologie chrétienne et de liturgie*، طبع Cabrol و Leclercq، مادۃ Damas، ۳ (۱۹۲۰ء) : عمود ۱۱۹ تا ۱۲۶، R. Janin، در *Dictumnaire d'histoire et de*

اور سامان کی مسلسل درآمد و برآمد کی وجہ سے یہاں کی چہل پہل کسی بڑی بحری بندرگاہ سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی۔ صحرا کے بالقابل واقع ہونے کے باعث اس پر کئی بار حملے ہوئے لیکن ہمہ مکمل طور پر تباہ و برباد کبھی نہیں ہوا، چنانچہ اپنے غیر متبیر پس منظر کی بنا پر دمشق ہماری سامنے کئی ہزار سال کی تاریخ کی شہادت پیش کرتا ہے۔

ہمیں ٹھیک ٹھیک علم نہیں کہ تاریخ کے کس دور میں دمشق کی بنیاد رکھی گئی۔ بہر حال ۱۹۵۰ء میں دمشق کے جنوب مشرق میں تل الصالحیہ کے مقام پر جو کھدائیاں ہوئیں، ان سے یہاں چار ہزار سال قبل مسیح تک ایک شہری مرکز ہونے کا انکشاف ہوا ہے۔ جب ہم برنجی دور تک استعمال ہونے والے ابتدائی اور نامکمل اوزاروں کو دیکھتے اور ان کا مقابلہ (یہاں کے) پیچیدہ نظام آب پاشی سے کرتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ دو ہزار سال ق۔م کے وسط میں اس شہر کی خوشحالی ایک بڑے طویل اور مست رفتار تمدنی ارتقا کا نتیجہ ہوگی۔ *تل الامرنة کی الواح* میں اس کا تذکرہ آنے سے گویا دمشق کی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کا نام ان شہروں کے ضمن میں آتا ہے جنہیں فرعون تھتوسس (Thutmoses) سوم نے، جو کچھ مدت کے لیے شام پر قابض ہو گیا تھا، پندرہویں صدی ق۔م میں فتح کیا تھا۔ [تل الامرنة کے کتبوں میں اس کا نام *Dimashka* درج ہے۔ رامیسس ثالث کے کتبوں میں یہ نام *Darmesek* کی شکل میں ملتا ہے۔

گیارہویں صدی ق۔م میں دمشق سر زمین آرام کا بارونق صدر مقام تھا، جس کا حوالہ حضرت ابراہیمؑ کے قصے میں ملتا ہے (کتاب مقدس، التکوین، ۱۰ : ۱۲ و ۱۳ : ۱۵)؛ حتیٰ کہ آج بھی مسلمان دمشق کے شمال میں مقام پرزہ کی مسجد ابراہیمؑ کو مقدس سمجھتے ہیں، جو بروئے روایت حضرت ابراہیمؑ کا مقام ولادت تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانے میں آرامیوں نے اس شہر کا

ارتیاس Artias الثالث کے عہد میں اتر قیسم (Petra) سے وارد ہوئے تھے۔ ان تو واردوں نے یونانی شہر کے مشرق میں ایک لیا محلہ بسایا، جسے قرون وسطیٰ کے عرب مؤرخ النبطیوں کے نام سے یاد کرتے تھے۔ علاوہ بریں انہوں نے جبل قلمیوں کی ڈھلانوں پر نہر نوری کے اوپر ایک نہر کھودی، جو عہد بنی اسد میں دوبارہ بنائی گئی اور نہر یزید کے نام سے مشہور ہوئی۔

۶۴ قبل مسیح میں پومپی Pompey نے شام کے رومی سلطنت کا ایک صوبہ ہونے کا اعلان کیا، لیکن دمشق اس کا صدر مقام نہیں تھا بلکہ نمائندگان شہنشاہ نے انطاکیہ میں اپنا مستقر بنایا۔ ۳۷ سے ۶۵ء تک ہمد ارتیاس الرابع فیلو پاتور Arcas IV philopator دربار روم کی رضامندی سے نبطی دوسری بار دمشق کے مالک بنے۔ یہ اسی دور کا واقعہ ہے کہ ساؤل Saul، جو آگے چل کر پولوس St. Paul کے نام سے مشہور ہوا، مسیحیوں کا کھوج لگانا شہر کی بڑی یہودی بستی میں پہنچا مگر انیاس Ananias کے ہاتھ پر خود دین مسیحی قبول کر لیا۔ انیاس کا قدیم عبادت خالہ ۶۱۹۲۱ء میں کھود کر نکال لیا گیا اور اب تک محفوظ ہے۔ قیصر ہڈریں Hadrian کے عہد (دوسری صدی عیسوی کے آغاز) میں دمشق کو صدر مقام کا درجہ دیا گیا سپٹیمس سیوروس Saptimus Severus اور کارکلا Caracalla نے یہاں بہت سی سرکاری عمارتیں تیار کرائیں اور ۲۰۲ء کے بعد الیگزائٹر سیوروس Alexander Severus نے اسے ایک رومی نو آبادی بنا دیا۔

سلطنت روم نے دمشق کو داخلی امن و امان اور باقاعدہ نظم و نسق دیا، جن کے باعث یہاں ایسی خوشحالی پیدا ہو گئی کہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ اقتصادی طور پر روز بروز ترقی پذیر رجحانات کے باعث شہر میں لوگوں اور سامان کی ایسی واپس ہو گئی کہ جلد ہی شہر کی حدود تنگ محسوس ہونے لگیں؛ چنانچہ رومیوں نے تعمیر شہر کے ایک نئے منصوبے

E. van Aubert, géographie ecclésiastiques, ۱۴, Cauwenbergh, ۱۸۷۶: ۷۷ تا ۸۷۔

۳۳۲ ق۔م میں سکندر اعظم نے دمشق فتح کیا؛ یہ ایک بڑی اہم تاریخ ہے۔ اس کے معنی یہ تھے کہ ۶۳۵/۸۱۴ء میں عربوں کی فتح تک کئی صدیوں کے لیے دمشق ہخامنشیوں کے ہاتھ سے نکل کر مغرب کے زیر اثر آ گیا۔ یونانی عہد حکومت کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: پہلے تو تیسری صدی ق۔م میں ایک بطلموسی Ptolemaic سلطنت کی بنیاد رکھی گئی، پھر کیزی کوس Cyzicus کے سلوق Seleucid فرمانروا انطاکیا کوس Antiochus نے اسے دارالحکومت بنا کر اس کا درجہ بلند کیا (۱۱۱ ق۔م) اور بالآخر ۹۰ ق۔م کے لگ بھگ دیمتریوس Demitrius سوم کے عہد میں یہاں ایک جدید یونانی نوآبادی قائم ہوئی۔ سلوق دارالحکومت کی حیثیت سے دمشق کو ایک بار پھر اہمیت حاصل ہو گئی اور وہ یونانیوں کی شہری منصوبہ بندی کے مطابق ترقی کرنے لگا۔ آراء ی ہستی وہ تھی جہاں کا بندر نویں صدی ق۔م سے شہر کی پڑھتی ہوئی آبادی پر چھایا رہا تھا۔ اب اس کے پہلو میں ایک دوسرا دمشق ابھرا۔ جب ایک ہی مقام پر ایک دوسرے سے بالکل مختلف نوعیت کی دو تہذیبیں ساتھ رہنے پر مجبور ہو جائیں تو عموماً ایسی ہی دورنگی ظہور میں آتی ہے۔ یونانیوں کی شہری تعمیرات کے اسلوب کے بعض عناصر نمودار ہونے لگے، مثلاً بازاروں کے دورویہ محرابی جھت، جن کا سراغ مسجد اُمویہ کے مشرق میں ملتا ہے، یا گزرگاہ عام، جس کی یاد رُقاق الساحة سے، جو اب تک موجود ہے، نازہ ہوتی ہے، یا ۵۰ x ۱۰۰ میٹر کے مقررہ رقبے کے مکانات پر مشتمل چھوٹے چھوٹے محلے، جن میں مکانات کے طویل تر حصوں کی سمت شمالاً جنوباً رکھی جاتی تھیں۔

۸۵ قبل مسیح میں یہ شہر پہلی بار نبطیوں کے قبضے میں آیا، جو "یونان پسند" (the Philhellene)

تھے، جن میں سے ایک اب بھی موجود ہے! اس کے جنوب میں ایک چھوٹے سے نصف دائرے کی شکل میں "آئل" ہے، جسے ایک ترچھی گلی پہاڑ سے قطع کرتی ہوئی گزرتی ہے۔ یہ تِل یا ٹیلہ قدیم رومی تماشاکہ کا محل وقوع تھا۔ دوسری ستونوں والی بڑک وہ قدیم راستہ تھا جو مندر اور معام اجتماع (agora) کو آپس میں ملاتا تھا۔ اسے رومیوں نے کولی عدالت گاہ (forum) میں بدل دیا۔ مندر مشرقی دیوتا (Jupiter of the Damascenes) سے منسوب تھا جو کہ حداد (Hadad) یعنی طوفان کے دیوتا کا جانشین تھا۔ کئی موقعوں پر بالخصوص دوسری اور تیسری صدی عیسوی میں اسے جزوی طور پر از سر نو تعمیر کیا گیا اور اس میں تبدیلیاں کی گئیں۔ احاطے (peribolus) کا ایک حصہ، جس کے کونوں پر واقع دو برج اب مسجد کے میناروں کی بنیاد کا کام دیتے ہیں، مسجد جامع کی بیرونی دیوار کے اندر آگیا ہے۔ مندر کے مشرق دروازے (propylaea) مسجد جامع کے مشرق جانب موجودہ چیلرون میں اور مغربی دروازے، جو کہ سائبانوں سے مزین تھے، مسجد کے مغربی جانب باب البرید میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ آخری بات یہ معلوم ہے کہ گول میدان (سر دس circus) جس نے غالباً کھیلوں کے میدان (stadium) کی جگہ لے لی تھی، وہاں واقع تھا جہاں اب باب الفرداس کے باہر گورستان کے شمال میں، جس سے رومی عہد کے سنگی قابوت پر آمد ہوئے ہیں، 'خاندان حداد' ہے۔

یون وسطی کے عربی اعلام کی چند اور شکلوں میں بھی رومی اختراع کی یاد باقی رہ گئی ہے، مثلاً ایڈیماس قدیم (demonian) کے مطابق ہے: 'الفورنی' سے furnace یا مٹی کے برتن پکانے کی بھٹی ذہن میں آتی ہے اور الفسفار سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سڑک کے خاتمے پر جو المستقیم کہلاتی ہے کسی زمانے میں لوہے کی بھٹی تھی، جہاں سوئے (fusa) بنائے اور بیچے جاتے تھے۔

کو چلایا اور قدیم آرامی بستی کو یونانی بستی کے ساتھ ملا دیا، جس سے ایک نیا شہر منظر عام پر ابھر آیا۔ حکومت نے اپنی توجہ زیادہ تر عام ضرورت کے منصوبوں پر مبذول رکھی، مثلاً فصیل شہر اور مزید مالی کی بہم رسانی کے لیے اضافی ٹھروں کی تعمیر۔

برڈی کے دائیں کنارے ۱۵۰ × ۷۰ میٹر کے رقبے میں فصیلی تعمیر کی گئیں تاکہ یہاں کے باشندے بدوبو کی لوٹ مار سے محفوظ رہ سکیں۔ شمال مشرقی گوشے میں ایک قلعہ نما برج کی تعمیر سے فصیل کو مزید استحکام حاصل ہو گیا تھا۔ پورا شہر ایک وسیع مستطیل نظر آتا تھا، جس کے سات دروازے تھے: شرق میں باب شرق، جنوب میں باب کسبان اور باب الصغیر، مغرب میں باب الجایہ اور شمال میں باب الفردیس (- باغوں کا دروازہ)، باب الجیشیق اور باب توما (Thomas)۔ ان فصیلوں اور دروازوں کے بڑے بڑے آثار آج بھی نظر آتے ہیں۔ آبادی میں اضافے کے باعث کاریز ("الانوات") بنانے کی ضرورت محسوس ہوئی تاکہ لوگوں کو پینے کا پانی فراہم کیا جائے۔ یہ اب تک کام دے رہی ہے۔ چوک کے جنوب میں نئے مکانوں کی تعمیر سے نوواردوں کے لیے جائے سکونت کی تلاش کا مسئلہ حل ہو گیا۔ شہر کی ایک نئی خصوصیت یہ تھی کہ یہاں دو وسیع سڑکیں ایسی بنائی گئیں جن کے دونوں جانب ستونوں کی قطاریں تھیں۔ ان میں سے ایک اہم شارع عام پچیس میٹر چوڑی تھی۔ اس کے دونوں جانب محرابی جھت تھے۔ نہ شہر کو شرقاً غرباً قطع کر کے باب شرقی کو باب جایہ سے ملاتی تھی اور رومی شہروں کی شارع کبیر (decumanus) سے مشابہ تھی۔ یہ سڑک اب سوق مدحت پاشا کہلاتی ہے اور غیر ملکی مصنف [ایہ عہد نامہ جدید] اعمال الرسل، ۱: ۱۰ کے ایک کٹانے کی بنیاد پر اسے "الرفاق المستقیم" (= سیدھا راستہ) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس کے پچھون پچھ روٹیوں کے [زمانے میں] نین محرابی دروازے قائم

شہنشاہ کی وفات پر شہر خالی کر دیا گیا اور اگلے سال ہرقل شام میں واپس آ گیا۔

فتح اسلامی: اول تو عثمانی امارت (phylarchate) کے خاتمے اور دوم ایرانیوں کی تباہی کے باعث ظاہر ہے کہ حجازی عربوں کے لیے شام فتح کرنا مشکل نہ رہا تھا۔ ہر سال عرب اپنی فوجی سہعات کے سلسلے میں بوزنطی سرحد پار کر جاتے تھے۔ جمادی الاولیٰ ۸۱۳ھ/ جولائی ۶۳۴ء میں حضرت خالد بن الولید کے لشکر نے فلسطین کا علاقہ طے کر لیا اور شمال کی جانب جولان کے راستے کے ساتھ ساتھ بڑھتے گئے۔ محرم ۸۱۳ھ/ مارچ ۶۳۵ء میں دمشق کی طرف جانے سے قبل بوزنطیوں نے الصنہین کے شمال میں مَرْج الصُّفَر میں کچھ مزاحمت کی۔ چند روز بعد مسلمان شہر کے دروازوں کے سامنے پہنچ گئے۔ حضرت خالد بن الولید نے اپنا فوجی پڑاؤ شہر کے شمال مشرقی جانب قائم کیا۔ ایک قدیم روایت کی رو سے ان کا مستقر باب ثوما کے باہر بتایا جاتا ہے، جہاں کہ اب شیخ زسلان کا مقبرہ ہے۔ [شہر کی] ناکہ بندی کر لی گئی تاکہ ان بوزنطی دستوں کے ساتھ جنہیں پسپا کر کے دمشق میں محصور کر لیا گیا تھا کوئی فوج شمال سے آ کر نہ مل سکے۔ چونکہ اہل دمشق بوزنطی حکومت کو ناپسند کرتے تھے لہذا ان کے زعماء کی ایک جماعت نے، جس میں وہاں کا اسقف و ناظم اعلیٰ اور قدیس یوحنا الدمشقی کا باپ منصور بن سرجون بھی شامل تھا، باشندگان شہر کو غیر ضروری کشت و خون سے بچانے کے لیے گفت و شنید شروع کر دی۔

رجب ۸۱۴ھ/ ستمبر ۶۳۵ء میں باب شرق کو مسلمانوں کے واسطے کھول دیا گیا اور بوزنطی دستے شمال کی طرف ہٹ گئے۔ تسخیر شہر کے بارے میں کئی روایات ملتی ہیں۔ مشہور ترین روایت ابن عساکر (تاریخ، ۱: ۲۳ تا ۲۴) کی ہے جس کی رو سے حضرت خالد بن الولید شمشیر بدست لڑتے ہوئے باب شرق سے اور دوسری طرف حضرت ابو عبیدہؓ باشندگان شہر

یہ امر یقینی ہے کہ بہت سے قدیم آثار زمین کے نیچے دب کر معدوم ہو چکے ہوں گے، جس کی سطح روسی عہد سے لے کر اب تک بعض مقامات پر چار میٹر سے زیادہ بلند ہو چکی ہے؛ لیکن شہر کے نقشے میں، جو تیسری صدی عیسوی میں اسے بسائے وقت تیار ہوا تھا، مسلمانوں کی آمد تک مشکل ہی سے کوئی رد و بدل ہوا ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ روسی شہر ہی نے از منہ وسطی کے شہر کے لیے ایک ڈھانچے کا کام دیا تھا۔

رومیوں کی جگہ بوزنطیوں نے سنبھالی۔ ۳۹۵ء میں تیودوسیوس Theodosius کی وفات کے بعد شام سلطنت شرقیہ کا ایک حصہ بن گیا۔ جب دمشق بوزنطی سلطنت کا سرحدی شہر بنا تو یہاں اہل کلیسا کی صورت میں ایک لیا شہری عنصر نمودار ہوا۔ سب سے پہلے مشتری (Jupiter) کا مندر از سر نو تعمیر کر کے اسے گرجا کی شکل دی گئی اور اسے قدیس یوحنا [حضرت یحییٰ] امطیباغی (Baptist) کے نام سے منسوب کیا گیا۔ حضرت یحییٰ بن حضرت ذکریاؑ کا سر ایک (دُخمے) تہ خانے (crypt=) میں ابھی تک محفوظ ہے جو اب مسجد جامع میں واقع ہے اور اس کی مسیحی اور مسلمان یکساں طور پر تعظیم و احترام کرتے ہیں۔ جہاں کسی زمانے میں ولیہ مریم کا کلیسا واقع تھا وہاں اب کلیسائے شرقی کے بطریق اعظم کا مرکز قائم ہے۔

عسائیوں کے ضعف اور چھٹی صدی عیسوی کی ایرانی جنگوں نے دمشق کی اقتصادی حالت تباہ کر کے رکھ دی۔ ۶۱۲ء میں خسرو ثانی کی سپاہ نے دمشق پر قبضہ کر لیا جس کے باشندوں میں کثرت یعقوبی monophysite ارتے کے عیسائیوں کی تھی [جو حضرت مسیح کے اتحاد باللہ کے قائل] اور بوزنطی فرقہ ملکی Melkites کے مخالف تھے۔ چونکہ ماسائیوں کا یہاں خیر مقدم ہوا تھا اس لیے انہوں نے اس شہر میں ویسی لوٹ مار نہیں کی جیسی کہ آگے چل کر بیت المقدس میں کی (۶۱۴ء)۔ ۶۲۷ء میں ایرانی

سے اس کا حتمی طور پر الحاق کر لیا گیا۔

دمشق کا سقوط ایک ایسا واقعہ تھا جس کی اہمیت کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ اس فتح نے مغرب کی تئربیا ہزار سالہ سیادت کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے بعد سے یہ شہر پھر سامی حلقہ اثر میں آ گیا اور اس کا رخ از سر نو صحرا اور مشرق کی طرف پھر گیا۔ اہل دمشق زبان اور ثقافت کے اعتبار سے سامی، حضرت مسیح کے اتحاد باللہ کے قائل اور یونانی (بولنے والے) کلیسائے مشرق کے مخالف تھے۔ انہوں نے فاتحین کا دلی مسرت سے خیر مقدم کیا۔ علاوہ بریں وہ اپنے آپ کو باعتبار نسل و زبان اور مذہب بوزنظیوں کی یہ نسبت ان سے نزدیک تر محسوس کرتے تھے۔ خود اسلام کی نسبت ان کا خیال تھا کہ وہ اسلام سے بہت زیادہ قریب ہیں اور انہیں توقع تھی کہ وہ مسلمانوں کے زیر حکومت زیادہ آزادانہ زندگی بسر کر سکیں گے۔ دوسرے شہروں سے کہیں زیادہ دمشق کے حالات عرب اور یونانی ثقافت کے استزاج کے لیے سازگار معلوم ہوتے تھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہاں کی آبادی کا، جو بیشتر آرامی زبان بولنے والوں پر مشتمل تھی، بہت ہی قابل حصہ یونانی ثقافت قبول کر سکا تھا۔ جہاں تک نظم و نسق کا تعلق ہے بوزنظیوں کے مسلمہ اصولوں پر عمل درآمد جاری رہا البتہ مذہبی منافقین پیدا ہو گئے! ان سے بھی اسلامی الہیات کی تشکیل میں مدد ملی۔ باہم شیر و شکر ہونے کا اثر (نصاری کی توفع کے) بالکل برعکس ہوا بلکہ مسلمانوں کی فتح کا مثبت نتیجہ اشاعت اسلام نکلا اور نصف صدی کے اندر اندر حکومت نے اسلام کی زبان عربی کو بطور سرکاری زبان رائج کر دیا۔

خليفة المسلمين حضرت عمرو نے یزید بن ابی سفیان کو شہر کا والی نامزد کیا۔ فاتحین میں سے ممتاز ترین افراد بوزنظیوں کے خالی کردہ مکاؤں میں مقیم ہو گئے (ابن عساکر: تاریخ، ۱۳: ۱۳۳ تا ۱۳۴)۔ [عرب کے] بادیدہ نشینوں کو اس شہر نے مسحور کر لیا

کو امان دینے کے بعد باب النجایہ سے داخل ہوئے اور دونوں سپہ سالار کنیسہ کے وسط میں ایک دوسرے سے ملے۔ ایک اور روایت البلاذری (فتوح، ص ۱۲۰ تا ۱۳۰) کی ہے جس کا بیان ہے کہ حضرت خالد نے باب شرقیہ شہر کا اقرار اطاعت قبول کیا اور [حضرت] ابو عبیدہؓ باب النجایہ سے بزور شمشیر داخل ہوئے! دونوں سپہ سالاروں کی ملاقات الیریں کے مقام پر شارع المعروف بہ المستقیم کے وسط میں کلیسائے القسالت کے قریب ہوئی (ابن عساکر: تاریخ، ۱: ۱۳۰)۔ کائناتی Coetani نے ۵۱۴ء میں حضرت ابو عبیدہؓ کی شام میں عدم موجودگی ثابت کر کے ان روایات کی صحت باطل کر دی، ہے۔ (MFOB) Lamimens، ۳: ۲۵۵) نے ان کی صحت کو ثابت کرنے کی کوشش میں حضرت ابو عبیدہؓ کی جگہ بزید بن سفیان کا نام تجویز کیا ہے۔ بہر صورت Lamimens نے شہر کے منقسم ہو جانے کو غیر اغلب بتایا ہے۔ یہ روایت بہت بعد کے زمانے میں صلیبی جنگوں کے دوران میں وجود میں آئی تھی۔

مسلمانوں نے عیسائیوں کو ان کی املاک یعنی اراضی، مکانات اور گرجاؤں کی حفاظت کی ضمانت دی۔۔۔ ۵۱۵ء/۶۳۶ء کے موسم بہار میں ہرقل کے بھائی تیودورس Theodorus کے زیر قیادت ایک لشکر دمشق کی طرف بڑھا۔ حضرت خالدؓ بن الولید نے شہر خالی کر دیا اور طبریتہ کے مشرق میں یرموک کے قریب مورچہ آرا ہونے سے قبل النجایہ کے مقام پر از سر نو فوج کو مرتب کیا۔ اس میدان میں ۱۲ رجب ۵۱۵ء/ ۲۰ اگست ۶۳۶ء کو حضرت خالدؓ نے بوزنظی فوج کو راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ وہ خود اس کامیابی کے بعد مدینہ منورہ چلے گئے، لہذا اس بار شام اور دمشق کی فتح کا سہرا حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح کے سر رہا۔ ۲ ذوالقعدہ/۱۵ دسمبر ۶۳۶ء میں اہل دمشق نے دوبارہ ہتیار ڈال دیے اور اسلامی مملکت

سلطنت کے قلب کی حیثیت حاصل رہی جس کا شمار دنیا کی عظیم ترین سلطنتوں میں ہوتا ہے۔

شروع شروع میں فاتحین کے تسلط سے شہر کی زندگی میں کوئی تغیر رونما نہیں ہوا کیونکہ مسلمانوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ عربیت کا رنگ غالب آنے کا عدل بڑا مست روٹھا، چنانچہ خلیفہ عبدالملک کے عہد تک دربار خلافت پر عیسائی چھائے رہے۔ اسی عہد میں مسلمان رعایا کی تعداد میں اضافے کے باعث ایک ردّ عمل ہوا، جس کی بنا پر نظم و نسق کی سرکاری زبان یعنی یونانی کی جگہ عربی نے لے لی۔ اس خاندان خلافت کے ابتدائی دور میں انعام و ضبط، خوشحالی اور رواداری عام تھی لیکن آگے چل کر خانہ جنگیوں نے سخت ابتری ڈال دی، جو بنی امیہ کی حکومت کے خاتمے پر منتج ہوئی۔ شہر دمشق میں بھی چھوٹے فساد برپا ہونے لگے، آتش زنی کی وارداتوں میں اضافہ ہونے لگا، حتیٰ کہ جب مروان ثانی ۶۸۴/۷۱۲ء میں اپنے لئے دارالخلافہ حرّان میں تخت نشین ہوا تو دمشق کی فصیل تک مہندم ہو چکی تھی۔

شہر کے نقشے (میں بوزنطی عہد کے بعد) حکومت کی تبدیلی کا سراغ دو عمارتوں کی تعمیر میں ملتا تھا جو ایک دوسرے سے ملحق تھیں، یعنی قصر خلافت اور مسجد، لیکن ان سے شہر کے عام نقشے میں کوئی تغیر رونما نہیں ہوا۔ [امیر معاویہؓ نے تو قدیم احاطے (peribolus) کے جنوب مشرق میں، جہاں آج کل سونے چاندی کے زبورات بنانے والوں کا بازار ہے، بوزنطی والیوں کی قیام گاہ کو نئے سرے سے تعمیر کرنے ہی پر اکتفا کیا۔ یہ [نصر] "الخصرا" کے نام سے موسوم ہوا۔ دراصل یہ نام سرکاری عمارتوں کے ایک مجموعے کو دیا گیا ہوگا جس کی مثال ہمیں تسطانیہ اور آگے چل کر بغداد میں بھی ملتی ہے۔ محل کے پہلو میں دارالخیل واقع تھا، جو سفیروں کے اقامت خانے کا کام دیتا تھا۔ معام ہوتا ہے کہ دور عباسیہ میں اسے زندان میں تبدیل

تھا۔ وہ [قرآنی اشارات کی بنا پر] اسے "جنت ارضی" کے نام سے یاد کرتے تھے، لیکن جگہ اور اس سے بھی زیادہ چراگاہوں کی قلت کی وجہ سے وہ الجابیہ کی چھاؤنی ہی میں مقیم رہے۔ بہت جلد دمشق کو ایک مقدس شہر کا درجہ بھی حاصل ہو گیا کیونکہ روایات کی روشنی میں یہاں ان مقامات کا سراغ لگ گیا جنہیں انبیائے سابقین نے شہرت عطا کی تھی، چنانچہ زائرین کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ زیادہ تر لوگ جبل قسّیوں میں کھف آدم یعنی کھف "دم" (Blood)، جہاں روایت کی رو سے ہابیل کا قتل ہوا تھا، یا کھف جبریلؑ میں جایا کرتے تھے۔ برزہ Berze میں حضرت ابراہیمؑ کے مقام ولادت کی بڑی تعظیم و تکریم کی جاتی تھی۔ خیال تھا کہ حضرت موسیٰؑ بن عمران کا مہرہ وہاں واقع ہے جہاں اب محلّہ قنم آباد ہے۔ حضرت یسح عیسیٰؑ ابن مریمؑ کا نام ان انبیاء کے زمرے میں لیا جاتا تھا جنہوں نے اپنی تشریف آوری سے اس شہر کو عزت بخشی تھی۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ آپ [یہاں] ایک پُر سکون ثلّی ("ریوہ") پر قیام فرما ہوئے تھے (إلی ربوۃ ذات آرار ۷۳: المؤمنون) [۵] اور دنیا کے خاتمے کے قریب دجال سے لڑنے کے لیے سفید منیار پر، جسے کبھی تو باب شرق کا منیار قرار دیا جاتا تھا اور کبھی مسجد جامع کا مشرق منیار (مأذنة عیسیٰؑ)، نزول اجلال فرمائیں گے۔

بنو امیہ: ۶۴۹/۷۱۸ء میں یزیدؓ بن ابی سفیان کا عارضہ طاعون انتقال ہوا۔ ان کی جگہ جند دمشق کی قیادت ان کے بھائی حضرت معاویہؓ کے ہاتھ میں آئی۔ ۶۵۶/۷۳۶ء میں حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد امیر معاویہؓ خلیفہ منتخب ہوئے اور انہوں نے انجانیہ سے ترک سکونت کر کے دمشق میں امانت اختیار کر لی۔ اس نئے دارالحکومت کو درجہ کمال تک پہنچانا بنو امیہ کا کار نامہ تھا۔ ایک صدی تک یہ خلافت کے مرکزی صوبے کا مدنی مرکز رہا اور اسے ایک ایسی

کی جاتی رہی۔ امن و امان قائم کرنے کے لیے خلیفہ المأمون پہلی بار ۲۱۵ھ/۸۳۰ء میں یہاں آیا، لیکن شورشیں جاری رہیں۔ ۲۱۸ھ/۸۳۳ء میں، یعنی جس سال اس نے وفات پائی، وہ دوسری بار پھر آیا۔ ۲۳۸ھ/۸۵۴ء میں ایک خونریز بغاوت دمشق کے عباسی والی کی ہلاکت پر منتج ہوئی مگر لشکر خلافت امن قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ چار سال بعد خلیفہ المتوکل نے اپنا دار الخلافہ شامی صبر مقام میں تبدیل کرنے کی کوشش کی لیکن وہاں وہ صرف اڑتیس یوم قیام کرنے کے بعد مائرا واپس چلا گیا۔

۲۵۴ھ/۸۶۸ء میں بخارا کے ترک احمد بن طوئون [رگ باں] کو خلیفہ نے، جس کا وہ محض برائے نام باجگزار تھا، مصر کا والی مقرر کیا۔ اس نے دیکھا کہ زنج کی مسلسل و متواتر بغاوتوں سے خلافت بہت کمزور ہو چکی ہے، چنانچہ اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ۲۶۴ھ/۸۷۸ء میں امن نے دمشق پر قبضہ کر لیا۔ ۲۷۰ھ/۸۸۴ء میں اس کا بیٹا حمارویہ [رگ باں] اس کا جانشین ہوا اور مصر و شام پر اپنی فرمانروائی برقرار رکھنے کے لیے خلیفہ کو سالانہ خراج ادا کرنا رہا۔ ذوالحجہ ۲۸۲ھ/فروری ۸۹۶ء میں اسے دمشق میں قتل کر دیا گیا۔ بنو طوئون کی حکومت ہی کے آخری سالوں میں قرامطہ [رگ باں] شام میں نمودار ہوئے اور ان کی وجہ سے سیاسی و معاشرتی شورشوں کے مرکزوں میں اضافہ ہو گیا۔ بنو طوئون کے زوال اور قرامطہ کی روز افزوں سرگرمیوں نے، جو دمشق کا محاصرہ کر لینے کی حد تک جا پہنچی تھیں، خلیفہ کو وہاں فوجی دستے بھیجنے پڑے، جنہوں نے ۲۸۹ھ/۹۰۲ء میں قرامطہ کو ہتیار ڈالنے اور محاصرہ اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ دمشق کے عامل طغی بن جف نے، جو ایک ماوراء النہر ترک تھا، عباسی سپہ سالار محمد بن سایمان کے ساتھ بلاذقت رشتہ اتحاد ایک بار پھر استوار کر لیا اور

کر دیا گیا تھا۔ پانی کی بہم رسانی کا انتظام بہتر بنانے کے لیے بزید الاول نے خیل قاسیوں کی ڈھلانون پر، نہر قوری کے پرے ایک نبطی نہر از سر نو کھدوائی۔ اسے نہر بزید کا نام دیا گیا اور آج بھی یہ اسی نام سے مشہور ہے۔ خلیفہ عبدالملک بن مروان کے بیٹے الحجاج نے باب العجائب کے مغرب میں فصیل شہر کے باہر ایک قصر تعمیر کرایا جس کی باد قائم رکھنے کے لیے آج تک محلہ قصر الحجاج کے نام سے موسوم ہے۔

اسلامی فن تعمیر کے اولین اور عظیم ترین شاہکاروں میں جامع مسجد اموی کی تعمیر کا سہرا خلیفہ الولید الاول کے سر ہے۔

عہد عباسیہ: نئے خلیفہ ابو العباس السفاح کے چچا عبداللہ بن علی نے خاندان بنو امیہ کا خاتمہ کرنے کے بعد رمضان ۱۳۲ھ/اپریل ۷۵۰ء میں دمشق فتح کیا اور وہ اس کا پہلا عباسی والی مقرر ہوا۔ اموی عمارتیں تباہ و برباد کر دی گئیں، دفاعی انتظامات توڑ دیے گئے اور مقبروں کی بے حرمتی کی گئی۔ جہاں تک اس شہر کا تعلق ہے، ایک تاریک دور کا آغاز ہو گیا۔ اس کی حیثیت ایک صوبائی شہر کی سی رہ گئی اور خلافت نے اپنا صدر مقام عراق میں قائم کیا۔ شام کے دارالحکومت ہیں اندر ہی اندر بغاوت کی آگ ملگتی رہی۔ المہدی کے عہد (۱۵۶ھ/۷۷۳ء تا ۱۶۸ھ/۷۸۵ء) میں بنو قیس اور یمنیوں کے باہمی تصادم نے حکومت سے سرکشی کی صورت اختیار کر لی، جس کی قیادت السفیانی نام ایک اموی مدعی کے ہاتھ میں تھی اور بنو قیس اس کے معاون تھے، لیکن یہ بغاوت ناکام رہی۔ ہارون الرشید کے دور خلافت میں حکومت بغداد کے خلاف بغاوت کی تحریک زیادہ وسیع بنیادوں پر شروع ہوئی۔ ۱۸۰ھ/۷۹۶ء عباسی خلیفہ نے جعفر البرمکی کی سپہ سالاری میں ایک تادیبی مہم روانہ کی مگر امن و انتظام صرف عارضی طور پر قائم کیا جاسکا اور عباسی خلفاء کے احکام کی برابر تقیر

ہوا: اہل دمشق اور بربری سپاہیوں کے درمیان جھگڑے سے آگ لگی اور مسجد جامع اور شہر کو شدید نقصان پہنچا۔

ترکی حکومت: ایک ترکمان سردار آتسز بن اوک [رک بان]، جو بنو فاطمہ کا تنخواہ دار ملازم تھا، ان کا ساتھ چھوڑ کر بطور خود دمشق پر قابض ہو گیا اور اس طرح ۴۶۸ھ/۱۰۷۶ء میں مصریوں کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ چونکہ اسے اپنے سابق آقاؤں سے خطرہ تھا لہذا آتسز نے بڑی عجات سے قلعے کے استحکامات درست کیے اور ملک شاہ [رک بان] کے ساتھ، جس سے اس نے مدد طلب کی، اتحاد قائم کرنے کے لیے کوشاں ہوا۔ سلجوقی سلطان نے اس کے جواب میں دمشق اپنے بھائی تئش [رک بان] کو جاگیر میں دے دیا۔ مؤخر الذکر ۴۷۱ھ/۱۰۷۹ء میں دمشق پہنچا اور وہاں لئے مرے سے امن و امان قائم کر کے آتسز کو موت کے گھاٹ اتار کر اس سے چھٹکارا حاصل کیا۔ تشدد کا دور جاری رہا۔ ۴۷۶ھ/۱۰۸۳ء میں مسام بن قرش نے شہر کا محاصرہ کر لیا مگر اسے فاطمیوں کی طرف سے متوقع کمک نہ پہنچ سکی اور تئش شہر کو محاصرے سے آزاد کرانے میں کامیاب ہو گیا۔ تئش ۴۸۸ھ/۱۰۹۵ء میں اپنے بھتیجے برکیاروق [رک بان] کے خلاف لڑتا ہوا مارا گیا۔ اس کے بیٹوں نے اس کی رنست آپس میں تقسیم کر لی۔ رضوان نے حاب اور دقاق نے دمشق کی حکومت سنبھالی۔ مؤخر الذکر نے کاروبار سلطنت کی بگ ڈور اپنے ترک اتابک نامیرالدین تغتکین کے ہاتھ میں دے دی۔ چنانچہ اس زمانے سے وہی دمشق کا حقیقی حکمران نظر آتا ہے۔ اس کی سیاسی حیثیت بہت مخدوش تھی کیونکہ مصر کے فاطمی اور سلاجقہ بغداد اس کے مخالف تھے اور ۴۹۰ھ/۱۰۹۷ء سے افرنکی (Franks) بھی اسی صف میں شامل ہو گئے تھے۔

دقاق کی وفات (ربضان ۴۹۷ھ/جون ۱۱۰۳ء)

بطور انعام اسے خلیفہ نے مصر کا والی مقرر کر دیا۔ اس ولایت میں اس کے بیٹے محمد نے ۴۳۶ھ/۹۳۸ء میں خاندان اخشیدیہ [رک بان] کی بنیاد رکھی: اسی لیے خاندان شاہی نے بنو عباس کی برائے نام سیادت قبول کر لی اور حمدانیوں کے مقابلے میں دمشق کا دفاع کرنے کے لیے بڑھا۔ ۴۳۳ھ/۹۴۵ء میں ایک معاہدہ ہو گیا، جس کی رو سے اخشیدی اس شہر پر قابض ہو گئے اور اس کے عوض انھوں نے فرمانروایان حلب کو خراج دینا منظور کر لیا۔ جب ۴۳۴ھ/۹۴۶ء میں بمقام دمشق محمد الاخشیدی وفات پا گیا تو وہاں اور قاہرہ دونوں جگہ ابتری پھیل گئی۔

بنو فاطمہ [رک بان] ۴۵۷ھ/۹۶۸ء میں خاندان اخشیدیہ کے قاہرہ میں جانشین ہوئے۔ ان کے پہلے مصر اور پھر شام میں برسرِ اقتدار آنے سے ایک شیعہ خلافت قائم ہو گئی، جو خلافت بغداد کی دشمن تھی۔ گیارھویں صدی کے شروع میں شہر دمشق کو بہت سی مشکلات کا سامنا رہا۔ حمدانی شمال سے دباؤ ڈال رہے تھے اور فاطمی جنوب سے۔ بوزاطی اقدامات، قرمطی سرگرمیاں اور ترکمانی حملے ان پر مستزاد تھے۔ ایک وقت ایسا بھی آنا کہ شہر پر قرامطہ کا قبضہ ہو گیا، لیکن ۴۵۹ھ/۹۶۷ء میں فاطمیوں نے انھیں نکال باہر کیا، اگرچہ اس میں شہر کو خاصی آتش زدگی اور تباہی کا سامنا کرنا پڑا۔ بنو فاطمہ کے تسلط سے شہر کے حالات بدتر ہو گئے، کیونکہ شہر کی حکومت قاہرہ کے تنخواہ دار مغربی سپاہیوں نے وہاں کے باشندوں کو بہت تنگ کیا۔ غرض یہ ساری صدی ابتری اور انحطاط کا زمانہ تھی۔ بعض اوقات فسادات سخت مصیبت کا سبب ہو جاتے تھے۔ چونکہ بیشتر مکانات کچی اینٹوں کے بنے ہوئے تھے اور ان کی چھتوں اور پیل دیواروں میں پاپار poplar کی لکڑی لگائی گئی تھی، اور کسی بھی آتش زدگی کے سنگین نتائج ہو سکتے تھے، چنانچہ ۴۶۱ھ/۱۰۶۹ء میں یہی

کے بعد تثنیٰ کین کم سن تثنیٰ الثانی کے نام پر حکومت کرتا رہا، لیکن تثنیٰ الثانی جلد ہی وفات پا گیا۔ اب اتابک دمشق کا واحد مالک تھا، چنانچہ ۵۸۹ھ/ ۱۱۵۸ء میں نورالدین کی آمد تک اس کا خاندان بُورِہ [رک بان] یہاں برسر اقتدار رہا۔ تثنیٰ کین کے عہد حکومت میں، جو رابع صدی تک جاری رہا، شہر نے اخلاق اور معاشی دونوں اعتبار سے نمایاں ترقی کی۔ صفر ۵۲۲ھ/ فروری ۱۱۲۸ء میں اس کی رحلت پر اس کا بیٹا تاج الملوک بُوری اس کا جانشین قرار پایا۔ فرقہ باطنیہ [رک بان] نے ۵۰۷ھ/ ۱۱۱۳ء ہی میں امیر مودود کو قتل کر کے دمشق میں اپنے وجود ہونے کا احساس دلا دیا تھا۔ اب انہوں نے دمشق وزیر ابو علی الطاهر التزدقانی کی اعانت پا کر اپنی سرگرمیاں دو چند کر دیں۔ ۵۲۳ھ/ ۱۱۲۹ء میں بُوری نے اس وزیر کو مروا ڈالا۔ یہ گویا قتل عام کا اشارہ تھا، چنانچہ باشندگان شہر نے بے قابو ہو کر کئی موباطنی موت کے گھاٹ اتار دیے۔ جو لوگ باقی بچے انہوں نے بھی اپنا انتقام لینے میں تساہل نہیں برتا، چنانچہ تاج الملوک بُوری ۵۲۵ھ/ ۱۱۳۱ء میں اقدام قتل کا ہدف بنا اور ایک سال بعد رجب ۵۲۶ھ/ مئی ۱۱۳۲ء میں اپنے زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسا۔ اس کے دو جانشین بھی یکے بعد دیگرے قتل کر دیے گئے۔ ان میں سے اسمعیل تو ۵۲۹ھ/ ۱۱۳۵ء میں خود اپنی ماں کے اور دوسرا شہاب الدین محمود ۵۳۳ھ/ ۱۱۳۹ء میں اپنے دشمنوں کے ہاتھ سے سارا گیا۔

۵۳۴ھ/ ۱۱۴۰ء میں قائدین عسکر نو عمر ابو سعید ابی مجبر الدین کو برسر حکومت لے آئے، جس نے زمام اقتدار اپنے اتابک معین الدین آثر کے سپرد کر دی۔ دس برس بعد اتابک کی وفات پر ابی نے خود حکومت کا کاروبار سنبھالا لیکن نور الدین کی سرپرستی قبول کرنے پر مجبور ہو گیا، جس نے آخر میں اسے

دمشق سے بھگا دیا، بُورِہ کی حالت ناقابل رشک تھی۔ چونکہ انہیں سند حکومت خایفہ بغداد سے ملنی تھی اس لیے فاطمیوں کے زیر تسلط ملک مصر کو جانے والے راستے کی سرحدی چوکی کا دفاع ان کے فرائض میں شامل تھا۔ دوسری طرف ان کے لیے غلے کی بہم رسانی کا انحصار حوران اور رقنہ کے دو علاقوں پر تھا، جنہیں بیت المقدس کی لاطینی حکومت سے حملے کا خطرہ لاحق رہتا تھا اور بعض اوقات ان کے لیے افرنگیوں کے ساتھ گفت و شنید کرنا ناگزیر ہو جاتا تھا۔ ادھر اپنے اس رویے کے متعلق خلافت بغداد کے سامنے جواب دہ بھی ہونا پڑتا تھا۔ ۵۲۴ھ/ ۱۱۳۰ء کے آغاز سے دمشق کو ایک نیا خطرہ لاحق ہونے لگا۔ یہ خطرہ زنگیوں کی جانب سے تھا، جو اس وقت حلب کے مالک بن گئے تھے۔ ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے بُوریوں نے ایک سے زیادہ موقعوں پر افرنگیوں کی امداد حاصل کی، لیکن چونکہ ۵۳۳ھ/ ۱۱۳۸ء میں خود افرنگیوں نے دمشق پر حملہ کر دیا، اس لیے ان سے آئندہ معاہدات کرنے کا امکان باقی نہ رہا۔ شہر کو حال ہی میں اقتصادی خوشحالی دوبارہ نصیب ہوئی تھی، اسے برقرار رکھنے کے لیے مجبوراً بُوریوں کو نئے اتحادیوں کی جستجو ہوئی۔

تثنیٰ کین کے ہاتھوں امن و امان کی بحالی سے قبل دمشق تین صدیوں تک بد نظمی کا سامنا کر چکا تھا۔ چند روزہ والیوں اور ان کے گماشتوں کی من مانی حکومت کے پنجے میں پھنس کر شہر کی آبادی ایک عجیب دہشت اور مصیبت کے دور سے گزر رہی تھی، اسے اپنی حفاظت کا خیال ہر وقت دامن گیر رہتا تھا۔ اسی کے پیش نظر شہر کے گلی کوچے ایک مخصوص نقشے کے مطابق بنائے گئے۔ اہل دمشق اسے لوگوں کے درمیان زندگی بسر کرنا چاہتے تھے جن سے وہ بخوبی واقف ہوں اور جو ایک دوسرے کو اچھی طرح سے جانتے ہوں،

اور ایسے لوگوں کے قریب ہوں جن کا رہن سہن ان سے ملتا جلتا ہو۔ یہی وہ نقطہ نظر تھا جسے سامنے رکھ کر ان کی اجتماعی زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

شہر کا نقشہ، جس میں رومیوں کے زمانے سے بہت کم تبدیلی رونما ہوئی تھی، چوتھی صدی ہجری / [یہ تصحیح دسویں] صدی عیسوی سے متعدد علاقوں میں بٹ کر رہ گیا جن کا ایک دوسرے سے کوئی واسطہ اور تعلق نہ تھا۔ ہر محلہ (حارة) اپنی دیوار اور دروازوں کے اندر، مورچہ بند اور بجائے خود چھوٹے پیمانے پر ایک شہر بن جانے پر مجبور ہوا، جس میں شہری آبادی کے تمام لوازم موجود ہوں، جیسے مسجد، حمام، ذخیرہ آب "تالغ"، عوامی تنور خانے، اور چھوٹا سا بازار (سوق) جس میں نانباٹیوں کی دکانیں ہوں۔ ہر محلے کا اپنا شیخ اور فوجی دستہ (امدادات) [رکبان] الگ الگ ہوتا تھا۔

قدیم شہر کی اس تقسیم کے ساتھ ساتھ مذہبی بنیاد پر لوگوں کی ایک دوسرے سے مکمل علیحدگی بھی عمل میں آگئی، کیونکہ ہر فرقے کا شہر میں اپنا علاحدہ محلہ تھا۔ مسلمان مغرب میں قلعے اور مسجد جامع کے قریب رہتے تھے، عیسائی شمال مشرق میں اور یہودی جنوب مشرق کے حصے میں تھے۔ شہر کی ظاہری ہیئت یکسر تبدیل ہو گئی، مکانات کے دروازے براہ راست گلی کوچوں میں نہیں کھلتے تھے۔ شہر کی قدیم سڑکوں کے ساتھ ساتھ گلیاں (درب) بن گئیں، جو اپنے اپنے محلے کے شارع عام کا کام دیتی تھیں اور ان کے دونوں سروں کو بھاری بھاری دروازوں سے بند کر دیا جاتا تھا۔ یہ گلیاں آگے چل کر کباروں (زقاق) یا سربستہ راستوں میں بٹ جاتی تھیں۔

بائیں ہمہ ابھی تک شہر میں چند چیزیں ایسی موجود تھیں جن سے باہمی اتحاد و اشتراک کا پتا چلتا تھا۔ ان میں سے ایک تو بیرونی مورچہ بند فصیل تھی جس سے پورے شہر کا دفاع ہوتا تھا، پھر جامع مسجد

الاسوی تھی، جو شہر کے دینی و سیاسی مرکز کا کام دیتی تھی اور یہیں سرکاری احکام کا اعلان ہوتا اور وہ منظر عام پر لائے جاتے تھے، اور آخری چیز یہاں کے سوق تھے جہاں محتسب کے زیر نگرانی اجناس اور ضروری مصنوعات کی بہم رسانی ہوتی تھی۔ کاروبار تجارت انہیں مقامات پر ہوتا رہا جو رومیوں کے قدیم زمانے سے اس مقصد کے لیے مقرر تھے۔ ایک تجارتی علاقہ تو اس شارع کبیر پر واقع تھا جس کے دونوں جانب محرابی چھتے تھے اور دوسرا ستواؤں والے راستے پر جو مسجد جامع کے مشرق میں پرانی عبادت گاہ کے بڑے چوراہے (agora) کو جاتا تھا۔ یہ شاہراہیں مکمل طور پر بدل چکی تھیں۔ چھتوں پر دکانیں بن گئی تھیں، خود گذر گاہوں پر سایبان لگا کر عارضی دکانیں قائم کر لی گئی تھیں اور ہر کاروباری علاقے میں بازاروں (اسواق) کا ایک جال بھول بھلیوں کی طرح بچھ گیا تھا۔ قدیم رومی شارع کبیر (Decumanus) کا ایک مرکز دارالبطیخ تھا، جو دراصل بغداد کے دارالبطیخ کی طرح بھلوں کی منڈی تھی۔ اس کے مقابلے میں قدیم چوراہے (agora) کے قریب ہی قیصریوں میں بڑی آمد و رفت رہتی تھی۔ ان مستف احاطہ بند منڈیوں میں، شہری باسلیقوں (basilicas) کی طرح، جواہرات، کارچولی کپڑوں، تالینوں اور سمور جیسی قیمتی چیزوں کی تجارت ہوتی تھی۔

جب تغشکین کے عہد حکومت میں امن بجالا ہوا گیا تو نئے محلے آباد ہونے لگے، مثلاً العقیبة شمال میں، شہر جنوب میں اور قصر العجاج جنوب مغرب میں۔ شہر کے دروازوں پر دباغت کے کارخانے آئے جن میں چمڑے کا کام کرنے والوں کے لیے خام مواد تیار کیا جاتا تھا، کاغذ بنانے کے دو کارخانے نویں صدی کے اوائل سے چل رہے تھے اور کئی بن چکیاں تھیں جن میں مختلف چکنی چیزیں پسی جاتی تھیں۔

یورپیوں سے قبل کے عہد کی جو واحد یادگار

عقائد کو غلبہ نصیب ہوا، اور تمام کوششیں جمہاد [رک بان] پر مرکوز ہو گئیں۔ دمشق اہل سنت و الجماعت کا مرکز بن گیا۔ کثیر التعداد نئی مذہبی عمارات، مساجد اور مدارس کی تعمیر سے اس کی شہرت میں اضافہ ہوا اور اس دور میں عسکری اہمیت اور مذہبی وقار دونوں کے اعتبار سے اسے اپنی حریت مل گئی۔

عسکری نقطہ نظر سے دفاعی استحکامات کا منصوبہ بڑی احتیاط سے بنایا اور عمل میں لایا گیا۔ فصیل شہر کو مستحکم کیا گیا۔ نئے برج تعمیر ہوئے، جن میں سے ایک آج بھی باب الصغیر کے جنوب میں موجود ہے۔ بعض دروازوں، مثلاً باب شرق اور باب الجانبہ کو زیادہ مضبوط بنانے پر اکتفا کیا گیا، لیکن دوسرے دروازوں (باب الصغیر اور باب السلام) میں دہرے پھانک لگوائے گئے۔ فصیل شہر کی شمالی دیوار کا ایک حصہ بڑی کے دائیں کنارے تک بڑھا دیا گیا اور یہاں ایک نیا دروازہ باب الفرج قلعے کی شرقی سمت تعمیر ہوا۔ اس کے برعکس باب کیسان، جو جنوبی جانب تھا، تباہ کر دیا گیا۔

نورالدین نے قلعے کے اندر بھی تعمیرات کیں، نتائج باب الجدید کو مستحکم کیا اور ایک وسیع مسجد تعمیر کرائی۔ علاوہ بریں دو وسیع قطعات اراضی شہر کی عسکری سرگرمیوں کے پیش نظر رسالے کی تربیت اور فوج کی قواعد کے لیے مخصوص کیے گئے یعنی میدان الأخضر شہر کے مغرب میں اور میدان الخضر جنوب میں۔

مذہبی اور علمی سرگرمیاں ترقی کے بلند مراحل طے کرنے لگیں۔ اس سلسلے میں دو خاندان یعنی شافعی المذہب بنو عساکر اور حنبلی المذہب بنو آتامہ بہت ممتاز ہوئے۔ یہ لوگ ابتداءً ۵۵۶ھ/۱۱۶۱ء میں اس علاقے سے آئے تھے جو فصیل شہر کے باہر کوہ قاسیوں کی ڈھلانوں پر واقع تھا اور آج کر صالحہ کے نام سے مشہور ہے۔ عبادت گاہوں کی تعداد میں

اب تک باقی رہی ہے وہ بیت المال کا قبة ہے جو مسجد جامع میں خلیفہ المہدی کے ایک عامل نے ۸۱۶ھ/۸۰۸ء میں تعمیر کرنا تھا۔

دقاق کے دور حکومت میں شہر کا قدیم ترین شفاخانہ مسجد جامع کے مغرب میں تعمیر ہوا تھا، اسی طرح وہیں ۵۹۱ھ/۱۰۹۸ء میں پہلا مدرسہ الصادریۃ حنفیوں کے لیے بنایا گیا تھا۔

کسی زمانے میں دمشق کی اولین خانقاہ طاروسید میں دقاق اور اس کی والدہ صفوة الملک کے مقبرے موجود تھے لیکن اس خانقاہ کے آخری آثار ۱۹۳۸ء میں معدوم ہو گئے۔ یورپیوں کی حکومت میں علمی سرگرمیوں اور سبوں کی تبلیغ نے دمشق میں فروغ پایا۔ شافعیوں نے اپنا پہلا مدرسہ امینیۃ ۵۱۴ھ/۱۱۲۰ء میں قائم کیا تھا۔ لیکن حنبلیوں کا پہلا مدرسہ شرقیہ ۵۳۰ھ/۱۱۳۶ء سے پہلے تعمیر نہیں ہوا تھا۔ جب نورالدین نے دمشق فتح کیا تو اس وقت سات مدرسے قائم تھے لیکن ان میں سے کسی کا تعلق امام مالک کے مذہب سے نہ تھا۔

دمشق نورالدین کے عہد میں ۵۴۹ھ/۱۱۵۳ء میں نورالدین کی آمد سے شہر کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ دمشق میں اقامت گزراں ہو کر اس بادشاہ نے، جو پہلے ہی سے حلب کا فرمانروا بن چکا تھا، کلیسیا Cilicia کے دامن کوہ سے لے کر جلیل (Galilee) کے پہاڑوں تک پورے شام کے اتحاد کو ہٹا کر دیا۔ بنو امیہ کے دور کے پہلی بار دمشق پھر ایک وسیع، متعدد اور خود مختار اسلامی ریاست کا دارالحکومت بنا۔ نورالدین کی سیاست کی بدولت شہر میں خود اس کے اپنے کردار کی جہاں تک گئی، اور دمشق کو فاطمی ملاحدہ اور کافر افرنجیوں کے مقابلے میں راسخ اسلامی عقائد رکھنے والوں کے لیے پشت و پناہ کی حیثیت حاصل ہو گئی، مذہبی جوش و خروش اس زمانے میں ایک بار پھر عود کر آیا جس کا واحد مقصد یہ تھا کہ سنی

کہ یہ علم طب کی درسگاہ کا کام بھی دے۔ بارہویں صدی عیسوی میں دمشق کی یادگار عمارتوں کی صحیح فہرست ابن عساکر نے اپنی تاریخ مدینۃ دمشق کے دیباچے میں، جو مقامی جغرافیے سے متعلق ہے، دے دی ہے۔ نورالدین کے عہد کے آخر میں مساجد کی تعداد بڑھ کر فسیل شہر کے اندر دو سو بیالیس اور باہر ایک سو اٹھتر ہو گئی تھی۔

دور ایوبیہ: ۵۶۹ھ/۱۱۷۴ء میں نورالدین کی وفات پر اس کا بیٹا الملک الصالح اسماعیل، جس کا الایک امیر شمس الدولہ ابن المقدم تھا، اپنے باپ کی جگہ تخت نشین ہوا۔ دمشق میں، جہاں اس زمانے سے جب کہ صلاح الدین [رک بان] کا والد ایوب وہاں کا عامل تھا، ایوبیوں کے حامیوں کی ایک طاقتور جماعت موجود تھی؛ اب امرا طرح طرح کے منصوبے باندھنے لگے۔ نو عمر بادشاہ حلب بھیج دیا گیا اور شہر کا مختار ابن المقدم رہ گیا۔ اپنی حکومت کے استحکام کی خاطر اس امیر نے افرنگیوں سے ہتکالی صلح نامہ طے کیا مگر اس سے آبادی کے ایک حصے کی رائے اس کے سخت خلاف ہو گئی۔ صلاح الدین کے گماشتوں نے اسے حامی اسلام کی حیثیت سے پیش کر کے اہل دمشق کو اپنا ہم نوا بنا لیا۔ صلاح الدین نے، جو کسی زمانے میں نورالدین کا گُرد باجگذار تھا، جہاد کا علم بلند کیا اور ۵۷۱ھ/۱۱۷۶ء میں دمشق میں داخل ہو گیا۔ اگلے چند برسوں میں معرکہ کارزار متواتر گرم رہا۔ یہ تیسری صلیبی جنگ کا زمانہ تھا۔ مسلمانوں کے دل میں اس بھی تمنا تھی کہ کسی طرح افرنگیوں کو واپس سمندر کی طرف دھکیل دیں۔ آخر ۵۸۳ھ/۱۱۸۷ء میں فتح حطین [رک بان] کے بعد لشکر اسلام بیت المقدس میں واپس پہنچنے کے قابل ہو گیا۔ صلیبیوں کے ساتھ صلح کر لینے کے چند ماہ بعد خاندان ایوبیہ [رک بان] کے بانی صلاح الدین نے ۵۸۹ھ/۱۱۹۳ء کو دمشق میں وفات پائی۔

بہت اضافہ ہوا، خود نورالدین نے کئی مساجد کو درست یا تعمیر کرایا۔ سنی عقائد اور احادیث کی نشر و اشاعت میں خاص طور سے بڑی محنت اور کوشش سے کام لیا گیا اور نورالدین نے حدیث کی تعلیم دینے کے لیے پہلا مدرسہ دارالحدیث جاری کیا۔ اس چھوٹے سے مدرسے کے اب صرف کھنڈر باقی رہ گئے ہیں۔ اس کا پہلا معلم شافعی مؤرخ ابن عساکر تھا۔ کئی اور نئے مدرسے بھی تعمیر ہوئے، جن میں سے بیشتر شافعی یا حنفی مسلک سے متعلق تھے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب المدرسة المصالحیہ بنا شروع ہوا جسے صلاح الدین نے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ العادلیہ (جہاں اب عرب اکادمی قائم ہے) کے عظیم مدرسے کی تعمیر کی ابتدا کا سہرا نورالدین کے سر ہے۔ اس کی تعمیر کا آغاز ۵۶۷ھ/۱۱۷۱ء میں ہوا اور نصف صدی بعد ۶۱۹ھ/۱۲۲۲ء میں جا کر اس کی تکمیل ہوئی۔

ایک اور نیا ادارہ دارالعدل بھی نورالدین کا مرہون بنت ہے۔ یہی آگے چل کر دارالسعاده کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ انصاف کی عدالت عالیہ اس عمارت میں قائم تھی جو قلعے کے جنوب میں ہے۔ مساوات کے تقاضوں کے پیش نظر یہاں بادشاہ کے حکم سے چاروں مذاہب کے نمائندے قاضی القضاۃ کے پہاؤ میں بیٹھتے تھے۔

دمشقی عمارات میں نئی نئی شکلیں نمودار ہوئیں، جن سے عراق کا اثر ظاہر ہوتا تھا؛ خاص طور پر گنبد قابل ذکر ہے، جسے باہر کی جانب سے مقب (honey comb) بنایا جاتا تھا۔ یہ نمونہ نورالدین کے مقبرے اور اس سے ملحق مدرسے کے گنبد میں، جو ۵۶۷ھ/۱۱۷۱ء میں تعمیر ہوا اور مارستان کے باب الداخلہ کے قریب پر ملتا ہے، مؤخر الذکر کے پہاٹک کی طاقچوں سے تزئین کی گئی ہے۔ نورالدین ہی نے اس شفاخانے ("مارستان") کی تعمیر کی، جسے اسلامی فن تعمیر کی تاریخ میں اہم ترین حیثیت حاصل ہے؛ اور مقصد یہ تھا

اور اپنے بھتیجے داؤد کو برطرف کر کے ۵۶۲۵ھ/ ۱۲۲۸ء میں دمشق کی حکومت پر قابض ہو گیا۔

الکامل کی وفات پر، جو ۵۶۳۵ھ/ ۱۲۳۸ء میں العادل کی جگہ قاہرہ میں تخت نشین ہوا، دور زوال کا آغاز ہو گیا تھا۔ بھائیوں کے درمیان از سر نو لڑائیاں شروع ہو گئیں۔ الملک الصالح اسماعیل دمشق پر قابض رہنے کی خاطر اپنے بھتیجے الصالح ایوب والی مصر کے مقابلے میں افرنگیوں کے ساتھ مل گیا۔ ۵۶۳۳ھ/ ۱۲۳۵ء میں ایوب نے خوارزمیوں کی مدد سے اس پر فتح پائی اور ایک بار پھر دمشق حکومت قاہرہ کے تحت آ گیا۔ ایوب نے ۵۶۳۶ھ/ ۱۲۳۸ء میں وفات پائی۔ اس کا بیٹا توران شاہ لا پتہ ہو گیا اور غالباً چند ماہ بعد قتل کر دیا گیا، اور ۵۶۳۸ھ/ ۱۲۵۰ء میں فرمانروائے حلب الملک اناصر یوسف نے دمشق پر قبضہ کر لیا۔ وہ یہاں کا آخری ایوبی بادشاہ تھا۔ مغول کا خطرہ اب بالکل سر پر سٹڈلے لگا تھا، ۵۶۵۶ھ/ ۱۲۵۸ء میں بغداد کا سقوط ہوا اور دو سال نہ گزرنے پائے تھے کہ شامی دارالحکومت کی بھی باری آ گئی۔

اس میں شک نہیں کہ نورالدین کے برسر حکومت آ جانے سے دمشق کا احیاء شروع ہو گیا تھا، لیکن صلاح الدین کے عہد حکومت کے حالات ایسے تھے کہ شہر کی ترقی کی رفتار مست رہی۔

دور ایوبیہ میں جب دمشق پھر ایک بادشاہ کا دارالحکومت قرار پایا تو دوبارہ ترقی کا آغاز ہوا۔ آبادی میں اضافے اور اس اضافے کی وجہ سے نئے نئے وسائل دولت کی فراہمی سے یہاں کی عام معاشی زندگی پر بھی خوشگوار اثر پڑا، جو اس لیے اور بھی نمایاں ہوا کہ العادل اور اس کے جانشینوں کے برسکون دور نے بڑی بر امن فضا پیدا کر دی تھی۔ ان معاشی سرگرمیوں میں ترقی کے ساتھ ساتھ تجارتی روابط بھی بڑھنے لگے۔ اس زمانے سے دمشق میں اطالوی تاجروں کی باقاعدہ آمد کا آغاز ہو گیا۔ صنعت و حرفت میں پور ترقی شروع ہوئی: یہاں

تدفین پہلے تو قلعے کے اندر عمل میں لائی گئی، لیکن بعد ازاں میت کو مسجد جامع کے شمالی جانب مدرسة العزیزہ میں منتقل کر کے باقاعدہ رقد بنا دیا گیا۔ سلطان موصوف کی وفات کے بعد اس کے دو بیٹوں اور بھائی کے درمیان شدید جنگ چوڑ گئی۔ الافضل [رک بان] چاہتا تھا کہ دمشق پر، جو ۵۵۸۲ھ/ ۱۱۸۶ء میں آسے باپ کی طرف سے بطور جاگیر ملا تھا، اپنا قبضہ برقرار رکھے، لیکن ۵۵۹۲ھ/ ۱۱۹۶ء میں اس کے چچا العادل نے اسے وہاں سے بھگا دیا اور اپنے دوسرے بھتیجے العزیز کی حکومت تسلیم کر لی، جو قاہرہ میں صلاح الدین کا وارث قرار پایا تھا۔ تین برس بعد العزیز بھی وفات پا گیا اور طویل تنازعات کے بعد بالآخر ۵۵۹۷ھ/ ۱۲۰۰ء میں العادل کو خاندان ایوبیہ کا سربراہ تسلیم کر لیا گیا۔ صلاح الدین کے اس روحانی وارث کے زیر حکومت اعلیٰ نظم و نسق اور سیاسی امن و اطمینان کا دور شروع ہوا۔ اس زمانے سے قاہرہ سلطنت کا صدر مقام ہو گیا تھا، لیکن دمشق کو دستور اہم سیاسی، عسکری اور معاشی مرکز کی حیثیت حاصل رہی۔ العادل نے ۵۶۱۵ھ/ ۱۲۱۸ء میں دمشق کے نزدیک وفات پائی اور مدرسة العادلہ میں مدفون ہوا۔ الملک المعظم عیسیٰ نے، جو ۵۵۹۷ھ/ ۱۲۰۰ء سے شام میں اپنے والد کا نائب تھا اور جس نے ۵۶۰۳ھ/ ۱۲۰۷ء میں یہ صوبہ جاگیر میں پایا تھا، دمشق میں اپنی خود مختاری قائم رکھنے کی کوشش کی، لیکن سیاسی زندگی کے نشیب و فراز اور جوڑ توڑ سے مجبور ہو کر وہ ۵۶۲۲ھ/ ۱۲۲۶ء کے شروع میں خوارزم شاہ جلال الدین [رک بان] کا نام خطبے میں پڑھوانے لگا اور یوں شہر دمشق پر خوارزم شاہ کی برائے نام سیادت قائم ہو گئی۔ ۵۶۲۴ھ/ ۱۲۲۷ء میں المعظم کی وفات پر اس کا بیٹا الملک الناصر داؤد اپنے اٹابک عزالدین ایبک کے زیر ولایت وارث تخت ہوا۔ اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد امیر الاشرف دیار مضر سے آہنچا

عام خوشحالی کی بدولت آلِ ایوب نے علما اور مصنفین کی ایسی دریا دلی سے سربِ پرستی کی جس کی مثال نہیں ملتی۔ اس زمانے میں دمشق مسلمانوں کی ثقافتی زندگی ہی کا نہیں بلکہ دینِ مبین کا حصّہ حصّہ بنی تھا۔ اس خاندان کے طریقِ عمل میں تبلیغی رجحانات کا اظہار اس سے ہوتا ہے کہ اس کے سربراہوں نے ساجوقوں اور زنگیوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے دینِ اسلام اور اس کے سلسلہ عقائد کی تبلیغ و اشاعت کی حتی الامکان حوصلہ افزائی کی۔ شیرِ عسکری تعمیرات کو بھی اس دور میں بہت فروغ ہوا۔ شہزادیاں اور شہزادے، اہلِ اور عمائدین اور عمالِ حکومت مقدس عمارتوں کی تعمیر میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرنے لگے اور ایک قلیل مدت میں دمشق مدارس کا شہر بن گیا۔ ان کی تعداد، جو ابنِ جبّیر نے ۸۱۸ھ/ ۱۷۷۷ء میں بیس بتائی ہے، ایک ہی صدی میں اس سے چوگنی ہو گئی تھی (ایوبی مدارس کے بارے میں دیکھیے Herzfeld در *Ara Islamica*، ۱۱ - ۱۲ : ۷۱ تا ۷۲)۔ اس زمانے سے مساجد کی طرح مدرسے بھی اکثر اوقات مع اپنے درسی اور تعلیمی و متعلّیّین کے رہنے کے کمروں کے اپنے بانی کے مقبرے سے ملحق بنائے جانے لگے (مثال کے لیے دیکھیے العادلیہ اور المعظمیہ)۔ اسی زمانے میں ”مقبرہ“ مدرسوں سے مربوط ہونے کی وجہ سے دمشق میں انک، مخصوص قسم کی ”تربّۃ“ منظر عام پر آنے لگی۔ یہ مقبرہ (تربّۃ) ایک مربع کمرے پر مشتمل ہوتا تھا جس کی دیواریں استرکاری کے نقوش سے مزین ہوتی تھیں۔ اس کے اوپر چار نیم دائرہ طاقچے اور چار سطح طاقچے جنہیں متناسب فاصلوں پر رکھا جاتا تھا، مل کر ایک ہشت پہلو صورت اختیار کر لیتے تھے۔ اس کے اوپر یکساں عرض و طول کے سولہ طاقچوں سے ڈھول نما سطح تیار کرتے جس پر ایک شانزدہ پہلو گنبد تعمیر ہوتا تھا۔ مربع عمارت پر گنبد بنانے کی یہ ایک، مخصوص صورت تھی۔ اس کی اولین مثال، جس

کی رہنمائی زربفت کی شہرت بدستور قائم رہی، سادہ یا کوفت کاری کے مسی برتن، ملحق کی ہوئی شیشے کی اشبا اور برصے کی دباغت شدہ کھانوں کی بڑی مانگ تھی۔ اسواق یا منڈیوں میں بے حد چہل پہل رہتی تھی، شہر میں قیصریوں کے ساتھ ساتھ بنے ہوئے گوداسوں (فندقوں) کی تعداد میں بہت اضافہ ہو گیا اور دارالوکالۃ نے، جو تجارتی شراکتوں کی ذخیرہ گاہ تھی، بڑی اہمیت حاصل کر لی۔

افراد خاندان کی خواہش تخت و تاج، نیز افرنگیوں کے خطرے کی روک تھام کو مضبوط کرنے کے لیے اور اپنے دفاعی نظام کو عسکری فنون کی جدید ترین ترقیوں کے مطابق بنانے کی غرض سے آلِ ایوب نے دمشق کی فصیل اور قلعے میں تبدیلیاں اور اصلاحیں کیں۔ فصیل کی مضبوطی کا کام محض بڑے دروازوں ہی پر ہوا۔ ۸۶۰ھ/ ۱۲۰۷ء میں المعظم عیسیٰ نے بابِ مشرق اور بابِ الصّغیر کو مستحکم کیا؛ الناصر داؤد نے ۸۶۲ھ/ ۱۲۲۷ء میں بابِ توما دوبارہ بنوایا؛ بابِ الفرج ۸۶۳ھ/ ۱۲۳۹ء میں از سر نو بنایا گیا اور آخر الامر الصّالح ایوب نے ۸۶۴ھ/ ۱۲۴۱ء میں بابِ السلام کو اس طرح ایک نئی صورت دی کہ اس کے ساتھ ایک مربع برج کا اضافہ کر دیا جو آج بھی فصیل کے شمال مشرق گوشے پر نظر آتا ہے۔ قلعے کی مکمل طور پر از سر نو تعمیر ہوئی۔ یہ کام جس پر دس برس صرف ہوئے، ۸۶۴ھ/ ۱۲۰۷ء میں شروع کیا گیا تھا۔ قلعے کے اندر سلطان کی سکونت کے لیے ایک نیا محل تعمیر کیا گیا؛ اس کے ایک کمرے کے اندر تخت رکھا جاتا تھا؛ نئی عمارتیں بنا کر ان میں فوجی دفاتر اور دیوانی محکمے قائم کیے گئے۔ موجودہ زمانے تک جو انتظامات چلے آتے ہیں، ان کی ابتدا اسی دور میں ہوئی تھی۔ اگرچہ مغول نے قلعے کو نذرِ آتش کر کے منہدم کر دیا تھا، تاہم ساتویں/ تیرھویں صدی کے برجوں میں سے دو ابھی تک اپنی اصل حالت میں قائم ہیں۔

جس کا قبضہ قیصری کے طاقتور کرد خاندان نے سلطان مصر کی فوج کے حوالے کر دیا۔ شہر کے عیسائی اپنے اس رونے کی بدولت جو انہوں نے مغول کے ساتھ روا رکھا تھا، کسی قدر انتقامی کارروائی کا شکار ہوئے۔ اب دمشق کی جگہ قاہرہ نے لے لی، جہاں ۱۲۵۶ء/۶۵۸ھ سے ایک برائے نام خلافت چلی آرہی تھی۔ دمشق سیاسی اعتبار سے مصر کا مانتا صوبہ ہو کر رہ گیا۔

ہاں ہمہ یہ شہر صوبہ شام یا دوسرے الفاظ میں مملکت یا ایالة الدمشقی کا اہم ترین شہر متصور ہوتا تھا (اس کی انتظامیہ کے لیے دیکھیے Gaudefroy پیرس ۱۹۲۳ء ص ۱۳۵ تا ۲۰۱)۔ پہلے جلیل القدر مملوک سلطان الملک الناصر قیصری (ارک بان) نے دمشق پر خاص توجہ مبذول کی اور اپنے عہد حکومت (۱۲۵۸ء/۶۵۸ھ تا ۱۲۶۰ء/۶۶۰ھ) کے دوران میں اکثر وہاں جاتا رہا۔ اس نے فلے کو از سر نو درست کیا، کیونکہ شہر میں وزود سلطانی کے موقع پر یہی شہابی فرود گاہ بنتا تھا۔ اس میں ٹکسال، سلاح خانہ، فوجی ضروریات کا گودام، حوراک کی ذخیرہ گاہیں، ایک چکی اور چند دکانیں بھی تھیں (دیکھیے L. A. I. Sauvaget، *Citadelle de Damas*، در Syria، ۱۱، (۱۹۳۰ء) : ۵۰ تا ۹۰، ۲۱۶ تا ۲۳۱)۔

قیصری نے میدان الأخضر میں، جو شہر کے مغرب میں واقع تھا، ایک محل تعمیر کرایا جس میں سیاہ اور ہلکے بادامی رنگ کے رتے جمائے گئے تھے۔ یہ مشہور قصر اہلق تھا جس کے انور نے ہر آئندہ سلطان محمد بن قلاوون نے قاہرہ میں محل بنوایا۔ چند صدیوں کے بعد دسویں صدی ہجری/سولہویں صدی عیسوی میں ترک سلطان سلیمان نے اس عمارت کی جگہ پر ایک ”تکیہ“ یا خانقاہ بنوا دی۔ ۱۲۷۶ء/۶۷۶ھ میں قیصری نے قصر مذکور میں وفات پائی اور اپنے بیٹے الملک الشہید

کی تاریخ ہمیں معلوم ہے، مقبرہ زین الدین ہے، جو ۱۲۷۶ء/۶۷۶ھ میں تعمیر ہوا تھا۔ اس قسم کی جو یادگار عمارتیں آج بھی سلامت ہیں، ان میں حسب ذیل چھٹی/بارہویں صدی کی ہیں: تربة البدری، مدرسة النجعة، مدرسة العزیزية، جہاں صلاح الدین کا مقبرہ واقع ہے، اور مقبرہ ابن سلامة، جو ۱۲۶۱ء/۶۶۱ھ میں تعمیر ہوا۔ انوی فن تعمیر کی ممتاز ترین خصوصیت اس کا حسن تناسب ہے۔ ان عمارتوں کی روکاریں تراشیدہ پتھر کے وزوں جو کون سے بنائی گئی ہیں۔ ان میں سنگ بسل (Basalt) اور چونے کے پتھر یکے بعد دیگرے لگا کر آرائش کی ایک خوبصورت شکل نکالی گئی ہے۔ اس کی سب سے عمدہ مثال مدرسة قنیجہ ہے، جو ۱۲۵۱ء/۶۵۱ھ میں مکمل ہوا۔ گنبدوں کا حجم ایسا ہے کہ وہ شہری عمارات کے پس منظر کا ایک طبعی حصہ بن گئے ہیں۔

ساتویں صدی ہجری / تیرہویں صدی عیسوی کا شمار دمشق کے زرائع ادوار میں ہوتا ہے۔ دمشق ایک بار پھر سیاسی، تجارتی، صنعتی، عسکری، علمی اور مذہبی مرکز بن گیا۔ جو عمارتیں اس شہر کے لیے ابھی تک باعث زینت ہیں، ان میں سے بیشتر اسی دور میں تعمیر ہوئی تھیں۔

دور ممالیک (۱۲۶۰ء/۶۶۰ھ تا ۱۲۶۰ء/۶۶۰ھ) : جب ربیع الاول ۱۲۵۸ء/مارچ ۱۲۶۰ء میں علاؤ کوکی فوجیں دمشق میں داخل ہوئیں تو اس شہر کی تاریخ یکسر بدل گئی۔ یہاں کا عامل فرار ہونے پر مجبور ہو گیا، محافظ دستوں کو جنوب کی جانب پسپا ہونا پڑا اور یہاں کا فرمانروا الملک الناصر اور اس کے بچے قید کر لیے گئے۔ خاندان ابوبند ختم ہو گیا۔ حملہ آور فوجوں کی پیش قدمی عین جاؤت (ارک بان) کے مقام پر روکی گئی، جہاں مملوکوں نے امیر قوطوز اور امیر بیبرس کی سپہ سالاری میں مغول کو راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس پر انہوں نے دمشق خالی کر دیا،

کے حکم کے مطابق مدرسۃ الظاہریہ میں ، جہاں آج کل کتب خانہ ملی واقع ہے ، دفن ہوا۔ اس کے سترہ سالہ طویل عہد حکومت میں دمشق میں صرف چار عامل مقرر ہوئے ، لیکن اس کی وفات کے بعد شہر کو سیاسی بے چینی کے ایک طویل دور سے گزرنا پڑا ، جس کے دوران میں وقتاً فوقتاً بغاوتیں بھی برپا ہوتی رہیں ۔

سلطنت میں دوسرا سب سے اہم شہر دمشق ہی رہا ۔ اس کے والی کے منصب پر بالعموم حلب کی نیابت سے آنے والے کسی ممتاز مسلمان کو مقرر کیا جاتا تھا ۔ قلعے میں ایک عامل کی موجودگی سے والی دمشق اور سلطان کے درمیان کسی مقابلے یا رقابت کا امکان معدوم ہو گیا تھا ۔ بالفاظ دیگر اب یہاں کے عامل دو ہوتے تھے ، ایک تو نائب شہر ، جسے پروانہ تقرر سلطان کی جانب سے عطا ہوتا تھا اور جو قلعے کے جنوب میں دارالسعادة میں رہتا اور وہیں دربار لگاتا تھا اور دوسرا نائب قلعہ ، جسے ایک خصوصی مرتبہ حاصل تھا اور جو سلطان کا ذاتی نمائندہ تصور کیا جاتا تھا ۔ ان دونوں حاکموں اور ان کے اپنے اپنے طبقوں کے امرا کے درمیان مسلسل رقابتیں سلطان کی سیادت برقرار رہنے کی کافی ضمانت تھیں ۔ جب کبھی قاہرہ میں سلطان کی تبدیلی عمل میں آتی تو بالعموم والی دمشق بغاوت کا علم بلند کر دیتا ۔ چنانچہ جب تیسرے کا بیٹا السعيد تخت سے معزول کیا گیا اور سلطان الملك المنصور قلاوون [رک بان] نے اس کی جگہ سنبھالی تو یہاں کے والی مستورا لاشقر نے اس کی حکومت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ۔ امرا کی اعانت اور مشہور عالم مؤرخ ، قاضی القضاة ابن خلیکان کے ایک فتوے سے تقویت پا کر مستور نے قلعے پر قبضہ کر لیا اور حاکم قلعہ نجین [لاجین] کو گرفتار کر کے جمادی الآخرہ ۷۶۷ھ / اکتوبر - نومبر ۱۲۷۸ء میں اپنے سلطان ہونے کا اعلان کر دیا ۔ اس نے اپنے نام کا خطبہ پڑھوانا شروع کیا ، تا آنکہ

بعض دمشق دستوں کے اختلاف کی بدولت صفر ۷۶۷ھ / جون ۱۲۸۰ء میں قلاوون کی فوجوں نے اس پر فتح پائی اور مستور الرجیمہ کی طرف بھاگ گیا ، جو دریائے فرات کے کنارے واقع ہے ۔ نجین کو ، جو اب آزاد ہو چکا تھا ، شہر کا والی مقرر کر دیا گیا ۔ ہر لیا سلطان اکثر والیوں کو تبدیل کر دینے کا فیصلہ کیا کرتا تھا ؛ چنانچہ الملك العادل کتبغا کی تخت نشینی کے موقع پر عزالدین ایبک کو ۷۶۵ھ / ۱۲۹۶ء میں اس عہدے سے سبکدوش کر دیا گیا ، اور اس کی جگہ سلطان نے شجاع الدین آچرا کو نامزد کیا ۔ کتبغا کی معزولی کے بعد ، جسے قلعہ دمشق میں قید کر دیا گیا تھا ، نجین نے ، جو سلطان بن گیا تھا ، ۷۶۶ھ / ۱۲۹۷ء میں سیف الدین قچاق کو والی مقرر کیا ۔ مؤخر الذکر نے اپنی خدمات شاہ غازان [رک بان] کے سامنے پیش کر دیں اور جب شاہ مذکور نے شام پر بغاوتی تو اس نے اس کی رفاقت اختیار کی ۔ ۷۶۹ھ / ۱۳۰۰ء میں مغول لشکر دمشق میں داخل ہوا ۔ اس نے مسجد جامع پر قبضہ کر لیا مگر قلعے کو تسخیر کرنے میں ناکام رہا جہاں مسلمانوں نے سورجہ بندی کر لی تھی ۔ ان دونوں سرگروں کے درمیان شہر کا جو علاقہ تھا آجے شدید نقصان پہنچا اور نور الدین کا [تعمیر کردہ] دارالحدیث بھی اس کی زد میں آ گیا ۔ جب مغول نے شہر کو چھوڑا تو قچاق مدبر گیا اور ایک بار پھر نئے سلطان الملك الناصر محمد بن قلاوون کے ساتھ مل گیا ۔ ۷۷۰ھ / ۱۳۰۳ء میں مغول کی جانب سے ایک نیا خطرہ شہر پر منڈلانے لگا تھا ، لیکن ان کی پیشقدمی روک دی گئی ۔ ۷۷۲ھ / ۱۳۱۲ء کے اوائل سے محمد بن قلاوون کے تیسرے دور حکومت میں تنکیز دمشق کا والی مقرر ہوا ۔ وہ صحیح معنوں میں حکومت کی صلاحیت رکھتا تھا اور اس کے اقتدار کو امراے شام نے تسلیم کر لیا ۔ وہ نہ صرف برائے نام بلکہ در حقیقت شام کا نائب السلطان تھا ۔ اس نے یہاں سلطان کا وقار قائم رکھا جس کی نمائندگی کا فرض اس

حاب کے ایک والی پُلُغہ [دبیل بوغا] الناصری کے قبضے میں چلا گیا، جو سلطان مصر سے باغی ہو گیا تھا۔ شام پر قبضہ کر لینے کے بعد وہ دمشق کی قسبل سے گزر کر شہر میں داخل ہوا اور برفوق کی بھیجی ہوئی ایک فوج کو شکست فاش دے کر مصر کی جانب بڑھا۔ اب کے خود اس نے شکست کھائی لیکن شعبان ۵۹۲ھ/ جولائی۔ اگست ۱۳۹۰ء میں ہم اسے ایک بار پھر والی دمشق کے عہدے پر فائز دیکھتے ہیں۔

اگرچہ برفوق کو تیمور کی پیش قدمی کی اطلاع مل چکی تھی تاہم اُسے اپنے ملک کے دفاع کو مزید مستحکم کرنے کی فرصت نہ ملی اور ۸۰۱ھ/ ۱۳۹۹ء میں وفات پا گیا۔ دمشق میں سیف الدین تنیک نے، جو بہان ۵۹۵ھ/ ۱۳۹۳ء سے حکومت کر رہا تھا، نئے سلطان قرج کے خلاف بغاوت کر دی اور مصر پر چڑھائی کرنے چلا۔ غزہ کے قریب اُسے شکست ہوئی، وہ گرفتار ہوا اور دمشق میں موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔ امرا کی باہمی رقابتوں نے شام کو بارہ بارہ کر دیا تھا چنانچہ اس پر تیمور کا قبضہ بڑی آسانی سے ہو گیا۔ مغل سپہ سالار بڑھتے بڑھتے دمشق تک آ پہنچا اور یہیں شہر کے قریب اس کے پڑاؤ میں جا کر ابن خلدون نے تیمور سے ملاقات کی جو تاریخ میں یادگار ہے۔ سلطان قرج، جو برفوق کے بھتیجے امیر مدن کی مدد پر آیا تھا، اپنے ساتھیوں کے مسلسل ساتھ جھوڑ دینے کے باعث واپس جانے پر مجبور ہوا۔ شہر [دمشق] کی (تیموری) تسخیر کے بعد لوٹ مار کی عام اجازت مل گئی تھی۔ قلعہ ایک ماہ تک مقابلے میں ڈٹا رہا۔ آتش زنی کی کئی وارداتوں سے شدید نقصان پہنچا اور بہت سے افراد جان سے گئے۔ اس آفت سے جامع کبیر تک نہ بچ سکی اور لہ دارالسعادة محفوظ رہا۔ ۸۰۳ھ/ ۱۴۰۱ء میں تیمور دمشق سے رخصت ہوا مگر یہاں کے تمام

نے وہ صدی سے زیادہ مدت تک انجام دیا۔ اس زمانے میں دمشق کو جو خوشحالی نصیب ہوئی اس کے باعث علمی و فکری سرگرمیوں نے بڑا فروغ پایا۔ یہ مصلح اسلام ابن تیمیہ اور ورخ الصفدی کا زمانہ تھا۔ ۵۱۷ھ/ ۱۳۱۷ء میں تنیک نے وہ مسجد تعمیر کی جس کے احاطے کے باہر آگے چل کر اس کا مقبرہ تیار ہوا۔ چند برس بعد اس نے دمشق کی جامع کبیر کی بھی مرمت کروائی۔ آخر الامر ۵۳۹ھ/ ۱۳۴۹ء میں اس نے ایک دارالحدیث کی بنیاد رکھی۔ نئے سلطان الملک ابوبکر کی تخت نشینی پر دفعۃً وہ عتاب سلطانی کا مورد بن گیا۔ چنانچہ ذوالحجہ ۵۴۰ھ/ جون ۱۳۴۸ء میں وہ گرفتار ہو کر سکندریہ میں قید کر دیا گیا جہاں وہ زہر خورانی سے فوت ہوا۔

۵۴۳ھ/ ۱۳۴۸ء [بہ تصحیح ۱۳۳۰ء سے ۵۸۴ھ/ ۱۳۸۲ء تک وہ زمانہ تھا جب ابن بطوطہ اسلامی بلاد مشرق کی سیاحت کر رہا تھا۔ اس دوران میں بارہ ہجری سلاطین یکے بعد دیگرے قاہرہ کے تخت پر بیٹھے اور درجن یور والی، نائب شہر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ان میں سے چند ایک کئی دفعہ شہر کی تدبیر کے مالک رہے۔ یہ ایک مسلسل کشاکش کا زمانہ تھا جو کسی نہ کسی کی آرزو سے ملک و دوات کے باعث جاری رہتی تھی اور "زعر" کی دراز دستی اسے اور بھی ہوا دیتی تھی، کیونکہ یہ شہری سپاہ، جس کا اصل مقصد شہر کا دفاع تھا، اپنے فرائض منصبی کو نظر انداز کر کے شہری آبادی کو دہشت زدہ کرتی رہتی تھی اور اکثر اوقات اس کی کوئی روک تھام بھی نہ ہوتی تھی۔

۵۴۳ھ/ ۱۳۸۲ء [بہ تصحیح ۱۳۳۸ء میں برفوق [رک بان] کی تخت نشینی سے چرکسی (Circassian) سلاطین کا ایک لبا خالداں بر سر اقتدار آ گیا جسے برجیہ بھی کہا جاتا ہے۔

۵۹۱ھ/ ۱۳۸۹ء میں چند ہفتوں کے لیے دمشق

یہ عجیب اجتماع ضلین ہے کہ شہر میں عمارتوں کی ایک بہت بڑی تعداد اسی المناک دور میں تیار ہوئی۔ معالیک کی زندگی کا لہج کچھ ایسا تھا کہ اپنے مستقبل کے بارے میں وہ وثوق سے کچھ بھی نہیں کہہ سکتے تھے، مگر انہوں نے اپنے لیے کم از کم آخری آرام گاہوں کا بندوبست ضرور کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ انہوں نے بہت کم مدارس تعمیر کیے لیکن مقبروں اور مقبرہ مسجدوں کی تعداد میں بہت اضافہ ہو گیا۔

اس عہد کے فن میں کہیں کہیں جدت نظر آتی ہے، کیونکہ یہ نیا حکمران خاندان اسلامی فنی روایات کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ اپنے اوائل عہد میں معالیک نے ابوبی اسلوب کے مطابق عمارتیں بنوائیں۔ مدرسۃ الظاہریۃ، جو اب کتب خانہ ملی ہے اور جہاں بیترس کا مقبرہ واقع ہے، دراصل الاقبیٰ کا گھر تھا، جہاں صلاح الدین کا والد ایوب مقیم رہا تھا۔ ۶۶۷ھ/۱۲۷۷ء میں اس کے اندر جو تبدیلیاں عملی میں لائی گئیں وہ ایک گنبد اور ایک شش پہلو دروازے کے اضافے تک محدود رہیں۔

دہرے مقبرے کو لئی طرز کی واحد عمارت کہا جا سکتا ہے۔ سلطان کتبغا کا پرانا مقبرہ، جو ۶۹۵ھ/۱۲۹۶ء میں تعمیر ہوا تھا، دمشق میں اس طرز کی پہلی مثال تھا۔

۷۷۷ھ/۱۳۷۶ء میں پلٹے، جو آن دنوں شہر کا عامل تھا، ایک عمارت ایک سابقہ مسجد کی جگہ وقوع پر بنوائی، جس کا نقشہ اسے مسجد جامع کو دیکھ کر سوجھا تھا۔ موجودہ میدان المرجہ کے تواج میں یہی وہ مسجد تھی جہاں پر لیا عامل شہر میں رعب داب کے ساتھ داخل ہونے سے قبل خلعت زیب تن کیا کرتا تھا۔

صناعی کا زوال، جس کے آثار آٹھویں صدی ہجری/

باقی ماندہ باغیہ معماروں اور کاریگروں کو اپنے ساتھ سمرقند لے گیا۔ وسیع پیمانے پر آبادی کا یہ انخلا شہر کی تاریخ کے عظیم ترین حادثات میں شمار ہوتا ہے۔ مغول کی رخصت کے بعد امیر تغری بڑی الظاہری اس تباہ شدہ شہر کا، جو اپنی دوات اور آبادی سے محروم ہو چکا تھا، عامل بنا۔ علاقے میں دم نہ رہا تھا اور اسے ہزاروں مشکلات کا سامنا تھا۔ بارے دو بادشاہوں کے طویل عہد حکومت نے دمشق کو اپنے کھنڈروں سے ابھرنے کا موقع دیا۔ ہمارا مطلب سلطان بیس باے (۸۲۵ھ/۱۴۲۲ء تا ۸۴۱ھ/۱۴۳۸ء) اور اس سے بھی زیادہ اہم قانت باے [رگ باک] کے عہد سے ہے جو ۸۷۲ھ/۱۴۶۸ء سے ۸۹۵ھ/۱۴۹۵ء تک جاری رہا اور ملک میں امن و سکون کا ایک طویل دور لانے کا باعث بنا۔ علاوہ بریں ۱۶ شعبان ۱۰ رمضان ۸۸۲ھ / ۲۳ نومبر اور ۱۶ دسمبر ۱۴۷۷ء کے مابین یہ سلطان خود دمشق آیا۔ اس زمانے میں یہاں کا عامل امیر قنچس تھا۔

سیاسی ہنگاموں کی وجہ سے ایک طرف حکومت کے محاصل میں زبردست کمی واقع ہو گئی تھی اور دوسری جانب اس کے اخراجات حد سے بڑھ گئے تھے۔ میزانیہ کو متوازن کرنے کے لیے حکومت وقت مزید محصول لگانے پر مجبور تھی، جس سے رعایا کی مالی پریشالیوں میں اضافہ ہوا ناگزیر تھا۔ اس سے نئے سیاسی ہنگامے پرورش پاتے، جن کو فرو کرنے کے لیے حکومت بعض اوقات تشدد کرنے پر مجبور ہو جاتی۔ اس صورت حال کا بالآخر خاتمہ قانصوہ القوری (۵۰۵ھ/۱۵۰۰ء تا ۵۲۲ھ/۱۵۱۶ء) کا عہد حکومت آنے ہی سے ہوا۔ اس آخری مملوک سلطان کو آل عثمان کے مقابلے میں، جنہوں نے شام پر حملہ کر دیا تھا، اپنا دفاع کرنا پڑا۔ وہ رمضان ۵۲۲ھ/وسط اکتوبر ۱۵۱۶ء میں جنگ میں مارا گیا اور سلطان سلیم اول کی فوجیں دمشق میں داخل ہو گئیں۔

صنعت میں خصوصیت حاصل کر لی۔ کاروبار کی ترقی سنڈیوں ("اسواق") کی انہی توسیعات سے نمایاں ہوتی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ مختلف تجارتی علاقے اپنے گاہکوں کی انعام کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بالکل ایک ایک ہوتے جاتے تھے۔ ایک نیا محلہ تحت قلعہ، شہر کے شمال مغرب میں قلعے کے نیچے آباد ہو گیا، سوق النخیل میں، جس کا کھلا میدان دستور عسکری زندگی کا مرکز رہا، بہت سے کاریگر آ رہے، جن کے گاہکوں کا تعلق بنیادی طور پر فوج سے تھا اور جنہوں نے اندرون شہر میں اپنی دکانیں دوسرے کاریگروں کے حوالے کر دی تھیں۔ پھنوں اور سبزیوں کا تھوک بیوپار بھی بیرون شہر منتقل ہو گیا۔ اَلْعُقْبہ میں، جہاں امرا اور ان کے ارکان چند رہتے تھے، ایک نیا داراللبطیخ قائم ہوا۔

نویں صدی ہجری / پندرھویں صدی عیسوی کے وسط میں ایک اقتصادی بحران کے اوّلین آثار ظاہر ہونے لگے۔ سرکاری خزانہ خالی ہو چکا تھا اور اس کا کاروبار صرف دفع الوقتی کی تدبیروں سے چل رہا تھا، لیکن جیسا کہ Ludovico de Varthema (Itineraria) ج ۵ تا ۷، جو ۱۵۰۷ء / ۱۵۱۲ء میں دمشق آیا تھا، اور اس جیسے دوسرے سیاحوں کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے، تجارت کی گرم بازاری ابھی تک جاری تھی۔ یورپ اور اسلامی ممالک مشرق کے درمیان زوردار تجارت نے شہر کو بڑا فائدہ پہنچا۔ یورپ سے زعفران بکثرت یہاں آتے تھے اور خوب کاروبار کوٹے تھے، لیکن وہ اہل دمشق سے، جو خود سیلے تاجر تھے، کسی قسم کی تجارتی اجارہ داری حاصل نہ کر سکے۔ یہ سوداگر سب سے بڑھ کر فلانڈرز Flanders کا کپڑا تھے اور ریشمی زربفت، تانبے کے کواک کاری یہاں لائے کے برتن، مینا کیا ہوا شیشے کا سامان لاد کر یہاں سے رخصت ہو جاتے تھے۔ راس امید کا بحری راستہ دریافت ہو جانے کے بعد بھی اس کے اثرات فوری طور پر

چودھویں صدی عیسوی کے دوران میں واضح تر ہوئے لگے تھے، نویں صدی ہجری کے اوائل میں قبور کی غارت گری کے بعد دوری طرح منظر عام پر آ گیا۔ اب ہر چیز بازاری ہیئت پر قربان کی جانے لگی۔ بڑی بڑی عمارتیں محض نمائشی آرائش کے لیے بنائی جاتی تھیں اس ذوق خوشنمائی کا اظہار ان میناروں میں ہوا جن کی لائیں کثیر الاضلاع بنائی جاتی تھیں اور اوپر بہت سے چھوڑے اور توڑے یعنی آگے بڑھے ہوئے چھتے تیار کیے جاتے تھے اور ان کی کثرت اور یک رخ منظر سے پورے شہر کا فضائی نظارہ یکسر بدل گیا۔ اس کی پہلی مثال جامع ہمام کا مینار تھا، جو ۸۸۳ء / ۱۴۷۷ء میں تعمیر ہوا۔ رنگ برنگ کی روکاریں بہت مقبول ہو گئیں بلکہ ان میں ارضیع بھی کی جانے لگی۔ مسجد الصبونیۃ، جو ۸۶۸ء / ۱۴۶۸ء میں مکمل ہوئی اور سب سے کا مقبرہ مدرسہ، جو جامع الخرافین کے نام سے مشہور ہے اور نویں صدی ہجری / سولہویں صدی عیسوی کے ابتدائی برسوں میں تعمیر ہوا، آخری مملوک فرمانرواؤں کے عہد میں فن تعمیر کے زوال کی دو ممتاز مثالیں ہیں۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ بیشتر مملوک یادگاریں فصیل شہر سے باہر تعمیر ہوئیں، فصیل شہر کے اندر گنجائش باقی نہیں رہی تھی اور شہر گویا جھاک پڑا تھا، وجہ اس کی وہی اجتماع اعداد معجوبہ، کہ "اس المناک دور میں اقتصادی سرگرمیوں کو انتہائی فروغ حاصل ہوا تھا"۔ پچھلی چند صدیوں میں وہ تمام صنعت و حرفت جس کی ترقی سلاطین کی سرپرستی کی مرہون بنت تھی، اب اس کے فروغ کا انحصار فوجی امرا پر تھا، جو امیرانہ ٹھانڈے سے زندگی گزارنا کرتے تھے۔ دمشق حوران کے غلے کی ایک بہت بڑی سنڈی قوت تھی، اب وہ ایک بڑا صنعتی شہر بھی بن گیا اور اس نے سامان تعمین اور اسلحہ کی

۱۵۲۱/۹۲۷ء میں سلیم اول کی وفات پر والی دمشق نے سلطان سلیمان کی حکومت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، اپنی خود مختاری کا اعلان کیا اور قلعے پر قابض ہو گیا۔ چنبردی طرابلس، شام، حص اور حماہ کو اپنے مقبوضات میں شامل کر کے حلب کی طرف بڑھا اور اس کا محاصرہ کر لیا، مگر ناکام رہا اور واپس دمشق آ گیا۔ سلیمان نے [اسے کچلنے کے لیے] فوج روانہ کی، جس نے شام کی سرحد عبور کر لی اور جنگ قانون میں جو دمشق کے شمال میں ہے، ۱۷ صفر ۹۲۷/۲۷ جنوری ۱۵۲۱ء کو والی تمام مارا گیا۔ اس کے بعد ترکی سپاہ نے جس تشدد اور سختی کا مظاہرہ کیا اس سے دمشق اور اس کے اواج میں دہشت بیٹھ گئی۔ شہر کے ایک تہائی حصے کو بنی جریوں کے ہاتوں نقصان پہنچا۔

سلیمان کے عہد حکومت میں سیاسی نظام تبدیل ہو گیا اور انتظامہ میں باقاعدگی کے آثار ظاہر ہوئے۔ ۱۵۲۵/۹۳۲-۱۵۲۶ء میں آل عثمان نے دمشق کی اراضی، آبادی اور محصول کا پہلا جائزہ لیا (دیکھئے ڈاکٹر خاتمی و B. Lewis The Ottoman Archives as a source of the history of the Arab Lands, ۱۹۵۱ء، ص ۱۵۲ و ۱۵۳، جہاں دمشق سے متعلق دفاتر کی فہرست دی گئی ہے)۔ دمشق کا مرتبہ اس وسیع و عریض سلطنت میں، جس پر ترک سلطان کا ظلی عثمانی چھایا ہوا تھا، ایک معمولی پاشالقی سے زیادہ نہ تھا۔ دمشق کے شہر کو ایک صدی تک مصر کے چرکسی فرمانرواؤں کے عہد میں سیاسی جوڑ توڑ کا مرکز ہونے کا جو امتیاز حاصل رہا تھا وہ اس سے بھی اب یقیناً محروم ہو گیا۔ مختلف پاشا یکے بعد دیگرے اور جلد جلد یہاں کی حکومت پر ماسور ہوتے رہے۔ ایک قاضی اور ایک مہتمم مالیات ان کا معارف ہوتا تھا، لیکن اُسے حفاظتی فوج پر کوئی اختیار نہیں تھا۔ ۱۵۱۷ء اور ۱۱۰۳ھ/۱۶۷۹ء [یہ تصحیح ۱۶۹۱ء]

محسوس نہیں ہوئے۔ آل عثمان کی آمد کے قریب تجارت کی گرم بازاری میں کسی آجانے کا اصل باعث محاصل کی زیادتی ہی سمجھنا چاہیے۔

دور آل عثمان (۹۲۲/۱۵۱۶ء تا ۱۲۳۶ھ/۱۸۳۱ء): ۲۵ رجب ۹۲۲ھ/۲۴ اگست ۱۵۱۶ء کو ترکی لشکر نے حلب کے قریب مرج دابق کے مقام پر ممالیک کے رسالے کو میدان جنگ سے بھکا دیا۔ اس فتح کا سہرا ان کے اعلیٰ تربیت یافتہ رسالے اور برتر قسم کے توپ خانے کے سر ہے۔ چونکہ مقامی حکام (نااہلین) کی اکثریت ترکوں کے ساتھ اُملی تھی، لہذا اس کارہیابی کے بعد پورے شام کو بہت جلد فتح کر لیا سلطان سلیم اول کے لیے آسان ہو گیا۔ دمشق بھی طرف سے عملاً کسی مزاحمت کا سامنا نہیں ہوا، کیونکہ ممالیک کا حفاظتی دستہ وہاں سے پسپا ہو گیا۔ یکم رمضان ۹۲۲ھ/۲۸ ستمبر ۱۵۱۶ء کو سلطان شہر میں داخل ہوا۔ تین ماہ بعد غزہ کے قریب ممالیک کے ان دستوں کو شکست ہوئی جو مصر کے دفاع پر مامور تھے۔ شام کی امدادی افواج کا سپہ سالار چنبردی الغزالی اپنی فوج سمیت سلطان سے مل گیا اور اسے والی دمشق کے عہدے پر واپس جانے کی اجازت دے دی گئی جس پر آخری مملوک سلطان قائلصوہ النوری نے اسے نادمز کیا تھا۔

آل عثمان کی آمد کو اہل دمشق نے ایک مقامی واقعے سے زیادہ حیثیت نہیں دی۔ ان کے نزدیک یہ کوئی انقلابی واقعہ نہ تھا، جو کسی نئے دور کا پیش خیمہ ثابت ہوتا۔ ان کے خیال میں تو صرف آقا بدلے تھے۔ پہلے قاہرہ کے مملوک حاکم تھے اب ان کی جگہ غیر ملکوں کے ایک اور ذی اقتدار گروہ یعنی بنی چری نے ترکی سے آکر حکومت سنبھال لی، لیکن کچھ زیادہ مدت نہ گزرنے والی تھی کہ طبقہ امرا کی طرف سے مخالفت شروع ہوئی۔ چنبردی نے وہ تمام عناصر اپنے گرد جمع کر لیے جو ترکوں کے خلاف تھے۔

کے درمیان کے زمانے میں دمشق پر ایک سو تینتیس والیوں نے حکومت کی۔ ان کے ناموں کی ایک فہرست اور عہد حکومت کا بیان *Les gouverneurs: II. Laoust Ottomans*، دمشق ۱۹۵۲ء میں ملے گا۔

بارہویں صدی ہجری کے اوائل/سترہویں صدی عیسوی کے اواخر میں بوری سلطنت میں نئے خیالات چھا گئے۔ سلاطین اپنے اختیارات کھو بیٹھے اور حرم سراے (Seraglio) میں ہی رہنے لگے۔ سلطنت عثمانیہ کی حدود سمیٹنے لگی، لیکن اب بھی بدلتی وسیع تھیں کہ دمشق دشمن سے محفوظ رہا۔ البتہ اس زمانے میں یہاں کی آبادی اندرونی آفتوں سے دو چار ہوئی۔ سرکاری عہدے مستاجری پر دیے جانے لگے۔ یہ مستاجر ہاتھیکے دار اور بالخصوص والی اپنے منصب کے حصول پر صرف کی ہوئی رقم جلد از جلد وصول کرنے کے خواہاں ہوتے اور عوام پر دباؤ ڈالتے تھے۔ رشوت ستانی عام ہو گئی اور قواعد و ضوابط سے انحراف معمول بن گیا۔ بایں ہمہ ایک خاص حد تک دمشق کی خوشحالی قائم رہی۔ یہ دو باتوں کی سرھوں ست تھی یعنی تجارت اور حج کعبہ۔

اس سے بہت قبل یعنی ۱۵۳۵/۹۴۲ء میں فرانس نے باب عالی سے ایک معاہدہ امتیازات خصوصی طے کر لیا تھا جس کی رو سے ترکی بندرگاہیں فرانسیسی تاجروں کے لیے کھل گئی تھیں اور وہ بحیرہ روم کے تمام مشرقی ممالک میں تجارت کر سکتے تھے۔ گراٹبار محاصل، سرکاری اہلکاروں کی بد سلوکی، اور بعض اوقات عدم تحفظ کے باوجود بیرونی تجارت بہت منفعت بخش تھی اور سیاسی واقعات اطراف سلطنت میں تجارت کی گرم بازاری میں کبھی حائل نہ ہو سکے تھے۔ شام کے دوسرے اقطاع کی طرح دمشق میں بھی مقامی عیسائی فرانکیوں اور حکومت ترکی کے اہلکاروں نیز یہاں کے باشندوں کے درمیان واسطے کا کام دیتے تھے۔ اہل دمشق

ایسی عربی بولتے تھے جس میں گزشتہ چار صدی کے دوران میں ترکی کے بہت سے الفاظ دخل ہو گئے تھے۔ تاجروں کی کثرت سے آمد و رفت کی ادوات کئی ”خانیں“ (سرائیں) تعمیر ہو گئیں جو غیر ملکی تاجروں کے لیے ہوٹلوں، صرافے اور گوداؤں کا کام دیتی تھیں۔ قدیم ترین، خانوں مثلا ”خان البحریر“ کا تعمیری نقشہ ملک شام کے، روجہ نقشے ہی کے مطابق ہے، اسے ۹۸۰ھ/۱۵۷۲ء میں درویش پاشا نے تعمیر کرایا تھا اور ابھی تک سلامت ہے، اس میں ایک صحن، جو عموماً مربع ہوتا ہے، اس کے چاروں طرف ایک حجرابی دالان جس میں دکانوں اور اصطباؤں کے دروازے کھلتے ہیں اور اس کی بالائی منزل سکونت کے لیے مخصوص ہوتی ہے۔ یقیناً وینسی (Venetian) فنڈق کی شکل ابھی یہی ہوگی جو دمشق میں ۱۵۳۳ء کے بعد ظہور میں آئی تھی۔ اٹھارہویں صدی عیسوی کے اوائل میں اس نقشے میں اصلاح کی گئی۔ وسطی صحن کا رقبہ کم کر کے اس پر گنبد بنادے گئے۔ اس طرح سادہ تجارت، وسطی خرابیوں سے محفوظ ہو گیا۔ یہ نئی قسم کی عمارت صرف دمشق سے مخصوص تھی۔ آج بھی ”خان سلیمان پاشا“ موجود ہے، جس کی تعمیر ۱۱۳۸ھ/۱۷۲۲ء میں ہوئی تھی۔ اس کے وسطی صحن پر دو بڑے بڑے گنبد بنے ہیں۔ اس سلسلے کی اہم ترین عمارت ”خان اسعد پاشا“ ہے جو ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء میں تعمیر ہوئی۔ یہ آج بھی قائم ہے اور یہاں کاروبار ہوتا ہے۔ فن تعمیر کا یہ شاہکار ایک وسیع و عریض مربع صحن پر مشتمل ہے۔ اس کے اوپر آٹھ چھوٹے چھوٹے گنبد بنے ہیں، جن کے وسط میں ایک بڑا گنبد سنگ مرمر کے چار ستونوں پر قائم ہے۔ یورپ کے ساتھ تجارت ولایت دمشق کی بندرگاہوں سے ہوتی تھی جن میں سے اہم ترین صیدا تھی۔

چونکہ عثمانی سلاطین نے مقامات مقدسہ کی حفاظت کی ذمہ داری [خادم الحرمين] بھی سنبھال لی تھی اس لیے انھوں نے حج کعبہ کے بارے میں خاص دلچسپی کا

قبل ۱۵۷۴/۹۸۱ء میں درویش پاشا نے ایک بڑی مسجد اس محلے کے شمال میں بنوائی تھی جس کی خوبصورت چینی ٹائلیں قابلِ تعریف ہیں۔ آرائش کا یہ انداز آل عثمان کے ساتھ یہاں پہنچا اور یوں استانبولی فن کا پورا سرزمین دہلی میں یک لخت لگا دیا گیا۔ شہر میں فن تعمیر کے اعتبار سے ایک نیا اسلوب بھی منظر عام پر آنے لگا۔ ہماری مراد ترکی مسجد سے ہے، جس کا نقشہ کچھ یوں ہوتا تھا کہ ایک وسیع و عریض مربع ایران، اس کے اوپر گول ٹکونوں (pendentives) پر قائم ایک نیم کروی گنبد، سامنے کی جانب مسقف پیش دروازہ اور گوشوں میں ایک یا ایک سے زیادہ گول مینار جن کی چوٹی پر گول گھرانے کلمہ ہوئے تھے۔ دہلی میں اس طرح کی عمارت کی پہلی مثال وہ مسجد تھی جو قصر الہائی کے محل وقوع پر سلطان سلیمان قانونی نے شانِ معمار کے نقشے کے مطابق ۱۵۵۵/۹۶۲ء میں تعمیر کرائی۔ حقیقت میں یہ مسجد بہت سی عمارات کا حصہ تھی جو آج بھی تکیہ سلیمانہ کے نام سے معروف ہیں۔ نماز کے پڑھے دالان کا اگلا کمانچہ ایک وسیع صحن کی جنوبی سمت میں کھلتا تھا۔ اس کے مشرقی اور مغربی جانب حجروں کی قطاریں تھیں، جن کے سامنے ستون دار پیش دالان تھا۔ شمال کی طرف حجروں کے ایک مجموعے میں مطبخ اور طعام خانے واقع تھے، لیکن ۱۵۹۵ء سے ان میں فوجی عجائب خانے کی اشیاء محفوظ کر دی گئی ہیں۔ دینی سرگرمیوں کے بارونق مراکز محلۃ الصالحیہ کے مدرسہ عمریہ نیز محی الدین [ابن] انعمی کے مقبرے کے آس پاس قائم ہو گئے تھے جہاں ۱۵۵۲/۹۵۹ء میں سلطان سلیم اول نے ایک لنگر خانہ بنوا دیا تھا کہ اس شہرہ آفاق صوفی کے مقبرے کی زیارت کے لیے آنے والے غریب کو مفت کھانا تقسیم کیا جائے۔ اسی طرح کا مرکز تکیہ مربوۃ میں بھی قائم ہوا، جو ۱۵۸۵/۹۹۳ء میں اہل وجد و حال

اظہار کیا اور حج، دہلی کی آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ بن گیا۔ حضری علاقے میں "درب الحج" [شاہراہ حجاج] کی آخری منزل ہونے کے باعث اس شہر میں ہر سال سلطنت کے شہابی علاقوں سے آنے والے حجاج ہزاروں کی تعداد میں جمع ہوتے تھے۔ اس سالانہ اجتماع سے تجارتی کاروبار میں بہت ترقی ہوئی۔ صحرا کو عبور کرنے کی تیاریوں کے سلسلے میں حجاج اس جگہ اپنے قیام سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ یہاں وہ ہار برادری اور سواری کے لیے جانور، راہ میں قیام کے لیے خیمے اور تین ماہ کی ضروریات کے لیے خوراک خریدتے تھے۔ وقت مقررہ پر پاشا دہلی، جسے امیر الحج کا لائق رشک لقب حاصل ہوتا تھا، سرکاری قافلے کی قیادت کرتا اور محفل لے کر، فوج کی حفاظت میں، مقامات مقدسہ کی طرف روانہ ہو جاتا۔ واپسی کے سفر میں دہلی، دہلی، پہلا اہم شہر ہوتا تھا جتنا چاہے یہاں حجاج عرب سے خرید کر لایا ہوا سامان، شلاقمہ اور افریقہ کے حبشی غلام فروخت کر دیتے تھے۔

باب اللہ سے گزرتے ہی، جو شہر کے انتہائی جنوبی سرے پر واقع تھا، قافلے تین کھانوں کا فاصلہ میدان کے علاقے میں طے کرتے، جس میں غلے کے گودام اور مصالح کے مقبرے یکے بعد دیگرے مسلسل بنے ہوئے تھے۔ جنوب کی طرف آمد و رفت کے باعث باب جانیہ کے باہر فصیل کے قریب بھی ایک نیا محلہ آباد ہو گیا تھا۔ یہاں قافلے قیام کرتے تھے۔ وہ اپنی خوراک اور ضروریات کا سامان (قریبی) منڈیوں سے خریدتے جہاں زمین سازوں اور تہاڑوں کے ساتھ نوادر فروشوں نے بھی اپنی دکانیں قائم کر لی تھیں۔ اس محلے کا نام السیاقیہ اس جامع مسجد کی وجہ سے پڑا جو صدر اعظم شان پاشا وائی دہلی نے ۱۵۸۶/۹۹۴ء اور ۱۵۹۹/۱۰۰۷ء کے مابین تعمیر کرائی تھی۔ اس کا مینار، جس پر سبز رنگ کی روغنی اینٹیں لگی ہیں، دور دور سے نظر آتا ہے۔ اس مسجد کی تعمیر سے بھی چند برس

درویشوں کے لیے مسجد تنکیز کے مغرب میں تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ بات کہ مذکورہ بالا بڑی بڑی مذہبی عمارتی عثمانی عہد میں مروجہ شہر تعمیر ہوئی، اس

اس پر دلی ہے کہ اب جامع مسجد الاموی مسلمانوں کے اجتماع کا واحد مرکز نہیں رہی تھی، اور اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ شہر اپنی قدیم حدود سے باہر پھیل گیا تھا۔

عہد جدید میں توپوں کے فروغ سے دمشق کے پرانے دفاعی استحکامات فرسودہ ہو کر رہ گئے۔ دوسری طرف اس امن و امان کی بدولت جو سلطنت کے گوشے گوشے میں قائم تھا فصاوی کی اہمیت باقی نہ رہی اور ان پر سکونت مکانات بکثرت بننے لگے اور خندقی، جن سے گھوڑے کا کام لیا جاتا تھا، کوڑے کرکٹ سے پٹا دی گئیں۔

شہر پناہ کے اندر آخری معاویہ فرماڑواؤں کے دستور کے مطابق کوچوں کے پختہ فرش، صفائی اور روشنی وہاں کے صاحبان خانہ کے خرچ پر ہوتی تھی۔ جہاں ایک طرف لوگوں کی خدا ترسی سے یہود عامہ کے لیے سیلابی مدرسے اور زاویے تعمیر ہوئے، وہاں ایسے آدمی بھی تھے جو ان کے بجائے قہرہ خانوں کو پسند کرتے تھے، چنانچہ ان کی تعداد میں بڑا اضافہ ہوا اور ان کا شمار بھی عام اجتماع کے مقامات میں ہونے لگا۔ اندرون شہر میں ”خانوں“ یعنی سراؤں کے علاوہ جو واحد قابل ذکر عمارت بنی وہ ایک محل ہے، جسے یہاں کے والی انسعد پاشا الاعظام نے مسجد جامع کے جنوب مشرقی جانب ۱۱۶۲ھ / ۱۷۴۹ء میں تعمیر کرایا تھا۔ اس محل کی سب عمارتیں اٹھارہویں صدی کے شامی مکانات کی ترقیب کے مطابق بنائی گئی ہیں، البتہ اس میں ایک سلامیق [دیوان خانہ] اور ایک حرمیق [زنانخانہ] کا اضافہ کر دیا گیا ہے، جنہیں ترکی اسلوب کے مطابق جوہی کام سے مزین کیا گیا ہے۔ آج کل اس محل میں نسلیات (ethnography) اور

عوامی فنون کا قومی عجائب خانہ ہے۔

دور حاضر (۱۸۳۰ء تا ۱۹۱۴ء): دمشق میں جو گزشتہ کئی صدیوں تک سیاسی واقعات کے بڑے دھارے سے انگ تھلک رہا تھا، ۱۸۳۲ء اور ۱۸۴۰ء کے دوران مصری تسلط کی بدولت تاریخ ابالی پیدا ہو گئی۔ ۱۸۳۲ء میں محمد علی کے بیٹے ابراہیم پاشا نے فلسطین کا علاقہ عبور کر کے دمشق پر قبضہ کر لیا، جہاں اس کی آمد سے قبل عثمانی حکومت کے خلاف بغاوتیں برپا ہو چکی تھیں۔ شہریوں نے ابراہیم کی افواج کی اعانت کی، جنہوں نے حصہ کے قریب عثمانی لشکر کو بھگا دیا اور پھر جولائی کے آخر میں حلب کے قریب اسے ایک اور شکست دی اور کوہ طوروس Taurus کے پار دھکیل دیا۔

مصری حکومت دس برس تک قائم رہی۔ اس نے یورپیوں کو واپس آنے کی اجازت دے دی، جنہیں اب تک شہر کے اندر مغربی لباس میں آنے کی سماعت تھی اور کئی قسم کے دوسرے رسوم و آداب کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ۱۸۳۳ء کے موسم بہار میں سلطان نے شام کی نیابت محمد علی کے حوالے کر دی اور ابراہیم پاشا اپنے والد کے نام پر یہاں حکومت کرنے لگا۔ اس زمانے سے غیر ملکی نمائندے یہاں آ کر مقیم ہونے لگے۔ ابراہیم پاشا مذہبی اعتبار سے بہت وسیع الخيال اور روا دار تھا۔ اس نے دمشق میں ایک دارالعلوم قائم کیا، جہاں چھ سو کے قریب باوردی طلبہ فوجی اور عام دونوں طرح کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ کئی عمارتیں سرکاری دفتر بنیں اور اس سلسلے میں بعض قدیم یادگاروں کو بھی قربان کر دیا گیا، مثلاً تنکیزہ کو ایک فوجی مدرسے میں بدل دیا گیا، جو یہاں ۱۹۳۲ء کے بعد تک جاری رہا۔ والی دمشق کے لیے ایک نئی قیام گاہ سرایل Sérail تیار ہوئی۔ یہ عمارت، جو فصیل شہر کے باہر باب الحديد کے بالمقابل تعمیر ہوئی تھی، رومی کاریز کے قریب ایک نئے

محلے، المقنات، کے ظہور میں آنے کا باعث بنی۔ دارالسعادة اور الاصطبل کی عمارتیں، جہاں ممالیک کے زمانے سے ایک چھوٹا سا چڑیا گھر قائم تھا ایک فوجی صدر دفتر کی صورت میں بدل دی گئیں جس کا وجود ۱۹۱۷ء میں کہیں جا کر ختم ہوا۔ شہر کے اسی علاقے میں یاروقی دکانیں ایک ہی جگہ سوق الأروام میں واقع تھیں۔ J. L. Porter : five years in Damascus جلد، لندن ۱۸۵۵ء، میں ایسویں صدی عیسوی کے وسطی زمانے کے دمشق کی بڑی دلچسپ کیفیت ملتی ہے۔ ۱۸۴۰ء میں نظم و ان قائم کرنے کے بعد ابراہیم پاشا نے اصلاح کی طرف پہلا قدم اٹھایا (رک بہ بلدیہ، مجلس) اور ایک خود مختار اور مرکزی حکومت کے قیام کی تجویز پیش کی۔ اہل یورپ محمد علی کے عزائم کے مخالف تھے اور سب سے بڑھ کر پامرسٹن تھا، چنانچہ جبری فوجی بھرتی کے باعث جو بے چینی شہر میں پھیلی اس سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے عوام کو ابراہیم پاشا کے خلاف بھڑکا دیا، جو دمشق خالی کر جانے پر مجبور ہو گیا۔ اس کے اصلاحی اقدام کی تجدید نہ ہوئی اور دمشق ایک بار پھر آل عثمان کے زیر تسلط آ گیا۔ پھر فرقہ دارالہ فسادات نے یہاں کی ہر سکون زندگی کو قدرے درہم برہم کر ڈالا۔ لبنان کے جنوب میں رہنے والے مارونیوں اور دروزیوں کے درمیان جھگڑے ہونے لگے۔ دمشق میں رائے عامہ کو بھڑکایا گیا اور ۱۲ جولائی ۱۸۶۰ء کو مسلمانوں اور عیسائیوں میں خونریز تصادم ہوا۔ اس خونریزی کے دوران میں امیر عبدالقادر نے جو الجزائر سے جلا وطن ہو کر یہاں آئے ہوئے تھے، بیچ میں پڑ کر کئی سو انسانی نفوس کو ہلاکت سے بچا لیا۔ اس فساد کے برپا کرنے والوں کو سلطان نے شدید سزائیں دیں اور اسی سانحے سے برانگیختہ ہو کر اگست ۱۸۶۰ء کے آخر میں بولین سوم کی بھیجی ہوئی افواج شام کے ساحل پر اتر گئیں۔

اس دور کی ابتدا ہی سے یورپی اثرات شہر کی ثقافت اور معاشیات کے شعبوں میں ظاہر ہونے لگے تھے۔ مختلف مذہبی فرقوں کے غیر ملکی مدارس اپنی حکومتوں کی اعانت کی دولت ترقی کرتے رہے۔ ۱۷۷۵ء سے لزاری (Lazarist) فرقے کے پادری بڑی سرگرمی سے ایک مدرسہ عالیہ چلا رہے تھے اور ۱۸۵۳ء سے ایک پروٹسٹنٹ تبلیغی ادارہ کام کر رہا تھا۔ ۱۸۶۰ء کے بعد نئے نئے ادارے قائم ہونے لگے، مثلاً برطانوی شامی تبلیغی ادارہ اور عیسوی فرقے (Jesuits) کا کالج (۱۸۷۲ء)، تعلیم نسوان کا کام Sisters of charity (عیسائی راہبات) نے سنبھال رکھا تھا۔ مدحت پاشا نے سرکاری طور پر تعلیم کو فروغ دینے کی کوشش کی جسے آئندہ جاری نہ رکھا گیا۔ اس زمانے میں صحیح معنوں میں علمی و فکری مرکز قاہرہ تھا اور دمشق میں قاہرہ ہی کے اخبارات المقتطف اور المقطام پڑھے جاتے تھے۔ دمشق میں مرتب اور طبع ہونے والا عربی زبان کا پہلا اخبار الشام کہیں ۱۸۹۷ء میں جا کر شائع ہونا شروع ہوا۔ بہر حال رفتہ رفتہ دارالحکومت شام عرب قومیت کے مراکز میں شمار ہونے لگا۔ انیسویں صدی کے ربع آخر میں شام کے دوسرے شہروں کی طرح یہاں بھی خفیہ انقلابی جماعتیں سرگرم کار تھیں اور عوام کو وقتاً فوقتاً بغاوت پر آکسائی رہتی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ مدحت پاشا، جو ۱۸۷۶ء کے حریت پسندانہ آئین کا مصنف تھا، جب ۱۸۷۸ء میں والی دمشق بنا تو ان تحریکوں کی حمایت کرتا رہا۔ اس جلیل القدر مصلح کے پیش نظر ڈیڑھ لاکھ کی آبادی پر مشتمل شہر کا نظام و نسق تھا اور اس نے یہاں ایسے مفید کام کیے جو مستقل نوعیت کے تھے۔ اس کی اصلاحات کا تعلق زیادہ تر عوام کے حفظان صحت اور آمد و رفت کے ذرائع سے تھا۔ گاڑیاں چل لگانے سے قدیم شہر کا پرانا نظام آمد و رفت ناکافی اور غیر موزوں ہو کر رہ گیا تھا۔ والی موصوف نے بازاروں میں تنگ گلیوں کی جگہ زیادہ

غیر ملکی باشندے بیروت سے دمشق تک ڈاک گاڑی سے اس نئی سڑک پر سفر کرنے لگے جسے فرانسیسی ٹھیکیداروں نے تعمیر کیا تھا۔ ذرائع آمد و رفت میں مزید ترقی اس وقت ہوئی جب ایک فرانسیسی کمپنی نے بیروت، دمشق، اور حورن کے درمیان ریل جاری کر دی۔ بعد ازاں رباق سے اس کی ایک شاخ شمال کی طرف حمص اور حاب تک پہنچ گئی۔ اس کے بعد عزت پاشا العبد کو، جو شام کا باشندہ اور سلطان کا دیر دوم تھا، یہ خیال سوجھا کہ سفر حج کو آسان بنانے کے لیے دمشق اور مدینہ منورہ کے درمیان ریل جاری کی جائے۔ انہیں دونوں سلطان اور تبصر وشم ثانی کے درمیان جو ۱۸۹۸ء کے موسم سرما میں دمشق آیا تھا، دوستانہ تعلقات کا آغاز ہو گیا تھا، چنانچہ اس ریلوے لائن کی تعمیر کا کام جرمنوں کے سپرد کر دیا گیا۔ چھوٹی لائن کی حجاز ریلوے کا افتتاح ۱۹۰۸ء میں ہوا۔ حجاج، جو قبل ازیں قافلوں کی صورت میں مدینہ منورہ چالیس روز میں پہنچتے تھے، اب وہاں پانچ دن میں پہنچنے لگے۔ اسی سال فوجی افسروں کی ایک تحریک سے مجبور ہو کر سلطان نے وہ آئین بحال کر دیا جو گزشتہ آئیس برس سے معطل پڑا تھا۔ اس کے بعد پھر تھوڑا ہی عرصہ گزرنے پایا تھا کہ عبدالحمید ثانی کو معزول کر دیا گیا۔ اس خبر کا دمشق میں بڑی مسرت سے خیر مقدم کیا گیا۔ لوگوں نے وسیع پیمانے پر مظاہرے کیے، اور آتش بازی چھوڑی گئی، لیکن ان کی مسرت بہت دنوں قائم نہ رہ سکی۔ حریت کا وہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا جس کی امید پر گرد علی نے اپنا مجلہ العقاب جسے نین سال قبل قاہرہ سے بطور روزنامہ جاری کیا تھا، دمشق میں منتقل کر لیا تھا۔ ۱۹۰۹ء میں حکومت عثمانیہ نے اسے خلاف قانون قرار دے کر بد کر دی اور عرب قوم پرستوں نے خفیہ جماعتوں کی صورت میں منظم ہونا شروع کر دیا۔ ۱۹۱۳ء میں اعلان جنگ ہوا تو دمشق کو اس

چوڑے بازار بنوائے۔ شارع، موسم بہ مستقیم کے مغربی حصے کو مزید فراخ کرا کے اس پر اوٹے کی نالی دار چادر کی چھت ڈالوا دی، موجودہ زمانے کا سوق مدحت پاشا یہی ہے۔ قلعے کے جنوب میں جو خندق تھی اُسے ڈاک دیا گیا اور اس پر نئے سوق آباد ہو گئے۔ اسی طرح باب العبد کو مسجد جامع سے ملانے والی سڑک کو شروع سے آخر تک اتنا وسیع کر دیا گیا کہ اس پر گاڑیوں کی دو طرفہ آمد و رفت ہو سکے۔ اس کا نام سوق حمیدیہ رکھا گیا۔ شہر کے مغرب میں المرحۃ یعنی سبزہ زار کے آس پاس جو خالی قطعے بڑھے تھے، وہاں نئی عمارتیں تعمیر کی گئیں۔ یہ عمارتیں ایک نئی سرائے، انتظامیہ کے دفتر، فوجی عملے کے صدر دفتر، دارالبلدیہ، عدالتوں، ایک ڈاک خانے اور سپاہیوں کی بارکوں پر مشتمل تھیں۔ حمیدیہ بارکوں، جنہیں ۱۹۰۵ء کے بعد نئے ساز و سامان سے آراستہ و زیبائہ کیا گیا تھا، اچکل جامعہ کی مرکزی عمارت کا کام دیتی ہیں۔ باب ثوما کے عیسائی محلے میں عائشان مکانات تعمیر ہوئے جہاں یورپی سفیروں، پادریوں اور تاجروں وغیرہ نے سکونت اختیار کی۔ اس کے برعکس قدیم شہر غیر آباد ہونے لگا۔ اب مغربی جانب القنات اور سوبقات اور شمال مغربی جانب سروجۃ اور العقیبۃ کی مضافاتی بستیوں کے درمیان کوئی خالی قطعہ اراضی باقی نہیں رہا۔ الصالحیہ میں گردوں اور اتریشی (کریٹ) کے تارک الوطن مسلمانوں کی ایک نئی بستی قائم ہو گئی اور اس کا نام المهاجرین پڑ گیا۔ جیل قاسیوں کی ڈھلوانوں پر اس بستی کا محل وقوع ترکوں کے امرا کو اتنا پسند آیا کہ انہوں نے وہاں بڑے خوبصورت مکانات بنوائے، جو باغات سے گھرے ہوئے تھے۔ اس زمانے میں بیروت دنیا کے ساتھ تعلقات میں، زید سہولتیں پیدا ہوئیں اور ان دو لوکانوں [رستوران restaurants] کے علاوہ جو ۱۸۶۰ء سے قبل سے موجود تھے، غیر ملکوں کے لیے نئے ہوٹل بن گئے۔ ۱۸۶۳ء کے بعد

فیصلے مسترد کر دیے جو انتداب (mandate) کے بارے میں وہاں کیے گئے تھے۔ ۱۰ دسمبر کو ایک قومی شامی حکومت تشکیل پذیر ہوئی۔ ۷ مارچ ۱۹۲۰ء کو مجلس ملی نے شام کی آزادی کا اعلان کر دیا اور فیصل کو بادشاہ منتخب کر لیا۔ (Sykes-Pical معاہدے کے مطابق جو خفیہ طور پر انگلینڈ، فرانس، روس کے درمیان ہوا شام کو فرانس کے زیر حمایت دے دینے کا فیصلہ کیا گیا)۔ اپریل ۱۹۲۰ء میں معاہدہ سان ریمو (San Remo) کی رو سے فرانس کو 'جمعیت اقوام' کے نمائندے کی حیثیت سے شام پر انتداب کا حق مل گیا، لیکن اس فیصلے سے دمشق اور شام کے دوسرے بڑے شہروں میں سخت بے چینی پھیل گئی۔ مجلس ملی نے ۱۰ جولائی کو حالت محاصرہ کا اعلان اور جبری بھرتی کا قانون نافذ کیا، لیکن ۱۴ جولائی کو جب جمہوریہ فرانس کے ہائی کمشنر جنرل گورا (Gouraud) نے فیصل کو آخری تنبیہ (الٹی میٹم) دیا تو اس نے تمام شرائط تسلیم کر لیں۔ دمشق میں عوامی شورش زور پکڑ گئی۔ ۲ جولائی کو عرب فوج نے عوام کے ایک بہت بڑے جلسے کو زیر دستی منتشر کیا۔ معاہدے کی شرائط پر عمل کرانے کے لیے فرانسیسی فوجیں شام بھیجی گئیں۔ ۲۴ جولائی کو مصلحوں میں جنگ چھڑ گئی اور ۲۵ جولائی کو فرانسیسی شہر میں داخل ہو گئے۔ شاہ فیصل کو ملک چھوڑنا پڑا اور اقتدار ہائی کمشنر کے ہاتھ میں منتقل ہو گیا۔ اب واقعی انتداب کا دور آگیا تھا۔ [تفريق ڈالو اور حکومت کرو کے مطابق فرانس نے اپنے زیر انتداب شامی علاقے کو دو حصوں میں تقسیم کر کے حکومت کرنا شروع کر دیا]۔

موجودہ دور : دور انتداب کی خصوصیت یہ تھی کہ انتدابی قوت کے خلاف مخالفت کے مظاہرے ہوتے رہے جو کبھی تو ہڑتالوں اور کبھی تشدد آمیز بنیوں کی صورت اختیار کرتے تھے۔

اس سلسلے میں شدید ترین مظاہر ۱۹۲۵ء میں

کے بہت بڑے نتائج دیکھنے پڑے۔ اس سال کے آخر میں جمال پاشا شام، لبنان اور فلسطین کا نائب السلاطت اور عثمانی جیش چہارم کا سپہ سالار مقرر ہوا، جس کا مستقر اعلیٰ دہش تھا۔ بہت جلد یہ شہر جرمن اور ترک افواج کا مرکز اور منطقہ سویز پر لشکر کشی کرنے کے لیے جھاوٹی بن گیا۔ جمال پاشا نے جلد ہی ثابت کر دیا کہ وہ اوسط درجے کا سپہ سالار لیکن نہایت مستعد ناظم ہے۔ اسے توقع تھی کہ وہ اہل دہش کو ترکوں کی حمایت پر آمادہ کر لے گا لیکن چند ہی روز بعد اسے اپنے اس خیال کو ترک کرنا پڑا۔ دمشق ہی وہ شہر تھا، جہاں اپریل ۱۹۱۵ء میں، البکری خاندان کے حلقے میں، شریف مکہ حسین کا بیٹا امیر فیصل عرب بغاوت کے منصوبے کا حامی بنایا گیا۔ وہ اسی زمانے میں خفیہ انجمنوں، افتات اور العہد کے ارکان سے ملا۔ مئی کے آخر میں فیصل قسطنطنیہ سے واپس آیا اور انگریزوں کی مشاورت سے ترکوں کے خلاف جنگ کا ایک منصوبہ تیار کرنے میں حصہ لیا۔ بالآخر وہ مشہور "میناق دہش" طے ہوا جس کی رو سے برطانیہ سے عربوں کی آزادی تسلیم کرنے اور (یورپی) استیلازات خصوصی ختم کر دینے کا مطالبہ کیا گیا۔ جنوری ۱۹۱۶ء میں فیصل ایک بار پھر دمشق میں موجود تھا اور ۶ مئی کو بھی وہیں مقیم تھا جب جمال پاشا کے حکم سے عرب بغاوت کے اکیس حامیوں کو پھانسی دی گئی۔ آج بھی یہ سانحہ "بوم شہداء" کے رنگ میں ہر سال منایا جاتا ہے۔ ۱۰ جون کو حجاز میں بغاوت برپا ہو گئی، جہاں شریف حسین نے "سلطان عرب" ہونے کا اعلان کر دیا۔ دمشق سے ترکی افواج کا انخلاء ۳ ستمبر ۱۹۱۸ء کو عمل میں آیا۔ یکم اکتوبر کو اتحادی فوجیں، جن میں امیر فیصل کے دستے بھی شامل تھے، شہر میں داخل ہو گئیں۔ شام کی مجلس ملی کا قیام عمل میں لانے کے لیے مئی ۱۹۱۹ء میں انتخابات ہوئے اور جون میں اس مجلس نے بیرس کی صلح کانفرنس کے وہ

بن گئیں۔ آبادی میں اضافے اور عوام کے حفظانِ صحت کے پیش نظر ۱۹۳۲ء کے اوائل میں پینے کا پانی خاص نلوں کے ذریعے عین فیجہ کے طاقتور چشمے سے لایا گیا جو وادی بردی میں واقع ہے۔ [تقریباً دس برس شاہیوں کی جدوجہد کے بعد آخر فرانسیسی انہیں آزادی دینے پر رضا مند ہو گئے]۔

پہلی عالمگیر جنگ کی بد نسبت دوسری جنگ میں دمشق نے بہت کم نقصان اٹھایا۔ [۲۱] جون ۱۹۴۱ء میں برطانوی [آسٹریلین، ہندوستانی] اور آزاد فرانسیسی دستے شام میں داخل ہوئے۔ ۱۶ ستمبر ۱۹۴۱ء کو جنرل Catroux نے اس کی آزادی کا اعلان کر دیا [اور تاج الدین اس کے پہلے صدر بنائے گئے] لیکن کوئی آئینی زندگی اگست ۱۹۴۳ء سے قبل شروع نہ ہو سکی تا آنکہ [اگست ۱۹۴۵ء کو] شکری القوتلی کا انتخاب بطور صدر جمہوریہ شام عمل میں آیا۔ ۱۲ اپریل ۱۹۴۵ء کو شام اقوام متحدہ کا رکن بن گیا [اور ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو اس نے آزاد رکن کی حیثیت سے شرکت کی] تو انتداب کا خاتمہ ہو گیا لیکن فرانس اور شام کے باہمی تعلقات میں ایک نیا کھچاؤ محسوس ہونے لگا۔ اس کی انتہا یہ ہوئی کہ ۲۹ مئی ۱۹۴۵ء کو دمشق پر فرانسیسی فوج نے گولہ باری کی۔ برطانیہ نے اس بحال کرنے کے لیے فوج سے دخل اندازی کی۔ چند ماہ بعد [اپریل ۱۹۴۶ء کو] غیر ملکی افواج بالآخر شام کی سر زمین سے رخصت ہو گئیں۔

۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۴ء تک کئی بار حکومت میں فوجی انقلابات آئے۔ ۱۹۵۵ء میں شکری القوتلی ایک بار پھر صدر جمہوریہ بنا اور ۱۹۵۶ء سے اتحاد مصر و شام کی گفت و شنید شروع ہو گئی۔ [فروری ۱۹۵۸ء میں 'جمہوریہ متحدہ عرب' کی تشکیل کے اعلان سے دمشق شمالی علاقے کا صدر مقام قرار پایا، لیکن ۲۸ ستمبر ۱۹۶۱ء کے فوجی انقلاب سے [فاطمہ القدسی کے زیر اقتدار] وہ دوبارہ جمہوریہ عرب شام کا دارالحکومت

جیل دروز میں امیر سلطان الأطرش کے زیر قیادت ہوا، جس میں مخالفین دمشق پر قابض ہو گئے۔ اگست کے آخر میں مخالفوں کو جو مضافات شہر میں وارد ہو چکے تھے، پسپا کر دیا گیا۔ اہل شہر نے اس وقت تک ان کی کھلم کھلا حمایت نہیں کی جب تک وہ دوسری بار وہاں نہیں آ گئے۔ ۸ اکتوبر ۱۹۲۵ء کو شہر میں سخت فساد برپا ہو گیا جس کے پیش نظر ۱۸ اکتوبر کو جنرل سربیل Sarrail نے شہر پر گولہ باری کی۔ اپریل ۱۹۲۶ء میں غوطہ اور شہر میں ایک اور بغاوت کو کچلنے کے لیے دوبارہ گولہ باری کی گئی، لیکن امن و امان آئندہ موسم خزاں تک بحال نہ ہو سکا۔

۱۹۲۶ء کے بعد سے شہر مغربی نقطہ نظر سے خوب ترقی کرنے لگا۔ الصالحیہ اور قدیم شہر کے درمیان جو غیر ترقی یافتہ محلے تھے وہاں بڑی تیزی سے تعمیرات ابھرنے لگیں اور اس زمانے سے الجسر، العرثوس اور الشهداء نام کے مضافات میں یورپی جن کی تعداد روز بروز بڑھ رہی تھی، اور شامی کسی قومی غیریت کا لحاظ کیے بغیر پہاؤ بہ پہاؤ آباد ہونے لگے۔ باب ٹوما کے عیسائی قصبہ کے نئے محلے میں آباد ہونے کے لیے زیادہ سے زیادہ تعداد میں اندرون شہر سے باہر آ گئے۔ شہری عمارتوں میں ترتیب اور یکسانی پیدا کرنے کے لیے ۱۹۲۹ء شہری منصوبہ بندی کے فرانسیسی ماہر Danger نے آئندہ بننے والے شہر کا ایک مربوط اور متوازن نقشہ تیار کیا اور مشہور ماہر تعمیرات Michel Ecochard کے سپرد یہ کام کیا گیا کہ وہ حکومت شام کے سرکاری محکمہ کے تعاون سے اسے عملی جامہ پہنائے۔ نئی سڑکیں بنائی گئیں، جن میں سے بیشتر کے دونوں طرف درختوں کی قطاریں تھیں اور تیراب کا قدیم علاقہ ابورمانہ کے سکوتی محلے میں تبدیل ہو گیا اور مغرب کی جانب پھیلتا گیا۔ قدیم شہر کی شمالی سمت خیابان بغداد اور جبل قاسیوں کے درمیان اور شمال میں حلب کو جانے والی سڑک کی سمت نئی مضافاتی بستیاں

بن گیا۔ ۸ مارچ ۱۹۶۳ء کو وہاں پھر انقلاب آیا اور جنرل امین الحافظ پریزیڈنسی کونسل کے صدر مقرر ہوئے۔

شہر دمشق کا نظم و نسق ایک مجلس بلدیہ کے ہاتھ میں ہے، ۱۹۵۵ء میں اس کی آبادی ۳۸۸۰۰ نفوس پر مشتمل تھی جس میں ۹ فی صد سنی مسلمان تھے۔ ان کے علاوہ گُرد، دروزی اور امریکی گروہ خاصی اہم تعداد میں یہاں پائے جاتے ہیں۔

متعدد ثقافتی اداروں کے باعث دمشق کا شمار اول درجے کے علمی مراکز میں ہوتا ہے۔ جون ۱۹۱۹ء میں محمد علی کُرد کی تجویز پر مشہور عرب اکادمی (المجمع العلمی العربی) کی بنیاد رکھی گئی تھی جو مدرسۃ العادلیہ میں قائم ہے۔ اس کے بالقابل مدرسۃ الظاہریۃ میں کتب خانہ ملی ہے جس میں آٹھ ہزار سے زیادہ مخطوطات موجود ہیں۔ جامعۃ سورہہ جس کی ابتدا ایک مدرسۃ طب (۱۹۰۳ء) اور ایک مدرسۃ قانون (۱۹۱۲ء) سے ہوئی تھی، ۱۵ جون ۱۹۲۳ء کو قائم کی گئی۔ ۱۹۶۰ء میں یہاں تقریباً دس ہزار طلبہ زیر تعلیم تھے اور یہ چھ شعبوں (faculties) میں منقسم تھی۔ شام کے قومی عجائب خانے (Museum) کی بنیاد ۱۹۲۱ء میں رکھی گئی اور ۱۹۳۸ء سے اس کی انیا ایسے مکانات میں فراہم کی گئیں جو خاص طور پر قیمتی مجموعوں کو محفوظ رکھنے کے لیے بنائے گئے تھے مثلاً Palmyra (تدمر)، Douira Europos (دورہ یورپوس)، Ras Shamra (راس شمرہ) اور Mari (ماری کے کمرے)۔ شام کی اشیاء قدیمہ کی نظامت عمومی (Direction générale des antiquités de Syrie) کا دفتر، جو ۱۹۲۱ء میں قائم کیا گیا تھا، اسی عمارت میں ہے۔ کتابوں کی بہت سی دکانیں، کوئی درجن بھر سینما رینڈو اور ٹیلی ویژن کی نشر گاہیں، ان سب کی بدولت دمشق ایک بڑا جدید شہر دکھائی دیتا ہے۔ یہ وسائل حمل و نقل کا ایک اہم مرکز ہے، ریل کے ذریعے دمشق،

عمان اور آگے کے علاقے کے ساتھ مربوط ہے۔ عقبہ، دمشق اور حصص کو ملانے والی لائن اور اس کی شاخوں (U. H. P.) کا آخری سٹیشن ہے۔ یہاں موٹر کے ذریعے سفر کرنے کے قابل سڑکیں بیروت، بغداد، الموصل نیز بیت المقدس، عمان، بیروت ہیں اور اس کا درجہ دوم کا فضائی مستقر مڑہ میں واقع ہے۔ خوران کے غلے کی سب سے بڑی منڈی اور غوطہ کے کسانوں اور بدوؤں کو خوراک و سامان مہیا کرنے کا مرکز بھی دمشق ہے۔ ان بازاروں میں غیر ملکی مصنوعات ہی نہیں بلکہ دیہاتیوں کی ضروریات کے مطابق خاص طور پر نیاری کی ہوئی چیزیں بھی ملتی ہیں۔ یہاں کاریگروں کے ایک طبقے کو آرائشی سامان تیار کرنے میں خاص سہارت حاصل ہے، مثلاً چوبی مرصع کاری، سیپوں سے بنی کڑی، ریشمی زر ہفت کی صنعت اور تانبے کے برتنوں پر کندہ کاری یا بھرت کرنا۔ اکثری کے خرا دیے اور ششہ گر بھی اپنے کاروبار میں مصروف رہتے ہیں۔

۱۹۲۶ء میں صنعت کے لحاظ کے لیے جو اقدامات کئے گئے ان سے اس میدان میں نمایاں طور پر ترقی نظر آتی ہے۔ چنانچہ یکے بعد دیگرے ایک کپڑے کا کارخانہ (۱۹۲۹ء)، دسر میں ایک سینٹ تیار کرنے کا کارخانہ (۱۹۳۰ء) اور مربی اچار بنانے کا کارخانہ (۱۹۳۲ء) قائم ہوئے۔ ۱۹۳۷ء میں جدید طرز کے سوت کاتنے کے کارخانے جاری ہوئے۔ ۱۹۳۹ء تک مجموعی طور پر اسی کارخانے قائم ہو چکے تھے جو ڈیڑھ ہزار پیشوں کی نمائندگی کرتے تھے۔ ۱۹۳۵ء میں شیشے کا ایک بہت بڑا کارخانہ شہر کے جنوب میں قدم کے مقام پر قائم ہوا۔ مشرقی علاقے میں چمڑے کی دباغت اور رنگنے کے کئی کارخانوں میں یہاں کا صدیوں پرانا کام جاری ہے۔ ۱۹۵۳ء سے ہر سال موسم گرما کے ختم ہونے پر ایک اہم بین الاقوامی نمائش بردی کے کناروں پر لگتی ہے! دمشق کو مشرق قریب

کے عرب ممالک کا ایک عظیم تجارتی و صنعتی مرکز بنانے میں اس نمائش کا بھی حصہ ہے۔

[ملک کی دو یونیورسٹیوں میں سے ایک دمشق میں ہے جس کی بنیاد ۱۹۲۳ء میں رکھی گئی تھی؛ دوسری حلب میں ہے اور ۱۹۶۰ء میں قائم ہوئی تھی۔ ۱۹۶۳ء میں دمشق یونیورسٹی کے طلبہ کی تعداد پندرہ ہزار تھی]۔

مآخذ : متن میں مندرجہ حواتوں کے علاوہ :
(۱) جغرافیہ : R. Thoumin (۱) : *Géographie* : R. Thoumin (۱) : *Tours humaine de la Syrie Centrale* : ۱۹۳۶ء
La climatologie : Ch. Combier (۲) : ۲۳ تا ۲۵۹ : *Revue Géogr. Phys.* در *de la Syrie et du Liban* (۲) : ۳۱۹ : بعد : *et Géol. Dynam.* : ۱۹۳۲ء
L'irrigation dans la Ghouta de Damas : R. Tressac : R. Thoumin (۳) : ۵۷ تا ۸۵۹ : *REI* ۱۹۲۹ء
Notes sur l'aménagement et la distribution des eaux à Damas et dans sa Ghouta : J. BEO : ج ۴ (۱۹۳۶ء) : ص ۱ تا ۲۶ : - (ب) عربی سٹون : (۵) : *الربیع* : کتاب فضائل الشام ودمشق، طبع من مکتبہ RAAD : ۱۹۵۱ء (۶) ابن عساکر : تاریخ مدینہ دمشق، ج ۱، طبع مکتبہ RAAD : ۱۹۵۱ء (۷) عبدالقادر ندران : تہذیب تاریخ دمشق لابن عساکر ۷ جلدیں، دمشق ۱۹۲۹-۱۹۱۱ء (۸) ابن شداد : الأعلاق الفطیرة (Description de Damas) : طبع S. Dahan : PIFD : ۱۹۵۶ء (۹) یوسف بن عبدالہادی : تمارن المقاصد فی ذکر المساجد، طبع المکتبہ طلس : PIFD : ۱۹۳۳ء (۱۰) النعمانی : المدارس فی تاریخ المدارس، طبع جعفر الحسنی، ۲ جلدیں، RAAD : ۱۹۳۸ تا ۱۹۵۱ء (۱۱) محمد کرد علی : خطط الشام، ۶ جلدیں، (مطبوعہ دمشق) ۱۹۲۵ تا ۱۹۲۹ء (۱۲) یاقوت : معجم البلدان، بذیل مادۃ دمشق : (۱۳) ابن القلائسی : ذیل تاریخ دمشق، طبع Amedroz : لائڈن ۱۹۰۶ء (۱۴) الہروی : کتاب الزیارات، طبع J. Sourdel-Thomine

PIFD : دمشق ۱۹۵۷ء : ص ۱۰ تا ۱۶ (ترجمہ وہی مصنف) : PIFD : دمشق ۱۹۵۷ء : ص ۲۵ تا ۳۰ - (ج) تراجم و علم تصانیف : (۱۵) *Le Strange* : *Palestine under the Moslems* : لئڈن ۱۸۹۰ء : ص ۲۲۸ تا ۲۷۱ (۱۶) ابن جبیر : الرحلة، ترجمہ M. Gaudelory-Demombynes : ۳ جلدیں، پیرس ۱۹۳۹ء تا ۱۹۵۶ء : (۱۷) ابن بطوطہ : الرحلة، ترجمہ گیب H. A. R. Gibb : کیسبرج : ۱۹۵۸ء : ۱ : ۱۱۸ تا ۱۵۷ : (۱۸) H.A.R. Gibb : *The Damascus chronicle of the Crusades Damasde 1075 à* : R. Le Tourneau (۱۹) : ۱۹۳۲ء : M. Gaudelory-Demombynes : ۱۹۵۰ء : PIFD : 1154 : *La Syrie à l'époque des Mamelouks* : bynes : BAH : پیرس ۱۹۲۳ء : ص ۱۳۵ تا ۲۰۱ : ۲۰۱ تا ۲۳۸ : *La Syrie, précis historique* : H. Lammens (۲۱) : بیروت ۱۹۲۱ء : *Sovremenaya Siriya* : شائع کردہ A.N.S.S.R. : مسکو ۱۹۵۸ء : (۲۲) Syria, a : P. Hitti (۲۳) : short history : لئڈن ۱۹۵۹ء : (۲۴) R. Dussaud : *Topographie historique de la Syrie* : ج ۴ : پیرس ۱۹۲۵ء : ص ۲۹۱ تا ۳۲۲ : (۲۵) R. Mantran : *Règlements fiscaux ottomans relatifs* : J. Sauvaget : ۳ تا ۱۹۵۱ء : PIFD : *taux provinces syriennes* : Cl. Cahen (۲۶) : *Mouvements populaires et autonomisme urbain dans l'Asie Musulmane du Moyen Age* : در *Arabica* : ۵ : (۱۹۵۸ء) : ۲۲۵ : ۲۵۰ : ۲۵ : ۲۶ تا ۲۳۳ : ۲۶۵ : (۲۷) : شہر اور اس کی یادگاروں کے بارے میں تصنیفات : (۲۸) : *La description de Damas* : H. Sauvage : سلسلہ سوم ۳ تا ۱۸۹۳ء تا ۱۸۹۶ء : Index général : E. Ouéchék : PIFD : ۱۹۵۳ء : K. Wulzinger : *Damaskus, i, Die antike Stadt, ii* : C. Watzinger : *Die islamische Stadt* : ۲ جلدیں، برلن ۱۹۲۱ء تا ۱۹۲۳ء : *Le plan antique de Damas* : J. Sauvaget (۲۹)

میں شامل ہے۔ الدمشقی نے بمقام صفد ۷۷۷ھ/ ۱۳۷۷ء میں وفات پائی۔ اس کی مشہور ترین تصنیف نخبة الدھر فی عجائب البر والبحر ہے، جو وسیع ترین معنوں میں جغرافیے سے متعلق ہے اور بہت حد تک الفزونی کی عجائب المخلوقات سے ملتی جلتی ہے۔ اگرچہ مصنف کا نقطہ نظر نمایاں طور پر غیر تنقیدی ہے، تاہم اس کتاب میں بہت سی ایسی معلومات موجود ہیں جو کہیں اور نہیں ملتیں۔ الدمشقی کی ایک اور کتاب القائمات الفاسیة و الترجمات الصوفیة ہے جو نسبتاً کم معروف لیکن اس کے ساتھ ہی خاصی دلچسپ ہے (رک بہ براؤن Handlist: E.G. Browne of the Muhammadan Mss. preserved in the library of the University of Cambridge، ص ۲۱۸-۲۱۷)۔ یہ کتاب پچاس "مقامات" پر مشتمل ہے جن سے طبیعیات، ریاضیات اور الہیات کی ایک دائرۃ المعارف مرتب ہو گئی ہے۔ یہ مقامات ابو عبد اللہ الاواب کی سند پر ابو القاسم التواب کی زبان سے روایت کیے گئے ہیں۔ الدمشقی نے اسلام کی حیات میں بھی ایک تصنیف اپنی یادگار چھوڑی ہے، یعنی جواب رسالۃ اہل جزیرۃ قبرص، جس میں تصوف کی جھلک نظر آتی ہے دیکھیے Islam u. Christentum im Mittelalter: E. Fritsch (Breslau، ۱۹۰۳ء، ص ۳۳ تا ۳۶)۔ اس کی ایک اور تصنیف الرسالۃ (یا باختلاف نسخہ: السیاسة) فی علم الفراسة (قاہرہ ۱۳۰۰ھ) چھپ چکی ہے، لیکن معائنۃ التجارة (قاہرہ ۱۳۱۸ھ)، جسے براکلمان نے شمس الدین سے منسوب کیا ہے (صحیح نام: کتاب الامارة الی معائنۃ التجارة، ترجمہ H. Ritter در Islam، ج ۱، ۱۹۱۷ء، ص ۱ تا ۹۱)، دراصل ابو الفضل جعفر بن علی الدمشقی کی تصنیف ہے۔

مآخذ: (۱) Cosmographie: A. T. Mehren، de Chemis-ed Din Abon Abdallah Mohammed ed-Dinichqui، عربی متن، سینٹ پترزبرگ ۱۸۶۶ء ترجمہ

در Syria، ج ۲۶ (۱۹۵۹ء)، ص ۳۱۴ تا ۳۵۸: (۲۰) وہی مصنف: Monuments historiques de Damas بیروت ۱۹۳۲ء: (۳۱) وہی مصنف: Esquisse d'une chistoire de la ville de Damas در REI، ۱۹۳۴ء، ص ۴۲ تا ۴۸: (۳۲) K. A. C. Creswell A short account of early Muslim architecture لندن ۱۹۵۹ء، ص ۶۶ بعد: (۳۳) Monuments ayyoubides de Damas، PIFD، دمشق ۱۹۳۸ء تا ۱۹۵۰ء، کراہے لڑ J. Sauvaget، J. Sourdcl-Thomine اور M. Écochard: (۳۴) Les Bains de Damas: Ch. le Coeur و M. Écochard، جلدیں، PIFD، ۱۹۴۲ء تا ۱۹۴۳ء: (۳۵) E. Herzfeld Damascus: studies in architecture ۱: ۱ تا ۵۳، ۲: ۱ تا ۱۱۷، ۳: ۱ تا ۱۱۷، ۴: ۱ تا ۱۱۷، ۵: ۱ تا ۱۱۷، ۶: ۱ تا ۱۱۷، ۷: ۱ تا ۱۱۷، ۸: ۱ تا ۱۱۷، ۹: ۱ تا ۱۱۷، ۱۰: ۱ تا ۱۱۷، ۱۱: ۱ تا ۱۱۷، ۱۲: ۱ تا ۱۱۷، ۱۳: ۱ تا ۱۱۷، ۱۴: ۱ تا ۱۱۷، ۱۵: ۱ تا ۱۱۷، ۱۶: ۱ تا ۱۱۷، ۱۷: ۱ تا ۱۱۷، ۱۸: ۱ تا ۱۱۷، ۱۹: ۱ تا ۱۱۷، ۲۰: ۱ تا ۱۱۷، ۲۱: ۱ تا ۱۱۷، ۲۲: ۱ تا ۱۱۷، ۲۳: ۱ تا ۱۱۷، ۲۴: ۱ تا ۱۱۷، ۲۵: ۱ تا ۱۱۷، ۲۶: ۱ تا ۱۱۷، ۲۷: ۱ تا ۱۱۷، ۲۸: ۱ تا ۱۱۷، ۲۹: ۱ تا ۱۱۷، ۳۰: ۱ تا ۱۱۷، ۳۱: ۱ تا ۱۱۷، ۳۲: ۱ تا ۱۱۷، ۳۳: ۱ تا ۱۱۷، ۳۴: ۱ تا ۱۱۷، ۳۵: ۱ تا ۱۱۷، ۳۶: ۱ تا ۱۱۷، ۳۷: ۱ تا ۱۱۷، ۳۸: ۱ تا ۱۱۷، ۳۹: ۱ تا ۱۱۷، ۴۰: ۱ تا ۱۱۷، ۴۱: ۱ تا ۱۱۷، ۴۲: ۱ تا ۱۱۷، ۴۳: ۱ تا ۱۱۷، ۴۴: ۱ تا ۱۱۷، ۴۵: ۱ تا ۱۱۷، ۴۶: ۱ تا ۱۱۷، ۴۷: ۱ تا ۱۱۷، ۴۸: ۱ تا ۱۱۷، ۴۹: ۱ تا ۱۱۷، ۵۰: ۱ تا ۱۱۷، ۵۱: ۱ تا ۱۱۷، ۵۲: ۱ تا ۱۱۷، ۵۳: ۱ تا ۱۱۷، ۵۴: ۱ تا ۱۱۷، ۵۵: ۱ تا ۱۱۷، ۵۶: ۱ تا ۱۱۷، ۵۷: ۱ تا ۱۱۷، ۵۸: ۱ تا ۱۱۷، ۵۹: ۱ تا ۱۱۷، ۶۰: ۱ تا ۱۱۷، ۶۱: ۱ تا ۱۱۷، ۶۲: ۱ تا ۱۱۷، ۶۳: ۱ تا ۱۱۷، ۶۴: ۱ تا ۱۱۷، ۶۵: ۱ تا ۱۱۷، ۶۶: ۱ تا ۱۱۷، ۶۷: ۱ تا ۱۱۷، ۶۸: ۱ تا ۱۱۷، ۶۹: ۱ تا ۱۱۷، ۷۰: ۱ تا ۱۱۷، ۷۱: ۱ تا ۱۱۷، ۷۲: ۱ تا ۱۱۷، ۷۳: ۱ تا ۱۱۷، ۷۴: ۱ تا ۱۱۷، ۷۵: ۱ تا ۱۱۷، ۷۶: ۱ تا ۱۱۷، ۷۷: ۱ تا ۱۱۷، ۷۸: ۱ تا ۱۱۷، ۷۹: ۱ تا ۱۱۷، ۸۰: ۱ تا ۱۱۷، ۸۱: ۱ تا ۱۱۷، ۸۲: ۱ تا ۱۱۷، ۸۳: ۱ تا ۱۱۷، ۸۴: ۱ تا ۱۱۷، ۸۵: ۱ تا ۱۱۷، ۸۶: ۱ تا ۱۱۷، ۸۷: ۱ تا ۱۱۷، ۸۸: ۱ تا ۱۱۷، ۸۹: ۱ تا ۱۱۷، ۹۰: ۱ تا ۱۱۷، ۹۱: ۱ تا ۱۱۷، ۹۲: ۱ تا ۱۱۷، ۹۳: ۱ تا ۱۱۷، ۹۴: ۱ تا ۱۱۷، ۹۵: ۱ تا ۱۱۷، ۹۶: ۱ تا ۱۱۷، ۹۷: ۱ تا ۱۱۷، ۹۸: ۱ تا ۱۱۷، ۹۹: ۱ تا ۱۱۷، ۱۰۰: ۱ تا ۱۱۷، ۱۰۱: ۱ تا ۱۱۷، ۱۰۲: ۱ تا ۱۱۷، ۱۰۳: ۱ تا ۱۱۷، ۱۰۴: ۱ تا ۱۱۷، ۱۰۵: ۱ تا ۱۱۷، ۱۰۶: ۱ تا ۱۱۷، ۱۰۷: ۱ تا ۱۱۷، ۱۰۸: ۱ تا ۱۱۷، ۱۰۹: ۱ تا ۱۱۷، ۱۱۰: ۱ تا ۱۱۷، ۱۱۱: ۱ تا ۱۱۷، ۱۱۲: ۱ تا ۱۱۷، ۱۱۳: ۱ تا ۱۱۷، ۱۱۴: ۱ تا ۱۱۷، ۱۱۵: ۱ تا ۱۱۷، ۱۱۶: ۱ تا ۱۱۷، ۱۱۷: ۱ تا ۱۱۷، ۱۱۸: ۱ تا ۱۱۷، ۱۱۹: ۱ تا ۱۱۷، ۱۲۰: ۱ تا ۱۱۷، ۱۲۱: ۱ تا ۱۱۷، ۱۲۲: ۱ تا ۱۱۷، ۱۲۳: ۱ تا ۱۱۷، ۱۲۴: ۱ تا ۱۱۷، ۱۲۵: ۱ تا ۱۱۷، ۱۲۶: ۱ تا ۱۱۷، ۱۲۷: ۱ تا ۱۱۷، ۱۲۸: ۱ تا ۱۱۷، ۱۲۹: ۱ تا ۱۱۷، ۱۳۰: ۱ تا ۱۱۷، ۱۳۱: ۱ تا ۱۱۷، ۱۳۲: ۱ تا ۱۱۷، ۱۳۳: ۱ تا ۱۱۷، ۱۳۴: ۱ تا ۱۱۷، ۱۳۵: ۱ تا ۱۱۷، ۱۳۶: ۱ تا ۱۱۷، ۱۳۷: ۱ تا ۱۱۷، ۱۳۸: ۱ تا ۱۱۷، ۱۳۹: ۱ تا ۱۱۷، ۱۴۰: ۱ تا ۱۱۷، ۱۴۱: ۱ تا ۱۱۷، ۱۴۲: ۱ تا ۱۱۷، ۱۴۳: ۱ تا ۱۱۷، ۱۴۴: ۱ تا ۱۱۷، ۱۴۵: ۱ تا ۱۱۷، ۱۴۶: ۱ تا ۱۱۷، ۱۴۷: ۱ تا ۱۱۷، ۱۴۸: ۱ تا ۱۱۷، ۱۴۹: ۱ تا ۱۱۷، ۱۵۰: ۱ تا ۱۱۷، ۱۵۱: ۱ تا ۱۱۷، ۱۵۲: ۱ تا ۱۱۷، ۱۵۳: ۱ تا ۱۱۷، ۱۵۴: ۱ تا ۱۱۷، ۱۵۵: ۱ تا ۱۱۷، ۱۵۶: ۱ تا ۱۱۷، ۱۵۷: ۱ تا ۱۱۷، ۱۵۸: ۱ تا ۱۱۷، ۱۵۹: ۱ تا ۱۱۷، ۱۶۰: ۱ تا ۱۱۷، ۱۶۱: ۱ تا ۱۱۷، ۱۶۲: ۱ تا ۱۱۷، ۱۶۳: ۱ تا ۱۱۷، ۱۶۴: ۱ تا ۱۱۷، ۱۶۵: ۱ تا ۱۱۷، ۱۶۶: ۱ تا ۱۱۷، ۱۶۷: ۱ تا ۱۱۷، ۱۶۸: ۱ تا ۱۱۷، ۱۶۹: ۱ تا ۱۱۷، ۱۷۰: ۱ تا ۱۱۷، ۱۷۱: ۱ تا ۱۱۷، ۱۷۲: ۱ تا ۱۱۷، ۱۷۳: ۱ تا ۱۱۷، ۱۷۴: ۱ تا ۱۱۷، ۱۷۵: ۱ تا ۱۱۷، ۱۷۶: ۱ تا ۱۱۷، ۱۷۷: ۱ تا ۱۱۷، ۱۷۸: ۱ تا ۱۱۷، ۱۷۹: ۱ تا ۱۱۷، ۱۸۰: ۱ تا ۱۱۷، ۱۸۱: ۱ تا ۱۱۷، ۱۸۲: ۱ تا ۱۱۷، ۱۸۳: ۱ تا ۱۱۷، ۱۸۴: ۱ تا ۱۱۷، ۱۸۵: ۱ تا ۱۱۷، ۱۸۶: ۱ تا ۱۱۷، ۱۸۷: ۱ تا ۱۱۷، ۱۸۸: ۱ تا ۱۱۷، ۱۸۹: ۱ تا ۱۱۷، ۱۹۰: ۱ تا ۱۱۷، ۱۹۱: ۱ تا ۱۱۷، ۱۹۲: ۱ تا ۱۱۷، ۱۹۳: ۱ تا ۱۱۷، ۱۹۴: ۱ تا ۱۱۷، ۱۹۵: ۱ تا ۱۱۷، ۱۹۶: ۱ تا ۱۱۷، ۱۹۷: ۱ تا ۱۱۷، ۱۹۸: ۱ تا ۱۱۷، ۱۹۹: ۱ تا ۱۱۷، ۲۰۰: ۱ تا ۱۱۷، ۲۰۱: ۱ تا ۱۱۷، ۲۰۲: ۱ تا ۱۱۷، ۲۰۳: ۱ تا ۱۱۷، ۲۰۴: ۱ تا ۱۱۷، ۲۰۵: ۱ تا ۱۱۷، ۲۰۶: ۱ تا ۱۱۷، ۲۰۷: ۱ تا ۱۱۷، ۲۰۸: ۱ تا ۱۱۷، ۲۰۹: ۱ تا ۱۱۷، ۲۱۰: ۱ تا ۱۱۷، ۲۱۱: ۱ تا ۱۱۷، ۲۱۲: ۱ تا ۱۱۷، ۲۱۳: ۱ تا ۱۱۷، ۲۱۴: ۱ تا ۱۱۷، ۲۱۵: ۱ تا ۱۱۷، ۲۱۶: ۱ تا ۱۱۷، ۲۱۷: ۱ تا ۱۱۷، ۲۱۸: ۱ تا ۱۱۷، ۲۱۹: ۱ تا ۱۱۷، ۲۲۰: ۱ تا ۱۱۷، ۲۲۱: ۱ تا ۱۱۷، ۲۲۲: ۱ تا ۱۱۷، ۲۲۳: ۱ تا ۱۱۷، ۲۲۴: ۱ تا ۱۱۷، ۲۲۵: ۱ تا ۱۱۷، ۲۲۶: ۱ تا ۱۱۷، ۲۲۷: ۱ تا ۱۱۷، ۲۲۸: ۱ تا ۱۱۷، ۲۲۹: ۱ تا ۱۱۷، ۲۳۰: ۱ تا ۱۱۷، ۲۳۱: ۱ تا ۱۱۷، ۲۳۲: ۱ تا ۱۱۷، ۲۳۳: ۱ تا ۱۱۷، ۲۳۴: ۱ تا ۱۱۷، ۲۳۵: ۱ تا ۱۱۷، ۲۳۶: ۱ تا ۱۱۷، ۲۳۷: ۱ تا ۱۱۷، ۲۳۸: ۱ تا ۱۱۷، ۲۳۹: ۱ تا ۱۱۷، ۲۴۰: ۱ تا ۱۱۷، ۲۴۱: ۱ تا ۱۱۷، ۲۴۲: ۱ تا ۱۱۷، ۲۴۳: ۱ تا ۱۱۷، ۲۴۴: ۱ تا ۱۱۷، ۲۴۵: ۱ تا ۱۱۷، ۲۴۶: ۱ تا ۱۱۷، ۲۴۷: ۱ تا ۱۱۷، ۲۴۸: ۱ تا ۱۱۷، ۲۴۹: ۱ تا ۱۱۷، ۲۵۰: ۱ تا ۱۱۷، ۲۵۱: ۱ تا ۱۱۷، ۲۵۲: ۱ تا ۱۱۷، ۲۵۳: ۱ تا ۱۱۷، ۲۵۴: ۱ تا ۱۱۷، ۲۵۵: ۱ تا ۱۱۷، ۲۵۶: ۱ تا ۱۱۷، ۲۵۷: ۱ تا ۱۱۷، ۲۵۸: ۱ تا ۱۱۷، ۲۵۹: ۱ تا ۱۱۷، ۲۶۰: ۱ تا ۱۱۷، ۲۶۱: ۱ تا ۱۱۷، ۲۶۲: ۱ تا ۱۱۷، ۲۶۳: ۱ تا ۱۱۷، ۲۶۴: ۱ تا ۱۱۷، ۲۶۵: ۱ تا ۱۱۷، ۲۶۶: ۱ تا ۱۱۷، ۲۶۷: ۱ تا ۱۱۷، ۲۶۸: ۱ تا ۱۱۷، ۲۶۹: ۱ تا ۱۱۷، ۲۷۰: ۱ تا ۱۱۷، ۲۷۱: ۱ تا ۱۱۷، ۲۷۲: ۱ تا ۱۱۷، ۲۷۳: ۱ تا ۱۱۷، ۲۷۴: ۱ تا ۱۱۷، ۲۷۵: ۱ تا ۱۱۷، ۲۷۶: ۱ تا ۱۱۷، ۲۷۷: ۱ تا ۱۱۷، ۲۷۸: ۱ تا ۱۱۷، ۲۷۹: ۱ تا ۱۱۷، ۲۸۰: ۱ تا ۱۱۷، ۲۸۱: ۱ تا ۱۱۷، ۲۸۲: ۱ تا ۱۱۷، ۲۸۳: ۱ تا ۱۱۷، ۲۸۴: ۱ تا ۱۱۷، ۲۸۵: ۱ تا ۱۱۷، ۲۸۶: ۱ تا ۱۱۷، ۲۸۷: ۱ تا ۱۱۷، ۲۸۸: ۱ تا ۱۱۷، ۲۸۹: ۱ تا ۱۱۷، ۲۹۰: ۱ تا ۱۱۷، ۲۹۱: ۱ تا ۱۱۷، ۲۹۲: ۱ تا ۱۱۷، ۲۹۳: ۱ تا ۱۱۷، ۲۹۴: ۱ تا ۱۱۷، ۲۹۵: ۱ تا ۱۱۷، ۲۹۶: ۱ تا ۱۱۷، ۲۹۷: ۱ تا ۱۱۷، ۲۹۸: ۱ تا ۱۱۷، ۲۹۹: ۱ تا ۱۱۷، ۳۰۰: ۱ تا ۱۱۷، ۳۰۱: ۱ تا ۱۱۷، ۳۰۲: ۱ تا ۱۱۷، ۳۰۳: ۱ تا ۱۱۷، ۳۰۴: ۱ تا ۱۱۷، ۳۰۵: ۱ تا ۱۱۷، ۳۰۶: ۱ تا ۱۱۷، ۳۰۷: ۱ تا ۱۱۷، ۳۰۸: ۱ تا ۱۱۷، ۳۰۹: ۱ تا ۱۱۷، ۳۱۰: ۱ تا ۱۱۷، ۳۱۱: ۱ تا ۱۱۷، ۳۱۲: ۱ تا ۱۱۷، ۳۱۳: ۱ تا ۱۱۷، ۳۱۴: ۱ تا ۱۱۷، ۳۱۵: ۱ تا ۱۱۷، ۳۱۶: ۱ تا ۱۱۷، ۳۱۷: ۱ تا ۱۱۷، ۳۱۸: ۱ تا ۱۱۷، ۳۱۹: ۱ تا ۱۱۷، ۳۲۰: ۱ تا ۱۱۷، ۳۲۱: ۱ تا ۱۱۷، ۳۲۲: ۱ تا ۱۱۷، ۳۲۳: ۱ تا ۱۱۷، ۳۲۴: ۱ تا ۱۱۷، ۳۲۵: ۱ تا ۱۱۷، ۳۲۶: ۱ تا ۱۱۷، ۳۲۷: ۱ تا ۱۱۷، ۳۲۸: ۱ تا ۱۱۷، ۳۲۹: ۱ تا ۱۱۷، ۳۳۰: ۱ تا ۱۱۷، ۳۳۱: ۱ تا ۱۱۷، ۳۳۲: ۱ تا ۱۱۷، ۳۳۳: ۱ تا ۱۱۷، ۳۳۴: ۱ تا ۱۱۷، ۳۳۵: ۱ تا ۱۱۷، ۳۳۶: ۱ تا ۱۱۷، ۳۳۷: ۱ تا ۱۱۷، ۳۳۸: ۱ تا ۱۱۷، ۳۳۹: ۱ تا ۱۱۷، ۳۴۰: ۱ تا ۱۱۷، ۳۴۱: ۱ تا ۱۱۷، ۳۴۲: ۱ تا ۱۱۷، ۳۴۳: ۱ تا ۱۱۷، ۳۴۴: ۱ تا ۱۱۷، ۳۴۵: ۱ تا ۱۱۷، ۳۴۶: ۱ تا ۱۱۷، ۳۴۷: ۱ تا ۱۱۷، ۳۴۸: ۱ تا ۱۱۷، ۳۴۹: ۱ تا ۱۱۷، ۳۵۰: ۱ تا ۱۱۷، ۳۵۱: ۱ تا ۱۱۷، ۳۵۲: ۱ تا ۱۱۷، ۳۵۳: ۱ تا ۱۱۷، ۳۵۴: ۱ تا ۱۱۷، ۳۵۵: ۱ تا ۱۱۷، ۳۵۶: ۱ تا ۱۱۷، ۳۵۷: ۱ تا ۱۱۷، ۳۵۸: ۱ تا ۱۱۷، ۳۵۹: ۱ تا ۱۱۷، ۳۶۰: ۱ تا ۱۱۷، ۳۶۱: ۱ تا ۱۱۷، ۳۶۲: ۱ تا ۱۱۷، ۳۶۳: ۱ تا ۱۱۷، ۳۶۴: ۱ تا ۱۱۷، ۳۶۵: ۱ تا ۱۱۷، ۳۶۶: ۱ تا ۱۱۷، ۳۶۷: ۱ تا ۱۱۷، ۳۶۸: ۱ تا ۱۱۷، ۳۶۹: ۱ تا ۱۱۷، ۳۷۰: ۱ تا ۱۱۷، ۳۷۱: ۱ تا ۱۱۷، ۳۷۲: ۱ تا ۱۱۷، ۳۷۳: ۱ تا ۱۱۷، ۳۷۴: ۱ تا ۱۱۷، ۳۷۵: ۱ تا ۱۱۷، ۳۷۶: ۱ تا ۱۱۷، ۳۷۷: ۱ تا ۱۱۷، ۳۷۸: ۱ تا ۱۱۷، ۳۷۹: ۱ تا ۱۱۷، ۳۸۰: ۱ تا ۱۱۷، ۳۸۱: ۱ تا ۱۱۷، ۳۸۲: ۱ تا ۱۱۷، ۳۸۳: ۱ تا ۱۱۷، ۳۸۴: ۱ تا ۱۱۷، ۳۸۵: ۱ تا ۱۱۷، ۳۸۶: ۱ تا ۱۱۷، ۳۸۷: ۱ تا ۱۱۷، ۳۸۸: ۱ تا ۱۱۷، ۳۸۹: ۱ تا ۱۱۷، ۳۹۰: ۱ تا ۱۱۷، ۳۹۱: ۱ تا ۱۱۷، ۳۹۲: ۱ تا ۱۱۷، ۳۹۳: ۱ تا ۱۱۷، ۳۹۴: ۱ تا ۱۱۷، ۳۹۵: ۱ تا ۱۱۷، ۳۹۶: ۱ تا ۱۱۷، ۳۹۷: ۱ تا ۱۱۷، ۳۹۸: ۱ تا ۱۱۷، ۳۹۹: ۱ تا ۱۱۷، ۴۰۰: ۱ تا ۱۱۷، ۴۰۱: ۱ تا ۱۱۷، ۴۰۲: ۱ تا ۱۱۷، ۴۰۳: ۱ تا ۱۱۷، ۴۰۴: ۱ تا ۱۱۷، ۴۰۵: ۱ تا ۱۱۷، ۴۰۶: ۱ تا ۱۱۷، ۴۰۷: ۱ تا ۱۱۷، ۴۰۸: ۱ تا ۱۱۷، ۴۰۹: ۱ تا ۱۱۷، ۴۱۰: ۱ تا ۱۱۷، ۴۱۱: ۱ تا ۱۱۷، ۴۱۲: ۱ تا ۱۱۷، ۴۱۳: ۱ تا ۱۱۷، ۴۱۴: ۱ تا ۱۱۷، ۴۱۵: ۱ تا ۱۱۷، ۴۱۶: ۱ تا ۱۱۷، ۴۱۷: ۱ تا ۱۱۷، ۴۱۸: ۱ تا ۱۱۷، ۴۱۹: ۱ تا ۱۱۷، ۴۲۰: ۱ تا ۱۱۷، ۴۲۱: ۱ تا ۱۱۷، ۴۲۲: ۱ تا ۱۱۷، ۴۲۳: ۱ تا ۱۱۷، ۴۲۴: ۱ تا ۱۱۷، ۴۲۵: ۱ تا ۱۱۷، ۴۲۶: ۱ تا ۱۱۷، ۴۲۷: ۱ تا ۱۱۷، ۴۲۸: ۱ تا ۱۱۷، ۴۲۹: ۱ تا ۱۱۷، ۴۳۰: ۱ تا ۱۱۷، ۴۳۱: ۱ تا ۱۱۷، ۴۳۲: ۱ تا ۱۱۷، ۴۳۳: ۱ تا ۱۱۷، ۴۳۴: ۱ تا ۱۱۷، ۴۳۵: ۱ تا ۱۱۷، ۴۳۶: ۱ تا ۱۱۷، ۴۳۷: ۱ تا ۱۱۷، ۴۳۸: ۱ تا ۱۱۷، ۴۳۹: ۱ تا ۱۱۷، ۴۴۰: ۱ تا ۱۱۷، ۴۴۱: ۱ تا ۱۱۷، ۴۴۲: ۱ تا ۱۱۷، ۴۴۳: ۱ تا ۱۱۷، ۴۴۴: ۱ تا ۱۱۷، ۴۴۵: ۱ تا ۱۱۷، ۴۴۶: ۱ تا ۱۱۷، ۴۴۷: ۱ تا ۱۱۷، ۴۴۸: ۱ تا ۱۱۷، ۴۴۹: ۱ تا ۱۱۷، ۴۵۰: ۱ تا ۱۱۷، ۴۵۱: ۱ تا ۱۱۷، ۴۵۲: ۱ تا ۱۱۷، ۴۵۳: ۱ تا ۱۱۷، ۴۵۴: ۱ تا ۱۱۷، ۴۵۵: ۱ تا ۱۱۷، ۴۵۶: ۱ تا ۱۱۷، ۴۵۷: ۱ تا ۱۱۷، ۴۵۸: ۱ تا ۱۱۷، ۴۵۹: ۱ تا ۱۱۷، ۴۶۰: ۱ تا ۱۱۷، ۴۶۱: ۱ تا ۱۱۷، ۴۶۲: ۱ تا ۱۱۷، ۴۶۳: ۱ تا ۱۱۷، ۴۶۴: ۱ تا ۱۱۷، ۴۶۵: ۱ تا ۱۱۷، ۴۶۶: ۱ تا ۱۱۷، ۴۶۷: ۱ تا ۱۱۷، ۴۶۸: ۱ تا ۱۱۷، ۴۶۹: ۱ تا ۱۱۷، ۴۷۰: ۱ تا ۱۱۷، ۴۷۱: ۱ تا ۱۱۷، ۴۷۲: ۱ تا ۱۱۷، ۴۷۳: ۱ تا ۱۱۷، ۴۷۴: ۱ تا ۱۱۷، ۴۷۵: ۱ تا ۱۱۷، ۴۷۶: ۱ تا ۱۱۷، ۴۷۷: ۱ تا ۱۱۷، ۴۷۸: ۱ تا ۱۱۷، ۴۷۹: ۱ تا ۱۱۷، ۴۸۰: ۱ تا ۱۱۷، ۴۸۱: ۱ تا ۱۱۷، ۴۸۲: ۱ تا ۱۱۷، ۴۸۳: ۱ تا ۱۱۷، ۴۸۴: ۱ تا ۱۱۷، ۴۸۵: ۱ تا ۱۱۷، ۴۸۶: ۱ تا ۱۱۷، ۴۸۷: ۱ تا ۱۱۷، ۴۸۸: ۱ تا ۱۱۷، ۴۸۹: ۱ تا ۱۱۷، ۴۹۰: ۱ تا ۱۱۷، ۴۹۱: ۱ تا ۱۱۷، ۴۹۲: ۱ تا ۱۱۷، ۴۹۳: ۱ تا ۱۱۷، ۴۹۴: ۱ تا ۱۱۷، ۴۹۵: ۱ تا ۱۱۷، ۴۹۶: ۱ تا ۱۱۷، ۴۹۷: ۱ تا ۱۱۷، ۴۹۸: ۱ تا ۱۱۷، ۴۹۹: ۱ تا ۱۱۷، ۵۰۰: ۱ تا ۱۱۷، ۵۰۱: ۱ تا ۱۱۷، ۵۰۲: ۱ تا ۱۱۷، ۵۰۳: ۱ تا ۱۱۷، ۵۰۴: ۱ تا ۱۱۷، ۵۰۵: ۱ تا ۱۱۷، ۵۰۶: ۱ تا ۱۱۷، ۵۰۷: ۱ تا ۱۱۷، ۵۰۸: ۱ تا ۱۱۷، ۵۰۹: ۱ تا ۱۱۷، ۵۱۰: ۱ تا ۱۱۷، ۵۱۱: ۱ تا ۱۱۷، ۵۱۲: ۱ تا ۱۱۷، ۵۱۳: ۱ تا ۱۱۷، ۵۱۴: ۱ تا ۱۱۷، ۵۱۵: ۱ تا ۱۱۷، ۵۱۶: ۱ تا ۱۱۷، ۵۱۷: ۱ تا ۱۱۷، ۵۱۸: ۱ تا ۱۱۷، ۵۱۹: ۱ تا ۱۱۷، ۵۲۰: ۱ تا ۱۱۷، ۵۲۱: ۱ تا ۱۱۷، ۵۲۲: ۱ تا ۱۱۷، ۵۲۳: ۱ تا ۱۱۷، ۵۲۴: ۱ تا ۱۱۷، ۵۲۵: ۱ تا ۱۱۷، ۵۲۶: ۱ تا ۱۱۷، ۵۲۷: ۱ تا ۱۱۷، ۵۲۸: ۱ تا ۱۱۷، ۵۲۹: ۱ تا ۱۱۷، ۵۳۰: ۱ تا ۱۱۷، ۵۳۱: ۱ تا ۱۱۷، ۵۳۲: ۱ تا ۱۱۷، ۵۳۳: ۱ تا ۱۱۷، ۵۳۴: ۱ تا ۱۱۷، ۵۳۵: ۱ تا ۱۱۷، ۵۳۶: ۱ تا ۱۱۷، ۵۳۷: ۱ تا ۱۱۷، ۵۳۸: ۱ تا ۱۱۷، ۵۳۹: ۱ تا ۱۱۷، ۵۴۰: ۱ تا ۱۱۷، ۵۴۱: ۱ تا ۱۱۷، ۵۴۲: ۱ تا ۱۱۷، ۵۴۳: ۱ تا ۱۱۷، ۵۴۴: ۱ تا ۱۱۷، ۵۴۵: ۱ تا ۱۱۷، ۵۴۶: ۱ تا ۱۱۷، ۵۴۷: ۱ تا ۱۱۷، ۵۴۸: ۱ تا ۱۱۷، ۵۴۹: ۱ تا ۱۱۷، ۵۵۰: ۱ تا ۱۱۷، ۵۵۱: ۱ تا ۱۱۷، ۵۵۲: ۱ تا ۱۱۷، ۵۵۳: ۱ تا ۱۱۷، ۵۵۴: ۱ تا ۱۱۷، ۵۵۵: ۱ تا ۱۱۷، ۵۵۶: ۱ تا ۱۱۷، ۵۵۷: ۱ تا ۱۱۷، ۵۵۸: ۱ تا ۱۱۷، ۵۵۹: ۱ تا ۱۱۷، ۵۶۰: ۱ تا ۱۱۷، ۵۶۱: ۱ تا ۱۱۷، ۵۶۲: ۱ تا ۱۱۷، ۵۶۳: ۱ تا ۱۱۷، ۵۶۴: ۱ تا ۱۱۷، ۵۶۵: ۱ تا ۱۱۷، ۵۶۶: ۱ تا ۱۱۷، ۵۶۷: ۱ تا ۱۱۷، ۵۶۸: ۱ تا ۱۱۷،

Manual de la Cosmographie du Moyen Age
کونین ہیگن ۱۸۷۳ء (۲) براکمان، ۲ : ۱۳۰، تکملہ ۲ :
GAL ۱۶۱، طبع دوم ۲ : ۶۱۔

(D.M. DUNLOP (ڈنلپ

* الدمام : خلیج فارس کی ایک بندرگاہ اور سعودی عرب کے صوبہ شرقیہ کا صدر مقام۔ پہلے یہ ایک برج نما قلعے کا نام تھا جو ۲۶ درجے ۲۷ دقیقے ۵۶ ثانیے عرض بلد شمالی اور ۵۰ درجے ۶ دقیقے ۶ ثانیے طول بلد شرقی میں ساحل بحر کے قریب ایک مسطح پہاڑی پر جو آج کل کے شہر کے شمالی جانب ہے، واقع تھا۔ یہ تو معامون نہیں کہ یہ قلعہ کتب اور کیسے بنا لیکن اس کی عمارت کے بقیہ آثار جو ۱۹۵۷ء میں چھوٹے جہازوں کی لنگرگاہ بنانے کی غرض سے منہدم کر دیے گئے تھے، جلاہدہ کے معروف سمندری کپتان رحمۃ بن جابر (رگ بان) کے زمانے کے معلوم ہوتے ہیں۔ ابن جابر نے ۱۸۰۹ء میں آل سعود سے اتحاد کر کے الدمام میں ایک قلعہ تعمیر کیا تھا لیکن جب اُس نے اُن سے متعرف ہو کر البحرین پر حملہ کر دیا تو ۱۸۳۱ء/ ۱۸۱۹ء میں سعودیوں نے اس قلعے کو تباہ کر دیا۔ دو سال بعد اس نے القطیف پر قبضہ کرنے میں ابراہیم پاشا کی ترکی مصری فوجوں کی مدد کی اور الدمام پر دوبارہ قابض ہو گیا۔ اس نے قلعے کو فوراً از سر نو تعمیر کیا اور یہ قلعہ اپنے ضمنی استحکامات اور ساحل کی دیہاتی آبادی سمیت البحرین کے آل خلیفہ کے خلاف اس کی بحری کارروائیوں کا مرکز بن گیا۔ ۱۸۳۲ء/ ۱۸۲۹ء میں جب رحمۃ بن جابر بحرین کے محاصرہ کرنے والے بیڑے سے لڑنا ہوا مارا گیا تو آل خلیفہ اور بنی خالد نے الدمام پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد سترہ سال تک الدمام البحرین کے قبضے میں رہا۔ اس زمانے میں آل خلیفہ نے بنی خالد کی شاخ عمائر اور بنی ہاجر کے لوگوں کو الدمام میں بسنے کی اجازت دے دی۔ ۱۸۳۳ء/ ۱۸۲۵ء میں جب عبداللہ آل خلیفہ کو اس کے

بھتیجے کے بیٹے محمد نے الدمام سے نکال دیا تو خشکی کی طرف سے سعودی فوج یہاں داخل ہو گئی اور سمندر کی طرف سے البحرین کے بیڑے نے اسے آگھیرا؛ فیصل بن ترکی آل سعود نے ۱۸۳۳ء/ ۱۸۲۶ء میں قلعے پر قبضہ کر لیا۔ اس سے بشر بن رحمۃ بن جابر کو سخت مایوسی ہوئی، اس لیے کہ اس نے اس امید پر حملے میں شرکت کی تھی کہ اسے اس کی آبائی ریاست پھر مل جائے گی۔ ۱۸۵۲ء/ ۱۸۲۶ء میں آل سعود کا محمد آل خلیفہ سے جھگڑا ہو گیا اور آل سعود نے الدمام میں فرزند ابن عبداللہ کو دوبارہ برسر اقتدار کر دیا۔ جلاوطنوں نے البحرین پر پھر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ اس پر برطانیہ نے آل سعود سے انہیں البحرین سے نکال دینے کا مطالبہ کیا۔ جب آل سعود نے یہ مطالبہ پورا نہ کیا تو ۱۸۶۱ء/ ۱۸۴۸ء میں سمندر سے تھوڑی سی گولہ باری کر کے برطانیہ نے خود الہیں وہاں سے نکال دیا۔ ۱۸۶۶ء/ ۱۸۴۸ء میں الدمام کی محافظ فوج نے برطانوی بحری فوج کو پسپا کر دیا۔ برطانیہ کی فوج چاہتی تھی کہ قلعے کو برباد کر کے اس واقعے کا انتقام لے جو عمان کے مقام صور میں پیش آیا تھا۔ ۱۸۷۱ء/ ۱۸۷۱ء میں ترکی کی حملہ آور فوج نے جو مشرقی عرب کے ایک بڑے حصے پر قابض ہو چکی تھی، الدمام پر بھی قبضہ کر لیا۔ ترکی انتظام کے تحت قلعے کی کوئی مرمت اور دیکھ بھال نہ کی گئی اور الدمام گھٹتے گھٹتے مادی گبروں کی ایک چھوٹی سی بستی ہو کر رہ گیا جس کا ذکر کبھی کبھی بنی ہاجر کے ساتھ ان کی بحری ڈاکہ زنی میں آجاتا تھا۔ ۱۹۰۸ء/ ۱۸۹۶ء میں لوریمر (Lorimer) نے اسے ایک کھنڈر بتایا ہے جو کس پرستی کی حالت میں پڑا ہے۔ عبدالعزیز آل سعود نے جب ۱۳۳۱ھ/ ۱۹۱۳ء میں الحسا کو فتح کیا تو الدمام پھر سعودی حکومت میں شامل ہو گیا۔ موجودہ شہر الدمام کی بنیاد قیام الدواسر (رگ بان) کے لوگوں نے رکھی جو ۱۳۳۱ھ/ ۱۹۲۳ء میں اپنے آپ کو برطانیہ کے انتقام سے محفوظ

پر واقع ہے۔ یہاں سے اوبید تاسوت Oued Tassawt کی حاصل خیز وادی (جو اورلویا) سانچے دکھائی دیتی ہے۔ اس پہاڑی کی ڈھلانی زیتون کے درختوں اور انگور کی بیاوں سے ڈھکی ہوئی ہیں۔

الحسن بن محمد بن الوزان الزیاتی (Leo Afri- canus) نے لکھا ہے کہ دمنات میں کئی علمائے حدیث و فقہ موجود تھے، جن میں علی بن سلیمان الدمناتی (الجمعی: ۱۳۳۴ھ تا ۱۳۰۶ھ) کا نام بآسانی لیا جا سکتا ہے [جس نے کتب حدیث کی شروح اور حواشی کی طرف بالخصوص توجہ کی]، مثلاً سنن ابی داؤد کی مختصر شرح لکھی ہے جس کا نام درجات مرقاة الصعود إلى سنن ابی داؤد ہے اور جو ۱۲۸۵ھ اور ۱۹۲۸ء میں قاہرہ میں طبع ہو چکی ہے؛ [نیز ۱۲۹۷ھ میں صحیح البخاری کا حاشیہ روح التوضیح (طبع قاہرہ ۱۲۹۸ھ) لکھا؛ وشی الدبیاج علی صحیح مسلم بن الحجاج (طبع ۱۲۹۹ھ)؛ جامع الترمذی کی شرح نفع قوت المغتذی علی جامع الترمذی (طبع ۱۲۸۹ھ)؛ نور مصباح الزجاجة علی سنن ابن ماجہ (طبع ۱۲۹۹ھ) وغیرہ تصانیف یادگار چھوڑی ہیں]۔

مآخذ: (۱) P. Flammand: Les communions- (۲) testsrlites au Sud-Morocain دارالانشاء- ۱۹۵۹ء؛ (۳) P. Voynet: Pèlerinages judéo-musulmans au Maroc: Notes et Documents IHEM ج ۳، پیرس ۱۹۳۸ء؛ (۴) Missions au: E. Doulté (۲) ج ۶، ۶۰ تا ۶۱؛ (۵) Maroc: En tribu پیرس ۱۹۱۳ء؛ (۶) Textes Berb. en dial. de la l'Atlas marocain (۲) (در École des Lettres d. Alger ج ۲۶) پیرس ۱۹۰۸-۱۹۰۹ء؛ (۷) Étude sur Le dialecte berbère des Ntifa پیرس ۱۹۱۸ء؛ (۸) معجم الطبوعات العربیة، عمود ۵۲۷ تا ۵۲۸؛ (۹) معجم المؤلفین، ۷: ۱۰۳ (بع مآخذ)؛ (۱۰) کمالہ: معجم المؤلفین، ۷: ۱۰۳ (بع مآخذ)؛ (۱۱)

رکھنے کے لیے البحرین سے بھاگے تھے۔ بیس سال تک الدمام ماہی گیروں کا ایک گنہام گاؤں رہا۔ ۱۳۵۷ھ/ ۱۹۳۸ء میں کیلیفورنیا اریبین سنڈرڈ آئل کمپنی Arabian Standard Oil Company نے (جو اب اریبین امریکن آئل کمپنی Arabian American Oil Company ہے) قریب کے ایک مقام الظہران (رگ بان) میں تیل دریافت کیا جو اس بلند مقام پر واقع تھا جو برج دمام کہلاتا تھا۔ الدمام نے اس وقت سے ترقی کرنا شروع کی جب ۱۳۶۵ھ/ ۱۹۴۶ء میں اسے جدید طرز کی گہری سمندری بندرگاہ بنایا گیا اور یہاں سے ایک ریل دارالحکومت آریاض جانے لگی۔ یہ بندرگاہ جو اینٹ اور پتھر کے ایک پائے (pierhead) پر مشتمل ہے جسے خشکی سے لکڑی کے ۱۰۷ کیلومیٹر لمبے پل کے ذریعے ملا دیا گیا ہے، ۱۳۶۹ھ/ ۱۹۵۰ء میں کھولی گئی تھی اور بعد ازاں اسے زیادہ وسیع کر دیا گیا ہے۔ ۱۳۷۲ھ/ ۱۹۵۳ء میں صوبہ شرقیہ کا صدر مقام الھفوف سے جو الحسا کے نخلستان میں واقع ہے، الدمام میں منتقل کر دیا گیا۔ اس وقت سے الدمام تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔ اب یہاں شہری زندگی کی مختلف سہولیتی سہیا ہو گئی ہیں اور چھوٹے پیمانے پر تجارت اور صنعت و حرفت بھی شروع ہو گئی ہے۔ ۱۹۶۰ء میں اس شہر کی آبادی کا اندازہ پچیس ہزار لگایا گیا تھا۔

مآخذ: (۱) محمد النیمانی: النقطۃ النیمانیہ، قاہرہ ۱۳۴۷ھ؛ (۲) عثمان ابن بشر: عنوان المجدد، قاہرہ ۱۳۷۳ھ؛ (۳) Gazetteer of the Persian Gulf: J. G. Lorimer (۲) کلکتہ، ۱۹۰۸ء تا ۱۹۱۵ء؛ (۴) H. St. J. B. Philby: Saudi Arabia، لندن ۱۹۵۸ء۔

(H. W. ALTER)

* دمنات: (= دمنات، دمنت)، برونوں کا ایک چھوٹا سا شہر جو مراکش میں اطلس اعظم کے کنارے پر شہر مراکش کے مشرقی جانب ایک سو بیس کیلومیٹر کے فاصلے پر نو سو ساٹھ میٹر اونچی ایک چھوٹی سی پہاڑی

الزکلی : الأعلام، ۵ : ۱۰۰

(CH. PELLOT) [و ادارہ]

دہلی : رگ بہ دہلی

* دہلی : یہ نام قدیم مصری زبان کے لفظ دہلی سے لیا گیا ہے، جس کے معنی ہیں حورس اور کا شہر۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اس نام کے بہت سے شہر ملتے ہیں جو تقریباً سب کے سب دریائے نیل کے طاس میں واقع ہیں۔ (۱) دہلی الشہید یعنی "شہید کا" دہلی، یا قوت کے زمانے تک بھی اس کا یہی نام تھا اور اس نے یہی نام لکھا ہوا ہے۔ بعد میں اس گاؤں کا نام دہلی شہر ہو گیا، لیکن یہ نام المقدسی کے علم میں پہلے ہی سے تھا۔ ابن مثنیٰ اسے فقط دہلی لکھتا ہے، ان دونوں ناموں میں اجزا کی ترتیب کبھی الٹ جاتی ہے۔ چنانچہ بعض مصنفین نے اسے شہر دہلی لکھا ہے یہاں تک کہ بعض نے اسے شہر شہید بھی لکھا ہے۔ اس قسم کے تغیرات مصر میں اکثر نظر آتے ہیں، خاص کر اس صورت میں جب ایک نام کے کئی مقاموں کو باہم الگ الگ کرنا ہوتا ہے۔ شہر کو شہر الخیمہ یا شہر الخیم بھی کہہ دیتے ہیں یعنی خیموں کا شہر۔

اس مقام پر کبھی عسائیوں کا ایک قلعہ تھا جس میں کسی شہید کی ہڈیاں دفن تھیں۔ ۸ ہجری (۳ مئی) کو ہر سال اس گاؤں میں عام تعطیل منائی جاتی تھی اور لوگ اس قلعہ کو ساتھ لے کر جلوں کی شکل میں دریائے نیل تک جاتے تھے جہاں وہ تابوت دریا میں پھینک دیا جاتا تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اس طرح دریا میں دئی زیادہ مقدار میں آئے گا۔ یہ بات یقینی ہے کہ ۱۳۰۲ھ/۱۳۰۲ء میں اس دن زیادہ شراب پینے اور دعوتیں کرنے کی سعادت کر دی گئی تھی۔ یہ رواج ۱۳۳۸ھ/۱۳۳۸ء میں دوبارہ شروع ہو گیا، لیکن ۱۳۵۵ھ/۱۳۵۵ء میں اسے قطعی

طور پر بند کر دیا گیا اور قبرگت کو جلا دیا گیا۔

مآخذ : (۱) أبو صالح، ورق ۵۳ : (۲) ابن مثنیٰ، ص ۱۰۰ : (۳) المقدسی، ص ۵۳ : (۴) ۱۰۹۳ : (۵) یا قوت : (۶) ۱۰۱ : (۷) ابن مثنیٰ، ۵ : ۱۰۰ : (۸) Wiet : ۱ : ۲۹۲ تا ۲۹۶ : (۹) وہی مصنف : السلوک : ۱ : ۱۰۰ (مترجمہ Quatremère، ج ۲، ص ۲۱۳) : (۱۰) ابن مثنیٰ، ورق ۵۳ : ۸ : ۲۰۲ تا ۲۰۳ : (۱۱) ابن مثنیٰ، ص ۱۰۰ : (۱۲) Quatremère : Mémoires sur : Géographie de : Amelineau : ۱ : ۳۶۰ : (۱۳) ابن مثنیٰ، ص ۱۰۰ تا ۱۱۵ : (۱۴) J. Maspero اور G. Wiet : Matériaux : ص ۱۰۰ تا ۱۱۰ : (۱۵) ۲۱۲

(۲) صوبہ بحیرہ کا صدر مقام جو یوزنطی عہد میں ہیرنوپولس پروا (Hermopolis Parva) کہلاتا تھا۔ نام چونکہ قدیم ہے اس لیے اسے مسلمانوں کی تخلیق نہیں کہہ سکتے، لیکن عرب فتوحات سے پہلے کی قدیم تاریخوں میں اس کا ذکر کم ہی نہیں ملتا۔ یہاں کا مشہور مقام قرطبہ ہے اور یہی ایک نام ہے جس سے قدیم مصنفین واقف تھے، انہوں نے اسے ایک کورہ کا صدر مقام بتایا ہے۔

اس کا قدیم ترین ذکر ابن مثنیٰ کے یہاں ملتا ہے جو اسے دہلی والوحش کہتا ہے۔ ابن خیر اور یا قوت اس میں سے ہو کر گذرے تھے۔ وہ اسے اوسط درجے کا شہر بتاتے ہیں، جو فصل سے گھرا ہوا تھا۔ ابن مثنیٰ ایک نہر کا بھی ذکر کرتا ہے جو تسمیر کے نام پر بحر دہلی کہلاتی تھی۔ سلطان برقوق نے اس کی قلعہ بندی دوبارہ درست کرائی تاکہ بدوبوں کے حملوں کی مؤثر طریقے پر روک تھام ہو سکے۔ علاوہ بریں اس شہر کو ۱۳۰۲ھ/۱۳۰۲ء میں زلزلے سے بھی سخت نقصان پہنچ چکا تھا۔ دہلی کی اہمیت بڑھتی رہی، اور ابن مثنیٰ کے بیان کے مطابق اس میں ایک جامع، مسجد، متعدد مدارس، کاروان سرائیں

Mémoires sur l'Égypte : ۱ : ۳۶۱ تا ۳۶۳ : (۱۵)
Histoire de la Nation Égyptienne : Dehétrain : ۵
 ۱۸۳۶ : (۱۶) J. Maspero اور *Matériaux* : Wiet
 ۱۸۵۶ تا ۱۸۵۷، ۱۸۵۸ تا ۱۸۵۹، ۱۸۶۰ تا ۱۸۶۱، ۱۸۶۲ تا ۱۸۶۳ : ۱۹۳

اسی نام کے دیگر مقامات جغرافیائی فہرست میں
 درج ہیں لیکن ان کا کچھ حال بتایا نہیں گیا ۔

مآخذ : المقدس : ص ۵۵ : ابن مثنیٰ : ص ۱۳۵ -
 ۱۳۵ : ابن دقاق : ۵ : ۸۹ : ابن جیمان : ص ۷۸ -
 (G. Wiet)

دھیاط : (Damiatta)، مصر زبیر کا ایک شہر، *
 جو دریائے نیل کی مشرقی شاخ پر اس کے دھانے کے
 قریب واقع ہے۔ دھیاط کو، جو فتح اسلام سے پہلے
 ایک اہم شہر تھا، مقداد بن الاسود کی قیادت میں ایک
 فوج نے تسخیر کیا جسے عمرو بن العاص نے بھیجا تھا۔
 مسلمانوں کے قبضے میں آنے کے بعد اس شہر کو بار بار
 بحری حملوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ حملے پہلے بوزنطیوں
 کی طرف سے ہوئے اور پھر صلیبیوں کی طرف سے۔
 ذوالحجہ ۵۲۳۸ / جون ۱۸۵۳ء میں ایک حملے کے
 بعد المتوکل نے بحیرہ روم کے ساحل کی ورجہ بندی کے
 ایک عام منصوبے کے مطابق دھیاط کے مقام پر ایک
 قلعہ تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ بنو فاطمہ کے خاتمے پر اور
 آل ایوب کی حکومت کے دوران فرنگیوں اور مسلمانوں
 کی باہمی جنگوں میں دھیاط کو کلید مصر کی حیثیت سے
 خصوصی اہمیت حاصل رہی۔ جب صلاح الدین ایوبی
 وزیر مصر تھا، فرنگیوں نے امالک (Amalric) اول،
 فرمانروائے بیت المقدس کی کمان میں دھیاط کا محاصرہ کر
 لیا، لیکن ربیع الاول ۵۶۵ / دسمبر ۱۱۶۹ء میں انہیں
 پسپا کر دیا گیا۔ دھیاط دوبارہ پھر اہم فوجی مہموں
 کا مرکز بنا۔ ۵۶۱۵ / ۱۲۱۸ء تا ۵۶۱۸ / ۱۲۲۱ء کی
 عظیم صلیبی مہم کے دوران میں صلیبی اس شہر پر قبضہ
 کرنے میں کامیاب ہو گئے (دیکھئے Hans. L. Gotts-

اور چھٹی ہوئی مٹدیاں بھی تھیں۔ اس زمانے میں یہ فقط
 صوبہ بحیرہ کا صدر مقام ہی نہیں تھا بلکہ ایک
 مملوک افسر اعلیٰ کی اقامت گاہ بھی تھا، جس کا
 اقتدار پورے طاس پر تھا۔ ڈاک کی جو سڑک صحرا
 کے کنارے کنارے قاہرہ سے اسکندریہ جاتی تھی،
 یہ مقام اس کی ایک منزل گاہ تھا اور یہاں پیغام رسان
 کبوتروں کا اڈا بھی تھا۔ Sonnini کے بیان کے
 مطابق یہ شہر تو بڑا تھا لیکن اس کی تعمیر بہت
 بھرے انداز سے ہوئی تھی۔ یہاں کے تقریباً سارے مکان
 یا تو کچے ہیں یا ناتھیں اینٹوں کے بنے ہوئے تھے۔
 یہ کپاس کی تجارت کا مرکز ہے جو فراخ اور وسیع
 میدانوں سے جو اس کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے
 ہیں، اکھٹی کر کے وہاں لائی جاتی ہے۔

۳۰ اپریل ۱۷۹۹ء کو مہدی احمد کی
 فوجوں نے یہاں ایک فرانسیسی دستے کو تباہ تیغ کیا
 اور اس کے بڑے خوفناک نتائج برآمد ہوئے۔
 مشہور آج کل آبادی کے لحاظ سے بڑا گنجان
 شہر ہے، قاہرہ سے اسکندریہ جانے والی ریل بھی یہاں
 ٹھہرتی ہے اور یہاں سے بہت سے دوسرے مقامات کو
 بھی ریلیں جاتی ہیں۔

مآخذ : (۱) ابن عبدالحکم، ص ۸۳ : (۲) *Syna-*
Xaire Patrologia Orientalis : ۱۷ : ۵۶۵ : ۱۱۰۷ : (۳)
 الادریسی : المغرب، ص ۱۶۰ : (۴) ابن مثنیٰ، ص ۱۶۹
 ۲۲۶ تا ۲۲۷ : (۵) ابن جبر، ص ۴۴ (ترجمہ Gaudelroy
 Demombynes، ص ۳۵) : (۶) یاقوت، ۲ : ۶۰۱ : (۷)
 ابن قرات، ۹ : ۸۶ : (۸) ابن دقاق، ۵ : ۱۰۱ : (۹) التفتندی،
 ۳ : ۲۷۶ : ۲۸۱ : (۱۰) (ترجمہ ویسٹفلٹ، ص ۱۱۱) : (۱۱)
 المقریزی : السلوک، ۱ : ۹۳۸ (ترجمہ Quatrémer
 ۱۱۹ : ۱۱۷ : ۱۲۵ : (۱۲) الظاہری، ص ۱۱۷ : ۱۱۹ :
 (ترجمہ Venture de Paradis، ص ۵۵ : ۱۱۹ : ۱۲۰) :
 (۱۳) ابن ترقی بردی، (طبع قاہرہ) : ۱۱۷ : ۱۲۰ : ۱۱۳ :
 تا ۱۱۴ : (۱۴) ابن جیمان، ص ۱۱۶ : (۱۵) Quatrémer :

(P. M. HOLT)

الدمياطی البناء : احمد بن محمد بن احمد بن محمد بن عبد الغنی الدمياطی المعروف به البناء، اگرچہ وہ مصر زہرین میں مقامی طور پر درویشوں کے سلسلہ نقشبندیہ کے رکن رکین کی حیثیت سے مشہور تھا، لیکن اس کی اصلی شہرت اس کی تصنیف اِتِّخَافُ فَضْلَاءِ الْبَشَرِ کے باعث ہے، جو قراء اربع عشرہ کی مختلف قرآنی قراءتوں کے بارے میں ہے۔ الدمياطی دمياط میں پیدا ہوا۔ وہاں اس نے مقامی اساتذہ سے وہی تعلیم حاصل کی جو اس زمانے میں عام مسلمان لڑکے پاتے تھے تا آنکہ اسے قاہرہ جانے کا موقع ملا جہاں اس نے المراحی اور شرامسہ سے علم القراءت، حدیث اور شافعی فقہ پڑھی، اور الاجہوری، الشوری، التلیولی اور الیمونی جیسے کاملان فن سے بھی استفادہ کیا۔ اپنی تعلیم ختم کر لینے کے بعد وہ فریضہ حج ادا کرنے کے لیے مکہ معظمہ گیا جہاں اس نے الکورانی سے علم حدیث حاصل کیا۔ دمياط میں واپس آ جانے کے بعد الدمياطی نے اپنی کتاب اِتِّخَافُ شَائِعِی کی جسے وہ بظاہر اپنے قیام حجاز کے دوران تصنیف کرتا رہا تھا۔ اس کتاب میں اس نے ابن مَحْصِن المکی، الیزیدی البصری اور الاعمش الکوفی نیز ان قراء عشرہ کی قراءتیں جمع کیں جن کا عام طور پر زیادہ مطالعہ کیا جاتا ہے اور اس میں علم قراءت پر ایک نہایت فاضلانہ مقالہ بطور مقدمہ شامل کیا۔ الدمياطی نے مشہور کتاب السیرۃ الحلبيہ کا ایک جلد میں ملاحظہ بھی تیار کیا اور ایک رسالہ الذخائر المہمات روز قیامت سے پہلے ظہور میں آنے والی نشانیوں کے بارے میں لکھا۔ پھر اس نے دوسری بار حج کیا اور حرمین شریفین کی زیارت کے بعد یمن کا سفر اختیار کیا جہاں شیخ احمد بن عجل کے کہنے پر وہ سلسلہ نقشبندیہ میں منسلک ہو گیا۔ مصر واپس آکر اس نے عزیز الجرج کے ساحلی گاؤں میں سکونت اختیار کی اور ایک رابطہ (تارک الدنیا درویش) کی زندگی بسر کرنے لگا۔ الدمياطی جب تیسری بار حج

Al-Malik al-Kamil von Egypten und seine : chalk Wiesbaden, Zeit ۱۰۸۸ تا ۱۱۵۱) لیکن بالآخر الملک الکامل نے انہیں ہتیار ڈال دینے پر مجبور کر دیا۔ صفر ۶۳۷ھ/جون ۱۲۴۹ء میں ملک الصالح کی وفات سے کچھ ہی عرصہ پہلے لوئی Louis نہم نے دمياط فتح کر لیا لیکن بعد ازاں نوئی کے سپر انداز ہونے پر یہاں مسلمانوں کا قبضہ بحال ہو گیا۔ بحری مسالیک نے کہ ان دنوں مصر کا حکمران طبقہ انہیں پر مشتمل تھا، دمياط کی عسکری اہمیت ختم کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ ۱۲۵۰/۶۳۸ھ میں مسجد کے سوا فصیل اور سارے کا سارا شہر منہدم کر دیا گیا اور ۱۲۶۰/۶۵۹ھ میں بیرس کے حکم سے دریا کا دہانہ سمندر کی جانب جانے والے جہازوں پر بند کر دیا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ دمياط کی بربادی وہاں کی کپڑے کی صنعت کے معدوم ہو جانے کا باعث بنی لیکن بہت جلد پرانے قصبے کے جنوب میں ایک نیا شہر وجود میں آ گیا جو پرانے نام ہی سے مشہور ہوا۔ دور مسالیک اور عہد آل عثمان میں دمياط کو مقام جلاوطنی کی حیثیت حاصل رہی۔ ربیع الاول ۱۲۱۸ھ/جولائی ۱۸۰۳ء میں مصر کے عثمانی نائب السلطنت محمد خسرو پاشا کو البانوی فوجیوں کی ایک بغاوت کے سبب سے قاہرہ سے نکلنا پڑا اور اس نے دمياط کے مقام پر، جہاں وہ محصور ہو گیا تھا، اس فوج کے سامنے ہتیار ڈال دیے جن کی کمان محمد علی اور معاویوں کا امیر الامرا عثمان یک البردبسی کر رہے تھے۔

مآخذ : ضروری معلومات (۱) المقریزی : المواقف، طبع Wiet، ۲/۳ : ۲۷ تا ۸۰ : (۲) علی مبارک : الخطط الجندیۃ، ۱۱ : ۲۶ تا ۵۷ (جہاں زیادہ تر المقریزی ہی کے روایات نقل کر دیے گئے ہیں) میں موجود ہیں۔ مکمل مآخذ کے لیے دیکھئے (۳) Matériaux : Maspero-Wiet، ص ۹۰ تا ۹۱۔

تقریباً ۱۹۱۲ء) جو مکمل تصنیف کے ۱۲۵۰ میں سے ۱۱۸۵ مندرجات پر مشتمل ہے اور جس کی کتابت خود مصنف نے کرائی تھی۔ اس تصنیف میں وہ احادیث اور دیگر متون شامل ہیں جو الدیپاتی نے ۱۸۶۹ء/۱۲۳۸ اور ۱۸۶۹ء/۱۲۵۸ کے مابین مصر، حرمین شریفین، شام، الجزائر اور عراق کے متعدد سفروں کے دوران میں لکھنے کئے تھے۔ یہ تمام چیزیں، نذر کئی اسناد قراءت، جو ان کے ساتھ شامل ہیں، G. Vajda کے ایک تحقیقی مقالے کا موضوع بنیں گی۔ انہی تصنیفات سے قطع نظر الدیپاتی ساتویں صدی ہجری/تیسری صدی عیسوی کی آخری تہائی میں حدیث کا اہم ترین راوی تصور کیا جاتا تھا۔

مآخذ: (۱) براکلمان، بار دوم، ۲: ۸۸ و تکرار، ۲: ۷۹: (۲) الذر الکلمۃ، ۲: ۷۱، عدد ۲۵۲۵: (۳) ابن رفیع: منتخب المختار، طبع الزاوی، ص ۱۲۰ تا ۱۲۲، عدد ۱۰۰: الدیپاتی بحیثیت راوی حدیث کے بارے میں نیز دیکھئے (۴) Alwardt: Berlin Verzeichniss... ۱۸۶۸ء (۵) G. Vajda: Les certificats de lecture... ۱۹۲۱ء (۶) احمد آتش، در RIMA ۱۹۵۸ء، ص ۱۲: (۷) G. Vajda

* الدیپاتی: نور الدین، یا أصیل الدین: اس کی تاریخ ولادت اور تاریخ وفات کے بارے میں معلومات یقینی نہیں ہیں، لیکن اتنی بات کم و بیش وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اس کا زمانہ ساتویں صدی ہجری/تیسری صدی عیسوی کے اواخر سے پہلے کا نہیں ہے۔ وہ اسماعی باری تعالیٰ کی تشریح میں ایک قصیدہ لایہ کا مصنف تھا (رک بہ الاسماء العسوی: ذکر)۔ مشہور ہے کہ اس قصیدے کے ہر شعر میں پراسرار خصوصیات پائی جاتی ہیں اور اس کی شرحوں میں، جو بکثرت لکھی گئی ہیں، انہیں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے (مشہور قرآن شرح مراکشی

کرنے گیا تو مدینہ منورہ میں معزم ۱۱۱۷ھ/اپریل ۱۷۰۵ء میں وفات پا گیا اور البقیع میں سپرد خاک ہوا۔ اتحات کے علاوہ جو قسطنطنیہ میں ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸-۱۸۶۹ء میں اور قاہرہ میں ۱۳۱۷ھ/۱۸۹۹ء میں چھپی تھی، اس نے قراءت قرآن کے بارے میں چھوٹی چھوٹی کتابیں بھی لکھی تھیں جن کے قلمی نسخے اب تک باقی ہیں۔ علاوہ بریں امام الحرمین کی تصنیف البورقات پر المجلد کی شرح کا ایک حاشیہ بھی المدیہ اہلی نے لکھا تھا، جو قاہرہ میں ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۵-۱۸۸۶ء اور بار دوم ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۳-۱۹۱۴ء میں طبع ہو چکا ہے۔

مآخذ: (۱) الحیرتی: عجائب الآثار، ۱: ۸۹، ۹۰، ماقول در علی پاشا مبارک: الخطط الجردۃ، ۹: ۵۶: (۲) سر کس: معجم المصنفات النجاشی، ۴۷: ۱۸۸۵: (۳) براکلمان، ۲: ۳۷۷ و تکرار، ۲: ۵۵۔

(A. JEFFERY)

* الدیپاتی: عبدالمؤمن بن خلف شرف الدین التونی الدیپاتی الشافعی، ایک محدث، جو ۱۱۳۳ھ/۱۷۲۱ء میں دمشق اور تیس کے درمیان جزیرے قونیا میں پیدا ہوا۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں وہ منصوریہ میں اور قاہرہ کے مدرسۃ النظاریہ میں معلم تھا اور یہیں ۱۲۰۵ھ/۱۷۹۰ء میں اس نے وفات پائی۔ براکلمان کی دی ہوئی فہرست تصانیف کے علاوہ (جس میں A. Dietrich کے حالیہ مطالعے Abdulau'min شریقات مجموعہ سی، ۲: (۱۹۵۹ء): ۱۲۵ تا ۱۵۵ء کا بھی اضافہ کر لینا چاہیے) الدیپاتی نے معجم شیوخ کے نام سے ایک نکت اسناد بھی تصنیف کی ہے۔ زمانہ مابعد کے مؤرخوں اور سوانح نگاروں نے اکثر اس کتاب کے حوالے دیے ہیں اور اس سے استفادہ کیا ہے۔ آج یہ کتاب اپنے ایک واحد نامکمل نسخے کی صورت میں موجود ہے (کتاب خانہ احمدیہ، تونس، ص ۹۱۱

عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ اسی مفہوم میں اس لفظ کا اطلاق ترکوں نے سویڈن کے بادشاہ چارلس دوازدہم پر کیا تھا۔ ممکن ہے کہ یہ عربی نام اس کے ترکی سرکاری دفاتر میں چکر لگاتے رہنے پر ایک طنزہ تنقید ہو۔

مأخذ : (۱) BSLP، ۱۹۶۰/۱۹۶۱، ج ۳۳ (ادارہ ۱۹، لائن، بار دوم)۔

* ذمیر قبو : (یا ذمیر قبی) [تاسر قبو، تیسر قبو]، * رک بہ درآہن۔

الذمیری : محمد بن موسیٰ بن عیسیٰ کمال الدین، * ۴۲۲ھ/۱۳۳۱ء کے اوائل میں قاہرہ میں پیدا ہوا (اس کی خود نوشت تحریر کے مطابق، جسے السخاوی نے الضوء الامع، ۱: ۵۹ میں نقل کیا ہے) اور وہیں ۸۰۸ھ/۱۴۰۵ء میں وفات پائی۔ بعض مأخذ میں اس کی تاریخ پیدائش اس کے بعد کی بتائی گئی ہے (۴۲۵ھ/۱۳۳۴ء یا ۵۰۵ھ/۱۳۲۹ء)، لیکن یہ تاریخیں اس کی زندگی کی بعض تفصیلات سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ اس کی نسبت دو چھوٹے چھوٹے گانوں کے ناموں سے مأخوذ ہے، جن میں سے ہر ایک کا نام ذمیرہ ہے اور دونوں سننود کے قریب طامن میں واقع ہیں۔

شروع میں وہ اپنے آبائی شہر میں درزی کے کام سے کسب معاش کرتا رہا۔ بعد ازاں اس نے پیشہ ور عالم دین بننے کا فیصلہ کیا اور تحصیل عام کے لیے مشہور شافعی عالم بہاء الدین السبکی [رک بہن] کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور اس کے دامن عام سے وہ کئی سال تک وابستہ رہا۔ اس کے علاوہ اس نے جمال الدین الاسنوی (برا کلماں، ۱: ۱۱۰، وتکملة، ۳: ۱۰۷)، ابن العقيل، جو الفیہ ابن مالک کا مشہور شارح ہے (برا کلماں، ۲: ۸۰-۱۰۸ و تکملة، ۲: ۱۰۸)، برهان الدین التیراطی (برا کلماں، ۲: ۱۵۰ و تکملة، ۲: ۷۰) اور دیگر علما سے بھی درس لیا۔ اس کے میرت نگار لکھتے ہیں کہ اسے فقہ، علوم حدیث، تفسیر، عربی علم اللسان اور معانی و بیان میں بڑی

صوفی احمد البرنوسی زروق، ۸۹۹/۱۴۹۳ء کی ہے)۔ خاص طور پر شمالی افریقہ کے نیم خواندہ عوام کے اوراد و وظائف میں قصیدہ دیماطیہ کو خاصا بلند مقام حاصل ہے۔ ۱۲۵۷ھ/۱۸۴۱ء میں اس کا ترجمہ عثمانی ترکی میں ابراہیم بن محمد صالح القادری القسطنونی الاستانبولی نے کیا تھا، جو اگلے سال کئی تقریظوں اور عربی متن کے ساتھ استانبول میں نرائد اللالی فی بیان اسماء المتعالی کے نام سے طبع ہوا۔ اسی نوع کی ایک اور تصنیف الذمیطی سے مشہور ہے، جس کا ایک حصہ مع شرح ایک مخطوطے کی صورت میں کتاب خانہ ملی، پیرس (عربی، عدد، ۱۰۵، ورق ۱۲۸ تا ۱۳۹) میں محفوظ ہے۔ اس کی ایک نقل، جو عوامی زبان سے مبرا نہیں، محمود ہزہ الذمیطی نے لکھی تھی (جو الاستغفار الاسماء فی نظام اسماء اللہ الحسنی کے نام سے بولاق ۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء میں بدیع المقال کے ضمیمے کے طور پر طبع ہوئی تھی)۔

مأخذ : (۱) J. Goldzihr، در Orientalische Studien Nöldeke، ۳۱۷: ۱ تا ۳۲۰: (۲) Magie et Religion en Afrique du Nord : F. Dhullé، ص ۱۲۹ تا ۲۱۱: (۳) G. Levi Della Vida، (۴) Blenco، ص ۵۵ تا ۶۶: (م) برا کلماں، تکملة، ۲: ۳۶۱ حاشیہ۔

(G. Vajda)

* ذمیر باش : لفظی معنی ”لوہے کی انی“، دقتر، دکان، کھیت وغیرہ سے تعلق رکھنے والے قابل انتقال اٹائے اور ساز و سامان کے لیے ایک ترکی اصطلاح۔ عثمانی ترکوں کے محاورے میں اس کا اطلاق عموماً ان اشیاء پر ہوتا تھا جو حکومت کی ملکیت ہوتی تھیں، خاص طور پر اس سے مراد سرکاری دفاتر کے فرش و فرش، ساز و سامان اور مستقل لوازمات ہوتے تھے، جو کسی مستقل ادارے سے متعلق ہوتے تھے۔ لفظ ”ذمیر باش“ کے معنی ضدی اور مستقل مزاج کے بھی آتے ہیں اور

Index des sources : J. de Somogyi (۹) : ۲۷۲ : ۲
 de la Hayat al-Hayawan ad-Damiri در JA، جولائی-
 ستمبر ۱۹۲۸ء ص ۵ بعد، جس کا دار و مدار بعض طبع قاہرہ
 ۱۲۸۸ء پر ہے : (۱۰) وہی مصنف : Biblical Figures
 Dissert. in در in ad-Damiri's Hayat-Hayawan
 (۱۱) honorem E. Mahler، ۱۹۳۷ء ص ۲۶۳ بعد : (۱۲)
 وہی مصنف : ad-Damiri's Hayat al-Hayawan در
 Osiris، ج ۹ (۱۹۵۰ء) ص ۳۳ بعد : (۱۳) وہی مصنف :
 ad-Damiri Hayat al-Hayawanja (زبان ہنگروی)،
 در Sem. St. in Memory of I. Löw، ۱۹۶۷ء ص ۱۲۳
 بعد : (۱۴) وہی مصنف : Chess and Backgammon in
 ad Damiri's Hayat al-Hayawan, Et. or à la
 mêm. de P. Hirschler، ۱۹۵۰ء ص ۱۰۱ بعد : (۱۵)
 وہی مصنف : Hayawan در JSS، ۲ (۱۹۵۷ء) : ۶۲ بعد : (۱۶)
 وہی مصنف : The Interpretation of Dreams in
 ad-Damiri's Hayat al-Hayawan در JRAS،
 ۱۹۶۸ء ص ۱ بعد : (۱۷) Die Chalifengeschichte in
 "Damiri's 'Hayat al-Hayawan'" در Isl.، ۱۸
 (۱۹۶۹ء) : ۱۵۸ بعد : (۱۸) وہی مصنف : A History
 of the Caliphate in the Hayat al-Hayawan of
 ad-Damiri در BSOS، ۸ (۱۹۳۵ تا ۱۹۳۷ء) :
 ۱۳۳ بعد : (۱۹) Beitr. z. Gesch. d. E. Wiedemann،
 Naturw.، ۵۳ : ۲۳۳ بعد : (۲۰) H. A. Winkler،
 Eine Zusammenstellung christlicher Geschichten
 ein Artikel über das Schwein in Damiri's Tierbuch
 در Isl.، ۱۸ (۱۹۶۹ء) : ۲۸۵ بعد .

(L. Korf)

دَنَابِل، دَنَاقِلہ : رَک بہ دَنَابِل .

دَنَیْب : رَک بہ دَنَیْب .

دَنَابَوْنَد : رَک بہ دَمَاوَنَد .

دَنَابِل : رَک بہ کَرْد .

وہی اور خیالی باتوں کو بھی جگہ دی ہے۔ اس نے
 جانوروں کے متعلق ان تمام معلومات کو جن کی حیثیت
 روایتی ہے ایک ترتیب کے ساتھ جمع کر کے دوسروں
 تک پہنچا دیا ہے اور ان معلومات کی بنیاد سینکڑوں
 ماخذ پر رکھی ہے۔ ان ماخذ کا تجزیہ J. de Somogyi
 نے کیا ہے گو یہ تجزیہ اطمینان بخش نہیں۔ یہ کتاب
 تین متعق نسخوں میں ملتی ہے : ایک مفصل، ایک مختصر
 اور ایک متوسط۔ مطول نسخہ مشرق میں تیرہ بار طبع
 ہو چکا ہے (ان اشاعتوں کے علاوہ جن کا ذکر براکلمان
 نے کیا ہے یہ کتاب قاہرہ میں ۱۳۱۵-۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۵۳ء میں بھی چھپی تھی) اس کتاب کی
 تنقیدی طباعت کا هنوز انتظار ہے۔ اس کے متعدد خلاصے
 اور اقتباسات بھی مرتب کیے گئے ہیں۔ علاوہ براب
 سترہویں صدی کا ایک فارسی ترجمہ اور قریبی زمانے
 کا ایک ترکی ترجمہ بھی ملتا ہے۔ Jayakar کا انگریزی
 ترجمہ مقالہ ابو نواس تک ہے (جو پوری کتاب کا تقریباً
 تین چوتھائی ہے) اور لسانی نقطہ نظر سے قابل اطمینان نہیں۔
 الدیمی کی دیگر تصانیف میں سے اس وقت صرف
 تین موجود ہیں (دیکھیے براکلمان)۔ اس کی آخری تصنیف
 الاباجہ، ابن ماجہ (رَک باں) کی نصف سن کی شرح ہے
 لیکن الدیمی اپنی وفات سے پہلے اس کا صاف نسخہ تیار
 نہیں کر سکا تھا .

ماخذ : (۱) علی مبارک : الخطط الجديدة، ۱۱ :

۵۹ : (۲) براکلمان، ۲ : ۱۷۲ بعد و تکملہ، ۲ : ۱۷۰ :

بعد و ۳ : ۱۲۶ : (۳) الدیمی : حیاة الحيوان، عربی سے

ترجمہ از A. S. G. Jayakar، لندن و بیہی ۱۹۰۶ء تا

۱۹۰۸ء دیباچہ : (۴) حاجی خلیفہ، ۱ : ۶۹۶ بعد و

طبع Flügel، بعد اشارہ، ص ۱۱۲۷، عدد ۴۵۹ :

(۵) ابن العباد : شرات، بذیل ۸۰۸ : (۶) السخاوی :

الضوء اللامع، ۱۰ : ۵۹ بعد : (۷) Sarton، Intro-

duction to the History of Science، ۱۱۶۸ :

بعد، ۱۲۱۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۹ : (۸) الشوکنی : البدر الطالع،

دندان : ابو جعفر احمد بن حسین کا لقب، جو تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی کا ایک شیعہ محدث تھا۔ اس کا والد ایک معتبر راوی تھا، جس نے امام علی الرضا، امام محمد الجواد اور امام علی الہادی سے احادیث روایت کی ہیں۔ وہ دراصل کوفے کا باشندہ تھا اور وہ کچھ مدت اہواز میں بھی رہا اور وہیں اس کے ہاں دندان کی ولادت ہوئی۔ دندان نے بھی اپنے والد کے شیوخ کی سند پر احادیث روایت کی ہیں، لیکن چونکہ وہ غلغلہ میں سے متصوّر ہوتا تھا اس لیے بطور راوی حدیث اس کی ذات قابل گرفت سمجھیں جاتی رہی ہے۔ دندان نے کئی کتابیں تصنیف کی ہیں، جن میں کتاب الاحتجاج، کتاب الانبیاء، کتاب المناقب اور کتاب المختصر فی الدعوات شامل ہیں۔ معاموم ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی کتاب بھی محفوظ نہیں رہ سکی۔ وہ قم میں فوت ہوا اور وہیں سپرد خاک ہوا۔

یہ معلومات بارہ شیعہ تالیفات میں ملتی ہیں، جو علما اور ان کی کتابوں کے بارے میں ہیں (مثلاً *History of Shi'ah Books*، طبع شیپرنگر و عبدالحق، کلکتہ ۱۸۵۳ء، ص ۲۶؛ ابن شہر آشوب: معالم العلماء، طبع اقبال، تہران ۱۹۳۳ء، ص ۱؛ استرآبادی: منهاج العقائد، تہران ۱۳۰۷ء، ص ۱۴)۔ دندان کے غالی عقائد پر ان سنی مآخذ میں بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے جو اسمعیلیوں کے اصل و ابتدا کے بارے میں ہیں (الفہرست، ص ۸۸؛ البہمدادی: فرق، ص ۲۶۶، مترجمہ *Moslem schisms and sects*: A. S. Halkin، تل ایب ۱۹۳۵ء، ص ۸۰؛ انگریزی، طبع قارئین، در JA، ۱۸۳۹ء، ص ۱۲۲ وغیرہ)۔ ان کے مطالعے سے معاموم ہوتا ہے کہ دندان نے عبد اللہ بن میمون [رک بان] کے ساتھ مل کر اس فرقے کی بنیاد رکھی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے اسمعیلی عقائد کی تشکیل و تبلیغ میں عملی حصہ لیا اور دعوت کے مالی پہلو کو مستحکم کرنے کی غرض

سے بڑی بڑی رقمیں فراہم کیں۔ بروئے الفہرست وہ احمد ابن عبدالعزیز بن ابی دلف (م ۸۰/۹۳۷ء) [رک بان] کا دیبر تھا۔ اس کا نام اور شجرہ نسب ان مآخذ میں مختلف طریقوں سے بکڑا گیا ہے، تاہم قابل شناخت ہے۔ اس کے دادا کا نام مختلف تصحیفات کے ساتھ ”چہار لختان“ ملتا ہے، جو لازماً اس کا عرف ہوگا۔ ابوالعمالی (بیان الآدیان، طبع اقبال، ص ۳۶، مترجمہ Masse، در RHR، ۱۹۲۶ء، ص ۵۷) نے چہار لختان کو باطنی فرقے کی بنیاد رکھنے میں دندان اور عبد اللہ بن میمون کا شریک کار قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ اس جماعت میں سرمایہ لگانے والا وہی شخص تھا۔

شیعی مآخذ میں ان سے کہیں بہتر معلومات دستیاب ہوتی ہیں۔ ان کی رو سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ دندان تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی میں زندہ تھا؛ لہذا وہ ابن ابی دلف کا دیبر تو ہو سکتا ہے لیکن یہ غیر ممکن ہے کہ وہ عبد اللہ بن میمون کا معین و مددگار ہو کیونکہ مؤخر الذکر دوسری صدی ہجری/آٹھویں صدی عیسوی میں زندہ تھا اور اسی صدی میں فوت ہوا تھا۔ باقی ہمہ ممکن ہے کہ اس نے اسمعیلیہ کی ابتدائی تاریخ کی تشکیل میں کچھ حصہ لیا ہو، لیکن یہاں یہ امر قابل توجہ ہے کہ اسمعیلیوں کے ہاں نہ تو اس کا نام کہیں ملتا ہے، نہ اس کی کسی تصنیف کا ذکر آیا ہے۔

مآخذ: (۱) *Mémoire*: M. J. De Goeje (۱) *sur les Carmathes*..... بار دوم، لاڈن ۱۸۸۶ء، ص ۱۵؛ (۲) *Esquisse d'une bibliographie Carmathe* در *A volume of Oriental*، *Studies presented to E. G. Browne*، کیمبرج ۱۹۲۲ء، ص ۳۳۱؛ (۳) *The origius of Isma'ilism*: B. Lewis (۳) کیمبرج ۱۹۴۰ء، بعد از اشارہ: (۴) *Abu'l-* *Qasim al-Busti and his refutation of Isma'ilism*

JRAS, ۱۹۹۱ء، ص ۲۸ تا ۲۹۔

(B. Lewis)

دنزلی : (= دنگرلی، دینیزلی)، جنوب مغربی اناطولی میں اسی نام کی ولایت کا سب سے بڑا شہر، جو ایک زرخیز میدان میں واقع اور ازمینہ قدیم سے آباد ہے۔ چودھویں صدی عیسوی میں دنزلی نے لادیقی (قدیم زمانے کا Laodicea ad Lycum) کی جگہ لے لی، جس کے کھنڈر اسکی میں گنجلی کے رہاؤے سٹیشن کے نزدیک، دنزلی سے نوکیلومیٹر کے فاصلے پر، دریائے ایوک مند رس کی معاون ندی چوروک صو کے کنارے ابھی تک باقی ہیں۔ تیسری صدی ق۔ م میں اسے سلو کسی خاندان کے انطاکیوس Antiochus ثانی نے قدیم دبوس پولس Diopolis (Pliny، ۵ : ۱۰۵) کی جگہ پر تعمیر کرایا تھا اور تجارتی راستوں کا ایک اہم مقام اتصال تھا۔ رومیوں کے زمانے میں اس کا شمار فرجیہ Phrygia کے بڑے بڑے شہروں میں ہوتا تھا (Strabo، ۱۲ : ۵۷۸)۔ گیارہویں صدی عیسوی کے اواخر تک لاودیکیا (Laodicea) بوزنطی علاقہ رہا، لیکن بعد ازاں یہ کمینینی (Comneni) خاندان اور سلجوق ترکوں کے مابین متنازع قبہ بن گیا، چنانچہ سلاجقہ نے کئی دفعہ اس پر قبضہ کیا۔ الکسیوس Alexis اول نے اسے ۱۰۹۸ء/۸۹۱ء میں ان سے چھین لیا اور عارضی طور پر وہ اس کے ہاتھ میں رہا (Anna Comnena) طبع (Leiz، ۳ : ۲۷۷)۔ ۱۱۱۹ء/۵۱۳ء میں جون کمینینوس John Comnenus نے اس پر دوبارہ قبضہ کیا اور اسے مستحکم کر دیا (Cinn، ص ۵ : Nicetas، ص ۱۷۷)۔ گو ترکی قبائل نے، جو قریب قریب انہیں ایام میں اس ضلع میں آباد ہوئے تھے، ۱۱۵۸ء اور ۱۱۸۹ء میں اسے تاراج کیا، تاہم وہ ۱۲۰۶ء/۸۰۲ء تک بوزنطیوں ہی کے ہاتھوں میں رہا (Cinn، ص ۱۹۸ : Nicetas، ص ۱۹۳ تا ۱۹۴)۔ تاآنکہ اس تاریخ کو تھوڈور لاسکاریس Theodore

Lascares لاودیکیا اور چوناہ Chonaہ (موجودہ خوناہ) کو مانویل موروزومیس Manuel Mavrozomes کے حوالے کر دینے پر مجبور ہو گیا، جو عجائب الدین کیخسرو اول کا خسر تھا (Nicetas، ص ۲۸۲ : Rec. de textes rel. à l'hist. des Selj. : Houtsma، ص ۶۶ تا ۶۷ و ۷۴ : ۲۹)؛ تاہم ۱۱۵۵ء/۱۲۵۷ء میں عزالدین کیکاؤس ثانی نے یہ شہر میخائیل بلولو جوس Michael Palaeologus کو دے دیا، تاکہ وہ اس سے اپنے بھائی رکن الدین اور مؤخر الذکر کے حلیف مغول کے خلاف امداد حاصل کر سکے؛ لیکن مختصر سی یونانی محافظ فوج زیادہ دیر تک مدافعت نہ کر سکی (Acropolis، ص ۱۵۳ تا ۱۵۴) اور دو سال بعد یہ شہر ایک بار پھر ترکمانوں کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ تقریباً اسی زمانے میں مشرقی دستاویزات میں لادیقی کے ساتھ ساتھ سب سے پہلے طونزلو کا ذکر آتا ہے؛ یہ نام بعد میں تبدیل ہو کر دنزلی ہو گیا اور چودھواں صدی عیسوی میں اس نے لادیقی کی جگہ لے لی۔ ۱۱۶۹ء/۱۲۶۱ء میں اس ضلع کے ترکمان سردار، محمد بیگ نے (جسے اسی نام کے قرامانی سردار کے ساتھ جو ۱۱۶۵ء/۱۲۷۷ء میں فوت ہوا اور محمد بیگ ابدین اوغلو کے ساتھ، جو ۱۲۳۴ء/۱۳۳۴ء میں فوت ہوا، غلط منظر نہیں کرنا چاہیے) عزالدین کیکاؤس کے خلاف بغاوت کر دی اور اس ضلع کو فتح کر لیا۔ پھر سلجوق سلطان کی اطاعت سے انکار کر کے اس نے ہولاگو سے طونزلو، خوناہ (Honaz) اور طالمانی (Dalaman) کے شہروں کی باقاعدہ تعہد کے لیے فرمان کی درخواست کی۔ اس طرح دنزلی کی پہلی ترکمان ریاست کی بنیاد رکھی گئی، لیکن یہ چند روزہ ثابت ہوئی۔ ۱۱۶۹ء/۱۲۶۲ء میں رکن الدین کی درخواست پر ہولاگو نے محمد بیگ کے خلاف چڑھائی کر دی۔ محمد بیگ نے شکست کھائی اور موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اس کا داماد علی بیگ علاقے کے ترکمانوں کا سردار بن گیا،

زمانہ تھا جب طونزلو کے نام کی جگہ دنزلی نے لے لی، چنانچہ اسی نام سے اس شہر کا ذکر اولیا چلبی اور کاتب چلبی کے بیانات میں آیا ہے۔ ان سیاحوں کے قول کے مطابق دنزلی اس وقت چوایس محلوں میں مقیم تھا اور اس میں سات مسجدیں تھیں: ایک چھوٹا سا قلعہ بازار کی حفاظت کرتا تھا اور لوگ اصل شہر سے باہر باغوں اور کھیتوں میں مکان بنا کر رہتے تھے۔ یہی صورت حال آج کل بھی باقی جاتی ہے اور انیسویں صدی عیسوی کے یورپی سیاحوں کے بیانات کے خلاف یہ صورت اس خوفناک زلزلے کا نتیجہ نہیں جو ۱۷۰۳ء میں اس شہر میں آیا تھا اور جس میں بارہ ہزار جانیں تلف ہو گئی تھیں۔ اگرچہ دنزلی کو دوبارہ وہ اہمیت حاصل نہیں ہو سکی جو اسے قرون وسطیٰ میں حاصل تھی، لیکن جب سے جمہوریہ قائم ہوئی ہے یہ ایک دفعہ پھر روز بروز خوشحال ہو رہا ہے۔ ۱۸۹۱ء میں ایک ریلوے لائن بچھائی گئی جس نے دنزلی کو براہ گنجلی، ازبیر۔۔۔ اگر دیور لائن کے ساتھ ملا دیا۔ دنزلی، جو انیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں سنجاق کا صدر مقام اور ولایت ایڈین سے منسلک تھا، قیام جمہوریہ کے بعد ولایت دنزلی کا صدر مقام بن گیا۔ [اس کی] آبادی ۱۹۳۰ء میں ۱۹۳۶۱ باشندوں پر مشتمل تھی (جب کہ ۱۹۲۷ء میں ۱۵۷۸۷ تھی)۔ دنزلی میں اب ایک مرکزی ثانوی مدرسہ ہے اور یہ زراعتی پیداوار (بھل، اناج، تمباکو، کیاس، تل اور پوست کے بیج)، نیز دستی صنعتوں (چمڑا رنگنے، کپڑا بننے اور قالین بافی) کا مرکز ہے۔ قدیم شہروں کے آثار نے یہی، جو اس علاقے میں بکھرے پڑے ہیں (Kolossai, Hydreia, Hierapolis, Laodicea, Chonae کے کھنڈر)، اسے سیاحت کا ایک اہم مرکز بنا دیا ہے۔

مآخذ: (۱) هوتسما Houtsma: Recueil

۳: ۶۶ تا ۳۹۶: ۲۶ تا ۲۸۸: ۲۸۹ تا ۳۰۸: ۳۳۳: (۲)

العمری، در Not. et. Ext. des MSS de la Bibl. Nat.

لیکن لادیق اور خونس کے شہر ان مقبوضات میں شامل کر دیے گئے جو ۸۶۶/۱۲۷۱ء میں وزیر فخرالدین علی کے بیٹوں کو عطا ہوئے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ علی بیگ نے محض دوبارہ آزادی حاصل کرنے ہی کے لیے ۸۷۵/۱۴۷۷ء میں چدیری اور، حمد قرمانی کی بغاوت میں حصہ لیا تھا، لیکن اس نے سلطان کی فوج کے ہاتھوں شکست کھائی اور مارا گیا۔ بہر کیف مرکزی حکومت کی کمزوری کے نتیجے میں طونزلو۔ لادیق کا خطہ گرمیان کے ترکمان امیروں کے ہاتھ آ گیا، جنہوں نے تیرہویں صدی عیسوی کے آخری ربع میں کوتاہیہ کے شہر پر قبضہ کرتے ہی اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ العمری اور ابن بطوطہ کے بیانات کی رو سے، جنہوں نے ۷۳۰/۱۳۳۰ء اور ۷۳۲/۱۳۳۲ء میں اس شہر کی سیاحت کی، طونزلو اور نواحی علاقہ اس وقت گرمیان خاندان کے ایک امیر بینج [= اناج] بیگ کے قبضے میں تھا۔ بہر حال یہ شہر، گو اب بھی خوشحال تھا، منہجہ کے ترکمان امیروں کی فتوحات کی وجہ سے اپنی قدر کھو چکا تھا، جنہوں نے تیرہویں صدی عیسوی کے اواخر میں کاریہ Caria کے ساحلی علاقے پر قبضہ کر لیا۔ طونزلو، جس کے متعلق منہجہ کے امیروں اور گرمیان کے درمیان تنازع تھا، نتیجہ سرحدی چوکی کے طور پر اپنی حیثیت کھو بیٹھا اور وہ پھر کسی اہم ریاست کا مرکز نہ بن سکا۔ ۷۹۳/۱۳۹۰ء میں طونزلو۔ لادیق کا ضلع بھی اسی وقت گرمیان کی امارت کی حیثیت سے سلطنت عثمانیہ کو واپس مل گیا۔ تیمور نے طونزلو عارضی طور پر گرمیان کو واپس کر دیا: وہ ۸۰۲/۱۴۰۰ء کے موسم خزاں میں وہاں ٹھہرا۔ بایزید ثانی کے عہد حکومت میں اس کا ایک فرزند اس شہر میں مقیم رہا۔ ان دنوں وہ ایک لواء کا، جو اناطولیہ کی ایالت کے ساتھ ملحق تھی، سب سے بڑا شہر تھا۔ سترہویں صدی میں اس کا درجہ گھٹا کر اسے قضاء بنا دیا اور کوتاہیہ کی سنجاق کے ساتھ ملا دیا گیا۔ یہی

بعد بہ محاصرہ اٹھا لیا گیا۔ اس معاہدے کے نتیجے میں
 لیبیا اور مصر کے درمیان چھ صدیوں تک کے لیے
 باضابطہ طور پر تعلقات استوار ہو گئے۔ ازمینہ وسطی
 کے دنگلہ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اس شہر
 کے گرد فصل تھی اور اس میں بہت سے گرجے، بڑے
 بڑے مکانات اور کشادہ سڑکیں تھیں۔ سرخ اینٹوں سے
 بنے ہوئے گنبدوں والا قصر شاہی ۵۳۹۲/۱۰۰۲ء
 میں تعمیر ہوا تھا۔ مسیحی لیبیا کے مکمل زوال کے
 بعد دنگلہ ایک اسلامی شہر بن گیا۔ یہاں کی مسجد
 میں ۱۶ ربیع الاول ۵۱۷ھ / مئی ۱۱۱۷ء کا لکھا ہوا
 ایک عربی کتبہ موجود ہے۔ دسویں صدی ہجری /
 سولہویں صدی عیسوی میں فنج (رگ بان) کا وفاقی نظام
 قائم ہونے پر دنگلہ ایک ماتحت سلطان (مگ) کے صدر
 مقام کی حیثیت سے دوبارہ منظر عام پر آیا۔ شمال
 میں اس کا حلقہ اختیار [دریائے نیل کے] تیسرے
 آبشار (Third Cataract) تک بڑھ گیا تھا۔ یہ جگہ
 فنج سلطنتوں اور برابرہ (رگ بان) کے مابین حد فاصل
 تھی، جو عثمانی سیادت کو تسلیم کر چکے تھے۔
 گیارہویں صدی ہجری / سترہویں صدی عیسوی کے اواخر
 میں شقیۃ وفاق کے عروج کے بعد شمال سے جنوب کو
 جانے والی شاہراہیں دنگلہ کے علاقے سے ایک طرف ہٹ
 کر گزرتی تھیں۔ آخری دنوں میں یہ علاقہ شقیہ اور
 جدید دنگلہ میں پناہ لینے والے مالیک دونوں کی
 ترک تازیوں کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ
 یہاں کے چھوٹے چھوٹے حکمرانوں نے اسمعیل کامل پاشا
 کی ترک مصری افواج کا خیر مقدم کیا، جس نے
 ۱۲۳۶ھ / ۱۸۲۰ء میں ان غارت گر فوجی اشراف
 کی حکومتوں کو کچل دیا۔

(۲) دنگلہ جدید (العرضی، یعنی اردو، بمعنی
 لشکر گاہ)، جو آج کل اس خطے کا اہم ترین شہر ہے، اس
 جگہ آباد ہوا جہاں ۱۲۳۶ھ / ۱۸۱۱ء میں محمد علی پاشا
 کی گرفت سے بچ نکلنے والے مسلوکوں نے اپنی بستی

۱۳ : ۳۵۸ تا ۳۵۹ (۲) ابن بطوطہ، طبع Defrémery و
 Sanguinetti : ۲۷۰ تا ۲۷۷ (۴) اولیا جانی :
 مساحت قلعہ، استانبول ۱۹۳۵ء : ۹ : ۱۹۲ تا ۱۹۵ : (۵)
 کتب چلبی : جہان قلعہ، جامع ابراہیم منفردہ، استانبول
 ۱۱۰۵ھ / ۱۷۰۲ء ص ۳۷۷ : (۶) Paul Wissowa ج ۱۲ :
 بذیل مادۃ Landikeia : (۷) ریمزے W. M. Ramsay :
 The cities and bishoprics of Phrygia، آوکسفرڈ
 ۱۸۹۵ء : ۲۲ تا ۸۳ : (۸) La Turquie : V. Guinet :
 d'Asie، پیرس ۱۸۹۴ء : ۲ : ۶۱۵ تا ۶۲۸ : (۹)
 Reisen und Forschungen in West : A. Philippson
 lichen Kleinasien، Göttingen ۱۹۱۳ء :
 ۶۷ تا ۷۰ : ۸۵ تا ۱۰۷ : (۱۰) اوزون چار شلی :
 کتب لبر، استانبول ۱۹۲۹ء : ۲ : ۱۸۱ تا ۱۸۹ : (۱۱)
 Notes pour l'histoire des Turcomans : Cl. Cahen :
 d'Asie Mineure، در JA، ۲۳۹ : (۱۹۵۱ء) : ۳۳۵
 تا ۳۴۰ : (۱۲) Besim Dürkot، در ژ، ت، ج ۳، بذیل مادۃ
 دنزلی۔

(I. MELIKOFF)

* دَنْغَزَلَم : رگ بہ دنزلی۔

* دَنْقَلَه : (عربی)، (Dongola) [تبادل شکل :]
 دنقلا : متروک اشکال : دَنْقَلَه اور دَنْقَلَه : لیبیا میں دو
 شہروں کا نام اور زیادہ : سومیت کے ساتھ اس ساحلی
 خطے کا نام جس کا انحصار ان دو شہروں پر ہے۔ یہ سارا
 علاقہ موجودہ جمہوریہ سودان میں واقع ہے۔ دنقلا
 کے مستعرب نوبی لوگ دنقلا کہلاتے ہیں۔ ان کا بہ
 نام قبیلے کی نسبت سے انہیں بلکہ علاقے کی نسبت سے ہے۔
 (۱) دَنْقَلَه العَجُوز (قدیم دنقلا) دریائے نیل کے
 دائیں کنارے اس جگہ واقع ہے جہاں عہد قبل اسلام
 کا شہر اور مسیحی سلطنت کا دار الحکومت المقرۃ آباد تھا۔
 ۱۵۲/۸۳۱ء میں [اسلامی] لشکر نے عبداللہ بن سعد بن
 ابی سرح [رگ بان] کی زیر سرکردگی اس شہر کا محاصرہ
 کیا تھا، لیکن ایک معاہدہ [بقت رگ بان] طے پا جانے کے

کی سخت گرم اور ویران سر زمین میں حبشہ کی سب سے بڑی پہاڑی ڈھلان کے دامن تک دبید سے قصاب جانے والی سڑک کے دونوں طرف پھیلا ہوا ہے۔ اس قبیلے کے لوگ زیادہ تر خانہ بدوش ہیں، لیکن سب کے سب انہیں کیونکہ ان میں مویشی پالنے والے بعض ایسے گروہ بھی ہیں جنہوں نے ساحل اور اندرونی علاقے میں متعدد لیم مستقل بستیاں اور چند بڑے دیہات بسا رکھے ہیں، جہاں معدومے چند لوگ کاشتکاری بھی کرتے ہیں۔ ان کے دوسرے پیشے ماہی گیری اور کانوں سے لہکنا ہیں۔ بڑے بڑے مستقل دیہات میں آج کل سڈیاں اور پولیس کی چوکیاں قائم ہیں اور ان کی مہدیوں کی مکمل علحدگی اب بتدریج ختم ہوتی جا رہی ہے۔ معیار زندگی عام طور پر بہت ہی زیادہ پست ہے اور یہ غیر معمولی موسمی شدتوں اور (ماضی میں) حبشہ کے پہاڑی علاقوں کی طرف سے بے رحمانہ اور مسلسل یلغاروں کا نتیجہ ہے۔ دلقی کے لوگوں کی فطرت شکی، متاؤں اور وحشیانہ خیال کی جاتی ہے۔ یورپ والوں نے اول اول عصاب کو مرکز بنا کر حالات معلوم کرنے کی کوششیں کیں تو ان پر قاتلانہ حملے کیے گئے اور Muntzinger (۱۸۷۵ء)، Giuletti (۱۸۸۱ء) یا Bianchi (۱۸۸۳ء) کی فرنگی مہموں سے، جو اس غرض سے بھیجی گئی تھیں، کوئی شخص زندہ بچ کر نہ آیا۔ دناقل حامی نسل کے نمائندے معلوم ہوتے ہیں، جن میں قدیم زمانے میں عرب، صومالی اور دیگر نسلیں بکثرت مدغم ہو گئیں۔ اصل نسل کے متعلق ان کی اپنی کہانیاں سب کی سب اساطیری ہیں، لیکن ان سے مبہم طور پر ایرونی حملوں اور معاشرتی تبدیلیوں کا پتا چلتا ہے، نیز اس صورت حال کی وجہ معلوم ہو جاتی ہے جو اتریا اور شمالی حبشہ میں بھی کم و بیش موجود تھیں، یعنی ایک نسبتاً چھوٹی حکمران جماعت رہے، آزادی اور معاشی اعتبار سے ایک بڑی لیکن لیم غلام جماعت پر فوقیت رکھتی ہے اور پھر ان دونوں کا فرق قوم کو مزید

بسنائی تھی۔ آگے چل کر دلقہ جدید ایک کاشف (بعد ازاں بذیر-گورنر) کا صدر مقام اور صوبہ دلقہ کا دارالحکومت ہو گیا۔ ۱۸۸۶ء اور ۱۸۹۶ء کے مابین یہاں مہدوی فوجی گورنر (عمال: واحد: عامل) حکومت کرتے رہے۔ ۱۸۹۶ء میں کچنر کی مہم دلقہ کا صوبے کی از سر نو تسخیر پر گہرا اثر پڑا۔ اس وقت یہ مقام اپنی انفرادی حیثیت کو چکا تھا کیونکہ مشترک حکومت (Condominium) کے دور میں اسے وادی حلفا اور بربر (رگ بان) میں مدغم کر کے شمالی صوبہ بنا دیا گیا تھا۔

مآخذ: ازمنہ وسطی کے سنٹر بلکہ سرسری حوالوں کی فہرست کے لیے دیکھیے (۱) مسپرو Maspero و وائٹ Metelau: Wiet، ص ۹۰: نیز (۲) کراورڈ The Fing Kingdom of: O. G. S. Crawford Sennar، گلوستر Gloucester، ۱۹۵۱ء، بالخصوص ص ۳۲ تا ۳۶: ۱۹۹۸ء میں قدم دلقہ کی کیفیت کے لیے دیکھیے (۳) A voyage in Ethiopia: Ch. J. Poncet نڈن ۱۹۰۹ء، نیز اس کتاب کی اشاعت ثانی، طبع اورش Sir William Foster، بعنوان The Red Sea and adjacent countries at the close of Seventeenth century (Hakluyt Society)، سلسلہ دوم، عدد C، لندن ۱۹۳۹ء، ص ۹۹ تا ۱۰۰: (۴) ۱۸۲۱ء میں اس کا ذکر Journal d'ion: L. M. A. Linant de Bellefonds، voyage à Meroe، طبع M. Shinnie، خرطوم ۱۸۵۲ء، ص ۳۲ تا ۳۴، میں آیا ہے: (۵) مہدوی دور کی سرکاری مراسلت، جو خرطوم میں حکومت سودان کے مخالف خانے میں محفوظ ہے۔

(P. M. Holt)

* دلقی: (جمع دلاقل)، ایک قبیلہ، جو بحیرہ احمر کے مغربی ساحل پر زولہ (۳۹ درجے ۱۵ دقے شرق، ۱۵ درجے ۱۰ دقے شمال) کے نواح سے لے کر فرانسیسی صومالیہ تک آباد ہوا ہے اور اندرون ملک

۱۳ درجے ۵۵ دقیقے طول بلد شمالی اور ۳۳ درجے ۳۳ دقیقے عرض بلد غری (گریٹج) پر سطح سمندر سے ۲۷۸ میٹر کی بلندی پر واقع ہے۔
دتی کا (جسے اکثر غلطی سے دجنہ لکھا جاتا ہے) اشتقاق نامعلوم ہے، لیکن شاید یہ دائنہ (Dianne) چھوٹا دیہ ہو (دیہ ایک قدیم سولائی شہر ہے)۔ کیا وہ میٹر شمال مغربی جانب)۔ دتی کا ذکر اول اول Genoese Malfanie نے ۱۴۷۷ء میں، بذیل Geni، کیا تھا۔

دتی دریائے نائجر اور دریائے بنی کے سیلابی علاقے میں مؤخر الذکر کے بائیں کنارے سے ۵ میل پر واقع ہے اور ایک نہر کے ذریعے، جس میں جہاز رانی ہوتی ہے، اسے دریا سے ملا دیا گیا ہے۔ اس کی تعمیر ریتی مٹی کی ایک پہاڑی پر ہوئی، جو سیلاب کی زد میں تو نہیں آتی لیکن چاروں طرف سے پانی میں گھری رہتی ہے، خصوصاً سیلاب کے موسم میں، جو عموماً اگست سے فروری تک رہتا ہے اور جس میں یہاں آمد و رفت آسان ہو جاتی ہے، اس لیے کہ دریائے نائجر اور بنی کے درمیان قابل جہاز رانی نہروں کا جال بچھا ہوا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ اہم اور ہکثرت استعمال ہونے والی نہر گوکرو ہے۔ خشک موسم میں الراس شہر اور اس کے آس پاس کے ضلعوں میں کچی سڑکوں کے ذریعے آمد و رفت ہوتی ہے، جن پر موٹر گاڑیاں بھی چل سکتی ہیں۔

یہ معلوم نہیں اس شہر کی بنیاد کب رکھی گئی۔ تاریخ السودان، مترجمہ Houdas، ص ۲۳ میں مذکور ہے کہ پہلی بستی زبرومین قائم ہوئی اور شہر کی بنیاد ۱۵۱۵ء کے لگ بھگ رکھی گئی اور باشندے ۱۵۶۷ء کے قریب مشرف بہ اسلام ہوئے۔ لیکن غالب گمان یہ ہے کہ یہ شہر آگے چل کر آباد ہوا ہوگا۔ M. Delafosse کے نزدیک ۱۹۴۸ء/۵۰ء میں اور نولو (the Nono)، یعنی سونکنک Soninke، تاجروں نے آباد کیا۔ وہ کہتا ہے کہ باشندے غالباً

برادریوں اور ذیلی قبیلوں میں تقسیم کر دیتا ہے، جن پر دنقل مشتمل ہیں۔ یہ لوگ ۱۸۸۵ء/۱۳۰۳ء اور ۱۹۵۲ء/۱۳۷۲ء کے مابین اریتریا (یعنی اطالوی اور برطانوی علاقے) اور حکومت حبشہ میں بٹ گئے۔ ان میں کبھی کوئی سیاسی وحدت نہ تھی اور نہ اس کا کوئی نشان ہی ملتا ہے۔ ان میں باغی میل جول بھی صرف اسی قدر ہے جتنا ایک مشترکہ بولی، مشترکہ مذہب اور معاشی زندگی کی یکسانی کی بنا پر ہو سکتا ہے۔ فقط ایک ہی حکمران سلطان آوسہ، جو سردو میں رہتا تھا، ایسا ہوا ہے جس کا چھوٹے گروہ یا ذیلی قبیلے کے علاوہ اوروں میں بھی احترام کیا جاتا تھا۔ ۱۹۵۳ء میں دناقل کی تعداد غالباً پچاس ہزار سے اسی ہزار تک تھی۔

دناقل زبان کو، جسے عفر بھی کہتے ہیں، جنوبی حامی گروہ کی کسی زیریں شاخ کی ایک بولی قرار دے سکتے ہیں۔ یہ (زولہ کے مغرب اور جنوب میں سطح مرتفع پر رہنے والے قبائل کی) سہو زبان سے بہت ملتی جلتی ہے، اور اس کا صوتی بولیوں سے بھی رشتہ ہے۔

مآخذ: (۱) La Dankalia explo: M. Nesbitt

La Dankalia: O. Danto (۲) ۱۹۳۰ء

Settentriionale، اسماہ ۱۹۰۹ء: A. Pollera (۳)

Le Popolazioni indigene dell' Eritrea

Bologna ۱۹۳۵ء: (۴) برطانوی عسکری انتظامیہ

Races and Tribes of (S. F. Nadel) اریتریا

Eritrea، اسماہ ۱۹۳۳ء: (۵) D. Buxton

Travels in Ethiopia، لندن ۱۹۳۹ء

(S. H. LONGRIGG)

* دنگن: (دوئکن، تنگن)، چینی مسلمانوں کا نام، رک بہ چین، ترکستان۔

* دتی: (دائنہ) جمہوریہ سوڈان کا ایک شہر، جو نمبوکو سے ۳۶۰ کیلومیٹر جنوب مغرب میں اور سگو سے ۲۰۰ کیلومیٹر مشرق شمال مشرق میں

جاتا ہے۔ کبھی ادنیٰ بھی آخر میں آتا ہے اور اقصیٰ کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے۔

قرآن مجید میں یہ لفظ ایک سو پندرہ مرتبہ آیا ہے اور اکثر آخرہ [رک بان] کے مقابلے پر آیا ہے۔

کبھی کبھی یہ لفظ حیا سے مل کر ترکیب (حیوة الدنیا) کی صورت میں آتا ہے اور سماء الدنیا کی ترکیب بھی ایک سے زائد مرتبہ استعمال ہوئی ہے، جس کے معنی ہیں سب سے نیچے کا آسمان۔ کائناتی لحاظ سے دنیا وہ ہے جو گردش لیل و نہار کے اندر محدود ہے، آسمان اس کے اوپر سایہ کیے ہوئے ہے اور زمین اسے تھامے ہوئے ہے۔ یہ عالم الشہادۃ ہے، جسے آنکھ دیکھ سکتی ہے، اگرچہ اس کا ایک باطن بھی ہے جس کا عالم خدا ہے (عِلْمُ الْغُیْبِ وَالشَّہَادَةِ) ۲۳ [المؤمنون] ۹۲۔ قرآن مجید کی آیات سے دو نتیجے باسانی نکلتے ہیں: اول یہ کہ قرآن کی رو سے دنیا اور آخرہ دونوں کائنات کی حقیقت میں شامل ہیں اور ایک مؤمن سے یہ توقع ہے کہ ان دونوں کی فلاح و سعادت کے لیے کوشاں ہو۔ خدا برستی اور دین داری، دنیوی معیشت اور ترقی کے خلاف نہیں، اس لیے رَبَّنَا اِنَّا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةٌ وَفِی الْآخِرَةِ حَسَنَةٌ (۲ [البقرہ]: ۲۰۱) کی دعا سکھائی گئی ہے، جس میں دنیا و آخرہ دواؤں کے کمالات کے حصول کی التجا کی گئی ہے۔ حج کے احکام کے سلسلے میں حکم ہوا: لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّنْ رَبِّکُمْ [۳۰] اس میں تمہارے لیے کوئی گناہ نہیں کہ (اعمال حج کے ساتھ) تم اپنے پروردگار کے فضل کی بھی تلاش میں رہو (یعنی کاروبار تجارت کا بھی مشغلہ رکھو)، البتہ ایسا نہ کرنا چاہیے کہ کاروبار دنیوی کے انہماک کی وجہ سے حج کے اوقات و اعمال سے بے پروا ہو جاؤ۔ [۲ [البقرہ]: ۱۹۸]؛ لیکن اس امر کی ممانعت ہے کہ صرف دنیا (اسی زندگی) کو عین مقصود سمجھ لیا جائے اور آخرت کا انکار یا اس سے قطع نظر ہو جائے:

۵۷۰/۱۳۰۰ء کے لگ بھگ مسلمان ہوئے۔ . . . [مزید تفصیل کے لیے دیکھیے (۱) لائڈن، بار دوم، بذیل مقالہ]۔

مآخذ: (۱) Th. Monod و P. de Cenival : *Description de la Côte d'Afrique de ceuta au Sénégal par valentin Fernandes (1506-7)* پیرس ۱۹۳۸ء: (۲) تاریخ الفاشر، مترجمہ O. Houdas و M. Delafosse، پیرس ۱۹۱۳ء: (۳) تاریخ السودان، مترجمہ O. Houdas، پیرس ۱۹۰۰ء: (۴) *Leo Africanus* : *Description de l'Afrique*، ترجمہ از Épaulard، پیرس ۱۹۵۶ء: (۵) *R. Caillié* : *Journal d'un voyage à Tombouctou et à Dienne dans l'Afrique centrale*، پیرس ۱۸۳۰ء ج ۱۲ باب ۱۸: (۶) *Reisen und Entdeckungen in Nord und Zentral Afrika in Gotha 1849-1855* : ج ۱ ۱۸۵۸-۱۸۵۷: (۷) *Tombouctou la mystérieuse* : F. Dubois، پیرس ۱۸۹۶ء: (۸) *Ch. Monteil* : *Monographie de Tulle*، ۱۹۰۳ء: (۹) *J. Daget و A. H. Ba* : *Djenné*، ۱۸۵۳-۱۸۱۸ء: ج ۱ *L' Empire du Macina* : IFAN، باما کو ۱۹۵۵ء۔

(R. MAUNY [تلخیص از ادارہ])

⑤ الدنیا: (ع) مادہ دن و سے دنی یدنو دتوا: ادنیٰ بھی اسی سے ہے۔ لسان میں ہے: الدنیا... اسم لہذہ الحیاة بعد الآخرة عنها والساء الدنیا لقربها من ماکنی الارض۔ امام راغب کی مفردات میں ہے کہ دتو کے معنی قریب ہونے کے ہیں اور یہ قرب ذاتی، حکمی، مکانی اور زمانی بھی ہو سکتا ہے اور بلحاظ مقام اور بلحاظ کیفیت بھی۔ لفظ ادنیٰ کبھی بمعنی اصغر آتا ہے: اس سے منواریت میں یہ انہیں کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے۔ کبھی ادنیٰ بمعنی ارذل استعمال ہوتا ہے۔ اس وقت باطن کا استعمال خیر کے مقابلے میں ہوتا ہے: کبھی بمعنی اول استعمال ہوتا ہے اور آخر کے مقابل میں ہوتا

قرآن مجید نے حسنہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ حسنہ کے معنی میں خوش حالی، اطمینان اور نیکی تینوں چیزیں شامل ہیں۔ حسنہ کے تصور سے یہ بھی مترشح ہے کہ اس سے وہ قباحتیں خارج ہونگی جن کا ذکر اوپر آچکا ہے، یعنی زینۃ، تفاخر اور لہو و لعب (بے مقصدیت)۔ ظاہر ہے کہ دنیا داری کا یہ رنگ اچھے معاشرے کے لیے ایک تمدنی معیبت ہے، نیز باعث لساد اور موجب عدم توازن ہے۔ اس میں شبہہ نہیں کہ مال اور اولاد (المال والبنون) اور بیوی بچے حیات دایوی کی زینت (رونق اور زخۃ الحیاۃ الدنیا) ہیں، لیکن اگر صرف یہی ہو تو زندگی بے جہت ہو جاتی ہے۔ دنیا کا یہی تصور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کی پیروی میں صحابہؓ اور ائمہ تابعینؓ نے پیش کیا۔ اس امر کے ثبوت میں کہ عملی طور پر مسلمانوں میں یہ عقیدہ رچا بسا ہوا تھا یہ ثبوت کافی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، صحابہؓ، تابعینؓ اور بعد کے زمانوں میں مسلمانوں نے وسیع فتوحات ملکی کے ساتھ غیر معمولی اور قابل لغر عالمی کارنامے انجام دیے اور زندگی کے عمل کو ایک کار خیر سمجھ کر استغیر و الکشاف کو اپنی حد تک درجہ کمال تک پہنچا دیا۔

دوسری تیسری صدی ہجری میں زہد و تصوف کے کچھ مسلک ظہور میں آئے، جن کے زیر اثر ترک دنیا اور ترک سعی کی تلقین ہوئی، لیکن یہ الٹا پسند مولویوں اور زہدوں کا مسلک تھا۔ جن معتدل صوفیہ کی فطری روح شریعت پر رہی، انھوں نے بڑی دلیاداری سے بچنے کی تلقین کرنے کے ساتھ ساتھ کسب معاش اور سعی و عمل کو ضروری قرار دیا ہے۔

علی ہجویریؒ نے کشف المحجوب میں باب فقر میں اس مسئلے پر طویل بحث کی ہے اور مختلف آراء دی ہیں۔ ان میں یہ قول بھی درج کیا ہے: "فقر نہ آن بود کہ دستش از متاع و زاد خالی بود، بلکہ فقر آن بود کہ طبعش از مراد خیال خالی بود"۔

أَرْضَيْتُمْ بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ (۱) [التوبة: ۳۲] = کیا تم آخرۃ کے مقابلے میں حیاۃ دایوی کو پسند کرنے لگے ہو (ترجیح دیتے ہو)؟ لیز ۱۹: [النحل: ۱۰۷]؛ ۵۳: [النجم: ۲۹]؛ ۷۹: [الذاریات: ۳۸]؛ ۷۸: [الاعلیٰ: ۱۶]۔ ان سب آیتوں میں اس دلیاداری کی مذمت کی گئی ہے جسے آخرۃ کے مقابلے میں ترجیح دی گئی ہو۔ ان ارشادات ربانی سے معلوم ہوا کہ دین اسلام دنیا کا مخالف نہیں بلکہ اس دنیا پرستی کا مخالف ہے جو انسان کو خدا پرستی، نیکی اور جزا و سزا کے عقیدے سے غافل کر دیتی ہے۔ انسان کی اس ذہنی و قلبی حالت کو قرآن مجید نے فاسد کیا ہے اور اس قسم کی دنیا طلبی اور نفع پرستی سے حاصل کی ہوئی دولت اور متاع کو متاع الغرور (غریب، غرورہ بے ثبات اور گمراہی) قرار دیا ہے: وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ (۲) [آل عمران: ۱۸۵]؛ ۷۵: [الحديد: ۲۰]؛ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقَىٰ وَلَا تَتْلُمُونَ نُفُوسًا (۳) [النساء: ۷۷]؛ وَذَرُوا الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَهُمْ لَمَآءٍ وَهُمْ لَا يَخِفُّونَ غُرَّتُهُمْ الشَّيْءُ الدُّنْيَا (۴) [الانعام: ۷۰]؛ لیز دیکھیے ۶: [الانعام: ۱۳۰]؛ ۷: [الاعراف: ۳۲]؛ ۵۱: ۳۲۔ قرآن مجید میں قبیح دنیا داری کو جن وجوہ سے مذکور قرار دیا گیا ہے ان کی فہرست اس آیت میں موجود ہے: ارْغَمُوا أَنفُسَ الْغَيُوتِ الدُّنْيَا لَعِبًا وَ تَهْوُوا زِينَةً وَ تَفَاخُرُ بَيْنَكُمْ (۵) [الحديد: ۲۰]۔ جان لو کہ حیاۃ دنیا (جو آخرۃ کے تصور کے بغیر اور جزا و سزا کے خیال کے بغیر ہو) لہو و لعب سے زیادہ کچھ نہیں، اور لہا لہن اور تفاخر ہی اس کا کل مقصد ہے۔ ان حوالوں سے ظاہر ہوا کہ اسلام کا تصور دنیا فقط یہ ہے کہ یہ بھی حقیقت ہے، مگر آخرت کے عقیدے کے بغیر (جس کے ساتھ عمل صالح لازم ہے) یہ ناقص ہی نہیں، موجب لساد و تباہی ہے۔

دوسرا لکتہ یہ ہے کہ دنیا کا حصول ایک اخلاق اصول کا طلبگار ہے، اسی لیے ایسی دنیا طلبی کے ساتھ

دوم یہ تاریخ کے بعض پر آشوب ادوار کے درد ناک واقعات (مثلاً حملہ نارتار اور تیمور کی یلغاروں) کی وجہ سے بطور ایک ردّ عمل کے نمایاں ہوا۔ ایک ایسا دور جس میں سیاست نے برادر کشی اور اخلاقی باختگی کا روپ دھار لیا ہو اس میں زندگی کے اس گھٹاؤنے کاروبار کے خلاف طبائع میں بیزاری کا پیدا ہونا امر قدرتی ہے۔

اس کے باوجود اکابر علما و حکماء نے زندگی کو ایک معرکہ عمل قرار دیا ہے اور اس سے فرار کا سبق نہیں سکھایا۔ ابن خلدون نے اپنے مقدمے میں دنیا کو آخرت کی تجربہ گاہ قرار دے کر اس میں حسن زندگی کو انسان کا فطری تقاضا اور اس کا کمال ظاہر کیا ہے اور حضرات کو شرف انسانی کی علامت قرار دیا ہے۔ امام ماوردی نے اپنی کتاب الاحکام السلطانیہ کا آغاز ان الفاظ میں کیا ہے: الامامة موضوعة لخلافة النبوة في حراسة الدين وسياسة الدنيا

صوفیہ میں سے رومیؒ نے دنیا کی تشریح کرتے ہوئے کہا ہے :

جیست دنیا از خدا غافل بدن
نے قماش و لقرہ و فرزند و زن

متاخرین میں سے شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے حجۃ اللہ البالغۃ میں یہی بحث ارتقاات کے ضمن میں کی ہے اور ارتقاات اربعہ سے ان کی مراد وہ چار درجے ہیں جن سے انسانی تمدن گزرتا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے لکھا ہے کہ کسی بھی پنچہر نے رہبانیت کی تعلیم نہیں دی (اور الحضرت علی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ قول تو مشہور ہے : لا رہبانیۃ فی الاسلام)۔ وہ لکھتے ہیں : ”اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اس سے حاصل نہیں ہوتی کہ آدمی ارتقاات ثالث (یعنی تمدن کے معاشاتی حصے میں بعض طبائع کی خود غرضی اور فساد) سے بیزار ہو کر اس سے علحدگی اختیار کر لے۔ جنہوں نے لوگوں سے میل جول رکھنے اور خیر و شر میں ان کے

بعض لوگ اصحاب صفہ کی موجودگی سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ اسلام نے فقر (یعنی کسب معاش کے لیے ترک معاشی) کو پسندیدہ قرار دیا ہے، لیکن یہ صحیح نہیں۔ اصحاب صفہ صحابہ کی کثیر جماعت کے مقابلے میں ایک مختصر سا گروہ تھا اور اسے بھی یہ کار اور تارک الدنیا کہنا غلط ہے کیونکہ یہ گروہ خدمات دینی کے لیے وقف تھا، جس کی معاشی ذمے داری امت پر تھی۔ یہ بزرگ وقتاً فوقتاً معاش کے علاوہ خدا کے دین کی خدمت ادا کرتے توئے اور یہ سنی کی اشرف صورت ہے۔ امام غزالیؒ نے اعیان علوم الدین اور کیمیائے سعادت وغیرہ میں دنیا کے موضوع پر مفید بحث کی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ دنیا کو اس لیے یہ نام دیا گیا ہے کہ یہ مرگ کے قریب کی منزل ہے۔ دنیا کا مقصد زاد آخرت ہے (الدنیا مزرعة الآخرة)۔ ان کا یہ قول قابل توجہ ہے : ”ہائیں مذمت کہ دنیا را کردہ آمد گمان مبرکہ ہرچہ در دنیا ست مذموم است بلکہ در دنیا چیزهاست کہ آن نہ از دنیاست، چہ علم و عمل در دنیا ست و نہ از دنیا۔ مذموم دنیا آن باشد کہ مقصود از آن نہ کار دین بود بلکہ وے سبب غفلت و بطر و قرار گرفتن دل بود درین عالم (کیمیائے سعادت، فصل حقیقت دنیا)۔

الغزالیؒ کے بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا اور تن کی ذمے داری (تعهد) خود اعلیٰ مقاصد اور آخرت کے لیے بھی لازمی ہے، لیکن یہ حقیقت ان کے یہاں بلکہ پورے اسلامی ادب میں شد و مد سے نمایاں کی گئی ہے کہ ”تعهد او بقدر حاجت کند“ اور یہ اس لیے کہ اسلام میں زندگی کا اہل نصب العین مقاصد عالیہ کی پیش رات ہے، تن پروری غرض اصلی نہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اسلامی ادبیات میں بعض اوقات بے تعلقی اور ترک اسباب پر زور دیا گیا ہے۔ اول تو یہ رجحان صوفیہ کے بعض انتہا پسند گروہوں کا ہے، جو بعض غیر اسلامی صوفیانہ تصورات سے متاثر ہوئے :

نے نفاذ حاصل کر لیا تھا، جس پر اقبال نے (اور سرسید نے بھی) بڑی کڑی تنقید کی ہے اور اس کے ساتھ کم کوشی اور تقدیر پرستی کے غلط تصور پر بھی لے دے کی ہے۔ اس دور میں مغرب کی مادیت (Materialism) اور دنیویت (Secularism) کے نظریات بھی ایک چیلنج کے طور پر سامنے آئے۔ ان سے نئے مصنفوں کا ایک طبقہ متاثر بھی ہوا، چنانچہ ترکیہ، مصر، شام اور ہندوستان میں ایک مؤثر اقلیت دین اور دنیا (اور ضمناً مذہب اور سیاست) کو جدا جدا شعبے قرار دینے لگی، لیکن روایت سے وابستہ دینی نقادوں اور مفکروں کی اکثریت اس پر قائم ہے کہ اسلام میں دین اور دنیا دونوں ایک کلی حقیقت کے طور پر یک جا ہیں اور دونوں ایک عظیم مقصد کے تحت لازمی ہیں۔ ان نقادوں میں شبلی، اقبال، ابوالکلام، سایمان ندوی، ابوالاعلیٰ مودودی وغیرہ شامل ہیں۔ علمائے عرب میں مفتی محمد عابد، الامتاز عبدالعزیز شادیش، رشید رضا، سید قطب شہید وغیرہ نے اسی خیال کا اظہار کیا ہے [نیز رک بہ الآخرة]۔

مآخذ: من میں مذکور کتابوں کے علاوہ (۱) غزالی: اعیان علوم الدین (مطبوعہ ۱۳۱۲ھ)، ص ۲۳، ۵۸، ۱۳۸؛ (۲) الاشیور: المستطرف، آخری باب؛ (۳) اقبال: Reconstruction of Religious Thought: (۴) خلیفہ عبدالعظیم: Islamic Ideology: (۵) سید قطب شہید: اسلام کا نظام عمل اجتماعی (اردو ترجمہ)۔

(ادارہ)

ڈنيسر: بالائی عراق عرب میں، قرون وسطیٰ کا ایک تباہ شدہ شہر (جو موجودہ ترکیہ کی سرحد کے اندر)، مارڈین سے ۲۰ کیلومیٹر جنوب مغرب میں خابور کے ایک معاون دریا پر واقع ہے۔ اس کی جگہ کی نشاندہی آج کل ایک کردی گاؤں کوچ حصار سے ہوتی ہے، جسے مغربی و نائع نگاروں نے کوسر لکھا ہے۔ ڈنيسر پہلے زمانے کا ایک قلعہ تھا عموماً اسے اور

شریک حال رہنے سے قطعاً علیحدگی اختیار کر کے پہاڑوں کی کھوٹوں اور خانقاہوں کے تنگ و تاریک حجروں میں جا کر پناہ لی اور وحشیانہ زندگی بسر کرنا انہوں نے اختیار کر لیا ان کی یہ ادا حق سبحانہ تعالیٰ کے ہاں ہرگز پسندیدہ نہیں“ (اردو ترجمہ، از مولانا عبدالرحیم، ۱: ۵۲۰)۔ اس کے ساتھ ہی شاہ صاحبؒ نے یہ لکھا ہے کہ ”ارتقاات کے ایسے نظام کو بھی اللہ تعالیٰ پسند نہیں فرماتا جس کا مقصد خوشحالی کی زندگی بسر کرنے کو انتہائے کمال (یعنی عیش پرستی) تک پہنچانا ہو“۔ ان کے نزدیک تمام پیغمبروں کی تعلیم یہ ہے کہ ارتقاات کو باقی رکھ کر خدا کی یاد کو مناسب طریقے سے اس میں شامل کر دیں؛ دنیاوی معاملات میں بھی احکام و آدابہ شرعیہ کی پابندی کی تاکید کریں۔ صالح دنیا داری عیش پرستی سے مختلف شے ہے۔

دنیوی زندگی کو آخرت سے وابستہ کرنے کی حکمت انہوں نے یہ بتائی ہے کہ اعمال انسانی کے لیے ایک ایسا اخلاق معیار مہیا ہو جائے جو مثالی ہو۔ اعمال بہر حال ایک مقصد کے تابع ہیں اور مقصد اخلاقی ہونا چاہیے تاکہ دنیا کا نظام مکمل طور پر چل سکے۔ جزا و سزا دنیا میں بھی مل سکتی ہے، مگر ہو سکتا ہے کہ دنیا میں کوئی شخص جزا سے محروم رہ جائے، یا سزا سے بچ جائے، اس لیے آخرت سے بھی اسے وابستہ کر دیا ہے تاکہ یقینی ہو جائے۔ ابن مسکویہ اور امام غزالی کی طرح شاہ صاحب نے سعادت کو دنیوی زندگی کا نصب العین قرار دیا ہے۔ دور آخر کے اسلامی ادیبوں یا اسلام کے متعلق مستشرقین کی کتابوں میں دین و دنیا کی تقابلی بحث سابقہ ادوار کے مقابلے میں کچھ زیادہ آئی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ آخری صدیوں میں مختلف اسلامی ممالک میں تصوف کے بعض ایسے متسلک زور پکڑ گئے تھے جو ترک دنیا پر زور دیتے تھے، یا افلاطونی حکمت کے تحت شدید داخلیت

① دنیویت : (Secularism) رگ بہ الدنیا .

* دنیہ : (رگ بہ دانیہ) .

* دوا : رگ بہ اڈویہ .

* دوآب : (ف) لفظی معنی : دو دریا ۔ برصغیر

پاک و ہند میں اس کا (اصطلاحی طور پر) اطلاق اس علاقے پر ہوتا ہے جو دو ساتھ ساتھ بہنے والے [اور آگے جا کر باہم مل جانے والے] دریاؤں کے درمیان واقع ہو، بالخصوص اس زرخیز علاقے پر جو اتر پردیش (بھارت) میں دریائے جمنا اور گنگا کے درمیان ہے ۔ پنجاب کے پانچ دریاؤں کے درمیان لمبوتری شکل کے جو قطعات ان گنتے میں انہیں بھی دوآب [یا دواہ] کہتے ہیں، مثلاً ستلج اور بیاس کے درمیان ہست دوآب (یا دواہ) ہست جالندھر، بیاس اور راوی کے درمیان ہاری دوآب، راوی اور چناب کے درمیان رچنا دوآب، چناب اور جہلم کے درمیان جچ (یا جچ) دوآب اور جہلم اور سندھ کے درمیان سندھ ساگر دوآب ۔ کہا جاتا ہے کہ ان دوآبوں کے نام شہنشاہ اکبر [رگ باں] نے رکھے تھے (آئین اکبری، مترجمہ I. S. Jerret، ۱: ۲، ۳: ۱۵۰، بعد) ۔ جنوبی ہند میں سب سے مشہور دوآب رائچور دوآب ہے، جو دریائے کستنا (کرشنا) اور تنگبھڑا کے درمیان واقع ہے ۔ یہ دونوں دریا وجیا نگر کی هندو ریاست اور دکن کی اسلامی ریاستوں کے درمیان ایک غیر مستقل سرحد کا کام دیتے تھے ۔

مآخذ : (۱) آئین اکبری، حصہ دوم، آئین سیزدہم،

بذیل صوفہ لاہور؛ (۲) کنہیا لال : تاریخ پنجاب، لاہور

۱۹۲۹ء : (۳) مفتی غلام سرور : تاریخ مغزن پنجاب،

مطبع نولکشور ۱۸۷۷ء : (۴) سہد محمد اظہر :

تاریخ پنجاب مع حالات شہر لاہور، لاہور ۱۸۸۸ء : (۵)

سجان رائے : خلاصۃ التواریخ، طبع خضر حسن، دہلی

The Ancient Geog- : A. Cunningham (۵) : ۱۹۱۸

raphy of India لندن ۱۸۷۱ء (۶) H.K. Trevisakis :

The Land of the Five Rivers، مطبوعہ آکسفورڈ

Dio Cassius کے Adenystrai کو ایک ہی مقام قرار دیا ہے، لیکن عہد اسلامی کے ابتدائی ارسوں میں یہ کسی اہم مقام کی حیثیت سے مذکور نہیں؛ چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی میں کہیں جا کر اس کا نام ابن حوقل کے ایک مخطوطے میں نظر آتا ہے، جہاں اسے ایک سنڈی کا مقام بتایا گیا ہے ۔ آگے چل کر ساتویں صدی ہجری / تیرہویں صدی عیسوی میں شہر دتیسر ایک تجارتی، زرعی اور علمی مرکز بن گیا، جس کی خوشحالی کی شہادت اُرتقی فرمانرواؤں کے حکم سے بنائی ہوئی عمارتیں دے رہی ہیں، مثلاً مسجدیں اور مدرسے، جن کے آثار آج تک باقی ہیں ۔ یہ شہر ایک وسیع میدان پر پھیلا ہوا تھا، جس کے گرد کوئی دیوار نہ تھی اور یہ ایک نالی کے پہلو میں واقع تھا، جسے ایک سنگی پل کے ذریعے عبور کیا جاتا تھا ۔ ابن جبیر اس کے متعلق کہتا ہے : ”یہ شہر بھولوں اور سبزیوں (نباتات) کے باغات سے گھرا ہوا تھا اور اس پاس کے علاقے کے باشندے اس کی طرف کھینچے چلے آتے تھے ۔ جمعے سے اتوار تک یہاں ایک عوامی میلہ لگا کرتا تھا“ ۔ آگے چل کر دتیسر کا مرتبہ گر گیا اور وہ ماردین کا طفیلی ہو کر رہ گیا ۔

مآخذ : (۱) Pauly-Wissowa، بذیل مادہ

Adenystrai : R. Dussaud (۲) Topographie histori-

que de la Syrie، پیرس ۱۹۲۷ء، ص ۴۹۳ (۳)

Le Strange، ص ۹۶ : A. Gabriel (۴) Voyages :

archéologiques dans la Turquie orientale، پیرس

۱۹۰۷ء، ص ۵۳ تا ۵۴ : (۵) ابن حوقل، در BGA :

۱۵۱، حاشیہ : (۶) ابن جبیر : رحلة، طبع ثخویہ، ص ۲۸۰ تا

۲۸۲ و مترجمہ Gaudfroy Demombynes، ص ۲۷۷ تا

۲۷۸ : (۷) یاقوت، ۲ : ۶۱۲، علمائے دتیسر کے لیے دیکھیے

لوہنگ : (۸) ابراہیم کلمان، ۱ : ۶۰۶ (۳۳۳) و تکرار،

۵۶۶ : ۱

(D. Sourdél)

قریب دوا داروں کو بڑا اقتدار حاصل ہو گیا تھا، مثلاً امیر ہشک دوا دار کے فرائض ادا کرنے کے علاوہ امیر صلاح، وزیر، استاد، کشف الکشاف (انسپکٹر جنرل) و مدیر المملکۃ اور رأس المیسرہ بھی ہوتا تھا! اس سے پہلے کسی مملوک کے پاس اتنے زیادہ عہدے جمع نہ ہوئے تھے بالکل یہی عہدے دوا دار طومان ہای نے بھی سنبھالے ہوئے تھے، جو بعد میں سلطان ہو گیا۔ عثمانی اور صفوی ممالک میں دوا دار (جو دیوتار اور دوات دار کہلاتے تھے) دفتر وزارت میں صرف کاتبوں کی خدمات انجام دیتے تھے۔

مآخذ: (۱) اسمعیل حتی اوزون چارشلی: عثمانی دولتی تشکلاتہ مدخل، استانبول ۱۹۰۱ء، ص ۹۶، ۹۷ و بسند اشاریہ: (۲) D. Ayalon، Studies on the structure of the Mamluk army، ۱۹۵۷ء، ۶۲ تا ۶۸، ۶۹ تا ۷۱۔

(D. AYALON)

دوار: بدوی عربوں کا پڑاؤ، جس میں خیمے دائرے کی طرح یا بیضوی شکل میں اس طرح لگائے جاتے ہیں کہ بیچ کی خالی جگہ (مراح) کے گرد ایک قسم کا احاطہ بن جاتا ہے، جس کے اندر مویشی رات بسر کرتے ہیں۔ پڑاؤ ڈالنے کا یہ بہت پرانا طریقہ آج کل بھی مشرق بدویوں میں (شمالی شام، عراق عرب) نیز شمالی افریقہ کے تمام خانہ بدوشوں یا نیم خانہ بدوشوں میں رائج ہے۔ اس پڑاؤ کو جو دوار نام دیا گیا ہے وہ قرون وسطیٰ کے بعض سیاحوں اور جغرافیہ نویسوں کی تحریروں میں موجود ہے۔ مشرق میں اس لفظ کی صحیح شکل دوار یا (بسکون 'د') دوار اور مغرب میں اس کی شکل دوار یا دوار (جمع "دوادر") ہے۔ ان خیموں کی تعداد، جن سے دوار بنتا ہے، بہت مختلف بھی ہو سکتی ہے؛ کبھی یہ کئی سو بھی ہوتے ہیں اور کبھی دس سے زیادہ نہیں ہوتے۔ بہت سے مختلف النوع اسباب

اورنورڈسٹن ایس ۱۹۲۸ء: (۱) W. H. Moreland، *The Agrarian System of Moslem India*، کیمبرج ۱۹۲۹ء: (۲) محمد اکبر: *Punjab under the Mughals*، لاہور ۱۹۳۸ء: مزید مآخذ کے لیے رگ بہ پاکستان: پنجاب C. COLLIN DAVIES (و ادارہ)

دوات دار: (دوا دار، نیز دیودار اور امیر دوات)، سرکاری روشنائی کے ذخیرے کا منصب دار و معالظ۔ دوات عباسیوں کے عہد میں وزیر کے عہدے کا خصوصی نشان۔ دوا دار کا عہدہ سلجوقیوں نے قائم کیا اور اس عہدے پر انتظامی صیفے کے ملازم فالزرہ۔ سلطان پیرس نے یہ عہدہ ایک مملوک امیر عشرہ کو منتقل کر دیا۔ بحری ممالک کی حکومت میں "دوا دار" کا شمار با وقعت امرا میں نہ تھا، البتہ چرکسی بادشاہوں کے تحت دوا دار سلطنت کے اہم امرا میں شمار ہونے لگا اور اسے "دوا دار کبیر" کا لقب دیا گیا، جس کے تحت چند اور دوا دار ہوتے تھے۔ دوا دار کا عہدہ سلطنت کے سات اہم عہدوں میں سے ایک شمار ہوتا تھا۔ رأس نوبہ اور اور دوا دار کبیر کا پانچویں اور چھٹے درجے کے لیے مقابلہ رہتا تھا اور یہ درجے کبھی ایک اور کبھی دوسرے کے ہاتھ آ جاتے تھے۔ بعض دوا دار سلطان کے درجے تک بھی پہنچے۔ مملوکوں کے عہد کے اخیر میں دوا داروں کے فرائض میں یہ فیصلہ کرنا بھی شامل تھا کہ جنگی سہمات میں حلقے کے کون سے افراد شامل ہونے کے قابل ہیں (رگ بہ حلقہ)؛ علاوہ بریں وہ بالائی مصر کا باقاعدہ دورہ کرتا تھا اور کبھی کبھی جبل لائبس، الشریہ اور الغریہ کے صوبوں میں بھی جانا تھا تاکہ وہاں کے محصولات اور فصایں جمع کرے۔ یہ دورے بڑی دھوم دھام کے ساتھ ہوتے تھے۔ ہمارے مآخذ میں ان پر طویل بحثیں کی گئی ہیں۔ ان دوروں میں مقامی آبادی کے ساتھ ظلم و ستم کا پڑاؤ بھی ہوتا تھا۔ عہد ممالک کے اختتام کے

(Textes Arabes des Zaïr : Loubignac
Description general de : Marmal (۱۰) : ۳۰۳-۳۱۵
Africa ج ۱، باب ۲۵، ورق ۳۶ چپ
(G. S. COLIN و W. MARCAIS)

دَوَارِکَا : (دَوَارِکَا) : بھارت کے صوبہ گجرات

کے ضلع اوکھا منڈل کا ایک شہر، جو جزیرہ لمائے
کالھیاواڑ کے شمال مغرب میں، گومتی ندی کے کنارے،
۲۲ درجے ۱۵ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۶۹ درجے
۱ دقیقہ طول بلد شرقی پر واقع ہے۔ اسے دواروٹی اور
جگت بھی کہتے ہیں۔ یہ ہندوؤں کا ایک متبرک مقام
ہے کیونکہ اس کا تعلق سری کرشن سے بتایا جاتا ہے۔
اس کے کچھ قدیم تاریخی حالات ہندو اساطیر میں
ملنے ہیں۔ روایت ہے کہ سری کرشن نے اوکھا منڈل
فتح کر کے اپنا دارالحکومت دوارکا میں قائم کیا تھا۔
یہاں کا مشہور مندر دوارکا ناتھ (یا ترلوک سندر) ان کے
پرہوئے و جرنالہ کے تعمیر کرایا تھا اور اس کا شمار
بھارت کے انتہائی متبرک ”استھانوں“ میں ہوتا ہے
(ہندو دور کے مفصل حالات کے لیے دیکھیے Gazetteer
of the Bombay Presidency ج ۸)۔

اسلامی دور کی تاریخ میں دوارکا پر مسلمانوں

کے مندرجہ ذیل حملوں کا ذکر ملتا ہے :

(۱) ۸۷۷-۸۷۸/۱۳۷۲-۱۳۷۳ء میں گجرات
کے سلطان محمود شاہ بیگزہ نے دوارکا پر حملہ کر کے
اسے تباہ و برباد کر دیا، کیونکہ اوکھا منڈل کے
بحری قزاقوں کے ہاتھوں حجاج کا راستہ بہت
غیر محفوظ ہو گیا تھا اور انہوں نے نامور فاضل مولانا
محمود سمرقندی سے بدسلوکی کی تھی۔ اس وقت دوارکا
پر وادھل خاندان کا راجا بھیم حکومت کرتا تھا
(تاریخ فرشتہ، مترجمہ Briggs، ص ۵۹ : بعد)۔

(۲) ۸۹۳-۱۵۲۷/۱۵۲۸ء میں دوارکا کے
ہندو راجا پر سورٹھ کے صوبیدار ملک اسحق نے حملہ
کیا (سراۃ سکندری، مترجمہ فضل اللہ لطف اللہ نریدی،

ہیں جن کی وجہ سے بدویوں کا ایک ہی گروہ چھوٹے
دواروں میں بٹ جاتا ہے، جو کچھ اہمیت نہیں رکھتے،
یا پھر باہم مل کر خاصی بڑے بڑے دوار بن جاتے
ہیں۔ یہ اسباب اس قسم کے ہوتے ہیں، مثلاً چراگاہوں
کی کثرت یا کمیابی، امن و امان یا بدامنی وغیرہ۔ یوں
تو دوار کی اصطلاح ایسے پڑاووں کے لیے بمنزلہ اسم جنس
ہو گئی ہے، لیکن کم اہمیت اور چھوٹا درجہ
رکھنے والے پڑاووں کے لیے مختلف علاقوں کی
بولی میں اس کے نام انگ الگ ہیں، مثلاً رسم، جتہ،
نزلہ، فراقی وغیرہ۔ الجزائر کی سرکاری اصطلاح میں
لفظ ”دوئر“ کے وہ معنی نہیں رہے جو اصلی اور ابتدائی
تھے بلکہ اس سے مراد ایک ایسا انتظامی حلقہ
لیا جاتا ہے — خواہ یہ خانہ بدوشوں کا ہو یا مستقل
باشندوں کا — جو ایک ہی سردار، قائد یا شیخ کے تحت
ہو۔ عہد اسلامی کے ہسپانیہ میں لفظ دوار سے لوگ
واقف تھے۔ Vocabulista (طبع Schiaparelli) میں اسے
مفہوم کے اعتبار سے اطالوی لفظ ”mansio“ کا مرادف
قرار دیا گیا ہے، لیکن مزید تشریح نہیں کی گئی۔
موجودہ زبان میں ادوار aduar کے معنی خانہ بدوشوں
(چمپیوں) کے پڑاؤ کے ہو گئے ہیں۔

مآخذ : (۱) Supplément aux Dictionnaires : Dozy

natres Arabes : ۴۷۳ : ۱ : مشرق بدویوں کے دوار کی

بابت دیکھیے : Voyages en Arabie : Burckhardt (۲) :

(فرانسیسی ترجمہ) : ۳ : ۲۳ : von Oppenheim :

(۳) Vom Mittelmeer zum Persischen Golf : ۲ : ۳۳ : (۴)

Arabia Petaraca : A. Musil : ۱۳۰ : ۱۳۱ و

شکل ۱۸۰ : مغربی عربوں کے دوار کی بابت دیکھیے :

Recueil de Textes Pour l'Étude de : Delphin (۵)

l'Arabe Parlé : ص ۲۸۳ : (۶) A. Bernard و

L'évolution du nomadisme en Algérie : N. Lacroix

ص ۷۷۶ : بعد : Pillars of Hercules : Urquhart (۷) :

Archives Marocaines (۸) : ۱۰۶ : ۱۰۵ : (۹)

زبردست فوجی اڈا قائم کر لیا۔ ستمبر ۱۹۹۵ء کی جنگ پاکستان و بھارت میں یہاں کا قلعہ عسکری نقطہ نظر سے بڑی اہمیت کا حامل تھا، کیونکہ یہاں ایک انتہائی طاقتور راکٹر سٹیشن لگا ہوا تھا، جس سے اس علاقے میں پاکستانی فضائیہ کی نقل و حرکت بہت محدود ہو کر رہ گئی۔ علاوہ ازیں کراچی اور پاکستان کے دوسرے شہروں پر بمباری کے لیے بھارتی طیارے بھی یہیں سے پرواز کرتے تھے۔ سات اور آٹھ ستمبر کی درمیانی شب پاکستانی بحریہ کے چند جہازوں نے جنگی جہاز عالمگیر کے زیر قیادت دوارکا پر حملہ کیا اور اپنی بمباری سے دوارکا کا قلعہ مع راکٹر سٹیشن بالکل تباہ کر دیا۔

مآخذ: (۱) *Gazetteer of the Bombay Pres-*
dency ج ۸ (کاٹھیاواڑ)، بمبئی ۱۸۸۳ء ص ۵۸ بعد: (۲)
J. Burton-Page، بذیل مادہ، در *آٹز*، لائلن، بار دوم: (۳)
 وہی مصنف: *Aziz and the Sack of Dvarka*، در
BSOAS، ۲۰ (۱۹۵۷ء)؛ ۱۳۵ بعد، جس میں مزید مآخذ
 بھی درج ہیں: (۴) اسرار زبیدی: شکست در شکست،
 لاہور ۱۹۶۷ء۔

[ادارہ]

دوارو: جنوبی حبشہ (Ethiopia) کی ایک مسلم تجارتی ریاست۔ ایک تنگ سی لمبی پٹی کی شکل کا یہ علاقہ بالی کے متصل جانب مشرق واقع تھا اور اس میں هر Harar کا عظیم اسلامی مرکز تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی حد جنوب کی طرف وہی شبیلہ Webi Shabellہ تک پہنچتی تھی اور شمال میں دناقل Danakil کے نشیبی علاقے کے کنارے تک، جہاں اس کی اور بالی کی سرحدیں ریاست افات سے جا ملتی تھیں۔ بہر حال اتنی بات صاف ہے کہ کم سے کم کچھ زمانے تک۔ اور بلاد الحبشہ کے بادشاہ عامدہ صیون Amda Syon اول کے عہد حکومت ہی میں۔ دوارو نام کا ایک جداگالہ قطعہ دریائے هوش (Hawas) زریں کے شمالی جانب پھیلا ہوا تھا اور اس میں موجودہ سلطنت

مطبوعہ ایجوکیشن سوسائٹی پریس: عبداللہ محمد بن عمر، طبع ڈینی سن راس *Arabic: E. Denison Ross*
History of Gujrat، ص ۱۱۷، ۱۱۸۔

(۴) ۱۰۰۰-۱۵۹۱ / ۱۵۹۲-۱۵۹۳ء میں گجرات کے معزول سلطان مظفر سوم نے فرار ہو کر دوارکا میں پناہ لی۔ اس کے تعاقب میں خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش نے شاہی فوج روانہ کی، جس نے دوارکا پر بلا مزاحمت قبضہ کر لیا (مرآۃ احمدی: مرآۃ سکندری: اکبر نامہ)۔

(۵) ۱۵۱۱-۱۵۱۲ / ۱۵۰۵-۱۵۰۶ء میں شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے یہ اطلاع پا کر کہ دوارکا کی مغل چوکی پر حملہ ہو گیا ہے، فرمان جاری کیا کہ باغیوں کی سرکوبی کی جائے اور وہاں کے مندر کو سمار کر کے مسجد تعمیر کر دی جائے! تاہم یہ روایت درست معلوم نہیں ہوتی کیونکہ اس کی تائید میں کوئی تاریخی شہادت دستیاب نہیں (J. Burton-Page، در *BSOAS*، ج ۲۰)۔

انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں دوارکا بحری قزاقوں کی ایک بدنام آماجگاہ تھا، جن کی سرگرمیوں کے باعث سندھ سے دیوتک بحیرہ عرب کا ساحل کسی تاجر کے لیے محفوظ نہیں رہا تھا۔ ان کا قلع قمع کرنے کے لیے بڑودے کے انگریز ریڈیڈنٹ نے فوج روانہ کی، جس نے ۱۸۱۶ء میں دوارکا پر قبضہ کر لیا۔ انگریزوں نے یہ علاقہ مہاراجہ بڑودہ کے حوالے کر دیا، لیکن مقامی آبادی کو یہ انتظام پسند نہ آیا، چنانچہ آئندہ پچاس ساٹھ برس کے دوران گائیکوار کا تسلط ختم کرنے کے لیے یہاں کئی بار بغاوت ہوئی اور انگریزوں کو یہاں بار بار فوجی مہمات بھیجنی پڑیں۔ بالآخر ۱۸۷۳ء میں شورش پسند عناصر پر پوری طرح قابو پا لیا گیا۔ ۱۸۹۸ء میں یہاں کی آبادی ساڑھے چار ہزار کے قریب تھی۔

برصغیر پاک و ہند میں برطانوی حکومت کے خاتمے کے بعد بھارتی حکومت نے دوارکا میں ایک

لندن ۱۹۵۳ء

(G. W. B. HUNTINGFORD)

دوازده امام : رک بہ اثنا عشریہ

* الدَّوَّاسِر : واحد : دوسری ایک بڑا قبیلہ

جس کا مرکز وسطی عرب ہے۔ الدواسر اس کی ممتاز خصوصیات یہ ہیں: ان میں سے اکثر لوگ عرب سے باہر دور دور تک پھیل گئے؛ انہوں نے ایسے علاقوں میں جو ان کے اصل وطن سے بہت دور تھے اپنی مساعی میں کامیابی حاصل کی؛ جو لوگ مستقل طور پر جگہ جگہ آباد ہوئے انہوں نے اپنے قبیلے سے غیر معمولی تعلق اور عصیت برابر قائم رکھی اور وہ اپنے بدوی آبا و اجداد کے طور طریقے سے نہیں ہٹے۔

قبیلے کی اصل و نسل خواہ کچھ ہی ہو، الدواسر کا نام شروع ہی سے جنوبی نجد کی وادی الدواسر (جو ان اطراف کے تمام آباد اضلاع کی بدست الریح البخانی سے قریب تر ہے خطہ ہے) کے ساتھ اور الانلاج زرک باں کے ساتھ منسلک چلا آتا ہے۔ اگرچہ وہ ترک وطن کر کے شمال اور مشرق کی جانب جاتے رہے، تاہم دواسر (مہاجر یا وہ لوگ جو اپنے قدیم وطن کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے) جنوب و مغرب میں مازب کے قریب رغوان میں اور حجاز کے کوهستان الغمرہ میں پائے جاتے ہیں۔ الانلاج کے شمال میں دواسر اضلاع الخرج (جہاں کے بڑے شہر الدائم میں دوسروں کی نسبت ان کی تعداد بہت زیادہ ہے)، العارض، المحمل اور مدیر میں بکثرت موجود ہیں۔ ان شہروں میں، جہاں حال کی صدیوں میں دواسر قبیلے کے لوگ حاکم یا قاضی بنے یا ستار شہریوں کی حیثیت میں مشہور ہوئے، ضلع المحمل کے قصبات البیر اور ثادق اور مدیر کے قصبات المجمعة، جلالہ، العودہ اور الغاط شامل ہیں (ابن بشیر، ۳: ۱۴۲ تا ۱۴۴) نے حریملا کے ایک مشہور دواسر قاضی کا تذکرہ لکھا ہے۔ دواسر الزینبی میں، جو القصیم کی سرحد پر ہے، بود و باش رکھتے ہیں، مگر اس سے آگے

آوسہ Awssa کا ایک حصہ بھی شامل تھا۔ دوارو کا ذکر حبشہ کے وقائع ناموں میں پہلے پہل عامہ صیون اول کے عہد (۱۳۱۲ء تا ۱۳۴۲ء) میں آتا ہے۔ حبشہ کی دیگر مسلم ریاستوں کی طرح دوارو بھی اپنے الگ بادشاہ کے زیر حکومت تھا (جسے "قاریخ عامہ صیون" مخطوطہ موزہ بریطانیہ، عدد Or. ۸۲۱، ورق ۴۳ میں "مکوالن makuanen" کہا گیا ہے)، جو شاہ حبشہ کا باجگزار تھا۔ عامہ صیون کے عہد حکومت میں شاہ ہایدارا Haydara نے بغاوت کر دی اور آڈل کے باغی لوگوں سے مل گیا؛ مگر اس ریاست کو فتح کر لیا گیا اور وہ ۱۵۴۸ء کے بعد تک حبشہ کی باج گزار رہی جب کہ گلا وادی ووس Galsadewos کے تحت فتولل Fanu'al یہاں کا والی تھا۔ العمری کے بیان کے مطابق گو اس کا طول فقط پانچ دن کی اور عرض صرف دو دن کی مسافت کے برابر تھا، پھر بھی اس ریاست کی اوج بڑی اور طاقتور تھی؛ یہاں کے باشندے حنفی مسلمان تھے۔ المقریزی نے انعمری کے بیان کو دہرایا ہے۔ اوو Omu ندی کے مغرب میں سیدنا قوم کی چھوٹی سی ریاست کٹو Kullo کا بھی مقامی نام دوارو ہر گیا تھا، جس کی وجہ یہ تھی کہ حبشہ اور احمدگراں میں جب لڑائی ہو رہی تھی (۱۵۲۷ء تا ۱۵۴۲ء) تو دوارو کے پناہ گزینوں نے اس علاقے میں اپنی بستی قائم کر لی تھی، ورنہ کٹو اور دوارو میں اور کوئی تعلق نہ تھا۔

مآخذ : Histoire des guerres : Perruchon

Amda Seyon 'id' (دار ۱۸۸۹ء) ص ۲۷۱ تا ۲۷۳

Le canzon geez-amarina : I. Guidi (۲) ص ۹۳ تا ۹۴

Les Chron. : Perruchon (۳) عدد ۸ و ۱۰

uniques de Zar'a Ya'eqob et de Ba'eda Maryam

پیرس ۱۸۹۲ء : (۴) انعمری : مسالک الابصار، مترجمہ

Gaudefroy-Demombynes، پیرس ۱۹۰۲ء : (۵) المقریزی،

F. T. Rineck، لائلن، ۱۹۰۹ء : (۶) Beckingham و

Some Records of Ethiopia, 1593-1646 : Huntingford

میں ایک لام بڑھا کر "الداسر" آنا ہے) سے مأخوذ ہے، مگر اس کا مفہوم اور اطلاق نہیں واضح ہیں۔
 (۱) مآخذ : (۱) حمد بن عبّون، تاریخ الممکة ۱۳۵ھ؛
 (۲) احمد بن فضل اللہ : التعریف، قاہرہ ۱۳۱۲ھ؛ (۳)
 عثمان بن بشر : عنوان العبد، قاہرہ ۱۳۷۳ھ؛ (۴) ابراہیم
 بن عیسیٰ : عقد الدرد، قاہرہ ۱۹۵۳-۱۹۵۵ء؛ (۵) J. G. Lorimer : Gazetteer of the Persian Gulf، ۱۹۰۸ء تا ۱۹۱۵ء؛ (۶) H. St. J. B. Philby : The Heart of Arabia، لندن ۱۹۲۲ء؛ (۷) مصنف : Arabian Jubilee، لندن ۱۹۵۲ء؛ (۸) مصنف : Arabian Highlands، Ithaca (نیویارک) ۱۹۵۲ء؛ (۹) Max Freiherr von Oppenheim : Die Beduinen، ج ۳، Wiesbaden ۱۹۵۲ء؛ نیز وہ اطلاعات جو اس قبیلے کے افراد سے اور فضلاء سعودی عرب سے ہاتھ لگیں۔

(G. RENTZ)

دوائر : دائرہ کی جمع؛ الجزائر میں خاندانوں کے اس گروہ کو کہتے ہیں جو کسی مقامی سردار کی خدمت گزاری اور ذات سے وابستہ ہو۔ فرانس کی فتح سے پہلے دوائر (مقامی تلفظ دوائر) خاص طور پر ان چار قبائلی گروہوں کا نام تھا جو آورن کے جنوب مغرب میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے اور شہر کے لیے (=حاکم) کے ملازم تھے، اگرچہ ان کے علاوہ اور دوائر بھی تھے، جیسے تتری Tittiri ہیں۔ ان کی تنظیم رضا کار فوج (Militia) کی طرح کی جاتی تھی۔ ان کا گزارہ اس زمین کی پیداوار پر تھا جو سلطنت ترکیہ نے ان کی تعویل میں دے دی تھی، نیز اس منافع پر جو بے قابو یا مالیہ نہ دینے والے قبائل کے خلاف تادیبی مہمات سے حاصل ہوتا تھا۔ ان کے پڑوسی زمانہ بھی اسی طرح کی خدمات انجام دیتے تھے۔

فرانس کی فتح کے بعد پتا لگا کہ مقامی روایات میں ان گروہوں کے افراد کو ان فوجیوں کی اولاد قرار

دعائ کی طرف زیادہ تعداد میں نہیں بڑھے۔
 دواسر میں سدیریوں کا خاندان (السداؤ) ان کے لیے باعث فخر ہوا ہے۔ ان کا نام السدیری اس لیے ہوا کہ وہ تقریباً چار صدیوں سے سدیر کی بستی الغاط میں رہتے تھے۔ تیرھویں صدی ہجری/اٹھسویں صدی عیسوی میں احمد بن محمد السدیری آل سعود کا ایک مشہور و معروف نائب تھا۔ اس کی اولاد کے تعلقات اس وقت سے آل سعود کے ساتھ بہت گہرے چلے آ رہے ہیں۔ اسی کی ایک بیٹی شاہ عبدالعزیز (ابن سعود) (م ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۳ء) کی والدہ تھی۔ اس کی ایک بیوی کے بطن سے اس بادشاہ کے سات بیٹے ہوئے، جن میں سے دو (نہد اور سلطان) ۱۳۷۹ھ/۱۹۶۰ء میں سعودی عرب کی حکومت کے وزیر تھے۔ ۱۳۶۹ھ/۱۹۵۰ء میں سدائر خاندان کے تیرہ افراد سعودی عرب میں کسی نہ کسی صولے یا ضلع کے حاکم تھے؛ اسی سدائر خاندان کی بدولت دواسر مملکت سعودی کے کوئے کوئے میں پہنچ گئے۔

خلیج فارس پر دواسر نجد سے براستہ بحرین آئے اور وہاں اپنے نئے قصبے الدسام [رک بان] اور النخب بسائے، جن میں وہ خوب پھول پھل رہے ہیں۔ دوسرے دواسر بحرین اور قطر میں بود و باش رکھتے ہیں۔ کچھ ان میں سے بحرین سے ایرانی ساحل کی طرف ہجرت کر گئے ہیں۔ ان کے کچھ لوگ قطر سے جزیرہ ذلما میں چلے گئے ہیں۔ عراق کے اندر دواسر الزبیر میں ہیں اور شط العرب کا ایک قطعہ ضلع دواسر کہلاتا ہے اور وہاں کے دریائی جزیروں کا نام بھی یہی ہو گیا ہے۔ اس قبیلے کے دو بڑے حصے ہیں : عیال زائد اور

تغالبہ، جو ابتدا میں ایک دوسرے سے بالکل الگ تھے۔ ان میں سے کوئی بھی اپنے مورث اعلیٰ کا نام "دوسر" (=قوی اولٹ) نہیں بتاتا، گو ادبیات عالیہ میں ایک قبائلی نام کے طور پر دوسر کا ذکر آیا ہے۔ اس کی جمع "دواسر" عموماً ترکیب "الداسر" (جو کبھی کبھی بیچ

جہاں نما، طبع Fr. Taeschner، لاہرگ ۱۹۵۱ء
(۶۸، ۶۶) - نشری میں دوبروچ کے بٹے پنکو یا
اؤنکو کا نام دبرجہ اوغلو، مذکور ہے۔

مآخذ: (۱) Basvekalet، استانبول، محافظ خانے،
Tapu Defterleri، عدد ۳۰۸، ۱۸۳۲ء: (۲) Tapu ve
Kadastro Um. Md. انقرہ، قیود قلیہ، عدد ۳۹۸، ۳۹۷
Toponymical and historical: I. Bromberg (۳) ۳۹۹
miscellanies on mediaeval dobrudja, Bessarabia
and Moldo-Wallachia، در Byzantion، ۱۲: ۱۵۱ تا
۲۰۷، ۲۵۹ تا ۳۷۵: ۱۳: ۹ تا ۱۲: ۱۵۱ تا ۱۵۲
La question du Paristion، در Byzantion، ج ۸
(۱۹۳۳ء): (۵) Dobrudja: P. Mutačiev، صوفیہ ۱۹۵۷ء
(۶) Dobrudja: La Dobrudja، طبع Acad. Roumaine،
بھارسٹ H. Fazıl (Hiküsal) (۷) ۱۹۳۸ء: (۸)
Dobruca ve Türkler، Köstence، ۱۹۳۷ء: (۹)
Geschichte der Bulgaren: C. Jireček، بڑیگ ۱۸۷۶ء
Hist. des Roumains: N. Lorga، ج ۱، ۱ تا ۱۱
بھارسٹ ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۹ء: (۱۰) Yaz: P. Wittek
Ali on the Christian Turks of the Dobruja
در BSOAS، ج ۱۳ (۱۹۵۲ء) ص ۶۳۹ تا ۶۶۸: (۱۱)
Gagauzlar: A.T. Mann، ترکی ترجمہ از Acaroglu،
La politique: N. Lorga، (۱۲) ۱۹۳۰ء: انقرہ
venitienne dans les eaux de la mer noire
Acad. Roumaine, Bull. sect. hist.، ج ۲، ۱ تا ۱۱ (۱۹۱۳ء)
۱۸۹ تا ۲۰۷: (۱۳) وہی مصنف: Dobrotic, Dobrotici
Europeen، ج ۵ (۱۹۲۸ء): (۱۴) Istoria României, A. Moldova
Genoese اور Ivanco کے درمیان معاہدے کا متن،
۲۹۶ تا ۳۰۱: (۱۵) Recherches: G. I. Brătianu
sur Viciu et Cetatea Alba، بھارسٹ ۱۹۳۵ء: (۱۶)
اولیا چلی: سیاحت نامہ، ج ۳، استانبول ۱۹۳۱ء، ص ۳۳۵

دیا جاتا تھا جنہیں مولای اسمعیل سلطان مراکو
ترکوں سے جنگ کرنے کے لیے ۱۷۰۱ء میں اس علاقے
میں لایا تھا۔ لڑائی میں ترکوں سے شکست کھا کر
بہت سے مراکشی سپاہی ترکوں کی ملازمت میں داخل
ہو گئے اور انہوں نے مل کر اپنا ایک قبیلہ "مخزن"
بنا لیا جو دو مقامی خاندانوں کے زیر قیادت تھا۔ مزید
تفصیل کے لیے دیکھیے ۱۱ لائن بار دوم بغیل مادہ۔

مآخذ: (۱) گنام مصنف Douair et Zmala،
اوران ۱۸۸۳ء: (۲) Pellissier de Rynaud،
Annales algériennes، جلدیں، پیرس اور الجزائر ۱۸۵۵ء،
بمواقع کثیرہ: (۳) W. Ezterhazy، Notice sur le
Maghzen d'Oran، الجزائر ۱۸۳۸ء اور Dela Domination
Turque dans l'ancienne Régence d'Alger، پیرس
۱۸۵۰ء، ص ۲۶۶ بعد: (۴) Desmichels، Oran sous
le Commandement du général Desmichels، پیرس
۱۸۳۵ء، بمواقع کثیرہ: (۵) الناصری: کتاب الاستعمار،
قاہرہ ۱۹۳۱ء، ص ۸۸ تا ۱۹۲: (۶) M. Emerit،
L'Algérie à l'Époque d'Abd-el-Kader، پیرس ۱۹۵۱ء،
بمواقع کثیرہ: (۷) R. Tinthoin، Evolution des Genres de Vie dans la Région Ouest
d'Oran de 1830 à 1885، اوران ۱۹۴۷ء، بمواقع کثیرہ۔

(A COUR-[R. LE TOURNAU])

* دوبروچہ: ایک سطح مرتفع، جو شمال میں
دریائے ڈینیوب اور دریائے لوم Lom کے درمیان واقع
ہے اور جس کے مشرق میں بحر اسود اور جنوب میں
دریائے پروجسکا Prown dijska یا کوہستان بلقان
ہے۔ اس علاقے میں دلی ارمان کو مشرق کے صحرائی
خطے دبرجہ کبری سے متماثل کیا گیا ہے، جسے دبرجہ
خاص خیال کیا جاتا ہے۔ اس کا جدید نام دبرجہ میں
الی سے ماخوذ ہے (جیسے ایدن، ایدن الی سے)، جس کے
ترکی میں معنی دبرجہ کی سر زمین ہے، دبروچ (جیسے
کرلوتز سے کرٹفجہ) (قب susmanoselli، در نشری:

ابوظہبی یا کبھی نجد کے ماتحت سمجھے جاتے رہے۔
 ۱۳۳۵ھ / ۱۹۱۶ء میں عبداللہ الثانی نے شیخ قطر
 کی حیثیت سے حکومت برطانیہ کے ساتھ ایک معاہدہ
 کر لیا جس کی رو سے اس کی حیثیت قریب تر زمانے
 میں "ریاست زیر حمایت برطانیہ" جیسی قرار دی گئی
 پھر بھی اس کا تعلق برطانوی محکمہ خارجہ سے
 رہا، حالانکہ جو ریاستیں پورے طور پر برطانیہ کے
 زیر حمایت ہیں، جیسے جنوبی عرب کی ریاستیں، وہ
 محکمہ نو آبادیات کے زیر نگرانی میں ہیں۔ [مگر ان
 آبادیوں کی سیاست بھی معرض تفریق میں ہے اور ان
 جگہوں سے برطانوی اثر ختم ہوتا جاتا ہے]۔

مآخذ : (۱) ابن بشر: عنوان المجلد، قاہرہ ۱۳۳۳ھ؛
 (۲) محمد النبیانی : التحفة النبیانیة، قاہرہ ۱۳۵۲ھ؛ (۳)
 C.U. Alchison : A Collection of Treaties . . . ج ۱۱۱
 دہلی ۱۹۳۳ء : J. G. Lorimer (۴) Gazetteer of
 the Persian Gulf . . . کلکتہ ۱۹۰۸ء تا ۱۹۱۵ء۔

(R. L. HEADLEY)

دَوْدَالْفَرّ : رگ بہ حریر۔

دورباش : (ف)، گرز یا تبر جو فوجی اعزاز
 کے ایک نشان کے طور پر مستعمل تھا؛ فارسی اور ترکی
 زبان میں دورباش کا اطلاق اس (محافظ) پر بھی ہوتا ہے
 جو گرز اٹھانے ہوئے ہو (دیکھیے چاؤش، سرہنگ)۔
 نظام الملک نے سیاست نامہ باب ۲۹ میں چوہداروں کا
 ذکر کیا ہے، جن کے اعمال بھی کچھ اس سے ملتے جاتے تھے۔
 یہ چوہدار۔ رونے چاندی کے عصا اٹھانے ہوتے تھے؛ غوی:
 جامع الحکایات (جس کی عبارت M. Fuad Köprülü
 Bizans müesseselerin Osmanlı müesseselerine testiri
 Türk Hukuk ve İktisat hakkında bazı mülahazalar
 در Tarîhi Mecmuası، استانبول ۱۹۳۱ء، ص ۲۱۳؛
 اطالوی ترجمہ Alcune osservazioni، روما ۱۹۵۳ء،
 ص ۵۷ میں نقل کی ہے) میں دورباش کی کیفیت یوں
 بیان کی ہے کہ وہ چاندی کی پٹی باندھے جواہر

تا ۲۷۰ : (۱۷) Analele Dobrogei، انعامت در Constanta
 از ۱۹۲۰ء : (۱۸) A مقالہ Aurel Decei (Aurel Decei)؛
 (۱۹) نیز ملاحظہ ہوں تبہ دخی، دلی آرمان، گاکوز، سری
 سلقی (سرورملق)۔

(HALIL INALCIK)

ذوبیتی : رگ بہ رباعی۔

الدَّوْحَة : (دوہ) خلیج فارس کی ایک ریاست
 قطر کا دارالحکومت اور واحد عظیم شہر؛ ۲۵ درجے
 ۱۷ دقیقے عرض بلد شمال اور ۵۱ درجے ۳۲ دقیقے طول
 بلد شرقی پر جزیرہ نما، قطر کے مشرقی ساحل کی
 ایک خلیج (خلیج فارس - عربی میں "دوہ") کی لنگرگاہ
 کے جنوب مشرقی گوشے میں واقع ہے۔ یہ لنگرگاہ دو
 پتھریلے ساحلوں کے ملنے سے بنی ہے اور قدرتی طور پر
 پایاب ہے۔ پہلے اسی جگہ مچھیروں کا ایک گاؤں
 البدع تھا، وہ اب اس شہر کا ایک محلہ ہے۔

۱۲۳۸ھ / ۱۸۲۳ء سے پہلے الدوہ کے حالات
 تاریکی میں ہیں جب کہ خلیج فارس کا برطانوی قائم مقام
 Political Resident اس شہر میں آیا اور اس نے اطلاع دی
 کہ یہ بحرین (البحرین) کے تحت ایک علاقہ ہے تاہم
 اس رابطے کی نوعیت حالات کے ساتھ بدلتی رہی ہے۔
 تیرھویں صدی ہجری / آیسویں صدی عیسوی کے اوائل
 میں الدوہ بظاہر بحرین کے تحت تھا اور خود بحرین
 نجد کے آل سعود کو زکوٰۃ ادا کرتا تھا جسے برطانوی
 قائم مقام الدوہ سے وصول کرتا تھا کیونکہ بحرین
 ۱۲۳۵ھ / ۱۸۲۰ء میں، اور دوہ کی طرف سے محمد
 بن ثانی ۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۸ء میں برطانیہ کے ساتھ بحری
 صلح قائم رکھنے پر مجبور ہوا کر چکے تھے۔ جب
 ۱۲۸۸ھ / ۱۸۷۲ء میں ترکی فوج نے الدوہ پر قبضہ
 کر لیا اور اسے منجاق نجد کا حصہ قرار دے دیا
 تب بھی اس شہر نے اپنے روابط بحرین اور نجد کے
 آل سعود، نیز برطانیہ سے قائم رکھے۔ ترکوں کے
 انخلا تک قطر کے دوسرے حصے کبھی بحرین،

میں لیے ہوئے آواز دیتے جاتے تھے "راستے سے ہٹ جاؤ" ان چوہداروں کو ٹیورنیر Taverrier اور برنیئر Bernier سیاحوں نے "گرز بردار" کہا ہے۔

مآخذ : ان کتابوں کے علاوہ جو متن مقالہ میں دیے گئے ہیں (۱) Redhouse، مخطوطہ موزہ برطانیہ اور پینٹل ۱۷۹۵ء تا ۱۷۷۸ء (تفصیل مع چند اقتباسات) - عصا اور ڈنڈوں وغیرہ کے لیے دیکھیے "عنزہ"، "عصا"؛ قضیب، صونجان۔

[J. BURTON—PAGE]

دورق : پہلے یہ جنوب مغربی خوزستان کا ایک شہر تھا اور اسے دورق القوس (ایرانیوں کا دورق) اور کبھی کبھی المدینہ [شہر] بھی کہتے تھے، اصلی ایرانی نام ذراق تھا۔ قرون وسطیٰ میں دورق ایک ضلع کا صدر مقام تھا جسے کبھی تو اسی نام سے موسوم کرتے اور کبھی شرق کہتے تھے۔ دورق اسی نام کے ایک دریا کے کنارے واقع تھا جو دریائے جراحی کا معاون تھا۔ یہ ایک نہر کے ذریعے کارون [رگ بان] سے ملا ہوا تھا اور اپنی نیاہوں اور گندھک کے چشموں کے لیے مشہور تھا۔ کرمان اور فارس سے جو حاجی آتے تھے، وہ مکہ معظمہ کو جاتے اور آتے ہوئے دورق سے گزرتے تھے۔ ایک آشکدہ اور بعض شاندار عمارتیں جو ساسانی عہد کی تھیں، چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی تک اس شہر میں دکھائی دیتی رہیں۔ حدود العالم (۱۳۰) میں دورق کا ذکر ایک خوشنما، خوشحال اور دولت مند شہر کی حیثیت سے کیا گیا ہے۔ دسویں صدی ہجری/سولہویں صدی عیسوی کے اختتام پر بنی قسیم نے دورق اور نواحی علاقے پر قبضہ کر لیا، لیکن الہیں جوہرہ کے خاندان مشعشع کے سید مبارک نے نکال باہر کیا جو ۱۰۰۰ھ/۱۵۹۱-۱۵۹۲ء کے قریب عربستان (خوزستان) کا والی تھا۔ ۱۰۲۹ھ/۱۶۱۹-۱۶۲۰ء میں فارس کے بکر بیگی نے دورق اور اس کے ضلع کو فتح کر لیا (دیکھیے تاریخ

نگار گرز اٹھائے ہوتا تھا: Koprakli، موضع مذکور میں جواہر نگار گرزوں کے استعمال کے متعلق جو غزنویوں اور سامانیوں کے دور میں رائج تھا، کہتا ہے کہ یہ ساسانیوں کے دربار کا ورثہ تھا۔

مسلم ہندوستان میں دورباش زیادہ تر گرز کو کہتے تھے، گرز اٹھانے والے چوہدار کو نہیں۔ سب سے پہلے اس کا ذکر امیر خسرو کے "نہ سپہر" ج ۲، میں آیا ہے، جہاں مصنف نے ورنگل کے راجہ کے متعلق بیان کیا ہے کہ وہ اپنے دورباش کو جو اس نے پہلے سلطان سے لیا تھا، خسرو خان، قطب الدین مبارک شاہ کے سبہ سالار کے حوالے کر رہا ہے تاکہ وہ اس کے بدلے میں اسے سلطان وقت کا، جو تقریباً ۵۷۱۸ھ/۱۳۱۸ء میں حکومت کرتا تھا، دورباش عثابت کرے (دورباش کا ترجمہ History of India : Elliot and Dowson ج ۳ : ص ۵۶۱ میں شاہی چھتر "Canopy" کیا گیا ہے جو غلط ہے)؛ قب امیر خسرو : قرآن الممدین، طبع سنگی، علیگڑھ : ص ۷۸-۷۹۔ ضیاء الدین برنی نے تاریخ فیروز شاہی : Bib. Ind. : ص ۱۳۶ میں لکھا ہے کہ بادشاہوں کی سواری کے آگے آگے پیادے کندھوں پر دورباش رکھے ہوئے دوڑتے تھے۔ یحییٰ بن احمد سرہندی نے تاریخ مبارک شاہی میں اس دورباش کی بابت کہا ہے کہ وہ ایک مرصع دو شاخہ ڈنڈا ہوتا تھا (تَبَ غِیَاثُ اللَّغَاتِ، بہ ذیل مادہ: فرہنگ انجمن آراء ناصر، بہ ذیل مادہ)، اور مؤید الفضلاء نے اس کو نیزوں (نیزہا) سے تعبیر کیا ہے جنہیں اٹھائے ہوئے چوہدار قیصرہ اور ملوک کے آگے آگے جاتے تھے (مخطوطہ کتب خانہ ملا فیروز، بہ ذیل مادہ)۔ مغلوں کے عہد میں اس کے استعمال کی تصدیق یورپی سیاحوں نے کی ہے: Munucci نے Storia de Mogor، ج ۱ : ص ۲۲۰ میں لکھا ہے کہ شاہجہان کی دختر جہان آرا کی سواری کے ساتھ دورباش بھی ہوتا تھا، اس میں آگے آگے چوہدار سونے یا چاندی کا عصا ہاتھوں

کھاڑی ہے اور مشرق اور شمال مشرق میں دورفستان کی حد بندی کرتی ہے۔

مآخذ: مبنی میں دیے ہوئے حوالوں کے علاوہ: (۱) B.G.A. بمواضع کثیرہ: (۲) البلاذری: فتوح: ص ۳۸۲، ۱۵: (۳) باقوت: ۲: ۶۱۸، ۶۲۰: (۴) مرآۃ الاطلاع (مطبوعہ Juynboll): ۱: ۵۱۳، ۵: ۵۰۲، ۵۰۳: (۵) القزوینی: عجائب المخلوقات (وشرحها): ۱۹۱: (۶) J. Macdonald A geographical memoir of the Persian: Kinneir Empire: ص ۸۸ تا ۸۹: (۷) J. H. Stacquerel Fifteen months' pilgrimage through untrodden tracts of Khuzistan and Persia: Ritter: (۸) ۷۲: (۹) Erdkunde: ۱: ۱۵۸ تا ۱۶۰: (۱۰) Le Strange Persia and the Persian Question: G. N. Curzon: (۱۱) ۳۲۲ تا ۳۲۳: (۱۲) رزم آرا اور نوناش: فرهنگ جغرافیای ایران: ۶: ۲۲۸:

(L. LOCKHART)

دورنگی: (یا دورنگی)، اب دورنگی، جدید ترکیہ

میں ایک قصبہ ہے، جو آرمینیہ اور Cappadocia کی سرحدوں پر شام اور بالائی عراق سے اناطولیہ کے بلند مرتفع میدانی کو جانے والے ایک راستے پر واقع ہے۔ اس میں ایک ٹالا بہتا ہے، جو کرہ سو (شمالی دریاے فرات) کے ایک معاون چلتی ارمک میں جا گرتا ہے۔ سواس کے صوبے میں ایک "قضا" کا یہ صدر مقام ہے، اور سبزی ترکاری کے باڑوں اور پھلوں کے باغوں کے درمیان واقع ہے، جن کی وجہ سے یہ خوشگوار تفریح گاہ بن گیا ہے۔ قرون وسطیٰ میں اس کی خوشحالی کی شہادت صرف آثار قدیمہ سے ملتی ہے ورنہ آج کل اس کی حیثیت ایک پراگندہ گاؤں سے زیادہ نہیں، جس کا ایک حصہ ویران بھی ہو چکا ہے (۱۹۳۰ء کے قریب اس کے باشندے چار ہزار سے کم تھے)۔ یہ ایک زرخیز وادی کے زیریں حصے میں واقع ہے۔ قصبے کے پرانے محلے قلعے کے کھنڈروں کے ساتھ دائیں کنارے پر ایک دوسرے سے

عالم آرائے عباسی، ۶۷۵)۔ بعد ازاں، اس ضلع پر قبیلہ افشار [رگ بان] کی ایک شاخ نے قبضہ کر لیا، لیکن نادر شاہ [رگ بان] کے عہد حکومت میں کعب [رگ بان] کے شیخ سلمان نے انہیں نکال باہر کیا۔ شیخ سلمان نے دورق کے جنوب میں پانچ میل دور ایک نیا شہر تعمیر کرایا، جو فلاحیہ کے نام سے موسوم ہوا۔ بعد میں یہ کھنڈر بن گیا۔ فلاحیہ کو حوالہ اور دیگر دشمن قبائل سے بچانے کے لیے شیخ سلمان نے وہاں ایک مضبوط قلعہ تعمیر کرایا اور شہر کے گردا گرد کارے کی دیوار بنوائی جس کا گھیرا دو میل تھا۔ جب ایک صدی بعد لیٹرو Lazard فلاحیہ پہنچا تو یہ دیوار خستہ حالت میں تھی۔ اس کا یہ بیان تھا کہ متعدد نہروں اور آبی گزرگاہیں شہر کو گھیرے ہوئے ہیں، اگر ان کا مؤثر دفاع کیا جائے تو وہ حملے کے لیے بہت بڑی رکاوٹ ثابت ہو سکتی ہیں (۱) Description of the province of Khuzistan، در JRGs، ۱۸۸۶ء، ۱۶، ۳۹، نیز دیکھیے اس کی تصنیف لنڈن ۱۸۸۷ء، ۲، ۵۷)۔

۱۹۳۳ء۔ فلاحیہ کا نام بدل کر شادگان ہو گیا۔ یہ اسی نام کے ایک ذیلی ضلع (بخش) کا صدر مقام ہے جو خرم شہر (سابق محمرہ) کے شہرستان کا ایک حصہ ہے۔ کھجور کے درختوں کے جھنڈ اور دھان کے کھیت شہر کو محیط ہیں، ان کی آبیاری نہروں کے ذریعے ہوتی ہے۔ کھیتوں میں گیہوں کی کاشت ہوتی ہے۔ شہر میں تقریباً چار سو مکان، ایک سو بیس دکانیں، دو مسجدیں اور دو مدرسے ہیں: آبادی بشمول نواحی ضلع بیس ہزار کے قریب ہے۔ شادگان اور خلیج فارس کے ساحل کے درمیانی دلدلی علاقے کو ابھی تک دورفستان کہتے ہیں۔ یہ نام "خور دورق" میں بھی موجود ہے جو "خو موسیٰ" کا شمالی بازو ہے۔ یہ خلیج فارس کی ایک بڑی سی تنگ

ملحق ہیں۔

- مآخذ : (۱) ابن رستہ، ص ۹۳ : (۲) السمودی :
 مروج : ۸ : ۷۸ : (۳) التنبیہ، ص ۱۵۱، ۱۸۳ : المقدسی :
 Livre de la création، طبع و ترجمہ از Cl. Huart،
 ۵۸ : ۵۸ : (۵) الہروی : کتاب الفیارت، طبع و ترجمہ
 از J. Sourdel-Thomine، دمشق ۱۹۵۳ و ۱۹۵۷،
 ص ۵۹ تا ۶۰ (ترجمہ : ص ۱۳۳ تا ۱۳۵) : (۶)
 باقوت، ۱ : ۸۷ تا ۸۸ : (۷) ابن بیاض، طبع ہوتسما
 «Houtsma» : ۳ : ۳۱۸، ۳۱۰ : (۸) حمد اللہ المستوفی :
 نزہۃ، ص ۹۹ : (۹) حاجی خلیفہ : جہان نما، ص
 ۶۲۸ : (۱۰) اولیا جلیلی : سیاحت نامہ : ۳ : ۲۱۰
 تا ۲۱۳ : (۱۱) لسترینج Le Strange، ص ۱۱۹ :
 La Syrie à : M. Gaudelroy Demombynes (۱۲)
 l'époque des Mamelouks، پیرس ۱۹۲۳، ص ۹۸ :
 La poste aux chevaux dans : J. Sauvaget (۱۳)
 l'empire des Mamelouks، پیرس ۱۹۳۱، ص ۵۶ : (۱۴)
 Turquie d'Asie : Cuinet، ۱ : ۶۸۵ : کتبوں اور
 بادکاروں کے لیے دیکھیے : (۱۵) M. Van Berchem و
 CIA, Asie mineure : H. Edhem : ۱ : ۵۵ تا ۱۱۰ :
 (۱۶) Momuments turcs d'Anatolie : A. Gabriel،
 پیرس ۱۹۳۸، ۲ : ۱۶۹ تا ۱۸۹، ولوحہ ۶۲ تا ۷۹ :
 (۱۷) Décrets mamlouks de Syrie : J. Sauvaget، در
 BEO، ۱۲ : (۱۹۳۷-۱۹۳۸) : ۵۲ تا ۵۵ (۱۹۹۱)
 ۱۵۸۹-۱۶۸۷ کا فرمان : (۱۸) الوقت بتدیل مادہ (مقالہ از
 Besim Dorkot)۔

(J. SOURDEL-THOMINE)

* دوزخ : رک بہ جہنم۔

* دوزمہ مصطفیٰ : رک بہ مصطفیٰ دوزیہ۔

* دوس : رک بہ ازد۔

* دوست محمد : افغانستان میں بارک زئی

حکومت کا حقیقی بانی اور پایندہ خان کا، جو تیمور شاہ

کے عہد میں بارک زئی قبیلے کا سردار تھا، یسوان

فرزند۔ جب زمان شاہ کی حکومت میں پایندہ خان
 کو قتل کر دیا گیا تو دوست محمد کی پرورش اس کی
 قزلباش والدہ کے رشتے داروں نے کی، یہاں تک کہ وہ اپنے
 سب سے بڑے بھائی فتح خان کی حفاظت میں آیا، جو
 محمود شاہ کے عہد میں بڑا اثر و رسوخ رکھتا تھا۔
 محمود کی دوسری بار حکومت کے زمانے میں دوست محمد
 ممتاز عہدوں پر فائز رہا، جن میں کوہستان کی گورنری
 بھی شامل تھی، اس نے کشمیر اور ہرات کی بغاوت
 کو فرو کرنے کے لیے کامیابی کے ساتھ فوج کشی کی
 (۱۸۱۹ء)۔ ہرات کی مہم کے بعد دوست محمد پر اس
 کا عتاب نازل ہوا تو وہ کشمیر بھاگ گیا۔ اب با تو
 دوست محمد کی اس حرکت کا بدلہ لینے کے لیے یا
 خود فتح خان کی طاقت پر حسد کرتے ہوئے محمود شاہ
 اور اس کے فرزند کامران نے فتح خان کی آنکھیں
 نکالوا ڈالیں اور پھر اسے قتل کر دیا۔ دوست محمد
 نے کشمیر میں فوج اکٹھی کر کے کابل پر قبضہ
 کر لیا اور شاہزادہ سلطان علی کو برائے نام وہاں
 کا حکمران بنا دیا۔ محمود نے اسے برے دخل کرنے
 کی کوشش کی، مگر دوست محمد نے اسے کامیاب
 نہ ہونے دیا، تاہم اسے مجبور کیا گیا کہ وہ
 کابل اپنے سب سے بڑے بھائی محمد اعظم خان کے
 سپرد کر دے، جو کشمیر کا والی (گورنر) رہ چکا
 تھا۔ اس نے کابل بھائی کو دے دیا اور غزنہ کی
 حکومت خود سنبھال لی، لیکن دل میں یہ امنگ
 تھی کہ کابل کی حکومت بھی ہاتھ آئے۔ جب
 ۱۲۳۸-۱۲۳۹ / ۱۸۲۳ء میں اعظم چل بسا تو
 دوست محمد نے اس کے بیٹے اور وارث تخت حبیب اللہ
 خان کو شکست دی، لیکن اب بھی کابل اس کے ایک اور
 بھائی سلطان محمد خان پشوری ہی کو ملا گو کابل
 کے قزلباشوں کی تائید دوست محمد خان کو حاصل
 رہی۔ آخر کار سلطان محمد نے وہاں جمع رہنے کی
 کوشش ترک کر دی اور ۱۲۳۱-۱۲۳۲ / ۱۸۲۶ء میں

وہی آئندہ، جو اس سے پہلے قبائلی سرداروں کے ہاتھ آتی تھی، صرف کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اس نے غزنویوں کی طاقت کو ختم کر دیا اور بعض ممتاز قبائلی سرداروں کو قتل، بعض کو قید اور بعض کو جلا وطن کر دیا، مزید برآں اس نے فزلیاش اور سنی عناصر کو، جنہوں نے کابل کی حکومت کو اس سے پہلے بہت کمزور کر دیا تھا، اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا۔ اس کے نظام حکومت کا کمزور پہلو یہ تھا کہ اس کا تمام تر انحصار اپنے بیٹوں کے تعاون پر تھا، جنہیں اس نے اہم علاقوں میں والی (گورنر) مقرر کر رکھا تھا۔ یہ تعاون اس کی وفات کے بعد قائم نہ رہ سکا۔ بہر حال اس نے افغانستان جدید کی جغرافیائی حدود کو مضبوطی کے ساتھ قائم کیا اور داخلی استحکام کی بنیاد ڈالی۔ حقیقت یہ ہے کہ ”مؤسس افغانستان“ کہلانے کا وہ سب سے زیادہ حقدار ہے۔

دوست محمد نے ۱۲۷۹ھ/۹ جون ۱۸۶۳ء میں وفات پائی۔ اس کے کئی بیٹے تھے، جن میں زیادہ اہم یہ تھے: محمد افضل خان، محمد اعظم خان اور ولی محمد خان (یہ سب اس کی ہنگش زوجہ کے بطن سے تھے، جو کرم کی رہنے والی تھی)، محمد اکبر خان (م ۱۸۳۸ء؛ وزیر ۱۸۳۳ء تا ۱۸۳۸ء؛ ۱۸۳۱ء تا ۱۸۳۲ء کے ہنگاموں میں سب سے نمایاں شخصیت)، شمس علی خان (جو آئندہ امیر ہوا)، محمد امین خان اور محمد شریف خان (یہ سب اس کی پوپلزنی زوجہ کے بطن سے تھے)۔ یہ امر قابل توجہ ہے کہ اپنے جانشین مقرر کرتے وقت دوست محمد نے اپنے بڑے بیٹوں کو نظر انداز کر کے علی الترتیب اکبر، غلام حیدر، اور شیر علی کو نامزد کیا اور یہ اس کی اس بیوی کے بطن سے تھے جس نے نسبتاً زیادہ عالی مرتبہ خاندان میں جنم لیا تھا۔

مآخذ: رکا بہ؛ افغانستان؛ نیز (۱) C. M.

Macgregor (طبع)؛ Central Asia, ii, Afghanistan

ککتہ ۱۸۷۱ء (۲) محمد الدین؛ Dost Muhammad and

دوست محمد خان وہاں کا فرمانروا بن گیا؛ ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۳ء میں اس نے امیر کا لقب اختیار کیا۔ جب دوست محمد کے قدم کابل میں جم گئے تو اس نے افغانستان کے دوسرے علاقوں پر اپنی حکومت بھیلانے کی کوشش شروع کی اور وہاں کے حاکموں کی جگہ اپنے بیٹوں کو حاکم مقرر کیا۔ ۱۲۵۱ھ/۱۸۳۵ء میں وہ پشاور کو سکھوں سے واپس نہ لے سکا۔ ۱۲۶۵ھ/۱۸۴۸-۱۸۴۹ء میں سکھوں نے اس احسان کے عوض کہ اس نے انگریزوں اور سکھوں کی لڑائی میں سکھوں کی مدد کی تھی، پشاور اسے دے دیا، لیکن وہ اسے اپنے قبضے میں نہ رکھ سکا۔ باقی دوسرے مقامات پر اس نے نمایاں کامیابی حاصل کی۔ ۱۲۵۵ھ/۱۸۳۹ء میں شاہ شجاع اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی انگریزی فوجوں نے اسے کابل سے نکال دیا۔ اس سے پہلے وہ جلال آباد اور غزنہ اور ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۸-۱۸۳۹ء میں کندز کے مراد بیگ کو شکست دے کر اپنی حکومت ہندوکش کے شمالی علاقوں تک پھیلا چکا تھا اور حدود سلطنت میں کوپستان گذار اور ہزارہ قبائلی کے علاقے میں اپنا اقتدار مستحکم کر لیا تھا۔ ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۳ء میں دوبارہ حکومت حاصل کرنے کے بعد اس نے اپنا وہی سیاسی مسلک جاری رکھا اور شمال میں اپنا اقتدار بلخ اور خلم (۱۲۶۹-۱۲۶۷ھ/۱۸۵۰ء)، شہر غان (۱۲۷۱ھ/۱۸۵۴ء)، مہمند اور آندخونی (۱۲۷۱ھ/۱۸۵۵ء) اور کندز (۱۲۷۶ھ/۱۸۵۹ء) تک بڑھا لیا، اگرچہ اس کے اقتدار پر لوگ مسترض تھے۔ مغرب کی طرف اس نے قندھار (۱۲۷۲ھ/۱۸۵۵ء) اور غرات (۱۲۷۹ھ/۱۸۶۳ء) لے لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے قبائل کے سرداروں کی قوت گھٹا کر اپنی طاقت بڑھائی۔ بالخصوص اس طرح کہ اس نے جاگیرداروں کی فوجی طاقت کے بجائے، جس پر درانی بادشاہت کی بنیاد قائم تھی، ایک باقاعدہ فوج منظم کرنی شروع کی۔ اس فوج کے قیام اور اخراجات کے لیے

دیکھئے 'The inner life of syria, etc.' Lady I. Burton باب ۱، محمد بن عبد الوہاب، م ۱۲۷۴ھ/۱۸۵۷ء در Voyage au ouaday، ترجمہ از A. Perron، ص ۷۰۔ دوسرے طریقوں میں شیخ کے پاؤں یا بعض اُن زمین کی خاک، جس پر سے شیخ گزرا ہو، بدن پر ملنے سے "برکت" حاصل ہوتی تھی۔ سعیدہ طریقے میں گھوڑے کا استعمال بانی طریقہ کے بلندی مرتبہ سے منسوب کیا جاتا تھا، جو پیغمبر کی اولاد میں سے تھے۔ مصر میں دوسہ کی ابتدا اٹھک معاوم نہیں۔ مشہور روایت یہ ہے کہ جب سعدالدین الجبراوی، بانی طریقہ سعیدہ، کے فرزند شیخ یونس مصر میں آئے تو ان کے مریدوں نے درخواست کی کہ وہ ان کے لیے کوئی ایسا طریقہ جاری کریں جو اپنی کرامت کی وجہ سے ان کے مرتبہ ولایت کا ثبوت ہو۔ اس پر انہوں نے کہا کہ میرے راستے میں شیشے کے گول چکنے برتن پھیلا دو پھر وہ گھوڑے پر سوار ہو کر ان برتنوں پر سے گزر گئے اور اُن میں سے ایک برتن بھی نہ ٹوٹا یہ بات ان کے جانشینوں سے نہ ہو سکی، اس لیے شیشے کے برتنوں کے بجائے آدھوں کو اونڈھا لٹایا جانے لگا (Goldziher) در ZDMG، ۱۸۸۲ء، ص ۶۳۷ بعد: محمد رشید رضا: تاریخ... محمد عبدہ، ۲: ۱۳۷ بعد و بار دوم، ۲: ۱۳۹ بعد۔ شیخ یونس کی بابت بعض لوگوں نے کہا ہے کہ وہ باب النصر کے باہر مدفون ہیں (Goldziher) کتاب مذکور: خطط جدیدہ، ۲: ۷۲ سعدالدین کو عام طور پر ساتویں صدی ہجری/تیرھویں صدی عیسوی کا بزرگ بتایا گیا ہے، لیکن یہ تاریخ غیر یقینی ہے اور غالباً ان کو کسی حد تک شیخ یونس الشیبانی کے ساتھ، جو ایک "مجنون" اور یونسی طریقے کے بانی تھے، متبیس کر دیا گیا ہے (المقیزی: خطط، بولاق، ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۴ء، ۲: ۳۵) دوسہ کی رسم کو مصر کے مفتی اعظم کے فتویٰ دینے کے بعد کہ یہ "بدعت قبیحہ" ہے اور

J. Pak. Hist. Soc. در the second Sikh war (اکتوبر ۱۹۵۴ء) ص ۲۸۰ تا ۲۸۶: D.M. Chopra (۳) Proc. I.H.R.C. در Dost Muhammad in India (۱۹۶۳ء) ص ۸۱ تا ۸۶: Lord Elgin I: B. Saigal (۴) J. I. H. در and Afghanistan Disturbances in: M. E. Yapp (۵) ص ۶۱ تا ۸۱: Eastern Afghanistan 1839-42 (BSOAS) در ۱۵/۲: H. B. Lunsdon (۶) ۵۲۳ تا ۵۹۹: Mission to Kandahar (۱۸۶۰ء) (M. E. YAPP)

دوسہ: (دوسہ)، لفظی معنی روندنا، ایک رسم، جو پہلے قاہرہ میں صوفیوں کے طریقہ سعیدہ کے شیخ ادا کیا کرتے تھے۔ یہ رسم قاہرہ کے ایک مشہور ولی اللہ کے سلطان حنفی مولد یا محافل میلاد کے موقع پر دن کے وقت ادا کی جاتی تھی، ایک ایسی ہی رسم شیخ البکری، جو مصر کے طریقوں کے امام تھے الدشوطی کے مولد کے موقع پر رات کے وقت ادا کرتے تھے۔ اس رسم کو لن Lane نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے (کتاب مذکور، جس کے ساتھ قلمی تصویر دی ہے، ایک اور بیان میں C. Rudolf Huber کے ہاتھ کی تصویر ہے جس نے اس رسم کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، در Aegypten: G. Ebers، شٹٹ گارٹ و لائپزگ ۱۸۷۹-۱۸۸۰ء، ۲: ۱۲۹ بعد)۔ مختصر طور پر اس رسم کی کیفیت یہ ہے کہ طریقہ مذکور کے تین سو مرید زمین پر اونڈھے منہ لیٹ جاتے تھے اور شیخ گھوڑے پر سوار ہو کر ان کے اوپر سے گزرنا تھا۔ لوگوں کے عقیدے میں طریقے کی خاص کرامت [رک باں] یہ تھی کہ اس سے کسی کو کبھی کوئی بدی نقصان نہیں پہنچا اور ادھر اس جسمانی رابطے کے ذریعے شیخ کی برکت ("نسبت") اُن کے مریدوں میں ہر ایک کو پہنچ جاتی تھی۔ یہی رسم اور مقامات پر بھی ادا کی جاتی تھی بارزہ، نواح دمشق، کے لیے

العین مشرق کی جانب سے اور وادی عمد مغرب کی جانب سے اسی ندی میں گرتی ہیں۔ وادی الکسر (الہمدانی نے کسر فاقش لکھا ہے) ندی کے سب سے آخری حصے کا نام رکھا گیا ہے، جہاں عمدہ دوعن اور العین تینوں کے دھارے مل کر بہتے ہیں۔ حورہ اور المعجلانیہ کے قصبے اس کے دائیں کنارے پر ہیں۔ المکلا سے اندرونی علاقے کو موٹر کی ایک سڑک جاتی ہے، جو اس علاقے کی سب سے بلند چوٹی کور سیان سے گزرتی ہے اور پھر مولا سطر کی مقدس چوٹی سے گزرتی ہوئی دوعن کے بالائی حصے تک پہنچتی ہے۔

اس وادی میں سیانیوں کے عہد کے آثار دریافت ہوئے ہیں اور الشہد کے جنوب میں غیبوں کے کھنڈر نثار آتے ہیں۔

دوعن کے بہت سے باشندے وطن چھوڑ کر عدن، مشرق افریقہ اور جاوا چلے گئے ہیں، مگر دولت مند تارکین وطن نے جذباتی وجوہ کی بنا پر وطن میں اپنے مکانات اور باغات برقرار رکھے ہیں۔ علاقے سے صرف شہد کی برآمد ہوتی ہے۔

مآخذ : (۱) الہمدانی : (۲) محمد بن ہاشم : تاریخ الدولة الکبریٰ، ۱، قاہرہ ۱۳۶۷ء : (۳) صلاح البکری : تاریخ حضرموت السیاسی، قاہرہ ۱۳۵۵-۱۳۵۶ء : (۴) مصنف مذکور : فی جنوب الجزيرة العربیہ، قاہرہ ۱۳۶۸ء : (۵) M. de Goeje در H. Von Wissmann (۶) ۱۸۸۶ء : Rev. Colon. Internat Wiesbaden : Beitrage zur hist. Geog. : M. Höfner و ۱۹۵۳ء : (۷) L. Hirsch : Reisen : لائن ۱۸۹۷ء : (۸) H. Von Wissmann و D. Van der Meulen : Hadramaut : لائن ۱۹۳۲ء : (۹) W. Ingrams : A Report on ... Hadramaut : لائن ۱۹۳۷ء : (۱۰) مصنف مذکور : Arabia and the Isles، پارڈوم، لائن ۱۹۵۲ء : (۱۱) یاقوت : معجم البلدان، بذیل مادہ۔

(G. RENTZ)

اس میں مسلمانوں سے تحقیر کا برتاؤ ہونا ہے : ۱۸۸۱ء میں خدیو محمد توفیق نے بند کرا دیا۔ اس کے بعد کچھ زمانے تک مذکورہ بالا محافل میلاد کے بعد صبح کو سعدیہ طریقے کے بیرو اپنے شیخ کے دروازے کے آگے لیٹ جاتے تھے کہ وہ ان پر پاؤں رکھ کر گزرے Les confréries Musulmanes du : A. Le Chatelier (Hedjaz ص ۲۲۵)، مگر پھر اس کی بھی ممانعت کر دی گئی۔ مآخذ : جو حوالہ جات متن مقالہ میں دیے جا چکے ہیں ان کے علاوہ : (۱) علی باشا مبارک : الخطط الجدیدہ، ۱۱۲ : (۲) O. Depont و Les X. Coppolani : Confréries religieuses musulmanes ص ۲۲۹ بعد (D. B. MACDONALD)

دوعن : (بعض دفعہ دوعن)، وادی (-ندی) حضر موت کے جنوبی معاونوں میں سے سب سے بڑا معاون۔ یہ (سطح مرتفع) الجول میں ایک گہری تنگ درز ہے، جو تقریباً سیدھی شمال کی جانب ۱۰۰ کیلومیٹر تک جا کر قریہ ہین کے مقابل بڑی ندی میں جا گرتی ہے۔ دوعن کے سلاسی دار کنارے تقریباً ۳۰۰ میٹر بلند ہیں۔ اس کے کناروں کی بستیاں زہریں ڈھلانوں پر آباد ہیں اور ان کے نخلستان اس ندی کے پٹے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ وادی دوعن دو شاخوں، الایمن (جسے لین کہتے ہیں) اور الایسر (جسے لیسر بولتے ہیں) کے اتصال سے بنی ہے، جن میں سے الایمن بسا اوقات اصلی دوعن ہی کا ایک حصہ سمجھا جاتا ہے۔ الایمن کی گنجان آبادیوں میں الرباط، الخربہ، الرشید اور المصنعہ شامل ہیں۔ ٹھیک اس جگہ کے نیچے جہاں الایمن اور الایسر باہم ملتی ہیں، قصبہ صیف واقع ہے، جس کے بعد قیدون اور الحجرین آتے ہیں۔ آخر الذکر کے نام پر کبھی کبھی وادی کے زہریں حصے موسوم کیے جاتے ہیں۔ الحجرین کے شمال میں ایک نسبتاً جدید درگاہ موسومہ الشہد واقع ہے، جس میں السید علی بن حسن العطاس کی قبر ہے۔ وادی

* دوغانچی : رگ بہ طوغانچی .

* دوغر : اوغوز قوم کے ایک قبیلے کا نام۔ ان کا ذکر اوغوز نامہ میں ملتا ہے (شرف بہ اسلام ہونے سے پہلے اوغوز قوم کے حالات زندگی کے لیے دیکھیے *Oguzlar, a ait destani mahiyette eserler* : F. Sümer در *xvii (Auk. Ün. DTCFD)* تا ۴۷)، جہاں یہ لکھا ہے کہ اوغوز حکمرانوں کے بعض اہم بیگ (= سردار اس قبیلے سے تعلق رکھتے تھے، بقول شاہی مؤرخ شمس الدین محمد انجری (۵۶۵۸/۱۲۶۰ء تا ۵۷۳۹/۱۲۳۸ء) اراقی خاندان جو ماردین و دیاربکر کے علاقے پر حکومت کرتا تھا، دوغر قبیلے سے تعلق رکھتا تھا (F. Sümer) کتاب مذکور، ص ۵، عدد ۱۷۱) اس لیے یقیناً اس نے ساجوقیوں کی فتوحات میں حصہ لیا ہوگا، انھوں نے ۱۱ویں صدی ہجری (بہ تصحیح) جو دھویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں دوغر کی ایک اہم شاخ ارغہ (ادیسہ) کے جنوب میں اور جہیز کے گرد و نواح میں مقیم تھی (۵۷۷۳/۱۳۷۱ء تا ۵۸۷۳/۱۳۷۱ء) میں ان کا سردار سالم نامی ایک شخص تھا۔

سالم کے خاندان سے قطع نظر، دوغر کے دیگر بیگوں! بار علی، محمد اور کئی کو ہم شام میں حلب کے ترکمانوں کے درمیان دوغر خیلوں کے سرداروں کی حیثیت میں دیکھتے ہیں: کئی، ۵۸۵۷/۱۱۵۳ء میں معاویہ کی طرف سے ہجیرے کا "نائب" تھا۔ سلطان اول کے زمانے میں شام کے دوغر حلب، "خما اور دمشق کے علاقوں میں تین خیلوں میں تقسیم تھے۔ "قبو" یعنی سرکاری دفاتر سے ظاہر ہوتا ہے کہ دروشلم میں ان کے دو چھوٹے گروہ باب العاصود اور بنو زند کے خیلوں میں رہتے تھے (قب Lewis B در *BSOAS*، ۱۹۵۴، xiv/3 : ۷۹)۔ دیگر خیل دیاربکر کے گرد و نواح میں بنو اٹوس (آق قوونلو قبیلے کا ایک بچا ہوا قبیلہ) کے درمیان کرکوک کے مقام پر، نیز ایران کے ترکی قبائل میں بھی پائے جاتے تھے۔ ۱۲ویں صدی ہجری/

۱۲ویں صدی عیسوی میں، دوغر کا نام متعدد مقامات کے ناموں میں ملتا تھا، جن میں سے بہت کم باقی بچے ہیں۔ مآخذ : (۱) *F. Sümer* : *Döğlerle dair* در *Turkiyat Mecmuası*، ج ۱۰، ۱۹۵۲ء، ص ۱۳۹ تا ۱۵۸ : (۲) *Cl. Cahen* : *Contribution à l'histoire du*، ج ۱، ۱۹۵۵ء، ص ۸۱ : (۳) ابوبکر، طبرانی : کتاب دیار بکر، طبع N. Lugal اور F. Sümer، انقرہ (TTK) ۱۹۶۷ء، ص ۵۳، عدد ۵ تا ۱۷، ص ۱۲۳، عدد ۱۔

(F. SUMER)

* دوغلات : بعض اوقات دوغللات، ایک منگول

قبیلہ جس کا نام ابوالغازی (طبع Desmaisons)، سینٹ ایٹیز برگ (۱۵۷۱ء، ۱ : ۶۵) کے بیان کے مطابق منگول لفظ دوغولونگ (-لنگ)، بمعنی "لنگڑا" سے مشتق ہے یوں معلوم ہوتا ہے کہ منگول سلطنت کے ابتدائی دور میں اس قبیلے نے کوئی کارنامہ سر انجام نہیں دیا گو خیال کیا جاتا ہے کہ یہ قبیلہ ہمیشہ جنگیز خان کی حمایت کرتا رہا (زینید الدین، طبع Berezon، در *Trudi vost old Imp Russk Arkheol obshchestva*، ۲۷۵ : ۱۳ : ۱۳۷ : ۱۵۲، ترجمہ L. A. Khetagurov، ماسکو۔ لینن گراڈ ۱۹۵۲ء، ۱/۱ : ۱۹۳) اس وقت یہ قبیلہ سارے کا سارا منگولیا سے نقل مکان کر گیا، کم از کم اس وقت وہاں اس نام کا کوئی قبیلہ نہیں۔

ایلاخان سلطنت [رگ بہ ایلاخالیہ] کا شیرازہ بکھر جانے تک دوغلات کو کوئی سیاسی اہمیت حاصل نہیں ہوئی، البتہ اس زمانے سے اسی قبیلے کے ایک فرد محمد حیدر دوغلات (حیدر میرزا [رگ بان]) نے اپنی تصنیف تاریخ رشیدی (طبع N. Elias و F. Denison Ross، لندن ۱۸۹۵ء میں اُن سے متعلق معلومات فراہم کی ہیں لیکن اس کی یہ معلومات ہمیشہ قابل اعتماد نہیں ہوتیں، اور بعض جگہ تو جہاں اس قبیلے کا ذکر

(۶۵) : تیمور کی ایک بیٹی خاندان دوغلات کے ایک فرد سے بیاہی ہوئی تھی۔
 ۱۳۹۲ء کے بعد قمر الدین کا بھتیجا (۹) خدایداد بظاہر مغولستان کا مدارالہمام لیکن فی الحقیقت وہاں کا فراروا تھا۔ اس نے آل چنگیز (رگ بہ چنگیز) کے جن خوانین کو تخت پر بٹھایا، ان کی حقیقت، بعض کٹھ پتلی کی تھی۔ خدایداد نے آل تیمور (رگ بہ تیمور) کے ساتھ مفاہمت کرنے پر اپنی آبادگی کا اظہار اسی امر کے پیش نظر کیا کہ دونوں دین اسلام کے پیرو ہیں اور ۸۲۸/۱۴۲۵ء میں الخ بیگ (رگ بہ) سے سمرجی میں ملاقات کی (عبدالرزاق سمرقندی : مطلع سعدین، مطبوعہ لندن گراڈ، عدد ۱۵۷، ورق ۲۳۰)۔ اس معاہدے کی رو سے خوانین مغولستان کو خدایداد کے بھائیوں اور فرزندوں میں اپنے علاقے کی تقسیم منظور کرنا پڑی (تاریخ رشیدی، ص ۱۰۰)۔ اس کے بڑے لڑکے محمد شاہ (نواح ۱۴۱۸ تا ۱۴۳۹ء) کو خان وٹس کی طرف سے قبیلے کا سردار (الوس بیگی) مقرر کیا گیا۔ اس نے سمرجی میں سکونت اختیار کر لی (تاریخ رشیدی، ص ۷۸)، تیموریوں نے اس کے چھوٹے بیٹے کو طاس طارم کے مغربی علاقے سے باہر نکال دیا (۱۴۱۶ء؟ سمرقندی، در Notices et extraits، ۱/۱۶)۔
 (۲۹۶) اور وہ اپنے والد کی وفات سے پہلے ہی مر گیا۔ اس کے بیٹے سید علی نے بالآخر کاشغر پر دوبارہ قبضہ کر لیا اور چوبیس سال تک وہاں حکومت کرتا رہا۔ اس نے جیسا کہ کاشغر میں اس کے مزار سے پتا چلتا ہے (۸۶۶/۱۴۵۷-۱۴۵۸ء مطابق) میں وفات پائی دیکھیے (تاریخ رشیدی، ص ۸۷ و ۹۹)۔ اس کے جانشین اس کے دو بیٹے سائز میرزا (۸۶۹/۱۴۶۳-۱۴۶۵ء) اور محمد حیدر (۸۸۵/۱۴۸۰-۱۴۸۸ء) ہوئے، ان دونوں نے اس علاقے کی ترقی کے لیے بڑی خدمات انجام دیں، پھر سائز کے بیٹے ابونکر میرزا نے اپنے چچا حاکم خان یونس حاکم مغولستان کو مغربی طاس طارم سے نکال

دوسرے ماخذ میں بھی ملتا ہے، وہ ان کی تردید کرتا ہے۔ دوغلات حیدر کے بیان کے مطابق اس قبیلے کے ایک رکن تولک باغالباس کے چھوٹے بھائی تولاجی (ابوالغازی کے مطبوعہ نسخے میں ورق ۵۶ پر بولادجی چھپا ہے لیکن یہ شکل مخطوطات میں نظر نہیں آتی) کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ اس نے طاس طارم (Tarim Basin) میں آق سو کے مقام پر ۷۸۷ھ/مطابق ۱۳۸۷-۱۳۸۸ء میں خان بغلق تیمور کو تخت نشین کیا تھا؛ پھر یہ وہی قیاس کیا جاتا ہے کہ مؤخر الذکر نے اس کے بدلے میں "نو اختیارات" دے کر دوغلات کی احسان مندی کا حق ادا کیا، اس طرح طاس طارم کے علاقے میں ان کا تسلط قائم ہو گیا تھا۔ حیدر دوغلات کا دعویٰ ہے کہ اس نے چین میں یہ دستاویز منگولی زبان اور منگولی رسم الخط میں دیکھی تھی، لیکن اس کا کہنا ہے کہ دستاویز شبانی خان (م ۹۱۶ھ/۱۵۱۰ء) [رگ بہ] کے زمانے میں تلف ہو گئی (تاریخ رشیدی، ص ۵۵ بعد ۲۰۵)۔ بہر حال مؤرخ مذکور نے واقعہ نگاری میں تاریخوں سے متعلق جو غلط بینیاں کی ہیں، ان سے اس دستاویز کی اصلیت کے بارے میں سنگین شکوک پیدا ہو جاتے ہیں، ۷۶۹ھ/۱۳۶۸ء اور ۷۹۳ھ/۱۳۹۲ء (۹) کے مابین مغولستان (مشرق ایشیا) کا اندرونی علاقہ جو قریب قریب سمرجی سے شروع ہوتا تھا، ان دنوں اسی نام سے موسوم تھا) میں قمر الدین دوغلات پر سر اقتدار تھا (شرف الدین یزدی : ظفر نامہ طبع Bibl Ind، کلکتہ ۱۸۸۷-۱۸۸۸ء، ۱ : ۷۸ بعد) جو تاریخ رشیدی کے بیان کے مطابق تولاجی کا بھائی تھا۔ شروع شروع میں وہ ایک عرصے تک تیمور (رگ بہ) کے ساتھ تعاون کرتا رہا لیکن پھر ایک طویل کشمکش کے بعد تیمور نے اسے اورقش کے آس پار التائی کے علاقے میں بھاگ جانے پر مجبور کر دیا (یزدی، ۱ : ۳۹۳ بعد) اس کے دو بھائی تیمور کی ملازمت میں رہے (یزدی، ۱ : ۱۰۵ بعد

موسوم تھا! جو تین طور پر دوغلات سے مشق ہے،
اٹیسوئس صدی کے خاتمے پر یہ "آردو" تقریباً چالیس ہزار
خیموں پر مشتمل تھا (دیکھئے Zametki : N. Aristov
ob etniceskom sostave Tyurkskikh plemén i narod.
snostoy : سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۹۷ء ص ۷۷)۔

مآخذ : (حوالے اوپر دیے جا چکے ہیں۔ مطالعے
میں حسب ذیل کو بھی شامل کر لیا جائے) (۱) W. Barthold
Zwölf Vorlesungen über die Geschichte : thold
der Türken Mittelasiens : ارتن ۱۹۳۵ء ص ۲۰۹ تا
۲۱۴ (فرانسیسی ترجمہ برس ۱۹۳۵ء) (۲) وہی مصنف :
'Four studies on the history of Central Asia
ترجمہ V. Minorsky (۱۹۵۸ء) : ۱ : ص ۵۸ (۳)
R. Grousset : L'Empire des steppes : برس ۱۹۳۹ء
Očerki po istorii : P. P. Ivanov (۴) بسند اشاریہ :
Sredney Azii (تاریخ وسطی ایشیا کا خاکہ)، ماسکو
۱۹۵۸ء ج ۱ و ۲ : (۵) B. Spuler : Handbuch der
Orientalistik : ۵ : ۵ بسند اشاریہ۔ مؤرخ الذکر دو مآخذ
میں مفصل مآخذ دیے ہوئے ہیں۔

(W. BARTHOLD : [B. SPULER])

* **دولاب :** رگ بہ ناعورہ۔

* **دولت :** رگ بہ الدولۃ مالیات سمیت المال۔

* **الدولۃ :** (ع) [دول مادے سے، اس کے متعدد

معنی ہیں : (۱) یہ لفظ کسی حکمران کے خاندان یا
اس کے عرصہ حکومت و اقتدار کے لیے استعمال ہوتا ہے؛
(۲) بطور لقب یا خطاب کے (۳) اقتصادی مقہوم میں۔
ان سب کے بارے میں تصریحات درج ذیل ہیں : (۱)
دول کے اساسی معنی عربی میں صاف طور پر "گردش
کرنا اور یکے بعد دیگرے آنا" ہیں۔ (جس سے اس کا
سلسلہ زمانہ بعید سے قائم ہو جاتا ہے)۔ قرآن مجید میں
لفظ تَدَاوَلُوا ہم ان دنوں کو ادا کرتے رہتے ہیں
(۳) [آل عمران : ۱۴۰] اور دولۃ کے معنی "کوئی چیز
جس کے مالک ادلتے بدلتے رہیں" (۵۹ [الحشر : ۷])

بازر کیا۔ اس کے بعد اس نے یارقند میں سکونت
اختیار کی اور ۹۰۴ - ۸۹۰/۵۹۹ء میں خوانین
مغولستان کے ایک حملے کو روکا۔ ۸۹۲/۱۵۱۴ء
کے بعد سعید خان نے اسے حکومت سے عاجز کر دیا،
[دوغلات کے] بڑے خاندانوں کے علاوہ
اس کی دوسری شاخوں نے بھی کئی بار چھوٹی چھوٹی
حکومتیں قائم کیں، اور گاہ بگاہ بڑے خاندانوں سے
برسر پیکار بھی رہیں؛ مثال کے طور پر محمد حیدر نے
جو مؤرخ محمد حیدر کا دادا تھا، یوئس چنگیزی اور
احمد میرزا تیموری کے ساتھ مل کر ابوبکر میرزا
(دیکھئے سطور بالا) کے خلاف جنگ لڑی، اس کے بیٹے
محمد حسین اور سید محمد میرزا ہمیشہ مذہب رہے
کہ ان دونوں خاندانوں میں سے کسی کی حمایت کی
جائے، وہ وقتاً فوقتاً ازبکوں کی ملازمت بھی کرتے رہے،
مقدم الذکر بالآخر ہرات میں شیبانی خان [رگ بان] کے
حکم سے ۱۵۰۸-۱۵۰۹ء میں مارا گیا۔ اس کا
بھائی ۱۵۳۳ء میں مغولستان کے خان عبدالرشید کی
نفرت و خصوصیت کا نشانہ بنا جو اسی سال برسر اقتدار
آیا تھا (تاریخ رشیدی، ص ۶ بعد، ۳۰۵ و ۳۰۵)۔
محمد حسین کے بیٹے میرزا محمد حیدر مؤرخ نے کشمیر
میں خود مختاری کا اعلان کرنے کی نیت سے طاس طارم
کے حکمران کے ماتحت ۱۵۴۱ء میں لداخ کی گورنری
کا عہدہ چھوڑ دیا (دیکھئے حیدر مرزا)۔

۸۹۲/۱۵۱۴ء میں اس خاندان کے خاتمے
اور ابوبکر [دیکھئے اوپر] کی حکومت کے قیام پر طاس
طارم میں دوغلات خاندان کے اقتدار کا خاتمہ ہو گیا
وہ چنگیز خانیوں کی بدستور مدد کرتے رہے اور
سترہویں صدی عیسوی میں انہوں نے خاصا اقتدار
حاصل کر لیا۔

تیسویں صدی میں دریائے ایلے اور جیخوں
(Jaxartes) کے درمیان قزاقوں کے "اردوے کبیر"
(Great Horde) کا ایک معاون قبیلہ دولت نام سے

تہارے لیے ہماری ”دولة“ (عہد حکومت، یا زمانہ فتح) لے آیا“ (الطبری، ج ۳: ۳۰۰)۔ ابو منصور، السفاح کو ابو مسلم کے مار ڈالنے کا مشورہ دیتے ہوئے اپنی ”دولة“ کی قوت کی مدح کرتا ہے (وہی کتاب، ۳: ۸۵: History of the Arabs: P. K. Hitti) بار ششم، (ص ۲۸۶) السفاح، ابو مسلم کی ”دولة“ (عہدے داری کے زمانے) کا ذکر کرتا ہے (الطبری، ۳: ص ۸۶) اور ایک تحریر میں، جس کی تاریخ مشتبہ ہے، اس نے ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جو اس ”دولة“ (یہاں بہ معنی خاندان شاہی) میں خلفشار جاعتے ہیں (کتاب مذکور، ۳: ۱۰۰)۔ چند سال بعد منصور ان لوگوں کا ذکر کرتا ہے جنہوں نے عباسی ”دولة“ کی تائید کی تھی (کتاب مذکور، ۳: ۳۲۹) مگر دیکھیے ایک ایسی ہی عبارت در کتاب مذکور ۳: ۳۲۰، جہاں ”دولة“ کو بمعنی فتح استعمال کیا گیا ہے (المنصور کی آخری وصیت کی تشریح میں المہدی کی ”دولة“ (حکومت) کا ذکر آتا ہے (کتاب مذکور، ۳: ۳۵۴)۔ ان شہادتوں سے کوئی بات قطعی طور پر ثابت نہیں ہوتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عباسی عہد کی ابتدا میں ”دولة“ کا استعمال خاندان شاہی کے مفہوم میں پوری طرح متعین نہیں ہوا تھا۔ ہاں بنو عباس اس لفظ کو اپنی کابلیابی کی باری آ جانے کے مفہوم میں استعمال کرتے تھے۔ اس طرح سے اس لفظ کا تعلق حکمران گھرانے کے ساتھ قائم ہو گیا اور شائستہ اصطلاح کے طور پر اسی کے لیے زیادہ سے زیادہ استعمال ہونے لگا اور جلد ہی ”دولة“ کے حاسی اور ارکان (اصحاب، رجال)، خاندان شاہی کے حاسی اور ارکان سمجھے جانے لگے، پھر وہی وہ تاریخ قطعی طور سے متعین نہیں ہو سکتی جب کہ یہ لفظ پہلے پہل خاندان شاہی کے معنی میں بولا جانے لگا۔

قیاس کیا گیا ہے کہ یونانی (فلسفی مؤرخ) پولی بیان (Polybian) کے اصول ἀναρχία τῶν πολιτειῶν کی

آئے ہیں، علاوہ بریں حدیث میں لفظ اُدالی کسی کو اس کی ”کابیابی یا فتح کی“ باری دلانا آیا ہے اور سیرۃ (ابن ہشام، ص ۱۰۱) کی مشہور روایت میں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات سے متعلق ہے، بیان کیا ہے آپؐ کی وفات اس وقت ہوئی جب حضرت عائشہؓ صدیقہ کے ہاں آپکیؐ تشریف آوری کی باری (ذواتی یا دولتی) تھی۔ اس کے معنی لویۃ، وقت (کابیابی، عہدے پر فائز ہونے کی باری وغیرہ) کی تصدیق قدیم شواہد سے ہوتی ہے، مثلاً فروۃ بن مسیک کے اشعار میں یہ لفظ دو بار آیا ہے، مگر ایک جگہ دولة کے بجائے ایک دوسرا لفظ استعمال ہوا ہے (آسان العرب، بذیل مادہ ط، ب، ب: الطبری، ص ۳۵۴)۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہی خاندان کے معنی میں لفظ دولة کا استعمال اسی زمانے سے ہونے لگا تھا، یہ مسئلہ ابھی تک تحقیق طلب ہے کہ دولة کے معنی ”خاندان شاہی“ کمر طرح ہو گئے، زمانہ قبل اسلام میں کوئی ایسی بات نہیں سنی جس سے اس کی اصل کا پتا چلے۔ قبیلہ (خاندان) کے لیے لفظ ”بنو“ یا ”آل“ اسلامی زمانے میں بھی مستعمل رہے ہیں۔ ابتدائی عباسی زمانے سے پہلے زمانے کے ایسے قابل وثوق اسعار ابھی تک علم میں نہیں آئے جن میں ”دولة“ خاندان کے معنی میں استعمال ہوا ہو۔ نثر کے حوالے زمانی اعتبار سے مشتبہ ہیں، مثلاً یہ بات قرین قیاس نہیں کہ ایک اموی جرنیل حضرت عثمانؓ کے فرزند کو ان الفاظ میں الزام دے ”ہم تو تمہارے خاندان“ (دولتکم) کے لیے لڑیں اور تم اس سے بے وفائی کرو“ (البلاذری: السائب، ص ۹۳)۔ اس لفظ کے کثرت استعمال کی شہادت عباسیوں کی بالکل ابتدائی دستاویزوں میں ملتی ہے جن میں سے بعض میں اصلی الفاظ غالباً ہو بہو نقل کر دیے گئے ہیں۔ السفاح کو جب فتح حاصل ہو گئی تو وہ اہل کوفہ سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے: ”... تمہیں ہمارا زمانہ نصیب ہوا اور اللہ

ہم نوائی میں اترائیں گے سیاسی نظریات بھی فقط "دولۃ" یعنی خاندان شاہی کے استعمال کا باعث بنے۔ اس قیاس کی کچھ حقیقت سی بائید، مذکورہ بالا اس رائے سے ہو سکتی ہے کہ عباسیوں نے اپنے غلبہ و اقتدار کی باری کو اپنی "دولۃ" کہنے پر اکتفا زور دیا کہ یہ اصطلاح مستحضر ہو گئی۔ نور افی اس میں کسی سیاسی نظریے کا شعوری اطلاق نظر نہیں آتا، اگرچہ آئے حل کو فی الواقع "دولۃ" کا اطلاق سیاسی اقتدار کے مختلف ادوار پر بھی ہوا رہا۔ لکندی اپنے زمانہ و ملک العرب اطیح (O. L. al. دو Mungenländische Forschungen' Festchrift Fleischer لاٹزگ ۱۸۷۵ء) میں "دولۃ" کو عربی ملک کا مرادف قرار دیتا ہے نیز قسب الرازی فی اشارات التوال والدولۃ (مطبوعہ ۱۹۳۹ء) میں "دولۃ" کے معنی "سیاسی کاربانی" لئے گئے ہیں۔

(۲) اندولہ القاب کے دوسرے جزاء یہاں ہے کہ تیسری صدی ہجری/دسویں صدی مسیحی میں وزیر القاسم بن عبداللہ بن ولید کو ولید القواد (یعنی مملکت یا خاندان شاہی کا ہمدرد، افسر، عطا کار) قرار دیا گیا جو اس کے بعد المملکتی کے، لکھوں پر بھی اعلیٰ ہوا۔ ۹۰۸/۵۹۷ء کے سنوں کے دورے عام طور پر ملتے ہیں، G. C. Miles کی نظر میں ۵۷۵ء کے کسی ایسے حکمے کی وجوہی مشکوک ہے۔ مصنفین کے بیان کے مطابق یہ پہلا موقع ہے جب "دولۃ" کے لفظ سے مرکب لقب کسی کو ملا۔ القاسم کے فرزند الجاسم نے بھی اپنے باپ کی رسم کو قائم رکھا، جب کہ المعتز نے اسے عرب و اقار کے ساتھ "مملکت الدولۃ" (ملک کا سپہ سالار) لقب دیا جو سنوں میں آتا ہوا۔ ۸۷۵ء/۸۶۳ء / فروری ۸۶۳ء کا واقعہ یہ (ارشاد الارباب: ص ۲۶۱) مشکوکہ در Eclipse، ۲۶۱: ۲۶۲ء / فروری ۸۶۳ء / ۲۶۱: ۲۶۲ء

اس کے حصول کے لیے میں مر ذیل توضیحی القاب لوگوں کو دے رہے ہیں: اسی زمانے کے قریب قریب ہم ایک دوسری زبان القاب کا عرف "جرب الدولۃ" (جرب، لفظ) سنتے ہیں، لیکن اس کی بابت کہا گیا ہے کہ اس نے آل بویہ کا مضحکہ اڑانے کے لیے خود ہی ایسا یہ عرف پسند کیا تھا (ناقوت: ارشاد الارباب: ۲: ۶۲۰ بعد)۔ پھر حال پھر دولۃ کے لفظ سے مرکب القاب صحیح معنوں میں اس وقت پانچ ہوئے جب شعبان ۳۳۵ھ/اپریل ۹۴۷ء میں حسن حمدانی اور علی حمدانی کی بغاوتی الترتیب ناصر الدولۃ اور سب الدولۃ کے لقب عطا ہوئے۔ تھوڑے ہی عرصے بعد (۳۴۶ھ/۹۵۷ء) بن یوسف یحییٰوں کو لفظ "دولۃ" سے مرکب لقب دئے گئے اور یہ اس بات کی علامت بھی کہ انہوں نے بغداد اور مشرق پر اقتدار قائم کر لیا ہے۔ ان کے القاب پھر الدولۃ، مملکت الدولۃ اور دولۃ الدولۃ تھے۔ یہ القاب - مگر - کسی نہ تھے بلکہ پہلے تھے۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ خلیفہ نے بہت سے سیاسی اعتبارات سے اس بات والے نو حکمے دئے تھے۔

حمدانیوں اور یوسفیوں نے لفظ "دولۃ" سے مرکب القاب قائم رکھے اور اپنے اپنے وقتوں میں دوسروں نے بھی ان کی تقلید کی، مثالی کے طور پر مشرق میں غزنویوں اور آفگانیوں نے اور اندلس میں بعض ملوک طوائف نے نیز فاطمیوں نے بھی کبھی "دولۃ" سے مرکب القاب اپنے اعلیٰ عہدے داروں کو دیے، لیکن دسواں صدی مسیحی ختم ہونے ہی باقی تھی کہ یہ القاب اپنی اہمیت بہت کچھ کھو بیٹھے۔ پہلے تو ان کے ساتھ اور القاب بطور تکملہ ملائے گئے، پھر ان کی جگہ دوسرے القاب دیے جانے لگے۔ یہ وہ دور تھا جس میں ممالک میں القاب کی بھر مار ہونے لگی تھی، جس پر مسلمان اہل قلم کبھی کبھی لکھتے تھے کہ اس کے لیے

کہ دولت کا خصوصی تعلق زر سے ہو۔ اس میں کثرت کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ کم زر والے کو کم دولت مند نہیں کہہ سکتے۔ دولت میں جاہ و اقتدار کا مفہوم بھی شامل ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے کہ کسی ملک کو دولت کہا جاتا تھا بحالیکہ مال میں جاہ و اقتدار لازمی نہ ہو۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ کسی عبارت میں تینوں مفہوم (یعنی باری اور نوبت اور جاہ و اقتدار اور زر کی کثرت) شامل ہوں۔ اسلامی ادب کے جدید دور میں خصوصاً اردو میں لفظ دولت کا اطلاق وسائل بدواور اور بدواور دونوں پر ہوتا ہے۔

اسلام میں تقسیم دولت کا نظام کئی کتابوں کا موضوع ہے خصوصاً زمانہ قرب میں معاشیات کے اسلامی تصور پر بھی بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں (رک بہ معاشیات (اسلامی))۔ اس موضوع کی زیادہ تفصیلی بحث کے لیے رک بہ المال۔ یہاں مختصر طور سے اسلام کے تقسیم دولت کے نظام کا ایک خالہ پیش کیا جا رہا ہے۔ اسلامی نظریہ تقسیم دولت کے چند بنیادی اصول ہیں: (۱) اسلام بھائیانت کا مخالف ہے اور معاش کی جائز سرگرمیوں کو "فعل اللہ" اور "خیر" کے الفاظ سے یاد کرتا ہے اور اسے الطبیات بن البرزق کہتا ہے۔ لیکن معاش مقصود حیات نہیں بلکہ کردار کی بلندی اور آخرت کی بہبود اس کا مقصد ہے: (۲) دولت خوار کسی شکل میں ہو، اللہ کی ملکیت ہے۔ انسان کو جو کچھ ملتا ہے وہ اللہ کی عطا ہے اور اس کی ملکیت حکم خداوندی کے تحت ہوگی: (۳) حکم خداوندی کے تحت مال میں تصرف کے لیے ایک نظام قائم کیا گیا ہے، جس میں یہ مد نظر رکھا گیا ہے کہ ہر انسان اپنی قابلیت کے مطابق دولت پیدا کرے۔ پھر اس میں کچھ حصہ واجبہ (زکوٰۃ) کے طور سے اور کچھ اختیاری طور سے (وَبِیْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ) ۵۱ [الدورات]:

کے زمانے کے بعد "دولة" سے مرکب القاب دیے جانے کے بارے میں ابھی تک زیادہ تحقیق نہیں کی گئی ہے، مگر اس کا استعمال مختلف صورتوں میں مل رہا ہے۔ بارہویں صدی عیسوی میں ایک درباری طبیب ہبائے ابن التلمیذ "امین الدولة" کہلاتا تھا (غیر مسلموں کے لیے "دولة" سے مرکب القاب کے لیے دیکھئے، الفاشندی: ضیح: ۵: ۹۰ بعد حسن الزبائ، درالمشرق: ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷،

Mohammadan Theories of : N. P. Agnihotri (۲۵)

Finance، لاہور ۱۹۶۱ء

(P. ROSENTHAL | وادارہ)

دولت آباد : ایک پہاڑی قلعہ، عرض بلد

شمالی ۱۹ درجے ۵۵ دقیقے، طول بلد مشرق ۷۵ درجے ۱۵ دقیقے اور لنگ آباد سے دس میل شمال مغرب کی جانب صوبہ سہارنپور میں واقع ہے۔ دولت آباد پہلے دیوگری (صحیح دیواگری) یعنی ”خدائی پہاڑی“ کہلاتا تھا اور مسلمانوں سے پہلے یادوا Yadvas خاندان کے راجاؤں کا صدر مقام تھا جو اصل میں مغربی چالوکیہ راجاؤں کے باجگزار مگر ۱۱۸۳ء سے خود مختار ہو گئے تھے اور اس کے بعد اس مملکت پر خود مختارانہ طور پر دیوگری سے حکومت کرتے رہے۔ دہلی کے سلطان جلال الدین فیروز خلجی کے بھتیجے علاء الدین کو دیوگری کی بے حساب دولت کی خبر سن کر قلعہ کی تسخیر کا ذوق پیدا ہوا۔ وہ ۱۲۹۳ء/۱۲۹۴ء میں بڑی بڑی منزلیں طے کر کے یہاں آ پہنچا اور قلعہ کو گھیر لیا۔ اس وقت وہاں کا راجہ راجندر تھا۔ وہ ناگہانی حملے سے گھبرا کر مجبور ہو گیا کہ حملہ آوروں کو سونے، چاندی اور جواہرات کی کثیر مقدار اور ایلچیور کا علاقہ سلطنت دہلی کے حوالے کرے۔ اس دولت فراوان کا لالچ دے کر علاء الدین نے جلال الدین فیروز کو بلایا اور موت کے گھاٹ اتار دیا۔ راجندر ۱۲۹۶ء/۱۳۰۷ء میں ایلچیور کا خراج بھیجنے سے قاصر رہا اس لیے کافور ہزار دیناری کے زیر کمان، جو اس وقت نائب السلطنت تھا، ایک لشکر اس کے خلاف روانہ کیا گیا، لیکن راجہ نے کافور کے سامنے اظہار اطاعت کیا اس لیے اس کو عزت و توقیر کے ساتھ دارالسلطنت بھیج دیا گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے خراج کے بدلے بیش قیمت تحائف پیش کیے، اس کا قصور معاف کر دیا گیا اور رائے راباں کا خطاب دے کر اسے دیوگری کی حکومت تفویض

کی گئی مگر راجندر کا فرزند اور جانشین شنکر دہلی کی مبادت سے منحرف ہو گیا۔ ۱۳۱۳ء/۱۳۱۳ء میں کافور کو پھر وہاں روانہ کیا گیا اور اس نے شنکر کو قتل کر کے ریاست دیوگری کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ کوئی تین سال بعد شنکر کے داماد ہریال نے خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ دہلی کا نیا سلطان قطب الدین مبارک خلجی اس کے مقابلے میں خود لشکر لے کر آنا۔ ہریال کو قتل کر دیا گیا اور دیوگری کے علاقے کا سلطنت دہلی سے الحاق ہو گیا۔ ۱۳۱۸ء/۱۳۱۸ء میں وہاں ایک بڑی جامع مسجد تعمیر ہوئی۔ (دیکھئے آثار قدیمہ، دہلی میں)

اس کے بعد دیوگری کی تاریخ میں اہم زمانہ وہ ہے جب ۱۳۲۷ء/۱۳۲۷ء میں محمد بن تغلق نے یہ محسوس کر کے کہ اس کے ممالک محروسہ میں دہلی خاطر خواہ مرکزی مقام نہیں، یہ فیصلہ کیا کہ دیوگری کا نام بدل کر دولت آباد رکھا جائے اور وہی اس کی سلطنت کا صدر مقام بنے۔ پہلے تو رکاری عہدے داروں کو اس پر راضی کیا گیا کہ وہاں جا کر آباد ہوں، لیکن ۱۳۲۹ء/۱۳۲۹ء میں تمام آبادی کو تادیباً مجبور کیا گیا کہ دہلی چھوڑ کر دولت آباد جائیں (برنی، ۸۱۰ء بعد ابن بطوطہ، ج ۳ : ۳۱۳ء بعد) پھر دولت آباد کو مرکز عمل بنا کر تمام دکن میں امن و امان قائم کیا گیا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد جب شمالی ہند پر مغلوں نے طاقت کی تو محمد تغلق کو مجبوراً دہلی واپس آنا پڑا اور دولت آباد پہلے کی طرح پھر جنوب میں فوج کا ایک مستقر بن کر رہ گیا۔ دولت آباد ہی میں (از ادارہ) ۱۳۴۶ء/۱۳۴۶ء امیران صندھ نے اسمعیل منہج کو اپنا سردار منتخب کیا اور ایک سال بعد ظفر خان، جو دہلی کی فوج کو شکست دے چکا تھا، اسمعیل کی جگہ وہیں پہلا بھٹی سلطان بن گیا۔ بھٹیوں نے دولت آباد کو شمالی سرحد کی چھاؤنی بنائے رکھا اور

میں نظر آتا ہے جس کے نیچے چٹان کو سڑد پندرہ میٹر اندر تک مستطیل شکل میں کاٹ کر ایک پانی سے بھری ہوئی خندق بنائی گئی ہے (اس پر سے ایک سنگ بستہ راستہ پہاڑی میں تراشے ہوئے ایک دیول تک جاتا ہے اور اس کی ہندوانہ اصل کو واضح کرتا ہے)۔ بعد کی مسلمانوں کی تعمیرات میں ہندو کاریگروں کے تراشے ہوئے پتھروں کا استعمال ثابت کرنا ہے کہ مشرقی جانب کی ڈھلوان زمین پر پہلے زمانے میں ایک شہر موجود تھا۔

قلعے کی تہری فصیل بھی مشرق ہی کی جانب بنی ہوئی ہے، جس کی بنیاد محمد بن تغلق کے زمانے میں رکھی گئی، سب سے باہر کی دیوار بیرونی شہر کی فصیل ہے جسے اورنگ آباد سے خلد آباد جانے والی سڑک شمالاً جنوباً قطع کرتی ہے، شہر (جسے عبدالحمید لاہوری نے بادشاہ نامہ میں جا بجا عنبر کوٹ لکھا ہے) کا رقبہ شمالاً جنوباً تقریباً ۲ کیلومیٹر اور شرقاً غرباً زیادہ سے زیادہ ایک کیلومیٹر ہے۔ دوسری دیوار ۱۰۲ × ۴۰ کیلومیٹر کا رقبہ گھیرے ہوئے ہے، جو پہلی دیوار کے مغرب میں واقع ہے اور جس کا نام ابن بطوطہ نے ٹنک اور عبدالحمید لاہوری نے مہاکوٹ (قلعہ بزرگ) بتایا ہے۔ اس حصہ شہر کے اندر ایک مڑے مڑے راستے سے داخل ہوتے ہیں، جو گول برجوں کے آگے بیچھے بنائے سے بن گیا ہے۔ اس سے کچھ کم پیچیدہ داخلہ تیسری فصیل کے اندر کا ہے، جس کے ذریعے قلعہ دیوگری میں جاتے ہیں (جسے لاہوری بالا کوٹ نکھنا ہے)۔ چلے ایک زندہ طے کرتے ہیں، پھر چٹان میں کھدی ہوئی خندق پر بنے ہوئے ایک تنگ سنگی پل سے گزر کر ایک سڑک میں داخل ہوتے ہیں جو پہاڑ کے اندر تراشے ہوئے حجروں اور پرانے چین مت کے غاروں میں سے گزرتی ہے۔ اس طرح کوئی پندرہ میٹر اوپر جا کر پھر چٹان میں کٹی ہوئی جوڑی سیڑھیاں آتی ہیں، جن پر چڑھ کر ایک مغل بارداری میں جاتے ہیں اور جسے طے کر کے

اس کی دفاعی قلعہ بندی کو اور مضبوط کیا۔ مشہور چاند مینار انہیں کے زمانہ تسلط کی یادگار ہے۔ ۱۵۰۵ء میں بہ ان کا دارالسلطنت بن گیا۔ مغل بادشاہ شاہ جہاں بخوبی سمجھتا تھا کہ دکن پر تسلط قائم رکھنے کے لیے دولت آباد کایدی حیثیت رکھتا ہے، چنانچہ مہابت خان نے ۱۶۳۳ء/۱۰۴۳ھ میں اس کا سختی سے محاصرہ کیا اور مغل سلطنت کے لیے اسے فتح کر لیا (عبدالحمید لاہوری: بادشاہ نامہ، ۹۶-۱۰۳-۱۰۴)۔ ۱۷۵۷ء میں صلابت جنگ نے دولت آباد کو نظام الملک کے لیے مسخر کیا، مگر تین سال بعد یہ شہر، رھٹوں کے ہاتھ آ گیا۔

دولت آباد کو کبھی فتح آباد کے دارالضرب ہونے پر فخر تھا (محمد اول بہمنی کے زمانے میں دولت آباد کا نام فتح آباد رکھ دیا گیا تھا) اس کے لیے دیکھیے برہان المآثر، مطبوعہ ۱۹۳۶ء، ص ۱۷۱)۔ اس دارالضرب میں ۱۷۶۱-۱۷۶۲ء سے سکتے مضروب ہونے لگے۔ یہ شہر کاغذ سازی کی صنعت کا بھی مرکز تھا۔

مآخذ: علاوہ ان کتابوں کے جن کا ذکر مت میں آچکا ہے دیکھیے (۱) بلگرامی و Willmott: *Historical and Descriptive Sketches of H. H. Nizam's* *Historical landmarks*: T.W. Haig (۲) *Dominions Imperial Gazetteer of India*, (۳) *of the Deccan Hyderabad State*

(ہارون خان شروانی)

(۲) یادگار عمارات: دولت آباد میں پہلا تعمیری کام (پہلی صدی ق۔ م میں چٹانوں کو کاٹ کر بنائے ہوئے غاروں سے قطع نظر) دیوگری کو تراشنا تھا جو ایک مخروطی شکل کی دو سو میٹر اونچی سالم چٹان ہے اور ایک قدرتی درے کے سرے پر سر بلند کیے کھڑی ہے۔ اس تراش خراش کے باعث (جس کا آغاز کم از کم یادوا خاندان کے اوائل عہد میں ہو چکا تھا) پوری چٹان کا حلقہ پچاس سے پینسٹھ میٹر بلند عمودی دیوار کی شکل

گنبدوں کے مشابہ ہے، مگر اس میں تین غلام گردشیں ہیں جن کے سہارے کے لیے بڑے اہتمام سے دیوار گئیاں بنا دی گئی ہیں۔ چاند مینار مسجد کے مینار کے علاوہ دیدبان کا بھی کام دیتا تھا کیونکہ اس پر سے شمال مشرق کے جیل سستان میدان کا پورا منظر دکھائی دیتا ہے۔

محلات زیادہ تر کھنڈر ہو گئے ہیں۔ ان میں قابل توجہ ”بارہ دری“ ہے، جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ یہ ۱۶۳۶ء/۱۰۴۶ھ میں شاہجہان کی آمد کی تقریب میں بنائی گئی تھی۔ دوسری عمارت مہا کوٹ کا چینی محل ہے، جو نظام شاہی عہد میں تعمیر ہوا۔ اس میں کاشی کاری کی گئی ہے، چینی محل سے آخری قطب شاہی نادرشاہ ابوالحسن کے لیے سرکاری قید خانے کا کام لیا گیا تھا (اخانی خان: منتخب اللباب، ۲: ۳۷۱ بعد)۔

مآخذ: دولت آباد کی مقامی حیثیت کے متعلق کوئی خاص تحریر موجود نہیں ہے۔ متن مقالہ میں جو حوالے دیے گئے ہیں ان کے علاوہ دیکھیے *Some ancient cities of India* یعنی ۱۹۸۵ء، ص ۷۸ (اس میں خاکے کی تصویر بھی شامل ہے)۔

(J. BURTON-PAGE)

* الدولت آبادی: شہاب الدین احمد بن

شمس الدین بن عمر زاولی الہندی، نویں صدی ہجری/ پندرہویں صدی عیسوی کے ایک ممتاز ہندوستانی عالم، جو دکن کے شہر دولت آباد میں پیدا ہوئے۔ وہ دہلی میں شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے ممتاز شاگردوں قاضی عبدالغفور اور مولانا خواجگی سے تعلیم پا کر فارغ التحصیل ہوئے۔ جب تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا تو شہاب الدین نے دہلی کو خیر باد کہا اور جونپور کی سکونت اختیار کی، جہاں سلطان ابراہیم شرقی (م. ۸۰۱/۱۴۰۱ء) نے نہایت اعزاز سے ان کا خیر مقدم کیا اور اپنی سلطنت کا قاضی القضاۃ

سمت پر آئے۔ اس سو سیرھویوں کا ایک اور زینہ آتا ہے جس پر چڑھ کر اصل بالا حصار پر پہنچتے ہیں۔ اس حیوٹرے کا رقبہ ۵۰ میٹر × ۳۶ میٹر ہے اور یہاں توہیں نصب ہیں۔ مذکورہ بالا تینوں فصیلیں باہر کی جانب ایک خندق اور آگے سامنے کے دندوں سے مستحکم کی گئی ہیں۔ ان سب میں (چھوٹے پتھر کی نقیس تراش خراش اور بہتر استعمال کو دیکھتے ہوئے ان تبدیلیوں کا پتا چلتا ہے) جو اہمینی عہد کے فن تعمیر میں ظہور پذیر ہوئیں۔ دفاعی استحکامات کے سلسلے میں یہ تعمیرات باعث دلچسپی ہیں: (۱) آخری خندق کے بل کا بیچ کا حصہ دونوں پہلوؤں کی سطح سے تقریباً تین میٹر نیچا ہے اور خندق کی منڈیر اور سرنگ تک ایک عمودی زینے کے ذریعے پہنچا جا سکتا ہے۔ خندق کے باقی کی سطح کو بلند کر دینا یقیناً اختیار میں ہوگا تاکہ بل کے بیچ کا یہ حصہ پانی میں غرق کیا جا سکے: (۲) لمبی سرنگ، جس کے داخلے کے دروازے پر ایک آہنی روک لگی ہوئی تھی، جسے تپا کر سرخ انگارا بنایا جا سکتا تھا۔

قطب الدین مبارک خلجی، شاہ دہلی، کی مسجد (کتبہ ۱۱۸۵ھ/۱۷۸۱ء) شاید قدیم ترین اسلامی یادگار ہے۔ اس کے پشتیان نالیاں دے کر گودم بنائے ہیں اور گنبد اس کا مورنیوں والا ہے۔ اس کے مجموعی احاطے کا رقبہ کوئی ۷۸ میٹر مربع ہے (تصاویر در *Annual Report of Archaeological Department Hyderabad* ۱۹۲۵-۱۹۲۶ء، لوحہ III)۔ کچھ عرصے سے اس کی محراب کو ایک بت رکھ کر بھر دیا گیا ہے۔

اس مسجد کا کوئی مینار نہیں، تاہم مینار کا کام ”چاند مینار“ دیتا ہے، جس کی بلندی تیس میٹر ہے اور تعمیر کی تاریخ ۸۳۰ھ/۱۴۲۵ء ہے۔ شکل میں وہ پندر [رگ ہاں] میں واقع مدرسہ محمود گوان کے

The Contribution of India to (۱) (۲) (۳) (۴) (۵) (۶) (۷) (۸) (۹) (۱۰) (۱۱) (۱۲) (۱۳) (۱۴) (۱۵) (۱۶) (۱۷) (۱۸) (۱۹) (۲۰) (۲۱) (۲۲) (۲۳) (۲۴) (۲۵) (۲۶) (۲۷) (۲۸) (۲۹) (۳۰) (۳۱) (۳۲) (۳۳) (۳۴) (۳۵) (۳۶) (۳۷) (۳۸) (۳۹) (۴۰) (۴۱) (۴۲) (۴۳) (۴۴) (۴۵) (۴۶) (۴۷) (۴۸) (۴۹) (۵۰) (۵۱) (۵۲) (۵۳) (۵۴) (۵۵) (۵۶) (۵۷) (۵۸) (۵۹) (۶۰) (۶۱) (۶۲) (۶۳) (۶۴) (۶۵) (۶۶) (۶۷) (۶۸) (۶۹) (۷۰) (۷۱) (۷۲) (۷۳) (۷۴) (۷۵) (۷۶) (۷۷) (۷۸) (۷۹) (۸۰) (۸۱) (۸۲) (۸۳) (۸۴) (۸۵) (۸۶) (۸۷) (۸۸) (۸۹) (۹۰) (۹۱) (۹۲) (۹۳) (۹۴) (۹۵) (۹۶) (۹۷) (۹۸) (۹۹) (۱۰۰) (۱۰۱) (۱۰۲) (۱۰۳) (۱۰۴) (۱۰۵) (۱۰۶) (۱۰۷) (۱۰۸) (۱۰۹) (۱۱۰) (۱۱۱) (۱۱۲) (۱۱۳) (۱۱۴) (۱۱۵) (۱۱۶) (۱۱۷) (۱۱۸) (۱۱۹) (۱۲۰) (۱۲۱) (۱۲۲) (۱۲۳) (۱۲۴) (۱۲۵) (۱۲۶) (۱۲۷) (۱۲۸) (۱۲۹) (۱۳۰) (۱۳۱) (۱۳۲) (۱۳۳) (۱۳۴) (۱۳۵) (۱۳۶) (۱۳۷) (۱۳۸) (۱۳۹) (۱۴۰) (۱۴۱) (۱۴۲) (۱۴۳) (۱۴۴) (۱۴۵) (۱۴۶) (۱۴۷) (۱۴۸) (۱۴۹) (۱۵۰) (۱۵۱) (۱۵۲) (۱۵۳) (۱۵۴) (۱۵۵) (۱۵۶) (۱۵۷) (۱۵۸) (۱۵۹) (۱۶۰) (۱۶۱) (۱۶۲) (۱۶۳) (۱۶۴) (۱۶۵) (۱۶۶) (۱۶۷) (۱۶۸) (۱۶۹) (۱۷۰) (۱۷۱) (۱۷۲) (۱۷۳) (۱۷۴) (۱۷۵) (۱۷۶) (۱۷۷) (۱۷۸) (۱۷۹) (۱۸۰) (۱۸۱) (۱۸۲) (۱۸۳) (۱۸۴) (۱۸۵) (۱۸۶) (۱۸۷) (۱۸۸) (۱۸۹) (۱۹۰) (۱۹۱) (۱۹۲) (۱۹۳) (۱۹۴) (۱۹۵) (۱۹۶) (۱۹۷) (۱۹۸) (۱۹۹) (۲۰۰) (۲۰۱) (۲۰۲) (۲۰۳) (۲۰۴) (۲۰۵) (۲۰۶) (۲۰۷) (۲۰۸) (۲۰۹) (۲۱۰) (۲۱۱) (۲۱۲) (۲۱۳) (۲۱۴) (۲۱۵) (۲۱۶) (۲۱۷) (۲۱۸) (۲۱۹) (۲۲۰) (۲۲۱) (۲۲۲) (۲۲۳) (۲۲۴) (۲۲۵) (۲۲۶) (۲۲۷) (۲۲۸) (۲۲۹) (۲۳۰) (۲۳۱) (۲۳۲) (۲۳۳) (۲۳۴) (۲۳۵) (۲۳۶) (۲۳۷) (۲۳۸) (۲۳۹) (۲۴۰) (۲۴۱) (۲۴۲) (۲۴۳) (۲۴۴) (۲۴۵) (۲۴۶) (۲۴۷) (۲۴۸) (۲۴۹) (۲۵۰) (۲۵۱) (۲۵۲) (۲۵۳) (۲۵۴) (۲۵۵) (۲۵۶) (۲۵۷) (۲۵۸) (۲۵۹) (۲۶۰) (۲۶۱) (۲۶۲) (۲۶۳) (۲۶۴) (۲۶۵) (۲۶۶) (۲۶۷) (۲۶۸) (۲۶۹) (۲۷۰) (۲۷۱) (۲۷۲) (۲۷۳) (۲۷۴) (۲۷۵) (۲۷۶) (۲۷۷) (۲۷۸) (۲۷۹) (۲۸۰) (۲۸۱) (۲۸۲) (۲۸۳) (۲۸۴) (۲۸۵) (۲۸۶) (۲۸۷) (۲۸۸) (۲۸۹) (۲۹۰) (۲۹۱) (۲۹۲) (۲۹۳) (۲۹۴) (۲۹۵) (۲۹۶) (۲۹۷) (۲۹۸) (۲۹۹) (۳۰۰) (۳۰۱) (۳۰۲) (۳۰۳) (۳۰۴) (۳۰۵) (۳۰۶) (۳۰۷) (۳۰۸) (۳۰۹) (۳۱۰) (۳۱۱) (۳۱۲) (۳۱۳) (۳۱۴) (۳۱۵) (۳۱۶) (۳۱۷) (۳۱۸) (۳۱۹) (۳۲۰) (۳۲۱) (۳۲۲) (۳۲۳) (۳۲۴) (۳۲۵) (۳۲۶) (۳۲۷) (۳۲۸) (۳۲۹) (۳۳۰) (۳۳۱) (۳۳۲) (۳۳۳) (۳۳۴) (۳۳۵) (۳۳۶) (۳۳۷) (۳۳۸) (۳۳۹) (۳۴۰) (۳۴۱) (۳۴۲) (۳۴۳) (۳۴۴) (۳۴۵) (۳۴۶) (۳۴۷) (۳۴۸) (۳۴۹) (۳۵۰) (۳۵۱) (۳۵۲) (۳۵۳) (۳۵۴) (۳۵۵) (۳۵۶) (۳۵۷) (۳۵۸) (۳۵۹) (۳۶۰) (۳۶۱) (۳۶۲) (۳۶۳) (۳۶۴) (۳۶۵) (۳۶۶) (۳۶۷) (۳۶۸) (۳۶۹) (۳۷۰) (۳۷۱) (۳۷۲) (۳۷۳) (۳۷۴) (۳۷۵) (۳۷۶) (۳۷۷) (۳۷۸) (۳۷۹) (۳۸۰) (۳۸۱) (۳۸۲) (۳۸۳) (۳۸۴) (۳۸۵) (۳۸۶) (۳۸۷) (۳۸۸) (۳۸۹) (۳۹۰) (۳۹۱) (۳۹۲) (۳۹۳) (۳۹۴) (۳۹۵) (۳۹۶) (۳۹۷) (۳۹۸) (۳۹۹) (۴۰۰) (۴۰۱) (۴۰۲) (۴۰۳) (۴۰۴) (۴۰۵) (۴۰۶) (۴۰۷) (۴۰۸) (۴۰۹) (۴۱۰) (۴۱۱) (۴۱۲) (۴۱۳) (۴۱۴) (۴۱۵) (۴۱۶) (۴۱۷) (۴۱۸) (۴۱۹) (۴۲۰) (۴۲۱) (۴۲۲) (۴۲۳) (۴۲۴) (۴۲۵) (۴۲۶) (۴۲۷) (۴۲۸) (۴۲۹) (۴۳۰) (۴۳۱) (۴۳۲) (۴۳۳) (۴۳۴) (۴۳۵) (۴۳۶) (۴۳۷) (۴۳۸) (۴۳۹) (۴۴۰) (۴۴۱) (۴۴۲) (۴۴۳) (۴۴۴) (۴۴۵) (۴۴۶) (۴۴۷) (۴۴۸) (۴۴۹) (۴۵۰) (۴۵۱) (۴۵۲) (۴۵۳) (۴۵۴) (۴۵۵) (۴۵۶) (۴۵۷) (۴۵۸) (۴۵۹) (۴۶۰) (۴۶۱) (۴۶۲) (۴۶۳) (۴۶۴) (۴۶۵) (۴۶۶) (۴۶۷) (۴۶۸) (۴۶۹) (۴۷۰) (۴۷۱) (۴۷۲) (۴۷۳) (۴۷۴) (۴۷۵) (۴۷۶) (۴۷۷) (۴۷۸) (۴۷۹) (۴۸۰) (۴۸۱) (۴۸۲) (۴۸۳) (۴۸۴) (۴۸۵) (۴۸۶) (۴۸۷) (۴۸۸) (۴۸۹) (۴۹۰) (۴۹۱) (۴۹۲) (۴۹۳) (۴۹۴) (۴۹۵) (۴۹۶) (۴۹۷) (۴۹۸) (۴۹۹) (۵۰۰) (۵۰۱) (۵۰۲) (۵۰۳) (۵۰۴) (۵۰۵) (۵۰۶) (۵۰۷) (۵۰۸) (۵۰۹) (۵۱۰) (۵۱۱) (۵۱۲) (۵۱۳) (۵۱۴) (۵۱۵) (۵۱۶) (۵۱۷) (۵۱۸) (۵۱۹) (۵۲۰) (۵۲۱) (۵۲۲) (۵۲۳) (۵۲۴) (۵۲۵) (۵۲۶) (۵۲۷) (۵۲۸) (۵۲۹) (۵۳۰) (۵۳۱) (۵۳۲) (۵۳۳) (۵۳۴) (۵۳۵) (۵۳۶) (۵۳۷) (۵۳۸

دولت شاه : (امیر) از علاءالدوله بغی شاه،

ایک ایرانی مصنف، جو خراسان کے شہر اسفہان کے ایک جاگیردار خاندان سے تھا۔ اس کا باپ تیمور کے بیٹے شہرخ کے اہت ہے تکلف درباریوں میں سے تھا۔ یہ خود ان لڑائیوں میں شریک ہوا جو تیموری سلطان ابوالغازی سلطان حسین اور سلطان محمود نے اندخود کے نزدیک لڑیں۔ جب اس نے تذکرۃ الشعراء لکھنی شروع کی اس وقت اس کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ تھی اور اسے اس نے تقریباً ۸۹۲ھ/۱۴۸۷ء میں اپنی وفات کے قریب مکمل کیا، لیکن اس کی وفات کی صحیح تاریخ نامعلوم ہے۔ مشہور وزیر، مصنف اور ادب اور فن کا سرپرست میر علی شیر نوائی (قب برائون: A Literary History of Persia ۳: ۷۳) دوات شاہ کی اس بنا پر مدح کرتا ہے کہ اس نے بڑے آدمیوں سے ملنا جلتا ترک کر دیا تھا تاکہ وہ اپنا وقت مطالعہ کتب اور اپنی کتاب لکھنے میں صرف کرے۔ اس کی کتاب تذکرۃ الشعراء سب سے پہلا تذکرہ رک باں ہے جس سے اہل یورپ Von Hammer کے ترجمے کی بدولت روشناس ہوئے۔ یہ تذکرہ سات حصوں میں منقسم ہے۔ ہر حصے میں بیس یا کچھ کم و بیش شاعروں کا ذکر ہے اور ساتھ ہی ان ماوک و سلاطین کا بھی حال لکھا ہے جو ان کی سرپرستی کرتے تھے۔ اس کا ایک دیباچہ بھی ہے، جس میں فن شعر سے بحث کی گئی ہے۔ آخری حصہ ان سات شاعروں کے اسے وقف ہے، جو مصنف کے معاصر تھے۔ اس میں تیموری شاہزادے ابوالغازی سلطان حسین بن منصور یقرا کی ثناء و صفت بھی شامل ہے، جو خود بھی ایک ادیب تھا (برائون ۳: ۳۹۰، ۳۹۱)۔ تذکرے میں شعرا کے

مقرر کر کے انھیں "ملک العناء" کا خطاب عطا کیا۔
فرشتہ کا قول ہے کہ سلطان کی نظر میں ان کا مرتبہ
اتنا بلند تھا کہ دربار میں ان کے لیے جاندی کی ایک
خاص کرسی سہا کی گئی تھی۔ ان کا جونسور میں
۱۸۸۸ء/۱۳۰۵ھ میں انتقال ہوا۔

شہاب الدین اکبر الہ آبادی بزرگ تھے۔ بقول شیخ
 عبدالحق محدث دہلوی اور محمد عوفی شطاری قاوسی
 شاعر کی حیثیت سے بھی ان کی کچھ نہ کچھ شہرت
 تھی۔ ان کی غالبات میں سے مندرجہ ذیل خاص طور پر
 قابل ذکر ہیں : شرح الہندی، جو کافہ کی شرح ہے
 (مخطوطے کے لیے دیکھیے، زبداحمد : Contribution
 of India to Arabic Literature، ص ۱۰۱) : (۲)
 شرح اصول البزدوی (مخطوطہ، مولانا ابوالکلام
 آزاد) : (۳) المقائد الاسلامیہ، علم کلام پر ہے
 (مخطوطہ، رادپور، ۱۳۱۴ھ) : (۴) الارشاد، عربی نحو پر
 (مطبوعہ صدرآباد) : (۵) مصنف الفضل، مشہور قصیدہ
 بابت معاد کی شرح (مطبوعہ صدرآباد) : (۶) بحرالمواج،
 قرآن مجید کی فارسی تفسیر، جو سلطان ابراہیم شرفی
 کے نام سے منسوب ہے (مخطوطے کے لیے دیکھیے شوری،
 ۱۰ : ۱۱۹۳) : (۷) تاریخ السنیۃ (شوری، ۲۲) :
 (۸) فتاویٰ ابراہیم شامی : (۹) بدائع البیان
 (۱۰) مناقب السادات، آل رسولؐ کے فضائل و حقوق
 خصوصی پر (شوری، ۲۱۱، ۱۲۶) : ۱۱

مآخذ : (۱) عبدالمصطفیٰ دہلوی : اخبار الاعیار،
 (دہلی، ۱۳۰۹ھ)، ص ۱۷۵ تا ۱۷۶؛ (۲) محمد غوثی، طآری
 کاراۃ ابرار (مخطوطہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ص ۷۷)؛
 (۳) محمد صادق : طبقات امامجمانی، (مخطوطہ، وزارت
 بریطانیہ، ورق ۹۰)؛ (۴) غلام علی آزاد : سائر الکرام
 (اکبر، ۱۹۱۰ء)، ص ۱۸۸ تا ۱۸۹؛ (۵) فقیر محمد؛
 حدائق العنقیہ (نولکشور، لکھنؤ، ۱۹۰۶ء)، ص ۳۱۶؛ (۶)
 رحمن علی : تذکرۃ علمائے ہند (نولکشور، لکھنؤ، ۱۹۱۱ء)؛
 ص ۸۸، ۸۹؛ (۷) نور الدین : تجلی نور (جونپور، ۱۹۰۰ء)،

یعنی تخت کا وارث اول مقرر کیا۔ جب ۱۵۵۸/۱۵۵۹ء میں عثمانی ترکوں کی زور دار فائید سے وہ خان بنا دیا گیا تو قریم میں عثمانیوں کا اثر بڑھ گیا۔ اس نے اپنے پسر رو کی طرح روسیوں کے ساتھ مخالفانہ رویہ بہت زور شور سے جاری رکھا اور ۱۵۵۹/۱۵۶۰ء میں پولینڈ کے خانوادہ جاگیلو سے روسیوں کے خلاف اتحاد کرایا۔ اس نے ماسکو پر چند بار فوج کشی کی مگر روسیوں کو قریب کی دو ریاستوں قازان [وگ ہاں] اور استراخان [وگ ہاں] پر قبضہ جمائے سے انہ روک سکے۔ جب ۱۵۶۷/۱۵۶۹ء کی فوجی مہم میں عثمانی ترک والگا کے زمریں علاقے پر اپنا تسلط چماتے میں ناکام رہے تو انھوں نے دولت گراہی دو ترکیب دی کہ روس سے جنگ جاری رکھے۔ ۱۵۶۹/۱۵۷۰ء میں دریائے وگا Oka پر روسیوں کی معاہدہ توڑ کر وہ ماسکو پہنچ گیا اور اس کو چلا ڈالا اور اسی سے اسے "تخت آغاں" کا لقب ملا۔ اس سے اگلے سال جب زار نے قازان اور استراخان کی بابت خان کا مطالبہ بد کر دیا تو اس نے پھر اپنا حملہ کیا، لیکن اسے ماسکو کے قریب مولوڈی Molody پر سخت شکست دی گئی۔ پولینڈ کے انتخابات میں روس کے خلاف اس کا ترکوں کے ساتھ تعاون زیادہ کامیاب رہا (دیکھئے Bellaten، عدد ۳۹، ص ۳۹)۔ اس کی وفات صفر ۹۸۷ھ اپریل - مئی ۱۵۷۷ء میں ہوئی۔ اس کا عہد حکومت اس لیے امتیاز رکھتا ہے کہ ایک طرف تو اس میں قریب کی خانی ریاست اور روس کے دوسری طرف والگا کے طاق میں آلتون اردو یعنی چنگیزی ورے کے لیے نمائندہ کن کشمکش جاری رہی اور دوسری طرف کریمیا سلطنت، تاتاریہ کا کامل جزو بن گیا۔ سوائے اس جامع مسجد کا بھی ذکر مناسب ہے جو خان نے ۱۵۷۱/۱۵۷۲ء میں بہنام Gzileve تعمیر کی۔ خان کے بعد اس کے اٹھارہ فرزندوں میں سے چھٹے خان ہوئے (وگ بہ گراہی اور آغاں)۔

کلام کا نہایت عمدہ انتخاب دیا گیا ہے، جو تاریخ ادبیات خصوصاً آٹھویں اور نویں صدی ہجری/چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی کے شعرا کے مطالعے کے لیے بہت مفید ہے، لیکن اس کی باد دانتوں میں منوک، امرا اور شاعروں کے حالات کے بیان میں بہت سی غروگراشتیں پائی گئی ہیں اور ساتھ ہی ان کے اوصاف شعر گوئی پر جو فیصلے صادر کیے گئے ہیں ان میں جا بجا ناقدانہ شعور کی کمی نظر آتی ہے۔

فتح علی شاہ کا سب سے بڑا بیٹا بھی دولت شاہ کہلاتا تھا۔ وہ شہر نوا میں ۷ ربیع الآخر ۱۲۰۳ھ/ ۶ جنوری ۱۷۸۹ء کو پیدا ہوا۔ برسوں تک وہ کرمان شاہان کا حاکم رہا۔ محمود پاشا کے مقابلے میں لشکر کشی سے واپسی پر ۲۶ صفر ۱۲۰۷ھ/ ۳ دسمبر ۱۸۲۲ء کو وفات پائی۔ اس نے ... نظامیں اپنی نادگر چھوڑی ہیں۔

- ۱) (تذکرۃ الشعراء) بی ۱۸۸۷ء
 ۲) تذکرۃ الشعراء، طبع براؤن G. Browne، لندن ۱۹۰۱ء، ترجمہ: Geschichte der schönen Rede
 ۳) Künste Persiens... از J. Von Hammer
 ۴) ۱۸۱۸ء (۳) رضا فی خان: مجمع الفصحاء، ۱: ۲۶ (۴)
 ۵) Belin در ۱۸۶۱ء (۵) ۱: ۳۵ (۵) براؤن ج
 ۶) بعد اشارہ: (۶) وہی مصنف، ۲: ۱۲۸
 ۷) of Daulat-Shah، IRAS، ۱۸۹۹ء، ص ۳۷ تا ۳۸
 ۸) دوسرے تذکروں کی فہرست کے لیے دیکھئے (۸) Pl. ۱: ۱۰۷
 ۹) ۲۱۶ تا ۲۱۷ (۹) سید عبدالغنی: تذکرۃ دولتشاہ فی تذکرۃ درمناحت، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور
 ۱۰) (۱۱) Masani، ۱: ۱۱۱

* دولت گراہی تخت: ۱۵۱۸ء تا ۱۵۱۹ء
 ۱۵۷۱/۱۵۷۲ء، المطلب بہ تخت آغاں (فاتح دارالسلطنت) ۱۵۷۱/۱۵۷۲ء سے ۱۵۷۲/۱۵۷۳ء قریم (کریم) کا خان رہا۔ وہ مبارک گراہی کا فرزند تھا اور ۱۵۳۲/۱۵۳۳ء میں سعادت گراہی خان نے اسے "قائد" کے

(نخلستان) کے نام میں بھی تغیر ہو گیا ہے، اور اب اسے کم سے کم پچھلی صدی سے الجوف کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے (الجوف)، یعنی ”وسیع نشیب“ گول حوض، چوڑا اسفنجی صحن، ایک وادی یا قطعہ زمین جس میں پانی جمع ہوتا ہو۔“ یا توت، جو اس مقام کا کسی قدر طویل ذکر کرتا ہے، اس کے نام کے بدل جانے سے ناواقف ہے۔

دومہ (اس کا تلفظ دومہ ناقابل قبول ہے) غالباً ایک آراسی لفظ ہے، قدیم فضلاء عرب مثلاً ابن الکلبی اور الزجاجی کے کہنے کے مطابق یہ نام حضرت اسمعیلؑ کے لڑکوں میں سے ایک کے نام (دوم یا دومان یا دوما) سے ماخوذ ہے۔ اتفاق کی بات ہے کہ دوما نام بائبل میں بھی آیا ہے (سفر التکوین، ۲۵: ۱۴، سفر اخبار، ۱: ۳) اور وہاں اسے ایک اسمعیلی قبیلے کا نام بتایا گیا ہے۔ عرب مصنفین نے کہا ہے کہ جب تمامہ اسمعیل کے کثیر التعداد گھوڑانوں کے ایسے کافی چراگاہیں مہیا نہ کر سکا تو ان کا مذکور الصدر فرزند اس علاقے میں ہجرت کر کے چلا آیا اور اسی کے نام پر اس علاقے کا نام بھی دومہ پڑ گیا اور اس نے یہاں ایک قلعہ تعمیر کیا۔ یہ واقعہ ہے کہ اسلام سے پہلے ہی دومۃ الجندل میں ایک قلعہ موجود تھا اور اس کے نام مارد کا ایک قدیم مثل میں ذکر آیا ہے جس کی بنیاد اس فقرے پر ہے جو الزباء سے منسوب ہے (تمرۃ مارد وعزالا بلق)۔ ایک قدیم قلعے کے کچھ بچے کھجے نشانات پچھلی صدی تک باقی تھے اور Euting نے ۱۸۸۳ء میں ان کا ایک خاکہ بھی بنایا تھا۔ یہ قلعہ پتھر کا بنا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے گرد ایک دیوار بھی پتھر ہی کی تھی، ان تعمیرات ہی کی بنا پر اس کے نام کے ساتھ الجندل کا لفظ بڑھایا گیا تھا جو ایک اسم جنس ہے جس کے معنی پتھر کے ہیں۔ قبل اسلام یہاں وہ بت کی پرستش ہوتی تھی۔

یا توت اور دیگر عرب جغرافیہ دان جہیں بتاتے

ماخوذ : (۱) محمد رضا: السج السیاری اخبار سلوک التاتار، طبع کالم بیگ، تازان ۱۸۳۲ء، ص ۹۳ تا ۱۰۰؛ (۲) حلیم کرے: کلین خانان، استانبول ۱۲۷۸ء، ص ۱۸ تا ۲۱؛ (۳) عبدالغفار: عمدة التواریخ، در TOEM، ص ۱۱۲؛ (۴) H. Feyiz-khanoglu-V. Zernov، Kicim yurtuna wa ol tarastargha da'ir bolghan yartolitor wa haqlar، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۶۴ء، ۱۸۶۴ء، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۶۴ء، ص ۵۵۸ بعد؛ (۵) فریدون: منشآت السلاطین، استانبول ۱۲۶۵ء، ۲: ۵۵۸ تا ۵۵۹؛ (۶) اے۔ رفیق: Bahri Khazar - Karadeniz، ۱۸۵۹ء، ج ۸، عدد ۳۳، ص ۱ تا ۱۴؛ (۷) H. Inalcik، Osmanlı-Rus tckabehinin menşei ve Don-Volgakanalı teşebbüsü، Belleten، ج ۱۲، عدد ۴۶، ص ۳۶۸ تا ۳۹۰، (HALIL INALCIK)

* دومۃ باغیچہ : [مطلوبہ باغیچہ]، رک بہ استانبول [۲: ۵۶۲]۔

* دومۃ الجندل : وادی سرخان کے سرے پر ایک واحہ (نخلستان)؛ وادی سرخان جنوب مشرق سے شمال مغرب کی طرف پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے ایک سرے پر وسطی عرب اور دوسرے سرے پر حوران اور شام کا کوہستان ہے اور یہ وادی دونوں کو ملاتی ہے؛ اور اس لیے یہ مدینے اور دمشق کے درمیان سب سے زیادہ سیدھے راستے پر واقع ہے جو تقریباً پندرہ دن کی مسافت پر مدینے سے اور تقریباً سات دن یا اس سے زیادہ کی مسافت پر دمشق سے پیدل چل کر ہے۔ یہ واحہ (نخلستان) ایک غائط (کھڈ) یا خبت (وسیع نشیبی زمین) میں ہے جس کا طول بقول یا توت پانچ پرسنگ، یا موجودہ اصطلاح میں حافظ وہبہ کے کہنے کے مطابق، تین میل اور عرض آدھ میل اور گہرائی ارد گرد کی صحرا کی بلند سطح سے پانسو فٹ نیچی ہے۔ اس علاقے کی ہیئت کے تحت اس واحہ

ہیں کہ دُومۃ نام کے تین مقام ہیں : ایک دمشق کے قریب (جہاں اب تک بھی ایک دُومۃ موجود ہے)، اور دوسرا الحیرۃ کے پاس، اور تیسرا جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں، شمالی عرب میں تھا۔ ناموں کے اس لوارد کی وجہ سے بعض عربی تاریخی مآخذ میں ایک التباس پیدا ہو گیا ہے؛ اور بعض حوادث جو دوسرے مقامات میں رونما ہوئے ان کو دُومۃ الجندل کی طرف منسوب کر دینے کا رجحان پایا جاتا ہے۔

دُومۃ الجندل کے باشندے بنو کنانہ تھے کیونکہ بنو کلب کی اس شاخ کا زیادہ تر حصہ اسلام سے پہلے شمالی عرب کے صحراء السواءۃ کے اندر، شمال میں دُومۃ الجندل کے مسطح میدان سے لے کر، جنوب میں طی کے دو پہاڑ اجا و سُنَی [رک باں] تک، پھیل گیا تھا۔ بنو کلب کے عام اجتماع میں جو اس لیے منعقد ہوا تھا کہ دو فریقوں کے درمیان باہمی جنگ کا خاتمہ کر دیا جائے، یہ علاقہ ان کی چراگاہوں کے لیے دیدیا گیا تھا (Register : F. Wustenfeld، بذیل مادۃ کلب بن ویرہ : قب البکری : معجم : ص ۳۳ بعد)۔ خود وَاَحۃ (نخلستان) میں کچھ لوگ الحیرۃ کے ”عباد“ میں سے آکر بس گئے تھے (البلاذری میں ان کا نام ”عباد الکوفۃ“ آیا ہے لیکن ڈخویہ نے اس کی تصحیح ”عباد الحیرۃ“ کی ہے)، جس کا مطلب یہ ہوا کہ عیسائیوں کی بھی کچھ تعداد تھی جو اس شہر میں رہتی تھی اور یہ تَنُوخ سے الگ تھے جو ارد گرد کے اضلاع کے خانہ بدوش لوگ تھے۔ گمان کیا جاسکتا ہے کہ یہ عباد جو اس وَاَحۃ (نخلستان) میں رہتے تھے تجارت پیشہ تھے اور کچھ لوگ زراعت بھی کرتے تھے، کیونکہ دُومۃ الجندل کا شمار شمالی عرب کی بڑی منڈیوں میں تھا۔

دُومۃ الجندل کو قدیم اسلام میں ایک خاص شہرت حاصل رہی ہے، خصوصاً اس وجہ سے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے فتح کرنے کے لیے

تین غزوات کیے : اول غزوہ ۵ھ (۶۲۶ء) میں جس میں خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قائد العیش تھے۔ اس کا کچھ نتیجہ یہ نکلا کہ وَاَحۃ کے باشندے لشکر کے پہنچنے سے پہلے ہی تتریت ہو گئے تھے؛ دوسرا غزوہ ۶ھ (۶۲۷ء) میں پیش آیا جس کے قائد العیش حضرت عبدالرحمن بن عوف تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سردار الأصبغ بن عمرو الکلبی اسلام میں داخل ہو گیا۔ تیسرے غزوے کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تبوک سے تیاری کی اور خالد بن ولید کو اس مہم پر ۷ھ میں بھیجا۔ خالد بن ولید نے وَاَحۃ (نخلستان) کے شہر پر قبضہ کر لیا اور وہاں کی آبادی پر بھاری تاوان جنگ عائد کیا اور سردار اَکْبَر بن عبدالملک الکندی السُکونی [رک باں] پر زور ڈالا کہ ملنے جا کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے معاہدہ صلح کرے۔ اس صلحنامے کی اصل عبارت اب تک محفوظ چلی آتی ہے، اور ممکن ہے کہ بعد میں اس کے اندر جہاں جہاں کچھ بڑھایا بھی گیا ہو (البلاذری : الفتح) ص ۹۱ بعد؛ ابن سعد، ۱ : ۲، ۳۶ بعد؛ یاقوت : ج ۲، ص ۶۲؛ لوز دیکھیے ایم حمید اللہ : وثائق، عدد : ۱۹۱ : Skizzen und Vorarbeiten : Wellhausen : ص : ۱۳۳، حاشیہ ۳ و ص ۴۰۴، حاشیہ ۱ : Caetani : Annali، ۹ ہجری اور ص ۴۵ حاشیہ ۲)۔ ان سرداروں کے، جن سے مسلمانوں کو ۵۶ھ اور ۹ ہجری میں واسطہ پڑا، ناموں میں اختلاف، نیز ان کے قبائل کی اصل میں تفاوت جن میں ایک کلبی اور ایک کندی تھا، نیز اَکْبَر کے حالات میں روایات کے تضاد کی وجہ سے ڈخویہ نے کچھ سوالات اٹھائے ہیں اور کائناتی نے کچھ شکوک ظاہر کیے ہیں جو حد سے متجاوز معلوم ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ان خالہ بدوش کلبیوں (بنو کلب) میں جو ایک بڑا رقبہ منبھالے ہوئے تھے اور جن کے اپنے الگ الگ سردار تھے اور ان مستقل باشندگان وَاَحۃ میں جن کے افراد زراعت پیشہ، سوداگر

ڈخوبہ کا استدلال بہت مطابقت رکھتا ہے اور (Palestina) Modirkov ج ۱، ص ۵۳۳ (بعد) نے اسے مان لیا ہے اور کتابی نے بھی تسلیم کیا ہے۔ اس بنا پر آئینہ کا قتل، اگر وہ قتل تھا، تو عراق میں واقع ہوا۔ ہمیں یہاں یہ اضافہ کرنا ہے کہ عمرو بن العاصؓ کو دوران "ردہ" میں حکم ملا تھا کہ ویدعہ کلبی سے قتال کرے جو بعض دیگر کلبیوں کے ساتھ باغی ہو گیا تھا اور دومۃ الجندل میں رہا کرین ہوا، رہا ابن الامیخ تو وہ تو اسلام کا وفادار ہی رہا تھا (الطبری، ج ۱، ص ۱۸۷، ۱۸۸)۔ شاید یہ عمرو بن ہون جنہوں نے دومۃ الجندل فتح کیا، مگر یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کارنامہ عیاض بن غنم کی طرف منسوب کیا جائے۔ فی الواقع قصہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ ایک فوجی دستہ اس کی قیادت میں مدائن سے روانہ ہوا تھا اور اس کی غرض بھی یہی تھی مگر وہ مشکلات میں پھنس گیا۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ عیاض اس واقعہ (نخلستان) پر ۶۳۲ھ/۶۳۳ء میں حکومت کرتا تھا (الطبری، ۱: ۲۱۳۶)۔ اسی کے مطابق یہ نہ دومۃ الجندل میں ہوا نہ الحیرہ کے قریب کے دومۃ میں، جیسا کہ ڈخوبہ نے کہا ہے (کتاب مذکور، ص ۱۶، بعد)۔

تاریخ اسلام میں ایک اور موقع پر، ایک بڑے واقعے کے سلسلے میں، دومۃ الجندل کا نام بھی باعث نزاع بن گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ صفین میں یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ حکمین ابو موسیٰ الاشعریؓ [رک بان] اور عمرو بن العاصؓ [رک بان] جب علیؓ اور معاویہؓ کی باہمی نزاع کے بارے میں اپنی تحقیقات مکمل کر چکیں تو اسی نخلستان (واقعہ) میں اکٹھے ہوں اور اسی جگہ اپنا فیصلہ سنائیں؛ لیکن بعض مآخذ اکٹھے ہونے کی جگہ اذرح [رک بان] بتاتے ہیں۔ اس کی توجیہ یہ کی گئی ہے کہ حقیقت میں ان کا اجتماع مختلف تاریخوں میں دو دفعہ ہوا (Supra)، بذیل مادۃ علی بن

اور مقام (نہ) اور غزوات دومۃ سے پہلے ہی وہاں آ رہے تھے، فرق سمجھ لیا جائے جس کی نے مسعودی (نوی تاریخی کی ج ۱، ص ۱۸۷) کو بہت سے اشکال حل ہو سکتے ہیں۔ آئینہ کے حالات کے مان میں یہ ملحوظ خاطر رہے کہ یہ کہا گیا ہے کہ وہ واقعہ جیوڑ کر عراق میں آ بسا تھا اور دومۃ الجندل کی یادگار کے طور پر اپنے عراقی گور کا نام دومۃ رکھا تھا؛ ایک اور روایت میں جسے البلاذری (کتاب مذکور، ص ۶۳) اور باقوت (ج ۲، ص ۶۷۷) نے محفوظ رکھا ہے، اس کے برخلاف یہ کہا گیا ہے کہ اس عربی واقعہ کو آئینہ دومۃ الجندل اس لیے کہتا تھا کہ یہ اس دومۃ سے جو الحیرہ کے قریب تھا اور جہاں سے وہ خود آتا تھا، مجز ہو جائے۔ ان میں سے پہلی روایت غالباً زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے، کیونکہ اس بات کے تسلیم کرنے کے کافی وجوہ ہیں کہ اس واقعہ (نخلستان) کا نام دومۃ الجندل قدیم سے چلا آتا ہے۔

بعض مآخذ میں دومۃ الجندل کا نام اس سلسلہ بیان میں آتا ہے جو ۶۳۲ھ/۶۳۳ء میں خالد بن الولید کے مشہور واقعہ عبور صحرائے قلعہ رکھتا ہے۔ جب خالد بن الولید سے کہا گیا کہ شام کے مسلم عساکر سے جس قدر جلد ہو سکے دوبارہ جا ملے، کیونکہ وہ خطرے میں گھر گئے تھے، تو حضرت خالدؓ روانہ ہو گئے اور کہا گیا ہے کہ راستے میں دومۃ الجندل پر حملہ کیا اور آئینہ کو قتل کر دیا۔ ڈخوبہ نے (کتاب مذکور، ص ۱۵، بعد) یہ خیال پیش کیا ہے کہ یہاں الجندل کا لفظ خواہ مخواہ بڑھا دیا گیا ہے اور کہا ہے کہ مآخذ میں جو دومۃ یہاں مذکور ہے اس سے مراد الحیرہ کا دومۃ ہے؛ یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خالدؓ نے اتنا چکر لگایا ہو جو انہیں اپنے راستے سے دور ہٹا دے اور یلتاز میں دیر لگا دے۔

کے بعد اسے اپنی مملکت میں شامل کر لیا (۱۹۳۱ء)۔ اس کے فوراً بعد شرق اردن نے جنوب کی طرف اپنی سرحد کو النفود تک بڑھانے کی کوشش کی، لیکن ابن سعود سختی کے ساتھ اڑ گیا اور (۱۹۲۳ء-۱۹۲۴ء) کی گزیت کی مجلس میں اس مسئلے کا کچھ فیصلہ نہ ہو سکا۔ ابن سعود نے حجاز اور عراق کے خلاف وسیع عسکری کارروائیوں کے دوران میں شرق اردن پر بھی یورش کی۔ جب ابن سعود اور سر۔ جی کلرٹن G. Clayton کے درمیان حد بندی کا معاہدہ ہوا تو اس میں سرحدیں مین کر دی گئیں (۴ نومبر ۱۹۲۵ء)۔ اس وقت سے وادی سرخان مع الجوف [رگ بان] اور قریبات الملح نجد کا حصہ قرار پا گئے (OMJ جلد ۱، تا ۸، ۱۹۲۲ء-۱۹۲۸ء) (بمدد اشاریہ)۔

خانہ بدوش اور نیم خانہ بدوش قبیلے جو اس علاقے میں جنوب میں یتیم سے لے کر شمال میں کرک تک اور مشرق میں نفود اور وادی سرخان تک بود و باش رکھتے ہیں ان کو ایک ہی نام العویطات [رگ بان] کے تحت جمع کر دیا گیا ہے۔ پچھلی صدی کے دوران میں چند یورپی سیاحوں نے اس واحد (نخلستان) کی سیر کی: ان کے اکتشافات کا بیان Hogarth نے ملے گا۔

مآخذ: (۱) واقدی، طبع ولہاؤزن: ص ۱۷۳، ۱۷۴، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۹۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰۵، ۱۴۰۶، ۱۴۰۷، ۱۴۰۸، ۱۴۰۹، ۱۴۱۰، ۱۴۱۱، ۱۴۱۲، ۱۴۱۳، ۱۴۱۴، ۱۴۱۵، ۱۴۱۶، ۱۴۱۷، ۱۴۱۸، ۱۴۱۹، ۱۴۲۰، ۱۴۲۱، ۱۴۲۲، ۱۴۲۳، ۱۴۲۴، ۱۴۲۵، ۱۴۲۶، ۱۴۲۷، ۱۴۲۸، ۱۴۲۹، ۱۴۳۰، ۱۴۳۱، ۱۴۳۲، ۱۴۳۳، ۱۴۳۴، ۱۴۳۵، ۱۴۳۶، ۱۴۳۷، ۱۴۳۸، ۱۴۳۹، ۱۴۴۰، ۱۴۴۱، ۱۴۴۲، ۱۴۴۳، ۱۴۴۴، ۱۴۴۵، ۱۴۴۶، ۱۴۴۷، ۱۴۴۸، ۱۴۴۹، ۱۴۵۰، ۱۴۵۱، ۱۴۵۲، ۱۴۵۳، ۱۴۵۴، ۱۴۵۵، ۱۴۵۶، ۱۴۵۷، ۱۴۵۸، ۱۴۵۹، ۱۴۶۰، ۱۴۶۱، ۱۴۶۲، ۱۴۶۳، ۱۴۶۴، ۱۴۶۵، ۱۴۶۶، ۱۴۶۷، ۱۴۶۸، ۱۴۶۹، ۱۴۷۰، ۱۴۷۱، ۱۴۷۲، ۱۴۷۳، ۱۴۷۴، ۱۴۷۵، ۱۴۷۶، ۱۴۷۷، ۱۴۷۸، ۱۴۷۹، ۱۴۸۰، ۱۴۸۱، ۱۴۸۲، ۱۴۸۳، ۱۴۸۴، ۱۴۸۵، ۱۴۸۶، ۱۴۸۷، ۱۴۸۸، ۱۴۸۹، ۱۴۹۰، ۱۴۹۱، ۱۴۹۲، ۱۴۹۳، ۱۴۹۴، ۱۴۹۵، ۱۴۹۶، ۱۴۹۷، ۱۴۹۸، ۱۴۹۹، ۱۵۰۰، ۱۵۰۱، ۱۵۰۲، ۱۵۰۳، ۱۵۰۴، ۱۵۰۵، ۱۵۰۶، ۱۵۰۷، ۱۵۰۸، ۱۵۰۹، ۱۵۱۰، ۱۵۱۱، ۱۵۱۲، ۱۵۱۳، ۱۵۱۴، ۱۵۱۵، ۱۵۱۶، ۱۵۱۷، ۱۵۱۸، ۱۵۱۹، ۱۵۲۰، ۱۵۲۱، ۱۵۲۲، ۱۵۲۳، ۱۵۲۴، ۱۵۲۵، ۱۵۲۶، ۱۵۲۷، ۱۵۲۸، ۱۵۲۹، ۱۵۳۰، ۱۵۳۱، ۱۵۳۲، ۱۵۳۳، ۱۵۳۴، ۱۵۳۵، ۱۵۳۶، ۱۵۳۷، ۱۵۳۸، ۱۵۳۹، ۱۵۴۰، ۱۵۴۱، ۱۵۴۲، ۱۵۴۳، ۱۵۴۴، ۱۵۴۵، ۱۵۴۶، ۱۵۴۷، ۱۵۴۸، ۱۵۴۹، ۱۵۵۰، ۱۵۵۱، ۱۵۵۲، ۱۵۵۳، ۱۵۵۴، ۱۵۵۵، ۱۵۵۶، ۱۵۵۷، ۱۵۵۸، ۱۵۵۹، ۱۵۶۰، ۱۵۶۱، ۱۵۶۲، ۱۵۶۳، ۱۵۶۴، ۱۵۶۵، ۱۵۶۶، ۱۵۶۷، ۱۵۶۸، ۱۵۶۹، ۱۵۷۰، ۱۵۷۱، ۱۵۷۲، ۱۵۷۳، ۱۵۷۴، ۱۵۷۵، ۱۵۷۶، ۱۵۷۷، ۱۵۷۸، ۱۵۷۹، ۱۵۸۰، ۱۵۸۱، ۱۵۸۲، ۱۵۸۳، ۱۵۸۴، ۱۵۸۵، ۱۵۸۶، ۱۵۸۷، ۱۵۸۸، ۱۵۸۹، ۱۵۹۰، ۱۵۹۱، ۱۵۹۲، ۱۵۹۳، ۱۵۹۴، ۱۵۹۵، ۱۵۹۶، ۱۵۹۷، ۱۵۹۸، ۱۵۹۹، ۱۶۰۰، ۱۶۰۱، ۱۶۰۲، ۱۶۰۳، ۱۶۰۴، ۱۶۰۵، ۱۶۰۶، ۱۶۰۷، ۱۶۰۸، ۱۶۰۹، ۱۶۱۰، ۱۶۱۱، ۱۶۱۲، ۱۶۱۳،

جمہوریہ ترکیہ میں منتقل ہونا پڑا (۱۹۲۳ تا ۱۹۲۴ء)۔ زیادہ تر وہ استانبول میں آباد ہوئے، لیکن ان کے چھوٹے چھوٹے گروہ دوسرے شہروں میں بھی بس گئے۔ وطن کی یہ تبدیلی اور اس سے پیدا ہونے والے انتشار، سلاویک کے خالص یہودیہانہ ماحول سے قطع تعلق، غیر مذہبی ترکی قومیت کے مکتب فکر کے اثرات، ان سب عناصر نے مل کر دوئمہ کی نئی بود میں باہمی لا تعلقی اور بے اعتنائی کے روز افزوں رجحان میں اور بھی اضافہ کر دیا، تاہم اس کا جماعتی وجود، بالخصوص سماجی یہود کے میدان میں برقرار رہا۔ استانبول میں کئی ہزار دوئمہ کی آمد کے باعث ۱۹۲۴-۱۹۲۵ء میں ترکی اخبارات میں قومی ادغام کے مقابلے میں فرقہ دارانہ علیحدگی کے موضوع پر گرما گوم بحثیں ہونے لگیں۔ اب ان میں مسلمانوں کے ساتھ شادی بیاہ کا رواج آہستہ آہستہ پھیل رہا ہے اور مشکلات کے باوجود وہ جدید ترک معاشرے میں جذب ہوتے جا رہے ہیں۔

مآخذ : (۱) تاریخ یہود پر S. H. Graetz اور Dubnow اور S. W. Baron کی عمومی تصنیفات میں دوئمہ کے حالات بھی ملیں گے؛ (۲) یہودی تصوف پر G. Scholem کی قابل قدر تحقیقات کا خلاصہ *The Jewish People*، ج ۱، نیو یارک ۱۹۴۸ء میں شامل ایک خاکے میں ملتا ہے؛ نیز (۳) وہی مصنف *Main Trends in Jewish Mysticism*، نیویارک ۱۹۴۹ء بالخصوص ص ۲۸۷ ببعد؛ (۴) وہی مصنف *Shabbetai Sebi* (عبرانی) ج ۲، جلد ۱، تل ابیب ۱۹۵۷ء؛ (۵) وہی مصنف : مقالات، در *Zion*، ج ۶ و *Kiryat Sepher*، ج ۱۸ تا ۱۹؛ (۶) وہی مصنف : *Die Kripto-Judische Sekte der Dönme (Sabbatianer) in der Türkei*، در *Namen*، ج ۱ (۱۹۶۰ء)؛ ۶۳ تا ۱۲۲؛ *Encyclopaedia Hebraica*، ج ۱۱ (۱۹۵۹ء)؛ بذیل مادہ (از L. Ben. Zvi) و (۸) *إثبات*، ج ۳ : ۶۴۶ ببعد؛ (۹) *The exiled and the redeemed* : L. Ben Zvi

کہ یہ تقسیم معاشرتی طبقہ کسی سے غیر متعلق نہ ہو، چنانچہ اس کا اظہار بالوں اور لباس کی تراش خراش کی صورت میں ہوتا ہے۔ وہ ایک علیحدہ محلے میں رہتے تھے۔

یہ لوگ اپنے آپ کو ایمان والوں (نَسَیْمِیْم) کی جماعت سمجھتے ہیں۔ اس میں سخت رازداری سے کام لیا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی دور کے بعد ان کی ادبی کارکردگی عبرانی، آرمی، یہودی، ہسپانوی اور ترکی زبانوں میں نظموں اور دعاؤں تک محدود رہ گئی تھی۔ مآخذ کی کئی اور رازداری کے باعث اس فرقے کے عقائد کا مطالعہ مشکل اور اس کی تاریخ پیچیدہ ہو کر رہ گئی ہے۔

۱۷۰۰ء میں چند گھرانے ایسے تھے جن کا تعلق مرکزی سلاویکی Salonika گروہ سے تھا۔ ۱۹۰۰ء کے قریب ان کی تعداد کا اندازہ دس ہزار لگایا گیا تھا۔ انہیں تجارت، صنعت و حرفت اور انتظامی ملازمتوں میں نمائندگی حاصل تھی۔

انیسویں صدی کے اواخر میں مغرب سے متاثر نوجوانوں کا ایک روز افزوں طبقہ معلوموں، ڈاکٹروں، قانون دانوں اور صحافیوں کی شکل میں سامنے آیا اور انہوں نے ترکیہ کی عوامی زندگی میں حصہ لیا، بعض اوقات انہیں کامیابی بھی نصیب ہوئی۔ انقلاب ۱۹۰۸ء کے بعد ”نوجوان ترکوں“ کے دور میں جاوید بے کا عروج اس کی ایک نمائندگی مثال ہے۔

عام طور پر مسلمان اس فرقے کے بارے میں بے نیاز تھے، لیکن کبھی کبھار باز پرس اور پکڑ دھکڑ کی دو جیل بڑی تھی (مثلاً ۱۸۵۹ء، ۱۸۷۰ء اور ۱۸۷۵ء میں) دوئمہ کی اصل کے بارے میں ناسندیدگی کے اظہار کی مثالیں بھی نایاب نہیں۔

یونانی اور ترک آبادی کے باہمی تبادلے کے ساتھ دوئمہ کے لئے دور کا آغاز ہوا۔ سلاویکی دوئمہ کو مجبوراً اپنے آبائی شہر کی سکونت ترک کر کے

انہوں نے عربی میں فلسفے اور تصوف کی مشہور کتابوں کی بہت سی شرحیں اور عقائد، تصوف اور فلسفے پر رسائل لکھے۔ اُن کی التفاتِ لائق (م ۱۳۹۵ء) ۱۳۸۹ء کی تہذیب المنطق والکلام کی شرح، لکھنؤ ۱۲۶۳، ۱۲۹۳ء (مع حواشی از میر زاہد) اور رسالۃ الزوراء، جو ۱۳۶۵/۸۴۰ء میں مکمل ہوا (قاہرہ ۱۳۲۹ء مع تعلیقات) دونوں چھپ چکے ہیں۔ فارسی میں ان کی سب سے زیادہ مقبول عام تصنیف توامع الاشراق فی مکالم الاخلاق ہے۔ یہ اخلاق جلالی کے نام سے مشہور ہے (طبع سنگی کلکتہ ۱۲۸۳ء، ۱۸۶۶-۱۸۶۷ء)۔ اس کا انگریزی میں ترجمہ W. T. Thompson نے کیا جس کا نام *Practical philosophy of the Muhammedan people* (لنڈن ۱۸۳۹ء)۔

یہ کتاب نصیرالدین طوسی کی اخلاق ناصری کا ”بہ طرز جدید“ اور ”مقبول عام“ بیان ہے جسے آق قویونلو بادشاہ اوزون حسن کے حکم سے لکھا گیا اور اسی کے نام سے منسوب ہے (فارسی متن، ۱۶)۔ جلال الدین نے اس ممنونیت کا اعتراف بھی کیا ہے (۳۲۱)۔ اخلاق ناصری تین حصوں میں منقسم ہے: علم اخلاق، تدبیر منزل اور سیاست مدن؛ پہلا حصہ ابوعلی احمد بن یعقوب بن مسکویہ کے عربی رسالہ کتاب طہارۃ الاعراق فی تہذیب الاخلاق سے ماخوذ ہے؛ دوسرا حصہ Bryson سے بواسطہ مقالۃ بوعلی بن سینا تدبیر المنزل، لیا گیا ہے؛ اور تیسرا الفارابی کی المدینۃ الفاضلۃ اور کتاب السیاسة المدینۃ پر مبنی ہے۔ اخلاق جلالی میں بھی اسی ترتیب کا تتبع کیا گیا ہے۔ جلال الدین نے بھی نصیرالدین طوسی کی طرح بدلائل ایک اعلیٰ ملکی قانون، ایک فرمانروا اور ایک سنگہ رائجہ کی ضرورت ثابت کی ہے۔ قانون سے اس کی مراد شریعت ہے اور فرمانروا سے ایسا شخص مراد ہے جو اللہ کی نائید کے ساتھ ممتاز ہو اور اپنے اندر ایسی صفات

فلا فلما ۱۹۵۷ء: (۱) A. Danon (۱۰) در ۱۸۹۷ء: (۱۱) Farewell to Salonic: Sciaky نیویارک ۱۹۳۶ء باب ۹: (۱۲) A. Struck در ۱۹۰۲ء: (۱۳) Nouveaux documents sur sabbetai: A. Calants: E. E. Ramsaur Jr. (۱۴) ۱۹۳۵ء: (۱۵) Sabatay Sevi: A. Gova: استانیول بدون تاریخ (۱۶) مقالہ از Gordlevsky در ۱۹۲۶ء: (۱۷) دوتہ متون R. Molho، I. Ben Zvi، M. Alias اور G. Scholem نے شائع کئے ہیں: تب (۱۸) Sefir: not ج ۳، بیت المقدس ۱۹۹۰ء۔ (M. PERLMANN)

* الدوانی: محمد بن اسمٰعیل جلال الدین، ۸۸۳ء/۱۳۲۷ء میں دوان ضلع گازرون میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد یہاں کے قاضی تھے جو خلیفہ ابوبکرؓ کی اولاد میں سے تھے، اس لیے الصدیقی کہلاتے تھے۔ انہوں نے اپنے والد سے تعلیم پائی۔ اس کے بعد شیراز گئے اور وہاں مولانا، محی الدین گوشہ کناری اور مولانا ہمام الدین گلباوی اور صفی الدین الایچی کی شاگردی کی۔ وہ یوسف بن جہان شاہ قراوقونلو کے زمانے میں صدر کے عہدے پر مامور رہے اور وہاں سے مستعفی ہو کر مدرسہ بیگم میں مدرس ہو گئے جسے ”دارالایام“ بھی کہتے تھے۔ آق قویونلو کے زمانے میں وہ فارس کے قاضی مقرر ہوئے۔ جب آق قویونلو کی مملکت کے زوال پر ملک میں افراطی بھیلی اور شاہ اسمعیل صفوی سے لڑائیاں ہوئیں تو الدوانی نے لار اور جرون میں پناہ لی۔ ابوالفتح بیگ بیاندر نے شیراز پر قبضہ کر لیا تو وہ گازرون کا ارادہ کر کے روانہ ہوئے مگر ابوالفتح کی لشکرگاہ میں پہنچنے کے تھوڑے دنوں بعد ۱۵۰۲/۸۹۰ء میں وفات پائی اور دوان میں دفن ہوئے۔

سوداگر، کاریگر اور اہل حرفہ؛ (۴) زراعت پیشہ جن کے بغیر، انسانی زندگی کی بقا ناممکن ہے۔ اس کے آگے بھی وہ نصیر الدین طوسی کا تشیع جاری رکھتے ہوئے اخلاقی سیرت کے لحاظ سے آدمیوں کی پانچ قسمیں بیان کرتا ہے؛ (۱) وہ لوگ جو فطرۃ نیک ہیں اور جو دوسروں پر اپنا اثر ڈالتے ہیں، انہیں نصیر الدین زبده خلافتی قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ حاکم کو چاہیے کہ ان کی سب سے زیادہ تعظیم و توقیر کرے اور ان کو تمام طبقوں سے افضل جانے۔ جلال الدین ان کی تفصیل اس طرح پیش کرتا ہے کہ یہ لوگ علمائے شریعت، شیوخ طریقت اور اصحاب تصوف ہیں؛ (۲) وہ لوگ جو فطرۃ نو نیک ہیں لیکن دوسروں پر اپنا اثر نہیں ڈال سکتے؛ (۳) وہ لوگ جو نہ نیک ہیں نہ بد؛ (۴) جو خود بد ہیں لیکن دوسروں پر اثر نہیں ڈالتے؛ (۵) جو خود بھی بد ہیں اور دوسروں پر بھی اپنا برا اثر ڈالتے ہیں۔ اس کے بعد وہ ان ذرائع سے بحث کرتا ہے جو بدی کے دبائے کے لیے اختیار کرنے چاہییں، نیز وہ حاکم کے لیے اپنی رعایا کے معاملات سے شخصی طور پر واقف ہونا ضروری ٹھہراتا ہے۔ کتاب کا آخری حصہ جمہ کی بنیاد پر اخلاق ناصری پر ہے، بہت سے سیاسی مقولات پر مشتمل ہے جو افلاطون اور ارسطاطالیس کی طرف منسوب کیے گئے ہیں۔

جلال الدین کے عرض نامہ کا جو سلطان خلیل کی خاطر اس وقت لکھا گیا جب وہ اپنے والد اوزون حسن کی طرف سے فارس کا والی تھا، انگریزی میں ترجمہ *A civil and Military Review in fars in ۱۸۷۶* V. Minorsky در BSOS ۱۱-۱۲/۱-۱۳۱-۱۳۸ء کر دیا ہے۔
 مآخذ: (۱) خواندہ میر: حبیب السیر (بینی ۱۸۵۷ء)؛
 ۳: ۱۱۱؛ (۲) حسن رسولو: آئین التواریخ (طبع ۱۹۳۱ء)؛ (۳) C. N. Seddon: بڑودہ (۱۹۳۱ء)؛ ۱: ۷۱-۷۲؛ (۴) حاجی مرزا حسن فسائی: فارس نامہ ناصری، تہران، طبع: ۱۹۱۱ء

رکھتا ہو جن سے وہ لوگوں کی درجہ کمال تک رہنمائی کر سکے۔ حکومت اگر صالح ہوگی تو اس صورت میں وہ "امامت" ہے، یا غیر صالح ہوگی تو وہ مبنی بہ جبر ہوگی۔ وہ فرمانروا کے انتخاب اور اس کے عزل کی کوئی شرائط پیش نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک ہر عادل سلطان زمین پر ظل اللہ، خلیفہ اللہ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نائب ہے، بلاشبہ ان معاون میں دوائی اپنے سرپرست، اوزون حسن کو "خلیفہ" کہہ کر خطاب کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ صالح حکمران دنیا میں توازن قائم رکھتا ہے، جس کی بقا کے لیے انسانوں کے باہمی تعاون کی ضرورت ہے۔ جلال الدین تمدن کی دو قسمیں مانتا ہے: صالح اور غیر صالح۔ جلال الدین، الفارابی اور نصیر الدین طوسی کا تشیع کرتے ہوئے ان کا نام مدینہ فاضلہ اور مدینہ غیر فاضلہ رکھتا ہے؛ غیر فاضلہ کی آگے چند قسمیں ٹھہراتا ہے، مدینہ جاہلہ، مدینہ فلسفہ (بد معاشرہ شہر) اور مدینہ خالہ (شرانگیز شہر)۔ مدینہ فاضلہ کے رہنے والوں کے فہم و ذکا کے اعتبار سے کئی درجے ہیں اور ان کے عملی فرائض یا وظائف میں بھی تفاوت ہے۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ہر طبقے کو اس کے مناسب مقام پر قائم رکھا جائے اور ہر فرد کو اسی کام میں لگایا جائے جس کے لیے وہ موزوں ہے اور جس میں وہ مہارت حاصل کر سکتا ہے۔ حکومت صالح یعنی امامت کا کام یہ ہوگا کہ وہ لوگوں کے معاملات کا ایسا انتظام کرے کہ ہر فرد اس قابلیت کی تکمیل کر سکے جو اسے ودیعت کی گئی ہے (۲۶۹)۔ حکومت غیر صالح کا مدار جبر و تعدی پر ہے۔ اس کا کام ہندکان خدا کو غلام بنانا اور خدا کی زمین میں فساد پھیلانا ہوتا ہے۔ تمدن میں توازن برقرار رکھنے کے لیے معاشرے کے اندر چار طبقے قائم کرنے چاہییں؛ (۱) صاحبان علم مثلاً علماء فقہاء، قضاة، کتّاب، ریاضی اور ہیئت کے ماہرین، اطبا اور شعرا (۲) صاحبان شمشیر؛ (۳)

کے درہ بان قرہ داغ کے پہاڑوں میں) نیز کچھ گاؤں بھی اسی نام کے ہیں (مثلاً البستان اور گوک سو کے دربان)۔ اسی طرح کے دوسرے نام یہ ہیں: دیوہ گچندی (Deve Gecidi) (درہ شتر) جو دیار بکر کے شمال مغرب میں ایک گاؤں اور وادی ہے: دیوہ چایر (Deve Çayırı) (چراگہ شتر) گورون (Gürün) کے مغرب میں ایک گاؤں: دیوہ تپسی (Deve Tepesi) (کوہ اول) بلغر داغی کے پہاڑوں میں ایک چوٹی (دیکھیے 'Reise in den Kilik Taurus: T. Kotschly' ۱۸۵۸ء، ص ۲۰۱): دیوہ لی، آباد بستیوں اور پہاڑ کا نام۔ اسی قسم کے نام شام اور عراق میں بھی ملتے ہیں۔ قدیم آشوری زبان میں Gaugamela (آرامی زبان میں گب گملا (Gub Gamela)، جہاں ایک مشہور لڑائی لڑی گئی، کے معنی ہیں "بشت شتر" (Pauly-Wissowa، ۲: ۶۵۷، بذیل مادہ Gaugamela - بیری رئیس نے Piri Reis کے دیوہ بویونی نام کی تین چوٹیوں کا ذکر کیا ہے، جو آناطولی کے افریقی ساحل پر واقع ہیں (کتاب البحریۃ، ص ۱۳۰، ۱۵۱، ۲۳۰)۔ جدید نقشوں میں اسی نام کی ایک اور چوٹی دکھائی گئی ہے جو ذبیہ Dadya کے جزیرہ نما کے مغربی کنارے پر واقع ہے، نیز بحیرہ وان (Lake Van) (رک بان) کے جنوبی ساحل پر بھی دیوہ بویونی نام کی ایک چوٹی ہے۔

(BASIN DARTOC)

دیوہ جی: ایک ترکی لفظ، جس کے معنی شتر بان ہیں۔ یہ نام اپنی چری [دیکھیے Yen Çri] کے بعض دستوں کو دیا گیا تھا، جو اس جماعت کا ایک حصہ تھے اور ان کا کام سامان رسد لانے لے جانے والے دستوں کی نگرانی کرنا تھا۔ ان کے لیے لقب کے طور پر فارسی لفظ شتر بان بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ شروع میں جماعت کے پہلے پانچ اورتا (Ortas) دیوہ جی تھے (D'Ohason کے مطابق جاز)۔ آگے چل کر ان میں اوروں کو بھی شامل کر دیا گیا، وہ اپنی کلفی

Catalogue of: Reiu (۴): ۲۵۰: ۲۱۶۱۸۹۰-۱۸۹۰
'the Persian Manuscripts in the British Museum'
(۵) براکمان: ۲۱۵: ۲۱۶: Storey (۶)
(۸) Browne (۷): ۲۱۶: ۲۱۷: E. I. J.
'Political Thought in Medieval Islam: Resenthol'
تکمیرج ۱۹۵۸ء ص ۲۱۰ تا ۲۲۳: نکات ثنائیہ میں
الدوانی کے اثر و رسوخ کی بابت دیکھئے: (۹) S. Mardin
'The Mind of the Turkish Reformer 1700 1900'
'The Western Humanities Review' ۱۹۶۰، ۱۱: ۱۸

(ANN K. S. LAMBTON)

* دیوہ بویونی: (= دیوہ بویون: Deve Boyun)
لفظی ترجمہ "اونٹ کی گردن"۔ ترکی میں ایک جغرافیائی اصطلاح جو بعض پہاڑی دروں اور پہاڑ کی چوٹیوں کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ سب سے مشہور پہاڑی درہ جسے دیوہ بویونی کہتے ہیں وہ ہے جو اُرز روم [رک بان] اور حسن قلعہ کے بیچ میں ہے اور جس نے اُرز روم کے پہاڑ میں بڑا حصہ لیا ہے۔ اس میں سے گزرنے والی سڑک طرازون [رک بان] سے ایران جاتی ہے اور اُرز روم - کرس ریلوے بھی اس میں سے ہو کر گزرتی ہے (دیکھیے Armenia: F. B. Lynch 'Travels and Studies ۱۸۹۸ء، لندن ۱۹۰۱ء: ۲: ۱۹۳ بعد: Reise nach Innerarabien: E. Nolde ۱۸۹۵ء: ص ۲۶۰ بعد)۔ دیوہ بویونی نام کا ایک اور درہ گول جوک (Goldjuk) کے قریب واقع ہے جس میں ہو کر العزیز - ارغنی (Elâziz-Ergani) (دیار بکر، [رک بان] کی سڑک گزرتی ہے (دیکھیے Voyages: Hommaire de Hell ۱۸۳۰: ۸۳: Voyages: E. Chaput ۱۸۳۰: ۸۳: en Turquie d'études géologiques et géomorphogéniques en ۱۹۳۰ بعد)۔ اس نام کے کچھ درے اور بھی ہیں عین تاب [رک بان] (Gaziantep) اور بستی

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ نہ باقوت نے اور نہ ابوالفداء (۲ : ۲ : ۱۵۰ تا ۱۵۱) نے اور نہ مختصر ابن حوقل کے مصنف نے اس بات کی تحقیق کی کہ دیبل اور دوین ایک ہی شہر کے دو نام ہیں نیز دیکھیے (۱) لانڈن، بذیل مادہ Dwin]

(M. CANARD بتخیص از ادارہ)

دہاس : شمالی افغانستان میں ایک دریا، جس کی تشریح ابن حوقل (ص ۳۲۶) نے کی ہے : "دہاس" یعنی جو دس چٹیاں چلاتا ہے ۔ یہ کدو بابا (خلع بابا) کے دریاؤں میں قندھار کے پہاڑی جھروٹ سے نکلتا ہے اور کئی قدرتی جہازوں میں سے ہوتا ہوا، مندر اور راجہ کروان کے پاس سے گزرتا، عام طور پر شمالی جانب بہتا ہوا، آخر کار بلخ [رگ پان] کے غلیے میں پہنچ جاتا ہے ۔ اس علاقے، خاص کر جنوبی حصے، کی سربراہی اور سرسبزی کا اس دریا پر دار و مدار ہے، خصوصاً سیاہ گرد کا، جو ترمذ کے راستے پر ہے، نیز مضافات کی بستی نوہار کا، چونکہ دہاس بلخ کے لیے اہم ہے اس لیے اسے نمبر بلخ بھی کہتے تھے (مثلاً حدود العالم، ص ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، مگر قرون وسطیٰ میں یہ نام دریا [رگ پان] کا بھی ایک نام تھا ۔ آج کل اس دریا کو بلخ آب کہتے ہیں ۔

مآخذ : (۱) الاصلطوری، ص ۲۸ : (۲) 'Le Strange'

ص ۳۲ : (۳) 'Eränshahr' J. Markwart، ص ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳ : (۴)

(۵) وہی مصنف : 'Wehrat'، لانڈن ۱۹۳۸ء، ص ۲، ۳، ۴، ۵

'Afghanistan' : W. K. Fraser-Tytler (۵) : ۱۶۹ : (۶)

لانڈن ۱۹۵۵ء، مدد اشارجہ بذیل مادہ بلخ : (۷) A. Foucher :

'De Kaboul a Buctres'، در 'La Geographie'، ص ۳۲

۱۹۲۸ء : (۸) نیز دیکھیے مقالہ بلخ کے مآخذ : فلسفے :

(۱) حدود العالم، ص ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷ : (۲) Fraser-Tytler، ص ۱۶۹

(B. SPULER بتخیص از ادارہ)

دہر : زمانہ، خصوصاً غیر منہادی استداد زمانہ (۱) (۲) ابن البیضاوی : اوار التزیل، ۱ : ۱۶۰ : (۳) اسلام سے

میں ہکلے کا پر لکھا کرتے تھے (دیکھیے سورج : Soigne) ۔ بد لوگ جب دیوان میں حاضر ہوتے تو مٹھلی وردی پہنتے تھے، جسے مسور اور لٹکس کے نرم بالوں سے آراستہ کیا جاتا تھا ۔ "اورتا" میں دوہ جی افسروں کو بڑی قدیم کا درجہ حاصل تھا ۔ مرسیگی Marsigli کے بیان کے مطابق مرکزی حفاظی قلعوں کے افسران اعلیٰ مقرر کرتے وقت ہمیشہ پہلی بلخ اورتا کے سرداروں کو ترجیح دی جاتی تھی ۔ ان کا سردار اعلیٰ "باش دوہ جی" رائے کے لحاظ سے بہت اونچا ہوتا تھا اور ان کا درجہ بابا باشی [رگ پان] کے اوپر اور خاصگی آغا [رگ پان] سے لیچر ہوتا تھا ۔

مآخذ : (۱) Marsigli : 'L'Etat militaire de

'L'Empire Ottoman the Hague'، ۱۷۰۷ء، ص ۱۰۱، ۱۰۲ :

(۲) 'Tableau general de l'empire Ottoman' D'Ohsson (۳)

۱۷۷۳ء : Hammer Purgstall (۴) : ۳۳۳ : ۶۱۸۲۳

'Histoire' : ۵ : ۲۱۲ : ۳۳۶ : (۵) وہی مصنف :

'Staatsverfassung' : ۲ : ۲۰۹ : (۶) احمد جواد :

تاریخ حکمرانی عثمانی، استانبول ۱۹۱۲ء، ص ۱۲ وغیرہ :

(۷) 'Ormanli Devletitaskilatin-' : I. H. Ukuncarsb (۸)

'dan Kap' Kulu Ocaklare'، ج ۱، انقرہ ۱۹۷۳ء :

مجدد اشاریہ : (۹) 'Gibb-Bowen'، ص ۳۲۱ - ۳۲۲ :

(B. Lewis)

* دیوہ لی قرہ حصار : رگ بہ قرہ حصار ۔

* دیوہ : (ذوی) رگ بہ دُوہ ۔

* دُوین : اس کا تلفظ دُوین بھی ہے ۔

ارمینہ میں ایک اہم شہر تھا اور عربوں کے دور میں دارالحکومت ۔ اور کہا جاتا ہے کہ جب ارمینہ کے ارماسی یہاں آئے تو یہ نام بھی اپنے پہلی سکونت گاہ سے لیتے آئے جو آج کل ایک ترکمان میاٹ میدان ہے ۔ عرب مصنفین کے ہاں یہ نام دُوین یا دُوین (باقوت) ہے ۲۳۳ : (۱) ابن خلکان، مطبوعہ بولاق، ۱۵۰۱ : (۲) دُوین اور دیبل (باقوت) : (۳) سب سے زیادہ مستعمل شکل ہے :

معرہ ۵۵ [الجزایہ] ۲۴: اعلیٰ تشریح کے لئے دیکھیے
 لسان العرب، بذیل مادہ دہر، ظاہرہ [رک بان] کے متعلق
 کم، گیا ہے کہ وہ دہر کو خدا کے اسمیں سے ایک اسم قرار
 دیتے ہیں (لیکن دیکھیے Die Zählzeiten (Goldziber)، لاہور ۱۸۸۳ء، ص ۱۵۱ بعد)۔ بہت سے محدثین نے النہج
 سے بحث کے لئے حدیث کی تشریح اس طرح کی ہے (دیکھیے
 T. Goldziber، کتاب مذکور، ص ۱۵۵: ابن قتیبہ،
 تاویل مختلف الحدیث، قاہرہ ۱۳۲۹ھ، ص ۲۸۱ تا ۲۸۴)۔
 منکابین نے اس بحث میں کوفی، داجینی، امینی، ابی الغزالی
 نے دہر کو دہریہ [رک بان] کے ان افکار کے لئے استعمال
 کیا ہے جن کا قبل اسلام کے عرب مآخذ سے کوئی تعلق
 نہیں (تہافت الفلاسف، طبع M. Bouyges، بیروت
 ۱۹۳۷ء، ص ۲۰۸)۔ شاعروں اور نثر نگاروں نے
 اس لفظ کو اس مفہوم میں استعمال کیا ہے جس طرح
 زمانہ قبل اسلام میں یہ استعمال ہوتا تھا (دیکھیے
 المصنوع، طبع F. Dieterici، برلن ۱۸۶۱ء، ص ۷۷، ۷۸)۔
 ایک سوانح نگار لکھتا ہے کہ الزمان (وقت) اور الآیام
 (دن) الغزالی کو کہیں سے کہیں لے گئے (السیرۃ:
 طبقات الشافعیہ، قاہرہ ۱۳۲۳ھ، ص ۱۰۹)۔

(W. MONTGOMERY WATT)

الدہر: (سورۃ)، اس جلد کے اختتام پر۔

دہران: رک بہ ظہران۔

دہریہ: دہر سے منسوب، وہ گروہ جو دہر

کو ندیم مانتا ہے اور اسی کو حوادث کا باعث
 جانتا ہے۔ کشاف اصطلاحات الفنون کی رو سے یہ
 لفظ اسم جمع ہے اور بہت ہی مجموعی ایک فرقے
 کا مظہر ہے۔ یہ لفظ "دہریوں" سے الگ ہے جو
 دہری کی جمع ہے اور دہر سے منسوب ہے جس کے
 معنی قرآن میں امتداد زمانہ کے لئے آئے ہیں۔ قرآن
 مجید کے بعض مصاحف میں چہم تروین سورۃ [الدہر]
 کا نام سورۃ "الانسان" بھی آیا ہے، لیکن بیستالیہ سوان
 سورۃ [الجزایہ]: ۲ میں اس کا استعمال کافروں،

دہری کے عرب، جیسا کہ ان کے بہت سے اشیاء سے ظاہر
 ہے، دہر (بزرگ زمان اور الآیام) کو انسان پر گذرنے والے
 ہر لمحے اور ہر لمحے کا منبع اور منبع قرار دیتے تھے،
 اس طرح گویا وہ اس لفظ کو قسمت یا تقدیر کے مفہوم
 میں استعمال کرتے تھے، گو اس کی درستش نہیں کرتے
 تھے (Über den Fatalismus der: W. L. Schaumier
 : Th. Nöldeke، ۱۸۸۱ء، Islāmische Araber
 : Encyclopaedia of Religion and Ethics،
 اس کے مماثل اقوال کے لئے دیکھیے A. Christensen
 : ۱۹۱۹ء، بعد، ۱۵۵: زر وان Zervan زمان اور
 تقدیر دونوں کا دیوتا تھا: کروئس Kronos، زلیوس
 کا باب: نیز دیکھیے Zervan: B. C. Zacher،
 ۱۹۵۵ء، خصوصاً ص ۲۵۴ تا ۲۶۱۔ قرآن مجید میں یہ
 نظریہ ہمارے طرف منسوب کیا گیا ہے: وَقَالُوا مَا هِيَ
 إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ:
 ۵۵: [الجزایہ]: ۲ (= کہتے ہیں، ہماری تو یہی دنیا کی
 زندگی ہے اور ہم کہہ نہیں سکتے ہیں اور یہیں جئے
 ہیں اور زمانہ ہی ہم کو مار دیتا ہے)۔ قبل اسلام کے
 ان تصورات نے [جہاں] کے مسئلہ قضا و قدر پر
 اثر ڈالا (Free Will and Pre: W. Montgomery Watt)
 : ۱۹۵۹ء، ص ۲۰، بعد،
 ۳۱)۔ حدیث سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ لوگ اللہ
 اور دہر کو ایک ہی قرار دینے کی کوشش کرتے تھے،
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے ایک مرفوع
 روایت ہے: لَا إِلَهَ إِلَّا الدَّهْرُ هُوَ اللَّهُ، يُوْذِنُنِي إِنْ
 آدَمُ نَسِبَ الدَّهْرَ أَنَا الدَّهْرُ... (آپ نے حکم دیا دہر
 کو برا کہہ دو، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی دہر ہے)۔ ابن آدم
 نے زمانے کو کالی دے کر مجھے ایذا دی کیونکہ مجھے وہ
 زمانے سے منسوب کرنا ہے اس کا خالق تو میں ہوں،
 تمام چیزیں میرے قبضے میں ہیں)۔ (مثلاً بخاری،
 باب التفسیر بذیل سورہ ۵۵: [الجزایہ]: ۲، کتاب الادب،
 باب ۱۰۱: کتاب التوحید، باب ۵۳: الطبری: تفسیر،

حضرة الالهية کا استناد ہے اور "زمان" کا باطن ہے جس میں ازل اور ابد دونوں متحد ہیں۔

البیضاوی کی تشریح کے مطابق مادی دنیا کے ساتھ اس کے معنوی تعلق کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ اس کا کہنا ہے کہ دہر بنیادی طور پر وہ عرصہ زمانی ہے جس میں یہ دنیا گزر رہی ہے اور جو رفتار زمانہ پر غالب ہے، آگے چل کر اس لفظ کو دہریہ کے عقیدے کی تعبیر کے لیے استعمال کیا گیا اور اس کے مطابق، غزالی منجانبہ اور لوگوں کے "القول بالدہر" (دہر کے قائل ہونے) کا ذکر کرتا ہے (تہافت، طبع Bouyges، ص ۱۹)۔ بعض اوقات اس کا ترجمہ قدری (Fatalists) کیا گیا ہے، لیکن یہ کسی طرح بڑی صحیح نہیں۔ اس لحاظ سے اسم نسبت یعنی دہری کے دو فلسفیانہ مفہوم ہو سکتے ہیں: اس سے ایک تو وہ شخص مراد ہے جو دنیا کو ماضی اور حال دونوں میں قدیم اور دائمی جانتا ہے اور اس عقیدے کی رو سے قیامت اور آخرت کی زندگی سے انکار کرتا ہے؛ اس کے دوسرے معنی ملحد یعنی اس شخص کے ہیں جو صحیح عقیدے سے انحراف کرتا ہے (لین)؛ بذیل مادہ دہری۔ پہلے مفہوم کے لیے دیکھیے، Nutue miscellonae : Paeocke لائبرنگ ۱۷۰۵ء، ص ۲۳۹ تا ۲۴۰ بذیل لفظ دہرینی۔ انسانی زندگی کو اس دنیا کے اندر منحصر کر دینے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان تیزی سے لذت پسند بن جاتا ہے۔ ادب میں یہ لفظ سب سے پہلے اس مفہوم میں الجاخط کی کتاب الحيوان (ناشر ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۶ء تا ۱۳۲۶ھ ۱۹۰۷ء) میں استعمال ہوا ہے۔ یہاں اس لفظ کو سورہ ۲۵ [البجائیہ]: ۲۴ کے زیر اثر ایک وسیع مفہوم کا حامل قرار دیا گیا ہے اور دہری کی تشریح اس طرح کی گئی ہے۔ "دہری وہ شخص ہے جو رب الارباب (اللہ)، خان، ثواب و عذاب، دین اور قانون سب سے انکار کرتا ہے، اپنی انسانی خواہشات کے سوا

بے دینوں، گمراہوں اور کور چشموں کے لیے کیا گیا ہے۔ ان مفہیم نے آگے چل کر اس کے مفہوم کے ارتقائی مدارج پر اثر ڈالا اور بالآخر اس لفظ کا ایک فلسفیانہ مفہوم متعین ہو گیا جو اصلی معنی سے بالکل مختلف ہے۔ یہ بے دین کہتے ہیں: وَقَالُوا مَادِي الْآحْيَاتِنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُبَايِعُنَا إِلَّا الدُّهْرُ، ۵۴ [البجائیہ]: ۲۴) کہتے ہیں: "ہماری تو یہی دنیا کی زندگی ہے اور بس کہ یہیں مرتے ہیں اور یہیں جڑے ہیں اور زمانہ ہی ہم کو مار دیتا ہے اس وقت تک اس کا کوئی فلسفیانہ مفہوم مقرر نہیں ہوا تھا؛ البیضاوی اور الجلائین کی تفاسیر کے مطابق دہر سے مرور زمانہ مراد ہے۔ الزمخشری نے ۵۴ [البجائیہ]: ۲۴ کی تفسیر کرتے ہوئے اس سے زمانے کی گزرنے والی مدت (دہر یعنی) مراد لی ہے (الکشاف، ص ۲۴)؛ اور سورہ ۷۶ [الدہر]: ۱ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ اس سے زمانے کی طویل مدت کا ایک وقفہ مراد ہے [دیکھیے وہی کتاب، ص ۶۶۵]۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ "زمانے کی ایک طویل مدت" کا مفہوم روز بروز غالب ہوتا چلا گیا اور آخر کار زمانے کی غیر متناہی مدت کو دہر کہنے لگے۔ اس مفہوم نے اتنی وسعت اختیار کر لی کہ بعض مصنفین نے الدہر کو خدا کا ایک نام قرار دے دیا، اگرچہ اس رجحان کو سخت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا (لین)؛ بذیل مادہ دہر، نیز دیکھیے کشاف اصطلاحات الفنون، ۱: ۴۸۸)۔ رسائل الخوان الصفاء کی طبع جدید ۱۳۷۶ھ/۱۹۵۷ء، جلد سوم، فصل نسیم، ص ۵۵ میں اس کا تلفظ دہریہ لکھا ہے۔ اس خیال کو ماہرین لسانیات کی تائید حاصل ہے اور انہوں نے اسے ان تغیرات کے تحت داخل کیا ہے جو اسامیے نسبت کے حرکات و سکنات میں ہوتے رہتے ہیں (السیبویہ، طبع Derenbourg ۲: ۶۳، ۱۹ تا ۲۱)۔ الجرجانی: التعریقات نے دہر کی قدامت پر زور دیا ہے (زیر مادہ)، اور دہر کی یہ تعریف کی ہے: "وہ لحظہ دائمی ہے جو

کرتا، لیکن منکرین خدا کے زمرے میں بار بار ان کا ذکر کرتا ہے۔ خصوصاً ان فلسفیوں کے ساتھ جو افلاک و نجوم کو ایسا پانچواں طبقہ قرار دیتے تھے جو فساد و ہلاک سے محفوظ ہے اور قدم عالم کا قائل تھا (طبع)۔ بصرہ قاہرہ ۱۳۲۸ھ/ ۱۹۱۱ء، ص ۲۱۱۔ ۱۰۶۔ وہ انہیں عیسائیوں کا معادل بھی قرار دیتا ہے، لیکن اس کی وجہ بیان نہیں کرتا (ص ۱۵۷)۔

الغزالی بھی دہرائے کو فلسفیوں کا ایک گروہ بتاتا ہے جنہوں نے صدیوں تک خیالات کی ایک نوع کو پھیلایا، جس سے متاثر ہونے والے کسی نہ کسی تعداد میں ہر زمانے میں ملتے ہیں۔ وہ ان کے متعلق ہمیشہ ایک سے خیالات ظاہر نہیں کرتا۔ المتخذ من الضلال (باب ۳، قاہرہ ۱۹۵۵ء، ص ۹۶ تا ۹۷) میں وہ انہیں سلسلہ واقعات کی ترقیب میں صف اول میں رکھتا ہے۔ اس وقت وہ قدیم فلسفیوں کا ایک گروہ (طائفہ) تھے۔ ایک ایسے خالق کے وجود سے منکر تھے جو دنیا کا نظام چلاتا ہے۔ وہ عالم آخرت پر بھی ایمان نہیں رکھتے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ عالم ہمیشہ ایسا ہی رہے گا۔ وہ انہیں آج نظر آتا ہے اور وہ ہمیشہ ایسا ہی رہے گا۔ وہ انہیں زنادتہ کے معادل قرار دیتا ہے، جن میں ایک اور گروہ بھی شامل ہے جو تعداد میں ان سے کہیں زیادہ ہے۔ یہ گروہ ”طبیعیون“ (naturalists) کا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دہریہ قدم عالم کو اپنے عقائد کی بنیاد ڈھرائے ہیں اور طبیعیون مزاجوں کے خواص پر زور دیتے ہیں اور گو وہ تخلیق عالم سے تو انکار نہیں کرتے، لیکن جنت، دوزخ، قیامت اور حساب اعمال کے قائل نہیں۔ ان دو گروہوں کے علاوہ ایک تیسرا گروہ بھی تھا جنہیں ”الشیون“ کہتے تھے، جو ان کے بعد ظاہر ہوا اور اس میں سقراط، افلاطون اور ارسطاطالیس شامل تھے۔ ان لوگوں نے پہلے دو گروہوں کے غلط عقائد کی تردید کی، لیکن اسلامی فلسفیوں مثلاً ابن سینا اور الفارابی نے ہمیشہ ان کے خیالات کا اتباع نہیں کیا۔

کسی اور چیز کی طرف توجہ نہیں کرتا اور بدی صرف اس چیز میں ہے جو اس کے خواہشات کی تکمیل میں حائل ہو۔ اس کے نزدیک انسان، پالتو جانوروں اور وحشی درندوں میں کوئی فرق نہیں، اور مسئلہ صرف لذت و الم کا ہے؛ خیر اس کے نزدیک صرف وہ چیز ہے جو اس کے مفاد کے حصول میں مدد دے، چاہے اس میں ہزار آدمیوں کی جان بھی چلی جائے (کتاب الحيوان، ۵ تا ۷)۔ دہریوں کے ان مسئلہ اصول سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ اوہام العوام کو تسلیم نہیں کرتے؛ فرشتوں اور شیطانوں کے وجود کے قائل نہیں؛ خوابوں اور ساحروں کی قوت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے (البحاظ: کتاب مذکور، ۲: ۵۰)، لیکن ان میں سے بعض عقلی قیاسات کی بنا پر یہ ظاہر مسخ یعنی آدمی کے جانور کی شکل میں بدل جانے کے قائل معلوم ہوتے ہیں (کتاب مذکور، ۴: ۲۴)۔

مفتاح العوام (طبع Van Vloten، لندن ۱۸۹۵ء، ص ۳۵) میں دہریے کی تعریف اس طرح کی گئی ہے: ”وہ لوگ جو زمان کے قدیم ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں۔“ رسائل اخوان الصفا میں انہیں ازلیہ کہا گیا ہے یعنی وہ لوگ جو نظام کوئی کے دوام اور اس کی قیامت کے قائل ہیں؛ برخلاف ان لوگوں کے جو اس سارے نظام کائنات کو ایک خالق اور مسبب کی تخلیق اور نتیجہ سمجھتے ہیں (مطبوعہ بمبئی ۱۳۰۶ھ، ۲۹: ۳، مطبوعہ بیروت، ۱۳۲۶ھ/ ۱۹۵۷ء، ۳: ۳۵۵)۔ اس لحاظ سے متکلمین ان کے خلاف ہیں۔ وہ عالم اجسام کے حدوث کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ اللہ نے اجسام اور عالم اجسام کو پیدا کیا۔ اس عقیدے میں وہ اللہ کے لیے اسمائے صفات کا اضافہ بھی کرتے ہیں اور قدیم اور قوت والا صرف اللہ ہی کو مانتے ہیں (کتاب مذکور، مطبوعہ بمبئی، ص ۳۹ تا ۴۰، مطبوعہ بیروت، ص ۳۵۶)۔ ابو منصور عبدالقادر بن طاہر البغدادی اپنی کتاب الفرق بین الفرق میں دہریہ کا شمار فرقوں میں نہیں

فعل ایک خارجی عامل کا محتاج ہوا اور یہ بات قابل تسلیم نہیں۔ الغزالی نے اس نظریے کو بھی ناقص قرار دیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ واحد سے فقط ایک ہی چیز صادر ہو سکتی ہے (ص ۹۵ تا ۹۳ د) اور یہ کہ مادہ قدیم ہے جس میں چار عناصر ایک طرف ہیں اور دوسری طرف ایک پانچواں عنصر ہے جو غیر فانی ہے اور جس سے منکوق عناصر بنے ہیں۔ یہی تمام اسباب اس کے متقاضی ہیں کہ ان نظریات پر اعتقاد رکھنے والوں کو دہریہ کہا جائے (ص ۲۰۶، سطر ۵ بعد)۔ ابن رشد نے تہافت انتہافت (طبع Bouyges، ۱۹۳۰ء) میں الغزالی کا سا سخت رویہ اختیار نہیں کیا۔ وہ ان لوگوں کو جو فقط الغزالی کے نظریات کی بنا پر دہریہ ٹھہراتے ہیں دہریہ نہیں کہتا (ص ۱۴۷، ص ۵)۔ وہ دہر کے لفظ کو قطعاً اس کے اصلی معنی یعنی "زمان کی ایک مدت" کے مفہوم میں استعمال نہیں کرتا بلکہ ان مسائل کے معنی میں بوی جو فلسفے کے مشہور معتقدات ہیں اور غلطی سے مسلمان حکماء کی طرف بھی منسوب کر دیے گئے ہیں (ص ۱۵۵)۔

ابن حزم اور الشہرستانی نے اس لفظ کی جو تعریف کی ہے اس کی رو سے دہریہ محض ایک فرقہ ہے۔ ابن حزم قدم عالم کو دہریہ کا عقیدہ بتاتا ہے جس سے لازم آتا ہے کہ عالم پر کوئی حکمران نہیں۔ اس کے مقابلے میں دوسرے تمام فرقوں کا عقیدہ یہ ہے کہ عالم حادث اور مخلوق (محدث) ہے (کتاب الفصل، قاہرہ ۱۳۱۷ھ، ۱: ۹)۔ ابن حزم دہریہ کی ان پانچ دلیلوں کا ذکر کرتا ہے جن کی رو سے دہریہ کو "القائلون باندھر" کہتے ہیں (ص ۱۱، س ۹)۔ ان دلائل کا خلاصہ یہ ہے: (۱) ہم کسی چیز کو حادث اسی وقت کہہ سکتے ہیں جب وہ کسی چیز سے نکلے یا اس کے اندر پیدا ہو (ہم نے ایسی چیز کوئی نہیں دیکھی جس کی بابت کہا جائے کہ وہ حادث ہوئی جب تک کہ وہ کسی چیز سے یا کسی چیز کے اندر پیدا

الغزالی نے تہافت الفلاسفہ میں انہیں دونوں کا ذکر کیا ہے (طبع Bouyges، بیروت ۱۹۲۰ء، ص ۱۰۱) اور انہیں کے حوالے دے کر فلاسفہ کے بیان میں تضاد و تناقض ثابت کیا ہے (M. Bouyges نے اپنے ترجمے میں اسے تخریب کے بجائے تضاد اور تناقض ہی کہا ہے اور دکھایا ہے کہ ان کے مخالف ان کے مقابلے میں فاسد اور عاجز ہیں)۔ ان دونوں مسلمان فلسفیوں نے ان لوگوں سے مقابلہ کیا۔ جو اللہ کے وجود سے منکر تھے، لیکن ان نظریات سے محفوظ نہیں رہ سکے جن کی بنا پر غزالی کی رائے میں انہیں دہریہ میں شامل کیا جانا ضروری ہے۔ دہریہ کی طرف ذیل کے نظریات منسوب کیے گئے ہیں: وہ کسی اسے سبب سے منکر ہیں جو مسبب الاسباب بھی ہو (ص ۱۵، سطر ۳ تا ۴)؛ عالم قدیم ہے اس کا کوئی سبب ہے نہ خالق؛ سبب فقط حوادث جدیدہ کا ہوتا ہے (ص ۱۳۳، سطر ۶ اور ص ۲۰۶، سطر ۵)۔ عالم میں فلاسفہ کے صرف دو گروہ ہیں، تین نہیں۔ اول اہل الحق؛ دوم دہریہ (ص ۱۳۳، سطر ۶)۔ حقیقت یہ ہے کہ کچھ فلسفی اسے بھی ہیں جو سمجھتے ہیں کہ عالم قدیم ہے، لیکن وہ ایک صانع کا کارنامہ ہے۔ الغزالی کے نزدیک اس بات میں بدیہی تضاد ہے (ص ۱۳۳، سطر ۶ بعد)۔ ابن سینا نے اس بحث کو بار بار چھیڑا ہے اور اسے اپنے استدلال کی قوت پر یقین ہے۔ الغزالی اس استدلال سے مطمئن نہیں۔ وہ فلاسفہ اور دہریہ کا موازنہ و مقابلہ کرتے ہیں (ص ۹۵، سطر ۶)۔ وہ اس استدلال کو مبہم قرار دیتے ہیں جس سے فقط یہ نتیجہ نکلتا ہو کہ اللہ خالق عالم ہو سکتا ہے بشرطیکہ اس نے پہلے سے عالم کی تخلیق کا کوئی منصوبہ تیار نہ کیا ہو، بلکہ عالم بطور ایجاب اس سے صادر ہوا ہے۔ کم و بیش یہی نظریہ ہے جس کا ابن سینا قائل تھا۔ وہ کہتا ہے کہ اگر اللہ نے عالم کو کسی پہلے سے تیار کیے ہوئے منصوبے کے مطابق پیدا کیا تو اس کا

(طبع Cureton، ص ۲۰۲، ص ۲۵) غالباً ان (طبیعیوں) سے تعلق نہیں رکھتی جو ڈیئر کے قائل ہیں، بلکہ یہ "فلاسفہ ڈیہریوں" سے متعلق ہے، جن سے غالباً ابن ہنا اور فارابی مراد ہیں جنہوں نے وہ طبیعیوں کا مذہب مقابل قرار دیتا ہے۔ یہ بات ان فلسفیوں کے حال کے بہن مطابق ہے، کیونکہ وہ خود اس بات کو پرزور دلائل سے ثابت کرتے ہیں کہ ایک عالم معقول موجود ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ڈیہریوں کو جو بعض مسائل میں طبیعیوں سے متفق ہیں اور بعض میں فلسفیوں کے ساتھ اتحاد رکھتے ہیں، پوری طرح دونوں میں سے کسی کے ساتھ شامل نہیں کیا جا سکتا، لیکن یہ عبارت بہر حال مبہم ہے۔ کتاب نہایتہ الإقدام (طبع Guillaume، اوکسفورڈ، ۱۹۳۱ء مع جزئی ترجمہ کے) میں الشہرستانی ڈیہریوں (ترجمے میں مادہوں) اور ان کے مخالفوں کے درمیان چند مباحثوں کا حال بیان کرتا ہے (ص ۲۹، ص ۱۱، ص ۳، ص ۱۵، ص ۱۲۳، ص ۱۰، ص ۱۲۶، ص ۹)۔ مباحثوں کا موضوع عالم کا آغاز ہے، اس میں جواہر فرد کا نظریہ بھی شامل ہے جو ابتدا میں غیر منظم حالت میں ادھر ادھر گھومتے رہتے تھے، ڈیہریوں کا طرز استدلال سوفسطائیوں کا سا ہے، لیکن ان کے مخالف بھی جو زحل کی حرکت کے قائل ہیں کوئی دلیل پیش نہیں کرتے۔ جمال الدین القزوينی اپنی کتاب مفید العاوم و مفید المہوم، قاہرہ، ۱۳۱۰ھ، ص ۳۷ میں اس رائے کو بھی ڈیہریوں کی طرف منسوب کرتا ہے کہ عالم کی ابتدا ذرات جوہری کے اتفاقی تصادم سے ہوئی ہے جو اس سے پہلے فضا میں ادھر ادھر گھومتے پھرتے تھے۔

انیسویں صدی میں آکر اس لفظ کی صحیح تعریف کی گئی جو ایک مثبت دراز سے غیر معین اور غیر محدود معنی میں استعمال ہوتا رہا تھا۔ یورپ کے علوم طبیعیہ کو جب مشرق میں دخل حاصل ہوا تو ان سے نہایت سادہ لیکن مادی خیالات کا ایک چشمہ

نہ ہو)؛ (۲) اجسام کی پیدا کرنے والی چیزیں (محدثات اجسام) جواہر ہیں یا اعراض؛ (۳) اگر کوئی چیز اجسام کی محدث ہے تو بالکل اجسام جیسی ہوگی یا اس سے بالکل مختلف؛ بالکل مختلف ہونا تو باطل ہے اس لیے کہ کوئی چیز ایسی شے پیدا نہیں کر سکتی جو اس کی ضد یا مخالف ہو! مثلاً آگ کبھی ٹھنڈک پیدا نہیں کر سکتی؛ (۴) اگر عالم کا کوئی بنائے والا (فاعل) ہوگا تو وہ اس کے بنائے میں نا تو اپنا کچھ نفع سوجے گا یا نقصان کی کمی پوری کرے گا، اور یہ اسی طرح کا کام ہوگا جیسے اس دنیا کی مخلوق کرتی ہے یا وہ صرف اسے اپنی طبیعت کے تقاضے سے بنائے گا اور اس وقت اس کا کام قدیم اور دائم ہوگا؛ (۵) اگر اجسام حادث ہوں تو ان کا محدث ان کے بنائے سے پہلے ان کے معدوم کرنے کے لیے عدم بنائے گا، پھر عدم خود جوہر ہوتا یا عرض، اور اس سے جوہر اور عرض کا قدیم ہونا لازم آتا ہے (ص ۱۰-۱۱)۔ ان دلائل کو ترقیب وار رد کرنے کے بعد ابن حزم اپنے پانچ دلائل، جو ان کے معارض ہیں، پیش کرتا ہے اور پھر اس بحث کو اس کے آگے کے باب میں جاری رکھتا ہے جو تمام کی تمام ان لوگوں سے بحث کے لیے وقف ہے جو عالم کو قدیم کہنے کے باوجود اس کا ایک قدیم خالق بھی مانتے ہیں۔

الشہرستانی اپنی کتاب الملل والنحل کا دوسرا باب، جس میں فلاسفہ کے گروہوں کا بیان ہے، ان لوگوں کے بیان سے شروع کرتا ہے جو اس عالم محسوسات کے علاوہ کسی اور عالم کو نہیں مانتے۔ یہ گروہ "الطبیعیون والدہریون" یعنی ان لوگوں کا ہے جو طبعہ (فیجر) کے قائل ہیں اور ڈیئر پر اعتقاد رکھتے ہیں اور کسی عالم معقول کو ثابت شدہ نہیں مانتے: "لَا يَتَّبِعُونَ مَعْقُولًا"۔ یہ آخری لفظ مفرد ہے (طبع Cureton، ص ۲۰۱، ص ۲)۔ ایک اور جگہ کی عبارت "... کبھی کبھی دوسری جانب وہ معقول کو بھی تسلیم کرتے ہیں

التیشرین [نیچری] شامل تھا، جس سے صاف ظاہر ہے کہ ان کے نزدیک دہری کے معنی کیا تھے اور اس لیے اس کا ترجمہ ”نیچری مادہ پرست“ کیا گیا۔ اس مختصر سی تصنیف میں جمال الدین اس نظریے کا سلسلہ یونانی فلاسفہ تک پہنچاتے ہیں اور وہ اصطلاحات استعمال کرتے ہیں جن سے الغزالی کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ وہ پہلے اس کی تاریخ بیان کرتے ہیں اور اپنے بیان کو ڈارون پر ختم کرتے ہیں، مگر ان کے رد کا انداز شروع سے آخر تک مناظرانہ ہے۔

ایک طرف تو مادیت پہنچاتی چلی جا رہی تھی، خصوصاً یورپ کی کتابوں کے عربی ترجموں کے ذریعے مثلاً Büchner کی کتاب *Kraft und Stoff* جس کا ترجمہ شبلی شکیل (اسکندریہ ۱۸۸۴ء) نے کیا اور دوسری طرف اس کے خلاف ایک تحریک پیدا ہو رہی تھی۔ ان دو متخالف تصورات کی تاریخ نزاع ابھی ختم نہیں ہوئی۔ اس کے لیے بہت زیادہ جستجو اور تحقیق ضروری ہے، لیکن اس کی یہاں گنجائش نہیں۔ ان مختلف تصانیف میں جن کا ذکر اوپر ہوا مادیت اور مادیوں کے الفاظ ہمیشہ دہریہ اور دہریوں کے نامی میں استعمال کیے گئے ہیں۔ انجام کار دہریہ اور دہریوں کے الفاظ ختم ہو گئے اور ان کی جگہ زیادہ صحیح الفاظ نے لے لی۔ مصر میں جو الفاظ استعمال ہو رہے ہیں ان میں یہ الفاظ نظر نہیں آتے، (یہ نملاع R. P. Jonier نے بہم پہنچائی ہے)۔ دوسرے مذاہب کے متعلق ہماری معلومات مکمل نہیں ہیں، لیکن ہم پڑھیں پاک و ہند کے متعلق ضرور یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہاں کی تصانیف میں [یہ الفاظ اب زیادہ استعمال نہیں ہوتے اور اگر ہوتے بھی ہیں تو قدرے غیر معین مفہوم ہیں]۔

مآخذ: متن مقالہ میں مذکور ہوئے، ان کے علاوہ

دیکھیے: (۱) *Über den Fatalismus*: W. L. Schramm

(۲) *der vorläufigen Annahmen*: یون ۱۸۸۱ء ص ۱۲ تا

بھوٹا جو علمائے اسلام کے لیے غیر متوقع مسائل کا منبع بن گیا (۱۷۹۸ء ایک عثمانی فرمان میں انقلاب فرانس کے دہری نظریے کو رد کیا گیا ہے اس کے لیے دیکھیے امیر حیدر احمد شہاب: تاریخ احمد باشا الجزائر، طبع شبلی اور خلیفہ، بیروت ۱۴۱۹ھ ص ۱۱۵ بعد: قب Lewis، در *Journ. World Hist.* (۱۹۵۳ء، ۱: ۱۳۱ تا ۱۳۲)۔ مادیت کا مسئلہ ہندوستان میں بڑے شدید انداز میں اٹھایا گیا۔ ۱۸۵۷ء تا ۱۸۵۸ء کی جنگ آزادی کے بعد سید احمد خان نے اندازہ لگا لیا کہ مسلمان اس وقت تک برطانیہ کے تقوق کا مقابلہ نہیں کر سکتے جب تک مغربی سائنس اور نظام عدل کو نہ اپنائیں۔ ۱۸۷۵ء میں انہوں نے علی گڑھ [رک بان] میں سچل اننگلو اورینٹل کالج قائم کیا جو آگے چل کر مسلم یونیورسٹی بنا۔ اس کالج میں انگریزی تہذیب اور اسلامی دینیات کو مطالعے کا مشترک موضوع بنا دیا گیا۔ ضمیر اور نیچر کے تصورات کا گہرا اثر قبول کر کے سرسید نے اصول طبعیہ کو دینی اقدار کا معیار قرار دے دیا۔ علما نے اس نظریے کی مخالفت کی اور اس کے رد میں کتابیں لکھیں۔

۱۸۷۸ء/۱۲۹۸ھ میں جمال الدین الافغانی [رک بان] نے فارسی میں اس کا ایک سخت رد لکھا اور اسے بطور ضمیمہ اپنی کتاب الرد علی الدہرین (*Refutation of the materialists*) میں شائع کیا۔ اس کا ترجمہ اردو میں ۱۸۸۳ء میں کلکتے میں چھپا۔ عربی میں اس کا ترجمہ محمد عبدہ نے کیا جو پہلے پہل رسالۃ فی ابطال مذہب الدہرین و بیان مفاسدہم و اثبات ان الدین اساس المدنیۃ و الکفر اساس العمران کے نام سے شائع ہوا (بار اول، بیروت ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۵ء)۔ اس کے بعد (بار دوم، قاہرہ ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۳ء اور بار سوم، قاہرہ ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء) الرد علی الدہرین کے عنوان سے چھپا (فرانسیسی ترجمہ A. M. Goichon، پیرس ۱۹۴۳ء)۔ اصل نسخے میں اس کے نام میں اثبات

بیش نہیں آیا۔ یہ غالباً وہی شہر ہے جہاں اب خواجہ دہستان کا مزار واقع ہے۔

مآخذ : (۱) اسطخری، ص ۲۹۸، بعد : (۲) ابن حوقل، ص ۳۱۹، بعد : (۳) المقاسی، ص ۳۰۸، ۲۹۸، ۵۔ (۴) حمد اللہ مستوفی : نزہۃ، ص ۱۵۳، ترجمہ (۱۹۱۹ء) ص ۱۵۱ : (۵) اسٹرنج J. C. Strange، ص ۱۳۸، بعد : (۶) مارکوارٹ J. Marquart : *Eransahr*، (۱۹۰۰ء) ص ۱۵۰ : (۷) J. Markwart (مردھی مصنف) : *Wehrat und Arang* : (۱۹۳۸ء) ص ۳۰ : (۸) بارٹولڈ W. Barthold : *Turkestan*، ص ۳۰۸، ۳۳۵، ۳۳۸ : (۹) Spuler : *Iran*، ص ۳۱۱۔

(۲) ایک خطے کا نام جو باعتبار زراعت بڑا زرخیز اور اترک زیریں [رگ بہ اترک] کے شمال میں واقع ہے۔ اس کا جنوبی حصہ اسی دریا سے سیراب ہوتا ہے۔ دارالحکومت آخور ہے (جرجان کے شمال میں چار روز کی مسافت پر)، جسے بقول المقدسی (ص ۳۵۸، بعد)، دہستان بھی کہتے تھے، اور جو اس راستے پر آباد ہوا جو جرجان سے خوارزم کو گیا تھا۔ اسی نام کا ایک سرحدی قلعہ (رباط) بھی تھا، یہاں خوبصورت مسجدیں اور ایک بارونق منڈی تھی (المقدسی، ص ۳۵۸، نیز مقابلہ کیجیے، وہی کتاب، ص ۳۱۲، ۳۶۷، ۳۷۲ : اور نیچے دیکھیے)۔ بارٹولڈ W. Barthold کے نزدیک یہ قلعہ بارہویں صدی میں سارے علاقے کا دارالحکومت تھا۔ اس بیان کا تعلق یاقوت سے ہے (۱ : ۳۹)۔ اس علاقے کے بارے میں اسلامی معامات غیر واضح ہیں۔ بقول ابن حوقل (۱ : ۲۷۷، ۲۸۶ : ۲ : ۳۸۸، ۳۹۸)، اس علاقے کی آبادی جھدری تھی، جہاں صرف بحر خزر کے ماہی گیر ہی آباد تھے، مگر اس کے علی الرغم المقدسی نے بیان کیا ہے کہ اس علاقے یعنی جرجان کے گاؤں بہت زیادہ گنجان آباد تھے۔

ایران کے وسطی زمانے کے شہروں کو پیش نظر رکھا جائے تو دہستان کی بنیاد اشکانی بادشاہ

Die philosophischen Systeme : M. Horten (۲) : ۲۲
der spekulativen Theologen im Islam یوں ۱۹۱۷ء
 اشارہ بذیل سادہ : (۳) زائز محشری : الکشاف : ۲ : ۲۹۱
 ۱۹۶۵ء بیروت بلا تاریخ۔

(J. GOLDZIEHER - [A M. GOICHON])

* دہستان : شمال مشرقی ایران میں دو اضلاع اور ان سے متعلق شہروں کا نام۔

(۱) ہرات کے شمال مشرق میں ایک شہر، خطہ بادغیس [رگ بآں] کے جنوبی حصے کا دارالحکومت اور اس علاقے کا دوسرا بڑا شہر (رقبے میں پوشنج کے نصف کے برابر) : بقول یاقوت (۱ : ۳۶۱)، ۵۹۶ھ/۱۲۰۰ء کے قریب سارے بادغیس کا دارالحکومت، یہ شہر ایک زرخیز علاقے میں چاندی کی ایک کان کے قریب پہاڑی پر واقع تھا : شہر ۵۹۸ھ/۷۱۶ء-۷۱۷ء میں پختہ ہونے سے تعمیر ہوا تھا۔ اس کا ذکر ایک ایرانی "دہقان" کے دارالحکومت کے طور پر بھی آتا ہے (طبری، ۲ : ۱۳۲)۔ ۴۲۶ھ/۱۰۳۵ء کے نواح میں یہ شہر سلجوقیوں کی رسالت سے (جسے انہوں نے غزنویوں سے لیا تھا) ایک ترکی "دہقان" کے قبضے میں آ گیا (ایسے لقب ترکوں میں بھی رائج تھے)۔ ۵۵۲ھ/۱۱۵۸ء میں، وہ غز سلطان اختیار الدین آیت کی قیام گاہ بن گیا، جس نے اس ضلع کے واحد حکمران کی حیثیت سے خوارزم شاہ ثانی ارسلان کی اطاعت اختیار کر لی تھی (یہی : تاریخ یسعی)۔ پھر جب خوارزم شاہ سلطان شاہ کے بجائے اس کا بیٹا تیکش اس کا جانشین ہوا اور سلطان شاہ ۵۹۹ھ/۱۱۷۴ء میں اپنی ماں ترکین (اسلامی نام : ترکان) کے ساتھ راہ فرار اختیار کر کے آیا تو تیکش نے دہستان کا شہر بھی اپنے قبضے میں لے لیا اور ترکان کو اس نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ سلطان شاہ البتہ اور آگے بڑھ کر غوریوں کے ہاں پناہ گزیں ہوا (ابن الاثیر، ۹ : ۲۵۳/۲۵۷)۔ معلوم ہوتا ہے، اس کے بعد دہستان میں کوئی اہم واقعہ

مآخذ: متن میں حوالوں کے علاوہ: (۱) تاریخ ہیفی،

تہران ۱۹۴۶ء: (۲) معانی: کتب الانساب، ۱۹۰۲ء

(GMS، جلد ۲)، ورق ۲۳۷ ب (صحیح کافظ دینی ہے):

(۳) نگینی (در نقشہ)، طبع (Ch. Schefer)، ص ۱۵۳: (۴)

(Syr. Akten pers. Martyrer: Gg. Hoffmann

۱۸۸۰ء) ص ۲۷۷ تا ۲۸۱: (۵) بارٹولڈ (W. Barthold

K istorii orasheniya Turkestana، (ترکستان کی تاریخ

آپاشی)، (۱۹۱۳ء) ص ۲ تا ۳: (۶) لسٹرنج (J. C. Strange

ص ۳۷ تا ۳۸: (۷) Iran: Spuler، ص ۳۳۰، ۳۵۵،

۳۶۳: (۸) حدود العالم، ہمدان اشارہ

(B. Spuler)

دہشور: رگ بہ دہشور، صحیح املا دہشور *

ہی ہے۔

دہقان، دہکن، دہکن، دہگان کی معرب شکل: *

[نیز دہقان] گاؤں کا چودھری اور ایران کے ساسانی عہد

میں کمتر درجے کے جاگیردار طبقہ اورا کا ایک رکن۔

”دہقانوں“ کا اختیار، جو ان کے موروثی خطاب کے

باعث انہیں حاصل تھا، مقامی عملداری تک محدود تھا۔

اس کو بہت زیادہ اہمیت حاصل تھی، گو زمین کا اصل

رقبہ، جس کی کاشت وہ خاندان کی موروثی ملکیت کے

طور پر کرتے تھے، بالعموم چھوٹا ہوتا تھا۔ وہ

حکومت کے نمائندے ہوتے تھے، ان کا سب سے

اہم فریضہ محاصل کی وصولی تھا، Christensen کی رائے

میں وہ چونکہ ملک اور اہل ملک کے حالات سے بخوبی

واقف ہوتے تھے، لہذا دربار کی شان و شوکت اور

جنگوں کے بڑے بڑے مصارف کے لیے انہیں کافی مالیات

بہم پہنچایا جاتا تھا (L'Iran sous les Sassanides)

طبع ثانی، کوپن ہیگن ۱۹۵۳ء، ص ۱۱۲ تا ۱۱۳۔

مسعودی ”دہقانوں“ کو پانچ طبقوں میں تقسیم کرتا

ہے، جو اپنے لباس کے ذریعے ایک دوسرے سے ممتاز

ہوتے تھے (مسعودی، ۲: ۲۴۱) اور ایرانی روایات کی رو

سے ان کا نسب اساطیری بادشاہ ہوشنگ کے بھائی و بگرد

Arsacid Narsah نے رکھی تھی (مارکار J. Marquart

Eränsahr [۱۹۰۱ء]، ص ۵۳، ۷۳، ۳۱۰): لیکن

اسلامی عہد میں اسے ساسانی بادشاہ قباد بن فیروز

(فیروز) سے منسوب کیا گیا ہے (حمد اللہ مستوفی:

نزہت الثلوب [۱۹۱۵ء]، ص ۱۶: ترجمہ [۱۹۱۹ء]

ص ۱۵۷: اشارہ کا بھی مقابلہ کیجیے)۔ چوتھی/دسویں

صدی میں اس کی حیثیت ایک سرحدی علاقے کی تھی

(”ترکوں کے خلاف“، اور حمد اللہ، ص ۲۱۲) (ترجمہ،

ص ۲۱۵) نے تو چودھویں صدی میں بھی اس کا ذکر

اسی حیثیت سے کیا ہے لیکن اس زمانے میں اس کا اشارہ

ان خانہ بدوش قبائل کی طرف ہو سکتا ہے جو خوارزم

اور آست یرت کے درمیان آباد تھے، کیونکہ اس وقت

تک یہاں بلکہ ماوراء النہر کے مغول میں بھی اشاعت

اسلام ہو چکی تھی۔

حدود العالم، مرتبہ منورسکی V. Minorsky

(۱۹۳۷ء)، ص ۶۰، میں جزیرہ نما دہستانان سور (؟) کا

ذکر بھی آتا ہے جو مجہیروں اور برندوں کے شکاریوں

سے آباد تھا، اور جسے بارٹولڈ W. Barthold نے جدید

”راس حسن قلی“ (دھانہ، اترک کے شمال میں) قرار دیا

ہے۔ لیکن اگر الاصطخری کی معلومات (ص ۲۱۹) صحیح

ہیں تو ایسا ہونا ممکن نہیں۔ وہ کہتا ہے دریائے

جرجان کے دہانے اور اس جزیرہ نما کے درمیان ۵۰

فرسنگ کا فاصلہ ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خلیج

قرزل صو (روسی: Krasnovodsk) تک پھیلا ہوا تھا۔

منورسکی V. Minorsky نے (حدود، ص ۳۸۶)

دہستان کا نام قدیم دہر (د) کے نام سے جوڑ دیا ہے

(ان کے متعلق، مقابلہ کیجیے W. Tomaschek، در

Realencyklopädie: Pauly-Wissowa، ۱۲: ۱۳ [۱۹۰۱ء]

کالم ۶/۱۹۳۵)۔ آج کل رباط دہستان کے آثار کو (جن

کا اندازہ تیرھویں صدی کے اوائل کی ایک مسجد کے

کتبے سے کیا جا سکتا ہے) مشہد مصریان (رگ باں)

سے موسوم کیا جاتا ہے۔

چودھری یا زمیندار کے بدستور قائم رہا۔ یہ اصطلاح ان معنوں میں اس دستاویز میں بھی ملتی ہے جو سنجر کے دیوان نے شائع کی (عقیدہ الکتاب، طبع عباس اقبال، تہران، ۱۹۵۰ء، ۵۳، ۵۵) علیٰ ہذا خوارزم کے ایک معمار کو حاصل ہونے والی سند میں بھی جس کا زمانہ چوٹی صدی کا آخری نصف ہے، اس کا یہی مفہوم ملے گا۔ (بہاء الدین محمد مؤید بغدادی: الترسل الی الرسل، طبع بہمن یار، تہران ۱۳۱۵ ہجری شمسی، ۱۱۳، ۱۱۴)۔ نجم الدین رازی نے بھی اسی طرح ”دہقان“ کی اصطلاح ”مالک زمین“ کے معنوں میں استعمال کی ہے (مرصاد العباد، ۱۳۱۲ ہجری شمسی، ۲۹۴، ۲۹۵)۔ نصیر الدین طوسی (اخلاق ناصری، لاہور طبع سنگی، ۱۸۰-۱۸۱) اور جلال الدین دقوانی (اخلاق جلالی، طبع سنگی، ۲۷۸)، کے نزدیک البتہ ”دہقان“ کا مفہوم کسان ہی ہے، جدید فارسی میں بھی اس کے یہی معنی ہیں۔ ترکستان میں کاشتکاروں کو دہقان ہی کہتے ہیں (RMAF، جلد ۱۳، ۱۹۱۱ء، ص ۵۶۸)۔

مآخذ: (۱) فردوسی: شہنامہ (طبع Mohl، جلد ۸، بیحد)؛ (۲) M.C. Inostrančev: *Sasunidskie Etiudi*؛ (۳) J.A. Quatremère: *JA*، سلسلہ ۱۶، ۵۳۲؛ (۴) P. Horn: *Gr. I. Ph.*، ۱۷۸؛ (۵) تولدک: *Gesch. der Perser*، Max van Berchem؛ (۶) *Propriété territoriale*؛ A. V. Kremer؛ (۷) *Das arabishe reich und sein Sturz*، arabische reich und sein Sturz، برلن ۱۹۰۲؛ (۸) *Die Rolle der Gebiete des kaspischen Meeres in der Geschichte des muslimanischen Welt*، K. H. Menges؛ (۹) *Isl. skische Texte*، F. Lokkegaard؛ (۱۰) *Islamic taxation in the classic period*، D. C. Dennett؛ (۱۱) *Conversion and the poll tax in early Islam*، ہارورڈ، ۱۹۵۰ء، ص ۲۲ تا ۲۳؛ (۱۲) *Daruya*، F.W. Cleaves؛ (۱۳) ۳۲ تا ۳۳

نک پہنچتا ہے (Le premier homme et le premier roi dans L'histoire Légendaire des iraniens)۔ ۱۳۳: ۱۔ ۱۵۹، ۱۵۵، ۱۵۳، ۱۵۱، ۱۵۰، ۱۴۹)۔ عربوں کی فتح کے بعد ”دہقان“ بدستور مقامی عملداری اور ذمیوں سے جزئی کی وصولی کے ذمے دار رہے، ان میں سے بیشتر مشرف بہ اسلام ہو گئے اور ان کی زمینیں زیادہ تر انہیں کے پاس رہیں (فان کریمر Van Kremer: *Culturegeschichte*، ۱۶۰: ۲)۔ ماوراء النہر میں جہاں عربوں کے حملے سے کچھ ہی پہلے ”دہقانوں“ کا اثر و نفوذ اس سے کہیں زیادہ تھا، جتنا کہ ایران میں، اس لیے کہ ان کے اختیارات ابھی بادشاہت اور زرتشتی موبدوں کی وجہ سے محدود نہیں ہوئے تھے، مقامی حکمران اور زمیندار دونوں کے لیے ”دہقان“ کی اصطلاح استعمال کی جاتی تھی (بارٹولڈ: *Turkestan*، ۱۸۰-۱۸۱) اور دیکھیے نرشخی: *تاریخ بخارا*، طبع مئرس رضوی، ۷، ۷۲)۔ طاہریہ اور سامانیہ کا اقتدار بھی زیادہ تر اس لیے قائم ہوا کہ ان کا اور دہقانوں کا مفاد باہم مشترک تھا؛ بایں ہمہ سامانی عہد کے اختتام کے قریب ”دہقان“ غیر مطمئن ہو چکے تھے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ بغداد کے ہارون بن موسیٰ ایلک خان کے ہاتھوں سامانی خاندان کے بالآخر زوال کی ذمے داری جزو ان پر بھی عائد ہوتی ہے (بارٹولڈ، ۲۵۷، ۳۰۷)۔ پانچویں / گیارھویں صدی میں جب نظام ”اقطاع“ ہر طرف پھیل گیا اور زمینداروں کے طبقوں کا زور گھٹنے لگا تو ”دہقانوں“ کی حیثیت اور اثر و نفوذ بھی کم ہوتا چلا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ اس نام کا وقار بھی جاتا رہا حتیٰ کہ پانچویں / گیارھویں صدی میں اس کے معنی کاشتکار کے ہو گئے جیسا کہ ناصر خسرو (ذہقان، تہران ۱۳۰۴-۱۳۰۷ ہجری شمسی، ۵۵) اور کاؤس بن اسکندر (قابوس نامہ، G.M.S.، ۱۳۸) نے ایسے استعمال کیا ہے۔ برعکس اس کے، سلطنت کے مشرقی حصے میں سلجوقیوں کے ماتحت ”دہقانوں“ کا درجہ بطور گاؤں کے

[رگ بان] کے مغربی کنارے پر واقع ہے اور آج کل ۲۸ درجے ۲۰ ثانیے اور ۲۸ درجے ۴۴ ثانیے طول بلد شمالی اور ۷۷ درجے ۵ ثانیے اور ۷۷ درجے ۱۵ ثانیے عرض بلد مشرق کے درمیان پھیلا ہوا ہے۔ یہ ۸۶.۸/۱۲۱۱ سے ہندوستان کے اولین مسلمان فرمانرواؤں کا دارالحکومت تھا اور چند مستحیات (مثلاً دولت آباد، آگرہ اور لاہور [رگ بان] جنہیں گاہے گاہے بعض حکمرانوں نے اپنا مرکز بنانا پسند کیا) سے قطع نظر، ۸۶.۸/۱۲۱۱ سے ۸۵.۸/۱۲۱۱ میں بہادر شاہ ظفر کی معزولی تک شمالی ہندوستان کے شاہی خانوادوں کا پایہ تخت رہا! ۱۹۱۱ء میں یہ برطانوی ہند کا دارالسلطنت قرار پایا اور ۱۹۴۷ء کے بعد سے آزاد بھارت کا دارالحکومت ہے۔

اس نام کو رومن حروف میں عام طور پر Delhi لکھتے ہیں، جو مسلمانوں کے ہاں قدیم سے مستعمل شکل "دہلی" پر مبنی ہے؛ اردو، ہندی (یقیناً سابقوں صدی ہجری / تیرھویں صدی عیسوی کی تصنیف پر تھی راج راسا کے زمانے سے یقینی طور پر) اور پنجابی میں اس کا عام تلفظ "دہلی" ہے۔ اس کا اشتقاق مبہم ہے، بعض مشہور و مقبول اشتقاقیات کے لیے دیکھیے A. Cunningham، در ASI، ۱: ۱۳۷ بعد۔

"دہلی کے سات شہروں" کا ذکر عوامی روایات میں اکثر ملتا ہے، لیکن دہلی کے علاقے میں مراکز حکومت کی تعداد فی الحقیقت اس سے تقریباً دو چند رہی ہے۔ سطور ذیل میں ان کا حال حتیٰ الوسع تاریخی تسلسل کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔

قدیم ترین ہستی [نڈرہت] (منسکرت: نڈرہت) ایک ٹیلے پر تھی، جہاں اب پرانا قلعہ واقع ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ قلعہ دیومالائی دور میں بانڈوؤں نے تعمیر کیا تھا۔ یقیناً یہ ایک بہت قدیم عمارت ہے، کیونکہ یہاں سے خاکستری رنگ کے روغنی اور شمالی علاقے سے مخصوص سیاہ چلا دار ظروف کے ٹکڑوں

Harvard Journal of Asiatic Studies در and Gerege Land: A. K. S. Lambton (۱۴): ۲۳۷ ص ۱۹۵۳ء (اوکسفورڈ)۔

(ANN K. S. LAMINGTON)

* **دہلیک (جزائر):** بحیرہ احمر کے مغربی ساحل کے قریب مضوع (Eritrea) کے بالمقابل واقع جزیروں کا ایک مجموعہ، جن کا مرکز تقریباً ۱۴ درجے ۱۰ دقیقے مشرق اور ۴ درجے ۵ دقیقے شمال میں ہے، تقریباً ان ۱۲۵ جزیروں میں سے، جن میں چھوٹے چھوٹے جزیرے، چٹانیں اور ٹاپو (reefs) شامل ہیں، دو سب سے بڑے جزیرے ڈھلک الکیر اور نورہ ہیں۔ ان کے علاوہ نوکرہ (Nokra) دوہول (Dohol)، حرث (Harat) درکہ (Daraka) اور دینفارخ (Dinifarikh) ہیں۔ یہ سب سیاٹ اور نشیبی ہیں، بحالیکہ ان کے ساحل بہت گہرے کئے ہوئے ہیں ان میں بارش کم ہونے کی وجہ سے نباتات کی قلت ہے۔ بعض جزائر میں معمولاً یا وقتی طور پر نگری (Tigre) زبان بولنے والے مسلمان آباد ہیں، جن کی مجموعی تعداد پندرہ سو سے ڈھائی ہزار نفوس ہے، اور جو سنہرے ساحلی قبائلیوں سے قریبی مشابہت رکھتے ہیں یہ لوگ حبشی الاصل ہیں جس میں عربوں، دناقلہ صومالیوں اور سوڈانیوں کی آمیزش ہے۔

مآخذ: (۱) C. Conti Rossini: Storia d'

Etiopia، میلان ۱۹۲۸ء، ج ۱: ۱ (۲) Issel: Viaggiatori

amar Rosso، میلان ۱۸۸۹ء: (۳) R. Basset: Les

Inscriptions de l'Église de Dahlak در J.A. بیرس

Le Popolazioni indigene: A. Pollera (۴) ۱۸۹۳ء

dell'Eritrea، رولنگا، ۱۹۳۵ء (۵) G. Wiet: Roitelets

de Dahlak در RIE، ۱۹۵۲ء، ص ۸۹ تا ۹۵ - [نیز

دیکھیے وو لانڈن بار دوم - بذیل مقالہ]

(S. H. Longrigg [تلخیص از ادارہ])

* **الدہلوی، نور الحق:** رگہ یہ نور الحق الدہلوی

دہلی: (۱) تاریخ: دہلی کا شہر دروایے جہا

آباد جو اپنے ساتھ حکمران کی نسبت سے قلعہ رائے پتھورا کے نام سے موسوم ہوا۔ آثار قدیمہ سے ملنے والی شہادتوں کے بارے میں بحث کے لیے دیکھیے (J. D. Beglar, ASI, ۱۰، ۱۱-۱۲ (۱۹۵۵) : ۱۳۰)۔

قلعہ رائے پتھورا ہی سلاطین دہلی کی مستقل اقامت گاہ رہا، یہاں تک کہ ۱۲۸۸ھ/۱۲۸۹ء کے قریب معزالدین کیفیاد نے کیو کھڑی کے مقام پر جو اس وقت جٹا کے کنارے تھا، اپنا محل بنوایا (تاریخ فرشتہ، مترجمہ Briggs، ۱ : ۲۷۳)۔ ۱۲۸۹ھ/۱۲۹۰ء میں جلال الدین فیروز خلجی نے اس پر قابض ہو کر اس کی تکمیل کی اور اس کے مضافات کو وسعت دی۔ اب یہ مقام پورے طور پر ویران ہو چکا ہے۔ معلوم ہوتا ہے جلال الدین کے وقت میں بھی پرانا شہر نسبتاً زیادہ قدر و منزلت کا حامل تھا، چنانچہ جونہیں اسے سیاسی طور پر ممکن نظر آیا، اس نے اپنا دربار وہاں منتقل کر دیا۔ سلطان علاء الدین خلجی نے اس میں بہت کچھ ترمیم کی اور ترقی دی۔ لال کوٹ کے مغربی دروازے (راجیت دروازہ) کی تعمیر امی میں شامل ہے۔ (امیر خسرو، ترجمہ در Elliott و Dowson، ۳ : ۵۶۱)۔ اس نے قلعہ لال کوٹ کی توسیع کا بھی آغاز کیا (دیکھیے Beglar، محل مذکور)۔ حملہ آور منگواؤں سے بچاؤ کے لیے اس نے پہلے شمال میں سیری (یا سیری) کے میدان میں ایک فوجی مستقر قائم کیا۔ بعد ازاں خندقوں سے اس کا احاطہ کر لیا اور بالآخر ۱۲۸۳ھ/۱۲۸۳ء کے قریب اس کے گرد فصیل بنا دی۔ سیری کے اصل محل وقوع پر اعتراض کیے گئے ہیں (مثلاً کیپبل C. J. Campbell : Notes on the history and topography of the ancient cities of Delhi, JASB, ۳۵ (۱۸۶۶) : ۲-۶ تا ۲۱۳)؛ لیکن ابن بطوطہ (۳ : ۱۳۶، ۱۵۵) اور تیمور (ملفوظات تیموری، ترجمہ در Elliott اور Dowson، ۳ : ۷۷۴) نے اس کا جو حال قلمبند کیا ہے، اس کے پیش نظر، نیز یہاں کے آثار اور

کے علاوہ، جو پانچویں صدی قبل مسیح کی ساخت کا نمونہ ہیں، پہلی اور دوسری صدی عیسوی کے کشان عہد کے ظروف کے ٹھہکے بھی دستیاب ہوئے ہیں (دیکھیے Ancient India، ۱۰-۱۱ (۱۹۵۵) : ۱۳۰)۔ بعد ازاں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آگے چل کر دہلی کے علاقے کو تقریباً ترک کر دیا گیا تھا، کیونکہ اس کے بعد جو بستی ظہور میں آئی اس کا تعلق نویں یا دسویں صدی عیسوی سے ہے۔ یہ تمار خاندان کا وہ شہر تھا جسے اب سورج کنڈ کہتے ہیں اور جہاں ابھی تک پختہ چٹائی کا ایک بڑا تالاب اور مٹی کا ڈھس موجود ہیں۔ جوہان راجپوتوں نے جو شہر بنایا، اس کی باقیات نسبتاً زیادہ وسیع ہیں؛ اس کی آبادی کی تاریخ غالباً دسویں صدی عیسوی ہے اور وہ مسلمانوں کی فتح سے ذرا پہلے موجود تھا۔ اس علاقے کے جنوب مغرب میں، ایک چھوٹی سی بھاڑی پر الٹک پال نے ۱۰۵۲ء کے لگ بھگ ایک قلعہ ”لال کوٹ“ تعمیر کرایا تھا اور پرتھوی راج نے ۱۱۸۰ھ/۱۱۸۱ء کے قریب مسلمان حملہ آوروں کے خلاف اپنی مدافعت کے لیے بستی کے گرد ایک اور بیرونی فصیل تیار کرا دی تھی (Cunningham، در ASI، ۱ : ۱۸۳)۔ فتح کے بعد قطب الدین ایبک نے ۱۱۹۲ھ/۱۱۹۳ء میں مسجد ”قوت الاسلام“ تعمیر کرائی اور بعد ازاں اس کے متعلق اس مینار کی تعمیر شروع کی جو نہ صرف مسجد کا ”مآذنہ“ تھا بلکہ اس کی فتح کی یادگار بھی تھا۔ ان عمارات اور ان میں شمس الدین ایتھمش اور علاء الدین خلجی کے حکم سے کی جانے والی توسیعات، نیز اس علاقے کی، جو ”قطب“ کے نام سے مشہور ہے، دیگر عمارات کے لیے دیکھیے نیچے، بعنوان ”یادگار عمارتیں“۔ ہندوؤں کی قدیم فصیل کی توسیع اور اسے باقاعدہ طور پر از سر نو مستحکم کرنے کا کام یہاں کے ابتدائی مسلمان صوبیداروں اور بادشاہوں کے ہاتھوں انجام پایا اور، دہلی کا پہلا مسلم شہر وجود میں

آثار باقدہ *Ancient India* (ج ۱) کی ایک عکسی تصویر (لوحة ۹) میں دیکھے جا سکتے ہیں، جو فضا سے لی گئی تھی۔ شہر کے جنوب میں پہلے ایک مصنوعی جھیل تھی، جس میں غیاث الدین کا مقبرہ اب تک موجود ہے۔ قلعے سے مقبرے تک ایک مورچہ بند راستہ محرابوں کے اوپر بنایا گیا تھا اور ان محرابوں میں بھی دفاعی استحکامات موجود تھے۔ تغلق آباد سے جنوب مشرق میں ایک سنگ بستہ راستہ عادل آباد کے ذیلی قلعے کو تغلق آباد سے ملاتا ہے۔ یہ راستہ دراصل جھیل کا پانی روکنے کے لیے بند کا کام دیتا تھا۔ عادل آباد، غیاث الدین کے بیٹے محمد بن تغلق نے ۱۳۲۵ء/۷۳۲ھ کے لگ بھگ تعمیر کرایا تھا، لیکن جب اس نے اپنا دارالحکومت دولت آباد (رگ بان) میں منتقل کیا (۱۳۲۹ء/۷۲۹ھ) تو تغلق آباد کے ساتھ اسے بھی ترک کر دیا (ان مقامات کے لیے دیکھیے *Adilabad: a part of: Hilary Waddington* the "fourth" Delhi در *Ancient India* : ۱ : ۶۰ تا ۶۷، مع عکسی تصاویر اور پیمائش کے نقشوں کے)۔ جب تغلق آباد تعمیر ہو رہا تھا تو مشرق میں ایک چھوٹے سے قلعے کو، جسے "حجام" یا "دھوبی" کا قلعہ کہتے تھے اور جو اصل میں ممکن ہے کہ کوئی مدرسہ یا درگاہ ہو، مورچہ بند کر دیا گیا تھا اور قیاساً وہ ان دنوں غیاث الدین کی اقامت گاہ کے طور پر استعمال ہوا۔ تقریباً عادل آباد کی تعمیر کے زمانے ہی میں محمد بن تغلق نے جملہ منہاغات شہر کے گرد، جو قلعہ رائے پتھورا اور سری کے درمیان نمودار ہو گئے تھے، فصیل بنانے کا ایک عظیم منصوبہ تیار کیا تھا۔ اس سے ایک اور شہر وجود میں آیا، جو "جہاں پناہ" کے نام سے موسوم ہوا۔ اس فصیل کی دیواریں کوئی بارہ میٹر چوڑی تھیں، جو اب بالکل گر چکی ہیں اور ان کے صحیح محل وقوع کا سراغ لگانا آسان نہیں رہا۔ موضع کھڑکی کے قریب فصیل میں جو نہری بھاٹک

زمین پر دفاعی مورچوں کے نشانات کی مدد سے کٹنگھم Cunningham (در *ASI* : ۱ : ۲۰۷) نے کیمل Campbell کے نظریات کی مدلل طور پر تردید کر دی ہے۔ سری کی قدیم فصیلوں کے اندر جو کچھ باقی رہ گیا ہے، وہ نسبتاً زمانہ حال کا گاؤں شاہ پور ہے۔

اگرچہ ہم اسے مشکل ہی سے "دہلی کا شہر" قرار دے سکتے ہیں تاہم یہاں کی عمارتیں دہلی کی تاریخ میں ایک اہم مقام کی حامل رہی ہیں۔ ہماری مراد اس مجموعہ عمارات سے ہے جس کی قدیم ترین عمارتیں خجی عہد سے تعلق رکھتی ہیں اور جو سلسلہ چشہ کے مشہور ولی اللہ حضرت نظام الدین اولیاء کے مقبرے کے گرد پھیلی ہوئی ہیں۔ ان سب سے مل کر ایسی شکل پیدا ہو گئی ہے جسے Piggott نے "بد زب" مگر دلچسپ گورکھ دھندے" سے تعبیر کیا ہے۔ سرکاری طور پر اب یہ "بستی" نظام الدین" کہلاتی ہے (ان عمارات کے نقشے اور حالات کے لیے دیکھیے نیچے بعنوان "یادگار عمارتیں")۔

سلاطین دہلی کے دور کی اکثر عظیم الشان عمارتوں کے منصوبے خاندان تغلق کے عہد میں تیار ہوئے، جو خلجیوں کے بعد برسر اقتدار آیا تھا۔ اولاً غیاث الدین تغلق نے ناصر الدین [خسرو شاہ] کو، جو متحدہ دہم چھوڑ کر مسلمان ہو گیا تھا، ۱۳۲۰ء/۷۲۰ھ میں شکست دینے کے فوراً بعد قلعہ رات پتھورا سے تقریباً آٹھ کلومیٹر مشرق میں اپنا دارالحکومت تغلق آباد بنانے کے لیے جگہ منتخب کی۔ اس شہر کی قدیم شہر پناہ کے آثار سے پتا چلتا ہے کہ یہ قریب قریب شش بساو تھی؛ اس بیرونی فصیل کے اندر شاہی محلات کا رقبہ برج و بارہ سے مستحکم تھا اور اس سے بھی زیادہ مستحکم بالا حصار کو بنایا گیا تھا۔ شہری رقبے میں ایک مسجد کے آثار باقی ہیں، نیز شہر کے بازاروں، گلی کوچوں اور ان کے مکانات کے نشانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خوب گنجان آباد تھا۔ یہ

(مت پلا) بنایا گیا تھا اس کے لیے دیکھیے سطور آئندہ،
بذیل ”یادگار عمارتیں“۔

ایک اور شہر فیروز آباد کی تعمیر محمد تغلق کے جانشین فیروز تغلق کی رہوں مت ہے۔ یہ شہر اندراپت سے کوشک شکار تک پھیلا ہوا تھا۔ ”کوشک شکار“ زمانہ مابعد کے شہر شاہجہان آباد سے تین کیلومیٹر شمال مغرب میں واقع تھی اور اب بڑی حد تک شاہجہان آباد ہی کے اندر آچکی ہے۔ فیروز آباد کی عمارات کو بعد کے حکمرانوں، خصوصاً شیر شاہ سوری اور شاہجہان نے (نئی عمارتیں بنانے کے لیے) توڑ پھوڑ دیا تھا اور اب فقط اس کا بالا حصار باقی ہے، جسے کوئٹہ فیروز شاہ کہتے ہیں۔ اس کی فصیلوں کو توڑ کر انھیں دفاعی ریزاؤں تک لچا کر دیا گیا۔ ان کے اندر اب محل کی عمارات، ایک خوبصورت مسجد کے آثار اور ایک عجیب سا مخروطی چبوترہ نظر آتا ہے، جو اشوک کی اس لالہ کی کرسی کا کام دیتا تھا جسے انبالے کے قریب سے یہاں لایا گیا تھا۔ قدم شریف کی الگ تھلک عمارت اور اس کے قریب عیدگہ دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ شہر کی مغربی حد زمانہ مابعد کے شاہجہان آباد سے آگے نہیں گئی تھیں۔ دہلی کے ارد گرد دور دور تک فیروز شاہ کی بنائی ہوئی عمارات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے زمانے تک مضافات شہر بخوبی آباد تھیں۔ اس کی مزید شہادت جہاں پناہ میں دو بڑی مسجدوں، نظام الدین میں ایک بڑی مسجد اور شمالی مضافات اور وزیر آباد میں متعدد چھوٹی چھوٹی مسجدوں سے ملتی ہے۔ علاوہ ازیں کچھ تعمیرات علاء الدین کے تعمیر کردہ تالاب ”حوض علائی“ (جسے بعد میں اسے ”حوض خاص“ کہنے لگے) کے گرد بھی وجود میں آئیں۔ یہاں فیروز تغلق نے ایک بڑا مدرسہ قائم کیا اور اپنا مقبرہ بنوایا۔

تیمور کی تباہ کاری کی وجہ سے دہلی کا عظیم شہر کچھ زمانے تک گہن میں رہا، اگرچہ سید خاندان

کے حاکم خضر خان نے اپنا دربار خضر آباد میں اور مبارک شاہ نے مبارک آباد میں قائم کیا (یہ دونوں مقامات دریائے جمنا کے کنارے واقع تھے) اور بعد ازاں سلطان مبارک شاہ نے اپنا مقبرہ مبارک پور (یا مبارک شاہ کوئٹہ) کے قلعہ بند گاؤں میں بنایا، لیکن سیدوں اور ان کے جانشین لودیوں نے دہلی میں مزید شہر نہیں بسائے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ لودی اپنا پایہ تخت آگرے لے گئے اور دہلی ایک وسیع گورستان سے کچھ ہی بہتر رہ گیا، اس لیے کہ سیری اور فیروز آباد کے درمیان کا میدان اس عہد کے مقبروں سے پٹا پڑا تھا۔ اس سلسلے میں یہ علاقے بالخصوص قابل ذکر ہیں: نظام الدین سے دو کیلومیٹر مغرب میں خیر پور کا میدان مبارک پور سے ایک کیلومیٹر مغرب میں ایک علاقہ ”نہن برج“ اور حوض خاص کو جانے والی سڑک کے کنارے کا علاقہ ”نہر پرا“۔ موضع مہرولی کی جنوبی سمت الشمس کے تعمیر کردہ تالاب حوض شمسی کے علاقے میں بھی کچھ عمارتیں تھیں۔

دسویں صدی ہجری/سولہویں صدی عیسوی کے اوائل میں مغل (رک بان) برصغیر میں داخل ہو گئے۔ ہمایوں دہلی میں مقیم ہو گیا اور اس نے ۱۵۴۰ء/۱۵۳۳ء میں اندراپت کے پرانے ٹیلے پر قلعہ دین پناہ کی تعمیر شروع کی، لیکن [جلد ہی] شیر شاہ سوری نے اسے تاج و تخت سے محروم کر دیا اور زمام حکومت سنبھالنے کے بعد اس عمارت کو ایک نئے شہر کے قلعے کے طور پر پایہ تکمیل کو پہنچایا، مگر اس شہر کا کوئی خاص نام مذکور نہیں اور اب اس کے آثار بھی باقی نہیں رہے، بجز شمالی دروازے کے، جو فیروز شاہ کوئٹہ کے قریب ہے اور جنوبی دروازے کے جو قلعے (دین پناہ) کے بالمقابل رہ گیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ شیر شاہی شہر کا بیشتر پتھر آگے چل کر شاہجہان آباد کی تعمیر میں استعمال کیا گیا تھا۔ شیر شاہ کے

اورنگ آباد [رگ باں] میں انتقال کیا؛ تاہم مصافحات میں تعمیرات بدستور ہوتی رہیں، مثلاً ہمایوں کے مقبرے سے ملحقہ عمارات، درگاہ نظام الدین^۳ اور درگاہ روشن چراغ دہلی قدیم جہاں پناہ میں، اور درگاہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی^۴ سہرولی میں؛ مؤخر الذکر عمارتیں مغل حکمرانوں کے قبرستان کے طور پر کام آتی رہیں۔ علاوہ انہیں سہرولی میں ایک چھوٹا سا گرامی محل ہے، جسے آخری مغل بادشاہ استعمال کرتے تھے۔

۱۸۵۸ء میں خاندان مغلیہ کے خاتمے کے ساتھ انگریزوں نے غدر کے دوران میں اور بعد میں بہت سی یادگار عمارات کو تباہ کر ڈالا اور دارالحکومت کلکتے میں منتقل کر دیا تو شہر دہلی کی اہمیت کم ہو گئی اور وہ مقامی فوج کی ایک چھوٹی سی چھاؤنی ہو کے رہ گیا۔ انگریزوں نے اس شہر کو شاہجہان آباد کے شمال میں وسعت دی، جہاں سول لائٹز بنائی گئی۔ اسی جگہ ۱۹۱۱ء میں (ہندوستان کا) دارالحکومت منتقل ہوا اور نئے شہر کی تعمیر شروع ہوئی، جسے ابتدا میں رائے سینا کہتے تھے اور بعد میں نئی دہلی کہنے لگے۔ بعد ازاں شاہجہان آباد کے مغربی جانب توسیع ہوئی، یعنی سبزی منڈی، قروں باغ اور در بازار کے علاقے میں؛ خیر پور کے جنوب میں اور سہرولی کی سڑک پر؛ نیز چھاؤنی کے گرد، گڑ گاؤں کی شاہراہ اور پالم کے نئے ہوائی مستقر کے نواح میں۔ مذکورہ بالا بیانات میں ناموں کی جن الجھنوں کو ہم نے نظر انداز کر دیا ان کا ذکر کر دینا ضروری ہے۔ لال کوٹ اور قلعہ رائے پتھورا کو تیسور کے زمانے تک ”ہرائی دہلی“ کہتے تھے اور یہی نام برطانوی عہد کے اوائل میں باقاعدہ استعمال ہوتا تھا؛ مگر جب سے ”نئی دہلی“ بنی ہے ”ہرائی دہلی“ کے نام کا اطلاق اکثر غلطی سے شاہجہان آباد پر کر دیتے ہیں۔ شاہجہان کے نئے قلعے، یعنی لال قلعے کی تعمیر کے بعد ہمایوں اور شیر شاہ کے قدیم قلعے

بٹھے اور جائنشین اسلام شاہ نے، جو سلیم شاہ کے نام سے معروف ہے، ۱۵۵۰/۸۹۵۷ء کے قریب ہمایوں کی مراجعت کا سڈباب کرنے کی غرض سے دریائے جمنا کے کنارے ایک چھوٹا سا قلعہ سلیم گڑھ شہر کے بیرونی مورچے کے طور پر تعمیر کرایا تھا۔ ہمایوں کی مراجعت پانچ برس بعد ہوئی، مگر [اس کے مختصر سے دوسرے عہد حکومت میں] دہلی کی عمارتوں میں کوئی اضافہ نہیں ہوا اور بعد کے دو مغل حکمرانوں نے آگے اور لاہور میں قیام کرنا پسند کیا، تاہم دہلی کی بعض عمارات ان کے عہد کی تعمیر کردہ ہیں، خصوصاً جو عمارتیں ہمایوں کے مقبرے کے گرد تعمیر کی گئیں (دیکھیے ایس۔ اے۔ اے۔ نقوی: Humayun's tomb and adjacent buildings، دہلی ۱۹۷۷ء) شاہ جہان نے بھی گیارہ برس آگے رہ کر بادشاہی کی، لیکن وہاں کی زحماتیں دیکھ کر وہ دہلی منتقل ہو گیا (عمل صالح، ورق ۵۷۵ تا ۵۷۶؛ Storia de Mogor: Manucci، ۱: ۱۸۳) اور وہاں اس نے ہم عصر مؤرخین، نیز خوابگاہ کے کتبے کی رو سے ۱۲ ذوالحجہ ۱۰۸۸ھ/۱۶/۸۱ اپریل ۱۶۳۹ء کو، لیکن بروئے مآثر الآراء، (۲: ۴۶۴) اور بقول سید احمد خان ۹ محرم ۱۰۸۹ھ/۱۲ مئی ۱۶۳۹ء کو ایک نئے قلعے کی بنیاد رکھی، جسے لال قلعہ کہتے ہیں۔ یہ اس کے نئے شہر شاہجہان آباد کا بالا حصار تھا اور نو برس میں مکمل ہوا۔ شہر کے گرد فصیل بنانے کا کام ساتھ ساتھ شروع ہوا۔ اور اس کے اندر شاہجہان اور اس کے جائنشینوں کے عہد حکومت میں بہت سی نئی عمارات نے شہر کی زینت بڑھائی (ان میں ممتاز ترین جامع مسجد ہے، جس کی تعمیر قلعے کی تکمیل کے دو برس بعد شروع ہوئی)، مگر انہوں نے کسی اور شہر کا اضافہ نہیں کیا اور شاہجہان آباد بدستور مغل حکمرانوں کا دارالحکومت بنا رہا (بجز اورنگ زیب کے، جس نے اپنا بیشتر وقت دکن میں بسر کیا اور

زنانہ شاہ نشین بن سکے۔ "لیوان" اور کھلے صحن کے درمیان ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۱ء میں ایک بلند محرابی پردے کا اضافہ ہوا تھا، لیکن اس کی محرابیں عقی دالان کے ستونوں کے فاصل اور محرابوں سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ دالان کی محرابوں کے تقریباً ستائیس ستون ہندو اور جینی مندروں سے لیے گئے اور سطوبہ ارتفاع تک لانے کے لیے جہاں تھان لگا دے گئے تھے تاکہ مسجد کی چھت ان پر ڈالی جائے اکثر ستون بر ستون جما دیا ہے۔ چھت بھی اسی قبیل کے مندروں کی سنگی پٹیوں سے بنی ہے ان پر تراشی ہوئی صورتوں کی صورتیں مسخ کر دی گئیں اور ان پر روا روی میں چوٹے کی تہہ چڑھا دی اور کہیں کہیں ان کا رخ اندر کی جانب اونڈھا کر دیا گیا۔ صحن میں کھلانے والی محرابیں چوٹی پر بن دے کر بنائی اور ان سے سورتیاں نکالی گئی ہیں۔ ان کی اونائی کوئی ۲۰۵ میٹر رہے، وسطی محراب ۱۳۷ میٹر بلند ہے اور کمان کی چوڑائی ۷۷ میٹر ہے۔ اس مقصورے کی کل سطح پر نقش و نگار تراشے ہیں، جن میں ہندوانہ بھول بنی اور عربی نقوش اور نسخ خط کی عسودی مسطور کندہ ہیں۔ صحن میں ایک بے رنگ، ڈھلے ہوئے لوہے کا ستون استادہ ہے، جو عہد گپتا (چوتھی صدی عیسوی) کے ایک وشنو مندر سے لایا گیا اور بلاشبہ عمارت بنانے والوں نے اسے وہاں نہ صرف ایک نادر قدیم شے کے طور پر بلکہ بت پرستوں پر اپنی فتح کا نشان بنا کے گاڑا ہے۔ جب مسجد قطب الدین بایہ تکمیل کو پہنچ گئی تو اس کے جنوب مشرقی کونے میں قطب مینار بننا شروع ہوا، جس کا حال آگے آتا ہے۔

قطب الدین کے جانشین شمس الدین ایلتمش کے عہد حکومت میں تعمیرات میں اضافہ ہوا اور یہ فقط دہلی تک محدود نہ تھا۔ اس نے مسجد دہلی میں ستونوں کے سلسلے اور بڑے "مقصورے" والی دیوار میں توسیعیں دے کر ان میں مزید حسن تناسب اور

کو براب "برانا قلعہ" یا "قلعہ کھنہ" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

بناکار عمارتیں : دہلی کی عمارات برصغیر میں مستقل اسلامی حکومت کی قدیم ترین یادگاروں کو پیش کرتی ہیں۔ اسی جگہ سب سے اول ہندوستانی مسلمانوں سے مخصوص اسالیب تعمیر نے نشوونما پائی، جن کا اثر و نفوذ خود دہلی سے باہر دور دراز تک پھیلا۔ اس اعتبار سے یہاں جو کچھ بیان کیا گیا ہے، وہ فقط بڑی بڑی عمارتوں کی مادہ اور مجمل ہی کیفیت تک محدود ہے، البتہ انہیں زمانی ترتیب سے لکھا گیا ہے اور مختلف زمانوں کی عمارتوں کی ممتاز خصوصیات کی نشان دہی کر دی گئی ہے۔ لوحوں اور تفصیلی نقشوں کے ساتھ ان اسالیب پر بحث کے لیے رک بہ فن تعمیر : ہند۔

دوسرے مقامات [رگ بہ اجیرا، بیجاپور؛ دولت آباد؛ دھارا؛ جون پور؛ گوڑا؛ گجرات؛ مانڈو؛ تربیتی] کی طرح دہلی کی اسلامی تعمیرات کے اولیں دور میں بھی ہندوؤں کے مندروں سے حاصل کیے ہوئے تعمیری مسائل سے کام لیا گیا۔ اس کی شہادت ہندوستان کی سب سے پہلی مسجد، یعنی قلعہ رائے پتھورا میں قطب الدین ایک کی تعمیر کردہ مسجد قوت الاسلام سے ملتی ہے، جس کا قدیم ترین کتبہ ۱۱۹۱ھ/۱۱۹۱ء کا ہے۔ اس مسجد کا وسطی دالان (۳۷۵×۳۷۵ میٹر) ایک مندر کی کرسی (۳۷۵×۳۷۵ میٹر) پر تعمیر کیا گیا ہے، جس میں ستونوں پر تین کمانچے مشرق میں ہیں اور دو شمالی اور جنوبی جانب۔ مغربی "لیوان" (=دالان) کی چوڑائی حار گمہ کی ہے۔ اصل میں یہاں محراب قبلہ کے گوشوں کے آگے جو جگہ چھوٹی ہوئی تھی، اس پر پانچ گنبد تھے اور دالان کی چھت شمالی درے پر اونچی کر دی گئی تھی تاکہ اس حصے میں

ساڑھے چار درجے ہو گیا ہے اور ہر منزل بن کھنڈ کو چھوڑ کے ایک دوسرے سے جدا کرتے ہیں۔ یہ چھوڑ کے طاقیہ دار توڑوں پر لگے ہوئے ہیں۔ ہر منزل میں پختی یا نالیان تراشی ہیں اور اس طرح غالباً غزنہ کے اصلی نمونہ مینار کی کثیرالاضلاع ساخت کو ترقی دی گئی، چنانچہ پہلی یہی سب سے نیچے کی منزل میں باری باری سے نالی اور ترجھے کٹاؤ ہیں اور دوسری منزل ساری کی ساری نالی کی اور تیسری کمر کی یا ترجھے کٹاؤ کی ہے۔ بالائی منزلیں سادہ و صاف ہیں جو فیروز تغلق کی بنائی ہوئی ہیں (نیچے دیکھیے)۔ سب سے نیچے کی منزلوں میں سے ہر ایک خط نسخ کے عربی کتبوں سے مزین ہے، جو چوڑے چوڑے پشکوں کے اندر دائرہ بناتے چلے گئے ہیں۔ ان کتبات پر تاریخ زمانہ تعمیر، معزالدین محمد بن سام اور شمس الدین کی تہریف اور آیات قرآنی درج ہیں)۔ غرض اس یادگار عمارت میں ہندوانہ اصل کی خصوصیات قریب قریب کلیہً مفقود ہیں۔ ہندوستان میں قبر پر یادگار عمارت یا مقبرہ بنانے کی پہلی مثال التمش کے عہد حکومت میں نظر آتی ہے! یہ ملک پور میں اس کے بیٹے ناصرالدین محمود کا مقبرہ (۵۶۲۹/۵۶۳۱ء) ہے۔ یہ ایک ہشت پہلو حجرے میں کوئی دو میٹر اونچی کرسی پر استادہ ہے، جس کی چھت بڑھ کر بیرونی چار دیواری سے ملتی ہے۔ اس چار دیواری میں موزی والی محرابیں تراشی ہیں اور مشرق و مغربی دیواروں پر ہندو ساخت کے ستونوں کے محرابی دالان ہیں۔ مغربی سمت کا دالان ایک چھوٹی سی مسجد ہے، جس میں وسطی کمانچہ اور محراب قبلہ بنا دی گئی ہے۔ بیرونی صدر دروازے پر کوئی حروف میں تاریخ بنا کا کتبہ لگا ہے (خط کوئی میں غیر قرآنی کتبے یہاں کے علاوہ فقط مسجد قوت الاسلام اور اجیر ہی میں دیکھے جاتے ہیں)۔ کونے کے برج فیروز تغلق کی اصلاح عمارات کا حصہ معلوم

عظمت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ جہاں تک نئی محرابوں، کمانچوں اور مقصورے کی محرابوں کا تعلق ہے، انہیں اسے متناسب انداز میں بنانا گیا کہ پوری عمارت ایک متوازن و ہم آہنگ نقشے سے بنائی ہوئی معلوم ہو۔ نئے صحن میں مینار شامل تھا، جس میں اس نے اضافے بھی کئے اور اس کے داخلوں کو سابقہ مسجد کے بالمقابل اور جوڑ کا ترتیب دیا۔ نئے ستونوں کی تظار مقابلاً سادہ ستونوں پر مشتمل ہے اور دیوار مقصورہ کی تزئین کی کوئی غلطی اور متناقض تلاش واضح طور پر بتاتے ہیں کہ وہ کسی اسے صنایع کی صنعت میں جو اپنے مسالے سے پہلے کاریگروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ واقفیت رکھتا ہے۔ محرابیں ابھی تک موزی والی ہیں، مگر قدیم تر مقصورے کی کمانچوں سے تراش بدلی ہوئی ہے، یعنی اس پر ڈھانچل نہیں دیا گیا ہے۔ اس مسجد کی شمالی جانب اس نے جو توسیع کی تھی، اسی سے ملا ہوا مغرب میں مقبرہ التمش (حدود ۵۶۳۲/۵۶۳۵ء بدون کتبہ تاریخ) ہے! یہ ایک جو کور کمرہ ہے، جس پر ابتدا میں گول گنبد، موزی والی بڑی ڈانٹوں پر استوار تھا۔ تمام اندرونی سطح و افرائی گکاریوں، ماہی پشت کی نقاشی اور نسخ و کوئی کتبوں سے (جو سب کے سب قرآنی ہیں) مزین ہے۔ بیرونی حصہ پتھر کے تراشیدہ چوکوں کا بنا ہوا ہے، جس میں شمال، مشرق اور جنوب کی طرف سنگ خارا یا بھر پھرنے سنگ سرخ کے محرابی روشن دان ہیں! یہی سنگ سرخ اندرونی حصے میں بھی استعمال ہوا ہے، لیکن سمت قبلہ کی دیوار اور تمویذ قبر میں سنگ مرمر لگا ہوا ہے۔ اصل قبر نیچے تہہ خانے میں ہے۔ التمش نے قطب مینار میں تین مزید منزلوں کا اضافہ کر کے اس کی توسیع کی تھی، جس سے مجموعی بلندی ۶۹ء میٹر ہو گئی (Cunningham: ASI، ۱: ۱۹۵) اور یہ کام ۵۶۲۶/۵۶۲۹ء کے لگ بھگ مکمل ہو گیا۔ ڈھلان کا زاویہ چوٹی سے تقریباً

ہوتے ہیں (فتوحات فیروز شاہی، علیگزہ ۱۹۳۳ء، ص ۱۶)۔ اس مقبرے کو مقامی طور پر "سلطان غازی" کہتے ہیں۔ بظاہر اس کی وجہ وہ گہرا سردابہ یا گیار ہے جس میں ناصر الدین مدفون ہے، لیکن یہ نام سید احمد خان (آثار الصنادید، دہلی ۱۸۳۸ء، ص ۲۰۶ تا ۲۰۸) سے پہلے مذکور نہیں (مفصل مطالعے کے لیے دیکھیے اس۔ اے۔ اے۔ نقوی: سلطان غازی، دہلی، در Ancient India ۳ (۱۹۴۷ء): ۴ تا ۱۰ و لوحہ ۱ تا ۱۲)۔

بعد میں آنے والے بادشاہوں کے عہد میں علاء الدین خلجی کے برسر حکومت آنے تک سلطان بلبن (۵۹۸۶ء) کے مقبرے کے سوا کوئی بڑی اور قابل ذکر عمارت تعمیر نہیں ہوئی۔ یہ مقبرہ قلعہ رائے پتھورا کے جنوب مشرق میں ہے اور التمش کے مقبرے سے بھی بڑا ہے۔ اس میں صدر ایوان کے ساتھ بغلی کمرے ہیں اور ایوان میں پہلی مرتبہ صحیح معنی میں کیلی کی محراب کا استعمال نظر آتا ہے۔ اس سے نہ صرف تعمیر میں فنی ترقی کا پتا چلتا ہے بلکہ ہندو کاریگروں سے جو کام لیا جاتا تھا ان کی تعمیری روایت کے خلاف یہ فن تعمیر کی اسلامی روایت کے مستحکم ہو جانے کی نشاندہی کرتا ہے۔

علاء الدین خلجی کی قلعہ لال کوٹ کی توسیعات اور سیری کی عمارات کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ اس نے مسجد قوت الاسلام کے شمال اور مشرق میں توسیع کے ایک مہتمم بالشان منصوبے کا آغاز کیا: چند ستون اور شمالی مستطی دروازے کی بنیادیں باقی رہ گئی ہیں، جن سے اس کی اور "مقصورہ" کے بہت بڑے دالان کی دیوار کی وسعت کا پتا چلتا ہے، جسے سابقہ دالانوں کی دیواروں کی مجموعی لمبائی کے برابر لمبا اور دگنے پیمانے پر بنانا مقصود تھا۔ شمالی صحن میں ایک دیوہیکل مینار کی پہلی نامکمل منزل کھڑی ہے، جس کا قطر بنیاد پر قطب مینار کے قطر سے دگنا ہے۔

ان توسیعات کی سب سے زیادہ قابل ذکر خصوصیت جنوبی داخلہ، موسوم بہ علانی دروازہ ہے، جو بے مثل تعمیری عرونی کا جامل ہے۔ اس مربع عمارت کے اوپر، جس کی اندرونی پیدائش ۱۰۷۵ء سیر اور دیواروں ۳۴۴ء سیر مٹی ہیں، ایک چپٹا گنبد بنا ہوا ہے۔ مشرق، جنوب اور مغرب کی جانب لہایت رفیع محرابیں ہیں (سطح زمین سے چوٹی تک ۱۰۷۵ء سیر) اور شمال میں ان سے بیٹھوٹی ایک سہ گوشہ محراب ہے، جس سے صحن کی مشرقی توسیع میں راستہ جاتا ہے۔ تین بڑی محرابیں اور ڈالیں (جو گنبد کو اٹھانے ہوئے ہیں، لو کدار نعل کی وضع کی ہیں اور کیلی کا پتھر دے کے بنائی گئی ہیں۔ محرابوں کے اندرونی خدوں پر نیزوں کے پھل کی مروجہ وضع کی جھالر ہے۔ اسی قسم کا اسلوب درگہ نظام الدین کی جماعت خانہ مسجد میں دکھائی دیتا ہے اور یہ ہندوستان میں ایسی مساجد کی پہلی مثال ہے جسے ہندو عمارتوں کے مسائل سے، جیسا کہ مل گیا، نہیں بتایا گیا تھا بلکہ اس کے لیے پتھر خاص طور پر بہاڑ سے کاٹ کر لایا گیا تھا (اس مسجد کی بحث کے لیے دیکھیے ظفر حسن: A guide to Nizam-ud-Din Memoire ASI، ج ۱۰، ۱۹۲۳ء)۔ حوض علانی (حوض خاص) پر ایک ابتدائی عمارت (مدرسہ؟) بھی اس نے بنوائی تھی، مگر اس سے قطع نظر دہلی میں علاؤ الدین کی دیگر عمارتوں میں سے اس کا مقبرہ اور مدرسہ ہی رہ گئے ہیں: یہ مسجد قوت الاسلام کے جنوب مغرب میں واقع ہیں اور اب بالکل کھنڈر ہو گئے ہیں۔ ان کی مغربی دیوار پر چھوٹے حجروں کا سلسلہ ہندوستان میں پہلی مرتبہ وہ گنبد پیش کرتا ہے جنہیں دیوار گیر یوں کا سہارا دے کر اٹھایا گیا ہے۔ "قطب صاحب" کی تمام یادگار عمارتوں اور آثار کے مفصل حالات کے لیے دیکھیے Historical: J.A. Page 'Memoir ASI' = Memoir on the Qutb, Delhi ج ۲۲، ۱۰۲۵ء: وہی مصنف: Guide to the Qutb.

ہوتے ہیں (فتوحات فیروز شاہی، علیگزہ ۱۹۳۳ء، ص ۱۶)۔ اس مقبرے کو مقامی طور پر "سلطان غازی" کہتے ہیں۔ بظاہر اس کی وجہ وہ گہرا سردابہ یا گیار ہے جس میں ناصر الدین مدفون ہے، لیکن یہ نام سید احمد خان (آثار الصنادید، دہلی ۱۸۳۸ء، ص ۲۰۶ تا ۲۰۸) سے پہلے مذکور نہیں (مفصل مطالعے کے لیے دیکھیے اس۔ اے۔ اے۔ نقوی: سلطان غازی، دہلی، در Ancient India ۳ (۱۹۴۷ء): ۴ تا ۱۰ و لوحہ ۱ تا ۱۲)۔

بعد میں آنے والے بادشاہوں کے عہد میں علاء الدین خلجی کے برسر حکومت آنے تک سلطان بلبن (۵۹۸۶ء) کے مقبرے کے سوا کوئی بڑی اور قابل ذکر عمارت تعمیر نہیں ہوئی۔ یہ مقبرہ قلعہ رائے پتھورا کے جنوب مشرق میں ہے اور التمش کے مقبرے سے بھی بڑا ہے۔ اس میں صدر ایوان کے ساتھ بغلی کمرے ہیں اور ایوان میں پہلی مرتبہ صحیح معنی میں کیلی کی محراب کا استعمال نظر آتا ہے۔ اس سے نہ صرف تعمیر میں فنی ترقی کا پتا چلتا ہے بلکہ ہندو کاریگروں سے جو کام لیا جاتا تھا ان کی تعمیری روایت کے خلاف یہ فن تعمیر کی اسلامی روایت کے مستحکم ہو جانے کی نشاندہی کرتا ہے۔

علاء الدین خلجی کی قلعہ لال کوٹ کی توسیعات اور سیری کی عمارات کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ اس نے مسجد قوت الاسلام کے شمال اور مشرق میں توسیع کے ایک مہتمم بالشان منصوبے کا آغاز کیا: چند ستون اور شمالی مستطی دروازے کی بنیادیں باقی رہ گئی ہیں، جن سے اس کی اور "مقصورہ" کے بہت بڑے دالان کی دیوار کی وسعت کا پتا چلتا ہے، جسے سابقہ دالانوں کی دیواروں کی مجموعی لمبائی کے برابر لمبا اور دگنے پیمانے پر بنانا مقصود تھا۔ شمالی صحن میں ایک دیوہیکل مینار کی پہلی نامکمل منزل کھڑی ہے، جس کا قطر بنیاد پر قطب مینار کے قطر سے دگنا ہے۔

Delhi (مذکورہ کتاب کا ماخذ) ، دہلی ۱۹۳۸ء :
The architecture of : H.H. Cole
Ancient Delhi لندن ۱۹۷۲ء .

خاندان تغلق کے بانی غیاث الدین کی تعمیرات
تغلق آباد کے شہر (دیکھیے اوپر ، تاریخ) اور اس کے
اپنے دو مقبروں کی تعمیر تک محدود ہیں۔ پہلے مقبرے
کی تعمیر کے لیے رگ بہ ملتان۔ دوسری تعمیر کا آغاز
اس وقت ہوا جب وہ پنجاب چھوڑ کر بادشاہ کی حیثیت
سے دہلی میں آگیا۔ شکل کے اعتبار سے یہ ایک
بے قاعدہ محبس ہے ، جس کے ہر زاویے پر برج ہیں۔
اجالے کے سب سے چوڑے حصے میں مقبرے کی
عمارت آڑی بنی ہوئی ہے۔ روضہ سرخ پتھر کا ہے ،
جس کے سہارے میں سفید سنگ مرمر لگا ہے۔ اس کی
دیواروں میں اچھی نمایاں مخروطیت (اس سے ۲۵
درجے) ہے۔ شمالی ، مشرقی اور جنوبی پہلوؤں میں
کمانچہ دار دروازے ہیں (مغربی پہلو محراب قبلہ کے
نہیں بند ہے)۔ خاندان کے عہد حکومت میں نئے کے
مہل والی جہاز کا رواج چلا تھا ؛ اسے ان کمانچوں
میں استعمال کیا گیا ہے اور محراب کے سرے پر خفیف
مادہ پراہل دیا ہے۔ یہاں ہندوؤں کے قدیم کڑیاں
استعمال کرنے کے طریقے کو نئے قوسی طریقے سے
اس طرح ملا دیا گیا ہے کہ جہاں سے قوس محراب
شروع ہوئی ہے وہاں نیچے آریار سردل بھی جما
دی گئی ہے۔

محمد تغلق کے ہاتھوں عادل آباد اور دین پناہ
کی بناد رکھی جانے کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ دین پناہ
کی فصل میں پانی کا پھانک با سنت دریچے بنائے ہیں ،
جن میں چھوٹی محرابوں سے کام لیا گیا ہے اور سرے
پر برجیاں بنا دی ہیں۔ یہ ست پلا ہے اور اس کے دو
درجے ، بند کے اندر ، پانی کی سطح اونچی نیچی کرنے کا
ہندوستان رکھنے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ اسی بادشاہ
کے عہد کی ایک عمارت موضع بیگم پور کے قریب

نیچے منسلک کہلاتی ہے ، جسے قصر ہزار ستون کے
آثار قدیمہ گمان کرتے ہیں۔ اس میں چامی ڈاٹ کی
ہندوستان پور میں سب سے پہلی مثال پائی گئی ہے۔
اس کے بالکل قریب ایک شاندار مگر گدام ، مندر اور
بارہ کھمبا ہے (نیچے دیکھیے)۔

محمد بن تغلق نے دہلی کی کل منتخب آبادی
کو دولت آباد (رگ بان) میں منسلک کیا تو اس کا نتیجہ
یہ نکلا کہ شمالی ہند کے مہاجرت پتھر ہو گئے۔ اس کے
جانشین فیروز شاہ (۱۲۰۵ء/۱۲۱۰ء تا ۱۲۳۵ء/۱۲۴۰ء)
نے تعمیرات میں پڑی سرکاری دکانوں اور اس کی
سرپرستی میں گارے کی چٹائی اور استرکاری کے دور کا
آغاز ہوا۔ اس بادشاہ نے بہت سے تعمیراتی منصوبوں
کا بیڑا اٹھایا ، جن کی فہرست شمس مراح عقیف
(تاریخ فیروز شاہی) اور فرشتہ نے دی ہے۔ وہ خود اپنی
فتوحات فیروز شاہی میں اپنے دشمن بادشاہوں کی ان یادگار
عمارتوں کا ذکر کرتا ہے جو اس نے دوبارہ بنوائیں یا
ان کی مرمت اور تجدیدی۔ تعمیر اور مرمت کے یہ
متعدد منصوبے سخت کفایت شعاری کے مقتضی تھے ،
جنتیچہ ہر منصوبے کی تجاویز دیوان وزارت کے
سامنے ہستی کی جاتی تھیں اور زیادہ قیمتی تعمیراتی مسالا
(سنگ مرمر وغیرہ) استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔ فیروز شاہ
کے شہروں میں سے فیروز آباد کا ذکر اوپر گزر چکا
ہے (نیز رگ بہ چولپور ؛ فتح آباد ؛ حصار فیروزہ ؛
کوٹلے کی قلعہ بندی اور فصل کے کنگوروں میں
روزن سازی کا طریقہ اختیار کرنے کے لیے رگ بہ برج)۔
کوٹلے کے اندر جامع مسجد بہت ہی کرمی پر استادہ
ہے اور اس کا صدر دروازہ شمال میں ہے۔ صحن کے
چاروں جانب گہری گہبہ کے تہرے دالان بنائے تھے
اور وسطی ہشت پہلو حوض کے گرد فیروز شاہ کی
رفاہ عاہد کی عمارتوں کی فہرست مرتسم کر دی تھی۔
اب ان عمارات کا صرف ڈھانچہ بچا ہوا ہے۔ اس کی
انک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کا بہت سا پتھر برطانوی

بنائے ہیں (ASI, Annual Report) ج ۲۷، لوحہ ۱)۔
سات ہلا کے نزدیک جہان پناہ کے جنوب میں کھڑکی
گاؤں کی مسجد کا نقشہ بھی اسی طرح کا ہے، لیکن چلیانی
دالانوں میں، جو ایک دوسرے کو قطع کرتے ہیں،
محرابوں کے تین درجے رکھے ہیں، جیسا کہ
بہلو کے صدر دالان یا لیوانوں میں؛ لہذا فقط چار
صحن، جن میں سے ہر ایک ۹۷۸ مربع میٹر ہے،
تقریباً ۵۲ مربع میٹر کے کل رقبے میں غیر مستقیم ہیں۔
کلاں مسجد (جسے بعض اوقات غلطی سے کالی مسجد
کہتے ہیں) زمانہ مابعد میں شاہجہان آباد کی شہر پناہ
کے اندر آ گئی تھی۔ یہ نسبتاً چھوٹی ہے اور اس
میں صرف ایک کھلا صحن ہے، جسے قبہ دار محرابی
دالانوں کا سلسلہ چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔
کلاں مسجد، کھڑکی کی مسجد اور کوٹلا کی جامع مسجد،
تینوں نیچے قبہ خانے کی منزل دے کر ایک بلند کرسی
پر بنی ہوئی ہیں اور خود مسجدوں میں اونچی سیڑھیوں
کے ذریعے اندر جاتے ہیں۔ کلاں مسجد بلاشبہ نئے
فیروز آباد کے مضافات کی سب سے بڑی مسجد تھی،
لیکن بیگم پور اور کھڑکی کی مسجدوں کی وسعت اس
امر پر دلالت کرتی ہے کہ پرانے شہروں میں بھی ابھی
تک اچھی خاصی آبادی تھی۔ پہاڑی کے شمالی مضافات
کے لیے چوارجی مسجد تعمیر کی گئی تھی؛ اب وہ طرح
طرح کے کام لیے جانے کی وجہ سے اس قدر تبدیل
ہو چکی ہے کہ اس کا اصل تعمیری نقشہ مشکل ہی سے
شناخت کیا جا سکتا ہے۔ مسجد کے نزدیک فیروز شاہ
کی کوشک شکار یا جہان نما کے باقی آثار نظر آتے ہیں،
جہاں وہ ۱۷۷۶ء/۱۷۷۷ء میں اپنے بیٹے فتح خان کی
موت کے بعد غم غلط کرنے چلا آیا تھا۔ یہ شہزادہ
قدم شریف میں مدفون ہے، جو ایک قلعہ بند احاطہ ہے
(رک بہ برج؛ نیز ASI, Annual Report ج ۲۲، لوحہ
۳ ج ود)۔ احاطے کے اندر قبر کے چاروں طرف قبہ دار
محرابی دالان ہیں۔ قبر کے اوپر ایک پتھر پر رسول اللہ

انجیثروں نے شاہجہان آباد کی فصیلاوں میں لگا دیا تھا۔
دوسری عمارت، جو کوٹلا کے اندر کھڑی ہے، ایک
سہ منزلہ مخروطی چٹائی ہے۔ اس کے اوپر اشوک
(تیسری صدی ق م) کی ایک لالہ چڑھائی گئی ہے،
جسے ضلع میرٹھ سے لانا گیا تھا۔ ان کے لیے اور قلعے
کے اندر کے دیگر کھنڈرات کے لیے دیکھئے J. A. Page
Memoir ASI = A Memoir on Kotla Feroz Shah, Delhi
ج ۵۲)؛ دہلی ۱۹۳۷ء۔ اس عہد میں مسجد بنانے کا
جو طرز رائج تھا وہ تقریباً ۱۷۶۶ء/۱۷۶۷ء تا ۱۷۷۶ء/۱۷۷۷ء
کے عشرے میں تعمیر شدہ نصف درجن مساجد
سے پیروی واضح ہوتا ہے۔ یہ سب گارے کی چٹائی
اور اوپر استر کر کے بنی ہیں، جس پر شروع میں سفیدی
کی جاتی ہوگی۔ ان میں ستون اور سنگ خارا میں کائے
ہوئے ہندووانہ طرز کے طاقے اور دیوار گیریاں بنی
ہیں۔ شان دار مستقیم دروازے، کئی کئی گنبد کی
بیڑیں اور دروازوں کے بہلو میں مخروطی شکل کے
آرائشی ستون ہیں۔ ان میں سب سے سادہ مسجد
وزیر آباد (= تیمور پور) میں "شاہ عالم کی درگاہ" میں
ہے۔ پانچ کمانچوں کے سیدھے سادے غریبی دالان
کے اندر عقبی گوشے میں ایک زنانہ بغلی دالان ہے،
جسے دہلی میں اس طرز کا اولین نمونہ قرار دیا جا سکتا
ہے؛ مسجد پر تین گنبد ہیں۔ بیگم پور کی بڑی
مسجد کا صحن (۷۵۳ × ۶۸۷ میٹر) چاروں طرف سے
برجی دار محرابی دالانوں سے گھرا ہوا ہے اور مغربی
"لیون" کے وسط میں داخلے کی کہان روکار تک اتنی
اونچی بنائی ہے کہ مسجد کے بڑے گنبد کو نیچے کے
رخ سے چھپا لیتی ہے۔ "نظام الدین" میں مسجد منجر
(جسے کالی مسجد بھی کہتے ہیں) میں ایک وسطی
صحن ہے؛ ایسے چلیانی شکل کے ایک گہبہ کے محرابی
دالان نے چار چھوٹے حصوں میں تقسیم کر دیا ہے،
جن میں سے ہر ایک ۱۳۷ × ۱۰۱ میٹر ہے؛ نیز
اس میں چاروں طرف کے محرابی دالان گنبد دار

دہریے ہیں۔ عمارت میں ایک وسطی گنبد ہے اور آٹھ گنبد نما چھتریاں ایک دوسری کے بالمقابل بنائی ہیں۔ اس مقبرے کا اصلی ندوہ تلاش کرنے میں لوگ بیت المقدس کے القبة الصخرہ تک پہنچے ہیں اور یہ تو واقعہ ہے کہ بعد کے سید، لودی اور سوری خاندانوں کے بہت سے شاہی مقبروں کے لیے یہ نمونے کا کام دیتا رہا۔ تغلقوں کی سب سے آخری عمارت میں شیخ کبیر الدین اویا کا مقبرہ ہے (غالباً ناصر الدین محمود کے عہد اور ۱۲۹۶ء/۱۲۹۸ء کے بعد کا)؛ گو یہ غیاث الدین تغلق کے مقبرے کی نصف پیمائش پر سرسری سی نقل ہے، لیکن وہ اس لحاظ سے لائق توجہ ہے کہ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عہد فیروز شاہی کی خشک سادگی سے آگے لوگ پھر اسلوب کی رنگا رنگی کی طرف مائل ہو رہے تھے۔

دہلی میں فیروز شاہ کی سرنگوں کے لیے دیکھئے H. Hosten در JASB، سلسلہ جدید، ۸ (۱۹۱۱ء) : ۹۹ تا ۱۰۸ و ۸ (۱۹۱۲ء) : ۲۴۹ تا ۲۸۱ و ۹ (۱۹۱۳ء) : ۸۳ تا ۹۱۔

چونکہ نظام الدین کی درگاہ میں بڑی عمارتیں اسی زمانے کی ہیں، لہذا اس مجموعہ عمارت کی کیفیت یہاں دی جاتی ہے۔ داخلے کے دروازے پر تاریخ ۷۸۰ھ/۱۳۷۸-۱۳۷۹ء مرقوم ہے اور اس کے اندر ایک بڑی باؤلی [رنگ بان] ہے، جس کے کنارے پر دو مقبرے اور ایک دور منزلہ مسجد ہے۔ ان تینوں کا طرز تعمیر فیروز شاہی نظر آتا ہے۔ باؤلی کا تاریخی نام "چشمہ دلکش" (۷۸۰ھ/۱۳۷۸-۱۳۷۹ء) ہے۔ درگاہ کے احاطے کے اندر جانے کا ایک اور بڑا دروازہ بن ہے۔ شیخ (نظام الدین اولیاء) کا مقبرہ اکبر کے زمانے کا ہے اور اس قدیم مقبرے کی جگہ بنا ہے جسے فیروز تغلق نے تعمیر کروایا تھا؛ لیکن اکبری عہد کے بعد بوی بارہا اس کی تجدید ہوتی رہی ہے، چنانچہ اس کے گنبد کا اضافہ اکبر شاہ ثانی نے ۱۸۱۳ء میں کیا تھا۔ اس

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نقش قدم بنائی کے ایک چھوٹے سے حوض میں نصب ہے۔ خود فیروز تغلق کے مقبرے سے ایک مدرسہ ملحق ہے، جسے اس نے حوض خاص پر علاء الدین کی عمارت کے ڈھانچے کی جگہ پر بنایا تھا۔ اس حوض کے مشرق اور جنوب میں مدرسے کی عمارتوں میں، جو جھیل کے سامنے دو منزلہ اور عقب میں یک منزلہ ہیں، کئی گہہ کی ستونوں کی قطاریں ہیں۔ چھتیں محرابوں یا سردل اور دیوار گیریوں پر بنائی گئی ہیں۔ فصیل چھوڑ کر قیہ دار چوکور ایوان دالانوں کو باہم ملاتے ہیں۔ یہ عمارت تقریباً ۷۶ میٹر ایک کنارے پر اور ۱۲۰ میٹر دوسرے کنارے تک پھیلی ہوئی ہے۔ جنوب مشرق کنارے پر ۱۳۷ میٹر چوکور مقبرہ ہے، جس کی استر کی ہوئی دیواروں کی موٹائی اوپر کی جانب قدرے کم ہوتی چلی گئی ہے۔ بیرونی دو دیواروں (جنوبی اور مشرق) میں معدولی سا ابھار دے کر کمان کھولی ہے اور کمان کے اندر سردل اور دیوار گیری کے چوکھٹے میں دروازہ بنایا ہے۔ عمارت میں ہشت پہلو ڈھولے پر ایک ہی گنبد اٹھایا ہے اور مذکور ڈالٹوں سے اسے مستحکم کیا گیا ہے۔ مغربی دیوار میں ایک دروازہ متصلہ ایوان میں کھاتا ہے اور اس میں ایک چھوٹی سی محراب ہے۔ یہ عمارت ایک چھوٹی سی کرسی دے کر چنی گئی ہے اور یہی کرسی جنوبی سمت آگے بڑھ کر کھلا چبوتہ بن جاتی ہے، جس کے گرد پتھر کا کشہرا نر مادہ خانوں کی ساخت کی طرح چٹا ہے، جو چوبی کام کے مشابہ ہے۔ ایک اور مقبرہ، جو بڑی تعمیری اہمیت رکھتا ہے، فیروز شاہ کے وزیر اعظم خان جہاں تانگانی (م ۷۷۰ھ/۱۳۶۸-۱۳۶۹ء) کا نظام الدین میں کوٹ کے اندر ہے۔ یہ دہلی میں پہلا ہشت پہلو مقبرہ ہے (اگرچہ "باطان غازی" میں مقبرے کا حجرہ بھی ہشت پہلو ہے) اس کے گردا گرد ایک برآمدہ ہے، جس کے ہر رخ تین محرابیں کھلی ہوئی ہیں اور ان کے اوپر چوڑے چھتے

مقبرے کے مغرب میں جماعت خانہ کی مسجد کا ذکر
بہائے ہو چکا ہے۔ اس احاطے کے جنوب میں بہت
سے اکابر (جہاں آرا، دختر شاہجہان، محمد شاہ،
م ۱۱۶۱/۱۷۷۸ء، جہانگیر، پسر اکبر ثانی، شیخ
کے مشہور، مرید امیر خسرو، گو ان کا مقبرہ اوائل
گیارہویں صدی ہجری/سترہویں صدی عیسوی کی تعمیر
ہے، وغیرہ) کی قبریں ہیں۔ اس صحن کی مشرقی دیوار کے
باہر کی طرف اکبر کے رضاعی باپ انکھ خان م ۹۶۹/۱۵۶۲ء
کا چوکور مقبرہ ہے، جس میں مختلف رنگوں
سے بچی کاری کی ہوئی ہے اور صلیبوں کے مقبرے
کی طرز پر بنا ہوا ہے (نیچے دیکھیے)۔ اس مقبرے سے
کوئی ساٹھ میٹر جنوب مشرق میں جونسٹون کھمبا ہے، جو
بھورے سنگ مرمر کی نہایت نفیس و موزوں عمارت ہے
اور انکھ خان کے فرزند میرزا عزیز کوکلتاش، م ۱۰۳۳/۱۶۲۵ء
کے خاندانی گورستان کا کام دیتی تھی۔ متصلہ
کوٹ اور اس کے اندر مقبرہ تلنگانی کا حال پہلے بیان
ہو چکا ہے۔ ان تمام عمارات کی مکمل تفصیلات کے
لیے دیکھیے ظفر حسن : *A Guide to Nizamu-d-Din*
Memoir (Memair ASI، ج ۱)، کلکتہ ۱۹۲۲ء۔

ایک اور درگاہ، جو زیادہ تر عہد فیروزی سے
تعلق رکھتی ہے، نصیر الدین چراغ دہلی (م ۷۵۷/۱۳۵۶ء)
کی ہے (رک بہ چشتیہ)۔ اس کا مشرقی دروازہ
۱۳۷۵/۱۷۷۵ء کا ہے، لیکن مقبرے میں بہت سی حالیہ
جدتیں کی گئی ہیں۔ اس درگاہ اور گاؤں کے گرد کی فصیل
کو محمد شاہ نے ۱۱۶۲/۱۷۷۹ء میں تعمیر کرایا
تھا۔ اس کے پہلو میں بھلول لودی کے مبینہ مقبروں
میں سے ایک مقبرہ کھڑا ہے۔

سید اور لودی خاندانوں نے کوئی بڑے تعمیری
منصوبے نہیں تیار کیے۔ بجز ایک ممتاز مسجد کے
ان کی یادگار عمارتیں کلیہ مقبروں پر مشتمل ہیں۔
یہ سب عمارتیں مندرجہ ذیل تین مقامات ہی میں
مرکز ہیں : خیر پور، مبارک پور اور جہاں پور۔

کے جنوب میں اس مڑک پر جو حوض خاص کو جاتی
ہے۔ یہ مقبرے دو جداگانہ نمونوں کے ہیں : چوکور
اور مشن، مگر دونوں صورتوں میں، ان میں ایک بڑا
و، نلی گنبد ہوتا ہے اور منڈیر کے اوپر عموماً کھلی
چھتریاں ہوتی ہیں۔ مشن کا سب سے قدیم نمونہ
کوئلہ مبارک پور میں مبارک شاہ (م ۸۳۸/۱۴۳۷ء) کا
ہے، جو مقبرہ تلنگانی کے طرز کی ترقی یافتہ صورت ہے۔
گو مقبرہ کافی اونچا نہیں ہے اور ہر مہرے پر آٹھ
سامنے ہشت پہلو چھتریاں بہت قریب قریب بھنچی ہوئی
نظر آتی ہیں۔ دس سال بعد اسی خاندان کے فرمانروا
محمد شاہ کے مقبرے میں گنبد کے ڈھولے اور چھتریوں
کو اونچا کر کے اور پرآمدے کی منڈیر کے ہر گوشے
میں گلدستے کا اضافہ کر کے ان نقائص کو دور
کر دیا گیا ہے۔ سکندر لودی (حدود ۹۲۴/۱۵۱۸ء)
کا مقبرہ خیر پور کے شمال میں ہے اور طول و عرض
میں اسی کے برابر ہے، لیکن اس میں چھتریاں نہیں
اور گنبد کا ایک اندرونی اور ایک بیرونی خول ہے۔
یہ مقبرہ فصیل بند احاطے میں واقع ہے، جس کی مغربی
دیوار پر محرابوں کا ایک سلسلہ عیدگاہ کے مشابہ ہے
اور قیاساً ایک بیرونی محراب قیام ہے۔ مبارک شاہ کے
مقبرے میں ایک علاحدہ مسجد ہے، لیکن محمد شاہ
کے مقبرے میں ایسی کوئی مسجد نہیں۔ تمام مقبروں
کے گوشوں پر ڈھلوان پشتیاں بنے ہیں۔

دوسرے نمونے کے چوکور مقبرے تمام کے تمام
غالباً نویں صدی ہجری/پندرہویں صدی عیسوی کے
آخری ربع کے ہیں، لیکن ان میں کتبوں کی کمی ہے
اور وہ ایسے مقامی ناموں سے موسوم ہو گئے ہیں جن
سے حقیقت کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ مبارک پور کے مغرب
میں جو تین گنبد "تین برج" کہلاتے ہیں ان میں سے
عہد ترین "بڑے خان کا گنبد" ہے۔ یہ ان میں سے
سب سے بڑا (بلندی ۲۵ میٹر) ہے۔ مذکورہ گنبد باہر
سے منظم تین درجوں کا لیکن فی الواقع ایک ہی بڑا

محراب کے ساتھ ایک اور دروازہ لگا چیز بنا دی ہے، جو باقی عمارت کے برابر ہی بلند اور حاذب توجہ ہے۔ ”ہون“ کے پہلو میں جو گنبد ہیں، ان کی بنیاد گروہ گوشوں پر رکھی ہے، جو طاقوں سے مزین ہیں۔ سفید سنگ مرمر، بھرپورا سنگ سرخ اور کاشی کاری کے رنگین چوکوں سے، نیز استرکاری میں نقش تراشی سے جا بجا کام لیا ہے۔ جمالیاتی نقطہ نظر سے ہندوستان بھر میں یہ مسجد مسلمانوں کے فن تعمیر کے انتہائی جان دار نمونوں میں شامل ہے۔ نودہوں کی دیگر عمارتیں، کم ہیں۔ ایک عمارت (مدرسہ؟) جس میں ایک چھوٹی سی مسجد شامل ہے، ”جہاز محل“ کہلاتی ہے اور مہرولی میں حوض علائی کی مشرقی جانب واقع ہے۔ نظام الدین کے قریب چند چھوٹی بارہ دریاں اور محل اور بیگم پورہ کے مقام پر سکونتی مکان (بارہ کتبہ) ہے، جس کا صحن احاطہ بند ہے اور اس میں ایک سہ منزلہ مینار ہے۔

مغل فتوحات کے ابتدائی ایام میں، جب کہ ان کی سلطنت کو هنوز استقلال نصیب نہیں ہوا تھا، لودی سلطان (شیخ) جمالی میں، جو قلعہ رائے پورہ کے جنوب میں ہے، پتھر کے نقس چو کے لگائے دیں۔ بڑے دالان کی پانچ محرابیں ہیں، جن کے مرغوانوں کی سطح کی زمین نیچی رکھی ہے۔ داخلے کی وسطی محراب ایک اور بڑی محراب سے مل کر ایک ہو گئی ہے، جس میں نیزے کے پھل جیسی جھانر لگی ہوئی ہے۔ یہ وسطی کمرے کے پھل کر پیش دروازہ بن گیا ہے، جو روکار کی عام سطح سے اوپر اٹھوا ہوا ہے۔ مسجد میں صرف ایک ہی وسطی گنبد شمال کی جانب ہے۔ فضل اللہ [رک بان] المتخلص بہ جمالی کی قبر کے اوپر ایک مستطیل عمارت ہے، جو بہت معمولی دکھائی دیتی ہے، لیکن اس کی چھت میں رنگوں کی آرائش دہلی پور میں بہترین ہے۔ ہشت پہلو مقبرے کا طرز

ایوان ہے۔ اس کے اور اس کے متصلہ ”چھوٹے خان“ کے گنبد“ میں ڈھولے کے نیچے جو مربع بنا ہے اس کے گوشوں میں ہشت پہلو چھتریاں ہیں، جس طرح مجاہد پور کے مجموعہ عمارات میں ”دادی“ اور ”بوتی“ کے گنبدوں میں بنی ہیں۔ خیرپور میں سب سے اچھی حالات میں محفوظ عمارات ایک تو بڑا گنبد (تعمیر ۱۸۹۹ء/۱۸۹۹ء) ہے، جس کے اندر کوئی قبر نہیں اور جس کے متعلق مقامی لوگ کہتے ہیں کہ وہ متصلہ مسجد، صحن اور ”مجلس خانہ (?)“ کا دروازہ ہے۔ مسجد کے ہر عقبی گوشے میں بھاری بھر م مخروطی اور ڈھلوان ستون ہیں۔ ہر ستون میں نالی کا ہنکا ایک گول، ایک زاویہ دار کی قریب سے بنایا ہے، جو قطب مینار کی سب سے نیچے کی منزل کی یاد تازہ کرتا ہے۔ مشرق میں بیرونی رخ وسیع وسطی محرابیں ہیں، جن کے علاقے (= اوپر کے خالی زاویے) استرکاری کے بہترین نقش و نگار سے مزین ہیں۔ دہلی کی عمارتوں میں استرکاری پر اتنی اچھی نقش تراشی اور کھیں نہیں ہے۔ اس کے قریب شیش گنبد ہے، جو بڑے گنبد کے بالکل مشابہ ہے، مگر اس میں گہرے لیلے رنگ کی کاشی کاری کے رتے بھی دیے گئے ہیں۔ مذکورہ بالا مسجد کے علاوہ نودہوں نے اس درجے کی عمارتوں میں ایک بڑا نمونہ اور تیار کیا تھا، یعنی مبارک پور کے جنوب میں موٹھ کی مسجد، جو ایک بالکل الگ تھاک عمارت ہے۔ اسے سکندر لودی کے وزیر نے حدود ۱۵۰۵ء/۱۵۰۵ء میں تعمیر کرایا تھا۔ اس کی مغربی دیوار میں اسی قسم کے مخروطی ستونوں کے کنگورے ہیں، لیکن بڑھی ہوئی محراب قبلہ کے گوشوں پر، نیز بیرونی کونوں پر، دو منزلہ ڈھلے بوج بنائے گئے ہیں، پہلو کی دیواروں میں عودی کڑیاں ڈال کر جھروکے نکالے ہیں، مغربی ”ہون“ کے سامنے کے رخ محرابوں کے خطوط ان کی زمین کو نیچا کر دینے سے اور نمایاں کر دئے گئے ہیں۔ اسی طرح وسطی

چاہتا تھا۔ اس شہر کے فقط دو بڑے دروازے باقی رہ گئے ہیں: شمالی (لال، کابل، یا خونی دروازہ)، جو کوئلہ نیروز شاہ کے بالمقابل ہے اور جنوبی دروازہ، جو اپنی تھوڑی سی دیوار کے ساتھ برائے قلعے کے نزدیک ہے (دیکھیے ASI, Annual Report ۱۹۰۶: ۱۲)۔ لوحہ ۳ - شیر شاہی قلعے کی فصیحوں کے علاوہ اندرونی عمارات میں سے صرف دو باقی رہ گئی ہیں: (۱) شیر منڈل، سرخ پتھر کی ایک دو منزلہ مشن عمارت، جس کی اصلی غرض بنا معلوم نہیں، لیکن ہمایوں اسے کتب خانے کے طور پر استعمال کرتا تھا اور اسی (کے زینے) سے گر کر فوت ہوا تھا؛ (۲) ایک مسجد، جس کا کوئی الگ نام نہیں ہے اور جس کا سب سے قریبی نمونہ جمالی مسجد ہے، لیکن اس میں عرصاً پانچوں دالانوں کی روکار کی کمان کسی قدر چھوٹی اور نیچی ترشی ہوئی سطح کے خانے میں بنائی ہے اور سابق الذکر مسجد کے دوسرے اجزا کو بھی بہتر و نفیس تر کر دیا گیا ہے۔ بیرونی چٹائی تراشیدہ پتھر کے چوکوں سے کی گئی ہے اور "ایوان" کا سہرا سنگ سرخ کا ہے، اس کے کچھ حصے میں نفیس نقش تراشے ہیں اور سنگ مرمر اور رنگا رنگ کی کاشی کاری سے اس کی تزئین کی گئی ہے؛ وسطی گنبد کے اندرونی حصے کو ڈاٹوں کے دو سلسلوں پر قائم کیا ہے اور بغلی دالانوں کی چھت جن کروی گوشوں پر رکھی ہے ان میں آرائشی طاقچے بنائے ہیں۔ عقبی دیوار میں محراب قبلہ جو آگے نکلی ہوئی ہے اس کے دونوں پہلوؤں پر مخروطی شکل کے مینار ہیں اور ہر گوشے پر کھلی ہشت پہلو برجیاں بنی ہیں۔ دہلی میں مغلوں کی پہلی بڑی عمارت شہنشاہ ہمایوں کا مقبرہ ہے، جس کا طرز وہی ہے جس کا نقشہ پہلے نظام الدین میں اتکھ خان کے چھوٹے سے مقبرے کے سلسلے میں بتایا جا چکا ہے۔ اس کی بنیادیں اس کی دیوہ نے ۱۵۷۸ء/۹۷۰ھ میں رکھی تھیں

۱۵۵۷ء/۹۵۸ھ کے عیسوی خان نیازی کے مقبرے میں یعنی اسلام شاہ سوری کے عہد حکومت میں بھی قائم رہا؛ اس کی ساخت پہلے ادونوں کی طرح ہے، بشمول بند مغربی دیوار اور محراب قبلہ کے، لیکن اس میں کاشی کاری کے جو دوغنی جو کے باقی رہ گئے ہیں ان کی تعداد زیادہ ہے۔ ہشت پہلو صحن کے مغرب میں ایک علیحدہ مسجد موجود ہے، جو پھورے سنگ مورہ اور سنگ سرخ کی ہے؛ عرصاً تین دالانوں میں سے وسطی دالان کو ایک آگے نکلے ہوئے کمانچے میں بٹھایا گیا ہے؛ اوپر ایک وسطی گنبد اور بغلی دالانوں پر چھتریاں ہیں؛ مقبرے کی عمارت کے ہر گوشے پر ڈھلوان پشتیان ہیں اور یہ دہلی میں آخری عمارت ہے جس میں یہ عمل کیا گیا ہے (ان عمارات کے لیے دیکھیے Humayun's tomb: S. A. Naqvi and adjacent buildings دہلی ۱۹۷۷ء، ص ۱۱ تا ۲۴)۔ دہلی میں سب سے آخری ہشت پہلو منبرہ کوئی چودہ سال بعد اکبر کے عہد حکومت میں تعمیر ہوا تھا۔ یہ ادم خان کا مقبرہ ہے، جو قلعہ راے پتھورا کے انتہائی جنوب مغرب میں واقع ہے۔ اس میں مزید بلندی پیدا کرنے کی کوشش میں گنبد کے ڈھولے کو ایک درمیانی منزل کی صورت دے دی گئی ہے۔ باہر کے رخ بحرابی کوشکیں ہیں، مگر اوپر چھتریاں نہیں ہیں؛ گنبد کے درمیان کی منزل میں دیواروں کے چوڑے آثاروں کے اندر سیڑھیوں کی بھول بھلیاں بن گئی ہیں۔ عمارت کا عام تاثر یہ کیف سا ہے (عکسی تصویر اور مختصر حال کے لیے دیکھیے Cole: کتاب مذکور)۔

پہلے دو مثل شہنشاہوں، یعنی بابر اور ہمایوں نے دور اول میں قلعہ کہنہ کی تعمیر کا آغاز کرنے کے سوا دہلی کی یادگار عمارتوں میں کسی چیز کا اضافہ نہیں کیا اور اس کی تعمیر بھی زیادہ شیر شاہ سوری کی مرہون منت ہے، جس نے مغلوں سے سلطنت چھینی اور جو اسے اپنے نئے شہر کا بالا حصار بنانا

لہذا یہ ہمایوں کے مقبرے کی بہ نسبت واضح طور پر تاج محل کی پیشرو ہے۔ اس عمارت کے سنگ مرمر کو بعد میں آصف الدولہ، وزیر اودھ، اٹار کر لے گیا تھا۔ دیگر مغل عمارات یہ ہیں: لال چوک دا خیرا (منزل: مؤخر الذکر نام، مادہ تاریخ ہے ۱۵۶۹ء/۱۵۶۹-۱۵۶۹ء)؛ ایک مسجد، جسے اکبر کی انا ماہم انکہ نے تعمیر کرایا تھا؛ اس کے مشرق، جنوب اور شمال میں دو منزله داران ہیں، جو درجہ کا کام دیتے تھے (ASI, Annual Report) ۲۲: ۶ و لوجہ الف و ب: کتبہ، Memoir ASI، ۴۲: ۱۰) اور شیخ عبدالنبی، یعنی اکبر کے صدر الصدور کی بنائی ہوئی مسجد، جو فیروز شاہ کے کوئلہ اور پرانے قلعے کے درمیان ہے اور ۱۵۷۵ء/۱۵۷۵-۱۵۷۶ء میں تعمیر ہوئی (دیکھیے ظفر حسن: Mosque of Shaikh Abdun Nabi (Memoir ASI ج ۹)، کلکتہ ۱۹۲۱ء، دہلی میں مغلیہ تعمیرات کا سب سے بڑا دور وہ ہے جب شاہجہان آباد اور لال قلعے کی تعمیر ہوئی: مؤخر الذکر کی بنیاد ۱۶۰۸ء/۱۶۰۸-۱۶۰۸ء میں رکھی گئی تھی۔ مغلیہ محلات اور دیگر عمارات کی اہم خصوصیات کے لیے رگ بہ فن: مغل۔ یہاں فقط مختصر سا حال دیا جاتا ہے۔ محل کا احاطہ تقریباً ۵۵x۵۵ میٹر اور اس کے وسطی صحن میں دیوان عام ہے۔ اس کے دونوں جانب پھر کھلے صحن ہیں، جن میں باغات ہیں۔ مشرقی فصیل کے ساتھ محلات کا جو سلسلہ ہے اس کا رخ اندر کی طرف ان باغات کی جانب اور باہر کی طرف دریا کی جانب ہے۔ دیوان عام سنگ مرمر کا ہے، جس کے کھلے ضلعوں میں ڈہرے فائز ستون ہیں۔ ان میں اور جنوب مشرق محلات میں دندلے دار محرابیں ہیں۔ یہ عمارتیں نیچی کمرہوں پر بنائی گئی ہیں اور ان میں سے بہتوں کی جہت کے ہر گوشے پر کھلی چھتریاں ہیں۔ محلات میں سے ایک آرائشی نمبر، جس کا نام نمبر

(دیکھیے سنگین بیگ: سنر انزال، خطوطہ در عجائب خانہ لال قلعہ، دہلی) مگر بقول سید احمد خان ۱۵۶۵/۱۵۶۵ء میں، جس کی بعد کے بیشتر مصنفین پیروی کرتے ہیں) اور اس کے لیے اس نے ایرانی ماہر تعمیرات مرزا غیاث کو مامور کیا تھا۔ یابی ہمہ احاطے کی دیوار کوئی پانچ برس پہلے شروع ہوئی تھی۔ روضے کی عمارت ایک بڑے باغ کے احاطے میں ہے (۳۴ میٹر ضلع) یہ ہندوستان میں پہلا چار باغ ہے جو ابھی تک اپنے اصلی نقشے پر قائم ہے: یہ عمارت ۱۵۷۵ء میں شروع ہوئی اور ۱۵۷۵ء میں مریم میٹر کمرے پر بنائی گئی، جو ۱۵۷۵ء میں شروع ہوئی ہے۔ عمارت کے چاروں رخ یکساں ہیں۔ ہر رخ کے وسطی مستطیل کے اندر بڑی لمبی چوڑی محراب ہے اور دونوں طرف دو چھوٹے بازو ہیں، جن میں سے ہر ایک میں نسبتاً چھوٹی محراب ہے: یہ بازو نقشے میں ہشت پہلو اور بڑی محرابوں کے آگے بڑھے ہوئے ہیں۔ وسطی داران کے اوپر اونچا گردن اور بصلی گنبد قائم ہے، جس کے ارد گرد بازووں اور دارانوں کے اوپر چھتریاں ہیں۔ عمارت ساری کی ساری سنگ مرمر کی ہے، جس میں سفید اور رنگین سنگ مرمر کا استعمال فراخ دلی سے کیا گیا ہے۔ نواحی عمارتیں یہ ہیں: نالی کا گنبد، یعنی حجام کا ایک چھوٹا مقبرہ، نیلا گنبد، جو ہمایوں کے مقبرے سے پہلے کا ہے (لہذا فییم خان م ۱۶۰۵ء/۱۶۰۵-۱۶۰۵ء)؛ ۱۶۲۶ء کا نہیں ہے، جیسا کہ عموماً کہا جاتا ہے: "افسر والا" مقبرہ اور مسجد: عرب سرائے اور عیسیٰ خان کا مقبرہ، جس کا حال پہلے بیان ہو چکا ہے۔ ان عمارات کی مکمل تفصیلات در S.A.A. Naqvi Humayun's tomb and adjacent buildings، دہلی ۱۹۴۷ء)۔ جنوب میں قریب ہی عبدالرحیم [رگ بان] خان خاناں (م ۱۶۲۶ء/۱۶۲۶-۱۶۲۶ء) کا مقبرہ ہے، جو اسی قسم کی، مگر نسبتاً چھوٹی عمارت ہے اور اس کے گوشوں میں ہشت پہلو کمرے نہیں:

دہشت ہے، گزرتی ہے۔ یہ شاہ برج سے جنوب کی طرف بہتی ہے اور اس کا پانی تبس ککوس دور اوپر جا کر دریائے جمنا سے لایا جاتا تھا (مغربی نہر جمنا کے ذریعے) اس کی تاریخ فیروز شاہ تغلق کے عہد سے شروع ہوتی ہے۔ پوری کیفیت کے لیے دیکھیے *History and description of Govern-ment canals in the Punjab* : J. J. Hatten (۱) لال قلعے کی مذکورہ نہر سادہ سنگ مرمر کی بنائی ہے، جو رنگ محل میں پہنچ کر ایک حوض میں جا گرتی ہے، جس میں سنگ مرمر کا کنول نصب کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے یہ نہر ایک پردے کی دیوار کے نیچے نیچے، جس پر ”میزان عدل“ کی تصویر نقش ہوئی ہے، شاہی محل کے نجی کدروں سے گزر کر آتی ہے۔ ان کدروں کے آگے باہر کو نکلا ہوا وہ جھروکا یعنی مشن برج ہے، جس سے شہنشاہ درشن [رگ بان] دیا کرتا تھا۔ ان محلات میں رنگ محل اور دیوان خاص کی سب سے زیادہ اور انتہائی پر تکلف تزئین کی گئی ہے۔ ان کی تعمیر اور فرش بندی سفید سنگ مرمر سے ہوتی ہے اور محرابوں کے ستونوں میں سیپ اور نکیسے جڑ کر پیل ہوئے بنائے ہیں۔ اس دیوان خاص میں پیش بہا تخت طاؤس رکھا تھا، جسے نادر شاہ ۱۷۵۲ء/۱۷۳۹ء میں ایران لے گیا اور وہاں اُسے ٹڑوا دیا (Persia : G. N. Curzon) and the persian question : ۱، ۲۲۱ تا ۲۲۲)۔ ابتدا میں قلعے کے اندر کوئی مسجد نہیں تھی۔ موتی مسجد کا اضافہ اورنگ زیب نے ۱۷۲۳ء/۱۶۶۲-۱۶۶۳ء میں کیا تھا۔ یہ کلیۃً سفید سنگ مرمر کی ہے، جس کے وسطی حصے میں اوپر مڑی ہوئی ”ہنگلی“ منڈیر قابل دید ہے (قلعے اور اس کی عمارات کے لیے دیکھیے *A Guide to the buildings and gardens* : G. Sanderson Delhi Fort بار چہارم، دہلی ۱۹۳۷ء)۔ شاہجہان آباد کی جامع مسجد (جس کا نام مسجد

جہاں نما ہے) ۱۷۵۲ء/۱۶۳۸ء تا ۱۷۵۹ء/۱۷۵۵ء میں تعمیر ہوئی، لال قلعے کے مغرب میں ایک کھنڈ میدان میں موجود ہے۔ اس کی بلند بنیادی منزل، جس کی تمام سمتوں میں خضی محرابیں ہیں، کچھ اراولی کے ایک الگ تھاک ٹیکرے پر اٹھائی گئی ہے۔ شمال، مشرق اور جنوب کے دروازوں میں پہلے باہر کے رخ نصف گنبد کی شکل کا کھلاڑ ہے پھر سب میں نیچے کے رخ نسبتاً چھوٹا دروازہ ہے۔ مشرق دروازہ، جو شاہی داخلے کے لیے استعمال ہوتا تھا، سب سے بڑا ہے۔ ”لیوان“، جو صحن کے تین جانب بنا ہے، باہر کی طرف بھی کھلا ہوا ہے اور اس میں ایک تو جو کور برج ہے اور اوپر چھت کے ہر گوشے پر ایک کھلی چھتری محیط ہے۔ مغرب میں اصل مسجد یا امان صاۃ دوسرے اجزا سے الگ مستقل دالان ہے، جو ۷۹ میٹر × ۲۷۵ میٹر ہے۔ اس سے متصل صحن مسجد (۹۹ مربع میٹر) کی طرف بہت چوڑی مرکزی محراب ہے اور اس کے دونوں جانب عراضاً پانچ پانچ دالان دندانہ دار محرابوں کے ہیں۔ سامنے کے دونوں سروں پر ایک ایک سہ منزلہ مینار ہے۔ اوپر تین سفید سنگ مرمر کے بصلی گنبد ہیں، جن میں سیاہ سنگ مرمر کی باریک عمودی دھاریاں ڈالی گئی ہیں۔ اس کی قریب قریب ہم عصر فتح پوری مسجد چاندنی چوک کے مغربی کنارے پر ہے۔ یہ شاہجہان آباد کا خاص بازار ہے۔ مسجد اسی طرز کی ہے جیسی جامع مسجد، مگر نفاست کم ہے اور اس میں صرف ایک ہی گنبد ہے؛ اس کے احاطے میں مسجد کا مدرسہ ہے۔ اسی طرز کی ایک نسبتاً چھوٹی مسجد، جس میں تین گنبد ہیں اور جو زیادہ پیاز نما ہیں اور جن میں مساوی طور پر سیاہ اور سفید سنگ مرمر کی دھاریاں ہیں، زینت المساجد ہے، جو حدود ۱۱۱۲ء/۱۷۰۰ء میں شاہجہان آباد کے مشرق (یعنی کنار جمنا کے) حصے میں تعمیر ہوئی تھی۔ عہد مغلیہ کے آخری دور کی مندرجہ ذیل

The archa: Carr Stephen (۶) : ۵۵۱ تا ۵۶۰ : ۱۷ و
 teology and monumental remains of Delhi
 Journal of the Archaeological (۷) : ۸۷۶ تا ۸۷۷ : ۱۷
 Society of Delhi : ۱۸۵۰ء : بمواضع کثیرہ : (۸)
 Catalogue of the Delhi museum of : J. Ph. Vogel
 The Sultans of : ۱۹۰۸ء تک : Archaeology
 Delhi and their existing monuments ... : ص ۶۰
 An Account of the present : W. Franklin (۹) : ۱ تا ۷۱ :
 Asiatick Researches : ۱۷۹۵ء : (۱۰)
 ۱۹۰۱ء تا ۱۹۰۲ء : دہلی میں کتبوں کے لیے دیکھئے خصوصاً
 A list of the published : J. Horowitz : (۱۱)
 Mohammedan inscriptions in India : در EIM : ۱۹۰۹ء
 ۱۹۱۱ء : ص ۳۰ تا ۱۰۸ : (۱۲) : Memoir ASI : ج ۳۷ :
 Archaeological : A. Cunningham (۱۳)
 survey of India : ج ۷۱ : ۵۷۱ : ۱۸۷۱ء : (۱۴)
 A. Har- : (۱۵)
 The New Guide to Delhi : court : ۱۸۷۰ء : (۱۶)
 محمد ریاض الدین لاجپور : سرو ریاض : آگرہ : ۱۸۷۰ء : (۱۷)
 عبدالغفور : آثار المتأخرین : دہلی : ۱۸۷۵ء : (۱۸)
 حیرت : چراغ دہلی : دہلی : ۱۹۰۳ء : (۱۹)
 سید احمد دہلوی :
 دادگار دہلی : دہلی : ۱۹۱۱ء : (۲۰)
 نواب علی نور : سیر دہلی :
 دہلی : ۱۹۱۱ء : (۲۱)
 بشیر الدین احمد : واقعات دارالحکومت
 دہلی : آگرہ : ۱۹۱۹ء : (۲۲)
 حسن نظامی : سیر دہلی :
 بار پنجم : دہلی : ۱۹۲۷ء : (۲۳)
 Ency. Brit. بذیل مادہ)

(J. BURTON-PAGE)

دہلی سلطنت : رگ یہ ہند

دہلی کالج : ۱۸۲۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی
 کی قائم کردہ مجلس تعلیم عامہ نے ملک کے تعلیمی
 حالات کی چھان بین شروع کی ۔ دہلی کی مقامی مجلس
 تعلیم نے مدرسہ غازی الدین خان میں کالج کے قیام کی
 سفارش کی ۔ مشرق علوم کی یہ درسگاہ ۱۷۹۲ء میں قائم
 کی گئی تھی ۔ ۱۸۲۵ء میں کمپنی کی حکومت کی سرپرستی
 میں دہلی کالج کی تنظیم جدید عمل میں آئی ۔ ایسٹ

عمارقوں کا ذکر بھی کر دینا چاہیے : مرقی مسجد، جو
 سہرولی میں حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کی درگاہ میں
 ہے (بارہویں صدی ہجری : اٹھارہویں صدی عیسوی کے
 اوائل میں) : غازی الدین پندر آصف جاہ کا مقبرہ، مدرسہ
 اور مسجد : تینوں کی مجموعی عمارت کا نقشہ سینک
 کی شکل کا ہے اور شاہجہان آباد کے اجمیری
 دروازے کے باہر ہے (سن بنا ۱۱۳۲ھ / ۱۷۱۷ء) جس
 میں اینٹوں اور عربک کالج ابھی تک چل رہا ہے :
 قدسیہ باغ کا دروازہ (حدود ۱۱۶۳ھ / ۱۷۵۰ء) : اسی
 عہد کی جاوید خان کی چھوٹی سی نفیس مسجد (سہری
 مسجد) جو ہلکے بادامی رنگ کے پورے پتھر کی
 ہے : صفدر جنگ (م ۱۱۶۶ھ / ۱۷۸۳ء) کا اسی پتھر
 سے نہایت متناسب بنایا ہوا مقبرہ جو مغلوں کے آخری
 بڑے باغ میں قائم ہے ۔ ایک برطانوی عمارت بھی
 قابل ذکر ہے اور وہ سینٹ جیمز کا گرجا ہے، جسے کرنل
 جیمز سکنر J. Skinner نے ۱۸۲۴ء میں پالادی
 (Palladian) طرز پر تعمیر کرایا تھا ۔ نئی دہلی کے بہت
 وسیع تعمیراتی منصوبے کہیں کہیں مغلیہ تعمیر کی عظمت
 کی یادوں کو تازہ کرتے ہیں، لیکن اسلامی فن تعمیر
 کے اعتبار سے ان کی کوئی خاص اہمیت نہیں ۔

مآخذ : خصوصی مقالات اور رسالوں کا ذکر متنی
 میں کر دیا گیا ہے ۔ عام تصانیف : (۱) H. C. Panshawe :
 Delhi Past and Present : لندن : ۱۹۰۲ء : (۲) H. Sharp :
 Delhi : its story and buildings : لندن : ۱۹۰۱ء : (۳)
 The seven cities of Delhi : G. Heatn : کلکتہ : ۱۹۲۸ء
 (عام طور پر معتبر نہیں) : (۴) P. Brown : Indian
 Architecture : Islamic period : بمبئی : بدون تاریخ،
 بمواضع کثیرہ : (۵) سید احمد خان : آثار الصنادید، دہلی
 ۱۸۶۳ء / ۱۸۸۷ء : بار دوم، دہلی : ۱۹۲۷ء / ۱۸۵۸ء و
 لکھنؤ : ۱۸۷۶ء، ۱۹۰۰ء و کانپور : ۱۹۰۸ء فرانسیسی ترجمہ
 از Garcin de Tassy، در JA، سلسلہ پنجم، ۱۵ : ۵۰۸ تا
 ۱۹۰ : ۱۶۹ و ۱۹۰ : ۲۵۸ تا ۲۹۲ : ۵۵۱ تا ۵۷۱ : ۵۸۳ تا

انڈیا کمپنی کے منتظمین کی سفارش پر برطانوی پارلیمنٹ نے ہندوستان کی تعلیم کے لیے ایک لاکھ روپیہ سالانہ منظور کیا، جس میں سے پانچ سو روپے ماہوار دہلی کالج کے لیے مقرر کیے گئے۔ یہاں عربی، فارسی اور سنسکرت کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ۱۹۳۸ء میں دہلی کالج میں انگریزی زبان کی تعلیم بھی دی جانے لگی، لیکن عام مخالفت کی وجہ سے انگریزی جماعت مشرقی شعبے سے برائے نام علحدہ کر دی گئی۔ دہلی کالج کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ یہاں السنہ و علوم کا ذریعہ تعلم اردو تھا۔ ۱۸۳۵ء میں ہندوستان میں نئے تعلیمی نظام کا نفاذ ہوا، جس میں نہ صرف مغربی علوم میں بلکہ عربی، فارسی، سنسکرت کے لیے بھی ذریعہ تعلیم انگریزی کو قرار دیا گیا تھا، لیکن دہلی کالج کا ذریعہ تعلیم اردو ہی رہا۔ ۱۸۳۴ء میں مغربی اور مشرقی شعبوں کا نصاب تعلیم یکساں کر دیا گیا۔ کالج میں حساب، جیومیٹری، الجبرا، طبیعی فلسفہ، طبیعیات، جغرافیہ، تاریخ، معاشیات، اصول قانون وغیرہ مضامین داخل نصاب تھے۔ مغربی شعبے میں انگریزی اور مشرقی شعبے میں اردو ذریعہ تعلم تھا۔ نصابی کتب کی کمیابی کی وجہ سے شروع شروع میں تعلیم زیادہ تر لیکچروں کی صورت میں دی جاتی تھی۔ مسٹر کارگل، پرنسپل، اپنی رپورٹ میں لکھتے ہیں کہ ”مشرق شعبے کا طالب علم سائنس کی تعلیم میں آگے بڑھ رہا ہے اور کسی طرح اپنے حریف یعنی انگریزی شعبے کے طالب علم سے پیچھے نہیں ہے، لیکن اندیشہ یہ ہے کہ مناسب کتابوں کے نہ ہونے سے وہ بخوبی اس علم کو حاصل نہیں کر سکتا جو کتابوں کے موجود ہونے سے کر سکتا ہے“ (مرحوم دہلی کالج، ص ۵)۔ اس مشکل سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ۱۸۳۳ء میں ”دہلی ورنکار ٹرانسلیشن سوسائٹی“ قائم کی گئی۔ اس انجمن نے علوم و فنون کی کتابوں کو انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے کے لیے چند قواعد بھی وضع

کیے (مرحوم دہلی کالج، ص ۲۵)۔ مسٹر پتروس، پرنسپل (تقریر ۱۸۳۱ء)، نے انگریزی کتب کا اردو میں ترجمہ کرانا شروع کر دیا تھا، انجمن کے قیام سے یہ سلسلہ ایک باقاعدہ تجربک کی صورت اختیار کر گیا۔ کالج کے اساتذہ اور ذہین طلبہ پرنسپل کی نگرانی میں ترجمہ کرتے، جس کا انہیں فی صفحہ معاوضہ دیا جاتا۔ ترجمہ مکمل ہونے پر ہر کتاب کے ایک ایک سو نسخے طبع کرا کے نصاب میں داخل کر دیے جاتے۔ ان ترجمہ شدہ کتب کے متعلق یہ قرار پایا تھا کہ مدرسین پڑھانے وقت تمام غلطیوں اور مبہم جملوں وغیرہ پر نظر رکھیں جو ان کی رائے میں قابل اصلاح ہوں اور بعد میں پرنسپل کے مشورے سے دوسرے ایڈیشن میں اصلاح کر لی جایا کرے۔ اس طرح ہر ترجمہ گو شروع میں کیسا ہی ناقص کیوں نہ ہو، آخر میں تمام غلطیوں سے پاک و صاف ہو جائے گا۔ ۱۸۳۵ء میں مسٹر پتروس کی سبکدوشی کے بعد ڈاکٹر سپرنگر پرنسپل مقرر ہوئے۔ ان کے عہد میں بھی تالیف و ترجمے کا کام بڑی سرگرمی سے جاری رہا۔ پہلے درسی کتب کے تراجم کیے گئے، پھر دوسری کتابیں بھی تالیف و ترجمہ ہونے لگیں۔ جب کسی انگریزی کتاب کا اردو میں ترجمہ ہو کر چھپ جاتا تو وہ کتاب دہلی کالج کے مشرق شعبے میں بالکل اسی طرح کام آتی جس طرح مغربی شعبے میں اصل انگریزی کتاب کام آتی تھی۔ اردو کو علمی زبان بنانے کی یہ پہلی سعی تھی جو خاص اصول اور قاعدے کے ساتھ عمل میں آئی۔ ٹرانسلیشن سوسائٹی نے ریاضی، جیومیٹری، قانون، تاریخ، ہیئت، کیمیا، جغرافیہ، طبیعی فلسفہ، معاشیات، نباتیات، عضویات، طبیعیات، طب، لسانیات، صرف و نحو، شعر و ادب وغیرہ مختلف موضوعات پر کم و بیش ۱۷ کتب تالیف و ترجمہ کرائیں (فہرست کے لیے دیکھیے مرحوم دہلی کالج، ص ۱۳۷)۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب میں دہلی کالج کو سخت

۱۹۵۳ء تک انحصاء یا الانحصاء کا صوبہ) کے درمیان ایک غیر رسمی حد فاصل کا کام دیتا ہے۔ اس کا مغربی کنارہ بڑی حد تک اس علاقے کی مغربی حد کی تشکیل کرتا تھا، جہاں سے تیل نکالنے کا اجارہ ۱۹۳۳ء میں امریکی کمپنی کو دیا گیا تھا، تاہم اس علاقے کی حدود اس سے بھی زیادہ مغرب کی جانب پھیلی ہوئی تھیں۔ ۱۹۵۷ء میں تیل کے پہلے کنویں کی کھدائی سے اس ریگستان میں، نیز مشرق سمت میں اس سے ملحق علاقے میں تیل کا ایک خطہ دریافت ہوا، جو خرائص کا خطہ کہلاتا ہے اور غوار کے بڑے خطے کے تعیناً ۱۲۰ کیلومیٹر مغرب میں اور الھوف (انحصاء کے ریگستان میں) کے تقریباً ۱۵۰ کیلومیٹر مغرب میں واقع ہے۔

الدھناء ریتلے صحراء کے ان دو متوازی ٹکڑوں میں سے مشرق اور نسبتاً بڑا مسلسل ٹکڑا ہے جو النفوذ سے بحیثیت مجموعی جنوب مشرق کی سمت میں پھیلے ہوئے ہیں (دیکھئے جزیرۃ العرب، بالخصوص ص ۵۳۶ الف)۔

مآخذ: علاوہ ان جغرافیہ نگاروں اور مؤرخین کے جن کا ذکر اوپر ہوا ہے (۱) *A Hand-Admiralty* (۲) *book of Arabia* لندن ۱۹۱۶ء تا ۱۹۱۷ء: (۳) *Minority* (طبع ۱۹۳۷ء: لندن) (۴) ابن بلید: صحیح الأخبار، قاہرہ، ۱۳۷۰ھ (۵) *In Unknown: R.E. Cheesman* (۶) *The Arab: H.R.P. Dickson* (۷) *of the Desert* لندن ۱۹۴۹ء (۸) *and Her Neighbours* لندن ۱۹۵۶ء (۹) *الرحلة* طبع Wright، لندن ۱۹۰۷ء (۱۰) *The Penetration of Arabia* لندن و نیویارک ۱۹۰۸ء (۱۱) *A Journey in Northeastern Arabia* : G.H. Leachman (۱۲) *Arabia* : در J.G. ج ۳، ۱۹۱۱ء (۱۳) *A Journey through Central Arabia* : G.J. ج ۳، ۱۹۱۸ء (۱۴) *Roy Leblicher, G. Rentz* (۱۵)

نقصان پہنچا اور اس کا ساز و سادان قباہ ہو گیا۔ ۱۸۶۳ء میں کالج دوبارہ جاری ہوا، لیکن اس کی صورت بہت کچھ بدل گئی تھی۔ کالج کا تعلق پنجاب گورنمنٹ سے تھا، لیکن ظلمہ کاکتہ بولیورسٹی میں امتحان دیتے تھے اور وہیں کا نصاب تعلیم رائج ہو گیا تھا، جس میں ذریعہ تعلیم انگریزی تھی۔ کالج میں اردو کا چرچا کم ہو گیا اور ترجمہ و تالیف کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ ۱۸۷۷ء میں دہلی کالج ٹوٹ گیا اور اس کا عملہ گورنمنٹ کالج میں منتقل ہو گیا۔

مآخذ: (۱) مولوی عبدالحق، مرحوم دہلی کالج، مطبوعہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد؛ (۲) *Ram Bahu* (۳) *A History of Urdu Literature: Sakseena* ص ۱۹۷ تا ۲۰۱ و اردو ترجمہ: تاریخ ادب اردو، از محمد عسکری، مطبع نولکشور، فار دوم، حصہ ثر، ص ۲۲؛ (۴) محمد عتیق صدیقی: *ہندوستانی اخبار نویس*، دہلی ۱۹۵۷ء، ص ۲۲؛ بعداً: *A History of the Govern-: H.L.O. Garret* (۵) *ment College, Lahore* ۱۹۱۸ء، ص ۳۵؛ (۶) سی۔ ایف۔ اینڈریوز: *ذکاء اللہ دہلوی* (ترجمہ ضیاء الدین پری) کراچی ۱۹۵۱ء، ص ۶۵؛ بعداً۔

(غلام حسین ذوالفقار)

* **الدھناء: سعودی عرب میں، صحرائے نفوذ کا ایک طویل و تنگ محراب نما قطعہ، جس کا عرض دس سے لے کر ۷۵ کیلومیٹر تک ہے اور مجموعی طور پر ایک ہزار کیلومیٹر سے زائد لمبائی میں ایک شرق رویہ خم دار خط کے گرد پھیلا ہوا ہے، جو شمال مغرب کے نفوذ اعظم کو جنوب کے (الرّبع الخالی [رگ باں]) سے ملا دیتا ہے۔ کناروں کے ماسوا اس کا باقی حصہ پانی کے قدرتی وسائل سے عاری ہے، لیکن چراگاہ کے طور پر یہ ایک مقبول عام خطہ ہے۔**

گزشتہ زمانے میں یہ البساسمہ کے الدورانی علاقے کو البحرین کے ساحلی خطے سے جدا کرتا تھا، لیکن آج کل نجد کے صوبے اور مشرق صوبے

نقشہ ۱ - B-I (۱۹۵۰ء) - پیمانہ ۱ : ۵۰۰,۰۰۰
(جغرافیائی)؛ جنوبی طوبی، نقشہ ۱ - B-II (۱۹۵۶ء)؛ شمالی
طوبی نقشہ ۱ - B-III (۱۹۵۷ء)؛ مغربی خلیج فارس، نقشہ
۱ - B-IV (۱۹۵۸ء)؛ درب زبند، نقشہ ۱ - B-V (۱۹۶۰ء)؛ طبع
طبع - The Times Atlas of the World (۱۹۶۰ء)؛ طبع
Mid-Century Edition (Bartholomew)؛ نقشہ عرب در جلد
۱، لندن ۱۹۶۰ء [نیز دیکھئے (۱)؛ لندن، بار دوم، بیل، مادہ۔
C. D. MATTHEWS] (تلفیص از ادارہ)

دھنچ، فارسی دہنہ، دھانہ، مرمر سبز (سبز سنگ *
مرمر)؛ ترکی؛ دھنہ فرنگی؛ انگریزی؛ malaichite؛ تانبے
کی معروف سبز رنگ کی خام دھات۔ وسائل اخوان الصفا
میں اس دھات کے بارے میں جو بیان ہے
اس کا تعلق نام نہاد ارسطاطالیسی دور کی حکمت
سے ہے۔ اس بیان کی رو سے جب تانبے کی کانوں
میں گندھک کے بخارات تانبے میں سرایت کر جاتے
ہیں تو سبز رنگ کا ارت دار پتھر بن جاتا ہے۔ اس کے
رنگ کو زبرجد (chrysolite) کے رنگ سے مشابہ بتایا
گیا ہے، تاہم یہ مختلف رنگتوں میں ظاہر ہوتا ہے؛
گہرا سبز، دھاری دار (veined)، مور کے پروں کی
رنگت اور ہلکا سبز اور سبز رنگ کی دوسری اقسام۔
بعض اوقات زمین کے اندر تہ در تہ شکل اختیار کرنے
کے دوران میں ایک ہی ٹکڑے میں، یہ سب رنگیں پیدا
ہو جاتی ہیں۔ یہ پتھر نرم ہوتا ہے، لیکن ایک زمانے
کے بعد اس کی چمک دمک زائل ہو جاتی ہے۔ بلکہ اس
(= اپولونیوس تیانوی) کے تتبع میں تباہ ہو جاتا ہے
یہ کہ کس طرح بہترین تانبا اس پتھر سے حاصل کیا
جاتا ہے۔ مصر، کرمان اور خراسان سے ایک قسم کا
نیا اور پرانا دھنچ دستیاب ہوتا ہے۔ سب سے اعلیٰ قسم
پرانا کرمانی پتھر ہے۔ یہ قدیم مصری متابر میں
بالعموم تعویذوں (scarabs)، چھوٹی چھوٹی مورتوں
اور تراشے ہوئے پتھروں کی شکل میں پایا گیا ہے۔
دھنچ کے بارے میں ایک مفصل بیان الرازی (۱) ہے،

The Arabia of Ibn Saud : M. Steink
Gazetteer of the Persian Gulf : J. G. Lorimer (۱۲)
Oman, and Central Arabia : کلکتہ ۱۹۰۸ء تا ۱۹۱۵ء
Northern Negd : Alois Musil (۱۳)
Central and Eastern Arabia : W. G. Pulgrave (۱۴)
A Visit to the : Lewis Pelly (۱۵)
Wahabee Capital, Central Arabia : J. R. H. S. (۱۶)
Across Arabia : H. St. J. B. Philby (۱۷)
the Persian Gulf to the Red Sea : J. G. (۱۸)
The Heart of Arabia : وہی مصنف (۱۹)
The Empty Quarter : وہی مصنف (۲۰)
Gen. : Barclay Ravkhiarr (۲۱)
nem Wahhabiternes Land puu Kamelryg
(انگریزی ترجمہ نقشوں اور تصویروں کے بغیر
۱۹۱۳ء)
Through Wahabland on Camel-Back : قاهرہ ۱۹۱۶ء
Auf dem Kamelrücken : W. Schmidt (۲۲)
durch das Land der Wahibiten (۱۹۱۷ء) : (۲۰)
امین
Ibn Sa'oud of Arabia : لندن ۱۹۲۸ء : (۲۱)
Account of a Journey from Katif... : G. F. Sadlier
to Yambou... : Transaction... Lit. Soc. Bombay
Lندن ۱۸۲۳ء : وہی مصنف (۲۲)
cross Arabia : طبع P. Ryan (۱۸۶۶ء) : (۲۳)
عمرضا
کعالة : جغرافیہ جزیرۃ العرب، دمشق ۱۳۶۵ھ/۱۹۴۵ء
Die Strasse von : Ferdinand Wüstenfeld (۲۴)
Bagra Nach Mekka... : ABh. K.G. IV, Göt (۱۹۱۶ء)
Bahrein und Jemâna : وہی مصنف (۲۵)
nach Arabischen Quellen : ۱۹۰۸ء

نقشے : وزارت مالیات و اومی معانیات (مملکت
عمودی عرب) اور وزارت خارجہ (امریکہ) کی مشترکہ
سرپرستی میں شعبہ مبادت ارضیات، ریاست ہائے متحدہ
امریکہ اور عرب امریکی اڈل کمپنی کے نقشوں کا سامان۔
پیمانہ ۱ : ۲۰۰,۰۰۰ (جغرافیائی) : "جزیرۃ عرب"،

ص ۵۳ (انگریزی ترجمہ): (۱۲) Wiedemann : Beiträge ۳۰ : ۱۲۷ = SSPMS Eng. ج ۳۴ : ۱۹۱۲ء، بہ تتبع ابن الاکفانی : منتخب الآثار (A. Dietrich)

دہ ہانی : خوجہ، سائویں صدی ہجری/ *

تیرھویں صدی عیسوی کا اناطولی شاعر "دیوان" (ومنی غزل کی) شاعری کا قدیم ترین نمائندہ۔ اس کی زندگی کے متعلق بجز اس کے کچھ معلوم نہیں کہ وہ خراسان سے آیا تھا اور ایک زمانے میں سلجوق سلطان علاء الدین کی قیادت سوم کے دربار میں تھا، جس کے لیے اس نے بیس ہزار شعروں کا سلجوق شاہنامہ لکھا جو ہم تک نہیں پہنچا (Anadolu Selçuklu : M. F. Koprulu) Tarihînin Yerli Kaynakları، در ۲۷ : ۳۹۶ تا ۳۹۷ء۔ اس کی صرف دس غزلیں باقی بچی ہیں۔ انہیں کئی "نظیر" مجموعوں سے اکٹھا کیا گیا ہے اور وہ ۱۹۲۶ء اور اس کے بعد سے شائع ہوتی رہی ہیں (دیکھیے مآخذ)۔ اپنے ہم عصروں کے برعکس وہ متصوفانہ یا فاضلانہ موضوعات کو نہیں چھیڑتا، بلکہ عروض کی حیرت انگیز مہارت کے ساتھ بڑے روان انداز میں عشق مجازی، شراب اور صاحب دیوان شاعروں کے دوسرے مقررہ موضوعات پر شعر کہتا ہے۔ مآخذ : کوپرولو زادہ محمد فواد : خوجہ دہ ہانی، در حیات : ۱۱ : ۱۱۹۹ء (۲) وہی مصنف : Selçuklu derri edebiyati hakkında bazı notlar، در حیات : ۳ : ۱۹۲۸ء (۳) Mecdud Mansuroğlu : Dehlânî ve Manzûmleri : xili asir Anadolu Turkeci، استانبول ۱۹۸۷ء۔

(FAHR 12)

دی : رگ بہ دابی ۔

دیوار بکر : یعنی "بنو بکر کی سر زمین وطن"

جو جزیرہ (العراق) کے شمالی صوبے کا نام ہے۔ بہ اس خطے کو محیط ہے جو دریائے دجلہ کے منبع سے

جو انور ذیل سے بھی بحث کرتا ہے: (۱) اس کی تکلیس (اس کی تحلیل اور اس میں شامل گندھک اور تیل کا جل جانا)، جس کے عمل کے چار طریقے ہیں: (۲) تمکیات اور سہاگے کی وجہ سے اس کا مٹی بن جانا۔ ہر ایک بجائے خود چار طرح سے عمل کرتا ہے۔

سفوف کی شکل میں سر کے ساتھ اس کا استعمال زہر کا اثر زائل کرنے کے لیے بہت مفید سمجھا جاتا ہے: اس کے برعکس یہ اس شخص کے لیے مضرت رساں ہے، جسے زہر نہ دیا گیا ہو؛ چنانچہ اس صورت میں یہ اعضا میں خطرناک سوزش پیدا کر دیتا ہے۔ اگر اسے بچھو یا شہد کی مکھی کے کاٹے پر مل دیا جائے تو تکلیف کم ہو جاتی ہے۔ یہ جذام اور آفتاب چشم کے لیے داروسے شفا ہے۔ شاعری میں اس لفظ کے استعمال کی مثال الشعاع کے کلام میں مل سکتی ہے (LA، بذیل مادہ دینج)۔

مآخذ : (۱) رسائل الخیطان الصفا (مطبوعہ دمشق) : ۲ : ۸۱ (۲) التیفاشی : ازہار الافکار، مترجمہ C. Raineri Bisdia، طبع جدید، Bologna ۱۹۰۶ء، ص ۹۳ : (۳) القزوبی : عجائب المخلوقات (Cosmography، طبع Wüstenfeld)، ۱ : ۲۲۳ : (۴) ابن البیطار (طبع بولاق، ۱۳۹۱ء) : ۲ : ۱۱۷ : بعد : (۵) Traité des Simples : Leclerc Clément-Mullet، در JA، سلسلہ ششم، ۱۱ : (۶) ۱۸۵ : بعد : (۷) Steinschneider، در WZKM، ۱۲ : (۸) ۱۸۹۸ : ۱۳ : Ruska : Das Steinhuch aus der Kosmographie des Al-Qazwini (Beilage zum Jahresbericht 1895-96 der prov. Oberrealschule zu Heildelberg)، ص ۲۲ : (۹) وہی مصنف : Das Steinhuch des Aristoteles، ص ۱۰۳ : بعد : ۱۸۵ : (۱۰) وہی مصنف : Al-Rāzi's Buch Geheimnis der Geheimnisse، ص ۸۶ : ۱۸۹ : بعد : ۱۷۷ : بعد : ۱۹۷ : بعد : (۱۱) Barhebraeus : منتخب کتاب جامع المفردات لاحمد۔۔۔ القافی (طبع Meyehof و Sohly)، تارخہ ۱۹۳۸ء : ۳/۱ : ۱۱۷ : (عربی متن) و

دراجل ارمینیا کا ایک حصہ ہے۔ انتظامی نقطہ نظر سے دیوار بکر کے علاقے کی قسمت عام طور پر وہی رہی جو الجزیرہ کی تھی۔ پھر بھی اس نے بعض اوقات اپنے ہمسایہ ارمینیا کے ساتھ مل کر جدا ذلت اور نیم خود مختار حکومت قائم کی اور عہد اسلامی میں بڑے بڑے تاریخی واقعات کا محل و مقام رہا (افندیل کے لیے دیکھیے لا لائن، بار دوم، بذیل مثال)۔

یادگاریں: دیوار بکر کے موجودہ شہر کے سب سے زیادہ استیلازی خصائص میں ایک بلا شبہ اس کالے پتھر کے شہر کی اثری دولت ہے جس میں اس کے قدیم محلے اپنی حید دار ہیں، جو فصیل بند ہونے سے اس شہر کو اس کی خصوصیت عطا کرتے ہیں اور جنہوں نے سارے قرون وسطیٰ کے دوران میں اسے بڑی جنگی اہمیت دی تھی، کیونکہ قدرتی حفاظت کے دیگر ذرائع کی بہاں کمی تھی۔ اس کا حصار ابھی تک محفوظ ہے، لہذا قدرتی طور پر اس نے انیسویں صدی عیسوی کے یورپی سیاحوں کی توجہ کو اپنی طرف متعلق کیا، نیز عرب فتح کے وقت سے جو سیاح بھی اس قلعے کی سیر کو آئے ان سے ستائش حاصل کی (مثلاً ناصر خسرو کا بیان)۔ لیکن جب تک کہ A. Gabriel نے موقع پر باقاعدہ اثری تائیش نہ کر لی اس مشترکہ مطالعے کا از سر نو آغاز نہیں ہوا جسے M. van Berchem اور J. Strzygowski نے فقط عکسی تصاویر کے مواد کی بنا پر انجام دے دیے تھے، اور اس کے بعد ہی تسلیم کیا گیا کہ یہ آثار مشرق قریب میں قرون وسطیٰ کے عسکری فن کے سب سے واضح شواہد میں سے ہیں۔ یہاں باقاعدہ ماویل و عربی دھس دکھائی دیتا ہے، جس میں زمین کے نشیب و فراز کے مطابق کسی قدر ترمیم کر دی گئی ہے (اصل شہر فی الحقیقت ایک سطح مرتفع کے کنارے پر واقع تھا، دریائے دجلہ کی طرف کی ڈھلانی اس کی حد بندی کرتی تھی)؛ بائچ کیلو میٹر سے زائد محیط

بائیں اور دائیں کناروں پر وہاں تک چلا گیا ہے جہاں دریا اپنی شرقاً غرباً گزرگاہ کو تبدیل کر کے جنوب مشرق جانب مڑ گیا ہے۔ لہذا یہ شہر آمد اور حصن الحصہ (جرمک) کے شمال مغرب تک آمد کے مغرب اور سمرقند تل فافان سے لے کر آرمین کے خطے تک دریائے دجلہ کا بالائی طاس ہے۔ باقوت نے بھی وضاحت کی ہے کہ دیوار بکر مدانی علاقہ سے آگے نہیں جاتا۔ اسے دیوار بکر اس لیے کہتے ہیں کہ پہلی صدی ہجری/ساتویں صدی عیسوی کے دوران میں یہ بکرین و نزل (رگ بان) کے قبیلہ ربیعہ کے ایک ممتاز گروہ کا مسکن بن گیا تھا۔ قبائل بکر قبل از اسلام کی قبائلی جنگوں کے سلسلے میں یہاں ہی عراق میں آگئے تھے۔ الگوتہ کہ خطے میں کچھ عرصہ ٹھہرنے کے بعد ان کے گروہ شمال کی طرف پھیل گئے۔ حضرت عثمانؓ کی خلافت کے عہد فتوحات میں، جب حضرت معاویہؓ شام اور جزیرے کے والی تھے، بعض مضر اور ربیعہ قبائل حکومت کے حکم سے اس خطے کی غیر مقبوضہ اراضی میں بس گئے۔ حضرت معاویہؓ نے مضر کو بسایا اسے دیوار مضر، اور جہاں ربیعوں کو بسایا اسے دیوار ربیعہ کہنے لگے۔ البلاذری، جو یہ معلومات ہم پہنچاتا ہے، بنو بکر کا ذکر واضح طور پر نہیں کرتا، جو ربیعہ گروہ میں شامل تھے، لیکن اغلب یہ ہے کہ وہ اسی طریقے سے اور اسی زمانے میں دیوار بکر میں مقیم ہوئے۔ تاہم اس نام سے یہ مراد نہیں کہ یہ علاقہ فقط بنو بکر سے آباد تھا؛ اسی بنو بکر دوسرے مقامات میں بھی موجود تھے۔

یہ دونوں گروہ چونکہ باہم مل گئے تھے لہذا دیوار بکر اور دیوار ربیعہ دونوں کو بعض اوقات مشترکہ طور پر دیوار ربیعہ کے واحد نام سے پکارا جاتا تھا (باقوت، ۲: ۶۳۷)۔

دیوار بکر کے بڑے بڑے شہر یہ ہیں: آمد، جو دارالحکومت تھا؛ مہا فارمین؛ حصن کیفہ اور ارژن، جو

اور غلام گردش کے پیچھے نظاموں کے سابقہ سابق عمارت کو کھیرے میں آئے ہوئے ہیں۔ آخر میں عثمانی ترکوں کے عہد کے کام ہیں جنہوں نے حصار کی تو صرف برست پر قناعت کی لیکن اپنی اہم کوششوں کو قلعے کی طرف لگایا، دھس کے شمال مشرق کونے پر آئے بڑھایا اور اُرتوں کے سابق محل کے کھنڈروں کی جگہ اپنی عمارتیں بنوائیں۔

احاطے کے دائرہ جامع مسجد، یعنی الجامع قابل ذکر ہے۔ اس کے کتبے بڑی تعداد میں (عمارت کے ان غیر متجانس حصوں میں بکھرے پڑے ہیں، جن میں دوبارہ استعمال میں لایا ہوا مسالا غالب نظر آتا ہے۔ عمارت مذکور کی اصل اور تاریخ کے بارے میں یہ کتبے شدید اختلاف کا باعث بنتے رہے ہیں۔ جہاں تک اس عمارت کی اصل حالت اور ان آفتوں (بالخصوص آگ) کا تعلق ہے جن سے ہماری کتابی معلومات کی رو سے یہ دو چار ہوتی رہی ہے، قرین قیاس نتیجہ یہی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ یہ عمارت خالصہ اسلامی ہے! اور اس میں ملک شاہ کے زمانے سے سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی کے عثمانی سلاطین تک مختلف فرمانرواؤں کے عہد میں ترمیم و اصلاح ہوتی رہی ہے۔ یہاں چند اُرتی مدرسوں کا ذکر بھی لازم ہے۔ ان کے بچوں لیج صحن ہوتا تھا، اس کے گرد کمانچے اور پھر مسعودیہ اور زنجیرہ مدارس، نیز متعدد عثمانی مساجد کی طرح ایک بہت بڑا اندرونی ایوان ہوتا تھا! مسجدوں میں نماز کے دالان کا داخلہ ایک سادہ کمانچے سے ہوتا اور اُوپر کثیرالاضلاع ڈھولے پر ایک گنبد بنا دیتے تھے۔ یہ گنبد ۱۵۹۲ء/۱۵۱۴ء میں شہر فتح ہو جانے کے بعد کے سین میں تعمیر ہوئے۔ اس آخری دور کے دوسرے دلچسپ آثار، جن سے دیار بکر کی حقیقی معاشی خوشحالی کا پتا چلتا ہے، شہری تعمیرات سے تعلق رکھتے ہیں اور بالکل نئے طرز کی عظیم الشان کاروان سراؤں اور شاندار حویلوں پر مشتمل ہیں، جو

کی فصلی اور اس کے بازوؤں پر ترج نور جوانی دمدیے بنے ہوئے تھے! آگے مصنوعی ڈھلان دے کر خندق تھی جو اب پر ہو چکی ہے۔ فصلی میں کئی یادگار بڑے دروازے تھے اور اب لٹی جگہ اس میں شکاف کر دیے گئے ہیں۔ بردہ فصلی کی خانہ بندی (آٹھ تا بارہ میٹر اونچی، تین تا پانچ میٹر جوڑی، دونوں طرف استرکاری، لیج میں اینٹ پتھر) اور اس کے اُوپر گشت کے راستے کی حفاظت روزن دار منظر (-کنگورون) سے کی گئی ہے اور گشت کے راستے کے ایسے خاص خاص مقامات پر محرابی چھتے بنا دیے گئے ہیں، پور مربع کثیرالاضلاع یا کول، مختلف ادھار والے برجوں کی ترتیب، سنگ میل کے مضبوط پیل پائے، جن کے نیچے خانے اور اُوپر کمرے یا چوکتے دفاع کے لیے ترتیب دیے گئے ہیں۔ یہ اور رومن عہد کے بعض تعمیراتی اجزا جو خربوت، اُرفہ اور ماردین نام کے بڑے دروازوں کے بیرونی گوشوں میں موجود ہیں، یہ سب کتیات کی شہادت کے ساتھ ملی کر اس حصار کی قدامت ظاہر کرتے ہیں، جس میں مسلمانوں کی فتح کے بعد بلاشبہ مسلسل تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ پھر کیف، ان عمارتوں کی اہمیت بھی کچھ کم نہیں جو بعد میں تعمیر ہوئیں، یعنی ایک طرف تو عہد عباسی میں خصوصاً بڑے دروازوں کی تعمیر نو، جنہیں معتضد نے منہدم کرا دیا تھا، پھر القادر نے انہیں دوبارہ تعمیر کروایا، (جس کا ۹۰۹ء/۹۰۹ء کے کتیات تصدیق کرتے ہیں)، دوسری جانب بنو مروان، بنو ساجوق اور بنو اُرتی کی عمارت، جنہوں نے مختلف اوقات میں مغربی جانب فصیل اور برجوں کی جزوی مرمتیں کروائیں (جن کی طرف کتبے اور چٹائی میں تھوٹی کی موجودگی دونوں اشارہ کرتے ہیں)، یا اور بڑے بڑے وہ عمارت کام ہیں جن کا ثبوت اُرتی عہد کے اُلوفن اور یڈی گردش کے عظیم الجثہ برجوں کی تعمیر سے ملتا ہے۔ ان برجوں کا قطر پچیس میٹر سے زائد ہے اور اپنے تہہ خانوں

در: *Archéologie*, ۱۹۲۰ تا ۱۹۲۱ء، ص ۲۵ تا ۲۸، ۲۸۹ تا ۲۹۸
 تا ۵۸ (۶۲): *Voyager: A. Gabriel* (۶۲)
 مع: *archéologiques dans la Turquie orientale*
 از: *Recueil d'inscriptions arabes* (۶۲)
 پیرس: ۱۹۹۸ء، ص ۵ تا ۲۰۵، ۲۱۰ تا ۲۳۸ (۲۳۸) تا ۳۸ (۳۸)
 (۱۰۸).

(SOURDEL-THOMINE) [تخلص از ادارہ]

الدیار بکری: حسین بن محمد بن الحسن -

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تاریخ بعنوان تاریخ
 الخفیس فی احوال نفس نفیس کا دسویں صدی ہجری /
 سولہویں صدی عیسوی کا مصنف، مذکورہ تاریخ اپنے زمانے
 میں بہت مقبول تھی اور متعدد مخطوطات کی صورت میں
 محفوظ ہے اور دو مرتبہ چھپ بھی چکی ہے (فہرہ
 ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء)۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں بعد کی
 تاریخ اسلام کا مختصر خاکہ بھی درج ہے۔ اختتام پر
 عثمانی حکمرانوں کے نام گنائے گئے ہیں۔ بعض
 مخطوطات میں یہ شمار سلیمان خانوی پر ختم ہو
 جاتا ہے، لیکن عام طور پر اس کا خاتمہ مراد سوم
 (۹۸۲ھ/۱۵۷۴ء) پر ہوا ہے۔ اس مصنف کی ایک
 خصوصیت یہ ہے کہ اس نے مکہ معظمہ کے
 خانہ کعبہ کا مفصل حال بیان کیا ہے۔ اس کی شخصیت
 کے متعلق بہت الجھن پائی جاتی ہے۔ بقول حاجی
 خلیفہ (طبع فلوکل)، ۳: ۱۷۷، یہ تاریخ ۹۹۸ھ /
 ۱۵۳۸ء میں پایہ تکمیل کو پہنچی اور اس کا مصنف
 مکہ معظمہ میں رہتا تھا اور ۹۹۶ھ/۱۵۵۰ء کے
 عشرے میں فوت ہوا۔ لیکن آسے اور قاضی کرم الدین
 حسین المالکی مکی کو، جسے ۹۸۲ھ/۱۵۷۴ء -
 ۱۵۷۵ء میں قاضی مقرر کیا گیا تھا (العیدروسی:
 النور السافر، ۳۸۰ تا ۳۸۳) ابن العباد: شہوات،
 ۸: ۱۹۹ (بہد)، چونکہ ایک ہی شخص مان لیا گیا
 ہے اس بنا پر اس کی تاریخ وفات اب ۹۹۰ھ/۱۵۸۲ء
 دی جاتی ہے، لیکن ان کے ایک ہی شخص ہونے کا

ایک ہی طرز کی اور عمدہ تراشیدہ پتھروں سے بنی
 ہوئی ہیں

ان مختلف عمارتوں کی ساخت کی خصوصیات
 کے ذکر میں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ
 قرون وسطیٰ میں اعلیٰ درجے کے ماہرین سنگ تراشوں
 کا بھی ایک دیستان دیار بکر میں تیار ہو گیا تھا، جس
 نے نہ صرف فنی اعتبار سے بہت بلند پایہ مہبت کاری
 کے نمونے ان کی دیواروں پر نقش کئے (ارتقی مہبت
 نقش و نگار میں اکثر حوائی اشکال ملتی ہیں) بلکہ
 آرائشی تحریر [خط طبری] کو، جو ان دنوں یادگار
 عمارتوں کی بیرونی تزئینت میں اضافہ کرنے کے سلسلے
 میں بہت مقبول تھا، ایک مخصوص اسلوب بخشنے
 میں تحریک کا کام دیا۔ دیار بکر کی پانچویں صدی
 ہجری / گیارھویں صدی عیسوی میں کتبوں والے فتنے
 جو S. Flury کی (جسے صحیح معنوں میں اس میدان
 کا پہلا محقق کہا جا سکتا ہے) گہری تضحیق کا
 موضوع بن چکے تھے، شمالی میسوپوٹامیا (عراق) کی
 آرائشی کتابت کی بہترین مثالیں ہیں۔ اسی نے آگے
 چل کر نواحی علاقوں کو متاثر کیا۔ ان کی آرائش
 و ترصیع سے "اس حیرت انگیز تنوع کی اہمیت بہت
 نمایاں ہو گئی ہے جس سے جزئیات پیش کرنے میں
 کام لیا جاتا تھا اور جس سے ایک نیا طرز وجود میں
 آیا جو مخترعانہ صلاحیت کا نمونہ تھا" (J. Sauvaget)
 در: *Ars Islamica* (۱۹۳۸ء، ص ۲۱۴)۔

مآخذ: (۱) *Arabische*: M. van Berchem

Inschriften, apud: M. von Oppenheim, Inschriften
aus Syrien, Mesopotamien und Kleinasien

۱۹۰۹ء، ص ۱ تا ۱۰۰ (۱۰۰ تا ۱۲۵): (۲)

Amida: J. Strzygowski و M. van Berchem

پیرس، ۱۹۱۰ء: (۳) *Islamische Schrift*: S. Flury

händler Amida-Diarbekr، بایسل، پیرس، ۱۹۲۰ء

(= *Bauwerke ornamentés à inscriptions arabes*)

مرحد بنانا ہے۔ دونوں نواب ندیوں کے زیریں سلسلے بھی اس آخری خطے میں شامل ہیں۔ بڑے بڑے شہر یہ ہیں: دارالحکومت موصل (الموصل) دریائے دجلہ کے بائیں کنارے پر، بلد، جزیرہ ابن عمر، السن، اور مغرب میں برقمید، سنجار، نصیبین، مار دین اور راس النعین۔

ديار ربیعہ کی تاریخ کو عموماً الموصل کی تاریخ کے ساتھ خلط ملط کر دیا جاتا ہے۔ اس کی خصوصیت خارجیوں کی متعدد بغاوتیں تھیں جنہوں نے الجزیرہ کے دوسرے خطوں کو بھی متاثر کیا، عہد نبی امیہ میں بھی اتنا ہی جتنا عہد عباسیہ میں۔ پہلے عہد میں ان بغاوتوں میں الجزیرہ اور شام کے والیوں کی باہمی رقابت کی وجہ سے مزید پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں۔ عہد عباسیہ میں دیار ربیعہ میں جو فسادات رونما ہوئے ان کا بیان ان تصانیف میں ملتا ہے: (۱) ساین مائغ: *Histoire de Mossoul*، بیروت ۱۹۲۳ تا ۱۹۳۸ء، ۱: ۳۳ بعد: (۲) L. Vercia، *Le vicende del Hārigismo in epoca Vaglieri*، *abbaside* در RSO، ۲۴ (۱۹۸۹ء)؛ ۳: ۳۱ بعد: (۳) *Hist. de la dynastie des Hamdānides*: M. Canard، ۱: ۲۹۱ بعد۔

ديار ربیعہ ہی وہ خطہ ہے جہاں سے حمدانیوں کا تغلبی خاندان پیدا ہوا جس نے خارجیوں کی مذکورہ بغاوتوں میں حصہ لیا اور بعد ازاں الموصل کی نیم آزاد امارت کی بنیاد رکھی، جو ناصرالدولہ کے عہد حکومت میں زیادہ تر دیار ربیعہ پر مشتمل تھی۔ الموصل کی حمدانی امارت کو آل بویہ کے فتح کر لینے کے بعد آخری حمدانیوں، ابراہیم اور حسین کی طرف سے بویہی بہاءالدولہ (۳۷۹/۹۸۹ء تا ۳۸۳/۹۹۳ء) کے زمانے میں اپنے مفاد کے مطابق امارت قائم کرنے کی کوشش کی گئی، جس کی ایک طرف دیار بکر [رک بان] کے مروانیوں نے اور دوسری

قیوت پر نہیں آیا۔ ہو سکتا ہے کہ النہروالی کی غیر مطلوبہ تصانیف سے اس مسئلے کا فیصلہ ہو جائے۔ بہر کیف، دونوں کا ایک ہونا غیر اغلب ہے، یعنی اگر تاریخ کے فقط وہ مخطوطے پیش نظر رکھے جائیں جو استانبول میں موجود ہیں، جیسے [مخطوطہ] طوب بوسرائے، احمد ثالث، ۳۰۳، جو زیادہ سے زیادہ ۱۵۵۳/۹۶۰ کے لگ بھگ لکھا گیا تھا اور جس میں کہا گیا ہے کہ یہ تصنیف ۱۵۳۵/۱۵۲۸-۱۵۲۹ء میں مکمل ہوئی تھی (اور جو ایک قدیم تر تصحیح کردہ نسخے پر مشتمل ہے جو دراصل مصر میں یوسف المستنصر کی خلافت پر پہنچ کر متعلق ہو جاتا ہے)، یا داماد ابراہیم [کتاب خانے کا مخطوطہ] عدد ۸۹۸، جس کی تاریخ کتابت ۲۸ صفر ۵۹۳/۱۱۹۸ء (سہ شنبہ) ۸ ستمبر ۱۵۳۳ء ہے اور جس میں مذکور ہے کہ یہ کتاب یک شنبہ ۸ شعبان ۹۳۰/۱۵۲۳ء فروری ۱۵۳۳ء کو مکمل ہوئی تھی (دیکھیے حاجی خلیفہ، موضوع مذکور)۔

مآخذ: (۱) براکمان، ۲: ۵۰۰؛ تکملہ ۲: ۵۱۸؛ تکملہ ۳: ۱۲۹۳؛ (۲) عثمانی مؤلفی، ۲: ۱۸؛ بعد: (۳) رسالہ فی ذرع الکعبہ کا ایک اور نسخہ در استانبول، *Bagdadi Vehl*، ۱۱۳۲، ورق ۱۰ ب نا ۱۶ الف۔

(P. ROSENTHAL)

* دیار ربیعہ: ایک نام جس کی تشکیل اسی طرح ہوئی ہے جیسے دیار بکر [رک بان] کی، الجزیرہ کا سب سے مشرقی اور وسیع ترین صوبہ ہے۔ اس میں تین خطے شامل ہیں: دریائے خابور اور اس کے معاون ہرماس (جنگ جغ) اور ان کے سرچشموں کا خطہ، یعنی طور عبدین کی ڈھلانیں، دریائے ہرماس اور دریائے دجلہ کے دریاں کا قطعہ، یعنی سابقہ پٹ، دریا، مع جبل سنجار کے اور دریائے دجلہ کے دونوں کناروں پر قل فافان اور تکربت کے دریاں کا خطہ، جو عراق کی

حکمران کی حیثیت پر قناعت کرنا ہی بہتر سمجھا۔ عقیلی ریاست اس طرح ۸۷۹ھ/۱۰۸۶ء تک قائم رہی، یہاں تک کہ مسلم بن قریش، جس پر آخر میں مصر کے ساتھ ساز باز کرنے کا شبہ کیا گیا تھا، شام کی ایک لڑائی میں کام آیا تو ملک شاہ نے، جو تیسرا سلجوقی سلطان تھا، اس کے مقبوضات کو بغیر مزاحمت کے اپنی سلطنت میں مدغم کر لیا۔ اس تاجدار کے بعد سلجوقی سلطنت بارہ بارہ ہو گئی اور دیار ربیعہ کا وہی حشر ہوا جو الموصل کا، جہاں مسلسل کئی روز افزوں خود مختار ہو جانے والے سید سالاروں کی حکومت رہی۔ انہیں میں سے ایک زکی تھا، جس کا تقرر ۵۲۱ھ/۱۱۲۷ء میں ہوا تھا، اس نے بالآخر اپنی خود مختاری کا اعلان کر کے الموصل کے خاندان اناہک کی بنیاد رکھی۔ یہ خاندان کوئی ایک صدی کے قریب رہا، گو اس کے افراد کے درمیان تنازعات کی وجہ سے، جن میں سے بعض کو ابوبی حایت حاصل تھی، وقتاً فوقتاً سنجار باجزیرہ ابن عمر کو الموصل سے علاحدہ ہوا ہوا۔ زنگیوں کا سابق غلام اور وزیر بدر الدین لؤلؤ ساتویں صدی ہجری/تیرھویں صدی عیسوی میں ان کا جانشین ہوا۔ ۶۳۲ھ/۱۲۳۴ء میں وہ کچھ عرصے کے لیے مغول کی اطاعت قبول کر اپنے پر مجبور ہو گیا، لیکن اس کے فرزندوں نے مسلوکوں سے اپنے تعلقات قائم کر لیے تھے۔ وہ ۶۵۹ھ/۱۲۶۱ء میں بے دخل کر دیے گئے۔ بعد ازاں الموصل اور دیار ربیعہ، جو دیار بکر کے گردوں اور ترکمانوں اور دیار مصر کے مسلوک والیوں کے بالمقابل پہلے تو الجزائرہ میں ایرانی ایلخانوں کی حکومت کی بنیاد بنے، پھر ان کے جلائی (رکبان) جانشین قرہ قویونلو اور آق قویونلو ترکمانوں کے زیر نگیں رہے اور آخر میں صفویوں کے قبضے میں آ گئے تاکہ انہیں سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا گیا۔ یہ الحاق ۱۰۷۷ھ/۱۶۶۷ء میں جا کر مکمل ہوا۔ ایرانیوں کے حملوں کے باوجود یہ صوبہ ۱۹۱۸ء تک عثمانی حکومت ہی میں

جانب عقیلی امیر محمد بن المسیب نے مخالفت کی، حالانکہ شروع میں اس نے ان دو حمدانی حکمرانوں کی مدد کی تھی اور صلیب میں دیار ربیعہ کے تین مقامات حاصل کیے تھے۔ مؤخر الذکر الموصل کا حکمران بن گیا اور برائے نام ہی بغداد کے ٹوہمیدوں کا محکوم تھا۔ وہ الموصل کے عقیلی خاندان کا بانی تھا، جس کا خاتمہ سلجوقوں نے کیا۔

مآخذ : ان حوالوں کے علاوہ جو متن میں دیے

کئے ہیں دیکھیے : (۱) Le Strange، ص ۸ بعد : (۲) Hist. de la dynastie des H'amlânides : M. Canard ۱ : ۹۷ بعد ۹۹۱ بعد ۵۷۳ بعد، ویدوانغ کثیرہ جہاں دیار ربیعہ کے مختلف خطوں کے جغرافیائی مطالعے کے ساتھ کے تعلق معلومات ملیں گی : (۳) The : Margoliouth eclipse of the Abbasid caliphate بعد اشارہ

(M. CANARD)

۲۔ پانچویں صدی ہجری/گیارھویں صدی عیسوی

کے وسط میں دیار ربیعہ کو ترکوں کی پیش قدمی کے عواقب برداشت کرنا پڑے۔ ۵۳۳ھ/۱۰۴۱ء تا ۵۳۵ھ/۱۰۴۳ء سے اسے ترکمانوں کے پہلے گروہ نے تاخت و تاراج کیا جو آخر میں سب کے سب قتل کر دیے گئے۔ ۵۴۷ھ/۱۰۵۵ء میں جب سلجوقی سلطان طغرل بیگ کو عباسی خلیفہ نے بغداد میں تخت نشین کیا تو بنو عقیل اپنے عقیدے اور اپنی چراکھوں کے ساتھ سے نکل جانے کے خوف سے مخالف ہو گئے اور اس کے بلاوے پر نہیں گئے۔ پھر انہیں کے علاقے میں سلطان کے عرب مخالفین کے جتھے کی تنظیم ہوئی اور وہ ایک سابق بوہمی سید سالار البساسیری (رکبان) کے تحت مجتمع ہو گئے جو اب قاہرہ کے فاطمی خلیفہ کا ساتھ دے رہا تھا (۵۴۹ھ/۱۰۵۷ء تا ۵۵۱ھ/۱۰۶۰ء)۔ تاہم عقیل قریش نے مناسب وقت کے اندر طغرل بیگ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہونے کا فیصلہ کیا اور ادھر اس نے بھی اس سرحدی علاقے پر ایک باج گزار

شامل رہا، لیکن کبھی کبھی اس سے جدا بھی ہو جاتا تھا۔ چنانچہ حمدانی عہد میں یہی صورت تھی، جب وہ سیف الدولہ کے عہد میں امارت حلب کا ایک حصہ تھا۔ بعد ازاں یہ الموصل کی امارت کے پاس دوبارہ چلا گیا، اور اس کے بعد باقی ماندہ جزیرے کی طرح آل بوبہ کے قبضے میں آ گیا، پھر وہ ایک چھوٹے سے قلعہ خاندان (بنو تمیم) کا دارالحکومت بن گیا، جس کا خانہ سلجوقوں نے کیا۔ دوسری طرف چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی میں بوزنطی فوجیں دیار مضر کو عموماً تھ و ہلا کرتی رہیں، اور پانچویں صدی ہجری/گیارہویں صدی عیسوی میں بوزنطی سلطنت اتر رہا اور اس کے ضلع کو ۵۳۳/۵۳۲ء میں اپنے علاقے سے ملحق کرنے میں کامیاب ہو گئی۔

مآخذ: (۱) Lo Strange، ص ۸۶، بعد: (۲) Cl. Cahen، *La Syrie du Nord*، ص ۱۱۰، بعد: (۳) Margoliouth، *The eclipse of the*، بعد: (۴) M. Canard، *Abbasid Caliphate*، بعد: (۵) H. S. Rice، *Medieval Harran*، در *Anatolian Studies*، ج ۲، ۱۹۵۲ء، ص ۳۶ تا ۸۳۔

(M. CANARD)

۲۔ الرہا کی بوزنطی فتح کے بعد دیار مضر کی حیثیت ایک رابطے کے علاقے کی رہی، جسے صحیح معنوں میں خود مختاری حاصل نہیں تھی۔ یہ اس وقت دو حصوں میں منقسم تھا: ایک حصہ شمال میں، جس پر عیسائیوں کا غلبہ تھا اور اس میں جزوی طور پر ایک آرمینی نو آبادی قائم ہو گئی تھی؛ دوسرا جنوب میں تھا، جس کا بڑا مرکز حران تھا اور جہاں قلعہ عربوں کے اثرات غالب تھے۔ اسے ۷۵۵ء/۱۰۶۵ء سے ترکوں کی بڑھتی ہوئی قوت کا سامنا کرنا پڑا، یعنی پہلے تو اسے لیبیوں کے چھوٹے قوت

شامل رہا۔ چونکہ دیار بکر کے برعکس اس نے اصل ترک آبادی کو اپنے اندر جذب نہیں کیا تھا، لہذا اسے جدید ترکیہ میں شامل نہیں کیا گیا، سرحدوں کی عجیب و غریب ترتیب و تقسیم کی وجہ سے یہ عراق اور شام میں منقسم ہو گیا ہے۔

مزید دیکھئے مقالات الجزيرة، جزيرة ابن عمر، الموصل، نصیبین، سنجار اور زنگی زخاندان]۔

مآخذ: اس کے مآخذ اس عہد کی عام تاریخ کے مآخذ ہیں: خاص نصیب قطبہ ہے، ابن الاثیر: تاریخ الدولة الاتابکية بالموصل (طبع اور فرانسیسی ترجمہ در *Recueil des Hist. des Croisades, Hist. Arabes*، ۲/۲)، جو پھر حال خصوصاً نور الدین کے کارہا پر نما ان سے بحث کرتی ہے، جس نے حلب پر حکومت کی تھی، نہ کہ الموصل پر۔ عزیز الدین بن شداد کی اعلیٰ دیار ریمہ کا حال بیان کرتی ہے (دیکھئے Cl. Cahen، در *REI*، ۱۹۳۳ء، ۱) لیکن الموصل کے متعلق معروفہ واقعات کو بیان نہیں کرتی۔ (CL. CAHEN)

* دیار مضر: ایک نام جو اسی طرح شکل پذیر ہوا جس طرح دیار بکر (رگ باں)، انجیرہ کا وہ صوبہ ہے جس کے علاقے کو دریائے فرات اور اس کا معاون بلخ، نیز دریائے خابور کے نشیبی سلسلے سیراب کرتے ہیں۔ یہ دریائے فرات کے دونوں کناروں پر شمال میں ساموسا Samosata سے لے کر جنوب میں عما (عانات) تک پھیلا ہوا ہے۔ دیار مضر کا بڑا شہر دریائے فرات کے بائیں کنارے پر ارقہ تھا؛ دیگر بڑے شہر دریائے بلخ پر واقع حران، الرہا Edessa، اور ہوتہ Osrhoene کا دارالحکومت اور اتر رہا کے جنوب میں سروج تھے۔ وہ مقامات جو بلخ سے اس کے سنگھم سے آگے دریائے فرات پر واقع تھے افریقیہ اور ارحیہ تھے جنہیں بعض اوقات ایک خاص ضلع میں شامل کر دیا جاتا تھا، جسے شارع فرات کہتے تھے۔

دیار مضر زندہ تر الجزيرة کی حکومت میں

نصف صدی تک اپنے قبضے میں رکھا۔ عقیلی عرب حکمران کو، جس کی حکومت قلعہ جعبر پر تھی، نورالدین [رک بان] نے ۵۵۸ھ/۱۱۶۳ء میں مطیع کر لیا۔ اس سلطان کی جانشینی کے سلسلے میں جو فسادات ہوئے، ان کی بدولت صلاح الدین [رک بان] نے دیار مصر پر قبضہ کر لیا اور پہلے تو اسے اپنے بھتیجے قتی الدین عمر کو بھر اپنے بھائی الامدل کو عطا کیا۔ مؤخر الذکر نے، جو سلطنت کا وارث ہوا، اسے اپنے بیٹے الاشرف (۵۹۲ھ/۱۲۰۱ء) کے حوالے کر دیا، جس نے ۶۲۴ھ/۱۲۲۷ء میں اسے اپنے بھائی، یعنی مصر کے والی الکمل سے دمشق کے ساتھ بدل لیا۔ الکمل نے اسے اس مملکت میں شامل کر دیا جو اس نے مشرق میں اپنے فرزند الصالح ابوب کی خاطر قائم کی تھی، مگر الکمل کی وفات پر جب ایوبی خاندان کے خلاف تحریک شروع ہوئی تو الصالح نے اس پر حملے کے اندیشے سے اسے ایشیائے کوچک کے تازہ وارد خوارزمی ہتھیار گزینوں کو رعایت کر دیا (۶۳۵ھ/۱۲۳۸ء)۔ بعد ازاں خوارزمیوں کی شکست اور مصر میں ایوبی خاندان کے سقوط کی وجہ سے یہ خطہ حلب کے ناصر یوسف ایوبی کے ہاتھ آ گیا، جس کے زمانے سے عزیزالدین بن شداد کے تحریر کردہ کوائف انتظامیہ کا آغاز ہوا ہے۔ ۶۵۸ھ/۱۲۶۰ء میں اسے مغلوں نے فتح کر لیا، جو ایشیائے کوچک اور عراق پر پہلے ہی قابض ہو چکے تھے۔

اس کے بعد سے دیار مصر کی حیثیت بدل گئی۔

اسے غمگینوں نے، جنہوں نے مصر اور شام میں ایوبیوں کی جگہ لے لی تھی، دوبارہ فتح کر لیا اور پہلے ایران کے مغلوں کے ساتھ اور بعد ازاں ترکمان خاندانوں کے ساتھ، جو آٹھویں صدی ہجری/چودھویں صدی عیسوی کے اواخر میں ان کے جانشین بن گئے تھے، اپنی سرحد قائم کر لی۔ لگاتار حملوں نے اس علاقے کو اور خصوصاً اس کے جنوبی حصے کو

کرتے رہے، پھر ۶۶۳ھ/۱۲۷۱ء کے اوائل میں سلجوق سلطان آلپ ارسلان شام جانے ہوئے یہاں سے گزرا اور ایک موقع پر اس نے ارہا کا محاصرہ کر لیا۔ ۷۰۸ھ/۱۳۰۸ء میں نئے سلطان ملک شاہ کے بھائی تئش کا گزر ہوا۔ اسی سال حران اور سروج مع حلب مسلم بن قریش العقیلی [رک بان] انموصلی کی تلواروں میں شامل کر لیے گئے، جو ملک شاہ کا بوائے نام و محکوم اور انموصل کا والی تھا۔ ارہا یونانی نژاد ارمن Philaretes کی ریاست میں شامل ہو گیا جو مغربی طارس اور بعد ازاں انطاکیہ کا حاکم بنا۔ انجام کار دیار مصر کے دونوں حصے ۷۳۹ھ/۱۸۰۶ء میں انموصل اور شمالی شام سمیت خود ملک شاہ کے ہاتھ آ گئے۔

بائیں حصہ اس سرحدی علاقے میں سلجوق تسلط کچھ ڈھیلا ہی رہا اور ملک شاہ کے انتقال ۷۸۵ھ/۱۲۹۲ء کے بعد جو فسادات برپا ہوئے ان کی وجہ سے ارہا میں ایک ارمن حکومت قائم ہو گئی، جو عملاً خود مختار تھی۔ ۷۹۷ء کے اواخر میں صلیبی جنگ نے اس تقسیم کو نصف صدی تک کے لیے از سر نو قائم کر دیا، جس کا آغاز بوزلٹی فتح سے ہوا تھا۔ اگرچہ ارہا کے ارمنی وارمن علاقے، نیز وسطی دریائے نرات کے ساتھ مغربی طارس کے جنوبی اقطاع پر دیار مصر کا شمالی حصہ، مشتمل ہو چکا تھا، تاہم حران، جو چوتھی صدی ہجری/بارہویں صدی عیسوی کے اوائل میں ایک چند روزہ ترکی ریاست کا دارالحکومت رہا، حلب کے ساتھ کبھی ارتقیوں اور کبھی زنکیوں کے ماتحت آتا رہا۔ ۵۵۳ھ/۱۱۵۸ء میں زنکی نے اسے علی کوچک کو، جو انموصل کے مشرق میں اربیل پر قابض تھا، بطور جاگیر عطا کر دیا تاکہ ترک اور کرد فوجیوں کی بھرتی یقینی ہو جائے؛ یہی لوگ اس کے دفاع کے ذمے دار تھے، جو فوجی نقطہ نظر سے اہم تھا۔ اس کے جانشین خاندان بکتکیں [رک بان] نے اسے

جس، کہ یاقوت کے علم میں آیا اور اس کے بیشتر حصے کے لیے عموماً یہی نام مستعمل ہے۔ یہ دریائے دجلہ کے بائیں کنارے کا معاون بنتا ہے۔ اس میں صرف جھوٹی کشتیاں ہی چل سکتی ہیں اور پانی کا اخراج سلاب کے موسم (مارچ تا مئی) میں شدت سے، لیکن گرما اور خزاں کے موسموں کے اواخر میں معمولی ہوتا ہے۔

یہ دریا مغربی ایران سے نکلا ہے، جہاں بہت سے پہاڑی ندی نالے (جو موسم گرما اور خزاں میں اکثر خشک رہتے ہیں) باہم مل کر اس کے بڑے معاون بنتے ہیں اور مندرجہ ذیل علاقوں کا پانی اس میں بہا کر لے آتے ہیں: (۱) کرمان شاہ کے شمال کا علاقہ؛ (۲) صوبہ آذربائیجان میں سنندج (ستائے پختہ) کے شمال اور جنوب کا علاقہ؛ (۳) اروان کے اردگرد کا ایرانی و عراقی سرحدی علاقہ اور (۴) صوبہ کرمان شاہ کا مغربی علاقہ، جو کوند کے مغرب میں (عراقی) خاقلین اور (ایرانی) قصر شہین کے بالمقابل واقع ہے۔ ان میں پہلے تینوں علاقوں کا پانی تو اصلی دریا، یعنی اروان کی ایرانی سرحد کو عبور کرنے سے قبل ہی اس میں شامل ہو جاتا ہے۔ اس کی معاون ندیاں مختلف مقامی ناموں سے موسوم ہیں اور یہ سب ان وادیوں سے گزرتی ہیں جو قدرتی حسن سے مالا مال ہیں: وہاں زمانہ قدیم سے ایرانی اور گُرد قبائل آباد ہیں۔ مذکورہ بالا علاقوں میں سے جو تھے علاقے کے پانی سے آلودہ ندی کی تشکیل ہوتی ہے (یہ عہد عباسیہ میں اپنے مشہور شہر کے نام پر حُوان کہلاتی تھی)؛ یہ ندی خاقلین کے متصل مغرب میں سرحد عراق میں داخل ہوتی ہے۔ تنجرہ ندی بھی، جو وادی شہر زور (سلیمانہ لواء) کے پانی کو بہا کر لاتی ہے، دریا کی عراقی معاون ہے؛ چھوٹے موٹے اور بھی معاون ہیں۔ اس دریا کی وسطی گزرگاہ ۱۲۳۳ھ/۱۹۱۴ء کی سرحدی کمیشن کی مقرر حد بندی تک ترکی و ایرانی

نباتہ کر دیا اور حران ناقابلِ تلافی طور پر زوال پذیر ہو گیا، حالانکہ اگر اس صوبے کا دارالحکومت تیار شمال، مشرق اور مغرب کے ہمسایہ علاقوں کی طرح ترکمانی عنصر، خصوصاً قبیلہ دوگر Döğeri نے یہاں بھی اپنا اثر و نفوذ بڑھا لیا۔ انھوں نے ۱۱ویں صدی/۱۱ویں صدی عیسوی کے اواخر میں اس خطے کو تیمور نے پور ویران کر دیا۔ آئندہ صدی میں بھی جب معاویوں نے اپنے علاقے کی توسیع کے لیے نامکمل کوششیں کیں، تو اس علاقے نے ان کے لیے فوجی مرکز کا کام دیا اور اس طرح اسے امن و اطمینان نصیب نہ ہوا۔ یہ معاویوں کے برائے نام تسلط کے تحت بلا وقت دیار بکر کے آق قویونلو کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ پھر نرکان عثمانیہ کا شام و عراق پر قبضہ ہوا تو اسی زمانے میں یہ بھی ان کے ہاتھ آ گیا۔ یہ بات لائقِ لحاظ ہے کہ عرب آبادی کی حدود آج بھی زیادہ تر وہی ہیں جو صلیبی جنگوں کے وقت تھیں، چنانچہ ترکی اور شام کی جدید سرحد دیارِ مصر کو اسی طرح دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے جس طرح وہ پانچویں صدی ہجری/گیارہویں صدی عیسوی اور چھٹی صدی ہجری/بارہویں صدی عیسوی میں بنا ہوا تھا۔

مآخذ: اس عہد کی تاریخ اور جغرافیے کے ماخذ کے لیے، جن کا اطلاق تقریباً سارے الجزیرہ پر ہوتا ہے، دیکھیے ابن شداد: اطلاق، ج ۳، تجزیہ از Cl. Cahen در ۱۹۳۵ء۔

(Cl. CAHEN)

دیناسقور دینس: رگ بہ دینسقور دینس۔

دنیائی: وسطی عراق کے مشرق میں ایک اہم دریا۔ اس کا نام، جس کی اصل اور معنی نامعلوم ہیں، بہت پرانا ہے اور قدیم زمانے میں دنیاس یا دیناس یا دبالاس کی صورت میں ملتا ہے۔ اس کے بالائی حصے کو سروان یا (اصل میں اور صحیح تو) سروان کہتے ہیں

اس سے یہ کثرت نہروں نکلی گئی تھیں؛ پور دہائی کا بڑا حصہ غالباً دریائے دجلہ میں اس کے موجودہ دہانے ہی کے مقام پر، یا اس کے قریب، بغداد سے دس میل نیچے آ کر مل جاتا تھا۔ تکنیکی اعتبار سے دہائی (جس میں یکایک سخت طغیانی آ جانے کی خصوصیت پائی جاتی ہے) اور نہروں کے نظام انہار کے درمیان تعلق کی وجہ واضح نہیں؛ عرب جغرافیہ نویسوں کے اصطلاحی نام یکساں نہیں؛ وہ مصنوعی نہروں اور محض سیلابی نالوں میں امتیاز نہیں کرتے، حتیٰ کہ بعض اوقات دریائے دہائی اور نہروں یا تلمرا میں بھی فرق نہیں کرتے۔ قرون وسطیٰ کی جن بستیوں کا دہائی اور اس سے نکلی ہوئی نہروں پر انحصار تھا، ان میں نہروں، ہاجسرا، بَعْقُوبہ، دَسْکَرہ اور جَلُولَا شامل تھیں۔ اس کی نشیبی گزرگاہ کے دونوں جانب کے علاقے کا انتظام بڑی توجہ سے کیا جاتا تھا اور وہ سیکڑوں دیہات اور ایک گنجان آبادی کی کفالت کرتا تھا۔ ساسانی اور قدیم مقامات کے آثار بتاتے ہیں کہ یہ ہمیشہ سے ایک پسندیدہ علاقہ رہا ہے۔ بغداد سے جو بڑی سڑک صوبۃ البیال کو یہاں سے ہو کر جاتی اور شاہراہ خراسان کہلاتی ہے، وہ اس علاقے سے گزرتی اور زیادہ تر دریا کی گزرگاہ کے ساتھ ساتھ جاتی تھی؛ یہی صورت حال اب بھی ہے۔ پکی سڑک، جو بغداد سے شروع ہو کر ایرانی سرحد کے پار تک جاتی ہے، واقعہ پرانی حد بندی کے مطابق بَعْقُوبہ، شہربان، قِزِل رباط، خاقین اور قصر شیرین کے راستے سے گئی ہے۔ چھوٹی پٹری کی ریل کا بھی، جو ۱۳۳۷ھ/ ۱۹۱۸ء میں اور اس کے بعد تعمیر ہوئی تھی، یہی راستہ ہے۔ بَعْقُوبہ اور قرغان کے مقام پر ریل کے پل ہیں جہاں سے گرگ کوکھ—ایریل لائن نکلی ہے۔

مآخذ: عرب جغرافیہ نویسوں، نیز Streck

لسترینج Le Strange، Willcocks اور Longrigg کی مشائخہ تصانیف کے لیے دیکھیے مآخذ، بذیل مادہ دجلہ۔

(S. H. LONGRIGG)

سرحد کی نشان دہی کرتی تھی، جتنی کہ اس وقت تک مستقل طور پر قائم ہو چکی تھی؛ لیکن اس قطعے کے مغرب میں، جو اب خاقین کی "قضا" کا علاقہ ہے، بعد میں اور قریب بھی "مستقل شلہ علاقوں" کے نام سے قریب کے حوالے کر دیے گئے۔

یہ دریا وسطی اور نشیبی گزرگاہ میں اپنی مخصوص وضع کو بدلنا رہتا ہے؛ پہلے وہ ناہموار علاقے سے گزرتا ہے، پھر سطح میدانی علاقے میں بہتا ہے، جہاں بہاؤ کی رفتار کم ہو جانے کے باعث یہ آب پاشی کے استعمال کے قابل ہو جاتا ہے۔ جس جگہ یہ جبل حمرین کو کاٹ کر نکلا ہے، وہاں بڑی بڑی نہروں کا ایک سلسلہ بنا ہوا ہے جو کہ چوروں کے وسیع باغوں اور سرمائی اور گرمائی فصلوں کے لیے پانی بہم پہنچاتا ہے۔ یہ نہریں خاص طور پر دائیں کنارے سے نکلتی ہیں، مثلاً نہر خالص، جو دلتادہ [رگ بان] کو سیراب کرتی ہے؛ بائیں کنارے سے نہر رُوز (جس پر بلند رُوز واقع ہے)، نہر معرُوت اور نہر خراسان نکلتی ہیں۔ دہائی کا "یوا" (بضاع) اسی دریا کے نام پر موسوم ہے اور عراق میں اس کی تقریباً ساری گزرگاہ اسی علاقے میں ہے (اس "یوا" کا صدر مقام بَعْقُوبہ ہے اور اس کی ماتحت "قضائیں" [تخصیصیں] خاقین، مندلی، خالص اور بَعْقُوبہ ہیں)۔ اس ضلع میں وسیع پیمانے پر زراعت اور یہاں کے مشہور پھل کلیۃً اس آب پاشی کے مرہون منت ہیں جو ان نہروں یا "گرَد" (ڈھینکلی) اور دیگر آب کش آلات کے ذریعے کی جاتی ہے۔ یہ نظام آبپاشی اسی انداز سے کام کر رہا ہے جو منگولوں کے ہاتھوں تباہی سے پہلے تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی سے لے کر ساتویں صدی ہجری/تیرھویں صدی عیسوی تک موجود تھا، تاہم یہ سابقہ نظام کے عین مطابق نہیں بلکہ اس سے کچھ کمتر ہی ہے۔ اس عہد میں یا اس کے زیادہ حصے میں جبل حمرین کے نیچے دریائے دہائی کا پانی نہر تلمرا۔ نہروں میں گرتا تھا [رگ بہ دجلہ؛ نہروں] اور

* دیناج : رگ بہ قماش .

* ذیل : ذیل یا دیول (سندھ کی قدیم بندرگاہ،

جس میں "البد" کا ایک دیول (مندر) تھا (البلاذری :

فتوح، مطبوعہ قاہرہ، ص ۴۴۲)۔ یہ ایک کھاڑی (الخور)

کے دہانے پر واقع تھا، جو سمران، یعنی دریائے سندھ

کے مغربی جانب تھی۔ ذیل پہلا مقام تھا جو محمد

ابن قاسم الثقفی [رگ بان] نے تسخیر کیا۔ اس نے

راجا داہر حاکم سندھ کو سزا دینے کی غرض سے

۸۹۲ء-۹۱۱ء میں فوج کشی کی تھی۔ راجا پر یہ

الزام تھا کہ ذیل کے مقام پر بحری قزاقوں نے بعض

ایسی کشتیوں کو لوٹ لیا جو مسالم مرد وزن کو لٹکا کر

عراق اور مکنہ [مظفہ] لے جا رہی تھیں اور اس نے

اغماض سے کام لیا۔ ذیل ایک پارونق شہر تھا، جو

بحری تجارت اور کاربار کا مرکز تھا۔ اس کے باشندوں

کی بڑی تعداد تاجروں اور کاریگروں کی تھی، جو زیادہ تر

قبیلہ مید سے تعلق رکھتے تھے۔ اس سے پہلے ذیل

کو فتح کرنے کے لیے عربوں کے دو بحری حملے ناکام

ہو چکے تھے، جن کے قائد علی الترابی عیّد اللہ بن

نہان اور ہذیل بن طہفۃ البجلی تھے۔ تیسری بار

محمد بن قاسم نے ذیل پر خشکی کی طرف سے چڑھائی

کرنے کا فیصلہ کیا، اس کی یہ تدبیر کامیاب ہوئی۔

عربوں نے ہندوستان میں پہلی بار منجیق [البلاذری :

عروس] کو استعمال کر کے اسے لڑائی کا ایک کارگر

ہتیار ثابت کر دیا۔ ذیل کے برج کے اوپر ایک قہ

[البلاذری : ذیل] تھا، جس کی اونچائی ۴۰ گز تھی۔ اس

قہ سے ایک بہت بڑا سرخ جھنڈا - ارے شہر کے اوپر

لہراتا تھا۔ برج میں بدھ مت کا ایک ستوپا (stupa) یا

وہ دیول تھا جس کے باعث بظاہر شہر ہی کا نام دیول

(ذیل، جسے عربوں نے ذیل کر لیا) مشہور ہو گیا۔

ایک بہت وزنی پتھر، جو منجیق سے پھینکا گیا تھا، اس

برج پر آ کر لگا اور ایسی ضرب پڑی کہ وہ

دھڑام سے زمین پر آ رہا اور گنبد اور وہ عظیم جھنڈا،

جسے مقامی لوگ ناقابل تسخیر ہونے کی یقینی

علامت سمجھتے تھے، خاک پر گر پڑا۔ شہر پر

قابض ہو جانے کے بعد محمد بن قاسم نے مغلوب

غیر مسلموں کے سامنے نرم شرائط پیش کیں اور

ذبیوں کی حیثیت سے انھیں پورے حفظ و امان کا

یقین دلایا۔ اس نے ایک مسجد بھی تعمیر کرائی، جو

سرزمین سندھ کی پہلی مسجد تھی اور ایک نیا

محلہ خود تعمیر کرا کے اس میں چار ہزار عرب خاندان

بسا دیے۔ برباد شدہ ستوپا ایک عرصے تک کس مہر سی

کی حالت میں پڑا رہا تا آنکہ عبسہ بن اسحق النضی

نے، جو الواتی باللہ [رگ بان] کے عہد میں ذیل کا

والی تھا، اس کی کسی قدر مرمت کر کے اسے سرکاری

قیدخانے میں تبدیل کر دیا۔ یہ تقریباً ۸۳۲ء/۸۴۶ء

کا واقعہ ہے۔

عربی وقائع کے مطابق (الطبری، ہذیل سن

مذکور: ابن الجوزی : المنظم، ۵: ۱۴۳) ایک ہولناک

زلزلے نے ۸۲۸ء/۸۹۳ء میں اس شہر کے بڑے حصے

کو تباہ کر دیا اور ہزاروں باشندے نذراجل ہو

گئے۔ اس مصیبت کے باوجود شہر بچ گیا اور معلوم

ہوتا ہے کہ برباد شدہ حصہ دوبارہ تعمیر ہو گیا

کیونکہ اس کے بعد بہت عرصے تک یہ شہر موجود

تھا یہاں تک کہ تقریباً ۸۶۳ء/۹۳۹ء میں رضی اللہ بن

حسن بن محمد الصفانی [رگ بان] نے اس کی سیر کی

اور عجیب بات یہ ہے کہ وہ ذیل کے مالدار طبقے کی

اس پرانی عادت کا ذکر کرتا ہے کہ وہ اس وقت

بھی بحری لوٹ مار اور ڈاکہ زنی میں حصہ لیتے تھے،

۸۶۸ء/۹۲۱ء میں جلال الدین خوارزم شاہ قاتاروں

کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد سندھ آیا اور

ذیل پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا اور وہاں بت پرستوں

کے ایک مندر کی جگہ ایک جامع مسجد تعمیر کرا دی۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ ساتویں صدی ہجری/

تیرھویں صدی عیسوی تک ذیل میں بت پرستی

بمبئی: (۳) السعدی: مروج (مطبوعہ قاہرہ)، ۱۰: ۳۷۸: (۴)
 الاضطحری، ص ۱۷۵: بمبئی: (۵) ابن حوقل، ص ۳۱۷،
 ۳۲۰: (۶) باقوت، ۲: ۶۳۸: (۷) الثوری: نہایۃ الأرب
 (برسے ہاتھ نہیں لگی): (۸) الفلشنیدی: صبح الاعشی، ۵:
 ۶۳: (۹) حدود العالم، ص ۳۷۲: (۱۰) الادریسی:
 نزهة المشتاق (اقتباسات)، علی گڑھ ۱۹۵۳ء، ص ۲۸: (۱۱)
 عبدالحمید خان: Towns of Pakistan، کراچی بدون تاریخ،
 ص ۵۹ تا ۶۹: (۱۲) Journal of Sind Historical
 Society، مئی ۱۹۳۳ء، ص ۳: بمبئی: (۱۳) J. McMurdo،
 در JASB، ۱۸۳۳ء: (۱۴) سلیمان ندوی، در JPakHS،
 ۱: ۱۹۵۳ء: ۸ تا ۱۵: (۱۵) N. B. Baloch:
 The most probable location of Dabul, the first
 Arab settlement in Sind، در Dawn، کراچی، قوری
 (۱۸۱۳) ۱: ۱۹۵۱ء: (۱۶) الجونی، ۲: ۱۹۳ تا
 ۱۳۸: (۱۷) Djawayni-Boyle، ۲: ۱۱: بمبئی: (۱۸)
 Sidi Ali Reis: Travels and Adventures، لندن
 ۱۸۹۹ء، ص ۳۸: (۱۹) چچ نامہ (طبع محمد عمر
 داؤد پوتا) دہلی ۱۳۵۸/۱۹۳۶ء، ص ۸۹ تا ۹۱،
 ۱۰۰ تا ۱۱۰: (۲۰) البیرونی: قانون مسعودی، حیدرآباد
 ۱۹۵۵ء: ۲: ۵۵۲: (۲۱) مراصد الاطلاع، تہران، ۱۳۱۰،
 ص ۱۸۳: (۲۲) البلاذری: فتوح، ص ۳۳۱ تا ۳۳۸،
 ۳۳۳: (۲۳) Le Strange، ص ۲۳۱: (۲۴) H. Cousens:
 The Antiquities of Sind، کلکتہ ۱۹۲۵ء، ص ۱۲۳
 بمبئی: (۲۵) Elliot اور Dowson: The history of
 India as told by its own historians، لندن ۱۸۷۷ء،
 بمبئی اشاریہ: (۲۶) H. G. Raverty: The Mihar of
 Sind، کلکتہ ۱۸۹۲ء (JASB کی خاص اشاعت):
 (۲۷) M. R. Haig: The Indus Delta Country،
 لندن ۱۸۹۳ء، ص ۳۲: بمبئی: (۲۸) J. Abbot:
 Sind، آوکسفورڈ ۱۹۲۳ء، ص ۳ تا ۵۵: (۲۹) البیرونی:
 کتاب الهند (ترجمہ E. Sachau)، لندن ۱۹۱۳ء، ص ۲۰۵،
 ۲۰۸، ۲۲۰، ۳۱۶: (۳۰) الیعقوبی، ۲: ۳۳۰ تا ۳۳۱

ہوق تھی اور وہاں غیر مسلموں کی خاصی بڑی تعداد
 رہتی تھی۔

برباد شدہ دبیل کی جگہ اور نشان متعین کرنے
 کی مختلف کوششیں اب تک ہو چکی ہیں، لیکن ان
 میں کاسیابی نہیں ہوئی۔ عرب مصنفوں اور سیاحوں
 نے اس شہر کے متعلق جو بیانات دیے ہیں ان سے
 اس شہر کی گزشتہ شان و شوکت کی بابت مفید
 معلومات تو حاصل ہوتی ہیں، لیکن اور کسی حیثیت
 سے یہ بیانات مفید نہیں۔ محکمہ آثار قدیمہ پاکستان
 نے اس جگہ پہلی دفعہ ۱۹۵۸ء میں بڑے پیمانے پر
 کھدائی کی، جہاں ایک اور شہر بھنبھور واقع
 تھا اور جسے بعض علما نے فرض کر لیا تھا کہ
 اصل میں شہر دبیل یہی تھا، لیکن بھنبھور کے
 ٹیلوں کی جگہ کھودنے سے اس وقت (۱۹۶۶ء) تک
 جو کچھ ظاہر ہوا ہے اس سے اس کی قطعی شہادت
 نہیں ملتی کہ بھنبھور کے کھنڈر وہی دبیل کے
 کھنڈر ہیں، الاضطحری شہر دبیل کا اور بھنبھورا
 (بھنبھور) کے بت خانے کا ذکر الگ الگ کرتا ہے۔
 مسلمانوں کے حوالوں کے ابتدائی زمانے میں دبیل
 ثقافت اور تعلیم کا بڑا مرکز تھا اور الشعانی
 (کتاب الأنساب، ورق ۲۳۶ ب) اور باقوت، محدثین
 کی ایک بڑی تعداد کا ذکر کرتے ہیں جو وہاں
 بھلے ہوئے۔

دبیل کی تباہی، اس تباہی کے اغلب اسباب اور
 ایک ایسے شہر کا بالآخر بالکل غالب ہو جانا جو اس
 قدر بڑی وسعت اور آبادی رکھتا تھا اور اتنے عرصے
 تک دنیا میں موجود رہا، یہ وہ مسائل ہیں جن کا
 کوئی خاطر خواہ حل اس وقت تک دستیاب نہیں ہو
 سکا اور تمام کوششیں تاحال ناکام ہی ہیں۔

مآخذ: (۱) سلیمان المہری: تِلَادَةُ الشُّمُوسِ وَ
 اسْتِخْرَاجُ قَوَاعِدِ الْأَسَاسِ (جو مجھے دستیاب نہیں ہوئی): (۲)
 ابن خردادبہ: المسالك والممالك، لندن ۱۳۰۶ء، ص ۶۲

(= ثار) [رگ بہ قصاص] لینے کا قاعدہ خاص طور پر ہر جگہ نافذ تھا۔ اگرچہ یہ ممکن تھا کہ اس حق سے باختیار خود کوئی دست بردار ہو جائے اور اس کے بدلے میں دیۃ لینا منظور کر لے۔ اس دیۃ کی مقدار اصولاً سو عدد اونٹ مقرر تھی، کم از کم اس علاقے کے اندر جہاں اسلام وجود میں آیا، اگرچہ بعض روایات میں صرف دس اونٹوں کا ذکر بھی موجود ہے۔ اس قاعدے پر عمل کرنے میں قبیلے کے تمام افراد کا بالقوۃ اور بالفعل قوی اتحاد کام کرتا تھا۔ سارا قبیلہ مجموعی طور پر دیۃ کے ادا کرنے کا ذمے دار تھا، جس طرح قصاص میں بھی خود قاتل کے بجائے اس کے قبیلے کے کسی فرد یا افراد سے انتقام لیا جا سکتا تھا۔ برعکس اس کے جہاں مقتول کا قریبی رشتے دار خود قصاص لینے کے قابل نہ ہوتا اس کے قبیلے کا کوئی مستحق شخص اس کی طرف سے قصاص لے سکتا تھا۔

اسلام نے اس رواج کی اصل بنیاد میں مداخلت نہیں کی: قرآن مجید کی مختلف عبارتیں اس کی صراحت تصدیق کرتی ہیں، لیکن ان آیات میں بعض ترمیمات پائی جاتی ہیں، جن میں سب سے زیادہ اہم یہ ہے کہ قتل خطا میں بھی دیۃ ادا کرنا واجب ہوگا۔

دوسری جانب اس قدیم دستور کے وحی قرآنی میں آ جانے کا اثر یہ ہوا کہ وہ لا محالہ ایک معین قانون کی صورت میں آ گیا اور آئندہ نظری طور پر اس میں اصلاح و ترمیم کی گنجائش نہ رہی۔

تاہم بہت عرصہ نہ گزرنے پایا تھا کہ یہ قانون بعض مسلمانوں کے جدید معاشرے کے حالات کے لیے عملاً سازگار نہ رہا۔ معاشرہ ترقی کر کے بہت جلد ایسی جماعت بن گیا جو نظری طور پر متحد اور بالخصوص ایک منظم ریاست کی صورت میں نمودار ہوئی۔

ان مخالفانہ مطالبات کے زیر اثر کام کرتے ہوئے مابین قانون نے دیۃ [اور ذاتی انصاف کے قانون (رگ بہ قصاص)] کا ایک نظریہ قائم کیا جس کے اندر

۳۳۵ تا ۳۳۶: ۳۳۸: (۳۱) انطبری، ۱: ۸۶۷: (۳۲) (ابن الاثیر: تاریخ (مطبوعۃ ناہرہ)، ۴: ۲۵۷ تا ۲۵۸: (۳۳) منہاج راج: طبقات ناصری، (ترجمہ Raverty، ۱: ۲۹۸، ۲۹۹: ۳۵۲: (۳۴) الجوالیقی: العرب، ص ۱۶۷: (۳۵) محمد طاهر نیای: تاریخ طاهری، (مخطوطہ): (۳۶) القفیس، ص ۸۱ تا ۸۸: (۳۷) TA، بذیل مادۃ دیل: The most probable site: N. B. Baloch (۳۸) of Debal... IC، ۲/۲۹، ۱۶۱۹۵۲، ص ۳۵ تا ۳۹۔

(اسی انصاری)

* دیۃ: [خون بہا]، زر نقد یا مال کی وہ معین مقدار جو کسی کو قتل کرنے یا ظالمانہ طور پر کسی کو جسمانی ضرب پہنچانے کی صورت میں واجب الادا ہو۔ یہ ذاتی بدلہ لینے کا قائم مقام ہے اور اس حیثیت سے یہ اس معاوضے یا "Wergeld" کے بالکل مطابق ہے جو قدیم رومی یا جرمن قانون میں مقرر تھا، لغت کے اعتبار سے اس لفظ کے معنی اس چیز کے ہیں جو ادا کی جائے۔ دیۃ کو، نسبتاً بہت شاذ طور پر "عقل" بھی کہتے ہیں۔

محدود مفہوم، یعنی اس مفہوم میں، جو قانون میں زیادہ تر لیا جاتا ہے، دیۃ وہ معاوضہ ہے جو قتل کے عوض واجب الادا ہو اور جسم کو دوسری قسم کا ضرر پہنچانے کے عوضانے کو خصوصی طور پر "آرش" کہتے ہیں۔

آئین دیۃ کی تاریخی اصل زمانہ قبل اسلام کے رواجی دستور میں پائی جاتی ہے جب کہ یہ عرب کے معاشری نظام کے ساتھ لازم و ملزوم تھا۔ معاشرے کی بنیاد قبائلی زندگی پر تھی۔ ملک میں کوئی سیاسی اقتدار عام موجود نہیں تھا، بلکہ کسی قبیلے میں علیحدہ شکل میں بھی نہیں پایا جاتا تھا، اپنا انصاف خود چکانے کا رواج تھا جس میں کسی حد تک پنچایت کے فیصلے کو بھی دخل ہوتا تھا۔ قتل کی صورت میں شخصی طور پر بدلہ

کے حق ققط مقتول یا اس کے ورثہ کا ہے یا اس اختیار کے نافذ ہونے میں قاتل کی رضامندی بھی ضروری ہے۔ اگر فریقین میں اس کے خلاف کوئی باہمی سمجھوتا نہ ہو جائے تو دبۃ کی مقدار کا ایک معین اور محدود پیمانہ مقرر ہے۔ اصولاً اس میں مختلف صورتوں میں مختلف عمر اور جنس کے اولادوں کی تعداد مقرر کر دی گئی ہے۔ قتل نفس کی صورت میں اولادوں کی تعداد سو مقرر ہے جو برابر تعداد کے پانچ گروہوں میں منقسم ہے: ۲۴ سالہ، ۲۳ سالہ، ۲۲ سالہ مادہ اونٹ اور ۲۱ سالہ نر اونٹ، لیکن اس تقسیم میں مختلف قسمی آرا کے اعتبار سے اگر قتل عمد یا شبہ عمد ہے تو دبۃ کی قیمت میں زیادتی کر دی جائے (دبۃ منغلظہ) یعنی چار پہلی انواع میں نر اونٹ کے بجائے صرف مادہ اونٹ دینا پڑے گا۔

ہر اس صورت میں بھی جہاں کسی پورے عضو کے کاٹ دینے یا جسمانی یا ذہنی وظیفے کے مختل کر دینے کا نتیجہ اتفاقی موت ہو پوری دبۃ واجب الادا ہوگی۔ اگر موت نہ واقع ہو تو دبۃ ہر ضائع شدہ عضو کے مناسب ہوگی: ایک بازو، ٹانگہ، آنکھ یا اس کے ڈھیلے کے بدلے کامل دبۃ کا نصف واجب الادا ہوگا؛ پلکوں کے ضائع کر دینے کے عوض چوتھائی دبۃ دینا ہوگی؛ ہاتھ یا پاؤں کی ایک انگلی کاٹ ڈالنے کے بدلے دبۃ کا دسواں حصہ دینا ہوگا؛ ایک دانت کے عوض دبۃ کا دسواں حصہ واجب الادا ہوگا وغیرہ۔

باقی ماندہ جسمانی ضرر جن کے لیے دبۃ یا آرش مقرر ہے اور جس کی مقدار دبۃ قتل کا کوئی حصہ مقرر کی جاتی ہے، حسب ذیل ہیں: الجافۃ، وہ زخم جو بدن کے اندر تک گھس جائے، اور الآمۃ (یا المامومۃ) وہ زخم جو دماغ تک پہنچ جائے؛ پوری دبۃ کا تیسرا حصہ؛ الشقیۃ، وہ چوٹ جس سے ہڈی ٹوٹ کر جگہ سے ہٹ جائے؛ ۳۔ واں حصہ؛ الهاشمۃ، جس سے ہڈی ٹوٹ جائے، پوری دبۃ کا دسواں حصہ؛ الموضجہ، وہ

مختلف مہلکات کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ یہ نظریہ عموماً سنی اور شیعہ دونوں مسلکوں میں یکساں پایا جاتا ہے، اس کے سوا کہ ثانوی امور میں بعض اختلافات پائے جاتے ہیں، جن میں سے بعض کی طرف ہم آگے اشارہ کریں گے۔

اس نظریے (دستور) کا میدان عمل قتل اور بعض جسمانی ضرروں تک محدود ہے، جن کی صراحت ذیل میں آتی ہے، جنہیں نام یہ نام گن کر اس طرح معین کر دیا گیا ہے کہ ان کے باہر جتنی صورتیں ہیں ان پر حقوق شہریت کے سروجہ قانون کا اطلاق ہو اور نقصان کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کر کے اس کی تلافی کی جائے۔ دبۃ کہیں اختیاری ہے کہیں واجب۔

اختیاری دبۃ تو وہاں ہوتی ہے جہاں ضرر رسانی کا عمدا ارتکاب کیا گیا ہو۔ قتل عمد کی صورت میں ارادے کی تعریف چند قیود سے مقید کی گئی ہے: نمایاں قید یہ ہے کہ قتل کا ارتکاب ایسے آلے میں کیا گیا ہو جو بذاتہ مہلک ہے۔ اگر یہ آلہ جان سے مارنے کے لیے استعمال نہیں ہوتا تو اس قتل کو قتل شبہ عمد قرار دیا جائے گا اور اس صورت میں دبۃ اختیاری نہیں رہتی۔ مالکی مذہب میں قتل کی اس تفریق کو نہیں مانا گیا۔ وہ کہتے ہیں جب قتل کا ارادہ ثابت ہو جائے تو خواہ مارنے کے لیے کوئی سا آلہ استعمال کیا جائے، دبۃ اختیاری رہے گی۔

لیکن چند صورتیں ایسی ہیں جہاں قتل عمد میں قصاص کا حق نہیں دیا جاتا اور ان صورتوں میں دبۃ اختیاری نہ رہے گی: مثلاً بچے کا قتل، یا ایسا قتل جس میں موت فوری اور براہ راست حملے کے اثر سے واقع نہ ہوئی ہو وغیرہ (رک بہ قصاص)۔ قتل عمد کی اس صورت کے سوا جہاں حق قصاص ثابت ہو جاتا ہے، دیگر صورتوں میں دبۃ واجب ہے۔

مختلف مذاہب میں اس مسئلے کے متعلق اختلاف پایا جاتا ہے کہ اختیاری قصاص کی جگہ دبۃ قبول کرنے

زخم جس سے ہڈی کھل جائے، $\frac{1}{10}$ دیتہ۔
اس کے سوا دیگر ضرر دیتہ کے نظام سے باہر
ہیں اور ان کا فیصلہ اس بنا پر کیا جاتا ہے جسے
”حکومت عدل“ کہتے ہیں، یعنی اصلی نقصان کی
تشخیص، پھر بھی یہ نظام دیتہ کے تحت اس حد تک
باقی رہتا ہے کہ معاوضے کی مقدار اس ضرر سے مقابلہ
کر کے معین کی جاتی ہے جس کے لیے کوئی دیتہ معین
ہو چکی ہے اور کسی حالت میں مقررہ مقدار دیتہ سے
نہیں بڑھ سکتی۔

دیتہ یا آرش کی یہ مقادیر جن کا اوپر ذکر ہوا
پوری پوری اس صورت میں واجب ہوتا ہے جب
ضرر رسیدہ شخص مسلم مرد اور رقیے میں آزاد ہو۔
عورت کی دیتہ مرد سے آدھی ہوتی ہے۔ مالکیہ، جن کے
اس مسئلے میں شافعیہ بھی پیرو ہیں، کہتے ہیں کہ
آدھی دیتہ انہیں صورتوں میں ہوگی جہاں دیتہ پوری
دیتہ کے تیسرے حصے سے بڑھی ہوئی ہو، لیکن مثال کے
طور پر جہاں جرم کی نوعیت پوری دیتہ کے فقط چوتھائی
حصے کی متقاضی ہو تو عورت کے لیے بھی وہی چوتھائی
دیتہ دینا ہوگی جو مرد کے لیے مقرر ہے۔

ذمی اور مسلمان (وہ غیر مسلم اجنبی جو اسلامی
علاقے میں عارضی طور پر اجازت لیے کر آیا ہو) وہ
اجنبی غیر مسلم جو اجازت سے نہ آیا ہو اس کے لیے کوئی
دیتہ مقرر نہیں ہے) کے لیے اکثر فقہاء کی رائے میں شرح
دیتہ ایک تہائی یا نصف دیتہ ہے، اگرچہ حنفی مساوی
شرح کے قائل ہیں۔ ہر صورت میں دیتہ، جہی
واجب الادا ہوگی جب ارتکاب جرم مسلم علاقے میں
ہوا ہو۔ غلام کی بابت یہ فیصلہ ہے کہ اگر وہ جرم
کا شکار ہوا ہو تو وہ نظام دیتہ کے تحت نہیں آتا
(اگر غلام خود مجرم ہو تو اس کا حکم آگے بیان
کیا جائے گا) چونکہ وہ دوسرے شخص کی ملک میں
مانا گیا ہے اس لیے اگر وہ قتل کر دیا جائے یا اسے
ایسا ضرر پہنچایا جائے جس سے اس کی جسمانی صحت

بگڑ جائے تو خود مالک کو جتنا نقصان پہنچا ہے
اس کے مناسب وہ معاوضے کا مطالبہ کر سکتا ہے۔
یہ معاوضہ اس دیتہ کی مقدار سے زیادہ بھی ہو سکتا
ہے جو خر کے لیے مقرر ہے، لیکن قضا کی کمتر تعداد
اس طرف ہے کہ قتل کی صورت اس سے سستی ہے
جہاں معاوضہ دیتہ کی مقدار سے نہیں بڑھ سکتا۔

اگرچہ اصل قاعدے کی رو سے دیتہ میں اونٹ دینا
چاہیے، لیکن سونے کے سکوں میں (۱۰۰۰ دینار)
یا چاندی کے سکوں میں (۱۰۰۰۰ یا ۱۲۰۰۰ درہم،
اس میں اختلاف رائے ہے جس کی بنا بلا شک و
شبہ سونے اور چاندی کے سکوں کی شرح مبادلہ
مختلف ہونے پر ہے) ادا کرنا بھی بالکل اسی کے
برابر ہے۔ بعض کی رائے یہ بھی ہے کہ دیتہ مویشی
(۲۰۰)، بھیڑ (۱۰۰۰) یا لباس (۲۰۰ حُلّے) کی شکل
میں بھی ہو سکتی ہے، لیکن اس مسئلے میں اختلاف
رائے ہے کہ صورت ادا کا فیصلہ فریقین کی باہم
رضامندی سے ہو گا یا مجرم فریق کو اختیار دیا
جائے گا یا قاضی فیصلہ کرے گا، یا یہ ہوگا کہ ان
میں سے ایک صورت ادا واجب التعمین ہو جائے گی،
اس لیے کہ جہاں قرض چکلا جا رہا ہے اس علاقے
میں اسی صورت میں ادا کرنے کا عام رواج ہے، یا
صورت یہ ہے کہ دیتہ اونٹوں ہی کی شکل میں ادا
کرنا پڑے گی جو اصل قانون میں مقرر کی جا چکی ہے،
سوا ان حالات کے جن کے تحت اونٹوں کی شکل میں
ادا کرنا ناممکن ہو اور اس کی وجہ سے کسی اور
شکل میں ادا کرنا ضروری ہو گیا ہو۔

پوری دیتہ کے ادائے سؤجل کے بارے میں
اکثر مذاہب (شافعی، مالکی اور حنبلی) قتل عمد اور
بلاعمد میں فرق کرتے ہیں۔ قتل عمد کی صورت میں
دیتہ کی ادائی کا مطالبہ اس سال کے اندر اندر کیا جا
سکتا ہے جس میں ارتکاب جرم ہوا ہو، بلا عمد کی صورت
میں دیتہ کو تین سال کے اندر ایک تہائی فی سال کی

وقت ایک ایسے خیراتی کام سے زیادہ نہ رہی جو ایک مفاسد فرہدار کی مدد کے لیے عمل میں لایا جائے۔ اس کے بعد ترقی یافتہ اسلامی معاشرے میں قبیلے کی ذمہ داری کا خاتمہ مان لیا گیا تو عاقلہ کی جگہ حکومت نے ذمہ داری سنبھال لی، مگر اس کی ذمہ داری بھی آخر کار ختم ہو گئی۔ جس جرم کے ارتکاب میں بہت سے مجرم شریک ہوں تو ذمہ کی رقم ہر شخص پر بعضہ مساوی عائد ہوگی۔

اگر جرم کا مرتکب مملوک (غلام) ہو تو اس صورت میں بھی قتل و قتل خطا میں فرق کیا جائے گا۔ پہلی صورت میں قصاص کا احتیال ہے بالکل اسی طرح جیسے آزاد شخص بجز اس کے کہ ستم رسیدہ یا اس کے وارث مملوک کو حوالے کر دینا پسند کریں لیکن جنہور اس طرف ہیں کہ اگر مستغنیث مقدمہ جیت جائے تو وہ یا تو قصاص لیے سکتا ہے یا بالکل معاف کر سکتا ہے۔

قصاص یا ذمہ سے اجتماعی قسامۃ [رک بان] کی ضمنی رسم بھی تھی یعنی اگر کسی مقام، قبیلے، گاؤں یا علاقے میں کوئی لاش پڑی ملے اور قاتل کا پتا نہ چلے تو اس مقام کے باشندوں میں سے پچاس آدمی حلف اٹھائیں کہ انہیں مجرم کے نام و نشان کا کوئی علم نہیں۔ اگر پچاس آدمی یہ حلف نہ اٹھائیں تو تمام مقامی باشندوں کو مل کر ذمہ کا ادا کرنا لازم آئے گا۔ یہ دستور بھی آخر کار معدوم ہو گیا جیسا کہ چوٹی صدی ہجری/بارہویں صدی عیسوی کے ایک مصنف نے لکھا ہے۔

ذمہ کی موجودہ صورت:

موجودہ زمانے میں ذمہ کا نظام دو خاص شکلوں میں، مقامی حالات کے مطابق، باقی نظر آتا ہے۔ بدوی قبائل میں جو بالطبع ہر نظام حکومت سے دلی مخالفت رکھتے ہیں، ذاتی انتقام کا طریقہ ابھی تک جاری ہے جس کے ساتھ ذمہ سے بھی حسب موقع

قسط میں ادا کیا جا سکتا ہے۔ حنفیہ کے نزدیک ہر سال میں ذمہ تین سال کے اندر ادا کی جا سکتی ہے۔ جب ذمہ پوری ذمہ کی ایک تہائی ہو تو ہر صورت میں، ہر مذہب کے مطابق پہلے سال کے اندر بالجبر وصول کی جا سکتی ہے۔ جب ذمہ پوری ذمہ کی ایک تہائی سے زیادہ ہو تو اس کی ادائی میں وہی اختلاف ہے جو پوری ذمہ کی صورت میں ہے؛ جرم عمد کی صورت میں دوسری قسط حسب راستہ اکثریت، وقوع جرم کے سال کے اندر اندر بالجبر وصول کی جا سکتی ہے۔ حنفیہ کہتے ہیں کہ وہ دوسرے سال کے دوران میں بھی ادا کی جا سکتی ہے۔ ذمہ کی قانونی نوعیت پیچیدہ ہے اور مختلف اور متضاد اوصاف کی حامل ہے جو اس کی اصل صورت اور بعد کے تکمیلی مراحل کا نتیجہ ہے۔ یہ ایک وقت ذاتی انتقام کے مالوں کا مظہر، اس عائدہ قائم رکھنے کا ذریعہ اور نقصان رسیدہ کے نقصان کی تلافی کی صورت ہے۔

ذمہ کا لین دار ضرر رسیدہ ہوتا ہے، قتل کی صورت میں اس کے وارث حسب قانون وراثت حصہ دار ہوں گے۔ اس میں مقتول کی صرف حیثیت دیکھ کر ذمہ کا تعین نہیں ہوگا۔

شروع سے ذمہ کے ادا کرنے کی ذمہ داری مجرم کے سارے قبیلے پر عائد ہوتی تھی اور ان حالات میں اس کے قبیلے کو عاقلہ [رک بان] سے تعمیر کیا گیا ہے۔ اس بات سے ذمہ کی رقم بہت زیادہ ہونے کی وجہ سے جہ میں آتی ہے۔ اجتماعی ذمہ داری کا قاعدہ نظری حیثیت سے تو ضرور قائم رکھا گیا؛ لیکن آہستہ آہستہ لوگ اس کی صحیح اہمیت کا احساس کھو بیٹھے اور آخر کار بالکل مغتود ہو گیا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ جرم بالعمد میں اس کو سراسر نظر انداز کیا گیا ہے۔ عاقلہ کی ذمہ داری جو پہلے اولین درجہ رکھتی تھی، خود مجرم کی ذمہ داری کے سامنے ماند پڑ گئی۔ اس کی

طور پر دیۃ کی مقدار دو سو چوبیس قرۃ ہونڈ معین کی گئی تھی۔

اب عملی طور پر یہ سب باتیں، دستور سازی سے غالب ہو چکی ہیں؛ لیکن پہلے حالات کے آثار جن کا مٹانا سخت مشکل ہے ابھی تک باقی ہیں۔ بعض ممالک، جیسے شام میں عدالتیں اگرچہ قانون کی ظاہراً و باطناً پابند ہیں اور دیوانی اور فوجداری قوانین زمانہ حال کے تقاضے کے مطابق ۱۹۶۹ء سے جاری ہیں پھر بھی وہ دیات ادا کرنے کا فیصلہ کرتی ہیں جس کی مقدار قتل انسان کی صورت میں یکمشت رقم فوق ہے اور اس کی کمی بیشی قتل عمد یا قتل خطا کے لحاظ سے معین کی جاتی ہے۔

قانون دیۃ کی تمدنی حکمت کے لیے رک بہ قصاص۔

مآخذ: (۱) شیخ زائد: مجمع الأنهر، طبع احمد بن عثمان، ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء ج ۲: ص ۶۱۵، بعد: (۲) ذریر بر السوق یعنی حاشیہ مختصر الخلیل، ص ۲۵۸، بعد: (۳) ابن عبدالرحمن الدمشقی: رحمة الامة فی اختلاف الامة، طبع عبدالحمید، قاہرہ، ص ۲۵۵، بعد: (۴) ابن الہمام: فتح القدر، قاہرہ، ۲۴۴، بعد: (۵) ابن قدامہ: المغنی، بارسوم، طبع رشید رضا، قاہرہ، ۱۳۶۴ھ/۱۹۴۵ء، بعد: ۸: ۱، بعد: (۶) خروشی: شرح مختصر الخلیل، ۲: ۲، بعد: (۷) Querry: Recueil de lois concernant les musulmans ch. ۱۲، ۱۸۷۱ء، ۲: ۵۴۱، بعد: (۸) [امام] الشافعی: کتاب الام، قاہرہ، ۱۹۰۳ء، ۲: ۲، بعد: (۹) ابو ہیف: الذب، (فرانسیسی سے عربی ترجمہ)، قاہرہ، ۱۹۳۲ء، (۱۰) Hakim: Le dommage de source: délictuelle et son évaluation en droit musulman، مقالہ (ثانی شد)، بیروت، ۱۹۵۵ء، ص ۱، بعد: (۱۱) Handbuch: Juynboll، ص ۲۹۵، بعد: ۲۵۳، (۱۲) Tynn: Système de responsabilité delictuelle en droit musulman، مقالہ لیون، ۱۹۲۶ء، ص ۱۳، بعد:

کام لیا جاتا ہے۔ اس نظام کی بنیاد چند خصوصیات کے لحاظ سے ایسے رسم و رواج پر ہے جو قدیم عرب کے رواج سے ملتا جلتا ہے اگرچہ ہر قبیلے میں اس کی صورت الگ الگ ہے۔ متعلقہ حکومتیں اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکیں کہ ان جماعتوں کے طریق عمل پر چند پابندیاں عائد کر دیں جن کا دائرہ اثر بھی محدود ہے۔

چنانچہ مصر، اردن اور شام میں یہ رسم تقریباً عام ہے کہ قتل عمد کے سوا ہر صورت میں دیۃ واجب ہے۔ دیۃ کے اجزائے ترکیبی میں قبیلے قبیلے کے لحاظ سے فرق ہوتا ہے: صرف ۳۰۰ نر اونٹ یا ۳۰ نر اونٹ اور ایک دوشیزہ لڑکی یا نقد روپیہ (مثلاً مصر میں ۳۰۰ مصری ہونڈ یا ۳۰۰ م - ہونڈ یا ۱۵۰ م - ہونڈ وغیرہ)۔ عورت کی دیۃ مرد کی دیۃ سے زیادہ ہوتی ہے؛ بعض قبائل میں اس کی مقدار مرد کی دیۃ سے چار گنا یا آٹھ گنا تک زیادہ ہوتی ہے۔ اثبات جرم کے لیے، آگ یا پانی میں سے گزرنے کا استعان اکثر عمل میں لایا جاتا ہے، بعض قبائل میں عمل قساسة بھی دیکھا جاتا ہے۔

زیادہ ترقی یافتہ اور سیاسی حیثیت سے زیادہ منظم قوموں میں بھی دیۃ در اصل اس لیے باقی رہی کہ اس کی نوعیت مذہبی حکم کی سی ہو گئی تھی۔ اس کی مخصوص مثال حکومت عثمانیہ میں ملتی ہے۔ اگرچہ وہاں ایسویں صدی عیسوی کے وسط کے قریب زمانہ حال کے مطابق قانون کی اصلاح ہو چکی تھی اور نقصان رسیدہ کے معاوضے کا قانون (معاوضے کے صحیح معنوں کے لحاظ سے) نافذ کر دیا گیا تھا اور اس کے مطابق قانون عامہ باقاعدہ معمول یہ ہو چکا تھا؛ پھر بھی اہل مقدمہ کے قصاص کا اور آگے چل کر دیۃ کے مطالبے کا حق باقی رکھا گیا۔ خاص طور پر ۱۸۶۳ء کے قانون تمزیرات میں، سرکاری

اور جن کے مؤلفین نے اس بات کی کوشش کی تھی کہ اپنے زمانے کا سارا فلسفہ اور اپنے عہد کے جماعہ علوم عام فہم انداز اور سادہ اور سلیس زبان میں بیان کر دیے جائیں۔ دی تریسی نے ان رسائل کے مستدرجات سے بحث کی، اور ان میں سے بعض کو جرمن زبان میں منتقل کیا اور اس طریق سے اہل مغرب کو ان رسائل سے آشنا کیا جو مسلمانوں کی علمی اور فکری تاریخ میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔

دی تریسی نے فارابی اور اس کے فلسفے کی تشریح پر بھی خاص ترجمہ مبذول کی، چنانچہ اپنی عمر کے آخری ایام میں پروفیسر موصوف فارابی کی کتاب *السیاسة المدنية* کا جرمن زبان میں ترجمہ کر رہے تھے، لیکن ابھی اسے مکمل نہ کرنے پائے تھے کہ انہیں داعی اجل کو لبیک کہنا پڑا۔ تاہم ان کی وصیت کے مطابق ان کے شاگرد رشید ڈاکٹر پال برنولہ Paul Brönle نے اس کی تکمیل کی اور آغاز کتاب میں ایک مقدمہ لکھا اور اس میں اپنے نامور استاد کے مختصر حالات کے علاوہ ان کے علمی کارناموں کا تفصیلی جائزہ دیا۔ یہ ترجمہ مقدمہ مذکورہ کے ساتھ ذیل کے عنوان سے طبع ہو چکا ہے: *Die Staatsleitung von Alfarabi, deutsch Bearbeitung, herausgegeben mit einem Gedenkblatt von Dr. P. Brönle, Laßn ۱۹۰۰*۔ پروفیسر دی تریسی نے اگست ۳: ۱۹۰۰ء میں وفات پائی۔

مآخذ: (۱) ابوالقاسم سحاب: فرهنگ خاورشناسان، صفحہ ۱۱۱: (۲) نجیب العقیلی: المستشرقون، ۲: ۱۶، قاهرہ ۱۹۶۵ء (۳) Paul Brönle: Introduction to F. Dietrich Die Staatsleitung von Alfarabi Laßn ۱۹۰۰۔

(شیخ عباس اللہ)

دیندبان: فارسی ”دیندبان“ کا معرب، ایک اصطلاحی لفظ جو مختلف زمانوں میں بعض انواع کے پھرے داروں، چوکیداروں اور ناظروں وغیرہ کے لیے

[(۱۳) شاء ولی اللہ: حجة الله البالغة، مبحث المظالم، ۲: ۱۵۱ تا ۱۵۸: ۱۳۵۵ھ (اردو ترجمہ، ج ۲، مظالم کا بیان)]۔

(E. Tyan)

⑧ دی تریسی: فریڈریش دی تریسی (Friedrich Dietrich)، تیسویں صدی کا ایک ممتاز جرمن مستشرق ہے، جس نے عربی ادب اور مسلمانوں کے فلسفے کو اپنا خاص موضوع بنایا اور اس سلسلے میں قابل قدر خدمات سر انجام دیں۔ دی تریسی ۱۸۲۱ء میں برلن میں پیدا ہوا اور برلن یونیورسٹی ہی میں اس نے تحصیل علم کی۔ برلن کے علاوہ اس نے لایپزگ اور ہالہ Halle کی دانشگاہوں کے اساتذہ سے بھی اکتساب فیض کیا۔ اس نے مشرقی ممالکوں یعنی مصر، شام اور فلسطین کا بھی سفر کیا اور وہاں کے علما سے بھی استفادہ کیا۔ دی تریسی ۱۸۵۰ء میں برلن یونیورسٹی میں عربی کا پروفیسر مقرر ہوا اور عمر بھر اسی دانشگاہ سے وابستہ رہا۔

عربی ادب کے سلسلے میں دی تریسی نے عربوں کے مشہور شاعر *أبو العباس* کو اپنا موضوع سخن بنایا اور اس کے محاسن کلام سے بحث کی، اور اس ضمن میں اس کے دیوان کو واحدی کی شرح کے ساتھ دو ضخیم جلدوں میں شائع کیا۔ علاوہ ازیں *التعالی* کے ”رسالة فیما جرى بین المتنبی وسیف الدولة“ کو بھی طبع کیا اور اس طریق سے عربوں کے اس مایہ ناز اور مقبول شاعر کو اہل یورپ سے روشناس کرایا۔

یورپ میں دی تریسی سے پہلے مونک Munk اور رنان Renan وغیرہ مستشرقین مسلم فلاسفہ کے متعلق مستقل کتابیں تصنیف کر چکے تھے۔ دی تریسی نے ان روایات کو قائم رکھتے ہوئے مسلمانوں کے فلسفے کی تحقیق میں خاص نام پیدا کیا اور اس ضمن میں سب سے پہلے رسائل *أخوان الصفاء* پر توجہ کی، جو چوتھی صدی ہجری میں مرتب ہوئے تھے

ذیرا (ذیران) بھی رکھے جاتے تھے۔ راہب جنہیں "ذیرا یا ذیرانی" کہتے تھے ان دیروں میں رہتے تھے (جنہیں عراق میں "عمر" بھی کہتے تھے، جس کی اصل کا صحیح عام نہیں)۔ خانقاہیں اکثر و بیشتر میدے سادے حجروں سے زیادہ مختلف نہ ہوتی تھیں خصوصاً اگر وہ زیادہ دور دراز علاقوں میں واقع ہوتی، تاہم وہ عموماً کئی عمارتوں پر مشتمل ہوتی تھیں۔ ایک گرجا (کنیسیہ یا یسوع) رہنے کے حجرے (قائے، جمع قلاتی، یا کُورج، جمع انکراج اور آکیرج)۔ یہ سریانی زبان کے الفاظ ہیں، اگرچہ دوسرا صحیح معنوں میں عراقی ہے) اور بیرونی عمارتیں، مثلاً دکانیں اور مراہیں۔ ذیر فی الحقیقت زراعت کو فروغ دینے کا بھی مرکز بن گیا تھا اسے ان اراضی سے ماادہ حاصل ہوتا تھا جو اس کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کاشت کی جاتی تھیں (قاکستان، زیتون کے باغ اور بخلسان)۔ حجروں اور خانقاہوں کو حفاظتی دیواروں کے ذریعے، یا محفوظ مقام انتخاب کر کے انہیں قابل دفاع بنایا جاتا تھا (مثلاً انہیں پہاڑوں کے پہلو پر بلکہ گھاٹیوں کے اندر بنایا جاتا تھا اور اس طرح وہ داخلے کے عام ذرائع سے بالکل الگ کر دیے جاتے تھے)۔

عیسائی خانقاہیں اسلام کے ابتدائی ایام میں مذہبی اور دماغی مشاغل کا مرکز ہوتی تھیں مثلاً تیسری۔ چوتھی صدی ہجری / نویں۔ دسویں صدی عیسوی میں نسٹوری کلیسا میں عبادت کے جو قواعد رائج ہوئے انہیں موصل کے "ذیر الاعلیٰ" میں مرتب کیا گیا تھا (دیکھیے *Mussoul chrétienne* : J. M. Picy بیروت ۱۹۵۹ء، ص ۱۲۳ تا ۱۳۲)۔ قدیم یونانی کتابوں کی اشاعت میں بھی ان خانقاہوں نے بڑا معقول حصہ لیا۔ یہ کتابیں عام طور پر سریانی میں اور وہاں سے عربی میں ترجمہ کی گئیں۔ بعض صورتوں میں ان خانقاہوں میں بڑے بڑے کتاب خانے قائم کیے گئے، جن میں سے کوہ سینا پر سینٹ کیتھرائن کی خانقاہ کا ذخیرہ کتب

مستعمل تھا۔ رسائل اخوان الصفا میں یہ لفظ پہلے ہی ایک پیشے کے نام کے طور پر نظر آتا ہے (رسالہ ۸، سالہ اول، طبع قاہرہ ۱۹۲۱ء؛ نیز دیکھیے IC ۱۹۳۳ء، ص ۷۴) اور اس کے ساتھ "فناطور" بھی مذکور ہے۔ ترکان عثمانی کی معیاری اصطلاح میں یہ لفظ، جس کا تلفظ ان کے ہاں "دیدیہ بان" تھا، جنگی خانے کے محافظوں کے لیے مخصوص تھا جن کا سردار "دیدیہ بان باشی" کہلاتا تھا۔ استانبول کے برجہائے آتش کے چوکیداروں کو بھی یہی نام دیا جاتا تھا اور اسی طرح بحری اور فوجی دنکھ ہمال کی چوکیوں کو بھی۔

مآخذ : (۱) *Supplément : Dozy*، ۱ : ۳۸۱

(۲) اسمعیل حق اوزون چارشیلی : *Osmanli Devleti*

teşkilâtından Kapikulu Ocakları، انقرہ ۱۹۳۳ء

ج ۱، ص ۳۹۳ : (۳) *M. Z. Pakulia*، ۱ : ۵۵۔

(ادارہ وژ لائن)۔

⑤ ذیر : رک بہ دوو۔

* ذیر : سریانی الاصل لفظ، ان عیسائی خانقاہوں پر دلالت کرتا ہے جو مشرق وسطیٰ میں عربوں کی فتح کے بعد بھی کام کرتی رہیں۔ اگر ہم عرب محققین کی مرقب کردہ فہرستوں پر یقین کریں تو ان خانقاہوں کی تعداد بہت زیادہ تھی، بالخصوص زبیری عراق (دجلہ اور فرات کی وادیوں کے ساتھ ساتھ) بالائی عراق، شام (اگرچہ شہروں کے قریب و جوار میں "منارہ نشین" Stylite راہبوں کی درگاہیں)، فلسطین اور مصر میں (وادی نیل کے ساتھ ساتھ)۔ ان کے نام اکثر مرہی راہبوں کے نام پر (: تکریت کے نزدیک ذیر مار یوحنا، شمالی شام میں ذیر سمعان)، یا اپنے بنائے والوں کے نام پر (عراق میں ذیر عبدون) رکھے جاتے تھے، لیکن گاہے گاہے قریب ترین شہر یا دیہات (: شام میں ذیر الرصافہ) یا مقامی علاقے کی خصوصیت کی بنا پر (: موصل کے قریب ذیر الاعلیٰ، بالائی عراق میں

دبر اب خائے بھی مانع ہوئے تھے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ زندانہ اور عذبیہ شاعری میں خائناہوں کا ذکر کیوں آتا ہے اور کیوں ان کے بعض مکینوں کے قابل اعتراض کردار کے متعلق طبعی طبع کے قصے مشہور ہیں۔ تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی اور چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی کے عرب مصنفوں نے ایسی نظموں اور کہانیوں کو جمع کر کے جن میں ان کا ذکر آتا ہے، ان کے متعلق پوری کی پوری کتابیں لکھ ڈالی تھیں۔ اگرچہ ان میں سے اب بعض الشائبہ (م ۸۸۸/۸۹۸ء) کی کتاب البیانات ہی موجود ہے، تاہم یہیں کئی دوسری کتابوں کے نام معلوم ہیں جنہیں هشام الکلبی، ابوالفرج الاصفہانی، شاعر السری الرقاء اور دو بھائیوں الخاندیان اور السیستانی نے لکھا تھا۔

عرب فتح کے بعد خائناہوں اور گرجاؤں در قضا کی لکائی ہوئی شرطیں عائد کر دی گئیں۔ اگرچہ جو خائناہیں موجود تھیں انہیں جوں کا توں رہنے دیا گیا، لیکن راہبوں کو نئی عمارات بنانے کی، بلکہ فرسودگی یا کسی حادثے کے باعث جو نقصان پہنچا ہو اس کی مرمت کی بھی ممانعت کر دی گئی، مگر حقیقت یہ ہے کہ خائناہوں کی حالت و انت کے ساتھ بدلتی رہتی تھی اور مذہبی رواداری کے بعد جبر و تشدد کے دور بھی آتے رہتے تھے۔ خائناہوں کے مکینوں پر عائد ہونے والے محاصل مستقل بحث و تمحیص کا موضوع ہوتے تھے۔ راہب، ابتدا میں جزیے سے مستثنیٰ تھے اور قضا بعد میں اس، متواتر عمل کی اکثر توثیق کرتے رہے، لیکن بعض کے نزدیک یہ استثنا فقط مفادک الحال راہبوں کے لیے جائز تھی اور شوائع کی رائے میں تو یہ معافی قطعاً ناجائز تھی۔ تاریخوں سے پتا چلتا ہے کہ عہد بنو امیہ میں بعض والیوں نے مصری خائناہوں میں راہبوں پر شخصی محمول عائد کر دیا تھا اور عباسی عہد میں بعض والی صرف خاص حالات میں معافی کی منظوری

قابل ذکر ہے (دیکھئے The Arabic : A. S. Aliya manuscripts of Mount Sinai) ۱۹۵۵ء)۔ مزید برآں، بعض عراقی خائناہیں اور ان سے وابستہ عسائی فرقے عباسی عہد میں سرکاری محذروں کی فراہمی کا ایک اہم ذریعہ ثابت ہوئے۔ وہ سلطنت کے نظم و نسق میں حصہ لیتے تھے اور اسلام قبول کرنے کے بعد منصب وزارت تک کے مستحق ہو جاتے تھے زرک بہ دیر قنأ۔ اسلامی دنیا کی سیاسی اور معاشرتی زندگی میں بھی ان خائناہوں کی خاصی اہمیت رہی۔ ان میں بلا امتیاز مذہب کم و بیش سب مسافروں کو، جن میں ممتاز شخصیتیں بھی شامل ہوتی تھیں، آئے کی اجازت تھی اور بلا شبہ وہ اکثر کسی دوسری جگہ سے زیادہ محفوظ پڑاؤ، مہیا کرتی تھیں، مثلاً دمشق کے قریب دبر، ران، ارک، بان کے مقام پر ایک شاہی اقامت ڈھ تھی (جسے بعض مصنفین نے غلطی سے خائناہ بیان کیا ہے)۔ بعض اوقات بادشاہ یا حکم کو خاص ”دبر“ کے اندر ٹھہرنے کی جگہ دی جاتی تھی۔ یہی صورت، وصل کے دبر الاعلیٰ، الرقہ کے دبر الرقی یا الانبار کی خائناہ کی تھی، جہاں ہارون الرشید اور اس کے خدم و حشم نے ۸۷۸ء/۸۷۳ء میں قیام کیا تھا۔ یہی جگہ تھی جہاں جعفر البرمکی کو قتل کیا گیا (الطبری، ۳: ۶۷۵ تا ۶۷۸) فاطمی خلیفہ المعز نے مصر پہنچ کر چند ماہ الحجڑہ کی خائناہ میں قیام کیا تھا۔ ایسے بہت سے تحریری شواہد موجود ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حکمران اور شہزادے سیر و شکار کے دوران میں مقامی خائناہوں میں جاتے جہاں راہب کھائے پینے کی چیزوں سے ان کی تواضع کرتے تھے۔ ہر خائناہ میں کوئی نہ کوئی سالانہ مذہبی تیوہار منایا جاتا تھا اور ان عمارات کے آس پاس عموماً کھیل تھائے بلکہ بدکاری کے اڈے ہوتے تھے۔ خصوصاً جب وہ کسی بڑے شہر کے قریب واقع ہوتیں۔ علاوہ ازیں ان کے ساتھ عام طور پر

علاقے کی فنکارانہ زندگی میں حصہ لیا، چنانچہ بعض خانقاہوں میں مستعمل آرمینیائی کا اس عہد کے اسلامی فن پاروں سے تقابل بڑا معلومات افزا ثابت ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں مصر میں وادی النطرون کے مقام پر ڈیرا السریانی (جہاں چوڑے گچ کے نقش و نگار میں سامرا کے اسلوب کے اثرات نمایاں ہیں) اور موصل کے قریب خانقاہ مار بہنام (جس کے بعض حصے قدامت میں چھٹی صدی ہجری / بارہویں صدی عیسوی تک جاتے ہیں) خصوصیت سے دلچسپ ہیں۔ مزید برآں خانقاہوں میں نقل شدہ بعض مخطوطوں کی طلاکاری قدیم ترین اسلامی مرقعوں سے مشابہت رکھتی ہے اور ایسا معام ہوتا ہے کہ ان مخطوطوں نے اسے اسلوب اور فن کی بعض خصوصیات وہیں سے ورثے میں پائی تھیں۔

- مآخذ: (۱) حسن زویات: الدیارات النصرانیة فی الاسلام، در مشرق، ۱۹۳۸ء، ص ۲۱۹ تا ۲۱۷؛ (۲) Le statut légal des non-Musulmans: A. Fattal بیروت ۱۹۵۸ء، ص ۱۷۳ تا ۱۷۰، ۱۷۳ تا ۱۷۰؛ (۳) الشاہین: کتاب الدیارات، طبع کور کیس عواد، بغداد ۱۹۵۱ء؛ (۴) البکری: المعجم، طبع و شیفٹ، ۱: ۲۵۹ تا ۳۸۱؛ (۵) یاقوت، ۲: ۶۳۹ تا ۷۱۰، ۳: ۷۱۵ تا ۷۲۶؛ (۶) العمری: المسالک، مطبوعہ قاہرہ، ۱: ۲۵۳ تا ۳۸۶؛ (۷) Textes géographiques arabes: A. S. Marmardji sur la Palestine، بیروت ۱۹۵۱ء، ص ۷۲ تا ۷۹؛ (۸) المغربی: الخطط، طبع بولاق، ۲: ۵۰۱ تا ۵۰۹، و طبع قاہرہ، ۳: ۵۰۹ تا ۵۳۷؛ (۹) The churches and monasteries of Egypt، جسے ابو حلیج ارمینی سے منسوب کیا جاتا ہے، ترجمہ از Evetts-Butler، اوکسفرڈ ۱۸۹۵ء؛ (۱۰) The chronography of: E. A. Wallis Budge (Gregory Abū 'l-Faradj (Bar Hebraeus) لندن ۱۹۳۲ء؛ مقدمہ: (۱۱) Le Couvent de Barsauna et le patriarcat jacobite d' Antioche et de Syrie، لیون ۱۹۵۵ء؛ (۱۲) N. Abbott

دیتے تھے۔ المتقدّر کی خلافت میں یہ سوال پھر اٹھایا گیا جب ۳۱۳/۶۹۲ء میں مصر میں محصولات کے ناظر اعلیٰ علی بن عسّی نے مطالبہ کیا کہ وادی النطرون کے راعیوں کو جو محصولات کی معافی دی گئی تھی اسے منسوخ کر دیا جائے۔ خلیفہ نے اس کی درخواست کو منظور نہ کیا۔ ۳۶۶/۹۷۶ء میں الطائع نے ایک بار پھر اعلان کیا کہ جزیرے کا اطلاق عرب راعیوں پر نہ کیا جائے (دیکھئے ذمہ)۔

پانچویں صدی ہجری / گیارہویں صدی عیسوی عیسائی خانقاہوں کے لیے روز افزوں تکلیف کے آغاز کا زمانہ تھا۔ انہیں بے دریغ ساجوق اور مغول حملوں، بڑھتی ہوئی بدامنی (مثلاً بالائی عراق میں ترکمانی حملے)، صابی جنگوں کے وقت مسلمانوں کے ساتھ تمکلات کی خرابی اور جھوٹی عیسائی بستیوں کی روز افزوں معدومی سے سابقہ پڑا۔

عراق میں بغداد اور سامرا کے قریب جو خانقاہیں تھیں وہ تباہ ہو گئیں اور جو مصر میں تھیں ان میں سے بیشتر کو خالی چھوڑ دیا گیا اور وہ ریت میں دب گئیں (ان میں سے بعض حالیہ کھدائیوں میں ظاہر ہوئی ہیں)۔ مغول حملے کے بعد سے عیسائی خانقاہی زندگی صرف چند ایک خانقاہوں تک محدود ہو کر رہ گئی، جو زیادہ تر بالائی عراق، الموصل اور علاقہ ساردین میں (طور عبّیدین کی خانقاہیں)، صحرائے سینا اور مصر میں (وادی النطرون کے کنارے اور بحیرہ احمر کے قریب)۔ فلسطین اور شام میں، جو عرب فتح سے پہلے خانقاہوں کے بڑے مرکز تھے، فقط چند ایک منتشر خانقاہیں ہی باقی رہ گئیں اور وہ بھی زیادہ تر یروشلم اور جبال لبنان کے علاقے میں۔ اس کے برعکس خود لبنان میں خانقاہی نظام کو ایک نئی زندگی ملی، خصوصاً پندرہویں صدی میں جب ہماڑوں میں واقع قنوبین کی خانقاہ مارونی بطریق کا صدر مقام مقرر ہو گئی۔

عیسائی خانقاہوں نے اپنے عہد فروغ میں اپنے

سوات، دیر اور چترال کی ریاستیں پاکستان میں مدغم کر کے ان پر مشتمل مالا کنڈ ڈویژن تشکیل کی گئی، جو شمال مغربی سرحدی صوبے کا حصہ ہے۔

دیر کا آخری نواب، سلطان محمد شاہ خسرو اخوند خیل کا فرد تھا، جو یوسف زئی کے ہائندہ خیل کی ایک ذیلی شاخ ہے۔ دیگر ہمسایہ ریاستوں، سوات، امب اور چترال کے بانیوں کی طرح دیر کے حکمران خاندان کے بانی ملا الیاس الملقب بہ اخوند بابا نے گیارہویں صدی ہجری / سترہویں صدی عیسوی میں

فروغ پایا۔ مگر کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے اس کے پوتے غلام بابا نے مذہبی مقتدا کی زندگی ترک کر کے دنیوی اقتدار اختیار کیا۔ اس کا بیوتا غزن خان بن قاسم خان بن ناصر خان تھا، جو ۱۸۶۳ء میں اپنی دس ہزار فوج کے ساتھ امپیرلک مہم میں قبائلی لشکروں کے ساتھ شریک ہو گیا۔ یہ مہم برطانوی ہندوستانی فوج سید احمد بریلوی کے مجاہدین اور ان کے حلیوں کے خلاف لائی تھی۔ جب غزن خان نے دیکھا کہ لڑائی کا پلہ حملہ آور (انگریزوں) کے حق میں جھوک رہا ہے تو وہ اپنا لشکر لے کر واپس چلا گیا۔ اس کے بعد اس کا لڑکا رحمت اللہ خان جانشین ہوا۔ اُسے اپنے استحقاق کی کمزوری کا علم تھا، لہذا اس نے مہاراجا کشمیر کی مالی امداد سے ریاست حاصل کی۔ ۱۸۷۵ء میں رحمت اللہ نے کشمیر کے ایجنٹ (برطانوی قائم مقام) سے ناراض ہو کر مہاراجا سے اپنے تعلقات منقطع کر لیے اور اس کی سیادت سے نکل گیا۔ ۱۸۸۴ء میں اس کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا محمد شریف تخت نشین ہوا اور جلد ہی اس نے اپنی ہمسایہ ریاست چترال [رگ بان] کے خلاف لڑائیوں اور چڑھائیوں کا سلسلہ شروع کر دیا، مگر محمد شریف خان کی فوجوں کو شکست فاش ہوئی اور چترال کے مہتر اسان الملک کا دیر میں بڑا عمل دخل ہو گیا۔ محمد شریف خان کو سوات [رگ بان] میں بناء لینا پڑی،

The monasteries of the Fayyum در *ASL* ۵۳ (۱۹۳۷ء) : ۱۳ تا ۳۳، ۷۳ تا ۱۵۹
The monasteries : H. C. Evelyn White (۱۳) : ۱۷۹
of the Wadi el Natrun جلدیں، نیویارک، ۱۹۲۶ء تا
the Gipsornamente des : S. Flury (۱۴) : ۱۹۳۳
Dér es-Sūrjāni در *Isl* : ۴ (۱۹۱۰ء) : ۷۱ تا ۸۷
Archaeologische : E. Herzfeld و F. Saure (۱۵)
Reise im Euphrat und Tigris Gebiete برلن
Moines et : J. Leroy (۱۶) : ۲۴۷ : ۲ : ۱۹۱۱ء
monastères du Proche-Orient پیرس ۱۹۵۸ء : (۱۷)
Les manuscrits syriaques à peintures : مصنف
conservés dans les bibliothèques d'Europe et du
Proche-Orient جلد شائع ہونے والی ہے۔

(D. Soudrel)

* دیر : ایک نوابی ریاست، جس کا الحاق ۱۹۴۷ء میں پاکستان سے ہوا۔ اس کا رقبہ ۲۰۴۰ مربع میل ہے اور اس کی آبادی ۱۹۵۱ء میں ۱,۳۸,۶۳۸ تھی۔ یہ چترال [رگ بان] کے جنوب میں ۳۵ درجہ ۵۰ ثانیے اور ۳۴ درجہ ۲۲ ثانیے عرض بلد شمالی اور ۷۱ درجہ ۲ ثانیے اور ۷۲ درجہ ۳ ثانیے طول بلد مشرق کے درمیان واقع ہے۔ اس کا نام والی ریاست کے صدر مقام موضع دیر سے موسوم ہے اور یہ موضع اسی نام کی ایک ندی کے کنارے واقع ہے، جو دریائے پنج گوڑا کی معاون ہے۔ سیاسی لحاظ سے ریاست دیر کم و بیش اس علاقے پر مشتمل ہے جسے پنج گوڑا اور اس کی معاون ندیاں سیراب کرتی ہیں۔ اس ریاست کو انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں ”مجاہدین“ کے ساتھ دشمنی کی وجہ سے شہرت حاصل ہوئی۔ یہ مجاہدین سید احمد بریلوی [رگ بان] کی شکست خوردہ فوج کے باقی ماندہ لوگ تھے، جن کا صدر مقام پہلے آسمٹ (سمٹہ) میں اور بعد ازاں باغستان میں چمکنڈ تھا۔

[۱۹۶۹ء میں عوامی مطالبات کے پیش نظر

جس کے ساتھ اس کی ریاست کم و بیش ہمیشہ زیر سرِ بیکر رہی تھی۔ اس نے امان الہلک سے اپنا علاقہ واپس لینے کی کئی بار کوشش کی، مگر ناکام رہا۔ ۱۸۹۰ء میں اسے -جنڈول کے ممالک آزما سردار عمرا خان نے فتح کر لیا تھا۔ واپس آنے والے سال بعد ۱۳۱۳ھ/۱۸۹۵ء میں محمد شریف خان بونالوی فوجوں کی اخلاق اور مادی مدد سے دیر کو واپس لینے بلکہ چترال کے تخت کے مدعی شیر افضل کو گرفتار کرنے میں بھی کامیاب ہو گیا۔

۱۸۹۶ء میں محمد شریف خان کو لوٹ کا اسے عطا کیا گیا اور اسی سال اس نے اپنے خاندان کی دیرینہ دشمن ریاست سوات کے بالائی علاقے کے ایک حصے کو اپنی ریاست سے ملحق کر لیا۔ نوابی کا خطاب اسے ۱۹۰۰ء انگریزوں کی خیر خواہانہ خدمات کے صلے کے طور پر عطا ہوا تھا، کیونکہ اس نے دیر کے قبائل کو اس جہاد میں حصہ لینے سے باز رکھا جسے ملا سعد اللہ خان پٹری عرف ”سرتور“ (یعنی سر پتورا) نے بیرونی حکومت کے خلاف شروع کیا تھا۔ محمد شریف خان بونالوی حکومت کا بہت بڑا حلیف رہا۔ اسے چھبیس ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ ملتا تھا۔ ۱۹۰۳ء میں اس کی وفات پر اس کا بیٹا اورنگ زیب خان (بادشاہ خان) اس کا جانشین ہوا۔ جلد ہی اس کا اپنے چھوٹے بھائی میان گل خان سے جھگڑا ہو گیا، جس نے دیر کی آبادی میں نواب کے مخالف گروہوں سے اتحاد کر کے اپنے بڑے بھائی کے خلاف پیش قدمی کر دی اور حمادی الاوی ۱۳۲۳ھ/جون ۱۹۰۵ء میں دیر کے دو قلعوں پر قبضہ کر لیا۔ شمال مغربی سرحدی صوبے کے برطانوی چیف کمشنر کی کوششوں سے ان میں صلح ہو گئی، مگر وہ چند روزہ ثابت ہوئی اور دونوں بھائیوں کے درمیان ۱۹۱۱-۱۹۱۲ء میں بھر پور لڑائی چھڑ گئی۔ اس خانہ جنگی کا زمانہ ۱۹۱۳ء میں جنڈول کے مقام پر میان گل کی وفات کے ساتھ ختم ہوا۔

۱۹۱۷ء میں جب کہ پہلی عالم گیر جنگ

جس کے ساتھ اس کی ریاست کم و بیش ہمیشہ زیر سرِ بیکر رہی تھی۔ اس نے امان الہلک سے اپنا علاقہ واپس لینے کی کئی بار کوشش کی، مگر ناکام رہا۔ ۱۸۹۰ء میں اسے -جنڈول کے ممالک آزما سردار عمرا خان نے فتح کر لیا تھا۔ واپس آنے والے سال بعد ۱۳۱۳ھ/۱۸۹۵ء میں محمد شریف خان بونالوی فوجوں کی اخلاق اور مادی مدد سے دیر کو واپس لینے بلکہ چترال کے تخت کے مدعی شیر افضل کو گرفتار کرنے میں بھی کامیاب ہو گیا۔

۱۸۹۶ء میں محمد شریف خان کو لوٹ کا اسے عطا کیا گیا اور اسی سال اس نے اپنے خاندان کی دیرینہ دشمن ریاست سوات کے بالائی علاقے کے ایک حصے کو اپنی ریاست سے ملحق کر لیا۔ نوابی کا خطاب اسے ۱۹۰۰ء انگریزوں کی خیر خواہانہ خدمات کے صلے کے طور پر عطا ہوا تھا، کیونکہ اس نے دیر کے قبائل کو اس جہاد میں حصہ لینے سے باز رکھا جسے ملا سعد اللہ خان پٹری عرف ”سرتور“ (یعنی سر پتورا) نے بیرونی حکومت کے خلاف شروع کیا تھا۔ محمد شریف خان بونالوی حکومت کا بہت بڑا حلیف رہا۔ اسے چھبیس ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ ملتا تھا۔ ۱۹۰۳ء میں اس کی وفات پر اس کا بیٹا اورنگ زیب خان (بادشاہ خان) اس کا جانشین ہوا۔ جلد ہی اس کا اپنے چھوٹے بھائی میان گل خان سے جھگڑا ہو گیا، جس نے دیر کی آبادی میں نواب کے مخالف گروہوں سے اتحاد کر کے اپنے بڑے بھائی کے خلاف پیش قدمی کر دی اور حمادی الاوی ۱۳۲۳ھ/جون ۱۹۰۵ء میں دیر کے دو قلعوں پر قبضہ کر لیا۔ شمال مغربی سرحدی صوبے کے برطانوی چیف کمشنر کی کوششوں سے ان میں صلح ہو گئی، مگر وہ چند روزہ ثابت ہوئی اور دونوں بھائیوں کے درمیان ۱۹۱۱-۱۹۱۲ء میں بھر پور لڑائی چھڑ گئی۔ اس خانہ جنگی کا زمانہ ۱۹۱۳ء میں جنڈول کے مقام پر میان گل کی وفات کے ساتھ ختم ہوا۔

۱۹۱۷ء میں جب کہ پہلی عالم گیر جنگ

جب حمید بن قحطبه جنوب کی طرف کربلا۔ دیر الأعور۔ عباسیہ کے راستے بڑھا (الطبری، ۳: ۱۵) نیز اس وقت جب الحسن بن قحطبه نے بھی یہی راستہ اختیار کیا تھا (الطبری، ۳: ۱۸) اور آخر میں جب معبد اور ابوالبط قصبہ لیل سے چڑھائی کر کے دیر الأعور سے گذرے تا کہ حرثہ کی فوجوں کو روکیں جو نہر سری کے کنارے شاہی نامی گاؤں میں ڈیرے ڈالے پڑی تھیں۔

ان متون سے ظاہر ہوتا ہے کہ دیر الأعور کی جائے وقوع ارم کے مغرب اور نجف کے شرق میں ہے نیز کربلا سری اور شاہی کے جنوب اور عباسیہ اور نیل کے شمال میں ہے۔ ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تیسری صدی ہجری/اولیٰ صدی عیسوی تک لوگ اسے جانتے تھے۔

کوفی باغی عبید اللہ بن الحر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ مضعب کے زمانے میں عمر بن عبید اللہ کے ہاتھوں شکست کھا کر دیر الأعور کی جانب پسیا ہوا تھا (الطبری، ۲: ۷۷۵؛ ابن الاثیر، ۳: ۲۴۱)۔

مآخذ: در متن۔

(SALEH A. EL. ALI)

دیر الجاثلیق: یہ نام عراق میں دو خاقانوں کو دیا گیا ہے۔ پہلی مسکن کے ضلع (طسوج) میں واقع ہے جس کی آبپاشی نہر دجلہ سے ہوتی ہے۔ یہ نہر سامرے کے جنوب میں دریائے دجلہ کے مغربی کنارے سے نکلتی ہے اور جنوب کی طرف تقریباً اسی خط پر بہتی ہے جس پر جدید دجلہ یہاں تک کہ وہ بغداد کے قریب پہنچ جاتی ہے مسکن کا محل وقوع بغداد کے شمال میں تقریباً نو دس فرسنگ (۵۰ تا ۵۵ کیلو میٹر) کے فاصلے پر متعین کیا جاسکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے آثار ہی اب اپنے قدیم نام سے موسوم اور "خرائب مسکن" (یعنی مسکن کے کھنڈر) کہلاتے ہیں۔ وہ جدید دجلہ کے مغربی

محمد شاہ خسرو ہوا جسے ۹ نومبر ۱۹۶۰ء کو مالاکنڈ ایجنسی میں جگنڑہ کے مقام پر باغابطہ دیر کا نواب بنایا گیا۔

مآخذ: (۱) C. U. Aitchison: *Treaties*,

Engagements and Sanads... دہلی ۱۹۲۳ء، ۱۱:

۱۱۷ تا ۱۳۶: (۲) غلام رسول مہر: سرگذشت سجادین،

لاہور ۱۹۵۶ء ص ۳۴۸، ۳۵۹، ۳۶۵، ۳۶۸، ۳۸۹،

۵۳: (۳) *Imperial Gazetteer of India* (۴) اوکسفرڈ

۱۹۱۸ء ص ۲۶۰ تا ۲۶۱: (۵) *The Indian Musul-*

mans کلکتہ ۱۹۵۵ء ص ۱۹: (۶) *Memoranda on the*

Indian States دہلی ۱۹۱۴ء ص ۲۱۰ تا ۲۱۵: (۷)

نیز دیکھیے مقالہ سوات۔

(بزی انصاری)

* دیر الأعور: عراق میں ایک مقام، جو قبیلہ ایادی شاخ امیہ بن حذافہ کے ایک فرد کے نام پر موسوم ہے (البلاذری: فتوح، ص ۲۸۳: ابن الفقیہ الہمدانی: بلدان، ص ۱۸۲: باقوت، ۲: ۶۴۴)۔ اس لیے یہ ایک ایادی دیر ہے (ابن الفقیہ الہمدانی، ص ۱۳۵: بحوالہ الہشتم بن عدی: آبشیری، ص ۶۹: بحوالہ ابن شبہ)۔ الہمدانی کا اسے دیر الجہاجم سمجھنا (محل مذکور) غالباً غلطی ہے، کیونکہ اس کی تائید کسی دوسرے مآخذ سے نہیں ہوتی۔

دیر الأعور کا ذکر سامانی سپہ سالار رستم کے پیش قدمی کے بیان میں ملتا ہے جو اس نے مدائن (Ctesiphon) سے قادیسہ تک براہ گونا برس (قدیم Bursippa)۔ سلطا، نجف کی تھی جہاں وہ خبیہ زن ہوا تھا (الطبری، ۱: ۲۲۵۴)۔ اس دیر کا ذکر اس وقت بھی ملتا ہے جب سلیمان بن صرد نے افساس مالک اور کربلا کی طرف کوچ کرنے سے پہلے توابعین کی سمیت میں کوفہ چھوڑا اور اسی مقام کو اپنے متبعین کے جمع ہونے کے لیے منتخب کیا (الطبری، ۲: ۵۴۸: البلاذری: انساب، ۵: ۲۰۹)۔ پھر اس وقت

ابو یوسف : کتاب الخراج، ص ۵۷ : ابن الاثیر، ص : ۳۷۶ بعد .

مآخذ : در مقالہ .

(SALEH A. EL-ALI)

دیر الزور : شام کا ایک چھوٹا سا شہر، جو

سطح بحر سے ۱۹۵ میٹر بلند اور دریائے فرات سے دائیں کنارے پر ہے، جس پر ۵۵ میٹر لمبا معلق (Suspension) پل، جو ۱۹۳۱ء میں مکمل ہوا تھا، شہر سے کچھ آگے بنا ہوا ہے۔ ۱۸۶۷ء میں یہ ایک "سنجاق" اور بعد میں ایک "محافظہ" کا صدر مقام بن گیا۔ یہ شہر آج کل دور جدید کی بھی جھلک رکھتا ہے۔ اس کے بائیس ہزار باشندوں میں اکثریت سنی مسلمانوں کی ہے اور مختصر سی عیسائی اقلیت سابق ترکی مقبوضات سے آئے ہوئے ارمنی مہاجرین پر مشتمل ہے۔ اس میں تین مسجدیں اور کئی مشرق کلیسا اور رومن کیتھولک گرجے ہیں۔ یہ ایک اہم فوجی مرکز اور حلب و دمشق سے ہستے (Hasatché) موصول اور بغداد جانے والی سڑک پر ایک منزل ہے۔ اس طرح یہ آج کل وہ کردار ادا کرتا ہے جو قرون وسطیٰ میں رجبہ مالک اور قریبہ کیا کرتے تھے۔

یہ غالباً قدیم شہر اوزرہ Auzara کی جگہ بنا تھا اور "اوزرہ" ہی کی بدلی ہوئی ترتیب حروف سے دیر الزور کا نام نکلا ہے۔ اس کے معنی اب "درختوں کے جھنڈ میں بنی ہوئی خانقاہ" کے بتائے جاتے ہیں۔ ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ اسی دیر الزور کے بالکل متصل دیر الرمان واقع تھا، جسے یاقوت (۲ : ۶۶۲) نے الرقہ اور خابور کے درمیان بتایا ہے۔

مآخذ : (۱) La Turquie d'Asie : V. Cuinet

(۲) A. Musil : ۱۸۹۰ء : ۲۷۵ بعد : (۲) A. Musil

The Middle Euphrates، نیویارک ۱۹۲۷ء، ص ۱ تا ۳،

Topographie historique : R. Dussaud (۲) : ۱۵۰

ان متونوں کی مدفون کھودایوں پر رکھا گیا تھا جو ایاد بہرا (الشرق : فتوح، ص ۲۸۳ : ابن الفقیہ الہمدانی : البلدان، ص ۱۸۲) یا ایاد اور ساسانیوں کے درمیان لڑائی میں مارے گئے تھے (ابن الکلبی : الفتوح، ص ۲۸۳ : ابن شیبہ درالبکری، ص ۷۰ : المسعودی : التنبیہ، ص ۱۷۵) : یاقوت (۲ : ۶۵۲) کہتا ہے کہ اس کا نام ایک کنوئیں سے ماخوذ ہے جو شور زمین میں تھا۔

دیر الجماجم فرات کے مغرب میں (البکری، ص ۷۰ : ۵۷۳ بحوالہ ابن شیبہ) کوئے کی سطح مرتفع پر (الاصفہانی درالبکری، ص ۵۷۳ : یاقوت، ۲ : ۶۵۲) عین النضر اور فلوچہ کے قریب (الطبری، ۲ : ۱۰۷۳) کوئے سے تقریباً سات فرسنگ پر واقع ہے۔

جماجم کی لڑائی (۵۸۳/۷۰۲ء) کی تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیر کوئے اور فرات سے نسبتاً زیادہ قریب دیر قرہ (رگ باں) کے نزدیک (الاصفہانی درالبکری، ص ۵۹۲ : یاقوت، ۲ : ۶۸۵) جنوب مشرق میں ہے۔

تاریخ اسلام میں دیر الجماجم، الحجاج اور ابو عبد الرحمن بن الأشعث کے درمیان ۵۸۳/۷۰۲ء کی جنگ کے میدان کے طور پر معروف ہے (دیکھئے ابن الأشعث)۔ مؤخر الذکر کی حمایت بیشتر عرب کوئیوں اور بعض غیر عرب موالیوں نے کی تھی۔ جب طویل گفت و شنید ناکام ہو گئی تو الحجاج نے، جسے شامی عربوں کی کمک پہنچ گئی تھی، ابن الأشعث کو شکست دی، جو مسکن کی طرف ہسپا ہو گیا اور الحجاج کا کوئے سے متعلق کوئی حریف نہ رہا۔ اسے موقع مل گیا کہ اپنے مخالفوں کے خلاف سخت اقدامات کر کے شہر پر پورا اقتدار جمائے۔ اس لڑائی کے لیے دیکھئے الطبری، ۲ : ۱۰۷۰ بعد : الیعقوبی، ص ۳۳۲ : المسعودی : التنبیہ، ص ۳۱۵ اور مروج، ص ۳ : ابن قتیبہ : المعارف، ص ۱۵۶

de la Syrie (1904-1909) ص ۱۵۶ تا ۱۵۸

"Histoire des H'andânides" M. Canard (۴)

الجزائر ۱۹۵۱ء: ۹۵

(D. SORDEL)

* دیر سَمْعَان : شام میں کئی مقامات کا نام، جسے ماضی و حال کے اہل قلم اکثر خاطر ملاحظہ کرتے ہیں۔ یہ نام ان عیسائی خانقاہوں کی جگہوں کے لیے آئے تھے جو اسلام کی ابتدائی صدیوں تک آباد اور پر رونق تھیں۔ ان خانقاہوں میں سے جنہیں سمعون کا نام، جو شام میں عام ہے، دیا جاتا تھا، دیر مَرَّان (مَرَّان یا مَرَّان) ہے، جو مَعْرَۃ النُّعْمَان کے قریب ہے، اور جس کے نام دیر سَمْعَان کا اطلاق غلطی سے دمشق کے دیر مَرَّان پر بھی کیا جائے لگا، نیز انطاکیہ کے علاقے میں ان روزانہ عمارتوں پر جو پھاڑی چوٹیوں پر جا بجا بنی ہوئی تھیں (کیونکہ یہ سبھی چوٹیاں جبل سَمْعَان کہلاتی تھیں)۔ مگر اس نام کی خانقاہوں میں سب سے ممتاز حلب کے شمال مغرب میں ۳۰ کیلو میٹر پر تھی اور اپنی شہرت کے لیے ایک منارہ نشین Stylite راہب سمعون اکبر (Simeon the Elder) کی سرھون منت تھی، جو وہاں اقامت پذیر تھا۔ چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی میں اس خانقاہ کو بوزنطیوں اور عربوں کی جنگ میں اور بھر آگے چل کر فاطمیوں اور حملانیوں کے مابین جنگ میں سخت نقصان پہنچا۔ عہد آویں تک غالباً یہ خانقاہ ویران ہو چکی تھی۔ بہر کیف شمالی شام کے دلچسپ آثار الصنادید میں سے ایک یہاں کے "سمعون یا سَمْعَان ولی کا دیوان خانہ" (basilic) اور ان حجروں کے "کھنڈر میں جہاں زائرین آکر ٹھہرتے تھے" (اسی کی طرف جدید لفظ "دیر" خصوصیت سے اشارہ کرتا ہے)۔ قرون وسطیٰ میں مسلمانوں نے اس دیوان خانے کو قلعہ بنا کر قلعہ سَمْعَان نام رکھا۔ ایک دوسری خانقاہ، جو انطاکیہ

سے سوئڈنہ کو جانے والی سڑک پر واقع ہے، منارہ نشین راہب سمعون اصغر (Simeon the Younger) کی یادگار تھی اور بلاشبہ یہی وہ دیر سَمْعَان ہے جس پر ابن بطَّان کے بیان کا، جسے یاقوت (۲ : ۶۷۲) نے نقل کیا، اطلاق ہوتا ہے۔

مآخذ : (۱) ابن العديم : زبدہ، طبع صلی الدہان،

۱ : دمشق ۱۹۵۱ء : ۱۲۳ : (۲) J. Lassus

Sanctuaires chrétiens de Syrie، پریس ۱۹۵۷ء، بیروت

اشاریہ، بذیل مادۃ دیر سَمْعَان، قلعہ سَمْعَان،

Villages antiques : G. Tchalenko (۳) Admirable

de la Syrie du Nord، بیروت ۱۹۵۸ء : ۱۹۲

Ancient : Howard C. Butler (۴) : ۱۱۹ : ۱۰۰

architecture in Syria (Publications of the Princeton

University archaeological expeditions to Syria in

1904-1909)، قسمت ۲، لندن ۱۹۶۹ء۔

(D. SORDEL)

* دیر العاقول : عراق کا ایک قصبہ، جو دجلے

کے کنارے بغداد کے جنوب مشرق میں ۱۵ فرسنگ

(تقریباً ۸۳ کیلو میٹر) پر واقع ہے (یاقوت، ۲ : ۶۷۶ -

۶۷۷ : القُدسی، ص ۱۳۴، یہ فاصلہ دو منزل بتاتا ہے

اور ابن فضل اللہ العمری : مسالک الابصار، قاہرہ

۱۹۲۳ء : ۱ : ۲۶۳، اسے ۱۲ فرسنگ یا ۶۷ کیلو میٹر

لکھتا ہے)۔ اس قصبے نے غالباً ایک عیسائی خانقاہ کے

ارد گرد ترقی پائی اور وہ مرکزی نہروان میں ایک

زراعتی ضلع (طسوج) کا مرکز بن گیا تھا۔

ابن رستہ (۵۳۰/۵۹۱ء) وہاں کی جامع مسجد

اور مٹی کی ذکر کرتا ہے؛ اس طرح اس کی قدرے

خوشحالی کی نشان دہی ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں یہ ایک

چوکی تھی جہاں کشتیوں میں لانے ہوئے تجارتی سامان

"باصر" پر محصول لیا جاتا تھا (ابن رستہ، ص ۱۸۶)۔

الإصطخری (۵۳۱/۵۹۳ء تا ۵۳۲/۵۹۴ء) اس کے

متعلق لکھتا ہے کہ وہ واسط کے شمال میں دوسرے

اسے براہ راست دریائے دجلہ کے مشرق کنارے پر دکھایا ہے (Sausa: العراق في الجوارط القديمة، بغداد ۱۹۹۶ء، عدد ۱۲، ۱۸، قُب نقشۃ المقدسی، عدد ۲۳ اور الجغرافی، عدد ۲۷)۔ ان حوالہ دریا کو قدرے مغرب کی جانب ہٹا ہوا دکھاتا ہے (وہی کتاب عدد ۲۲)۔ ابوسمید المغربی (۶۸۵ھ/۱۲۸۶ء) (تصحیح ۱۲۸۶ء) اسے دریائے دجلہ کے مشرق میں کچھ فاصلے پر دکھاتا ہے، اور اس طرح وہ یاقوت کی تائید کرتا ہے (وہی کتاب، نقشہ عدد ۲۲)۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس بستی نے یور سینڈالا لیا تھا، کیونکہ حمد اللہ المستوفی (م ۵۷۰ھ/۱۱۷۴ء) اسے ایک بڑا قصبہ بتاتا ہے، جس کی آب و ہوا باغیوں اور نخلستانوں سے گھرے ہونے کے باعث مرطوب تھی (ازہۃ القلوب، ص ۴۶)۔ المغربی (م ۵۷۸ھ/۱۱۷۷ء) اگرچہ خانقاہ کی عمدہ عمارات کا ذکر کرتا ہے لیکن خود بستی کو ایک بڑا ٹکڑن بتاتا ہے۔

دبر العاقول انجام کار بالکل ویران ہو گیا۔ اس کا محل وقوع ان کھنڈروں کے درمیان جنوبی مقامی طور پر "الدیر کہتے ہیں شناخت کیا جا سکتا ہے۔ الدیر تین ٹیلوں پر مشتمل ہے جو دریائے دجلہ کے مشرق اور جدید عزیزہ کے شمال میں ہیں (دیکھیے ہاشمی: مفصل جغرافیۃ العراق، بغداد ۱۹۳۰ء، ص ۵۲۹)۔

دبر العاقول کا نام، جو بظاہر عربی ہے (لفظاً) اولٹ کٹارا [Camel-thorn، Athagi mauroum] یا Hedysarum Athagi کی خانقاہ) عراق کے دیگر متعدد قبل از اسلام ناموں کی طرح آراسی زبان کا ہے۔ عربی دوسری شکل زبان کے "عاقول" سے آراسی زبان کا آکولہ (akula) موڑ بنا ہے، اس لیے اس نام کے معنی دریا کے موڑ کی خانقاہ ہوئے۔ آکولہ عراق میں ایک دوسرے قصبے کا نام بھی ہے، جو کوفے کے مضافات میں ہے، اور یہ نام دریائے فرات میں ایک بہت ہی نمایاں خم کے باعث دیا گیا ہے، جیسا کہ سربانی

قصبات کے مابعد متوسط رقبے کی بستی تھا، اس کے چاروں طرف کھیت تھے۔ نصف صدی بعد حدود العالم کا مؤلف (۸۳۷/۸۹۸ء) اسے ایک خوشحال شہر بتاتا ہے، جب کہ المقدسی (حدود ۸۳۷/۸۹۵ء) اسے بغداد اور واسط کے درمیان دجلے کے کنارے کا اہم ترین شہر لکھتا ہے، جو بہت خوشحال اور پررونق تھا۔ اس میں کئی منڈیاں تھیں، جن کی جامع مسجد سے کچھ دور بہت سی شاخیں تھیں (المقدسی، ص ۱۲۳)۔

تاریخ میں دبر العاقول اس فیصلہ کن جنگ کے لیے مشہور ہے جو ۸۷۲ھ/۸۷۷ء میں یعقوب بن اثیث الصفار اور خلیفہ المعتمد کی فوج کے مابین ہوئی، جس کی قیادت اس کے قابل بھائی الموفق نے کی تھی۔ اس میں باغی والی آٹو پہلی دفعہ شکست ہوئی اور خلافت کو جو بہت بڑا خطرہ لاحق ہو گیا تھا دور ہو گیا (دیکھیے الطبری، ۱۸۹۳: ۳؛ المسعودی: مروج، ۸: ۱۱۱؛ بعد، Geschichte der Chalf: Weil، ۲: ۴۴۱؛ Ist.: Müller، ۱: ۵۸۳؛ Sketches: Nöldeke، ۱۸۹۲ء، ص ۱۹۵؛ بعد)۔

بعد ازاں یہ شہر زوال پذیر ہو گیا اور جب یاقوت نے اس کے حالات لکھے (ساتویں صدی ہجری) قیرھویں صدی عیسوی کا آغاز) جن کی مراد الاطلاع میں لفظ بہ لفظ نقل کی گئی ہے، تو العاقول کی خوشحالی کا زمانہ قصہ ماضی ہو چکا تھا۔ خلافت کا انحطاط، نہر نہروان کی قباضی اور گزرگاہ دجلہ میں تبدیلی اس انحطاط کے بڑے اسباب تھے۔ یاقوت نے اسے دریا سے مشرق کی طرف ایک میل (۱۸۸۸ میٹر) دور دیکھا تھا، جہاں وہ الگ تھلک ایک ویران علاقے میں واقع تھا۔

عرب جغرافیہ نویسوں کے نقشوں سے دریائے دجلہ کے تعلق سے اس کے محل وقوع کی بتدریج تبدیلی ظاہر ہوتی ہے۔ البیہی (۸۳۰ھ/۱۴۲۷ء) اور الاصطخیری نے

(الطبری، ۱: ۲۳۵) اور جہاں الحجاج نے جنگ جمامہ کے دوران میں پڑاؤ کیا تھا [رگ یہ دیر الجمامہ]۔ یہ دیر کوفے سے سات فرسنگ کے فاصلے پر ہے، جو کربلا سے بہت دور ہے اور اس کی سرحد پر نہیں، جیسا کہ A. Musil نے اپنے مقالے میں غلطی سے اس کا محل وقوع بتایا ہے (Middle Euphrates) ص ۱۱۱)۔

(SALEH A. EL-ALI)

* دیر قنا: عراق کا ایک مقام، جو کوفی ۹۰ کیلومیٹر بغداد کے جنوب میں، دریائے دجلہ کے بائیں کنارے سے ایک میل دور ہے۔ یہ نام ایک بڑی خانقاہ کی نسبت سے ہے، جو عہد عباسیہ تک ابھی بہت بارونق تھی۔ اس میں ایک گرجا، ایک سو حجرے اور زمینوں اور گھجور کے وسیع باغات تھے اور ان سب کو چوڑے آثار کی دیواریں احاطہ کئے ہوئے تھیں۔ متبرک صلیب کے تموار کے موقع پر بہت سے لوگ خانقاہ میں جمع ہو جاتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سلجوق قبضے کے زمانے میں یہ خانقاہ ویران ہو گئی۔ ساتویں صدی ہجری/تیرہویں صدی عیسوی کے جغرافیہ نویس لکھتے ہیں کہ اس وقت فقط اس کے کھنڈر باقی رہ گئے تھے۔

دیر قنا اصل میں عیسائی نور نو مسلم اعلیٰ عہدے داروں کے خاندان کی وجہ سے، جن کا یہ وطن تھا، مشہور ہوا۔ ان میں معروف ترین بنو الجراح کا خاندان ہے۔ تین وزیر الحسن بن مخلد، محمد بن داؤد اور علی بن عیسیٰ اس خاندان کے افراد تھے۔ دیر قنا کے سرکاری کاتب تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی کے اواخر اور چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی کے اوائل میں خاصا اہم سیاسی کردار ادا کرتے تھے۔ خلیفہ المعتد کے عہد حکومت میں انہوں نے نجران کے معاہدے کے عام تسلیم کرائے کی کوشش کی، جس میں عیسائیوں کو خاص خاص مراعات دی

مآخذ میں صراحتہ بیان کیا گیا ہے (دیکھیے Nöldeke، در S B Ak. Wico، ج ۱۲۸، Abh. ۹: ۴۳)۔

مآخذ: حوالے مقالے میں موجود ہیں۔ مندرجہ ذیل بھی قابل غور ہیں: (۱) Sumer، ۱۰: ۱۹۵۳، ص ۱۱۲: (۲) لٹریچر، ص ۳۵: (۳) وہی مصنف در JRAS، ۱۸۹۵، ص ۱۰: (۴) Erdkunde: K. Ritter، ۱۰: ۲۳۲، ۱۹۱

(A. A. DURU)

* دیر عبدالرحمن: کوفے کے فوج میں حمام آبیوں کے قریب (الطبری، ۲: ۷۰۳) قناطر رأس الجالوت (الطبری، ۲: ۷۰۱) سے اگلا مقام، بد کوفی فوج کا مقام اجتماع تھا، جسے حجاج نے الجزل کی قیادت میں خوارج اور ابن الأشعث کے خلاف بھیجا تھا (الطبری، ۲: ۷۰۲، ۷۰۳)۔ الحارث بن ابی ربیعہ نے الہخزار کے خلاف بغاوت کے دوران بھاگ پڑاؤ کیا تھا (الطبری، ۲: ۷۵۹)۔

(SALEH A. EL-ALI)

* دیر قرہ: ایک جگہ جو اسمیہ بن حذافہ نامی قبیلے کے کسی قرہ کے نام پر موسوم ہے (الفقیہ الہمدانی: البلدان، ص ۱۸۲؛ یاقوت: معجم، ۲: ۶۸۵) بحوالہ ابن الکلبی)۔ یہ قبیلہ ایاد کی ایک شاخ تھی (البلادری: فتوح، ص ۲۸۳؛ البکری، ص ۵۹۲)۔ بحوالہ ابن شہید) اس لیے اسے اصل کے لحاظ سے ایادی دیر سمجھنا چاہیے (الفقیہ الہمدانی، ص ۱۳۵)۔ بحوالہ الہیثم بن عدی: البکری، ص ۶۹۸ بحوالہ ابن شہید)۔ الاصفہانی کا دعویٰ ہے کہ قرہ ایک لفظی شخص تھا (البکری، ص ۵۹۱؛ یاقوت، ۲: ۶۸۵) اور یہ دیر المنذر کے عہد حکومت میں قائم ہوا تھا (البکری، محل مذکور)۔

قدیم اسلامی تاریخ میں دیر قرہ کا ذکر ایک ایسے مقام کے طور پر ملتا ہے جس میں سے سامانی فوج کا ایک دستہ قادیسیہ کی لڑائی میں ہٹا کر گزرا تھا

(ص ۲۶۲)۔

(SALEH A. EL-ALI)

* دیر مران : شام میں دو سابقہ خانقاہوں کا نام۔

اس نام کی اصل مبہم ہے۔ عربی اشتقاق ”ذیر الدّرّان“ بمعنی ”جنگلی زیتون کی خانقاہ“ مشتبہ ہے اور سریانی زبان میں بھی اس کی کوئی تسلی بخش تشریح نہیں ملتی۔ ان دو خانقاہوں میں سے زیادہ معروف دمشق کے نزدیک تھی، گو اس کے بالکل صحیح محل وقوع کی تعیین نہیں ہو سکتی۔ یہ جبل قیسون کی زبرین ڈھلانون پر باب الفرّادیس اور ایک عقیہ (درہ) کے قریب تھی جہاں سے غوطہ کے میوہ دار باغ سامنے نظر آتے ہیں۔ اور غالباً [نہرو] بردی [رک بان] کا دہانہ بھی دکھائی دیتا ہے۔ یہ ایک وسیع خانقاہ تھی اور بنو امیہ کے زمانے میں بڑی کاری سے مزین تھی۔ اس کے ارد گرد ایک گاؤں بسایا گیا تھا۔ اور قناس یہ ہے کہ یہ ایک سکونت گاہ تھی جہاں وہ کر خلفاء تفریح بھی کر سکتے تھے اور اپنے دارالخلافہ پر نگاہ بھی رکھ سکتے تھے۔ دیر مران کا ذکر اپنے زمانے کی نظموں میں اکثر آتا تھا۔ خلیفہ یزید اول نے نہر یزید کو جو قرق دی اس سے بلاشبہ اس کی اراضی کو فائدہ پہنچا۔ وہ اس جگہ قیام پذیر تھا جب اس کی تخت نشینی سے پہلے اس کے والد نے اسے قسطنطنیہ کے خلاف مہم کی قیادت کے لیے طلب کیا تھا۔ الولید اول نے ۸۹۹ھ/۷۱۵ء میں اس جگہ انتقال کیا اور خیال یہ ہے کہ الولید ثانی نے اسے اپنی سکونت گاہ بنا لیا تھا۔ عباسی خلفا اور ان کے نائب کئی موقعوں پر دیر مران آئے یا اس میں مقیم ہوئے تھے۔ ہارون الرشید اور المأمون، جس نے پہاڑ کے پہلو پر دیدبان تعمیر کروایا اور ایک نہر کھدوائی تھی، اور اسی طرح المعتصم بھی یہاں آکر رہے۔ الواثق نے قیس کی بغاوت فرو کرنے کے لیے رجبہ بن ایوب کو دمشق بھیجا، تو اس نے دیر مران ہی میں اپنا مستقر قائم کیا تھا۔

گئی تھیں اور ابن العنّز (۸۲۹ھ/۸۰۸ء) کی سازش کی تائید کی۔ جب انہوں نے اسلام قبول کر لیا تو وہ پکے سنی مسلمان بن گئے اور انہوں نے خلافت کے انحطاط بذریعہ اقتدار کو بحال کرنے کی کوشش کی۔ وہ الحلاج کی تعلیمات سے بھی متاثر ہوئے (الحلاج نے مریدوں میں سے کم از کم ایک دیر قنا کا تھا)، لیکن شیعیوں کے حمایتی گروہوں کی کھلم کھلا دشمنی نے سنی خلیفہ کے اقتدار کو بحال کرنے اور عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان مصالحت کی تمام کوششوں کو ناکام بنا دیا۔

مأخذ : (۱) یاقوت، ۲ : ۶۸۰ تا ۶۸۸ : (۲)

الشامی : کتاب الدیارات، بغداد، ۱۹۹۱ء، ص ۱۷۱ تا

۱۷۶ تا ۲۸۸ : (۳) البکری : المعجم، طبع وشفاف،

۱ : ۳۸۱ : (۴) المعری : مسالک الابصار، طبع احمد زکی

یاسا، ص ۲۵۶ تا ۲۵۸ : (۵) الطبری، ج ۳، ۱۹۶۱ء : (۶)

لسترینج، ص ۳۶ تا ۳۷ : (۷) میخائیل عواد : دیر قنا،

در مشرق، ۱۹۳۹ء : ۱۸۰ تا ۱۹۸ : (۸)

L. Massignon، در 'Vivre et penser (Revue biblique)

سلسلہ دوم، ۱۹۸۲ء، ص ۱ تا ۱۸ : (۹) وہی مصنف، دو

Dieu vivant، ۱۹۸۶ء : ۱۸ تا ۲۲ : (۱۰)

'Le statut légal des non-Musulmans : A. Fattal

بیروت، ۱۹۵۸ء، ص ۳۶ : (۱۱) D. Sourdel : Le vizirat

abbāside، دمشق، ۱۹۵۹ء تا ۱۹۶۰ء، بعد اشارہ

(1). SOURDEL)

* دیر کعب : ایادی دیر (البلاذری : فتوح، ص ۱۸۳) جو عراق میں مدائن (Ctesiphon) سے کوفے جانے والی اس بڑی شاہ راہ پر ہے جو کوفہ۔ دیر کعب۔ مزاحمہ (نزد قسین) سے گذرتی ہے (الطبری، ۴ : ۶۰ : الاصفہانی : مقاتل الطالبین، ص ۶۳)۔ مسلمان افواج قادمیہ میں فتح حاصل کر کے جب مدائن کی طرف بڑھیں تو انہوں نے یہاں ایک ساسانی دستے کو، جو تغیر جان کی قیادت میں تھا، شکست دی (فتوح،

۱۰۰: (۱۰) (المصری: مسالک الامصار، طبع احمد زکی ہاداد،
۱: ۲۵۰ تا ۲۵۶: (۱۱) *Études sur le regne*
der calife omayyade Mo'awiya Ier پیرس ۱۹۰۸ء
۲۷۷ تا ۲۷۸ (۱۲) *R. Dussaud* (۱۲) ۱۹۳۵ء
۱۸۴ تا ۲۹۸: (۱۳) محمد کرد علی: *توطئة دمشق*،
۱۳۶۶ء/۱۹۹۹ء ص ۲۴۱ تا ۲۴۳: (۱۴) حسن زوات، در
مشرق، ۳۳: (۱۹۵۹ء) ۵۱۵ تا ۳۳۸۔

(D. Sourdel)

ذیر موسیٰ: سری جاتے ہوئے کوئی کے *
نزدیک ایک مقام (الطبری، ۲: ۶۴۴)۔ جب حضرت
علیؑ نے الأشعث کو خوارج کے خلاف جنگ کرنے
کے لیے بھیجا تو انہوں نے اپنی فوجوں کے اجتماع کے لیے
یہ مقام منتخب کیا (الطبری، ۱: ۳۴۲ تا ۳۴۴)۔
البحار اس ذیر میں یزید بن انس کو الوداع کہنے
کے لیے پہنچا تھا جسے اس نے موصل پر قبضہ کرنے
کے لیے بھیجا تھا (الطبری، ۲: ۶۴۴)۔

(SALEH A. EL-ALI)

دیسقوریڈیس: [دیا سقوریڈس]، یونانی
diaporēdis کی صحیح ترین عربی 'ملا۔ دوسری شکلوں
مثلاً دیاسقوریڈوس، میں سریانی اثر و نفوذ تسلیم کرنے کی
گنجائش ہے۔ اسلام میں یہ نام ہمیشہ Pedanius Dios-
corides (پہلی صدی قبل از مسیح) کی طرف اشارہ کرتا
ہے جو کلیکیا میں عین زریہ Anazarbe کے مقام پر پیدا
ہوا، اس کے نام کی مکمل معرب شکل "دیسقوریڈیس
العین زریہ" ہے۔ قرون وسطیٰ میں مسلمان اس کے
اور اس کی تصانیف کے متعلق جو کچھ جانتے تھے
اس کا خلاصہ ابن جابل کی طبقات الأطباء و الحكماء
(طبع فواد سید، قاہرہ ۱۹۵۵ء، ص ۲۱) میں مل سکتا
ہے۔ جالینوس [رگ بان] (۷۲۷ھ/۹۸۷ء) کے بعد بھی
طیب ہے جس کا مسلمان بکثرت حوالہ دیتے ہیں۔ اس کی
تصنیف περὶ ὑγιεινῆς διατροφῆς جسے جالینوس پہلے ہی

ذیر مَران کو ابوالفرج البیہا (الثعالبی: بقیۃ
۱: ۱۸۰) اور کشاجم اور الصنوبری حلبی نامی شعرا
نے چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی میں
شہرت دی۔ عہد ایوبی میں اس کا ذکر ایک
جغرافیہ نویس اور صلاح الدین کے ایک مداح قصیدہ
گوئے بھی کیا تھا۔

بعض لوگوں نے یہ غلط دعویٰ کیا ہے کہ
حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا مقبرہ ذیر مَران میں
تھا۔ دراصل وہ اسی نام کی ایک دوسری خانقاہ
میں تھا جو ایک پہاڑی پر ممرۃ النعمان کے قریب
شمالی شام میں تھی، جس کے نیچے کفر طاب نظر آتا
تھا۔ مؤخر الذکر کو ذیر الثغرہ اور ذیر مَمَّان بھی
کہتے تھے۔ اگرچہ یہ خانقاہ ایوبی عہد ہی میں
بے نشان ہو گئی تھی تاہم وہ موضع اس وقت تک
آباد تھا اور ایک مقدس بزرگ شیخ ابو زکریا
المغربی کا مسکن تھا۔ ان سے ساتویں صدی ہجری/
تیرھویں صدی عیسوی کے وقائع نویس واقف تھے اور
سلطان صلاح الدین نے بنفس نفیس ان کی زیارت کی
تھی۔ انہیں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے مقبرے
کے قریب دفن کیا گیا تھا (Annales: J and D. Sourdel
archéologiques de Syrie ۱۳: ۱۹۵۲ء: ۸۳ تا
۸۸)۔

مآخذ: (۱) الطبری، ۲: ۱۲۷۰، ۱۲۹۲: (۲)
الیعقوبی، ۲: ۱۷۲: (۳) ابن الاثیر، ۶: ۳۷۲: (۴) الاغانی،
۶: ۱۹۵: ۷: ۵۵: ۱۶: ۳۳: (۵) البکری: المعجم،
طبع ڈیٹفٹ، ۱: ۳۶۲: (۶) ابن عساکر: تاریخ مدینۃ
دمشق، طبع صلاح الدین المجدد، ۲: دمشق ۱۹۵۳ء:
۱۰۳، ۱۰۶، ۱۶۶: (۷) ابن شداد: تاریخ دمشق، طبع
سامی الدہان، دمشق ۱۹۵۶ء، ص ۲۸۲ تا ۲۸۷: (۸)
یاقوت، ۱: ۸۶۵: ۲: ۶۶۶ تا ۶۹۷: ۳: ۶۰۴، ۶۰۸: (۹)
ابن شاكر الكنبی: عیون التواریخ یہ تتبع H. Sanvair
Description de Damas، در ۱۸۹۶ء، ص ۳۸۱

قرابادین (materia medica) کا ایک معیاری دستور العمل خال کرتا تھا اور جو مسلمانوں کے علم دوا سازی (دیکھئے ادویہ) کی اساس رہی ہے، عربی زبان میں اسے مختلف ناموں سے موسوم کیا گیا ہے: ہیولی علاج العلاب، کتاب الادویۃ المفردۃ اور کتاب الحشائش۔ یہ یونانی سے سریانی میں اصل ترجمہ تھا، جس نے عربی ترجمے کی بنیاد کا کام دیا، اسے اصطفا بن یسیر نے اصل متن سامنے رکھ کر کیا تھا، اور اس کی اصلاح حسین بن اسحق [رک ہاں] نے تیسری صدی ہجری/اٹھویں صدی عیسوی میں بغداد میں کی تھی۔ فقط یہی ایک مکمل ترجمہ تھا جو بلاد اسلامیہ میں کیا گیا تھا۔ یہ ترجمہ قدیم یونانی متن کی طرح دو نسخوں میں شائع ہوا: (۱) دیسقوریڈیس Dioscorides کا اصل نسخہ، جس میں مزید ادویہ کو مختلف اقسام میں باقاعدہ ترتیب دیا گیا تھا، جس سے کتاب پانچ حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ ان میں سمیات پر بعد میں تین اور موضوعہ کتابوں یا حصوں کا اضافہ کیا گیا: (۲) دوسرے نسخے میں حوالے کی سہولت کے لئے حروف تہجی کی ترتیب اختیار کی گئی اور اس سے متن کی عبارتوں میں اضافہ ہوا۔

دیسقوریڈیس Dioscorides کے عربی متن کی مجموعی باجزوی صورت میں، اگر بلاد اسلامیہ میں اشاعت ہوئی اور اس نے عربی زبان میں علم الادویہ کے متاخر مطالعات میں مدد دی۔ آغاز ہی سے دو بڑی مشکلات نمایاں تھیں: پہلی مشکل تاریخ طبیعی کا مسئلہ تھا کیونکہ باقی انواع ہر جگہ ایک جیسی نہیں تھیں؛ دوسری لسانی اور فارسی دقت، کیونکہ مختلف انواع کو انہیں ابہام کے موسوم کرنا آسان نہیں تھا۔ اصلی عربی ترجمے کے متن میں اصل یونانی، سریانی اور ایرانی ناموں کو داخل کر کے ان مشکلات کو تسلیم کیا گیا ہے۔

اسی بنا پر دیسقوریڈیس کی قرابادین materia

medica کے مخطوطات کے ذیلی حواشی و تشریحات بہت ہی اہمیت رکھتی ہیں۔ ایک سب سے قیمتی مخطوطہ، جسے شہزادی اینسیا جولیا Anicia Juliana کے لیے بوزنطی حکومت کے شاہی دربار میں نقل کیا گیا تھا، اپنے متنوع حواشی کی بنا پر بہت دلچسپ ہے۔ یہ حواشی یونانی، نیز عربی مخطوطات کی مشرق سے مغرب کی جانب پر خطر نقل مکانی کے شاہد ہیں اور اس مسلسل عالمانہ تحقیقات کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں جس کے یہ خود محرک ہوتے رہے۔ چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی میں اس غیر مستحکم محنت کا مرکز قرطبہ کا دربار خلافت تھا، جہاں راہب نیکولاس Nicholas نے، جو قسطنطنیہ سے آیا تھا، حسداس بن شیمون [رک ہاں] اور دوسروں کے ساتھ مل کر عربی کے قدیم مشرق ترجمے کو مغرب کی ہسپانوی عربی مصطلحات علمیہ کی ضروریات کے مطابق ڈھال لیا۔ اس کام کو ابن جلیل، ابن بکلاؤش اور دوسروں نے برابر جاری رکھا۔ مشرق میں الحسین بن ابراہیم النبطی نے اسی قسم کی مکرر تطبیق کی خدمت انجام دی اور اپنی عربی تالیف دیسقوریڈیس کو ۸۳۸ھ/۹۹۰-۹۹۱ء میں طبرستان کے سلطان ابوعلی السمجوری کے نام سے منسوب کیا۔ اب اگر عربی علم الادویہ کی نسبت یہ مان لیا جائے کہ اندلس میں اسے الغافقی اور ابن البیطار [رک ہاں] نے کمال تک پہنچایا تھا تو اس میں نہ صرف دیسقوریڈیس کے متن کے اجزاء سے استفادہ کیا گیا تھا بلکہ ابن البیطار (ساتویں صدی ہجری/تیرھویں صدی عیسوی میں) نے خود تفسیر کتاب دیسقوریڈیس مدون کی تھی جس کا ایک مخطوطہ تشریحات کے ساتھ مکہ معظمہ میں محفوظ ہے۔ بعد ازاں کثیر التصانیف ابوالفرج ابن البرقی (Bar Hebraeus) (ساتویں صدی ہجری/تیرھویں صدی عیسوی) نے سریانی میں Kethabha dhe Dhioskoridhus کے نام سے ایک خلاصہ لکھا۔ مجموعی لحاظ سے لوگ دیسقوریڈیس کی تصنیف

مطبع سے ۱۸۶۳ء اور ۱۸۶۸ء کے درمیان تین جلدوں میں شائع ہوا۔ بیرن موصوف کے ترجمے کی اہمیت اس بات میں مضمر ہے کہ اس کے ذریعے مغرب کے علما اس نادر عرب مؤرخ کے خیالات اور افکار سے بخوبی واقف ہوئے اور انہوں نے اس بات کا اعتراف کیا کہ ان خلدون نہ صرف ایک غیر معمولی صاحب بصیرت فلسفی مؤرخ ہے، بلکہ وہ علم العمران (Sociology) کا بھی بانی ہے۔ گزشتہ صدی میں پروفیسر رابرٹ فلٹ R. Flint نے اور موجودہ صدی میں پروفیسر ٹائی بی Toynbee نے ابن خلدون کے افکار کا جو عالمانہ جائزہ لیا ہے، اور اس کی عظمت کا جس کشادہ دلی سے اعتراف کیا ہے، وہ اسی فرانسیسی ترجمے کے مطالعے کی بدولت ہے۔

دیسلاں کا انتقال چار اگست ۱۸۷۸ء کو ہوا۔
 مآخذ: (۱) ابوالقاسم صاحب: فرهنگ خاورشناسان، صفحہ ۱۰۷، مطبوعہ تہران: (۲) نجیب العقیلی: المستشرقون، ۱: ۱۹۷، قاہرہ ۱۹۶۳ء۔
 (نسخ عنایت اللہ)

دِیْصَانِیَہ : (Daysanites یا Disanites) شہر یرھا (Edessa) کے مشہور حامی تطبیقی عقائد (Syncretist) اور ملحد (Heresiarch) برِ دِیْصَان (Bardesane) یا ابن دِیْصَان کے مریدوں کا فرقہ۔ ابن دِیْصَان، ۱۵۴ء (یا ۱۴۳ء) تا ۲۰۰ء تک عراق کا مشہور یسویائی اور معاصر ہے جس نے مختلف نظریات کو ملا کر ایک نیا (مسیحی) مذہب بنایا تھا۔ ثنویوں کے متعلق لکھنے والے عرب مصنفوں نے اسے زردشت اور مرقیون Marcion کے درمیان اور سانی کے بعد چھوٹے نبیوں میں شمار کیا ہے۔ اس کے متعلق ان کا بیان بہت حد تک قیاس آرائی پر مبنی اور غیر معتبر ہے۔ عجب نہیں دِیْصَانِیَہ کے متعلق ان کا علم مذہب ثنویت کے کسی تاریخ نویس (مثلاً ابو عیسیٰ الوراق) کی کتاب کے صرف ایک باب تک محدود ہو جو اب تک ان کا واحد مأخذ معلوم

اور اپنے زمانے کے شہرہ آفاق استاد بیرن سلوستر دسائی De Sacy سے عربی زبان کی تعلیم پائی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اس کا فرانسیسی فوج میں مترجم اعلیٰ کے عہدے پر فائز ہوا، جو ان دنوں الجزائر میں متعین تھی۔ اس تقریب سے اسے شمالی افریقہ کی تاریخ کے ساتھ گہری دلچسپی پیدا ہو گئی اور اس نے تاریخ ابن خلدون کے اس حصے کو جو اقوام بربر کے متعلق تھا، مع فرانسیسی ترجمہ الجزائر سے ۱۸۳۸ء اور ۱۸۵۶ء کے درمیان متعدد جلدوں میں شائع کیا اسی طرح اس نے البکری کی کتاب المسالك والممالك کا بھی وہ حصہ طبع کیا جس میں شمالی افریقہ کا جغرافیہ بیان ہوا ہے۔

قاضی ابن خلکان کی وفات الاعیان کی اسلامی موانع نگاری کے اعتبار سے جو اہمیت اور افادیت ہے، محتاج بیان نہیں۔ وفات کا عربی متن اس سے پہلے جرمن مستشرق و شیفٹ Wüstenfeld کوٹنگن سے شائع کر چکے تھے۔ بیرن دیسلاں نے اس اہم کتاب کو انگلستان کے اورینٹل ٹرانسلیشن فنڈ کی فرائش پر تمام و کمال انگریزی کا جامہ پہنایا جو لندن سے چار ضخیم جلدوں میں ۱۸۴۳ء اور ۱۸۷۱ء کے درمیان شائع ہوا۔

دیسلاں کا سب سے بڑا علمی کارنامہ یہ ہے کہ اس نے مقدمہ ابن خلدون کو فرانسیسی زبان میں منتقل کیا۔ مقدمہ مذکور کا عربی متن اس سے پیشتر پروفیسر کانر میئر Quatremere تین جلدوں میں شائع کر چکے تھے اور ان کا ارادہ تھا کہ عربی متن کی طباعت کے بعد اس کا فرانسیسی ترجمہ بھی شائع کریں گے، لیکن اس منصوبے کی تکمیل سے پہلے ہی وہ اس دنیا سے انتقال کر گئے۔ ان کی وفات کے بعد بیرن دیسلاں نے اس کٹھن کام کا بیڑا اٹھایا اور کئی سال کی محنت و ساقہ کے بعد مقدمے کا فرانسیسی ترجمہ (مع حواشی) تیار کیا، جو فرانس کے سرکاری

معلومات سے اخذ ہوتے ہیں۔ ان میں سربرآورد لوگ یہ ہیں: Epiphanius, Eusebius, دمشق کا قدیس یوحنا (سینٹ جون) اور سربانی مصنفین میں تھیوڈور، بارکونی (Barkouni)، نصیبین کا الیاس، Moses Bar Kepha، Elias of Nisibi اور St. Ephraem اور اس طرح ہم بعض مفید سواڑے کر سکتے ہیں۔ ہمیں یہ معلوم ہے کہ بردیسان نے غیر اہل کتاب کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد نظام آفریش کا مطالعہ اور اس پر غور و فکر کیا۔ وہ پروزی (وجودی) (Emanationist) اور سحر آمیز (Hermetic) عقائد سے متاثر ہوا، جنہیں جوئش (جیوم) کہتے تھے۔ دوسرے معصروں کی طرح اس کے خیال میں یہی یہ دنیا اجرام فلکی کے موجودات پر نائیر کا نتیجہ آئی اور یہ عمل جوہر واحد (Monad) یا جوہر ثنوی (Dyad) کے تواتر سے مرتب ہوا۔ ایرانی اثرات جو الزما (Zoroaster) کے خطے کے عقائد کی تہہ میں موجود ہیں، جہاں بردیسان رہتا تھا، بلاشبہ تصور ثنویت کی بنیاد ہیں، جس کا پتا عرب مصنفین کے نزدیک اس کی طبیعیات میں چلایا جا سکتا ہے۔ اس کی تعلیم نے جو تصورات آفریش، طائریہ تھے ان کی بنیاد پر بردیسان نے عیسائیت کی وہ تعبیر تیار کی جو الزما کے ایک باشندے کو نظر آتی تھی جس کی پرورش ہائرو بولس Hieropolis کی شامی دیوی کے ایک پجاری کے گھر میں ہوئی تھی؛ اور وہ بھی ٹھیک اس زمانے میں جب کہ Samosata کے Lucian نے ان رسوم کو بیان کیا جو وہاں ادا کی جاتی تھیں (Lucian تقریباً ۱۶۰ء میں پیدا ہوا تھا)۔ بلاشبہ بردیسان نے نجات کاسل کے جو مہنی بتائے اس میں نور و ظلمت کی باہمی آمیزش کے متعلق ان لاطہری کہانیوں کے مبداء کا سراغ لگانا چاہیے جو ابن الندیم اور الشہرستانی نے نقل کی ہیں۔ بردیسان کی ایک بڑی تصنیف The Dialogue on The Lairs of the Lands the Land جو سلامت رہ گئی ہے، تقدیر پر اس ممتاز

ہوتا ہے۔ وہ ابن دیمان کے کہ تو حالات زندگی نکھتے ہیں اور نہ اس کی نسل و نسب کی تفصیلات۔ اس سے جو عقیدہ منسوب کیا جاتا ہے وہ قدرے عام ثنویت کا ہے جو فطوحہ کی جسمانی حالت کے نقطہ نظر سے ہے؛ جو مذاہب اور فرقوں پر لکھنے والے عرب مصنفین کے مستقل انداز فکر کے عین مطابق ہے، اس میں شروع ہی سے اثبات عدل الہی (theodicy) کا عقیدہ مرکوز خاطر رہتا ہے۔ دیصانیہ نور و ظلمت کو عناصر اولی تصور کرتے ہیں اور انہیں بالترتیب خیر و شر کا مآخذ مانتے ہیں لیکن اس امتیاز کے ساتھ کہ نور، فعال، زندہ، مدبر اور حیات کی بنیادی صفات، عام اور قوت سے متصف تھا۔ اس کے برخلاف ظلمت، محض جامد، صفات مذکور سے معرا تھی اور فقط وجود رکھتی تھی۔ آفریش کے عمل کا آغاز نور کے اس عزم سے ہوتا ہے کہ ارادی عدل کے ذریعے ظلمت میں سرایت کر جائے اور اس طرح انجام کار نجات تک لے جائے۔ اس ارادی عمل کے بعد نور کسی طبعی افتاد و ہلا کے سبب اپنے آپ کو ظلمت سے جدا کرنے میں ناکام ہو چکا ہے، جس کے سبب کی صراحت نہیں کی گئی۔ عرب مصنفین جنہوں نے بردیسان اور اس کے متبعین کے عقیدے کے متعلق لکھا ہے، ان کے دو اعتقادی رجحانات میں امتیاز کرتے ہیں؛ یعنی یہ کہ ان میں ایک گروہ کا عقیدہ ہے کہ ظلمت کی اعلیٰ صورتوں میں کمتر درجے کی نوری مخلوقات کے ساتھ مل جانے کا رجحان پایا جاتا ہے جو بعد میں اس اتحاد سے رہائی نہیں پا سکتیں۔ دوسرے گروہ کے خیال میں نور و ظلمت کا ایک دوسرے سے مل جانا نور کا ایک شعوری عمل ہے جس کے ایسے غیر متوقع نتائج برآمد ہوتے ہیں، جو ظلمت کی طبعی فطرت میں ودیعت ہوئے ہیں۔

مذکورہ بالا خیالات کے ساتھ ساتھ ہم ان تصورات کو بھی پیش کر سکتے ہیں جو بدعنی عقائد کے عیسائی محققین کی بالاتفاق فراہم کی ہوئی

نسلوں نے تسلیم کیا کہ بردیسان مرقیون Marcion سے مختلف روش رکھتا تھا پھر بھی اسے مرقیون کے ساتھ مانی کے متبعین کی صف میں شمار کیا۔ اس رائے کی عرب مصنفین نے متابعت کی۔ بدعتی عقائد کے متأخر عیسائی علما کے نزدیک بھی اس کا فلسفہ، جو وبلشان (Valentinism) کے زیر اثر پھلا پھولا تھا، فلسفہ مانی سے ملوث ہے۔

مآخذ : (۱) ابن الندیم، (مطبوعہ قاہرہ) ص ۷۷۷؛ (۲) الشہرستانی، ابن حزم کے حاشیے پر، قاہرہ، ۲ : ۷۷ تا ۷۸؛ (۳) عبدالناہر البغدادی، قاہرہ، ۱۹۱۰ء، ص ۳۳۳؛ (۴) البیہقی، طبع MacCarthy، بیروت، ص ۷۷۷؛ (۵) Eusebius، در Patr. Graec. ۲ : ۳۹۷ تا ۴۰۰؛ (۶) Patr. Graec. : V. Philosophumena : ۱۶؛ عمود (Bardesanes von Edessa : Meix) : ۵۶۹/۱۷۰؛ (۷) Halle : ۱۸۶۳؛ (۸) Burdisane l'Astrologue : F. Nau؛ (۹) Le livre des lois des pays، پیرس ۱۸۹۹ء؛ (۱۰) Dictionnaire de Théologie catholique، پیرس، مادہ (مع مآخذ)۔

(A. ABEL)

دیوک : مرغ، یہ لفظ شاید سامی الاصل نہیں ہے۔ چنانچہ جنوبی عرب کی جدید زبان کے سوا اور کسی سامی زبان میں اس لفظ کا ہم جنس مترادف نہیں ملتا۔ (Lexique Syriac : Leslau، ۱۹۳۸ء، ص ۱۳۶)۔

قدیم عربی نظموں، ضرب الامثال اور حدیث میں مرغ (دیوک) کا اکثر ذکر ملتا ہے۔ علم الحیوانات کی کتابوں میں اسے تمام پرندوں سے زیادہ پر شہوت اور خود پسند پرندہ بیان کیا گیا ہے۔ اس کی ذہانت کمزور ہوتی ہے، کیونکہ جب یہ کسی دیوار سے لیچے گرے تو اپنے دڑبے کا راستہ معلوم نہیں کر سکتا۔ باوجود اس کے اس میں متعدد قابل ستائش خصوصیات پائے جاتے ہیں۔ یہ دوسرے مرغوں سے لڑنے اور اپنی مرغیوں کی حفاظت کرنے میں بڑا نڈر، جفاکش، جری

ستن کی حامل ہے جسے Eusebius نے محفوظ کر لیا تھا۔ اس سے ہم اس کے بنیادی فلسفے کو سمجھ سکتے ہیں۔ اس میں وجود کی طبعی حالت جو بلعاط ماعت ستاروں پر منحصر ہوتی ہے (اس نے فلکیاتی جبریت کے عقیدے کے خلاف جو استدلال کیا، اس کی صدائے باز گشت ہمیں ابن حزم کے ایک باب میں سنائی دیتی ہے جو اس نے نجومیوں کی تردید کے لیے وقف کیا ہے، مطبوعہ قاہرہ، ۳ : ۲۴) اور اخلاقی تقدیر کے درمیان امتیاز کیا گیا ہے۔ یہ اخلاقی تقدیر ظلمت سے فرار کی مانند مادے کی ناقابل تبدیل فطرت اور انسان کی آزاد فطرت میں تضاد سے پیدا ہوتی ہے اور یہ دونوں قسم کی فطرتیں خدا کی طرف سے ملتی ہیں۔ یہ خالق حقیقی ہے جس نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا اور اختیار یا آزادی کی صفت عطا کی۔ مزید برآں، سب سے بڑھ کر یہ کہ خدا ان وجودوں کے نظام مراتب کا مدون اور خالق ہے جن کے اہل خصائص اور میلانات وہ متعین کر چکا ہے اور انہیں کے مطابق یہ دنیا مسلسل بنی اور بگڑتی رہتی ہے۔ علاوہ ازیں یہ ناکامی کی دنیا ہے اور یہاں فلسفہ مانی کی روح ظاہر ہوتی ہے؛ جہاں خدا اپنے حلم کے سبب بے نظمی و ابتری کو جاری رہنے دیتا ہے، یہاں تک کہ چھ ہزار برس گزرنے کے بعد وہ دوبارہ ایک دنیا پیدا کرے گا جو ساری کی ساری سقیم، نورانی اور صالح ہوگی۔

بردیسان کی شہرت بحیثیت جوتشی کے بھی تھی۔ اس نے اپنی روش کو اس بارے میں خود بالکل صاف اور واضح کر دیا تھا لیکن آخر میں اس حیثیت کو قدیس افرام (St. Ephraem) نے متعین کیا، جس نے اس کے خلاف اس کے اپنے شہر الرہا میں لڑائی لڑی، اس کے خلاف مواعظ لکھے اور ایسے نعمات حمد لکھے جنہوں نے آگے چل کر بردیسان کے حمدیہ ترانوں کو بھلا دیا اور خود ان کی جگہ لے لی۔ بعد کی

میں ہے کہ جب تم بالک مرغ منو تو اللہ تعالیٰ سے اس کا فضل طلب کرو (صحیح البخاری، باب بدء الخلق)۔ اسرائیلی روایات میں ہے کہ جنت میں عرش الہی کے بالکل نیچے ایک فرش ہے وہ جب نماز کے اوقات کا اعلان کرنے کے لیے بانگ دیتا ہے تو اس کی بالک دنیا کے تمام مرغ دہراتے ہیں (La escatologia: M. Asin Palacios)۔ *musulmana en la Divina Comedia* طبع دوم، میٹرڈ اور غرناطہ ۱۹۳۳ء، ص ۵۰، بعد: E. Cerulli: *Il Libro della scala* Vatican city ۱۹۳۹ء، ص ۹۸ بعد (فصل ۶۹) اور لوحہ ۴۰ (بالمقابل ۴۱): *Convegno di Scienze morali* R. Ettinghausen: *Storiche e Filologiche* (۱۲) *Volta* Convegno، روم ۱۹۵۷ء، ص ۳۶۲ بعد: J. Berque: *Les Arabes* پیرس ۱۹۵۹ء، ص ۱۷۰)۔ برغواطہ [رک بان] اپنی نمازوں کے اوقات کی تعیین مرغ کی بانگ سے کرتے تھے اور اس کا گوشت نہیں کھاتے تھے (البکری، طبع de Slane ۱۳۹ بعد)۔

اگرچہ دیک ”دجاجة“ [رک بان] کا نہ ہے مگر بیشتر کتب میں اس کا تذکرہ الگ عنوان کے تحت کیا گیا ہے۔ تاہم ابن الیطار اور داؤد انطاکی نے اس کے طبی خواص کا ذکر ”دجاجة“ کے ابواب کے تحت ہی کیا ہے، زیادہ تر اس کا گوشت اور اس گوشت کی بغلی، پٹا، بھیجا، کانی اور خون کو طبی استعمال میں لایا جاتا تھا۔

الجاحظ، جس نے ”صاحب الدیک“ اور ”صاحب الکلب“ کے درمیان جھگڑے کا اکثر ذکر کیا ہے، بظاہر کسی گمنام تصنیف کے اقوال نقل کرتا ہے، جو اس قسم کی کتب سے تعلق رکھتی ہے جن سے *Rangstreit Literatur* نے اپنی تصنیف *Steinschneider* (SHAK, Wien 'phil-hist. Kl) ۱۵۵، ۱۸۰۸ء) میں بحث کی ہے۔

مآخذ: (۱) السیوطی: کتاب الدیک فی فضل

اور جالاک ہوتا ہے، یہ ان تمام مرغیوں سے نکساں ساوک کرتا ہے جن سے اس کا جوڑ ہوتا ہے۔ وہ خود بھوکا ہی کیوں نہ ہو، لیکن دائہ دکان ان مرغیوں میں تقسیم کر دیتا ہے جس سے اس کی فیاضی ضرب العمل ہو گئی ہے۔ غذا کے طور پر استعمال کرنے کے لیے بہترین مرغ وہ ہوتے ہیں جو ابھی بانگ نہ دیتے ہوں۔ افزائش نسل کے لیے دو برس کے مرغ کا انتخاب کرنا چاہیے۔ اس کی قوت کا اندازہ گول کانی، جھوٹی جونچ اور آنکھ کی سیاہ رتلی وغیرہ سے لگایا جاسکتا ہے۔ اچھے لڑاکا مرغ کی نشانی یہ ہے کہ اس کی کانی مرغ اور اس کی گردن، مونی ہوتی ہے، وغیرہ۔

مرغ اپنی تمام عمر میں زایک روایت کی رو سے سال میں ایک بار صرف ایک چھوٹا سا انڈا دیتا ہے جسے ”بیضة العقر“ کہتے ہیں۔ اس کے خصبے بڑے، خوش ذائقہ اور زود ہضم ہوتے ہیں۔ خصبی کہے ہوئے مرغوں کا گوشت دوسرے تمام جانوروں کی بہ نسبت زیادہ جربی دار اور لذیذ ہوتا ہے۔ جب مرغوں کو خصبی کر دیا جاتا ہے تو ان کی کانی اور ”ڈاڑھی“ رُجھا جاتی ہے۔ عربی کتابوں میں ”دیک“ کی بہت سی اقسام اور القاب (ہندی، بطنی، زنجی وغیرہ) بیان کیے گئے ہیں، بقول الذہری سندھ کے ایک شہر میں مرغ، شتر مرغ کے قد و قامت تک پہنچ جاتا ہے۔

مرغ کی اہم خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ رات خواہ نو گھنٹے کی ہو یا پندرہ گھنٹے کی، وہ رات کے مختلف اوقات کے مطابق بانگ دیتا ہے۔ لوگ اس کی بانگ سے خوشی محسوس کرتے ہیں۔ مریض جب اچھے ہوتے ہیں تو وہ اپنے درد میں افاقہ محسوس کرتے ہیں۔ ایک حدیث میں وارد ہے کہ حضرت بنی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا کہ مرغ کو برا بھلا نہ کہو کیونکہ وہ اوگوں کو نماز کی طرف بلاتا ہے (صحیح المسلم، باب ۵) دوسری حدیث

وہ خلیفہ المنصور کے زمانے میں دیوان العطاء کا صدر مہتمم تھا (الجاحظ : البخلاء : طبع حاضری، ص ۳۹۱) ترجمہ Pellat، بعد اشارہ : الجہشاری، ص ۱۰۲ : Bughdād : Le Strange، ص ۹۵۔ دیک الجین ۸۱۰-۸۱۱/۷۷۸-۷۷۹ء، تمام حصص پیدا ہوا اور المونکل کے عہد خلافت یعنی ۲۳۵ یا ۲۳۶ھ/۸۵۰-۸۵۱ء میں فوت ہوا۔ وہ شام کے علاقے سے کبھی باہر نہیں گیا۔ کہتے ہیں کہ وہ خوش باش اور لا ابا لی ما آدمی تھا۔ امام حسین بن علی بن ابی طالب کے متعلق اس کے مرثیوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ معتدل شیعہ تھا۔ احمد بن علی السہاسی اور اس کے بھائی جعفر سے اس کے خاص تعلقات تھے اور ان دونوں کی مدح میں اس نے قصائد لکھے۔ اس نے اپنے زمانے کے ذوق کے مطابق ہجویہ نظمیں اور غزلیات بھی لکھیں۔ اس کے بہت سے اشعار اگرچہ اس کے وطن سے باہر تک مشہور ہو گئے تھے لیکن اس کے باوجود عرب لقاد اس میں کسی اعلیٰ صلاحیت کو تسلیم نہیں کرتے : پور بی بی پانچویں صدی ہجری/گیارہویں صدی عیسوی کے قیروانی فضلا اس کے کلام میں سے ایک بہت ہی پیچیدہ اور غامض شعر نکال لائے (ابن رشیق : المعجدة، ۱ : ۱۴۷) ابن شرف، طبع و ترجمہ Pellat، ص ۸۵ : A. Benhamouada، در Bull. des Et. Ar. مارچ۔ اپریل ۱۹۴۹ء ص ۶۵)۔ اس کے چند متفرق اشعار جو ہم تک پہنچے ہیں وہ اس اعتبار سے دلچسپ ہیں کہ شاعر مذکور اپنے ہم وطن مستعرب شامیوں کے لیے اصلی عربوں کے برابر حقوق کا حامی تھا اور اس لحاظ سے بھی کہ وہ جنوبی اور شمالی عربوں کے باہمی معرکوں پر شعر لکھنے کے مواقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔

مآخذ : متن میں دیے ہوئے مآخذ کے علاوہ : (۱) الاغانی : بار اول، ۱۲ : ۱۴۲ تا ۱۴۹ (طبع بیروت، ص : ۹۰ تا ۶۵) : (۲) ابن خلکان، عقد ۱۳۹۵ء، ترجمہ از

الدیک، قاہرہ ۱۳۲۲ھ (براکلان، ۲ : ۱۹۸) : تکلمہ، ۲ : ۱۹۲ (عدد ۲۳۵) : (۲) احمد بن احمد القنوسی القرقاوی : الاسرار والدلائل الی بیان ما فی الدیک من الصفات و الفضائل (براکلان : تکلمہ، ۲ : ۳۳۸) : (۳) عبدالغنی التابلسی : معطیر الانام، قاہرہ ۱۳۵۳ھ، ۱ : ۲۱۹ : بعد : (۴) ابرحیان التوحیدی : الاستماع، ۱ : ۱۳۳ : ۱۸۷ (ترجمہ Kopf : Osiris، ج ۱۲، ۱۹۵۶ء، بعد اشارہ) : (۵) الدبیری، بنیل مادہ (ترجمہ Jayakar، ۱ : ۸۰۰ : بعد) : (۶) الجاحظ : الحيوان، بار دوم، بعد اشارہ : (۷) ابن العوام : فلاحہ (ترجمہ Clément-Mullet)، ۲ : ۲۳۳ : (۸) ابن قتیبہ : عیون الاخبار، قاہرہ ۱۹۲۵ء تا ۱۹۳۰ء، ۲ : ۷۸ : ۸۹ (ترجمہ Kopf، ص ۵۳، ۶۵) : (۹) الاشعری : المستطرف، باب ۶۲، بذیل مادہ : (۱۰) الزوی : شعائب المغرقات، (طبع Wüstenfeld)، ۱ : ۳۱۲ : بعد : (۱۱) المستوفی (طبع Stephenson)، ص ۱۷ : بعد : (۱۲) الذویری : اہلیۃ الارب، ۱ : ۲۱۹ : بعد : (۱۳) J. Schacht اور M. Meyerhof : The medico-philosophical controversy between Ibn Butlan of Baghdad and Ibn Ridwan of Cairo، قاہرہ ۱۹۳۷ء، ص ۷۳ : بعد : ۷۹ : بعد (انگریزی) : ۷۷ : بعد : ۸۳ : بعد (عربی) : (۱۴) J. Henninger : Über Huhnopfer und Verwandtes in Arabien und seinen Randgebieten، دو Anthropol، ج ۱ : ۱ تا ۱۳۳ : ۱۹۵۶ء تا ۱۹۳۹ء، ص ۳۳ تا ۳۶۔

(L. Kopf)

* دیک الجین الحمصی : ایک شامی عرب

شاعر عبدالسلام بن رغبان بن عبدالسلام بن حبیب بن عبداللہ بن رغبان بن یزید بن قسیم کا لقب۔ یزید بن قسیم، سؤۃ (رک بان) میں حبیب بن مسامۃ الفہری (رک بان) کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہوا اور اس کا مولیٰ بن گیا۔ اس شاعر کے آبا و اجداد میں سے حبیب نے بغداد میں اپنے نام پر ایک مسجد بنوائی جو مسجد ابن رغبان کہلاتی ہے۔

de Slane ۱۳۳۲ : (۳) الثمالي: التيممة، ۱ : ۱۶۶، ۱۶۷ : ۱۶۸

(۴) Goldziher : *Mon. St.* : ۱ : ۱۵۶ : (۵) براکلمان :

تکملة، ۱ : ۱۳۷

(A. SCHAEFER) و (CH. PELLAT)

* **دیلم :** عراق کا ایک قبیلہ جو دریائے فرات پر فلولجہ کے بالکل زبیری مقام سے شروع ہو کر القام تک آباد ہے۔ اس قبیلے کے لوگوں کا دعویٰ ہے کہ پانچ صدی پہلے ان کے آبا و اجداد کا اصلی وطن دیلمیات تھا، جو نجد میں واقع تھا، لیکن یہ محض اساطیری خیال ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ قبیلہ مخاوط قبیلوں کے مختلف حصوں اور بے قبیلہ کاشت کاروں کا ایک مجموعہ ہے۔ اس کے کچھ افراد جزیرے میں خانہ بدوشوں کی زندگی بسر کرتے ہیں اور دریا کی طرف فقط اپریل سے دسمبر تک رہتے ہیں؛ لیکن ان کی بڑی اکثریت، عراقی کسانوں کے غریبانہ معیار زندگی کے مطابق، زمین کاشت کر کے زندگی بسر کرتی ہے۔

عراق کے "دیلم نیوا" (صوبہ) کا نام، اسی قبیلے کے نام پر رکھا گیا ہے۔ اس کی آبادی ۱۹۴۷ء میں ۱۹۳۰۰۰ تھی، جس میں فلولجہ اور رمادی کے "قضاء" شامل ہیں اور رمادی اس کا صدر مقام ہے۔

(S. H. LONGRIGG) : تلخیص از ادارہ)

* **دیلم :** جغرافیائی حیثیت سے گیلان [رگ باں] کی سطح مرتفع کا نام۔ جنوب کی جانب گیلان خاص کی پست زمینیں سلسلہ کوہ البرز سے گھری ہوئی ہیں؛ اس مقام پر یہ سلسلہ کوہ ایک ہلال کی شکل بنائے ہوئے ہے؛ اس ہلال کا مشرق سرا (لاہیجان اور چالوس کے درمیان) بحیرہ خزر کے ساحل کے قریب تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کے وسطی حصے میں ایک خلا ہے جس میں وسطی ایران کی پہاڑیوں سے سفید رود بہتا ہوا بحیرہ خزر میں جا گرتا ہے۔ منجیل کے مقام پر پہاڑ کی گھاٹی میں داخل ہونے سے پہلے، جہاں اس کے بہاؤ کا رخ مغرب سے مشرق کی جانب

ہے، اس میں ایک بڑا معاون شاہ رود آکر مل جاتا ہے، جو ضلع طالقان سے نکل کر مشرق سے مغرب کی طرف بہتا ہوا کوہ البرز کی جنوبی دیوار کے ساتھ ساتھ گزرتا ہے۔ جنوب کی طرف شاہ رود کے طاس کو پہاڑیوں کی ایک قطار، قزوین [رگ باں] کے میدان سے جدا کرتی ہے اور ادھر دائیں پہاڑ سے بہت سے ندی نالے البرز کی جنوبی ڈھلانوں سے اتر کر اس میں مل جاتے ہیں۔ ان معاون ندیوں میں سے بڑی وہ ہے جو الموت [رگ باں] کی وادی کو سیراب کرتی ہے۔ بظاہر اسی شاہ رود اور اس کے معاونوں کی وادیاں دیلمی قبیلے کا گہوارہ تھیں۔ اگرچہ یہ سب علاقہ گیلان کے بڑے دریا (سفید رود) کے طاس میں شامل ہے پھر بھی دیلم خاص (الديلم المخص) کو کوہ البرز کی بلند دیوار جدا کرتی ہے۔ قبیلہ دیلم کے لوگ اس پہاڑ (کوہ البرز) اور اس کی شاخوں کی شمالی ڈھلانوں پر بھی آباد تھے جو سمندر کی جانب شاخ در شاخ چلی گئی ہیں (دیکھئے حدود العالم) اور اس جگہ دیلم، گیلان اور طبرستان کے درمیان حائل ہو گیا تھا۔

گیلان کا علاقہ دلدلی اور غیر صحت بخش مگر بہت زیادہ حاصل خیز ہے۔ اس کے مقابلے میں دیلم کا بلند علاقہ، جو زیادہ زرخیز نہیں، توانا، باہمت اور حوصلہ مند لوگوں کا گہوارہ ہے اور وہ وطن چھوڑ کر باہر جانے اور خدمات انجام دینے کے لیے کمر بستہ رہتے ہیں۔ جغرافیائی نام "دیلم" چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی میں دیلمیوں کے اطراف و جوانب میں پھیلنے کے ساتھ ساتھ وسعت پذیر رہا ہے اور اس نے بہت سے قرب و جوار کے علاقوں کو اپنے مفہوم میں شامل کر لیا تھا (دیکھئے نیچے)۔

دور قدیم : دیلمیوں کی قدیم نسل و نژاد کی بابت یقینی طور پر کچھ معلوم نہیں۔ قیاس غالب یہ ہے کہ ان کا سلسلہ نسب ان لوگوں سے ملتا ہے جو ایرانیوں

دہلمیوں سے ماہر کوہ پیمانوں کا کام لیا گیا اور
 Turkic Sabirs [سبیری قبیلہ ترکمان] سامنے سے
 حملے کی قیادت کر رہے تھے (دیکھیے Procopius
 De bello gothico، ۳ : ۱۵، طبع Dindorf، ص ۵۲۹)۔
 (۵۲)۔ چند سال بعد دہلمیوں نے سبیریوں کے ایک
 اور دستے پر، جسے بوزنطیوں نے ملازم رکھا تھا، شیخون
 مارا، جو ناکام رہا (دیکھیے Agathias، ۳ : ۱۷)۔
 Procopius کے مطابق دہلمی (Dolomites) ناقابل گزر
 پہاڑوں کے رہنے والے تھے اور ایران کے بادشاہوں
 کے زیر فرمان کبھی نہیں ہوئے، لیکن وہ تنخواہدار
 سپاہی بن کر کام کیا کرتے تھے۔ یہ پیادہ پا
 لڑتے تھے۔ ان میں ہر شخص تلوار اور ڈھال سے
 مسلح ہوتا تھا، اور ہاتھوں میں تین چھوٹے نیزے
 (یا acontia-خنجر) ہوتے تھے۔ عہد اسلام کے بیانات
 سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

خسرو اول کی یمن پر مشہور مہم (تقریباً
 ۵۷۷ء) میں دہلم اور اس کے قرب و جوار کے آٹھ سو
 قیدی شامل تھے، جن کا سردار ملقب بہ وهرز Wahriz
 [رگ باں] ایک سن رسیدہ شخص تھا، جو خود قید سے ریا
 کیا گیا تھا۔ جب قباذ اور خسرو کے زمانے میں قفقاز
 کے درے قلعہ بند کر دیے گئے اور ان کے قریب فوجی
 نوآبادیاں قائم ہو گئیں تو بستیوں کے ناموں سے مترشح
 ہوتا تھا کہ وہ دہلم نوراس کی نواحی بستیوں سے ماخوذ تھے
 (دیکھیے نیچے، مقامی نام)۔ خسرو کے جانشین ہرمزد بہرام
 کے خلاف سازش، جس کا انجام ہرمزد کا زوال ہوا (زونب)
 Zoanab کی سرکردگی میں ہوئی تھی اور یہ دہلمیوں
 کا سردار تھا (Theophylactus Simocatta، ۳ : ۱۷)۔
 دہلم اور عرب : عربوں کے حملے کے زمانے میں
 جب قزوین کے باشندوں نے دہلمیوں سے مدد طلب کی
 تو دہلمیوں نے قاتل و قذذب کا موقف اختیار کیا،
 لیکن انھوں نے رے کے لوگوں کی مدد سے نعمان بن
 مقرن کا، جسے حضرت عمرؓ نے بھیجا تھا، مقابلہ کیا۔

سے پہلے اس سرزمین میں آباد تھے۔ پہاڑ کی اس
 چوٹی کا نام جو سفید رود کے دائیں کنارے منجیل
 کے شمال مشرقی جانب ہے دلفک (یا دلفک) ہے،
 اسے ایک پرانے قبیلے ApiBoxec کے نام کے ساتھ
 ملایا گیا ہے۔ دہلم کے نام سے بہت سے قدیم یونانی
 مصنف واقف تھے۔ دوسری صدی قبل مسیح میں
 Polybius، ۵ : ۴۴، میڈیا کے شمالی ہمسایوں کا ذکر
 کرتا ہے : ΔΑΕΥΑΙΟΙ (Avarozzi) (غیر آریا)،
 Mariavoi 'Καθόνιοι - دوسری صدی عیسوی میں
 بطلمیوس، ۶ : ۴، ΔΑΥΑΙΟΙ (= دیاوہ) کو
 Chromithrene (رے کے جنوب مشرقی خوار و ورہیز)
 کے شمال میں اور تابوری (ماہرسان) کے مغرب
 میں بتاتا ہے۔ ایران کی جانب سے صرف سامانیوں
 کے زمانے سے معلومات کا آغاز ہوتا ہے۔ آردشیر ساسانی
 کی آردوان اشکانی (Arsacid) پر آخری فتح سے پہلے
 کہا جاتا ہے کہ آردوان اشکانی نے ری، دماوند،
 دہلمان اور پشخوارگر Patishkhwargar کی فوجوں کو
 اکٹھا کیا (کارنامہ آرتخشیر، ترجمہ Nöldeke، ص ۷۷)۔
 اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اشکانیوں کا اقتدار
 کوہ البرز کے جنوب کے باشندوں میں مستحکم ہو چکا
 تھا۔ ابتداء میں سامانیوں کا دہلمیوں کے ساتھ
 محتاط برتاؤ رہا (دیکھیے Marquart : ایرانشنیر،
 ص ۱۲۶)، لیکن رفتہ رفتہ لشکر اور دربار دونوں میں
 دہلمی نمایاں نظر آنے لگے۔ کاواز [قباذ] نے ایک مہم
 آئیریا (گرجستان) پر حملہ کرنے کے لیے بھیجی۔ اس
 کا قائد ایک "ایرائی" تھا، مگر اس کے نام Boes (بویہ)
 اور لقب Ουαπίης (Wahriz) سے یہ بتا جاتا ہے
 کہ اس کا دہلمیوں سے تعلق ہوگا (دیکھیے Procopius
 De bello persico، ۱ : ۱۳)۔ خسرو انوشیروان کے
 زمانے میں دہلمیوں کے ایک فوجی دستے کا Lazica میں
 Archepolis (آج کل Tsilic-Godji) کے محاصرے
 (تقریباً ۵۵۲ ق۔ م) کے موقع پر ذکر آتا ہے۔ اس میں

ممکن ہے کہ دیلم میں کچھ زرتشتی اور عسائی موجود ہوں، لیکن دیلمیوں کے چاہلے عقائد کی بابت درحقیقت کوئی بات معلوم نہیں۔ البیرونی کے کہنے کے مطابق (الآثار، ص ۲۲۴) یہ لوگ اساطیری افریڈون کے قائم کردہ قانون کی پیروی کرتے تھے، جس نے حکم دیا تھا کہ مرد اپنے اپنے خاندان میں حکمران ہونے چاہیں، اور ان کا لقب اس نے کَذُّخْدَا (Kadhkhudha) مقرر کیا تھا۔ کسی قدر مبہم طریقے سے البیرونی اس پر یہ اضافہ کرتا ہے کہ یہ آئین الناصر الأطروش علوی (دیکھیے نیچے) نے منسوخ کر دیا تھا، اس کے بعد یہ لوگ پھر اسی طریقے کی طرف لوٹ گئے جو جابر بادشاہ ضحاک یوراسپ کے زمانے میں رائج تھا جب کہ ان کے گھروں کو "بھوٹوں اور دیوؤں" (انشیائین والہردہ) نے اپنا مسکن بنا رکھا تھا اور لوگ ان کے آگے بڑھے۔

کَذُّخْدَاؤں کے علاوہ، جو خاندان پر حکومت بزرگان کا حق رکھتے تھے، دیلمیوں کے اپنے اپنے مقامی حکمران بھی ہوتے تھے، جن کی موجودگی بعض القاب جیسے وردان شاہ، وهرز (wahriz) سے قیاس کی جا سکتی ہے (قب: Hübbschmann: Atmen. Gramm. ص ۷۷)۔ ان میں بادشاہ نک بھی ہوتے تھے (دیکھیے اوپر، موتا)۔ بادشاہوں کے کارنامے صرف نویں اور دسویں صدی عیسوی میں واضح طور پر سامنے آتے ہیں جب کہ انھوں نے علویوں کے ساتھ اشتراک عمل کیا تھا۔ علویوں کے ابتدائی زمانے ہی میں دیلم کے مستحکم مقامات نے ان علویوں کے لیے بناء گھوٹ کا کام دیا جو عباسیوں سے بچ کر بھاگنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ جہاں تک معلوم ہے قدیم ترین بناء گزین یعنی ابن عبداللہ تھا، جس کے دو بھائیوں کو سزائے قتل مل چکی تھی اور جو خود ہارون الرشید کے ایک باغی بھائی سے ساز باز رکھتا تھا۔ وہ دیلم میں ۸۱۵ء/۷۹۹ء

دیلمیوں کی قیادت ان کا بادشاہ (سردار؟) موتا (یا مورتا) کو رہا تھا، جسے دستارے (دشت ہے، یعنی اس میدان کا آثارہ جو بے اور ہمدان کے درمیان پھیلا ہوا تھا) (الطبری، ۱: ۲۶۵ تحت سنہ ۲۲۲ھ/۷۴۲ء) میں دریائے واج پر شکست ہوئی۔ البلاذری (ص ۲۱۷-۲۲۵) اور دیگر مؤرخوں نے دیلم پر مسلمانوں کے سترہ حملوں کا ذکر کیا ہے، جو حضرت عمرؓ سے شروع ہو کر الماؤن کے زمانے تک ہوئے اور جن کا ذکر عربی اشعار میں ملتا ہے (دیکھیے کسروی، ص ۴۴ تا ۲)۔ شاعر الأعشى ہمدان (۵۸۳ھ/۷۷۲ء) کو دیلمیوں نے قید کر لیا تھا، اگرچہ جن مقامات کا اس نے خود ذکر کیا ہے (قلعہ لسم، قبول، حامن، لہژین) وہ بظاہر دماوند (وہما؟) کے علاقے سے تعلق رکھتے ہیں، تاہم دیلم نے اپنی آزادی برقرار رکھی۔ ان کے مقابلے کے لیے مسلمانوں کے مستحکم مقامات یہ تھے: جنوب میں قزوین اور شمال مشرق میں طبرستان کی سرحد کے ساتھ ساتھ قلعہ بند مقامات درناے کلار اور جالوس پر۔

زبان اور مذہب: بادشاہ موتا (؟) کا نام تو ایک غیر معمولی سا معلوم ہوتا ہے لیکن جب نویں صدی ہجری اور دسویں صدی عیسوی میں دیلمی سردار بڑی تعداد میں نمودار ہوتے ہیں تو ان کے نام صاف طور پر ایرانی بے دین لوگوں (pagans) کے سے ہیں۔ یہ نام جنوب مغربی "ایرانی" ساخت کے نہیں بلکہ شمال مغربی نوعیت کے ہیں جیسے گورانگیز (کورانکج نہیں، جیسا کہ پہلے بڑھا گیا تھا)، فارسی "گور-انگیز" کے مطابق ہے (یعنی گورخر کا شکری)، شیرزل فارسی شیردل (شیر کے بے دل والا) سے ملتا ہے، وغیرہ۔ الإصطخری (ص ۵، ۶) فارسی اور دیلمی زبان میں فرق کرتا ہے اور یہ اضافہ کرتا ہے کہ دیلم کے پہاڑوں پر ایک قبیلہ بسنا تھا، جو دیلم اور گیلان دونوں سے الگ زبان بولتا تھا۔

وہ خود جُستان (عدد ۲) ہی کا نام تھا یا کسی غاصب یا مقامی حاکم (لاہیجان؟) کا۔

دَیّام کا حال اس وقت سے زیادہ صاف اور واضح ہوتا ہے جب حسنی خاندان کے سید اس کی سرحد پر نمودار ہونا شروع ہوئے۔ یہ ہوشیار سیاست دان اور بہت اچھے جنگ آزما تھے اور دہلیوں کو اپنی جدوجہد اور منصوبوں کے اندر شامل کر لینے میں کامیاب ہو گئے، گو ابھی تک ان پر اسلام کا اقرار کرنے کی کوئی شرط نہیں لگائی گئی تھی۔

سید حسن بن زید "الداعی الکبیر" (عدد ۱) ۸۶۴ھ/۸۲۵ء کی شورش کا، جو چالوس اور کلار میں برپا ہوئی، سرگروہ تھا، اور اس نے وہاں کے باشندوں کی طاہری عامل کے خلاف حمایت کی۔ یہ عامل چاہتا تھا کہ شاملات اراضی کو، جہاں مویشی چرتے تھے اور ایندھن مہیا ہوتا تھا، خود ہتھالے (الطبری، ۳: ۱۵۲)۔ الاضطحری کے بیان کے مطابق حسن بن زید سے پہلے دَیّام کو کُفر کی سرزمین (دارالکفر) خیال کیا جاتا تھا، مگر علویوں نے دَیّام کی حمایت کی، وھسودان بن جُستان (عدد ۳) نے حسن بن زید کی اطاعت کا حلف اٹھایا۔ لیکن کچھ ہی عرصے بعد اس سے قطع تعلق کر لیا اور انہیں دانوں وفات پائی۔

تاریخ جیل و دَیّام میں (جس کا حوالہ جونی، ۳: ۲۷۱ میں دیا گیا ہے) اطلاع درج ہے کہ ۸۶۴ھ/۸۶۰ء میں ایک جُستانی نے کوہ الموت پر ایک عمارت بنانا شروع کی، جس پر شاہان دیلم فخر کیا کرتے تھے۔ یہ زیادہ قرین قیاس ہے کہ یہ کارنامہ وھسودان کی حکومت کے خاتمے کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ اس کے مستعد فرزند جُستان دوم (عدد ۴) کی حکومت کے آغاز کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس جُستان دوم نے (سادات کے) داعی کو دعوت دی کہ وہ اپنے نمائندے دولم میں بھیجے اور اسی نے علویوں کے زیر حمایت

میں آیا مگر اس نے جلد ہی فضل بن یحییٰ البرسکی کی اطاعت قبول کر لی۔ معاوم ہوا ہے کہ اس اثنا میں خلیفہ نے شاہ دَیّام پر ترغیب و ترہیب دونوں سے دباؤ ڈالا (قُب الطبری: سنہ ۸۶۶ھ، الیعقوبی، ۲: ۴۶۲)۔

خاندان جُستانی: ۸۸۹ھ/۸۰۵ء میں جب ہارون الرشید نے پہنچا تو اس نے بحر خزر کے علاقے کے حکمرانوں کو بلایا اور دَیّام کے سردار مرزبان بن جُستان کو نقد روپیے کا انعام اور اعزازی خدمت دے کر رخصت کیا، اس سردار کی بابت ادائے خراج کا ذکر کمیں نہیں، حالانکہ دیگر حکمرانوں پر خراج لگایا گیا تھا۔ اگرچہ یہ پہلا موقع ہے جب ہم خاندان جُستان کا ذکر سنتے ہیں، پھر بھی گمان غالب یہ ہے کہ ہارون کی اس مہربانی کا تعلق ۸۱۷ھ/۷۹۱ء کے واقعات سے تھا، جب کہ ضرور یہی سردار (مرزبان یا اس کا باپ) حکمران ہوگا۔ سردست ہم فرض کیے لیتے ہیں کہ "بنو جُستان" کے فرمانرواؤں کی فہرست میں پہلا نام مرزبان ہی کا ہے۔

اس کے بعد کا حکمران جرہمارے علم میں آیا ہے وہ وھسودان بن جُستان ہے، مرزبان (جس کا زمانہ ۸۸۹ھ/۸۰۵ء بیان کیا گیا ہے) اور وھسودان (۸۲۵ھ/۸۷۲ء تک زندہ تھا) کے درمیان کی مدت اتنی زیادہ ہے کہ ہم انہیں بھائی خیال نہیں کر سکتے، اس وقت اتفاق رائے (جُستی Justy) وسمر Vasmer الگسروی، القزوی) اس امر پر ہے کہ جُستان اول (عدد ۲)، پہلے بادشاہ مرزبان کے فرزند اور عدد ۳ کے والد کے درمیان وھسودان کو شمار کیا جائے۔ فی الواقع سال ۸۱۶ھ/۸۰۱ء کے تحت الطبری لکھتا ہے کہ عبداللہ بن خردادبہ نے دَیّام پر اپنے فاتحانہ حملے کے دوران میں ایک بادشاہ کو گرفتار کیا جو ابولیلی کہلاتا تھا، لیلی (یا لیلی) دَیّام میں مردوں کا نام ہوتا ہے (قُب) ایک بخت آزما لیلی بن النعمان، لیکن سوال یہ ہے کہ

کی مدد کرنے سے روٹا اور رافع کو کچھ دن بعد بھاگ کر خوارزم جانا پڑا، جہاں وہ ۵۲۸ھ/ نومبر ۸۹۶ء میں مارا گیا۔ اس کے چار سال بعد (۵۲۸ھ/ اکتوبر ۸۹۶ء) محمد بن زید بنی ایک سامانی سپہ سالار سے لڑتا ہوا مارا گیا۔

تھوڑے وقفے کے بعد علویوں کے حق کی حمایت حسن بن علی الحبیبی ناصر الدین الطغرٹش الأطرش "الاحم" (الثالث) نے سنبھالی۔ اس کی حکومت کی مدت اگرچہ مختصر تھی (۳۰۱ تا ۳۰۴ھ) [یہ تصحیح ۹۱۳ تا ۹۱۶ء] اور بھی اسے علوی حکمرانوں میں سب سے بڑا مانا گیا ہے۔ الطغرٹش کے بیان کے مطابق اس ملک نے الأطرش کا ماعدا عدل و انصاف کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ تیرہ سال تک دیلیوں کے درمیان رہا تھا اور "سغد رود کی آخری سرحد (مشرق) اور آمل کے درمیان" لوگوں کو خاصی بڑی تعداد میں زیدی عقیدے کا پیرو بنانے میں کامیاب ہوا۔ انہی اس کامیابی کے ثبات کرنے کے لیے اس نے چالوس کے برج گرا کر زمین کے برابر کر دیے۔ جستان نے اس کی حکومت تسلیم کر لی، اگرچہ سامانیوں کے مقابلے میں ناکام رہا لیکن اس نے آئندہ سال، چالیس دن تک جم کر لڑائی کر کے سامانیوں کو بحر خزر کے صوبوں سے باہر نکال دیا۔

الیرونی کی اس مبہم عبارت کا جس کا اوپر ذکر ہوا اور جو ناصر کی اس کارروائی سے متعلق بھی جس سے کثرت خدا کے سابقہ اقتدار میں رخنہ پڑا ممکن ہے مطلب یہی ہو کہ دیالہ کے متفرق خاندان اسلامی شعائر کے زیر اقتدار آ گئے تھے۔ واقعات کا ایسا میلان دیکھ کر جستانوں نے ضرور اظہارِ ناراضی کیا ہوگا اور بعض مؤرخوں (اولیاء آملی: تاریخ رویان، ۵۵۷ھ/ ۱۱۶۳ء)، مطبوعہ تہران، ص ۷۷؛ ابن واصل: التاريخ الصالحی، در Mohamm. Quellen z. Gesch. d.: Dorn Kasp. Meers ۴: ۳۷۷ نے ذکر کیا ہے کہ جستان

طغرتموں سے رفق چھین لیا اور تڑپیں اور زنجان پر قبضہ کر لیا۔ ۵۲۵ھ/ ۸۹۶ء میں خلفہ المعتز نے موسیٰ بن یحییٰ کی قیادت میں ایک فوج روانہ کی، جس نے جستان کی کھدائیوں کو ملتا جلتا کر دیا۔ ۵۲۵ھ/ ۸۹۶ء میں جستان نے دھر کو شش کی کہ ری پر قبضہ کر لیا مگر یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ تاہم وہ سفاریوں کے خلاف لڑائی میں داعی کی برائے مدد کرنا رہا۔ ۵۲۷ھ/ ۸۸۳ء میں حسن بن زید نے وفات پائی اور اس کا بھائی محمد بن زید جسے "اراعی انصاف" کہتے ہیں، اس کا جانشین ہوا اور جستان دوم نے اس کی اطاعت کا حلف اٹھایا۔

ذوالم بر سب سے بڑی مصیبت تقریباً ۵۲۶ھ/ ۸۸۹ء میں نازل ہوئی، جب رافع بن حرثمة نے جو ایک خراسانی بخت آزما سپاہی تھا اور سامانیوں کی طرف سے کام کر رہا تھا، محمد بن زید کو جرجان سے نکال دیا۔ اس داعی نے دیہام میں جا کر پناہ لی۔ رافع کے سپاہیوں نے چالوس پر قبضہ کر لیا مگر سید نے جستان کی مدد سے ان کا محاصرہ کر لیا۔ تب رافع خود آگے بڑھا۔ محمد بن زید گیلان کی طرف ہسپا ہوا۔ ادھر جستان کا رافع نے پیچھا کیا اور چالوس سے ملتان تک بڑھتا چلا گیا۔ تین مہینے تک (۵۲۸ھ/ ۸۹۱ء کا موسم گرما) حملہ آوروں نے اس علاقے میں لوٹ مار کا بازار گرم رکھا۔ جستان نے وعدہ کیا کہ سید کی مدد نہ کروں گا اور رافع نے قزوين اور ری پر قبضہ کر لیا (دیکھئے ابن الاثیر، ۲: ۳۰۳ اور ابن استفہار، طبع اقبال، ص ۲۵۲ تا ۲۵۸)۔ ۵۲۹ھ/ ۸۹۱ء میں رافع نے جب دیکھا کہ اسے بہت سی جانب سے حملوں کا خطرہ ہے تو اس نے یکایک داعی کی اطاعت کا حلف اٹھا لیا اور اسے جرجان واپس دے دیا۔ سمجھوتہ یہ ہوا کہ داعی کے لیے چار ہزار دیہامی بہادر بھیجے گا۔ عمرو بن کثب الصفاری نے دمعہ کا اور کچھ وعدے وعدے کر کے داعی کو رافع

ابن مسافر پر فوج کشی کی لیکن ابن مسافر نے اسے قتل کر دیا۔ خسرو کے فرزند سہمی (عدد ۷) نے بھی کنگری ابن مسافر کے خلاف ہتھیار مٹوائے لیکن شکست کھائی اور دہلیم کے لئے اُورے ہوئے ستارے اسفار بن شیرویہ یا شیرویہ کے ہاں پناہ لی۔

متاخرین اس واقعے کے ساتھ (تقریباً ۵۳۱ء/۶۲۷ء) جُستانیوں کی بابت ہماری براہ راست اطلاعات ختم ہو جاتی ہیں، مگر خاندان کے بچے کچھ اراد، کم سے کم اپنی مملکت کے کسی حصے میں، سرگرم ہوں گے۔ جب ابن مسافر اپنے جُستانی مخالفوں (عدد ۵، ۶، ۷) سے بھگت رہا تھا اس وقت علویوں کے سابق امیر اور جُستانی امیر پہلے ہی ایران کی سطح مرتفع پر پویل چکے تھے اور دیلم ابن مسافر کے ہاتھ میں آ گیا تھا۔ ایک اطلاع نامے میں کسی سرکاری عہدے دار نے ۵۲۹ء/۵۸۹ء سے کچھ مدت پہلے شیران (تاروم) کی تاریخ کا خلاصہ یونانیوں کے وزیر ابن عباد کے لیے کرایا تھا (دیکھئے باقوت، ۳: ۱۴۹ تا ۱۵۰؛ الکسروی، ۱: ۲۰ تا ۲۱)۔ اس میں وہ بیان کرتا ہے کہ مسافری خاندان والے سارے پہاڑی آستانہ پر حکمران تھے اور (اس طرح ۹) دہلیم کے ایک حصے کو بھی ہتھ لیا تھا۔ چنانچہ اس وقت وُہسودان (عدد ۳) بن جُستان کی اولاد کو نقطہ لائجیہ کے علاقے پر قناعت کرنا پڑی تھی۔ یہی کیفیت دیلمیوں کے مخالف اور ترکوں کے موافق اس رسالے میں بھی ظاہر کی گئی ہے جو کاتب (Secretary) ابن حُصول نے طغرل بیگ کے وزیر الکنڈری کو پیش کیا (تقریباً ۵۸۵ء/۶۰۵ء) (دیکھئے فضائل الآثار، طبع المَعزَوی، vi 'Bellefen: A. al 'Azzawi ۱۵-۱۴ (۱۹۳۰ء) م ۳۱)۔ ابن حُصول نے یہ وضاحت کی ہے کہ اوستان دہلیم کا اونچا علاقہ ہے اور لائج (جو غلط طور پر "لائج" چوب کیا ہے) دہلیم کا نشیبی حصہ ہے، اوستان وُہسودانی (جنوبی یہاں کنگری

اور ناصر میں ایک مدت تک کشمکش چلتی رہی، اگرچہ ظاہر ہے کہ یہ ناصر کی تخت نشینی (۵۳۰ء/۹۱۳ء) سے پہلے ہوا ہوگا۔ ناصر کی وفات ۵ شعبان ۳۱/۵۳۰ء جنوری ۹۱۷ء کو ہوئی۔ وفات سے پہلے وہ اپنے داماد حسن بن القاسم الحسینی (حسن الرابع) کو اپنا جانشین بنا چکا تھا۔

تقریباً اسی زمانے میں، چالیس سال حکومت کرنے کے بعد، جُستان کو بھی قتل کر دیا گیا۔ اس جرم کا ارتکب اس کا بوائی علی بن وُہسودان (عدد ۵) تھا، جسے پہلے ہی ۵۳۰ء/۹۱۳ء میں بنو عباس اصنافان میں اپنا مالی عامل بنا چکے تھے۔ ۵۳۰ء میں اسے برطرف کر دیا گیا لیکن ۵۳۰ء/۹۱۹ء میں عباسی سپہ سالار مؤنس نے، جو اسی زمانے میں یوسف بن ابی الساج کو قیدی بنا چکا تھا، علی کو دوبارہ رہے، قزوین اور زنجان کا ولی بنا دیا۔ اسی سال اسے (تاروم Tarom) کے دوسرے دیلمی حاکم خاندان کنگری با سلاوی کے) محمد بن مسافر نے قزوین میں قتل کر ڈالا۔ محمد بن مسافر کی شادی جُستان بن وُہسودان (عدد ۴) کی ہوشیار لڑکی خراسوہ سے ہو گئی تھی۔ اس لڑکی کی خواہش تھی کہ اپنے خسر (اپنے بھتیجے) کا نہیں، جیسا کہ ابن الاثیر نے، ۸: ۷۶ میں لکھا ہے) کا انتقام لے۔ اپنے سیاسی موقف کے پیش نظر علی بن وُہسودان کو سارا دہلیم بمشکل ہی (اپنا حکم) مان سکتا تھا۔ بہر حال یہ معاوم ہوا ہے کہ جب حسن بن القاسم الحسینی (داعی رابع) کو طبرستان میں گرفتار کر کے علی کے سپرد کیا گیا کہ اسے بغداد بھجوادے تو علی نے اسے اپنے بزرگوں کے قلمے اُتوت میں قید کر دیا (دیکھئے ابن اسفندیار، طبع اقبال، ص ۲۸۱)۔ علی کی موت کے فوراً بعد اس کے دوسرے بھائی خسرو فیروزان نے، جو بہ ظاہر علی کے مقامی عامل (locum tenens) کی حیثیت سے کام کر رہا تھا، سید کو رہا کر دیا۔ خسرو فیروزان (عدد ۶) نے...

نام سے لیا جا رہا تھا۔ نام کی سرگزشت، مذکورہ بالا حسن بن قاسم الحسنی (السامی) کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے، جو الاطروش کا داماد (ختن) تھا، اگرچہ اسے خود ناصر الاطروش نے اپنا ولیعهد نامزد کر دیا تھا۔ پھر بھی اس کے اور ناصر کے بیٹوں کے مابین مسند نشینی کے بارے میں کشاکش شروع ہوئی اور ناصر کی وفات کے بعد دیلمی امیر تنازعات میں مبتلا ہو کر خود اپنی سیادت بڑھانے کے لیے باہم لڑتے رہے۔ حسن بن قاسم تقریباً ۹۲۸/۳۱۶ء میں مرداویج بن زبار کے ہاتھ سے قتل ہوا، جو اس وقت افسار بن شیروہ کا حلیف تھا۔

دیلمیوں کا ادھر ادھر پھیلنا: علویوں کی سرگرمیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیلمیوں میں، جن کے ایک حصے نے زیدی عقیدہ اختیار کر لیا تھا، خلافت کے خلاف بہت زور کا جذبہ پیدا ہو گیا، ادھر علویوں کی خاطر بہت سی لڑائیوں میں شریک ہونے سے ان کی فوجی مہارت بہت کچھ بڑھ گئی اور ان میں اپنی طاقت کا احساس پیدا ہو گیا۔ ماجد یوسف بن دیوداد کی بغاوتوں (۹۰۵ء/۳۹۵ء اور ۹۱۶ء/۳۹۷ء تا ۹۳۰ء/۹۱۹ء) اور ۹۲۸/۳۱۵ء میں اس کی وفات سے پہلے اس کی حتمی معزولی کی وجہ سے بد نظمی کا دروازہ کھل گیا۔ رے میں سامانی عامل ترک غلام اور دیلم کے علوی بکے بعد دیگرے برسرِ اقتدار آتے رہے۔ تاروم کے مسافریوں کی ایک اہم شاخ آذربائیجان اور ماورائے قفقاز (Transcaucasia) کی جانب پھیل گئی تھی (دیکھیے Minorsky، در BSOAS، ۳/۲۷، ۱۹۵۳ء: ۵۱۳-۵۲۹ء) اور ادھر ایران کی سطح مرتفع کے وسطی علاقے کے اندر بالکل جدید گروہ نمودار ہو گئے تھے: اول افسار بن شیروہ، جس نے تقریباً ۹۳۱ء/۳۱۹ء میں اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان کیا، پھر زبیری (۳۱۶ء/۹۲۸ء تا ۳۳۸ء/۹۲۷ء)، جو تھوڑی مدت تک رے

کہتے ہیں) علویوں کے قبضے میں تھے اور لانیج جستانی بادشاہوں کے تحت تھے۔ ایک دوسرے سے الگ یہ اطلاعات ظاہر کرتی ہیں کہ جستان بن وھسودان (عدد ۳۸) کی وفات کے بعد اس کے مغبوضات منتشر ہو گئے۔ وھسودانیوں (یعنی تاروم کے کنگری وھسودان بن محمد کی اولاد) نے دیلم کے اونچے علاقوں پر قبضہ کر لیا (شاید یہی جستانیوں کا "اوستان" یعنی "وطن" ہے)۔ جستانی ضرور یہاں سے وطن چھوڑ کر لاهیجان (یعنی دیلم کے ساحلی علاقے میں، جس کے دس ضلعی حدود [العالم] میں گنوائے گئے ہیں) چلے گئے ہوں گے۔

اس کے برخلاف، جب سلطان طغرل قزوین کے نزدیک سرکھ آرائی میں مصروف تھا (ابن الاثیر، ۳۳۸/۵۲۲ء) اس وقت دیلم کا بادشاہ اس کے پاس خراج لے کر حاضر ہوا، اس کے بعد ابن الاثیر الگ بھی "سلار" طرم (تاروم) کے مطیع ہو جانے کا ذکر کرتا ہے۔ اس سے ہمیں یہ نتیجہ نکالنا پڑے گا کہ یا تو جستانی اپنی مملکت کے ایک حصے پر دوبارہ قابض ہو گئے تھے یا خراج لاهیجان کی شاخ نے ادا کیا ہوگا، یہ دوسرا احتمالی زیادہ قوی ہے کیونکہ ناصر خسرو اپنے سفرنامے میں بیان کرتا ہے کہ ۳۳۸/۹۲۶ء میں شاہ رود کے معبر پر (اس مقام کے قریب جہاں وہ سفید رود سے ملتا ہے) امیر امیران کی طرف سے، جو دیلمان کا ایک بادشاہ تھا، محصول لیا جاتا تھا۔ اس کے بعد ناصر خسرو اپنے شہیران جانے کا حال لکھتا ہے اور کہتا ہے کہ اس وقت شہیران کے فرمانروا کا لقب "مرزبان الدیلم جیل جیلان (کذا) ابو صالح تھا" اس کا نام جستان ابراہیم تھا اور اس کے قبضے میں "دیلم کے بہت سے قلعے تھے"۔ یہ فرمانروا ضرور تاروم کے وھسودان کا پرہوتا ہوگا (دیکھیے مقالہ مسافریہ) اور یہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاہ رود کا "باغ" وہی اسی کے

میں بٹا ہوا تھا اور آخر میں قوج کے اندر دہلیوں اور ترکوں کی مخالفت (دیکھئے بیان آئندہ) - بنوبوہ کے اقتدار کو سب سے بڑا دھچکا اس سے لگا کہ ۸۴۲ھ/۶۱۰۲۹ میں محمود غزنوی نے رے پر قبضہ کر لیا۔ اس خاندان کا قطعی خاندانہ طغرل بیگ سے متصادم ہونے پر ہوا، جس نے ۸۴۴ھ/۶۱۰۵۵ میں بغداد کے آخری بوہ الملک الرحیم کو گرفتار کر لیا۔ فارس میں بوہ خاندان کے آخری افراد نے چند سال اور سلجوقیوں کے باجگذار ہو کر گزارے (دیکھئے Bowen در IRAS، ۶۱۹۲۹؛ ص ۲۲۹-۲۳۵)، اپنے ملک کے باہر دہلی لوگ اجیر سپاہیوں کی حیثیت میں خدمت انجام دیتے رہے۔ نظام الملک: سیاست نامہ، باب ۱۹ میں اپنے زمانے تک ۱۰۰ دہلیوں اور خراسانیوں کو قصر شاہان سلجوقیہ کے محافظوں کے طور پر ملازم رکھنے کی سفارش کرتا ہے۔ دہلیوں کی پراگندہ پستیوں بہت سے مقامات پر الگ الگ آباد رہیں یہاں تک کہ وہ مقامی آبادی میں مدغم ہو گئے۔

مقامی نام: وہ رقبہ جس میں دہلی سداہے دراز تک نسلاً بعد نسل پھیلے پڑے رہے بہت وسیع ہے، لیکن تاریخی ترقیب کی مشکلات کے پیش نظر بہتر یہ ہے کہ ناموں کا ذکر ایک واحد عنوان کے تحت اکٹھا کر دیا جائے! مثلاً بہت قدیم بابلی نام جزیرہ دلمون (Dilmun) (بحرین) اس وقت بھی قابل توجہ ہے اور دوسری طرف فارس کے جنوبی ساحل پر بندر دہلم کا نام زیادہ سے زیادہ بوہی عہد تک جاتا معلوم ہوتا ہے۔ قفقاز کے نیچے کی سوا زمین میں ساسانیوں کے زمانے کی فوجی جھاؤنیوں کا وجود اس قسم کے ناموں سے معلوم ہوتا ہے، جیسے لیزان بالانزان (آچکل لمہج) جس کا تعلق لایجیان سے ہے، سروان کا نام غالباً شیر (عربی میں شرز) کے نام سے وابستہ ہے جو دو دریا طالقان اور انہوت کے سنگم پر واقع ہے، دیکھئے حدود، باب ۳۲، فصل ۲۴ اور جوینی، ۳: ۲۵ (حاشیہ محمد قزوینی)۔

میں اور اصفہان میں اس کے بعد بحر خزر کے جنوب مشرق کوئے میں جہاں آئیں اپنے سے زیادہ نامور بنوبوہ (رگ باں) کے سامنے سے بسپا ہونا پڑا، برسر اقتدار رہے۔ اس عہد کے حالات میں ایسے مآخذ کے ذریعے معلوم ہوئے، جیسے السعودی: مروج، ۱: ۱۵ تا ۱۵؛ مسکویہ، در Eclipse؛ ابن اسفندیار، طبع اقبال Eghlal، ص ۲۲۴ تا ۲۰۱، ترجمہ از براؤن: ص ۱۶۲ تا ۲۲۲؛ اور ایسے ضمنی تذکروں سے جیسے ساسانیوں کے تاریخ نویسوں کے ہاں ملتے ہیں، قب گردیزی: زین الاخبار؛ ابن فضلان در رحلة وغیرہ۔

ایران کی سطح مرتفع کے بڑے حصے پر قبضہ کرنے کے بعد (بیشک خراسان جو ساسانیوں کے قبضے میں تھا) بنوبوہ نے جن کا ۸۴۲ھ/۶۱۰۳۲ میں خروج ہوا، ۸۴۴ھ/۶۱۰۳۶ میں بغداد پر قبضہ کر لیا اور ۱۰۹ سال تک خلیفہ کو اپنے علوی اقتدار کے ماتحت بے دست و پا رکھا۔ ان کے زیر سایہ بہت سے ایرانی نسل کے مقامی حکمران خاندان (دہلی اور کرد) سرحدی اخلاص میں اٹھ کھڑے ہوئے: (۱) مسافری: (۲) گنجہ کے کرد نژاد شدادی (۳۴۰ تا ۹۵۱ھ/۶۱۰ تا ۱۰۱۸ء) اور ان کی شاخ انی Ani (۵۱۰ھ تا ۵۵۹ھ/۱۰۵۹ تا ۱۱۶۳ء): (۳) کاگویہ (رگ باں) ہمدان اور اصفہان میں (۳۹۸ تا ۸۴۴ھ/۱۰۰۷ تا ۱۰۵۱ء): (۴) خستونی کرد (دیکھئے خستونیہ Hasanawayhids کرمانشاہ کے علاقے میں (۳۳۸ تا ۹۵۹ھ/۶۱۰ تا ۱۰۱۵ء): (۵) عتازی کرد (رگ باں) اور کوہ زگروس کی جنوبی ڈھلانوں پر (۳۸۱ تا ۹۹۱ھ/۱۰۱۱ تا ۱۱۱۷ء): (۶) مروانی کرد، متافرقین اور دیار بکر میں (۳۸۰ تا ۸۴۷ھ/۹۹۰ تا ۸۵۰ء) وغیرہ۔ دہلی نظام کی کمزوری کی اصل وجہ یہ تھی کہ دہلی گروہ جن کی تعداد کچھ بہت زیادہ نہ تھی، حد سے زیادہ وسیع رقبے میں پھیلے ہوئے تھے؛ ان کا حکمران خاندان چند حریف شاخوں

(دیکھیے سوج بولاکی Sawdji Bulak (از ترکی) چند اور گاؤں بحیرہ آرمیا کے طاس میں گڑھ سواہن (Mt. Savalan = لاهی) وغیرہ کے شمال میں اسی نام لاهیجان سے موسوم پائے جاتے ہیں۔

ملک اور باشندے: قدیم مسلم جغرافیہ نویس جیسے ابن خردادبہ الیعقوبی، ابن رستہ، ابن فقیہ دہلیم کا کچھ ذکر نہیں کرتے مگر ان کے ملک اور ان باشندوں کی بابت معلومات ان مؤرخوں اور جغرافیہ دانوں نے بافراط مہیا کی ہیں جو چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی میں دیلمی حکمران خاندانوں کے عروج کے بعد ہوئے ہیں۔ الاضطحری پہلے ہی دیلم کے ذیل میں بحر خزر کا تمام جنوبی ساحل اور وہ سر زمین جو کوہستان البرز کے جنوب میں ایک پٹی بناتی ہے، شامل کر چکا تھا (جس میں رے اور قزوین شامل ہیں)۔ المقدسی (جو دہلہ سلطنت کے انتہائی زمانہ عروج میں ہوا ہے) اس میں بحر خزر کے سارے ساحلوں کا اضافہ کرتا ہے جس میں والکا کے خلیجی دیباے کی مملکت خزر شامل تھی۔ الاضطحری (شاید البلخی کا تتبع کرتے ہوئے) خاندان جستان کا دارالحکومت روڈبار کو ٹھہراتا ہے۔ جوینی، ۳: ۳۴ کا مصنف مرزا محمد قزوینی اس بات کے وزنی دلائل پیش کرتا ہے کہ یہ روڈبار وہی روڈبار الموت ہے اور یہی خالوادہ دیلم کا اصلی وطن ("استان" ostan) ہے۔ ابن حوقل کے متن میں جو دراصل الاضطحری کے بیان پر مبنی ہے جستانیوں کا دارالحکومت طرم معین کیا گیا ہے جو غالباً کسی کاتب یا قاری کا سہو ہے، کیونکہ طرم (= Tarom) جستانیوں کا نہیں بلکہ مسافریوں کا جو ان کے بعد آئے، صدر مقام تھا۔ پروان (B. rwan) کی تعیین اور بھی پیچیدہ ہے اور وہ المقدسی، ص ۳۶ ("پروان" بلا اعراب) کے کہنے کے مطابق دیلم کا صدر مقام تھا۔ یہ مقام سہولتوں سے محروم تھا۔ اس کے مقابلے میں طالقان (شاہ روڈ کی وادی میں) کہیں زیادہ حاصل خیز

سربر (Avaria) کے بادشاہ کا لقب، جو البلاذری میں ص ۱۹۶ پر درج ہے، وھرزن آیا ہے، اس کا تعلق وھرز لقب کے ساتھ ثابت ہو سکتا ہے؛ دیکھیے History of Sharran: Minorsky ۱۹۵۸ء، ص ۲۳ تا ۲۵۔ نام نہاد زازا Zaza جو دیاربکر کے شمال میں پالو اور ترسہ تک بسے ہوئے ہیں اور ابھی تک ایک ایرانی زبان بولتے ہیں اپنے کو دیملا Dimla کہتے ہیں، اور اس نام کو F. C. Andrees دیلم ہی کی صورت بتاتا ہے۔ قبیلہ دُمبلی (Dumbuli) (جو اب ترکوں کے رنگ میں رنگ گیا ہے) اور اُنیسویں صدی عیسوی کے شروع میں خوی Kloy کے علاقے میں سرگرم کار تھا، دیملا سے رشتہ رکھتا معلوم ہوتا ہے۔ یہ اس لائق توجہ ہے کہ اگنھیاس (Agathias)، ۳: ۱۷، "دیلیمیتائی (Dilimmitai) فوجوں کے ذکر کے ضمن میں، جو Lasica میں مصروف جنگ تھیں، بتاتا ہے کہ ان کا آبائی وطن (شاید اس مخصوص گروہ کا؟) ایران کی سر زمین کے آس پاس "دجلہ (Tigris) کے وسطی حصے میں تھا" یعنی (اگر دجلہ غلطی سے سفید رود کے بدلے نہیں لکھا گیا ہے) اس علاقے میں جہاں آج کل زازا آباد ہیں۔ ابو دلف سیاح، طبع Minorski، قاہرہ ۱۹۵۵ء، فصل ۲۵، ایک مقام دیلمستان کا ذکر کرتا ہے جو شہر زور سے سات "فرسخ" مشرق کی طرف ہے، جہاں سے قدیم شاہان ایران کے زمانے میں دیلمی اپنی غارت گر جماعتیں عراق کے نشیبی علاقوں میں بھیجتے تھے۔ نصیہ دیلمان جو لاهیجان کے مغرب میں ہے، اس امر کا شاہد ہو سکتا ہے کہ دیلمیوں کا مرکز اوستان (دیکھیے اوپر) سے ہٹ کر لاهیجان کے علاقے میں منتقل ہو گیا تھا۔ بحیرہ آرمیا (Lake Urmia) کے شمال مغرب میں ساس کا وسطی حصہ ابھی تھوڑا عرصہ پہلے تک دیلمقان کہلاتا تھا؛ بحیرہ آرمیا کے جنوب مغرب میں کوہستان زگروس کے ایک اہم درے کے قریب ایک ضلع موجود ہے جو لاهیجان کہلاتا ہے

کے سامنے ایک دیوار بن جاتی تھی۔ فوج کے اندر ایک خاص جماعت ان کی ہوتی، جو زوہین کے ساتھ جاتا ہوا نقطہ (مراقب النقطہ و الزیران) بھونک کر مارتے تھے (دیکھئے Eclipse، ۱ : ۲۸۲)۔ دبلیوں کی جنگ کا ایک شاعرانہ بیان گرگنی کی مشہور ویس و راپین، طبع Minovi، باب ۹۹ میں دیا گیا ہے۔ دبلیوں میں سب سے بڑی کسی بد تہی کہ ان کے پاس سوار فوج نہ تھی، وہ مجبور تھے کہ اجیر ترک سواروں کے ساتھ (جن کے اسلحہ ان سے زیادہ مکمل ہوتے تھے، دیکھئے Eclipse، ۲ : ۳۳۶) مل کر کام کریں، مگر ان دونوں کے درمیان جو گہری رقابت تھی اس نے لشکر کو منتشر کر دیا۔

اس بات کا اکثر ذکر کیا گیا ہے کہ دبلی اپنے عزیزوں کی وفات پر حد سے زیادہ آہ و زاری کیا کرتے تھے اور اسی طرح مصیبت کے وقت خود اپنے حال پر فریاد و ماتم کرتے تھے (القدس: ۳۹۹ : Eclipse، ۲ : ۱۶۲ : ۳ : ۲۶۰)۔ ۶۹۶۳/۵۳۵۲ میں اسی قوم کے مزار الدولہ نے امام حسینؑ کے عام ماتم ("نیاہ") کی رسم جاری کی (ابن الاثیر، ۸ : ۴۰۶ : التتوخی : نیشاور، ترجمہ Margolinch، ۲۱۹ : لیکن دیکھئے ہلال بن الحسن اس رسم کی وقتی نوعیت ہونے پر، Eclipse، ۳ : ۵۵۸ : ۳۹۳-۳۹۴)، اور یہی رسم آگے چل کر ایرانی تہذیبوں کی بنا ہوئی جو ماہ محرم میں آج بھی ایرانی (دیکھئے Perskiy teatr : A. B. Krinskiy، ۱ : ۶۱۹)۔

تقریباً ۶۲۰۰ میں ایک شامی حکیم Bardésanes نے لکھا تھا کہ گیلان کی عورتیں کھیتوں میں کام کرتی ہیں (Patrologia Syriaca Leges regionum، ۱ : ۲ : ۱۹۰، طبع F. Nau، ص ۵۸۶)۔ آٹھ صدی بعد حدود کا وصف لکھتا ہے کہ دبلم کا نسائی طبقہ زراعت میں مردوں کی طرح مشغول رہتا ہے۔ رڈراوری (Eclipse : Rudhiwari، ۳ : ۳۱۳ کے قول کے مطابق

تھا اور مصنف کی رائے میں دارالسلطنت بننے کا زیادہ مستحق تھا۔ اروان (Arwan) میں حکومت کی قیام گاہ ("مستقر السلطان") شہرستان کہلاتی تھی جہاں خزانہ ایک گہرے کنوئیں میں رکھتے تھے (ظہیر الدین شہرستان کا اہل شاید شہر "اوسان" بمعنی "اوسان کا شہر" کرتا ہے، دیکھئے اور)۔ المقدسی دو نام الگ الگ بیان کرتا ہے۔ ایک Samirum (کذا) سار وندی (Saharwand) (بہار) حاکموں کا صدر مقام جو دارم کے علاقے کے حاکم تھے اور دوسرا ششم جو عاوی داعیوں کا شہر تھا اور مشرق گیلان میں ایک پل کے پاس واقع تھا۔

الاصطخری، ص ۲۰۵، دبلیوں کی بابت لکھتا ہے کہ وہ دبلی بننے لوگ تھے، جن کے بال ہلکے (غالباً بچولے ہوئے) ہوتے تھے، رواج کے تیز، جلد باز اور بے مروت تھے۔ وہ زراعت پیشہ تھے، مہاشی پالتے تھے، مگر گھوڑے ان کے پاس نہ تھے۔ المقدسی، ص ۳۶۸ - ۳۶۹، کہتا ہے کہ دبلی خوبرو تھے اور داڑھیاں رکھتے تھے۔ "دبلم خاص" اور گیلان کی بابت حدود العالم باب ۲۲، فصل ۲۴ یا ۲۵ میں گراں قدر معلومات دی گئی ہیں : دبلم کے دس اضلاع بحر خزر کی تہائی میں اور تین وستان، شیر (بد ظاہر وہی ہے جسے عربی ماخذ میں شہر کہا گیا ہے) اور یزم، کوہستانی علاقے میں ہیں۔

عادات و رسوم۔ دبلیوں کی عادات و رسوم پر اس وقت کے ہم عصر مصنف تعجب کرتے ہیں۔ ان کے مرد انتہا درجہ فوی تھے اور فقر و فاقہ کو بڑے صبر کے ساتھ برداشت کر سکتے تھے (مسکویہ : Eclipse، ۱ : ۱۴۰) : ان کے اسلحہ میں سانگ یا بھینک کر مارنے والی پرچھان ("زوہین") اور لمبی ڈھالوں کا خاص طور پر بیان آتا ہے، جن کے رنگ شوخ ہوتے تھے اور جنوبی مدقار اڑکے ساتھ لے کر جاتے تھے۔ ان ڈھالوں کو ملا در ہم او یہ بہار جمائینے سے حنائہ آوروں

دبلم کی تاریخ میں جدید ترین واقعہ اہل حق [آرگ بان] کے پیشوا سید محمد کا اکتوبر ۱۸۹۱ء میں کلاردست کے اندر شورش برپا کرنا ہے (دیکھئے Minois : *Notes sur la secte des Ahle-Haq* : Minois ۱۹۲۰-۱۹۲۱ء ص ۵۱)۔
 دبلم خاص کی آبادی کی بابت کوئی مکمل تحقیق نہیں کی گئی H. Rabiou (*Le Guilan*، ص ۲۸) بیان کرتا ہے کہ اصلی دبلمی (مرما میں) فقط کلاردہ اور جول میں ہوتے ہیں اور موسم گرما میں کلج خانی کو چلے جاتے ہیں۔ دبلمان (لاہیجان کے جنوب مغرب میں) کے باشندوں نے اپنی زمینیں بیچ دی ہیں اور اب فرنگیان میں ہون و باش رکھتے ہیں (جس کو حدود میں دبلم کی لاشی زمین کا ایک پرگنہ کہا گیا ہے)۔
 مآخذ: متن، مقالہ میں دئے دیئے گئے ہیں۔ (۱) تاریخ جبل و دبلم جو فرانزولہ یونیس کے نام سے سٹون ہے (جس نے G. C. Miles کے کہنے کے مطابق، ری میں ۳۷۳ تا ۲۸۷/۱۸۸۲ء تا ۱۹۹۷ء حکومت کی) اور جس سے الجوزی نے ۲: ۲۸۰ کام لیا، اس وقت قابلہ ہے۔ جستانیوں کے سنئے ابھی تک مانو نہیں لکھے ہیں؛ (۲) Marquet : *ابراہیم* ص ۱۶۶ تا ۱۷۷: (۳) H. T. : *Les provinces Caspiennes* : Rabiou، ج ۳، ۱۹۱۵ء تا ۱۹۱۶ء ص ۲۲۷ تا ۲۸۳ (دبلمان، لاہیجان، ران کوہ) : (۴) R. Vasner : *Zur Chronologie d. Gastaniden*، ج ۱، ۱۹۲۷ء ص ۱۶۵ تا ۱۸۶ اور ۳۸۳ تا ۴۸۵: (۵) اے۔ کروی: A. Kasravi : *پادشاهان گنم*، ۱۹۲۸ء، ۱: ۲۳ تا ۳۷ (جستانیوں) ایک بیش قیمت تصنیف؛ (۶) V. Minorsky : *La domination des Dailamites*، *Soc. des Etudes Iranienues*، عدد ۳، ۱۹۳۳ء ص ۱ تا ۲۶: (۷) محمدزوی، تعلقات ایرانیوں، ۳: ۳۰۶ تا ۲۰۹ (غلزوں)، ۳۳۲ تا ۳۳۵ (جستانیوں)؛ (۸) دبلمی مادہ دیام (A. Ates)۔

(V. MINORSKY)

دبلمی مآخذ: جسے دبلمی مآخذ کہتے ہیں، * سابقہ ترکی حکومت کے صوبہ روم اہلی کا ایک شہر۔ دبلمی مغربی تھریس Thrace میں دریائے مرلیج (Murisa) کی ایک بگلی وادی میں واقع ہے اور بعض اوقات تاریخ آل عثمان میں اسے بڑی ممتاز حیثیت حاصل رہی ہے۔
 مآخذ: متن کی مندرجہ کتابوں کے علاوہ دیکھئے (۱) شافعیہ ادرنہ، طبع ۱۳۰۹ھ، ص ۲۰۳ تا ۲۰۹؛ طبع دست و ہضم / ۱۳۱۹ء، ص ۹۹۶ بعد؛ (۲) سیاسی یک فرسہری (Farsleri) : *تأسیس الاعلام*، ج ۳، قسطنطنیہ ۱۳۰۸ھ / ۱۸۹۱ء، ص ۲۱۶ بعد؛ (۳) *Recueil d'itineraires dans la Turquie* : Ami Boue، ج ۱، وی ۱ تا ۱۸۵۳ء، ص ۱۰۲ بعد۔ یورپی سیاحوں نے دبلمی اور اس کے فواج کو مشکل میں سے سیاحت کے قابل سمجھا ہے اور اس کے بارے میں کوئی بیان قائم نہیں کیا؛ (۴) (۵) لائن، بار دوم دبلمی مادہ۔

(F. RABINGER)

دیموکریٹ پارٹی: ترکوں کی سیاسی جماعت، * جس کا ۷ جنوری ۱۹۴۶ء کو سرکاری طور پر اندراج عمل میں آیا۔ اسی سال جولائی میں جو عام انتخابات ہوئے، ان میں اس جماعت نے ۶۵ نشستوں کے لیے ۲۷۳ امیدوار کھڑے کیے، ان میں سے ۶۱ منتخب ہوئے اور یہ حزب اختلاف کا سب سے بڑا گروہ بن گئے۔ اس جماعت کی پہلی مجلس (کانگریس) ۷ جنوری ۱۹۴۷ء کو منعقد ہوئی، اس میں باقاعدہ طور پر جماعت کے لیے ایک لائحہ عمل اور منشور منظور کیا گیا۔ کئی اندرونی اختلافات کی وجہ سے خصوصاً نمائندگان کے اس گروہ کے علحدہ ہو جانے سے، جس نے جولائی ۱۹۴۸ء میں نیشنل پارٹی ("ملت پارٹیس") کی تشکیل کی تھی، مجلس ملی میں دیموکریٹ پارٹی کے اراکین کی تعداد ۱۹۵۰ء میں ۲۱ رہ گئی۔ تاہم اس کا اثر ملک میں بڑھتا رہا اور مئی ۱۹۵۰ء کے

عیون آتی ہے (دیکھئے احکام القرآن لابن العربی ۱: ۲۸۷)۔
لسان العرب، زیر مادہ دَانْ اور عَانْ: مقدرات القرآن،
۱: ۲۶۱: النماۃ، ۱: ۲۳۷ (بعد)۔ شرعی نقطہ نظر سے ذین
ہر وہ چیز ہے جو کوئی عقد (سودا) ملے پانے یا کسی
خاص فعل کا ارتکاب کرنے کے باعث کسی شخص کے
ذمے لازم اور واجب الادا ہوتی ہے۔ عقد کی مثال یہ ہے
کہ جیسے عقد نکاح کے بعد مہر کی رقم شوہر کے ذمے
واجب ہو جاتی ہے، جب تک یہ ادا نہ ہو اس وقت
تک یہ شوہر کے ذمے دین کی حیثیت سے واجب الادا
رہتی ہے؛ یا عقد (سودے) کی ایک مثال یہ ہے کہ
جیسے خریدار یا مشتری کے ذمے کی چیز کی قیمت
واجب الادا ہوتی ہے اور جب تک ادا نہیں ہوتی
خریدار کے ذمے دین کی حیثیت سے واجب رہتی ہے۔
جو ذین کسی خاص فعل کے ارتکاب سے واجب ہوتا
ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی کا
مال قبضے میں کرائے اور پھر اسے تلف کر دے تو اس
صورت میں بھی جو چیز تلف کنندہ کے ذمے واجب
ہوگی وہ بھی ذین کے ضمن میں آتی ہے (احکام القرآن
لابن العربی، ۱: ۲۸۷: دستور العلماء، ۲: ۱۱۸ تا ۱۱۹)۔
تھاوی (کشاف، ۱: ۵۰۲) نے ذین کی تعریف کے ضمن
میں لکھا ہے کہ شرعاً ذین سے مراد وہ مال ہے جو عقد
(سودا کرنا)، استہلاک (خرچ کرنا، تلف کرنا) اور
استقراض (فرض مانگنا) کے باعث کسی شخص پر واجب
ہوتا ہے؛ اس کے نزدیک حقیقت میں ذین صرف ان تین
اسباب کے باعث واجب ہوتا ہے، لیکن مجازاً اس
ذمے داری کو بھی دین سے تعبیر کرتے ہیں جس سے
عہدہ برآ ہونا مال کے ذریعے ہی ممکن ہوتا ہے۔

ذین اور قرض میں معمولی سا فرق ہے، قرض خاص ہے،
صرف نقد (درہم، دینار، روپیہ) لینے کے لیے بولا جاتا ہے
لیکن ذین عام ہے۔ عبداللہی احمد نگری (دستور العلماء،
۲: ۱۱۸ (بعد) نے لکھا ہے کہ فقہائے اسلام کے ہاں
متعارف یہ ہے کہ دین عام ہے اور قرض خاص،

عام انتخابات میں وہ واضح اکثریت سے جیت گئی۔
ب دیموکریٹ پارٹی نے ملک کی حکومت سنبھالی اور
اگلے دس سال تک اسے اقتدار حاصل رہا۔ کئی بار
کابینہ بنی، جلال بایار اور عدنان مندريس بالترتيب
صدر اور وزیر اعظم منتخب ہوئے۔ ۱۹۵۴ء کے
عام انتخابات میں دیموکریٹ پارٹی مزید بھاری
اکثریت سے جیت گئی، لیکن ۱۹۵۷ء کے انتخابات
عوام کی اکثریت نے اس کی تائید کی، لیکن پارلیمنٹ
میں اسے واضح اکثریت محض اس بنا پر حاصل ہو سکی
کہ حزب اختلاف کئی گروہوں میں بٹی ہوئی تھی۔
روز افزوں بے اطمینانی کے ایک دور کے بعد ۲۷ مئی
۱۹۶۰ء کے انقلاب (دیکھئے ترکہ، تاریخ) نے
دیموکریٹ پارٹی کو اقتدار سے محروم کر دیا۔
۲۹ مئی ۱۹۶۰ء میں یہ پارٹی ہی باقاعدہ طور پر ختم
کر دی گئی۔

مآخذ: (۱) Turkey's : K. H. Karpat
politics, the transition to a multi-party system
پرنسٹن ۱۹۵۹ء ص ۸۰ تا ۳۳۱ اور ہدایہ کثیر: (۲)
Türkiyede Siyasî Partiler : Tarık Z. Tunaya
استانبول ۱۹۵۲ء ص ۶۳۶ تا ۶۹۲ (۳) B. Lewis :
Democracy in Turkey، در MEA ج ۱۰، ۱۹۵۹ء ص
۵۵ تا ۷۲: G. Lewis : Turkey : the end of the
first Republic، در World Today، ستمبر ۱۹۶۰ء ص
۳۷۷ تا ۳۸۶: حالات پر تبصرہ در MEA، MEJ، COC،
OM

[ادارہ: (آؤ لائن)]

⑥ ذین : لغت میں عین کی ضد کو کہتے ہیں۔ عین
کے معنی ہیں بعینہ وہی چیز۔ چنانچہ عرب ہر اس چیز
کو ذین کہتے تھے جو خرید و فروخت کے وقت بعینہ
سامنے موجود نہ ہو، اس کے برعکس جو چیز بوقت بیع و
شری سامنے موجود ہو، اسے عین کہتے ہیں۔ ذین کی جمع
آدین اور ذیون آتی ہے جس طرح عین کی جمع عین اور

حال یا معجل جو دائن (دین دینے والے) کے طلب کرنے پر ادا کرنا واجب ہوتا ہے: دوسرا دین، مؤجل جس کی ادائی وقت آنے (حلول اجل) سے قبل واجب الادا نہیں ہوتی لیکن قبل از وقت ادا کر دینا صحیح ہے اور ذمے داری پوری ہو جاتی ہے (حوالہ سابق)۔

اس بارے میں فقہائے اسلام میں اختلاف رائے موجود ہے کہ دین کا معاملہ کرتے وقت دستاویز مرتب کرنا واجب ہے یا مستحب؟ بعض علما کے نزدیک آیت دین (۲: البقرة: ۲۸۲) میں امر کا صیغہ (فأكتبوه: دین کو ضبط تحریر میں لاؤ) ہے، جس سے وجوب ثابت ہوتا ہے، بعض اہل علم کا خیال ہے کہ دین کا ضبط تحریر میں لانا مستحبات میں سے ہے کیونکہ آگے چل کر اسی آیت میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ فَإِنْ آمَنَ بَعْضُكُم بَعْضًا، یعنی اگر انہیں ایک دوسرے پر اعتماد ہو تو پھر یوں نہیں صاحب اسات کو دین ادا کر دینا چاہیے، احناف کا بھی مسلک ہے۔ زیادہ محفوظ طریقہ یہ ہے کہ اگر خیانت کا خطرہ ہو تو دستاویز اور گواہ ضروری ہیں اور اگر اس کا خطرہ نہ ہو تو مستحب ہے کیونکہ حضرت ابو موسیٰ الاشعری نے جن تین اشخاص کی دعا نہ قبول ہونے کا ذکر کیا ہے، ان میں سے ایک وہ ہے جس نے دین پر گواہ نہ بنائے ہوں (جصاص: احکام القرآن، ۱: ۳۸۲)۔ مالکی، شافعی اور حنبلی فقہاء کی اکثریت اس بات پر زور دیتی ہے کہ معاملہ دین کی دستاویز ضبط تحریر میں لانا واجب ہے کیونکہ معاملہ دین اور حلول اجل (وقت پورا ہونے) کی مدت کے درمیان انسان پر کئی قسم کے عوارض طاری ہو سکتے ہیں (جیسے موت، غفلت، تباہی، بلکہ نفس شیطانی انکار پر بھی ابھار سکتا ہے) جو ادائے دین میں رکاوٹ کا باعث بنیں گے۔ کتابت دین کی دستاویز جامع و مانع اور ایسی واضح ہونی چاہیے کہ اگر معاملہ عدالت میں لے جانا پڑے تو اس کے مطابق صحیح فیصلہ کرنا

گویا قرض پر دین کا اطلاق ہو سکتا ہے لیکن ہر دین کو قرض سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ مرغینانی (ہدایہ اخیرین، ص ۳۹۰ بعد) اور قاضی ثناء اللہ بانی یتى (التفسیر المظہری، ۱: ۳۸۳ بعد) کی رائے یہ ہے کہ دین "بیع السلام" ہی کی ایک شکل ہے جو صرف ان اشیاء میں جائز ہے جن کی مقدار اور وزن معلوم و مقرر ہو اور ساتھ ہی مدت (اجل) بھی متعین ہو۔ دین یا بیع السلام میں صاحب حق قبل از وقت مطالبہ نہیں کر سکتا اور جس کے ذمے حق واجب ہو، وہ وقت آجانے کے بعد ٹال نہیں سکتا، اس کے برعکس قرض میں مہلت اور ڈھل ہو سکتی ہے اور اس میں وہ التزام نہیں جو دین میں ہوتا ہے کیونکہ قرضہ تو ایک ایسی مساعیہ چیز ہے جو بعینہ واپس ہوگی (مقابلے کے لیے رک بہ ربوا)۔

ادائی اور عدم ادائی کے لحاظ سے دین کی دو قسمیں ہیں: اول دین صحیح اور اس سے مراد وہ دین ہے جو واجب الادا ثابت ہونے کے بعد صرف ادا کر دینے یا بری الذمہ قرار دے دینے (بالأداء أو الإبراء) سے ہی ساقط ہو سکتا ہے، جیسے دین القرض (قرضہ لینے کی صورت میں جو دین واجب ہوتا ہے)، دین المسہر (مسہر کی صورت میں شوہر کے ذمے جو دین واجب ہوتا ہے) اور دین الاستہلاک (کسی کی چیز تلف یا خرچ کرنے پر جو دین واجب ہوتا ہے)۔ دین کی دوسری قسم غیر صحیح ہے اور اس سے مراد وہ دین ہے جو اداء اور إبراء (بری الذمہ قرار دینا) کے بغیر بھی ساقط ہو سکتا ہے جیسے بَدَلُ الْكِتَابَةِ (یعنی وہ معاوضہ جو کسی غلام یا عید مکاتب نے اپنے آقا کو اپنی آزادی کی قیمت کے طور پر ادا کرنا ہوتا ہے)۔ یہ دین اس صورت میں بھی ساقط ہو سکتا ہے جب غلام قانونی طور پر معاوضہ ادا کرنے سے عاجز قرار پائے (کشاف، ۱: ۶۷، ۵۳۱، ۵۳۲)۔ وجوب ادا اور عدم وجوب ادا کے لحاظ سے دین کی دو قسمیں ہیں: اول دین

نفس پرستی، غبن، قریب، غیبت، جبر، تعدی، تخویف اور تکبر کی سماعت تھی۔ ان میں جن مت کے عقیدہ اہلسا اور کینوولک عیسائیوں کی تجرّد پسندی کا اضافہ کیا گیا۔ دین الہی میں جن دس فضائل کی تاکید کی جاتی تھی، ان میں سے نو غالباً براہ راست قرآن مجید سے ماخوذ تھے: کشادہ نظری، اعمال بد سے اجتناب اور غیظ کو حلم سے دبانا، تشدد آمیز مادی مشاغل سے پرہیز، پرہیزگاری، تقویٰ، زہد، احتیاط، نرمی، شفقت، دسویں فضیلت یہ تھی کہ صوفیہ کے طریق پر آرزوئے الہی کے ذریعے تزکیہ نفس کیا جائے۔ مذہبی رسوم کے اعتبار سے اسے ایک طرح کی "شمسی توحید" کہا جا سکتا ہے، جس میں نور، شمس اور نار پر مبالغے کی حد تک زور دیا جاتا تھا! اس سے اولاً زرتشتی، ثانیاً ہندوانہ اور صوفیانہ اثرات کا پتا چلتا ہے۔

دور اکبری پر راسخ العقیدہ مسلمانوں کی تنقید کا ہدف زیادہ تر یہ بات ٹھہرتی ہے کہ شہنشاہ کو بالواسطہ طور پر نبی بلکہ خدا کا درجہ دے دیا گیا تھا، چنانچہ اس کے تمام مرید آپس میں دہشتے وقت "اللہ اکبر" اور "جلّ جلالہ" کہہ کر سلام کرتے تھے۔ یہ کلمات اگرچہ صوفیانہ ذکر کے اکثر اُوراد میں آتے ہیں، تاہم ان میں اکبر کے نام کی طرف ایک خوشامدانہ اشارہ بھی پایا جاتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اکبر اپنے مذہب میں شامل ہونے والوں کو یہ کہہ کر باز رکھنے کی کوشش کرتا تھا کہ "خود ہدایت پانے سے پہلے میں کسی کو ہدایت کیسے دے سکتا ہوں؟" اس کے مریدوں کی تعداد انیس سے آگے نہیں بڑھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اکبر دین الہی کو ایک روحانی کلب Club تصور کرتا تھا، جو ان منتخب درباریوں تک محدود تھی جن کی وفاداری نے اس کی حوصلہ افزائیوں سے شدہ پاکر ایک مخفی اور غیر شرعی شخصیت پرستی کی صورت اختیار کر لی تھی۔ دین الہی میں نہ تو

سکین ہو (کتاب الام، ۸: ۱۰۴، بعد)۔ اگر کوئی شخص دین ادا نہ کرے تو اس کی جائداد فروخت کر کے ادا ہوگا اور اگر جائداد نہ ہو تو حاکم اسے قید کر سکتا ہے (مختصر المرقی، ۲: ۲۲۲، کتاب الام، ۸: ۱۰۴)۔

مذہبوں (جس کے ذمہ دین ہو) کی وفات کی صورت میں امام شافعیؒ کے نزدیک تعزیر و تکفیر کے اخراجات کے بعد جو ترکہ بچے، اس میں سے سب سے پہلے دین ادا ہوگا، اس کے بعد زکوٰۃ، پھر فریضہ حج کے اخراجات نکالے جائیں گے اور پھر جو مال بچے گا وہ وارثوں میں تقسیم ہوگا، لیکن امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک ترکہ وارثوں کا حق ہے لیکن اگر مرنے والا دین، زکوٰۃ یا حج کے بارے میں وصیت کر گیا ہو تو پھر پہلے یہ واجبات ادا ہوں گے اور باقی وارثوں میں تقسیم ہوگا (احکام القرآن لابن العربی، ۱: ۳۴۴، مختصر المرقی، ۲: ۲۲۲، کتاب الام، ۸: ۱۰۴، الشریفہ، ص ۸۵، بعد)۔

ماخذ: (ابن منظور: لسان العرب زیر مادہ دان، غان: (۲) ابن الاثیر: (۱) قاهرہ ۱۳۰۶ھ: (۲) راغب: مفردات القرآن، قاهرہ ۱۳۰۶ھ: (۳) عبدالحی احمد نگری: دستور العلماء، حیدر آباد دکن، ۱۳۲۹ھ: (۴) تھانوی: کشاف اصطلاحات الفنون، کلکتہ ۱۸۹۲ء: (۵) ایوبکر الجصاص: احکام القرآن، قاهرہ، ۱۳۳۵ھ: (۶) ابن العربی: احکام القرآن، قاهرہ، ۱۹۵۷ء: (۷) امام شافعی: کتاب الام، قاهرہ ۱۹۶۱ء: (۸) ثناء اللہ ہانی پٹی: التفسیر العظمیٰ، حیدر آباد دکن، بلا تاریخ: (۹) المرغانی: ہدایۃ الخیرین، لکھنؤ ۱۳۱۳ھ۔

(ظہور احمد اظہر)

* دین: رگ یہ اسلام۔

* دین الہی: [یا دین الہی اکبر شاہی]، جسے ہندوستان کے مغل شہنشاہ اکبر نے ۱۵۸۱/۱۵۸۹ء میں جاری کیا۔ اخلاقی اعتبار سے [بظاہر] دین الہی میں

اور مان سنگھ جیسے اکبر کے معتد مذهب دار امن کے مخالف تھے۔

[دین الہی کی تشکیل میں جو محرکات کارفرما تھے ان میں ملکی مصالح کو سب سے زیادہ اہمیت دی جا سکتی ہے۔ اکبر ہندوستان میں ایک عظیم الشان اور مستحکم سلطنت قائم کرنا چاہتا تھا، لیکن علماء، بالخصوص مغدوم الملک اور صبرالصدر اس قدر با اثر اور مقتدر ہو چکے تھے کہ ملک کے جملہ فوجداری اور دیوانی معاملات ان کی رائے کے مطابق طے پاتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اپنے منصب سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ اپنی من مانی بھی کرتے لگے تھے اور انہوں نے نہ صرف جلب زر و منفعت کو اپنا شیوہ بنا لیا تھا، بلکہ حسب ضرورت فقہی مسائل میں بھی رد و بدل کرنا شروع کر دیا تھا، تاہم ان کے یہ نقائص اور کمزوریاں ضمنی اور ثانوی حیثیت کی تھیں۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ بادشاہ مختار بالذات ہے یا علما کے فتوؤں کا پابند؟ ایک اعتبار سے یہ ارباب شرع اور حکومت کی کشمکش بھی تھی، جس میں بالآخر حکومت کا ہلہ بھاری رہا۔ عبداللہ خان ازبک کے نام اکبر کے مذکورہ بالا خط میں علما کی مخالفت کا ان الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے: ”می خواہند کہ در فرمانروائی و کارگزاری شریک بادشاہی باشند“ (دیکھیے رودکنور، ص ۱۹۴، ۱۹۵)۔

پھر یہ بھی ملکی مصالح کا تقاضا تھا کہ (۱) سنی افغانوں کے مقابلے میں، جن کے ہاتھوں ہماریوں کو ملک بدر اور جن کے ساتھ اکبر کو اپنے ابتدائے عہد میں قدم قدم پر نبرد آزما ہونا پڑا تھا، شیعی ایرانیوں کی حوصلہ افزائی کی جائے، جن کی مدد سے ہندوستان میں مذہبی حکومت دوبارہ قائم ہو سکی تھی۔ (۲) برصغیر میں مروجہ فقہ اسلامی سے اکبر نے شروع شروع میں جو روگردانی کی، اس کا ایک باعث یہ اثرات بھی قرار دیے جا سکتے ہیں: (۳) ملک کی اکثریت اسے ایک

کسی الہامی کتاب کے نازل ہونے کا دعویٰ کیا گیا، نہ اس سے مذہبی پیشواؤں کے کسی سلسلے کا آغاز ہوا۔ عبداللہ خان ازبک [رگ بار] کے ساتھ سیاسی خط و کتابت کے دوران میں اکبر کی حمایت میں کہا گیا ہے کہ اس کا مذہبی عقیدہ دراصل عقلیت پر مبنی ہے اور اکبر مسلمان ہونے کی حیثیت سے اسلام کی تصدیق کرتا ہے اور اس امر کی تردید کی گئی ہے کہ اس نے نبی یا خدا ہونے کا دعویٰ کیا۔ دوسری طرف ابوالفضل نے اکبر کا ایک اعتراف بھی نقل کیا ہے جس کی رو سے اکبر نے کم از کم مجازاً اور کنایہ ترک اسلام کا اقرار کیا تھا۔

اگرچہ انتخاب عقائد میں دین الہی دیگر ادیان سے متاثر ہے، لیکن اس کے بنیادی ارکان شرعی اور غیر شرعی تصوف کے مختلف سلسلوں سے لیے گئے ہیں۔ اس دین میں روشنی کا جو بار بار ذکر آتا ہے، وہ اس نظریہ نور کی مبالغہ آویز صورت ہے جس پر سلسلہ سہروردیہ میں بہت زور دیا جاتا تھا۔ اکبر کی ذات کی پرستش کا سرچشمہ ”انسان کامل“ کے بارے میں ابن العربی [رگ بہ ابن العربی، ابوبکر محمد بن عبداللہ و رگ بہ انسان کامل] اور الجیلی کے نظریات میں سلام کرتے وقت شہنشاہ کے نام کا استعمال دراصل صوفیہ کے ایک مقبول کلمہ ذکر کی شرعی صورت تھی۔ مرید کی بیعت لینے وقت جو رسوم ادا کی جاتی تھیں، وہ پیشیہ طرقت پر مبنی تھیں [دیکھیے آئندہ مطلقاً]۔

سورج اور آگ سے متعلق مذہبی رسوم کے بعض آداب، بالخصوص ایک زمانے میں اکبر کا سنسکرت میں سورج کے ایک ہزار نام جپنا، ہندو مذہب کے اثرات کی طرف اشارہ کرتے ہیں! لیکن یہاں یہ امر قابل غور ہے کہ ٹھیکہ ہندو دھرم یا بھگتی تحریک سے بہت کم باتیں اخذ کی گئیں۔ دین الہی کو صرف ایک ہندو راجا یریل نے قبول کیا تھا، مگر بھگوان داس

غیر ملکی فاتح نہیں، بلکہ اپنی ہی برادری کا فرد سمجھے۔
جزائے کی معافی، یاقریبوں کے محاصل کی موقوفہ راجپوت
راجاؤں کے ساتھ رشتے نانے اور ان کا اعلیٰ ترین مناصب
پر قرار، یہ سب اسی لیے تھا کہ ہندوؤں کی دلدادہی کی
جائے تاکہ وہ ہمیشہ کے لیے حکومت کے وفادار
بن جائیں۔ بد قسمتی سے اس کی یہ حکمت عملی صرف
ڈائیوی امور تک محدود نہ رہی بلکہ اس کے مذہبی
اسور و عقائد کو بھی متاثر کر گئی۔

ابتدا میں اکبر ایک سیدھا سادہ خوش عقیدہ
مسلمان تھا۔ وہ علماء، مشائخ اور صوفیہ کا بے حد احترام
کرتا تھا اور علمی و مذہبی حقائق کا جواب دہتا تھا،
چنانچہ اس نے شیخ سلیم چشتیؒ کی خانقاہ کے مرید
ایک عظیم الشان "عبادت خانہ" تعمیر کرا دیا، جس میں
مسلمانوں کے تمام فرقوں کے علاوہ دیگر مذاہب کے
علماء اور پیشوا بھی جمع ہوئے اور بادشاہ کے سامنے
مختلف مسائل پر آزادانہ بحث و تمحیص کرتے۔ وہ

کچھ ایسا پڑھا لکھا نہ تھا کہ ذاتی طور پر کسی کتاب
کا مطالعہ یا کسی امر کی تحقیق کرنے پر قادر ہوتا،
البتہ جو سنتا اسے دماغ میں بٹھا لیتا۔ ان مجالس میں اسے
محسوس ہوا کہ علماء ایک دوسرے کو نیچا دکھانے
کے لیے کج بحثی اور بہتان طرازی پر اندر آتے ہیں
اکثر ایسا بھی ہوا کہ ایک نے کسی بات کو حرام قرار
دیا تو دوسرے نے اسے حلال ٹھہرا دیا۔ مختلف فرقوں
اور مذاہب کے نظریات سنتے سنتے اکبر کے اعتقادات
میں پہلے ہی سے لغزش پیدا ہو چلی تھی، علماء کے اس
دوہرے نے اسے صرف انہیں سے نہیں بلکہ اس مذہب سے بھی
بدگمان کر دیا جس کی نمائندگی کے وہ مدعی تھے۔ اس پر
سستزادہ کہ اسی زمانے میں شیخ مبارک اور اس کے
بیٹوں، فیضی اور ابوالفضل، کو بادشاہ کا تقرب حاصل
ہو گیا۔ وہ اپنی "آزاد خیالی" کے باعث علماء کے
ہاتھوں بہت تکلیفیں جھیل چکے تھے، اب ان کا زور
تورنے کے لیے انھوں نے انک محضر تیار کیا، جس کی

رو سے اکبر کو سلطان عادل قرار دیتے ہوئے اسے
مختلف فیہ دینی مسائل میں اجتہاد کے وسیع اختیارات
دے دیے اور اس پر اکثر علماء کے دستخط بھی ثبت
کرا لیے۔ اگرچہ محضر میں اس کی تصریح موجود تھی کہ
بادشاہ ان اختیارات سے صرف اسے اور میں کام لے گا جو
نص کے خلاف نہ ہوں اور عوام کی بہبود کا باعث ہوں،
تاہم ایک ایسے دور میں جبکہ مہدویت اور بھگتی
تحریک کی مقبولیت اور آزاد صوفیانہ طریقوں کی ترویج
سے ملک میں ایک روحانی انتشار رونما ہو چکا تھا
اور دربار میں ظل الہی کے ہر ارشاد کی از روئے
کتاب و سنت تاویلات پیش کرنے والے بھی موجود
تھے تو نص شرعی کے سراسر خلاف بدعات کا رواج
پانا باعث حیرت نہیں ہونا چاہیے! بقول شیخ احمد
سرہندی: "ہر فتورے کہ درین زمان در ترویج ملت
و دین ظاہر گشتہ از شومی علمائے سوء است" (بحوالہ
ابوالکلام آزاد: قد کرہ، ص ۲۱)۔

عبادت خانے کی مجالس اور ابوالفضل جیسے
نذیموں کی بدولت اکبر کے دل میں یہ خیال راسخ
ہو گیا کہ سچائی کسی ایک مذہب کا اجارہ نہیں، بلکہ
ہر مذہب میں اچھی اچھی باتیں موجود ہیں اور اس
معاملے میں اسلام کو کوئی برتری نہیں دی جا سکتی۔
اس رجحان کو دیکھ کر ہندو ہندوتوں اور مسیحی پادریوں
کو اسلام، شائع اسلام اور شعائر اسلام کے خلاف زبان
درازی کا موقع مل گیا۔ ان مجالس کی ابتدا تو بے لاگ
تحقیقات سے ہوئی تھی اور بادشاہ کی کوشش یہ تھی کہ ہر
مذہب کے عقائد و شعائر معلوم کیے جائیں، لیکن کچھ
تو مخالف مولویوں کی ضد میں، کچھ اپنی ہندو رانیوں
کی دلہنی اور راجپوت راجاؤں کی تالیف قلوب اور کچھ
ابوالفضل جیسے مشیروں کے زیر اثر نوبت یہاں تک
پہنچی کہ بقول ہداؤنی ارکان دین اور اسلامی عقائد کے
متعلق پہلے تو شکوک و شبہات کا اظہار کیا گیا،
پھر نماز، روزہ اور ان سب باتوں کو جن کا تعلق نبوت

اور شہباز خان کنہوہ جیسے امرا نے جرات سے کام لے کر اکبر کو سمجھانے کی کوشش کی اور مرزا حکیم نے علم بغاوت بلند کیا، ایکن بادشاہ پر کوئی اثر نہ ہوا اور پھر بعد دیگرے تمام مخالفین ترغیب و تخویف یا تشدد کا نشانہ بن گئے۔ ادھر حاشیہ نشینوں نے یہ بات اڑا دی کہ بعثت نبوی پر ایک ہزار سال گزر جانے کے بعد اسلامی شریعت کی عمر پوری ہو چکی ہے، لہذا ایک نئے دین اور ایک نئے شارع کی ضرورت ہے اور اس منصب کے لیے اکبر ہی سزاوار ہے۔ اس کی تصدیق میں طرح طرح کی جھوٹی سچی پیشگوئیاں، اقوال اور اشعار پیش کیے گئے اور بالآخر دین الہی اکبر شاہی کا اعلان کر دیا گیا۔

جو لوگ اس دین میں داخل ہوتے تھے انہیں بیعت کرتے وقت کلمہ ”لا الہ الا اللہ - اکبر خلیفۃ اللہ“ کے ساتھ دین اسلام مجازی و تقلیدی (یعنی جو باب دادا سے دیکھا سا تھا) سے علیحدگی اور اخلاص چہارگانہ (یعنی ترک مال، ترک جان، ترک ناموس، ترک دین) کا اقرار کرنا پڑتا تھا۔ ان مریدوں کو جو گیوں کی اصطلاح میں چیلہ کہا جاتا تھا۔ بادشاہ کی طرف سے انہیں زنا یا انگشتری ”جس پر اسم اعظم و نقش اللہ اکبر کندہ ہوتا تھا“ (آئین اکبری) اور بطور شجرہ بادشاہ کی تصویر عطا ہوتی تھی، جسے وہ سرخ غلاف میں رکھ کر دستار میں لگاتے تھے (منتخب التواریخ) اس دین کے عقائد و عبادات کے بیان میں ابوالفضل نے انتہائی ابہام اور اجمال سے کام لیا ہے، البتہ بدافق کے ہاں بڑی تفصیل ملتی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ بادشاہ نے علی الاعلان اسلام کی مخالفت شروع کر دی، وہ قرآن کا انکار ہو گیا اور وحی، حیات بعد الموت اور یوم جزا کا انکار کرنے لگا، اس کے برعکس وہ آفتاب پرستی اور مسئلہ تناسخ کا قائل ہو گیا، علاوہ ازیں سجدہ تعظیمی پر زور دیا گیا، شراب حلال کی گئی، سور کا گوشت شراب کا جزو بن گیا، جزیہ، موقوف کر

سے ہے، تعابدات کا نام دے دیا گیا۔ اس سلسلے میں ابوالفضل: ”آئین اکبری، باب آئین دہمنوی میں بھی بعض واضح اشارات ملتے ہیں۔ اکبر شروع شروع میں شیوں کی ضد میں شیعوں اور اہل صوفیوں کی طرف مائل ہوا تھا جو عقائد میں نسبتاً آزاد اور بے باک تھے، لیکن جب تعریض کی نوبت ائمہ اربعہ سے گزر کر ائمہ اثنا عشر اور اثنا تک پہنچی تو یہ بھی پیچھے ہٹ گئے اور انہیں بھی تقلید کا مازم ٹھہرا دیا گیا۔ یہی حال پارسی موبدوں اور برنگیز بادریوں کا ہوا، جنہیں ایک زمانے میں یہ خیال ہو چلا تھا کہ اکبر ان کا مذہب قبول کر لے گا۔ دراصل بادشاہ اور اس کے مشر ہر مذہب کو اپنے علم و عقل کی کسوٹی پر کستے تھے اور جو چیز ان کی سمجھ میں نہ آتی (جیسے حشر و نشر، وحی و رسالت وغیرہ) اسے بے تکلف رد کر دیتے چونکہ تحقیق کرنے والا ایک مطلق العنان بادشاہ تھا، اس لیے اکثر لوگ اپنے ذاتی مفادات کے پیش نظر ریاکاری سے اور بادشاہ کے میلان کے مطابق سخن سازی سے کام لیتے۔

یہاں یہ امر خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ ہندوؤں کے دل جیتنے کے لیے اکبر تمام حدود سے تجاوز کر گیا تھا اور اس نے ایسی رسوم اختیار اور رائج کیں جو سراسر ہندوانہ تھیں اور شریعت کے منافی، مثلاً ذبیحہ گاؤ کی ممانعت، جھروکہ درشن، داڑھی منڈوانا، بھدرا کروانا، قدقہ لگانا، اور ہندو رانیوں کے ساتھ مل کر ان کی مذہبی رسموں میں حصہ لینا۔ اسے خواہ سیاسی مصلحت یعنی ہی سے تعبیر کیوں نہ کیا جائے لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ اس حکمت عملی کے نتائج و عواقب برصغیر میں اسلام اور پیروان اسلام کے لیے سخت مہلک ثابت ہوئے۔ دربار کی اس روش سے ملک میں بے چینی پھیلنا ایک قدرتی امر تھا، چنانچہ ملا محمد بردی نے فتویٰ دے دیا کہ بادشاہ بد مذہب ہو گیا ہے اور اس کے خلاف جہاد واجب ہے۔ قطب الدین کو کہ

دیا گیا۔ سود اور جوئے کی حلت کا اعلان ہوا، صوم و صلوٰۃ اور حج منسوخ کر دیے گئے؛ دیوان حکومت میں اذان اور نماز باجماعت، موقوف ہو گئی، عربی کے مظاہر کو بہ نظر تحقیر دیکھا جانے لگا اور تہ و تفسیر و حدیث کے بجائے نجوم و طب اور حساب و فلسفہ کی تعلیم رائج کی گئی؛ تقویم اسلامی کے بجائے الہی ماہ و سال رائج کیے گئے؛ "صاح کل" کی آڑ میں ہندوؤں کو اجازت مل گئی کہ وہ رمضان میں علی الاعلان کھانیں پئیں، لیکن جب ہندو برت رکھیں تو مسلمان علاقہ کھانے پینے سے باز رہیں؛ بعض مقامات پر عبدالاضحٰی کے موقع پر کلمے ذبح کرنے کی پاداش میں مسلمانوں کی جان لی گئی؛ بعض مقامات پر ہندوؤں نے مساجد کو منہلیم کر کے سندر بنا لیے، وغیرہ وغیرہ۔ بعض مؤرخین کی رائے میں بداؤنی کے یہ بیانات اکبر اور ابوالفضل سے اس کی ذاتی مخالفت پر مبنی ہیں اور اس مخالفت سے کسی صورت انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بابی ہمدہ عہد جہانگیری کے ابتدائی ایام میں حضرت شیخ احمد سرہندیؒ نے جن کے ہاتھوں سر زمین ہند میں شریعت اسلامی کا احیا عمل میں آیا، شیخ فرید بخاری کے نام اپنے مکتوب میں دور اکبری پر جو تبصرہ کیا ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ بداؤنی کا بیان صداقت سے سراسر خالی بھی نہیں ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "گزشتہ زمانے میں کافر غالب ہو کر دارالاسلام میں کفر کے احکام جاری کرتے تھے اور مسلمان اسلام کے احکام جاری کرنے سے عاجز و مجبور تھے اور اگر کرتے تو قتل کیے جاتے۔ ہمارے افسوس! حق تعالیٰ کے محبوب نبیؐ کریم کی تصدیق کرنے والے ذلیل تھے اور ان کے منکر معزز تھے۔ مسلمان زخمی دلوں کے ساتھ اسلام کا ماتم کرتے تو دشمن تمسخر کر کے ان کے زخموں پر نمک پاشی کرتے۔ ہدایت کا آفتاب گمراہی کے حجاب میں مستور تھا" (مکتوبات امام ربانی، ۱: ۷۷، نیز

دیکھیے ۱: ۸۱، ۱۹۵، ۲۰۲، مکتوب ۲۹)۔ زمانہ حلت کے محققین کے ہاں یہ رجحان پنا جاتا ہے کہ دین الہی کو اسلام سے ارتداد تصور کرنے کے بجائے دائرۃ اسلام ہی کے اندر ایک غیر شرعی فرقے کی حیثیت دی جائے (لیکن مجدد سرہندیؒ کے ملفوظات کی روشنی میں اس رائے کو قبول کرنے میں تامل ہونا ہے۔

بہر حال اکبر کے حق میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ مروجہ اسلام کے دائرے سے باہر آ جانے کے باوجود اس نے علی الاعلان خدا یا نبی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا اور نہ کسی کو اپنا پیامدھب قبول کرنے پر مجبور کیا۔ ۱۰۰۱ھ میں شیخ مبارک اور ۱۰۰۳ھ میں فیضی کے انتقال کے بعد اس کو ساختہ دین کے دو بڑے ستون گر پڑے۔ ۱۰۰۷ھ میں ابوالفضل دکن کی مہمات پر بھیج دیا گیا تو دربار میں دین الہی کی سرگرمیاں مدھم بڑگیں اور بقول جہانگیر ابوالفضل کے خاتمے (۱۰۱۱ھ) کے بعد اکبر کی بد اعتقادی کا بھی خاتمہ ہو گیا اور وہ ایک بک عقیدہ مسلمان کی طرح دنیا سے خدا کے حضور میں گیا۔ اگرچہ اکبر کی وفات کے ساتھ دین الہی کا خاتمہ ہو گیا لیکن اس کی بدولت مسک کے اندر نے دینی اور بدعت کی جو رو جل نکلی تھی، وہ دور جہانگیری میں بھی ایک عرصے تک جاری رہی۔ اس کے خلاف راسخ العقیدہ مسلمانوں کی طرف سے نہایت شدید رد عمل کا اظہار ہوا، جس کی نمائندگی نقشبندہ تصوف میں حضرت شیخ احمد سرہندیؒ نے اور علوم دینیہ میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے کی۔

مآخذ: (۱) ابوالفضل علامی: انبیا آفری، ج ۱ (انگریزی ترجمہ از بلاوخم)، کلکتہ ۱۹۷۷ء، ص ۵۰ تا ۵۸، ۶۵، ۱۱۰، ۱۱۵ تا ۱۵۷، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸ (ترجمہ از جبرٹ)، کلکتہ ۱۹۸۹ء، ص ۳۰، ۳۱، ۳۲ (ترجمہ از جبرٹ) کلکتہ ۱۹۸۸ء، ص ۲۶ تا ۲۹، ۳۰ (۲) وہی مصنف:

(نسخ) احمد سرہندی، ابوالفضل، اکبر وغیرہ)۔

(عزیز احمد [ادارہ])

دیناج پور : مشرقی پاکستان کا ایک ضلع، ۱۹۵۱ء

آبادی (۱۹۵۱ء میں) ۱۳۵۴۴۳۲۔

۱۹۴۷ء میں یہ ضلع تقسیم ہو گیا اور اس کا

جنوبی حصہ بھارت میں شامل کر دیا گیا۔

مآخذ : (۱) Eastern Bengal District Dina-

A. Cunningham: الہ آباد ۱۹۱۲ء: (۲)

ASI: ham ج ۱۵، کلکتہ ۱۸۸۲ء: (۳) G.H. Damant

Notes on Shah Ismā'il Gilgāzi, with a sketch of the

contents of a Persian Ms. Risālat ush-Shuhadā

The House of: A. H. Dani (۴) ۱۸۷۳ء: (۵) JASB

در Rājā Gaussa of Bengal JASB ۱۹۵۲ء: (۶)

وہی مصنف: Bibliography of the Muslim inscrip-

tions of Bengal کھاگہ ۱۹۵۷ء۔

(A. H. Dani [تلخیص از ادارہ])

دینار : (جمع دنانیر) ابتدائے اسلام میں ایک

طلاتی سکے کا نام۔ یہ لفظ یونانی کلمہ δηνάριον

(لاطینی denarius) سے ماخوذ ہے، جو دراصل چاندی

کے ایک سکے کا نام تھا، لیکن عہد قسطنطینی کے بعد

کے زمانے میں یہ سولڈیوس Solidus دینار، روم اور بوس

denarius aureus یا νομισματικόν کے مترادف

کے طور پر استعمال ہوتا رہا۔ عرب ظہور اسلام سے

پہلے اس لفظ سے اور رومی و بوزنطی طلانی سکے

سے بخوبی مانوس تھے (قرآن مجید م [آل عمران]: ۷۵:

نیز دیکھئے J. Stepková، در Numismatický Sborník

۳ (۱۹۵۶ء): ۶۵)۔

قدیم نون عربی دینار پر کوئی تاریخ درج

نہیں، لیکن اسے نواح ۶۹۱/ھ - ۶۹۲ء سے منسوب

کیا جاتا ہے اور یہ بات قریب قریب دورے

ونوق سے کہی جاسکتی ہے کہ یہ دمشق میں

مضروب ہوا تھا۔ یہ ہرقل اور اس کے دو بیٹوں کے

مکتوبات، نکھشو ۱۸۶۳ء: ۳: ۲۶: (۳) بدائق: منتخب

اندواریخ، کلکتہ ۱۸۶۸ء - ۱۸۸۰ء: ۲: ۲۰۰ تا ۲۰۸ء

۲۵۵ تا ۲۸۷ء: ۳۰۱ تا ۳۲۶ء: ۳۳۹ تا ۳۵۶ء: ۳۹۱

تا ۳۹۲ء: (۴) محسن قلی: داستان مذاہب (انگریزی

ترجمہ از A. Tanyer و D. Shio: پیرس ۱۸۷۳ء: ۳۸

تا ۱۰۵: (۵) عنایت خان راسخ: عنایت نامہ، مخطوطہ،

انڈیا آفس، عدہ ۵۴۹ فارسی، ورق ۲۰۲ تا ۲۰۳ الف: (۶)

Akbar the Great Mogul: V. A. Smith: آکسفورڈ

: ۱۹۳۷ء، ص ۲۰۹ تا ۲۲۲ء: (۷) E. W. Buckler

A New interpretation of Akbar's "infallibility"

decree of 1579 در JRS ۱۹۲۴ء، ص ۵۹۱ تا ۶۰۸

The religious policy of the Mughal: (۸) سری رام شرما:

Emperors, آکسفورڈ، ۱۹۹۷ء، ص ۱۸ تا ۶۸: (۹)

سکھن لال رائے چودھری: The Din-i-Ilahi، کلکتہ ۱۹۹۱ء

(۱۰) شیخ محمد ابراہیم: روداد کوثر، مطبوعہ کراچی،

ص ۷۷ تا ۸۷: (۱۱) Akbar's religious: B. Wellesz

thoughts reflected in Mogul Painting لندن

L'Essai de: Y. Hikmet Bayur (۱۲) ۱۹۵۲ء

reforme religieuse et sociale d'Ekler Gurken در

Bulletin ۱۹۳۸ء: ۱۲۷ تا ۱۸۵: (۱۳) عزیز احمد:

Akbar, heretique or apostat? در JA ۱۹۶۱ء

ص ۲۱ تا ۳۸: (۱۴) Father Xavier: Coereia Afonso

and the Muslims of the Mughal Emperor ۱۹۵۷ء

انیز دیکھئے (۱۵) ابوالفضل: اکبر نامہ، م جلد، کلکتہ

۱۸۷۷ء تا ۱۸۸۸ء: (۱۶) محمد میاں: علمائے ہند کا

شائدار، ماضی، دہلی ۱۹۵۸ء، ص ۱۶، پیغہ: (۱۷) سید ہاشمی

فرید آبادی: تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت، مطبوعہ

کراچی، ص ۵۵۲، پیغہ: (۱۸) مجلہ الفرقان، بریلی، مجدد

الف ثانی نمبر و شاہ ولی اللہ نمبر: (۱۹) محمد فرمان:

حیات مجدد، لاہور ۱۹۵۸ء: (۲۰) محمد حسین آزاد:

دینار اکبری: (۲۱) اسام قریشی: دین الہی: (۲۲)

حسن علی: تعلیمات مجدد، نر دیکھئے، آخذ بذیل مادہ های

عہد کے سولڈیوس Solidus کی نقل ہے، لیکن اس کی مخصوص مسیحی علامات حذف کر کے ان کے بجائے عربی زبان میں ایک مذہبی عبارت کندہ کر دی گئی ہے۔ جب عبدالملک نے سکوں کی اصلاح کی تو اس کا دینار کی شکل و صورت پر بڑا گہرا اثر پڑا: چنانچہ چند شاذ مستثنیات سے قطع نظر اس پر صرف عبارت باقی رہ گئی۔ شمالی افریقہ اور اندلس کے دینار (قوق) کی اپنی ایک الگ تاریخ ہے: تقریباً ۸۸۵ھ/۷۴۰ء سے پہلے دینار اور اس کے مکسور سکے ہرقل کے فرطاجنی سولڈیوس کی نقل تھے، لیکن ان پر اسلامی عبارات کا مختصر لاطینی ترجمہ درج کیا جاتا تھا۔ بعد ازاں ۸۹۵ھ/۷۴۲ء تک شیبہیں خارج رہیں اور تاریخ ضرب بعض اوقات قسطنطینی تقویم کے مطابق لکھی جاتی رہی۔ ۹۵۵ھ سے ہجری تاریخیں درج ہونے لگیں اور ۹۷۰ھ/۷۱۵ء - ۷۱۶ء میں دو زبانوں میں عبارات لکھی جانے لگیں اور پھر نئی صدی کے آغاز ہی سے افریقہ (قیروان) اور الاندلس (قرطبہ) دونوں جگہ خالص عربی نمونے کے دینار جاری ہو گئے، جو صرف معمولی جزئیات کے اعتبار سے بلاد مشرق کے اصلاح شدہ دیناروں سے مختلف تھے۔ طلائق سکوں کا ضرب ہونا الاندلس میں ۱۰۶۷ھ/۱۰۲۵ء میں بند ہو گیا (۱۰۲۷ھ/۱۰۷۴ء - ۱۰۸۵ء میں بے قاعدہ ضرب کیے ہوئے سکے، جو جاری بھی نہیں ہوئے، اس سلسلے میں واحد استثنا ہیں) اور ۱۲۱۷ھ/۹۲۹ء تک، جو عبدالرحمن الثالث کا عہد ہے، اس کا دوبارہ اجرا نہ ہو سکا۔

قدیم عبوری دینار کا معیاری وزن وہی تھا جو بوزنطی سولڈیوس کا تھا، یعنی تقریباً ۴.۵۵ گرام۔ عبدالملک کی اصلاحات کے بعد اس کا وزن گھٹا کر ۴.۲۵ گرام کر دیا گیا۔ اس وزن کی تصدیق نہ صرف دیناروں کے اوزان سے ہوتی ہے، جو بڑی احتیاط سے محفوظ رکھے گئے ہیں، بلکہ مصری

آدمہ دینار (نصف، Semissis) اور تہائی دینار (ثلث، tremisses) شمالی افریقہ اور اندلس میں عبوری دور اور دوسری صدی ہجری / آٹھویں صدی عیسوی کے اوائل میں مضروب ہوئے اور ان مکسور سکوں کے مساوی الوزن (۲۰۱۲ اور ۱۰۴۱ گرام) شیشے کے باٹ اس صدی کے تیسرے ربع تک جاری رہے۔ چوتھائی دینار (ربع) تیسری صدی ہجری کے اوائل میں شمالی افریقہ میں بنو اعلب نے جاری کیا اور بعد ازاں بنو فاطمہ نے اسے شمالی افریقہ اور صقلیہ دونوں

ان کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان میں سلاوٹ گھٹیا درجے کی دھاتوں کی ہے، جن میں چاندی کی اچھی خاصی مقدار موجود ہے۔ یہ کھوٹ ملوک الطوائف کے اندلسی سکوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ عہد مغول اور دور مابعد میں مشرق ایران اور ماوراء النہر میں چاندی اور تانبے کے دیناروں کا بھی پتا چلتا ہے (دیکھیے V. Schröter : کتاب مذکور در مآخذ)۔

دینار کی مختلف مکسور سکوں میں تقسیم کے بارے میں رگ بہ دانق، قیراط، حبة، بذیل مادہ "سکہ"۔

ظاہری وضع کے اعتبار سے خلفا اور بیشتر خود مختار شاہی خانوادوں کے دیناروں میں بڑا معمولی اختلاف نظر آتا ہے۔ ابتدائی سکوں پر کلمہ شہادت اور سورۃ الاخلاص کا ایک حصہ درج کیا جاتا تھا اور مدور حاشیوں پر "مصدق نبوت" (القرآن التوبہ) : ۳۳) ہوالذی ارسل رسولہ بالہدی و دین الحق لیظہرہ علی الدین کلہ و توکرہ الشرکون :- اسی نے بھیجا اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دے کر تاکہ اس کو غلبہ دے دین پر اور پڑے برا مانیں شرک (۹) [التوبہ] : ۳۳) : نیز ایک عبارت جس میں تاریخ ضرب الفاظ میں لکھی جاتی تھی۔ بنو عباس نے عبارات اور ان کی ترتیب قدرے بدل دی۔ ۸۱۷ء / ۸۱۶ء - ۸۸۷ء تک دینار پر کسی کا نام درج نہیں ہوا تھا۔ اس کے بعد بہتم دارالضرب کا نام لکھا جانے لگا۔ الامین اور السامون کے جاری کردہ بعض سکوں پر ان کے نام بھی موجود ہیں اور المعتصم کے زمانے سے خلیفہ کا نام باقاعدہ درج ہونے لگا۔ ۸۱۹۸ء / ۸۱۳ء - ۸۱۷ء تک سکوں سے دارالضرب کا پتا نہیں چلتا، البتہ سال مذکور سے مصر (فسطاط) اور بعد ازاں مدینۃ السلام (بغداد) صنعاء، دمشق، المحمدیۃ (ری)، مرو، سمرقند (سامرا) اور کئی دوسرے شہروں میں تیار ہونے والے سکوں پر تاریخ ضرب

ملکوں میں بکثرت رائج کیا۔ صقلیہ میں آگے چل کر یہ tarijoro کے نام سے مشہور ہوا۔ اسی طرح اسے اندلس میں عبدالرحمن الثالث اور اس کے جانشینوں نے اور بعض ملوک الطوائف نے جاری کیا۔

جسٹان تک کھوٹے پن کا تعلق ہے، ابتدائی دور کے دینار کا معیار بہت بلند تھا۔ دور اصلاحات کے بعد کا اموی دینار ۹۶ فی صد اور ۹۸ فی صد کے درمیان کھرا ہوتا تھا اور کم و بیش یہی معیار عہد بنی امیہ میں بھی قائم رہا۔ اس سلسلے میں جو ادوار مستثنیٰ قرار دیے جاسکتے ہیں وہ الامین اور السامون کی باہمی خانہ جنگی کے ایام، مصر میں بنی مولون کے خاتمے اور اخشیدی خاندان کی حکومت کے آغاز کا درمیانی عرصہ اور بغداد میں آل بویہ کا عہد ہے۔ ان کے مقابلے میں خلیفہ الناصر اور اس کے جانشینوں نے جو سکے اپنے نام پر دور خلافت کے آخری ایام میں بغداد میں دوبارہ ضرب کرائے شروع کیے تھے ان کے سونے میں بہت کم کھوٹ تھی، پھر بھی یہ پرانے سکوں کے معیار سے خاصے گرے ہوئے تھے۔ بنو فاطمہ کے عہد میں مصر میں ان کا معیار بڑھ کر ۹۸ فی صد ہو گیا بلکہ الامر کے دور میں یہ ۱۰۰ فی صد کے قریب قریب پہنچ گیا۔ صلاح الدین کے عہد میں یہ ۹۰ فی صد سے بھی گھٹ گیا، لیکن اس کے جانشینوں خصوصاً الکامل کے عہد میں یہ دوبارہ بڑھ کر ۹۸ سے ۱۰۰ فی صد تک ہو گیا۔ ابن بعرۃ ۶۱۵ اور ۶۳۵ کے مابین لکھتا ہے: "مغرب میں یا مشرق میں کوئی دینار معیار کے لحاظ سے الامر الکامل کے دینار سے باڑی نہیں لے جاسکا"۔ بلاد مشرق میں اپنے دور انحطاط میں دینار کے کھوٹے پن کے بارے میں قابل اعتماد اعداد و شمار نہیں ملتے (غزنویہ، سلاجقہ، خوارزم شاہیہ وغیرہ)، لیکن اس عہد کے جو سکے محفوظ ہیں انہیں دیکھنے سے، نیز پانچویں اور چھٹی صدی ہجری میں مشرق خراسان سے متعلق جو محدود فنی معلومات دستیاب ہوتی ہیں

بلکہ پانچویں صدی ہجری/گیارہویں صدی عیسوی میں ان مسیحی سکوں کے لیے جو ہسپانیہ میں دینار کی نقل میں تیار ہوئے، بطور اسم صفت یعنی استعمال ہونا ہے (دیکھئے Rev. belge : P. Grierson، *Le phil. et d'histoire* ۲۲ : ۱۹۵۳) : ۱۱۵۹، *Rev. Numismatique* J Duplessy، ۱۹۵۶ء، ص ۱۰۱)۔ الفانسو ہشتم، حکمران قشتالہ، کا ابتدائی سکہ marabotino (maravedi وغیرہ) رابطی دینار کی نقل تھا، جس پر مسیحی عبارات عربی رسم الخط میں درج تھیں۔

مختلف قسم کے دیناروں کو بیان کرنے اور ایک دوسرے سے تمیز کرنے کے لیے مختلف مآخذ میں جو اسماء اور اسمائے صفات ملتے ہیں، ان کی ایک فہرست Sauvage (دیکھئے مآخذ) نے مرتب کی ہے۔ اس میں حسب ذیل کا اضافہ کر لیجیے : اناہکی (زلنگی)، توری (برائے ٹری؟ JAOS، ۱۹۵۳ء، ص ۱۶۳)؛ جیشی (Dozy، مکملہ)؛ حاکمی (فاطمی)، حسنی (فاطمی)، الخربطہ (مخصوص موقعوں کے لیے، *Geschichte... Samarra* : Hertzfeld، ص ۱۹۵)؛ عدد ("گنا ہوا"، *αριθμητικὴ πύλη*)؛ بردی (پاپیری)؛ سوا (درست وزن کا، بردی طری (تازہ، غیر مدور، بردی)؛ قوامی (بویہی *Ars Islamica*، ۱۹۵۱ء، ص ۲۳)؛ مثقالی (پورا وزن، بردی)؛ مدوڑہ (فاطمی، جس پر ہم مرکز دائروں کی صورت میں عبارات درج ہیں؟)؛ مسطرہ (فاطمی، جس پر عبارات متوازی بطور میں ہیں؟)؛ مشخص یا شخص (جس پر شبہیں ہیں، یعنی یورپی، BSOAS، ۱۹۵۳ء، ص ۲۲)؛ JESHO، ۱۹۵۸ء، ص ۸۸)؛ مشرقی (بردی پاپیری)، مظفری (شاہ اسمز JAOS، ۱۹۵۳ء، ص ۱۶۳)؛ معول ("صحیح طور پر گنا ہوا"، بردی پاپیری)؛ ساکی (زریعی *Num. Zeitschrift* : Zuray'id، ج ۸، ۱۹۱۸ء، ص ۱۷۲)؛ متحت ("تراشا ہوا"، بردی)؛ نزاری (فاطمی)، بوسفی (موحدی، ابن خنکلی)۔

وائی عبارت میں دارالضرب کا نام بھی درج ہونا شروع ہو گیا۔ آہستہ آہستہ کچھ اور عبارات کا بھی اضافہ ہوئے لگا، مثلاً ولی عہد کا نام، ذیلی مذہبی عبارتیں اور بالآخر خود مختار شاہی خانوادوں اور فرمانرواؤں کے نام۔ اگرچہ بنو فاطمہ نے ابتدائی سکوں کے نمونوں کو یک قلم ترک نہیں کیا تاہم وہ ان پر شیعہ عبارات درج کرنے لگے۔ ان کے سکوں پر تمام عبارتیں ہم مرکز دائروں کی صورت میں لکھی جاتی تھیں۔

چھٹی صدی ہجری میں المغرب میں، ساتویں صدی ہجری/اٹھارہویں صدی عیسوی میں بلاد مشرق اور ہندوستان میں اور آٹھویں صدی ہجری/چودھویں صدی عیسوی میں مصر میں دینار کا لفظ متروک ہو گیا۔ دینار کے باقاعدہ رواج کے دوران میں اور اس کے بعد بھی ایک حسابی سکے کے اعتبار سے اس کا استعمال دور دور تک جاری رہا۔

مغربی یورپ کی معاشیات پر دینار کے اثر اور آڑنے وسطی کی بین الاقوامی تجارت میں یوزقطنی صولڈیوس Solidus یا نومسمہ Nomisma کے ساتھ ساتھ اس کے استعمال کے بارے میں Pirenne، Monneret de Villard، Grierson، Bolin، Lopez، Lombard، Block وغیرہ نے بالخصوص سیر حاصل بحث کی ہے (ان تمام مباحث کو مآخذ کے ساتھ F.J. Himly نے *Rev. Suisse d' Histoire* ۵۰ : ۱۹۵۵ء، ص ۳۱ میں آسانی کی خاطر یکجا کر دیا ہے)۔ لہذا یہ ناگزیر تھا کہ جس طرح مختلف اوقات میں دوسرے مقبول عام مبادیے کے سکوں (مثلاً فلورن florin، ڈوکٹ ducat وغیرہ) کی نقل ہوتی رہی تھی ان کی بھی وقتاً فوقتاً نقل ہوئی (مثلاً صلیبی زناخت اور عربی دینار صوری، جو زیادہ تر المستنصر اور الامر کے فاطمی سکوں کی نقل تھا)۔ مغربی بحیرہ روم کے علاقوں میں دینار نے mancus کی صورت اختیار کی۔ یورپی کلمہ صرف عربی دینار اور اصطلاح حساب کے طور پر ہی نہیں

Fatinid coins (نیوبارک ۱۹۵۰ء) (۱۱) وہی مصنف :
 The coinage of the Umayyads of Spain (نیوبارک
 ۱۹۵۰ء) (۱۲) عربی شیشے کے بانوں کی کئی نمونیں
 (دیکھیے مادہ سنہ جات) : P. Grierson (۱۳) The mone-
 ary reforms of Abd al-Malik (۱۹۶۰ء) JESHO
 ص ۲۳۱ : (۱۴) کاغذی سکوں کی متعدد نمونیں (سکمل
 مأخذ در : A. Grohmann (۱۵) Arabic papyri in the
 Egyptian Library اور سکوں کے ذمروں کے بارے میں جن
 میں سے ممتاز ترین ذخیرے لندن (این بول) پیرس (Laviox)
 برلن (Nutzel)، استانبول (اسمعیل غالب، احمد توحید، خلیل
 ادھم) میں ہیں اور (۱۵) اموی و عباسی سکوں کے بارے میں
 Moneti vostochnago : W. Tiesenhausen
 Khalifata : (۱۶) متعلقہ کتابوں کی تفصیل :
 Bibliography of Moslem Numismatics طبع دوم لندن
 ۱۹۵۳ء میں ملے ہے۔

(G.C. Miles)

* دینار ملک : جن اوغوز سرداروں نے سلجوق

فرساروا سنجر کی سلطنت میں خال آجانے کے بعد
 خراسان پر قبضہ جما لیا تھا، ان میں ایک سردار دینار ملک
 بھی ہے۔ چونکہ خوارزم شاہی سلطنت کے دہاو کے باعث
 یہاں حکومت قائم رکھنا دشوار تھا اس لیے دینار ملک
 نے پملاجقہ کرمان کے باہمی نزاع سے فائدہ اٹھا کر
 اس ریاست پر قبضہ کر لیا (۵۸۲ھ/۱۱۸۶ء) اور ان
 تمام مخاصمتوں کے باوجود، جن کا اندیشہ اسے سیستان،
 فارس اور خلیج فارس کی سرحدوں کی طرف سے لاحق
 رہتا تھا، وہ تادم مرگ یعنی ۵۹۱ھ/۱۱۹۵ء تک
 کرمان پر قابض رہا۔ البتہ اس کی وفات کے بعد کرمان
 بھی خوارزمیوں کی سلطنت کا حصہ بن گیا جس کی وجہ
 یہ تھی کہ اوغوز یہاں کافی تعداد میں نقل مکان کر کے
 نہیں آ سکے تھے۔

مأخذ : (۱) بدائع الزمان فی وقائع کرمان غالباً

اس دور کی تاریخ کرمان کا واحد مأخذ ہے۔ یہ ہم عصر

مختلف دہاتوں مثلاً نکل، تانبا وغیرہ کے سکوں
 کے لیے لفظ دینار عہد حاضر میں بھی استعمال ہونا رہا
 ہے، مثلاً قاجاری (ناصر الدین شاہ اور اس کے جانشین اور
 خاندان یہلوی) عہد میں اور عراق (دینار کاغذی سکے
 ... Filz اور یوگوسلاویہ (دینار = ... para)
 میں، لیکن ان کا قدیم عربی سکے سے فوقی تعلق نہیں۔
 (نیز دیکھو یہ مقالہ، قیراط، سنہ جات اور ...)
 مأخذ : (۱) المنبری : کتاب تذکر العتود،
 مختلف طباعتیں بشمول Tychsen (۱۷۹۷ء)، استانبول
 (۱۹۱۹ء) L.A. Mayer (۱۹۳۳ء) A.M. de St. Elie
 Die Nominale der : E. V. Bergmann (۲) (۱۹۳۹ء)
 Münzreform der Chalifen Abdulmelik : SBAk.
 وائن (۱۸۷۰ء) H. Saffaire (۳) (۲۳۹ء) :
 Matériaux pour servir à l'histoire de la numis-
 matique et de la métrologie musulmanes
 (۱۸۷۹ء تا ۱۸۸۲ء) : اس جامع اور ضروری کتاب کا مفید
 خلاصہ از S. Lane-Poole در NC (۱۸۸۳ء) ص ۶۶ تا
 ۹۶ : (۴) R. Vasmer در Wörterbuch : F.V. Schrötter
 der Münzkunde (برلن-لائپزگ ۱۹۳۰ء) بنیل مادہ دینار :
 A catalogue of the Arab-Byzantine : J. Walker (۵)
 and post-reform Umayyad coins (Cat. of the
 Muhammadan coins in the British Museum
 Einführung und : A. Grohmann (۶) (۱۹۵۶ء)
 Chrestomathie zur arabischen Papyruskunde (Mon-
 graphie Archiv Orientalis ۱۱/۱۲) (۱۹۵۵ء)
 (۷) A. S. Ehrenkreutz کے دینار اور اس کے سونے کے
 معیار کے بارے میں کئی مقالات، در JAOS ۱۹۵۳ء
 ص ۱۹۲، ۱۹۵۶ء ص ۱۷۸ اور JESHO ۱۹۵۹ء : (۸)
 Some early Arab dinars : G.C. Miles در
 Museum Notes : Numismatic Society ج ۱۳
 (۱۹۳۸ء) ص ۹۳ : (۹) وہی مصنف : The numismatic
 history of Rayy (نیوبارک ۱۹۳۸ء) : (۱۰) وہی مصنف :

(۱۷۶) یہ بیان کرتا ہے کہ نہراوسوس (کرخا) دینور کے نواح سے نکلتی ہے تو اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس کے نزدیک اس کا حقیقی منبع جم دینور تھا۔ دینور کی بنیاد، اگر زیادہ قدیم زمانے میں نہیں، تو کم از کم سلوکی (Seleucid) دور میں رکھی گئی تھی۔ کنگاور (۲۲۰ کباویشتر شرقاً جنوباً) میں ایک یونانی بستی موجود تھی، جہاں زمانہ حال کی کھدائی میں بتیر کا ایک آئینہ دریافت ہوا ہے، جس کی آرائش سلیووس (Satyrs) اور ساپیرون (Silenus) کے جسون کے بالائی حصوں کی تصویروں سے کی گئی ہے، اس لیے یہ امر قریب قیاس ہے کہ یہاں یونانیوں نے دیونیسس (Dionysus) پرستی کی ترویج کی ہوگی دیکھیے (R. Ghirshman : Iran ص ۲۳۶)۔

۶۳۲/۸۲۱ء میں جنگ نہاوند کے فوراً ہی بعد اہل دینور نے عربوں کی اطاعت قبول کر لی۔ [حضرت] امیر معاویہ [رضی اللہ عنہ] کے عہد میں اس کا نام ماہ الکوفہ رکھا گیا۔ خلیفہ موصوف کے زمانے میں جب سلطنت کو نظم و نسق کے اعتبار سے مختلف اضلاع میں تقسیم کیا گیا تو ماہ الکوفہ صرف دینور کے شہر ہی کا نہیں بلکہ حبال کے دو اضلاع کا بھی نام تھا۔ دینور بالائی اور قریبین (کرمان شاہ) زبیر علاقے پر مشتمل تھا۔ ماہ الکوفہ کے مغرب میں ضلع حلوان، جنوب میں ماسبدان، مشرق میں ہمدان اور شمال میں آذربائیجان تھا (دیکھیے قدامتہ در BGA (طبع ڈیوہ) ۶ : ۲۳۳ بعد)۔ ماہ الکوفہ اور ماہ البصرہ (نہاوند) جیسے ناموں میں لفظ ماہ کے مفہوم کے بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ بعض عرب مصنفوں کی رائے میں ماہ ایک فارسی اسم ہے اور عربی لفظ قصبة بمعنی شہر یا صدر مقام کا مترادف ہے! اس کے برعکس بلعمی نے تاریخ الطبری کے فارسی ترجمے میں لکھا ہے کہ یہ ایک پہاوی لفظ ہے جس کے معنی ہیں صوبہ یا سلطنت (دیکھیے Zotenberg کا

مؤرخ افضل الدین الکرمانی کی تصنیف ہے۔ اس کا متن مؤلفین مامد (بالخصوص حسن بزدی) کی کتابوں سے از سر نو مرتب کر کے سہدی الیانی نے ۱۳۳۱/۱۹۵۲ء میں تصحیح ۱۹۱۲ء میں شائع کیا لیکن اس ماخذ تک ہماری رسائی اس سے پہلے اسی آسانی کے ساتھ محمد بن ابراہیم کی تصنیف *History of the Seldjūks of Kirmān* طبع Th. Recueil de textes relatifs à l'histoire : Houtsma *des Seldjoukides* ج ۱ : (جس کا تجزیہ Houtsma نے ۱۸۸۵ء میں ایک مقالے میں کیا ہے) کے ذریعے ممکن تھی۔ اس سلسلے میں ملک دینار کے بارے میں افضل اندین کی ایک خاص کتاب (۲) عتدائلی، طبع ۱۳۱۱/۱۹۳۲ء نیز (۳) رسالۃ سے رجوع بھی کر رہے ہیں حال ہی میں عباس اقبال کو سلا اور ۱۳۳۱/۱۹۵۲ء میں اس نے شائع کیا ہے۔ اس میں کرمان کی تاریخ کا تسلسل ۱۲۱۵/۸۶۱ء تک قائم رکھا گیا ہے۔ (مدیر نے افضل الدین پر ایک بہترین تعارف تحریر کیا ہے) : متفرق والے (۴) ابن الاثیر، ۱۱ : ۱۱۶، ۱۳۸ تا ۱۲۲۹ : ۱۹۸ میں اور (۵) الجوبینی : تاریخ جہانگشاہی، طبع مکتبۃ الترویجی : ۲ تا ۲۲ (دور غرسانی) میں بھی ملتے ہیں۔

(CL. CAHEN)

* دینور : (جسے بعض اوقات غلطی سے دینور لکھا گیا ہے) ازمنہ وسطیٰ میں الجبال (Media) کا ایک اہم شہر تھا، مگر اب کھنڈر بن چکا ہے۔ اس کا صحیح محل وقوع ۳۴ درجے ۲۵ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۴۷ درجے ۲۶ دقیقے طول بلد مشرق (گرینچ) ہے۔ اس کے کھنڈر سطح سمندر سے ۱۶۰۰ فٹ بلند ایک میدان کے شمال مشرق کنارے پر واقع ہیں جو جم دینور سے سیراب ہوتا ہے۔ یہ ندی تنگ دینور کے زرخیز علاقے کو قطع کرتی کوہ بستوں کے قریب گمش آب سے جا ملتی ہے۔ گمش آب قرہ صو کا ایک معاون ہے جس کی زبیریں گورگاہ کرخا کے نام سے مشہور ہے۔ جب ابن خردادبہ (طبع ڈیوہ) ص

یہاں ایک جھوٹی سی خود مختار ریاست قائم کر لی جس کا دارالحکومت دینور تھا۔ یہاں اس کا قبضہ تقریباً پچاس برس (۸۳۶۹/۶۷۹ء میں اس کی وفات) تک قائم رہا۔ حمد اللہ مستوفی (نزهة، ص ۱۰۶) نے دینور کے متعلق لکھا ہے کہ یہ ایک چھوٹا سا شہر ہے، آب و ہوا معتدل اور پانی کی فراوانی ہے۔ یہاں غلے کی فصلیں ہوتی ہیں اور پھل بھی بکثرت ہوتا ہے۔ مستوفی کے زمانے سے پچاس برس بعد تیمور کے ہاتھوں دینور پوری طرح تباہ و برباد ہو گیا اور پھر دوبارہ کبھی تعمیر نہ ہو سکا۔

تھیوڈور شٹراوس Theodore Strauss، جس نے ۱۹۰۵ء میں سیاحت کے دوران میں دینور کے کھنڈروں کو دیکھا تھا، لکھتا ہے: ”دینور کے محل وقوع کا سراغ صرف مٹی کے ان ٹیلوں سے ملتا ہے جنہیں سکوں کی تلاش میں کئی بار کھودا جا چکا ہے۔ اب بھی کئی پرانی چیزیں ملتی رہتی ہیں، بالخصوص ان کسانوں کو جو کھیتوں میں ہل چلاتے ہیں (دیکھیے Strause : Eine Reise im Westlichen Persien، در Geog. Mitteil : Petetmann، ۱۹۱۱ء ص ۶۵)۔ شٹراوس نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ تنگ دینور میں، جو اس کے نواح میں واقع ہے، ایک قدیم سڑک کے آثار آج بھی نظر آتے ہیں۔ یہ سڑک پہاڑ کاٹ کر بنائی گئی تھی اور غالباً دینور کو بغداد سے ملاتی تھی۔

مآخذ : مبنی میں مندرجہ کتابوں کے علاوہ : (۱) المكتبة الجغرافية العربية (طبع لثوبه)، بمواضع کثیر، بالخصوص ۳ : ۲۹۵ تا ۵۳۹۶ : ۵ : ۲۵۹ : ۶ : ۱۱۹ : بعد ۲۲۶ بعد ۲۸۳ : بعد ۷ : ۲۷۱ : (۲) البلاذری : فتوح، ص ۱۱۹ : ۳۰۹ تا ۳۱۰ : (۳) السمودی : مروج : ۳ : ۲۶۳ : ۹ : ۲۲۳ : ۲۵ : ۳۱ : (۴) باتوت، ۲ : ۷۰۰ : ۳۰۷ : (۵) القزوینی (طبع و شفلک)، ۲ : ۲۵۰ : (۶) الأغانی، جلد اول، ص ۷۵۲ : (۷) لیسٹرنج، ص ۱۸۹ : ۲۲۷ : (۸) Culturgeschichte des Orients unter : A. v. Kremer

فرانسیسی ترجمہ، ۳ : ۸۰)۔ ملحوظ رہے کہ یہ توضیح عربی متن میں نہیں ملتی۔ ایک اور نسبت زیادہ قابل قبول توضیح یہ ہے کہ ماہ اپنے معنی میں قدیم مادہ یا مدیة (Media) کا مترادف ہے۔ یہاں یہ امر قابل غور ہے کہ وہ تمام جغرافیائی نام جو لفظ ماہ سے مرکب ہیں، ان کا محل وقوع پورے وثوق کے ساتھ علاقہ مدیة (Media) میں متعین کیا جا سکتا ہے (دیکھیے مثلاً ماہ البصرة)۔ ماہ الکوفہ کے نام کی توجیہ کے سلسلے میں یہ روایت بھی ملتی ہے کہ جو محاصل یہاں سے اور اس کے ضلع سے وصول کیے جاتے تھے وہ اہل کوفہ کی فلاح و بہبود پر صرف ہوتے تھے۔ لفظ ماہ کے بارے میں دیکھیے بالخصوص نؤلڈک Nöldeke، در ZDMG، ۳۱ : ۵۵۹ بعد اور وہی مصنف : Gesch. der Perser und Araber zur Zeit der Sasaniden : J. Marquart، ص ۱۰۳ و مارکوارٹ J. Marquart : ایران شہر، برلن ۱۹۰۱ء، ص ۱۸ تا ۱۹۔

بنو امیہ اور بنو عباس کے عہد میں دینور میں بڑی خوشحالی رہی۔ چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی میں، بقول ابن حوقل، یہ ہمدان سے رقبے میں صرف ایک تہائی کم تھا۔ المقدسی نے اس کے نہایت عمدہ بنے ہوئے بازاروں اور بھلوں سے لدے پھندے باغات کی تعریف کی ہے۔ المقدس (م ۸۳۲/۹۳۲ء) کے عہد کے آخری برسوں میں جو انتشار برپا ہوا، اس سے یہ شہر کچھ مدت کے لیے تباہ ہو کر رہ گیا۔ جب باغی سپہ سالار مرداویج نے اس لشکر کو شکست دے کر، جو خلیفہ نے اس کا مقابلہ کرنے کے لیے بھیجا تھا، الجبال کے پورے صوبے پر قبضہ کر کر لیا تو دینور بھی اس کے تصرف میں آگیا (۸۳۹/۹۳۹ء)، اور اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد کئی ہزار باشندے (جن کی تعداد ۷ ہزار سے ۲۵ ہزار تک بیان کی جاتی ہے) ہلاک ہو گئے۔ حسنبود، ایک کرد شہزادہ، اسی علاقے میں رہتا تھا۔ اس نے

ہندوؤں نے نباتیات کی ابھی خدمت کی ہے لیکن علم میں بھی شاید چھوٹ چھوٹ ہوئی کہ ان کی کتابوں میں غیر ملکوں کے پودوں کا نام و نشان تک نہیں۔ بہر حال ان کی اور یونانیوں کی نباتاتی کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہونے سے پہلے ہی الذینوری نے خالص اسلامی معلومات کی مدد سے چھپے ضخیم جلدوں میں ”کتاب النبات“ تیار کر لی تھی جو گویا نباتاتی دائرہ معارف تھی۔ اس کے متعلق جرن، محقق زلیبرگ کے اس بیان میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ یونانیوں نے اپنی ہزار سالہ تاریخ اور اپنے علم و فضل کی انتہا کے زمانے میں نباتیات پر جو کتابیں تالیف کیں، ابو حنیفہ الذینوری (جو اسلامی نباتیات کا آغاز کرنا ہے) ان کو بھی بہت پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔

اس کی تقریباً بیس کتابوں کا پتا چلتا ہے۔ ان میں سے اب تک صرف الأخبار الطوال اور جزء کتاب النبات دستیاب ہوئی ہیں؛ نیز کتاب الاتواء کے طویل اقتباسات ملتے ہیں۔ تفصیل یہ ہے :

۱. تفسیر (تیرہ جلدوں میں)۔
۲. فقہ میں کتاب النوصایا اور کتاب فی حساب الدور (علم فرائض اور تقسیم ترکہ کے ایک پیچیدہ مسئلے کے متعلق)، کتاب القبلة و الزوال (نیم فہمی، نیم فلکیاتی امور پر)۔
۳. لغت و ادبیات میں ما یاجن فیہ العامة، کتاب اصلاح النطق، کتاب الفصاحة، کتاب الجمع و التفريق، کتاب الشعر و الشعراء (اس آخر الذکر کے جواب میں لغۃ الاصفہانی نے الرد علی الشعراء لکھی تو اس کے جواب الجواب میں کتاب الرد علی لغۃ الاصفہانی) اور جواهر العلم۔
۴. نباتیات میں کتاب النبات (جو چھپے ضخیم جلدوں میں ہے) ابن اخت غانم الاندلسی نے، بروایت فتح الطیب، اس کی شرح ساٹھ جلدوں میں لکھی۔
۵. طب میں کتاب الباء (یا کتاب الباء)۔

iden Cholifen (۶۱۸۷۵)، ۱ : ۳۳۷ تا ۳۳۸، ۲۶۵ : ۲۶۶ (۹) Nöldeke، در ZDMG ۱۱ : ۲۸، ۱۰۲ : ۱۰۳ (۱۰) Weil : Cholifen ۱ : ۲۴۳ : ۲۴۴ (اس میں غلط املا Deinewr لکھی ہے) : ۱۰۱ (۱۱) J. de Morgan Mission : Scientif. en Perso Études Géograph. ۹۵ : ۲ بعد : ۱۶۱، ۱۹۵۶، Moyen Orient : Guides Bleus (۱۲) من ۷۰۵۔

(J. LOCKHART)

* الذینوری : ابو حنیفہ احمد بن داؤد بن ولید، مشہور آفاق ماهر نباتیات کی ولادت تیسری صدی ہجری کے اوائل میں ہوئی۔ ابن ندیم کے مطابق وہ دینور ہی کا باشندہ تھا۔ شاید پیدا بھی وہیں ہوا ہو۔ اس کی وفات ۲۶ جمادی الاول ۲۸۷ھ کو ہوئی، جیسا کہ یاقوت نے ارشاد الاریب میں مشہور طبیب ابن المسیح کی قلدی یاد داشت کے حوالے سے درج کیا ہے، (اگرچہ ایک روایت ۲۸۱ھ کی بھی ہے) تیسری روایت ”۲۹۰ھ سے قبل“ سے ظاہر ہے کہ کوئی فیصلہ کن بات نہیں کہی جا سکتی)۔

اگرچہ وہ ماهر لغات کی حیثیت ہی سے زیادہ تر مشہور ہے، لیکن ”لغۃ لغت، ہندسہ، نجوم، ریاضی، تاریخ اور ہر علم میں قابل وثوق“ سمجھا گیا ہے۔ فقہ اور تفسیر میں بھی اس نے گراں قدر آثار چھوڑے ہیں۔

ادبیات اور عربیت کی حد تک تعلیم بصرے اور کوفے کے دبستانوں میں حاصل کی، لیکن زیادہ تر السکیت اور ابن السکیت سے۔ بطور ادیب وہ الجاحظ کا ہم پلہ مانا جاتا ہے، اور جغرافیے میں ابوزید البلخی کا۔ ممکن ہے وہ الجاحظ کے برابر ذہین نہ ہو، لیکن علوم دقیقہ (ریاضی و فلکیات) میں خصوصی درک کے باعث مستحاج و اسلوب کے نقطہ نظر سے وہ وضاحت بیان اور ضبط و اتمام میں الجاحظ سے بہت آگے ہے۔ بروایت الذہبی و عبدالقادر البغدادی وہ حنفی المذہب تھا۔

کی ہو۔

المسعودی نے (مروج الذهب) ۳: ۲۳۳ باب ۶۶ میں) لکھا ہے کہ ابن قتیہ قاضی دینور اور ابوحنیفہ الدینوری کی فلکیاتی اور دیگر متعدد تصانیف کے بارے میں انتساب کی غلطی ہو گئی ہے، چونکہ الدینوری اور ابن قتیہ دونوں کی فہرست تالیفات میں کتاب الانواء اور کتاب الشعر والشعراء موجود ہیں (اور ابن قتیہ کی حد تک دونوں دستیاب بھی ہو گئی ہیں) اس لیے یہ اشارہ انہیں کتابوں کے متعلق ہو سکتا ہے۔

فارسی اس کی آبائی زبان تھی۔ اس کا دادا وند شاید مسلمان بھی نہیں ہوا تھا۔ بہر حال کتاب النہای میں بودوں کے ناموں اور اصطلاحوں کو وہ کثرت سے عربی اور فارسی دونوں میں لکھتا ہے اور اس طرح تیسری صدی ہجری کی فارسی کا ایک گراں قدر مأخذ معلومات بھی ہے۔ خود عربی کی حد تک وہ مقامی لہجوں کا بھی غور سے مشاہدہ کرتا، اور جا بجا اپنی کتاب میں ان کا ذکر کرتا ہے۔ بودوں کے ناموں کی تفصیل میں جب بھی موقع ملتا ہے وہ یہ ضرور بتاتا ہے کہ اس کے مترادفات دیگر عرب علاقوں میں کیا ہیں، یا مختلف قبائلی تلفظ میں کیا فرق ہے۔

اس کا شاہکار یقیناً کتاب النہای ہے۔ اس پر باقی لحاظ سے تو نہیں، البتہ خالص ادبی نقطہ نظر سے کچھ اعتراض کیے گئے ہوں تو چنداں باعث حیرت نہیں۔ چنانچہ علی بن حمزہ البصری نے التنبیہات علی اغالیط الرواة کے نام سے ایک چھوٹی سی کتاب لکھی ہے۔ (طبع عبدالعزیز الیمینی قاہرہ ۱۹۶۸ء)۔ اس میں آٹھ باب ہیں؛ تیسرا باب "التنبیہات علی ما فی کتاب النہای للدینوری" پر ہے اور تقریباً چوتھائی کتاب پر مشتمل ہے، لیکن یہ اعتراضات شاذ ہی صحیح ہیں؛ مثلاً الدینوری انسان کو اشرف

مزید برآں کتاب النہای میں بودوں کی خاصیتوں میں طبی خواص و اثرات کا کثرت سے ذکر ملتا ہے۔

۶. ریاضی اور فلکیات میں البحت فی حساب الهند، کتاب الجبر والمقابلہ، کتاب نوادر الجبر، کتاب الکسوف اور بارش کے نبھتروں کے متعلق کتاب الانواء (جس کا بڑا حصہ ابن سیدہ: المخصص ۹: ۱۰۰ بعد میں منقول ملتا ہے، اور اسی کے ایک حصے کو المقریزی نے اپنی کتاب الخبر عن البشر مخطوطہ استانبول، جلد رابع، ذکر السماء والفلک میں بلا حوالہ نقل کیا ہے)۔

۷. جغرافیہ میں کتاب البلدان، جو ایک بڑی کتاب تھی (الآخبار الطوال، ص ۳۳، سطر ۱۶ تا ۱۷ میں الدینوری نے اپنی جس تالیف کا اشارہ کیا ہے وہ غالباً یہی ہے)۔

۸. تاریخ میں الآخبار الطوال، خلافت راشدہ میں ایران کی فتح کے متعلق ایک گراں قدر مأخذ [اس کا اردو ترجمہ شائع ہو چکا ہے]۔

ایران کے شہر دینور میں (جواب کھنڈر ہے، اور جس کے تلفظ میں دال کی زیر اور زبر دونوں روایتیں عرب مؤلفوں کے ہاں ملتی ہیں، ایک ابن خلکان کے ہاں، دوسری سماعی کے ہاں، گویا پائے مجہول پڑھنا چاہیے، نیز واو کو زبر سے) ہمارا مؤلف ایک مکان کی جوت پر سے فلکیاتی مشاہدے کیا کرتا تھا۔ ۵۳۳۵/۹۳۶ء میں عبدالرحمن الصوفی (مشہور ماہر فلکات) وہاں گیا تو اس وقت بھی یہ مکان موجود تھا اور دینوری کے رصدی مشاہدات کی روایت چلی آ رہی تھی۔ الصوفی نے الدینوری کی فلکیاتی مہارت کے ریاضیاتی حصے پر کچھ اعتراض کیا ہے، لیکن البیرونی نے اس بارے میں الدینوری پر کافی اعتماد ظاہر کیا ہے، اور اپنی کتاب الآثار الباقیہ میں الدینوری کی رصدی جدولیں نقل کی ہیں۔ ممکن ہے الدینوری نے کتاب الانواء کے علاوہ رصدی مشاہدات پر کوئی مستقل زیج بھی مرتب

کی ساخت، ان کے غذائی و دہائی اور دیگر خواص و سائل کا بہت دقیقہ رس اور جامع بیان ملتا ہے۔ بودوں کی جنس وار تقسیم بھی اس نے ایک مستقل باب میں کی تھی۔ زمین، بارش، نہروں اور پودا پھولنے سے لے کر اس کے ختم ہونے تک کا مفصل حال بھی اس نے دیا تھا۔ ضمناً شہر، انگور، کھجور، خضاب و رنگ، پھول اور عطر، ڈھیوں حتیٰ کہ وہ چراگاہوں کے ضمن میں اونٹوں کی بیماریوں اور علاجوں کا ذکر کرتے ہوئے پتروں (نفل) اور ڈاٹر نک کے متعلق دلچسپ تفصیلات دیتا ہے۔ ایات تراہد کے ذریعے سے اس نے عربی شاعری کے نباتی ذخیرے کو اجگر کر دیا ہے اور ایسی ہزاروں ایات نقل کر کے اس مقالے کی صحت ظاہر کر دی ہے کہ الشعر دیوان العرب۔ اس کی کتاب مہ گانہ مأخذوں سے مرتب ہوئی ہے اپنے ہشروں کے بیانات کا اعادہ، اپنے ذاتی مشاہدات اور اپنے ہم عصروں (اساتذہ، منسے و انوں اور دیگر مأخذ معلومات) کے بیانات کی نقل۔ ذاتی مشاہدات کے سلسلے میں وہ ایران، عراق، بوزغلی سرحد، شام عرب، افغانستان، بلوچستان، خراسان وغیرہ کے بکثرت مقامات کے بودوں کا ذکر کرتا ہے۔ الدینوری کی یہ خصوصیت بھی قابل ذکر ہے کہ نباتی اصلاحات کے سلسلے میں وہ معربات کا ذرا بھی محتاج نہیں رہا اور اس کی درج کردہ اصطلاحیں اتنی عمدہ ثابت ہوئیں کہ پور کبھی عربوں کو ان کے بدلنے کی ضرورت نہیں پیش آئی۔ الدینوری ہمیشہ اپنے مأخذ کا حوالہ دے کر کھلے دل سے اپنی مسنونیت کا اعتراف کرتا ہے! ان میں ابو زیاد، ابو عمرو، ابو نصر، ابن الاعرابی السندی اور ابن السکیت کے کثرت سے حوالے ملتے ہیں۔ بدویوں میں "الاعراب القم (کذا) اهل السراة، اعراب عمان وینی اسد و ربیعہ وغیرہ کا بھی کافی ذکر ہے۔ کتاب النبات کی جلد سوم جامعہ Yale بیل (امریکا) اور جلد پنجم جامعہ استانبول کے کتاب خانوں میں ملی ہے۔ ان کے علاوہ چند ابواب کا

المعاومات قرار دیتا ہے تو ایہ ری ڈو اعتراض ہے کہ نوشتے انسان سے ایمن ہیں، وغیرہ۔ ابن سیدہ کی المدحمت میں اس تنقید کے اقتباسات "قال المنقب" دہہ کر بارہا دہا نہ گئے ہیں۔

اس کے برخلاف طیسوں کے ہاں اس کی بڑی وقعت رہی ہے۔ چنانچہ ابن سمجون (مخطوطات اوکسفرڈ و لندن) دمر الخاقی (مخطوطات قاہرہ و ایبیا و مونٹریال) اور مد ازان ابن ابیظار نے مفردات طبیہ پر اپنی کتابوں میں دل کھول کر الدینوری کے بیانات نقل کیے ہیں اور ان کو دیگر تمام معاومات پر ترجیح دی ہے۔

لغت ذاتی کی حد تک الازہری: تہذیب اللغة ابن سیدہ: المحکم: وہی مصنف: المخصص: ابن منظور: لسان العرب: الصفاتی: العیاب: مرتضی الزبیدی: تاج العروس وغیرہ میں الدینوری کے جو اقتباسات ہیں ان کو جمع کیا گیا، تو مختلف مکررات ہندو۔ صفحوں میں ان کا بیضہ شمار ہوا ہے۔ ان کی مدد سے کتاب النبات کا کم و بیش نصف حصہ دوبارہ مرتب ہو جاتا ہے، جیسا کہ کتاب النبات کی دستیاب شدہ جلدوں سے متعلقہ اقتباسات کا مقابلہ کر کے واضح ہوا ہے۔ اس سے ضمناً ان متأخرین کی صحت نقل اور دیانت داری کی بھی وقع تہادت فراہم ہو جاتی ہے۔

فتوحات جنگی، تدوین قانون، تعمیرات اور متعدد دیگر علوم کی طرح نباتیات میں بھی مسلمانوں کی تیز گدلی مورخ کو حواس باختم کر دیتی ہے۔ اوپر زہر برگ کا اعتراف اس بارے میں نقل ہوا۔ الدینوری نے بیانات کی قاموس بہ ترتیب تہجی مرتب کی۔ کتاب النبات کی جلد پنجم کا نصف دوم اور جلد ششم اس پر حاوی تھی۔ جلد پنجم میں الف سے ز تک چار سو بیاسی بودوں کا ذکر ہے۔ س سے ی تک میرے ہاں اس سے دگنی تعداد میں بودوں کے تذکرے الدینوری کے حوالے سے جمع ہوئے ہیں۔ ان تذکروں میں بودوں

ایک حصہ کتاب خانہ شیخ الاسلام (مدینہ منورہ) میں ہے۔ مکمل کتاب کا تاحال پتا نہ چل سکا۔

اس کی شہرت مشرق ہی میں نہیں، بلکہ مغرب اقصیٰ اور آندلس تک پہنچ گئی تھی۔ اگر فرنگیوں اور تاتاریوں کے ہاتھوں لاکھوں عربی مخطوطات کی بربادی نہ ہوئی ہوتی تو الدینوری کی اصل کتاب کے سوا ابن اخت غانم کی شرح، جو مائتہ جلدوں میں تھی، انسانی میراث میں قابل قدر چیز ہوتی۔

یہ امر مشتبہ ہے کہ اس نے فلکیاتی مشاہدوں کے لیے اپنے وطن دینور کو چھوڑ کر اصفہان کا کبھی سفر کیا ہو، کشف الظنون (عدد ۶۴۶۳ و ۶۹۳۶) سے ایسا گمان کیا جاتا رہا ہے، مگر یہ بیانات صاحب کشف الظنون نے تاریخ گزیدہ سے لیے ہیں، اور اس کا یہ کہنا کہ الدینوری [رکن الدولہ ابوالحسن علی الدیلمی کے عہد میں اصفہان میں صاحب رصد رہا اور اس نے زیچ بنائی تھی درست نہیں، اس لیے کہ الدینوری ۸۲۸۱ میں یا بقول دیگر ۸۲۹ھ میں فوت ہو چکا تھا۔ ممکن ہے اس نے حج کیا ہو اور حرمین کی زیارت کی ہو، لیکن قطعیت اس لیے دشوار ہے کہ جن چار پانچ مقامات میں وہ مکے اور مدینے کا ذکر کرتا ہے، وہاں چشم دید حالات نہیں لکھتا۔

ہم عصروں سے مناظرے اس زمانے کی عام چیز تھی، چنانچہ الدینوری نے بھی مناظرے کیے۔ یاقوت نے الدینوری کے المبرد سے دینور میں عیسیٰ بن ماہان کے ہاں ایک علمی بحث کا ذکر کیا ہے، جس سے اس کی فقہ، حدیث اور لغت دانی میں فوقیت ظاہر ہوتی ہے۔ لفظ الاصفہانی سے تو رسالہ بازی تک نوبت آگئی تھی جیسا کہ اوپر کی تالیفات کے سلسلے میں بیان ہوا۔ بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ قدما میں

الدینوری سب سے بڑا ماہر لسانیات تھا۔ اور علوم دقیقہ و ادبیہ میں بھی اس کو بلند رتبہ حاصل تھا۔ اس کی تاریخ، جامع و مانع الفاظ میں ضخیم تر کتابوں کا علم

نچوڑ ہے (مثلاً حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاں بھی ہوئی سفارت کے حالات دلائل النبوة لابی نعیم اور الدینوری کی الاخبار الطوال دونوں میں درج ہیں اور ان کا مقابلہ کرنے سے یہ بہاؤ آسانی ہو سکتا ہے)۔ اگر اس کی دوسری کتابیں بھی دستیاب ہوں تو اندرونی شہادت سے اس کے مزید حالات زندگی کے علاوہ مختلف علوم میں اس کی مہارت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ہو سکے گا۔ فقہ و تفسیر میں اس کی تالیفات کو چھوڑ کر اس کے سوانح نگار اسے ”فقہ“ اور ”من کبار الحنفیہ“ بھی لکھتے ہیں جس سے اس کا تقدس اور زہد و ورع بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

مآخذ: کشف الظنون، السمعانی؛ الانساب اور براہین کے علاوہ: (۱) کتاب النبیات (ج ۵، قسم دوم) طبع ایسالا ۱۹۵۳ء؛ (۲) الاخبار الطوال خصوصاً اشاریہ کی جلد میں اس کے حالات بقلم کراچکوسکی، لندن ۱۹۱۲ء؛ (۳) ابن الندیم: الفہرست، طبع یورپ، ص ۷۸؛ (۴) یاقوت: ارشاد الأرب: ۱: ۱۲۳ تا ۱۲۷؛ (۵) السیوطی: بغیۃ الوعاة، طبع تاحرہ ۱۳۲۶ھ، ص ۱۳۲؛ (۶) البغدادی: خزائن الأدب، طبع بولاق ۱۲۹۹ھ، ص ۲۶۱؛ (۷) معارف، اعظم گڑھ دسمبر ۱۹۴۹ء و جون ۱۹۵۰ء؛ (۸) عبدالرحمن الصوفی: الکواکب الثابتة، طبع دائرة المعارف حیدرآباد دکن، ص ۷ و ۸؛ (۹) ابن خلکان: وفيات الأعیان، ص ۱۱۸ (عدد ۲۹۵)؛ طبع یورپ: (۱۰) Silberberg در Zeitschrift für Assyriologie، ج ۲۳، ۲۵ (۱۹۱۰ء) ص ۲۱۵ تا ۲۶۵؛ (۱۱) Die Pflanzensbuch des Abu: (ص ۳۹ تا ۸۸)؛ (۱۲) Hanifa Ahmad ibn Dawad ad-Dinawari: Relation de l'Égypte: S. de Sacy، ۱۸۶۳ء؛ (۱۳) Gesch. d. arabischen aerzte und Naturvor-، ۱۸۸۲ء؛ (۱۴) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۵) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۶) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۷) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۸) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۹) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۰) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۱) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۲) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۳) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۴) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۵) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۶) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۷) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۸) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۹) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۰) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۱) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۲) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۳) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۴) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۵) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۶) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۷) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۸) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۹) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۰) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۱) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۲) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۳) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۴) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۵) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۶) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۷) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۸) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۹) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۵۰) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۵۱) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۵۲) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۵۳) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۵۴) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۵۵) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۵۶) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۵۷) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۵۸) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۵۹) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۶۰) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۶۱) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۶۲) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۶۳) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۶۴) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۶۵) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۶۶) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۶۷) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۶۸) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۶۹) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۷۰) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۷۱) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۷۲) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۷۳) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۷۴) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۷۵) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۷۶) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۷۷) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۷۸) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۷۹) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۸۰) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۸۱) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۸۲) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۸۳) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۸۴) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۸۵) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۸۶) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۸۷) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۸۸) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۸۹) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۹۰) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۹۱) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۹۲) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۹۳) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۹۴) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۹۵) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۹۶) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۹۷) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۹۸) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۹۹) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۰۰) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۰۱) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۰۲) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۰۳) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۰۴) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۰۵) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۰۶) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۰۷) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۰۸) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۰۹) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۱۰) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۱۱) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۱۲) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۱۳) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۱۴) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۱۵) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۱۶) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۱۷) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۱۸) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۱۹) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۲۰) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۲۱) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۲۲) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۲۳) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۲۴) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۲۵) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۲۶) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۲۷) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۲۸) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۲۹) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۳۰) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۳۱) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۳۲) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۳۳) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۳۴) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۳۵) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۳۶) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۳۷) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۳۸) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۳۹) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۴۰) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۴۱) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۴۲) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۴۳) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۴۴) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۴۵) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۴۶) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۴۷) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۴۸) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۴۹) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۵۰) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۵۱) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۵۲) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۵۳) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۵۴) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۵۵) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۵۶) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۵۷) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۵۸) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۵۹) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۶۰) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۶۱) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۶۲) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۶۳) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۶۴) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۶۵) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۶۶) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۶۷) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۶۸) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۶۹) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۷۰) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۷۱) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۷۲) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۷۳) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۷۴) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۷۵) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۷۶) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۷۷) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۷۸) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۷۹) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۸۰) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۸۱) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۸۲) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۸۳) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۸۴) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۸۵) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۸۶) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۸۷) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۸۸) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۸۹) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۹۰) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۹۱) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۹۲) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۹۳) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۹۴) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۹۵) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۹۶) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۹۷) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۹۸) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۱۹۹) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۰۰) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۰۱) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۰۲) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۰۳) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۰۴) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۰۵) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۰۶) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۰۷) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۰۸) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۰۹) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۱۰) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۱۱) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۱۲) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۱۳) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۱۴) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۱۵) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۱۶) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۱۷) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۱۸) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۱۹) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۲۰) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۲۱) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۲۲) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۲۳) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۲۴) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۲۵) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۲۶) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۲۷) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۲۸) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۲۹) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۳۰) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۳۱) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۳۲) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۳۳) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۳۴) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۳۵) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۳۶) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۳۷) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۳۸) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۳۹) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۴۰) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۴۱) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۴۲) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۴۳) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۴۴) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۴۵) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۴۶) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۴۷) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۴۸) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۴۹) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۵۰) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۵۱) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۵۲) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۵۳) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۵۴) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۵۵) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۵۶) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۵۷) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۵۸) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۵۹) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۶۰) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۶۱) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۶۲) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۶۳) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۶۴) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۶۵) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۶۶) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۶۷) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۶۸) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۶۹) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۷۰) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۷۱) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۷۲) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۷۳) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۷۴) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۷۵) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۷۶) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۷۷) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۷۸) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۷۹) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۸۰) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۸۱) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۸۲) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۸۳) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۸۴) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۸۵) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۸۶) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۸۷) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۸۸) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۸۹) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۹۰) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۹۱) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۹۲) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۹۳) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۹۴) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۹۵) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۹۶) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۹۷) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۹۸) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۲۹۹) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۰۰) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۰۱) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۰۲) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۰۳) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۰۴) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۰۵) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۰۶) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۰۷) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۰۸) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۰۹) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۱۰) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۱۱) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۱۲) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۱۳) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۱۴) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۱۵) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۱۶) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۱۷) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۱۸) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۱۹) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۲۰) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۲۱) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۲۲) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۲۳) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۲۴) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۲۵) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۲۶) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۲۷) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۲۸) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۲۹) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۳۰) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۳۱) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۳۲) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۳۳) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۳۴) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۳۵) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۳۶) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۳۷) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۳۸) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۳۹) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۴۰) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۴۱) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۴۲) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۴۳) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۴۴) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۴۵) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۴۶) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۴۷) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۴۸) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۴۹) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۵۰) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۵۱) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۵۲) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۵۳) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۵۴) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۵۵) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۵۶) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۵۷) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۵۸) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۵۹) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۶۰) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۶۱) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۶۲) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۶۳) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۶۴) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۶۵) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۶۶) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۶۷) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۶۸) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۶۹) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۷۰) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۷۱) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۷۲) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۷۳) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۷۴) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۷۵) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۷۶) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۷۷) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۷۸) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۷۹) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۸۰) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۸۱) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۸۲) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۸۳) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۸۴) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۸۵) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۸۶) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۸۷) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۸۸) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۸۹) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۹۰) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۹۱) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۹۲) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۹۳) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۹۴) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۹۵) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۹۶) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۹۷) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۹۸) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۳۹۹) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۰۰) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۰۱) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۰۲) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۰۳) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۰۴) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۰۵) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۰۶) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۰۷) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۰۸) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۰۹) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۱۰) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۱۱) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۱۲) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۱۳) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۱۴) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۱۵) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۱۶) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۱۷) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۱۸) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۱۹) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۲۰) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۲۱) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۲۲) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۲۳) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۲۴) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۲۵) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۲۶) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۲۷) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۲۸) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۲۹) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۳۰) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۳۱) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۳۲) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۳۳) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۳۴) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۳۵) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۳۶) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۳۷) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۳۸) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۳۹) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۴۰) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۴۱) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۴۲) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۴۳) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۴۴) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۴۵) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۴۶) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۴۷) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۴۸) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۴۹) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۵۰) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۵۱) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۵۲) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۵۳) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۵۴) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۵۵) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۵۶) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۵۷) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۵۸) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۵۹) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۶۰) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۶۱) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۶۲) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۶۳) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۶۴) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۶۵) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۶۶) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۶۷) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۶۸) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۶۹) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۷۰) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۷۱) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۷۲) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۷۳) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۷۴) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۷۵) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۷۶) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۷۷) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۷۸) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۷۹) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۸۰) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۸۱) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۸۲) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۸۳) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۸۴) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۸۵) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۸۶) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (۴۸۷) E. Meyer: ۱۸۸۲ء؛ (

مسیحی اور یوزنٹی ماخذ کا تعلق ہے، الدینوری نے غالباً یونانی رسالہ المعروف بہ *Agnetioz Seneit* کے اصل عربی نسخے سے استفادہ کیا ہوگا۔ اسے ایک عیسائی نے نکھا تھا اور ۱۱۲۰ء میں لیونٹسکس I. in Tuscus نے اس کا لاطینی میں ترجمہ کیا تھا [دیکھیے ابن سیرین]۔ ہندو اور ایرانی ماخذ کے طور پر بھی یہی کتاب اس کے کام آتی ہوگی۔ مصنف یہودیوں سے منسوب تعبیرات کا اکثر مقامات پر حوالہ دیتا ہے اور اس نے بائبل سے متعدد اقتباسات نقل کیے ہیں۔

ماخذ : (۱) القادری فی التنبؤ ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ اس کے ۲۹ قلمی نسخوں کا ہمیں علم ہے۔ اس کا فارسی میں ترجمہ (AS ۱۷۱۸ء) اور حاجی خلیفہ (۲ : ۳۱۷ شماره ۳۰۶۸) کے بعد اس کا ترکی میں منظوم ترجمہ شہاب الدین احمد بن عرب شاہ (م ۸۵۳ھ/۱۴۵۰ء) نے کیا۔ اس تصنیف اور عربی میں تعبیر گوئی پر دوسری کتابوں کے بارے میں دیکھیے (۲) *Les Rôles* : T. Fahd Sources Orientales، ج ۲، پیرس ۱۹۶۰ء، ص ۱۲۵ تا ۱۵۸۔

(T. FAHD).

دنیو : (دراصل ”دنیو“ ہے، اوستا میں دایوا *daeva*، سنسکرت میں دیو *dēva*) فارسی میں ہدی اور تاریکی کی ارواح کا نام ہے، جو گناہوں کے دیوتا اہرمز کی آفریدہ ہیں؛ ان کی تعداد بڑے شمار ہے، ان میں اہرمز سمیت سات بڑے دیوتاؤں کا گروہ دوسروں سے ممتاز ہے، یہ سات دیوتا سات امشسپند (اوستا - امیشا سپنتا *aməša spənta* ”غیر فانی ارواح مقدسہ“) کے مد مقابل ہیں۔

”دنیو“ (*Daiva*) اسم جمع کے طور پر سب سے پہلے فقط دشمن دیوتاؤں کے معنی دیتا ہے، پھر ان دیگر فوق الفطرت ہستیوں پر بھی، جن کی جبلت شر ہے اور جو نیکی اور دین کی دشمن ہیں، اطلاق کیا جانے لگا۔۔۔ یہ دیوا (*daiva*)، یہ دیو (*dēva*) ان روز افزوں

Grammatiche : G. Flügel (۱۵) : ۱۶۳ تا ۱۶۷ : ۱۵) *Schulens der Araber* (لائیپزگ ۱۸۶۲ء) ص ۱۹۰ بعد : *Historie de la médecine arabe* : L. Leclerc (۱۶) پیرس ۱۸۷۶ء : ۱ : ۲۱۸ : ۱۷) *Steinschneider* (۱۷) *ZDMG* ج ۲۳ : ۲۳ : ۲۷ : ۱۸) *H. Derenbourg* (۱۹) *Revue Critique*، پیرس ۱۸۸۸ء ص ۶۱ تا ۶۳ : ۱۹) *Die Mathematiker, u. Astronomen d.* : H. Suter *Araber*، لائیپزگ ۱۹۰۰ء، ص ۱۳۱ عدد ۶۰ : ۲۰) محمد حمید اللہ : *Dinawari's Encyclopaedia Botanic* : در Fund Köprülü Armaganı، ص ۱۹۵ تا ۲۰۶ : ۲۱) (احمد عیسیٰ بی) *Ahmed Issa Bey* *Abou Hanifa elDinawari et son Livres des plantes*، در *Bulletin de l'Institut d'Egypte*، ج ۱۶ : ۱۹۳۵ء، ص ۱ تا ۷۔

(محمد حمید اللہ)

* الدینوری : ابوسعید (سعد) نصر بن یعقوب

ایک مصنف ہے جو زیادہ تر اپنی کتاب القادری فی التنبؤ کی وجہ سے مشہور ہے جو اس نے ۳۹۷ھ/۶۰۶ء میں تصنیف کی اور القادر باللہ (۳۸۱ تا ۴۲۲ھ/۹۹۱ تا [۶۰۳ء]) کے نام معنون کی۔ یہ تعبیرات پر عربی زبان میں قدیم ترین مستند رسالہ ہے جس میں وہ سارا مواد نہایت اچھے طریقے سے جمع کر دیا گیا ہے، جو اس زمانے میں اس موضوع پر ملتا تھا۔ اس کے ماخذ عربی [زبان میں] ہیں : ابن سیرین [رک بان] جن سے بڑے شمار تعبیرات منسوب کی گئی ہیں؛ یونانی : ارتمیڈورس ایسوسی *Artemidorus of Ephesus* جس کی آؤنی روکری طیفاً (*Oneirocritica*) [یعنی تعبیر الرؤیا] کا ترجمہ عربی میں حنین بن اسحق (م ۲۶۰ھ/۸۷۳ء) نے کیا تھا (دیکھیے الفہرست، ص ۲۵۵، مخطوطہ عربی ۷۲۶م، در کتاب خانہ جامعہ استنبول، جو اشاعت کے لیے تیار ہو رہا ہے) تقریباً ساری کی ساری اس علمی کتاب میں نقل کر دی گئی ہے۔ جہاں تک

skunde : ۱ : ۱۲۶ تا ۱۳۶ : (A. V. W. Jackson (۲) : در Gr. f. Ph. : ۲ : ۱۳۹ : ۱۳۵ : ۱۹۶ : ۱۹۶ : بعد ۱۹۶۲ : (A. Christensen (۳) : Essai sur la : idmonologie iranienne : ۶۰ : (دیو، بریان اور ازدا، جدید فارسی رزیہ میں) : ۶۷ : (دیو عربی اور فارسی متون میں) : ۱ : ۷۱ : (دیو اور جن) : ۶۲ : (نتائج) : فارسی کی ناوی جنگی نظموں میں دیووں سے متعلق : فردوسی : کتاب مذکور، ج ۱، مقدمہ، ص ۶۱، حاشیہ ۱، ص ۷۱، حاشیہ ۲، ص ۷۲ : Croyances : H. Massé (۵) : عوامی اعتقادات : et coutumes persanes : ج ۲، باب ۱۳ اور اشارہ III : دیو - ارمینیا کے دیووں سے متعلق : Christensen : کتاب مذکور، ص ۸۷ : (۶) : F. Macler : Les dew arméniens : (متن اور اصلی نقل منخطوطہ) - جدید تصاویر، سرد، علاوہ ان کے جو داستانوں کی توفیح کے لیے دی گئی ہیں، اہی موجود ہیں : بعض نے دیووں اور ہیروں میں التباس پیدا کر دیا ہے : دیکھئے (۷) : E. Blochet : Eulimbures : de la Bibliothèque Nationale : (۸) : Sakisian : La miniature persane : لوحہ ۷۸ : (۹) : Ph. W. Schulz : Die persische-Islamische Malerei : لوحہ ۱۳ : Iran : Miniatures de la : (دیو اور ہیرو) : Bibliothèque Impériale de Téhéran : (نیویارک : Graphic Soc-Unesco) : لوحہ ۶ : (دیو بہشت انسان) : (CL. HUART-(H. MASSE))

دیو : ہندوستان میں سوراشر (سورٹھ) کے جنوبی کونے کے سامنے ایک جزیرہ ہے، جس میں ایک اچھی بندرگاہ ہے، جو خلیج کھسبات (کبی) کے خطرناک مد و جزر سے بچی ہوئی ہے - ۱۲۹۸/۵۶۹۸ - ۱۲۹۹/۵۶۹۹ : میں آئے علاء الدین خلجی کے سپہ سالاروں نے Cudasimas سے لیا - غالباً چند سال کے بعد یہ ہاتھ سے نکل گیا اور محمد بن تغلق نے ۱۳۳۹/۵۷۵۰ میں دوبارہ فتح کیا -

تعداد میں ان غولوں اور دیگر شیطانی ہستیوں کے ساتھ مدغم ہوتے گئے جن کی اصل اسلاف کے معتقدات میں مل جاتی ہے (A. Christensen)۔

یہاں ان سارے دیووں کا جو ایرانی ادب یا عوامی مآخذ میں پائے جاتے ہیں، ذکر کرنا ناممکن ہے : اکثر دیو کا لفظ عربی کے الفاظ عفريت، شيطان، طاغوت کے پہلو بہ پہلو لایا جاتا ہے، مثلاً کلمے کے سے پاؤں والے دیو ("دیو گاؤ پائے") : سعد الدین الوراوینی : مرزبان نامہ، طبع محمد القزوینی : ص ۷۷ : بعد ائم - نظام الدین : - Introduction to the Jawāmi' : ul hikāyat of Muhammad Awfi : ص ۱۶۳ : - زمانہ حال کی عوامی کہانیوں میں عموماً دیو کی جگہ جن کا لفظ استعمال ہونے لگا ہے، مگر دیو بھی موجود ہے، مثلاً در Contes en persan populaire : H. Massé : شماره ۷۷ اور ۲۹ : یا یہ کہ اسے جن اور پری دونوں کے ساتھ ملا دیا جاتا ہے (مثلاً Ria-Hackin اور Légendes et coutumes afghanes : A. A. Kohzad : ص ۱۷ اور حاشیہ) - شیعینوں کے نزدیک آدمی، دیو اور جن بروز حشر انعام یا سزا دیے جائیں گے (تیسرے العوام، طبع اقبال، ص ۲۱) - حمد اللہ مستوفی القزوینی دیو رود (ہندی) کا ذکر کرتا ہے (ضلع جیرفت، کرمان) - اس کا یہ نام اس لیے رکھا گیا کہ اس کا ہم آؤ بہت تیز و تند ہے (نزهة القلوب، ترجمہ Le Strange : ص ۱۳۹ : ۲۱۷)۔

مآخذ : دیو کے مختلف مفہوموں اور اس ترکیب کلام میں اصالت اور استعارۃ استعمال کے لیے (۱) : Vullers : Lexicon persico-latinnu : Desmaisons اور Dictionnaire persan-français : فردوسی کے ہاں دیو بہ کثرت استعمال ہوا ہے (دیکھئے Glossar : F. Wolff) : Firdosis Schahname : بذیل مادہ diw, dēv اور شاعرانہ طبع اور فرانسیسی ترجمہ از J. Mohl : ۱۸۷۸ : اشارہ : Eranische Altherthum : Spiegel (۲) : بہ ذیل مادہ) : (۳) : Spiegel

اسے شکست دی۔

۱۵۳۵/۹۹۳۲ء میں سلطان بہادر شاہ، جو ہمایوں سے بیچ کر بھاگا تھا، اور مغل شہنشاہ دونوں نے پرتگیزیوں کو دیو کی پیش کش کی۔ ادھر نوندا کنہا Nuno da Cunha نے بہادر شاہ کو کم ملاتور جان کر دیو کے بدلے میں جنگی مدد دینے کے ایک معاہدے پر ۲۷ ربیع الآخر ۹۹۳۲/۲۵ اکتوبر ۱۵۳۵ء کو دستخط کیے۔

۱۵۳۶/۹۹۳۳ء میں بہادر شاہ مغلوں کو نکال کر دیو واپس پہنچ گیا۔ یہاں اس نے نوندا کنہا کو دعوت دی کہ شمالی جانب آئے اور پھر ترغیب دی کہ ساحل میں آکر آئے، جب وہ آئے تو خود بہادر شاہ اس کے جہاز پر اس سے ملنے گیا۔ وہاں سے ساحل پر واپس آتے وقت پرتگیزیوں سے ایک جھڑپ میں ۳ رمضان ۹۹۳۳/۱۳ فروری ۱۵۳۷ء کو مارا گیا۔ اس کے بعد پرتگیزیوں نے دیو کے ساحل، خزانے اور املاہ خانے پر قبضہ کر لیا اور دیو پر ان کا اقتدار تسلیم کر لینے کے عوض میں ۱۵۳۷/۹۹۳۳ء میں مجدد زمان میرزا کی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ تاہم وہ دیو کے باہر شکست کھتا گیا اور ۱۵۳۸/۹۹۳۵ء میں خواجہ صفر نے اس جزیرے کا محاصرہ کر لیا۔ یہ محاصرہ (خادم) سلیمان پاشا [رگ بان] والی مصر کے ایک ملاتور بیڑا لے کر پہنچنے کے بعد اور زیادہ سخت ہو گیا، لیکن ۳ ماہ بعد ترکوں اور گجراتیوں میں باہم بدگمانی ہو گئی۔ ادھر اطلاع آئی کہ نوندا کنہا پہنچا چاہتا ہے، اس پر محاصرہ اٹھا دیا گیا اور ۹ شوال ۹۹۳۵/۲۵ فروری ۱۵۳۹ء کو صالح ہو گئی۔

۲۰ ربیع الآخر ۹۹۵۳/۲۰ جون ۱۵۴۶ء کو خواجہ صفر نے دیو کا دوسری دفعہ محاصرہ شروع کیا جو سات مہینے جاری رہا۔ جواؤدی کاسٹرو (João de Castro) نے ۱۹ ذوالقعدہ ۹۹۵۳/ [۱۱ تصبیح ۱۱ جنوری ۱۵۴۷ء] کو سام اوج کو

۱۵۴۰/۲۰ جون ۱۵۴۰ء میں مظفر خان نے، جو آخری اتفاق بادشاہوں کی طرف سے گجرات کا صوبے دار اور پھر گجرات کا پہلا بادشاہ ہوا، دیو میں مسجدیں بنائیں، قاضی مقرر کیے اور محافظ فوج تعینات کی۔ ۱۵۴۱/۸۸۳۸ء میں دیو با رونق بندرگہ تھا جو گجرات کے بیڑے کے لیے جہاز مہیا کرتا تھا۔ ۱۵۴۱/۹۹۱۶ء سے یہ سورنہ کے صوبے داروں کا صدر مقام بن گیا جن میں سے مشہور ملک آواز ہوا ہے۔ اس نے دیو کو ایک بڑا تجارتی مرکز بنا دیا، قلعہ بنایا، بندرگہ کی دفاع کا بندوبست کیا اور خشکی کے قریبی قصبے گوگلا سے ملانے کے لیے ایک پل تعمیر کیا۔ ۱۵۴۱/۹۹۱۶ء میں اس کے بیڑے اور مملوک امیر البحر امیر حسین کے بیڑے کو پرتگیز حاکم فرانسسکو ڈی آلمائدا (Francisco d'Almeida) نے دیو کی بندرگہ میں شکست دی۔ پھر بھی امیر حسین اس قابل رہا کہ ۱۵۴۱/۹۹۱۶ء میں سلطان مظفر دوم کو آمادہ کر سکے کہ البوکرک Albuquerque کو اس نے جو دیو کی پیشکش کی تھی، اُسے واپس لے لے، اور ۱۵۴۱/۹۹۲۶ء اور ۱۵۴۱/۹۹۲۷ء میں وہ پرتگیزی بیڑوں کو پسپا کر سکے۔ ملک ایاز نے ۱۵۴۲/۹۹۲۸ء میں وفات پائی اور دیو میں اس کا فرزند اسحق اس کا جانشین ہوا۔ ۱۵۴۲/۹۹۲۸ء میں اسحق نے بغاوت کر دی اور پرتگیزیوں کو دیو کی پیش کش کی۔ نئے صوبے دار قوام الملک کا بیڑا وہاں پہلے پہنچ گیا اور اس نے ان کے بیڑے کو شکست دی، لیکن آئندہ موسم بہار میں پرتگیزیوں نے دیو کے بیڑے کو، جو قوام الملک کے بیٹے کے زیر قیادت تھا، کچل دیا اور قوام الملک کو برطرف کر کے اس کی جگہ ملک ایاز کے دوسرے فرزند ملک طوغان کو دیو کا حاکم مقرر کر دیا گیا۔

۱۵۴۱/۹۹۳۷ء میں طوغان نے دو عثمانی جرنیالوں، امیر مصطفیٰ اور خواجہ صفر کی ہر وقت مدد سے، وائسرے Nuno da Cunha کے بھرپور حملے میں

قائم کیا تھا (فتوح البلدان، ص ۶۶۳)۔ حضرت معاویہؓ نے ”دیوان البرید“ (ڈاک خانہ) کی بنا ڈالی جس کی تنظیم نو بعد میں عبدالملک (۶۰۱/۵۸۵ء) نے کی تھی [مزید دیکھیے برید]۔

دیوان الجند اسی فہرستوں کی تجدید کے لیے وقتاً فوقتاً عربوں کی قبیلہ وار مردم شماری کرتا رہا تھا۔ دیوان مصر نے پہلی صدی ہجری/ساتویں صدی عیسوی کے دوران میں تین بار مردم شماری کی، تیسری مردم شماری قوہ بن شریک نے ۶۰۵ء میں کی تھی (الکندی: تاریخ الولاء، ص ۸۶؛ المقریزی: الخطط، ۱: ۱۵۱)۔

دیوان النفقات (اخراجات)، جو غالباً ایک یوزنٹی محکمے ہی کا سلسلہ تھا، کل اخراجات کا حساب رکھتا تھا (دیکھیے جہشیاری، ص ۳)۔ بدینہ المال (زرک بان) سے وابستہ دکنہائی دینا ہے (جہشیاری، ص ۹۳)۔ دیوان الصدقہ کی زیاد (کوۃ اور عشر زرک بانہا) کی تعیین کے لیے رکھی گئی تھی۔ ایک دیوان المستغلات، بظاہر، شہروں میں سرکاری اراضی اور عمارات، خصوصاً لوگوں کو کرائے پر دیے ہوئے ”موقوف“ (منذون) کے انتظام کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ دیوان الطراز پھر سے، علم، سرکاری وردیاں اور فرایجر بنانے کا ذمے دار تھا۔ اس کے کاتب کا نام کبڑے پر لکھا ہوتا تھا (دیکھیے الجہشیاری، ص ۲۰۰؛ الصابی: الرسائل، ۱: ۱۸۱)۔ ہر صوبے میں ایک دیوان الخراج، جہاں کل مالیہ (”نوجوہ الاموال“) جمع ہوتا، ایک دیوان الجند اور ایک دیوان الرسائل ہوتا تھا (الجہشیاری، ص ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰۵، ۱۴۰۶، ۱۴۰۷، ۱۴۰۸، ۱۴۰۹، ۱۴۱۰، ۱۴۱۱، ۱۴۱۲، ۱۴۱۳، ۱۴۱۴، ۱۴۱۵، ۱۴۱۶، ۱۴۱۷، ۱۴۱۸، ۱۴۱۹، ۱۴۲۰، ۱۴۲۱، ۱۴۲۲، ۱۴۲۳، ۱۴۲۴، ۱۴۲۵، ۱۴۲۶، ۱۴۲۷، ۱۴۲۸، ۱۴۲۹، ۱۴۳۰، ۱۴۳۱، ۱۴۳۲، ۱۴۳۳، ۱۴۳۴، ۱۴۳۵، ۱۴۳۶، ۱۴۳۷، ۱۴۳۸، ۱۴۳۹، ۱۴۴۰، ۱۴۴۱، ۱۴۴۲، ۱۴۴۳، ۱۴۴۴، ۱۴۴۵، ۱۴۴۶، ۱۴۴۷، ۱۴۴۸، ۱۴۴۹، ۱۴۵۰، ۱۴۵۱، ۱۴۵۲، ۱۴۵۳، ۱۴۵۴، ۱۴۵۵، ۱۴۵۶، ۱۴۵۷، ۱۴۵۸، ۱۴۵۹، ۱۴۶۰، ۱۴۶۱، ۱۴۶۲، ۱۴۶۳، ۱۴۶۴، ۱۴۶۵، ۱۴۶۶، ۱۴۶۷، ۱۴۶۸، ۱۴۶۹، ۱۴۷۰، ۱۴۷۱، ۱۴۷۲، ۱۴۷۳، ۱۴۷۴، ۱۴۷۵، ۱۴۷۶، ۱۴۷۷، ۱۴۷۸، ۱۴۷۹، ۱۴۸۰، ۱۴۸۱، ۱۴۸۲، ۱۴۸۳، ۱۴۸۴، ۱۴۸۵، ۱۴۸۶، ۱۴۸۷، ۱۴۸۸، ۱۴۸۹، ۱۴۹۰، ۱۴۹۱، ۱۴۹۲، ۱۴۹۳، ۱۴۹۴، ۱۴۹۵، ۱۴۹۶، ۱۴۹۷، ۱۴۹۸، ۱۴۹۹، ۱۵۰۰، ۱۵۰۱، ۱۵۰۲، ۱۵۰۳، ۱۵۰۴، ۱۵۰۵، ۱۵۰۶، ۱۵۰۷، ۱۵۰۸، ۱۵۰۹، ۱۵۱۰، ۱۵۱۱، ۱۵۱۲، ۱۵۱۳، ۱۵۱۴، ۱۵۱۵، ۱۵۱۶، ۱۵۱۷، ۱۵۱۸، ۱۵۱۹، ۱۵۲۰، ۱۵۲۱، ۱۵۲۲، ۱۵۲۳، ۱۵۲۴، ۱۵۲۵، ۱

ص ۶۱ (۶۷، ۶۸ تا ۷۵) : *The Caliphs: Tritton*، باب ۳ : الکندی : تاریخ ولّاء مصر، ص ۸۰ : البلاذری : فتوح البلدان، ص ۹۳ : *The Orient: von Kromer*، ص ۱۹۶ تا ۱۹۷ : عباسی عہد : بنو عباس نے دیوان کے اموی نظام میں توسیع کی اور اس کو پایہ تکمیل تک پہنچایا اور وزیر [رک بان] کے توسط سے مرکزی دفتر سے ہدایات دینے کا انتظام کیا ۔

السفاح کے تحت بنو مروان کی ضبط شدہ اراضی کے لیے ایک دیوان قائم کیا گیا (الجہشیاری، ص ۹) ۔ یہی غالباً ترقی کر کے ”دیوان الضیاع“ بن گیا، جو خلیفہ کی ذاتی جائیداد کی بھی نگرانی کرتا تھا (کتاب مذکور، ص ۲۷) ۔

المصور کے تحت سیاسی حریفوں کی جائدادوں کو ضبط کرنے اور ان کی دیکھ بھال کے لیے ایک عارضی دیوان بنایا گیا (الیقوی، ۳ : ۱۲۷ : النخعی، ص ۱۱۵) ۔ ایک ”دیوان الاحشام“ کا بھی ذکر ملتا ہے ! یہ غالباً محل کے ملازمین کی دیکھ بھال کرتا تھا (Wiel - الیقوی : *Les Pays*، ص ۱۵) ۔ ایک دیوان الرقاق (درخواستیں) بھی تھا، جس کا کام خلیفہ کے سامنے پیش کرنے کے لیے درخواستیں جمع کرنا تھا (ابن طیفور : تاریخ بغداد، ج ۶) ۔

المہدی کے عہد حکومت میں ۱۶۲ھ/۷۷۸ء میں ”دواوین زمام“ (= نگرانی) کا ذکر آتا ہے، یہ زمام ہر دیوان کے ساتھ ہوتا تھا ۔ ۱۶۸ھ/۷۸۳ء میں تمام دواوین زمام کے اوپر ان کی نگرانی کے لیے ایک اور مرکزی دیوان، زمام الازمہ قائم کیا گیا، جو تمام دواوین زمام کے حسابات کی جانچ پڑتال اور کام کی نگرانی کرتا اور واحد دیوان اور وزیر یا دیگر دواوین کے درمیان واسطے کا کام کرتے تھے (الجہشیاری، ۱۳۶، ۱۶۶، ۱۶۸ : الطبری، ۱۰ : ۱۱) : البلاذری : فتوح البلدان، ص ۹۳) ۔ دیوان العظام کو

اب تک خراج کے دیوان مقامی زبانیں استعمال کرتے تھے : فارسی عراق اور ایران میں، یونانی شام میں، قبطی اور یونانی مصر میں ! نیز وہ حساب کتاب رکھنے میں سابق طریقوں کا تتبع کرتے تھے حتیٰ کہ اکثر مقامی سہراں اور تاریخیں عام استعمال ہوتی تھیں ۔ اب عربی علامات اور قواعد کو مروج کیا گیا اور سابق نظام تقویم کو اسلامی قمری سال کے مطابق بنا دیا گیا (دیکھیے PERF عدد : ۵۶۶، ۵۵۹، ۵۶۶، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۹، ۶۰۱ : CFR Bd. ۳، Teil ۱ : ۸۷ : Teil ۲ : ۵۰) ۔ سرکاری زبان بننے سے پہلے عربی کبھی کبھار استعمال ہوتی تھی (سب سے پہلا ورق بردی جو سلامت ہے اس کی تاریخ ۵۲۲ھ ہے۔ PERF، عدد ۵۵۸) ۔ پھر بھی مقامی زبانیں دوسری صدی ہجری آنھویں صدی عیسوی میں خاصی دیر تک وقتاً فوقتاً استعمال ہوتی رہیں (تب Etude de papyrologie : Grohmann، ۱ : ۷۷ تا ۷۹ : P. Lond، ۸ : ۱۲۷ : Nabia Abbott : کتاب مذکور، ص ۱۳ تا ۱۴) ۔ سلطنت کے محکموں میں عربی کی ترویج درجہ بدرجہ ہوئی ۔ ۷۷۸ھ/۷۹۷ء میں خجاج نے عراق کے دیوانوں میں عربی رائج کی (الجہشیاری، ص ۳۹) : البلاذری : فتوح البلدان، ص ۳۰۰ تا ۳۰۱ : الصولی : ادب الکتاب، ص ۱۹۲) : پھر ۸۸۱ھ/۷۷۰ء میں عبدالملک نے شام کے دواوین میں عربی رائج کی (البلاذری : فتوح البلدان، ص ۱۶۳ : الجہشیاری، ص ۳۰ : الصولی : ادب الکتاب، ص ۱۹۲ تا ۱۹۳) ۔ مصر کے دیوان ۸۸۷ھ/۷۷۵ء میں عربی ہوئے (الکندی : تاریخ ولّاء مصر، ص ۸۰ : ابن عبدالحکم : فتوح مصر والمغرب، ص ۱۲۲ : المقریزی : الخطط : ۱ : ۱۵۰) ۔ آخر میں، خراسان کے دیوان میں ۸۱۲ھ/۷۷۲ء میں الہشام کے عہد میں عربی سرکاری زبان قرار پائی (الجہشیاری، ص ۶۳ تا ۶۴) ۔ ذمیوں کو، جو ان محکموں میں کثرت کے ساتھ کاتب تھے، ہٹانا پڑا، لیکن کچھ بدستور ملازم رہے ۔ موالی برابر ملازمت میں لیے جاتے رہے (قب الجہشیاری،

صوبوں میں خراج، جند اور وسائل کے مقامی دیوان ہوتے تھے جو مرکزی دیوانوں کی چھوٹے پیمانے پر نقل ہوتے تھے (قب الجہشیاری، ص ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۷۷، ۲۲۰ تا ۲۲۱)۔

کبھی کبھی ایک نامور کاتب کا ایک سے زیادہ دواوین پر تقرر کر دیا جاتا تھا (کتاب مذکور، ص ۲۶۶؛ قب ص ۱۷۹)۔ مأمون کے عہد تک ”کتاب“ کی تنخواہیں نین سو درہم سے دس درہم ماہوار تک ہوتی تھیں (الجہشیاری، ص ۲۳، ۱۲۶، ۱۳۱ تا ۱۳۲)۔ الجاحظ کہتا ہے کہ مأمون کے بعد سب سے زیادہ تنخواہ پانے والا کاتب الخراج تھا (قب ثلاث رسائل طبع Finkel، ص ۴۹)۔ (مزید دیکھیے مادۃ کاتب)۔

دیوان تیسری، چوتھی صدی ہجری / نویں، دسویں صدی عیسوی میں پوری طرح بابۃ تکمیل کو پہنچ گئے تھے۔

دیوان الخراج کے پاس عموماً مقامی (صوبائی) دیوانوں کی مشلوں کی نقول ہوتی تھیں، لیکن تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی کے وسط تک ہر صوبے کا دارالخلافہ میں ایک خاص دیوان (الخراج) الگ الگ تھا۔ المعتضد نے ان تمام دیوانوں کو باہم ملا کر ایک دیوان بنا دیا جسے دیوان الدار (یا دیوان الدار الکبیر) کہتے تھے۔ اس کے جانشین المکتفی کے عہد

میں دوبارہ تین دیوان بنادے گئے: دیوان المشرق، مشرقی صوبوں کے لیے؛ دیوان المغرب، مغربی صوبوں کے لیے اور دیوان السواد عراق کے لیے۔ علی بن عیسیٰ دیوان السواد کو اہم ترین دیوان خیال کرتا تھا (مسکوبہ: تجارب الأمم، ۱: ۱۵۲)۔ بہر حال المعتز کے عہد میں بھی ایک مرکزی دفتر دیوان الدار موجود تھا۔ تینوں دیوان وزیر یا اس کے بعد کے کسی ایک کاتب کے ماتحت رہے، اور انہیں ابھی تک دیوان الدار کی شاخیں تصور کیا جاتا تھا (قب الصابی،

سرکاری گماشتوں کے خلاف لوگوں کی شکایات پر غور کرنے کے لیے بنایا گیا تھا۔ اس دیوان میں قاضی اجلاس کرتے تھے (الفخری، ص ۱۳۱)۔

معلوم ہوتا ہے کہ دیوان الخراج تمام محاصل اراضی کی دیکھ بھال کرتا تھا، جب کہ دیوان الصدقہ کا کام مویشیوں کی زکوٰۃ تک محدود تھا (قب الیعقوبی: کتاب البلدان، ص ۱۱؛ [امام] ابو یوسف: کتاب الخراج، ص ۸۰ تا ۸۱)۔ اس کی مختلف شاخیں تھیں، جن میں جہنہ کی شاخ بھی شامل تھی جو حسابات کی پڑتال اور مالیہ کی مددات کی کیفیت کی جانچ کے لیے تھی (الجہشیاری، ص ۲۲۰ تا ۲۲۱؛ التتوخی: الفرج، ۱: ۳۹ تا ۴۰)۔ [مزید دیکھیے جہنہ]۔ ایک اور شاخ تھی، جس کا نام ”مجلس العسکدار“ تھا، جہاں موصول ہونے والے اور باہر بھیجے جانے والے خطوط اور دستاویزات کی مثلیں متعلقہ افراد کے ناموں کے ساتھ تیار کی جاتی تھیں۔ یہی شاخ ”دیوان البرید“ میں اور ”دیوان الرسائل“ میں ہائی جاتی ہے (الجہشیاری، ص ۹۹؛ الخوارزمی: مقاتلح العلوم، ص ۴۲، ۵۰)۔ ”دیوان الخراج“ کے خطوط کی جانچ پڑتال ”دیوان الخاتم“ میں ہوتی تھی اور اس دفتر میں تاخیر ہو جانے کی وجہ سے الرشید نے اپنے وزیر کو براہ راست خطوط بھیجنے کی اجازت دی تھی (الجہشیاری، ص ۱۷۸)۔

المستول کے عہد حکومت میں دیوان الموالی و الفلمان کا ذکر بھی آتا ہے جو شاید دیوان الاحشام کا دوسرا نام ہے۔ اس کا تعلق محل کے غلاموں اور ستوسلین سے ہوتا تھا جن کی تعداد بہت زیادہ تھی (الیعقوبی: کتاب البلدان، ص ۲۳)۔

”دیوان الخاتم“ جسے ”دیوان السر“ (صیغہ راز) بھی کہتے تھے (الجہشیاری، ص ۱۷۷)، اس بنا پر خاص اہمیت رکھتا تھا کہ اس کے سربراہ کا خلیفہ سے قریبی رابطہ ہوتا تھا (قب الطبری، ۱: ۵۱ تا ۵۲)۔

کتاب الوزراء، ص ۱۲۳ تا ۱۳۱، ۱۳۲ تا ۱۳۶، ۲۶۲ تا ۲۶۴ : یاقوت : ارشاد، ۱ : ۲۲۶ : العریب، ص ۳۲ : مسکویہ، ۱ : ۱۵۱ تا ۱۵۲ : Bowen : علی بن عیسیٰ، ص ۳۱ تا ۳۲)۔ ایسا معلوم ہے کہ دار یا محل دارالوزارۃ یا وزیروں کی اقامت گاہ پر دلائل کرتا ہے (قب الصابی : تاریخ الوزراء، ص ۳۱)۔ دیوان الدار کا کاتب عمال کے ساتھ براہ راست خط و کتابت کرنے کا مجاز تھا (الصابی : تاریخ الوزراء، ص ۱۷۷)۔ بنو ابویہ کے قبضے (۳۳۳/۶۴۵ء) کے بعد خلافت کے حصے بخرے ہو جانے کے باعث ہم فقط دیوان السواد ہی کا نام سنتے ہیں (قب صابی : تاریخ الوزراء، ص ۳۶۷ تا ۳۶۸)۔ خراج کے دیوانوں کے پاس اراضی کے رقبوں، معاصل کی شرحوں، نقد یا جنس میں، اور مستعمل اوزان کی فردیں رہتی تھیں (الماوردی : کتاب مذکور، ص ۱۸۲ تا ۱۸۳ : الخوارزمی : مفاتیح العلوم، ص ۷۷)۔ وہ خراج، جزیہ اور زکوٰۃ کی آمدنی وصول کرتے تھے (الحسن بن عبداللہ : آثار الاول (یولاق ۱۲۹۵/۷۲)۔ "دیوان العشر" کے نام سے الماوردی کا مطلب اس دیوان کی ایک شاخ ہی ہو سکتا تھا (الماوردی، ص ۱۸۲)۔ جب دیوان الدار پایا گیا تو زمام کے متعلقہ دیوانوں کو یکجا کر دیا گیا (الصابی : تاریخ الوزراء، ص ۷۳، ۸۳ : وہی مصنف : تاریخ، ص ۳۶۸)۔ زمام "بیت انمال اور لوگوں کے حقوق کا نگہبان ہوتا تھا" (الماوردی، ص ۱۸۹)۔ یہ دیوان الخراج میں اراضی سے متعلقہ دستاویزات کی ایک اور نقل رکھتا تھا، اور مالیے کی تشخیص اور رقوم کی ادائیگی اور وصولی کے احکام کی جانچ پڑتال کرتا تھا (الماوردی، ص ۱۹۰ تا ۱۹۱)۔ المعتضدی عطا کردہ اقتطاع جو وزیر اور دیوان الدار کے کاتب کی منظور شدہ ہوتی تھی، اس کا انتقال دیوان الزمام کا کاتب اس وقت تک نہ ہونے دیتا تھا جب تک کہ وہ اپنے اندراجات میں اس اقطاع کی پڑتال نہ کر لیتا تھا (الصابی : تاریخ الوزراء، ص ۶۸۳)۔

دیوان النفقات کا تمام دیوانوں سے سروکار تھا۔ وہ ان کے اخراجات کے حساب کتاب کی جانچ پڑتال کرتا اور اس کے بارے میں اپنی رائے لکھتا تھا (الحسن بن عبداللہ : کتاب مذکور، ص ۷۱)۔ تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی کے اختتام پر اس کا زیادہ تر واسطہ دارالخلافت کی ضروریات سے رہ گیا (Mez (عربی) : ۱۲۵ : قب الصابی : تاریخ الوزراء، ص ۱۱۱ بعد)۔ یہ متوالی اور جاریہ اخراجات کی مثالیں رکھتا تھا (الصابی : تاریخ الوزراء، ص ۱۶)، اور اس کے کئی ذیلی شعبے تھے جو اخراجات کی مختلف مذاات سے سروکار رکھتے تھے (قب Mez (عربی) : ۱ : ۱۲۵ تا ۱۲۶)۔ نفقات کا زمام بھی تھا اور ۳۱۵/۹۲۷ء میں اس کے کاتب کے پاس خزانہ کا زمام بھی ہوتا تھا (الاصولی : اخبار الراضی والمعتی، ص ۶۱ : مسکویہ، ص ۱۵۲)۔

"بیت المال کا دیوان" جسے الذیوان السامی بھی کہتے تھے، بیت المال میں داخل ہونے والے نقد و اجناس کے ذرائع کی قسم وار مثالیں رکھتا تھا، اور اس کی تحویل میں مختلف اقسام کے محاصل کے لیے خزانہ اور ہر ایک کے لیے ایک چھوٹا دیوان ہوتا تھا، مثلاً دیوان الخزانہ (کپڑے اور روپے کے لیے)، دیوان الہراء (اناج کے لیے)، اور دیوان خزائنہ السلاح (اسلحہ کے لیے) (الحسن بن عبداللہ : کتاب مذکور، ص ۷۲ : قب الصابی : تاریخ الوزراء، ص ۱۶)۔ یہ دیوان آمدنی کی تمام مذاات کی پڑتال کرتا تھا اور اسی سے اخراجات کی منظوری لینا پڑتی تھی۔ وزیر تمام ہندلیوں اور روپے کی ادائیگی اس کے کاتب کا نشان دیکھ کر کرتا تھا (Mez (عربی) : ۱ : ۱۲۶ تا ۱۲۷)۔ یہ دیوان عموماً ماہانہ اور سالانہ آمد و خرج کی فہرستیں یا فردیں تیار کرتا تھا۔ (۳۱۵/۹۲۷ء میں علی بن عیسیٰ نے ہفتہ وار فردیں تیار کرنے کی استدعا کی تھی۔ مسکویہ، ۱ : ۶۵۱ تا ۶۵۲ : الصابی : تاریخ الوزراء، ص ۳۰۶)۔

دیوان الجہنہ بیت المال زرک بان] ہی کی ایک شاخ تھی (مزید دیکھیے دفتر، جہنہ)۔ دیوان الضیاع خزانے کی جاگیروں کا انتظام کرتا تھا (الہمدانی: تکملہ، ص ۱۸؛ مسکویہ، ۱: ۲۱۱؛ تب الصابی: الرسائل، ۱: ۱۳۹)، تاہم وقتاً فوقتاً ہم ایک سے زائد دیوان الضیاع کے نام سننے میں آتے ہیں۔ ۳۲۵ھ میں دیوان الضیاع الخاصہ والمستحدثہ تھا (یعنی خلیفہ کی ذاتی اور ٹی حاصل کی ہوئی جاگیریں)، اور دیوان الضیاع الفرائیہ (یعنی دریائے فرات کے کنارے کی جاگیریں) (الصابی: تاریخ الوزراء، ص ۱۲۳ تا ۱۲۴؛ مسکویہ، ۱: ۱۵۳)۔ ۳۰۸ھ/۹۱۶ء میں ابن الفرات نے ایک دیوان المرافق قائم کیا (اغظی ترجمہ امدادیں، رشوتیں، یعنی جو وایان صوبہ ادا کرتے تھے، صریحاً اس دولت سے، جو مستحبہ ذرائع سے اکٹھی کی ہوتی تھی)۔ مرافق کی رقم ان دنوں شام سے ایک لاکھ دینار سالانہ اور مصر سے دو لاکھ دینار آتی تھی۔ علی بن عیسیٰ نے سراق کی ممانعت کر دی، کیونکہ ان سے انتظامیہ میں بدعنوانیاں پیدا ہوتی تھیں (مسکویہ، ۱: ۳۴۸)۔ ۳۰۸ھ تا ۳۱۱ھ؛ الصابی: تاریخ الوزراء، ص ۳۱ تا ۳۲)۔

اگرچہ ہر دیوان میں، جو مالیات کا کام کرتا تھا، زمام (محکمہ نگرانی) ہوتا تھا، مگر وقتاً فوقتاً زمام کے تمام دیوان ایک ہی شخص کو سونپ دیے جاتے تھے۔ ۳۰۵ھ/۹۰۷ء میں یک روزہ کے خلیفہ ابن المعتز کے وزیر نے تمام "اصول" (حقیقی دیوان) علی بن عیسیٰ کے تحت اور زمام کے دیوان ابن عبدون کے تحت کر دیے (مسکویہ، ۱: ۶۰)۔ ۳۱۹ھ/۹۳۱ء میں جملہ زمام کو ایک کاتب اور "اصول" کو وزیر کے ماتحت کر دیا گیا (مسکویہ، ۱: ۲۲۶)۔ اس کا اعادہ ۳۲۵ھ/۹۳۶-۹۳۷ء اور ۳۲۷ھ/۹۳۸-۹۳۹ء میں کیا گیا (اصولی: اخبار الرازی والمتی، ص ۸۷، ۱۳۷)۔

دیوان الجند کے پاس افواج کی فہرست رہتی تھی،

جس میں ان کے عہدوں اور ان کی تنخواہوں یا اقطاع کے مطابق درجہ بندی ہوتی تھی۔ یہ دو حصوں پر مشتمل ہوتی تھی، ایک تنخواہ (عطاء زرک بان) اور اخراجات کی، اور دوسری فوج کی بھرتی اور جماعت بندی (تصنیف) کی (الجاحظ: ثلاث رسائل، ص ۹۴)۔ فداہ انہیں مجالس التثریر اور مجالس المقابله سے موسوم کرتا ہے، Mez (عربی)، ۱: ۱۶۵۔ نیز دیکھیے الماوردی، ص ۱۷۹ تا ۱۸۰۔ اس دیوان کا ایک زمام تھا، جسے دیوان زمام الجيش کہتے تھے جو اس کے حساب کتاب اور خرچ پر نگرانی رکھتا تھا (مسکویہ، ۱: ۱۵۲)۔

دیوان الرسائل براہ راست وزیر یا ایک کاتب کے ماتحت ہوتا تھا۔ مکتوبات اور دستاویزات کا مسودہ وزیر (یا خلیفہ) کی ہدایات پر کاتب اول تیار کرتا تھا، اور جب وہ اس کی منظوری دے دیتا تو پھر اس کی آخری نقل تیار کی جاتی تھی۔ کبھی کبھی کوئی خاص خوشنویس (محرر) یہ آخری نقل تیار کرتا تھا۔ تین سال کے بعد مکتوبات اور دستاویزات الخزانۃ العظمیٰ (بڑے محافظ خانے) میں بھیجی جاتی تھیں تاکہ وہاں ان کی آخری قسم بندی کی جائے اور فہرست بنائی جائے (التفشندی، ۱: ۹۶؛ ابن الصیرفی: قانون دیوان الرسائل، ص ۹۳، ۱۰۰ تا ۱۰۳؛ ۱۰۸، ۱۱۶، ۱۱۸، ۱۲۳ تا ۱۲۵؛ الجاحظ: ثلاث رسائل، ص ۹۴؛ الخوارزمی: سفاتیح العلوم، ص ۵۰؛ تب الصابی: تاریخ الوزراء، ص ۹۰۔ جہاں "دیوان الخرائط" استعمال ہوا ہے)۔ دیوان الغض، جو غالباً ابتدا میں دیوان الرسائل کا ایک شعبہ تھا، مکتوبات اور دستاویزات وصول کرتا، انہیں کھولتا اور ان کی قسم بندی کرتا، ان کی پشت پر ان کے مستدرجات کا خلاصہ لکھتا، انہیں وزیر کے سامنے پیش کرتا اور ان کی تحریری یادداشت رکھتا تھا (Mez (عربی)، ۱: ۱۳۰ تا ۱۳۱؛ ابن الصیرفی: کتاب مذکور، ص ۸۰-۸۱؛ التوحیدی: الامتاع والمواضع، ۱: ۹۸)۔ ۳۱۵ھ میں قس اور خاتم کو ایک دیوان

میں جمع کر دیا گیا (مسکویہ، ۱: ۱۵۲)۔

۳۰۱ میں علی بن عیسیٰ نے مذہبی خیرات و مہرات ("وقوف" اور "صدقات") کے انتظام کے لیے ایک دیوان البر قائم کیا۔ اس کی آمدنی مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے مقدس مقامات اور بوزنطی معاذ جنگ کے رضا کاروں پر خرچ کی جاتی تھی (مسکویہ، ۱: ۲۵۷، قسب ص ۱۵۱)۔ دیوان الصدقات بدستور سوشیوں پر زکوٰۃ لگاتا رہا۔ ۳۱۵ھ/۹۲۷ء میں ایک ہی کاتب البر اور صدقات کے دونوں دیوانوں کی نگرانی کرتا تھا (مسکویہ، ۱: ۱۵۲؛ صابی: رسائل، ص ۱۱۱)۔

دیوان الحرم کا ذکر بھی آتا ہے، جو محل کے زنان خانے کے امور کی نگرانی کرتا تھا (مسکویہ، ۱: ۱۵۲)۔

ضبط شہ اسلامک کے انتظام کے لیے ایک دیوان تھا، جسے دیوان المصائرین کہتے تھے (صابی: وزراء، ص ۳۰۶، ۳۱۱)۔ قریبوں کی دو نقلیں تیار کی جاتی تھیں، ایک دیوان کے لیے اور دوسری وزیر کے لیے (مسکویہ، ۱: ۱۵۵)۔ ضبط شدہ جاگیروں کے انتظام کے لیے دیوان الضیاع المقبوضہ بنایا گیا تھا (صابی: وزراء، ۳۰۶، ۳۱۱؛ مسکویہ، ۱: ۸۳؛ حمدانی: تکملہ، ص ۸۳، جہاں ایک "دیوان المخالفین" کا بطور اسلامک مؤانس کے منتظم کے ذکر کیا گیا ہے)۔

یہ بات واضح ہے کہ ایک ہی دیوان کے الگ الگ شعبوں کو بھی بعض اوقات دیوان کہتے تھے؛ نیز بعض دیوان مختصر مدت کے لیے ہوتے تھے اور انہیں عارضی ضروریات کے لیے قائم کیا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں بعض اوقات ایک سے زائد دیوان ایک کاتب کے ماتحت ہوتے تھے (دیکھئے صابی: وزراء، ص ۱۲۳ تا ۱۲۴)۔

معتضد کے عہد حکومت میں پھر دو دن کی تعطیل کی جانے لگی تھی، منگل کو آرام کے لیے اور

جمعے کو نماز کے لیے (صابی: وزراء، ص ۲۲۳)۔ دیوانوں کے سربراہوں کی تنخواہوں میں تفاوت پایا جاتا تھا۔ چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی کے اوائل میں دیوان السواد کا کاتب ۵۰۰ دینار ماہانہ وصول کرتا تھا اور دیوان العطاء کا کاتب صرف دس دینار۔ ۳۱۸ھ میں علی بن عیسیٰ نے تنخواہوں میں ایک تہائی کی کمی کر دی، لہذا دیوان السواد کا کاتب کو $۲۳۳\frac{1}{4}$ دینار ملتے تھے اور دیوان الفس اور دیوان الخاتم کے کاتبوں کو دو سو دینار۔ دیوان المشرق اور دیوان الضیاع الخاصہ والمستحدثہ کے کاتبوں میں سے ہر ایک کو ۱۰۰ دینار، دیوان الدار کے کاتب کو ۵۰۰ دینار اور زمام کے دیوانوں کے ہر ناظم کو مع اپنے گھٹا کے ۲۷۰۰ دینار (صابی: وزراء، ص ۳۰۶، ۳۱۱، ۳۱۳؛ قسب: کتاب مذکور، ص ۲۰ تا ۲۱؛ مسکویہ، ۱: ۶۸)۔ کفایت شعاری کے اقدامات کے پیش نظر علی بن عیسیٰ نے سال کو گھٹا کر تنخواہ کے ۸ تا ۱۰ ماہ کا کر دیا اور یہ عام معمول ہو گیا (صابی: وزراء، ص ۳۱۳؛ مسکویہ، ۱: ۱۵۲)۔

یوہی عہد (۳۳۸ تا ۳۴۷ھ/۹۵۵ تا ۹۵۵ء) تک بھی ہم دیوان السواد، مع اس کے ایک کاتب اور ایک معاون کاتب (خلیفہ) کے، نیز دیوان الضیاع (یا الضیاع الخاصہ) کا نام سنتے ہیں (صابی: تاریخ، سال ۳۹۰ھ، ص ۴۰۱ تا ۴۰۲، سال ۳۹۲ھ، ص ۴۶۷ تا ۴۶۸؛ مسکویہ، ۲: ۱۲۰ تا ۱۲۱؛ ابوشجاع: ذیل تجارب الأمم، ص ۱۴۷)۔ مالیات کے مرکزی دیوان کو اب "الادیوان" کہتے تھے؛ یہ وزیر کے ماتحت یا اس سے اگلے درجے کے کاتب کے ماتحت ہوتا تھا (دیکھئے مسکویہ، ج ۲، سال ۳۳۸ھ، ص ۱۲۴ تا ۱۲۵؛ ابوشجاع، ص ۱۴۳)۔ ۳۶۶ھ/۹۹۹ء میں بغداد کے بنے ہوئے ریشمی کپڑے پر عشر عائد کرنے کے لیے ایک خاص دیوان بنایا گیا (صابی:

تاریخ، ص ۳۶۸)۔ دیوان التفتات ایک خاص ”زام“ کے ساتھ (مسکویہ ۲: ۱۲۰ تا ۱۲۱) اخراجات کے حساب کتاب اور رقم کی جانچ پڑتال کے لیے جاری رہا (دیکھیے صابی: تاریخ، ص ۳۵۳، ۳۵۷)۔ تاہم مالیاتی دیوانوں کی نگرانی کے لیے دیوان الزمام بھی موجود تھا (کتاب مذکور، ص ۳۶۷ تا ۳۶۸) خزانے کے دیوان کو دیوان الخزائن یا دیوان الخزن کہتے تھے (ابوشجاع، ص ۳۶۸: صابی: تاریخ، ص ۳۶۸: الخوارزمی: مناقب، ص ۳۱)۔ اس دیوان کا سربراہ خازن یا ناظر کہلاتا تھا اور وقتاً فوقتاً دارالضرب بھی اس کی تعویل میں دے دیا جاتا تھا (ابوشجاع، ص ۲۵۰ تا ۲۵۱)۔ تاہم التوحیدی دارالضرب کے لیے ایک اور دیوان کا ذکر کرتا ہے، جسے دیوان النقد والعیار و دارالضرب کہتے تھے (ابتاع، ۱: ۹۸)۔

دیوان الجند دو دیوانوں میں منقسم تھا، ایک دیلمیوں کے لیے اور دوسرا ترکوں کے لیے (فوج کے دو بڑے عنصر یہی تھے)، اور اسے دیوان الجیش کہتے تھے (صابی: تاریخ، ص ۳۶۷ تا ۳۶۸)۔ تاہم ان دونوں کا سربراہ یا بخشی ایک ہی ہوتا تھا، جسے ”العارض“ کہتے تھے (ابوشجاع، ص ۲۵۸)۔

بنو فاطمہ: فاطمی دیوان بنیادی طور پر عباسیوں کے دیوانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ دیوان الرسائل یہاں دیوان الانشاء ہو جاتا ہے، اس کا سربراہ ”صاحب دیوان الانشاء“ یا ”کاتب الدست الشریف“ کہلاتا ہے۔ اس دیوان کی تفصیلی روداد ہے، جو ابن الصیرفی نے دی ہے، پتا چلتا ہے کہ یہ عباسی دیوان کے مانند تھا (دیکھیے ابن الصیرفی: قانون دیوان الرسائل، طبع اے۔ بیہجت، قاہرہ ۱۹۰۵ء: المقریزی: الخطط، ۲: ۲۳۴، ۲۳۶، ۳۰۶، ۳۱۰: ۱: التفتشندی، ۳: ۳۹۰، ۱: ۱۰۳، ۱۰۴: ۱: ابن الفلاس: ذیل تاریخ دمشق، ص ۸، شیال: الوثائق الفاطمیہ، ص ۳۶۵)۔

دیوان الجند کو ”دیوان الجیش“ یا ”دیوان الجیش

والرواتب“ (فوجوں اور تنخواہوں کا دفتر) کہتے تھے۔ یہ دو شعبوں پر مشتمل تھا: دیوان الجیش ایک ستونی کے ماتحت ہوتا تھا، اور اس کا سرکار قوجی بوری، فوج کے ساز و سامان اور فوجوں کے معائنے سے تھا اور دیوان الرواتب تنخواہ سے متعلق تھا۔ بہر حال دیگر حوالوں سے مترشح ہوتا ہے کہ دونوں دیوان عموماً علیحدہ علیحدہ ہوتے تھے، پہلا صاحب دیوان الجیش کے ماتحت تھا اور مؤخر الذکر کا سرکار فوجیوں اور غیر قوجی ملازمین کی تنخواہوں سے تھا (دیکھیے المقریزی: الخطط، ۲: ۲۳۲: التفتشندی، ۳: ۳۹۲ تا ۳۹۳، ۳۹۵: ۳) قب ابن الصیرفی: اشارہ، ص ۲۵، ۲۷: المقریزی: إقباط، سال ۵۴۲: شیال: الوثائق، ص ۳۰)۔ بنو فاطمہ جنگی بیڑے کو بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے، ان کے ہاں ایک دیوان ہوتا تھا، جو جہازوں کی تعمیر اور ان کے لشکروں کی دیکھ بھال کرتا تھا (التفتشندی، ۳: ۳۹۶)۔

مالیات کے دیوانوں کے معاملات الجہے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دیوان المجالس مرکزی محکمہ تھا، اس کے مختلف شعبے تھے، ان میں سے ایک کا کام جاگیروں (إقطاعات) سے متعلق تھا۔ یہ غالباً عباسیوں کے الدیوان کے مانند تھا۔ یہ ہفت ضرورت تمام دیوانوں سے تخمینے حاصل کرنے کے بعد میزانہ کا تخمینہ (استیمار) تیار کرتا تھا (المقریزی: الخطط، ۲: ۲۳۶: ۱: ۱۶۰ تا ۱۶۲: دیکھیے ۲: ۲۳۵: شیال: الوثائق، ص ۳۲۵)۔ دیوان النظر کے ہاتھ میں مالیات (اموال) کے دیوانوں اور ان کے عملے کی نگرانی تھی۔ یہ عباسیوں کے مرکزی دیوان الخراج کے مشابہ معلوم ہوتا ہے (دیکھیے شیال: الوثائق، ۱: ۳۰۴: ابن الصیرفی: اشارہ، ص ۳۵: المقریزی: الخطط، ۲: ۲۳۱: التفتشندی، ۳: ۳۹۳)۔ دیوان التفتش دیوان النظر سے وابستہ تھا، لیکن اس کا کام مالیات کے دوسرے دیوانوں کے حساب کتاب کی جانچ پڑتال

۲۹، ۸۳)۔ اس کا سربراہ وزیر ہوتا تھا، لیکن کبھی کبھی دبیر بھی ہوتا تھا، جسے صاحب الدیوان کہتے تھے (ابن الجوزی، ۱۰: ۱۶۵، ۱۶۵، ۱۶۵)۔ بعد ازاں اسے الدیوان العزیز کہنے لگے تھے۔ (دیکھیے الفوطی، ۳۷، ۶۳، ۸۸: ابن الساعی، جامع، ۹: ۲۸۵)۔

مالیات، فی الاصل دیوان الزمام کی ذمے داری تھی، جو فی الواقع دیوان الخراج کا کام کرتا تھا؛ جاگیروں کے مستاجر اور والیان صوبہ اسے مالیہ بھیجتے تھے (ابن الساعی، ۹: ۱۶)۔ اس کے دو شعبے تھے: بڑے دیوان کا سربراہ کاتب (کاتب الزمام) (دیکھیے ابن الجوزی، ۹: ۱۵۰، ۲۲۳، ۱۰: ۱۲۳، ۲۷) تھا، جسے بعد میں صدر کہنے لگے۔ دوسرے شعبے کا سربراہ ایک مشرف ہوتا تھا، جو دیوان کے کام کی اور آمدنی کی نگرانی کرتا تھا (ابن الساعی، ۹: ۹۸ تا ۹۹، ۱۱۸: ابن الفوطی، ص ۱۶، ۶۲، ۶۳)۔ ہر صوبے (یا ضلع) میں بھی اسی قسم کا دیوان تھا، جس کا سربراہ ایک ناظر اور ایک مشرف ہوتا تھا (ابن الفوطی، ص ۶۳، ۱۰۱)۔

المخزن المدور جو آگے چل کر المخزن (خزانہ) ہو گیا تھا، بیت المال کے لیے استعمال ہوتا تھا اور اس کے سربراہ صاحب المخزن کی جگہ ناظر یا صدر نے لے لی تھی۔ یہ دیوان دارالضرب کی نگرانی بھی کرتا تھا (دیکھیے ابن الجوزی، ۱۰: ۲۸ تا ۲۵، ۵۲، ۱۲۵: ۹: ۱۲۵، ۱۵۵، ۲۱۶)۔ اس کا رتبہ بہت بلند تھا (قب ابن الجوزی، ۹: ۲۰۳)۔ ۵۹۳ھ/۱۱۹۸ء میں اس کے صدر کو تمام دیوانوں پر اختیار دے دیا گیا (ابن الساعی، ۹: ۲۵)۔ اس کے بہت سے شعبے تھے اور ہر ایک کا سربراہ ایک ناظر ہوتا تھا مثلاً خزائن الغلات (ابن الفوطی، ص ۷، ۳۷: دیکھیے ابن الجوزی، ۹: ۸۳، ۱۰: ۵۲: ابن الساعی، ۹: ۱۰۳، ۱۲۷)۔ اس نے تقرر کی رسم کا حال بیان کیا ہے، ص ۱۵۱)۔ یہاں بھی ایک مشرف ہوتا تھا جو

کرتا تھا۔ یہ عباسیوں کے مرکزی زمام کے برابر تھا (المقریزی، ۲: ۲۴۲: الفلقشنی، ۳: ۱۹۳: ۱: ۱۰۰: ابن میسر، اخبار، ص ۴۳)۔

دیوان الخاص، محل کے مالی امور کی نگہداشت کرتا تھا (المقریزی: إتمام، ص ۲۰۰)۔ وقف کا دفتر دیوان الاحباس تھا (الفلقشنی، ۳: ۱۹۵، ۲۹۸ تا ۲۹۵)۔ لاوارث اور ضبط شدہ املاک کے انتظام کے لیے دیوان الموارث الحشریہ قائم کیا گیا تھا (ابن میسر، ص ۵۶: الفلقشنی، ۳: ۱۹۶)۔ "مظالم" خلیفہ یا وزیر کے سامنے پیش ہوتے تھے، ان کا بندوبست کرنے کے لیے دو کاتبوں سمیت ایک دیوان التوقيع تھا (المقریزی: إتمام، ص ۲۰۷، الفلقشنی ص ۹۱)۔

کاتبوں کی تنخواہوں میں تفاوت تھا۔ انشاء کے کاتب کو ۱۵۰ دینار ماہانہ، نظر کے کاتب کو ۷۰ دینار، بیت المال کے کاتب کو ۱۰۰، اور تحقیق کے کاتب کو ۵۰ دینار ملتے تھے، اور جیش، توقيع مجلس اور اقطاع کے کاتبوں میں سے ہر ایک کو چالیس دینار، کمتر درجے کے کاتبوں کو ۵ سے ۱۰ تک (الفلقشنی، ۳: ۵۲۶: المقریزی: الخطط، ۲: ۲۴۳)۔ غیر مسلموں کو کثرت سے دیوانوں میں ملازم رکھا جاتا تھا اور اس کے باعث وقتاً فوقتاً ان سے مخالفت پیدا ہوتی تھی (دیکھیے ابن القلاسی، ص ۵۹: ابن العبری: تاریخ، ص ۳۷: ابن الصیرفی: الأشارہ، ص ۳۳، ۳۵، ۳۸، ۵۳: Tritton، کتاب مذکور، باب ۲)۔

گیارہویں سے تیرہویں صدی تک: بویہی عہد سے دیوان الرسائل کو دیوان الانشاء کہا جاتا تھا اور اس کے دبیر (سیکرٹری) کو "کاتب الانشاء" (ابوشجاع، ص ۱۵۳ تا ۱۵۴: ابن الجوزی: المنتظم، ۹: ۵۵، ۱۰: ۱۲۵: ابن الفوطی: حوادث، ص ۱۶: ابن الساعی: جامع، ۹: ۲۲۲)۔ مرکزی دفتر "الديوان" تھا (دیکھیے ابن الجوزی، ۹: ۹۱، ۲۷، ۲۸)

British Museum Greek Papyri IV. (۲): ۱۹۳۸ء
 H. I. Bell طبع (the Aprodito Papyri) لندن ۱۹۱۱ء
 National Bibliothek Papyrus Erzherzog Rainer (۳)
 وی افا ۱۸۹۸ء: Corpus Papyrorum Raineri (۴)
 Adolf Grohmann طبع (Archiducis Austriae III
 Abbasid: H. F. Amedroz (۵): ۱۹۲۳ء تا ۱۹۲۴ء
 administration in its decay ... JRAS ۱۹۱۳ء
 The life and times: H. Bowen (۶): ۸۳۲ء تا ۸۳۳ء
 of 'Alī b. isā کمبریج ۱۹۲۸ء: A. A. Duri (۷)
 القلم الاسلامیہ ج ۱، بغداد ۱۹۵۰ء: R. Levy (۸)
 The social structure of Islam کمبریج ۱۹۵۷ء ص
 Arab administra-: S.A.Q. Husaini (۹) ۳۲۵
 یعد: Renaissance: باب ۶: (عربی ترجمہ از اے۔ ایچ۔ ابوربداء،
 ۲ جلد، قاہرہ ۱۹۲۰ء تا ۱۹۲۱ء): D. Sourdel (۱۰)
 Le vizirat 'abbāside de 132/750 à 324/934 دمشق
 ۱۹۶۱ء

(A. A. Duri)

۲۔ مصر

مصری دیوان کی نشوونما کے لحاظ سے تین
 دور الگ الگ نمایاں کیے جا سکتے ہیں، کیونکہ
 حکومت کی تبدیلیوں کے مقابلے میں انتظامی اداروں
 میں تسلسل زیادہ قوی نظر آتا ہے، لہذا ان تین ادوار
 کے درمیان فی الواقع کوئی واضح انقطاع نہیں ہوا:
 (۱) وہ عہد جب مصر اسلامی سلطنت عظمیٰ کا صوبہ
 تھا (۱۸/۵۱۸ء [بہ تصحیح ۶۳۹ء] تا ۳۵۸/۹۶۶ء): (۲)
 خلافت فاطمیہ (۳۵۸/۹۶۹ء تا ۵۶۷/۱۱۳۷ء):
 (۳) ایوبی اور مملوکی عہد (۵۶۷/۱۱۷۱ء تا
 ۹۲۳/۱۵۱۷ء)۔

پہلے حصے کے مآخذ مقدم و متاخر مؤرخین
 کی مشہور آرا اور کتاب کے لیے دستور العمل، نیز عربی
 کے اوراق بردی ہیں جن کی تعداد روز افزوں ہے۔

مخزن کی نگرانی کرتا تھا۔ اشراف واضح طور پر
 سابقہ زمام کی جگہ لے لیتے (ابن القوطی، ص ۱۰۳:
 ابن الساعی، ۹: ۲۰، ۲۱، ۲۲)۔

دیوان الجوالی (یعنی جزیہ) جزیہ کی تشخیص و
 تعیین کی نگرانی کرتا تھا (دیکھیے جوالی، جزیہ)۔
 لاوارث جائداد کے انتظام کے لیے ایک نیا محکمہ
 دیوان التركات الحشریہ قائم کیا گیا (ابن الساعی،
 ص ۱۰۷: ابن الجوزی، ۱۰: ۶۸)۔ دیوان العقار،
 جس کا سربراہ ایک ناظر ہوتا تھا، عمارات کی نگرانی
 کرتا تھا، مثلاً دکانیں جو حکومت کی مملوکہ ہوتی
 تھیں (ابن القوطی، ص ۶۳: قب ابن الجوزی، ۱۰:
 ۲۴۳)۔ تاہم تعمیر و مرمت کا کام ایک دوسرے محکمے
 سے تعلق رکھتا تھا جسے دیوان الایبہ (محکمہ
 تعمیرات) کہتے تھے۔ اس کے عملے میں مہندس اور
 مہران تعمیرات ہوتے تھے (ابن الساعی، ۹: ۶۳،
 ۱۸۸)۔ ۱۲۳۷/۵۴۳ء - ۱۲۳۸ء میں اس نے بغداد
 کی فیصل کی مرمت میں حصہ لیا (ابن القوطی، ص
 ۱۱۱)۔ دیوان الحصبہ عموماً قاضی القضاة یا ایک
 نائب کے ماتحت ہوتا تھا (ابن الساعی، ۹: ۱۶:
 ابن القوطی، ص ۶۳)۔

خلافت کے اختتام تک مسلمانوں کے ساتھ غیر
 مسلم مالیاتی دفاتر میں کام کرتے تھے۔ ان کے خلاف
 وقتاً فوقتاً قدغین عائد کی جاتی تھیں، مگر فقط عارضی
 طور پر - ۵۳۳/۱۱۳۹ء میں یہودیوں اور عیسائیوں
 کو دیوان اور المخزن سے محظوظ کر دیا گیا لیکن
 ایک ہی ماہ بعد انہیں واپس لا لیا گیا (ابن الجوزی،
 ۱۰: ۷۸)۔ ایسے احکام کے (مثلاً ۶۰۱ھ میں
 الناصر یحییٰ بن عبد اللہ کے) تکرار ہی سے ظاہر ہے کہ ان پر
 عمل درآمد نہیں ہوا اور غیر مسلم بدستور ملازمت
 میں رہے (ابن الساعی، ۹: ۱۶۲)۔

مآخذ: مقالے میں درج ہیں۔ مزید دیکھیے
 The Kurrah papyri: Nahia Abhatt، شکاگو،

ہوئی کہ اس ابتدائی زمانے میں کوئی مرکزی دفتر مال قائم ہوا تھا یا اس کے لیے لفظ دیوان کا استعمال ہوتا تھا۔ المقریزی (لکھتا ہے (الخطط، ۱: ۳۹۹، ۲ تا ۱۰) کہ والی مسئلہ بن محمد الانصاری (۳۷۷/۵۶۲ تا ۴۸۲/۱۰۸۹ء) الکندی، طبع Rih. Guest، ص ۳۸ تا ۳۹، المقریزی: الخطط، ۱: ۳۰۱، ۲ تا ۲۷) نے اس بات پر ایک سرکاری افسر سامور کیا کہ وہ ہر صبح عرب آباد کاروں کے درمیان جا کر ان کی خاندانی حیثیت میں تبدیلیوں یا مہمانوں کی آمد کے متعلق پوچھ گچھ کرے اور اس کی اطلاع دیوان کے سامنے پیش کرے۔ اسی اطلاع پر والی اہل الدیوان (دیوان کے عمال) کو مزید وظائف جاری کرنے کی ہدایت کرتا تھا۔ اس بیان سے ایک باقاعدہ محکمہ دیوان کا موجود ہونا ظاہر ہوتا ہے، نیز یہ کہ دیوان مذکور عرب مہاجرین کے ناموں کا اندراج اور اداے وظائف کا کام کرتا تھا۔ دیوان کی اصطلاح کا ایسا ہی استعمال الکندی کی ایک تحریر میں بھی دکھائی دیتا ہے (طبع Guest، ص ۱۷۱، المقریزی: الخطط، ۱: ۳۹۹، ۲ تا ۱۰)۔

تا ۱۳)۔ مصر میں پہلا دیوان حضرت عمرو ابن العاص رضی اللہ عنہ نے، دوسرا دیوان عبدالعزیز مروان، تیسرا قرہ بن شریک (زک یان)، چوتھا بشر بن صفوان نے قائم کیا تھا۔ چوتھے دیوان کے قیام کے بعد کوئی قابل ذکر بات وقوع پذیر نہیں ہوئی، اس کے سوا کہ قیس قبیلے کو هشام بن عبدالملک بن مروان کے دور خلافت (۱۰۵/۷۲۳ء تا ۱۲۵/۷۴۳ء) میں دیوان میں داخل کیا گیا۔ الکندی (طبع Guest، ص ۷۶) اس واقعے کو ۱۰۹/۷۲۷ء سے منسوب کرتا ہے: قیس کے تین ہزار خاندان مع ان کے دیوان (یعنی فہرستوں اور وظائف کی کتابوں) کے مصر کو منتقل ہوئے۔ ان تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ دیوان کی اصطلاح قدیم زمانے ہی سے ان معانی کے لیے استعمال ہوتی تھی: (الف) مسلمان عرب قبائل کے وظائف کی فہرستیں؛ (ب) اور یہ کہ قبیلہ

دوسرے اور تیسرے دور کے لیے کتاب کے لیے دستور العمل، اور مفصل و جامع کتابیں وافر مواد مہیا کرتی ہیں، جن میں وسطی دور کے اواخر میں اضافہ ہوتا جاتا ہے: پھر مؤرخین ہیں جن کے بیانات مذکورہ بالا مآخذ کی تشریحات میں تو زیادہ اضافہ نہیں کرتے لیکن مزید اصل واقعات فراہم کرتے ہیں۔ متأخرین میں المقریزی (م ۸۸۵/۱۴۸۲ء) کی الخطط امتیازی اہمیت رکھتی ہے، کیونکہ وہ مصری انتظامیہ کی تاریخ مسلم فتح سے لے کر خود اپنے وقت تک تقریباً مسلسل بیان کرتا ہے (مطبوعہ بولاق، ۱: ۸۱، بعد، ۳۹۷ بعد، ۲: ۲۱۵ بعد)، علاوہ ازیں اس نے متفرق سوانح اور عمارات کے بیانات میں اہم اضافے کیے ہیں۔

(۱) مسلمان مصر میں اسی طریقے سے انتظامات

چلاتے رہے جسے یوریشیوں نے وہاں کی مقام عیسائی آبادی کی مدد سے قائم کیا تھا، حتیٰ کہ مقامی باشندوں کو قبطی زبان تک استعمال کرنے کی اجازت تھی۔

چونکہ دیوان کی اصطلاح مصر میں یوریشیوں کے

تحت مستعمل نہیں تھی، لہذا ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ اسے مصر کے نئے آقا اپنے ساتھ لائے تھے۔ سورس بن المقفع (جو ۶۰۰ء کے قریب زندہ تھا) دیکھتے ہیں ابن المقفع، ابوالبشر) اطلاع دیتا ہے کہ دوسرے والی مصر عبداللہ بن سعد بن سہل (۸۳۳/۶۶۲ء تا ۸۳۵/۶۵۶ء)، زک یان نے "مصر (الفسطاط) میں دیوان قائم کیا، جہاں مصر کے تمام محصولات ادا کیے جاتے تھے" (History of the Patriarchs of Alexandria) طبع C. F. Seybold، ص ۱۰۳، طبع (Patr. Orient.) B.T. Evetts، ج ۵، ۱: ۱۵۰، نقل کردہ از The Kurra papyri: N. Abbott، ص ۱۰۳ اور Conversion and poll tax: D.C. Dennett، ص ۷۳)۔ بدقسمتی سے اسلامی مآخذ سے اس بات کی توثیق نہیں

پہلے ہی ایک ورق بردی، مؤرخہ شوال ۹۰ھ/اگست - ستمبر ۹۰ء میں ذکر ملتا ہے: یہ بات اغلب معلوم ہوتی ہے کہ یہ لوگ اسی دیوان الہراء کے اہل کار تھے جس کا نام بعد میں النابلسی نے فہرست میں درج کیا ہے (Pap. Schott - Reinhardt : C. H. Becker, ۲۰، ۳۷ اور ۴۹: نیچے دیکھیے)۔ المقریزی کہتا ہے (الخطط، ۲: ۲۷، ۲۲۶، ۲۷ تا ۲۹: W. Björkman : Staatskanzlei، ص ۱۸، حاشیہ ۳) کہ دیوان البرید (ڈاک کا دیوان) قدیم زمانے کے دیوان الانشاء سے بھی پڑنے بنا تھا: اور (A. Grohmann : Studien z. hist. Geogr. und Verw، ص ۳۵) اس بات کو مسلم سمجھتا ہے کہ محصول کے دفاتر، عامل اور نائب عامل کے ساتھ، دوسرے بہت سے دفاتر کے علاوہ صوبوں کے بڑے بڑے مقامات کورہ میں [صحیح کورہ = ضلع] تھے۔ دیوان اسفل الارض (لشبی مصر کا دیوان) کی موجودگی ایک ورق بردی مؤرخہ ۱۴۳ھ/۷۱۶ء سے ثابت ہوتی ہے (Pap. : C. H. Becker, Schott-Reinhardt، ص ۲۹، حاشیہ ۹: A. Grohmann, APEL، ۴: ۱۴۳: نیچے دیکھیے)۔

طوٹونیوں کے عروج سے ذرا پہلے کے برسوں میں دیوانوں کی تعداد میں اضافہ ملاحظہ کیا جا سکتا ہے (المقریزی: الخطط، ۱: ۱۰۷ تا ۲۸: ۲۹: A. Grohmann : Beiträge : C. H. Becker، ۲: ۱۴۳: A. Grohmann : Zum Steuerwesen im arabischen Agypten : mann، در Actes d. V. Cong. Int. d. Pap.، ۱۹۳۸ء، ص ۱۳۲)۔ مشہور عامل مالیات ابن مدبر نے چراگہ اور ماہی گیری (سراعی، مصادی) پر نئے محصول عائد کیے اور ان کے انتظام کے لیے ایک خاص دیوان قائم کیا۔ دوسری طرف، خلیفہ المعتصم کے ایک حکم سے عرب آبادکاروں کے حقوق وظیفہ ختم کر دیے گئے اور اس لیے غالباً متعلقہ دیوان بھی باقی نہیں رہے۔ الفسطاط میں دیوان الخراج کی جگہ پہلے مسجد عمرو ابن العاص کے

جہاں جانا تھا یہ فہرستیں ان کے ساتھ بھیجی جاتی تھیں (ج) نیز یہ کہ نتیجہ قبیلہ تیس کا دیوان (یعنی فہرست وظائف) بھی مصر منتقل ہوا تو وہاں جو دیوان پہلے ہی سے موجود تھے ان میں اس کا اضافہ ہو گیا۔

پہلی صدی ہجری/ساتویں صدی عیسوی کے نصف ثانی کے دوران میں مرکزی سرکاری دفاتر کو ظاہر کرنے کے لیے دیوان کی اصطلاح کا استعمال یقیناً زیادہ عام ہو چکا تھا۔ بتایا گیا ہے (الکندی، ص ۵۸ تا ۵۹: المقریزی: الخطط، ۱: ۱۹۸ تا ۱۱۰) کہ مصری دیوانوں میں قبطی زبان کو چھوڑ کر عربی زبان کو ۵۸ھ/۷۷ء میں اختیار کیا گیا تھا (فب طبع Wiet، ۲: ۵۸)۔ اس کا مطلب فقط یہ ہو سکتا ہے کہ مذکورہ بالا سال میں اصطلاح دیوان پہلے ہی سے الفسطاط میں مرکزی سرکاری دفتر کا نام تھا۔ مالیات کا پہلا آزاد مدیر (عامل الخراج) اسامہ بن زید التثوخی تھا، جسے خلیفہ سلیمان بن عبدالملک نے والی مصر قرہ بن شریک کی وفات پر ۹۶ھ/۷۱۵ء میں مقرر کیا تھا۔ یہ بات کہ اسامہ ایک دیوان کی مدد سے کام کرتا تھا المقریزی کی ایک تحریر سے (الخطط، ۱: ۷۷، ۷۸ تا ۳۸، ۳) ثابت ہے، جہاں لکھا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ (۹۹ھ/۷۱۷ء تا ۱۰۱ھ/۷۲۰ء) نے مسلمانوں پر سے جزیہ منسوخ کر دیا اور اس سے دیوان (الخراج) کو مطلع کر دیا۔ ۱۰۵ھ/۱۰۷ء تصحیح ۷۲۴ء میں والی العز بن یوسف نے دیوان کے اہلکاروں کو قبطی کسانوں کے خلاف زائد محصولات کی جبراً وصولی کے لیے بھیجا۔ دو سال بعد مشہور عامل الخراج ابن حجاب (Beiträge : C. H. Becker، ۲: ۱۰۷ تا ۱۱۰) نے محصول دہندگان کی فہرستیں تیار کیں، جنہیں احتیاط سے یکجا رکھا گیا اور دیوان الخراج کے لیے ان میں مفصل معلومات درج کیں (المقریزی: الخطط، ۱: ۷۷، ۷۸ اور ۲۳، ۲۹، ۱۰)۔ اصحاب الہراء (اناج کے سرکاری گوداموں کے عمال) کا

۳۹۷، ۳۲ بعداً نیز دیکھئے النابلسی : لمعة، باب ۳، در *Quelques aspects...* : Cl. Cahen، ص ۱۰۳۔ پہلا مرکزی النظامی دفتر اور دیگر تمام دیوانوں کی مان دیوان المجالس (مشاورت کا دیوان) تھا، جس میں کل انتظامیہ مرکوز تھی۔ متعدد منشی اپنے اپنے الگ کمروں میں ایک یا دو معاونوں (معیین) کے ساتھ وہاں بیٹھتے تھے۔ اس دیوان کا حاکم اعلیٰ جاگیروں (اقطاع) کو عطا کرنے کا ذمے دار تھا (C. H. Becker : *Islamstudien* : ۱، ۲۲۰ : W. Björkman : بعداً اشاریہ : Cl. Cahen : *Evolution de l'Etat*، در *Annales ESC* (۱۹۵۳ء) اور اس کے فیصلوں کو "دفتر المجالس" (مجلس کی اسٹلہ) کہتے تھے۔ دیوان المجالس کے مختلف شعبے خیرات، عطیات، خیام اور سلطان کے ذاتی اخراجات کی مدتوں سے چھٹتی تھے۔ ہمارے ماخذ سے اس بات کا پتا نہیں چلتا کہ آیا بنو فاطمہ سے پہلے یہ دیوان موجود تھا یا وہ کب خود مختار شعبوں میں منقسم ہوا۔ بایں ہمہ یہ اغلب معلوم ہوتا ہے کہ دیوان المجالس دیوان الاسوال کا پیش رو تھا، اور یہ کہ دیوان الانشاء اس کے پہلو بہ پہلو موجود تھا۔

دواوین کی مفصلہ ذیل فہرست، جو مذکورہ بالا ماخذ سے اخذ کی گئی ہے، مکمل ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ دیوان کی طرز کے مختلف دفاتر ایک ہی درجے کے نہیں تھے، کیونکہ دیوان سے کبھی کبھی مرکزی دفاتر کی محض صوتی تباہی مراد ہوتی تھیں۔

(۱) دیوان الانشاء، یا الرسائل، یا المکاتبات (ملک کا دفتر وزارت) تین ذیلی شعبوں میں منقسم ہے : (۱) صحابت دیوان الانشاء والمکاتبات یا دیوان النظر (صدر دفتر یا نگرانی کرنے والا محکمہ)، اس کے سربراہ کو رئیس (سربراہ) یا متولی (نگران) یا صاحب (حاکم) یا مشد (مدیر) کہتے تھے اور اسے الشیخ الاجل

قریب ایک عمارت میں تھی؛ متولی الخرج (ناظر مالیات) جاگیروں کی تشخیص کے لیے خود مسجد کے اندر اجلاس عام کرتا تھا۔ احمد بن طوئون نے اس دیوان کو مسجد احمد بن طوئون میں منتقل کر دیا، جہاں وہ عہد فاطمیہ تک رہا (المقریزی : الخطط، ۱ : ۳۸۲ تا ۱۵)۔ ایک ورق یردی مؤرخہ ۳۰۱ھ/ ۹۱۳ء مقامی دفتر محصولات کو دیوان الخراج کے نام سے بیان کرتا ہے (A. Grohmann : *APEL*، ۳ بار دوم، ۲۲۷)۔ احمد بن طوئون کے تحت خلافت بغداد سے مصر کی بالفعل آزادی کا اظہار دیوان الانشاء (ملک کا دفتر وزارت) کی تاسیس سے کیا گیا، جس کا پہلا سربراہ ابو جعفر محمد بن عہدکن (م ۸۷۸ھ/ ۸۶۸ء، القلقشنندی، ۱ : ۹۵ : W. Björkman، ص ۱۸ تا ۱۹ : زکی محمد حسن : *Les Tulumides*، ص ۱۹۱ تا ۲۱۶ و ۲۸۰ تا ۳۸۲) مقرر ہوا۔

(۲) عہد فاطمیہ : ہمارے بڑے بڑے ماخذ یہ ہیں : (الف) عام معلومات کے لیے (۱) القلقشنندی (۳ : ۳۹۰ تا ۳۹۶ : ویٹیفیکٹ، ۱۸۸ تا ۱۹۳) : (۲) المقریزی الخطط : ۱ : ۳۹۷ تا ۴۰۲) : (۳) خانوادۃ فاطمی کے آخری عشروں اور ایویوں کے ابتدائی سنیں کے لیے ابن السمانی (قوائین الدواوین، ج ۸ و ۹) : (ب) دیوان الانشاء کے لیے خصوصاً ابن الصیرفی کا قانون دیوان الانشاء۔ القلقشنندی اور المقریزی کے بیانات زیادہ تر المرتضیٰ ابو محمد عبدالسلام بن محمد بن الطویر (تیسرائی، جس کا زمانہ حیات نامعلوم ہے، کی گمشدہ کتاب *نسحة المقلین فی اخبار الدولین الفاطمیة والمصلحیة* پر منحصر ہیں) (حاجی خلیفہ (طبع جی۔ فلوگل G. Fluegel) : ۳۳۳ : ۱۳۷۲ : R. Guest : *Writers, books, etc., in the Khilafat* : ۱۹۰۲ء : ۱ : ۱۱۷ : C. H. Becker : *Beiträge* : ۱ : ۲۹ تا ۳۰ : W. Björkman، ص ۲۶ حاشیہ ۸۳)۔ بقول ابن الطویر (القلقشنندی، ۳ : ۹۳ : المقریزی : الخطط، ۱ :

(۲) دیوان الجیش والرواتب (فوج اور تنخواہوں کا دیوان) تین شعبوں میں منقسم تھا: (الف) دیوان الجیش ایک قسم کا جنگی دفتر عسکری انتظامیہ اس کے سربراہ کا مسلمان ہونا ضروری تھا: (ب) دیوان الرواتب، وزیر سے رسالے کے سوار تک کے لیے تمام تنخواہ یافتہ اشخاص کی تنخواہ کا مرکزی دفتر (قب: Renaissance: A. Mez ص ۳۷ تا ۳۸): (ج) دیوان الاقطاع (جاگیروں اور وظیفوں کا دیوان) غیر فوجی ملازمین کے لیے، کیونکہ فوجی عملہ دیوان الرواتب سے تعلق رکھتا تھا (انفائندی، ۳: ۴۹۲ تا ۴۹۳: انگریزی: الخطط، ۱: ۴۰۰ تا ۴۰۲)۔

(۳) دیوان الاموال (مالیات کا دفتر، خزانہ) چودہ شعبوں میں منقسم تھا، جنہیں دیوان بھی کہتے تھے، جنہیں الفلکندی نے شمار کیا ہے (۳: ۴۹۳ تا ۴۹۶) اور اس سے کہیں مختصر طور پر انگریزی نے (الخطط، ۱: ۴۰۰ تا ۴۰۱)۔ ابن المعانی نے شہری ملازمت کے درجے کے مترہ ملازمین کی فہرست دی ہے۔ (اسماء المستخدمین من حمل الافام)، جو ظاہر طور پر دیوان الاموال کے عملے سے تعلق رکھتے تھے: لیکن یہ بات ہر موقع پر واضح نہیں ہوتی کہ چودہ شعبوں میں سے کن کن کے ساتھ یہ مترہ گروہ مطابقت رکھتے تھے (طبع A. S. Atiya ص ۲۹۷ تا ۳۰۶)۔ (الف) نظر الدواوين یا دیوان النظر (یعنی دیوان کا نگران محکمہ)۔ دیوان الاموال کا سربراہ یعنی وزیر مال بحیثیت منصب اس کا سربراہ ہوتا تھا۔ ابن المعانی ناظر دیوان (نگران کار، معاسب، جو حسابات کی جانچ پڑتال اور تصدیقی دستخط کرتا تھا) اور متولی (مستعم) کے درمیان تیز کرتا ہے، جو تمام امور دفتر کا ذمے دار تھا (C. H. Becker: Islamstudien، ۱: ۱۷۰ تا ۱۷۳)۔ (ب) دیوان التحقیق (سرکاری تفتیش کا دفتر) (قب ڈوزی، بذیل مادہ)،

(عزت مآب) سے خطاب کرتے تھے۔ اسے یہ بلند سربہ اس لیے حاصل تھا کہ وہ خلیفہ کے حضور میں رسوخ رکھتا تھا، جس کے پاس وہ سرکاری کاغذات لاتا اور ان کے جواب کے بارے میں مشورہ دیتا تھا۔ اس کی معاونت بقول ابن الصیری، دو بلند مرتبت عہدے دار کرتے تھے۔ دیوان الانشاء کے دیگر دو شعبے یہ تھے: (۱) اعلیٰ محکمہ یا مرافعہ کا دفتر (توقیعات بالقلم الدقیق) جس کا تعلق خلیفہ کے ان فیصلوں سے ہوتا تھا جو وہ شکایت کی ان عرضیوں پر صادر کرتا تھا جنہیں کوئی شخص عام بارہابی کے وقت اس کے سامنے پیش کر سکتا تھا اور (۳) رجسٹرار کا دفتر (توقیعات بالقلم الجلیل) جو عرضی گزار کی درخواست پر مفصل قانونی کیفیت اکھٹا اور دفتر مرافعہ کے فیصلوں پر عمل درآمد کرتا تھا۔ دیوان الانشاء کے دوسرے چھوٹے چھوٹے دفاتر میں یہ شامل تھے: (الف) بیرونی ممالک کے سلاطین سے مراسلت کا محکمہ (مکاتیب الی الملوک)، (ب) دفتر تقررات (النشاءات تقیید)، (ج) صوبے کے اعلیٰ عہدے داروں اور اُترا سے مراسلت کا محکمہ (مکاتیب الی اُترا، الدولة وکبرائما)، (د) شاہی کا محکمہ (منشی)، خفیہ احکام کتب لطاف اور نقول (نسخ) کا محکمہ۔ ان محکموں کے علاوہ کمتر درجے کے چار منشیوں کا ذکر ملتا ہے، مگر وہ مستقل شعبوں کو نہیں چلاتے تھے: نقل نویس (نسخ) منشی، جو مشنوں کو ایک منظم طریقے سے محفوظ رکھنے کے لیے ہوتا تھا تا کہ انہیں آئندہ بطور نظائر استعمال کیا جاسکے: اصلی دستاویزات کا رکھنے والا (خازن) اور حاجب، جو اس بات کا خیال رکھتا کہ کوئی شخص بغیر اجازت رئیس دیوان کے پاس نہ چلا جائے (ابن الصیری: Massé، بمبدأ اشاریہ: الفلکندی، ۱: ۱۳۰ و ۳: ۴۹۰ بعد: W. Björkman، ص ۲۰ بعد: انگریزی: الخطط، ۱: ۴۰۰ تا ۴۰۲)۔

تاجروں سے محصول درآمد وصول کرنے کی خاطر ایک انتظامی وحدت بن گئی تھی (العشیر اور متجر [دیکھیے مکس]: ابن المماتی، ص ۳۲۵ تا ۳۲۷)؛ (ک) دیوان الجوالی وانواریت العشریة (جزیرے اور زمینوں کی جاگیروں کے محصول کا دیوان)؛ Islamic Taxation: F. Lokkegaard، ص ۵۱ اور ۱۴۰ تا ۱۴۱؛ Islamstudien: C. H. Becker، ص ۱۷۱؛ ابن المماتی، ص ۳۰۹ تا ۳۱۸ اور ۳۵۳؛ Le régime des impôts: Cl. Cahen در Arabica، ص ۳؛ (ل) دیوان الخراجی والہلالی (شرعی وغیر شرعی محاصل کا دیوان) - F. Lokkegaard، ص ۱۸۵ تا ۱۸۶؛ Islamstudien: C. H. Becker، ص ۱۷۷ تا ۱۷۸؛ ابن المماتی، ص ۱۷۹۔ ابن المماتی اس دیوان سے تعلق رکھنے والے کئی عہدے دار گنوتا ہے: الجہیز (محصولات)، الشاہد (ناظر اندراجات)، جو بیچک پر تصدیقی دستخط کرتا تھا، الماسح (مساحت کرنے والا) وغیرہ؛ (م) دیوان الاصطبلات (گھوڑوں یا اصطبلوں کا دیوان)؛ (ن) دیوان الجہاد یا العیائر (دینی جہاد یا بحریہ کا دیوان)۔ اس کا مقام قاہرہ میں بندرگاہ کی گودیوں میں تھا، اور یہ بحری فوج کے لیے انتظامی مرکز کی خدمت سرانجام دیتا تھا (ابن المماتی، ص ۳۳۰ تا ۳۳۱)۔

(۳) ایوبی عہد: مصر کے لیے خلافت فاطمیہ کا خاتمہ سیاسی اور مذہبی انقطاع کے معنی رکھتا تھا، مگر انتظامی تسلسل کے ذریعے اس کی تلافی ہو گئی، جسے ایک سربراہ آوردہ شخصیت نے عملاً کر دکھایا، یعنی آخری صاحب دیوان الانشاء، القاضی الفاضل محی الدین کو سلطان صلاح الدین نے اسی عہدے پر برقرار رکھا اور بعد ازاں وزیر بنا لیا۔ لہذا القاضی الفاضل اور اس کے بہت سے شاگرد، ان دو ادوار کے درمیان رابطے کا کام دیتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے ابن المماتی کی کتاب قوانین الدواوین

جس کی بنیاد الافضل بن بندر الجمالی [آرک بان] نے ۵۵۰ھ / ۱۱۰۷-۸-۱۱۱۰ء میں رکھی تھی، جب ایک یہودی اور ایک نصرانی اس کے سربراہ مقرر کیے گئے؛ بعد میں اسے بہت عرصے تک پر نہیں کیا گیا (ابن الصریق / Massé، ص ۸۲ حاشیہ ۱)؛ (ج) دیوان المجلس، فقط شاہی عطیات، خیرات وغیرہ کا انتظام کرتا تھا؛ (د) دیوان خزائن الکسوة، کپڑے کے گوداموں کا دیوان؛ متعدد مال گوداموں کے لیے دیکھیے طویل فہارس در القاشندی، ص ۳۵۵؛ بعد: اور المشرقی: الخطط، ص ۱۰۰؛ بعد: (ه) دیوان الطراز (کشیدہ کاری کے کارخانوں اور گوداموں کا دیوان)۔ دیوان کی ان مقامات پر کئی شاخیں قائم کی گئی تھیں، جہاں کارخانے واقع تھے، مثلاً اسکندریہ، دمیاط، تینس (ابن المماتی، ص ۳۳۰ تا ۳۳۱؛ Stud.: A. Grohmann، ۱۲. hist. Geogr. u. Verw.، ص ۳۳۱)؛ (و) دیوان الاحباس (اوقاف کا دیوان)۔ خلیفہ المعز نے اس کی بنیاد ۵۳۶ھ / ۱۱۴۲ء میں رکھی تھی اور اسی وقت سے اس دیوان نے مقدس اداروں کے انتظام سے سروکار رکھا؛ اس کے عہدے دار فقط مسلم ہوتے تھے (المشرقی: الخطط، ص ۲۰۵؛ بعد: Cl.: Cahen، Le régime des impôts در Arabica، ص ۳؛ ۲۴ تا ۲۵)؛ (ز) دیوان الرواتب (آجرتوں کا دیوان)۔ یہ بات واضح نہیں کہ اس دیوان اور دیوان العیش کے تحت اس نام کے دفتر کے درمیان کیا تعلق تھا۔ یہ بات ممکن دکھائی دیتی ہے کہ یہ دیوان الرواتب، دیوان الخاص (خلیفہ کے نجی خزانے کا دیوان، القاشندی، ص ۳۰۹ اور ۳۵۷) کا ایک طرح سے پیشرو ہو؛ (ح) دیوان المعید (بالائی مصر کا دیوان)؛ (ط) دیوان اسفل الارض (نشیبی مصر کا دیوان)؛ (ی) دیوان الثغور (سرحدی اضلاع کا دیوان)۔ اسکندریہ، دمیاط، تینس اور عیذاب کی سرحدی بندرگاہوں پر

دیگر عہدوں میں یہ شامل ہیں: (الف) شاہد بیت المال (خزانے کا ناظر اندراجات)، (ب) المشرف (نگران)، (ج) الخُمَیذ (محصل محصولات) اور (د) العَازَن (اندراج کرنے والا)۔ اُنابلسی مندرجہ ذیل دیوانوں کا ذکر کرتا ہے: (الف) دیوان الجیوش، (ب) دیوان الانشاء، (ج) دیوان الاحباس، جو عہد فاطمیہ میں دیوان الاموال کی ماتحت شاخ سے ترقی کر کے خود مختار وزارت بن گیا تھا (اوپر ۲۰)، (د) دیوان المال، جو دو شعبوں میں منقسم ہے: (۱) دیوان بالعمال (صوبوں کے لیے دیوان) اور (۲) دیوان بالباب (دربار کے لیے دیوان)۔ یہ دواؤں نام اور دفتر تھے ہیں: ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے نے دیوان الصعید، دیوان اسفل الارض اور دیوان الثغور کی جگہ لے لی تھی: یہ ان صوبوں میں خراجی اور عیالی محصولوں کا انتظام کرتا تھا۔ دیوان بالباب زکوٰۃ، جوالی اور موارث کے محصولوں کا بندوبست، نیز خزانے کے تمام شعبوں بشمول سابق دیوان التحقيق، دیوان المجالس وغیرہ کے نظم و نسق کی نگرانی بھی کرتا تھا۔

دیوان کی اصطلاح کا سبب زیادہ وسیع اور مبہم استعمال لَمَعَةُ الْقَوَانِین کے ایسے جملوں میں آیا ہے جیسے دیوان خزائن السلاح (اسلحہ کا دیوان)، دیوان ساحل السَّط (یہاں والے ساحل کا دیوان)، ابن المماتی، طبع A.S. Atiya، ص ۳۴۷ تا ۳۴۸: القریزی: الخطط، طبع Wiet، ج ۲، MIFAQ، ج ۱۳، ۱۹۱۳ء (ص ۱۰۸، حاشیہ ۸) اور دیوان الاحرا (دیکھیے اوپر، جلد ۳)۔ اُنابلسی بھی دیوان الزکوٰۃ، دیوان الموارث اور دیوان النبوی (رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد کے لیے دیوان) کا ذکر کرتا ہے جس کا دوسرا قلم نقابة الاشراف تھا اور اس کے سربراہ کو نقیب الاشراف (نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد کے وکیل) کے نام سے موسوم کرتے تھے (W. Popper: Egypt and Syria، ص ۱۰۱، ۱۵، W. Bjorkman

ابوبی عہد کے پہلے نصف کے لیے ہم عصر مآخذ کا کام دے سکتی ہے! نصف آخر کے لیے دو ہم عصر مصنف یہ ہیں: ابن شیت القرشی اور عثمان النابلسی۔ ابن المماتی کی طرح ابن شیت القرشی بھی قاضی الفاضل کا شاگرد تھا، جو اُسے شعر و ادب میں سہارت رکھنے کی وجہ سے بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ وہ دمشق چلا گیا، جہاں وہ دیوان الانشاء کا سربراہ اور المعظم بن العادل (م ۵۶۲/۵۱۲ء) کا دوست بن گیا۔ معالم الکتابہ میں جو دیوان الانشاء کے منشیوں کے لیے [صحیح خطوط نویسی کی] رہنما کتاب ہے، ہمارے موضوع پر فقط ایک ہی باب ہے (ص ۲۳ تا ۲۴)۔ ابن شیت کی نظروں میں دیوان الانشاء اہم ترین سرکاری دفتر ہے! لہذا اس کے سربراہ (صاحب الدیوان) کو اس اخلاق معیار کا ہونا چاہیے جو اس کے بلند رتبے اور اس عزت کے مطابق ہو، جو اُسے اپنے رفقاء کا رہے۔ درمیان حاصل ہوتی ہے۔ اس کا ماتحت عہدے دار، جسے وہ خطوط و دستاویزات جواب کے لیے بھیجتا تھا، مستوفی کتاب الانشاء (وزیر کے صدر دفتر کا مہتمم) کہلاتا تھا۔ ابن شیت نے جو دیگر دفاتر گنوائے ہیں وہ یہ ہیں: دیوان الجیوش، جس کا سربراہ (کاتب الجیش) صاحب دیوان الانشاء سے درجے میں کم تر ہوتا ہے اور اُسے حساب کا ایک کھاتا رکھنا ہوتا ہے، جس میں تمام فوجی عملے کے نام اور جائدادیں درج ہوں تاکہ وہ ان کی تنخواہیں اس حالت میں بھی ادا کر سکے جب کہ دیوان الاقطاع کا کوئی سربراہ مقرر نہ ہوا ہو۔ دیوان الاقطاع بظاہر ایک خودمختار دفتر تھا، جس کا سربراہ دیوان الجیش سے عہدے میں کم تر ہوتا تھا اور وہ دونوں صاحب دیوان النظر کے ماتحت اکٹھے کام کرتے تھے، جو صاحب دیوان المال ہی کی مانند ہوتا تھا۔ اس اہم عہدے دار کا تقرر براہ راست سلطان کرتا تھا۔ صاحب دیوان المال کا معاون مستوفی (سیاق دان) کہلاتا ہے! خزانے کے

بمدد اشاریہ)۔

(۴) عہد مملوک: ممالک کے عہد کے نظم و

نسق میں فوجی طبقے (ارباب یا اصحاب الصیوف) کا اثر و نفوذ غیر فوجی کُتّاب (ارباب الاقلام) اور متعدد سرکاری محکموں میں بڑھ جانا ثابت ہے، جیسا کہ استاد، دوا دار وغیرہ کا دخل پایا جاتا۔ ابن خلدون اسے ایک عہد اور خاندان کی "ضعیفی" کا مخصوص نشان تصور کرتا ہے، کیونکہ ایسی حالت میں "تلوار" "قلم" پر فوقیت رکھتی ہے (۲: ۱، ترجمہ Rosenthal، ۲: ۱۰۷، ۱: Goldziher)۔

۳۲۹ تا ۳۲۱)۔ انتظامیہ میں دو اصلاحات کرنے کی کوشش کی گئی اور دونوں سے دیوان متاثر ہوئے: سلطان الناصر محمد بن قلاؤن (۷۰۹ / ۱۳۰۹ تا ۷۴۱ / ۱۳۴۱) نے پہلی مرتبہ ۷۴۱ / ۱۳۴۱ء میں وزارت منسوخ کر دی اور اس کے وظائف کو چار عہدے داروں میں تقسیم کر دیا: ناظر المال (خزانے کا مستظم)، شاد الدواوین (دیوانوں کا مستظم)، ناظر الخاص (سلطان کے ذاتی خزانے کا ناظم)؛ (Egypt and Syria: W. Popper، ص ۹۷: شاہی خزانے کا ناظم) اور کاتب السیر (امین مملکت)؛ (القلقشندی، ۲: ۲۲۷، القریزی: الخطط، ۲: ۲۲۷، السلوک، ۲: ۲، ۹۳ اور ۱۰۳۔ بعد ازاں پہلے چرکسی مملوک سلطان انظاہر سیف الدین یقوق (۷۸۸ / ۱۳۸۲ تا ۸۰۱ / [یہ تصحیح ۱۳۹۸ء] نے دیوان الخاص کو ثمر الاسکندریہ (اوپر دیکھیے) کا نظم و نسق حوالے کر کے اسے مزید قوت دی اور دیوان المفرد (خاص محکمے کا دیوان) کو شاہی ممالک کے وظائف اور لباس وغیرہ کے نظم و نسق کے لیے قائم کیا، اور ان کی وجہ سے وزارت کے اختیارات کم ہو گئے۔ پھر بھی وزیر خزانے کا سربراہ بن گیا اور اسے تمام قسم کے مختلف معمولات کو وصول کرنے کا کام تفویض کیا گیا کیونکہ وہ مالیاتی امور کے

جملہ اعمال سے بلند مرتبہ رکھتا تھا اور اسی بنا پر ابن خلدون وضاحت کرتا ہے کہ کیوں متعدد قبطیوں کو اس عہدے اور اس قسم کے دیگر عہدوں کے لیے منتخب کیا گیا، جو زمانہ قدیم سے ان امور سے خوب واقفیت رکھتے تھے (دیکھیے ابن خلدون، ۲: ۱۵ اور ۲: ۲، ترجمہ Rosenthal، ۲: ۱۹، ۲: ۲۵، القریزی: الخطط، ۲: ۲۲۳، ۲: ۲۲۸، Gaudefroy، Syria: Domombynes، ج ۳: Egypt: W. Popper، ص ۹۶ تا ۹۸)۔ (۱) دیوان الانشاء جسے "کتابت السیر" بھی کہتے تھے (القریزی: الخطط، ۲: ۲۲۵، ۲: ۲۳۶، بعد: القلقشندی، ص ۳۰: ۳۰، الظاہری: زبدہ، ص ۹۹ تا ۱۰۰) ابھی تک اپنے متعدد سابق کام سرانجام دیتا رہا (اوپر دیکھیے ۳۰)۔ اس کے سربراہ کاتب السیر کو غیر فوجی عہدے داروں کے نظام مراتب میں سب سے زیادہ توفیر حاصل تھی (Egypt and Syria: W. Popper، ۹۷: القریزی: الخطط، ۲: ۲۲۶، ۲: ۲۲۷)؛ لیکن وہ دوا دار یعنی ایک صاحب السیف کے سامنے جوابدہ ہوتا تھا، اور یہ عسکری طبقے کے بالا دست ہونے کی دلیل ہے۔ وہ سلطان کی غیر فوجی کابینہ کا سربراہ رہ چکا تھا، جو ڈاک وصول کرتا اور سلطان کی خدمت میں بھجواتا یا غیر ملکی سفیروں کو حکمران کے حضور پیش کرتا تھا (القلقشندی، ص ۱۹)۔ دوسری طرف کاتب السیر نے بتدریج صاحب البرید کا کام سنبھال لیا؛ ان دونوں عہدوں کا اولین حامل اوحد الدین عبدالواحد بن اسمعیل الحنفی (م ۷۸۶ / ۱۳۸۵ء) تھا؛ القریزی: الخطط، ۱: ۷۸؛ ابوالمعاس بن تغری بردی: مشہل، عدد ۱۳۸۳۔ Staatskanzlei: W. Björkman، ص ۳۱ و حاشیہ ۳۔ دیوان الانشاء ان امور سے متعلق تھا؛ (الف) غیر ملکی حکومتوں اور صوبائی حکم سے خط و کتابت (مکاتبات)۔ اسی لیے القلقشندی اس دیوان کے عہدے داروں کے لیے غیر ملکی زبانوں کے علم کا

Egypt and Syria، ص ۹۷، ۴ - (م) دیوان المفرد (خاص محکمے کا دیوان) کی بنیاد الظاهر برفوق نے رکھی تھی، جب اس نے وزارت کے بجائے اسے قائم کیا (المقبریزی: الخطط، ۲: ۲۲۳، بعد القاشندی، ۳: ۵۷، اس نام کے ایک دفتر کا ذکر کرتا ہے جو پہلے سے فاطمیوں کے تحت موجود تھا)۔ اس کا اصلی سربراہ استاد ایک صاحب السیف ہوتا تھا، جسے کبھی کبھی نام نہاد وزیر تک ہی مقرر کیا جاتا تھا (Egypt and Syria: Popper، ص ۹۳، ۹: انظاہری: زبدۃ، ص ۷۰، ۱، ترجمہ ص ۷۸)۔ اس استاد کے تحت دیوان المفرد کا ناظر ایک بڑے عملے کی اعانت سے اس دیوان کے فرائض مثلاً سلطان کے معلوکوں کے لیے وظائف، لباس، خوراک چارے وغیرہ کے متعلق ہدایات دیتا تھا (Popper، ص ۹۷)۔ (د) دیوان الاموال، کل مالی لین دین یا خرچ پر قابو رکھتا تھا اور تنخواہوں کی ادائی اور حسابات رکھنے کا ذمہ دار تھا (القاشندی، ۴: ۲۹، بعد المقبریزی: الخطط، ۲: ۲۲۴، ۷ بعد)۔ وزیر اس کا سربراہ تھا، لیکن وہ بھی ناظر دیوان المفرد کی طرح زیادہ سے زیادہ استاد کے ماتحت ہوتا چلا گیا، لہذا اس عہدے کی جو اعلیٰ توفیر تھی وہ کم ہو گئی (Egypt - Popper and Syria، ص ۹۶، ابن خلدون، ۲: ۲۰، ۲: ۲۱، ترجمہ ص ۲۵)۔ پھر فاسد طریقوں سے جو نقر ہوئے ان سے صورت حال واضح ہو جاتی ہے، مثلاً جب ۵۸۶ھ/۱۱۹۶ء میں ایک تھوک فروش فساد شمس الدین محمد البیاضی کو وزیر اور ناظر الدولہ بنایا گیا اور پھر ۵۸۷ھ/۱۱۹۶ء میں "سکوں کا دلال قاسم یغیتہ شغیتہ مقرر ہوا، یہ دونوں اشخاص غیر تعلیم یافتہ تھے (ابوالمحسن بن قمری بردی، طبع Popper، ۷: ۲۳، ۷: ۲۵، ۷: ۳۸ اور ۷: ۲۹، ترجمہ Popper، ۸: ۵۸، ۷: ۷۶، ابن اناس غیر مطبوعہ صفحات ۱۳۶، ۲ و ۱۶۰، ۳ تا ۵)۔

مطابقت کرتا ہے: مثلاً ترکی، ایرانی، یونانی اور "انفرنجد" (لاطینی ۹): صبح الاعشی، ۱: ۱۶۵ تا ۱۶۷: Björkman: Staatskanzlei، ص ۴۴ و حاشیہ ۱: (ب) تقریران (ولایات)، بشمول بیعت اور سلطان کے جانشین کے لیے تحریر (عہد)، نیز صوبوں کے والیوں کے لیے (تقلید) اور دیگر عہدے داروں کے نقر کے لیے (توقیع، توقیع): القاشندی، ۱: ۲۵۲: Björkman: Staatskanzlei، ص ۴۸، ۵۲: (ج) عاتۃ الناس کی شکایات پر شاہی فیصلے (توقیعات علی القصاص) اوپر دیکھیے، القاشندی، ۶: ۲۰۲، بعد: Björkman: Staatskanzlei، ص ۵۲ تا ۵۳)۔ (۲) دیوان الجیش یا دیوان الجیوش المنصورہ، فوجی عملے کے لیے جاگیروں کے عطیے کا انتظام کرتا تھا (القاشندی، ۱: ۱۰۲، ۱: ۱۰۳، اسی لیے اسے بعض اوقات دیوان الانقطاع کہتے تھے: القاشندی، ۳: ۵۷، ۳: ۵۷: Björkman: Staatskanzlei، ص ۵۱، حاشیہ ۲۔ اس کا سربراہ ناظر الجیش فوج کے دیوان کا ناظم اکثر قاضی ہوتا تھا، اس کی معاونت دیوان الجیش کا ناظر (صاحب دیوان الجیش) اور دیگر کثیر التعداد اہل کار کرتے تھے، جو شہود، کتاب وغیرہ کمالات تھے (Egypt and Syria: Popper، ص ۹۷)۔ بقول الظاہری (زبدۃ، ص ۱۰۳) دیوان الجیش دو علاقائی شعبوں میں منقسم تھا: دیوان الجیش المصری اور دیوان الجیش الشامی۔ (۳) دیوان الخاص نے اپنی اہمیت سلطان الناصر محمد بن قلاؤن کے تحت حاصل کی تھی (دیکھیے اوپر)، ۳: المقبریزی: الخطط، ۲: ۱۰۲، ۱۰۲ میں فاطمیوں کے عہد ہی میں اس کا موجود ہونا لکھتا ہے، اور مابعد کے عشروں میں اس کا اثر و نفوذ زیادہ ہوتا گیا یہاں تک کہ انظاہر برفوق کے عہد حکومت کے اوائل میں ۵۹۰ھ/۱۱۸۸ء میں اپنے عروج کو پہنچ گیا، جب کہ دیوان انخزانہ (مال گوداموں کا دیوان) بھی اس کے اندر ضم ہو گیا: المقبریزی: الخطط، ۲: ۲۲۷، ۱۵ بعد: Popper:

frühmittelalterlichen Ägypten, وی تا ۱۹۵۹ء
Ost. Akad. d. Wiss. Phil. hist. Kl. Denkschr.)
Beiträge zu: C. H. Becker (۴): (77 Bd., 2 Abh.
۱/۱) Geschichte Ägyptens unter dem Islam
شراس برگ ۱۹۰۲ء تا ۱۹۰۳ء: (۵) وہی مصنف:
Papyrus Schott Rheinhardt, ج ۱، اینٹیل برگ ۱۹۰۶ء:
(۶) وہی مصنف: Islamstudien, ۱/۱، لانبرگ ۱۹۲۳ء
تا ۱۹۳۲ء: (۷) D. C. Dennett Conversion and:
poll-tax in early Islam, کیبرج، Mass, ۱۹۵۰ء:
(Harvard Historical Monograph) ج ۲۲: (۸)
Islamic taxation in the classic: F. Lokkegaard
period, کونن ہیگن، ۱۹۵۰ء: (۹) زی محمد حسن، Les:
Tulunides برس ۱۹۲۳ء: (۱۰) Cl. Calvet Evolution:
Annuaire ESC de l'Iqit'du IX^e au XIII^e siècle
ج ۱۸ (۱۹۵۳ء) ص ۲۵ تا ۵۲: (۱۱) وہی مصنف:
Le régime des impôts dans le Fayyum ayyubide
در Arabica, ج ۳ (۱۹۵۶ء)، ص ۸ تا ۳۰: (۱۲)
وہی مصنف: Histoires Coptes d'un cadé médiéval:
BIFAO, ج ۵۹ (۱۹۶۰ء)، ص ۱۳۳ تا ۱۵۰: (۱۳)
La Syrie à l'ep-: M. Gaudelroy-Demombynes
logue des mamelouks, برس ۱۹۲۳ء: (۱۴) W. Popper:
Egypt and Syria under the Circassian Sultans
1382-1468 A. D., برکلی اور لاس اینجلس ۱۹۵۵ء
یحد (University of California Publications. in)
Semitic Philology, ج ۱۵ اور ۱۷: (۱۵) D. Ayalon:
The system of payment in Mamluk military society
در JESHO, ۱: ۳۷ بعد ۲۵۷ بعد: (۱۶) وہی مصنف:
The plague and its effect upon the Mamluk army
در JRAS, ۱۹۶۶ء، ص ۹۷ تا ۷۳: (۱۷) وہی مصنف:
Studies on the structure of the Mamluk army I
در BSOAS, ج ۱۵ (۱۹۵۳ء)، ص ۲۰۳ تا ۲۲۸:
(۱۸) حصہ ۲، کتاب مذکور، ص ۳۳۸ تا ۳۷۶: (۱۹)

یہ ناظرالدولہ (بعض اوقات خود وزیر، اور بعض
اوقات وزیر کی شرکت میں) خزانے کے حاکم اعلیٰ کے
طور پر کام کرتا تھا اور اس کے تحت متعدد محاسب
(سُتوف) محافظ دفتر (شاهد) وغیرہ ہوتے تھے جیسا
کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ دیوان الاموال متعدد
محکموں کی نگرانی کرتا تھا جنہیں دیوان یا نظر کہتے
تھے اور جو انتظامیہ کے مختلف شعبوں سے متعلق تھے،
مثلاً نظر بیت المال، جو التوریزی کے قول کے مطابق
اس کے زمانے میں موجود نہیں تھا (الخط، ۲۲۳، ۲۳۶
تا ۲۳۷)، نظر الحوارث الحشریہ (لاوارث جائداد کی
نگرانی کا دفتر: Syria and Egypt: Popper، ص ۹۹،
۱۷)، نظر المرتجعات جسے نظر السلطان (یعنی املاک کی
بازبانی کے نگران کا دفتر بھی کہتے تھے: W. Popper،
کتاب مذکور، ۱۹، ۱۸: القلقشندی، ۳: ۳۳)، اس کے
سربراہ کو سُتوف المرتجعات، نظر التوجہ القبلی و
نظر التوجہ البحری (پہلا بالائی اور دوسرا زیریں مصر کا
نگران دفتر)، دیوان الاستیفاء (تنخواہوں کی ادائی
گی کا دیوان)، دیوان الاحباس (محکمہ اوقاف)، دیوان
الزکوٰۃ کہتے تھے۔ مؤرخین اس پیچیدہ نظام کے
طریق کار اور اس کی عملی کمزوریوں کے تباہ کن اثرات کی
بد کثرت مثالیں پیش کرتے ہیں، جو اعلیٰ حکام نیز
حکمرانوں کی مسلسل تبدیلیوں اور سزاؤں کے ظالمانہ
اور مستبدانہ نظام (مصادره) کی وجہ سے جو ہر
تبدیلی کا لازمہ تھا، اور یہی بڑھ گئے تھے۔

مآخذ: ان حوالوں کے علاوہ جو مقالے میں درج ہیں
(۱) عربی ورق بردی برس کی مطبوعات کی تازہ فہرست در
Arabische Briefe aus der Papyrus: A. Dietrich
sammlung der Hamburger Staats- und Universitäts-
bibliothek، ہیبرگ ۱۹۵۵ء: (۲) A. Grohmann کی
نہایت ضروری تصنیفات کی ایک فہرست در ادا، ج ۱۳
(۱۹۵۷ء) ص ۲ تا ۴: (۳) A. Grohmann Studien zur:
historischen Geographie und Verwaltung des

۲۔ وزارت مال: دیوان الخراج والعبایات، دیوان الاشغال یا الاعمال (القراچیہ یا مالیہ)، دیوان الحسبان، دیوان الزمام، جو مختلف محصولات کی وصولی، محصلوں کی نگرانی اور آمد و خرچ کا حساب رکھنے کا ذمہ دار تھا۔ اس کے ساتھ ایک حد تک دیوان الخزانہ کا براہ راست تعلق تھا، جو سرکاری خزانے کی دیکھ بھال کرتا تھا اور بیت المال ہے، جس کی نوعیت مذہبی تھی، جداگانہ تھا۔

۳۔ وزارت فوج: دیوان الجیش، دیوان الجند، دیوان العساکر، دیوان اہل الثغور، جس کے تین مختلف فرائض تھے: (الف) باقاعدہ فوج کے مالی دفتر کو تاریخ جاریہ تک مکمل رکھنا؛ (ب) حسابات رکھنا، فوجوں کو تنخواہ (ارزاق) اور (فوجی خدمت کے صلے میں) عطیات دینا؛ اور (ج) اعلیٰ محسروں میں جاگیریں (اقطاع) تقسیم کرنا۔ تاہم فوجوں کی قیادت یا لڑائیوں کے متعلق احکام دینے میں اس کا کوئی حصہ نہ تھا۔

بنو امیہ کے بعد اسی قسم کی یہ گوئے تنظیم، گو فطری طور پر بہت محدود پیمانے پر تھی، سوبائی حاکموں (ملوک الطوائف) کے درباروں میں اور آگے چل کر نصریہ خاندان میں پائی جاتی تھی۔

الموحدون کے عہد (چوتھی صدی ہجری/بارہویں صدی عیسوی) سے قبل جہاں تک شمالی افریقہ کا تعلق ہے، ہمیں دواوین یا ایسے محکموں کا عملاً کچھ عام نہیں۔

۵۵۵ھ/۱۱۵۹ء میں عبدالؤمن الموحّد نے شمالی افریقہ پر وادی گول سے برفہ تک اپنا تسلط چھانے کے بعد سلطنت کی مساحت اس غرض سے کروائی کہ زر نقد اور جنس میں ادا ہونے والے زمین کے مالے (خراج) کی تمین کے لیے جمع بندی تیار کی جائے! اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ ایک خاص مالی دیوان یا تو قائم کیا گیا تھا یا اسے ترقی دی گئی۔

ایک دوسرے الموحّد یعقوب المنصور (۵۸۰ تا

حصہ ۳، کتاب مذکور، ج ۱۶ (۱۹۵۸ء) ص ۵۷ تا ۹۰: (۲۰) وہی مصنف: *Gunpowder and fire arms in the Mamluk kingdom* لندن ۱۹۵۶: (۲۱) *Les révoltes populaires en Egypte à l'époque des Mamlouks et leurs causes économiques* در REI ج ۸ (۱۹۳۸ء) ص ۲۵۱ تا ۲۷۳: (۲۲) وہی مصنف: *Feudalism in Egypt, Syria, Palestine and the Lebanon 1250-1900* لندن ۱۹۳۹: (۲۳) ابن ابی اس، محمد بن احمد: *pages of the chronicle of Ibn Iyas, A. H. 857-873 A.D. 1453-1468* قاہرہ ۱۹۵۱ء: (۲۴) ابن خلدون: مقدمہ، ترجمہ F. Rosenthal، ج ۱، تا ۳، نیویارک ۱۹۵۷ء: (۲۵) ابو بکر بن عبد اللہ الدوادری: *Die Chronik des Ibn Dawdari* ج ۱، طبع H. R. Roemer، قاہرہ ۱۹۶۰ء۔

(H. L. GOTTSCHALK)

۳۔ المغرب

(الف) جہاں تک اندلس کا تعلق ہے، ہمیں اس بات کا علم نہیں کہ دوسری صدی ہجری / آٹھویں صدی عیسوی کے اوائل میں پہلے مسام غالمین نے وہاں وزی گوٹھ Visigoths کے دیوانی اور فوجی نظم و نسق کو جو ہلاشیہ ہوزنطی نظام سے متاثر تھا، کس حالت میں پایا اور کس طرح اسے خود اختیار کیا۔

چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی میں، عہد امیہ میں اتنا معلوم ہے کہ تین بنیادی دیوان، حکومت کی تین بنیادی ضرورتوں کے لیے کام کرتے تھے اور ہر ایک کا نظم و نسق ایک خاص وزیر (یا صاحب) کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ وہ یہ تھے:

۱۔ دیوان الرسائل (الترسیل) والکتابہ (وزاوق اور ملکی دفتر)۔ یہ موصولہ اور مجاریہ دونوں طرح کے مراسلات اور مختلف اسناد اور فرامین (سیجالات محکوک) تیار کرتا تھا۔

۱۲۷۴ء تا ۱۱۸۳ء [بہ تصحیح ۱۱۹۹ء] نے علامت کے طریق کار کا آغاز کیا، یعنی توہمی کلمات جو مراسلون اور احکام کے سرناموں پر بڑے بڑے حروف میں لکھے ہوئے تھے، ان کے بعد وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَحْدَہ ہوتا تھا۔ پہلے تو حکمران خود اپنے ہاتھ سے یہ ثبت کرتا تھا؛ بعد میں علامت کی تحریر وزیر ادلی کے سپرد کر دی گئی۔ اس پر بنو حفص اور بنو مرین کے فرمانروا بھی عمل کرنے لگے اور بنو سعد کے زوال تک اس کی پابندی ہوئی۔ فقط نصیریوں نے اسے اختیار نہیں کیا۔

۱۲۷۴ء تا ۱۱۸۳ء [بہ تصحیح ۱۱۹۹ء] نے علامت کے طریق کار کا آغاز کیا، یعنی توہمی کلمات جو مراسلون اور احکام کے سرناموں پر بڑے بڑے حروف میں لکھے ہوئے تھے، ان کے بعد وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَحْدَہ ہوتا تھا۔ پہلے تو حکمران خود اپنے ہاتھ سے یہ ثبت کرتا تھا؛ بعد میں علامت کی تحریر وزیر ادلی کے سپرد کر دی گئی۔ اس پر بنو حفص اور بنو مرین کے فرمانروا بھی عمل کرنے لگے اور بنو سعد کے زوال تک اس کی پابندی ہوئی۔ فقط نصیریوں نے اسے اختیار نہیں کیا۔

دوسری باتوں میں الموحّدون کے دیوان اندلس کے اموی دیوانوں سے مشابہ تھے، لیکن وزارت اعلیٰ کے دفتر میں دیوان الانشاء بننے کا رجحان پایا جاتا تھا۔ اس تنظیم کو افریقہ میں بنو حفص نے اور سرائش میں بنو مرین نے قائم رکھا تھا، تاہم بسا اوقات بہت سے دیوانوں کو باہم ملا کر ایک مدیر کے تصرف میں دے دیا جاتا تھا۔ یہ مدیر وزیروں کے کسی نہ کسی بڑے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔

دوسری باتوں میں الموحّدون کے دیوان اندلس کے اموی دیوانوں سے مشابہ تھے، لیکن وزارت اعلیٰ کے دفتر میں دیوان الانشاء بننے کا رجحان پایا جاتا تھا۔ اس تنظیم کو افریقہ میں بنو حفص نے اور سرائش میں بنو مرین نے قائم رکھا تھا، تاہم بسا اوقات بہت سے دیوانوں کو باہم ملا کر ایک مدیر کے تصرف میں دے دیا جاتا تھا۔ یہ مدیر وزیروں کے کسی نہ کسی بڑے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔

دسویں صدی ہجری/بسولہویں صدی عیسوی سے شمالی افریقہ میں دیوانوں کے کاروبار، بلکہ ان کے وجود تک کے متعلق بہت کم معلومات ملتی ہیں۔ سرائش میں ہم صرف دیوان العیش کے متعلق جانتے ہیں، جس میں تمام باقاعدہ افواج شامل تھیں، جو ابتدا میں عربوں اور بعد میں حبشیوں (عبید یا حراطین) پر مشتمل تھیں۔ ان افواج (بالغیر من عبید) نے چونکہ اکثر علوی سلاطین کو بنایا اور معزول کیا تھا، لہذا ان کا دیوان بعض اوقات شاہی مجالس شوریٰ کی قسم کا ہو جاتا تھا۔

قطوان کی تباہ کن جنگ (۱۱۸۶ء) کے بعد سلطان محمد الثالث بن عبدالرحمن نے جدید قسم کا دیوان العیش قائم کرنے کی کوشش کی تھی، مگر اس کی کوشش ناکام ثابت ہوئی۔

مآخذ : (۱) ابن خلدون : مقدّمہ، طبع بولاق

(ب) الموحّدون کے عہد (چھٹی صدی ہجری/تیرھویں صدی عیسوی) سے ان بندرگاہوں میں، جنہیں عیسائی یورپ سے تجارت کرنے کی اجازت تھی (افریقہ میں المہدیہ سے سبطہ (Ceuta) تک، نیز المریہ میں) ان خاص دفاتر کی موجودگی کی تصدیق ہو چکی ہے جو دیوان الاشغال کے ماتحت ہوتے تھے اور جن کا کام عشر اور متفرق محصولات (ملازم) کی وصولی تھا، جو یورپی درآمد کنندگان پر عائد کیے جاتے تھے۔ اس قسم کے دفتر کو عام طور پر بعض الادیان کہتے تھے؛ لیکن اس سے زیادہ تفصیلی نام بھی کہیں کہیں ملتے ہیں: دیوان البحر اور خصوصاً دار الاشراف علی عمالة الادیان، "محصولات عائد کرنے کی نگران کے صدر دفاتر"۔ مقامی مہتمم کو مشرف کہتے تھے۔ محصولات کے طریق کار کو سہل بنانے کے لیے اور اس کے علاوہ عیسائی تاجروں اور ان کے تجارتی مال کے تحفظ کے لیے ایک یا زیادہ تجارتی سزالیں (ہر قوم کے لیے ایک) "دیوان" کے بالکل قریب ہوتی تھیں، یہ قنّاق یا نیساریہ کہلاتی تھیں، جن کے مشرق مترادفات "خان" اور (دارالوکالة) تھے۔

اس قسم کے دفاتر، شاذ صورتوں میں اندرون ملک کے بڑے بڑے شہروں مثلاً قاصمان اور فاس میں بھی کام کرتے تھے، مؤخر الذکر شہر میں دفتر محصولات یورپ سے درآمد شدہ کپڑے پر محصول عائد

اس وقت یہ لفظ اعلیٰ عہدے داروں کی جماعت کا ہم معنی تھا جو اس علاقے کے سربراہان اور ترکہ عمل کی معاونت، بلکہ خاص طور پر ان کی نگرانی کے لیے مقرر کیے جاتے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ اس قسم کی جماعتوں کی نظیر پر گیارہویں صدی ہجری / سترہویں صدی عیسوی کے آغاز میں بربری عربوں نے جو رباط کے "قصبہ" میں رہتے تھے، اپنا "دیوان" یا مجلس شوریٰ قائم کی تھی (ہم عصر مغربی تصانیف میں اس کا ذکر 'duano' 'duana' کے نام سے آیا ہے) جس کے ارکان مقامی افسر اعلیٰ کی نگرانی کرتے تھے۔

عام معاوضے میں اس کے موجودہ استعمال میں لفظ دیوان کا اطلاق بعض اوقات ان "مجالس" پر ہوتا ہے جن کے متعلق مشہور ہے کہ انہیں صوفیہ اور جنات وقتاً فوقتاً منعقد کرتے ہیں۔ یہ لفظ جو کبھی کبھی "سازش، ساز باز" کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے تو اس کی ایک وجہ بھی یہی ہے۔

مآخذ: (۱) الجزائر، لیبیا اور تونس کے مقالے دیکھیے: (۲) *Les trois républiques : de Castries* *Sources inédites de l'histoire du du Bou-Regreg Maroc*، حالہند، سلسلہ اول، ۵ : ۱ تا ۲۸ جس میں مصنف سے "douane" کے بارے میں سہو ہوا ہے۔

مشرق کے سرکاری دفاتر میں لکھنے کے مخصوص طریقے استعمال ہوتے تھے، مثلاً عدالتی اور سفارتی استعمال کے لیے "دیوانی" اور مالیاتی اور مالی مشلوں کے لیے مع عددی مخففات "سیاق" یا "سیاقہ"۔ مغرب میں محاسب مالی دفاتر میں ۲۷ رقوم کے ایک سلسلے کا استعمال کرتے تھے، جسے رسوم (یا حروف) الزمام، یعنی بڑی کتاب کے مخففات یا حروف کہتے تھے، اس طریقے کا بوزنطی اصل سے ہونا مسلم ہے، نیز دیکھیے خط۔

مآخذ: (۱) *De l'origine grecque* : G.S. Colin

کرتا تھا۔ اس کی نسبت Leo Africanus نے (دسویں صدی ہجری / سولہویں صدی عیسوی کے اوائل میں) لکھا ہے کہ یہ قسارہ میں تھا۔ وہ ضرور اسی چھوٹے تجارتی محلے میں ہوگا، جسے موجودہ قسارہ کے بالکل شمال میں ابھی تک "الديوان" کہتے ہیں۔

لفظ دیوان، اگر اس محدود مفہوم میں لیا جائے (جس سے یورپی تاجر یقیناً زیادہ اچھی طرح واقف ہوں گے) تو وہ صریحاً اطالوی *dogana* اور ہسپانوی *aduana* کا اور اسی طرح فرانسیسی *douane* کا مأخذ ہوگا، لیکن باء کا فقدان اور الف کا اضافہ پہلے دو استعار لفظوں میں دشواری پیدا کرتا ہے۔ غرناطہ میں (نویں صدی ہجری / پندرہویں صدی عیسوی) کے اختتام پر P. de Alcalá نے اپنے زمانے تک ہسپانوی لفظ *aduana* کا عربی ترجمہ "دیوان" کیا ہے۔

بہر حال جو صورت حال بھی ہو، سرائش میں رائج الوقت اصطلاح دیوانہ ہے، شاید اس پر ہسپانوی لفظ کا اثر ہوا ہے۔ دیگر مغربی زبانوں میں مشرقی زبانوں کی طرح (یعنی عربی زبان بولنے والے ملکوں میں، جو سابق سلطنت عثمانیہ سے ملحق ہو گئے تھے) محصولات کے لیے الفاظ ترکی لفظ "گمرک" سے استعار لیے گئے تھے، جس کا سلسلہ عہد زوال کی یونانی زبان کے ذریعے لاطینی "commercium" تک پہنچتا ہے۔

مآخذ: (۱) ابن جبیر الرحلة، طبع لخبیہ، برائے اسکندریہ (ص ۳۹ تا ۴۰) اور عکہ (ص ۳۰۲)؛ (۲) *Relations et commerce : De Mas Latrie* *de l'Afrique septentrionale* ۱۸۸۶ء ص ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰۵، ۱۴۰۶، ۱۴۰۷، ۱۴۰۸، ۱۴۰۹، ۱۴۱۰، ۱۴۱۱، ۱۴۱۲، ۱۴۱۳، ۱۴۱۴، ۱

des "Chiffres de Fes" در JA، ۱۹۳۳ء، ص ۹۳
(G. S. COLIN)

۲۔ ایران

دیوان کی اصطلاح عام طور پر مرکزی حکومت کے معنی میں مختلف طریقوں سے استعمال ہوتی تھی اور اس مفہوم میں یہ زیادہ خصوصیت سے دیوان اعلیٰ کے نام سے بھی معروف تھی، یہی وہ محکمہ یا جگہ جہاں سرکاری اور دیوانی انتظام کے امور انجام پاتے تھے برخلاف فوجی انتظامیہ کے، گو ان کے درمیان حد فاصل قائم کرنا بعض اوقات مشکل ہو جاتا ہے۔ البسویں صدی عیسوی کے وسط سے مرکزی حکومت کے معنی میں دیوان کی جگہ دولت یا دائرہ دولت بہت زیادہ رواج پا چکا تھا۔ ثانیاً دیوان کی اصطلاح کو عام سرکاری محکمے کے مفہوم میں استعمال کیا جانے لگا تھا اور اس مفہوم میں اس کی جگہ آخر وزارہ، دائرہ اور ادارہ نے لے لی۔ ان دیوانوں میں ضروریات وقت کے مطابق اختلاف تھا۔ اسم صفت دیوانی کو بھی اسی طرح استعمال کیا جاتا تھا۔ چنانچہ "مہمات دیوانی" سے مراد مرکزی انتظامیہ کے امور ہوتے تھے اور "تکالیف دیوانی" سے مراد محصولات یا واجبات (غیر شرعی نوعیت کے) ہوتے تھے جنہیں دیوان عائد کرتا تھا۔ جب اس کا اطلاق زمین پر ہوتا تو دیوانی سے مراد سرکاری زمین ہوتی تھی، برخلاف شاہی زمین یا نجی جاگیروں کے۔

بارٹولڈ کا یہ بیان کہ "شرق میں مسلمانوں کی سیاسی تنظیمات کے پورے نظام میں انتظامیہ کے تمام شعبوں کو دو بڑی انواع میں منقسم کر دینا درگاہ (محل) اور دیوان (وزارہ) (Turkestan)، ص ۲۲۷، شاید اس نظام کو حد سے زیادہ سادہ بنا دیتا تھا! حکومت کی سخت ذاتی نوعیت کی وجہ سے یہ رجحان تقریباً ناگزیر تھا کہ مختلف سرکاری عمال کے اختیارات کے درمیان خط فاصل اکثر بدلتا رہے۔

ایلیخانی صفوی اور قاجار حکومت کے ابتدائی دور میں بدیہی وجوہ کی بنا پر عام رجحان یہ تھا کہ مرکزی انتظامیہ نسبتاً سادہ ہو اور مختلف اعضاء حکومت میں وقت کے ساتھ ساتھ تقسیم کار پڑھتی رہے۔ یہ بات خاص کر صفوی اور قاجار عہدوں میں دیکھنے میں آتی ہے۔

دیوان اعلیٰ انتظامیہ کے سارے میدان پر حاوی تھا، لیکن اس کا تعلق بنیادی طور پر تین شعبوں سے تھا: اسناد و احکام کا اجرا؛ مالی انتظام؛ اور عدالتی انتظام (ذاتی نوعیت کے مقدمات کے ماسوا، جو شرعی عدالتوں کے تحت آتے تھے)۔ پہلے دو وزیر کے دائرہ اختیار میں تھے: تیسرا شعبہ، جہاں تک اس کے اختیارات تفویض کر دینے کا تعلق تھا، وہ وزیر کو نہیں سونپا جاتا تھا، جسے فیصلوں پر عمل درآمد کرائے کا اختیار نہ تھا، بلکہ "لوجی" حکام کو تفویض کیا جاتا تھا۔ سلجوق دور میں سلطان یا اس کے عمال دیوان اعلیٰ میں سرکاری امور سرانجام دینے کے ساتھ وقتاً فوقتاً "دیوان مظالم" کا اجلاس بھی کرتے تھے۔ تہذیبی اور سفویوں کے تحت عدلیہ کا اعلیٰ عہدے دار دیوان بیگی ہوتا تھا جو عموماً فوجی طبقوں سے تعلق رکھتا تھا۔ فرما روا کے ذاتی طور پر نظم و نسق کرنے کی روایت، جس میں عدالتی انتظام بھی شامل تھا، عہد قاجار تک قائم رہی (History: Malcolm، لندن ۱۸۲۹ء، ص ۲: ۳۰۸)، اور شاہی قیام گاہ کو، جہاں بادشاہ (اور صوبوں میں والی) عام طور پر امور مملکت سرانجام دیتا تھا، خصوصاً دربار عام کے ایوان کو "دیوان خانہ" کہتے تھے۔

مرکزی عہدے دار ملک کی حکمت عملی یا والیوں کے تقرر کے سلسلے میں بہت ہی کم اثر رکھتے تھے، کیونکہ یہ چیز سلطان یا بادشاہ کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ سلطنت کے وسیع علاقوں کو بھی "اقطعات" یا "تہولات" کی صورت میں اس (مرکزی انتظامیہ) کے

شعبے یا وزارت کے سربراہ اور والی کے ماتحت صوبے کے سب سے بڑے عہدے دار کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ صفوی عہد کے اواخر میں مرکزی حکومت کے سب سے بڑے عہدے دار کو "وزیر اعظم" کہتے تھے اور اس کا خطاب اعتماد الدولہ ہوتا تھا۔ قاجاروں کے تحت بھی کبھی کبھی وزیر اعظم کا، جسے صدر اعظم کہتے، بھی خطاب ہوتا تھا۔

عظیم سلجوقیوں کے عہد میں وزارت مرکزی انتظامیہ کا محور تھی؛ وزیر جب اپنے عروج افتدار پر ہوتا تو انتظامیہ کے تمام پہاؤں کی، جو مرکزی حکومت کے ماتحت ہوتے نگرانی کرتا، جن میں خصوصیت سے مالیات شامل تھا۔ وہ ایک حد تک ذرائع آمدنی میں نظم پیدا کرتا تھا اور اس کا بڑا کام آمدنی کو بڑھانا تھا۔ اس کے ماتحت بڑے بڑے دیوان یہ تھے: "دیوان الانشاء والظفر" (جسے کبھی کبھی دیوان الرسائل کہتے تھے)، جو موصول ہونے اور بھیجے جانے والی مراسلات کا کام کرتا تھا، اور "دیوان الزمام والاستیفاء" (جسے "دیوان الاشراف" بھی کہتے تھے)، جس کا تعلق مالی امور سے ہوتا تھا۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ انیسویں صدی عیسوی میں مرکزی حکومت کے در اہم محکمے بالترتیب "منشی الممالک" اور "مستوفی الممالک" کے ماتحت تھے۔ دیوان الزمام والاستیفاء دو بڑے حصوں میں منقسم تھا، ایک تو مستوفی الممالک کے تحت تھا اور دوسرا بشرق الممالک کے۔ ان کی تقابلی اہمیت بدلتی رہتی تھی۔ سلجوقیوں کے زمانہ مابعد میں دونوں دفاتر میں خود مختار ہونے کا رجحان پایا جاتا تھا، اول الذکر کا تعلق آمدنی کے امور سے تھا، مؤخر الذکر کا نظارت و نظم و نسق سے۔ آمدنی کا بیشتر حصہ فوج پر خرچ ہوتا تھا، چنانچہ جب آمدنی جاگیروں (انقطاع) کی صورت میں مرکزی حکومت کے اختیار سے نکل جاتی تھی، تب بھی اس معاملے کی مثالوں کو مرکزی حکومت کے شعبہ "دیوان عرض" میں رکھا

اختیار سے آزاد کر دیا گیا تھا۔ تاہم ایران میں انتظامی روایت کا تسلسل بہت نمایاں رہا، خصوصاً شعبہ مالیات میں، جو مرکزی حکومت کا بہت ہی زیادہ منظم شعبہ تھا۔ اس روایت کا سلسلہ انیسویں صدی عیسوی کے وسط سے (جس کے بعد مغرب کے یورپی ممالک کی مثال سے متاثرہ انتظامی تبدیلیاں رونما ہوئے لگیں) پیچھے صفوی اور تیموری زمانوں تک پہنچا ہوا ہے اور باوجود ایلخانیوں کی خاص خاص جدتوں کے، اس کا سراغ اور بھی پیچھے عظیم سلجوقیوں کے عہد تک لگایا جا سکتا ہے۔ یہ امر کہ یہ تسلسل بدستور قائم رہا، زیادہ تر اس واقعیت کا مرہون منت تھا کہ دفتری عمال کو کثیف مفہم آبادی سے لیا جاتا تھا اور وہ ہر نئے شاہی سلسلے کی خدمات بجا لاتے تھے۔ چنانچہ قدیم صفوی سلطنت کا انتظامی عملہ زیادہ تر ایسے ہی عمال پر مشتمل تھا جو اس سے پہلے ترکمان خاندانوں کی ملازمت میں رہ چکے تھے؛ اسی طرح ایلخانیوں کے قانون پسند عمال ان خاندانوں کی ملازمت کر چکے تھے جو مغلوں کی فتح سے پہلے ایران میں حکومت کرتے تھے۔ اتنی ہی حیرت انگیز یہ بات ہے کہ قاجار خاندان کے ابتدائی دور میں کثرت سے وہی لوگ اعلیٰ منصب پر فائز رہے جو سابقہ زند خاندان کے عہد حکومت میں عہدے دار یا وزیر رہے تھے۔

مرکزی انتظامیہ کا اہم ترین عہدے دار وزیر [رگ ہاں] تھا۔ اس کے اختیارات اچھے حکمران تفویض کرتا تھا۔ بعض اوقات ایسا ہوا کہ وہ دیوانی، فوجی، مذہبی غرض کہ حکومت کے ہر شعبے پر حاوی ہوتا۔ اس کے اختیار اور اثر و نفوذ کے حدود کا فیصلہ کرتے تھے شخصی عنصر کا بہت دخل ہوتا تھا۔ ابتدائی صفویوں کے سب سے بڑے عہدے دار کو کچھ مدت تک وکیل [رگ ہاں] کہتے تھے، جب کہ وزیر کی اصطلاح زیادہ تر کسی

جاتا تھا (دیکھیے عتبۃ الکتاب، طبع عباس اقبال، تہران ۱۹۵۰ء، ص ۲۹ تا ۳۰، نیز دیکھیے دفتر)۔

پہلے تین سلطانوں کے عہد حکومت کے بعد وزیر کی اہمیت مستثنیٰ (رک بان) کی اہمیت کی بہ نسبت کم ہو گئی۔ مثال کے طور پر لغز الملک بن نظام الملک، وزیر برکیاروق، مستثنیٰ مجد الملک البلاسی کے سامنے بالکل مائل بڑ گیا (بتداری: دولة السلجوقیہ، قاہرہ ۱۳۱۸ء، ص ۷۹)۔ مزید برآں، جب کہ ابتدائی دور میں سلطان اور وزیر کے مابین کوئی درمیانی واسطہ نہ ہوتا تھا، زمانہ ماہد میں ان کے درمیان وکیل دار اور امیر حاجب قائم کر دیے گئے (بتداری، ص ۸۶، ۱۰۷، ۱۰۵: (۲) ابن الاثیر: ۱۱: ۵۹) اور جیسے جیسے وزارت کا اثر و نفوذ کم ہوا، بادشاہ کا رجحان یہ ہوتا گیا کہ مختلف دیوانوں کے سربراہوں کے ساتھ وزیر کے توسط کے بغیر براہ راست تعلق رکھے (دیکھیے رشید الدین: جامع التواریخ، مخطوطہ، موزہ بریطانیہ، عدد Add. ۷۶۲۸، ورق ۲۵۱ الف)۔ اس سے مراد یہ نہیں کہ ابتدائی دور میں دیوان کا سارا کام وزیر ہی کے ذریعے ہوتا تھا، یا بعد کے عہد میں معاملہ بالکل اس کے برعکس ہو گیا تھا۔

مرکزی حکومت کے دو بڑے دیوانوں کے علاوہ کئی دیوان ایسے تھے جن کا تعلق مالی امور اور اراضی کی خاص نوعیتوں سے تھا، مثلاً ”دیوان خاص“ (جن کا تعلق شاہی اراضی سے تھا) اور دیوان اوقاف (عتبۃ الکتاب، ص ۳۲، ۵۲، ہیملہ)۔ مرکزی حکومت کے نمونے کی کسی حد تک صوبوں میں پیروی کی جاتی تھی۔ والی کا اپنا دیوان ہوتا تھا، جسے کبھی کبھی ”دیوان ایالت“ کہتے تھے (دیکھیے عتبۃ الکتاب، ص ۷۹)۔ بڑے بڑے ضلعوں میں دیوان استیفاء ہوتا تھا، مثلاً مرو اور ہسٹام میں (عتبۃ الکتاب، ص ۵۶، ۵۷)؛ اور متعدد دیوان جو مالی انتظامیہ کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھتے تھے۔ چنانچہ رے میں قوام الدین (تاریخ

تتبع ہلکا کو، جو سنجر کی طرف سے والی تھا، اس کی دستاویزات میں حکم دیا گیا تھا کہ وہ اپنی اقامت گاہ (سرآسے) میں دیوان عمل اور دیوان شہنگ قائم کرے (عتبۃ الکتاب، ص ۷۳)۔ اسی طرح تاج الدین ابوالمکارم کو سنجر کی طرف سے رئیس مازندران مقرر کرنے کے فرمان میں مرقوم تھا کہ وہ اپنی اقامت گاہ میں دیوان معاملات و قسبات قائم کرے (عتبۃ الکتاب، ص ۲۶)۔ رسوم کی وصولی: عام لہجے اور محصولات کی تعیین کے متعلق مقدمات بعض حالات میں دیوان ریاست کے سامنے پیش کیے جاتے تھے (A. K. S. Lambton: The administration of Sanjar's empire, BSOAS, ۱۹۵۷ء، ۲۰: ۳۸۶)۔ ان مختلف محکموں کے سربراہوں کو اپنے ماتحتوں کے معزول و مقرر کرنے کے اختیارات میں غالباً کسی بیشی ”وق“ رہی تھی۔ معین الدین کو، جسے سنجر نے جوقین کا شہنہ (کوآوال) مقرر کیا تھا، اپنے ماتحتوں کو برطرف کرنے کا اختیار دیا گیا تھا، لیکن اسے دیوان کے کلسدا کو مستقل کرنے کی ہدایات دی گئی تھیں (عتبۃ الکتاب، ص ۶۱)۔ ایسی سلجوق خواتین کی مثالیں بھی موجود ہیں جو اپنے دیوان رکھتی تھیں (دیکھیے عتبۃ الکتاب، ص ۶۱)۔ خوالد میر: دستور الوزراء، تہران، ص ۱۹۰)۔

ایران کے منگول حملے کے ساتھ قدیم روایت کسی حد تک ٹوٹ گئی؛ قدیم انتظامیہ کے ڈھانچے کا بہت سا حصہ بھر بھی باقی رہا یا ایلخانیوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد اس کو بحال کر دیا؛ اور دفتری حکام اور مذہبی اداروں کے عہدے دار اپنے اپنے دفاتر یا دیوانوں کے ساتھ عسکری حکام کے پہلو پہ پہلو بھر سے پائے جاتے تھے۔ حکومت کے سب سے ممتاز عامل کو حسب سابق وزیر کہتے تھے، یا کبھی کبھی فرمانروا کے نمائندے کی حیثیت سے وہ نائب کہلاتا تھا (Mongols: Spuler، طبع دوم، ص ۲۸۲)۔ بالی ہمد اس بات کا بھر کیف رجحان پایا جاتا تھا کہ مالی

سب سے بڑا شعبہ تھا، ”دیوان بزرگ امارت“ (دیوان بیگی کے ماتحت)، جس کا تعلق فوجی معاملات سے ہوتا تھا، اور دیوان مال (ایک وزیر کے ماتحت) جو دیوانی امور سے تعلق رکھتا تھا، میں منقسم تھا (Roemer : *Staatsschreiben der Timuridenzeit* ص ۱۶۹ بعد)۔

یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ ایلخانی سلطنت کا طرز انتظام قرہ قویونلو نے ورثے میں پایا تھا (*The Aq-Qoyunlu and land reforms : Minorsky*) در *BSOAS* ۱۹۵۵ء، ۱۷/۳، لیکن ان کے محاصل کے انتظام کے سوا ان کے مختلف دیوانوں کی تنظیم کی تفصیلات بہت کم معلوم ہیں۔ دیوان توابعی اور دیوان ہروالچی کا ذکر ملتا ہے (*Persia : Minorsky* in *A.D. 1478-90 : An abridged translation of Faqlullah b. Rūzbihān Khunja's Tārīkh-i 'alā-i 'arā-y'* ۱۹۵۷ء، ص ۲۸، ۱۰۱)۔ ایران میں ایلخانوں کی انتظامیہ کی تنظیم کے تجاویز کے لیے دیکھیے، آئی۔ ایچ۔ اوزون چارشیلی : عثمانی دولتی تشکیلات منعلی، استانبول ۱۹۴۱ء، خصوصیت کے ساتھ ۱۸۷ بعد۔

مرکزی انتظامیہ کے متعلق صفوی عہد کی معلومات سابقہ ادوار کی معلومات کی یہ نسبت زیادہ مکمل ہیں۔ ہائی ہند دیوان اعلیٰ جو شاہی دربار بھی تھا اور سرکاری حکومت بھی، کی مختلف حیثیتوں کے درمیان خط فاصل قائم کرنا بہت زیادہ مشکل تھا، اسی طرح دفتری حکام، عسکری عہدے داروں اور مذہبی اداروں کے عہدے داروں کے وظائف میں مستقل طور پر کوئی واضح حد فاصل نہیں تھی۔ دیوان اعلیٰ کی داخلی تنظیم ”ایشیک۔اقاسی۔باشی“ کے ماتحت تھی (تذکرۃ الملوک، ورق ۷۲ ب، ۱۳ الف بعد)۔ دربار قاجار کے مہتمم تقریبات کا بھی یہی نام تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکومت میں مجلس شوریٰ کی وضع کی کوئی چیز تھی جس سے دیوان اعلیٰ کے

امور کو وزیر کی براہ راست لگرائی سے ہٹا لیا جائے اور انہیں صاحب دیوان نامی ایک عہدے دار کے سپرد کر دیا جائے جس میں بعض اوقات وزیر کو ماند کر دینے کا میلان پایا جاتا تھا۔ یہ بات بعید از قیاس معلوم نہیں ہوتی کہ ایلخانی بادشاہ اس طریقے سے وزیر کے ناروا فوقیت حاصل کرنے کے امکان کو کم کر دینا چاہتے تھے۔ الجوانی وزیر کی حیثیت سے شرف الممالک، مجد الملک یزدی کے ساتھ ۸۶۷/ اور ۸۷۹ تا ۸۷۱/۔ ۱۳۰۰ تا ۱۳۱۸ء سے نظم و نسق کی سربراہی میں ایک سے زیادہ وزیر شریک ہوتے رہے۔ تاہم ہو سکتا ہے کہ اس بارے میں ایلخان، وسطی ایشیا کے قدیم حکمرانوں کی مثال کا محض تتبع کر رہے ہوں (دیکھیے *Die Korachaniden : Pritsak* در *Jal.* ۱/۳۱ : ۲۴)۔ دو عہدے داروں کو مشترکہ طور پر ایک ہی عہدے کے لیے مقرر کرنے کی رسم صفویوں نے بعد میں متعدد موقعوں پر اختیار کی۔ جب ۸۹۹/۱۲۹۹ - ۹۱۳۰۰ میں رشیدالدین کو صاحب دیوان مقرر کیا گیا، تو اسے سلطنت کی عام نگرانی کا اختیار دیا گیا، خصوصاً محصولات کے انتظام کا اور دیگر امور کے علاوہ شاہی اراضی، دفتری عہدے داروں کے تقرر، ملک کی ڈاک (پام) اور قریات کا (وصاف، بمبئی، ص ۳۷)۔ صاحب دیوان کے تحت مستوفی الممالک اور مالیات سے متعلقہ کئی محکمے تھے، جن میں دیوان الخالصات بھی شامل تھا (وصاف، ص ۳۷)۔ تیموریوں کے زیر حکومت کو نظری طور پر شرعی حکومت کے اصولوں کو دوبارہ نافذ کرنے اور روایتی طریقوں کی طرف رجوع کرنے کی کوشش کی گئی، لیکن عملاً انتظامیہ کے دیوانی اور فوجی شعبوں کے درمیان امتیاز، جو ترک اور تاجیک (ایرانی) کی دو گروہی تقسیم کے مطابق تھا، صاف نمایاں رہا۔ حسین یقرا کے ماتحت دیوان اعلیٰ، جو حکومت کا

اسمعیل اور طہماسپ کے ماتحت دیوان اعلیٰ کا سب سے بڑا عہدے دار وکیل ہوتا تھا، جو بادشاہ کا ہمزاد سمجھا جاتا تھا، جسے کد وزیر اپنے عروج کے زمانے میں سلطان کا مقرب خاص ہوا کرتا تھا، اس کا اختیار عدالت انتظامیہ کے ہر شعبے پر تھا۔ دون معلوم ہوتا ہے کہ دیوان اعلیٰ کے سب سے بڑے عہدے دار کے لیے وکیل کی اصطلاح دسویں صدی ہجری/سولہویں صدی عیسوی کے وسط میں مقنود ہو چکی تھی اور اس کی جگہ وزیر اعظم کی اصطلاح نے لے لی تھی، جو اعیان الدولہ کے خطاب کا حامل ہوتا تھا۔ ۸۹۲ھ/۱۵۱۸ء کے بعد اس کے دفتر کا ذکر نقارۃ دیوان اعلیٰ، نقارۃ دیوان یا دیوان وزارت کے طور پر کیا جائے لگا تھا (The principal offices of the Safawid: R. M. Savory) state در BSOAS، ۲۳/۱، ۱۹۶۰ء، ص ۹۱ تا ۱۰۵ اور ۲۲/۱، ۱۹۶۱ء، ص ۶۵ تا ۸۴)۔ رفتہ رفتہ انتظامیہ کے طریق کار کا ایک وسیع نظام ظہور میں آیا۔ وزیر، دیوان اعلیٰ کے صدر کی حیثیت سے سرکاری تقررات کی توثیق کرتا تھا؛ سرکاری عملے کے تمام معاملات اور تنخواہ سے متعلقہ کاغذات دفتر خانہ عیالوں اعلیٰ کے ذریعے بھیجے جاتے تھے، جو ایک خاص وزیر کے ماتحت ہوتا تھا۔ "مستقل فوج" (قورچی، غلام تنگچی اور توپ خانے کے ملازمین) کی تنخواہ کے کاغذات اسی کے محکمے (سرکار) کے ذریعے بھیجے جاتے تھے، جو وزیر اور مستوفی کے ماتحت ہوتا تھا اور اس کے عملے میں دیوان مذکور کے کاتب ہوتے تھے (تذکرۃ الملوک، ورق ۵۸ ب بعد)۔ دیوانی اور فوجی عہدے داروں کے نام اور تنخواہ کی منظوری کے مراسلات پر، نیز جن پر وزیر اعظم کی مہر ثبت ہوتی تھی، دیوان اعلیٰ کا لشکر نویس بھی مہر لگاتا تھا، جو خواجہ سراؤں، باز دار شکاریوں (قوش چیان)، نقیبوں (بساؤلان) اور دربانوں (قابوچیان) کے محکمے کا وزیر بھی ہوتا تھا (تذکرۃ الملوک، ورق ۶۵ الف

بعض ارکان تعلق رکھتے تھے، یہ مجلس مرکزی انتظامیہ کے روایتی نظام کے دائرے سے باہر تھی۔ Alessandir لکھتا ہے کہ طہماسپ روزانہ ایک مجلس منعقد کرتا تھا، جس میں بارہ سلاطین (یعنی صوبوں کے والے اور فوجی ارکان) اور اس کے بیٹے، جو دربار میں موجود ہوتے، شرکت کرتے تھے (A Narrative of Hukumat of Italian travels in Persia، ص ۲۲ تا ۲۳)۔ اس مجلس کا کام محض مشاورت معلوم ہوتا ہے۔ تذکرۃ الملوک میں لکھا ہے کہ قورچی ہاشمی، قار آغاسی، ایشک آغاسی ہاشمی، تنگچی آغاسی، وزیر اعظم، دیوان بیگی اور وقائع نویس از شد قدیم ہی سے اہم رائے جاتی کی مجلس مشاورت سے تعلق رکھتے تھے، اور شاہ سلطان حسین کے عہد حکومت کے آخر میں لغتہ، مستوفی الملوک اور امیر شکار ہاشمی (جو بھی بعض موقعوں پر امیرک مجلس کر لیا جاتا تھا)۔ اگر کسی سالار (شکر سپہ سالار) کو سلطنت کے کسی دور افتادہ علاقے میں بھیجے جانے کے سوال کے لیے مجلس منعقد ہوتی تو سپہ سالار کی جاتی مجلس مشاورت میں موجودگی لازمی شرط تھی (۷ ب تا ۸ الف)۔ Minorsky اس ادارے کو بلحاظ اصل سنگولی یا نیموری خیال کرتا ہے۔ Chardin اس رائے پر قائم ہے کہ یورپی ادارے کی قسم کی وہاں کوئی مجلس شوری نہیں تھی؛ اس کے برعکس Sanson لکھتا ہے کہ تمام فصلے بادشاہ کی مجلس شوری میں آکے جاتے تھے (تذکرۃ الملوک، ص ۱۱۳ تا ۱۱۴)۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قاچاروں کے تحت جاتی سرکاری حکومت کی انتظامیہ کا باقاعدہ جزو نہیں رہی بلکہ ایک قبائلی مجلس بن گئی تھی، جو قاچار قبیلے کے معاملات سے سروکار رکھتی تھی، جیسے کہ غالباً حسب معمول ایلخانی عہد میں ہوا کرتی تھی۔ Malcolm قاچار قبیلے کے ایک "بڑے امیر" کی غناری کے مقدمے کا ذکر کرتا ہے، جس کی سماعت ۱۸۰۸ء کے قریب ایک جاتی مجلس مشاورت نے کی تھی (History، ۲: ۱۱۳۷)۔

(بعد)

دیوان اعلیٰ کے سربراہ کی حیثیت سے "وزیر" کے دیگر فرائض میں نہ بھی تھا کہ وہ سرکاری عمل کی کارروائیوں کے باضابطہ ہونے کی جانچ پڑتال اور حکومت کے مالیاتی امور کی صدارت کرے (تذکرۃ الملوک، ۱۱۵)؛ یہ آخری کام عملی اعتبار سے اس کا اہم ترین وظیفہ تھا۔ ازنسہ سابقہ کی وزارت میں اپنے پیش روؤں کی طرح آمدنی بڑھانے کی کوشش بھی اس کا فرض تھا (تذکرۃ الملوک، ورق ۸ ب)۔ مالی انتظامیہ دو بڑے محکموں میں منقسم تھی؛ دیوان ممالک، جو مستوفی الممالک کے ماتحت تھا اور دیوان خاصہ جو ناظر بیوتات (جسے ناظر بیوتات سرکار خاصہ بھی کہتے تھے) کے تحت تھا۔ وزیر اعظم اور ناظر بیوتات کے باہمی تعلق اور دیوان خاصہ پر اس کے اختیار کی نوعیت اچھی طرح واضح نہیں۔ بظاہر بیوتات کا میزانیہ وزیر اعظم کے سامنے پیش کیا جاتا تھا (تذکرۃ الملوک، ورق ۶، الف)۔ مستوفی الممالک کے ماتحت کئی عہدے دار ہوتے تھے، جو مختلف دفاتر محصولات کے مستند تھے، بیشتر صورتوں میں دیوان الممالک اور دیوان خاصہ کے تحت متعلقہ امور پر کارروائی کرنے کے لیے ایک ہی قسم کے متعدد دفاتر تھے۔ ان میں دفتر موقوفات (تذکرۃ الملوک، ورق ۱۷، الف) اور دفتر بقایا شامل تھے (سکندر منشی: عالم آراء، ص ۶۵)۔ مشہد میں سرکار فیض آثار نام کا ایک خاص محکمہ تھا، جو روضہ امام رضا کے اوقاف کا انتظام کرتا تھا (عالم آراء، ۲۵۸، مکرر ۶۵)۔ اوقاف کی عام نگرانی صدر اعظم کے ماتحت "دیوان الصداریہ" کرتا تھا (H. Husse

Unter-suchungen zum Islamischen Kanzleiwesen

قاہرہ ۱۹۵۹ء، ص ۲۰)۔ بعض صوبائی صدور کے بھی دیوان یا "سرکار" ہوتے تھے (دیکھیے یزد کے موقوفات کے مستوفی کے لیے سند مورخہ ۷۷۰ھ، ۱۵۱

جامع مفیدی، B. M. Or. ۲۱۰، بعد ۱۶۸ ب تا ۱۷۰ ب؛ اور Busse، ص ۱۳۲)۔

دیوان ممالک ان صوبوں اور اضلاع کی انتظامیہ سے سروکار رکھتا تھا جن کا انتظام والیوں کے ہاتھ میں تھا اور جو مرکزی حکومت کے براہ راست اختیار سے باہر ہوتے تھے۔ دیوان خاصہ کا تعلق ان علاقوں سے تھا جن کا انتظام وزیروں کے ماتحت مرکزی حکومت براہ راست کرتی تھی۔ بالواسطہ طور پر انتظام دیے جانے والے علاقوں کی حدود بلاواسطہ انتظام کیے جانے والے علاقوں کی بہ نسبت بدلتی رہتی تھیں۔ (تذکرۃ الملوک، ص ۲۴، بعد، A. K. S. Lambton: Landlord and Peasant in Persia، آکسفورڈ ۱۹۳۳ء، ص ۸۰)۔ خاصہ کے رقبے میں اضافہ کے ساتھ، جوشاہ صفی کے تحت ہوا، دیوان خاصہ کی اہمیت غالباً بڑھ گئی تھی؛ شاہ صفی کے زمانے میں ناظر بیوتات سرکار خاصہ کا ذکر دیوان کے سب سے بڑے دفتر کے طور پر کیا جاتا ہے (جامع مفیدی، ورق ۳۳۸ ب تا ۳۳۹ الف)۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دیوان خاصہ کا مستوفی کسی حد تک مستوفی الممالک کے ماتحت تھا، لہذا وزیر اعظم کے ماتحت بھی ہوا (تذکرۃ الملوک، ورق ۲۷ ب تا ۲۸ الف)۔ اصفہان کو بطور دارالحکومت شاید خاص حیثیت حاصل تھی۔ سرکار فیض آثار اور سرکار انتقالی اراضی کی خاص اقسام سے سروکار رکھتے تھے (غالباً اوقاف اور حکومت کی بازیافتہ اراضی سے)؛ معلوم ہوتا ہے کہ شاہی اراضی کا انتظام وزیر اصفہان کے تحت تھا۔ یہ تینوں محکمے دیوان اعلیٰ کے وزیر اعظم کی عام نگرانی میں تھے (تذکرۃ الملوک، ورق ۱۷، الف (بعد)۔

بیوتات یعنی شاہی محل کا انتظام وزیر بیوتات، ناظر بیوتات کی عام نگرانی کے تحت کرتا تھا؛ یہ متعدد دفتروں (دفتر خانہ) اور کارخانوں میں منقسم تھا، اور ان میں سے ہر ایک "صاحب جمع" اور مشرف کے ماتحت

تھا: اول الذکر اس کی عام کارکردگی اور مؤخر الذکر انتظامی ضوابط پر عمل درآمد کا ذمہ دار تھا (تذکرۃ الملوک، ورق ۱۴۰)۔

وہ محکمہ جو سابق دیوان انشاء کے مانند تھا، صفویوں کے تحت دارالانشاء کہلاتا تھا اور وہ منشی الممالک کے ماتحت تھا (تذکرۃ الملوک، ورق ۳۹ ب تا ۴۰ الف؛ Busse، ص ۵۹ بعد)۔

عمومی نظر سے دیکھا جائے تو قاجاروں کے عہد میں بھی دیوان اعلیٰ کی تشکیل صفویوں کے طریق عمل کے مطابق کی گئی تھی۔ اس خاندان میں شاہی دربار کا طریق کار فتح علی کے عہد اور مابعد کے زمانے میں پایہ تکمیل کو پہنچا۔ شاہی محل، جو متعدد دفتروں پر مشتمل اور مجموعی طور پر بیوتات کہلاتا تھا، بہر حال بہ نسبت سابق کے دیوان اعلیٰ سے بالکل علیحدہ کر لیا گیا تھا۔ جہاں تک مرکزی حکومت میں دیوان اعلیٰ کا تعلق تھا، اس کی تنظیم اتنی معیاری نہیں رہی تھی جتنی صفویوں کے عہد میں تھی؛ اور "ممالک" اور "خاصہ" کے درمیان بھی کوئی امتیاز نہیں رہا تھا۔ آقا محمد خان بظاہر انتظامیہ کی تفصیلات پر بھی بذات خود توجہ کرتا تھا۔ فتح علی کی حکومت بھی شخصی نوعیت کی تھی، لیکن اس کے عہد حکومت میں انتظامیہ وسیع ہو گئی۔ دیوان اعلیٰ کا سب سے بڑا عہدے دار صدر اعظم تھا؛ اس کے اختیارات بادشاہ کی مستعدی، کاہلی یا صلاحیت کے مطابق کم و بیش ہوتے رہتے تھے۔ آقا محمد خان کے عہد میں صدر اعظم حاجی ابراہیم کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ حکومت کے تمام محکموں کی صدارت کرتا تھا (Malcolm، ۲: ۳۰۸ تا ۳۰۹)۔ دو اہم ترین محکمے بالترتیب مستوفی الممالک اور لشکر نویس کے ماتحت تھے؛ مؤخر الذکر فوجوں کی تنخواہ اور ان کی بھرتی سے متعلق تھا، جس کا محصولات کی انتظامیہ کے ساتھ گہرا رابطہ تھا۔ فتح علی کے عہد میں منشی الممالک

کے عہدے نے پھر اہمیت حاصل کر لی۔ قاجاروں کے ابتدائی عہد حکومت میں ان مختلف محکموں کا اندرونی انتظام نامکمل سا نظر آتا ہے۔ ۱۸۰۹ء میں Morier لکھتا ہے کہ وزیروں اور کاتبوں کے دفاتر بادشاہ کے محل میں واقع تھے، جہاں وہ ہر روز اس لیے جمع ہوتے کہ جب بادشاہ طلب کرے تو پیش ہو سکیں (A journey through Persia، لندن ۱۸۱۲ء، ص ۲۱۶)؛ لیکن فی الحقیقت وزیروں کو، جہاں کہیں وہ ہوتے تھے، اکثر وہیں اپنے محکمے قائم کرنے پڑتے تھے۔ آقا محمد خان اور فتح علی دونوں اپنا بیشتر وقت فوجی مہموں اور چھاؤنی میں گزارتے تھے (ایسا ہی ان کے جانشینوں نے کیا)؛ ان موقعوں پر ان کے وزرا عموماً ان کے ہمراہ ہوا کرتے تھے۔ ان حالات میں سرکاری محکموں کو زیادہ دفتری لوازم کے بغیر ہی کام کرنا پڑتا تھا۔ Malcolm لکھتا ہے کہ "حکومت کے شرعی، دیوانی، مالی اور عسکری محکموں میں رقوم کی وصولی اور ادائی کے حسابات کو بڑی باقاعدگی اور صحت کے ساتھ رکھا جاتا تھا" (History، ۲: ۳۰۸)۔ حقیقت یہ ہے کہ ان مثالوں کو زیادہ تر ان عہدے داروں کی ذاتی منکبت خیال کیا جاتا تھا جو انہیں مرتب کرتے تھے؛ اور جہاں تک ان کا تعلق محاصل کی تشخیص سے تھا، یہ سب اس صدی کے وسط میں اپنے زمانے کے واقعی حالات سے بہت کم مطابقت رکھتی تھیں۔ مستوفی الممالک کے دیوان کی تنظیم جغرافیائی بنیادوں پر کی جاتی تھی؛ کسی علاقے کے محصولات کی تشخیص اور کاغذات مستوفی کو تفویض کر دیے جاتے تھے، جسے اس ضلع کا مستوفی کہتے تھے۔ شاہی اراضی (خالصہ) اور اوقاف، نیز خاص صورتوں، مثلاً بقایا، کے لیے علیحدہ محکمے تھے۔ صوبائی انتظام کو والی کے اختیار میں دے دیا جاتا تھا، جو اس کی تفصیلات کو اکثر بذات خود دیکھتا تھا۔ ایک طاقتور صوبائی والی، خصوصاً اگر وہ

وزارت کے معنی میں استعمال کیا، غلط ہے۔ یہ اصطلاح اس سے بہت پہلے مستعمل تھی۔ سلاطین دہلی کے زمانے میں اس کا استعمال بنیادی طور پر وزیر مال تک محدود تھا، جو معمولاً خود وزیر ہوتا تھا، اور اس کا محکمہ وزارت مال کہلاتا تھا۔ جب کوئی نیا محکمہ بنتا تو اسے بھی دیوان کہتے تھے، جیسے دیوان رسالہ یا دیوان مظالم۔ اسی عہد میں یہ لفظ فوجی محکمے کے لیے بھی استعمال ہوتا تھا، اور یہ بھی وزیر کے ماتحت ہوتا تھا، گو غزنویوں کے عہد میں اس محکمے کو جداگانہ طور پر "دیوان عرض" کہتے تھے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظام سلاطین دہلی کے عہد سلطنت میں پوری طرح منظم ہو چکا تھا، کیونکہ ہم اچھی خاصی تعداد میں محکمے موجود ملتے ہیں۔ ان میں یہ شامل تھے: (۱) دیوان وزارت جس کا زیادہ تر تعلق مالیات سے تھا (قب شمس سراج عقیف؛ تاریخ فیروز شاہی، فارسی متن، ص ۱۹۷ تا ۲۰۰)؛ (۲) دیوان عرض، عارض ممالک کے تحت فوجی محکمہ؛ عارض ممالک بعض اوقات خود سلطان ہوتا تھا؛ (۳) دیوان رسالہ، جس کا تعلق مذہبی امور، اوقاف اور مدد معاش کے وظائف سے تھا اور جس کا نظام و نسق صدر الصدور کے ہاتھ میں تھا، اور وہ قاضی ممالک یا سلطنت کا اعلیٰ حاکم عدالت بھی ہوتا تھا؛ (۴) دیوان انشاء، بالکل دیوان خاتم کے مانند، جسے سب سے پہلے حضرت معاویہؓ نے قائم کیا تھا؛ غزنویوں کے تحت اسے دیوان رسالت کہتے تھے۔ یہ تمام سرکاری خط و کتابت کا کام کرتا تھا اور زمانہ جدید کی بیچیدہ تر، ترقی یافتہ سیکرٹریٹ کا نقش اول تھا؛ (۵) دیوان مظالم، جس کا تعلق مظالم (رُک، بان) کی عدالتوں کے دائرہ اختیار سے تھا، شرعی عدالتوں کا انتظام دیوان قضاء کے پاس ہوتا تھا، جو صدر الصدور یا قاضی القضاة کے ماتحت تھا؛ (۶) دیوان اشراف، جو

قاجاری شہزادہ ہوتا، اپنا صوبائی دربار، دیوان اعلیٰ کے نمونے کے مطابق (اگرچہ جھوٹے پیمانے پر) لگاتا تھا۔ اہم ترین صوبائی عہدے دار وزیر تھا، جس کا تقرر عام طور پر دیوان اعلیٰ کرتا تھا۔ اس کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ تھی کہ والی صوبائی محاصل کا مقررہ حصہ مرکزی حکومت کو بھیجنے میں کوتاہی نہ کرنے پائے۔

مآخذ: دین مغالہ میں مندرج حوالوں کو دیکھیے۔

(Ann. K.S. Lambton)

۵۔ ہندوستان

معلوم ہوتا ہے کہ دیوان کی اصطلاح سرکاری محکمے کے معنی میں ہندوستان میں سب سے پہلے غزنویوں کے عہد حکومت میں، جن کا (ہند میں) دارالحکومت لاہور تھا، رائج ہوئی۔ سلطان محمود کے مقرر کردہ ہندوستان کے سپہ سالار آریارک کی تمام دولت جو اس نے ہندوستان میں اپنی صوبے داری کے زمانے میں جمع کی تھی، اس کی برطرفی اور واپس غزنی بلا لیے جانے پر ضبط ہو گئی۔ اس کے مال و دولت کا بہت بڑا حصہ یقیناً "خراج" (زمین کا مالکہ) کے ذریعے آیا ہوگا، جس کی وصولی اور ادائی کے لیے لازماً ایک جداگانہ محکمہ ہوگا۔ ارشخی (دیکھیے تاریخ بخارا، طبع Schefer، ص ۲۴) غزنویوں کے تحت جن دیوانوں کا ذکر کرتا ہے وہ دس سے کم نہیں، جن میں دیوان وزراء یا محکمہ مال بھی شامل ہے (دیکھیے نیز ابوالفضل البیہقی: تاریخ البیہقی، طبع سعید نفیسی، تہران ۱۳۱۹ شمسی/۱۹۴۰ء، ص ۵۳، ۱۸۰، ۱۹۲)۔ مسعود بن محمود کے عہد حکومت کے دوران البیہقی بذات خود "دیوان رسالہ" (دیوان انشاء) کے عملے میں تھا۔ لہذا مورلینڈ Moreland کا یہ دعویٰ (دیکھیے مآخذ) کہ ہندوستانی مؤرخوں نے لفظ دیوان سب سے پہلے ساتویں صدی ہجری/تیرہویں صدی عیسوی اور آٹھویں صدی ہجری/چودھویں صدی عیسوی میں محکمے یا

مالی امور کا انتظام کرتا تھا دیوان کہنے لگے۔
دیانت خان، شاہجہان کے عہد حکومت کے پہلے سال
میں ممتاز محل کا دیوان تھا (مآثر الامراء، انگریزی
ترجمہ از A.H. Beveridge، ۱: ۸۸)۔ بعض ہندو
اور مسلم گھرانوں کے مرد دیوان کے اس دوروں
اعزازی لقب کو آج تک بڑے فخر کے ساتھ استعمال
کرتے ہیں، جس کا حامل ان کا کوئی نامور جد امجد
ہوتا تھا۔

دیوان کے تحت وزارت مال کو انجام کار
”دیوانی“ کہنے لگے۔ یہ اصطلاح برطانوی عہد میں
”دیوانی“ اور ”فوجداری“ عدالتوں میں باقی رہی اور
ابھی تک پاکستان کے قانونی نظام کا جزو ہے۔

عہد مغلیہ میں دیوان گوناگوں فرائض سرانجام
دیتا تھا۔ وہ نہ صرف مالی کاغذات کے الضرام کا ذمے دار
تھا بلکہ وہ ضروری شاہی مکتوبات اور فرامین کا
مسودہ بھی تیار کرتا تھا۔ وہ شاہزادوں کے وکلاء
صوبائی والیوں اور معزز امرا سے ملاقات و گفتگو
کرتا تھا۔ رات کو شاہی محل کے گرد کسی امیر
کے تحت پہرہ لگوانا بھی اس کے فرائض میں سے
تھا۔ وہ محاصل کی وصولی اور اخراجات کے گوشوارے
بادشاہ کی خدمت میں پیش کرتا تھا، جو اس طریقے سے
حکومت کے مالیات سے مطلع رہتا تھا۔ ناظم کی حیثیت
سے وہ اعلیٰ عہدے داروں کے تقرر کے وقت ان کے
فرائض کی تعیین کرتا تھا اور ان سے باقاعدہ کارگزاری
کی روداد وصول کرتا تھا اور انہیں رخصت دینے کا
بھی مجاز تھا۔ اس کی تعویل میں وہ تمام سرکاری
مثلیں ہوتی تھیں جو اس کے دفتر میں جمع کی جاتی
تھیں (ان مثلوں کی مفصل فہرست کے لیے دیکھیے
جادونا تہ سرکار: Mughal administration، طبع چہارم،
کلکتہ ۱۹۵۲ء، ص ۲۹ تا ۳۲)۔

اس کے رقبے کار دیوان خالصہ اور دیوان تن
جدگانہ فرائض انجام دیتے تھے۔ اول الذکر من جملہ

مشرف یا صدر محاسب کے ماتحت ہوتا، اور وہ صوبوں
یا دیگر محکموں سے وصول ہونے والے حسابات سے
تعلق رکھتا تھا۔ ان حسابات کی جانچ پڑتال اس
کا دوسرا محکمہ کرتا تھا جس کا نظم و نسق
مستوفی الممالک کے ہاتھ میں تھا۔ فیروز تغلق کے
عہد حکومت کے دوران میں (قب عقیف، فارسی متن،
ص ۹۰ تا ۹۱) مشرف کا تعلق محاصل اور مستوفی
کا تعلق صرف خرچ سے رہ گیا تھا۔ فیروز شاہ تغلق نے
شاہی کارخانوں کے لیے مستوفی کے ماتحت ایک علیحدہ
دیوان بھی قائم کیا تھا، مگر اس کے حسابات کی جانچ
پڑتال دیوان وزارت ہی کرتا تھا۔ عہد مغلیہ میں وزیر
کے نام میں خلیف تبدیل واقع ہوئی کہ اسے دیوان کل
اور اسی محکمے میں اس کے رقبے کار کو صرف دیوان
کہنے لگے، البتہ اس کے ساتھ وہ اصطلاحی نام شامل
ہوتے جو ان کے وظائف اور فرائض پر دلالت کرتے
تھے، مثلاً دیوان تن یا دیوان خالصہ۔

مغلوں کے تحت ایک اور نمایاں تبدیلی یہ ہوئی
کہ مالی اور مالیاتی محکمے کے سربراہ کو مختص طور
پر دیوان کہنے لگے۔ اکبر کے عہد حکومت میں وزیر
کے لفظ کو شاید ہی اس مفہوم میں استعمال کیا جاتا
تھا، کیونکہ اس کی جگہ دیوان کی اصطلاح نے لے لی
تھی، جو ادارے یا سرکاری محکمے پر دلالت کرنے
کے بجائے اب فرد (یا شخص) پر دلالت کرنے لگی
تھی۔ تاہم اس کے بیٹے جہانگیر کے عہد حکومت میں
پرانے طریق کار کا احیا ہوا اور وزیر کی اصطلاح پھر
سروج ہو گئی۔ یہ شاہجہان کا عہد حکومت تھا جس
کے دوران میں وزیر کو دیوان کل اور محکمے میں اس
کے دیگر رقبے کار کو دیوان کہنے لگے، مع ان اضافی
الفاظ کے، جو ان کے فرائض کو ظاہر کرتے تھے۔
وزیر اور دیوان کے دونوں الفاظ کچھ عرصے تک
تقریباً مترادف ہی رہے اور نجی کاروبار میں بھی اس
شخص کو جو کسی حاکم اعلیٰ یا دولتمند شخص کے

میں اضافہ ہوتا گیا۔ وہ نہ صرف تین سو سے ہزار نام تک کی منظوری دے سکتا تھا، بلکہ جاگیروں اور ائمہ کی اراضی کی سندات کا اپنے دستخط سے اجرا بھی کر سکتا تھا، جو بالفاظ ضابطہ شاہی مسہر یا مرکزی دیوان کے دستخط کے بغیر ناقص اور کالعدم ہوتی تھیں۔ اس کے باوجود دیوان کو وہ مرتبہ حاصل نہ تھا جو صوبیدار کو تھا، جسے انتظامی شعبے کا سربراہ ہونے کے سبب، عوام کی نظروں میں حاکم مالیات سے اعلیٰ مرتبہ، رتبہ اور عزت حاصل تھی۔

صوبائی دیوان کے فرائض میں اس کی، دد کے لیے ایک پیشکار (ذاتی معاون)، جس کا تقرر شاہی مد کے ذریعے، مرکزی دیوان کی مسہر کے تحت ہونا تھا، داروغہ (یا سہتم دفتر) مشرف اور تحویل دار دفترخانہ (محافظ اشلہ) ہوتے تھے، اور یہ سب منصب کے حامل ہوتے تھے، ان کے درجے کے عملے میں مردھا (عدالتی سرکار) عوام کی نظر میں یا اثر حشیت رکھتا تھا اور اس کی عموماً بہت توقیر کی جاتی تھی۔

گیارہویں - بارہویں صدی ہجری / سترہویں - اٹھارہویں صدی عیسوی میں دیوان کی اصطلاح صرف محکمہ مال کے لیے استعمال ہونے لگی۔ اس کے برعکس نقابات یا فوجداری کی اصطلاحات عام انتظامیہ پر دلالت کرتی تھیں اور ان کا تعلق بنیادی طور پر نظام و نسق اور قانون کے نفاذ سے تھا۔ برصغیر پاک و ہند میں آج تک غیر فوجی عدالتوں کو فوجداری عدالتوں سے ممتاز کرنے سے دیوانی عدالتیں کہا جاتا ہے۔ اس معنوم میں وہ انظر باعتبار مأخذ ایسٹ انڈیا کمپنی کے صوبہ بنگال میں، دیوان مقرر کیے جانے کا رجحان بنتا ہے۔ کمپنی کے منتظمین نے اپنی عدالت قائم کرنا مناسب سمجھا، جسے انہوں نے "دیوانی عدالت" یعنی دیوان کی عدالت کے نام سے موسوم کیا۔ ہندوستان میں بعض سابق راجاؤں کی ریاستوں میں، جو بھارتی وحدت میں مدغم ہو گئی ہیں، وزیر اعلیٰ

دیگر امور کے ان حسابات کی بالواسطہ جانچ کرتا جو محکمہ مال تیار کرتا تھا، (شاہی اراضی) کے طومار جمع (مجموعی طور پر تشخیص شدہ معیاری محاصل کے کاغذات) کی جانچ پڑتال کرتا اور فوجوں اور بادشاہ کے ذاتی عملے اور خدم و حشم کے اخراجات کے تخمینے (برآورد) تیار کرتا تھا۔ دیوان کن من جملہ اور چیزوں کے ان تمام امور کو بادشاہ کی خدمت میں پیش کرنے کا ذمہ دار تھا جن کا تعلق جاگیروں یا زر نقد کے عطیوں سے تھا، جن میں طالبہ، علماء، قضاة وغیرہ کی مدد معاش کی منظوری کے لیے فرمائوں، عرض داشنوں اور پروانوں وغیرہ کا مسودہ تیار کرنا بھی شامل تھا۔

صوبائی دیوان کا عہدہ اہمیت میں صرف سپہ سالار کے عہدے سے دوسرے درجے پر ہوتا تھا۔ صوبائی دیوان کا تقرر چونکہ بادشاہ مرکزی دیوان کی سفارش پر براہ راست کرتا تھا لہذا وہ کسی طرح بھی صوبیدار کے ماتحت نہ تھا۔ وہ اپنے احکام مرکزی دیوان سے حاصل کرتا تھا اور فقط اسی کے سامنے جوابدہ تھا، اس سے مقصود حکومت کے خزانے کو صوبیدار کے حلقہ اختیار سے آزاد رکھنا اور اس طرح سرکاری رویے میں عین اور خرد برد ہو جائے اور صوبیداروں کی سرکشی کے خطرات کو کم کرنا تھا۔ برائے احمدی (برآوردہ ۱۹۲۸ء : ۱ : ۱۶۳ تا ۱۷۱) میں، کبر کا ایک فرمان نقل کیا گیا ہے، جس میں صوبائی دیوان کے فرائض جامع شکل میں مرقوم ہیں۔ اس فرمان کے مطابق دیوان "قابل اعتماد اور تجربہ کار شخص ہونا چاہیے، اگر ایسے کسی بند مرتب امیر کے ہاں بھی ایسی کام کا تجربہ ہو"۔ اس کے فرائض میں بھاری ذمے داریاں شامل تھیں، کیونکہ اس کے ذمے محاصلین (عمال) کے حسابات کی جانچ پڑتال اور رشوت خوروں کی برطرفی کی تحریک کرنا ہوتا تھا۔ وہ کبھی کبھی صوبائی محاسب کے طور پر بھی کام کرتا تھا۔

جوں جوں وقت گذرتا گیا، دیوان کے اختیارات

۱۶۷۸ء تا ۱۶۸۱ء (۱۹۷۸ء تا ۱۹۷۹ء) (۹) Rieu
۱۶۷۸ء الف (۱۶۷۸ء) کے عہد حکومت کے لیے کر محمد شاہ
کے عہد حکومت کے وکیلوں اور دیوانوں کی فہرست
دی ہے۔

(نرسی انصاری)

دیوان ہمایون : عثمانی شاہی مجلس کا نام، *

جو گیارہویں صدی ہجری/سترہویں صدی عیسوی کے
وسط تک ترکی سلطنت کی انتظامیہ کا مرکزی ادارہ تھا۔
قدیم سلاطین کے تحت دیوان کے متعلق بہت کم
معلومات ملتی ہیں۔ بقول عاشق پاشا زادہ (باب ۳):
طبع N. Aisiz: عثمانی تاریخ لری Osmanlı tarihleri
استانبول ۱۹۸۹ء، ص ۱۱۸؛ جرمن ترجمہ R. Kreutel:
Graz ۱۹۵۹ء Vom Hürtenzeit zur hohen Pforte
ص ۶۶) دیوان میں بیچ دار بگڑی (برماو دل بند)
پاندہ کر حاضر ہونے کی رسم اُرخان کے عہد حکومت
میں پڑی تھی۔ اس سے غالباً ایک قسم کی عام
باریابی مراد ہے۔ مصری طبیب شمس الدین بن صغیر
جسے برقوق نے بایزید الثانی کے علاج کے لیے بھیجا
تھا، بیان کرتا ہے کہ کس طرح عثمانی حکمران صبح
کے وقت دربار عام منعقد کرتے اور عوام کی داد رسی
کے کرتے تھے (بعوالہ ابن حجر، در ایام الغمر، سال
۸۰۵ھ Şevkiye Tnaloik: - İbn Hacer'de Osmanlı-
clara dair haberler در AÜDTCFD ۳/۶ (۱۹۳۸ء):
ص ۱۹۵، ۱۹۶؛ قس تشکو پروزادہ کمال الدین محمد:
تاریخ صاف، استانبول ۱۹۲۸ء، ص ۳۸)۔ عاشق
پاشا زادہ (باب ۸۱) متن ص ۱۵۵ تا ۱۵۶، ترجمہ
ص ۱۳۳) پاشاؤں کے متعلق لکھتا ہے کہ جب محمد
اول کا آخری وقت تھا تو اس نے دیوان منعقد کیا، اور
باب عالی (قبر) میں تو روزانہ دیوان منعقد ہوتا تھا،
نیز (باب ۱۲۲) متن ص ۱۹۰ تا ۱۹۱، ترجمہ
ص ۱۹۵)۔ وہ مراد ثانی کی وفات پر بھی پاشاؤں کے
اسی قسم کے ایک دیوان کا ذکر کرتا ہے۔ ان

کو دیوان کہتے تھے۔ یہ لفظ دیوان صاحب اور
دیوان بہادر کے دو خطابات کا بھی جزو تھا، جو
ہندوستان کی برطانوی حکومت دیا کرتی تھی، مگر
ان کا استعمال جنوبی ہندوستان کے مشاہیر تک محدود
تھا۔

لاہور، آگرے، دہلی اور دوسری جگہ کے منیل
قلعوں میں دیوان عام (عوام کی باریابی کے لیے) اور
دیوان خاص (خواص کی باریابی کے لیے) ایسے جملوں
میں اس لفظ کا استعمال اپنے اصلی معنی کی ایک ہلکی
سی صدائے بازگشت ہے۔ گذشتہ ایام میں بڑے اور
مستول لوگوں کے مکالوں اور حویلیوں میں جدید ڈرائنگ
روم کی طرح ایک علیحدہ کمرہ ہوتا تھا، جسے دیوان خانہ
کہتے تھے، لیکن وہ گلیہ گور کے مردوں یا ان کے
مہمانوں اور ملاقاتیوں کے لیے مخصوص ہوتا تھا۔

مآخذ : ان سندوں کے علاوہ جو متن میں دی گئی

ہیں : (۱) ایس۔ ایم۔ جعفر : Medieval India

(The Ghaznavids)، پشاور ۱۹۸۰ء، ص ۲۸۲ تا ۲۸۷

(۲) وہی مصنف : Some cultural aspects of the

Muslim rule in India، پشاور ۱۹۵۰ء، ص ۲۵ تا

۲۹، ۵۱، ۱۱۰ : (۳) جادو ناتھ سرکار : Mughal

administration، طبع چہارم، کلکتہ ۱۹۵۲ء، ص ۲۵ تا

۵۳، ۵۴ : (۴) اشتیاق حسین قریشی : The adminis-

tration of the sultanate of Delhi، طبع دوم،

لاہور ۱۹۸۸ء، بحد اشاریہ: (۵) ابن حسن : The central

structure of the Mughal empire، لندن ۱۹۳۶ء

(اردو ترجمہ بعنوان دیوان غلیہ کی ہیئت مرکزی، لاہور

۱۹۵۸ء)، بحد اشاریہ: (۶) P. Saran : The provincial

government of the Mughals، آلہ آباد ۱۹۸۵ء

ص ۱۸۹ تا ۱۹۷ : (۷) R. P. Tripathi : Some aspects

of Muslim administration، آلہ آباد ۱۹۵۶ء : (۸)

The agrarian system of Moslem : W.H. Moreland

India، طبع دوم، آلہ آباد، بدون تاریخ، ص ۱ تا ۱۵

GOR : Hamber-Purgstall : ۳ : ۸۹ : Histoire (۲۸۲ : ۶) .

آئین اور طریق کار : محمد ثانی کے قانون میں، جس کا مقصد سلطان کے باپ اور دادا کے طریق کار کو پیش کرنا ہے، دیوان ہمایون کا آئین خاصی تفصیل کے ساتھ مندرج ہے۔ دیوان کا اجلاس ہر روز ہوتا تھا؛ اس میں شریک ہونے والے بلحاظ مراتب یہ تھے: وزیراعظم، دیگر وزراء، قاضی عساکر، دفتر دار اور نشانچی؛ اگر نشانچی کا عہدہ وزیر یا یلار ہے کا ہوتا تو وہ دفتر داروں کے اوپر بیٹھتا؛ اگر عہدہ سنجی بیگی کا ہوتا تو دفتر داروں کے نیچے۔ جب یہ عہدے دار آتے تو چاؤش باشی اور درباؤں کا داروغہ بڑی تعظیم کے ساتھ ان کا استقبال کرتا۔ یہ اجلاس ہفتے میں چار دن دیوان عام (ارض آدمی) میں منعقد ہوتا تھا، جس میں وزیر، قاضی عساکر اور دفتر دار شریک ہوتے تھے، اور اس میں سلطان پس پردہ موجود ہوتا تھا (قانون نامہ، ص ۱۲، ۲۳)۔ پہلے زمانے میں وزراء کے ساتھ کھانا کھانا سلاطین کا دستور تھا، لیکن محمد نے اسے منسوخ کر دیا تھا (کتاب مذکور، ص ۲۷)۔

دسویں صدی ہجری/سولہویں صدی عیسوی کے دوران میں دیوان کی رکیت کسی قدر بڑھا دی گئی۔ ۵۳۶/۵۳۶ء کی ایک دستاویز میں، جسے برلینوں نے نقل کیا ہے (منشآت السلاطین، طبع دوم، ۱ : ۵۹۵) روم ایلی کے یلار نے کو دیوان میں شرکت کا اختیار دیا گیا ہے، لیکن آناتولی کے یلار نے کو خارج رکھا گیا ہے۔ بعد ازاں بحری، معاملات کی روزافزون اہمیت کی بنا پر اس میں قیودان پاشا کا اضافہ کر دیا گیا۔ یمنی چریوں کا آغا صرف اس صورت میں رکن ہوتا تھا جب کہ اسے وزیر کا مرتبہ حاصل ہو۔ دیوان کے اصل ارکان کے علاوہ متعدد دیگر عہدے دار اس میں شرکت کرتے تھے، گو مجلس کے ایوان میں ان کے لیے کوئی نشست نہ ہوتی تھی اور

اقوال نیز پٹری اور دیگر قدیم واقعہ نگاروں کے مماثل بیانات سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ نویں صدی ہجری/پندرہویں صدی عیسوی کے اوائل تک ان پاشاؤں کی مجلس کی صدارت کرنا سلطان کا باقاعدہ معمول بن چکا تھا اور سلطان کی وفات اور اس کے جانشین کی آمد کے درمیانی عرصے میں پاشا اپنی مرضی سے مستثنیٰ طور پر دیوان منعقد کر سکتے تھے۔ محمد ثانی پہلا سلطان نظر آتا ہے جس نے دیوان کے اجلاس کی صدارت کرنے کی رسم ترک کر کے یہ کام وزیراعظم کے سپرد کیا۔ ایک حکایت کی رو سے، جسے مابعد کے مؤرخین نے نقل کیا ہے، اس کا سبب یہ تھا ایک دن ایک کسان شکایت لے کر دیوان میں آیا اور معززین کے مجمع سے کہا: "تم میں سے کون سلطان ہے؟ مجھے شکایت پیش کرنی ہے"۔ سلطان کو (یہ مخاطب) ناگوار گزرا، اور وزیراعظم کدک احمد پاشا نے اسے مشورہ دیا کہ وہ دیوان میں جاوہ افروز نہ ہوا کریں تاکہ اس قسم کی بے لطفی کی نوبت نہ آئے۔ اس کے بجائے وہ ان کارروائیوں کو پردے کے پیچھے سے دیکھ سکتے ہیں (سولق زادہ: تاریخ، ص ۲۶۸ : ۲) مصطفیٰ نوری پاشا: نتائج الوقعات، طبع دوم، ج ۱، استانبول ۱۳۲۷ھ : ص ۵۹ : (۲) عبدالرحمن شرف : توپ قبو سراے ہمایون، در TOEM، ۶/۱، ۱۹۱۱ء، ص ۳۵۱)۔ اس حکایت کی حقیقت جو کچھ ہو، محمد ثانی کے قانون سے سلطان کے کنارہ کش ہونے کی تصدیق ہوتی ہے، جس میں واضح طور پر لکھا ہے کہ سلطان پردے کے پیچھے بیٹھتا ہے (جناب شری غم پس پردہ آئوپ (قانون نامہ، ص ۲۳)۔ یہ طریق عمل سلیمان قانونی کے عہد تک جاری رہا، جس نے اس شکل میں بھی دیوان کے اجلاس میں جانا بند کر دیا (قچوبے : رسالہ باب ۲، طبع A.K. Aksül، استانبول ۱۹۳۹ء، ص ۲۰ تا ۲۳؛ جرمن ترجمہ از W.F.A. Behrman، در ZDMG، ج ۱۵، (۱۸۶۱ء)، ص ۲۷۵، بعداً قلم

وہ تمام امور کی روداد، جن کا تصفیہ وہ کر چکا ہے، مجملہ بادشاہ کے گوش گزار کرے (طبع Greaves، ۱۷۴۷ء، ص ۶۱۹)۔ دیوان کے باقاعدہ اجلاس کے علاوہ بعض خاص دیوان منعقد ہوتے تھے، جو یہ تھے: (۱) عارف دیوانی یا غائبہ دیوانی، جو بی بی چریوں کو دیگر "غلامان درگاہ" (دیکھیے قیوقلو) کو تنخواہ اور سامان رسد تقسیم کرنے کے لیے، نیز بیرونی ممالک کے سفیروں کے خیر مقدم کے لیے منعقد ہوتے تھے: (۲) ایک دیوانی — پیادہ دیوان — ایک غیر معمولی ہنگامی اجلاس، جس کی صدارت سلطان یا فوج کا سپہ سالار کرتا تھا۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ تمام حاضرین کھڑے رہتے تھے (ان دونوں کے لیے دیکھیے I. H. Uzunçarşili: 'Osmanlı devleti teşkilâtından kapukulu nezaret' ج ۱، انقرہ ۱۹۴۳ء، ہمد اشاریہ: اور وہی مصنف: 'Osmanlı devletinin saray teşkilâtı' انقرہ ۱۹۴۵ء، ص ۲۲۵ تا ۲۲۹)۔

اجلاس کا مقام: دیوان کی عمارت، جسے عام طور پر دیوان خانہ کہتے تھے، توپ قبو محل کے دوسرے صحن میں وسطی دروازے (آرتقپو) اور "باب السعادت" کے درمیان واقع تھی۔ موجودہ عمارت سلیمان قانونی کے عہد حکومت میں وزیر اعظم ابراہیم پاشا کے حکم سے تعمیر ہوئی تھی اور اس کی مرمت ۱۷۹۲ء اور ۱۸۱۹ء میں کی گئی تھی۔ ازمنہ سابقہ میں یہ اجلاس ایک اور عمارت میں ہوتا تھا، جس کا ذکر بعد میں "دیوان خانہ قدیم" کے نام سے کرتے تھے، مجلس کے دیوان کو "قبۃ آلتی" (گنبد کے نیچے) کہتے تھے اور وہ وزراء، جو دیوان میں شرکت کے مجاز تھے انہیں "وزرائے قبۃ" کہتے تھے (مزید دیکھیے وزیر)۔ ایوان مجلس سے کچھ بلندی پر ایک احاطہ تھا جس کے ارد گرد پردے لگے ہوتے تھے، جسے قصر عادل یا قفس کہتے تھے اور جہاں سے سلطان مجلس کی کارروائیوں کو دیکھ سکتا تھا۔ یہ احاطہ براہ راست

وہ بحث مباحثے میں حصہ نہیں لیتے تھے۔ ان میں کاتب اعلیٰ (رئیس الکتاب [رک بان]) یعنی صدر وزارت، دیوان وزارت کا سربراہ، چاؤش باشی اور دربانوں کا داروغہ تھا، جو سب وزیر اعظم اور سلطان کے درمیان رابطہ قائم رکھتے تھے: مالیات کے معتمدین (دیکھیے محاسبہ)، دیوان کے ترجمان (دیکھیے ترجمان)، پولیس کے حکام (دیکھیے شرطہ) اور محلات اور انتظامیہ کے دیگر متعدد عمال، جنہیں دیوان کے فیصلوں پر عمل درآمد کرنے کے لیے بلایا جاتا تھا، اپنے معاونوں، مشیروں اور ناصدوں کے ساتھ موجود ہوتے تھے۔

دسویں صدی ہجری / سولہویں صدی عیسوی کے دوران میں دیوان کا اجلاس ہفتے میں چار دن باقاعدگی سے ہوتا تھا، یعنی ہفتے، اتوار، پیر اور منگل کو۔ اس کی کارروائی طلوع آفتاب کے ساتھ شروع ہو جاتی، اور اس کا تعلق تمام سرکاری امور سے ہوتا تھا۔ صبح کا وقت عام طور پر عام اجلاس کے لیے وقف ہوتا تھا اور خاص طور پر عرضیوں اور شکایات کی سماعت کے لیے، جن کا فیصلہ دیوان کا متعلقہ رکن یا خود وزیر اعظم کرتا تھا۔ دوپہر کے قریب ذخیر التعداد عرضی گزار اور دیگر بیرونی زائرین چلے جاتے تھے اور پھر دیوان کے ارکان کے لیے کھانا چنا جاتا تھا، اس کے بعد وہ باقی ماندہ امور پر گفتگو کرنے لگتے تھے۔ Withers (بعد از Bon) اس بات کی صراحت کرتا ہے کہ مجلس محض مشاورتی تھی اور آخری ذمے داری وزیر اعظم ہی کی ہوتی تھی: "جب شام کا دھانا ختم ہو جاتا تو وزیر اعظم عام امور کے لیے تھوڑا سا وقت صرف کرتا اور (اگر وہ چاہتا اور اسے مناسب سمجھتا تو) دیگر پاشاؤں سے مشورہ کر لیتا: آخر کار وہ اپنے دل میں تمام امور کے متعلق فیصلہ کر کے بادشاہ کی خدمت میں جانے کے لیے تیار ہو جاتا (دیوان کے چار دنوں میں سے دو دن یعنی اتوار اور منگل کو ایسا کرنے کا عام دستور تھا) تاکہ

کے سرمائے سے ادا ہوتی تھیں۔ ان میں مذہبی، دیوانی اور فوجی اسامیاں شامل تھیں۔

ان تین بڑے دفتروں کے علاوہ دو اور شاخیں بھی تھیں، جن کے سربراہ قشریات جی آرگ بان اور واقع نویس آرگ بان ہوتے تھے اور علی الترتیب تقریبات سے مشغلی اور تاریخی مشلوں سے تعلق رکھتے تھے۔ آگے چل کر ان میں ”آمدی“ یا آمد جی“ [آرگ بان] کے دفتر کا اضافہ ہو گیا، جو ”رئیس الکتاب“ کے ذاتی عملے کا سربراہ ہوتا تھا۔ اس کا تعلق بیرونی حکومتوں کے ساتھ تعلقات قائم کرنے اور سرکاری محکموں اور محل کے درمیان رابطہ قائم رکھنے سے تھا۔

ان دفتروں کے عملے کے بعض ملازمین کو تنخواہیں ملتی تھیں اور بقیہ کو، جو کمتر درجے کے ہوتے تھے، ”انیمار اور زعامت“ دیے جاتے تھے۔ مؤخر الذکر کو ترقی دے کر تنخواہ دار ملازمتوں پر مقرر کیا جا سکتا تھا۔ اہم تر مستقل ملازم ”خواجگان“ [آرگ بان] کا درجہ رکھتے تھے۔ ان کے ماتحتوں کو ”خلیفہ“ کہتے تھے۔

دیوان ہمایوں کا زوال : محل کے متاثرین میں وزارت عظمیٰ کی روز افزوں اہمیت کے باعث ”اکبندی دیوانی“ کی رسم پڑی، یعنی ایک ایسے اجلاس کی جو عصر (اکبندی) کی نماز کے بعد وزیراعظم کے مکان پر منعقد ہوتا تھا، تاکہ ان امور کو سرانجام دیا جائے جو دیوان ہمایوں میں نا کمل رہ جاتے تھے۔ یہ مجلس ہفتے میں پانچ دفعہ اجلاس کرنے لگی اور اس نے بتدریج دیوان ہمایوں کے اصلی کام کا ایک بہت بڑا حصہ سنبھال لیا۔ معاملات کے نظم و ضبط اور انجام دہی کا محل سے وزارت عظمیٰ کی طرف انتقال رسمی طور پر ۱۵۵۸ء/ ۱۵۶۷ء میں ہوا، جب سلطان محمد چہارم نے وزراءعظم درویش محمد پاشا کو ایک عمارت عنایت کی، جو اقامت گاہ اور دفتر دونوں کا کام دیتی تھی (دیکھئے باب عالی اور پاشا قیسو)۔ انتظامیہ کے بہت سے محکمے،

حرم سرا کی عمارات سے ملحق تھا۔ دیوان خانے سے ملحقہ کئی وزرا کے دفتر اور مکان تھے، نیز وزیراعظم کا دفتر تھا، جسے ”دوت“ (دوات) ”آدسی“ کہتے تھے (قب ”دوادار“)۔ (ان عمارات کے لیے دیکھئے عبدالرحمن شرف : قوپ قیو۔ سراے ہمایوں، در TOEM، ۱/۱، ۱۹۱۱ء : ۳۲۹ تا ۳۶۳، خصوصاً ص ۳۵۰ بعد)۔

انتظامیہ : مرکزی انتظامیہ کے اہم شعبے، جو دیوان ہمایوں کے تحت کام کرتے تھے، مندرجہ ذیل تھے : (۱) ”دیوان قلمی“، جسے ”پلک“ یا ”پلکچی قلمی“ بھی کہتے تھے، مرکزی دفتر وزارت، جس کا سربراہ پلکچی، رئیس الکتاب کے ماتحت وزارت کا بڑا عہدے دار۔ یہ دفتر تمام فرامین، قواعد و ضوابط (”قانون“) اور ان فیصلوں اور احکام کا جو مالیات سے تعلق نہیں رکھتے تھے، مسودہ تیار کرتے، ان کا اجرا کرنے اور نقول کی مثلیں تیار کرنے کا ذمے دار تھا۔ معاہدے، غیر ملکوں کے لیے امتیازات خصوصی، مراعات اور سفیروں کے تقرر کی منظوریوں، جو بیرونی حکومتوں کو بھیجی جاتی تھیں، کچھ عرصے تک اسی شعبے کا کام رہا۔

وزارت کے علاوہ دو محکمے اور بھی جن کا تعلق (دفتر کے) عملے سے تھا، یعنی :

(۲) ”تحویل قلمی“، جسے اشان یا کسہ قلمی بھی کہتے تھے، یہ وزیر، بشارے، سنجی بیگی اور مولاء، یعنی قاضی ولایت کے عہدوں کے تفرقات کے احکام جاری کرتا اور ان کی مثلیں محفوظ رکھتا تھا، تیسار داروں اور زعامتوں [آرگ بان] کے تقرر اور تبادلے کی مثلیں اور احکام کا اجرا بھی اسی دفتر سے ہوتا تھا (مزید دیکھئے تحویل)۔

(۳) ”رؤس قلمی“، جس کا تعلق ان تمام عہدوں اور اسامیوں پر تقررات سے تھا جو تحویل قلمی کے تحت نہیں آتے تھے، جن کی تنخواہیں خزانے یا اوقاف

جو پہلے دیوان ہمایوں کے ماتحت تھے، رفتہ رفتہ اس نئے ادارے میں منتقل ہو گئے۔ اٹھارھویں صدی عیسوی تک دیوان ہمایوں کی اہمیت کم ہوتے ہوئے بالکل ختم ہو گئی۔ مصلح سلاطین سلیم سوم اور محمد دوم کے تحت دیوان کی ایک نئی شکل ظہور پذیر ہوئی: انہوں نے اصلاحات کے منصوبے بنانے اور اصلاحی احکام کے نفاذ کے لیے خاص مجلسیں قائم کیں (دیکھیے تنظیمات)۔ انہوں نے رفتہ رفتہ وزارتی طرز حکومت کی شکل اختیار کر لی۔

مآخذ : (۱) دیوان ہمایوں کے آئین اور اس کی کلرگداری کے متعلق عثمانی سرکاری مآخذ سے حاصل شدہ ایک قدیم روداد، محمد دوم کے قانون میں ملے گی، جس کا عثمانی حکومت کے دفاتر اور تنظیم سے ہے (قانون نامه آل عثمان، طبع محمد عارف، TOEM، تکملہ، ۱۳۳۳ھ، ص ۱۲، بعد ۳۳ بعد - موجودہ نقل میں اصلاحی کی کئی ہیں جو بايزيد الثاني کے عہد حکومت سے ملتی (کہوتی ہیں)؛ (۲) اس بیان میں ان معلومات سے اضافہ ہو سکتا ہے جو عثمانی وقائع میں ہیں (خاص طور پر ادریس بدیس [رک بان] کی اشت بہشت، جو محمد ثانی کے عہد حکومت کی ہے)؛ (۳) نیز یوروں سے اخذ ہونے والا [Donado da Leezzel] G. M. Angiolello : *Historia turchesca*، طبع I. Uisu، بخارست ۱۹۰۹ء، ص ۱۳۰ (۴) اس ادارے کی ترقی مابعد کا سراغ "قوائین" متاخر میں لکنا چاہیے (مثلاً ۱۸۷۸ء اور ۱۸۷۹ء کا قانون شائع شدہ، در *ATM* ۱۲/۱۰۴۳۱ : ۵۰۶ : ۵۰۷)؛ (۵) اور متاخر یوروں تذکروں (مثلاً ایک جامع تذکرہ، جسے وینس کے Baito Ottaviano Bon نے ۱۸۰۸ء میں لکھا : *Il Serraglio del gran Signore*، طبع N. Barozzi اور *Relazioni degli stati europei lette* : G. Berchet (۶) *al Senato...*، ج ۱، وینس ۱۸۶۶ء - (اس کا انگریزی ترجمہ از Robert Withers : *Grand Seigneur's Seraglio, Purchas' Pilgrims*، لٹن ۱۸۳۵ء، طبع مکرر کلاسکو ۱۹۰۵ء : ۹

Miscellaneous : John Greaves : نیز در *Tracts...*، ج ۲، لٹن، ۱۶۹۵ء اور بعد کی طباعت مکرر)؛ (۷) *History of the present state of the Ottoman Empire*، طبع جہازم، لٹن، ۱۶۷۵ء، کتاب ۱، باب ۹ : ص ۷۷ بعد : (۸) دسویں صدی عیسوی - سولہویں صدی عیسوی کے وسط کے قریب سے دیوان ہمایوں اور انتظامیہ کے مختلف محکموں اور ملازمتوں کی، جو اس کے اختیار میں تھے، ترقی اور بجا آوری قوانین کو ان مثالوں میں تفصیل کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے جو عثمانی دفتر خانوں میں محفوظ ہیں - ایک جماعت بندی اور تفصیل اس میں ملے گی، مذمت سر تقی : *Mudteran hakimindan basyekulet* : *inpiri*، انقرہ ۱۹۵۵ء، ص ۱۳ تا ۱۴ (نیز دیکھیے *Basyekulet Aisivi*)؛ (۹) دیوان ہمایوں اور اسی انتظامیہ کی کامل ترین روداد : I. H. Uzunçarsili : *Osmanlı devletinin merkez ve bahriye teşkilâtı*، انقرہ ۱۹۳۸ء، ص ۱ تا ۱۱۰، میں ہے - مختصر رودادیں ان میں ملیں گی : *Tableau général de l'empire* : D'Ohsson (۱۰) *othroman*، ۱۷ ژیرس ۱۸۲۳ : ۲۱۱ تا ۲۳۲ : (۱۱) *Staatsverfassung* : Hammer-Purgstall، ص ۱۱۲ تا ۱۳۶ : (۱۲) وہی مصنف : *GOR*، بعد اشاریہ : (۱۳) *The government of the Ottoman* : A. H. Lybyer، *Empire in the time of Suleiman the Magnificent*، کیپیج، خطوطہ ۱۹۱۳ء، ص ۱۸۷ تا ۱۹۳ : (۱۴) *Geschichte des osmanischen Reiches* : Zinkeisen، ۳ کوٹھہ، ۱۸۵۵ : ۱۱۷ تا ۱۲۵ : (۱۵) *Gilb-Howen*، ۱/۱ : ۱۱۵ : بعد و بعد اشاریہ : (۱۶) *Pakalin*، ۱ : ۱۶۶ تا ۱۶۷، بشمول اقتباس از غیر مطبوعہ قوانین، تشریفات، مؤلفہ نائلی عبداللہ پاشا (م ۱۱۷۱ھ) *Resimli Osmanlı* : Sertoglu، (۱۷) *carili ansiklopedisi*، استانبول ۱۹۵۸ء، ص ۷۸ تا ۸۱ - قدیم عثمانی اور سلجوق پس منظر کے لیے دیکھیے : (۱۸) *Osmanlı devleti teşkilâtina* : I. H. Uzunçarsili

اور ہوائی مستقر شہر اور ضلع کے مواصلات انجام دے رہے ہیں۔ دیوانیہ ایک اہم فوجی مستقر ہے۔

دیوانیہ کی تاریخ اپنے موجودہ نام کے تحت صرف ۱۸۵۵ء/۱۲۷۱ء سے شروع ہوتی ہے جب خزاغل شیوخ کے محاصل کے دفتر اور دیوان خانے کے لیے اس کی تشکیل ہستی کے طور پر کی گئی۔ چند ہی اسے ترکی حکومت نے "قضا" کا صدر مقام بنا دیا اور تاجروں، سرکاری عہدے داروں اور محافظ فوج اور پولیس نے جٹائی کے مکانوں اور مٹی کی جھونپڑیوں میں اضافہ کیا اور جدید فصیے کا آغاز کیا۔

پھر بھی محل وقوع کے لحاظ سے اور وسطی فرات کے قبائلی، انتظامی اور اہم فوجی مستقر کے طور پر یہ قبضہ (فرون وسطی کے بعد) کے جسکے کے ساتھ تسلسل رکھتا دکھائی دیتا ہے۔ جب ۱۸۸۰ء/۱۲۹۸ء سے دریائے فرات انہی مشرق (جگہ) شاخ کو ہندیہ شاخ کے حق میں ترک کرنے لگا تو جسکے اور اس ضلع کا نظام درہم برہم ہو گیا، اور قبائلی اور کاشتکار اس کے بہت سے حصے کو چھوڑ کر چلے گئے، لیکن ۱۸۳۰ء/۱۹۱۲ء میں ہندیہ بند ہونے سے حالات بھر معمول پر آ گئے۔

مآخذ: (۱) *Four centuries* : S.H. Longrigg

of modern Iraq (۲) اوکسفورڈ ۱۹۲۵ء

1900 to 1950، اوکسفورڈ ۱۹۵۳ء (۳) عبدالرزاق الحسینی:

العراق قديمًا و حديثًا، بیروت ۱۹۶۷ء۔

(S. H. LONGRIGG)

دیونا بند : اثر بردیش کے ضلع سہارن پور میں ایک بڑا ہی پرانا شہر ہے۔ لیکن اس کی قدیم تاریخ اساطیری اور رومانوی انسانوں میں چھپی ہوئی ہے۔ یہاں درختوں کے ایک جھنڈ کے درمیان گھرا ہوا دسی دیوی کا ایک مندر ہے، جس کے پیش نظر خیال بنا جاتا ہے کہ دیونند کو دیوی بن (دیوی کا جنگل) کی بکری ہوئی شکل تصور کرنا چاہیے۔ دیونند کا ذکر

medha: استانبول ۱۹۶۱ء، ص ۳۲ تا ۳۷، ۹۵ تا ۹۸

(۱۹) *Lebrannie sočineuiya* : V. A. Gordlevsky

۱۹۶۰ء : ۱۶۶ تا ۱۷۷ : (۲۰) مصطفیٰ

آنگنغ : *Türkiye'nin İktisadi ve İctimadi Tarih*

۱۲۸۳ تا ۱۳۵۲، انقرہ ۱۹۵۹ء، ص ۲۱۷ تا ۲۲۳

۳۳۳ تا ۳۳۴

(B. LEWIS)

* دیوانی : رگ بہ خط

* دیوانیہ : وسطی عراق کا ایک قصبہ دریائے

فرات کی شاخ جگہ پر (۸۰ درجے ۵۵ ثانیے مشرق،

۳۲ درجے شمال کو) جگہ اور سماوہ کے درمیان واقع

ہے۔ اس کی آبادی کوئی بارہ ہزار ہے، جو تقریباً تمام

شیعی عرب ہیں؛ یہ ایک "لواء" کا صدر مقام ہے

(۱۹۵۷ء کی "ابتدائی مردم شماری" کی رو سے کن

آبادی سماوہ نئی، شادیہ، ابو صخیر اور خود دیوانیہ

کے تابع تضایا سمیت ۵۰۸۰۰ ہے)۔ اس "لواء" میں

جو قبائل شامل ہیں وہ وسطی فرات کے سب سے

کثیر التعداد اور سب سے کم اطاعت گزار قبائل میں

سے ہیں؛ ترکی عہد تھا یا برطانوی قبضے کا دور

(خصوصاً ۱۳۳۶ - ۱۳۳۹/۱۹۱۹ - ۱۹۲۰ء) یا

عراق حکومت کی عملداری (خصوصاً ۱۳۵۸ - ۱۳۵۷/

۱۹۳۵ - ۱۹۳۸ء) انہوں نے گروہ بندی اور قانون

شکنی کے ذریعے، جس کے لیے نعرہ دہری مہموں کی

ضرورت پڑی، حکومت کو بار بار پریشان کیا۔ ان میں

نصف کے علما کا اثر و رسوخ بہت قوی ہے۔ یہ قصبہ،

جو زیادہ تر بائیں کنارے پر آباد ہوا تھا، اور جس

میں صرف چھوٹے چھوٹے کھجوروں کے باغات تھے،

اب دائیں جانب بدل رہا ہے اور حالیہ سین میں

پہلے سے بہتر دیوار، بازاروں اور سرکاری عمارتوں

کو بنا کر اسے جدید طرز کا ڈر دیا گیا ہے۔ قدیم

کشتیوں کے پلوں کی جگہ اب فولاد کے ایک نئے پل

نے لے لی ہے اور اب یہی حاصی سڑکیں، عراق ریلوے

مولانا حسین احمد مدنی: سفرنامہ اسیر مائٹا، دیوبند بدون تاریخ (شریک موسیٰ کے پہلے شاگرد اور بیٹے شیخ الہند محمود الحسن کے کردار اور سیاسی سرگرمیوں پر)؛ (۱۱) محبوب رضوی: دارالعلوم دیوبند کی تعلیمی خصوصیات، دیوبند بدون تاریخ؛ (۱۲) وہی مصنف: دارالعلوم دیوبند ایک نظر میں، دیوبند بدون تاریخ؛ (۱۳) *India as I knew it, 1855-1905: M. O'Dwyer* لندن ۱۹۲۵ء، ص ۱۷۸ تا ۱۸۱، ۱۸۹؛ (۱۴) مناظر احسن کیلانی: سوانح قاسمی، دیوبند بدون تاریخ.

(خورشید احمد نظامی)

دیوبندی: (نیز دیوبند، دیوبند، دیوبند، دیوبند)

زبدۃ المقامات، ص ۳۸۴: آئین اکبری، ص ۱۳۲؛
الہدیۃ السنیۃ، ص ۱۰: تاریخ دیوبند، ص ۲۱؛ اترپردیش (بھارت) کے ایک مشہور اور تقریباً دو ہزار سال قدیم قصبے دیوبند [رک بان] سے نسبت رکھنے والا؛ عرف عام میں اور اکثر و بیشتر اس تاریخی قصبے میں واقع اسلامی دارالعلوم کے فارغ التحصیل علما اور ان کے تلامذہ دیوبندی کہلاتے ہیں (تذکرۃ مشائخ دیوبند، ص ۳۵: مقدمۃ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند، ص ۳؛ علمائے حق کے مجاہدانہ کارنامے، ص ۶۲، علمائے ہند کا شاندار ماضی، ص ۵۵: انوار قاسمی، ۱: ۳۷)۔
اس دارالعلوم کی بنیاد ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۷ء کو دیوبند کی ایک قدیم مسجد چھٹا میں مشہور عالم دین مولانا محمد قاسم نانوتوی (۱۲۳۸ھ/۱۸۲۲ء تا ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء) نے چند اہل فضل و تقویٰ بزرگوں کے تعاون اور مشورے سے رکھی تھی، جن میں سے مولانا فضل الرحمن عثمانی (جو شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی کے والد تھے)، مولانا ذوالفقار علی دیوبندی اور حاجی عابد حسین کے نام قابل ذکر ہیں؛ اس درسگاہ کے سب سے پہلے مدرس ملا محمود دیوبندی اور سب سے پہلے طالب علم مولانا محمود الحسن (جو بعد

سب سے پہلے آئین اکبری میں ملتا ہے، جس میں ابوالفضل دیوبند میں بنی ہوئی پختہ اینٹوں کے ایک قلعے کا ذکر کرتا ہے۔ بہر کیف دیوبند میں زمانہ ماضی کی یادگاریں موجود ہیں۔ چھٹا مسجد کو دیوبند کی قدیم ترین یادگار خیال کیا جاتا ہے، جس کا تعلق پٹھان عہد کے ابتدائی ایام سے ہے۔ روایت ہے کہ شیخ علاؤالدین المعروف بہ شاہ جنگل بلش، جو وہاں دفن ہیں، ابن الجوزی [رک بان] کے شاگرد اور شیخ شہاب الدین سہروردی کے مرید تھے۔ سکندر لودھی (۸۹۴ھ/۱۴۸۹ء تا ۹۲۳ھ/۱۵۱۷ء)، اکبر (۹۶۳ھ/۱۵۵۶ء تا ۱۰۱۳ھ/۱۶۰۵ء) اور اورنگ زیب (۱۰۶۸ھ/۱۶۵۸ء تا ۱۱۱۸ھ/۱۷۰۷ء) کے عہد میں تعمیر شدہ بعض مساجد اور عمارتیں، ابھی تک موجود ہیں۔

آج کل دیوبند اسلامی علوم و معارف کی اس عظیم درس گاہ ("دارالعلوم") کے باعث مشہور ہے جو مولانا محمد قاسم نانوتوی اور حاجی محمد عابد حسین نے محکمۂ تعلیم کے تین بڑے فضلاء کی امداد و اعانت سے قائم کی اور جس کے پہلے سرپرست مولانا نانوتوی (۱۲۸۲ھ/۱۸۶۷ء میں منقرض ہوئے تھے)۔ [مزید تفصیلات کے لیے رک بہ دیوبندی]۔

مآخذ: (۱) *District Gazetteers of the United*

Provinces، ج ۲ (لکھنؤ ۱۹۲۱ء)، ص ۲۲۴ تا ۲۳۵؛ (۲)

سید محبوب رضوی: تاریخ دیوبند، (۳) مولانا

محمد لطیف: حالات دارالعلوم دیوبند (دیوبند ۱۳۷۸ھ)؛

(۴) ک۔ م۔ د۔ موقی: المنہاج، (لاہور ۱۹۴۱ء)؛ (۵)

محمد سیان: علمائے حق، حصہ اول (مراد آباد ۱۹۳۹ء)،

ص ۹۴ بعد؛ (۶) شیخ محمد اکرام: موج کوثر، لاہور

بدون تاریخ؛ (۷) ابتداء صابری: فرنگیوں کا جال، دہلی

۱۹۴۹ء، ص ۷۷ تا ۱۸۹؛ (۸) W. Cantwell Smith

Modern Islam in India، لندن ۱۹۴۶ء، ص ۲۹۴

تا ۲۹۷؛ (۹) محمد یعقوب نانوتوی: سوانح عمری

محمد قاسم، دیوبند بدون تاریخ، ص ۱۴ تا ۱۵؛ (۱۰)

کہیں، جن کا مقصد یہ تھا کہ حکومت وقت اور امرا و اغنیاء کے تداخل سے درسگاہ آزاد رہے۔ "یہی وجہ ہے کہ حکومت برطانیہ اور برہمنی حکومت کی خواہش کے باوجود دارالعلوم نے کسی سے آج تک گرانٹ لینا پسند نہیں کی" (انوار قاسمی، ۱: ۳۷۴ تا ۳۷۵)۔

دارالعلوم دیوبند کے نظم و نسق کے سلسلے میں ایک مجلس شوریٰ ہے، جسے سنڈیکیٹ کہنا چاہیے؛ ایک مجلس انتظامیہ ہے؛ ایک مہتمم ہے، جسے رئیس الجامعہ سمجھنا چاہیے؛ شیخ الحدیث یا صدر المدرسین کا عہدہ سب سے ممتاز اہل علم و تقویٰ کو ملتا رہا ہے (تاریخ دیوبند، ص ۲۳، بعد)۔ اس درسگاہ میں علم صرف و اجواء، ادب، علم المعانی، منطق، فلسفہ، فقہ، اصول فقہ، حدیث، تفسیر، علم الفرائض، علم العقائد، علم الکلام، علم الطب، علم المناظرہ، علم ہیئت اور قراءت و تجوید کے علاوہ فارسی زبان و ادب اور ریاضی کی بھی تعلیم دی جاتی ہے۔ آٹھ سال کا نصاب ہے، ابتدا میں اردو اور فارسی کی بقدر ضرورت تدریس ہوتی ہے، لیکن اس درس گاہ میں دورہ حدیث کی بڑی شان ہے، جس میں دور و دراز کے طالب علم مبادیات کی تکمیل کے بعد شریک ہوتے ہیں (انوار قاسمی، ۱: ۳۷۴، تاریخ دیوبند، ص ۱۰۳)۔

[گزشتہ نوے سال میں اس ادارے نے مسلمانوں کے دینی مدارس میں ایک ممتاز مقام حاصل کر لیا ہے۔ دارالعلوم میں ان تین مختلف النوع دینی اداروں کی خصوصیات جمع ہیں جو تیرہویں صدی ہجری/انیسویں صدی عیسوی کے دوران میں دہلی، لکھنؤ اور خیر آباد میں موجود تھیں۔ دہلی کے ادارے تفسیر اور حدیث کی تعلیم پر زور دیتے تھے، لکھنؤ کے فقہ پر اور کراچی دارالعلوم اور خیر آباد [رک باں] علم الکلام اور فلسفہ کے لیے مخصوص تھا۔ دیوبند ان تینوں کے امتزاج کی نمائندگی کر رہا ہے، گو اس کا اصل زور احادیث پر ہے، جنہیں شاہ ولی اللہ اور دہلی کے مکتب مجتہدین

میں شیخ الہند، شہور ہوئے) اور سب سے پہلے صدر المدرسین مولانا محمد یعقوب نانوتوی تھے؛ مولانا محمد قاسم نانوتوی اتفاق رائے سے سب سے پہلے سرپرست مقرر ہوئے۔ پہلے سال ہی کے اختتام پر اس درسگاہ کی شہرت دور دور تک پھیل گئی اور طلبہ کی تعداد اٹھارہ تک پہنچ گئی، جن میں بنارس، پنجاب اور افغانستان کے اٹھاون طلبہ بھی شامل تھے (انوار قاسمی، ۱: ۳۷۳؛ سوانح قاسمی، ۲: ۷۰، بعد؛ تاریخ دیوبند، ص ۷۵)۔ آگے چل کر یہ معمولی مدرسہ ایک عظیم درسگاہ بن گئی اور مسجد چھتا سے اپنی موجودہ نئی عمارت میں منتقل ہو گئی، جس کا سنگ بنیاد مولانا احمد علی محدث سہارنپوری نے اپنے ہاتھ سے ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء میں رکھا (تاریخ دیوبند، ص ۸۲ تا ۸۳)۔ اس درسگاہ کے بانی اور پہلے سرپرست مولانا محمد قاسم نانوتوی بڑے متقی اور متوکل علی اللہ مشہور تھے۔ یہی باتیں آگے چل کر دارالعلوم دیوبند کی ایک مستقل روایت اور دیوبندی علمائے کی خصوصیت بن گئیں۔

سلطنت مغلیہ کے خاتمے اور ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی ناکامی کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کی دینی اور علمی ضروریات کے پیش نظر یہ درسگاہ قائم کی گئی تھی۔ اس کے بانیوں کے پیش نظر اہم مقاصد یہ تھے: (۱) آزادی ضمیر اور اعلائے کلمۃ الحق؛ (۲) مسلمانوں کو ایک جمہوری عوامی تنظیم میں پروانے کی جدوجہد کرنا؛ (۳) حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کی حفاظت و اشاعت؛ (۴) مسلمان معاشرے سے خود غرضی اور استبداد کا خاتمہ؛ (۵) علوم دینی کا احیاء؛ (۶) علوم عقلیہ کی صحیح قرینیت؛ (۷) دین میں مہارت کے ساتھ ساتھ دنیاوی علوم کے تقاضے پورے کر دینے والے علما تیار کرنا (سوانح قاسمی، ۲: ۷۰، ۷۱؛ انوار قاسمی، ۱: ۳۷۳، بعد)۔ درسگاہ کی مالی ضروریات کے سلسلے میں بھی مولانا نانوتوی نے آٹھ اصول مقرر

کے نزدیک درجہ استاد حاصل ہے۔ دیوبند میں بلاد اسلامیہ کے مختلف حصوں سے بھی طلبہ آتے رہتے ہیں۔ اس میں تقریباً پندرہ سو طلبہ کے قیام کا بندوبست ہے۔ ”دارالعلوم“ کی عمارت ایک مسجد، ایک کتاب خانہ، اور حدیث، تفسیر اور فقہ وغیرہ کے متعدد درسی کمروں پر مشتمل ہے۔ دیوبند کے کتاب خانے کا شمار ہندوستان میں مخطوطات کے بڑے بڑے کتاب خانوں میں ہوتا ہے، تاہم اس کی فہرست کتب موجود نہیں۔ اس میں تقریباً ستر ہزار عربی، فارسی اور اردو کتابیں موجود ہیں، جو مطبوعہ بھی ہیں اور قلمی بھی۔ تعلیم کا طریقہ روایتی ہے۔ اس کا زور زیادہ تر اس بات پر ہے کہ دین دار شخصیتیں پیدا کی جائیں، اس پر نہیں کہ جدید علوم سے بہرہ ور ہو کر عہد حاضر کے تقاضے پورے کر سکیں۔ لہذا اس ادارے نے زیادہ تر دینی رہنما پیدا کیے ہیں، گو سیاسی میدان میں بھی اس کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

دارالعلوم کے بڑے بڑے عہدے دار بہ ہیں : سرپرست، مہتمم (میکرٹری)، صدر مدرس (ورنسیل) اور مفتی۔ مولانا رشید احمد گنگوہی^۱، مولانا محمد یعقوب^۲، مولانا اشرف علی^۳، شیخ الہند محمود الحسن^۴، مولانا انور شاہ کشمیری^۵ اور سید حسین احمد مدنی^۶ ایسی نامور ہستیاں ان عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ موجودہ (۱۹۷۲ء میں) مہتمم مولانا محمد طیب بانی مدرسہ کے پوتے ہیں۔ جمعیت علمائے ہند، جو ہندوستانی علماء کی ایک بہت بڑی اور بارسوخ تنظیم ہے، اپنی نظریاتی قوت دارالعلوم ہی سے حاصل کرتی ہے (ازلا، لائنڈ، بار دوم، مقالہ دیوبند)۔

دیوبندی علمائے کرام کا مسلک شاہ ولی اللہی مسلک ہے۔ مولانا محمد قاسم انوٹوی تین واسطوں سے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے شاگرد تھے۔ یہ حضرات قسمی مذاہب میں سے امام ابو حنیفہ

کے متقلد ہیں (انوار قاسمی، ۱ : ۳۸۵) اور تقلید کو بھی بالعموم ضروری سمجھتے ہیں۔ قرآن و سنت پر سختی سے عمل پیرا ہونے کے علاوہ ان کا تصوف سے بھی گہرا تعلق ہے۔ [رد بدعت میں یہ بھی پیش ہیں البتہ غلو سے پرہیز کرتے ہیں]۔ اکثر علمائے دیوبند روحانی مساک کے (حفاظ سے حاجی امداد اللہ کے حافظہ ارادت میں شامل ہیں جو تصوف کے چاروں سلسلوں یعنی نقشبندی، چشتی، قادری اور سہروردی سے مسلک تھے؛ تاہم تصوف کو دنیا داری سے قطعاً دور رکھنا ضروری ہے (حوالہ سابق)۔ عقائد و علم الکلام میں امام ابوالحسن اشعری [رک بہ الاشعری] کے مفاد ہیں؛ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت و عظمت پر ایمان رکھتے ہیں؛ کثرت درود کو اعلیٰ ثواب اور صدق نیت اور صحیح روایات کے مطابق ولادت نبوی کے تذکرے کو بھی پسند کرتے ہیں؛ اکابر علمائے دیوبند دین میں غلو اور انتہا بندی کے بجائے راہ اعتدال کے قائل اور عامۃ المسلمین کی تکفیر سے اجتناب و احتیاط لازم سمجھتے ہیں اچنانچہ وہ غالی بریلوی، مسلک اور غالی اہل حدیث مسلک کے بین بین رہتے ہیں (مہند، ص ۱۸، ۳۲؛ الشہاب، ص ۲۰ تا ۲۱؛ انوار قاسمی، ۱ : ۳۸۵ تا ۹۰)۔ علامہ شبیر احمد عثمانی ایک موقع پر لکھتے ہیں : ”ہماری حالت تو یہ ہے کہ نہ ہم غیر مقلدین کو کافر کہتے ہیں، نہ تمام شیعوں کو، نہ سارے بچراؤں کو۔۔۔“ (الشہاب، ص ۲۰ تا ۲۱)۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی نے ایک موقع پر کہا : ”فی زماننا کفار کا شاہ ہے۔ وقت نہیں ہے کہ مسلمانوں میں افتراق کو ہوا دی جائے، جس سے ان کا کلمہ متفرق ہو کر مزید ضعف پیدا ہو، بلکہ توڑنے کے بجائے جوڑنے کی فکر کی جائے“ (سوالج قاسمی، ۱ : ۳۸۰؛ انوار قاسمی، ۱ : ۳۹۱)۔ علمائے دیوبند کے اس مسلک نے انہیں سب کی نظر میں محترم بنا دیا، چنانچہ پیر مہر علی

شاہ گولڑوی نے ایک جگہ فرمایا: ”مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کا زمانہ میں نے نہیں پایا! مولانا خلیل احمد سہارنپوری اور مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی کی زیارت ایک دفعہ کی ہے، مصاحبت کا اتفاق نہیں ہوا! مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی ایک دفعہ زیارت کی ہے اور ایک دفعہ وعظ بھی سنا ہے۔ اس سے زیادہ ان حضرات کے ساتھ مصاحبت کا اتفاق نہیں ہوا، مگر میرا اعتقاد ان بزرگوں کے متعلق یہ ہے کہ یہ سب حضرات علمائے ربانین اور اولیائے امت مجددیہ ہیں۔“ (آخر کو بعض مسائل میں ان سے اختلاف بھی ہے، مگر میرا اعتقاد یہی ہے اور اس اعتقاد کے اختیار کرنے کا سبب ان کی تصنیفات کا مطالعہ اور قبول عام ہے۔۔۔۔) (چراغِ سنت، ص ۲۷۰: انوارِ قاسمی، ۱: ۳۹۱)۔

قیام پاکستان کے بعد دیوبندی علماء کا علمی و روحانی مرکز ہندوستان میں رہ گیا، اس لیے دارالعلوم دیوبند سے قلمی و روحانی وابستگی کے باوجود پاکستان کے مختلف مقامات پر علمی مراکز قائم کیے گئے۔ بھارت میں مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور اور مدرسہ قاسم العلوم مراد آباد علی اور فکری نقطہ نظر سے دارالعلوم دیوبند سے مربوط ہیں! اسی طرح انیسٹھ (ضلع سہارنپور) تھانہ بھون (ضلع مظفر نگر) اور گلاونوی (ضلع اند شہر) میں اس کی ملحہ شاخیں موجود ہیں (انوارِ قاسمی، ۱: ۳۹۱)۔ پاکستان میں مدرسہ اشرفیہ لاہور، جامعہ مدنیہ لاہور، مدرسہ عربیہ خیر المدارس ملتان، دارالعلوم ثلثو اللہ یار خان، دارالعلوم کینٹہ (کراچی)، دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خشک (پشاور) کے علاوہ اٹھارے اور راجشاہی کی درسگاہیں دیوبندی مکتب فکر کی علمی ہادگاروں کو زندہ رکھے ہوئے ہیں (تعمیر پاکستان اور علمائے ربانی، ص ۳۷)۔

دیوبندی مکتب فکر کے اہل علم میں مشہور اور نامور علماء کی ایک جماعت موجود رہی ہے جس نے فارسی زبان کی ابتدائی کتاب کریمہ سے لے کر صحیح بخاری تک اکثر و بیشتر تمام فنون کی کتب متداولہ کی شروح یا حواشی لکھے ہیں۔ ان نامور علماء میں سے بعض کے نام اوپر آچکے ہیں۔ ان کے علاوہ اس سلسلے میں مولانا خلیل احمد سہارنپوری، مولانا عبدالحق حقانی، مولانا عبداللہ سندھی، مفتی کفایت اللہ دہلوی، مولانا احمد علی لاہوری، مولانا

شاہ گولڑوی نے ایک جگہ فرمایا: ”مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کا زمانہ میں نے نہیں پایا! مولانا خلیل احمد سہارنپوری اور مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی کی زیارت ایک دفعہ کی ہے، مصاحبت کا اتفاق نہیں ہوا! مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی ایک دفعہ زیارت کی ہے اور ایک دفعہ وعظ بھی سنا ہے۔ اس سے زیادہ ان حضرات کے ساتھ مصاحبت کا اتفاق نہیں ہوا، مگر میرا اعتقاد ان بزرگوں کے متعلق یہ ہے کہ یہ سب حضرات علمائے ربانین اور اولیائے امت مجددیہ ہیں۔“ (آخر کو بعض مسائل میں ان سے اختلاف بھی ہے، مگر میرا اعتقاد یہی ہے اور اس اعتقاد کے اختیار کرنے کا سبب ان کی تصنیفات کا مطالعہ اور قبول عام ہے۔۔۔۔) (چراغِ سنت، ص ۲۷۰: انوارِ قاسمی، ۱: ۳۹۱)۔

دیوبندی علمائے کرام نے تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، مولانا محمد قاسم نانوتوی کے نزدیک دارالعلوم کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد یہ بھی تھا کہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی ناکامی کے بعد ملت اسلامیہ کو جہاد آزادی اور ہندوستان سے انگریزوں کو نکالنے کے لیے تیار کیا جائے۔ آزادی ہند کے لیے ویشی روال کی تحریک شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی ہی نے منظم کی تھی (انوارِ قاسمی، ۱: ۳۹۷ تا ۳۹۸)۔ تحریک خلافت میں بھی ان علماء نے بڑا حصہ لیا۔ قیام پاکستان سے کچھ قبل اس جماعت کے دو حصے ہو گئے: ایک انگریزوں کی مخالفت کے جوش میں الٹا بڑھ گیا کہ مسلم لیگ کی تائید سے قاصر رہا! اس کے برعکس مولانا اشرف علی تھانوی (۱۳۶۲ھ)، علامہ شبیر احمد عثمانی (۱۳۹۹ھ) اور مفتی محمد شفیع وغیرہ نے مسلم لیگ کے موقف کی تائید کی اور تحریک پاکستان میں بھی حصہ لیا! چنانچہ زیادہ تر انہوں کی وجہ سے برصغیر کی تقسیم سے قبل

تصنیف وہی معلوم ہوتی ہے جو احمد اول کے عہد میں
تیار ہوئی اور جس کا بیان *For Kit Tarih-Cografya*
Yazmalar Kataloglari (۱۸۸۱ء) (مخطوطہ)
Erdal Ef (۲۰۶۸) اور جس کے مخطوطے کی مخطوطہ
Revan (۱۳۲۰) تک دوسری نقل ہے (آب L. Forrer در
Isl. ج ۲۶، عدد ۶۲)۔

(V. L. MENAGE: تلخیص از ادارہ)

دیون عمومیہ : عثمانی حکومت کے قرضے

بالخصوص نظام قرض قائم شدہ ۱۸۸۱ء - حکومت
عثمانی نے ملکی قرضوں کے ذریعے روپہ فراہم کرنے کی
ابتدائی کوششیں اٹھارہویں صدی کے اواخر اور انیسویں
صدی کے اوائل میں کی تھیں (دیکھئے انسہام اور قائمہ)۔
جنگ کریعیا کی ضرورت اور مواقع کے پیش نظر قرض
کی ایک اور نئی قسم پیدا ہوئی، یعنی یورپ کی مالی
مڈلوں سے قرضہ لیا جانے لگا۔ اس قسم کا پہلا قرضہ
۱۸۵۴ء میں لندن سے لیا گیا اور دوسرا اس کے آئندہ
سال میں۔ پہلا قرضہ تیس لاکھ پونڈ کا چھ فی صد فی سال
سوڈ کی شرح پر لیا گیا اور دوسرا پچاس لاکھ پونڈ کا
بشرح جاری صد فی سال۔ ۱۸۵۴ء اور ۱۸۷۳ء کے درمیان
تقریباً ہر سال نئے غیر ملکی قرضے لیے جانے لگے، جن کی
مجموعی رقم تقریباً دو سو ملین پونڈ تک پہنچ گئی۔
چونکہ ترکی میں روپیہ ڈوبنے کا خدشہ زیادہ تھا، اس
لیے اسے انہی شرائط پر قرضہ دیا جاتا تھا جو اس
کے لیے افیم بخش نہیں ہوتی تھیں۔ اس قرضے کے
ذریعے جو روپیہ ملتا، اس کا اکثر حصہ ملک کے ہزاروں
کے مطابق معمولی اخراجات میں صرف ہوتا، تاہم
ایسے منصوبوں میں لگایا جاتا، جنہیں اقتصادی ترقی میں
کوئی تعلق نہ ہوتا تھا۔ ۶ اکتوبر ۱۸۷۵ء کو
معاملات انتہا کو پہنچ گئے جب کہ عثمانی حکومت
سوڈ کی رقم ادا کر سکی، نہ قرضہ ہی چکا سکی۔ اس کے
بعد ایک زمانے تک گفت و شنید جاری رہی اور بالآخر
ترکی حکومت اور سوڈی قرض خواہوں کے نمائندوں کے

لکھ رہا تھا۔ ایسے ہی *Lieudier* میں اور نیز وہ بیان
جو B. de Viganère کی *Illustrations* (طبع ۱۸۶۵ء
عمود ۹۸) میں دیا گیا ہے بہت کچھ پوسٹل سے لیا
گیا ہے۔ مندرجہ ذیل حوالے ایسے ہیں جو کسی اور
سے نقل نہیں کئے گئے : (۱۲) *Petit : Spandugin*
Traité طبع ۱۸۹۶ء، ص ۱۰۲، پیمہ ۱۳۳
پیمہ، *Documents inédits : Sathas*، ۱۸۶۲ء، پیمہ
۱۲۵ : (۱۳) *Le Voyage de M. d' : J. Chesneau*
Arman طبع ۱۸۸۷ء، ص ۳۳، پیمہ (۱۴)
Briefve Description : A. Geuffroy
ص ۲۸۲، پیمہ (۱۵) *De la République : Cl. Postel*
۱۵۶۰ء : ۳ : ۲۲، پیمہ (۱۶) *Cos : A. Thievel*
۱۵۷۵ء : ۱۵۷۹ء، ص ۸۰، پیمہ
۸۱ء (گھڑے ہوئے الفاظ) : (۱۷) *N. de Nicolay*
Navigation، ۱۵۶۸ء : ۱۵۶۹ء، پیمہ (۱۸) *S. Schweigger*
Neue Reysbeschreibung، ۱۶۶۸ء : ۱۶۶۸ء، پیمہ
(۱۹) *De Acie : Busbecq*، ۱۵۸۱ء : ۱۵۸۲ء، پیمہ
انگریزی ترجمہ از N. Tate، ۱۶۶۹ء : ۱۶۶۹ء، پیمہ
(۲۰) *Peregrinations : I. Palerne*، ۱۶۶۶ء : ۱۶۶۶ء، پیمہ
۵۰۲ : ۵۰۲، پیمہ (۲۱) *Relation : H. de Beauvau*
Journalière، ۱۶۶۹ء : ۱۶۶۹ء، پیمہ (۲۲) *Volage de Levant*
۱۶۶۳ء : ۱۶۶۳ء، پیمہ

ان بیانات کا جائزہ ان دفتر خاتون کے مواد سے لیا
جا سکتا ہے جو I.H. Uzunçarşılı نے *Osmanlı Devleti*
İstiklalatından Kapıkulu Ocakları ج ۱، ۱۹۴۳ء :
ص ۱۸۱ میں دیے ہیں ان میں تقریباً وہ سب
دستاویزات جمع ہیں جو احمد رفیق نے *Edebiyyat Fakih*
İleri Medjmuası ج ۱، ۱۹۲۶ء : ۱۸۱ میں طبع
کیے اور اسی کتاب پر I.H. Uzunçarşılı کے مقالہ
دیو شرمہ کی بنیاد ہے، جو I.H. میں شائع ہوا : *Uzunçarşılı*
اکثر ایک کتاب کا حوالہ دیتا ہے جو اس کے ذہنی کتاب
خانے میں ہے اور جس کا نام *قوائیم و نئی ہریان* ہے : یہ

جو عثمانی وزارت مالیات کے عملے سے زیادہ تھی۔ یہ مجلس منظمہ ارض بہت زیادہ طاقتور جماعت بن چکی تھی جس کا اثر سلطنت عثمانی کی مالی اور اقتصادی زندگی پر دور رس تھا اور اس کا سیاست پر بھی بڑا اثر تھا جس کے مختلف اندازے آئیے گئے ہیں۔

یہ مجلس منظمہ قرض پہلی جنگ کے دوران میں اور اتحادیوں کے قبضے کے ماتحت اپنا کام کرتی رہی، باوجودیکہ برطانوی، فرانسیسی اور اطالوی نمائندے جنگ کے دوران میں اور جرمنی اور آسٹریا کے نمائندے عارضی صلاح کے بعد اس میں سے نکل چکے تھے۔ اس کا کام باقی ماندہ نمائندوں کے زیر اہتمام چلتا رہا اور جو رقم دشمن قرض خواہوں کے حصے کی تھیں وہ بعد میں ادا کرنے کے لیے جمع رکھی جانے لگیں۔ یہ مجلس ختم اس وقت ہوئی جب مصطفیٰ کمال کی قیادت میں نوم برصغیر کی جیت ہو گئی اور ترکی جمہوریت کا قیام عمل میں آیا۔ معاہدہ لاسینی میں مطالب حکومت ترکیہ کے قرض میں جدید ترکی کا حصہ مقرر کیا گیا۔ پھر گفت و شنید شروع ہوئی اور ذمے داری اور ادائیگی کا معاہدہ ۱۹۲۸ء اور ۱۹۳۳ء میں طے ہو گیا۔ ۱۹۳۳ء میں یہ قرض مکمل طور پر ادا کر دیا گیا۔

مآخذ : (۱) *Essai sur l'histoire* - F.A. Belin

(۲) *Économique de la Turquie* - J.A. ۱۸۸۵ء

Les finances de Turquie - C. Morawitz

Essai sur l'histoire - A. du Velay (۳) ۱۹۰۲ء

financière de la Turquie - ۱۹۰۳ء (۴)

Essai historique et technique sur la - A Roumani

dette publique ottomane - ۱۹۰۲ء (ڈیکوی نہیں)

European financial con - D. G. Blaisdel (۵)

strol in the Ottoman Empire - ۱۹۲۹ء (۶)

Turkey an economy in transition - Z. Y. Hershlag

The Hague - دبوں تاریخ (۱۹۶۰ء) (۷) B. Lewis

رمبان سمجھوتا ہو گیا۔ اس سمجھوتے کو قانونی شکل نام لباد "فیصلہ مجرم" کے ذریعے دی گئی، جو ۲۸ حرم ۱۲۹۹ء / ۲۰ دسمبر ۱۸۸۱ء کو جاری ہوا جس کی رو سے "ادارہ قرض عمومی" "دبوں عمومی" فرانسیسی میں *Administration de la dette publique* ottomane قائم ہوا، جو براہ راست بیرونی قرض خواہوں کے زیر انتظام اور انہیں کے رو برو جوابدہ تھا۔ اس ادارے کا قرض اولین یہ تھا کہ قرضے کی وصولی کا یقینی اور قابل وثوق ذریعہ مہیا کرے۔ اس قرض کی مجموعی مقدار ۱۰۶۳،۹۹۲،۰۰۰ پونڈ سٹرلنگ، یا ۱۱۵،۹۱۲،۰۰۰ تری پونڈ بشرح ۱۱، پبشری پونڈ سٹرلنگ، جو اس وقت رائج تھی، مقرر کی گئی۔ اس قرض کے لیے حکومت عثمانی نے اپنے "مدر، محصولات مطلقاً اور ناقابل فسخ طور پر تا ادائیگی قرض ادارے کو سونپ دیے۔ یہ آمدنی ہمک اور قرضہ کی اجارہ داری، ٹکٹ، کچول (Chirits) پرسم اور بھی گیری کے محصولات سے حاصل ہوتی تھی اور ان سب کو "رسوم" سے "بھی چھپے ٹیکسوں سے موسوم کیا گیا۔ یہ ٹیکس براہ راست انبارے کے اپنے کارکن وصول کرتے تھے، علاوہ بران ولایات باغان سے بھی یہ ادارہ خراج وصول کرتا تھا اور ضرورت ہوتی تو جنگی کے محصول کا ایک حصہ بھی لے لیتا تھا۔

اس ادارے کی مجلس منظمہ چھپے منسوب پر مشتمل تھی جو برمانیہ، بالٹک، فرانسی، جرمنی، اطالیا، "تیریا، ہنگری" اور عثمانی ترکیہ کے نمائندہ گروہ کی نمائندگی کرتے تھے۔ ان کے ساتھ ایک سانواں منسوب اور تھا جو نقدی تسکات کے گروہ کی نمائندگی کرتا تھا، جن میں سے پبشر عثمانی حکومت کے بینک (Imperial Ottoman Bank) کے قبضے میں تھے۔ ۱۸۸۱ء ہی میں اس مجلس کے تین ہزار سے زیادہ محاصل وصول کرنے والے عمال تھے۔ ۱۹۱۱ء کے آنے آنے اس کے عملے کی تعداد ۸۹۳۱ تک پہنچ گئی تھی،

کے احاطے میں واقع ہے، جو دہلی کے حضرت نظام الدین چشتی کے شاگردوں میں سے ہے۔ اس احاطے میں سب سے پرانا کتبہ مزار ۱۵۹۵ھ/۱۶۰۲ء کا ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت حکمران بادشاہ محمود تغلق تھا اور اس کا مقامی نمائندہ دلاور خان آرگ باں]۔ یہ عمارت اور اس سے کسی قدر بعد کے زمانے کی جامع مسجد کی ساخت میں [بجائے، حراہوں کے] شہتیروں اور کڑیوں کی حقیقی استعمال کی گئی ہیں: جامع مسجد کی بیرونی ڈیوڑھی میں یہ کوشش نظر آتی ہے کہ کڑیوں سے ساختہ (trabeateed) روکار کو -توں کے بیچ بیچ میں بنائی ہوئی نوکدار حراہوں سے ہم آہنگ کر دیا جائے، جن کی بجائے خود کوئی عمارتی اہمیت نہیں ہے، یہ اسلوب مانڈو میں واقع مالک منیت کی مسجد کا پیشرو ہے۔ جامع مسجد کے مشرق دروازے پر ۸۰۰ھ/۱۳۰۰-۱۳۰۵ء کے اور شمالی دروازے پر ۱۵۰۰ھ/۱۳۰۰-۱۳۰۵ء کے کتبات ہیں (جنہیں قبائلی یہ ہے کہ جہانگیر: توڑک جہانگیری، فارسی متن، ص ۲۰۱-۲۰۲ نے غلط پڑھا ہے): ان کے لیے دیکھئے EIM ۱۹۰۹-۱۹۱۰ء، ص ۱۱-۱۲ اور اوجہ سوم۔ اسی وضع قطع کی ایک تیسری مسجد راجا بوج کا نام نہاد مدرسہ ہے، جس کا یہ غلط نام اس لیے مشہور ہو گیا کہ اس میں بکثرت فرش کی ایسی سائیں اور ستونوں کے شکستہ تھر ہیں، جن پر شکرت صرف و نحو کے سبک حافظہ قواعد کنندہ ہیں۔

متاخر عمارتیں تقریباً سب کی سب مانڈو کے پہلے شاہی حکمران محمود شاہ (۱۵۳۹ھ/۱۵۳۹ء تا ۱۵۷۳ھ/۱۵۷۳ء) کی بنا کردہ ہیں، جن میں شاید دھار کے قدیم ترین اسلامی مقبرے، یعنی عبداللہ شاہ چنگل کے مقبرے کی تعمیر او بیوی شامل ہے، جن کے بارے میں مشہور ہے کہ انہوں نے راجا بوج کو مشرف باسلام کیا تھا: اس میں اختلاف ہے کہ آیا اس سے

The emergence of modern Turkey بار دوم، لنڈن ۱۹۶۲: (۸) احمد راسم: عثمانی تاریخی، ج ۴، استانبول ۱۳۲۶ تا ۱۳۳۲: ص ۲۰۲۸ تا ۲۰۴۷ (فائدہ): (۹) Tanzimat dervinde istikrazlar: Refii Sükrü Süvle در Tanzimat، ج ۱، استانبول ۱۹۹۷: ص ۲۶۳ تا ۲۸۸: (۱۰) Pakalin، ج ۱، ۱۸۸۷ تا ۱۸۹۱: (۱۱) Osmanlı mali tarihi hakkında: Ziya Karamursal ۱۹۹۷: استانبول ۱۹۹۷۔

(B. LEWIS)

* دھار: وندھیا جل بہاڑوں کی اندرونی عمودی ڈھلان پر واقع ایک قدیم شہر، جہاں سے دربارے تربدا کی وادی کا منظر دکھائی دیتا ہے اور جو ۱۹۵۶ء سے فلم دھار، وندھیا پردیش (بھارت) کا صدر مقام ہے۔ اس کی تاریخ کے لیے دیکھئے (۱) لنڈن، بار دوم، بذیل مادہ۔

مآخذ: (۱) Central India gazetteer ۳۸۹: ۵ تا ۵۱۵: EIM (۲) ۱۹۰۹-۱۹۱۰ء، ص ۱ تا ۲۹: (۳) History of the Paramara dynasty: D.C. Ganguly لہاکہ ۱۹۳۳ء: (۴) The sultans of: H. N. Wright (۵) Delhi: their coinage and metrology ۱۹۳۶ء: (۶) Malwa in transition: R. Sinha (۷) History and culture of the Indian people (۸) ۱۹۳۶ء: ج ۶: The Delhi sultanate: بی بی، ۱۹۶۰ء۔ دیکھئے نیز دلاور خان: مالوہ، مانڈو۔

(J.D. HARRISON) [تلخیص از ادارہ]

۲۔ یادگار عمارتیں: عمارتی نقطہ نظر سے دھار کے آثار کی اہمیت محض یہ ہے کہ ان سے مالوے کے سب سے ابتدائی عمارتی روپ کی، جو ہندوستان کے اسلامی فن عمارت کا ایک مخصوص اسلوب تھا، وضاحت ہوتی ہے (دیکھئے مادہ ہند، فن عمارت)۔ قدیم ترین مسجد کی عمارت کمال الدین مالوی (جنہیں مقامی طور پر کمال مولیٰ کہا جاتا ہے) کے مقبرے

مآخذ: (۱) Dhār and Mandi, E. Barnes (۲) JBARAS در ۲۱ (۱۹۰۳ء) : ۳۵۳ تا ۳۵۴ (۳) وہی مصنف : Conservation of ancient buildings at Dhār : C. F. Barnes (۴) ۱۹۰۳ء میں : ۳۵ تا ۳۶ (۵) State Gazetteer : ۱۹۰۶ء میں : ۱۰۶ تا ۱۰۷ (۶) غلام بزدانی : The inscription on the tomb of Abdullah (Shah Chaugāl at Dhār) : EIM (۱۹۰۹-۱۹۱۰ء) ص ۱۰۵ و لوحہ ۱ (۵) وہی مصنف : Remarks on the inscriptions of Dhār and Mandi : EIM (۱۹۱۱-۱۹۱۲ء) ص ۱۰۱ تا ۱۰۲ (۶) ظفر حسن : The inscriptions of Dhār and Mandi : EIM (۱۹۰۹-۱۹۱۰ء) ص ۲۹ تا ۳۰

(1. Barnes-Page)

دھار وار: دھاری ریاست بمبئی کی قسمت بلخزم کا ایک ضلع، جس کا رقبہ ۵۳۰۵ مربع میل اور آبادی ۱۵۵۳۶۶ نفوس پر مشتمل ہے۔ ان میں سے ۱۵ فی صد مسلمان ہیں (بروئے مردم شماری ۱۹۵۱ء)۔ ساتویں صدی ہجری/تقریباً ۱۲ویں صدی عیسوی تک یہ شہر مسلمانوں کے حوالے سے محفوظ رہا، لیکن اگلی صدی میں محمد بن تغلق کی وسیع سلطنت کا حصہ بن گیا۔ پھر جب دہلی کی مملکت کو زوال آیا تو دھار وار اپنی جغرافیائی حالت کی وجہ سے، بالخصوص دو آبشاروں کے قریب ہونے کے باعث، دکن کی ہیمئی سلطنت اور وجینگر کی سندھو سلطنت کے مابین وجہ نزاع بن گیا۔ معاہدہ ہونا ہے کہ ۱۵۶۵ء/۹۷۲ھ کے قریب قریب اسے بجاپور کے عادل شاہی سلاطین نے فتح کر لیا تھا۔ یہ شہر انہیں کے قبضے میں رہا تا آنکہ اورنگ زیب کے ہاتھوں ۱۷۰۹ء/۱۱۲۶ھ میں ان کی ریاست کا خاتمہ ہو گیا۔ بارہویں صدی ہجری/اٹھارہویں صدی عیسوی میں جب مغلیہ سلطنت کے حصے بخرتے ہو رہے تھے تو اس پر مرہٹوں کی اثر مار کرنے والی فوجیں اکثر

براد بھوج اول (۱۰۱۰ء تا ۱۰۵۳ء) ہے، جو ایک وسیع النظار اور غیر متعصب تاجم ایک دکنی ہندو تھا۔ اس صورت میں یہ بزرگ محمود غزنوی کی فوج کے ہمراہ مالوے آنے ہوں گے۔ اس سے بھوج نالی (۱۰۲۸ء تا ۱۰۳۱ء) مراد ہے کیونکہ اس زمانے میں کسی جیوٹی ریاست کے حکمران کے لیے قبول اسلام ایک سیاسی مصالحت ہو سکتی تھی۔ ان بزرگ کے بارے میں اور کچھ معلوم نہیں اور بھوج کے تبدیل مذہب کی داستان کو اب بہت مشتبہ سمجھا جاتا ہے، لیکن محمود شاہ نے ۸۵۹ھ/۱۴۵۵ء میں جو کتبہ ان کے مزار پر لکوا یا تو، (EIM ۱۹۰۹-۱۹۱۰ء) ص ۱۰۵ اور لوحہ ۱: فارسی کی ۳۲ آیات، ہندوستان میں طویل ترین فارسی کتبوں میں سے ایک) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں عام طور پر لوگوں کا یہی یقین تھا۔ اعمال الدین کے متبرے کی فنی عمارت تھی محمود شاہ ہی کی رہیں، آیت ہے (دروازے کا کتبہ، مؤرخہ ۸۶۱ھ/۱۴۵۶ء - ۱۴۵۷ء)۔ ان بزرگ کی قبر کے بالمقابل ایک اور قبر ہے، جو مقامی روایت کی رو سے خود محمود کی ہے۔

بعد کے زمانے میں جامع مسجد اس لاٹ کی بدولت، جو غالباً ابتدائی تیرہویں صدی کے کسی مقامی برمار حکمران کا "ستون فتح" تھی (آب ASI Annual Report ۱۹۰۲-۱۹۰۳ء ص ۲۰۳) اور مسجد کے باہر بڑی ہے، "لاٹ کی مسجد" کے نام سے معروف ہو گئی تھی، اس لاٹ پر ایک کتبہ ہے، جس میں ۱۰۰۸ھ/۱۵۹۹ء میں اکبر کے دھار میں مختصر قیام کا ذکر ہے اور جس کی جگہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لاٹ اس وقت تک گر چکی تھی۔

کہا جاتا ہے کہ دھار کا قاعدہ، جو اب اندرونی عمارتوں سے خالی ہو چکا ہے، سلطان محمد بن تغلق نے دکن کی تسخیر کے لیے جاتے ہوئے بنوایا تھا، اس کا کوئی مفید مطالبہ اور تسلی بخش بیان موجود نہیں ہے۔

پر ہوتا رہا، حتیٰ کہ ۱۹۵۶ء کی تنظیم نو کے
مانحت اسے میسور کی نئی ریاست کے سپرد کر
دیا گیا۔

(C. COLLIN DAVIES)

دھتورا : یہ ہندی لفظ ہے، فارسی میں اس کی

شکل قاتورا ہے اور عربی میں اسے جوز مائل کہتے ہیں۔
یہ ایک چھوٹے سے خاردار پودے کا خاردار پھل
ہے۔ اس پودے کی دانچ آسمیں ہیں : (۱) اوڑے
پھولوں والا : (۲) سرخ پھولوں والا : (۳) سیاہ
پھولوں والا : (۴) سفید پھولوں والا : (۵) زرد پھولوں
والا : سرخ پھولوں والا : قسم کیاب ہے۔ یونانی طب
میں سفید اور اوڑے پھولوں والی صرف دو قسموں کا
ذکر آیا ہے۔ دھتورے کے پھل کا ذائقہ قدرے تلخ ہوتا
ہے۔ اس کے بیج سیاہ رنگ کے اور زہریلے ہوتے
ہیں۔ اس کے زہر کا درد بولا ہے۔ یہ بیج جسم
کو بے حس کرنے والے نیز خواب آور اور قے آور
ہیں۔ ان کا مناسب و محتاط استعمال جذام، خارش،
پتھریلے بھتسی اور دہے کے لیے مفید سمجھا گیا ہے۔

[ادارہ]

حماہ آور ہوتی رہیں۔ کچھ عرصے کے لیے اسے حیدر علی
نے اپنی سلطنت میسور میں شامل کر لیا تھا، مگر پھر
۱۷۹۱ء میں بعد ازاں سلطان انگریزوں اور مرہٹوں کی
متحدہ فوج نے Captain Little اور پرنس رام بھاؤ کی
سرکردگی میں دھار وار کا دھچکا چھین لیا Grant Duff :

History of the Malwattas : ۲ : ۱۹۷ تا ۲۰۱
اوکسفورڈ : ۱۹۹۱ء : Wilk : Mysore : ۲ : ۳۸۳ تا
۳۸۸ : میسور ۱۹۳۲ء)۔ اس کے بعد سے یہ شہر برابر
مرہٹوں کے قبضے میں رہا، حتیٰ کہ ۱۸۱۷ء میں
انہوں نے انگریزوں سے شکست کھائی۔ ۱۸۵۷ء
تا ۱۸۵۸ء میں بھاسکر راؤ (بابا صاحب) نے جو دھار وار
میں نرگند کا پیشوا تھا اور جسے لارڈ ڈنلوپی نے مہیشی
بنانے کی اجازت نہیں دی تھی، بغاوت کر دی۔ اس
نے جنوبی مہاراشٹر کے برطانوی کمشنر اور پولیٹیکل
ایجنٹ چارلس مینسن Charles Manson کو قتل کر ڈالا۔
اس کا نتیجہ بالآخر بھاسکر راؤ کی پھانسی اور ریاست نرگند
کی ضبطی کی صورت میں نکلا (Malleson و Kay :
Indian Mutiny : ۵ : ۱۶۳ تا ۱۷۷ : لندن ۱۸۸۹ء)۔
دھار وار کا انتظام بمبئی کے ایک حصے کے طور

زیادات و تصحیحات

جلد ۹

زیادات

(بحوالہ صفحہ ۸۸۳ عمود ۲، سطر ۲۰)

جانے گا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو صبر و استقامت اور تہجد گزاری کی تلقین کی گئی اور کفر و نافرمانی کی راہ پر چلنے والے سے اغراض کا حکم دے کر یہ بتایا گیا ہے کہ یہ نافرمان لوگ قیامت کے ہیبت ناک دن سے غافل ہو کر دنیا کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں، لیکن یہ دنیا زیادہ دیر ان کے ہاتھ میں نہیں رہ سکی گی۔ سب سے آخر میں یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ رحمت و نصرت اور نجات و عذاب اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تابع ہیں (تفسیر المواقف، ۲۹: ۱۷۷)۔

ابو بکر الجصاص (الحکم القرآن، ۳: ۱۷۷) نے اس سورت کی صرف ایک آیت (۸) سے اسیروں کے بارے میں احکام کا استنباط کیا ہے، لیکن ابو بکر ابن العربی (الحکم القرآن، ص ۸۸۵) بعد نے اس کی چھ آیت (۱، ۲، ۳، ۴، ۵ اور ۶) سے بارہ مختلف شرعی احکام اور اہم فقہی مسائل کا استنباط کیا ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک رقبہ سورۃ الدھر کی تلاوت فرمائی۔ جب ختم کر چکے تو اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرما: "جو کچھ میں دیکھتا ہوں وہ تم نہیں دیکھ سکتے"۔ "جو کچھ میں سنتا ہوں وہ تم نہیں سن سکتے"۔ اسے شیخ اثوا اور اس کا شیخ اٹھنا حق بجانب ہے کہ اسے ان بزرگواروں کے برابر کوئی بھی ایسی جگہ نہیں جہاں فرشتہ اللہ کے سامنے سجدہ ریز نہ ہو۔ اللہ کی قسم! جو کچھ میں جانتا ہوں اگر تمہیں معلوم ہو جائے تو بہت کم منسو اور زیادہ روپا کرو اور تمام دنیوی لذتوں کو چھوڑ

⑤ الدھر: قرآن مجید کی ایک سورت، جس کا عدد تلاوت ۶۷ اور عدد نزول ۹۸ ہے۔ الدھر کے علاوہ اس سورۃ کے دوسرے نام بھی ہیں، مثلاً سورۃ الانسان، الارار، الاستحاج اور سورۃ هل اتی (روح المعانی، ۲۹: ۱۵۰، فتح البیان، ۱۰: ۱۶۳، الاتقان، ص ۱۱)۔ یہ سورت دو رکوع اور اکتیس آیات پر مشتمل ہے۔ جمہور اہل علم اور مفسرین کی رائے میں یہ سورت مدنی ہے، لیکن بعض نے اسے مکی بھی کہا ہے حسن بصری، عکرمہ اور الکلبی سے منقول ہے کہ یہ سورت مدنی ہے، صرف ایک آیت (۲۳) مکی ہے (حوالہ سابق)۔ بعض کے نزدیک ابتدائی بائیس آیات مدنی ہیں اور باقی مکی ہیں (فتح البیان، ۱۰: ۱۶۳)۔

مفسرین نے سابقہ سورت کے ساتھ اس سورت کا ربط یہ بیان کیا ہے کہ پچھلی سورۃ القیامۃ میں ان ہوانا کیوں، حسرتوں اور محرومیوں کی تفصیل ہے جن کا ذکر قیامت کے دن بدکار لوگ کریں گے۔ اب اس سورت میں ان مسرتوں اور غیر فانی نعمتوں کا تذکرہ ہے جو دار آخرت میں نیکو کار اہل ایمان کو نصیب ہوں گی (تفسیر المواقف، ۲۹: ۱۵۰، روح المعانی، ۲۹: ۱۵۰)۔ سب سے پہلے اللہ کی اس حکمت بالغہ کا بیان ہے جس کے دست اعجاز نے انسان کو عدم سے وجود بخشا اور برے بھلے کی تمیز کی صلاحیت بھی اس میں رکھ دی۔ اس کے بعد ان نے بناہ مسرتوں اور بے شمار نعمات کا ذکر ہے جن سے اطاعت و شکر گزاری کی راہ پر چلنے والے بندوں کو جنت میں نوازا

خان: فتح البیان، قاہرہ بلا تاریخ: (۶) آنوسی: روح المعانی،
قاہرہ بلا تاریخ: (۷) الدواعی: تفسیر الراغب، قاہرہ ۱۹۴۶ء
(۸) الزمخشری: الکتاب، قاہرہ ۱۹۴۶ء (۹) البیضاوی:
تفسیر البیضاوی: لا بیگز ۱۹۴۸ء (۱۰) ابو بکر ابن العربی:
احکام القرآن، ۱۹۵۸ء (۱۱) شاء اللہ یاقی یقی: التفسیر
المظہری، حیدر آباد دکن بلا تاریخ: (۱۲) ابو بکر
الخصاص: احکام القرآن، قاہرہ ۱۹۳۵ء (۱۳) امیر علی:
تفسیر سواہب الرحمن

(ظہور احمد انظر)

کرا اللہ عزوجل کے حضور میں حاضر ہونے کے لیے نکل
دوڑو“ (فتح البیان، ۱: ۱۶۴)۔ ایک موقع پر آنحضرت
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”جس نے سورۃ
ہل ائی کی تلاوت کی اللہ کے ہاں اسے جنت کی نعمتیں
ملیں گی“ (الکشاف، ۴: ۷۷۷)۔ تفسیر البیضاوی، ۲:
(۳۷۷)۔

مآخذ: (۱) ابن منظور: لسان العرب، بیروت ۱۹۵۷ء
(۲) الشریف الرحمانی: کتاب الترمذی، بیروت ۱۹۶۶ء
(۳) السیوطی: الاتقان، قاہرہ ۱۹۵۶ء (۴) ابوالحسن علی
ابن ابی بکر: کتاب الترمذی، قاہرہ ۱۹۶۸ء (۵) صدیق حسن

تصحیحات

صفحہ	عمود	سطر	خطا	صواب
۶	۲	۲۰	خَنَدَق	خَنَدَق
۷	۲	۱۰	اسحق	اسحق
۳۰	۱	۱۳	ارابہ	ارابہ
۳۰	۱	۳۱	جمہور تہوں	جمہور تہوں
۳۶	۲	۴	تربیب	تربیب
۴۵	۲	۱۹۱۸	شروع کے خافا سے اس میں	شروع کے عباسی خلفائے اس میں
			کی توسیع کی اور اسے اپنے	کی توسیع کی اور اسے اپنے کام میں
			کام میں عباسی لائے	لائے۔
۵۲	۲	۳۰	خوشحال	خوشحال
۱۳۱	۱	۱۱۱۰	دارالعلوم سہارنپور	دارالعلوم (= مدرسہ مظاہر العلوم) سہارنپور
۱۳۳	۱	۳۲	وار	اور
۱۴۸	۱	۱۸	آئہ	آئہ
۱۵۸	۱	۱	منہجین	منہجین
۲۰۶	۱	۹	عمودی	عمودی

صفحہ	عمود	مطار	خطا	صوبہ
۲۱۸	۱	۲۶	جزوا	جزوا
۲۱۸		۲۸	شعبہ	شعبہ
۲۱۹	۱	۶	بچا کھچا	بچا کھچا
۲۱۹	۱	۳۳	تھی یا	تھی
۲۲۰	۱	۶	سیلابی	سیلابی
۲۲۰	۱	۹	شبہ	شبہ
۲۲۱	۲	۶	بگھلاؤ	بگھلاؤ
۲۳۰	۱	۳۲	عری	عری
۲۳۶	۱	۳۲	کہ غوطہ خور	غوطہ خور
۳۲۲	۲	۳۲	Vayages	Vayages
۳۲۳	۱	۱۶	فرامین	فرامین
۳۲۳	۱	۲۶	بالغوص	بالغوص
۳۲۳	۱	۲۸	کھینچ	کھینچ
۳۲۴	۱	۲۵	تکمل	تکمل
۳۲۵	۲	۸	(یا) -	(یا)
۳۲۹	نمبر صفحہ	۲۲۹		۳۲۹
۳۲۹	۲	۲۷	منصب	منصب
۳۳۱	۱	۸	یوری	یوری
۳۳۱	۲	۲۱	دوسوا	دوسرا
۳۳۲	نمبر صفحہ	۲۳۲		۳۳۲
۳۳۳	۲	۴	ارشوی	ارشوی
۳۳۴	۲	۹	کیے گئے	کیے گئے
۳۳۶	۱	۲۳	گھیرے ہو ہیں	گھیرے ہوئے ہیں
۳۳۷	۱	۲۱	حقائق	حقائق
۳۳۹	۲	۳۲	استمداد	استمداد
۳۴۸	۱	۱	سید	سید
۳۴۸	۱	۲۸	۱۰۰۵ء الحاکم	۱۰۰۵ء میں الحاکم
۳۴۹	۲	۹	الفرق	الفرق
۳۴۹	۲	۳۲	حلقہ دعوت میں اندر ہے	حلقہ دعوت میں ہے
۳۵۲	۱	۳۲	الطیبه	الطیبه
۳۵۷	۱	۱۸	۲۱ تا ۲۴	۲۱ تا ۲۴

صفحہ	عمود	خطا	صواب
۳۵۷	۱	۴۳ (بعد)	۴۳ بعد
۳۶۲	۱	کارگزاریوں	کارگزاریوں
۳۶۳	۲	۱۳-۱۳	اور اسے مندرجہ ذیل تذکرے اور دفاتر اس کی تحویل میں ہونے چاہیے :
۳۶۸	۲	۲ تا ۴	چنانچہ تیماروں - - - - - چنانچہ تیماروں ، یعنی تیمارداروں کی فہرستیں رکھی جاتی تھیں ، جن میں ان کے محاصل کے بارے میں مختصر بیانات بھی درج ہوتے تھے ۔ اسی طرح شاہی جاگیروں کی فہرستیں بھی - - - - - اراضی اور جاگیروں کی بھی فہرستیں تیار کی جاتی تھیں ۔
۳۶۸	۲	۳۰	دقت خانے
۳۷۰	۲	۱۳	بطور عشر میں
۳۷۳	۲	۳	صحیح
۳۷۴	۱	۱	ہر قسم
۳۸۳	۱	۷	دو زانو
۳۸۳	۱	۲۱	دیکھے
۳۸۳	۲	۷	صحیح
۳۹۹	۱	۲۳	میں
۳۹۹	۱	۲۵	چھتیں
۴۰۰	۱	۲۵	چھتیں تھیں
۴۱۶	۱	۲۹	گزارا
۴۱۹	۱	۸	باربرداری
۴۲۱	۲	۱۲	فروع
۴۳۵	۲	۳۱	طبیعیات
۴۵۸	۱	۱۱	بائیں دوسرے مقامات
۴۶۹	۲	۸	ڈھلوان زمین
۴۷۲	۱	۳۲	”قلعے“
۴۷۵	۱	۳	السمودی نے بھی
۴۸۵	۱	۲	اس کی خواہشات
۴۸۸	۱	۱۱	مغربی

جملہ حقوق بحق پنجاب یونیورسٹی محفوظ ہیں
مقالہ نگار یا کسی اور شخص کو کپی یا جزوی طور پر اس
کا کوئی مقالہ یا تعلقہ یا اس کے کسی حصے کا
ترجمہ شائع کرنے کی اجازت نہیں۔

ناشر	-----	مسٹر اقبال حسین، قائم مقام رجسٹرار، دانش گاہ پنجاب، لاہور
مقام اشاعت	-----	لاہور
سال طباعت	-----	۱۳۹۲ھ / ۱۹۷۲ء
مطبع	-----	جدید اردو ٹائپ پریس، ۳۹، جمہوریت روڈ، لاہور
طالع	-----	مرزا نصیر بیگ، ناظم مطبع
صفحات	-----	۲۳۵+۲ تالی

باب دوم

سال طباعت	-----	۱۴۲۵ھ / ۲۰۰۴ء
مطبع	-----	ادبیستان-۳۳ ریجنی گمن روڈ، لاہور
زیر نگرانی	-----	ڈاکٹر محمود الحسن، عارف
		نگران صدر شعبہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ
		پنجاب یونیورسٹی، لاہور

Urdu

Encyclopaedia of Islam

Under the Auspices
of

THE UNIVERSITY OF THE PUNJAB LAHORE



Vol. 9

(Khamsa..... Dhatira)

1425/2004

www.besturdubooks.wordpress.com